UNIVERSAL LIBRARY

224100

فہرست مضامین ادبی دنیا لاہور

بابت ماہ فروری سنہ ۱۹۴۰ء

جلد ۱۸ نمبر ۲

تصاویر:- ۱۔طوفان - ۲۔ایک اور طوفان

چندہ سالانہ مع محصول ڈاک اور وی پی پانچ روپے ممالک غیر سے دس شلنگ

دنیائے کاروبار

ہندوستانی چائے

چینی عورتوں میں اب تک یہ قصہ مشہور چلا آرہا ہے کہ دیوتاؤں کے بادشاہ نے چائے کے پودے میں وہ طاقت عطا کی ہے جس کی وجہ سے اُنہیں اپنے خاوندوں کو شراب خواری کی کشش سے روکنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

منگولی زبان میں نظمیں لکھی گئی ہیں جن میں چینی عورتوں کے مذکورہ بالا خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ شراب خوار خاوندوں کو نجات دلانے کے لئے چائے ایک بااثر علاج ہے۔ ایک نظم کا خلاصہ یہ ہے کہ اپنے شوہروں کو چائے پینے کی عادت ڈالنے سے وہ اُنہیں شراب خوری کی عادت سے بچا لیں گی۔ ہر چینی عورت اس بات کو خوب جانتی ہے کہ اُس کے شوہر کو نشہ کے لئے نشیلی اور جوشیلی کردہ اشیا کی کب خواہش ہوتی ہے۔ وہ اُس وقت فوراً ایک پیالی خوشبودار چائے کی بنا دیتی ہے۔ اس طرح رفتہ رفتہ نشیلی چیزوں کی خواہش دور ہو جاتی ہے۔

دنیا کے بعض حصوں میں جہاں چائے کو حال ہی میں رواج دیا گیا ہے وہاں کی عورتوں نے اسے دوسرے مصرف میں بھی لانا شروع کر دیا ہے۔ اول تو وہ اسے گھر میں تمام لوگوں کو پلاتی ہیں اور سب اس سے پورا فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ اور دوئم یہ کہ چائے پی کر طبیعت میں جو جوش پیدا ہوتا ہے اُس سے سب کو سیری ہوتی ہے۔ اُنہیں آرام ملتا ہے جس کی وجہ سے گھر بھر میں شادمانی ہو جاتی ہے۔

عورتوں کو چائے سے جو خصوصیت ہے اس کے بارے میں مشہور ناول نویس ولیم میک پیس تھیکری جو کلکتہ میں پیدا ہوئے تھے، بہت سال قبل لکھ چکے ہیں۔

جب سے چائے کے پودے کی شناخت ہوئی ہے عام لوگوں میں اس بیچاری چائے دانی نے بہت بڑا کام کیا ہے۔ بے شمار عورتیں اس کے لئے روتی ہیں۔ کتنے رشتوں کو اس نے زندہ کیا ہے۔ بخار والے بے شمار ہونٹوں نے اس کو پی کر تر و تازگی پائی ہے۔ قدرت نے چائے کے پودے کو پیدا کر کے عورتوں کے ساتھ بڑا احسان کیا ہے۔ اگر ذرا غور کیا جائے تو آپ کے ذہن میں بے شمار خیالات پیدا ہونگے۔ ایک جگہ چائے دانی اور اُس کے گرد بہتیرے لوگوں کے مجمع کی تصویریں دکھائی دیں گی۔ اور آپ یہ سب ماجرا دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔

ڈاکٹر سی ڈبلو سیلبی ایم۔ ڈی۔ ایف۔ آر۔ سی۔ ایس۔ ایڈن برا نے اپنی ایک کتاب بہ عنوان "غم عمر بھر کی بیماری ہے" میں چائے کے جوش پیدا کرنے والی طاقت کے بارے میں لکھا ہے کہ:۔

چائے بیماری کے خیال کو دور کرتی ہے۔ اس لئے نہیں کہ اس سے ضمیر مردہ ہو جاتا ہے۔ بلکہ طاقت کے ذرائع کو جگا دیتی ہے اور اُس خیال کو پیدا کرتی ہے جس پر اندرونی طاقت کا دارومدار ہے۔ یہ حقیقی معنوں میں جوش پیدا کرنے والی ہے۔ اور ایسی چیز ہے جو زندگی کے لئے مفید ہے۔

مغل لائن

ڈائرکٹر آف انفرمیشن بیورو بیان کرتے ہیں کہ بمبئی کے اخبارات میں حجاج کے جہازوں کی روانگی کے متعلق غلط اطلاعات و الزامات شائع ہوئے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ جہاز "رضوانی" جو بمبئی سے ۲ جنوری کو روانہ ہوا ہے اس نے حاجی پیچھے چھوڑ دیئے ہیں کیونکہ باقی جگہ کراچی کے لئے ریزرو ہو چکی تھی۔ اور ۲ جنوری کے بعد کوئی جہاز روانہ نہیں ہوا۔ درآنحالیکہ حکومت ہند کے اعلان کے مطابق دوسرے جہاز کی روانگی چار جنوری سے پہلے ہو جانی چاہئے تھی۔

درحقیقت رضوانی جہاز میں بمبئی سے صرف ۴۳۲ حجاج اور دو بچے روانہ ہوئے۔ حالانکہ اس جہاز میں ۱۴۴۶ حجاج جا سکتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں اور حجاج بھی جا سکتے تھے۔ کیونکہ کراچی میں ۱۰۱۲ حجاج منتظر نہیں تھے۔

دوسرے جہاز کی روانگی کے متعلق یہ ہے کہ چونکہ ایسے حجاج بالکل نہیں تھے جو اخراجات کے لئے مناسب روپیہ رکھتے ہوں جو آمدورفت کے لئے ضروری ہے کمپنی نے دوسرے جہاز کی ادائیگی کا ارادہ ترک کر دیا۔

بزمِ ادب

(۱)

خدا کا شکر ہے کہ سالنامہ ہماری امیدوں سے بڑھکر مقبول ہوا۔ اور اہلِ ذوق نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ہمارے معاونین کی محنت ٹھکانے لگی اور ترقیٔ ادب کی شاہراہ پر ایک اور سنگِ میل طے ہوگیا۔ احباب اور ناظرین کے بہت سے خطوط دفتر میں آرہے ہیں جن میں سالنامے کی مختلف خصوصیتوں پر اظہارِ رائے کیا گیا ہے۔ آئندہ نمبر میں ان خطوط میں سے چند کا خلاصہ پیش کیا جائے گا۔

ہمارے مینیجر صاحب اطلاع دیتے ہیں کہ ابھی جن خریداروں نے رجسٹری کے لئے ٹکٹ نہیں بھیجے اُن کے سالنامے رُکے پڑے ہیں ایسے اصحاب تین آنے کے ٹکٹ رجسٹری کے لیے بھیج دیں تاکہ سالنامہ بحفاظت اُن تک پہنچ جائے۔

زیرِ نظر نمبر کے علمی و ادبی مضامین میں ہمارے کرم دوست ملک عطاء اللہ صاحب کلیم ایم اے کا مضمون "عہدِ حاضر کے سیرت نگار" اپنی دلچسپی اور ندرت کے لحاظ سے ایک خاص امتیاز رکھتا ہے اور کلیم صاحب کے شگفتہ اور رواں طرزِ تحریر کا ایک بہت اچھا نمونہ ہے۔ اردو میں سیرت نگاری کو ابھی وہ درجہ حاصل نہیں ہوا جو اس صنفِ ادب کا حق ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ خیال افروز مضمون بہت سے ایسے اہلِ قلم کی رہنمائی کرے گا جو سیرت نگاری کے لق و دق میدان میں اپنے جوہر دکھانا چاہیں۔

منشی پیارے لال صاحب شاکر میرٹھی ادبی دنیا کے خاص کرمفرماؤں میں سے ہیں۔ اُن کا ایک نہایت مفید اور دلچسپ مضمون اس نمبر کی زینت ہے۔ یہ مضمون اور کلیم صاحب کا مقالہ دونوں سالنامے کے لئے موصول ہوئے تھے لیکن وقت پر موصول نہ ہونے کے باعث درج نہ ہو سکے۔ شاکر صاحب کا مضمون جس کا عنوان ہے "مبادیاتِ افسانہ نگاری" اپنی سنجیدگی، دلکشی اور جامعیت کے لحاظ سے اردو کے بہترین مضامین میں شمار ہونے کے قابل ہے۔

شاکر صاحب بہت اچھا کرتے اگر وہ اردو یا ہندوستان کی دیگر زبانوں کی ادبیات میں سے بھی چند ایسی مثالیں دیتے جیسی انہوں نے انگریزی افسانوں میں سے چُن کر دی ہیں۔ اس سے مضمون کی فضا بالکل ہندوستانی ہو جاتی۔ بہرحال ہمیں یقین ہے کہ ہمارے بہت سے نوخیز افسانہ نگار اس مضمون سے پورا پورا فایدہ اٹھائیں گے۔

افسانوں میں ابو محمد امام الدین صاحب کا افسانہ "چھوٹی بہن" جو مشہور اطالوی ادیبہ ماتیلدے سیراؤ کے ایک دل آویز افسانے کا ترجمہ ہے اپنے اندر ایک خاص دلکشی رکھتا ہے اور اس کی پاکیزہ فضا ہماری روح پر چھا جاتی ہے۔ یہ افسانہ بھی سالنامے کے لئے آیا تھا، لیکن اس کے لئے بھی گنجائش نہیں رہی تھی۔ امام الدین صاحب ہندی اور انگریزی افسانوں کے ترجمے کا اچھا سلیقہ رکھتے ہیں اور یہ افسانہ اُن کے منتخب ترجموں میں سے ہے۔

ہماری ممتاز افسانہ نگار محترمہ عصمت چغتائی نے اپنے افسانے "تاریکی" میں زندگی کی ایک عریاں حقیقت کو یوں چھپایا ہے جیسے رات نے افسانے کی بھکارن کو چھپا رکھا تھا۔

یہ افسانہ بھی انہوں نے حسبِ معمول واحد متکلم کے صیغے میں لکھا ہے لیکن یہاں وہ مردوں کے اخلاق کا جائزہ لینے کے لئے مرد بن گئی ہیں ہمارے دورُخے اور مصنوعی ضابطۂ اخلاق کی ایسی بے باک تنقید بہت کم دیکھنے میں آتی ہے اور ہم اس جرأت کے لئے افسانہ نگار کو مبارکباد کے قابل سمجھتے ہیں۔ عصمت کی تشبیہیں اپنے اچھوتے پن اور انفرادیت کے لحاظ سے قابلِ توجہ ہوتی ہیں۔ لیکن اُن کے تاثر میں اس انفرادیت کی وجہ سے فرق نہیں آتا۔ مثلاً "وہ گرم پانی کی بوتل کی طرح گرم اور پسیجی ہوئی تھی"۔ "ہوا دق کے مریض کی طرح لمبی لمبی سانسیں کھینچ رہی تھی"۔ یہ تشبیہات نہ صرف زندگی سے بہت قریب ہیں بلکہ افسانے کی مخصوص فضا اور کردار سے اس قدر مناسبت رکھتی ہیں کہ ان کی ہم آہنگی ان کے اچھوتے پن کو دبا جاتی ہے۔

سالنامے کے انعامی مضامین اور گولڈ میڈل کی نامزدگی کا اعلان آئندہ نمبر میں کیا جائے گا۔

(۲)

سالنامے میں پہلی بار ادارے نے بزمِ ادب کو دُہری صورت میں پیش کیا۔ اور یوں حصۂ نثر کے مقابلے میں حصۂ نظم کی اہمیت کو نمایاں کرنے کی کوشش کی۔ ابھی اس نئی روش کے مخالف یا موافق رائیں تو موصول نہیں ہوئیں لیکن ارادہ ہے کہ اسے مستقل حیثیت دے دی جائے تاکہ نثر کی طرح نظم میں بھی ادارے کا اندازِ انتخاب واضح تر ہو جائے۔

دنیا کی ہر مضبوط اور زندگی سے لبریز نسل کے لوگوں میں یہ رجحان رہا ہے کہ وہ اپنے خیالات اور احساسات کو مادّی شکلوں اور استعاروں میں قید کر دیں۔ چنانچہ ہر ملک کی دیومالا اسی رجحان کا اظہار کرتی ہے۔ ہندوستان ہی میں آریاؤں کا علم ادب اس کی بہترین مثال ہے، وہ صبح کے منظر کو بھی "اُدشا" کے نسائی استعارے ہی میں دیکھتے تھے۔ اخترؔ منیر کی نظم میں بھی اگر ہم "اُس محوِ انتظار، اُس رشکِ حور کو جگنوؤں کی کیاریوں سے تھوڑی دور بچار ہی ہے ناز سے ادائے دل نواز سے، نفیس، پیاری، نرم نرم انگلیوں پہ موجِ نور—" ایک منتظر عورت کی بجائے انتظار کا مجسمہ یا استعارہ سمجھ لیں تو نظم کے لطف میں ایک وضاحت، ایک نزاکت اور ایک نیا پہلو پیدا ہو جاتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی نے "خلش" میں انتظار کی کیفیت ہی کو ایک اور پہلو سے پیش کیا ہے۔ آخری دو شعروں سے پہلے تک پڑھنے والا یہی سمجھتا ہے کہ شاعر صرف دنیا کی بدلتی ہوئی کیفیتوں کا جائزہ لے رہا ہے۔ اور یہ کہہ رہا ہے کہ انقلاب اور تغیّر ہر شے کی تہ میں کارفرما ہے بلکہ یوں کہئے کہ ہر شے کی یہ تمنّا ہے کہ اُسے ایک نئی صورت مل جائے لیکن اس جائزے اور تفکرانہ اندازِ بیان کا نتیجہ ہمارے لئے غیر متوقع طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ ہم سوچتے یہ ہیں کہ شاعر کسی فلسفیانہ نتیجے پر ہمیں پہنچائے گا (اور آخری شعر میں وہ ہمیں وہاں پہنچاتا بھی ہے) لیکن اس کے اپنے دل میں اس تمام عرصے میں ایک خلش جاری رہتی ہے وہ محض ایک جذباتی تحریک کے ماتحت یہ فلسفیانہ غور و خوض کر رہا ہے اور جذباتی تحریک اُسے یوں ہوئی ہے کہ وہ اپنی محبوب سے بچھڑ کر دور ہو چکا ہے۔ اس زمانۂ فراق میں وہ سوچ رہا ہے کہ جب ہر چیز یکساں نہیں رہتی تو اس کا لازمی نتیجہ یہی ہے کہ جانے والے بھی لوٹ آتے ہیں"۔ بیان کے اس پیچ نے نظم میں ایک خاص دلکشی پیدا کر دی ہے۔

"پہلگام" ایک قصیدہ ہے۔ اور عبدالعزیز فطرتؔ نے اس میں قصیدے کی خصوصیات کو بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر نظر کے سامنے رکھا ہے۔ الفاظ کی شوکت اور بحر کی اجنبیت ہمارے دل میں وہی احساس پیدا کرتی ہے، جو ایسے منظرِ قدرت کو دیکھنے کے بعد ہم شہریوں کے دلوں میں پیدا ہو سکتا ہے۔

کیفیؔ اعظمی کی نظم "یقینِ شکست" اگرچہ ایک سراسر جذباتی چیز ہے لیکن اس کا تغزّل اور اس کی موسیقی اسے نظم کی بجائے ایک غزل بلکہ ایک گیت سمجھنے پر اکساتی ہے۔ نیز شاعر نے ان سیدھے سادے جذباتی خیالات میں عمومیت نہیں پیدا ہونے دی اور اپنے کو بلند رکھنے کے ساتھ ہی ساتھ لب و لہجے کو بھی جدید اور انفرادی رکھا ہے۔

میراجی کی نظم کے متعلق آپ خود سوچئے!

میراجی

ایک ذاتی بات

یوپی سے تعزیت کرتے ہوئے چندر بھوشن سنگھ لکھتے ہیں کہ "ہمدردی کے اس موقعے پر ہم ایک دوسرے سے کس قدر دور ہیں"۔ لیکن مجھے اُن سے اختلاف ہے۔ جس خلوص اور جوشِ دل سے مجھ سے ہمدردی کا اظہار کیا گیا ہے اُس نے مجھ پر پہلی بار اس حقیقت کا نقش بٹھایا ہے کہ اردو کے مضمون نگار اور شاعر ایک ایسے رشتے میں بندھے ہوئے ہیں جو دنیوی حیثیت سے بلند تر ہے کیونکہ اُسے سماج کی کسی رسم نے نہیں بنایا۔ فرداً فرداً میں بہت سے حضرات کا شکریہ ادا کر چکا۔ جو رہ گئے ہیں اُن کے لئے یہ سطریں لکھتا ہوں——

میراجی

آئینۂ عالم

آسٹریا کا انجام

۱۹۳۸ء کا سب سے دردناک سیاسی واقعہ آسٹریا کا الحاق تھا جو آسٹریا کے چانسلر ڈاکٹر شوشنگ کے جبری استعفے کے بعد عمل میں لایا گیا۔ اگرچہ آسٹروی قوم اپنے ملک کو آزاد رکھنے کے لئے خون کا آخری قطرہ تک بہانے پر تلی ہوئی تھی لیکن شوشنگ اُسے جنگ کے شعلوں میں دھکیلنے کی بجائے خود حکومت سے علیحدہ ہو گیا۔

جنوری ۱۹۳۸ء میں فرانسیسی سفیر مقیم برلن کو اطلاع ملی کہ دی آنا میں نازیوں کی تعداد دوگنی ہو گئی ہے اور وہاں نازی پروپیگنڈا خوب زوروں پر جاری ہے۔ اُسے فوراً خیال آیا کہ کہیں ہٹلر آسٹریا کو جرمنی سے ملحق تو نہیں کرنا چاہتا۔ وہ فوراً وزارت خارجہ کے دفتر میں پہنچا اور وہاں سے دریافت کیا کہ ہٹلر کا ارادہ آسٹریا کی طرف بڑھنے کا تو نہیں ہے۔

وہاں سے جواب ملا کہ گذشتہ جولائی میں آسٹریا اور جرمنی کے درمیان جو عہدنامہ ہوا ہے ہٹلر اس کا احترام کرے گا۔ وہ اُسے توڑ کر مسولینی کی دل شکنی اور توہین نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ عہدنامہ مسولینی کی استدعا پر کیا گیا ہے۔ فرانسیسی سفیر مطمئن ہو کر واپس آ گیا اس واقعے کے چند ہی دن بعد ہٹلر نے ایک تقریر کے دوران میں کہا کہ وہ کسی حالت میں شوشنگ کو زندہ نہیں چھوڑ سکتا، اب مسولینی کے متعلق بھی اُس کے خیالات تبدیل ہو گئے وہ اُسے بھی انگریزوں کا حلیف خیال کرنے لگا اور اس پر الزام لگایا کہ وہ انگریزوں کی دوستی کی وجہ سے آسٹریا کے معاملات میں دلچسپی لے رہا ہے۔ اس واقعے سے دنیا کی نگاہیں آسٹریا اور جرمنی کی طرف اُٹھ گئیں۔ ہر لب پر یہی سوال تھے۔

کیا ہٹلر آسٹریا پر قبضہ کرنا چاہتا ہے؟

کیا وہ اپنے گذشتہ عہدناموں کا احترام نہیں کرے گا؟

کیا وہ واقعی شوشنگ کے قتل پر تلا ہوا ہے؟

لیکن ابھی ان سوالوں کا جواب اثبات میں کوئی نہیں دے سکتا تھا۔ واقعات کا نہایت شدت سے انتظار کیا جا رہا تھا، یورپی حکومتوں کی راجدھانیوں کی سرگرمیاں بڑھ گئی تھیں غالباً ہر کہیں اس بات پر غور ہو رہا تھا کہ اگر ہٹلر نے واقعی آسٹریا پر حملہ کیا اور آسٹریا نے مدافعت کی تو ان کی کیا پوزیشن ہوگی۔ غرض کہ ہٹلر کی ایک تقریر نے ہی دنیا کی صورتِ حال کو یکسر تبدیل کر کے رکھ دیا۔

اسی اثنا میں ہر فان پیپن جرمن سفیر مقیم دی آنا۔ کو حکم پہنچا کہ اپنا کام شروع کر دے۔ کہتے ہیں ہر فان پیپن کو خدا نے جاسوسی اور سازش کا خاص مادہ ودیعت کیا ہے۔ حکم کے پہنچتے ہی اُس نے ہر طرف جرمنی کے حق میں فضا سازگار کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ حکومت کے بڑے بڑے حکام کو باری باری سفارت خانے میں بلایا۔ ان کی خوب خاطر و مدارات کی۔ کسی کو انعام کا لالچ دیا کسی کو ایک نہایت روشن مستقبل کے جال میں پھنسانے کی کوشش کی۔ وہ سات آدمیوں کی کمیٹی بھی جو آسٹریا اور جرمنی کے عہدنامے کے بعد دونوں حکومتوں کے تعلقات کو خوشگوار بنانے پر مامور ہوئی تھی۔ اُس کا ہاتھ بٹا رہی تھی بلکہ اسی کمیٹی نے تو اس کھیل میں سب سے زیادہ حصہ لیا۔ چند دن تک دعوتوں اور سازشوں کا یہی سلسلہ جاری رہا۔

ادھر آسٹریا میں حالات اتنی سرعت سے بدل رہے تھے اور جرمن جنرل سٹاف یہ محسوس کر رہا تھا کہ ہٹلر کے اس اقدام کا نتیجہ سوائے جنگ کے اور کچھ نہیں ہو سکتا جس کے لئے جرمن قوم تیار نہیں ہے اس لئے انہوں نے ہٹلر کو ہر طرح سمجھایا لیکن اُس نے

اس کی کوئی پروا نہ کی اور اُن کے آگے نہ جُھکا۔ انہوں نے سٹرائک کردی لیکن وہ اس سے بھی متاثر نہ ہوا بلکہ ہٹلر نے موقعہ دیکھ کر اپنے مخالف فوجی افسروں کو ہٹا کر اُن کی بجائے زیادہ قابلِ اعتماد افسر مقرر کر دیئے اور فوج کی کمان جنرل فان راشیو کو سونپ دی۔

اب ہر چیز تیار تھی صرف کسی بہانے کی تلاش تھی۔ ہرفان پیپن کو لکھا گیا کہ ہٹلر آسٹروی چانسلر سے مل کر آسٹریا اور جرمنی کی بہتری کے لئے دوستانہ اور برادرانہ طریقے سے گفتگو کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے اسے برچیگاڈن آنے کی دعوت دی جائے۔

ادھر ویآنا میں جب سات آدمیوں کی کمیٹی کی سرگرمیوں میں اضافہ ہو رہا تھا تو ایک دن پولیس نے اُن کے دفتر پر چھاپا مارا اور اُن کے آئندہ ارادوں کو بے نقاب کر کے رکھ دیا۔ جب پیپن نے چانسلر کو ہٹلر کی طرف سے برچیگاڈن جانے کی دعوت دی تو اس نے انکار کر دیا۔ اور کہا ان حالات میں سوائے غداری کے اور کسی بات کی بھی توقع نہیں ہوسکتی۔ لیکن فان پیپن ان باتوں سے مایوس ہونے والا انسان نہیں تھا وہ برابر شوشنگ کو منّاتا رہا اور اپنا مطلب نکالنے کے لئے اُس نے شوشنگ کے ایک گہرے دوست کو جو آسٹریا کا وزیر خارجہ بھی تھا شاندار مستقبل کے سبز باغ دکھا کر اپنے ساتھ ملا لیا اور شوشنگ کو ہٹلر سے ملاقات کرنے کے لئے آمادہ کرنے پر مامور کر دیا۔ اب ادھر اس کا دوست اُسے برچیگاڈن جانے کے لئے بار بار کہہ رہا تھا اور کبھی ملک کا واسطہ دے کر اس بات پر رضامند کرنے کی کوشش کرتا تھا تو کبھی یہ کہہ کر کہ ہٹلر کے مقاصد نیک ہیں۔ اُس کی نیت میں فساد نہیں ہے۔ اس کی دعوت کو منظور کرنے کے لئے مجبور کرتا تھا۔ ادھر برلن سے اس پر دباؤ ڈالا جا رہا تھا۔ ہر روز شوشنگ کے دوست اُسے وزیر خارجہ کی چالوں کی اطلاع دیتے وہ اُس سے کہتے کہ اس سے بچے رہنا۔ یہ غدار ہے۔ دھوکا دے گا۔ مسولینی نے بھی ایک بار اُسے اس شخص سے محفوظ رہنے کے لئے کہا اور بتایا کہ یہ شخص غداری کرے گا لیکن اُسے اپنے دوست پر اتنا اعتماد تھا کہ اُس نے کسی کی بات نہ مانی۔ آخر جب برلن کی طرف سے زیادہ اصرار ہونے لگا تو اس نے ٹیلیفون پر مسولینی سے مشورہ کرنا چاہا۔ مسولینی نے مایوس ہو کر اسے اپنی مرضی کے مطابق عمل کرنے کی اجازت دے دی۔ آخر وہ ۱۱ فروری کی شام کو ہر فان پیپن اپنے وزیر خارجہ اور ایک نوجوان سیکرٹری کی معیت میں برچیگاڈن کو روانہ ہوگیا۔ دوسرے دن ہٹلر کے دارالمطالعے میں داخل ہوا۔ لیکن اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب ہٹلر نے اس کا استقبال کرنے کے بجائے اُسے ڈرانا دھمکانا شروع کر دیا۔ وہ جونہی داخل ہوا، ـــــ "تم دغاباز۔ تم فریبی۔ تم ڈولفس کے قاتل۔ ابھی تک اپنی سازشوں سے باز نہیں آتے" یہی آواز اُس کے کانوں میں آئی جو ہٹلر کے منہ سے نکل رہی تھی۔ اس وقت ہٹلر کی آنکھیں آگ کی طرح سرخ تھیں نتھنے پھولے ہوئے تھے۔ منہ سے جھاگ نکل رہی تھی اور وہ بار بار میز پر مکّے مار رہا تھا۔ شوشنگ نے گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھا۔ چھت پر نگاہ ڈالی۔ اور سگریٹ سلگانے کے لئے سگریٹ کیس نکالا۔ لیکن ہٹلر فوراً گرج کر بولا۔

"یہاں سگریٹ پینا منع ہے"

اور ساتھ ہی اس نے ایک بٹن دبا دیا جس کے دباتے ہی فوراً جنرل فان روشیو، اور جرمن پریس کا ڈائرکٹر ڈیٹریچ اندر داخل ہوئے انہوں نے دایاں ہاتھ بڑھا کر سلام کیا اور ایک طرف استادہ ہوگئے۔ ہٹلر نے کہا۔

"اسے بتادو کہ اگر اس نے ہمارے مطالبات نہ مانے تو ہم نے کیا تیاریاں کر رکھی ہیں۔ فوراً ایک دستاویز لائی گئی جس پر گیارہ شرائط درج تھیں۔ اُسے مجبور کیا جانے لگا کہ وہ اس دستاویز پر دستخط کر دے۔ اب وزیر خارجہ کی باری آئی۔ وہ بھی شوشنگ کو تمام شرائط ماننے کے لئے کہنے لگا۔ لیکن شوشنگ صرف ان شرائط کے ماننے پر تیار ہوا۔

۱۔ وہ ایک نازی کو وزیر داخلہ مقرر کر دے گا۔
۲۔ نازیوں کو آسٹریا میں آنے کی اجازت دے گا۔
۳۔ اور سیاسی صورت حال میں عام تبدیلی۔

لیکن ہٹلر ان سے مطمئن نہ ہوا۔ شوشنگ نے بتایا کہ وہ پریزیڈنٹ کی مرضی کے بغیر اس سے زیادہ شرائط نہیں مان سکتا۔ لیکن وہ نہ مانا اور ایک گھنٹہ تک برابر گرجتا رہا۔ آخر اُسے مکان سے نکال دیا گیا۔

دوسرے دن وہ ویآنا میں تھا۔ جن لوگوں نے اُسے برچیگاڈن کے سٹیشن پر ٹہلتا ہوا دیکھا وہ جان گئے کہ وہاں کیا پیش آیا ہے۔ ڈاکٹر کے قدموں میں لغزش تھی۔ چہرہ زرد تھا۔ وہ آہستہ آہستہ ایک زخم خوردہ جانور کی طرح چل رہا تھا اور کسی گہرے خیال میں کھویا ہوا معلوم ہوتا

تھا۔ شاید وہ اس ملاقات کے واقعات کو دہرا رہا تھا یا آسٹریا کا مستقبل اس کی نگاہوں میں پھر رہا تھا جس نے اُسے اتنا غمگین بنا دیا تھا۔

وی آنا میں اس کے پہنچنے سے پہلے ہی سب واقعہ کی اطلاع ہو چکی تھی۔ لوگوں میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ کیا شوشنگ نے آسٹریا کو بیچ دیا؟ کیا اس نے غداری کی ہے؟ یہ دو سوال تھے جو ہر ذی فہم انسان کے لبوں پر تھے۔ شوشنگ جاتے ہی مویسکی سے ملا اور سب حال بیان کر دیا۔ پریزیڈنٹ نے اُسے کہا کہ وہ اسی وقت اس تمام واقعے کے متعلق ایک طویل بیان شائع کر دے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ رائے عامہ اُس کے ساتھ ہو جائے گی۔ دیگر غیر ملکی حکومتوں کی ہمدردی بھی حاصل ہو جائے گی۔ ہٹلر کا یہ وحشیانہ سلوک کس کے دل میں اس کے خلاف جذبۂ نفرت پیدا نہ کرے گا۔ علاوہ ازیں آسٹروی لوگ بھی اُس کے ساتھ ہو جائیں گے۔ لیکن ڈاکٹر ان باتوں پر رضامند نہ ہوا۔ اس موقعے پر یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر شوشنگ جہاں تک اس کی تعلیم و تربیت کا تعلق تھا، نہایت مہذب اور اعلیٰ پائے کا انسان تھا۔ لیکن وہ اس قدر تنہائی پسند اور عزلت گزیں تھا کہ وہ اپنے وزیروں سے بھی نہیں ملا کرتا تھا اور صرف نہایت ضروری حالات میں اُنہیں ملاقات کی اجازت دیتا تھا۔ عام حالات میں انہیں جو کچھ کہنا ہوتا تھا وہ لکھ کر کہتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ اپنی ہٹ کا پکا بھی تھا۔ کسی کی نہیں سنتا تھا۔ اس کے وزیر اس کے پاس اعلیٰ سے اعلیٰ تجاویز لے کر جاتے لیکن دل شکستہ ہو کر واپس آ جاتے۔ اس موقعے پر بھی سب نے باری باری اس سے ملاقات کی، مشورے دیئے اور کہا کہ اگر وہ اس وقت ایک ہلکا سا اشارہ بھی کر دے تو نازیوں کی اس فتح کو خاک و خون میں ملایا جا سکتا ہے۔ لیکن وہ ان باتوں پر رضامند نہ ہوا۔ جب مسولینی کو اس واقعے کی اطلاع ہوئی تو اُسے بھی سخت رنج ہوا کیونکہ ہٹلر نے اس کو یقین دلایا تھا کہ وہ آسٹریا کی آزادی کو بحال رہنے دے گا صرف وہاں نازی حکومت ہی قائم ہو گی۔ لیکن اس واقعے نے اس کا دل توڑ دیا اور اُس نے شکستہ دل ہو کر کہا۔

"اگر ہم نے آسٹریا کو یوں جانے دیا تو اس کا یہ مطلب ہو گا کہ ہم ہار گئے"۔

واقعے کے تین دن بعد اطالوی سفیر سائنو سلوٹا وی آنا میں آیا اور اُس نے ہر طرح کی امداد کا وعدہ کیا۔ اب چونکہ روم کی طرف سے امداد کا یقین ہو چکا تھا اس لئے اُس نے آگے بڑھنے کا تہیہ کر لیا۔ ۲۴ فروری کی شام کو آسٹریا کی پارلیمنٹ کا اجلاس ہوا جس میں اُس نے ایک غیر فانی تقریر کی جس کا جواب غالباً یورپ کی تاریخ میں نہیں مل سکتا۔ اس تقریر نے لوگوں کے پست حوصلوں کو بلند کر دیا۔ اُن کی ڈوبی ہوئی اُمیدوں کو اُبھارا۔ حب الوطنی کے جذبے کو بیدار کر دیا اور وہ اپنے ملک کے لئے خون کا آخری قطرہ بہانے پر آمادہ ہو گئے۔

۹ مارچ کو اُس نے رائے شماری کا اعلان کر دیا۔ یہ اس کی سب سے پہلی بڑی غلطی تھی۔ کیونکہ اس کی اپنی پوزیشن اتنی مضبوط نہیں تھی کہ وہ رائے شماری میں کامیاب ہو سکتا۔ نیز اُس نے تنہائی کی زندگی بسر کرتے ہوئے لوگوں سے کوئی رابطہ پیدا نہیں کیا تھا اور لوگ اس کے نظام حکومت سے بھی مطمئن نہیں تھے۔ مزدور اگر نازیوں سے نفرت کرتے تھے تو اس کی حکومت سے بھی مطمئن نہیں تھے۔ غرضیکہ یہ اُس کی غلطی تھی۔

ہٹلر نے شوشنگ کی اس تقریر کو میونچ میں سُنا۔ اسی شام اُسے ایک دعوت میں جانا تھا وہاں اس نے مسلسل تین گھنٹے تک تقریر کی جس میں بہت غم و غصے کا اظہار کیا۔ اُس نے کہا کہ خواہ آسٹریا کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود ہی کیوں نہ ہونا پڑے وہ شوشنگ کو زندہ نہیں دیکھ سکتا۔ اُسی رات اُس نے اپنے ہائی کمانڈ کو بلایا۔ جب ان کی خفیہ میٹنگ ہو رہی تھی تو مسولینی کا پیغام آ گیا کہ آسٹریا کے خلاف کوئی سخت اقدام نہ کیا جائے۔ اس لئے اس نے کچھ عرصے کے لئے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ لیکن شوشنگ کا اعلان رائے شماری جلتی پر تیل ثابت ہوا۔ وہ پھر بھڑک اُٹھا۔ ربن ٹروپ نے نازیوں کو ہدایت دی کہ وہ آسٹریا میں ہر طرف فسادات برپا کر دیں۔ تاکہ حملے کی کوئی جائز صورت پیدا ہو سکے۔ ۱۱ مارچ کو نازی سیکرٹری کیپلر آیا اور ہٹلر کے نام پر استدعا کی کہ رائے شماری کو ملتوی کیا جائے اور ڈاکٹر خود مستعفی ہو جائے اور سس انکورٹ کو چانسلر بنا دے۔ لیکن ڈاکٹر نے یہ بات ماننے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد جرمن ملٹری ایجنٹ کی طرف سے ۵ بجے اُسی شام کو ڈھائی گھنٹے کا الٹی میٹم دیا گیا جس میں انہی شرائط کو ماننے کا ذکر تھا۔

آسٹروی چانسلر نے ریڈیو پر چھ بجے اعلان کیا کہ رائے شماری نہیں کی جائے گی اور سات بجے خود مستعفی ہو گیا اور آٹھ بجے اُس نے

ان واقعات کے متعلق ایک نہایت دردناک اور رقت انگیز تقریر کی۔ اس کے بعد دو گھنٹوں میں کیا ہوا۔ ہم صرف یہی جانتے ہیں کہ پریزیڈنٹ مُسکی نے اُسے مدافعت کے لئے کہا کیونکہ ملک لڑنے کے لئے تیار تھا۔ لیکن شوشنگ نے قتل و غارت کے اس ڈرامے کا ذمّہ دار بننے سے انکار کر دیا۔ جب وہ اپنی آخری تقریر کر کے جلدی سے وزارت کے اجلاس سے نکل کر اپنی کار میں بیٹھ گیا تو اُس کے دو محافظ فوراً کار میں آئے اور انہوں نے ڈرائیور کو وی آنا کے ہوائی اڈّے کی طرف جانے کی ہدایت دی لیکن ڈاکٹر نے کہا "نہیں میں آسٹروی ہوں اور اس لئے یہیں رہوں گا"۔ اس کے بعد اچانک نازیوں کے دستے کے دستے وی آنا میں نمودار ہو گئے اور شوشنگ کے حامیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ سس انکورٹ کو چانسلر بنا دیا گیا۔ لیکن پریزیڈنٹ مُسکی کو بحال ہی رہنے دیا گیا کیونکہ ہٹلر نے وقت کی نزاکت کو پہچان لیا تھا۔

آسٹریا پر اس طرح قبضہ کر لینے کے بعد نازیوں نے اپنی فوجی اور ہوائی طاقت کا بہت سا حصہ وہاں بلا لیا۔ اور گوبلز اور ہٹلر اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے اور تھوڑے عرصے میں ہی وی آنا نازیوں کا مرکز بن گیا۔ ہر طرف نازی ہی نازی نظر آتے تھے۔ عمارتوں پر نازی جھنڈے لہرا رہے تھے۔ فضا ہٹلر زندہ باد کے نعروں سے گونج رہی تھی۔

اس واقعے کے تین گھنٹے پہلے ہی لوگ جواب ہٹلر زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔ شوشنگ زندہ باد پکار رہے تھے۔ ہر طرف آسٹریا کے قومی جھنڈے لہرا رہے تھے اور نازی سر جھکائے ہوئے جھنڈوں کو لپیٹے اِدھر اُدھر پھر رہے تھے اور اب یہ حال تھا۔ چند ہی دنوں میں شوشنگ کے حامیوں کو قید کر لیا گیا۔ کئی ہزار قیدی جرمن کنسنٹریشن کیمپوں کو روانہ کر دیے گئے۔

جس دن ہٹلر وی آنا آیا اُسی دن پیرس۔ لندن اور روم کے سفارت خانوں سے وہاں کی صورتِ حال کے متعلق دریافت کیا گیا معلوم ہوا کہ پیرس میں ابھی تک نئی وزارت قائم نہیں ہوئی اس واسطے فرانسیسی حکومت کچھ نہیں کرے گی۔ لندن سے اطلاع موصول ہوئی کہ برطانیہ اس واقعے سے بہت متأثر ہے لیکن فرانس کے بغیر کچھ نہیں کرے گا۔ روم سے پتہ چلا کہ مسولینی بھی کچھ کرنے کے قابل نہیں ہے۔

یہ تھا آسٹریا کا حسرت ناک انجام ـــــ!

۳۱ سال پہلے

بین الاقوامی صورتِ حال

نیویارک ٹائمز کے ایک نامہ نگار نے ۱۹۰۸ء میں قیصر ولیم سابق شہنشاہِ جرمنی سے ایک ملاقات کی جس کے دوران میں اس نے جن خیالات کا اظہار کیا وہ اس قدر تلخ تھے کہ اگر اُس وقت کسی اخبار میں چھپ جاتے تو جنگِ عظیم ۱۹۱۴ء کی بجائے ۱۹۰۸ء ہی میں شروع ہو جاتی لیکن جرمنی کی وزارت خارجہ، پریزیڈنٹ روزویلٹ اور دیگر ذمہ دار شخصیتوں کی کوششوں نے اس کی اشاعت کو روک کر چند سالوں کے لئے دنیا کو جنگ سے بچا لیا۔ اس ملاقات کا حال ۱۹۳۵ء تک نیویارک ٹائمز کے دفتر میں ہی مدفون رہا۔ جب ۱۹۳۵ء میں اس اخبار کے ناشر کی وفات ہوئی اور اُس کی فائلیں نکالی گئیں تو یہ کاغذات بھی نکل آئے۔ چونکہ اس وقت کی صورتِ حال ۱۹۰۸ء سے مختلف تھی اس لئے اسے شائع کر

۱۹۰۴ء میں روس اور جاپان میں جنگ ہوئی جس میں روس کو شکست ہوئی اور ۱۹۰۵ء میں برطانیہ نے جاپان کے ساتھ معاہدہ کر لیا۔ اس ملاقات کا موضوع یہی معاہدہ تھا۔

نامہ نگار ولیم برینڈ ھیل کو ٹائمز کی طرف سے امریکہ میں اس غرض کے لئے بھیجا گیا تھا کہ وہ مسٹر روزویلٹ سے ملاقات کر کے ان کی زندگی کے متعلق مضامین کا ایک سلسلہ لکھے۔ وہاں سے فراغت کے بعد اُسے اسی مقصد کے لئے جرمنی روانہ کیا گیا تاکہ قیصر کی زندگی کے متعلق بھی اسی قسم کے مضامین کا سلسلہ شروع کیا جا سکے۔ لیکن یہاں آکر اُسے مضامین لکھنے کی اجازت تو نہ مل سکی البتہ ایک ملاقات کا موقعہ مل گیا اور وہ بھی ایک اخبار کے رپورٹر کی حیثیت سے نہیں۔

نامہ نگار موصوف ایک طویل اور غیر دلچسپ سفر کے بعد جرمنی میں پہنچا اور

بڑی مشکل سے جنرل فان لیون فلڈ اور چند دیگر بڑے بڑے حکام کی مدد سے ۱۹ر جولائی ۱۹۰۸ء کو اُسے قیصر سے ملاقات کی اجازت ملی۔ نامہ نگار کا بیان ہے کہ قیصر اس وقت برلین سے باہر جا رہا تھا اور جہاز میں سوار ہو چکا تھا۔ اس ملاقات کے دوران میں وہ دونوں باتیں بھی کرتے رہے اور ڈک پر ٹہلتے بھی رہے۔ قیصر کا لہجہ نہایت تلخ تھا۔ اُسے انگریزوں کے خلاف بہت غصہ تھا اور اس کی وجہ برطانیہ کا جاپانی معاہدہ تھا۔ اور قیصر جاپان کو یورپ کے تجارتی اور سیاسی مفاد کا دشمن خیال کرتا تھا۔ قیصر کے خیال میں انگریزوں نے اس معاہدے سے سفید اقوام کے ساتھ غدّاری کی تھی۔ کیونکہ اُس کی نظر میں اس معاہدے کا نتیجہ یورپ کے حق میں نہایت مضر ہو سکتا تھا نیز یہ امر کہ امریکہ اور جرمنی دونوں مل کر مشرقی سوال کا حل تلاش کریں گے اور انہوں نے فیصلہ کیا ہے کہ چین کے دوست بن کر مشرق کو آپس میں بانٹ لیا جائے اور چین سے معاہدے کے سلسلے میں عنقریب ایک چینی افسر امریکہ سے ہوتا ہوا جرمنی میں بھی آئے گا گفتگو کا موضوع رہا۔

اس ملاقات میں قیصر نے کہا کہ سب جانتے ہیں کہ ایشیا اور یورپ میں کیا کچھ ہونے والا ہے۔ آنے والے واقعات سے چشم پوشی دانشمندی کی دلیل نہیں۔ اگر ہم اپنے آباؤ اجداد کی تہذیب اور خدائے مقدّس کے مذہب کی حفاظت نہ کر سکیں گے تو ہمیں اپنے بزرگوں کی اولاد کہلانے کا کوئی حق نہیں ہے۔

اس کے بعد اُس نے روس اور جاپان کی جنگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "وہ مستقبل میں پیش آنے والے عظیم الشان سانحہ کی پہلی جنگ لڑی جا چکی ہے۔ لیکن افسوس کہ ہم ہار گئے۔ وہ جنگ روس اور جاپان کی جنگ ہی نہیں تھی بلکہ ایشیا اور یورپ کی جنگ تھی اور روس سفید اقوام کی حفاظت کے لئے میدانِ جنگ میں آیا تھا لیکن اُس وقت کسی نے بھی اس بات کو نہ سمجھا۔ البتہ آج سب کی آنکھیں کھل گئی ہیں۔ کاش میری افواج کو جاپان سے جنگ آزمائی کا موقعہ ملتا!"

اتنا کہہ کر اس کی زبان سخت اور لہجہ تلخ تر ہوتا جا رہا تھا۔

"ہمارے لئے اکیلا جاپان خطرے کا موجب نہیں ہے۔ بلکہ وہ جاپان خطرے کا باعث ہے جسے چین پر قبضہ حاصل کرنے کے بعد ایشیا میں برتری حاصل ہو جائے گی۔ وہ جاپان سفید اقوام کی تہذیب کا سب سے بڑا دشمن ہے اور دنیا پر نازل ہونے والی سب سے بڑی لعنت ——— اس واسطے ہمارا سب سے پہلا فرض یہی ہے کہ ہم جاپان کو چین کے ہڑپ کرنے کا موقع ہی نہ دیں اور مل کر مشرق کے آپس میں حصے بخرے کر لیں ——— اس وقت سفید اقوام کا سب سے پہلا فرض یہی ہے ——— !"

اس کے بعد اُس نے روئے سخن برطانیہ کی طرف کیا اور کہا "میں جانتا ہوں کہ برٹش کولمبیا نے واضح طور پر کہہ دیا ہے کہ اس معاملے میں حکومت ذرا دیکھ بھال کر قدم اٹھائے ورنہ اُسے نقصان اٹھانا پڑے گا ——— اب سب جانتے ہیں کہ جنوبی افریقہ میں نسل کا مسئلہ کتنی نازک صورت اختیار کر چکا ہے۔ ہندوستان کی صورتِ حال بھی برطانیہ کے لئے تشویش کا موجب بنی ہوئی ہے۔ اس معاہدے سے ہندوستان کے سوتے ہوئے اختلافات پھر بھڑک اُٹھے ہیں۔ اگر برطانیہ کے اربابِ حل و عقد ان حقائق سے واقف ہو جائیں تو ان کی پریشانی بہت زیادہ بڑھ جائے گی۔ میں جانتا ہوں کہ برطانیہ کی رائے عامہ اس معاہدے کی پشت پر ہرگز نہیں ہے جو اس نے ایشیا کی ایک قوم کو ہمیشہ کے لئے غلام بنانے کے لئے ایک اور ایشیائی ملک سے کیا ہے۔ حکومت کے رکن جمہور کو اس کے خلاف دیکھتے ہوئے بھی اسے نباہنے پر تلے ہوئے ہیں اور وہ جب تک ایسا کرنے پر تلے رہیں گے، سفید اقوام میں اُن کی حیثیت ایک غدّار کی سی ہو گی ——— !"

اُس نے مزید کہا "جاپان کے بڑھتے ہوئے اقدامات کو نہ تو روس ہی روک سکتا ہے اور نہ فرانس۔ یہ سعادت صرف جرمنی اور امریکہ کے حصے میں آئی ہے"۔ اپنے ان فقروں سے ——— قیصر نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ امریکہ اور جرمنی کی دوستی کے امکانات بہت قوی ہیں اور کہا کہ "ہم (امریکہ اور جرمنی) دونوں ایک ہی نسل سے ہیں۔ ایک ہی مذہب رکھتے ہیں، اور ایک ہی جیسی سیرت کے مالک ہیں۔ موجودہ دور میں ہمارے درمیان کسی قسم کے جھگڑے کے پیدا ہونے کا امکان نہیں ہے۔ کیونکہ جرمنی کی سرگرمیاں امریکہ کے مفاد سے ہرگز متصادم نہیں ہوتیں"۔ اُس نے سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا "خیر یہ سب کچھ درست ہو جائے گا۔ کیونکہ مستقبل سفید اقوام کے ہاتھوں میں ہی ہے۔ یہ کسی اور قوم کی ملکیت نہیں ہو سکتا۔ یہ صرف عیسائیت کی ہی جائداد ہے۔ دنیا کے کسی مذہب اور کسی قوم میں اتنی طاقت نہیں کہ انسانیت کو تباہی سے بچا سکے۔ یہ سعادت صرف ہماری قسمت میں لکھی ہے ——— !"

اس کے بعد اس نے روزویلٹ کے متعلق بات چھیڑی اور

اُس کی ذاتی خوبیوں کے علاوہ اُس کے فلسفۂ حکومت کی بھی از حد تعریف کی۔ اور اس بات پر اظہارِ افسوس کہ امریکنوں نے اس کی صحیح طور پر قدر شناسی نہیں کی۔ یوں تعریف کرتے ہوئے وہ کہنے لگا۔

"وُہی ایک ایسا انسان ہے جس میں جدید دنیا کی روح حلول کر گئی ہے۔ یاد رکھو! دنیا کے بڑے بڑے کام صرف واحد اور اکیلے انسانوں نے ہی کئے ہیں۔ جب کسی قوم پر بحران کا وقت طاری ہوتا ہے تو قوم کو کسی ایسے انسان کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جو اُسے اُن حالات سے نکالے۔ آخر قدرت ایک انسان ایسا پیدا کر دیتی ہے، جو قوم کے خواب کی تعبیر بنتا ہے۔ اُس جواں ہمت اولوالعزم، اور نڈر انسان کے دل میں آگ ہوتی ہے۔ وہ ایک مسلک لے کر میدان عمل میں آ جاتا ہے کسی کی باتوں کی پرواہ نہیں کرتا کسی کی تنقید کی طرف کان نہیں دھرتا، کیونکہ اُسے معلوم ہوتا ہے کہ اُسے کیا کرنا ہے، اُسے کس چیز کی ضرورت ہے۔ اور وہ اسے کس طرح حاصل کر سکتا ہے۔ آخر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوتا ہے۔ سوشل ترقی کا قانون یہی ہے کہ ایک انسان کے ہاتھ میں سب کچھ دے دیا جائے، خواہ جمہوریت ہو یا ملوکیت، ذمہ داری صرف ایک شخص پر ہی عاید ہوتی ہے۔ پارلیمنٹیں اس کے راستے میں ہزار روڑے اٹکائیں، دانائی بگھاریں، اس پر تنقید کریں، لیکن سب کچھ اُسے ہی کرنا ہوگا۔ پارلیمنٹ کے ایوان میں جا کر تم دنیا جہان کی دانائی تو جمع کر سکتے ہو، لیکن عمل کا ذرہ بھر بھی حاصل نہیں کر سکتے۔ آخر ایک راہنما کو ہی تمہاری مدد کے لئے آنا پڑتا ہے۔"

اِس کے بعد وہ امن اور مذہب کے مسئلے کی طرف متوجہ ہوا

"یاد رکھو، عملی حقائق کی دنیا میں ہمیں صداقت کے لئے جنگ کرنی پڑتی ہے۔ انجیل اس قسم کی لڑائیوں کے اذکار سے بھرپور ہے۔ یہ خیال غلط ہے کہ مسیحیت جنگ کی دشمن ہے — زمانۂ قدیم کے عیسائی مذہب کو بزورِ شمشیر پھیلانے کے مخالف نہیں تھے۔ آخر ہمیں بھی تو بزورِ شمشیر ہی عیسائی بنایا گیا تھا۔

"میں آج کل ان طریقوں کو استعمال میں لانے کا قائل نہیں ہوں مگر جب تک ہم وحشی اقوام پر غلبہ حاصل کر کے اپنے مبلغوں کے واسطے رستہ صاف نہ کریں گے وہ کس طرح پر چار کر سکیں گے۔

ہمارا مذہب یہ ہے کہ ہم تبلیغ کے واسطے اپنی تمام قوتوں، علم و ہنر اور فوجی طاقت کو بروئے کار لانے کی تعلیم دیں۔"

اس ملاقات کے بعد مندرجہ ذیل واقعات پیش آئے۔

پہلے بیان کیا گیا ہے کہ مسٹر برینڈہیل کو اخبار کے ایک رپورٹر کی حیثیت سے ملاقات کی اجازت نہیں ملی تھی۔ اگرچہ سب جانتے تھے کہ وہ اخبار نیویارک ٹائمز کا نمائندہ ہے اور اُسے قیصر کے متعلق سلسلۂ مضامین لکھنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ اور یہ ملاقات بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ چونکہ اس ملاقات میں قیصر نے بعض بہت تلخ باتیں کہی تھیں۔ اس لئے برینڈہیل نے اس کی اشاعت سے قبل جرمنی کی وزارتِ خارجہ اور برطانوی سفیر مقیم برلن سے ملاقات کی تاکہ اگر کوئی اعتراض ہو تو وزارتِ خارجہ پہلے ہی بتا دے۔ لیکن وزارتِ خارجہ کو جب معلوم ہوا کہ قیصر نے کیا کچھ کہہ دیا ہے تو اُسے بہت پریشانی ہوئی۔ اور اس کی اشاعت روک دی گئی لیکن نامہ نگار مذکور نے پھر اس امر کی کوشش کی کہ اُسے اسی ملاقات کے متعلق کسی رسالے کے لئے ایک مضمون لکھنے کی اجازت مل جائے جو اخباری حیثیت کا نہ ہو، اُسے امید تھی کہ اس کی اجازت مل جائے گی۔ لیکن یہ امید بھی پوری نہ ہوئی۔ آخر بہت رد و کد کے بعد وزارتِ خارجہ نے اس کے بعض کم خطرناک حصّوں کو ایک مضمون کی صورت میں شائع کرانے کی اجازت دے دی، اور اس کے لئے سنچری میگزین کی سفارش کی۔ انہوں نے اسے رسالے میں شائع کرانے کی پابندی اس واسطے لگا دی تھی کہ مضمون اخبارات میں چھپتے ہی ایک ہنگامہ بپا ہو جانے کا خدشہ تھا۔ جس سے برطانیہ اور جرمنی کے تعلقات خراب ہونے کا امکان تھا۔ نامہ نگار نے اپنے دیگر اخبار نویس دوستوں سے بھی اس سلسلے میں مشورہ لیا اور آخر یہ سوچ کر کہ اس کا منظر عام پر آنا بین الاقوامی صورت حال کے لئے مضر ہوگا اس کی اشاعت کا ارادہ ترک کر دیا۔

اور کچھ عرصہ برلن میں ٹھہر کر پیرس اور لندن ہوتا ہوا امریکہ چلا گیا۔ امریکہ پہنچتے ہی مسٹر روزویلٹ نے اُسے ملاقات کے لئے بلایا، کیونکہ وہ ٹائمز کے ایڈیٹر کی معرفت اس ملاقات کی داستان سن چکا تھا۔ ۱۱ اگست ۱۹۰۸ء کو برینڈہیل روزویلٹ سے ملا۔ اور اُن میں اس کے متعلق بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ روزویلٹ قیصر کی زبان سے اپنی تعریف سن کر بہت خوش ہوا لیکن جب اس نے مشرقی سوال کو حل کرنے کے لئے چین کی دوستی، اور مشرق کے حصوں بخروں کے متعلق سنا تو بہت حیران ہوا اور اُس نے بتایا کہ وہ اس سے قطعاً بے خبر ہے نہ اُس نے قیصر سے ایسی باتیں کہی ہیں، اور نہ قیصر کے بیان کے مطابق

کوئی چینی افسر معاہدے کے سلسلے میں امریکہ آرہا ہے۔ الغرض اس انٹرویو کے حالات اور ان سے متعلقہ تمام خط و کتابت کو ٹائمز کے دفتر میں فائل کر دیا گیا اور کچھ عرصہ کے لئے سب معاملہ دب گیا۔ اسی اثنا میں مسٹر برینڈ ھیل نے بحری میگزین کے لئے اسی سلسلے میں ایک مضمون لکھا اور برلن بھیج دیا جہاں اسے سنسر کیا گیا اور آخر تمام مراحل طے ہونے کے بعد اس میگزین کے دسمبر نمبر کے لئے دفتر میں بھیج دیا گیا۔

انہی ایام میں ایک شخص میجر وارٹیلی نے ڈیلی ٹیلیگراف میں قیصر کے متعلق ایک مضمون لکھا۔ یہ مضمون قیصر کے چند بیانات پر مشتمل تھا جو اُس نے مختلف موقعوں پر دئے تھے۔ اس مضمون میں جرمنی کی بحری طاقت اور تجارت کو برطانیہ کی طاقت سے برتر ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی اور اس سلسلے میں جرمنی کے خلاف برطانیہ کی بدگمانی کو بُرا بھلا کہا گیا تھا۔

اس مضمون کے شائع ہوتے ہی برطانیہ اور جرمنی میں ایک شور بچ گیا۔ جرمن چانسلر فان بلیو قیصر کی ان حرکات پر سخت برافروختہ ہُوا۔ اور اُس نے قیصر سے وعدہ لے لیا کہ وہ آئندہ چانسلر کے مشورے کے بغیر کوئی بیان نہیں دیا کرے گا۔ اسی اثنا میں برینڈ ھیل کے مضمون کے متعلق بھی افواہ اڑی، حکومت جرمنی نے صاحب مضمون اور رسالے کے مالک پر دباؤ ڈال کر مضمون کی اشاعت رکوا دی، کہتے ہیں کہ مضمون چھپ چکا تھا اور صرف رسالے کی جلد بندی ہو رہی تھی کہ اشاعت کو روک لینے کا مطالبہ کیا گیا اور مضمون کے صفحات کو پھاڑ کر اس کی بجائے مختصر افسانے دے دئے گئے اور ایڈیٹر نے اس کے لئے قارئین سے معذرت کر لی۔ اس کے بعد جرمنی سے ایک جنگی جہاز نیو یارک آیا جس میں ان پھٹے ہوئے اوراق کو لے جا کر جلا دیا گیا اور اس طرح اس ملاقات کو اشاعت سے روک دیا گیا۔

تابش صدیقی

طوفان کے بعد

ہاں بیت گئے سب بیت گئے

تم سے ملنے کا دن بیتا — دن بیتا، راتیں بیت گئیں
چاہے جانے کا سن بیتا — چاہت کی باتیں بیت گئیں
وہ دن بیتے جب پھل چکھے — بیٹھا ہوں دل پر سل رکھے
رو رو کر تھک کر آنکھوں کی — اب سُوکھی ہے بہتی ندی
سویا ہے فلک سوئی ہے زمیں — کیوں میری آنکھ میں نیند نہیں
وہ رات جو میٹھی کاہش تھی — وہ دن جب تیری خواہش تھی

اب بیت گئے سب بیت گئے

اونچے آکاس کے آنگن میں — کچھ تارے بکھرے پھیلے ہیں
اور گہرے ساگر کے من میں — اک ناچ سا کرتی ہیں لہریں
ہریالی والے جنگل میں — من موہن سندر منڈل میں
کچھ پھول ہیں، کومل کلیاں ہیں — میٹھے پھل ہیں اور پھلیاں ہیں
یہ چیزیں دل کا دارو ہیں — لیکن آنکھوں میں آنسو ہیں
اور لمحے چلتے ہیں ایسے — ہلکے ہلکے، دھیرے دھیرے
جیسے ہوں روئے روئے سے — اور سوچ میں کھوئے کھوئے سے
اب اُن باتوں کا غم کیسا؟ — اب اُن راتوں کا غم کیسا؟
اب وہ باتیں بھولے سپنے — وہ راتیں، وہ دن بیت گئے

ہاں بیت گئے سب بیت گئے

بسنت سہائے

خلش

ہر کلی میں پھول بننے کی نہاں ہے آرزو
دیکھ کر طوفاں کو کھول اٹھتا ہے ننھے کا لہو

ہر ستارہ چاند بننے کے لئے بے تاب ہے
چاند کا دل بھی تمناؤں سے لذت یاب ہے

اُس کے سینے میں بھی ہے خورشید بننے کا خیال
اُس کی نظروں میں بھی ہے مہرِ درخشاں کا جمال

ہے خزف ریزے کے دل میں آئینہ بننے کا شوق
آئینے کو مہ وشوں کا نقشِ پا بننے کا شوق

ناچتے ہیں پھول اس امید میں مستانہ وار
گوندھے آئے گی مالن ایک دوشیزہ کا ہار

سر پٹخ کر جھاگ برساتے ہیں پیہم آبشار
چاہتے ہیں اپنی منزل سے ہوں یکدم ہمکنار

دن کے دل میں رات بننے کی تمنا ہے نہاں
رات کو یہ شوق کب ہوگی سحر جلوہ فشاں

تیرگی کو نور کا روئے حسیں محبوب ہے
نور کو ظلمات کی سنجیدگی مرغوب ہے

مفلسوں کو سلطنت کا شاہ بننے کی ہوس
شاہ کو کونین کا اللہ بننے کی ہوس

کم سنی کے دل میں رقصاں ہے تمنائے شباب
اور بڑھاپے کے تبسم پر جوانی کی نقاب

میں کہ اک شاعر ہوں بے پروائے قدرِ ننگ و نام
میرے سینے میں بھی اک امید ہے، آتش بجام!

ایک شعلہ سا لرزتا ہے رگوں میں مستقل!
"جانے والے لوٹ آتے ہیں" یہی کہتا ہے دل

زندگی کو میں نے دیکھا ہے برافگندہ نقاب
زندگی پیہم خلش ہے جاودانی اضطراب!

احمد ندیم قاسمی

عہدِ حاضر کے سیرت نگار

کتابوں کا حاصل "دماغی عیاشی" کے علاوہ بھی کچھ ہے یا نہیں اس کا قطعی جواب اگر ادب کی کوئی صنف دے سکتی ہے تو وہ سیرت نگاری ہے اس لئے بعض انقلاب پسند نقّاد تو اسے ادب میں شمار ہی نہیں کرتے۔ عام لوگ تو اس پر رضامند ہیں کہ اگر کوئی خیال مؤثر پیرایہ میں ظاہر کیا جائے تو اسے دنیائے ادب میں جگہ ملنی چاہئیے، لیکن ترقی پسند حلقوں میں اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ اب تک جن کتابوں پر ادب کا اطلاق ہوتا رہا ہے انہیں ایک کڑے امتحان میں پُورا اُترنا چاہئیے۔ ان حضرات کے نزدیک مفید کتابوں کو "علمی" اور دلچسپ کتابوں کو ادبی تصانیف کہنا چاہئیے۔ اس اصُول کے ماتحت وہ تذکرے جو بزرگانِ سلف کے اخلاق کے آئینہ دار ہیں جن میں اکابر کی جیتی جاگتی تصویریں آئندہ نسلوں کو دعوتِ عمل دیتی نظر آتی ہیں جن کے ورق ورق پر بہادرانِ وطن کا خون چمک رہا ہے اور جن کا لفظ لفظ غدارانِ ملّت کی زبان سے کہہ رہا ہے کہ

کم ہوں گے اِس بساط پہ ہم جیسے بد قمار
جو چال ہم چلے سو نہایت بُری چلے،

وہ کتابیں جو نوجوانوں کے لئے شمعِ ہدایت ہیں جو انہیں شاہراہِ زندگی کے نشیب و فراز سے آگاہ کرتی ہیں جو کامیاب اور ناکام زندگی کے وجوہ پر روشنی ڈالتی ہیں، وہ سب کتابیں دائرۂ ادب سے خارج کر دی جاتی ہیں، اس لئے کہ وہ مفید ہیں۔

نپولین میدانِ جنگ میں سکندر اور جولیس سیزر کی داستانِ حیات کا مطالعہ کرتا تھا اور موجودہ زمانے کی سب سے بڑی فوج کا سالارِ اعظم مارشل گامیلن اس بات پر فخر کرتا ہے کہ اسے نپولین کی زندگی کے واقعات پر عبور حاصل ہے لیکن بعض ترقی پسند نقّاد اِن کتابوں کو ادب کا درجہ دینے سے انکار کرتے ہیں!

"تذکرہ" "سیرت" "سوانح عمری" جس نام سے بھی ماضی کی شخصیتوں کے حالاتِ زندگی جمع کئے گئے ہیں چاہے انہیں ادب کا درجہ دیا جائے یا نہ دیا جائے، ہم اِس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ اس چیز کا وجود ہمارے تمام ادبی "کارناموں سے پہلے تھا اور چاہے ہم اس سے واقف نہ ہوں قدیم ترین ادبی شاہکار اِسی صنف کے تحت میں آتے ہیں۔

پہلی "سوانح عمری" انسانِ اوّل سے منسُوب کی جا سکتی ہے۔ انگریزی شاعر مِلٹن اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "فردوسِ گمشدہ" میں حضرتِ آدم کی زبان سے اُن کے ابتدائی حالات اس طرح ادا کرتا ہے۔

"مجھے یُوں محسُوس ہوا کہ میں نیند سے بیدار ہوا ہوں اور پھولوں کی سیج پر لیٹا ہوا ہوں۔ سورج نے میرے جسم سے شبنم کے خوشبودار قطرے اپنی کرنوں سے چن لئے۔ میں نے اپنی متحیر نظریں آسمان پر گاڑ دیں پھر ایک فوری جذبے سے متاثر ہو کر کھڑا ہو گیا۔ پہاڑ، وادیاں، جنگل، میدان، چشمے چاروں طرف مسکرا رہے تھے اور خوش الحان طیور چہچہا رہے تھے۔ میرا دل مسرت سے لبریز ہو گیا۔

"پھر میں نے اپنی طرف دیکھا، اپنے اعضا پر نظر دوڑائی جی چاہا تو چلنے لگا، جی چاہا تو دوڑنے لگا، لیکن میں کون ہوں، کہاں سے آیا ہوں میری زندگی کا مدعا کیا ہے، مجھے یہ معلوم نہ تھا۔ کچھ کہنے کو جی چاہا تو بے ساختہ زبان سے یہ الفاظ نکلے۔ . . . . اے چمکنے والے سورج اور اے منوّر زمین، اے پہاڑو اور وادیو، چشمو اور دریاؤ اور اے اُڑتے پھرتے پرندو! بتاؤ میں کدھر سے آیا ہوں؟ تم نے دیکھا نہیں؟ میں یہاں کس طرح پہنچا؟ خود بخود تو نہیں آیا! ضرور میرا کوئی پیدا کرنے والا ہے جس کی قدرت مجھے یہاں لائی ہے۔ بتاؤ اُس تک پہنچنے کا کیا ذریعہ ہے۔ اسے خوش کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ جب کہتے کہتے میں نہ معلوم کہاں سے کہاں پہنچ گیا یہاں تک کہ نیند غالب آگئی اور میں عالمِ خواب میں گم ہو گیا۔ . . . یہ میری زندگی کا پہلا دن تھا۔"

خواب میں خالقِ ذوالجلال نے انہیں اپنی مسند الفت کی اور

نویدی کہ تم نوعِ انسان کے مورثِ اعلیٰ ہو۔ تمام دنیا پر تمہاری اولاد حکمرانی کرے گی اور تمہارا نام لاکھوں برس زندہ رہے گا۔

یہ واقعات حضرت آدم نے اپنی رفیقۂ حیات کے سامنے بیان فرمائے۔ دنیا کا پہلا انسان دوسرے انسان کو پہلی ملاقات میں اپنے حالات سُنا رہا تھا۔ اور گویا پہلا تذکرہ مرتب کر رہا تھا۔

ہندوستان میں جب پہلے پہل کتابیں لکھی گئیں تو ان میں اُن میں سب سے زیادہ مقبول ہوئی جو شری رامچندر جی کا تذکرہ ہے۔ اسی طرح دنیا میں جس کتاب کی اشاعت سب سے زیادہ ہے وہ انجیل ہے جس کے عہد نامۂ جدید میں متی، مرقس، لوقا اور یوحنا نے اپنے آقا حضرت مسیح کی سیرت رقم فرمائی ہے۔ بدھ مذہب اور اسلام کی اوّلین کتابیں بھی سیرت سے تعلق رکھتی ہیں۔ انگوتر نکائیں کی بدھ چرتیہ اور بانئ اسلام کی احادیث دنیا کی اہم ترین کتابوں میں سے ہیں۔

مذہبی کتب کے علاوہ شعر کی دو اہم اصناف قصیدہ اور مرثیہ میں بھی سیرت نگاری کے عناصر موجود ہیں۔ جب شاعر لفاظی اور خیال آرائی کو ترک کر کے سچے واقعات کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو وہی بات کہتا ہے[۱] جس کی ایک سیرت نگار سے توقع کی جاتی ہے۔ اسی طرح تاریخی ڈراما نگار بھی جہاں تک اسے تاریخ سے تعلق ہے سیرت نگار کہلا سکتا ہے۔ افسانہ نویس بھی اگر اس کا موضوع صداقت پر مبنی ہو تو سیرت نگار کے فرائض ادا کرتا ہے اور بعض اوقات سیرت نگار صداقت سے کنارہ کش ہو کر افسانہ نویس کی حد میں داخل ہو جاتا ہے۔ راجہ بیربل کے تاریخی حالات بھی ہیں اور جانے لطیفے بھی۔ ہارون الرشید کا وجود تاریخ میں بھی ہے اور الف لیلہ کی داستانوں میں بھی۔ عبدالحلیم شرر کے تاریخی ناولوں میں تاریخ اور افسانہ دونوں کا امتزاج ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ”تاریخی واقعات“ افسانہ ثابت ہوتے ہیں اور کبھی مؤرخ کمالِ تحقیق کے بعد افسانہ کی صداقت پر مہر تصدیق ثبت کر دیتے ہیں۔ پدمنی کا واقعہ پہلی قبیل سے ہے اور سری کپ (سکیسلا) کا قصہ دوسری قبیل سے۔ افسانہ اور تاریخ کا فرق روز بروز مٹتا جا رہا ہے۔ بعد واقعات پر افسانہ کا رنگ اس قدر غالب آ رہا ہے کہ اکابر کے حالاتِ زندگی داستانِ امیر حمزہ بن کر رہ گئے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلے وقتوں کے قصہ نویس جو کچھ لکھتے تھے اس پر ان کا اعتقاد ہوتا تھا لیکن جدید دور کے انتہا پسند سیرت نگار جان بوجھ کر جھوٹ لکھتے ہیں اور اس [illegible] سے داد چاہتے ہیں۔

قدیم تذکرہ نویسوں کی یہ کوشش تھی کہ اپنے ممدوح کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات بہم پہنچائیں۔ اس کے خلاف جدید سیرت نگاروں کا رُخ اس طرف ہے کہ اپنے تذکرے کو دلچسپ سے دلچسپ بنانے کے لئے جو کچھ ہو سکے کر گزریں۔ قدیم اور جدید سیرت نگاری کا دوسرا فرق یہ ہے کہ پہلے مصنف اکابر کی خوبیاں گنتے تھے اور ان کے کارناموں کو بڑھا چڑھا کر دکھاتے تھے جس سے پڑھنے والوں کے دلوں پر زیرِ بحث شخصیت کا رُعب طاری ہو جاتا تھا۔ برعکس اس کے موجودہ دور کے مصنف اکابر کو ان کی بلند حیثیت سے گرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اگر ان کا دامن عوام کی بہ نسبت زیادہ آلودہ نہیں تو پاک بھی نہیں۔ ہمارے بزرگ خوش اعتقاد اور اکابر پرست تھے اور ہمارے ہم عصر بد بین اور عیب چین ہیں[۲]۔ بدنام کنندۂ نکو نامے چند۔ اگر قدما کسی عظیم شخصیت کی تعریف میں غلو سے کام لے کر کہہ دیتے تھے۔ ع۔ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر۔ تو اس بے ادب دور کے ادیب گلا پھاڑ پھاڑ کر کہتے ہیں۔ ع

بدخصلتوں کو کرتا ہے بالانشیں فلک
اونچی ہے آشیانۂ زاغ و زغن کی شاخ

اس طبقہ کے سیرت نگاروں کی معراج یہ ہے کہ سقراط کو شہوت پرست، نپولین کو بزدل، ہیلن کو بدصورت اور کمال کو لامذہب ثابت کرنے کے لئے اپنی اُلٹی منطق کا تمام زور صرف کر دیں۔ ایچ۔ جی۔ ویلز نے جا بجا اپنی ”تاریخِ عالم“ میں اور آرمسٹرانگ نے اپنی تصنیف ”گورا بھیڑیا مصطفےٰ کمال“ میں اس مذموم خصلت کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان اوصاف پر تبصرہ کرنے کی بجائے جو نپولین اور مصطفےٰ کمال کی عظمت کے ذمہ دار ہیں ان کی زندگی کے تاریک پہلو سے بار بار پردہ اُٹھانا کہاں تک جائز ہے؟ کیا نپولین کے کسی معاشقہ کی تفصیل سے اس کی عسکری عظمت پر روشنی پڑ سکتی ہے یا مصطفےٰ کمال کی شبانہ وارفتگیوں سے فاتح سقاریہ کی پُر اسرار شخصیت کا معمّہ حل ہو جاتا ہے۔ دنیا صرف اتنا جاننا چاہتی ہے کہ وہ کون سے جوہر تھے جنہوں نے ایک معمولی وکیل کے بیٹے کو نپولین اعظم اور ایک محرر کے لڑکے کو اتاترک بنایا۔ اس کا جواب ویلز سے یہی ملتا ہے کہ نپولین پرخود غلط، بے اصول، اوباش، بزدل اور فریبی تھا۔ اور آرمسٹرانگ کہتا ہے کہ مصطفےٰ کمال آوارہ گرد، فاسق، ظالم، لامذہب اور مسکین کش تھا۔ اگر ویلز اور آرمسٹرانگ کی نظر خوبیوں پر پڑے تو اس

[۱] ہماری رائے میں اس کی وجہ نفسیاتی ہے تہذیب و تمدن کی اُلجھی ہوئی صورتوں نے ہمارے اعصاب پر
[illegible]

[۲] [illegible] شعر کہہ کے اس آپ بیتی ہی سناتا ہے۔ (ادارہ)

ہیں نپولین اور مصطفےٰ کمال کا کیا قصور، چشمۂ آفتاب کی روشنی ان یک طرفہ
تاریک نظر افراد کے چلتے ہوئے نقروں سے کم نہیں ہوتی۔

ان مصنّفین پر مُردار خور گدھ کی مثال صادق آتی ہے کہ دنیا میں
ہزاروں نعمتوں کے ہوتے ہوئے ان کی نظر صرف بدبودار مردار پر پڑتی ہے۔ ان
کے علاوہ بعض نیک نیت مصنّف بھی ہیں جن کا مطمحِ نظر بلند تر ہے لیکن
ان کی نگاہ سطحی حسن تک محدود رہتی ہے۔ ان میں فرانسیسی مصنّف
آندرے موروا کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جس نے بائرن، شیلے
اور والٹیر کے تذکرے مرتب کئے ہیں اور ارباب اقتدار میں سے شاہ
ایڈورڈ ہفتم اور بنجمن ڈزریلی کے حالاتِ زندگی بھی رقم کئے ہیں۔ موروا
کی شگفتہ تحریر خشک سے خشک مضمون کو دلچسپ بنا دیتی ہے، صفحے
صفحے پر اس کی ظرافت جھلکتی ہے۔ دقیق مسائل اس کے ہاں عام فہم
بن جاتے ہیں اور گذشتہ صدی کی سیاسی بساط کی پُرپیچ چالیں بچوں
کا کھیل معلوم ہوتی ہیں۔ بڑے بڑے مدبّر سامنے کھیلے ہوئے ہمجولیوں کی
طرح آشنا نظر آتے ہیں اور حیرت انگیز تاریخی کارنامے آنکھوں دیکھے
واقعات معلوم ہوتے ہیں لیکن اس سے یہ نقص پیدا ہو جاتا ہے کہ چھوٹے
بڑے واقعات کے خلط ملط ہونے سے ممدوح کی حقیقی عظمت آنکھوں
سے اوجھل ہو جاتی ہے اور کتاب کے ختم ہونے پر جو تصویر پڑھنے
والے کے سامنے آتی ہے وہ ایک عظیم المرتبت شخصیت کی نہیں بلکہ
ایک معمولی انسان کی ہوتی ہے۔

"ڈزریلی" موروا کا شاہکار ہے۔ انیسویں صدی کی تقدیر کا فیصلہ
یا بسمارک کرتا تھا یا ڈزریلی۔ اگر ان دو کے نام خارج کر دیئے جائیں
تو انیسویں صدی کی تاریخ ایک کورا ورق رہ جائے۔ ڈزریلی ہی کی دُور
اندیشی سے ملکہ وکٹوریہ کے نام سے قیصرِ ہند کا لقب وابستہ ہوا اور ہندوستان
تاجِ برطانیہ کا درخشاں ترین موتی سمجھا جانے لگا۔ اسی کی حکمتِ عملی سے
روس کو قسطنطنیہ کے دروازے سے ہٹا دیا گیا اور بحیرۂ روم کا نگہبان
سائپرس برطانیہ کی حمایت میں آ گیا۔ اس نے خفیہ طور پر راتھ شائلڈ بینکر
سے روپیہ لے کر سویز نہر کے حصص خرید کر برطانیہ کے نام منتقل
کرا لئے اور دنیا کی سب سے بڑی تجارتی شاہراہ پر برطانیہ کا تسلط جما دیا
یہ ہیں ڈزریلی کی تاریخی عظمت کے چند شواہد لیکن موروا کی کتاب میں
ایک [illegible] تصویر کھینچی گئی ہے۔

ڈزریلی [illegible] اس کے [illegible] جیسی

میں بہت سی طلائی زنجیریں لگی تھیں۔ جب وہ تقریر کرنے کو کھڑا ہوا تو پہلے
دیر تک اپنے گھونگریالے بالوں کو سنوارتا رہا اور اپنے کپڑوں کی طرف
دیکھتا رہا۔"

اسی طرح اس کے بانکپن اور رنگین مزاجی کی طرف بار بار اشارہ
کیا گیا ہے جس سے یہ شک گزرتا ہے کہ یہ ایک ایکٹر کی داستانِ حیات
ہے یا ایک دانائے روزگار مدبّر کی۔

جرمن مصنّف لڈوگ جو ایک محتاط سیرت نگار ہے آندرے موروا
کی طرح سطحی تفصیلات کو بہت اہمیت دیتا ہے لیکن ان بظاہر سطحی
تفصیلات کا باطنی سیرت سے تعلق ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے
اس کا دعویٰ ہے کہ وہ باطنی اور ظاہری سیرت دونوں کے امتزاج سے
ایک مکمل شخصیت بنا کر دکھانا چاہتا ہے کیونکہ شخصیت نہ صرف جسم ہے
اور نہ صرف روح بلکہ دونوں سے مرکب ہے۔ چنانچہ وہ "سیرت نپولین"
میں کہتا ہے۔

"میں نے اس کتاب میں نپولین کی باطنی تاریخ لکھنے کی کوشش
کی ہے۔ چونکہ اس کی سیاسی زندگی کا ہر لمحہ اس کی شخصیت کا مظہر ہے
اس لئے نئی ریاستوں کے قیام کے متعلق اس کے خیالات اور انقلاب
اور شہنشاہی کے متعلق اس کا رویہ اور یورپ کے سیاسی نظام اور
سماج کے بارے میں اس کی جدوجہد یہ سب اس کے سیرت نگار کے
لئے بے حد اہم ہیں۔ اس کی جنگیں سب غیر متعلق ہیں۔ اس عہد کی
ریاستوں کی حالت، ان ریاستوں کے معاہدے اور سازشیں جہاں تک
ان کا صرف اس زمانہ سے تعلق ہے دُور از کار اور بے معنی ہیں۔
میرے لئے نپولین کی فتوحات سے زیادہ اہم ہیں وہ چھوٹے
چھوٹے اختلافات جو اس کے اور اس کے بھائیوں کے درمیان رونما
ہوئے۔ وہ اُمید و بیم کے لمحے، وہ غم و غصّہ کے مظاہرے، وہ دوست
اور دشمن سے احسان اور دغا کے شواہد اور ہر وہ لفظ جو اس نے اپنے
کسی فوجی افسر یا کسی معشوقہ سے کہا جس حد تک یہ مستند ہیں۔ ... لیکن
ہمیں صرف نپولین کی نفسیاتی کیفیات سے بحث نہیں جو فرانسیسی
مصنّفین کا مرغوب موضوع ہے بلکہ نپولین کی شخصیت سے بحث ہے
جو سیاسی اور سماجی زندگی میں نوعِ انسان کی عظمت اور [illegible] کی
آئینہ دار ہے میں نے [illegible]
ہی صفحے پر [illegible] کیونکہ دونوں کا ماخذ ایک ہی [illegible]

شخصیت کے دو پہلو ہیں! اگر ہم اس کے دل کی اُلجھنوں سے واقف ہو جائیں تو وہ اس کی سیرت کے سمجھنے میں اس کی جنگی تدابیر سے زیادہ مدد دے سکتی ہیں۔

"ایک ہزار برس میں نپولین جیسا انسان پیدا ہوتا ہے۔ ہمّت اور حوصلہ، جوش اور استقامت محنت اور استقلال، ذہانت اور خدا داد قابلیت سے جس کمالِ اَوج پر انسان پہنچ سکتا ہے نپولین نے وہاں پہنچ کر دکھایا۔ اس دورِ انقلاب میں نوجوانوں کو نپولین سے بہتر رہبر نہیں مل سکتا۔ انہیں نپولین کی زندگی سے سبق سیکھنا چاہئے اور اس کے حسرتناک انجام سے عبرت حاصل کرنی چاہئے۔ یورپ میں کوئی دوسرا شخص ایسا نہیں ہوا جس کی زندگی میں ایسے انقلاب پیش آئے ہوں اور جس کے دل میں ایسے طوفان اُٹھے ہوں"

ایمل لڈوگ کا ہم وطن اور اسی کی طرح جلاوطن جرمن سیرت نگار سٹیفن ژوائی نفسیات کے مطالعہ میں اس سے بھی دو قدم آگے ہے۔ اس کی کتابیں ایک اور ہی قسم کی عبرت کی حامل ہیں۔ لڈوگ کی دنیا میں عورتیں صرف "زیبِ داستان" کے لئے موجود ہوتی ہیں اور اس نے صرف ایک عورت کلیوپیٹرا کی سیرت رقم کی ہے لیکن سٹیفن ژوائی عورتوں کا ہی سیرت نگار ہے، مردوں کا وجود اس کے لیے ثانوی حیثیت رکھتا ہے اس کی دنیا میں عورتوں کی حکمرانی ہے اور ان جذبات کا عمل ہے جن سے عورت کا تعلق ہے۔ اس کی اہم تصنیف "ماری انٹوائینٹ" کا موضوع بظاہر انقلاب فرانس ہے لیکن درحقیقت عورت کی بغاوت ہے اور یہی مضمون ترمیم اور تبدل کے ساتھ اس کی تمام کتابوں میں مشترک ہے۔ وہ انقلاب فرانس کی تاریخ لکھنے کی بجائے پسِ پردہ انقلاب کی تاریخ لکھنا شروع کر دیتا ہے۔ اس کی کتابیں پڑھتے ہوئے یہ گمان ہوتا ہے کہ زیرِ بحث زمانہ میں شاید راتیں زیادہ تھیں اور دن کم!

تاریخی واقعات یہ ہیں۔ آسٹریا کی شہزادی ماری انٹوائینٹ اور لوئی شہزادۂ فرانس کی شادی کی رسم بہت دھوم دھام سے ادا کی گئی۔ چار سال کے بعد شہزادہ تخت پر بیٹھا اور لوئی شانزدہم کے نام سے مشہور ہوا اور ماری انٹوائینٹ ملکہ بنی لیکن تخت نشینی کے تین سال بعد تک شادی برائے نام رہی اس عرصہ کے بعد ڈاکٹروں کی مہربانی سے بادشاہ کی کمزوری رفع ہوئی اور وہ شاہی خاندان میں اضافہ کرنے کے قابل ہوا۔ اس دوران میں ملکہ کی سات سال [illegible] کی بےعنوانیوں سے ملک میں بدنظمی پھیل گئی۔

عوام کی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ رعیت میں بے اطمینانی بڑھتی گئی۔ جس کا نتیجہ انقلاب کی صورت میں رُونما ہوا۔ بادشاہ کے اختیارات چھین گئے اور اس نے ملکہ اور شہزادیوں کے ساتھ بھیس بدل کر راہِ فرار اختیار کی لیکن لوگوں نے انہیں پہچان لیا اور پہلے قید میں رکھا پھر مقدمہ چلا کر قتل کر دیا۔ چند سال کے بعد ملکہ پر بھی مقدّمہ چلایا گیا اور اسے بھی قتل کر دیا گیا۔ مقدمہ کے دوران میں ملکہ پر شرمناک الزامات لگائے گئے۔

ان واقعات کی شرح سٹیفن ژوائی اس طرح کرتا ہے کہ انقلاب کی علت العلل بادشاہ کی کمزوری ہے جب اس کے گھر میں بغاوت کی آگ سات برس تک بھڑکتی رہی اور وہ اسے نہ بجھا سکا شبستانِ شاہی کے پردے سات سال تک اس کی ہنسی اُڑاتے رہے اور اس سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔ یورپ کے درباروں میں اس کی ناکامیوں کے چرچے ہوتے رہے اور فرانسیسی ظریف اس کے دسترخوان پر بیٹھ کر اس پر پھبتیاں کہتے رہے اور وہ خاموش رہا یا کھسیانی ہنسی ہنس کر چپ ہوگیا، جب یہ حالت تھی تو وہ کس مُنہ سے کہتا کہ میں تمہارا بادشاہ ہوں ؟ اس کے ملک کے بچّے بچّے کی زبان پر تھا

تو قدردانِ "دریچہ کردی کہ بروں خانہ آئی ؟

ماری انٹوائینٹ جس کا سہاگ سات برس تک شرمندۂ تکمیل نہ ہوا نمائش اور آرائش میں اپنی خواہشات کی تسکین کا سامان ڈھونڈنے لگی۔

خوابگاہ سے نکلنے کے بعد ملکہ کا اہم ترین کام بالوں کی تزئین ہوا کرتا تھا۔ اس مقصد کے لئے اس نے ایک چوٹی کے ماہرِ فن کی خدمات حاصل کر لی تھیں۔ اس یکتائے روزگار کا نام موسیولیونارڈ تھا اور اس کی شہرت دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھی۔ وہ ہر صبح رئوسا کی طرح چھ گھوڑوں کی گاڑی میں بیٹھ کر شاہی محل میں آیا کرتا تھا اور ملکہ کے سر کو نئے نئے طریقوں سے سنوار کر اپنے فن کی داد لیا کرتا تھا جس طرح بعض معمار عالیشان عمارتوں کو مکمل کرنے کے بعد ان پر ایک نادر منقش چھت بنا دیا کرتے ہیں اسی طرح موسیولیونارڈ فیشن پرست خواتین کے سروں پر بالوں کا ایک مزین مینار بنا دیا کرتا تھا جو بڑے بڑے معماروں کے کارناموں کو مات کرتا تھا۔ کبھی وہ ملکہ کے بالوں کو موم اور پن لگا کر اتنا اونچا کر دیتا تھا کہ دُور سے بھڑکتا ہوا شعلہ معلوم ہو۔ کبھی وہ بالوں کو اس طرح گوندھتا تھا کہ دُور سے ایک شاداب باغ کا نقشہ نظر آئے جس میں ثمردار درخت کھڑے ہوں رنگ برنگ کے پھول کھلے ہوں اور چشمے اُبل رہے ہوں کبھی

انہیں اس طرح لہراتا تھا کہ ان پر سمندر کا دھوکا ہوتا جس میں جہاز طوفان کا مقابلہ کر رہے ہوں لیکن لیونارڈ کی صنعت مناظرِ قدرت تک ہی محدود نہ تھی بلکہ وہ ملکہ کے مشکبو بالوں میں ہنگامی واقعات کی عکّاسی بھی کیا کرتا تھا۔ خالی الذہن ملکہ کے سر میں جو سودا ابھی سماتا تھا موسیو لیونارڈ کی کاریگری اسے سطح پر لے آتی تھی۔ اگر تھیٹر میں کوئی ڈرامہ مقبول ہوتا تو موسیو لیونارڈ اس کے مناظر ملکہ کے منقش بالوں میں دکھا دیتا تھا۔ جب پیرس میں قحط نمودار ہوا اور بھوکے مزدوروں نے اشیائے خوردنی کی دکانیں لوٹ لیں تو زمانہ شناس لیونارڈ نے ملکہ کے "زیرِ سرپرستی" بلوائی ٹوپی کو رواج دیا جس پر ہوٹلوں کے لٹنے کے مناظر کاڑھے ہوتے تھے۔ مرصّع زلفوں اور مصوّر ٹوپیوں کے یہ مینار اتنے بلند ہوتے گئے کہ محل کے لئے اونچے دروازے بنانے پڑے۔"

ان مشاغل سے بھی ملکہ کے ارمان بھرے دل کو سکون نہ ملا تو اُس نے اپنی فطری خواہشات کے لئے فطری اور غیر فطری ذرائع تلاش کرنا شروع کئے اور بعض روایتوں کے مطابق کم از کم چالیس افراد سے جن میں مرد اور عورتیں دونوں شامل ہیں تعلقاتِ محبت استوار کئے۔ شٹیفن ٹزوائگ اس روایت کے آخری حصے کی تصدیق کرتا ہے۔

سات سال کے بعد لوئی ڈاکٹروں کی مدد سے ملکہ کے نفس کی بغاوت فرو کرنے میں کامیاب ہوا اور یہ خبر یورپ کے تمام بادشاہوں کو ان کے سفیروں نے خاص قاصد بھیج کر پہنچائی گویا ایک بڑا سیاسی انقلاب رونما ہو گیا ہو یا ایک جنگِ عظیم سر کر لی ہو۔ اس کے ایک برس بعد فرانس کے تمام روسا کو ملکہ کے پہلے بچے کی پیدائش کے موقع پر حاضر ہونے کی دعوت دی گئی اور سب عالی نسب امراء شاہی بچے کے استقبال کے لئے جمع ہوئے۔ اور یہ منظرِ عام سب خواص کو دکھایا گیا تاکہ بوقتِ ضرورت شہادت دے سکیں۔ یہ منظر آئندہ چند سالوں میں کئی مرتبہ دہرایا گیا اور اس طرح چند عدد شہزادیاں اور ایک شہزادہ وجود میں آئے لیکن اِدھر بادشاہ کا گھر آباد ہوا اُدھر سلطنت کی بربادی کے آثار نظر آنے لگے۔ بادشاہ کی ناکامی اور ملکہ کی عیاشی کے قصے گھر گھر پہنچ چکے تھے۔ شاہی خاندان کی عزت خاک میں مل چکی تھی۔ پیرس میں انقلاب برپا ہوا اور بادشاہ کو قتل کر دیا گیا۔ اِدھر ملکہ کی گود بھری گئی اُدھر تقدیر نے سر کا تاج چھین لیا۔ ملکہ ایک عرصے تک قید رہی پھر اس پر یہ الزام لگایا گیا کہ اس نے ملک میں بد اخلاقی کو رواج دیا ہے۔ اسی پر بس نہیں

ہوئی۔ انقلابی عدالت کے وکیل نے یہ بھی کہا کہ اس فاحشہ نے اپنے بیٹے کو بھی ہوس کا آلۂ کار بنایا ہے۔ غرض اس بدنصیب عورت کو قتل کرنے سے پہلے زندہ درگور کر دیا گیا۔ مصیبتوں کی ماری انٹوائینٹ نے اس کا یہ جواب دیا کہ فطرت ایک ماں کو اس سوال کا جواب دینے سے روکتی ہے۔

کیا اس سوال پر اور دوسرے متعلقہ مسائل پر کھلم کھلا بحث جائز ہے؟ مدّعیانِ اخلاق کہیں گے ع

نکتۂ خاص گو مجلسِ عام است ایں جا

لیکن شٹیفن ٹزوائگ کہتا ہے: "جب عدالت اور طبیب کے سامنے یہ پردہ اُٹھ سکتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ یہ فضول اخلاقی پابندیاں ایک سیرت نگار پر عائد کی جائیں جو تاریخی عدالت کا جج ہے اور جس کا فرض تاریخی حیثیت کے امراض کی تشخیص کرنا ہے؟ کیا حقیقت کو اس لئے عریاں نہ کیا جائے کہ چند اخلاق کے جھوٹے علمبردار معترض ہوں گے؟ کیا اُس راز کو جس نے لاکھوں انسانوں کی زندگیاں بدل ڈالیں راز ہی رہنے دیا جائے؟ آخر شرع میں کیوں شرم نہیں؟ آپ کہیں گے اس ساٹھ سال کی مفید تحقیق کے حاصل کو زمین میں دبا دیا جائے یا دریا بُرد کر دیا جائے نہیں یہ کبھی نہ ہوگا! اس "اخلاق" کا جنازہ اُٹھاؤ، اس تعصب کی لاش کو سمندر میں پھینک دو!"

موروا، لڈوگ اور ٹزوائگ تینوں کا کام انسانی فطرت کی عکّاسی ہے لیکن تینوں نے مختلف ذرائع استعمال کئے ہیں۔ موروا ایک فوٹوگرافر کی طرح اوضاع و اطوار کا مطالعہ کرتا ہے۔ لڈوگ ایک مصوّر کی طرح انسان کے خدوخال میں اس کے باطنی اوصاف کی جھلک دکھانا چاہتا ہے اور ٹزوائگ ایکس رے سے مریض کا اندرونی فوٹو لینے کی کوشش کرتا ہے۔ موروا کا انسان شکیل، رنگین اور بذلہ سنج ہے۔ لڈوگ کا انسان مستقل مزاج اور دلیر، آگ میں کود پڑنے والا اور ٹزوائگ کا انسان نفسی پیچیدگیوں میں اُلجھا ہوا مریض!

ہمارے اردو ادب میں مولوی محمد حسین آزاد موروا کی اور مولانا شبلی نعمانی لڈوگ کی یاد دلاتے ہیں۔ بدقسمتی یا خوش قسمتی سے ٹزوائگ کا مثیل ابھی ہمارے ہاں پیدا نہیں ہوا اور اگر ہوا ہے تو اب تک عالمِ گمنامی میں ہے۔ اردو میں سیرت نگاری کا سرمایہ ہو کیا [illegible] پھر بھی ہم بجا طور پر آزاد، شبلی، حالی اور ان کے [illegible]

کارناموں پر فخر کر سکتے ہیں۔ آزاد نے شعرا کی بیرنگ تصویروں میں رنگ بھرے پرانے تذکروں سے کاٹھ کے ڈھانچوں کو نکال کر انہیں حرکت دی اور دکھایا کہ یہ بھی انسان تھے اور یکتائے روزگار تھے۔ یوں اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے اور اس انداز کی گفتگو کرتے تھے۔ ان حالات میں فکرِ شعر کرتے تھے اور ان مجالس میں شعر سناتے تھے اور اس طرح مجلسِ مشاعرہ پر چھا جاتے تھے۔ آزاد کی نقادانہ حیثیت سے بحث نہیں لیکن ان کی سیرت نگاری میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔ "آبِ حیات" کو اسی نقطۂ نظر سے پڑھئے اور پھر "دربارِ اکبری" میں بھی ان کے کمالات کا مشاہدہ کیجئے۔

مولانا شبلی نے تاریخی اور ادبی اکابر کے سوانحِ حیات لکھے ہیں لیکن انہیں مؤرخ کی حیثیت میں سب سے زیادہ کامیابی ہوئی ہے "سیرت النبی"۔ "الفاروق"۔ "المامون"۔ اور "الغزالی" میں اگرچہ ان کا نفسِ مضمون ایک برگزیدہ ہستی کی سیرت ہے لیکن وہ ساتھ ساتھ اس تاریخی دور کی خصوصیات بھی بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انہیں اسی پر فخر نہیں کہ وہ نبیٔ کریم اور اسلامی بادشاہوں اور مفکرین کے سیرت نگار ہیں بلکہ وہ اول و آخر اسلام کے دورِ زرّین کے مؤرخ کہلانا پسند کرتے ہیں۔ راشد الخیری کی کتابیں "الزہرا" اور "وداعِ ظفر" میں بھی اسی طرح ایک شخص اور ایک دور کی تصویر یکجا کھینچی گئی ہے اور تاریخی دور کی تصویر کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

مولانا حالی کی بیشتر کتابیں "حیاتِ سعدی"۔ "یادگارِ غالب" وغیرہ ادبی تنقید سے تعلق رکھتی ہیں۔ صرف "حیاتِ جاوید" جو سرسید مرحوم کا تذکرہ ہے صنفِ سیرت نگاری میں ان کی یادگار ہے "حیاتِ جاوید" غالباً اس نوع کی پہلی کتاب ہے جس کا ممدوح ایک تاریخی شخصیت نہیں (اگرچہ سرسید نے اپنی قوم پر تاریخی احسانات کئے ہیں)۔

موجودہ زمانہ میں جامعہ ملیہ اور دار المصنفین اعظم گڑھ کی مطبوعات کو چھوڑ کر جن میں اکثر خالص "تحقیقی اور تعلیمی" قسم کی ہیں اردو میں بہت کم کتابیں سیرت سے متعلق لکھی گئی ہیں یا زیادہ حصہ تراجم کا ہے مثلاً "چنگیز" اور "تیمور" کا ترجمہ مولوی عنایت اللہ نے ہیرلڈ لیمب کی انگریزی کتابوں سے کیا ہے گاندھی اور جواہر لال نہرو نے بھی اپنی آپ بیتی انگریزی میں لکھی اور ان کتابوں کا ترجمہ اردو میں چھپا ہے۔ ہٹلر اور مسولینی کی آپ بیتیوں کا ترجمہ بھی انگریزی کی وساطت سے ہوا ہے اور مصطفےٰ کمال کی حیات نقل بھی کی گئی کتابوں سے تقطیر اور ترشید کے بعد اردو میں آئے ہیں۔ آخر الذکر سب سے مایوس کن ہے۔ اسے اسی حد تک مصطفےٰ کمال کی سیرت کہہ سکتے ہیں جس حد تک ابلے ہوئے پانی کو مرغ کا شوربا۔

ہندوستان میں بڑے آدمیوں ہی کا قحط نہیں سیرت کی اچھی کتابوں کی بھی حوصلہ شکن کمی ہے۔ سیرت نگار کے لئے بڑے آدمیوں سے بھی زیادہ اہم وہ اشخاص ہیں جن میں کوئی بڑا انسانی وصف ہو۔ سیرت نگاری کا دائرہ اتنا ہی وسیع ہے جتنا مرثیے کا۔ جب کسی کی موت پر اہلِ دل بے اختیار پکار اٹھیں۔ ع

آج ہر اک چیز میں کچھ کمی پاتا ہوں میں

تو یہ سمجھنا چاہئے کہ سیرت نگاری کا موضوع پیدا ہو گیا۔ کامل انسان اور مکمل سیرت دونوں حدِ امکان سے باہر ہیں لیکن قابلِ تعریف ہے وہ انسان جو کہتا ہے "یہ ناممکن سہی میں اس کو ممکن کر دکھاؤں گا"۔ سیرت نگاری ہمارا فرض ہے۔

عطاء اللہ کلیم

اشعار

ہو دورِ غم کہ عہدِ خوشی دونوں ایک ہیں
دونوں گزشتنی ہیں خزاں کیا بہار کیا!
ہم بیکسوں سے سختیٔ عہدِ فراق پوچھ
اے بے خبر! کسی سے بڑھاتا ہے پیار کیا!

محروم

ملاّح کی بیوی

بیٹھی ہوں اکیلی کٹیا میں اس دم وہ بہت یاد آتے ہیں

تاریک گھٹائیں ظاہر ہیں، پنہاں ہیں ستاروں کی شمعیں،
اُف، کیسی بھیانک ہیں یا رب! بے رحم سمندر کی موجیں
بادل بھی ڈراتے ہیں مجھ کو۔ طوفان بھی شور مچاتے ہیں!

پانی کی بھینٹ نہ چڑھ جائے کمزور سی ناؤ کہیں یا رب!
ایسا نہ کہیں ہو طوفانی گرداب میں گم ہو جائیں وہ،
ایسا نہ کہیں ہو لہروں کی آغوش ہی میں سو جائیں وہ!
کیا ایسی مصیبت آئے گی؟ کیا ایسا ہوگا؟ نہیں یا رب!

اُف ایسی بھیانک تاریکی، طوفان کا یہ اندھا منظر!
ممکن ہے کہ اس طوفان میں وہ بھی ہوش و حواس گنوا بیٹھیں،
ممکن ہے بھنور کے رُخ ہی پر وہ اپنی ناؤ لگا بیٹھیں،
اُف چھوڑ نہ دیں پتوار کہیں ہاتھوں سے وہ اپنے گھبرا کر!
میں دکھیا ہوں لاوارث ہوں کر رحم ذرا مجھ پر یا رب!
محفوظ و سلامت لوٹ آئیں اِس رات وہ اپنے گھر یا رب!

سلام مچھلی شہری

یقینِ شکست

مری آنکھ کھل گئی یک بیک مری بے خودی کی سحر ہوئی کہ مآلِ عشق سے آشنا یہ فریب خوردہ نظر ہوئی
وہ حسین رُت بھی بدل گئی، وہ فضا بھی زیر و زبر ہوئی
ہوئی موت مجھ سے قریب تر مجھے آج اِس کی خبر ہوئی

ترے التفات نے کر دیا تھا مجھے نصیب سے بے خبر میں تمام کیف و سرور تھا مری حد میں غم کا نہ تھا گذر
مرے دل کو تجھ پہ غرور تھا مجھے ناز تھا ترے پیار پر
ترا پیار ہائے تھا مختصر مجھے آج اِس کی خبر ہوئی

وہ حسین سحر، وہ شب حسیں وہ وفورِ شوق، وہ زندگی وہ نوازشیں، وہ عنایتیں، وہ کرم، وہ لطف وہ دلدہی
ترا روٹھنا، ترا ماننا، تری بے رخی، تری بے خودی
کبھی اب نہ دیکھوں گا عمر بھر مجھے آج اِس کی خبر ہوئی

ہے کسی کا اور تو کیا گلہ میں خود اپنی آنکھ میں خوار ہوں کبھی مجھ پہ بار ہے زندگی کبھی زندگی پہ میں بار ہوں
جو اُتر گیا وہ خمار ہوں، جو خزاں ہوئی وہ بہار ہوں
تمہیں میری کچھ بھی نہیں خبر، مجھے آج اِس کی خبر ہوئی

وہی آہ جس نے کبھی زمیں کو فلک سے اُٹھ کے ملا دیا وہی آہ جس نے مرے نصیب کی تیرگی کو مٹا دیا
وہی آہ جس نے بدل کے خو تری لطف تجھ کو سکھا دیا
اُسی آہ میں نہیں اب اثر مجھے آج اِس کی خبر ہوئی

وہ زمانہ کیف و نشاط کا وہ خودی میں ایک سرور سا وہ شکست عقل و شعور کی وہ جنوں میں جیسے غرور سا
وہ غرور عشق بھی چور سا وہ غیور حسن بھی چور سا
وہ سرور مٹ کے رہا مگر مجھے آج اِس کی خبر ہوئی

نہ سکوں میں بھی وہ ملے گا اب کہ جو کیف دردِ جگر میں تھا کبھی چور عیش و خوشی میں تھا کبھی چور غم کے اثر میں تھا
ترا کیفی آج بھی ہے وہی کہ جو پہلے تیری نظر میں تھا
مگر اب نہیں وہ تری نظر مجھے آج اِس کی خبر ہوئی

کیفی اعظمی

چھوٹی بہن

صوفیہ نے نگاہ اوپر نہیں اٹھائی اس کی نازک انگلیاں بدستور لیس کے کام میں لگی رہیں۔ اور لولو تھی کہ سارے کمرے میں چکّر لگا رہی تھی۔ وہ کبھی طاق میں رکھے ہوئے کھلونوں کو اُلٹتی پلٹتی اور کبھی دروازے سے کھول کر اندر دیکھتی۔ اس کا انداز صاف بتا رہا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے۔ لیکن بہن کی سنجیدگی کے باعث اپنے ارادے میں کامیاب نہیں ہو رہی ہے وہ کچھ دیر تک ایک گیت کا ایک بند بھی گنگناتی رہی۔ اس نے ایک نظم بھی پڑھ ڈالی لیکن صوفیہ نے جیسے کچھ سُنا ہی نہیں۔ لولو کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ اس نے طے کر لیا کہ سیدھے سادے پیرائے میں بہن سے اپنی بات کہے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ وہ صوفیہ کے سامنے جا کر بیٹھ گئی۔ اور بولی "صوفیہ! تمہیں معلوم ہے مِس جانیت نے مجھ سے کیا کہا ہے؟"

"کوئی دلچسپ بات تو نہیں بتائی ہوگی؟"

"اُف تمہارے اس سرد جواب سے تو گرمیوں میں بھی نزلہ ہو جائے، بڑی بی بی! تم اپنی باتوں میں ٹھنڈک پیدا کرنے کے لئے اتنے اولے کہاں سے لاتی ہو؟"

"لولو۔ تو ہے تو ذرا سی چھوکری لیکن کتنی شریر ہے!"

"میری بہن! میرے دل کی ملکہ! یہ تمہاری کتنی بڑی غلط فہمی ہے جو تم مجھے اب تک چھوکری ہی سمجھے جا رہی ہو۔ میں اب چھوکری نہیں رہی اس لئے کہ اب میری شادی ہونے والی ہے۔"

"کیا؟"

"جانیت نے مجھ سے یہی تو کہا ہے۔"

"یہ تو کیا بکے جا رہی ہے؟ تیرا تو ایک لفظ بھی میری سمجھ میں نہیں آیا"

"بہت بہتر جناب، اب میں ڈرامے کی طرح تمام حالات تفصیل کے ساتھ آپ کو سُناتی ہوں۔ لیکن داستان ذرا طویل ہے۔ کیا سنجیدگی کی ملکہ بغور سماعت فرمائیں گی؟"

"کچھ کہو گی بھی۔"

"تارس کے میدان میں گھوڑ دوڑ تھی۔ تم تو وہاں گئی نہیں تھیں۔ اِس لئے کہ تمہیں تو کتابوں کے سوا کسی اور چیز سے دلچسپی ہی نہیں ہے"

"پھر وہی فضول کی بکواس، اصل بات کہنا ہو تو کہو۔ ورنہ مجھے سُننے کی ضرورت نہیں"۔

"نہیں سُننا تو بہر حال پڑے گا۔ اس لئے کہ یہ پُر اسرار داستان سُنائے بغیر میرا دم گھٹا جا رہا ہے۔ جان پر بن رہی ہے۔"

"تو آخر کہو گی بھی وہ بات؟"

"اچھا تو سُنو ہم لوگ گھوڑ دوڑ میں گرینڈ سٹینڈ کی پہلی صف میں بیٹھے تھے کہ "پوا لولو" والو نے آکر ایک حسین و خوش رُو نوجوان "موسیٰ فرانکو روبرتو" سے ہمارا تعارف کرایا۔ رسمِ ملاقات کی ادائیگی کے بعد وہ دونوں ٹھیک ہمارے پیچھے بیٹھ گئے۔ گھوڑوں کے اسٹارٹ ہونے تک ہم لوگوں میں ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ تمہیں یاد ہوگا کہ میں نے گارگن گھوڑے پر بازی لگائی تھی۔ مجھے امید نہ تھی کہ میں دھوکا کھا جاؤں گی۔ تمام گھوڑے گرد و غبار میں چھُپ گئے تھے۔ میں نے چلّا کر کہا.... گارگن جیتے گا۔ روبرتو نے مسکرا کر کہا۔ جی نہیں لارڈ لاویلو جیت رہا ہے میں اپنی بات کٹتے دیکھ کر غصّے سے بیتاب ہو گئی۔ لیکن وہ اسی طرح مسکراتا اور میری بات کاٹتا رہا۔ آخر میں ہم دونوں نے آپس میں بازی لگا لی۔ بار منٹ کے اضطراب انگیز انتظار کے بعد دوڑ ختم ہوئی اور معلوم ہوا کہ گارگن نے مجھے دھوکہ دیا۔ روبرتو نے بازی جیت لی۔ ذرا اُس سین کا تصوّر کرو، میں نے کہا۔ میں ابھی روپے دیئے دیتی ہوں۔ تو اس نے جھُک کر ادب سے مُسکراتے ہوئے کہا۔ "ایسی جلدی کیا ہے۔ دے دیجئے گا"۔ اس کے بعد ساحل پر میری اُس سے ملاقات ہوئی۔ میں نے اُس پر ایک مستفسرانہ نگاہ ڈالی۔ وہ پھر معنی خیز انداز سے مسکرایا۔ اور جھُک کر آداب بجا لایا۔ تھیٹر میں اور ہر جگہ یہی صورت پیش آتی ہے۔ میرا تو دفورِ اضطراب سے دم نکلا جا رہا ہے۔ روبرتو ۲۶ برس کا خوبصورت نوجوان ہے۔ اور آج صبح اس کا باپ دو گھنٹے تک [illegible]

باتیں ہی کرتا رہا۔"

"اچھا!"

"تم میری باتوں کو توجہ سے سن رہی ہونا؟ امّی کے پاس اس کے آنے کا حال مجھے جانیت سے معلوم ہوا مختصر یہ کہ شادی کے تمام مراحل طے ہو چکے ہیں صرف یہ طے کرنا باقی ہے کہ میں میر کے وقت میں کب جاؤں اور گاؤن کیسا پہنوں بھورے رنگ کا یا بادامی، اور ٹوپی سائے دار ہو یا بے سائے کی؟"

"واہ کیسی قینچی کی طرح زبان چلا رہی ہے۔"

"کیوں نہ چلے گی اب تو کوئی مرحلہ باقی رہا نہیں۔ مجھ میں اور رودبرلو میں کامل محبت ہو گئی ہے۔ میرے رشتہ دار بھی اس نسبت سے رضامند ہیں......"

"تو تم اس طرح شادی کرنے پر تیار ہو؟"

"اس طرح سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ اس کے تو بیسیوں معنی ہو سکتے ہیں۔"

"میرا مطلب یہ ہے کہ تم اُسے اچھی طرح سے جانے اور محبت کئے بغیر اُس سے شادی کر رہی ہو۔"

"نہیں انجیوانے تو نہیں۔ میں اسے کافی جانتی ہوں۔ میں نے اسے کئی دفعہ میں اور اس کے علاوہ سیر و تفریح میں اکثر دیکھا ہے میں تو اس کی پرستش کرتی ہوں۔ پرسوں میں نے اسے نہیں دیکھا تو مجھ سے کھانا نہیں کھایا گیا۔ اور میں خودکشی کی غرض سے تین پیالے کافی بھی پی گئی۔"

"اور اُس کا کیا حال ہے؟"

"وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے مجھ سے محبت کرتا ہے۔"

لولو نے جوشِ مسرت میں یہ جواب دے تو دیا۔ لیکن صوفیہ کے چہرے پر افسردگی دیکھ کر اسے اپنے ان بیباکانہ الفاظ پر بہت افسوس ہوا۔ اس نے بہن کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا "بہن کیا میں غلط کہتی ہوں؟"

صوفیہ نے ایک لمبی سانس لے کر کہا۔ "نہیں دیوانی یہ تو غلط کیوں ہونے لگی۔ جب کوئی محبت کرتا ہے تو شادی تو کرتا ہی ہے۔ لیکن محبت کا پیدا کرنا مشکل ہے۔"

لولو کچھ جھنجھلا کر بولی "محبت کا بیدار کرنا مشکل ہے۔ صوفیہ یہ تو کچھ بھی مشکل نہیں لیکن تمہاری طرح جس کی بھنوئیں کھنچی رہیں۔ آنکھوں میں اُداسی چھائی ہوئی ہو، ہونٹوں پر مسکراہٹ کا نام نہ ہو، جو اُس وقت بھی اپنے خیال میں گم ایک گوشے میں پڑا رہے۔ جب دوسرے ناچ گانے اور ہنسی مذاق سے دل بہلا رہے ہوں۔ اور ہنسنے کھیلنے کی بجائے کتابوں میں اُلجھا رہے۔ جو جوان ہو کر بھی غمزدہ صورت بنائے رہے۔ اس کے لئے محبت کا بیدار کرنا البتہ مشکل ہے۔"

صوفیہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سر جھکا کر خاموش ہو گئی۔ اس کے ہونٹ اس طرح کانپ رہے تھے گویا وہ اپنے آنسو بڑی مشکل سے روک رہی ہو۔

لولو بولی "میری باتوں سے تمہیں کچھ رنج تو نہیں پہنچا؟ میں تو تمہیں بھی محبت سے سرشار اور ایک دُلہن کی صورت میں دیکھنا چاہتی ہوں۔ کتنا اچھا ہو اگر ہم دونوں کی شادی ایک ہی روز ہو۔"

"نہیں میں شادی کرنا نہیں چاہتی۔ میں کنواری ہی رہ کر زندگی گزار دوں گی۔"

"بس بس میں صاحبہ مجھ سے زیادہ بننے کی ضرورت نہیں۔ رودبرلو ایک حسین نوجوان ہے۔ اور اس کا کوئی نہ کوئی بھائی ضرور ہوگا۔ اس لئے میری دلی کوشش ہو گی کہ اُس سے تمہاری شادی ہو جائے۔"

اتنے میں اُن کی ماں کپڑے پہن کر باہر جانے کے لئے کمرے میں آئی۔

لولو نے پوچھا "کہیں باہر جا رہی ہو امّی؟"

"ہاں بیٹی ذرا وکیل کے ہاں جانا ہے۔"

"اچھا وکیل کے ہاں جا رہی ہو تب تو ضرور کوئی خاص بات ہو گی"

"ہاں بنتو!" خاص ہی بات ہے۔ جو تمہیں بھی جلد ہی معلوم ہو جائے گی۔ صوفیہ تم بھی میرے ساتھ چلو۔"

"اچھا تو کیا صوفیہ کو بھی قانونی صلاح لینی ہے؟"

"لولو تو زبان کو قابو میں رکھنا کب سیکھے گی۔ اور تیری یہ طفلانہ حرکتیں کب چھوٹیں گی؟"

"جلد ہی چھوٹ جائیں گی امّی۔"

پھر وہ ماں اور بہن کے لئے دروازہ کھول کر ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ اور از راہِ شرارت نہیں معصوم صورت بنا کر دوبارہ جھک کر سلام

کرکے بولی "میم صاحبہ اور مس صاحبہ اِدھر ہے"۔ اور جب وہ دونوں کچھ دُور نکل گئیں تو لولو نے ایک قہقہے کے ساتھ پکار کر کہا۔ "امّی خُوب اطمینان سے باتیں کر لینا۔ میں بھی ایسی بنوں گی گویا کچھ جانتی ہی نہیں۔"

(۲)

روبرٹ تو کچھ زیادہ غور و فکر کرنے والا آدمی نہ تھا۔ اُس کے پاس غور و فکر کے لئے وقت بھی نہ تھا۔ اس کے اوقات دعوتوں، اسپ سواریوں ملاقاتوں اور سیر تماشوں میں لطف سے گذر رہے تھے۔ وہ اپنا شام کا وقت اپنی محبوب لولو کے ساتھ بسر کرتا۔ باقی اوقات میں اُسے کبھی وکیل کے پاس کوئی قانونی مشورہ لینے جانا پڑتا۔ کبھی کسی قرضدار سے قرض کی وصولی کا بندوبست کرنا پڑتا۔ اس کے علاوہ اسے مکان اور شادی کے بعد ہنی مون منانے کا انتظام بھی کرنا تھا۔ اسے گھنٹہ آدھ گھنٹہ مطالعہ کے لئے بھی وقت نہ ملتا تھا۔ قہوہ خانے کے سامنے پندرہ منٹ چہل قدمی کرنا اس کا معمول تھا۔ آج کل وہ بھی ترک ہو گیا تھا۔ اس لئے وہ کبھی کسی گہرے خیال میں غرق نہیں دیکھا گیا۔ نہ وہ کبھی کسی معاشرتی مسئلہ میں سر کھپاتے پایا گیا۔ روبرٹ میں جوشِ انجام یا حزنیہ ڈرامے کے ہیرو بننے کا بھی کوئی جذبہ نہ تھا۔ وہ نہایت ہی سکون پسند انسان تھا۔ اور کچھ لوگ تو اُس کی اِس فطرت کے باعث اس پر رشک بھی کیا کرتے تھے۔

لیکن آج روبرٹ خلافِ معمول دن کو سہ پہر کے وقت آرام کرسی پر لیٹا ٹانگ پر ٹانگ دھرے کتاب ہاتھ میں لئے مطالعے کی کوشش کر رہا تھا۔ کتاب کافی دلچسپ تھی۔ لیکن پھر بھی اس کا دل کسی اور خیال میں اُلجھا ہوا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس کے چہرے سے فکر و تردّد کے آثار بھی نمایاں تھے۔ وہ ایک صفحہ بھی پُورا نہ پڑھ سکا۔ دو ہی چار سطروں کے مطالعے کے بعد اُسے ایسا معلوم ہوا گویا چھپے ہوئے حروف کاغذ پر رقص کر رہے ہیں۔ روبرٹ تو غیر ارادی طور پر خیالات کی وادیوں میں سرگرداں پھرنے لگا۔

"پاپا مطمئن ہیں۔ چچی اور پھوپھیوں نے دعائیں بھیجی ہیں۔ اور چچازاد بہنیں ناخوش ہیں۔ قہوہ خانے میں میرے احباب ازراہِ طنز مبارکباد دیتے ہیں اور میرے مخلص دوست افسوس کرتے ہیں۔ ان قرائن سے ظاہر ہوتا ہے کہ میں شادی کرنے میں کوئی غلطی نہیں کر رہا ہوں۔ یہ تو کہا نہیں جا سکتا کہ لولو حسین نہیں ہے۔ جب وہ اپنی شوخ آنکھیں اُوپر

اُٹھا کر مجھے دیکھتی ہے۔ اور ہنستے وقت اُس کے ہونٹوں کی لڑی جیسے دانت نظر آتے ہیں تو دل چاہتا ہے کہ دونوں ہاتھوں سے اس کے حسین و ملیح چہرے کو پکڑ کر اُس پر بوسوں کی بھرمار کر دوں۔ وہ طبیعت کی شریف اور اخلاق کے اعتبار سے کھرا سونا ہے۔ ہمیشہ خوش اور بشاش رہتی ہے۔ اور ہر وقت مذاق کرتی رہتی ہے۔ اس کے ساتھ شوخ و طرّار اور حاضر جواب بھی ہے۔ کبھی اداس نہیں رہتی۔ ہم دونوں میں نبھے گی خوب۔ مجھے لٹکا ہوا لمبا چہرہ ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ خصوصاً اس کا جس سے مجھے محبت ہو۔ میرا تو پختہ خیال ہے کہ جس شخص کے چہرے پر افسردگی طاری رہتی ہے اُس کے دل میں ضرور کسی نہ کسی طرح کا غم پوشیدہ ہوتا ہے۔ میری ہونے والی سالی صوفیہ میں نہ جانے ایسی کیا بات ہے کہ اس کے افسردہ چہرے کو دیکھتے ہی مجھے ایک وحشت سی ہونے لگتی ہے اور وہ جیسے ہی میرے سامنے آتی ہے میرا دل کام کی طرف سے اُچاٹ ہو جاتا ہے۔ اور ساری مسرت زائل ہو جاتی ہے۔ اس وقت خواہ کتنی ہی سہانی دھوپ نکلی ہو مجھے ایسی الجھن ہونے لگتی ہے گویا برسات کی گہری گھٹا چھائی ہو۔ مجھ میں لولو سے ہنسی مذاق تک کرنے کا جذبہ باقی نہیں رہتا۔ میری ساری خوشی کافور ہو جاتی ہے۔ وہ میری طرف دیکھے بغیر باتیں کرتی ہے۔ مجھ سے ہاتھ تک نہیں ملاتی۔ مختصر سے مختصر لفظوں میں جواب دیتی ہے۔ شاید صوفیہ نے بھی اس بات کو محسوس کر لیا ہے۔ کہ میں اس سے نفرت کرتا ہوں اور شاید یہی وجہ ہے کہ وہ مجھ سے الگ الگ رہتی ہے۔"

"لولو ہمیشہ ہنستی رہتی ہے۔ وہ ہے بھی تو بالکل بچی۔ کبھی اُس نے کبھی سنجیدہ صُورت بنا کر مجھ سے بات نہیں کی۔ اگر کبھی سنجیدہ بن کر بات کرنے کی کوشش بھی کرتی ہے تو معلوم ہوتا ہے مذاق کر رہی ہے۔ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے مگر دیوانہ وار نہیں۔ اور واقعہ تو یہ ہے کہ میں بھی اس سے دیوانہ وار محبت نہیں کرتا۔ اور یہی بہتر بھی ہے میں ازدواجی معاملے میں دو باتوں کو لازمی ضروری خیال کرتا ہوں۔ اوّل یہ کہ میاں بیوی کو ہم مزاج اور ہم مذاق ہونا چاہئے۔ دوئم یہ کہ ان کو اپنی ازدواجی زندگی کا آغاز حد سے زیادہ محبت کے ساتھ نہیں کرنا چاہئے ہماری حالت ان اصولوں کے بالکل مطابق ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ میری اور لولو کی بیاہی زندگی ہر طرح خوش گوار اور کامیاب ہوگی۔ شادی کے بعد ہم دونوں اطالیہ بھر کی سیر کریں گے۔ کہیں [illegible]

سے کام نہ لیں گے۔ چھوٹے چھوٹے سفر کریں گے۔ جہاں دل چاہے گا ٹھہر جائیں گے اور اطمینان سے ہر چیز دیکھیں گے۔ اسی طرح تین مہینے گذر یں گے نہیں تین مہینے کافی نہ ہوں گے۔ بلکہ چار مہینے۔ صوفیہ کی افسردہ صحبت سے لولو کا کچھ دنوں علحدہ رہنا ہی بہتر ہے۔"

"لیکن بہرحال یہ بات قابل غور ہے کہ کیا اس عمر کی دوشیزہ کے لیئے ایسی متانت و سنجیدگی مناسب ہے۔ زیادہ سے زیادہ اُس کی عمر تیس سال کی ہوگی اُس کا حُسن وجمال بھی معمولی نہیں ہے وہ حسین ہے اور بے انتہا حسین۔ بڑی بڑی سحر آگیں آنکھیں۔ چلتی ہے تو کبکِ دری کی طرح۔ اگر اُس میں کوئی عیب ہے تو یہی کہ وہ اپنی صُورت کو ہر وقت افسردہ اور مضمحل بنائے رہتی ہے۔ ورنہ وہ مرد بے حد خوش نصیب ہوتا جسے صوفیہ جیسی رفیقۂ حیات ملتی۔ میں دعوے کے ساتھ کہتا ہوں کہ وہ کنواری ہی بوڑھی ہو جائے گی۔ اور شاید اسی اندیشے سے وہ اس قدر افسردہ اور مضمحل رہتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اُس کی اِس افسردگی کے پردے میں کوئی غم ناک داستانِ محبت پوشیدہ ہو۔ بہرحال اس کی افسردگی کا راز معلوم کرنا ضروری ہے۔ لولو سے تنہائی میں اس کے متعلق دریافت کرنا چاہیے۔"

"میں اُس دن شام کو لولو کے ہاں گیا تو اس نے مجھے بتایا تھا۔ اسے چاکلیٹ بہت پسند ہے۔ وہ اسے کتر کتر کر کھاتی ہے سب کھا چکنے کے بعد وہ کس طرح مُنہ بنا کر کہتی ہے کہ ہائے سارے چاکلیٹ ختم ہو گئے۔ لولو کتنی حسین اور دلفریب ہے۔ ایک روز اُس نے میرے کان میں آہستہ سے کہا کہ جب بادل گرجتے ہیں تو وہ ڈر جاتی ہے اور تکیے میں منہ چھپا کر پڑ رہتی ہے۔ وہ اکثر خواب دیکھتی ہے کہ وہ لمبا سیاہ گاؤن پہنے ہے جس کا دامن بیگموں کے لمبے دامن کی طرح زمین پر گھسٹتا جاتا ہے۔ اس کے گلے اور آستین میں سفید لیس کا کالر اور کف ہے۔ اُس نے مجھے یہ بھی بتایا تھا۔ کہ وہ کسی قسم کی نقاہت برداشت نہیں کر سکتی۔ وہ ایک سنہرے دستے کی ایک چھوٹی سی کٹار خرید کر اپنے پاس رکھے گی۔ تاکہ اپنے دشمن سے بدلہ لے سکے۔ وہ اس قسم کی بے سروپا باتیں کرتے وقت کتنی پیاری معلوم ہوتی ہے۔ اور بچوں کی طرح اپنے تمام خیالات پر زبردست یقین رکھتی ہے۔ کبھی کبھی تو اس کی باتوں پر صوفیہ بھی مُسکرا پڑتی ہے۔ اور اُس وقت اُس کا مضمحل چہرہ مثلِ آفتاب ہے۔ صوفیہ بھی ایک عجیب پُراسرار دوشیزہ ہے۔

اس کا سمجھنا کس قدر مشکل ہے۔"

خیالات کے استغراق میں کتاب روبرٹو کے سینے سے کھسک کر نیچے گر پڑی جس کی آواز سُن کر وہ چونک پڑا۔ اور اِس طرح اِدھر اُدھر دیکھنے لگا گویا وہ اپنے آپ کو دیکھ کر حیران ہو رہا ہے۔ اِسے اپنے آپ پر تعجب ہو رہا تھا کہ اسے آج کیا ہو گیا ہے کہ وہ خیالات کے ہجوم میں اس طرح کھو گیا ہے۔

(۳)

شام کا جھٹپٹا فضا پر چھایا ہوا تھا۔ صوفیہ ایک کھڑکی کے پاس جو چھجے کی جانب کھلتی تھی کھڑی ہجوم اور شور و غل سے معمور سڑک کو دیکھ رہی تھی۔ صوفیہ کی نگاہوں سے ایسا ظاہر ہو رہا تھا گویا وہ آدمیوں کے اس ہجوم میں کسی کو تلاش کر رہی ہے۔ یکایک اُس کا چہرہ شگفتہ ہو گیا۔ لیکن پھر دفعتاً اُس نے اپنا سر جھکا لیا۔ اور اُس کے چہرے کی شگفتگی پژمردگی سے تبدیل ہو گئی۔ وہ کمرے میں واپس چلی آئی۔ اس کے ایک منٹ بعد دروازے کو زور سے کھول کرسیوں کو اِدھر اُدھر کرتی طوفان کی طرح لولو کمرے میں داخل ہوئی۔

"محترمہ مس صوفیہ ساناتاجلو! پھر مطالعہ کر رہی ہیں کیا؟"

"ہاں مطالعہ ہی کر رہی تھی۔"

"تم نے باہر چھجے پر کھڑے ہونے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی!"

"کیا ضرورت تھی؟"

"اچھا نہیں ضرورت نہ ہو لیکن مجھے تو ہے۔ اس لیئے کہ آج شام کے پہننے کے لئے آبیتا درزن میرا نیا گاؤن لانے والی تھی۔ اس کے انتظار میں میرا دم گھٹا جا رہا تھا۔ میں کب کی تیار ہو کر یہاں آ جانا چاہتی تھی۔ کیونکہ میں نے کل شام روبرٹو سے کہا تھا کہ وہ آج اپنا مخمور اوور کوٹ پہن کر اور سلیم کو گاڑی میں جوت کر ساڑھے چھ بجے ادھر سے گذرے۔ معلوم نہیں میرے کہنے کے مطابق وہ اس طرف آیا تھا یا نہیں۔"

"روبرٹو ادھر سے گیا تو ہے مخمور اوور کوٹ پہنے اپنی ٹم ٹم میں بیٹھا تھا۔"

"کیا واقعی؟ تمہیں کیسے معلوم ہوا۔ تم تو یہاں بیٹھی کتاب دیکھ رہی تھیں؟"

"میں کھڑکی کے پاس کھڑی تھی۔"

"خوب! تو تم نے روبرتو کو پہچان لیا۔ تم تو کبھی اُس کی طرف نگاہ بھر کر دیکھتیں بھی نہیں۔ وہ جھک کر آداب تو بجا لایا ہوگا؟"

"ہاں۔"

"اُس نے اپنی ٹوپی بھی اُٹھائی تھی؟"

"ہاں، کیوں وہ تو ہمیشہ ٹوپی اُٹھاتا ہے۔"

"تم نے جھک کر جواب دیا تھا؟"

"کیا تمہارا خیال ہے کہ میں تہذیب و اخلاق کے قاعدے سے بے بہرہ ہوں؟"

"تو کم سے کم تم اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرائی تو ضرور ہو گی؟"

"نہیں مجھے یاد نہیں۔"

"صوفیہ! روبرتو کل شام کو مجھ سے کہہ رہا تھا کہ تم اچھی عورت نہیں ہو۔"

"اس طرح کہہ رہا تھا؟"

"نہیں وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ تم اس قدر الگ الگ کیوں رہتی ہو؟ اور تمہاری طبیعت میری طبیعت سے اس قدر مختلف کیوں ہے۔ میں نے جواب میں تمہاری تعریف کے پُل باندھ دیئے۔ میں نے اُسے بتایا کہ تم مجھ سے کہیں زیادہ ملنسار اور خوش اخلاق ہو۔ مجھ سے زیادہ محبت کرنے والی ہو۔ اگر تم میں کوئی عیب ہے تو یہی کہ اپنی ان خوبیوں کو ظاہر نہیں ہونے دیتیں۔ وہ میری بات کو بغور سُن رہا تھا۔ آخر میں اُس نے مجھ سے دریافت کیا کہ تم اُس سے نفرت کیوں کرتی ہو؟"

"نفرت!"

"ہاں وہ تو یہی کہہ رہا تھا اور تم خود سمجھتی ہو کہ اُس کا کہنا غلط نہیں ہے تم تو اس سے سیدھے منہ بات تک نہیں کرتیں۔ لیکن میں نے تمہاری وکالت کرتے ہوئے اس کی تردید کر دی اور کہہ دیا کہ تم اُسے نہایت پسند کرتی ہو۔ اور اس کے متعلق تمہارا خیال......"

"لولو!"

"میں جانتی ہوں کہ میں نے جو کچھ کہا سرتاسر بے اصل تھا پھر بھی میں اتنا ضرور کہوں گی کہ روبرتو تمہیں اس قدر پسند کرتا ہے۔ کہ اس کے ساتھ تمہارا اجنبیوں کا سا برتاؤ سراسر خلافِ اخلاق ہے۔"

صوفیہ نے اپنی چھوٹی بہن کے گلے میں بانہیں ڈال کر اُس کا مُنہ چوم لیا۔

"لولو کچھ دیر تک خاموش رہ کر محبت بھری آواز میں بولی" تم اپنی محبت کا کچھ حصّہ روبرتو کو کیوں نہیں دے ڈالتیں؟"

صوفیہ نے کچھ جواب نہیں دیا۔ چونک کر اُس کی گردن سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

لولو نے گفتگو کا پہلو بدلتے ہوئے کہا "اچھا تو خیر اس بات کو چھوڑ دو۔ یہ بتاؤ کہ کیا واقعی تم شام کو ہم لوگوں کے ساتھ نہیں چل رہی ہو۔"

"نہیں میرے سر میں درد ہے۔ تم امی کے ساتھ چلی جانا۔"

"پھر وہی بات۔ میں تو ضرور ہی جاؤں گی کیونکہ مجھے تو زندگی کا لُطف اُٹھانا ہے۔"

"روبرتو بھی تمہارے ساتھ جائے گا؟"

"نہیں ڈائرکٹروں کی میٹنگ ہے اس لئے وہ اپنے کلب میں جائے گا۔ میں اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ویلینز کے رقص خانے میں چلی جاؤں گی۔ اور رات بھر ناچتی رہوں گی۔"

"اگر روبرتو کو پتہ چل گیا تو؟"

"یہ تو اور بھی اچھا ہوگا۔ اس طرح اس پر میری آزادہ روی ظاہر ہو جائے گی۔ مجھے یہ گوارا نہیں کہ وہ مجھ پر پابندیاں عائد کرے اور میری آزادی میں مخل ہو۔"

"میرا تو خیال ہے تمہیں اُس سے دلی محبت نہیں ہے۔"

"ہے کیوں نہیں۔ ذرا اپنے خاص ڈھنگ سے ہے۔ اچھا اب میں چل کر کپڑے بدل ڈالوں، کم سے کم دو گھنٹے اس میں بھی صرف ہوں گے۔"

(۴)

صوفیہ کھڑی ماں اور بہن کی گاڑی کے پہیوں کی گھڑگھڑاہٹ سُنتی رہی۔ وہ بالکل تنہا رہ گئی تھی۔ اور وہ تنہائی ہی کو پسند کرتی تھی۔ بچپن میں جب کوئی اُسے ڈانٹتا یا مارتا تو وہ بھاگ کر بستر کے اندر گھس جاتی اور تنہا پڑی رویا کرتی۔ اُس کی وہ عادت اب تک باقی تھی۔ اِس وقت بھی وہ اپنے طویل و عریض ڈرائنگ روم میں موم بتی سے روشن شمع دان کے پاس گدے دار کرسی پر سر ٹیکے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی تھی۔ چہرے پر عمیق حزن و ملال چھایا ہوا تھا۔ جو اس بات کا پتہ دے رہا تھا کہ اس کے دل میں جذبات کا طوفان برپا ہے[illegible]

کہ تنہائی میں اُس کے قلبی تاثرات پوری شدت اختیار کر چکے تھے۔

وہ پیروں کی آہٹ سُن کر چونک پڑی۔ یہ روبر تو کے پاؤں کی آہٹ تھی۔ وہ صوفیہ کو تنہا دیکھ کر ایک بار آگے بڑھنے سے جھجکا لیکن پھر یہ سمجھ کر کہ گھر کے اور لوگ کسی دوسرے کمرے میں موجود ہوں گے، اس نے پھر آگے قدم بڑھایا۔ صوفیہ گھبرا کر کھڑی ہوگئی۔

"شام بخیر صوفیہ!"

"شام بخیر۔"

دونوں بُت کی طرح خاموش کھڑے تھے۔ روبر تو دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔ کہ کیسی بد اخلاق لڑکی ہے۔ اتنی دیر میں صوفیہ نے سنبھل کر اپنی عادت کے مطابق متین صورت بنالی۔ اور دونوں ایک دوسرے سے کسی قدر ہٹ کر بیٹھ گئے۔

"تمہاری امّاں جان تو بخیر ہیں؟"

"جی ہاں بخیریت ہیں آپ کا شکریہ!"

"اور لولو؟"

"وہ بھی اچھی ہے۔"

پھر سکوت طاری ہوگیا۔ روبر تو رنج اور خوشی کی ایک ملی جلی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔

"کیا لولو کسی کام میں مصروف ہے؟"

صوفیہ نے اپنے اضطراب کو دباتے ہوئے کہا "وہ ماں کے ساتھ دیہاتوں کے رقص خانے میں گئی ہے۔" اُس نے اس طرح جلدی سے جواب دیا۔ گویا وہ سوالوں کا اندازہ کر کے ایک بار ہی تمام باتوں کے جواب سے فارغ ہونا چاہتی ہے۔

چونکہ صوفیہ اکیلی تھی۔ اور روبر تو خود کو بدتمیز کہلانا پسند نہیں کرتا تھا۔ اس لئے اسے اپنا وہاں ٹھہرنا اور بات چیت کرنا نامناسب معلوم ہوا۔ یہ خیال آتے ہی وہ وہاں سے نکل بھاگنے کے منصوبے سوچنے لگا پھر بھی اس سے اُٹھا نہ گیا۔

"میں اس لئے چلا آیا کہ کلب کے ممبر کافی تعداد میں نہیں آئے تھے۔" اُس نے یہ بات اس طرح کہی گویا اپنے آنے کی صفائی پیش کر رہا ہو۔

"مجھے افسوس ہے کہ بہتر یہ تھا کہ لولو کو تنہا نہ آنے کا [illegible]

"اس کا کچھ مضائقہ نہیں۔" روبر تو قطع کلام کر کے بولا۔

ایک دوشیزہ کی غیر موجودگی میں روبر تو کا ایسا جواب کسی طرح موزوں نہیں تھا۔

روبر تو نے پھر کہا۔ "اور تم نہیں گئیں؟"

"نہیں۔ مجھے رقص و سرود سے دلچسپی نہیں ہے۔"

"کیا تمہیں مطالعہ زیادہ پسند ہے؟"

"ہاں بہت زیادہ۔"

"تو تمہیں کثرتِ مطالعہ سے نقصان کا خطرہ محسوس نہیں ہوتا؟"

"نہیں میری نگاہ بہت اچھی ہے۔" صوفیہ نے آنکھیں اوپر اٹھا کر روبر تو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

روبر تو کو اس کی آنکھیں نہایت حسین معلوم ہوئیں۔ اس نے سوچا کاش یہ آنکھیں ہر وقت اُداس رہنے کی بجائے مسرور رہا کرتیں۔

روبر تو بولا۔ "میرا مطلب بینائی کے نقصان سے نہیں، قلبی اور دماغی نقصان سے تھا۔"

"اس طرح کے نقصان کا بھی اندیشہ نہیں۔ میں جن کتابوں کا مطالعہ کرتی ہوں وہ میرے لئے بہت ہی سکون بخش ثابت ہوتی ہیں۔"

"کیا تمہیں بھی حصولِ سکون کی ضرورت محسوس ہوتی ہے؟"

"کون ایسا انسان ہے جسے سکون و اطمینان کی ضرورت نہیں۔"

صوفیہ کی آواز متین اور ترنم آمیز تھی۔ اس لئے روبر تو کو اس کی گفتگو سے ایک کیف حاصل ہو رہا تھا۔ وہ ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے وہ ایک ایسی عورت کے پاس بیٹھا ہے جس سے وہ قبل ازیں بالکل ناآشنا تھا اور اب جس کے ایک ایک انداز اور ایک ایک ادا کی خوبیاں اس پر منکشف ہوتی جا رہی ہیں۔

صوفیہ کی خشک مزاجی بھی بکلفت زائل ہو چکی تھی۔ اب وہ روبر تو کی طرف دیکھتی بھی تھی مسکراتی بھی تھی اور دوستانہ لب و لہجے میں باتیں کر رہی تھی۔

ان دونوں کی پہلی حالت میں ایک انقلاب آگیا تھا۔

روبر تو بولا "تعجب ہے میں کوئی اچھی کتاب دیکھتا ہوں تو مجھے یہ معلوم کرنے کی بڑی شدید خواہش ہوتی ہے کہ خود کتاب کے مصنف یا مصنفہ پر کیا گزری ہے۔ کیا اس نے بھی کسی سے محبت کی ہے

کیا اس کو بھی محبت کے مصائب سے دوچار ہونا پڑا ہے؟"

صوفیہ نے کہا "کچھ دنوں بعد تمہارے اس خیال کی اصلاح ہو جائے گی اور تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ افسانہ نگار خواہ وہ مرد ہوں یا عورتیں اپنی داستانِ محبت کبھی سپردِ قلم نہیں کرتے۔ وہ ہمیشہ دوسروں ہی کی عشقیہ داستانیں لکھا کرتے ہیں"

"وہ خود داری کے خیال سے اپنی سرگزشت منظرِ عام پر لانا پسند نہیں کرتے"

"میرا خیال ہے کہ وہ رشک و رقابت کے جذبات سے اثر پذیر ہو کر اپنے خیالات سننے سے گریز کرتے ہیں۔ بہت سے ایسے دل بھی ہیں جن کے لئے دنیا کی گراں بہا اور عزیز ترین شے محبت ہے"

آخری الفاظ کے ادا کرتے ہوئے بھی صوفیہ کے لب و لہجے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اس کے چہرے کا بھی وہی سیدھا سادہ انداز قائم رہا۔ اس کی آواز اور اس کے لہجے میں اتنی سادگی، پاکیزگی اور خلوص و اعتماد تھا کہ اس کے مسئلہ محبت پر اس صحت و یقین کے ساتھ گفتگو کرنے پر روبرٹو کو مطلق تعجب نہیں ہوا۔ اسے صوفیہ کی تمام باتیں تصنع سے پاک اور بالکل فطری معلوم ہو رہی تھیں۔ روبرٹو کی اس روز کی شام جو صوفیہ کے ساتھ گذر رہی تھی اُسے ایسی معلوم ہو رہی تھی گویا وہ اس کا مدتوں سے منتظر تھا۔ اور جو گویا روزِ ازل ہی سے اس کی قسمت میں لکھی جا چکی تھی۔

جب وہ ایک دوسرے سے جدا ہونے لگے تو دیر تک ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے رہے گویا وہ ایک دوسرے کو اس طرح پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے کہ دوبارہ ملاقات ہونے پر ایک دوسرے کے پہچاننے میں دقت نہ ہو۔ صوفیہ نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا جسے روبرٹو نے اپنے ہاتھوں میں لے کر ازراہِ احترام اس پر جھک گیا۔ ساتھ ہی دروازے کے بھاری پردے نے درمیان میں آ کر دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا۔

(۵)

صوفیہ کی ہم نشینی اور بات چیت کا گہرا اثر روبرٹو کے دل سے کچھ کم نہ ہوا تو وہ بہت گھبرایا۔ اس کا دماغ ٹھیک کام نہیں کر رہا تھا۔ وہ کبھی انبساط و مسرت محسوس کرتا اور کبھی رنج و الم۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ، اپنے اور لولو کے متعلق کیا فیصلہ کرے۔

صوفیہ بے حد خوش تھی۔ اور اسی لئے وہ تکیے میں منہ چھپائے سسک سسک کر خوشی کے آنسو بہا رہی تھی۔

تین مہینے گزر گئے اور لولو کی شادی برابر ٹلتی چلی گئی۔ ماں اس تاخیر کا مطلب سمجھنے سے قاصر تھی وہ بار بار لولو کو علیحدہ بلا کر اس سے وجہ دریافت کرتی۔

لولو جواب دیتی "میں ابھی روبرٹو کو کچھ زیادہ سمجھنا چاہتی ہوں"

واقعی اب لولو بہت سنجیدہ اور دور اندیش ہو گئی تھی۔ وہ اب بھی ناچتی گاتی اور ہنسی مذاق کرتی مگر درمیان درمیان میں وہ روبرٹو اور صوفیہ کا مطالعہ کرنے اور صوفیہ کو سمجھنے کی بھی کوشش کرتی رہتی صوفیہ بھی اپنی دونوں بھنویں ملائے اور ہونٹ دبائے بڑے غور سے لولو کی بات سنتی۔

لولو کے غور و فکر اور مطالعہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسے صوفیہ اور روبرٹو میں روز افزوں تغیرات نظر آنے لگے۔

روبرٹو میں پہلے کی سی بے تکلفی اور شوخی و شگفتگی باقی نہیں رہی۔ اب وہ ہر وقت مضطرب اور بے چین نظر آتا تھا۔ اور اس کے چہرے پر زردی اور افسردگی سی چھائی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ اب بولتا بھی بہت کم تھا اور جب باتیں کرتا تو معلوم ہوتا کہ وہ کہیں اور ہے۔ اور اس کا دل کہیں اور۔ اسے پہلے جن چیزوں سے دلچسپی تھی۔ انہیں چیزوں سے اب وہ نفرت کرنے لگا تھا۔ وہ کبھی کبھی پہلے کی طرح خوش رہنے کی کوشش کرتا اور کامیاب بھی ہو جاتا لیکن یہ حالت محض عارضی ہوتی۔

روبرٹو تصنع اور تکلف سے واقف نہ تھا اس لئے وہ اپنی اندرونی حالت کو چھپانے کی کوشش کرتا تو وہ اور بھی عریاں ہو جاتی۔ اُس کا قلبی اضطرار و اضطراب اُس کی آنکھوں سے ٹپکا پڑتا تھا۔

صوفیہ میں بھی زبردست تبدیلی ہو گئی تھی۔ اب جس کا پہلا سکون و اطمینان یک لخت معدوم ہو گیا تھا۔ وہ ہر وقت مضطرب اور پریشان رہتی تھی۔ وہ کبھی وفورِ محبت میں چھوٹی بہن کو گلے سے لگا لیتی۔ کبھی اس سے الگ کمرے میں تنہا بیٹھی رہتی۔ اس کی آنکھوں سے ہر وقت چنگاریاں نکلتی رہتی تھیں۔ اس کے رخساروں پر اس طرح سرخی آتی اور جاتی رہتی تھی جس طرح ہوا کی رو کے ساتھ بادل آتے اور

چھٹتے رہتے ہیں۔ اس کا بدن بھی گرم رہتا تھا اور سانس بھی۔ ہجوم
جذبات سے کبھی اس کی آواز بھاری ہو جاتی کبھی سخت اور کرخت
کبھی نرم اور دھیمی۔ اس کے ہاتھ کانپا کرتے۔ رات کو نیند نہ آتی تھی۔
لولو اکثر رات کو ننگے پاؤں اس کے کمرے کے دروازے پر جا کر
آہٹ لیتی۔ صوفیہ تمام رات کروٹیں بدلتی اور سسکتی رہتی۔ لولو
وجہ دریافت کرتی تو صوفیہ جواب دیتی "نہیں، کوئی بات نہیں ہے"

۶

اب روبرتو اور صوفیہ میں روزانہ ملاقات ہونے لگی تھی۔ وہ آپس
میں ملتے تو اپنی تبدیل شدہ حالت کو اور بھی شدت سے محسوس کرتے۔ ان
میں باتیں بہت کم ہوتیں۔ وہ ایک دوسرے کی بات کا سرسری جواب
ہی دیتے۔ دونوں ایک دوسرے کو ایک عجیب انداز سے دیکھتے،
کبھی کبھی وہ ملاقات کے پورے وقت کو خاموشی ہی میں گزار دیتے۔
لیکن روبرتو کبھی نہ کسی حیلے سے اس کے ہاتھ کی مس کی ہوئی کتاب یا
اس کے کاڑھنے کی کوئی چیز اٹھا لیتا۔ جب کبھی صوفیہ کمرے میں نہ
آتی تو وہ اور بھی بےچینی کے ساتھ بار بار بند دروازے کی طرف دیکھتا۔
کبھی اس سے کچھ پوچھا جاتا تو بڑی بےدلی سے کوئی بےسروپا جواب
دے دیتا۔ کبھی صوفیہ کے آنے کے چند ہی منٹ بعد ٹوپ اٹھا کر جانے
لگتا۔

صوفیہ روز بروز زرد ہوتی جا رہی تھی۔ اور اس کی آنکھوں
کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ بالآخر اس نے یہ طے کر لیا کہ اب وہ
باہر نکلنا چھوڑ دے گی۔ چنانچہ وہ ایک ہفتے تک نہایت درد و کرب
اور اندوہ و غم کی حالت میں اپنے کمرے ہی کے اندر پڑی رہی۔

"اسی حالت میں ایک روز لولو اس کے کمرے میں جا کر کہنے
لگی۔ صوفیہ میرا ایک کام کر دو گی؟"

"کون سا کام ہے کہو؟"

"مجھے ایک مختصر سا خط لکھنا ہے۔ روبرتو چھت پر تنہا بیٹھا ہے
تم تھوڑی دیر تک اس کے پاس بیٹھ کر اس سے بات چیت کرو۔"

"لیکن میں ......"

"تو کیا تمہیں یہاں بند پڑے رہنا اچھا لگتا ہے کہ تم میرا اتنا معمولی
سا کہنا بھی نہیں کر سکتیں؟"

"تو جلدی آ جاؤ گی نا؟"

"اور کیا، مجھے محض چند ہی سطریں تو لکھنی ہیں۔"

صوفیہ اس نازک حالت کا مقابلہ کرنے کے لئے چھت کی
طرف چلی۔ روبرتو چھت پر چہل قدمی کر رہا تھا۔ صوفیہ ایک بار تو دروازے
پر پہنچ کر ٹھٹھکی پھر ہمت کر کے اس کے قریب چلی گئی۔

"مجھے لولو نے بھیجا ہے۔" صوفیہ دھیمی آواز میں بولی۔

"تم مجبوراً یہاں آئی ہو؟"

"مجبوراً ..... نہیں تو ......"

روبرتو اس کے پاس ہی کھڑا تھا۔ ہجوم جذبات سے صوفیہ
کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔

"تمہارا یہ کیا حال ہے صوفیہ؟"

"کچھ نہیں۔ لیکن تم میری طرف اس طرح نہ دیکھو۔" وہ سہمی ہوئی
سی بولی۔

"تمہیں بخوبی معلوم ہے صوفیہ کہ میں تم سے کس قدر محبت کرتا ہوں"

"روبرتو۔ مجھ پر مہربانی کرو۔ اس طرح نہ کہو۔ لولو نے سن لیا تو
کیا ہوگا؟"

"صوفیہ! مجھے لولو سے محبت نہیں ہے۔ تم سے محبت ہے۔"

"یہ لولو کے ساتھ بےوفائی ہے۔"

"میں جانتا ہوں لیکن میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ میں چلا
جاؤں گا ......"

لولو دوسرے دروازے پر کھڑی تھی۔ اس نے وہیں سے پکارا
"کیوں جی! تم دونوں میں صلح ہو گئی یا نہیں؟"

کسی نے کچھ جواب نہیں دیا۔ صوفیہ دونوں ہاتھوں سے منہ
چھپا کر بھاگ گئی اور روبرتو اس طرح بت بنا بےحس و حرکت کھڑا
رہا۔ گویا اسے بجلی چھو گئی ہو۔

لولو چلائی "روبرتو!"

"لولو!" روبرتو اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔

لولو پھر چلائی "یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

"کچھ نہیں میں جا رہا ہوں۔"

روبرتو لولو سے رخصت ہوئے بغیر چلا گیا۔ لولو اس کی جانب
دیکھتی اپنے خیال میں گم وہیں کھڑی رہی۔ وہ سوچ رہی تھی۔ ایک کی
وہ حالت اور دوسرے کی یہ۔ معاملہ طول پکڑ رہا ہے۔ اب مجھے کچھ

کرنا چاہئے۔

(۷)

لولو نے اِن تمام باتوں کو ماں سے بیان کرکے کہا "اب میں روبرتو سے شادی نہیں کرسکتی"۔

"تو نے بھی شادی نہ کرنے کا کیا سبب گھڑا ہے" ماں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"تو کیا میں سچی بات کہہ دوں کہ روبرتو مجھے خوش نہیں کرسکتا، اس لئے میں اُس سے شادی نہیں کرسکتی؟"

"تو نے اپنے دل کی بات ضرور کہہ دی لیکن یہ محض تیرا وہم ہے روبرتو کو تجھ سے دلی محبت ہے"۔

"جو کچھ بھی ہو وہ اپنے دل کو سمجھالے گا"۔

"تم نے تو ایک دوسرے کو زبان بھی دے دی ہے"۔

"تو اس سے کیا ہوتا ہے؟ زبان جس طرح دی جاسکتی ہے۔ اسی طرح واپس بھی لی جاسکتی ہے۔ وہ زمانہ تو اب ہے نہیں جب جبری شادیاں ہوا کرتی تھیں"۔

"دنیا کیا کہے گی؟"

"دنیا کے کیا معنی امّی؟"

"لوگ کیا کہیں گے؟"

"یہ لوگ کون ہوتے ہیں؟ میں انہیں نہیں جانتی میں لوگوں کی خوشی کے لئے اپنی زندگی تباہ کرنے پر مجبور نہیں ہوں"۔

"تو عجیب لڑکی ہے میں بھلا روبرتو کو کیا جواب دُوں گی؟"

"تم جو جی چاہے جواب دینا۔ آخر تم ماں کس لئے ہو؟"

"واہ کیا خوب تم خود رائیاں کرتی پھرو، اور اس کا خمیازہ بھگتوں میں، پھر تمام دنیا میں جو بدنامی و رسوائی ہوگی۔ اس کا کیا علاج ہوگا؟"

"اس میں رسوائی اور بدنامی کی کوئی بات نہیں ہے تم اسے نرمی کے ساتھ سمجھا سکتی ہو اور ڈھنگ کے ساتھ میری برائی بھی کرسکتی ہو تم کہہ دینا کہ لولو بڑی ضدی، خیر مستقل مزاج اور چھچھوری لڑکی ہے۔ وہ بات بات میں بچپنے سے کام لیتی ہے۔ وہ اچھی بیوی نہیں بن سکتی۔ یہ بھی کہنا کہ اس میں نہ متانت ہے نہ سنجیدگی، نہ حمیّت نہ خود داری، اور لولو کی بڑی بہن ۔ ۔ ۔ ۔"

"تیری بڑی بہن! دیوانی ہوگئی ہے کیا لولو؟"

"اونہہ! اتنا کہنے میں کیا حرج ہے ابھی تو روبرتو اور صوفیہ ایک دوسرے سے بے اعتنائی برتتے ہیں۔ لیکن ایک دوسرے سے بخوبی واقف ہونے کے بعد باہمی عیب و ہنر کو پسند کرنے لگیں گے اس میں تمہاری بھی نیک نامی ہے لوگ کہیں گے۔ بڑی لڑکی کی شادی پہلے کردی کتنی اچھی ماں ہے"۔

"اصل بات یہ ہے لولو ۔ ۔ ۔ ۔"

"بات کیا ہے؟ میں کنواری ہی تھوڑی رہ جاؤں گی۔ ابھی صرف اٹھارہ سال کی تو میری عمر ہے پھر میں ابھی آزاد رہ کر نوجوانی کا لطف بھی تو اٹھانا چاہتی ہوں۔ میری خواہش ہے کہ اپنے لڑکپن کے ایام اپنی شریف اور سلیقہ مند ماں کے ساتھ گزار دوں"۔

"تو بڑی شریر ہے" ماں نے پیار سے بیٹی کو آغوش میں کھینچ کر کہا۔

"اچھا تو تم ساری باتیں سمجھ گئیں نا؟ اب جاکر روبرتو کو ان باتوں کی اطلاع دے دو۔ ذرا سمجھا کر کہنا کہ ہم دونوں ہمیشہ ایک دوسرے کے دوست رہیں گے، اور ہم میں اکثر ملاقات ہوتی رہے گی اگر ان دونوں کے دلوں میں باہمی محبت کے جذبات پیدا ہوگئے تو دونوں خوشی خوشی باہمی محبت کے رشتے میں منسلک ہوجائیں گے"۔

"کیا تجھے یقین ہے کہ تمام معاملات بآسانی طے ہوجائیں گے؟ تو جانتی ہے کہ مجھے کشمکش اور نزاع پسند نہیں"۔

"ہاں تم بھی عجیب تنک مزاج ہو۔ میں پورے یقین سے کہتی ہوں کہ کسی طرح کی کوئی بے عزتی اور بدنامی نہ ہوگی۔ روبرتو ایک شریف آدمی ہے۔ وہ اسے گوارا نہیں کرے گا کہ میں اپنی پسند کے خلاف اس سے شادی کرنے پر مجبور کی جاؤں"۔

"یہ صوفیہ والی بات تو مجھے ناممکن معلوم ہوتی ہے"۔

"ناممکن سے زیادہ ممکن کوئی چیز نہیں ہوا کرتی ماں" لولو نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"اچھا اب تو اپنی فقرے بازی رہنے دے کافی باتیں ہوچکیں اب ہمیں تمام معاملات کو وقت کے سپرد کردینا چاہئے، وقت خود ہی تمام معاملات کو درست کردے گا۔ لیکن میں جانتی ہوں کہ تو کبھی

درست نہ ہوگی تو ہمیشہ نٹ کھٹ ہی رہے گی"۔

"ہاں ۔ضدی اور شریر چھوکری"۔

"ہاں ہاں ہیں پھر کہتی ہوں تو نہایت نافہم اور متلوّن مزاج چھوکری ہے"۔

"بلکہ پاگل اور سڑی بھی، جو جی میں آئے کہہ لو۔ میں سب کچھ ہوں کچھ اور کہنا چاہتی ہو تو وہ بھی کہہ ڈالو۔ میں انتظار کر رہی ہوں"۔

"اچھا میری پیاری لولو جیسی تمہاری مرضی۔ جاؤ اب جا کے سو رہو"۔

"شب بخیر۔ امّی"۔

ماں نے سوچا۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا۔ لولو ابھی بہت کمسن۔ کمسنی کی شادیوں کے بُرے نتائج روز ہی پیش آتے رہتے ہیں۔ خدا نے اس سے بچا لیا بہت اچھا ہوا۔

لولو ایک لمبی سانس لے کر دل ہی دل میں کہنے لگی "اُف امّی کو رضامند کرنے کے لئے کیا کیا چالیں چلنی پڑیں اور کیسی کیسی باتوں سے کام لینا پڑا۔ اگر مجھ کو شاہی سفارت کے کام پر مقرر کیا جائے تو اُسے کیسی خوبی سے انجام دے سکتی ہوں۔ کیسی زبردست فتح ہوئی ہے یہ محبت کی فتح نہیں بلکہ میری فتح ہے"۔

وہ اپنی بہن کے کمرے کے دروازے کے باہر جا کھڑی ہوئی اندر سے رہ رہ کر دبی ہوئی آہوں کی آواز آرہی تھی۔ غریب صوفیہ کو سکون و قرار نہ تھا۔ لولو نے اس طرح دروازے کو چوما گویا بہن کی پیشانی کا بوسہ لے رہی ہو۔ پھر اُس نے آہستہ سے کہا۔ صوفیہ اب تم آرام و اطمینان کی نیند سوؤ۔ میں نے آج تمہارے آلام و مصائب کا خاتمہ کر دیا"۔

اس کے بعد وہ فراخ دل اور ایثار پسند لڑکی اپنے کمرے میں آئی اور اپنی بہن کے مستقبل کی طرف سے مطمئن ہو کر خود بھی میٹھی نیند سوگئی۔

(۸)

صوفیہ اور روبرتو کی شادی کا مبارک اور مسرت انگیز وقت آگیا۔ لولو کبھی سوچتی کہ اسے بہن کی شادی کے موقع پر سالی کی حیثیت سے کس رنگ کا گاؤن زیب تن کرنا چاہئے۔ نیلا، ریشمی یا بادامی رنگ کا لیس کے کام کا۔ کبھی بعض تو سے کہتی کہ شادی کے وقت اسے چاکلیٹ کا بڑا سا ڈھیر ملنا چاہئے۔ اور صوفیہ سے اس کا وہ رومال مانگتی جس پر اس کے ہاتھ کی کڑھی ہوئی بادلوں کی تصویریں تھیں، روبرتو اور صوفیہ کو معلوم ہو چکا تھا کہ لولو کتنی ایثار پسند اور بلند حوصلہ لڑکی ہے۔ اس لئے وہ اس کی محبت اور امنگ بھری باتوں کو سُن سُن کر مسکرا دیتے تھے۔ اس طرح ان تینوں کا باہمی رشتۂ محبت مستحکم سے مستحکم تر ہوتا چلا جا رہا تھا۔

روبرتو نے اپنی شادی کے متعلق ایک دوست سے باتیں کرتے ہوئے کہا "میرا تو ہمیشہ سے یہ خیال رہا ہے کہ بیوی اور شوہر کو مختلف مزاج اور مختلف مذاق کا ہونا چاہئے۔ اسی صورت میں دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ اور ایک دوسرے میں جذب ہو سکتے ہیں۔ ایک ہی مزاج اور مذاق کے دو انسان اگرچہ دو متوازی خطوط کی طرح ہوتے ہیں۔ جو ساتھ ساتھ چلتے ہیں مگر آپس میں کبھی ملتے نہیں!"

اطالوی ادیبہ ماٹیلڈے سیراؤ

ابُومحمدؐ امام الدّین

مترازی

اشعار

مری فغاں ہی سے رونق ہے میری ہستی کی
صدا جرس کی ضروری ہے کارواں کے لئے
خلش نے دل کو مرے کچھ مزا دیا ایسا
کہ جمع کرتا ہوں میں خار آشیاں کے لئے

محروم

آمد

شوخ نکہت! سچ کہو کیوں مسکراتی آئی ہو؟
کس سے کی ہیں شوخیاں کس کو ستاتی آئی ہو؟

چٹکیاں لے کر نسیمِ صبح کی آئی ہو تم،
یا شمیمِ نازنیں کو گدگداتی آئی ہو؟

کر کے ہر اک پھول سے اظہارِ اُلفت کا مذاق
طائرانِ صحنِ گلشن کو جلاتی آئی ہو۔

چوم کر آئی ہو کتنی شرمگیں کلیوں کا منہ؟
کتنے غنچوں کو شرارت سے ہنساتی آئی ہو؟

پھول کے گھر کا غلط رستہ بتا کر کس لئے
پھول کے مشتاق بھنوروں کو ستاتی آئی ہو؟

چومتی ہیں بلبلیں آکر تمہارے نقشِ پا،
ہر روش، ہر رہگذر پر پھول اُگاتی آئی ہو۔

سچ کہو ان سرمگیں آنکھوں سے دیکھا ہے کسے!
سچ کہو کس کس کو دیوانہ بناتی آئی ہو؟

منہ کو دھو کر آئی ہو کیا آبِ رودِ نور سے؟
صبح کا تارا بنی ہو، جگمگاتی آئی ہو!

اِس طرح آئی ہو جیسے صبح کی ٹھنڈی ہوا،
ریشمیں ملبوس میں تم سرسراتی آئی ہو

مہدی علی خاں

تلاش

بچے اکثر ضدی ہوا کرتے ہیں اور ننھا قدرت کے اس قانون سے مستثنٰے نہیں تھا، وہ اپنے باپ کی تنہا یادگار، اپنی ماں کی زندگی کا سہارا اور اپنے بوڑھے دادا کی آنکھوں کا تارا تھا، جب وہ باتیں کرتا تو اپنی عمر سے کئی گنا بڑا معلوم ہوتا، یہی وجہ تھی کہ میں اُسے ننھا فلسفی کہہ کر پکارا کرتا، اس نام کو سن کر اس کی ماں کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگتیں، پھر تھوڑی دیر کے لئے وہ اپنے نوجوان شوہر کا غم بھول جاتی اور اپنے لختِ جگر کو بے اختیار گلے سے چمٹا لیتی۔

ننھے کے باپ کو مرے ہوئے دو سال ہو گئے تھے مگر اُس کے دماغ میں اپنے باپ کے متعلق تمام باتیں اس طرح سمائی تھیں جیسے ابھی کل ہی کا واقعہ ہے، ننھے کا باپ میرا سب سے چھوٹا اور آخری لڑکا تھا، میرے سب بچے ایک کے بعد ایک میری آنکھوں سے اوجھل ہو چکے تھے مگر ننھے کے باپ کی موت سے مجھے جتنا رنج ہوا اتنا رنج شاید اپنے سب سے بڑے لڑکے کی موت پر بھی نہیں ہوا تھا، میں اپنے بیٹے کا غم کبھی کا بھول چکا ہوتا، مگر ننھے کے عجیب و غریب سوالات ہمیشہ میرے مندمل ہوتے ہوئے زخموں کو نئے سرے سے ہرا کر دیتے اور میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑتے۔

اُس کی ماں تو دن میں کئی کئی بار اپنے شوہر کے لئے آنسو بہاتی، میں نے ننھے کو کئی بار اس کے باپ کے متعلق سوالات کرنے سے روکا اور بوقتِ ضرورت جھڑکا بھی مگر معلوم ہوتا تھا کہ اُسے اپنی ماں اور دادا کو رلانے میں ایک خاص لطف محسوس ہوتا تھا اور یوں بھی چھوٹے بچے ضدی ہوا کرتے ہیں اور اکثر وہی بات کرتے ہیں جس کے کرنے سے انہیں روکا جاتا ہے،

ننھا بے حد نڈر واقع ہوا تھا اور اگر وہ کسی سے ڈرتا تو صرف اللہ میاں کے نام سے، نہیں معلوم اس کی ماں نے اس کے ننھے سے دماغ میں اللہ میاں کے متعلق کس قسم کا تخیل قائم کر دیا تھا کہ نام سنتے ہی وہ ڈر کر گویا تعظیماً چپ ہو جاتا۔

ہمارا گاؤں شہر سے کوئی بیس بائیس میل کے فاصلے پر دریا کے کنارے واقع ہے، ننھے کا باپ شہر میں ایک بڑے آفس میں کلرک تھا، شہر کی ہنگامہ خیز اور گرد آلود فضا اُس کے لئے زیادہ دنوں تک موافق ثابت نہ ہو سکی، اور اُسے کلرکی کے خشک اور دماغ سوز کام سے بہت جلد چھٹکارا مل گیا، وہ میرے نقشِ قدم پر چل رہا تھا، اپنے باپ کے نقشِ قدم پر جو متواتر اٹھائیس سال تک میز پر بیٹھے بیٹھے قلم، دوات اور کاغذوں کے درمیان اپنی زندگی کے بہترین لمحے گذارتا رہا۔

ننھے کو کھلونوں سے بہت شوق تھا، اس کا باپ جب کسی چھٹی کے سلسلے میں ایک دو روز کے لئے شہر سے گاؤں کو آتا تو طرح طرح کے کھلونے اور مٹھائیاں اپنے ہمراہ ضرور لاتا، ننھا ان کھلونوں کو دیکھ کر دیوانہ ہو جاتا اور مارے خوشی کے ناچنے لگتا مگر وہ ان کھلونوں سے بہت جلد اکتا جاتا اور پھر دوسری چھٹی کا بڑی بے چینی سے انتظار کرنے لگتا، اس طرح گھر میں کھلونوں کا ایک انبار لگ گیا تھا مگر وہ ان پرانے کھلونوں کی طرف کبھی نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھتا،

موت کے بے رحم لفظ سے وہ ابھی بالکل ناآشنا تھا، اپنے باپ کے مرنے کے بعد جب وہ متواتر کئی دنوں تک اُسے نہ دیکھ سکا تو بے چین ہو کر مجھ سے سوالات کرنے لگا،

"ابا اب کیوں نہیں آتے؟"

"اس مرتبہ وہ کھلونے لانے کے لئے دُور ـــ بادل کے اُس پار گئے ہیں"

میں افق پر اڑتے ہوئے بادلوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیتا،

"تو پھر وہ کب آئیں گے؟" وہ بھولے پن سے پوچھتا۔

"جب انہیں اچھے اچھے کھلونے مل جائیں گے" میں اُس کے معصوم چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے جواب دیتا،

"کھلونے کب ملیں گے؟" وہ پھر بے تکلفی سے پوچھتا

"جب اللہ میاں کا حکم ہوگا" میں آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیتا، اور وہ چپ ہو جاتا

ہم لوگ روزانہ شام کو دریا کے کنارے سیر کے لئے جایا کرتے یہاں میری طبیعت کو قدرے سکون ملتا، دور افق پر جنگلوں سے ڈھکے ہوئے اُودے اُودے پہاڑوں پر جب سورج غروب ہونے لگتا اور شفق کی لالی دریا کی خاموش سطح پر پڑتی تو معلوم ہوتا جیسے کائنات کا ذرّہ ذرّہ گلال سے ہولی کھیل رہا ہے، شہر کے عیاش اور بے فکر نوجوانوں کا گروہ کشتیوں میں بیٹھ کر قہقہے لگاتا اور خوش فعلیاں کرتا مستانہ وار ہمارے سامنے سے گذر جاتا، سُرخ، سبز، زرد اور شوخ رنگ کی ساڑیوں میں لپٹی ہوئی دوشیزاؤں کی کشتیاں سورج کی نرم روشنی میں تیتری کی طرح سطح آب پر تیرتی، لہراتی اور بل کھاتی ہوئی دور دریا پر جھکی ہوئی [illegible]بوں میں گم ہو جاتیں، ننھے کا دل ایسے منظر سے تڑپ اُٹھتا اور اُس کا فلسفیانہ دماغ نہایت سرعت سے کام کرنے لگتا، پھر وہ اپنی ننھی سی پیشانی پر بل ڈال کر کچھ سوچنے لگتا اور جب اُسے کوئی بات سمجھ میں نہ آتی تو وہ سوالات کرنے شروع کر دیتا۔

"دادا یہ پہاڑ ہمیشہ وہیں کھڑے رہیں گے؟"

"ہاں بیٹا" میں آہستہ سے جواب دیتا

"پھر یہ سورج کیوں ادھر سے اُدھر جاتا ہے دادا؟" وہ وکیلوں کی طرح جرح کرتا۔

"سورج جب تھک جاتا ہے تو شام کو آرام کرنے کے لئے اپنے گھر چلا جاتا ہے" میں اُسے خاموش کرنے کی غرض سے کہتا۔

"اس کا گھر کہاں ہے دادا؟" وہ بے تکلفی سے پوچھتا۔

"وہاں! دور پہاڑوں کے اُس پار، بادلوں میں" میں ہاتھ اُٹھا کر افق کی طرف اشارہ کرتا۔

"یہ لوگ بھی اپنے گھروں کو جا رہے ہیں دادا؟ پہاڑ کے اُس پار بادلوں میں؟" وہ گذرتی ہوئی کشتیوں کی طرف اشارہ کرکے پوچھتا،

"نہیں ننھے ان کا گھر اُدھر نہیں، یہ سب شہر میں رہتے ہیں۔" میں شہر کی طرف اشارہ کرکے جواب دیتا، شہر کا نام سُن کر وہ چوکنا ہو جاتا۔

"شہر میں! وہاں تو کھلونے بڑے اچھے اچھے ہوتے ہیں۔ میرے ابا گئے ہیں" وہ پُر اُمید نگاہوں سے میری طرف دیکھ کر کہتا۔

"تمہارے ابا شہر میں نہیں گئے ہیں ننھے، وہ وہاں ہیں، اُس طرف پہاڑوں کے اُس پار، بادلوں میں" میں نمناک آنکھوں کو دوسری طرف پھیرتے ہوئے جواب دیتا،

"ان کا گھر سورج کے گھر کے پاس ہے دادا؟" وہ خوشی سے ناچنے لگتا،

"ہاں" میں مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیتا۔

"تو پھر وہ سورج کے ساتھ یہاں کیوں نہیں آتے؟" وہ حسرتناک لہجے میں پوچھتا۔

"وہ ابھی نہیں آئیں گے ننھے" میں اُسے تسلی دیتے ہوئے جواب دیتا۔

"پھر وہ کب آئیں گے؟ میں انہیں لینے جاؤں گا" وہ مچل کر پوچھتا،

"نہیں ننھے تم وہاں نہیں جا سکتے" میں مایوسانہ لہجے میں جواب دیتا۔

"کیوں نہیں؟" وہ غصے سے پوچھتا۔

"اللہ میاں کا حکم" میں آہستہ سے کہتا اور وہ چپ ہو کر اپنے فلسفے کی گتھیاں سلجھانے میں محو ہو جاتا،

چھٹی کے دنوں میں اس جگہ کی چہل پہل میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا شکاریوں کی بندوقیں دن بھر آس پاس کی جھاڑیوں میں دندناتیں پکنک والوں کی دلگداز تانوں، ہارمونیم کی سریلی آوازوں اور گراموفون کے ریکارڈوں کے سامعہ نواز نغموں سے فضا کی رنگینی میں اور بھی اضافہ ہو جاتا اور دیکھنے والوں کو اس پر پریوں کی بستی کا دھوکا ہوتا۔

ایک روز صبح ہی سے بندوقیں چل رہی تھیں، شام کو جب ہم لوگ دریا پر پہنچے تو ایک عجیب واقعہ پیش آیا، ننھا لمبی لمبی گھاس میں ایک تیتری کے پیچھے دوڑتا ہوا چلا جا رہا تھا، یکایک گھاس میں کوئی چیز پھڑ پھڑائی اس کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی، میں دوڑتا ہوا اس کے پاس پہنچا۔ ننھا خوف سے کانپ رہا تھا اور اس کی آنکھیں سامنے گھاس پر جمی ہوئی تھیں، ایک سفید پرندہ گھاس میں اِدھر اُدھر دبکنے کی کوشش کر رہا تھا،

میں نے آگے بڑھ کر فوراً اُسے پکڑ لیا۔ وہ ایک بگلے کا بچہ تھا اور اُس کے بازو پر خون کے قطرے جمے ہوئے تھے، غریب پرندہ شکاریوں کا نشانہ بن گیا تھا، میں نے احتیاط سے اس کے زخم کو دیکھا: زخم کاری نہیں تھا میں نے اُسے دھو کر اُس پر پٹی لپیٹ دی،

اس دوران میں ننھے کا خوف دور ہو چکا تھا اور جب اس نے بگلے کو میرے ہاتھوں میں خاموش بیٹھے ہوئے دیکھا تو خوشی سے تالیاں بجانے لگا۔

ایک ہفتے کے بعد اس کا زخم اچھا ہو گیا، اور بگلا آہستہ آہستہ ہم لوگوں سے ہل مل گیا، کبھی کبھی اُسے کھلا ہی چھوڑ دیا جاتا اور وہ مکان میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگتا، اُس کا بازو ابھی پرواز کے قابل نہیں ہوا تھا،

ایک روز ننھا دریا کی سیر کے لئے اُسے بھی اپنے ساتھ لے آیا، کُھلی ہوئی فضا، لہلہاتا ہوا سبزہ اور بہتے ہوئے شفاف پانی کو دیکھ کر بگلا بے چین سا ہو گیا، میں نے اُسے ننھے کے ہاتھوں سے لے کر ہوا میں اُچھالا، وہ قلانچیں بھرتا ہوا اِدھر اُدھر اڑنے لگا، تھوڑی دیر تک اڑتے رہنے کے بعد وہ دوبارہ ہمارے پاس آ کر بیٹھ گیا، مجھے اس کی اس حرکت پر بہت تعجب ہوا،

"ننھے اب یہ تمہارے پاس سے جانا نہیں چاہتا" میں نے ننھے سے کہا۔ اس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں، اور وہ بگلے کو پکڑ کر بے اختیار اُس کی گول گول چمکیلی آنکھوں کو چومنے لگا۔

ایک روز شام کو پھر بندوقیں چھوٹنے لگیں، ننھا خوف کے مارے اپنے ننھے ساتھی کو بغل میں دبائے خاموش بیٹھا تھا، اُس کی آنکھوں میں خوف اور غصے کی آمیزش تھی، وہ بار بار جھاڑیوں کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتا تھا، جب بندوق کی آواز ذرا کم ہوئی تو وہ مجھ سے پوچھنے لگا،

"دادا یہ پرندوں کو کیوں مارتے ہیں؟"

"دل بہلانے کے لئے!"

"دل کیسے بہلتا ہے دادا؟"

"جس طرح تم اس بگلے کے ساتھ کھیل کر خوش ہوتے ہو"

ننھا چپ ہو گیا، وہ دیر تک خاموش رہا، اُس کی خاموشی کو دور کرنے کے لئے میں نے بگلے کو مخاطب کر کے کہنا شروع کیا۔

"سنو میاں بگلے تم کبھی اُس طرف نہ جانا نہیں تو شکاری تمہاری جان لئے بغیر نہیں رہیں گے"

ننھے کا رنگ فق ہو گیا، پھر وہ سنبھل کر بولا،

"دادا اس کے ماں باپ اسے لینے کے لئے کیوں نہیں آتے؟ وہ تو اس کو شکاریوں سے ضرور بچائیں گے"

"وہ اب نہیں آئیں گے ننھے، وہ پہاڑوں کے اُس پار بادلوں میں اسے تلاش کرنے گئے ہیں" میں نے مایوسانہ لہجے میں کہا، وہ چونک پڑا۔

"پہاڑوں کے اُس پار بادلوں میں جہاں میرے ابا ہیں دادا؟" اُس نے بے چینی سے پوچھا۔

"ہاں ننھے"

"وہ بھی اس کے لئے کھلونے لائیں گے دادا؟" اُس نے اسی بے چینی سے سوال کیا۔

"ہاں ننھے"

"میں بگلے کے ساتھ وہاں جاؤں دادا! ہم اپنے ابا کو ڈھونڈھ لائیں گے" اس نے ملتجی نگاہوں سے پوچھا۔

"نہیں ننھے۔ تم وہاں نہیں جا سکتے"

"کیوں؟"

"اللہ میاں کا حکم!"

ننھا چپ ہو گیا اور بگلے کی طرف دیکھنے لگا، بگلے نے اپنی لمبی چونچ کو پانی میں ڈبو کر باہر نکالا اور ایک تڑپتی ہوئی مچھلی کو ہوا میں اچھال کر ہڑپ کر گیا، اُس نے اِس عمل کو دو تین بار دہرایا، ننھا اس منظر سے بے حد خوش ہوا اور خوشی کے مارے ناچنے لگا۔

"ننھے جس طرح تم مچھلی کو تڑپتا ہوا دیکھ کر خوش ہوتے ہو اسی طرح شکاری بگلے کو مار کر خوش ہوتے ہیں" میں نے ہنس کر کہا، اور ننھا گہری سوچ میں پڑ گیا،

شکاری بگلا..... بگلا مچھلی.....
ازلی مثلث کے وواضلاع
ننھے کا دماغ اس فلسفے کو سمجھنے سے قاصر تھا۔

ایک روز معمول کے مطابق ہم لوگ دریا کے نظارے سے لطف اندوز ہو رہے تھے، بگلا مچھلیوں کی تلاش میں کہیں دور نکل گیا، جب وہ دیر تک واپس نہ آیا تو ننھے کو کچھ تشویش ہوئی، اور وہ بار بار مجھ سے سوال کرنے لگا۔ یکایک جھاڑیوں میں سے بندوق کے چلنے کی آواز آئی،

ننھا خوف سے کانپنے لگا، اور اُس کی آنکھیں غم آلود ہوگئیں، ہم لوگ بہت دیر تک بگلے کا انتظار کرتے رہے مگر اُسے نہ آنا تھا نہ آیا، اندھیرا کافی ہو چکا تھا اس لئے ہم لوگ مکان پر لوٹ آئے، ننھا اُس روز بہت بے چین رہا،

"دادا بگلا کہاں چلا گیا؟"

"اُپنے ابا کو ڈھونڈنے"۔

"پہاڑوں کے اُس پار بادلوں میں؟"

"ہاں"

"مگر تم نے تو منع کیا تھا دادا؟"

"ہاں"

"پھر وہ کیوں گیا؟"

"وہ ضدی تھا، میرا کہنا اُس نے نہیں مانا"

"اللہ میاں نے اُسے حکم دیا تھا؟"

"ہاں"

"اللہ میاں مجھے کب حکم دیں گے دادا؟"

"وہ ابھی حکم نہیں دیں گے، مگر تم تو ضدی نہیں ہو ننھے؟ تم وہاں ہرگز نہ جانا"

"نہیں جاؤں گا دادا"

پھر وہ اپنے خیالات میں گم ہو گیا۔

ایک روز صبح ہی سے آسمان پر کالے کالے بادل گھر آئے، تمام فضا ایک خوفناک گھٹا میں گھری ہوئی تھی، اس روز میں نے سیر کا ارادہ ترک کر دیا، مگر شام ہوتے ہی ننھا میرے سر ہو گیا، میں نے بہت سمجھایا، بارش اور بجلی کا خوف دلایا مگر وہ نہ مانا، آخر وہ ضدی جو ٹھہرا، اُسے اپنے ننھے ساتھی کی واپسی پر اب بھی یقین تھا، آخر بادلِ ناخواستہ اُسے لے کر میں دریا کی طرف چل دیا، ابھی ہم لوگ زیادہ دیر بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ بارش نے جل تھل ایک کر دیئے راستہ نظر آنا مشکل ہو گیا، ہوا خوفناک بھوتوں کی طرح چیخیں مار رہی تھی، بجلی کی کڑک اور بادل کی گرج کانوں کے پردے پھاڑ رہی تھی، میں ننھے کو چمٹائے چھتری سنبھالے بے تحاشا بھاگا جا رہا تھا مگر طوفان خیز ہوا کے سامنے میری ایک نہ چلی، گھر پہنچتے پہنچتے ہم لوگ پانی میں تربتر ہو گئے اور ننھا سردی کی وجہ سے بری طرح کانپ رہا تھا۔

گھر پہنچتے ہی اُس کی ماں نے کپڑے تبدیل کئے اور گرم دودھ پلا کر اُسے بستر پر لٹا دیا اور لحاف سے اُس کے جسم کو نہایت احتیاط سے ڈھانپ دیا۔

اگر ماں کی احتیاط، اُس کی گڑگڑاہٹ اور اُس کے آنسو بچے کو موت کے بے رحم ہاتھوں سے بچانے میں کامیاب ہو سکتے تو نوعِ انسان کے لئے خیر و شر کا مسئلہ اور بھی پیچیدہ بن جاتا۔

ننھے کی ماں بھی اپنی دلخراش آہوں، فلک شگاف نالوں، بے شمار دعاؤں اور ان گنت التجاؤں کے باوجود ننھے کو موت کے پنجوں سے نہ چھڑا سکی، اور ننھا اپنی ذکاوت، معصومیت اور فلسفے سمیت اس دنیا سے چل بسا۔

شکاری، بگلا..... بگلا مچھلی..... موت، شکاری،

تیسرے ضلعے نے قدرت کی ازلی مثلث کو مکمل کر دیا تھا۔

اب جب کبھی میں دریا کے کنارے بیٹھا ہوا اُودے اودے پہاڑوں پر منڈلاتے ہوئے بادلوں کی طرف دیکھتا ہوں تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ننھا پہاڑوں کے اُس پار دور کہیں بادلوں میں اپنے ابا کو تلاش کر رہا ہے، اپنے کھلونوں کے لئے۔

میں نے اُسے بہت سمجھایا۔ مگر اُس نے نہ مانا، وہ اپنے ابا کی تلاش میں آخر چلا ہی گیا۔

بچے اکثر ضدی ہی ہوا کرتے ہیں اور ننھا قدرت کے اس قانون سے مستثنیٰ نہیں تھا۔

کچھ بھی ہو اس نے جانے میں جلدی کی!

محمد فاروقی

شعر

خدایا کسی روز جب میں پئے ہوں
مرا ہاتھ ہو اور دامن کسی کا

سعید احمد اعجاز

غزل

اور کچھ تیرے تصور کے سوا کام نہیں
میں سمجھتا ہوں کہ اب عشق مرا خام نہیں

یوں ہوس کار زمانے میں بہت ہیں لیکن
اصل میں عشق جسے کہتے ہیں وہ عام نہیں

تجھ کو دیکھا نہ تھا جب تک یہ مرا حال نہ تھا
عشق پیغام ہے تیرا، مرا پیغام نہیں

سجدہ کیا چیز ہے کیا شے ہے دعاؤں کا اثر!
مری تخئیل میں گنجائش اوہام نہیں

تو ہی چاہے تو بدل دے مری ہستی کا نظام
ورنہ اس صبحِ محبت کی کوئی شام نہیں

اب مجھے آٹھ پہر رہتا ہے تیرا ہی خیال
تجھ سے کچھ کام نہیں تجھ سے تو کچھ کام نہیں!

میری نظروں میں تری بزمِ وفا ہے اے دوست!
مجھ کو زنہار غمِ گردشِ ایام نہیں

کونسی رات ستاروں میں نہیں ذکر ترا!
کون سے دن مرے ہونٹوں پہ ترا نام نہیں؟

اختر اس چیز کو کہتے ہیں مقدر کا لکھا
اُن کے پہلو میں بھی حاصل مجھے آرام نہیں

اختر ہوشیارپوری

ساگر کی شام

نین ترے دو ناؤ ہیں،
اور پانی کا بہاؤ ہیں کالے بال گھٹاؤں سے!
میرے لچک والے دِل کے
جذبے، جو ہیں ہواؤں سے، بکھرے ذرّے ساحل کے!
روپ ترا لہروں جیسا ان ذرّوں کے نقش مٹائے،
پریم چمکتے موتی سا ایسے اور چمکتا جائے!
میری ہستی؟ — جان لیا، جیسے بلبلہ دھارے کا،
تیرا گھر؟ — پہچان لیا، جیسے پیڑ کنارے کا
نین ترے دو ناؤ ہیں،
پلکیں جن کے چپّو ہیں،
دل میں گہرے گھاؤ ہیں،
تارے — موتی، آنسو ہیں!
میرے لچک والے دل کے جذبے جو ہیں ہواؤں سے،
ان سے اُلجھے جاتے ہیں کالے بال گھٹاؤں سے!
بات نہیں بنتی کوئی دُکھیا دل کی دُعاؤں سے،
جذبے جو ہیں ہواؤں سے، میرے لچک والے دل کے،
بے کس، بے بس قیدی ہیں تیری حیا کے محمل کے!
کاش! اُٹھا کر پردے کو،
اوٹ سے جھانک کے دیکھے مُجھے!
پیار کرے مجبور تجھے!
روک نہ پائے جذبے کو!
تُو محمل سے اُتر آئے!
رات کی بازی ہر جائے،

میراجی

غزل

ہے ناممکن کہ پیدا ہو نہ ذوقِ آگہی مجھ میں ۔۔۔ خدا کو ساتھ اپنے لے کے آئی ہے خودی مجھ میں

نتیجہ ہے اُسی کا، یہ غمِ افسردگی مجھ میں ۔۔۔ سمٹ آئی تھی اک دنیائے کیف و کم کبھی مجھ میں

نہ ڈھونڈیں غنچہ ہائے نوشگفتہ تازگی مجھ میں ۔۔۔ خزاں آلود باقی رہ گئی ہے دلکشی مجھ میں

تمہارے آستاں کو میرے سجدوں نے سنوارا ہے ۔۔۔ بقیدِ ناز پیدا ہے نیازِ بندگی مجھ میں

غلط راہی منزل کا میں ذمّہ دار کیوں ہوتا؟ ۔۔۔ ترے نقشِ قدم نے کی ہے پیدا خودروی مجھ میں

یہ فیضِ عشق اب جو میری رگ رگ سے ہویدا ہے ۔۔۔ یہ تجلی کیوں نہ قبلِ عشق ہی بھردی گئی مجھ میں؟

خدارا پھر ودیعت کر وہ غم جو لے لیا مجھ سے ۔۔۔ کہ اب محسوس ہوتی ہے کسی شے کی کمی مجھ میں

بہاؤں رہنما کے پاؤں پر کیوں خونِ خودداری!! ۔۔۔ ابھی تو موجزن ہے ہمّتِ منزل رسی مجھ میں

فروزاں خود بخود ہونے لگے ہستی کے سب ذرّے ۔۔۔ ترے جلووں نے بھردی کس قدر تابندگی مجھ میں!

وہ سارے عیش مجھ سے چھین لیں، سوزِ الم دے دیں ۔۔۔ نہ ہو پیدا کہیں احساسِ خامِ زندگی مجھ میں

انہیں بالواسطہ عادت ہے اظہارِ تجلّی کی ۔۔۔ نہیں بے مصلحت خوئے مجازِ عاشقی مجھ میں

نہ ہنستا ہوں، نہ روتا ہوں، شکائت ہے نہ شکوہ ہے ۔۔۔ سمٹ کر رہ گیا ہے اک سکوتِ زندگی مجھ میں

دیا ہے درس روح و دل کو جلنے اور بجھنے کا ۔۔۔ تری نظروں نے پیدا کرکے سوزِ عاشقی مجھ میں

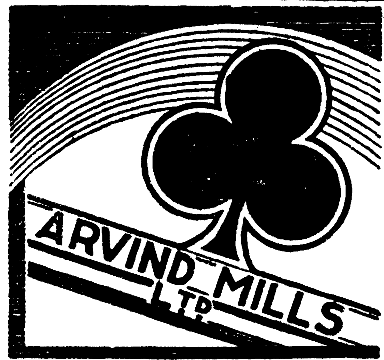
کہو موسیٰ سے قندیلِ سرِ ایمن بجھا دالیں ۔۔۔ چراغِ طور سے بھی تیز تر ہے روشنی مجھ میں

زمانہ ساز ہوں، روتا بھی ہوں، ہنستا بھی ہوں لیکن ۔۔۔ نہ ہے احساسِ غم مجھ میں، نہ احساسِ خوشی مجھ میں

خدایا بخش میری روح کو گلشن کی شادابی! ۔۔۔ ہے پھولوں سے زیادہ رنگ و بُو کی تشنگی مجھ میں

میں اے اعجاز اب ہستی کی مستی پر ترستا ہوں
کبھی انگڑائیاں لیتی تھی موجِ زندگی مجھ میں۔

اعجاز صدّیقی



स्टाइल और चमक के लिये
अरविंदका शर्टींग इस्तमाल कीजिये.

ایجنٹس

ورما برادرز اینڈ کمپنی

مرچنٹس

محلہ

موہلیاں۔ سوتر منڈی

لاہور

زندگی کی بولتی چالتی تصویروں کا رنگین مرقع

نظارے

از

کرشن چندر ایم۔ اے

کرشن چندر ایم۔ اے نے بہت جلد ملک کے چوٹی کے افسانہ نگاروں میں اپنے لئے ممتاز جگہ پیدا کر لی ہے۔ ان کے بیشتر افسانے ادبی دنیا میں شائع ہو کر خراج تحسین وصول کر چکے ہیں۔ یہ مجموعہ ان کے

تیرہ تازہ ترین افسانوں پر مشتمل ہے

کرشن چندر کا جادو نگار قلم رومانی دنیا کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ ان صحیح قلبی کیفیات کے نقوش کو بھی قلم بند کرتا ہے جو تمدن کے سٹیج پر معاشرتی تفریق و امتیاز کے باوجود بھی ہر انسان محسوس کرتا ہے۔ ان نقوش کی تہ میں انسانی زندگی کے مختلف پہلو جھلکتے ہیں۔ ان پہلوؤں میں بسا اوقات

حسن و عشق کی رنگین دنیا

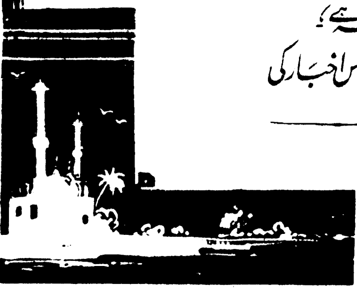
کے نظاروں کے علاوہ شکستہ قلب انسانی کی سسکیاں اور آنسوؤں کے وہ ابلتے چشمے بھی نظر آتے ہیں جو دنیا میں سرمایہ داروں کے مرہون منت ہیں۔ غرضیکہ بیسویں صدی کے انسان کے مکمل مطالعہ کے لئے اس نوجوان ادیب کے ان افسانوں کا مطالعہ اشد ضروری ہے۔

کاغذ دبیز۔ حجم تقریباً ۲۵۰ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ۔ محصول ڈاک علاوہ

کتب خانہ "ادبی دنیا" دی مال لاہور

سے طلب کیجئے





پہلگام

دنیا بھر کے جمیل منظر ہو سکتے نہیں یہاں کے ہمسر
وہ چاندنی شب کا جلوہ پاک جو اور اب جو ہیں سب منور
اے وادیٔ پہلگام تُو نے فطرت کو بھی کر لیا مسخر
شبنم کے گوہرِ درخشاں گویا آغوشِ گل میں نادر
تصویرِ جمال تیری تصویر تو یرِ نگاہ تیرے منظر
ہر قطرۂ آب "اخترِ صبح" ہر قطرے میں آب و تابِ گوہر
تو جلوہ گہہِ جمالِ یزداں تو جلوہ گہہِ کمالِ داور
ہر موج میں موجِ نور رقصاں ہر موج مہِ تمام در بر

نغمے ترے اور تری خموشی
ہر چشمہ ہے چشمۂ مصفا
دونوں ہیں بلا کے وجد آور
ہر نہر ہے رشکِ جوئے کوثر

کہسار خموش اور فلک بوس سبزہ پُر کیف و رُوح پرور
زیرِ تہہِ آب سنگریزے بکھرے ہوئے آبدار گوہر
پاکیزہ سکوت کوہساراں جیسے رہ جائے دل ٹھٹھک کر
کرنیں موجوں میں ہو کے تحلیل پیدا کرتی ہیں نُقرہ و زر
اور کوہ کے دامنِ حسیں میں ہنگامہ طراز رودِ "لدّر"
پانی بےتاب مثلِ سیماب رقصاں ہے نشے میں ضبط کھو کر
ندی ہے کہ آہوئے رمیدہ ہر لمحہ ہے بےقرار و مضطر
جس طرح فراق میں دُلہن کے تڑپے کوئی نوجوان شوہر

یا کیفِ شراب میں ہے بدمست
کہسار، درخت، سبزہ، پانی
کوئی رقاصۂ سمن بر
ہر ایک کی روح ہے مسخر

یہ ندی قیامت آفریں ہے اُٹھتا ہے قدم قدم پہ محشر
یہ سبزہ یہ گُل یہ چاندنی رات یہ رنگ یہ بُو یہ رقصِ "لدّر"
سبزہ کہ ہے زینتِ کنارہ مثلِ بلّور ہے منوّر
پُر کیف ہوائے شام کی موج بُوئے مئے کُہنہ کی ہے ہمسر
اس کا اندازِ دل رُبائی مستی پرور، نشاط آور
نیرنگیٔ حُسن سے ہے احساس خود مستی کا بےکراں سمندر
اشجار کے سائے میں بچھائے فطرت نے زمرّدیں مشجّر
رنگِ گل سے نگاہ مسرور بوئے گل سے فضا معطّر

ذرّہ ذرّہ نگاہ افروز
حُسنِ فطرت کا ہونا مدہوش
چپّہ چپّہ نگاہ پرور
فطرت کو آج آیا باور

عبدالعزیز فطرت

دنیائے ادب

تازہ ترین رسائل کے اہم مضامین

(اس مضمون کو رسائل پر کسی قسم کی تنقید نہیں سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ اس میں فقط چند خاص اور اچھے مضامین نظم و نثر کا ذکر ہوتا ہے۔ معمولی درجے کے مضامین کا مطلقاً تذکرہ نہیں کیا جاتا) (رسائل کا ذکر حروف تہجی کے اعتبار سے ہے)

ساقی۔ نومبر ۱۹۳۹ء

حیوان ناطق۔ جناب حقی دہلوی نے اس دلکش افسانے میں انسان کی حیوانیت اور حیوان کی انسانیت کا ایک لطیف موازنہ کیا ہے۔ ثریا کی جہالت کی یہی بے پناہ قوت دو ہستیوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ بیلو ہاتھی اور راج کمار بلبیر سنگھ کو بلبیر سنگھ ثریا کے منگیتر ارجن کو اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے کسی بہانے کے منتظر تھے۔ وہ اس لڑائی نے بہم پہنچا دیا جو ... کی حیثیت سے انہوں نے سندھیا کے ساتھ میں انگریزی ... کی اور اگرچہ یہ جنگ چھڑتے ہی ختم ہو گئی لیکن کچھ لوگوں کا رن میں کام آنا ضروری تھا۔ ان کی فہرست میں ارجن کا نام شامل کر لینا کچھ مشکل نہیں تھا۔

راج کمار کو ثریا سے اس وقت دلچسپی پیدا ہوئی جب وہ بیلو کو ندی سے پانی پلا کر اور نہلا کر واپس آ رہی تھی اور راستے میں راج کمار سے نہ صرف مڈبھیڑ بلکہ دو دو باتیں بھی ہو گئیں۔ اور پھر جب اس نے یہ قصہ اپنے منگیتر ارجن کو سنایا تو اسے یقین نہ آیا وہ بولا "جھوٹی ہے۔ بھلا بلبیر سنگھ جی تجھ سے بات کریں گے۔ سپنے میں دیکھا ہوگا۔ ہاتھی پہ بیٹھ کر تو بھی اپنے آپ کو راج کماری سمجھنے لگی ہے"۔ اور پھر یہ دلچسپی بڑھنے لگی اور رتھوں کی دوڑ میں جب ثریا کا ہاتھی جیت گیا اور راج نے ایک ہلکی پھلکی سی انگوٹھی اس کی خوش وضع مگر ناسنوار انگلی میں پہنا دی اور ثریا نے کل کی دلچسپ دوڑ کا حال ارجن کو ہنس ہنس کے سنایا تو اس نے کچھ دھیان سے نہیں سنا۔

انگوٹھی بھی سب سے پہلے اسی کو دکھائی۔ مگر اس نے الٹا منہ بنا لیا۔ بولا تو یہ بولا۔ چھپا کر رکھیو چاچا کو مت دکھائیو! ثریا کھسیانی سی ہو گئی — مگر آج بے اختیار ارجن کے بازو اس کی کمر تک آ گئے۔ ثریا کی آرزو کی کافور ہو گئی۔ وہ اس کی بات کیوں نہ مانتی۔ اس کا دھرم یہی تو وہی نے وا... تھا۔

"میں اسے سینت کے کہاں رکھوں گی؟ کیا پیٹ میں رکھ لوں؟"

ثریا نے ... کر کہا۔

"یہ کل کلیجہ پھٹ جائے گا" ارجن اسے سینے سے لگاتے ہوئے بولا۔"

اور یہاں منظر بدلتا ہے۔ فرنگیوں سے لڑائی کے لئے عام بھرتی شروع ہوتی ہے۔ ثریا کے بھائی اور چاچا کو تو جانا ہی تھا پر اس کا منگیتر دس بارہ روز سے بخار میں پڑا تھا، مگر حکم حاکم مرگ مفاجات ارجن بھی بخار میں ہلہلاتا ہوا سدھارا۔

ثریا کے دل کی کیا حالت ہوگی۔ اس کا اندازہ آسان نہیں اس کا پیارا منگیتر اور اس کا چہیتا بیلو سب ایک نامعلوم مدت کے لئے اس سے رخصت ہو گئے تھے ... ثریا نے ایک مہینہ اور بے چینی میں گزارا۔ اس کے بعد اس کے گھر پھر بستے اجالا ہو گیا اس کا باپ اور بھائی صحیح سلامت واپس آ گئے تھے۔ ارجن کا حال انہیں تو کچھ معلوم نہ تھا، مگر گاؤں کے ایک اور رنگروٹ نے بتایا کہ وہ اس کو دیکھ کے آیا تھا۔ اس کا بخار دو چار ہی دن میں باقاعدہ فوجی معالجے سے ٹوٹ گیا تھا — اب ثریا کے دن کی ایک سردی اور باقی

رہ گئی تھی۔ ابھی اسے کل نہیں پڑی تھی۔ اُس نے ارجن کے انتظار میں گھڑیاں اور پل گننے شروع کئے۔ دو کٹھن ہفتے اور بیت گئے ..... "وہ تو آج بھی نہیں آئے پیلو!" وہ رندھی سی ہو کر کہہ رہی تھی۔ "اب تو ساکھو چاچا کے گھر کے لوگ بھی آ گئے۔ آج تو بھی گڑھ کو جائے گا صاحب لوگ آ رہے ہیں نا! دیکھ اب کے ارجن کو ساتھ لوا کے لائیو! نہیں تو مجھے شکل مت دکھانا!" ..... بہت سے بچھڑے ہوئے دیس کو لوٹے۔ ارجن کے باپ نے اُسے ناحق اُن میں تلاش کیا۔ اس کا نام لڑائی میں کام آنے والوں کی مختصر فہرست میں درج تھا! مگر وہ خود یوراج کی راج ہٹ پر بھینٹ چڑھ چکا تھا! ایک تنکا تھا کہ شعلے سے بھڑا اور فنا ہو گیا۔

ثریا جنگل کے کنارے بیٹھی اپنے کڑوں کو گھور رہی تھی۔ بچپن سے اب تک کی سینکڑوں باتیں اس کی نظروں میں پھر گئیں۔ ارجن کا ایک ایک بول اُس کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ "جا میں نے کہہ دیا۔ تیری بات اگ رہی ہے! ہاتھی پہ بیٹھ کے اپنے آپ کو راجکماری سمجھنے لگی ہے! دیکھ ثریا جا جا سے مت کہیو۔ چل پگلی کلیجہ کٹ جائے گا۔" ثریا چونک سی پڑی۔ اس کے کلیجے میں درد تھا۔ وہ اسے کاٹ کے پھینک دینا چاہتی تھی۔

آج پیلو ہمیر پور سے زنجیر تڑا کے بھاگا تھا۔ وہ چار دن سے پیاسا تھا۔ اُسے ثریا کی تلاش تھی۔ سیدھا ندی پر پہنچا۔ ثریا اب اس جہان میں نہیں تھی۔ یوراج کا عطیہ نیگ لگ چکا تھا۔ اس کی لاش ندی کے کنارے پڑی "حیوان ناطق" کے ستم کی حیوان مطلق سے داد طلب کر رہی تھی۔

پیلو نے اسے سر پر اٹھا لیا ——— اور سیدھا دریا میں اُتر گیا "۔

افسانہ نگار نے انجام میں اپنے فن کا پورا کمال دکھایا ہے۔ ثریا ہیرے کی انگوٹھی سے جو راجکمار کا عطیہ تھا، اپنا کام تمام کرتی ہے۔ اور پیلو اُس کی لاش لے کر دریا میں اُتر جاتا ہے ——— اور افسانے کی روانی ہمیں وہیں چھوڑ کر کائنات کی نامعلوم وسعتوں میں کھو جاتی ہے۔ ثریا دیہاتی دوشیزگی کا ایک دلنواز نمونہ ہے، اس کی فطرت کی سادگی اور جذبات کی گہرائی کی ایک ہلکی سی جھلک صاحب افسانہ نے اس کی اُن باتوں میں دکھائی ہے جو وہ ارجن کی جدائی میں بے زبان پیلو سے مخاطب ہو کر کرتی ہے۔

"وہ آج بھی نہیں آئے پیلو ..... آج تو بھی گڑھ جائے گا ..... دیکھ اب کے ارجن کو ساتھ لوا کے لائیو! نہیں تو مجھے شکل مت دکھانا"۔

کیسا صحیح ریکارڈ ہے۔ کس قدر سچی ترجمانی!

نگار نومبر ۳۹ء

مثنوی زہر عشق پر ایک نظر

نواب مرزا شوق کی مشہور و معروف مثنوی زہر عشق پر بہت سے مضامین اور تنقیدیں لکھی جا چکی ہیں۔ لیکن زیر نظر مضمون جسے خواجہ احمد فاروقی صاحب نے لکھا ہے، اپنی جامعیت، ندرت اور سنجیدگی کے لحاظ سے ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ آغاز میں انہوں نے اُس زمانے کی معاشرتی فضا اور اس فضا کے ادبی تاثرات کا جائزہ لیا ہے جس میں یہ مثنوی لکھی گئی اور ثابت کیا ہے کہ اگرچہ زمانے کی گردش کچھ اور تھی اور عشرت کی فراوانی اور معاشرت کی رنگینی کا تقاضہ یہ تھا کہ مرزا شوق کا یہ کارنامہ بھی تکلف اور تصنع، دقت پسندی اور رعایت لفظی نسوانیت اور ہوسناکی کا مظہر ہو کے رہ جاتا، لیکن حیرت ہے کہ ایسا نہیں ہوا اور شوق نے ادب میں حقیقت نگاری اور شگفتہ بیانی کے وہ نقوش چھوڑے جو آج ایک صدی گذر جانے کے بعد بھی اپنی پوری آب و تاب سے فروزاں ہیں اور بہت ممکن ہے کہ مستقبل میں اور بھی روشن ہو جائیں۔

یہ بات قابل افسوس ہے کہ اس مثنوی کی تصنیف سے بہت عرصے بعد تک ہماری سوسائٹی میں ایک جھوٹے ادبی معیار کے رواج کے باعث اس کی وہ قدر و منزلت نہ ہوئی جس کی یہ حقدار تھی لیکن رفتہ رفتہ پہلا انداز نظر بدل رہا ہے۔ بقول صاحب مضمون "اب تنقید کا وہ عام معیار نہیں رہا کہ یہ چیز اخلاقی اعتبار سے اچھی ہے یا بُری بلکہ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ یہ چیز اچھی لکھی گئی ہے یا بری"۔ زہر عشق کا قصہ بہت سادہ ہے۔ جسے شاعر نے اپنے وقت کے لکھنو کی عام معاشرت کے مطابق لکھا ہے، اور اس کا کمال فن یہ ہے کہ اگرچہ قصے کے ہیرو کی بے عملی بلکہ بزدلی اور نسوانیت کے باعث پڑھنے والے کے دل میں اس کے لئے ہمدردی بھی کم ہو جاتی ہے۔ لیکن انہوں نے حقیقت نگاری کا دامن

ہاتھ سے نہیں دیا۔ وہ بڑی آسانی سے قصے کو خوش انجام اور ہیرو کو بامرام بنا سکتے تھے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ انہوں نے کوئی غیر فطری بات قصے کی بناوٹ میں داخل نہیں کی۔ اس کے علاوہ کردار بہت کم رکھے ہیں اور اس سے یہ فائدہ ہوا ہے کہ پڑھنے والے کی تمام توجہ مثنوی کے مرکزی خیال یعنی ہیروئن کی بے مثال قربانی میں جمع ہو جاتی ہے اور یہی اس مثنوی کا نقطۂ عروج ہے۔

صاحبِ مضمون نے قصے کا اختصار بیان کرنے اور جگہ جگہ اُسے مثنوی کے اشعار سے مزین کرنے کے بعد یہ دکھایا ہے کہ جہاں تک تاثیر کا تعلق ہے وہ اس مثنوی میں بدرجۂ اتم موجود ہے اور اس کے ساتھ زبان کا پیرایہ سادگی، بے تکلفی اور نغمگی کی خصوصیات لئے ہوئے ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"شوق کے یہاں واقعیت اور حسیت کا کمال نظر آتا ہے اور اسی وجہ سے ان کی مثنوی غیر معمولی اثرات کی حامل ہے۔ ہمیں تمام مثنوی میں ایک جگہ بھی ایسی نہیں ملتی جہاں شوق اثر انگیزی میں ناکام رہے ہوں۔ وہ کوئی ایسی چیز بیان ہی نہیں کرتے جو قدرت کے مسلمات کے خلاف ہو یا فطرت کے اصولوں سے متصادم نظر آتی ہو۔ ان کی زبان سادہ۔ بامحاورہ اور پر اثر ہے تشبیہیں اور استعارے قریب المأخذ ہیں، واقعات ایسے ہیں جو اس دنیا میں ہوتے رہتے ہیں۔ پھر اُن کے کردار بالکل اسی دنیا کے انسان ہیں جن میں خامیاں بھی ہیں اور خوبیاں بھی۔ اچھائیاں بھی اور برائیاں بھی۔ . . . . . شوق کی مثنوی زہرِ عشق کے بارے میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ ان کا اپنا واقعہ ہے جس کو نظم کر دیا ہے۔ اُن کے حالات زیادہ نہیں معلوم، اس لئے اس سلسلے میں کوئی بات یقین کے ساتھ نہیں کی جا سکتی لیکن شوق نے آپ بیتی کا رنگ اختیار کر کے قصے کو اتنا اصل بنا دیا ہے کہ ہمیں اس پر واقعہ کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ شوق کے کردار ایسے نہیں ہیں جو اس عالم کی چیز نہ معلوم ہوتے ہوں۔ اس کی ہیروئن ایک شریف سوداگر کی بیٹی ہے۔ اور اس کی سوسائٹی میں وہی پوزیشن ہے جو ہیرو کی۔ دونوں ایک محلے میں رہتے ہیں پھر عشق کی اس داستانِ سرگشتگی کی جہاں ابتدا ہوتی ہے۔ وہ کوئی جنگل، پرستان، کنج باغ، یا دریا کا کنارہ نہیں ہے۔ وہ صرف مکان کی چھت ہے جو لکھنؤ کے ایک گوشے میں واقع ہے۔ اس سے زیادہ اور کیا اصلیت کا ثبوت ہو سکتا ہے۔ عشق کی یہ ابتدا بہت سادہ ہے۔ اودھ کی شام ہے۔ پانی برس کر ابھی کھلا ہے۔ قوس قزح نکل آئی ہے سوداگر کی لڑکی اپنے تمام ملکوتی جمال کے ساتھ موسم کا لطف اُٹھا رہی ہے . . . . .

ساتھ ہمجولیاں بھی تھیں دو چار ۔۔۔ دیکھتی تھیں وہ آسماں کی بہار
بام سے کچھ اترتی جاتی تھیں ۔۔۔ چہلیں آپس میں کرتی جاتی تھیں

ایسے میں ہیرو کی نظریں جو اپنا دل بہلانے کے لئے اوپر چلا آیا ہے لڑکی پر پڑتی ہیں اور نگاہوں نگاہوں میں دل کا سودا ہو جاتا ہے:۔

دل مرا بیٹھے بیٹھے گھبرایا ۔۔۔ سیر کرنے کو بام پر آیا

سامنے وہ کھڑی تھی ماہِ منیر ۔۔۔ چپ کھڑا تھا میں صورتِ تصویر
دیکھتا اس کو بار بار تھا میں ۔۔۔ محوِ حسنِ جمالِ یار تھا میں

قصے کے درمیانی حصے کی تفصیل غیر ضروری ہے۔ انجام صاحبِ مضمون کے نزدیک فن کے اعتبار سے اچھا نہیں یعنی یہ کہ عاشق کا محبوبہ کی قبر پر آہ وزاری کرنا۔ پھر گھر آ کر زہر کھا لینا لیکن عجیب وغریب طریقے سے بچ جانا۔ اس میں کوئی خاص سلیقہ نہیں برتا گیا۔ لیکن اس کے جواز میں صرف یہی بات کہی جا سکتی ہے کہ ہیرو مرنے والی کی وصیت کے مطابق عمل کرنے پر مجبور تھا۔ اس کے علاوہ ہیرو کے کردار کی کمزوری میں بھی واقعیت کی جھلک نمایاں ہے۔

فاروقی صاحب نے اس امر کی تفصیل یوں کی ہے۔

"واقعہ یہ ہے کہ مرزا شوق نے ہیرو کو بالکل معمولی انسان کے طور پر پیش کیا ہے اور یہ ان کی حقیقت پسندی کا بڑا ثبوت ہے۔ ہیرو غیر معمولی خصوصیات کا حامل نہیں ہے بلکہ اوسط درجے کا ایک شخص ہے جس سے ہمیں زندگی میں روز سابقہ پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ انیسویں صدی کے افراد میں عملیت سے زیادہ جذباتیت بھری ہوئی تھی اور لوگ تدبیر سے زیادہ تقدیر کے قائل تھے۔ شوق کا ہیرو بڑی حد تک زمانے کا نمونہ ہے . . . . . وہ حسیات کے لحاظ سے بالکل چھوئی موئی ہے لیکن عمل کے اعتبار سے نہایت کمزور قسم کا انسان ہے۔ اس کے کردار میں بطلانہ اور جوانمردانہ رنگ نہیں ہے۔ آخر میں زہر کھا لینا اس کی عملیت سے زیادہ محبت کا ثبوت ہے۔ لیکن مرزا نے ایک اچھے حقیقت نگار کی طرح یہ

کوشش نہیں کی کہ وہ اسے خواہ مخواہ معمولی انسانوں سے بلند تر کر کے دکھلائیں اور مثنوی کی اصلیت اور واقعیت کو مجروح کریں۔ مرزا نے ہیروئن کو ہیرو سے بلند تر دکھلایا ہے اور یہ خوبی یا خرابی (؟) شکسپیئر کے بھی اکثر ڈراموں میں پائی جاتی ہے۔

"مرزا نے ہیروئن کے کردار پیش کرنے میں بڑی صناعی اور ہنرمندی کا ثبوت دیا ہے۔ ہیرو کے کیرکٹر کی طرح اس میں عمومیت نہیں پائی جاتی۔ وہ نہایت اعلیٰ تصوریت اور مثالیت کی حامل ہے۔ اس کے خیالات میں بلندی۔ استواری اور مضبوطی پائی جاتی ہے اس میں محبت، حمیت، ایثار اور عمل کا جذبہ بدرجۂ اتم موجود ہے وہ عام انسانوں سے بلند ہے لیکن اس دنیائے آب و گل سے بالکل علیحدہ اور غیر متعلق بھی نہیں ہے۔ اگر اس کے کیرکٹر کے تمام پہلوؤں پر نظر ڈالی جائے تو وہ کمالیات اور سیرت نگاری کا ایک اعلیٰ نمونہ نظر آتی ہے"

اپنی زندگی کی آخری رات میں ہیروئن نسوانی فطرت کے معراج پر پہنچ جاتی ہے۔ اور اس رات کا بیان شوق کا شاہکار اور مثنوی کا سب سے حسین اور شاید سب سے دردناک حصہ ہے۔ اور بقول صاحب مضمون۔

اثر انگیزی کے اعتبار سے شاید ہی اس کی کوئی مثال اردو لٹریچر میں مل سکے۔ ہیروئن اپنے آہنی عزم کے ساتھ اپنے عاشق سے آخری بار ملنے جاتی ہے اور اسے تمام واقعہ سے آگاہ کر دیتی ہے۔ یہ اس کی آخری ملاقات ہے اور زندگی کی آخری شب۔ صبح ہوتے ہی وہ اپنی روح کی امانت کو موت کے سپرد کر دیتی ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ موت کی ہیبت ناک صورت اسے ڈراونی نہیں معلوم ہوتی . . . . . اس کی ہر ہر ادا سے ملکوتی سکون اور ارادہ کی مضبوطی ظاہر ہوتی ہے اور ان سب پر جو چیز غالب ہے وہ بے غرضی، جذبۂ محبت اور حمیت ہے۔

ملاحظہ ہو:۔

طعنے سنتی ہوں دو مہینے سے — موت بہتر ہے ایسے جینے سے
خونِ دل کب تلک پئے کوئی — بے حیا بن کے کیا جئے کوئی
کہتی ہے بار بار ہمتِ عشق — ہے یہی مقتضائے غیرتِ عشق
عشق کا نام کیوں ڈبو جائیں — آج ہی جان کیوں نہ کھو جائیں
گو کہ عقبیٰ میں روسیاہ چلی — مگر اپنی سی میں نباہ چلی

صاحب مضمون نے آخری رات کے بیان میں ایڈیٹنگ کا کمال دکھایا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"پھر موت سے کھیلتے ہوئے، ذرا ان الفاظ کے ادا کرنے کے لئے جس صبر و ضبط کی ضرورت ہے، اسے بھی ملاحظہ فرمائیے۔

مرگ کا کس کو انتظار نہیں — زندگی کا کچھ اعتبار نہیں
خوب سا آج دیکھ بھال لو تم — دل کی سب حسرتیں نکال لو تم
حشر تک ہو گی پھر یہ بات کہاں — ہم کہاں تم کہاں یہ رات کہاں

یہ جذباتیت اور اس کی نشتیریت بھی ملاحظہ فرمائیے:۔

کل گلے سے کسے لگاؤ گے — یوں کسے گود میں بٹھاؤ گے
حال کس کا سنائے گی آ کر — کس کی ماما بلائے گی آ کر
ہم تو اٹھتے ہیں اس مکان سے کل — اب تو جاتے ہیں اس جہان سے کل
یاد اتنی تمہیں دلاتے جائیں — پان کل کے لئے لگاتے جائیں

"رات تیزی سے گزر رہی ہے۔ اسے اس کا ایک دم سے خیال آتا ہے اور بے چین ہو جاتی ہے لیکن اس سطحی تلاطم کے نیچے بھی جوشِ محبت، حسیت اور استواری عزم کا بے پناہ سمندر لہریں مارتا ہوا نظر آتا ہے:۔

بولی گھبرا کے پھر ٹھہر مری جان — کچھ سنا بھی کہ کیا بجا اس آن
حسرتِ دل نگوڑی باقی ہے — اور یہاں رات تھوڑی باقی ہے
گود میں اپنی پھر بٹھا لو تم — پھر گلے سے ہمیں لگا لو تم
ڈال دو پھر گلے میں باہوں کو — پھر گلوری چبا کے منہ میں دو
پھر کہاں ہم، کہاں یہ صحبت یار — کر لو پھر ہم کو بھینچ بھینچ کے پیار
پھر مرے سر پہ رکھ دو سر اپنا — گال پھر رکھ دو گال پر اپنا
پھر اسی طرح منہ کو منہ سے ملو — پھر وہی باتیں پیار کی کر لو
پھر ہم اٹھنے لگیں بٹھا لو تم — پھر بگڑ جائیں ہم منا لو تم

"موت اور اس کی قربت نے اس نفسی واردات اور حسیاتی بیان میں سوز و گداز اور حسرت و ارمان کی جو نمایاں کیفیت پیدا کر دی ہے۔ وہ صرف محسوس کی جا سکتی ہے الفاظ میں نہیں سما سکتی۔ رات گذرتی جاتی ہے، ہر گھنٹے کی آواز موت کا تازہ پیام ہے۔ ہیروئن گھبرا جاتی ہے، اس نفسیاتی حالت کو مرزا نے خوب دکھلایا ہے:۔

مردنی رخ پہ چھا گئی اس کے — دل میں دہشت سما گئی اس کے
دل پہ گذرا جو اس کے صبح کا شک — ہوئی استادہ جا کے زیرِ فلک

ٹھنڈی جس دم چلی نسیمِ سحر ہوگیا حال اور بھی ابتر
ہوئے ثابت جو صبح کے آثار ہوگئی اور اس کی حالت زار
بید کی طرح جسم تھرّایا سر سے لے پاؤں تک عرق آیا
باتیں کرتی جو تھیں سو بھول گئی دم لگا چڑھنے سانس پھول گئی

لیکن وہ معمولی عورت نہیں ہے۔ اس کا خمیر حیات محبت و جرأت سے گوندھا گیا ہے۔ وہ سراسر ہمتِ عشق ہے جس نے جسم اختیار کرلیا ہے۔ وہ فوراً اپنی کمزوری پر قابو پالیتی ہے اور کہتی ہے ؎

اب فقط یہ ہے خوں بہا میرا بخش دیجو کہا سنا میرا

پھر میرے سر کی قسم نہ آئیو تو اور بالکل چلتے وقت:۔

آزماتی تھی تجھ کو سستی تھی میں ترے چھیڑنے کو ہستی تھی

سبحان اللہ! اس دنیا کی ایک لڑکی۔ دنیا کی ہوتے ہوئے بھی۔ اس دنیا سے اور کیا دور ہوسکتی تھی۔ شائستگی کا اس سے زیادہ اور کیا عروج اُسے حاصل ہوسکتا تھا۔ مادیت اور روحانیت کا اس سے خوبصورت اجماع اور کیا ممکن تھا۔ یہ نامراد زلیست، جوان ارمانوں کی مالک، وضعدار لڑکی ایک ستارہ ہے۔ اس عالم سے دور اور نزدیک جس کی ضیا پاشیاں ہماری روح میں ایک طوفانِ نکہت و نور برپا کردیتی ہیں، نہیں بلکہ یہ لطف ہمارا مایۂ خمیر بن جاتا ہے اور ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اُس کے بغیر روح اور جسم کا رشتہ ہمیشہ کے لئے منقطع ہوجائے گا!"

صاحبِ مضمون نے اس آخری حصّے میں جس تاثر کا اظہار کیا ہے وہ یقیناً خلوص کی تصویر ہے اور ہمارا خیال ہے کہ مرزا شوق نے محض ایک مکالمے سے اردو میں ایک بے نظیر نسوانی کیرکٹر کی بنیاد رکھی جس کی پیشانی اس ظلمت کدے میں شاید ہمیشہ تک چمکتی رہے گی۔ زمانے کی روش کی بات ہے، آج جو چیز ہماری روح کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے۔ کل اس کے متعلق اردو کے پہلے جدید شاعر حالی کی یہ رائے تھی کہ یہ مثنوی لکھ کر مرزا شوق نے اپنی ہوس پوری کی ہے۔

کاش! اے کاش!!

نیا ادب اور کلیم (نومبر ۱۹۳۶ء)

گناہ کا خوف۔ چودھری محمد علی صاحب کے ایک افسانے تیسری [illegible] پہلے ان کالموں میں تبصرہ کیا جاچکا ہے [illegible] ناظرین ان کے اندازِ تحریر اور طرزِ خیال سے ایک حد تک آشنا ہیں۔ زیرِ نظر افسانے میں انہوں نے بڑی ژرف نگاہی سے سوسائٹی کی اس عجیب و غریب کمزوری کا مطالعہ کیا ہے جسے صاحبِ افسانہ گنّاہ کا خوف کہتے ہیں۔ دراصل اس خوف کو گناہ سے دور کی نسبت بھی نہیں ہے۔ لیکن از بسکہ ہم گناہ کے معاملے میں بھی جاں دادۂ طلسمِ رسوم و قیود ہیں۔ اس لئے خوف گناہ کا نہیں بلکہ ان رسوم و قیود کی شکست کا ہوتا ہے۔ جن کی قدر ہمارے ہاں خالص گناہ و ثواب سے بدرجہا زیادہ ہے۔ آپ جو چاہے کیجیے، جس قدر چاہے کھُل کھیلئے لیکن اگر آپ چند رسمی بندشوں کو ملحوظ رکھیں گے تو آپ کا بال تک بیکا نہیں ہوگا اور کسی کو جرأت نہیں ہوگی کہ آپ کی طرف انگلی بھی اٹھائے۔ لیکن جہاں آپ نے ان تکلفات کی طرف سے بے توجہی کی بس پھر آپ کی خیر نہیں۔

افسانے کے ہیرو عبد المغنی صاحب ایک پیشہ ور مختار ہیں اور اس معزز پیشے سے جو جو علائق دنیاوی لگے رہتے ہیں وہ اُن سے بری نہیں ہیں جعلی دستاویزیں اور جھوٹی شہادتیں تیار کروالینا۔ اہم گواہوں کو نظر بند کردینا، مسلیں غائب کرادینا اور اس قسم کی اور فن کاریاں ان کے بائیں ہاتھ کے کرتب ہیں، اور انہیں ان کی بجاآوری میں ضمیر یا اخلاق جیسے بے مصرف مشیروں سے مشورے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک با اثر اور وضعدار شخص ہیں۔ ہمسایوں اور ملنے جلنے والوں کے آڑے وقت میں کام آنا اُن کی عادت بلکہ طبیعت کا خاصہ ہے اور دوست احباب کے ساتھ اُن کے خاص معاملات میں تعاون کرنا اُن کی شرافت کا تقاضہ۔ روپیہ کمانے کی دُھن میں انہوں نے خوش صحبتی اور خوش وقتی کو ہاتھ سے نہیں دیا۔ احباب کی خاطر سے کبھی کبھی بالاخانوں پر بھی چلے جاتے اور ہنس بول آتے ہیں۔ ابھی ابھی انہوں نے اپنے رسوخ سے فائدہ اٹھاکر ایک موزوں قطعہ زمین لے لیا ہے جس پر ایک اور صاحب کی بھی نظر تھی، مگر وہ اُن کے مقابلے میں جم نہ سکے۔ اس قطعے پر مہمانوں کے لئے ایک چھوٹا سا خوش وضع مکان بنایا ہے۔ آہستہ آہستہ سامان بھی بھیج رہے ہیں۔ اس اثنا میں ان کے ایک قدیم مربّی کے صاحبزادے کو اپنے کسی خاص مقصد کے لئے اس نو تعمیر مکان کی ضرورت پڑتی ہے۔ عبد المغنی صاحب اپنی مخصوص وضعداری کے باعث ان کی ہر خدمت بجالانے کے عادی ہیں۔ خود اپنے ذاتی مکان کا ایک علیحدہ حصہ اُن کے مشاغل کے لئے ہمیشہ وقف رکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی مطلوبہ کو بھی [illegible] افسانہ جب اس نقطے پر پہنچتا ہے تو یکایک گھوم

جاتا ہے۔ دیکھئے:۔

اُس رنڈی کے یہاں پہنچ کر میاں عبدالمغنی صاحب نے منہ سے تو کچھ نہ کہا مگر شہامت علی کا ایسا ادب ولحاظ کیا گویا یہ ان کے ادنیٰ ملازم ہیں۔ ایک ایک گلوری نوش کی اور رئیس صاحب کی طرف سے کچھ دے کر دونوں آدمی اٹھ آئے۔ لیجئے صاحب وہاں رنگ ہی بدل گیا۔ ادھر یہ لوگ رخصت ہوئے اور اُدھر نائکہ نے اُستاد گھمن خاں کو بلایا کچھ سرگوشیاں ہوئیں جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ معاملہ رو براہ ہوگیا پیغام بھیجا کہ لونڈی کو حکم میں کبھی عذر تھا نہ ہے صرف بات یہ ہے کہ رات میں دوسرے کی پابندی ہے دن کو جب چاہئے گھڑی دو گھڑی کے لئے طلب کر لیجئے۔

اب دِقت یہ آن پڑی کہ رات کے لئے تو ان کا کمرہ مناسب تھا مگر دن کے لئے ناموزوں تھا عبدالمغنی کے اعزہ نوکر چاکر لڑکے سب ہی موجود رہتے۔ مناسب یہی معلوم ہوا کہ وہی نو تعمیر مکان تخلیہ کے لئے کام میں لایا جائے۔ عبدالمغنی کچہری جا چکے تھے۔ چنانچہ شہامت علی نے ایک لڑکے کو دوڑایا کہ عبدالمغنی سے اس مکان کی کنجی مانگ لائے۔ یہ بھی کہلا بھیجا کہ جب فرصت ہو تو خود بھی چلے آئیں۔ کنجی تو انہوں نے بھجوا دی اور خود تھوڑی دیر میں آنے کو کہا کلید مراد ہاتھ آ گئی۔ اب عبدالمغنی کو کون یاد کرتا ہے۔ انہوں نے نوکر کو تو اُس رنڈی کے یہاں بھیجا اور خود کنجی جیب میں لے کر اُس نئے مکان کی طرف چلے سب سے پہلے نل کھول کر دیکھا کہ پانی آ رہا ہے۔ اس کے بعد پلنگ کی طرف متوجہ ہوئے۔ نواڑ کی پلنگڑیاں متعدد بچھی ہوئی تھیں۔ اونہہ تکیہ بچھونا نہیں ہے نہ سہی۔ لوٹا بھی نہیں ہے مگر شیشے کی الماری میں جگ اور گلاس تو ہیں۔ یار کچھ پان منگوانے چاہئیں۔ نوکر جب آئے گا تو وہی لے آئے گا۔ شہامت علی صاحب کی بے تابی بیان کر کے اپنے پڑھنے والوں پر ناتجربہ کاری کا اتہام لگانا نہیں چاہتا۔

قصہ مختصر کچھ انتظار کے بعد معشوقہ محبوبہ تشریف لائیں۔ انہوں نے دھڑکتے دل سے استقبال کیا۔ نوکر کو گلوریاں، برف، لیمنڈ لینے کو بھیجا اور پاس تو بٹھا لیا مگر نوکر کی واپسی کے انتظار میں دست ہوس اور زیادہ نہیں بڑھایا۔ ان جو باتیں اظہار شوق کی بالکل پیش پا افتادہ تھیں ان کا ذکر نہیں مگر نگاہ نوکر کے دھڑکے میں دروازے ہی لڑی رہی۔ اتنے میں نوکر بھی آ گیا اور اُس کے ساتھ ساتھ میاں عبدالمغنی بھی دھمکے۔ ان کو دیکھ کر شہامت علی صاحب کے چہرے پر مسرت۔ خلوص اور شکر گذاری کا اشتہار لگ گیا۔ مگر عبدالمغنی صاحب کے چہرے پر خلاف امید سنجیدگی متانت بلکہ اُس سے بھی بالاتر وہ کیفیت ظاہر تھی جو اُس وقت ہوتی ہے جبکہ آدمی مروت کو توڑ کر کسی دوست کے خلاف دو ٹوک فیصلہ کر لیتا ہے۔ شہامت علی کا دل دھک سے ہو گیا۔ رنڈی کے دوسرے پہلو میں بیٹھنے کی دعوت دی، مگر عبدالمغنی نہ بیٹھے۔ ایک دو سکنڈ چپ کھڑے رہے اس کے بعد کہنے لگے "یار سنو۔ تم جانتے ہو کہ ہماری ہر چیز جان ومال دوستوں کے لئے وقف ہے مگر ابھی اس مکان میں یہ کام نہیں ہو سکتا ہے ابھی اس گھر میں مولود نہیں ہوا ہے"۔

آپ نے دیکھا فن کار نے افسانے کی ساری روح کھینچ کر آخری فقرے میں کس انداز سے بھر دی ہے اور فقط اس چھوٹے سے تاثر کی خاطر انہوں نے عبدالمغنی کی شخصیت کا طویل پس منظر بڑی محنت سے تیار کیا ہے۔ یہ شخصیت اُس دور کا ایک ماڈل ہے۔ جو شاید عنقریب گذر جائے گا۔ اس دور کی ایک دلچسپ خصوصیت یہ رہی ہے کہ مذہب اور اخلاق کے معاملات میں ہمیشہ مغز پر صورت کو اور باطن پر ظاہر کو ترجیح دی گئی ہے۔ اور ممکن ہے کہ انسانی فطرت کی یہ کمزوری ابھی دیر تک نسل آدم پر مسلط رہے۔

صاحبِ افسانہ نے جہاں اپنے موضوع سے پورا پورا انصاف کیا ہے، وہاں جزئیات سے کام لینے کے سلیقے میں بھی نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ افسانے کا جو مختصر اقتباس اوپر دیا گیا ہے، اس میں ایسی کئی چھوٹی چھوٹی اور نازک نازک باتیں ہیں جن سے افسانے کے نقوش میں حسب ضرورت شوخ اور سنجیدہ رنگ بھرے گئے ہیں۔ مثلاً

"پہلے نل کھول کر دیکھا کہ پانی آ رہا ہے" "کلید مراد ہاتھ آ گئی" "جو باتیں اظہار شوق کی بالکل پیش پا افتادہ تھیں ان کا ذکر نہیں۔ مگر نگاہ نوکر کے دھڑکے میں دروازے ہی سے لڑی رہی" "رنڈی کے دوسرے پہلو میں بیٹھنے کی دعوت دی" "لوٹا بھی نہیں ہے۔ مگر شیشے کی الماری میں جگ اور گلاس تو ہیں"۔

اس قسم کی بہت سی فن کاریاں افسانے کے اس حصے میں بھی ہیں جو عبدالمغنی کی شخصیت کی تعمیر میں صرف ہوا ہے۔ مگر اب اور گنجائش کہاں سے لاؤں کہ ان سب کا ذکر کروں۔ ہماری رائے میں یہ افسانہ "ترقی پسند ادب"

کا ایک نہایت سلجھا ہوا نمونہ ہے۔ خصوصاً اس لئے کہ اس کے عناصر میں وہ چیزیں بھی پائی جاتی ہیں جن سے ترقی پسندی کا معروف مفہوم بیزار ہے۔

ہمایوں۔ اکتوبر ۱۹۳۹ء

غالب کی قدر۔ ماضی، حال اور مستقبل میں

نورالحسن صاحب ہاشمی کا یہ بلند پایہ مضمون غالبیات میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ غالب کے اپنے زمانے میں اُن کی قدر بالکل نہ ہوئی۔ اُن کے کلام کا مرتبہ یادگار غالب کی اشاعت کے بعد پہچانا گیا اور اب رفتہ رفتہ لوگوں کے مذاق کی تبدیلی نے انہیں وہ بلند درجہ عطا کیا جس کے وہ حقیقی طور پر مستحق تھے۔

ہاشمی صاحب نے نہایت غیر جانبداری سے عوام کے اس خیال اور خود مرزا غالب کے اُن شکوہ ریز اشعار کا جائزہ لیا ہے جو ناقدری زمانہ کے باب میں اُن کے قلم سے نکلے۔ اور بڑے سلیقے سے یہ ثابت کیا ہے کہ باوصف اس کے کہ اس دور میں اردو شاعری پر ذوق اور شاہ نصیر کا رنگ چڑھا ہوا تھا، اور معنوی ندرت کی بجائے لفظی صنعت گری کو سخنوری کا معیار سمجھا جاتا تھا۔ غالب کے ہمعصروں نے ان کی کافی قدر کی اور حالات زمانہ کے لحاظ سے شاید اس سے زیادہ قدر ممکن ہی نہیں تھی۔ یہ اور بات ہے کہ خود مرزا کا ظرف اس قدر عالی تھا اور ان کے حوصلے اتنے بلند تھے یا ان کی طبیعت کی افتاد ایسی تھی کہ وہ اکبر شاہ اور بہادر شاہ کے عہد میں محمود، جہانگیر، اور رضا خاں کی سی قدر افزائیوں کے خواب دیکھتے تھے۔ صاحبِ مضمون نے گارساں دتاسی اور آثار الصنادید کے حوالے سے یہ بات بھی ثابت کی ہے کہ مرزا کی شہرت اُن کے اپنے زمانے ہی میں قابلِ رشک ہو چکی تھی۔ سرکار دربار میں بھی اُن کی کافی قدر و منزلت تھی اور مختلف ریاستوں کی طرف سے انہیں بیش قرار خلعت اور انعامات ملتے رہتے تھے۔ اگرچہ اُن کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی کہ وہ قیصرۂ ہند ملکہ وکٹوریہ کے خاص شاعر مقرر ہو جائیں؟ باقی رہا قبولِ عام تو اُس کی نسبت صاحبِ مضمون لکھتے ہیں کہ

"مرزا کے خود کے زمانے کا معیار لفظی صنعت گری اور ظاہری روایات شاعری کا برتنا تھا۔ خیالات کی وہاں نہ کوئی قدر تھی نہ کوئی جگہ۔ معاملات کا دائرہ محدود اور مقرر تھا اور راشہب شعری کو محض اُسی دائرے میں جولانی دکھانا منظور۔ جن اشعار کی تعریف ہوتی وہ ایسے ہوتے جن میں یا تو قافیے اور ردیف کی سخت دقتیں ہوں یا پھر اُن میں کوئی رعایتِ لفظی ہو یا کسی قسم کا حسنِ تعلیل یا کوئی اور تمثیل یا ثبوت یا پھر کوئی لفظی یا معنوی صنعت۔ لیکن مرزا کی خوش قسمتی (اگرچہ بعد از مرگ) کہ زمانے کا معیارِ شعری بہت جلد بدل گیا۔ انگریزوں کی آمد نے تصوّرات کے حلقوں کو ڈھا دیا۔ غلو اور مبالغے کی سربفلک دیواریں مسمار ہوگئیں۔ اور لوگوں کے تخیّل نے واقعات اور موجودات سے زیادہ قریب رہنا شروع کر دیا۔ محض ظاہری صورت ایک بیکار بے معنی سی چیز ہوگئی۔ خیالات و محسوسات یا جذبات اصل شے قرار دیئے گئے۔ تخیّل بغیر صداقت کے ناکافی سمجھا گیا۔ چنانچہ مرزا کی شاعری کا ستارہ چمکا اور اس طرح وہ مئے کہنہ آخر رنگ لائی۔ مختصراً یہ کہ بجائے لفظی صنعت گری کے معنوی ندرتِ خیال کی طرف زمانے کا رجحان ہونے لگا۔ آورد شعریت کے لئے بدمذاقی قرار دی گئی اور محض قوافی و ردیف کا نظم کر دینا ہی شاعری نہیں سمجھا گیا آمد شعریت کا جزوِ اعظم قرار دی گئی۔ مدح اور مدحیہ قصائد کا ستارہ گردش میں آگیا کیونکہ وہ ایک چیز تھی تمام تر آورد۔ خیالات و جذبات لازمۂ شعری قرار دیئے گئے۔ اس میں کچھ تو مغربی طرزِ تہذیب و دوسرے کچھ انگریزی ادب کا اثر جس نے یہ کایا پلٹ دی۔ لوگ جو واقعات تھے ان کی طرف دوڑے، اصلی اور حقیقی محاکات کا اثر زیادہ ہونے لگا بہ نسبت خالی محاکات کے۔ جذبات و محسوسات کی دنیا گرم ہوئی، خیالات افسوں ہو چلے۔ قدرتی مناظر اور ان کی رنگینی نے دامن پکڑنا شروع کیا۔ شاعری اب محض ایک پیشہ یا ہنر نہیں رہ گئی بلکہ ایک ذوقی اور وجدانی چیز جس پر ہنر صرف جلا کرتا ہے۔ اب شاعری شاگردی یا ذریعۂ استادی نہیں رہی بلکہ ایک ذاتی چیز۔ ایک ذاتی عطیۂ فطرت . . . . . یہی وجہ تھی کہ انیسوی صدی کا کروٹ بدلنا تھا کہ مرزا کی قدر و منزلت میں جو نمایاں اضافہ ہونا شروع ہوا تو اس نے آخر تان یہاں آن کر توڑی کہ "ہندوستان کا دو دیدوں کے بعد دوسرا الہامی کلام" ان کا دیوان ہوگیا اور اس طرح سے آخرش مرزا کی وہ پیشینگوئی تو پوری ہوگئی کہ میرے کلام کی شہرت میرے بعد ہوگی
"شہرت شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن"

مرزا کا زمانہ ایک ایسا زمانہ تھا کہ گویا ایک جدید کروٹ لے رہا تھا۔ پرانے ٹمٹماتے چراغ باقی تھے، اسی میں مرزا بھی پیدا ہوگئے گو باہم کہہ سکتے ہیں کہ فطرت نے مرزا کو کوئی سو سال پیشتر

پیدا کردیا تھا۔"

آگے چل کر مرزا کی عالم گیر مقبولیت کی توجیہہ یوں کرتے ہیں۔

"کلام غالب کی مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ غالب نے کسی خاص خیال، کسی خاص جذبے کا اظہار اپنا مقصد نہیں بنا لیا۔ اگر یہ صورت ہوتی تو وہ صرف اسی حلقے میں مقبول ہوسکتے جو اس خاص خیال یا نظریے میں اعتقاد رکھتا۔ مثال کے طور پر میر صرف قنوطیت کے بادشاہ ہیں۔ لامحالہ اُن اشخاص کو اُن سے زیادہ اُلفت ہو گی جن کی فطرت اور طینت میں قنوطیت کو زیادہ دخل ہوگا۔ لیکن مرزا بحیثیت ایک شاعرِ اعظم کے فطرتِ انسانی کے ہر جذبے سے اسی قدر متاثر ہوئے ہیں جتنا کہ ایک حد سے زیادہ زود حس آدمی اس سے ہوسکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ہر جذبے کا اظہار نہایت بلند معیار پر کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر قسم کی طبیعت کا آدمی اُن کے کلام سے دلچسپی لیتا ہے ...... جو جس افتادِ مزاج کا آدمی ہے اُسے ویسی ہی تصویر دیوانِ غالب میں نظر آتی ہے۔ گویا ایک آئینہ ہے جس میں خود دیکھنے والے کو اپنی شکل نظر آجاتی ہے اور یہ خصوصیت دراصل ایک شاعر کی عظمت پر دلالت کرتی ہے۔ اس قدر حیرت انگیز تنوع صرف دنیا کے بڑے بڑے شاعروں ہی میں مل سکتا ہے۔ اُن کے اشعار کے پیچھے ہمیں ایک ایسی پُرمعنی شخصیت چھُپی ہوئی ملتی ہے جس کے جاننے کے لئے ہم بے قرار رہتے ہیں۔ بقولِ بجنوری لوح سے تمت تک مشکل سے سو صفحے ہیں لیکن کیا ہے جو یہاں حاضر نہیں۔ کون سا نغمہ ہے جو اس ساز کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں۔"

آگے چل کر انہوں نے زمانۂ حال میں غالب کی مقبولیت کی ایک سند کے طور پر اُن متعدد شرحوں اور ایڈیشنوں کا ذکر کیا ہے جو گذشتہ چند سال میں مطالعۂ غالب کے بڑھتے ہوئے شوق کی تسکین کے لئے ظہور میں آئے۔ ان میں سے چند کے نام حسبِ ذیل ہیں۔

شرحیں:۔ شرح کلامِ غالب (آسی)، بیخود دہلوی، نظامی بدایونی۔ سہا۔ طبا طبائی۔ حسرت موہانی۔

ایڈیشن۔ نولکشور، نسخہ حمیدیہ۔ طاہر ایڈیشن۔ مرقع چغتائی۔ جرمن ایڈیشن

سوانح عمریاں۔ یادگارِ غالب (حالی)، غالب (مہر)، غالب نامہ (اکرام)، ذکرِ غالب (مالک رام)

تبصرے محاسن کلامِ غالب (بجنوری)، غالب (عبداللطیف)، غالب کی شاعری (عسکری)، غالب (عارف ہسوی) وغیرہ

اس کے بعد انہوں نے سوال کیا ہے کہ مستقبل میں غالب کی ایسی ہی قدر و منزلت ہو گی جیسی آج کل ہے یا نہیں اور خود ہی جواب دیا ہے کہ اگرچہ تغیر زمانے کے آب و گِل میں ہے لیکن غالب نے جو کچھ کہا ہے اس کا ایک معقول عنصر اپنے اندر ہمیشہ زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس لئے تعجب نہیں اگر آئندہ نسلیں بھی اس کے کلام سے اسی طرح متاثر ہوتی رہیں۔ جس طرح آج ہم لوگ ہو رہے ہیں۔ یہاں صاحبِ مضمون نے مثال کے طور پر کلام غالب میں سے مختلف اشعار چنے ہیں اور انہیں مختلف صنفوں میں تقسیم کیا ہے اور پھر ہر صنف کو علیحدہ علیحدہ ایک مخصوص نقطۂ نظر سے جانچا ہے۔ مثلاً ایک جگہہ وہ **لکھتے ہیں کہ**

"پھر بھی اتنا کہا جاسکتا ہے کہ جب تک انسان کے پہلو میں دل ہے اور دل میں محبت۔ تب تک مشکل ہے کہ ذیل کے اشعار اُس کے دلی جذبات کی ترجمانی کرکے اُسے لطف و تسکین نہ دے سکیں۔"

اور یہاں چند اشعار دئیے ہیں **مثلاً**

نینداس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں ؎ جن کے بازو پر تری زلفیں پریشاں ہوگئیں

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب   کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس   زلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کئے ہوئے

کس منہ سے شکر کیجئے اس لطف خاص کا   پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

پھر لکھتے ہیں۔

"یا جب تک دماغ میں سوچنے کی اور دل میں راز حقیقت کے سمجھنے کی کاوش موجود ہے۔ اس وقت تک غالب کے ذیل کے اشعار پر ہر متفکر کے دماغ میں کبھی نہ کبھی جگہہ نہ پالیں۔ مثلاً"

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا   یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا   درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے — ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

چلتا ہوں تھوڑی دیر ہر اک تیز رو کے ساتھ — پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں — ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے ؟
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے — نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے ؟
جب کہ تجھ بن کوئی نہیں موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ — عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن — دل کے بہلانے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں — موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

اسی طرح غالب کے وہ اشعار جن میں ظرافت اور شوخی کا عنصر بدرجۂ غایت پایا جاتا ہے۔ مثلاً

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر — نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے
ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین — ہاں منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

وعدہ آنے کا وفا کیجے یہ کیا انداز ہے — تم نے کیوں سونپی ہے اپنے گھر کی دربانی مجھے

اور وہ اشعار جن پر غم کی چھایا چھا رہی ہے۔ جیسے ؎

جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا — وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو
میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل — دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج — شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

یا وہ گہر ریزے جن میں حکمت و دانش کی آب جھلک کر نگاہِ حقیقت نگر میں روشنی پیدا کرتی ہے۔ مثلاً

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا — آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج — مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالبؔ — خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہئے

ہے دل اگر افسردہ ہے گرمِ تماشا ہو — کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

ایک غیر محدود عرصے تک انسانی دل و دماغ کو متاثر کرتے رہیں گے ان کی بقا کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ ان میں سے بیشتر اشعار لوگوں کی زبانوں پر چڑھ گئے ہیں اور ضرب الامثال کی طرح رواج پا گئے ہیں۔

یہاں یہ نکتہ بھی بیان کیا ہے کہ "مذاقِ سخن کا لفظی صنائع اور ظاہری خوبیوں کی طرف سے معنوی خوبیوں اور خیال بندیوں کی طرف دھارا پھیر دینا" غالب کا اجتہاد تھا۔ اور اس اجتہاد کا جو اثر اردو نظم پر ہوا وہ آشکار ہے۔ رہی زبان تو اگرچہ ممکن ہے کہ آیندہ ہندوستان کی زبان ایسی نہ رہے جس میں فارسی اضافتیں یا عطف یا الفاظ اس قدر شدت و کثرت سے ہوں جیسی کہ دیوانِ غالب میں ہیں۔ اس لئے ہم بالکل یقین کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتے کہ غالبؔ ہمیشہ ہمیشہ اسی شد و مد اور زور شور کے ساتھ مقبول رہیں گے۔ ہاں البتہ اتنا کہا جا سکتا ہے کہ جب تک اُردو زبان اور اس کے سمجھنے والے قائم ہیں (اور جب تک غزل گوئی میں کوئی ان سے بڑھ کر شاعر پیدا نہیں ہوتا) غالب شاعرِ غالب رہیں گے"۔

صلاح الدین احمد

شعر

وہ کس کے ہاتھ کے ہیں منتظر خدا جانے
لرزتے رہتے ہیں پردے حریمِ جاناں کے

احمد ندیم قاسمی

نقد ونظر

کالی داس اور بہاراں

ریڈیو کے مضامین کی نوعیت رسائل کے مضامین سے جداگانہ ہوتی ہے۔ اس لئے ہم اصولاً ریڈیو پر نشر کی ہوئی چیزیں شائع نہیں کرتے لیکن ذیل کا ریویو اس لئے ایک استثنا ہے کہ مدت سے "کالیداس" اور "بہاراں" ادبی دنیا میں ریویو کے لئے آئی رکھی تھیں۔ اس دوران میں ایڈیٹر ادبی دنیا کو ریڈیو پر کتابوں کی تنقید کرنا پڑی۔ چونکہ ان کتابوں پر ہمیں ریویو شائع کرنا ہی تھا۔ اس لئے یہی ریویو یہاں اے آئی آر کی اجازت سے درج کیا جاتا ہے۔

صوبہ سرحد کی سنگلاخ سرزمین سے ادب کا ایک چھوٹا سا چشمہ پھوٹتا دیکھ کر جو مسرت مجھے ہوئی ہے اس میں آپ کو بھی شریک کرنا چاہتا ہوں یعنی آج کی صحبت میں سب سے پہلے ہم چودھری جے کرشن ایم اے ایل ایل بی، وکیل ایبٹ آباد کی تالیف "کالیداس" کا ایک سرسری مطالعہ کریں گے اس چھوٹی سی کتاب میں ہندوستانِ قدیم کے سب سے بڑے شاعر اور ڈرامہ نگار کالیداس کی زندگی اور شاعری کا ایک ہلکا سا خاکہ نہایت دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اردو میں یوں تو وقتاً فوقتاً کالیداس کی بعض مشہور نظموں کے ترجمے شائع ہوتے رہے ہیں اور بعض رسائل میں اس کی شاعری پر چند مضامین بھی چھپے ہیں، لیکن جہاں تک ہم جانتے ہیں اس موضوع پر آج تک کوئی کتاب نہیں لکھی گئی تھی۔ اگرچہ ڈیڑھ سو صفحے کی یہ چھوٹی سی تالیف ہندوستان کے اس شاعرِ اعظم کی زندگی اور فن سے ہمیں مفصل طور پر آشنا نہیں کراتی، لیکن اتنا ضرور ہے کہ اسے پڑھ لینے کے بعد ہم اپنے دل میں کالی داس سے مزید تعارف حاصل کرنے اور اس کی حسین وجمیل شاعری سے لطف اندوز ہونے کی ایک زبردست خواہش موجود پاتے ہیں۔

کتاب کے تین حصے ہیں۔ پہلے حصے میں کالی داس کی تصانیف کی مدد سے اس کی زندگی اور اس کے عہد کے حالات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ بات حیرت انگیز ہے کہ جس شاعر نے اپنی جادو بیانی سے سنسکرت ادب کو زندۂ جاوید کیا، اس کی زندگی کے متعلق ہمیں کوئی تاریخی مواد نہیں ملتا۔ یہاں تک کہ یہ بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ بکرماجیت اعظم کے نورتنوں میں سے تھا یا اُس نے کسی اور بکرماجیت کے گیت گائے ہیں۔ بقول محمد عزیز مرزا مرحوم "ہندوؤں کی روحانی محویت نے کالیداس کی ہستی فانی کے نشانات کو ایسا نہیں مٹایا کہ ہم ان کی گرد کو بھی پہنچ سکیں"۔ بہر حال ہمیں اس ضمن میں جو کچھ مواد ملتا ہے خود کالیداس کی تصانیف ہی سے ملتا ہے اور انہی کی روشنی میں ہم اُس کے وطن، اس کی قومیت، اعتقادات، سیر وسیاحت، خانگی معاشرت اور مختلف علوم وفنون مثلاً طب، ہیئت، نجوم، جغرافیہ، آئین ملک داری سے اُس کی واقفیت کا کچھ اندازہ کر سکتے ہیں۔ اُس کے ڈراموں اور نظموں میں اس کے عہد کی سماجی زندگی یوں جھلکتی ہے، جیسے بلوری شیشے میں شرابِ ناب۔ مثلاً ہمیں پتہ چلتا ہے کہ کالیداس کے ہندوستان میں شادی کا دارومدار ایک بڑی حد تک مرد اور عورت کی باہمی محبت پر تھا، اگرچہ مرد کے لئے اپنی محبوبہ کے والدین کی رسمی رضامندی حاصل کر لینا، اچھی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ . . .

. . . . ہندی عورت کے لئے شوہر بمنزلہ ایک درخت کے تھا جس کے گرد وہ ایک نازک بیل کی طرح لپٹی رہتی تھی۔ زندگی اور موت میں شوہر کی ابدی رفاقت اس کا دھرم تھا۔ رتی کام دیو کے مرنے پر کہتی ہے۔

"چاند کی چاندنی چاند کے ساتھ ہی رخصت ہو جاتی ہے: بجلی کی چمک بادلوں کے ساتھ ہی غائب ہو جاتی ہے، یہ کہ عورت کو بھی اسی طرح مرد کا ساتھ دینا چاہیئے۔ مظاہرِ فطرت سے بھی ظاہر ہے"۔ لیکن اگر ایک طرف عورت کی شوہر پرستی کا یہ معیار تھا تو دوسری جانب شوہر بھی بیویوں کی قدر کرتے تھے۔ جب دشرتھ کی ماں اتفاقیہ موت کا شکار ہو جاتی ہے تو اس کا باپ اپنے جذبۂ درد کا یوں اظہار کرتا ہے۔

"آج میرا حوصلہ جاتا رہا، میری خوشیاں ختم ہو گئیں، موسیقی بند ہو گئی
موسم کا نکھار رخصت ہو گیا، زیورات کا مقصد زائل ہو گیا اور میرا
بستر خالی رہ گیا۔"

کتاب کے دوسرے حصے میں کالیداس کی شاعری پر ایک نظر ڈالی گئی ہے۔ کالی داس حسن و جوانی، اور مہر و محبت کا نغمہ خواں تھا اور مناظرِ قدرت کا عاشقِ زار۔ وہ فطرت کے حسین مظاہر سے اپنی پر کیف نظموں اور لافانی ڈراموں کے پس منظر کا کام لیتا تھا۔ کالیداس کی ان خصوصیات کی داد جرمنی کا ممتاز شاعر اور فلاسفر گوئٹے ان الفاظ میں دیتا ہے "کیا آپ بہار کے نوشگفتہ پھولوں اور خزاں کے خوشنما پھلوں کے خواہاں ہیں۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی روح وجد میں آئے اور اُسے فرحت اور بالیدگی نصیب ہو۔ کیا آپ کی خواہش مختصراً ایک لفظ میں زمین اور آسمان کی ہے تو میرا جواب ہے "اوشکنتلا" اور یہ لفظ اتنا جامع ہے کہ اور کچھ کہنے کی ضرورت نہیں"۔ کتاب میں جا بجا ایسے اقتباسات دئیے گئے ہیں جن سے کالیداس کے کلام کی فصاحت اور بندشوں کے حُسن، اور مضامین کی ندرت اور جوش کا خُوب خُوب اظہار ہوتا ہے۔ کالیداس کی خصوصیات میں سے ایک ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ وہ حسن کو بالکل خشک اور بے کیف مناظر میں بھی تلاش کر لیتا ہے مثلاً یہ دو تین شعر دیکھئے ترجمہ غالباً منشی پیارے لال صاحب شاکر نے کیا ہے۔

ٹُنڈ کچھ سوکھے ہوئے آتے ہیں صحرا میں نظر
چونچ کھولے جس پہ دم لیتی ہیں چڑیاں بیٹھ کر

عجب انداز سے بیلوں کو ہلاتی ہے نسیم ہاؤ اور گرد برے کے درختوں کو نچاتی ہے نسیم
یوں ہر اک پھول پلیسو کے برستی ہے بہار ہاؤ سرخ جیسے کسی طوطے کی نکیلی منقار

کالیداس کی دوسری ممتاز خصوصیت اُس کی اچھوتی اور کیف آور تشبیہات ہیں جن کی رنگینیاں فطرت سے مستعار لی گئی ہیں۔ ایک مثال سنئے۔

پاروتی کو جب دلہن بنایا گیا تو اس کے سنگھار کی کیفیت شاعر یوں بیان کرتا ہے۔

"جب اس کو زیور پہنائے گئے تو وہ اس طرح چمکتی تھی جیسے ایک
بیل پھولوں سے لد جانے پر۔ یا رات تاروں سے بھر جانے پر
سفید ریشم کی پوشاک پہنے، آئینہ ہاتھ میں لئے وہ یوں معلوم ہوتی
تھی جیسے کف آلود سمندر یا خزاں کی ایک چاندنی رات"۔

کالیداس جہاں مناظرِ قدرت کا پجاری ہے وہاں جذبات انسانی کی مصوری میں بھی اوج کمال پر پہنچ جاتا ہے۔ اور یہاں ہمیں اس کا مماثل اگر کوئی نظر آتا ہے تو وہ فقط شیکسپیئر ہے۔ اس مختصر کتاب کے اوراق میں اتنے بڑے فن کار سے پورا انصاف تو کیونکر کیا جا سکتا تھا، ہاں جو مثالیں پیش کی گئی ہیں ان سے مولف کے ذوقِ انتخاب اور دقتِ نظر کا اظہار ہوتا ہے۔

کتاب کے تیسرے حصے میں کالیداس کی مختلف تصانیف۔ مثلاً شکنتلا، وکرم اُروشی، رگھو ونش، میگھ دوت، رتو سنگھار وغیرہ کا مجمل تذکرہ ہے۔ اور ان پر عالمانہ انداز میں تنقید کی گئی ہے۔ اس باب کے شروع میں سنسکرت ڈرامہ پر بھی ایک اجمالی نگاہ ڈالی گئی ہے اور اس کی مختلف خصوصیات بتائی گئی ہیں۔ ایک دلچسپ خصوصیت یہ ہے کہ سنسکرت ڈرامے میں ٹریجڈی مفقود ہے۔

کالیداس کی جن نظموں اور ڈراموں کے ترجمے اردو میں ہو چکے ہیں۔ جناب مولف نے اپنے جائزے کے دوران میں ان کے اچھے اچھے اقتباسات بھی پیش کئے ہیں جن سے کتاب کی دلچسپی بڑھ گئی ہے۔ اسلوب بیان اگرچہ خوب شگفتہ ہے لیکن بعض مقامات پر زبان و محاورے کی غلطیاں بھی پائی جاتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب پر نظرِ ثانی نہیں کی گئی۔ کاغذ لکھائی اور چھپائی بہت خوب ہے۔ جلد معمولی۔ مصنف سے ایک روپے میں طلب فرمائیے۔

پتہ ہے: چودھری جے کرشن ایم اے۔ وکیل ایبٹ آباد۔

اب آپ سرحد سے گذر کر پنجاب کو پھاندیئے اور گنگا و جمن کی وادی میں چلئے، جہاں گومتی کے کنارے اثرؔ لکھنوی نغمہ خواں ہے۔

مرزا جعفر علی خاں اثرؔ کی ذات گرامی تعارف کی محتاج نہیں۔ وہ اردو کے غزل گو شعرا کی صف اوّل میں ہیں اور ان کا ایک مجموعۂ کلام اثرستان کے عنوان سے شائع ہو کر اہلِ ذوق کی نگاہوں سے گذرتا ہوا دلوں میں اتر چکا ہے۔ اب ایک اور دیدہ زیب اور ضخیم دیوان بہاراں کے روح پرور نام سے طبع ہوا ہے اور آپ کو آج اسی سے متعارف کرانا مقصود ہے۔

بہاراں قریباً پانسو صفحات پر مشتمل ہے اور اس کے دو حصے ہیں: بہاراں اور انتخاب اثرستان۔ حصۂ اوّل یعنی خاص بہاراں میں تقریباً پانچ سو غزلیں ہیں اور غزلیں کیا ہیں مرصّع زیور ہیں جو عروس شاعری کو پہنائے

گئے ہیں۔ غزلوں کی زمینیں قریباً سب کی سب شاداب ہیں۔ اور یہ اثر کے کلام کی ایک ممتاز خصوصیت ہے۔ آہنگ اور نغمہ اور داخلی تناسب و ترنم ان کی غزلوں میں بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے۔

تین چار زمینیں ملاحظہ ہوں:۔

آئیے وقت اب نہیں ناز کا اور حجاب کا

تری زلف کیوں ہے شکن شکن کہ نثار بادِ صبا نہ ہو

مجسّم کیفِ رنگیں بن کے وہ مستِ شباب آیا

سجدے کو رہ گذر تو ہے آپ کا در نہیں سہی

اس آخری زمین میں ایک شعر ہے۔

لعل و گہر سے بھر گئے، دامن و جیب اثر اثر
آخری ارمغانِ دل حصّہ آستیں سہی

اثر اثر کی تکرار میں جو موسیقی ہے، وہ حسن شعر کی جان ہے اور یہ چیز ملحوظ رہے۔ یہ زمینیں کچھ خاص طور پر منتخب نہیں کی گئیں۔ یونہی سرسری طریقے سے چُنی گئی ہیں۔ مگر آپ نے ملاحظہ فرمایا، شگفتگی۔ روانی، الفاظ کا حسن اور بندش کی چستی جو شعر کے خارجی محاسن ہیں ان مصرعوں سے کس حد تک نمایاں ہیں اثر ان لوازم کا بے حد خیال رکھتے ہیں۔ بظاہر ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے اس لئے انتخاب الفاظ میں انہیں کسی قسم کا تکلّف نہیں کرنا پڑتا، اور وہ نہایت بیساختگی سے ایسے ایسے الفاظ سے اپنا کام نکال لیتے ہیں جو عام طور پر اور لوگوں کے قابو میں نہیں آتے اور پھر جب وہ ان الفاظ کو ان کی جگہ پر جڑ دیتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہ خاص اسی مطلب کی ادائی کے لئے وضع کئے گئے تھے مثال ملاحظہ ہو۔

ترے نثار وہی اک تبسّمِ مبہم — کلی کلی کی زباں پر ہے جس کا افسانہ

تبسّم کے لئے مبہم کی صفت شاید اثر کے سوا اور کسی نے استعمال نہیں کی۔ لیکن غور کیجئے اور بتایئے کہ تبسّم کی اس نازک کیفیت کا اظہار مبہم کے لفظ کے سوا اور کونسا لفظ کر سکتا ہے۔

یہ ابرِ تیرہ اور یہ سماں لالہ زار کا
لَو دے رہا ہے حسن عروسِ بہار کا

یہاں جو کام لَو نے کیا ہے، وہ یقیناً کسی اور لفظ یا ترکیب سے ممکن نہیں تھا۔ لَو کے ایک چھوٹے سے لفظ نے ساری تصویر میں رنگ بھر کے رکھ دیا ہے۔

یہ ابرِ تیرہ اور یہ سماں لالہ زار کا
لَو دے رہا ہے حُسن عروسِ بہار کا

اب یہ سوچئے کہ ہماری شاعری کے روزمرّہ معمولات میں لَو کے لفظ کا کیا درجہ ہے۔ اثر کے کلام کی خوبی یہی نہیں ہے کہ وہ الفاظ کی جادوگری کرتے ہیں بلکہ اُن کی شاعری جذبات کی مصوّری اور حسنِ تخیّل کے اعتبار سے بھی بہت بلند مرتبہ رکھتی ہے اور یہاں ان میں اُن کے کمالِ فن کے نمونے بڑی کثرت سے ملتے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اُن پر میر کا رنگ غالب ہے، بعض انہیں غالب کا پیرو سمجھتے ہیں وہ خود عزیز لکھنوی کے شاگرد ہیں اور اس شاگردی کا اعلان اپنے اشعار میں فخریہ طور پر کرتے ہیں۔ لیکن میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ان پر فقط ان کا اپنا رنگ غالب ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے کئی غزلیں میر کے رنگ میں کہی ہیں اور چند میں غالب کا تتبع کیا ہے، مگر وہ کسی خاص رنگ میں رنگے نہیں گئے۔ یہیں ان کے کلام میں جہاں کہیں کہیں یاس و قنوطیت کے آثار ملتے ہیں، وہاں بیشتر فرحت و بہجت، سرخوشی و مستی، اور عشرت و کامرانی کے جلوے بھی نظر آتے ہیں۔ اگر کبھی وہ دوشِ تخیّل پر سوار، آسمانِ فکر کی بلندیوں پر پرواز کرتے نظر آتے ہیں، تو کئی بار یہ بھی دیکھا ہے کہ غزل میں معاملہ بندی مطلع سے جو شروع ہوئی ہے تو مقطع پر جا کر دم لیا۔

مضامین تصوف کو وہ اپنے اشعار میں نہایت خوبصورتی سے باندھتے ہیں اور دانش وری کے نکتے اُن کی غزلوں میں یوں بکھرے رہتے ہیں جیسے کسی کے ریشمیں دامن پر موتی۔ انہوں نے بے شمار چیزیں لکھی ہیں لیکن اس پُرگوئی کے باوجود ان کی غزلوں میں بہت کم اشعار ایسے ملتے ہیں جنہیں ادنےٰ درجے میں رکھا جا سکتا ہے یا جن سے طبیعت کوئی خاص اثر نہیں لیتی۔ اثر صاحب بہت اچھا کرتے اگر وہ ان تھوڑے سے اشعار کو اپنی غزلوں سے خارج کر دیتے۔ مثلاً اُن کی ایک نہایت مرصّع غزل ہے۔

دلہن بنی ہوئی اب کی چمن میں آئی ہے
بہار ہو کے تری انجمن میں آئی ہے

شمیم دوست لئے پیرہن میں آئی ہے
نسیم ہوش اڑاتی چمن میں آئی ہے

ظہورِ عشق حقیقت طراز تھا ورنہ
یہ دلکشی کہیں دار و رسن میں آئی ہے

یہ کس کی خاک ہے جو حسرتِ نشیمن میں
صبا کے دوش پہ صحنِ چمن میں آئی ہے

نسیمِ صبح کے جھونکے مہک وہ پھولوں کی
نفس نفس میں نئی روح تن میں آئی ہے

اس غزل کی مست مست کیفیت اور خوشبو دار فضا کو فقط ایک ناقص شعر نے خراب کر دیا۔ اور وہ شعر ہے۔

وہ بوئے خوں ہے کہ گھٹتا ہے دم معاذاللہ
بہار وادیٔ زخمِ کہن میں آئی ہے

اول تو زخمِ کہن کی وادی بجائے خود ایک ناخوشگوار اور دور از کار تصور ہے۔ اس پر بوئے خون سے دم گھٹنا۔ توبہ توبہ۔ مہکتی ہوئی غزل کا ستیاناس ہو گیا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ ایسے اشعار شاذ کالعدم کا حکم رکھتے ہیں۔

اب چلتے چلتے ان کی دو ایک غزلیں سن جائیے۔ پہلی میر کے رنگ میں ہے۔

اب جو باغ و بہار ہے اپنا — وہ دلِ داغدار ہے اپنا
ہوش کس کو ہے تیرے وعدے کا — جس کو ہے انتظار ہے اپنا
برق دیکھی ہے، رم نہ ہو جس میں — وہ دلِ بے قرار ہے اپنا
وہ جو دامن کشیدہ گذرا ہے — دامن افشاں غبار ہے اپنا
حیف وہ ملتفت نہیں ہوتا — حال تو آشکار ہے اپنا
عشق سے لوگ منع کرتے ہیں — جیسے کچھ اختیار ہے اپنا
آرزو ہے کہ ایک دن کہہ دو — اثرِ دلفگار ہے اپنا

دوسری غالب کے رنگ میں:-

آہ وہ اک نگاہِ تاب شکن — اُف وہ اک شعلۂ امید گداز
محرمِ راز تو زمانے کا — کوئی تیرا نہیں ہے محرمِ راز
بات کہنے میں آ ہی جاتی ہے — ناز اور ایک خستہ جاں سو ناز

جلوۂ نو بنو مبارک ہو — اے ہمہ شوخی و کرشمہ و ناز
رعشہ بن کر بہار میں ابھری — ہم اسیروں کی حسرتِ پرواز

عشق ہے ناتمام ورنہ اثر
ابھی آراستہ ہو خلوتِ ناز

اور اب اثر کے اپنے رنگ میں چند اشعار سنیئے۔

ضبط کیا تو کیا ہوا، رنگِ شکستہ نے کہا
قصۂ غمِ فراق کا، حالِ دلِ خراب کا

قطرہ کنارِ بحر میں، محوِ نمود و بود ہے
دیکھیے کیا نتیجہ ہو، سرکشیٔ حباب کا

راہِ ثواب اور ہے مسلکِ عشق اور ہے
خوف وہاں عذاب کا شوق یہاں عتاب کا

عقل کی بحث چھوڑ اثر مکتبِ دل میں درس لے
دفترِ روزگار ہے، اک ورق اس کتاب کا

یہ اپنی مستیٔ دوشینہ کا ہے افسانہ — بسنا رے ٹوٹ پڑے چھٹ پڑا جو پیمانہ
ہماری بے خودیٔ شوق، جوہرِ بادہ — ہماری لغزشِ مستانہ طرحِ میخانہ
گلوں سے کہتے ہی کہتے نسیم مست ہوئی — ترے خرام کی رنگینیوں کا افسانہ

جنوں کے جوش میں اپنی بلائیں لیتا ہے
کہا جو ناز سے تم نے اثر کو دیوانہ

کتاب کا کاغذ، جلد، طباعت اور کتابت سبھی کچھ بے حد اچھا ہے۔ قیمت تین روپے۔ سرورق پر میر کا یہ شعر درج ہے۔

چلتے ہو تو چمن کو چلیے کہتے ہیں کہ بہاراں ہے
پات ہرے ہیں پھول کھلے ہیں کم کم باد و باراں ہے

نظامی پریس میں چھپی ہے اور مصنف سے مل سکتی ہے۔ پتہ یہ: خان بہادر مرزا جعفر علی اثر۔ ڈپٹی کمشنر۔ سیتا پور۔ اودھ۔

صلاح الدین احمد

رسائل سلسلہ تعلیم و ترقی

اس وقت بالغ مبتدیوں کے لئے اردو درسیات کا کوئی سلسلہ موجود نہیں ہے۔ بچوں کی کتابیں بڑی عمر کے لوگوں کے لئے نہ دلچسپ ہوتی ہے نہ موزوں اس لئے ادارہ تعلیم و ترقی جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی۔ بالغ مبتدیوں کے لئے رسائل کا یہ سلسلہ ترتیب دے رہا ہے اور تقریباً دو سو رسائل کا خاکہ تیار کیا گیا ہے۔ جو بالغوں کے پورے نصاب تعلیم پر حاوی ہوگا۔ رسائل تعلیم و ترقی کی کتابت اور مضامین میں مدارج کا بھی لحاظ رکھا جائے گا۔

ان رسائل کا اصلی منشا یہ ہے کہ اردو پڑھنے کی اچھی طرح مشق ہو جائے اور کتب بینی کا شوق پیدا ہو تاکہ آئندہ کتب خانہ تعلیم و ترقی کے ذریعے بالغوں کی تعلیم کا سلسلہ خود بخود جاری رہے اور پڑھنا لکھنا سیکھنے کے بعد آدمی پھر ان پڑھ نہ بن جائے۔

حسب ذیل رسائل اس سلسلے کے شائع ہو چکے ہیں یا زیر طبع ہیں ان کا سائز $\frac{27}{8}$ × ۱۷ ہے ہر رسالہ کم و بیش سولہ صفحات کا ہے۔

(۱) نماز - یہ رسالہ بالغ مبتدیوں کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ اس میں نماز کی تمام ضروری چیزیں اور مسائل جو نماز سے متعلق ہیں بتائے گئے ہیں ۲۶ صفحات۔ قیمت ایک ار

(۲-۳) حکائتیں مکمل۔ اس کے دو حصے ہیں۔ دونوں میں چھوٹی چھوٹی سادے اور پیارے الفاظ میں کہانیاں لکھی گئی ہیں جو اخلاقی اور سماجی دونوں اعتبار سے بہت اچھی ہیں۔ قیمت ار

(۴) حبیب خدا۔ آنحضرتؐ کی سیرت پاک، بہت ہی آسان اور دلچسپ زبان میں کم پڑھے لوگوں کے لئے لکھی گئی ہیں قیمت ار

(۵) نظمیں۔ یہ مولوی شفیع الدین صاحب نیر کی نظموں کا مجموعہ ہے پہلی نظم "حمد" دوسری "دعا" تیسری "نعت" چوتھی "ہم مسلمان ہیں مذہب ہے ہمارا اسلام" پانچویں "جو کرنا ہے ابھی کر لو" چھٹی "جاگو اور جگاؤ" قیمت ار (۶) میونسپلٹی۔ اس میں بالغوں کو بتایا گیا ہے کہ میونسپلٹی کیا ہے اور اس سے کیونکر فایدہ اٹھایا جا سکتا ہے قیمت ار (۷) صدیق اکبر۔ رسول خدا کے سب سے پہلے جانشین حضرت ابوبکر صدیقؓ کے حالات زندگی قیمت ار (۸) خط و کتابت آسان عبارت میں بتایا گیا ہے کہ کیسے خط لکھا جائے اور کیسے خط کا جواب دیا جائے قیمت ار (۹) قومی گیت۔ اس میں اچھی اچھی قومی نظمیں جمع کر دی گئی ہیں قیمت ار (۱۰) ہمارا ہندوستان۔ اس کتاب میں ہندوستان کا تمام حال بیان کیا گیا ہے قیمت ار

زیر طبع کتابیں:۔ ضلع کا انتظام ا۔ غزلیں ار۔ عمر فاروقؓ ار

صدر دفتر:۔ مکتبہ جامعہ نئی دہلی **مقامی شاخ**۔ لوہاری دروازہ، لاہور

دیگر شاخیں: جامع مسجد دہلی ۲ امین آباد لکھنؤ ۳ پرنسس بلڈنگ جے جے ہسپتال بمبئی

ڈاک کے ڈاکو ہر ماہ ہمیں خریداروں کی طرف سے شکایتیں موصول ہوتی ہیں کہ انہیں پرچہ نہیں ملتا اور بیسیوں خریدار ایسے بھی ہیں جو شکایت نہیں کرتے لیکن یہ فرض کر لیتے ہیں کہ پرچہ دفتر نے نہیں بھیجا حالانکہ چھاپنا اور ہر خریدار کو نہ بھیجنا پاگل پن اور تجارتی خودکشی سے کم نہیں۔ ادبی دنیا ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ تک شائع ہو جاتا ہے اگر ۲۰ تک آپ کو پرچہ نہ ملے تو سمجھ لیجئے کہ کسی ڈاک کے ڈاکو کی نذر ہو گیا۔ اس ایک شکایتی کارڈ اپنے حلقہ کے سپرنٹنڈنٹ پوسٹ آفس کو لکھئے اور ایک کارڈ ہمیں لکھئے تاکہ آپ کو پرچہ دوبارہ بھیجا جائے اور محکمہ ڈاک کے زیر دارت پر تنبیہ اور دستک دی جائے۔ مینیجر

فہرست مضامین ادبی دنیا لاہور

بابت ماہ مارچ ۱۹۴۷ء

جلد ۱۸ تصاویر: ۱۔ پھر اس انداز سے بہار آئی ۲۔ لب ساحل **نمبر ۳**

چندہ سالانہ مع محصول ڈاک اور وی پی پانچ روپے ممالک غیر سے دس شلنگ

گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام صلاح الدین احمد ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر چھپ کر دفتر رسالہ ادبی دنیا دی مال لاہور سے شائع ہوا

دُنیائے کاروبار

آروِنڈ ملز احمد آباد

ہندوستان بھر میں کپڑے کی ساخت کا جہاں تک تعلق ہے۔ اگرچہ کانپور وغیرہ میں بھی اس صنعت کے کارخانے ہیں لیکن احمد آباد کو اس سلسلے میں ہندوستان کا مانچسٹر کہنا بیجا نہ ہوگا۔ جتنی ملیں یہاں ہیں ہندوستان کے کسی صوبے اور شہر میں نہیں۔ ان ملوں میں ہندوستانی ضروریات سے کپڑا تیار ہوتا ہے۔ جو ہندوستان کے کونے کونے تک پہنچتا ہے۔

ارونڈ ملز احمد آباد کو ان تمام ملوں میں ایک خاص امتیازی درجہ حاصل ہے۔ جہاں فنی نقطۂ نگاہ سے کپڑا بنانے کے لئے بہترین ماہرین فن کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔ ارونڈ ملز میں کپڑے کی ساخت میں جس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ کپڑے میں ذوق ترتیب ہندوستانی معاشرت کے لباس کی نوعیت کے مطابق ہوتا ہے۔ اور قیمت کے اعتبار سے بھی اس کا نرخ عوام کی مالی حالت کے مطابق ہوتا ہے۔ ارونڈ ملز کا انتظام نہایت اعلیٰ اور تجربہ کار لوگوں کے ہاتھوں میں ہے۔ اپنی خصوصیات کے پیش نظر ارونڈ ملز اپنے کپڑے کو ہندوستان کے ہر قصبے اور شہر میں پہنچانے کے لئے ہر قسم کا اشتہار دیتی ہے ہم ناظرین کرام سے سفارش کرتے ہیں کہ وہ ضرور ارونڈ ملز کے کپڑے آزمائیں۔

لٹن واچ کمپنی کلکتہ

گھڑیوں کی دنیا میں کلکتہ کی لٹن واچ کمپنی ایک امتیازی درجہ رکھتی ہے۔ صحیح وقت کے علم کی ضرورت نہ صرف کاروبار بلکہ سوشل زندگی کے لئے بھی ضروری ہے۔ لٹن واچ کمپنی کی گھڑیاں ہندوستانی عوام کی جیب کو پیش نظر رکھتے ہوئے بالکل مناسب قیمت کی ہوتی ہیں اور صحیح وقت دینے کے اعتبار سے بھی بہت قابل تعریف ہیں۔ ان گھڑیوں میں مشینری کی ساخت بہت قابل تعریف عنصر ہے۔ جس پر ان کے صحیح وقت دینے کی صلاحیت کا دارومدار ہے۔

ان گھڑیوں کی مختلف خصوصیات ناظرین ادبی دنیا کی خدمت میں متعدد دفعہ پیش کی جا چکی ہیں۔ اس لئے ہم ان کے استعمال کی پرزور سفارش کرتے ہیں۔

ایم۔ اے۔ جے۔ نوبل

ادبی دنیا کے بمبئی کے مشتہرین میں میسرز ایم اے جے نوبل اینڈ کمپنی بہت پرانی کمپنی ہے۔ کمپنی ہذا کی ادویات بہت مدت سے ناظرین کی خدمت میں پیش کئے جا رہے ہیں۔

یہ ادویات فائدے کے اعتبار سے بہت بے نظیر ہیں اور ہندوستان بھر میں مقبول ہو چکی ہیں۔ یہ چار ادویات ڈرائیکو۔ گلائیکو تھائمولین۔ نوبل اینٹی پلورائیڈ اور آنٹریکس ہیں۔ اور شہرہ آفاق حیثیت رکھتی ہیں۔

ان خصوصیات کی بنا پر ہم ناظرین ادبی دنیا سے ان کے استعمال کی پُرزور سفارش کرتے ہیں۔

کتب خانۂ ادبی دنیا

ادبی دنیا نے اب اپنی خدمت زبان وادب کے دائرے کو وسیع کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور اس سلسلے میں کچھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اور باقی اشاعت کے مختلف مرحلوں سے گذر رہی ہیں۔ اُمید ہے کہ اُردو دان حضرات علم وادب کی خدمت کے اس اقدام کو لبیک کہیں گے اور عملی طور پر اپنی ہمدردی کا ثبوت دیں گے۔ کتب خانہ ادبی دنیا کی کتب کے خریدنے سے آپ ہندوستان کے مقبول ترین رسالے کے استحکام میں بھی حصہ لیں گے۔

بزمِ ادب

بہت سے احباب نے ہماری درخواست کے بغیر سالنامہ کے متعلق اپنی قیمتی آرار کا اظہار فرمایا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس قسم کی رائیں خلوص اور صداقت کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ ہم درحقیقت اپنی کوششوں کو وہ درجہ نہیں دیتے جو احباب کا حسنِ ظن اُنہیں بخشتا ہے۔ منزل ابھی دور ہے اور کاروان اُردو کی رفتار عوام کی عملی ناقدری کے طفیل نہایت سست، اس لئے اس عالمِ یاس میں احباب کی حوصلہ افزائی ہی ہمارا اکیلا سہارا ہے۔ اگرچہ یہ معلوم نہیں کہ اس سہارے پر ہم ناساعد حالات کا کب تک مقابلہ کر سکیں گے۔

اگر یہاں ان تمام آرار کو درج کیا جائے تو بہت سی جگہ درکار ہوگی۔ جو ہمیں میسر نہیں اور درج نہ کیا جائے تو کمال درجہ ناشکری ہوگی۔ اس لئے ہم نے احباب کے گرامی قدر ارشادات سے محض چند سطور کا انتخاب کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

برادر عزیز **شاہد احمد** صاحب مدیر ساقی لکھتے ہیں: "اُردو کی حریف زبانوں میں جن میں ہم انگریزی کو بھی شامل کر سکتے ہیں اس سالنامہ کا جواب نہیں ملتا۔ کرشن چندر کا طویل افسانہ اور میرا جی کا علمی مضمون خاص طور پر مستحقِ مطالعہ ہیں رنگین تصویروں سے اعلیٰ درجہ کا مذاقِ حُسن ظاہر ہوتا ہے۔ مدیران ادبی دنیا مستحق مبارکباد ہیں اور ان کی ہمت لائق داد ہے کہ محض صحافت اُردو کی ترقی کے خیال سے اُنہوں نے اتنی مالی زیرباری گوارا کی۔ . . . "

سید **علی منظور** صاحب ارشاد فرماتے ہیں: "آپ کی سعی مشکور کو سالنامۂ ادبی دنیا کے روپ میں دیکھ کر جی خوش ہوگیا۔ اتنا ضخیم رسالہ اور اتنا دل آویز۔ ہر مقام لائق دید ہے۔ یعنی ع کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست"

اُپندر ناتھ صاحب **اشک** مدیر پریت لڑی رقمطراز ہیں: "آپ نے سالنامہ نکال کر ایک ریکارڈ قائم کر دیا ہے۔ اسے کوئی دوسرا توڑ سکے گا، مجھے اُمید نہیں۔ آپ ہی اسے توڑیں تو توڑیں۔ محترمہ عصمت کی کہانی بے حد اچھی ہے۔ دوسری کہانی جو مجھے بہت اچھی لگی دھرم پرکاش آنند کی ہے، مگر میں کہتا ہوں کون سی اچھی نہیں۔ آپ کی محنت، ہمت اور شناخت کی جتنی داد دی جائے کم ہے۔"

جناب **باقی صدیقی** فرماتے ہیں: "نظم و نثر کا بلند معیار نفاستِ فکر اور ذوقِ سلیم کا آئینہ دار ہے۔"

مرزا **عظیم بیگ** صاحب چغتائی لکھتے ہیں: "سالنامہ کو اس شان سے شائع کرنے پر زبردست مبارکباد دیتا ہوں۔"

علی احمد صاحب خلف نواب فصاحت جنگ **جلیل** کا ارشاد ہے کہ "سالنامہ نہایت دیدہ زیب اور اپنی جملہ خصوصیتوں کے اعتبار سے بہت ممتاز ہے"

جناب **اشرف** صبوحی نے فرمایا: "گرانی اور کساد بازاری کے باوجود آپ نے سالنامہ کی روایات قائم رکھنے کی جو کاوش کی ہے وہ یقیناً قابلِ تحسین ہے۔"

جناب **ناکارہ** حیدرآبادی رقمطراز ہیں: "سالنامہ کے متعلق حیران ہوں کہ کیا لکھوں۔ آپ کی ہمتوں کی بلندی کی داد کوئی کور ذوق ہی ہوگا، جو نہ دے۔"

ماہر القادری صاحب فرماتے ہیں۔ "میں سمجھتا ہوں کہ سالنامہ ۱۹۳۹ء کا ادبی شاہکار ہے۔ اس زمانے میں اتنے ضخیم حسین اور متنوع شمارہ کا نکالنا ادبی کرامت ہے۔"

محمد فاروقی صاحب کا خیال ہے کہ "سالنامے کی ظاہری و باطنی دل آویزی اور رنگینی پر کچھ لکھنا سورج کو آئینہ دکھانے کے مترادف ہے۔ اُردو ادب آپ کی کاوشوں کا ہمیشہ رہینِ منت رہے گا۔"

ابو محمد امام دین صاحب لکھتے ہیں: "دنیائے ادب کی تمام منتخب اور بہترین چیزیں اس سالنامے میں بدرجۂ اتم و اکمل مہیا ہیں۔"

اندرجیت صاحب شرما فرماتے ہیں۔ "مضامین ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر ہیں، کس کس کی داد دی جائے۔ کرشن چندر کا افسانہ، ظہیر الدین احمد کا تنقیدی مضمون۔ میرا جی کا یہودی شاعر اور قیوم نظر کا "سالِ گذراں" اُردو علم و ادب میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔"

دھرم پرکاش صاحب آنند رقمطراز ہیں: "عصمت چغتائی کی کہانی تو اتنی اچھی ہے کہ اگر میں لکھنے کے معاملے میں اتنا سست نہ ہوتا تو اُن کو ایک مبارکباد کا خط ضرور لکھ دیتا۔ کرشن چندر اور راجندر سنگھ کی کہانیوں کو میں نے وقت کی قلت کے باوجود دو دو بار پڑھا ہے۔ اور اُپندر ناتھ اشک کی "کونپل" کونپل ہی کی طرح نازک اور نفیس ہے۔"

سہیل عظیم آبادی صاحب۔ "میں ایسا کامیاب سالنامہ شائع کرنے پر آپ کو دلی مبارک باد دیتا ہوں"۔

ڈاکٹر **محی الدین** صاحب زورؔ قادری ارشاد فرماتے ہیں:۔ "میں نے محسوس کیا کہ ادبی دنیا کا سالنامہ اس سال کا بہترین سالنامہ ہے۔ تعجب ہے کہ آپ کے ادارے پر جنگ کے اثرات نہیں پڑے رنگین تصویروں میں چغتائی کی تصویر میرے بہت پسند آئی"۔

سعید احمد صاحب اعجازؔ لکھتے ہیں:۔ "حیرت ہے کہ علمی ادبی مضامین کی داد دیجئے یا افسانوں اور ڈراموں کی لطیف فن کاری کو سراہیئے یا پھر تصاویر کے نگارخانے میں کھو جایئے۔ "ادبی دنیا" اُردو ادبیات کا ایک نہایت نظر فریب پھول ہے جو سال بہ سال، نو بہ نو رنگ سامانیوں کے ساتھ کھلتا ہی جا رہا ہے۔ اور یہ واشگفت باصرہ نواز بھی ہے اور ترنم پاش بھی۔

احمد ندیم صاحب قاسمی فرماتے ہیں"۔ اس سالنامے سے پہلے سالنامے کو میں آپ کی کوششوں کی آخری معراج سمجھتا تھا، لیکن اب مجھے احساس ہوا ہے کہ صحیح ادب کی آخری منزل کوئی نہیں۔ کرشن چندر، عصمت چغتائی میراجی۔ حمید احمد خاں۔ فانی راشد اور عادم کی زبان زندہ رہے گی اور رہتی دنیا تک زندہ رہے گی۔

شبیر حسن صاحب رقمطراز ہیں:۔ "حقیقت سے دُور نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ آپ کا سالنامہ دیکھ لینے کے بعد یہ معلوم کرنا آسان ہو جاتا ہے کہ ایک سال کے اندر اہل قلم حضرات نے اُردو ادب کو کتنی ترقی دی ہے . . . . آپ کے حسنِ ترتیب اور حسنِ انتخاب نے خالص علمی مضامین اور ادبِ لطیف کے امتزاج سے سالنامہ کو خاص و عام دونوں کے لئے دلچسپ بنا دیا ہے"۔

جناب **اخترؔ** انصاری تحریر فرماتے ہیں:۔ "غالبًا یہ کہنا کہ ادبی دنیا کا یہ خاص نمبر ایک بےمثل چیز ہے۔ ایک فرسودہ سی بات ہو گی۔ ملک کے ادبی حلقوں میں یہ امر ایک امرِ مسلمہ کی حیثیت رکھتا ہے کہ ادبی دنیا کا سالنامہ ادب اور آرٹ کا ایک عدیم النظیر مرقع ہوتا ہے"۔

جناب **سادھو رام** صاحب تاجورؔ سامری لکھتے ہیں:۔ سالنامہ شروع سے آخر تک پڑھ چکا ہوں۔ لیکن ابھی طبیعت نہیں بھری۔ کرشن چندر کا افسانہ ایک بالکل نئی چیز ہے۔ میں خود کو اب تک اسکی فضا میں کھویا ہوا پاتا ہوں۔ عصمت صاحبہ ایک جدید طرز کی موجد ہیں۔ مستقبل میں ان کی ذات سے بہت سی اُمیدیں وابستہ ہیں"۔

تو یہ ہیں چند گرامی قدر آراء کے خلاصے۔ اُمید ہے کہ آپ انہیں پڑھ کر مسرور ہوں گے کہ ادبی دنیا کی کامیابی آپ کے ذوقِ ادب کی رہین ہے۔

موجودہ نمبر کے مضامین میں دو خاص چیزیں ہیں۔ ممتاز مفتی صاحب کا اَندھیرا اُردو میں ایک جدید قسم کا افسانہ ہے اور ممتاز مفتی صاحب کے فلسفیانہ اندازِ نگارش کی ایک بہت اچھی مثال ہے۔ زندگی کے اندھیرے میں ہم لوگ پُتلوں کی طرح اپنا پارٹ ادا کرکے آگے روانہ ہو جاتے ہیں۔ ہمارے جذبات اور اعمال ہماری حرکت اور سکون، ہمارا اُٹھنا بیٹھنا، ہمارا ہنسنا اور رونا یہ سب کچھ ایک میکانکی عمل کی طرح ہم سے سرزد ہوتا ہے، ہمارے دل رو رہے ہوں لیکن لوگوں کے سامنے ہم مسکرانے پر مجبور ہیں، ہم اپنے انفرادی جذبات وخیالات کے لحاظ سے خواہ کیسے ہوں مگر دنیا کے نزدیک ہمیں ایک مقررہ ظاہری صورت اختیار کرنا ہوتی ہے۔ پھر اس وحشت انگیز اور تاریک ماحول میں اگر کبھی کبھار روشنی کی وہ کرن ہمیں فریب حیات میں مبتلا کر دیتی ہے جو عورت کے تبسم سے پھوٹتی ہے۔ تو ہم اسی طرح مجبور ہیں جس طرح مفتی صاحب کے افسانے کے پُتلے۔

یادش بخیر ہمارے عزیز دوست مالک رام صاحب ایم اے آج کل مصر میں مقیم ہیں اور وہاں وطن کی اور محبوب چیزوں کی طرح ادبی دنیا کو بھی یاد رکھتے ہیں۔ اس دفعہ ان کا ایک بہت اچھا مضمون شائع ہو رہا ہے جو اگرچہ مرزا اسد علی کی کتاب "قتیل اور غالب" کی بعض غلط بیانیوں کا جواب ہے، لیکن درحقیقت غالبیات میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ غالب سے دلچسپی لینے والے حضرات میں سے اگر کوئی صاحب اس کا جواب لکھیں تو ہمیں اس کی اشاعت میں کوئی اعتراض نہ ہوگا بلکہ خود مالک رام صاحب کی بھی یہی خواہش ہے۔

سالنامہ کے سلسلے میں جن افسانوں اور مضامین پر ہدیے پیش کئے جا رہے ہیں اُن کا اعلان کہیں اور ملے گا۔ یہاں صرف اس قدر کہنا ہے کہ سالنامے کا افسانوی حصہ بہت زیادہ پسند کیا گیا تھا، اس لئے تمام افسانوں اور ڈراموں کو انعامی فہرست میں شامل کر لیا گیا ہے۔ البتہ ہمارے دوست کرشن چندر صاحب نے غالبًا کسی مصلحت کی بنا پر، ہمیں اپنا نام اس فہرست میں شامل کرنے کی اجازت نہیں دی۔ ان کی اس دست برداری کا ہمیں افسوس ہے۔

صلاح الدین احمد

(۲)

پچھلے مہینے حصۂ نظم میں سلام مچھلی شہری کی ایک نظم "ملاح کی بیوی"، شائع ہوئی تھی۔ بعض لوگوں نے اس نظم کو سرقہ خیال کیا۔ وجہ یہ تھی کہ اس سے پیشتر جنوری ۱۹۳۸ء میں "ادبی دنیا" ہی میں تخت سنگھ کی ایک نظم "ماہی گیر کی بیوی"، کے عنوان سے چھپی تھی۔ میں نے دوسری نظم کی اشاعت سے پہلے پہلی نظم نہ دیکھی تھی۔ اور اگرچہ سلام مچھلی شہری نے پروفیسر فراق گورکھپوری کے سمجھانے پر یہ کہہ کر مجھے نظم کی اشاعت روکنے کے لئے لکھ دیا تھا کہ اس قسم کی کوئی نظم کسی اور جگہ شائع ہو چکی ہے لیکن جب ان کا خط پہنچا تو فروری کا شمارہ پریس میں تھا۔ میرے خیال میں غالباً دونوں نظمیں کسی انگریزی نظم کا ترجمہ ہیں کیوں کہ اردو شعراء کے لئے ساحل سمندر کی دُوری کے باعث ماہی گیر کی بیوی اور اُس کے جذبات ایک دُور ہی کی بات ہیں۔ برعکس اس کے مغرب کی زندگی میں ایسے تصوّرات ایک لازمہ، بہر حال اگر میرا خیال صحیح ہے تو ایک ہی مغربی نظم کے ان دو ترجموں میں توارد کی ایک دلچسپی یہ بھی ہے کہ تین مصرعے یکساں ہو گئے ہیں۔ باقی نظم مفہوم میں یک رنگ لیکن الفاظ میں مختلف ہے۔

یہ شمارہ مارچ کا ہے۔ بسنت آ چکی ہے۔ اور شاعروں کے دلوں میں معلوم نہیں کیسے کیسے خیالات اور جذبات کی لہریں کروٹیں لے رہی ہوں گی۔ ممکن ہے کہ کوئی انفرادی شاعر میر تقی کا ہمنوا ہو کر کہہ رہا ہو کہ "دھوم ہے پھر بہار آنے کی، کچھ کرو فکر مجھ دوانے کی" یا شاید حفیظ جالندھری کی زبان میں یہ پیغام دینے کو تیار بیٹھا ہو کہ "یہ دامن ہے، یہ ہے گریباں آؤ کوئی کام کریں، موسم کا منہ تکتے رہنا کام نہیں دیوانوں کا"____ لیکن اندرجیت شرما ادبی دنیا کا مستقل نغمہ خواں ہے۔ اور "بسنت کی دیوی" کے چرنوں میں ایک احساسِ ستائش کی بھینٹ چڑھانے کو تیار ہے۔ مناظرِ قدرت سے ایسا احساسِ ستائش آریاؤں کے وقت سے ہندوستانیوں کی فطرت کا خاصہ ہے۔ اگرچہ اس نظم کی ہیئت گیت کی نہیں، لیکن موضوعی لحاظ سے نیز اپنی ایک اندرونی خاصیّت کے باعث (جو شاید مجھی کو محسوس ہوتی ہو) اس میں گیت کا ایک ایسا بہاؤ ہے۔ جس نے میرے دل کو رقص میں لا دیا اور میرے ذہن کو شادماں اور مگن کیفیتوں سے بھر دیا۔ اور میں کہوں گا کہ آپ بھی (اگر گا سکتے ہوں تو) اسے گا ہی کر پڑھیں"

بسنت کے اس چھلکتے ہوئے نغمے کے بعد اگر میں ایک اس سے بالکل مختلف چیز کا ذکر کروں تو اسے محض تضاد پرستی تصور کیا جائے "خاکبازی" میں آہنِ حزیں کا فلسفیانہ اندازِ نظر پوری طرح جلوہ گر ہے۔ اگرچہ اس کے بہت سے پر ابہام کا اندیشہ ہوتا ہے لیکن یہی ابہام ظاہر کرتا ہے کہ شاعر کس شدت سے تفکر میں ڈوبا ہوا ہے۔ اور اگرچہ اُس کا موضوع صرف خاک، خاکی، خاکبازی ہی ہے لیکن اُس کی نظر میں مقابلے کے لئے اس تحریکِ شعری کے وقت یہ نظامِ شمسی تو کیا، نظامِ قدرت کی تمام کائناتیں ہیں۔ اس نظم کے متعلق ایک نکتہ اور بھی یاد رکھنے کے لائق ہے اور وہ یہ کہ ترقی پسند کلام کے لئے ضروری نہیں کہ شاعری سے دست بردار ہوا جائے۔ شاعری ایک اندازِ نظر کا نام ہے۔ جس میں انفرادیت کا زور خود بخود لوگوں کو جگا سکتا ہے،

سعید احمد اعجاز کی "دو نظمیں"، اپنی ایک علیحدہ شان رکھتی ہیں۔ معلوم نہیں کہ یہ اختصار چین کا اثر ہے یا جاپان کا۔ البتہ اتنا میں کہہ سکتا ہوں کہ "زورِ خطابت" ایک جوہر ہے۔ جس کے پرکھنے کو نہ صرف جدید اردو شاعری کے ارتقا سے واقفیت ضروری ہے بلکہ دینیات، اور ارضیات و نجمیات میں سدھ بدھ بھی درکار ہے۔ دوسری نظم "ارادہ" پنجابی شاعری کا تاثر ہے اور اس بات کا ثبوت کہ پنجاب کے شعرا اپنے وطن سے دور رہ کر بھی اپنی وطنی روح کو برقرار رکھتے ہیں۔

تاجور سامری ہمیشہ اپنی نظم میں ایک مستقل فضا قائم کر دیتا ہے۔ اور اس کی یہ نظم بھی اس لحاظ سے استثنا نہیں ہے "اندھیری رات کے سناٹے میں"___ اگر اس عنوان کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو نظم کے پہلے آدھے حصے میں وہ صرف منظر باندھتا ہے۔ "پھر راہیں چپ چاپ آہیں بھرتی ہیں"۔ ایسے مصرعوں سے وہ اپنی دلی کیفیت اور حزن و ملال کی طرف قاری کو غیر شعوری طور پر متوجہ کرتا ہے۔ یہاں تک کہ نظم کے مرکزی مقام تک پہنچ کر اپنے شاعرانہ کردار کو سامنے لے آتا ہے۔ اور پھر اُس کی

دلی کیفیت کے بارے میں ایک آدھ بات کہہ کر اپنے ساز کو رکھ دیتا ہے۔ یوں اپنے موضوع کے لئے قاری کے ذہن کو تیار کرنے کا طریقہ ہی ایسی نظموں کی کامیابی کا راز ہوتا ہے۔

میراجی کی نظم "سنگِ آستاں" کی ایک دو باتوں کی طرف بھی آپ کی توجہ درکار ہے۔ پہلی بات اس کا فنی پہلو ہے۔ آزاد نظم میں بھی قوافی کی کھپت غیر شعوری اور بے ساختہ طریق پر ہو سکتی ہے، اس کا اظہار اس نظم میں ہو رہا ہے۔ دوسری بات اس کے استعارے اور اشارے ہیں، جن پر غور کئے بغیر اس کے صحیح مفہوم تک نہیں پہنچا جا سکتا۔ مثلاً "ستارے کے اُلجھنے کا جلوہ" سے مراد وہ پہلا منظرِ تخلیق ہے جب ایک ستارہ سورج کے قریب آیا تھا اور دونوں کی باہمی کشش سے سورج کا کچھ حصّہ فضا میں بکھر کر ہمارے موجودہ نظامِ شمسی کی تخلیق کا باعث بنا۔ اسی طرح "پنچھی"، "دھرتی کا جنگل"، "تاریک غار"، "گوہرِ مقصود" ان سب کے متعلق مطالعے سے پیشتر تعینِ مفہوم کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔ اور تیسری بات نظم کے پانچویں مصرعے میں ہے جہاں لکھنے والے نے محبوبہ کو "اے رات کے ساتی" کہا ہے۔ یعنی صیغۂ تذکیر میں مخاطب کیا ہے۔ اس سے صرف مقصود یہ ہے کہ لکھنے والے کو تمدنی احساسِ تذکیر و تانیث نہیں ہے وہ نر اور مادہ کے بنیادی تصور کو نگاہوں میں رکھے ہوئے ہے۔

میراجی

مضمون نگار حضرات سے

بعض مضمون نگار حضرات نے فروری کا شمارہ نہ پہنچنے کی شکایت کی ہے اس لئے جن اصحاب کو یہ نمبر نہیں ملا وہ دفتر میں اطلاع دے دیں تاکہ انہیں پرچہ دوبارہ بھجوا دیا جائے۔

مینجر

سالنامے کے انعامات

نظیر اکبر آبادی — جناب ظہیر الدین احمد — منصور گولڈ میڈل

(عطا کردہ ملک عطا اللہ کلیم)

مضمون	مصنف	انعام
۱۔ مہدی الافادی الاقتصادی کا اسلوب نگارش	جناب احمد صدیق مجنوں گورکھپوری	پندرہ روپے
۲۔ شادی	محترمہ عصمت چغتائی	گیارہ روپے
۳۔ کونپل	جناب اُپندر ناتھ اشک	دس روپے
۴۔ شوہر کی بھوک ہڑتال	جناب ناکارہ حیدر آبادی	دس روپے
۵۔ نفرت	جناب ممتاز مفتی	دس روپے
۶۔ یہ بھی۔ وہ بھی	جناب دھرم پرکاش آنند	دس روپے
۷۔ چھوکری کی لُوٹ	جناب راجندر سنگھ بیدی	دس روپے
۸۔ تناؤ	جناب شاہد احمد	دس روپے
۹۔ دیہاتی لڑکی	جناب طاہر قریشی	سات روپے
۱۰۔ بستر پر	جناب محمد صادق قریشی	سات روپے
۱۱۔ تیسری بہن	جناب فاروق علی خاں	دس روپے

حصہ نظم

نظم	شاعر	انعام
۱۲۔ بے کراں رات کے سناٹے میں	جناب ن۔ م۔ راشد	سات روپے
۱۳۔ سپاہی کی واپسی	جناب احمد ندیم قاسمی	پانچ روپے
۱۴۔ نسیم شوق (غزل)	جناب روشن صدیقی	پانچ روپے
۱۵۔ غزل	جناب ماہر القادری	پانچ روپے

اس ماہ کے ہدیے!

عنوان	صنف	انعام
۱۔ قتیل اور غالب	(مضمون)	دس روپے
۲۔ اندھیرا	(افسانہ)	دس روپے

آئینۂ عالم

روس، "جرمنی" اور "فن لینڈ"

پچھلے سال سے یورپی سیاست ایک ایسا معمّہ بن کر رہ گئی ہے۔ جس کا حل کرنا کسی کے بس کا روگ نہیں۔ اس معمّے کا بنانے والا ایک ہٹلر ہے۔ اور دوسرا جوزف سٹیلن یہ تو ظاہر ہی ہے کہ ان دونوں کا ملاپ صرف سطحی اور عارضی ملاپ ہے۔ لیکن اس سطحی اور عارضی ملاپ نے دنیا کو ایک ایسی جنگ میں مبتلا کر دیا ہے۔ جس کا انجام وہ خود بھی نہیں جانتے۔ جرمنی اور روس دونوں باقی یورپی طاقتوں سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ اور ان دونوں کو باقی طاقتوں نے اس طرح دبایا ہوا تھا کہ انہیں اپنی اپنی طاقت بڑھانے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔

اٹلی حبشہ اور البانیہ کو نگل چکا تھا۔ جاپان چین کو ہڑپ کر رہا تھا۔ برطانیہ اور فرانس کے پاس پہلے ہی ضرورت سے زیادہ علاقے تھے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر جرمنی کو آگ کیوں نہ لگتی۔ ہٹلر نے پہلے تو آسٹریا اور چیکوسلوویکیہ سنبھالا اِس کے بعد اُس کی نظر پولینڈ پر پڑی ادھر جرمنی کی بڑھتی ہوئی طاقت نے انگریزوں اور فرانسیسیوں کی آنکھیں بھی کھول دیں۔ اور انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ اگر آئندہ جرمنی اپنی طاقت کے ذریعے سے کسی ملک کو دبوچنے کی کوشش کرے گا تو اس صورت میں اسے ہوش میں لانا ضروری ہوگا۔ جرمنی کو شک سا ہو گیا تھا کہ ممکن ہے مغربی جمہوریتیں اُس کی اس خواہش کو کہ وہ اپنا کھویا ہوا اقتدار واپس حاصل کر لے، پورا نہ ہونے دیں اِس لئے اسے رُوس سے گانٹھنے کی سوجھی۔ وہ جانتا تھا کہ رُوس بھی برطانیہ، فرانس امریکہ، جاپان، اور اٹلی سے سخت بیزار ہے۔ اور وہ جرمنی کی مدد حاصل کرنے کے لئے کچھ قربانی پر بھی تیار ہو جائے گا۔ اور ہؤا بھی ایسا ہی۔ وہی روس جو لیگ آف نیشنز کا زبردست حامی تھا۔ اور کمزور طاقتوں کو بچانے کے لئے برطانیہ اور فرانس سے زیادہ بیقرار نظر آتا تھا۔ اسی روس نے پولینڈ کی تباہی کی داستان سنی لیکن کان بند کر لئے۔ اُسے اجڑتے ہوئے دیکھا لیکن خاموش رہا۔ پولینڈ کے دو حصّے کئے گئے۔ ایک تو جرمنی نے سنبھال لیا۔ اور دوسرا وہ حصّہ جس پر ایک زمانے میں روس کا قبض

رہ چکا تھا روس میں شامل کر لیا گیا۔

اب سٹالین کی دوربین نگاہوں نے دیکھا کہ اگر وہ فن لینڈ کو اپنے قبضے میں لینے میں کامیاب ہو جائے تو اس سے نہ صرف روس کا ہی ایک پہلو محفوظ ہو جائیگا۔ بلکہ سویڈن، ناروے اور چند ایک اور طاقتیں اس کے زیر اثر آجائینگی۔ چنانچہ

اکتوبر کو مولوٹاف نے فن لینڈ کو ان الفاظ میں دھمکی دی۔ روس چاہتا ہے۔ کہ فن لینڈ اُس کے ساتھ ایک دوستانہ معاہدہ کرے اگر ایسا نہ ہو سکا تو وہ مجبور ہو جائے گا کہ ضرورت کے مطابق کوئی قدم اٹھائے۔

۱۷ اکتوبر کو فن لینڈ سے مطالبہ کیا گیا کہ اپنے نمائندہ خصوصی کو بات چیت کرنے کیلئے روس بھیجے۔

۱۹ اکتوبر ڈاکٹر پاسے کوی (PAS Ai Kivi) فن لینڈ کی شرائط لیکر روس روانہ ہو گیا۔

۹ اکتوبر سے یکم نومبر تک دونوں حکومتوں میں تبادلہ خیالات ہوتا رہا۔

یکم نومبر کو فن لینڈ کے وزیر خارجہ نے ایک تقریر کے دوران میں کہا کہ فن لینڈ یہ کبھی گوارا نہیں کرے گا۔ کہ اپنی حفاظتی تدابیر کو چھوڑ دے اور فن لینڈ کو ایک ایسا چبوترہ بنا دے جس پر چڑھکر کوئی دوسری طاقت کسی اور پر حملہ کرنے کا کام لے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اُسنے لینن گراڈ کو زیادہ محفوظ بنانے کے لئے رُوس کی مدد کرنے کا وعدہ دیا۔

۱۲ نومبر۔ روس میں ایسے بیانات اخبارات میں نکلنے شروع ہو گئے جن سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ روس فن لینڈ پر حملہ کرنے کے بہانے تلاش کر رہا ہے، ایک روسی اخبار میں یہ مضحکہ انگیز خبر شائع کی گئی کہ فن لینڈ روس پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہا ہے جسے دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ایک چیونٹی ایک پہاڑ سے ٹکرانے کے لئے جا رہی ہے۔

۲۸ نومبر۔ روس نے اقدام جنگ نہ کرنے کا معاہدہ منسوخ کر دیا

۲۹ نومبر- مولوٹاف نے ایک ہٹلرانہ تقریر کے دوران میں کہا ہم فن لینڈ کی اندرونی حکومت میں کسی قسم کا دخل نہیں دینا چاہتے۔ ہم نہیں چاہتے کہ فن لینڈ سے اپنی پیش کردہ شرطیں منوائیں۔ لیکن ہم یہ ضرور چاہتے ہیں کہ فن لینڈ اپنے بیرونی تعلقات قائم کرتے وقت روس کا خیال رکھے۔ فن لینڈ اگرچہ ایک چھوٹی سی ریاست ہے۔ لیکن وہ ہمارے دشمنوں کے لئے ہمارے ملک میں داخل ہونے کے لئے ایک راہ گذار کا کام دے سکتی ہے۔

گو اس سے پہلے ہی فن لینڈ نے حفاظتی تدابیر اختیار کر لی تھیں لیکن فنش لوگ ابھی تک اس خیال میں تھے کہ روس انہیں محض ڈرا رہا ہے انہیں امید تھی کہ روس ۳۳-۱۹۳۲ء والے معاہدۂ عدم اقدام جنگ کا ضرور کچھ نہ کچھ خیال رکھے گا۔ اس معاہدہ کو ۱۹۴۵ء تک رائج رہنا تھا۔ اس معاہدے کی رو سے دونوں ملکوں کے لئے ضروری قرار دیا گیا تھا کہ ۱۹۴۵ء تک اپنے تمام باہمی جھگڑے آپس کی گفت وشنید سے طے کریں۔ اس کے علاوہ فن لینڈ کی اس غلط فہمی کی ایک اور بھی وجہ تھی۔ وہ یہ کہ باقی تمام دنیا کی طرح وہ اس مغالطے میں مبتلا تھا کہ روس جرمنی کی دوستی پر زیادہ اعتبار نہیں کرے گا۔ روس کو ابھی ۱۹۱۸ء کا وہ واقعہ یاد تھا جب جرمن فوجوں نے روسی فوجوں کو بری طرح فن لینڈ سے باہر نکالا تھا۔ روس کو اچھی طرح یاد ہوگا کہ ۱۹۱۹ء میں جرمنی کی مدد کی وجہ سے ہی فن لینڈ نے ایک آزاد ملک کی حیثیت حاصل کی تھی۔ فن لینڈ کو یہ جاننا چاہئے تھا کہ ۱۹۱۸ء کے جرمنی اور ۱۹۴۰ء کے جرمنی میں زمین آسمان کا فرق آچکا ہے۔ اور یہی حال روس کا ہے۔

۳۰ نومبر کو اچانک روسی ہوائی جہازوں نے فن لینڈ پر گولے برسانے شروع کر دیئے۔ روسی فوجیں فن لینڈ کے برفانی علاقوں میں بڑھنی شروع ہوگئیں اور روس نے ایک ایسی جنگ شروع کر دی جسے نہ صرف برطانیہ اور فرانس نے بلکہ امریکہ، اٹلی اور سویڈن نے بھی ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھا۔ یہ ممالک نہ صرف روس کے اس وحشیانہ حملے کی مذمت کر رہے ہیں بلکہ فن لینڈ کی ہر طرح سے مدد بھی کر رہے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ یہ ننھی سی حکومت اپنے سے ساٹھ گنا بڑی طاقت کا نہایت بہادری سے مقابلہ کر رہی ہے۔

وارسا

دنیا میں چند ایک شہر ایسے بھی ہیں جن کی سرزمین ہر چالیس پچاس سال کے بعد خون سے نہانے کی متمنی رہتی ہے۔ اور قدرت بھی ان کی یہ خواہش پورا کر دیتی ہے۔ ان شہروں میں سے ایک وارسا ہے جو پولینڈ کا دارالحکومت تھا۔ ۱۹۳۹ء سے پہلے یہ شہر بیسیوں بار تباہ وبرباد ہو چکا ہے۔ اور لاکھوں ہی انسان اسے فتح کرنے یا اس کی حفاظت کرنے میں اپنی جانیں گنوا چکے ہیں ۱۵۹۶ء میں پہلی بار وارسا پولینڈ کا دارالحکومت قرار دیا گیا۔ اس واقعہ کو ابھی ۶۰ برس بھی نہ گذرے تھے کہ اسے ہوہنزولیرن خاندان کے ایک ممتاز رکن نے پامال کیا۔ حملہ آور کا مقصد چونکہ محض لوٹ کھسوٹ تھا اس لئے وہ چند ہزار جانیں تلف کرنے اور مال وزر لوٹنے کے بعد چلتا بنا۔ مگر اہل وارسا نے دو چار سال کے عرصے میں ہی اپنی محنت اور ہمت سے شہر کی حالت پھر درست کر لی۔ اس کے بعد ۵۰ سال تک اس شہر میں امن وامان رہا۔ لیکن اس کے بعد اسے متواتر دو ایسی بلاؤں کا سامنا کرنا پڑا جن کی وجہ سے یہ پر رونق شہر صحرا کی طرح بے رونق اور بے جان ہو گیا پہلے تو سویڈن کی فوجوں نے اسے بری طرح لوٹا اور ابھی اس لوٹ کو چند مہینے ہی گذرے تھے۔ کہ پلیگ نے آن گھیرا۔ اور پلیگ کے ساتھ ہی قحط بھی آپہنچا۔ پھر کیا تھا۔ آبادی کا ۹۰ فی صدی حصہ موت کی نیند سو گیا قدرت نے وہ کچھ کر دکھایا جو بیرحم سے بیرحم دشمن بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اٹھارویں صدی کے وسط سے اس کے خاتمے تک وارسا کی بے جان لاش کو دو تین بار چیرا پھاڑا گیا۔ روس اور پرشیا نے انتہائی کوشش کی کہ اس بدنصیب شہر کا نقشہ اس طرح بگاڑا جائے کہ یہ پھر کبھی اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل نہ ہو سکے۔ لیکن پولش جوانمردوں پر ان حوادث کا کچھ اثر نہ ہؤا۔ ۱۷۹۴ء میں بہادر پولوں نے روسی محافظ فوج کو شکست دے کر اسے مجبور کر دیا کہ وہ شہر چھوڑ کر چلی جائے۔ روسی نکل تو گئے مگر زیادہ عرصہ کے لئے نہیں۔ وارسا کی خوبصورتی اور مال ودولت نے انہیں مجبور کیا کہ دوسرے سال ہی وہ پھر ادھر کا رخ کریں اور اس دفعہ وہ اکیلے نہیں آئے بلکہ اپنے ساتھ پرشیا کی فوجیں لے آئے۔ ان دونوں فوجوں نے مل کر شہر پر قبضہ کر لیا۔ ہزاروں بے گناہ شہریوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی۔ اس حملے کے کئی سال بعد تک بربادی، بیماری، قحط یکے بعد دیگرے اس بدنصیب شہر کے مہمان بنے رہے۔

ٹلسیٹ ۱۸۰۷ء کے معاہدے نے پولوں کی ایک بار پھر ہمت افزائی کی۔ وارسا کی آبادی سرعت کے ساتھ ترقی کرنے لگی۔ مگر تھوڑے ہی عرصہ بعد روسی سازشوں نے اسے پھر آن گھیرا مگر اس کے باوجود شہر کی آبادی جلد ہی ایک لاکھ چالیس ہزار تک جا پہنچی۔ ۱۸۳۰ء میں پولوں نے ایک بار پھر آزاد ہونے کی کوشش کی، وہ لگاتار ایک سال روسی فوجوں سے لڑتے رہے۔ بے شمار آزادی کے پرستار آزادی کی دیوی کے بھینٹ ہو گئے پھر بھی وہ دیوی کو خوش نہ کر سکے۔

اوین پیسکویچ پولش فوجوں کو شکست دے کر شہر پر قابض ہو گیا اور اس نے مصیبت زدہ شہریوں پر ایسے ایسے ظلم ڈھائے کہ دنیا کی تاریخ ان کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہے۔ شہر کا کونہ کونہ خون میں رنگ دیا گیا۔ شاید ہی کوئی ایسا گھر ہو گا جس کے باہر لاشیں تڑپتی ہوئی نظر نہ آئیں۔ بچے بوڑھے۔ عورتیں بے دریغ قتل کر دی گئیں۔ عورتوں کو ننگا کر کے بازاروں میں پھرایا گیا۔ لیکن مشکل سے تیس سال ہی گذرے ہوں گے کہ یہ شمع آزادی کے پروانے اپنی جانیں ہاتھوں میں لئے ایک بار پھر روسی فوجوں کے مقابلے میں ڈٹ گئے۔ کئی بار روسی سپاہی ان بھوکے، کمزور پولوں کے حملوں کی تاب نہ لا کر بھاگ کھڑے ہوتے تھے۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد تازہ دم روسی فوجیں پھر شہر کا محاصرہ کر لیتی تھیں۔ آٹھ مہینے کے کشت وخون کے بعد شہر پر روسیوں کا پھر سے قبضہ ہو گیا۔ اور پہلے کی طرح شہیدوں کے خون کی ندیاں گلی کوچوں میں چل نکلیں۔ لیکن یہ تمام جسمانی اذیتیں اور تکلیفیں پولوں کی آزادی کی خواہش کو دبا نہ سکیں۔

گذشتہ جنگ عظیم کے شروع ہوتے ہی پولینڈ ایک بار پھر آزادی کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ ۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۸ء تک اگرچہ بظاہر جرمن پولینڈ پر قابض رہے۔ لیکن اس عرصے میں بھی سوائے چند ایک بڑے شہروں کے باقی تمام پولینڈ آزاد تھا۔ اور ان بڑے شہروں میں سے ایک آفت کا مارا وارسا بھی تھا۔ جہاں جرمنوں نے بڑی مضبوطی سے پاؤں جما رکھے تھے۔ ۱۹۱۸ء میں پولینڈ آزاد ملک قرار دیا گیا۔ لیکن روسی پہلے سے ہی تاک میں تھے۔ ان کے غول کے غول آئے دن پولینڈ کے کسی نہ کسی حصے پر حملہ آور ہونے لگے مگر ۱۹۲۰ء میں تو پولش فوجوں نے اُن کے ایسے دانت کھٹے کئے کہ پھر انہیں اس طرف کا رخ کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ ان کی ہمت نے جواب دے دیا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد ان کی جگہ جرمنی نے ڈنزگ اور کرایڈر Corridor کا بہانہ تلاش کر کے اپنی توپوں کا منہ پولینڈ کی طرف پھیر دیا۔ وارسا کو یکبارگی توپوں ٹینکوں اور ہوائی جہازوں کے حملوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اس شہر کے بہادر باشندوں نے ایک دفعہ پھر بہادری کے وہ جوہر دکھلائے کہ دشمن کو بھی اعتراف کرتے ہی بن پڑی۔ اہل وارسا نے موت کو غلامی پر ترجیح دی اور ہنستے ہوئے جرمنی کی بے رحمی کی آگ میں جل گئے۔ لیکن پیچھے ہٹنے کا نام نہ لیا۔ کئی دن تک جرمنی ہوائی جہاز نہتے شہریوں پر بمباری کرتے رہے جرمنی ٹینک اس آفت زدہ شہر کی دیواریں توڑتے۔ اور جرمن توپوں کے زہر آلودہ گولے لاکھوں، جوانوں، بوڑھوں بچوں اور عورتوں کو موت کے آغوش میں سلاتے گئے۔ آخر جانِ ناتواں کب تک مقابلہ کرتی۔ ایک وقت آگیا کہ وارسا میں سوائے زخمیوں بچوں اور بوڑھوں کے کوئی نہ رہا۔ وارسائیوں کی عام قربانیاں اسے ان درندوں کے پنجوں سے نہ بچا سکیں۔ اور جرمن فوجیں کافی نقصان اٹھانے کے بعد آخر شہر پر قابض ہو گئیں۔

لیکن ہم آج بھی وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ شہر زیادہ عرصہ غیر ہاتھوں میں نہیں رہ سکتا اور نہیں رہے گا پولوں کی نہ مٹنے والی ہمت ایک دفعہ پھر حملہ آور سے بدلہ لینے کے لئے شمشیر بکف ہو جائے گی۔ اور اپنے عمر رسیدہ معزز شاعر پیڈرو سکی Pederewski کے لئے ایک بار پھر ایسی فضا پیدا کر دے گی جس میں وہ پہلے کی طرح آزادی کے گیت گائے۔

عنایت احمد

شعر

یہ دامن ہے یہ ہے گریباں آؤ کوئی کام کریں
موسم کا منہ تکتے رہنا کام نہیں دیوانوں کا

(ابو الاثر) حفیظ جالندھری

بسنت کی دیوی

کیا شان ہے تری دیوی بسنت کی اب نام کو کہیں افسردگی نہیں
پھولا ہوا ہے بن خوش رنگ ہے چمن بیدار ہے جہاں ہشیار ہے جہاں
سبزے کا یہ نکھار پھولوں کی یہ بہار دل میں امنگ ہے ذرّوں میں جنگ ہے
دلکش ہیں قہقہے ہیں خوب چہچہے عالم پہ چھا گئی دیوی بسنت کی
کیا شان ہے تری دیوی بسنت کی

اے انبساطِ دل تو ہے نشاطِ دل
سرسوں کا راج ہے سونے کا تاج ہے سینے میں اب چمک جذبات میں بھڑک
چلتی ہے کیا ہوا اُڑتا ہے کیا طلا اونچی ہوا میں اُڑ رنگیں فضا میں اُڑ
پھولوں کی ساریاں کیسر کی کیاریاں تو ہے مری پری
رکھتی ہے دل کشی دیوی بسنت کی دیوی بسنت کی

اندر جیت شرما

قتیل اور غالب

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے — جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے
کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو — عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے
پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق — سامانِ صد ہزار نمک داں کئے ہوئے
پھر بھر رہا ہوں خامۂ مژگاں بہ خونِ دل — سازِ چمن طرازیٔ داماں کئے ہوئے
دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے — پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے
پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا — جاں نذرِ دل فریبیٔ عنواں کئے ہوئے

۱۹۴۷ء کی گرمیوں کا ذکر ہے جب مجھے پہلی دفعہ خیال پیدا ہوا کہ غالب کے سلسلے میں آج تک جو کچھ شائع ہوا ہے اسے جمع کیا چاہئے لازماً سب سے پہلا کام "قاطع برہان" اور اس معرکے کی جملہ مطبوعات کو جمع کرنا تھا۔ میں نے نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی بہادر کی خدمت میں ایک خط لکھا کہ آپ کے یہاں کتب خانۂ حبیب گنج میں کون کونسی کتاب موجود ہے۔ اب یہ تو مجھے یاد نہیں رہا کہ "قاطعِ برہان" کے علاوہ انہوں نے کونسی دوسری کتاب کا نام لکھا تھا مگر اس کے ساتھ ہی تحریر فرمایا کہ یہ وقتی اور ہنگامی بحثیں تھیں اس لئے میں نے ان تمام کتابوں کو مہیا کرنے کی کوشش نہیں کی۔

یہ رائے ہے اہلِ نظر کی اُن ایک درجن کتابوں اور رسالوں کے متعلق جو طرفین سے شائع ہوئے تھے اور جن کی اشاعت سے سات آٹھ برس تک ہندوستان بھر کے علمی اور ادبی حلقوں میں گویا ایک طوفان سا بپا رہا۔ اس لئے میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب تھوڑے دن اُدھر مجھے معلوم ہوا کہ دہلی سے ایک کتاب "قتیل اور غالب"[1] شائع ہوئی ہے۔ کیونکہ قاطع برہان والے جھگڑے کی تو کچھ بنیاد بھی تھی قتیل کے متعلق تو غالب نے کچھ لکھا ہی نہیں۔ لے دے کے ان کے خطوط میں دس پندرہ جگہ قتیل کا ذکر ہے اور وہ بھی ان کے مخصوص طنز اور ظرافت کے انداز میں، نہ سنجیدگی سے کوئی اعتراض کیا ہے، نہ اُن کی کسی عبارت یا تحریر پر نکتہ چینی ہی کی ہے پھر یہ "قتیل اور غالب" کے موضوع پر کتاب کیسی! اور بالآخر جب میں نے یہ کتاب دیکھی تو یہ حیرت، افسوس اور تعجب کے جذبات میں تبدیل ہو گئی۔ افسوس مکتبۂ جامعہ پر اور تعجب جناب اسد علی انوری فریدآبادی کی جرأت پر۔

جیسا کہ اس کے عنوان سے ظاہر ہے یہ کتاب دو حصوں میں تقسیم ہو سکتی ہے۔ ایک وہ جس میں اُن موہوم اعتراضوں کا جواب دیا ہے جو مصنف کے خیال میں مرزا نے قتیل پر کئے ہیں اور دوسرا وہ جو غالب کی زندگی اور کلام پر اعتراضات اور نکتہ چینی پر مشتمل ہے۔ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ غالب کی زندگی پر صحیح اور غلط، جا اور بے جا جو اعتراض بھی آج تک کئے گئے ہیں یا کئے جا سکتے تھے وہ جناب اسد علی صاحب فریدآبادی نے اس میں درج کر دیئے ہیں اور مرزا غریب کے خلاف فردِ جرم اچھی خاصی طویل ہو گئی ہے۔ آپ بھی سن لیجئے:۔

۱۔ مرزا کی قصیدہ خوانی بھٹئی کے درجے تک پہنچ گئی تھی۔ جہاں ذرا سے فائدے (صلے) کی امید نظر آتی تھی یہ جھٹ اپنا قصیدہ پیش کر دیتے تھے۔
۲۔ اُنہیں ستائش کی بھی اتنی ہی تمنا تھی جتنی بر دے اعتراضِ سابق صلے کی پروا تھی۔
۳۔ وہ ابن الوقت اور بے غیرت تھے۔
۴۔ اُن کی اسلام دوستی اور وطن پرستی بھی محض برائے بیت تھی۔
۵۔ انہیں اپنی بیوی سے قطعاً کوئی محبت نہیں تھی بلکہ وہ اُن سے بیزار تھے۔
۶۔ بیوی کے علاوہ اور سب متعلقین سبھی سے بھی اُن کے تعلقات

[1] از سید اسد علی انوری فریدآبادی۔ ملنے کا پتہ مکتبۂ جامعہ دہلی نمبر ۱۳۰ صفحے قیمت ۸ ر۔

ایسے ہی بیزاری کے تھے ،

۷۔ ولیم فریزر کے قتل کے معاملے میں انہوں نے نواب شمس الدین احمد خاں کی بوجہ دشمنی چغلی کھائی۔

۸۔ انہوں نے اپنے بھائی میرزا یوسف اور ان کے اہل دعیال کی غدر اور اس کے بعد کوئی خاص مدد نہ کی۔

۹۔ ان کی اپنی ضرورتیں اتنی بڑھی ہوئی تھیں کہ وہ کسی کی خاطر اپنے آرام کو قربان نہیں کرتے تھے اور نہ اپنے تئیں خطرے میں ڈالتے تھے۔

۱۰۔ انہوں نے دوران غدر میں دستنبو کی تصنیف اس لئے شروع کی تاکہ آئندہ چل کر اس کی وجہ سے اپنی بریت ثابت ہو۔

۱۱۔ انہوں نے "دساتیر" اور "برہان قاطع" کی مدد سے دستنبو لکھی۔

۱۲۔ ان کے حالات ایسے رہے کہ غدر سے پہلے انہیں اتنا اطمینان نہ مل سکا کہ وہ قتیل سے پورا پورا انتقام لے سکیں ، "برہان قاطع" کا تو بہانہ تھا۔ اصل مقصود قتیل سے بدلہ لینا تھا۔

۱۳۔ وہ بالارادہ شگفتہ اور بے ساختہ اردو نثر لکھنے کے اہل ہی نہیں تھے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ یہ فیصلہ کرنے کے بعد کہ رقعات چھپوائے جائیں گے اور جو رقعات انہوں نے اس نیت سے لکھے کہ وہ اس مجموعے میں شامل ہوں وہ پہلے رقعوں کے مقابلے میں بہت کم درجے کے ہیں مثلاً نامۂ غالب۔

۱۴۔ ان کے اردو کلام میں شتر گربہ، غیر مستحسن مقدرات، نامکمل مضمون تحریف فی محاورہ، غلط محاورہ، حشو و زوائد، غیر فصیح الفاظ۔ سوقیت وغیرہ کی عام مثالیں ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے بیشمار ایسے اشعار ہیں جو نہ اردو کے ہیں نہ فارسی کے اور گو توجیہہ اور تاویل کرنے کو کر لی جائے لیکن اکثر ان میں سے بے معنی ہیں۔

۱۵۔ وہ ایک معیار بناتے ہیں پھر اس خود ساختہ معیار کو قدم قدم پر ڈھاتے ہیں۔ ابھی کچھ کہتے ہیں ابھی کچھ اور، گویا معیار و عیار کچھ نہیں، اصل معیار میرزا غالب کا قول ہے اب جو جو اس سے متفق ہیں وہ سب مسلّم الثبوت ورنہ ناقابل قبول۔

یہ ہیں پندرہ اہم اعتراض۔ لیکن اس سے یہ خیال نہ کیا جائے کہ تنقیص و تحقیر کی یہ داستان یہیں ختم ہو جاتی ہے۔ بلکہ انہیں خاکہ سمجھئے اس میں جنابِ اسد علی صاحب نے جو رنگ بھرے ہیں اور یہیں اسطور جو کچھ ودفعا گئے ہیں استغفراللہ وہ بھلا کس طرح بیان ہو سکتا ہے۔ کتاب کا اسلوب بیان اور لب و لہجہ ایسا شریفانہ اور ادیبانہ بلکہ مودبانہ ہے کہ بے اختیار ان کے ہاتھ چوم لینے کو جی چاہتا ہے۔ اے داغ:

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

آئیے اب ذرا ان اعتراضوں پر ایک نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ ان میں کہاں تک صداقت ہے۔

قصیدہ خوانی: جناب اسد علی صاحب فرماتے ہیں کہ میرزا کا یہ مصرعہ

نہ ستائش کی تمنا، نہ صلے کی پروا

واہمہ ہی واہمہ ہے، انہیں دونوں کی اتنی تمنا اور پروا تھی کہ جہاں سے ذرا سے فائدے کی امید نظر آتی تھی یہ جھٹ اپنا قصیدہ پیش کر دیتے تھے سب سے اول تو پورا شعر سن لیجئے۔

نہ ستائش کی تمنا، نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

اور اب اس کا شانِ نزول دیکھا چاہیے۔

یہ شعر ان کے اس دیوان کے متن میں شامل ہے جو بھوپال سے "نسخۂ حمیدیہ" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ گو یہ شعر میرزا نے پچیس برس کی عمر سے پہلے کہا ہے اور اس کے حقیقی مخاطب وہ لوگ تھے جنہوں نے ان کے کلام پر مہمل اور گوہ کندن و کاہ برآوردن کے مصداق ہونے کا اعتراض کیا تھا۔ جن لوگوں نے برسر مشاعرہ کہا تھا۔

کلام میر سمجھے اور زبان میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

جن لوگوں نے ان سے بجنیس کے انڈے والا شعر منسوب کرکے در پردہ یہ کہنے کی جرأت کی تھی کہ تم ایسے مہمل شعر بکتے ہو۔ اس قماش کے تمام لوگوں کو جن کے تتبع میں آج جنابِ اسد علی صاحب بھی میرزا کے اکثر شعروں کو مہمل بتا رہے ہیں، مخاطب کرتے ہوئے میرزا نے کہا کہ تم لوگ میرے شعروں پر اہمال کا اعتراض کرتے ہو۔ میری بلا سے۔ مجھے نہ تم ایسے ناشناسوں کی ستائش کی تمنا ہے اور نہ تم ایسے ذہنی افلاس کے ماروں کے صلے کی پروا، یہی دو چیزیں ہیں نا جن کی ایک شاعر کو آرزو ہوتی ہے! مجھے تم سے ایسی کوئی توقع ہی نہیں پھر میں تمہارے اعتراضوں کی کیوں پروا کروں!

مگر زمانے نے دیکھا کہ ان کی زندگی میں یہی منکر اور معترض ان پر ایمان لے آئے۔ ہندوستان کے بہترین نقادوں نے ان کے کلام کی

ستائش کی اور قدر شناس رئیسوں نے انہیں عطیئے اور وظیفے عطا کئے اور ان کے مرنے کے بعد تو جو کچھ زمانے نے کیا ہے وہ "حساد تنگ چشم" کو آتش زیر پا کرنے کو کافی ہے۔

غرضکہ جب معلوم ہو کہ یہ شعر میرزا نے کب اور کن حالات میں کہا تو یہ مورد طنز و اعتراض نہیں ہوسکتا۔

لیکن یہ تو بتائیے کہ یہ قصیدہ نگاری اور بھٹئی ممنوع یا قابل اعتراض کب سے ہوئی ہے؟ کیا یہ گناہ صرف غالب ہی نے کیا جو اس پر زبان طعن دراز ہو رہی ہے یا ع این گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند۔ فارسی شاعری کے ابوالآبا رودکی سے لے کر ملک الشعرا بہار تک سب ہی قصیدے لکھتے آئے ہیں اور آج بھی فارسی کے بیشتر شعرا کا نام اُنہی قصیدوں کی بدولت زندہ ہے اور ان قصیدوں کے مدح کے حصّے میں جو زمین و آسمان کے قلابے ملائے گئے ہیں اور جس طرح غلو اور اغراق کو راہ دی گئی ہے، وہ بھی کسی سے مخفی نہیں۔ پھر اکیلا غالب کیوں معتوب ہو اور دوسرے کیوں فرشتے قرار پائیں۔ بالخصوص جب دونوں کے قصیدے میں مابہ الامتیاز ہے۔ غالب کے کلیات میں بیسیوں قصیدے ہیں۔ ان سب کو دیکھ لیا جائے۔ تشبیب کا حصّہ نہایت زور دار اور پرشوکت ہے۔ جونہی گریز کرتے ہیں اس میں کمزوری شروع ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ مدح پر آکر سارا زور ختم ہو جاتا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ شاعر بے دلی سے اپنی خواہش کے خلاف تعریفی و توصیفی کلمات لکھ رہا ہے۔ یہ مدح دو چار شعروں میں ختم ہو جاتی ہے اور اس سے جلد جلد گذر کر وہ دعا پر قصیدے کو ختم کر دیتے ہیں۔ یہ آخری حصّہ بہت کم جگہ آٹھ دس شعر سے زیادہ ہے۔

یہی حال اُن کی تقریظوں کا ہے۔ ان کے کلیات میں متعدد کتابوں پر تقریظیں ہیں۔ ان میں سے اکثر کے مصنّف ان کے نہایت عزیز دوست تھے۔ لیکن دیکھ لیجئے نہ کہیں کتاب کو اُچھالا ہے نہ اس کے مصنّف کی بے جا تعریف کی ہے۔ چند فقرات میں مصنّف کے حالات ہیں۔ اوّل اس کے اخلاق و اوصاف کا مختصر بیان ہے پھر اس سے اپنے تعلقات کا ذکر کرتے ہیں اور آخر میں ایک آدھ فقرہ کتاب کے متعلق بھی لکھ دیتے ہیں اور بس۔

کیا یہ طریقے ایسے شخص کے ہیں جس کو بھٹئی میں مزا آتا ہے یا جس کی فطرت میں بے غیرتی اور کمینہ پن ہے؟ لیکن یہ نفسیاتی باتیں ہیں اور غالباً جناب اسد علی صاحب کے سامنے ان کا بیان چنداں سود مند نہ ہو۔

غیرت کا ذکر آگیا میرزا کی غیرت کے بھی دو واقعات سن لیجئے جناب اسد علی صاحب نے اس بات کا ذکر بڑے مزے سے لے کر کیا ہے کہ "وہ بڑی امیدوں اور کاف کرم کی کششوں کے ساتھ لکھنؤ گئے تھے اور اس لئے سال بھر کے قریب لکھنؤ میں پڑے رہے" لیکن اس شہر میں غالب کی کوئی قدر نہ ہوئی۔ بادشاہ تو بادشاہ نائب السلطنت سے بھی ملاقات نہ ہوسکی۔ یہ تینوں باتیں غلط ہیں۔

اوّل قدر کا یہ عالم تھا کہ جیسے کہ مولانا حالی مرحوم نے لکھا ہے۔ میرزا لکھنؤ میں وہاں کے اکابر کی خواہش کو منظور کرتے ہوئے تشریف لے گئے تھے۔ یہ لوگ انہیں ایک مدّت سے بلا رہے تھے اور غالب وہاں نہیں جاسکے تھے۔ اب جو دہلی سے نکلے تو راہ میں کان پور سے لکھنؤ چلے گئے گویا اس شہر میں غالب کے ایسے قدر شناس تھے کہ انہوں نے خود دعوت دے کر انہیں بلایا۔

ان کے اعزاز میں خاص مشاعرہ کیا اور خود میرزا نے بھی طرح پر غزل کہی۔ اس کے آخر میں مندرجہ ذیل قطعہ ہے۔

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی ہوس سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو
مقطع سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر عزم سیر نجف و طوف حرم ہے ہم کو
لئے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب جادۂ رہ کشش کاف کرم ہے ہم کو

جناب اسد علی صاحب نے یہ لکھ کر کہ "وہ بڑی امیدوں اور کاف کرم کی کششوں کے ساتھ لکھنؤ گئے تھے"۔ اپنی سخن فہمی کا جو ثبوت دیا ہے اب میں اُس کی کیا داد دوں۔ قبلہ! ان کا "مقطع سلسلۂ شوق" لکھنؤ نہیں بلکہ کلکتہ تھا۔ انہیں توقع تھی پنشن کے مقدمے میں کامیابی کی "کرم" کا تعلق نہ لکھنؤ سے ہے نہ بادشاہ اور نائب السلطنت سے بلکہ انگریزی انصاف سے۔ اگر جناب اسد علی صاحب ذرا غور فرماتے تو ایسی بے پر کی نہ اُڑاتے۔ نیز یہاں "کشش" کے وہ معنی نہیں جو جناب انوری صاحب سمجھے ہیں۔

لیکن لکھنؤ آنے کے بعد انہوں نے یہ نامناسب جانا کہ نائب السلطنت معتمد الدولہ آغا میر سے ملاقات نہ کی جائے۔ چونکہ قصیدہ لکھنے کا وقت نہ تھا اس لئے انہوں نے عجلت میں ایک دس پندرہ سطر کی مختصر فارسی نثر صنعت تعطیل میں لکھ لی۔ لیکن آغا میر بے چارے کو غرفا نوازی کا سلیقہ کہاں۔ "سترولد لا بیہ"۔ اس نے شرط لگائی کہ غالب یوں نذر پیش کریں اور یوں سلام بجا لائیں۔ میرزا کی غیرت نے ان شرطوں کو گوارا نہ کیا۔ اور انہیں اپنے لئے دون مرتبہ خیال کیا اور ملاقات سے انکار کر دیا۔

گویا آغا میر تو میرزا کو اپنی بارگاہِ قدس میں بار دینے پر راضی تھا لیکن غالب ہی نے اس شرف کو قبول نہیں کیا۔

دوسرا واقعہ بھی سن لیجئے۔ دہلی کالج میں مولوی مملوک علی عربی کے صدر مدرّس تھے جو بقول منشی کریم الدین صاحبِ طبقات الشعراء عالم بے بدل اور متقی بے عمل اور فاضل کامل" تھے۔ کالج میں فارسی کی تعلیم کا کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں تھا۔ ۱۸۴۰ء میں جب مسٹر ٹامسن مدرسے کے معائنے کے لئے تشریف لائے تو انہوں نے فرمایا کہ عربی کی طرح فارسی کا بھی ایک مستعد مدرّس مقرر ہونا چاہئے۔ مولوی صدر الدین صدر الصدور نے عرض کی کہ ہمارے شہر میں فارسی کے تین استاد ہیں۔ میرزا اسد اللہ خاں غالب، حکیم مومن خاں مومن اور شیخ امام بخش صہبائی۔ اس پر ٹامسن صاحب نے میرزا کو بلا بھیجا۔ اگلے دن یہ سوار ہو کر وہاں پہنچے اور دروازے پر کھڑے اس بات کا انتظار کرنے لگے کہ ابھی کوئی صاحب پذیرائی کو آتے ہیں۔ جب کوئی نہ آیا اور کسی نے آکے ان سے کہا کہ حضرت داخل ہو جئے تو کہا کہ صاحب کوئی آگے سے لینے کو آئے تو اُتروں۔ جواب ملا کہ آپ ملازمت کے لئے آئے ہیں۔ ملاقات کے لئے نہیں آئے کہ کوئی استقبال کو حاضر ہو۔ تو فرمایا کہ ملازمت اس لئے کرنا چاہتا ہوں کہ اس سے میرے عزّ و وقار میں اضافہ ہو نہ کہ پہلے میں بھی کمی ہو جائے۔ اگر ملازمت کے معنی کمیٔ مرتبہ کے ہیں تو ایسی ملازمت کو میرا دور ہی سے سلام۔ اور کہاروں کو حکم دیا کہ پلٹ چلو۔

بہتر معلوم ہوتا ہے کہ باقی واقعہ بھی یہاں بیان کر دیا جائے۔ اس پر ٹامسن صاحب نے حکیم مومن خاں کو بلوایا۔ یہ پہنچے جب تنخواہ کی بات چلی تو انہوں نے کہا کہ مولوی مملوک علی صدر مدرس عربی سو روپیہ ماہانہ پاتے ہیں۔ میں اس سے کم قبول نہیں کروں گا۔ چونکہ وہ چالیس سے زیادہ دینے پر تیار نہیں تھے اس لئے یہ انکار کر کے چلے آئے۔ صہبائی نے چالیس منظور کر لئے۔ بعد میں یہ پچاس کر دیئے گئے۔ دیکھا آپ نے فرقِ مراتب! بات کہاں سے کہاں جا پہنچی میں غالب کی قصیدہ نگاری کا ذکر کر رہا تھا۔ اور گذارش کر رہا تھا کہ قصیدہ لکھنا غیرت کے منافی نہیں۔

اب اس اعتراض کو ایک اور پہلو سے لیجئے بعض حضرات نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ میرزا نے اتنے انگریزوں کی مدح کی۔ حالانکہ اس وقت یہاں مسلمانوں کی حکومت تھی اور ابھی تخت طاؤس پر دلاکھ برائے نام ہی سہی، اکبر و جہانگیر، شاہجہان و عالمگیر کا نام لیوا موجود تھا۔ یہ اعتراض میں نے اور بہت سے حضرات کی زبان سے بھی سنا ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس پر ذرا تفصیل سے نظر ڈالی جائے۔

ان قصیدوں کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جو انہوں نے گورنر جنرل ہندوستان یا گورنر پنجاب کی مدح میں لکھے۔ دوسرے وہ جو انہوں نے کم درجے کے انگریزوں کے لئے کہے آخری گروہ میں بیشتر وہ اصحاب ہیں جو حکومتِ ہند کے سکرٹری یا دہلی میں کمشنر و ریزیڈنٹ یا پنجاب میں فنانشل کمشنر وغیرہ تھے۔ یہ سب قصیدے ان کے پنشن کے مقدمے کے دوران میں لکھے گئے ہیں۔ وہ شاعر تھے اور انہوں نے شاعری سے وہ کام لینا چاہا جو آج کل سفارشوں اور رشوتوں سے نکالا جاتا ہے۔ خوش قسمتی سے ان کے ممدوحین زمانہ حال کے انگریزوں کی طرح نہیں تھے کہ اردو تک ٹھیک طور پر نہیں جانتے۔ بلکہ ان میں سے بیشتر نہایت اچھی فارسی جانتے اور کلام کے حسن و قبح کو پرکھ کر داد دینے کی اہلیت رکھتے تھے۔ ان سب قصیدوں کے آخر میں مقدمے کا بیان ہے۔ کہیں اپنے خاندان کا حال لکھا ہے اور کہیں اپنی پریشانیوں اور مصیبتوں کا ذکر کر کے انصاف چاہا ہے۔ پس یہ قصیدے محض بھٹئی نہیں بلکہ یوں کہو کہ ان کے مقدمے کی روئیداد کا اہم جزو ہیں۔ وہ انگریزی نہیں جانتے تھے کہ اپنا حال اپنے مخاطبوں کو ان کی زبان میں سمجھا سکتے۔ خوش قسمتی سے یہ لوگ وہ زبان جانتے تھے جو غالب کی زبان تھی۔ اس لئے انہوں نے اپنی زبان میں یہ درخواستیں پیش کیں اور چونکہ وہ شاعر تھے اس لئے انہوں نے نثر پر نظم کو ترجیح دی۔ یہ قصیدے نہیں درخواستیں ہیں۔ اب جو کچھ ایک درخواست میں ہوتا ہے وہ سب کچھ ان میں ہے۔ مقدمہ اور اس کے کوائف انصاف اور اپنے حق میں فیصلے کی خواہش کا اظہار اور مخاطب کے جاہ و اقبال میں ترقی کی دعا۔ آپ ان سب قصیدوں کو دیکھ جائیے۔ الّا ماشاء اللہ آپ ان سب میں یہی کچھ پائیں گے۔ پیرایہ اور ترتیب کلام میں فرق ہو تو ہو۔ لیکن ہو گا یہی کچھ۔ نہ کم نہ زیادہ۔

رہے گورنروں اور گورنر جنرلوں کے قصیدے تو یاد رکھنا چاہئے کہ میرزا کو ان دونوں صاحبوں کے درباروں میں کرسی نشینی کا اعزاز حاصل تھا۔ وہ ایسی تقریبوں میں داہنی طرف دسویں نمبر پر بیٹھا کرتے تھے اور انہیں سات پارچے اور تین رقم جواہر کا خلعت ملا کرتا تھا اور معلوم رہے کہ ایسے موقعوں پر ان کی نذر اشرفی یا پانچ اشرفی نہیں تھی بلکہ یہی قصیدہ یا مدحیہ قطعہ ان کی نذر تھی۔ پھر جتنے دربار وہ شامل ہوتے ہوں گے

کم سے کم اتنے قصیدے اور قطعے تو ہونا ہی چاہئیں۔ اس پر نہ اعتراض ہو سکتا ہے نہ اس میں کوئی بے جا بات ہے۔

جب غدر کے دوران میں اور اس کے بعد بھی دو تین برس یہ دربار و خلعت بند رہا تو قصیدے بھی ختم ہو گئے۔ انہی ایام میں جب انہوں نے نواب علاؤالدین احمد خاں کو اپنے مخصوص پیرائے میں لکھا ہے۔

"اشعار تازہ مانگتے ہو کہاں سے لاؤں۔۔۔۔ گورنمنٹ کا بھاٹ بھٹی کرتا تھا۔ خلعت پاتا تھا۔ خلعت موقوف بھٹی متروک۔"

تو بتائیے اس میں کیا غلط بیانی کی اور اس پر طنز کیوں ہو؟

پھر یہ اعتراض بھی لغو ہے کہ بہادر شاہ کی موجودگی میں انہوں نے کسی انگریز کی مدح کیوں کی۔ اگر انگریزوں کی ملازمت گناہ نہیں تھی، اگر ان کی طرف سے مسلمان حکمرانوں کے خلاف جنگ کرنا گناہ نہ تھا۔ اگر خود بہادر شاہ کے لئے ان کے سامنے اپنے حقوق سے دست بردار ہو جانا اور ان سے ایک معقول وظیفہ قبول کر لینا گناہ نہ تھا۔ تو غالب کا ان میں سے بعض کی مدح میں صرف قصیدے لکھنا ہی گناہ کیونکر ہو گیا۔

جناب اسد علی صاحب نے اس ضمن میں مرزا کی اسلام دوستی اور وطن پرستی پر بھی اعتراض کیا ہے اور ثبوت میں میرزا کے ایک قصیدے کا یہ شعر پیش کیا ہے جو انہوں نے سر جان میکلوڈ کی مدح میں لکھا تھا۔

ہے یہ دعا کہ زیر نگیں آپ کے رہے   اقلیم ہند و سندھ سے تا ملک روم و شام

مجھے یہ اعتراض پڑھ کر صائب کا "شعر مرا بمدرسہ کہ برد" والا فقرہ یاد آ گیا۔ حضرت! اگر ایسی باتوں پر اعتراض ہونے لگے تو مجھے اندیشہ ہے کہ آپ کسی قصیدہ گو شاعر کو بھی مسلمان نہیں ثابت کر سکیں گے۔

رہی ان کی وطن پرستی تو اگرچہ ہم بالکل ڈاکٹر سید محمود کے ہم نوا بھی نہیں کہ میرزا کو خواہی نخواہی پکا وطن پرست اور نیشنلسٹ ہی ثابت کرنے کی کوشش کریں۔ لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ انہیں اپنے وطن سے بھی محبت تھی اور وہ اپنے ہم وطنوں کی مصیبت کو بھی اسی شدت سے محسوس کرتے تھے۔ جیسے اس زمانے کے کسی اور قوم پرست نے کیا ہوگا۔ اردو رقعات تو ان کی زار نالیوں سے بھرے پڑے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے یہ خط روشنائی سے نہیں بلکہ خون کے آنسوؤں سے لکھے ہیں۔ "دستنبو" میں بھی ہندوستانیوں کے مصائب پر اپنے دلی درد کا اظہار کیا ہے۔ ان کے اردو کلام میں بھی ایسے اشعار کی کمی نہیں۔ صرف ان کا وہ قطعہ ہی جس کا پہلا شعر

بسکہ فعال ما یرید ہے آج   ہر سلح شور انگلستاں کا

ان کے جذبۂ وطن پرستی کا کافی ثبوت ہے۔

جناب اسد علی صاحب نے ایک اور اعتراض بھی تصنیف فرمایا ہے کہ

"جب سرسید علیہ الرحمۃ نے آئین اکبری کی تصحیح کر کے اس کے چھپنے کا ارادہ کیا اور غالب سے تقریظ لکھنے کی خواہش ظاہر کی تو تقریظ لکھنے میں غالب نے اس قدر انگریز پرستی کا ثبوت دیا کہ سرسید جیسے انگریز پرست کے گلے سے بھی وہ تقریظ نہ اتر سکی۔ اور انہوں نے اس کو داخل کتاب نہیں کیا۔"

ایسے ہی موقعہ پر سخن فہمی عالم بالا کی مثل صادق آتی ہے۔ قبلہ! غالب کی تقریظ کو شامل کتاب کرنے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ غالب نے اس میں سرسید سے بھی زیادہ انگریز پرستی کا ثبوت دیا تھا۔ بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس میں اکبر کے قوانین اور ابوالفضل کے طرز تحریر کی تنقیص کی تھی۔ یہ گویا سرسید کی ساری محنت پر پانی پھیرنے والی بات تھی۔ تقریظ کلیات میں موجود ہے۔ دیکھ لیا جائے کہ اس میں کونسی بات زیادہ نمایاں ہے۔ انہوں نے عہد اکبری کے آئین کو انگریزی آئین سے کمتر درجہ پر رکھا ہے اور اپنے آپ کو ابوالفضل سے بہتر نثر نگار ظاہر کیا ہے۔ آخر "آئین اکبری" میں اور تھا کیا جس کے لئے سرسید نے برسوں خون جگر کھایا تھا۔ آئین و قانون سو نکتے۔ تحریر سو گئیا۔ لہذا انہوں نے تقریظ کو شامل کتاب کرنے سے انکار کر دیا اور اس کے بعد مدتوں مرزا سے بگڑے رہے۔ سرسید میرزا کی انگریز پرستی سے ناراض نہیں تھے۔ میرزا بے چارے کیا کھا کر اس باب میں سرسید علیہ الرحمۃ کا مقابلہ کریں گے۔ اگر مرزا اکبر کے آئین کی بھی تعریف کر دیتے اور ابوالفضل کی تحریر کو بھی سراہ دیتے تو انگریز پرستی دھری کی دھری رہ جاتی اور تقریظ کتاب کے ساتھ چھپ جاتی۔ لیکن اس صورت میں جناب اسد علی صاحب کا ایک اعتراض کم ہو جاتا۔

رہے بعض دوسرے والیان ریاست یا امرا کی مدح میں قصیدے تو یہ بھی کوئی بری بات نہیں معلوم ہوتی۔ ہمارے زمانے میں اقبال مرحوم سے زیادہ کسی اور شخص نے خودی اور "عین دریا میں پیمانہ نگوں" کرنے کی تعلیم نہیں دی۔ لیکن کسی سے پوشیدہ نہیں کہ بھوپال سے انہیں پانسو روپیہ وظیفہ ملتا تھا۔* اور دوسری بڑی اور چھوٹی ریاستوں سے جو رقوم انہیں ملا کیں

* یہاں جناب اسد علی صاحب یا کوئی اور حضرت یہ نہ کہہ دیں کہ انہیں یہ وظیفہ ایک کتاب لکھنے کے لئے ملتا تھا جس کا نام تھا "مطالعۂ قرآن کے اصول"!

ان کا علم تو محرمانِ راز کے حلقے کے باہر کسی کو کیوں ہونے لگا۔ جوش ملیح آبادی بہت بڑے استبداد دشمن اور حریت نواز سمجھے جاتے ہیں۔ انہیں بھی پٹیالہ سے دوسو ماہانہ وظیفہ ملتا ہے اور بعض دوسری ریاستوں سے بھی ان کے تعلقات رہے ہیں اور اب بھی ہیں۔ مگر کسی کو جرأت نہیں کہ وہ ان کے خلاف زبانِ اعتراض دا کرے۔ کیونکہ ایک علم بردارِ خودی اور حکیمِ مشرق ہے اور دوسرا مصورِ فطرت اور شاعرِ انقلاب۔ اس بارے میں رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم کا قول بھی یاد رکھنے کی چیز ہے۔ فرماتے ہیں:۔

. . . . چنانچہ خدا کے فضل سے جب سوراج نہیں مل جائے گا اور اسلامی حکومتیں بھی آزاد ہو جائیں گی۔ اور ہماری اس جنگِ آزادی کی تاریخ لکھی جائے گی۔ اس وقت لوگوں کو معلوم ہو گا کہ کس طرح ایک سیاستہً گمنام شخص نے ہم دو بھائیوں اور ہمارے بال بچوں کو تین برس کے عرصے میں یعنی ۱۹۲۰ء میں اور پھر قید کے دو سال میں چالیس ہزار کی گراں قدر رقم دے کر فکرِ معاش سے فارغ اور مستغنی کر دیا۔

صفحہ ۱۱۹ مضامین محمد علی

. . . . اسی طرح اگر حضور نظام یا کوئی اور مسلمان فرمانروا میری ذات پر اعتماد کرے اور مجھے فکرِ معاش سے فارغ کرنا چاہے تو اُن کے لئے ہرگز نامناسب نہیں۔ اور مجھے بھی اُن کی امداد قبول کرنے میں ہرگز عذر نہ ہو گا۔ صفحہ ۱۱۱۔ ۱۱۹ مضامین محمد علی

یہ محض قول ہی نہیں بلکہ ان کا عمل بھی اسی پر تھا۔ جب مرحوم مہاراجہ الور نے انہیں ۳۰۔ ۳۲ ہزار روپیہ علاج کے لئے پیش کیا تو انہوں نے شکریے کے ساتھ قبول کر لیا۔

اور سچ تو یہ ہے کہ ہم ذاتی طور پر بالکل مولانا مرحوم کے ہم خیال ہیں شاعروں اور ادیبوں۔ قومی کارکنوں اور رضاکاروں کا حق ہے کہ وہ قوم اور ملک سے اپنی معاش کا مطالبہ کریں۔ اگر قومی بیت المال نہیں تو پھر یہ سیر چشم اُمرا اور صاحب چشم رؤسا کا فرض ہے کہ وہ ان لوگوں کو معیشت کے تفکرات سے آزاد کر دیں تاکہ وہ بے غل وغش اپنی مفید سرگرمیاں جاری رکھ سکیں۔

بات سے بات نکلتی ہے۔ اگر دیکھا جائے تو قومی علم و ادب کی ترقی کا راز اسی سرپرستی میں مخفی تھا۔ اب کیوں ویسے لوگ نہیں پیدا ہوتے جن کا نام سن کر ہم بے اختیار فرطِ ادب سے سر جھکا دیتے ہیں یا جن کی تحریرات پر عرب و عجم کا سر فرطِ غرور سے آسمان کو دعوتِ مقابلہ دیتا ہے۔ اس کا جواب ہے۔ قومی سرپرستی کا فقدان۔ جب سے ان غریبوں کو کتابیں بیچنے کا کام کرنا پڑا ہے۔ ان کے تمام حوصلے پست اور ولولے سرد ہو گئے ہیں۔ پیٹ کا دھندا اور دماغ سوزی دونوں یکجا نہیں ہو سکتے۔

بیوی سے بیزاری: غالب کے لطائف میں بہت سے ایسے لطیفے ہیں۔ جہاں انہوں نے عورت اور متاہلانہ زندگی کا خاکہ اُڑایا ہے۔ ان کے کلام میں بھی ایسے اشعار کی کمی نہیں جہاں انہوں نے عورت اور بیوی کو مصیبت کا گھر بتایا ہے۔ یہ ایسی ہی باتیں ہیں جیسی سب ذہین و فطین آدمی کیا کرتے ہیں وہ کسی ایک موضوع کو اپنا نشانہ بنا لیتے ہیں اور جب کبھی انہیں موقع ملتا ہے اس پر آوازے کستے اور پھبتیاں اڑاتے ہیں۔ ڈاکٹر جانسن کا نام کون نہیں جانتا۔ جب بھی ان کا بس چلتا تھا وہ سکوس کا چکر کاٹ کر بھی اسکاٹ لینڈ کے باشندوں پر کوئی نہ کوئی فقرہ چست کر دیتے تھے۔ اب اگر کوئی شخص اس سے یہ نتیجہ اخذ کرے کہ انہیں اسکاٹ لینڈ کے لوگوں سے نفرت تھی یا وہ انہیں احمق سمجھتے تھے تو اس سے بڑی غلطی نہیں ہو سکتی۔ ان کے دوستوں میں خود اسکاٹ لینڈ کے رہنے والے بھی تھے اور یہ لوگ بھی ان کے لطیفوں سے اتنے ہی مسرور ہوتے تھے جتنے انگلستان یا ویلز کے لوگ۔ میرے ایک مہربان ہیں انہیں سکھوں کے خلاف اسی طرح کے لطیفے وضع کرنے میں لطف آتا ہے بلکہ جب ان کا کوئی سکھ دوست ملنے کو آ جائے تو ان کی جولانیاں اور بھی دلچسپ ہو جاتی ہیں۔ وہ بلبل کی طرح چہکتے اور گل فشانیاں کرتے ہیں۔ مارے ہنسی کے حاضرین کے پیٹ میں بل پڑ پڑ جاتے ہیں اور ایسے موقعے پر ان سکھ دوستوں کا قہقہہ سب سے بلند ہوتا ہے۔

ایسے لطیفوں سے ان حضرات کی سوانح عمری مرتب کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی شاعر کے دیوان سے اس کے مذہبی عقائد پر بحث کرنی یا جیسے پچھلے دنوں جناب پروفیسر شاہ آفاقی ساقی کے صفحات پر گلکاریاں کرتے رہے ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ غالب ایک رندمنش اور آزادہ رو شخص تھے۔ وہ فطرتاً باغی تھے۔ ایسے لوگ کسی قسم کی پابندی اور قید کو بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ یوں وہ اپنے معتقدات و مزعومات میں بہت پختہ اور راسخ ہوتے ہیں۔ لیکن صرف "بالقوۃ" کی حد تک۔ اس میں "بالفعل" یا "بالعمل" کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ کردار کے مضبوط۔ دُھن کے پکے اور دیانت کے دھنی۔ ان کی زندگی ایک لفظ میں تریخ لکھی جا سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نوع

کے تمام افراد کی طرح غالب بھی کسی زنجیر کو اپنے پاؤں میں ڈالنے پر راضی نہیں ہو سکتے تھے اور تاہل سے بڑی اور مضبوط زنجیر اور کونسی ہو سکتی ہے پس وہ سرے سے شادی ہی کے خلاف تھے۔ نہ صرف اپنی شادی کے بلکہ جناب اسد علی صاحب کی ہو یا میری، امراؤ سنگھ کی ہو یا حاتم علی مہر کی۔ سب کی شادی کے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ انہیں اپنی بیوی سے نفرت یا بیزاری تھی۔ یہ غلط منطق ہوگی اور ایسے اشخاص کے کردار کے خلاف۔ لیکن بدقسمتی سے بات پھر نفسیاتی ہے۔

جناب اسد علی صاحب نے سخت ظلم کیا ہے جہاں انہوں نے میرزا کے ایک خط کے غلط معنی لے کر ان پر اتہام لگانے کی کوشش کی ہے لکھتے ہیں:۔

"پھر یہ محض زبانی واویلا نہ تھا۔ بلکہ اس بیڑی کو کاٹنے کی انہوں نے کوشش بھی کی۔ یہ تصفیہ کیا کہ بیوی کو لوہارو بھیجا جائے اور خود آزادانہ زیست بسر ہو۔ ان کے (یعنی غالب کے) الفاظ ہی سنئے جو انہوں نے نواب علاؤالدین احمد خاں کو ایک خط میں لکھے ہیں:۔

تمہارے والد ماجد اور تمہاری جدہ ماجدہ سے اور تمہارے عم عالی مقدار سے کہہ چکا ہوں۔ خلاصہ یہ کہ میرے بیوی بچوں کو کہ یہ تمہارے ہیں۔ مجھ سے لے لو کہ میں اب اس بوجھ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ میرا قصد سیاحت کا ہے۔ پنشن اگر کھل گئی تو وہ اپنے صرف میں لایا کروں گا۔

غالب کی بیوی بھی مجبوراً اس پر راضی ہو گئی تھیں۔ لیکن پھر کسی وجہ سے یہ ارادہ پورا نہیں ہو سکا۔"

سب سے پہلے تو غالب کے خط کا اقتباس نامکمل ہے پورا یہ ہے:۔

"اپنا مقصود تمہارے والد ماجد اور تمہاری جدہ ماجدہ اور تمہارے عم عالی مقدار سے کہہ چکا ہوں۔ خلاصہ یہ کہ میری بیوی اور بچوں کو کہ یہ تمہاری قوم کے ہیں۔ مجھ سے لے لو کہ میں اب اس بوجھ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے بھی بشرط ان لوگوں کے لوہارو جانے کے اس خواہش کو قبول کیا۔ میرا قصد سیاحت کا ہے پنشن اگر کھل جائے گا تو اپنے صرف میں لایا کروں گا۔ جہاں جی لگا رہ گیا۔ جہاں سے دل اکھڑا چل دیا۔"

اور دوسرے انہوں نے خط غدر کے بعد اس زمانے میں لکھا ہے جب ساڑھے باسٹھ روپے ماہانہ پنشن بند ہو چکی تھی۔ جب قلعہ کی تنخواہ ختم ہو گئی تھی۔ تمام ذرائع معاش مسدود تھے اور خرچ بدستور۔ ایک مدت انہوں نے گھر کے برتن اور کپڑے بیچ بیچ کر بسر کی۔ لیکن یہ صورت حال کب تک برداشت کی جا سکتی تھی۔ ان حالات میں انہوں نے لوہارو والوں سے کہا کہ کچھ مدت کے لئے میرا بوجھ ہلکا کر دو وہ مان گئے۔ بیوی سے ذکر کیا وہ لوہارو جانے پر رضامند ہوئیں۔ یقیناً ان حالات میں یہ بہترین انتظام تھا۔ اب جن لوگوں کو اس پر اعتراض کرنے کا حق تھا۔ انہوں نے تو کچھ کہا نہیں یعنی نہ نواب علاؤالدین نے انکار کیا نہ امراؤ بیگم نے کچھ اس کے خلاف کہا، لیکن آج واقعہ کے اسی برس بعد جناب اسد علی صاحب آئے ہیں فریدآباد سے شکایت کرنے۔ چہ خوش۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر خط کو واقعات کے سیاق و سباق میں دیکھا جائے تو اس میں اعتراض کی کوئی بات ہی نہیں رہتی یہ اُن لوگوں کا گھریلو معاملہ تھا اور وہ یہ انتظام میرزا کے حالات سے مجبور ہو کر باہمی مشورے سے طے کر رہے تھے۔ میرزا نے نواب امین الدین احمد خاں، نواب ضیاءالدین احمد خاں اور جناب بیگم جان صاحبہ سے اپنی مشکلات بیان کیں اور کہا کہ میری خواہش ہے کہ جب تک کشائش کا سامان نہیں پیدا ہوتا۔ بیوی بچوں کو یہاں چھوڑ کر آپ کسی طرف کو نکل جاؤں۔ انہوں نے اس شرط پر اس خواہش کو قبول کیا کہ بیوی بچوں کو دہلی میں چھوڑ کے نہ جاؤ بلکہ لوہارو بھیج دو (جناب اسد علی صاحب کو معلوم رہے کہ "انہوں نے" کی ضمیر کا مرجع یہ تینوں ہیں نہ کہ غالب کی بیوی) چونکہ یہ لوگ دہلی میں موجود تھے۔ اس لئے ان سے مشورہ کرنا آسان تھا۔ اب ضرورت تھی لوہارو میں نواب علاؤالدین احمد خاں کو اطلاع دینے کی۔ اس پر انہوں نے یہ خط لکھا۔ بس اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا۔

اب میں ایک عینی شاہد کا بیان درج کر دوں ممکن ہے جناب اسد علی صاحب کی اس سے کچھ تسلی ہو جائے۔ نیر درخشاں کی صاحبزادی اور مرزا باقر علی خاں کامل کی بیوی جناب معظم زمانی بیگم صاحبہ دہلی میں موجود ہیں۔ وہ غالب کی زندگی کے آخری سات برس ان کے ساتھ رہیں پہلے پانچ برس ایک ہی مکان میں اور آخری دو برس علاحدہ مکان میں۔ میرے پوچھنے پر وہ فرماتی ہیں:۔

"بیٹا! میرزا صاحب کی تو غصے ہونے یا جھگڑا کرنے کی عادت ہی نہیں تھی۔ وہ تو کسی سے بھی ناراض نہیں ہوتے تھے۔ بیگم

سے ان کا برتاؤ ہمیشہ محبت کا دیکھا۔ گھر میں آتے تو ہر وقت لطیفے چھانٹتے رہتے کبھی بیگم سے مذاق کرتے کبھی حسین علی خاں کو چھیڑتے وہ مجھ تک سے تو در گزر نہیں کرتے تھے حالانکہ میں ان کی بہو تھی۔ بیگم نے بھی کبھی ان کی بات کو رد نہیں کیا۔ میں نے ہمیشہ انہیں ایک دوسرے سے محبت کرتے دیکھا۔ اگر کوئی اور بات ہوتی تو سات برس میں کم سے کم ایک بار ہی دیکھنے میں آتی۔"

متعلقین سببی سے بیزاری | جناب اسد علی صاحب لکھتے ہیں: ۔

"بیوی کے علاوہ اور سب متعلقین سببی سے بھی ان کے تعلقات ایسے ہی بیزاری کے تھے۔"

اور ثبوت میں غالب کے ایک خط کا مندرجہ ذیل اقتباس پیش کیا ہے۔

"میرا ہم قوم سراسر قلمرو ہند میں نہیں۔ سمرقند میں دو چار یا دشت قبچاق میں سو دو سو ہوں گے۔ مگر اقربا سببی ہیں۔ سو پانچ برس کی عمر سے ان کے دام میں اسیر ہوں۔ اکسٹھ برس ستم اٹھاتے

گر دہم شرح ستم ہائے عزیزاں غالب   رسم امید ہمانا ز جہاں برخیزد

میرزا نے جو کچھ اپنے اس خط کے آخری حصے میں لکھا ہے وہ حرف بحرف درست ہے۔ ان کے عزیزان سببی کے ستم کی شرح واقعی بہت طویل ہے۔ آپ بھی سنیں اور داد انصاف دیں۔

میرزا کی عمر مشکل سے پانچ برس ہوگی جب ان کے والد نے انتقال کیا اور وہ اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ چچا کی سرپرستی میں آ گئے۔ ان کی ننھیال بہت آسودہ حال تھی۔ چچا بھی پہلے مرہٹوں کی عملداری میں اکبر آباد کے صوبہ دار تھے۔ پھر انگریزوں کے عہد میں بھی لاکھ ڈیڑھ لاکھ سالانہ کے جاگیر دار اور سترہ سو ماہانہ کے مشاہرہ پانے والے رہے۔ اس بیان سے مقصود یہ ہے کہ میرزا کا بچپن نہایت آرام و آسائش سے بسر ہوا ہوگا۔ بدقسمتی سے چچا کی وفات بھی جلد ہی ہو گئی۔ اس وقت غالب کی عمر نو برس سے کم تھی۔

یہاں سے ان کی مصیبت کی کہانی شروع ہوتی ہے۔ نواب احمد بخش خاں نے (جن کی بہن میرزا کے چچا سے بیاہی تھی) اپنے بہنوئی کے انتقال کے بعد غالب اور ان کے چھوٹے بھائی کو اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ سرکار انگریزی کی طرف سے ان کے چچا کی خدمات کے عوض میں اس خاندان کے لئے دس ہزار روپیہ سالانہ کی پنشن مقرر ہوتی۔ لیکن نہ معلوم نواب احمد بخش خاں نے کیا جوڑ توڑ کئے کہ پہلے حکم کے ایک ہی مہینہ بعد انہوں نے ایک دوسرا حکم حاصل کر لیا جس میں پنشن کی رقم دس کی جگہ پانچ ہزار کرا لی اور تقسیم کچھ اس طرح کرائی کہ اس میں سے بھی غالب کو صرف ساڑھے سات سو سالانہ ملے۔

میرزا ۲۹ برس کے تھے جب نواب احمد بخش خاں نے ۱۸۲۶ء میں ریاست لوہارو اور فیروز پور سے دست برداری دے دی اور ان کی جگہ ان کے فرزند اکبر نواب شمس الدین احمد خاں فیروز پور کی گدی پر بیٹھے۔ ان حضرت نے ۱۸۳۱ء میں وہ ساڑھے سات سو دینے بھی بند کر دیئے۔

میرزا نے سرکار انگریزی میں مقدمہ دائر کیا کہ میرے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے۔ دس ہزار کا حکم تھا اور ملتا صرف تین ہزار ہے۔ اس میں سے بھی میرے حصے میں صرف سات سو پچاس آتے ہیں۔ پچھلا بقایا دلایا جائے اور آئندہ کے لئے پوری رقم ادا کرنے کا حکم صادر ہو (مقدمے کی تفصیلات آپ میری تالیف ذکر غالب میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں) اٹھارہ برس کامل انہوں نے یہ مقدمہ جاری رکھا۔ اس کے لئے خود کلکتہ کا سفر کیا اور پورا ڈیڑھ سال وہاں بیٹھے رہے۔ ہزار ہا روپے کی زیر باری ہوئی اور سچ پوچھئے تو ان کی زندگی بھر کی پریشانیوں کا باعث یہ مقدمہ اور اس کے اخراجات ہوئے۔ جو انہوں نے قرض لے لے کر کئے۔ مقدمے کا فیصلہ ان کے خلاف ہوا اور ان کی بقیہ عمر اس قرضے کے اتارنے میں کٹی۔

۱۸۴۷ء میں وہ ایک مقدمے میں گرفتار ہو کر چھ ماہ کے لئے قید کر دیئے گئے۔ خود رئیس ابن رئیس اور اقربائے سببی خاندان لوہارو کے افراد بھلا سنسنی کیسے نہ پھیلتی۔ ایک اخبار کی جو شامت آئی اس نے چھاپ دیا کہ میرزا نوشہ جو خاندان لوہارو کے فرد ہیں فلاں جرم میں ماخوذ ہو کر چھ ماہ کے لئے سزایاب ہوئے ہیں۔ جناب اسد علی صاحب ہی بتائیں کہ اس خبر میں کیا غلطی تھی لیکن معلوم ہے خاندان لوہارو کے ایک فرزند رشید نے کیا کیا۔ انہوں نے اس اخبار میں ایک خط چھپوایا کہ یہ غلط ہے کہ میرزا نوشہ خاندان لوہارو کا فرد ہے۔ ان کا ہم سے کوئی تعلق نہیں۔ ایک دور کا رشتہ ہے یعنی ہمارے ایک بزرگ کی بیٹی ان سے ضرور بیاہی ہے۔ سو یہ بھی کوئی ایسی بڑی بات نہیں اس سے وہ ہمارے خاندان کے فرد تھوڑی ہو جاتے ہیں۔

پھر ان لوگوں نے قید کے دوران میں بھی غالب کی خبر تک نہیں لی۔ خدا مغفرت کرے نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ کو کہ وہ بے چارے خبر سنتے ہی دوڑے آئے اور دہلی پہنچنے پر سیدھے زنداں میں پہنچے اور اس وقت تک شہر میں کسی سے نہیں ملے جب تک غالب کی خبر گیری

نہیں کرلی۔ بجائے اس کے کہ ان کے اقربائے سببی کو اس سے کچھ شرم محسوس ہوتی وہ الٹا شیفتہ سے ناراض ہو گئے کہ آپ نے میرٹھ سے آکے اور زنداں میں غالب سے ملاقات کرکے ہماری ناک کاٹی ہے۔

یہ داستان واقعی طویل بھی ہے اور دردناک بھی۔ کہاں تک لکھا جائے۔ گڑے مردے اکھیڑنے والی بات ہے۔ ان حالات میں اگر غالب نے کہا ؎

گر وہم شرح ستم ہائے عزیزاں غالب ۔۔۔ رسم امید ہما نا ز جہاں برخیزد

تو فرمائیے کیا غلط بیانی کی۔

جناب اسد علی صاحب نے دو تین جگہہ لکھا ہے کہ غالب سسرال کے ٹکڑوں پر پل رہے تھے۔ ایک جگہہ لکھتے ہیں "سسرال میں پڑے ہوئے تھے" دوسری جگہہ فرماتے ہیں "خانہ داماد" تھے۔ ایک اور جگہہ یوں اپنی تاریخ دانی کا ثبوت دیتے ہیں۔

"میرزا غالب کے چچا نصر اللہ بیگ خاں کی شادی نواب احمد بخش خاں کی بہن سے ہوئی تھی۔ نصر اللہ بیگ خاں نواب احمد بخش خاں کی معیت ہی میں لڑائی میں کام آئے تھے۔ اسی لئے نواب صاحب موصوف کو ان کے پس ماندگان کا بہت خیال تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ غالب اور ان کے چھوٹے بھائی یوسف مرزا کو کم عمری ہی میں دلی لے آئے اور غالب کی شادی تیرہ برس کی عمر ہی میں اپنے بھائی نواب الٰہی بخش خاں کی چھوٹی لڑکی سے کردی۔ اس کے کچھ ہی مدت بعد غالب مستقلاً دلی میں آبسے"۔ (دروغ گو را حافظہ نباشد)

یہ بالکل غلط ہے۔ ان کی عمر کے پہلے سترہ اٹھارہ برس اپنی ننھیال میں بسر ہوئے۔ ان کے نانا عمائد اکبر آباد میں سے تھے اور اُن کے تمول کے نشان اب بھی وہاں موجود ہیں۔ میرزا وہاں سے دہلی آئے تو اس کی وجہ سسرال کی کشش نہیں تھی بلکہ علمی لحاظ سے دہلی کی مرکزی حیثیت تھی۔ یہاں وہ اپنے خداداد جوہر اور قابلیت کو زیادہ مجلا اور نمایاں کرسکتے تھے۔ یہاں آنے پر انہوں نے علیحدہ مکان لیا۔ اول وہ شعبان بیگ کی حویلی میں رہے۔ اس کے بعد وہ جامع مسجد کے عقب میں اٹھ گئے۔ جہاں وہ ایک زمانہ تک رہے۔ اس کے بعد پھر واپس بلیماروں کے گرد و نواح میں آگئے غرضکہ نہ وہ سسرال میں پڑے رہے نہ ان کی حیثیت "خانہ داماد" کی تھی۔ وہ شروع سے آزادانہ علیحدہ مکان لے کر رہے اور یہ اُن پر بہتان اور واقعات کا منہ چڑانا ہے کہ وہ سسرال کے دست نگر ہو کر رہے۔ یوں ان لوگوں کی بیٹی غالب سے بیاہی تھی۔ وہ اپنی بیٹی سے جتنا سلوک کرتے مستحسن تھا۔ لیکن اس سے یہ کیونکر ثابت ہوا کہ غالب ان کے محتاج تھے۔

جناب اسد علی صاحب لکھتے ہیں۔

"میرزا کے تعلقات اپنے برادر سببی مرزا علی بخش رنجور سے گو شروع میں خراب نہ تھے لیکن آگے چل کر ان سے بھی دل گرفتہ ہو گئے تھے"۔

دراصل یہ اعتراض یا جو کچھ بھی اسے کہو پہلے جناب شیخ محمد اکرام صاحب نے غالب نامے میں کیا ہے۔ جناب اسد علی صاحب نے وہاں سے نقل کیا ہے۔ شیخ صاحب موصوف نے اس کے لئے دو ثبوت پیش کئے ہیں جن میں سے پہلا جناب اسد علی صاحب نے بغیر حوالہ اپنے یہاں درج کرلیا ہے اور دوسرا چھوڑ دیا ہے۔ غالب ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"سبحان اللہ گولہ انداز کا بارود بنانا اور توپیں لگانا اور رنگ گھر اور میگزین کا لوٹنا معاف ہو جائے اور شاعر کے دو مصرعے معاف نہ ہوں۔ ہاں صاحب گولہ انداز (مرزا معین الدین) کا بہنوئی (نواب ضیاء الدین احمد خاں) مددگار ہے اور شاعر (غالب) کا سالا (مرزا علی بخش) بھی جانبدار نہیں"۔

واوین کے درمیان کے نام جناب شیخ صاحب کے اضافہ کئے ہوئے ہیں۔ ممکن ہے یہ تلمیح درست ہو اور یہ بھی ممکن ہو کہ غلط ہو۔ بہر حال اس سے انہوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ مرزا کے تعلقات رنجور سے اچھے نہیں تھے۔

دوسرا ثبوت انہوں نے یہ پیش کیا ہے کہ وہ رنجور کے جنازے میں شریک نہیں تھے اور غالباً یہ بھی لکھا ہے کہ انہوں نے ایک خط میں رنجور کی غلط بیانی اور افسانہ طرازی کی عادت کا بھی ذکر کیا ہے۔

جہاں تک میں نے غور کیا ہے ان میں سے کوئی دلیل بھی قطعی نہیں ہوسکتی جس سے ہم یقین سے یہ کہہ سکیں کہ ان دونوں کے تعلقات کشیدہ تھے۔ اگرچہ میں اس میں کوئی گناہ اور برائی بھی نہیں دیکھتا کہ ضرور اس کی تردید کی ضرورت بھی محسوس کروں۔ البتہ اس سلسلے میں ایک بات کا ذکر میں کردینا چاہتا ہوں۔

رنجور کی وفات یکم جنوری ۱۸۶۱ء کو ہوئی۔ غالب ۲۲ ۱۸۶۱ء اور ۱۸۶۲ء

کے دونوں برس پھوڑوں کی تکلیف سے بیمار اور چلنے پھرنے سے معذور رہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ جس دن رنجور کی وفات ہوئی ہے وہ بیماری کی وجہ سے ان کے جنازے کے ساتھ نہ جا سکے ہوں۔ اسی ضمن میں ایک اور بات بھی عرض کر دوں۔ رنجور کی وفات دہلی شہر میں نہیں ہوئی جو کہا جائے کہ ان کی میت دفن کے لئے یہاں سے لے گئے اور میرزا دوسرے لوگوں کے ساتھ نہیں گئے۔ بلکہ رنجور غدر کے بعد ہی دہلی کی اقامت چھوڑ کر عرب سرائے میں اٹھ گئے تھے جو سلطان جی کے پاس ایک بستی ہے وہیں ان کی وفات ہوئی اور وہ سلطان جی میں اپنے والد بزرگوار کے پہلو میں سپرد خاک کئے گئے۔

میرے خیال میں رنجور سے میرزا کے تعلقات آخر تک دوستانہ رہے۔ ہاں نواب علاؤالدین احمد خاں ضرور رنجور سے ناراض تھے اور جب انہوں نے رنجور کی وفات کے بعد بھی ایک خط میں ان کے خلاف لکھا تو غالب نے انہیں جواب میں لکھا ہے کہ یہ طریق درست نہیں میت کو ہمیشہ کلمۂ خیر سے یاد کرنا چاہئے۔ آپ کو چاہئے کہ اب مرحوم کے خلاف دشمنی وغیرہ کے خیالات کو ترک کر دیں۔

میں اوپر ان متعلقین سببی کے سلوک کے کچھ حالات بیان کر چکا ہوں۔ اس کے باوجود ایک نواب شمس الدین احمد خاں کو چھوڑ کر باقی سب کے ساتھ میرزا کا برتاؤ آخر تک نہایت دوستانہ رہا۔ ان میں سے بیشتر ان کے شاگرد تھے اور ان کی تعلیم و تربیت میں میرزا آخر تک گہری دلچسپی لیتے رہے۔ نواب امین الدین احمد خاں سے ان کا زندگی بھر بھائی چارہ اور یارانہ رہا۔ جیسا کہ ان کے اور علائی کے نام خطوط سے ظاہر ہے مرزا علی بخش خاں رنجور۔ نواب ضیاءالدین احمد خاں نیر رخشاں اور نواب غلام حسن خاں محو تینوں ان کے شاگرد تھے۔ عارف اگرچہ شروع میں شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ لیکن غالب کے مستقلاً دہلی آ جانے کے بعد وہ بھی انہیں سے اصلاح لینے لگے اور انہوں نے اپنا پہلا دیوان بھی نظر کر دیا شہاب الدین احمد خاں ثاقب اور ان کے چھوٹے بھائی سعید الدین احمد خاں طالب اور غلام فخر الدین خاں کی تعلیم و تربیت ہی ان کے ہاتھوں ہوئی۔ کامل اور شاداں کا تو ذکر ہی کیا کہ وہ بمنزلہ ان کی اولاد کے تھے۔ ان سب کے ساتھ میرزا کے تعلقات آخر تک نہایت خوشگوار رہے اور اس کا ثبوت موجود ہے۔ پھر معلوم نہیں ان کے اقربائے سببی اور کون تھے جن کے متعلق جناب اسد علی صاحب فرماتے ہیں کہ

نسب متعلقین سببی سے بھی ان کے تعلقات ایسے ہی بیزاری کے تھے:

اچھا ایک لمحہ کے لئے میں انہی کی مانے لیتا ہوں کہ واقعی ان کے تعلقات ان لوگوں سے اچھے نہیں تھے لیکن فرمایئے تو اگر یہ لوگ غالب کے متعلقین سببی تھے تو کیا غالب ہی ان کے کچھ نہیں ہوتے تھے۔ رنجور کی بہن امراؤ بیگم ضرور ان سے بیاہی تھیں گویا رنجور ان کے برادر نسبتی تھے۔ تو کیا اسی سبب غالب بھی رنجور کے برادر نسبتی نہیں تھے۔ پھر رنجور سے غالب کی بھانجی امانی خانم بیاہی تھیں۔ رنجور کے بیٹے مرزا غلام فخر الدین سے غالب کی بھتیجی عزیز النسا خانم منسوب تھیں۔ نیر رخشاں کی صاحبزادی معظم زمانی بیگم کامل کے گھر میں تھیں۔ جو میرزا کے پوتے کی حیثیت رکھتے تھے۔ تعلق نسبتی دو دھاری تلوار ہے اگر یہ لوگ غالب کے متعلقین سببی تھے۔ تو غالب بھی ان کے سببی رشتہ دار تھے۔ اگر ان لوگوں کے لئے اپنے بہنوئی سے اپنے ماموں سسر سے۔ اپنے چچا سسر سے۔ اپنے سمدھی سے ناخوشگوار تعلق رکھنا نازیبا نہ تھا۔ تو غالب کے لئے ان سے کشیدہ رہنا نارا کیوں ہو؟ پھر یہ کس طرح معلوم ہوا کہ ان حالات کے لئے ذمہ دار غالب تھے! ان کے خلاف کوئی شہادت پیش نہیں کی گئی اور واقعات کا فیصلہ ان کے حق میں ہے۔

جیسا کہ میں اوپر لکھ چکا ہوں میں تسلیم نہیں کرتا کہ میرزا کے تعلقات اپنے عزیزان سببی سے خراب تھے لیکن اگر شیخ محمد اکرام صاحب اور جناب اسد علی صاحب ہی کا نظریہ درست ہے تو اس کے لئے غالب کسی طرح ذمہ دار نہیں ٹھیرتے۔

نواب شمس الدین احمد خاں کی چغلی نواب شمس الدین احمد خاں سے واقعی وہ دل گرفتہ تھے اور ایک وہ ہی نہیں بلکہ سب ہی ان سے بیزار تھے۔ اس پر ذرا تفصیل سے لکھنے کی ضرورت ہے۔ نواب شمس الدین احمد خاں اور ان کا ایک چھوٹا بھائی اور دو بہنیں ایک عورت مدی کے بطن سے تھے۔ یہ عورت بخارہ کی رہنے والی تھی اور کسی اچھے گھرانے سے نہیں تھی۔ نواب احمد بخش خاں کی دوسری اولاد (دو لڑکے اور تین لڑکیاں) ان کی بیاہتا بیوی بیگم جان سے تھی جو ایک اعلیٰ خاندان سے تھیں۔ مدی کی وجہ سے نہ صرف دوسری بیگم کی اولاد ہی بلکہ خاندان کے باقی لوگ بھی نواب شمس الدین خاں کو اپنے سے کمتر درجے کا سمجھتے تھے۔ غالب بھی انہی لوگوں میں سے تھے۔ نہ معلوم خود انہیں بھی احساس کمتری تھا یا غیر شعوری طور پر خاندان

کے باقی افراد کے اس غیر ہمدردانہ رویّے کا اثر ہوا یا کوئی اور بات ہوئی نواب شمس الدین احمد خاں شروع سے ان سب کے شدید مخالف تھے۔ وہ سب سے الگ تھلگ رہے اور جب بھی انہیں موقعہ ملتا ان پر چوٹ کرنے سے نہ چوکتے۔ اس کا ایک اور بُرا نتیجہ نکلا کہ وہ طبیعت کے غصّہ ور اور سخت گیر ہو گئے

لیکن اس کی خاندان کے لوگوں کو چنداں پروا نہیں تھی۔ کیونکہ بظاہر ان کے گدّی پر بیٹھنے کے امکانات کم تھے لیکن نواب احمد بخش خاں نے بعض مصلحتوں کی بنا پر ۱۸۲۲ء میں یہ فیصلہ کیا کہ فیروز پور جھرکہ کی گدّی پر شمس الدین احمد خاں کو بٹھایا جائے اور لوہارو امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں کو دے دیا جائے لیکن بھائیوں کی آپس کی مخالفت اور کشمکش ان سے مخفی نہیں تھی۔ وہ خوب جانتے تھے کہ اگر اس تقسیم پر میری زندگی میں عملدرآمد نہ ہوا تو بعد میں ضرور جھگڑا پیدا ہوگا۔ اس لئے انہوں نے ۱۸۲۶ء میں ریاست کے نظم و نسق سے دست برداری کا اعلان کر دیا۔ اور یوں شمس الدین احمد خاں فیروز پور جھرکہ کی گدّی کے مالک بن گئے۔

۱۸۲۷ء میں نواب احمد بخش خاں کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد نواب شمس الدین احمد خاں نے کوشش شروع کی کہ کسی طرح لوہارو بھی انہیں مل جائے۔ اس ارادے کی کامیابی میں جو بھی ان کے سدّراہ ہوا وہ اس کے دشمن ہو گئے۔ چونکہ غالبؔ کی ہمدردی دوسرے فریق سے تھی اس لئے نواب ان کے بھی سخت مخالف ہو گئے۔ نواب نے پہلا وار یہ کیا کہ ساڑھے باسٹھ روپیہ ماہانہ پنشن جو انہیں فیروز پور کے خزانے سے ملتی تھی اور جو ان کے لئے قوت لایموت کا حکم رکھتی تھی اس کی ادائیگی میں طرح طرح کے روڑے اٹکائے جانے لگے اور اس کے بعد اپریل ۱۸۳۱ء میں یہ بالکل ہی بند کر دی گئی ادھر نیّر رخشاں اور امین الدین احمد خاں کو لوہارو سے بے دخل کرنے کے لئے انہوں نے ہر طرح کے جوڑ توڑ شروع کئے۔ چونکہ یہ دونوں بھائی ابھی نابالغ تھے اس لئے آخر وہ اس میں کامیاب ہو گئے۔

یہ صورتِ حالات تھی۔ جب ولیم فریزر ریذیڈنٹ ہو کر دہلی تشریف لائے۔ ان کے تعلقات نواب احمد بخش خاں مرحوم سے نہایت دوستانہ بلکہ برادرانہ رہے تھے۔ وہ ان دونوں بھائیوں کو بہت اچھی طرح جانتے تھے اور یہ دونوں بچّے انہیں چچا کہہ کر پکارتے تھے۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے ریذیڈنٹ کی حیثیت میں نواب شمس الدین احمد خاں کے خلاف صدر میں رپورٹ کی اور لوہارو ان دونوں بھائیوں کو واپس مل گیا۔ اس سے نواب شمس الدین احمد خاں کے دل میں گرہ بیٹھ گئی اور وہ ولیم فریزر کے جانی دشمن ہو گئے۔

اس کے تھوڑے دن بعد فریزر کا قتل ہوا۔ سب سے پہلے نواب شمس الدین احمد خاں کا داروغہ شکار کریم خاں گرفتار ہوا۔ پھر وہ بندوق ایک کنوئیں سے ملی جس سے یہ قتل ہوا تھا اور جس کی کریم خاں کے قبضے میں ہونے کی شہادت موجود تھی۔ پھر نواب کا ایک دوسرا ملازم واصل خاں بعض مشکوک حالات میں گرفتار ہوا۔ ان دونوں کے بیانات سے مجسٹریٹ کو شبہ ہوا کہ یہ قتل خود نواب کے ایما پر ہوا ہے۔ اس پر اس نے نواب کو فیروز پور سے دہلی آنے کے لئے لکھا۔ جب یہ دہلی پہنچے اور مجسٹریٹ نے ان سے بعض سوال کئے تو ان کے جواب سے اس کی تسلّی نہ ہوئی۔ اور وہ نظر بند کر دیئے گئے۔

اب بتائیے کہ اس میں غالبؔ یا کسی اور کے لئے چغلی کھانے کا موقعہ یا ضرورت ہی کیا تھی۔ قاتل گرفتار ہو چکا ہے۔ نواب کا ایک اور ملازم بھی زیرِ حراست ہے۔ قاتل کا بیان نواب کی اعانتِ مجرمانہ کا ثبوت ہے اور اس سے نواب کے خلاف شبہ پیدا ہوتا ہے۔ ان کے فریزر سے تعلقات اس شبہ کو تقویت دیتے ہیں۔ مجسٹریٹ انہیں دہلی طلب کرتا ہے اور ان کے جوابوں سے مطمئن نہ ہو کر انہیں نظر بند کر دیتا ہے۔ مقدمے کی باقاعدہ تفتیش شروع ہو جاتی ہے۔ کریم خاں کا ساتھی بھی اس دوران میں گرفتار ہو جاتا ہے اور سلطانی گواہ بن کر سارا راز طشت از بام کر دیتا ہے۔ جس کے نتیجے میں کریم خاں اور نواب شمس الدین احمد خاں دونوں دار پر کھینچ دیئے جاتے ہیں۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میں غالب بے چارے کا کیا قصور تھا۔ میں نے جان بوجھ کر "ذکرِ غالب" میں خاص اس واقعہ پر تفصیل سے نہیں لکھا تھا۔ کیونکہ اس پر بحث بہت حد تک میرے موضوع سے خارج تھی۔ اب لوگوں کے شبہ کا حال سنئے۔

اگر نواب شمس الدین احمد خاں اور فریزر کے کشیدہ تعلقات کسی سے پوشیدہ نہیں تھے تو اُن کی غالب دشمنی بھی کسی سے مخفی نہیں تھی۔ اپنے مخصوص حالات کی وجہ سے غالبؔ سب افسروں سے ملتے رہتے تھے۔ فریزر سے ان کے دیرینہ تعلقات تھے اور وہ ایک دوسرے کے دوست تھے۔ جو مجسٹریٹ اس مقدمے کی سماعت کر رہا تھا وہ بھی ان کا دوست تھا اور اس کے یہاں میرزا کی آمد و رفت تھی یعنی مقدمے کے

دوران میں بھی یہ رسم و راہ جاری رہی اور مجسٹریٹ نے انہیں اپنا ہم راز بنا لیا تھا۔

کیا یہ سب قرائن میرزا کے خلاف چہ می گوئیاں کرنے کے لئے کافی نہیں تھے۔ نواب سے ان کی دشمنی، فریزر سے دوستی۔ مجسٹریٹ سے یارانہ اور اس کے یہاں آنا جانا۔ لوگوں نے اگر کہا کہ غالب نے نواب کی چغلی کھائی ہے تو انسانی فطرت کے عین مطابق کیا۔ شبہ کے لئے کافی بلکہ اس سے زیادہ بنیاد موجود تھی۔ انہوں نے وہی کیا جو عام حالات میں ہوا کرتا ہے۔ مگر ہمارا فرض ہے کہ ہم تحقیق سے کام لیں۔ عوام کالانعام کی پیروی مؤرخ کا فرض نہیں۔ قطع نظر مندرجہ صدر واقعات سے جو لوگوں کے شبہ کی تغلیط کے لئے کافی ہیں، خود نواب شمس الدین احمد خاں کو غالب کے خلاف کوئی شکایت نہیں تھی۔ انہوں نے بھی صرف اپنے عمزاد بھائی مرزا فتح اللہ بیگ خاں کا نام لیا ہے کہ یہ شخص ہمارا دشمن ہے اور میرے خلاف ریشہ دوانیاں کر رہا ہے۔ اگر غالب بھی ان کے خلاف سازش میں شریک تھے تو وہ آسانی سے ان کا نام بھی لکھ سکتے تھے۔ ایسے حالات میں تو لوگ اپنے دشمنوں کو پھانسنے کی غرض سے جھوٹ موٹ بھی ان کا نام لے دیتے ہیں۔ پھر تعجب ہے کہ انہوں نے غالب کا نام کیوں نہ لیا جب کہ بقول جناب اسد علی صاحب وہ واقعی ان کے لئے پھانسی کھڑی کر رہے تھے۔

نہیں صاحب حقیقت یہ ہے کہ نہ غالب نے نواب کی چغلی کھائی، نہ انہیں ایسا کرنے کی ضرورت ہی تھی۔ لوگوں کا شبہ ضرور تھا۔ لیکن واقعات اس کی تائید نہیں کرتے۔ خود نواب کو ان کے خلاف کوئی شکایت نہیں تھی اور ہمارے نزدیک میرزا کی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے یہ کافی ہے۔

لیکن میں بالفرض مان لیتا ہوں کہ غالب نے واقعی نواب کی چغلی کھائی۔ فرمایئے اس پر اعتراض کیوں ہو؟ نواب ان کے دوست نہیں تھے بلکہ دشمن تھے۔ انہوں نے غالب کو نقصان پہنچانے میں کونسی کسر اٹھا رکھی تھی۔ ان کا روزینہ تک انہوں نے بند کر دیا تھا۔ وہ ان کے دوستوں کے خلاف سر توڑ کوشش کر رہے تھے کہ کسی طرح ان لوگوں کو ان کے جائز حق سے محروم کر دیں۔ انہوں نے ان کے ایک اور دوست کو موت کے گھاٹ اتروا دیا۔ وہ دوست جو ان کا مربی بھی تھا اور جس سے انہیں بہت نفعے کی امید تھی۔ اگر ان سب باتوں کے پیش نظر انہوں نے نواب کی مخبری کی تو وہی کیا جو کوئی اور شخص غالب کی جگہ ہوتا ہوا کرتا۔ کیا دشمن سے بدلہ لینا حرام ہے؟ کیا ظالم کی مخالفت گناہ ہے؟ کیا قاتل کو اس کے کیفرِ کردار کو پہنچانا ناروا ہے؟ غالب انسان تھے۔ انہوں نے وہی کیا جس کی ایک انسان سے امید کی جا سکتی ہے اور کسی نے کب دعوےٰ کیا ہے کہ وہ انسان نہیں فرشتہ تھے۔

قصہ کوتاہ اگر غالب نے نواب کی مخبری نہیں کی جیسا کہ واقعات سے ثابت ہے تو انہوں نے انسان سے بلند تر ہونے کا ثبوت دیا اور اگر انہوں نے واقعی مخبری کی تو اس سے وہ انسان سے کمتر ثابت نہیں ہوتے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

میرزا یوسف کی مدد: جناب اسد علی صاحب نے شروع میں ایک فقرے کا اضافہ کر کے غالب نامہ سے مندرجہ ذیل اقتباس پیش کیا ہے:۔

"اصل میں وہ انتہائی خود غرض اور خود پسند آدمی تھے"۔ اور نو اور انہوں نے اپنے بھائی مرزا یوسف اور ان کے اہل و عیال کی غدر اور اس کے بعد کوئی خاص مدد نہ کی۔ غدر کی مصیبتیں میرزا یوسف کو تن تنہا جھیلنی پڑیں اور جب وہ مر گیا تو معلوم ہوتا ہے کہ مرزا نمازِ جنازہ میں بھی شریک نہ تھے۔ اس کی وفات کے بعد میرزا نے اپنی بھتیجی اور بھاوج وغیرہ کو ایک پائی نہ بھیجی (حالانکہ مرزا کی اپنی بسر اوقات بیشتر چچا کی پنشن پر تھی۔) بے شک یہ غیر معمولی وقت تھا اور میرزا اپنی مصیبتوں میں گرفتار تھے۔ لیکن ان حالات کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد یہی خیال ہوتا ہے کہ ان کی اپنی ضرورتیں اتنی بڑھی ہوئی تھیں کہ کسی کی خاطر اپنے آرام کو قربان نہیں کرتے تھے اور نہ اپنے تئیں خطرے میں ڈالتے تھے۔"

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ میرزا غدر کے دوران میں میرزا یوسف اور اس کے بعد ان کے اہل و عیال کی کوئی مدد نہ کر سکے۔ لیکن اس کے لئے کسی تحقیق و تجسس کی ضرورت نہیں۔ خود میرزا ایک خط میں میر مہدی کو لکھتے ہیں:۔

"اجی وہ یوسف ہند نہ سہی۔ یوسف دہر سہی، یوسف عصر سہی، یوسف مفت کشتہ ہی۔ اُن کی زلیخائے ستم برپا کر رکھا ہے۔ مجھے تو خبر نہیں کہیں حضرت کہہ گئے ہیں کہ میں ساڑھے سات روپے مہینہ بھیجے جاؤں گا۔ اب اُن کا تقاضا ہے۔ رحیم بخش روز آتا ہے اور کہتا ہے کہ پھوپھا جان کو لکھو کہ پھوپھی جان بھوکی مرتی ہیں۔ خرچ جلدی بھیجو ورنہ نالش کی جائے گی۔ اور تم کو گواہ قرار دیا جائے گا۔"

کیا یہ لفظ اس شخص کے ہیں جو مدد کرنا نہ چاہے۔ یہاں میرزا اپنے افلاس اور شرم کا اظہار کر رہے ہیں کہ وہ اپنی بھاوج اور بھتیجی اور اس کی اولاد کی ان تین برس میں کوئی مدد نہیں کر سکے۔ اب آئیے ذرا حالات کا مطالعہ کریں۔

۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو غدر شروع ہوا۔ میرزا نے مکان کا دروازہ بند کیا اور خانہ نشین ہو گئے۔ میرزا یوسف شروع سے ایک علیحدہ مکان میں رہتے تھے۔ چونکہ وہ بہت زمانہ سے دیوانہ ہو گئے تھے۔ اس لئے ان کی بیوی اور صاحبزادی بھی بہت کم ان کے ساتھ رہتی تھیں۔ صاحبزادی جناب عزیز النسا خانم صاحبہ رنجور کے بیٹے مرزا غلام فخر الدین سے بیاہی تھیں اور میرزا یوسف کی بیوی بالعموم اپنی بیٹی کے پاس یا اپنے میکے میں رہتی تھیں۔ ان کے میکے دہلی میں تھے۔

غدر کے دوران میں میرزا یوسف کی بیوی اور بیٹی انہیں چھوڑ کر جے پور چلی گئی تھیں جہاں اُن لوگوں کے دیرینہ تعلقات اور کچھ عزیز داری تھی اقتباس محولہ فوق میں جو عبارت واوین میں ہے یعنی "حالانکہ مرزا کی اپنی بسر اوقات بیشتر چچا کی پنشن پر تھی" یہ غالباً جناب اسد علی صاحب کی اضافہ کی ہوئی ہے۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ شیخ محمد اکرام صاحب یہ نہیں لکھ سکتے تھے بھلا اس سے زیادہ ناواقفی اور کیا ہو گی کہ غدر یا اس کے بعد میرزا کی پنشن کا ذکر کیا جائے۔ یہ پنشن مئی ۱۸۵۷ء میں بند ہوئی اور ایک طویل تگ و دو کے بعد مئی ۱۸۶۰ء میں دوبارہ جاری ہوئی۔ ان حالات میں یہ لکھنا کہ میرزا کی اپنی بسر اوقات چچا کی پنشن پر تھی لیکن انہوں نے اپنی بھاوج اور بھتیجی کی کوئی مدد نہیں کی۔ اپنی انتہائی جہالت کا ثبوت دینا ہے۔

میرزا یوسف کو بھی غالب کی طرح پنشن کے ساڑھے سات سو روپے سالانہ ملتے تھے۔ گویا جب تک میرزا کو پنشن ملتی رہی۔ میرزا یوسف بھی پاتے رہے اور جب غدر ہوا تو دونوں کی بند ہو گئی۔ اگر اس کے بعد میرزا کے پاس کوئی اور آمدنی کا ذریعہ تھا اور انہوں نے بھائی کی مدد نہیں کی تو واقعی اعتراض کا مقام تھا۔ لیکن یہاں تو کوئی اور ذریعہ تھا ہی نہیں دونوں ایک ہی کشتی کے سوار تھے بلکہ میرزا کی حالت بدتر تھی۔ بھائی کے مقابلے میں ان کے اخراجات ہمیشہ بہت زیادہ رہے تھے۔ ممکن ہے میرزا یوسف نے کچھ پس انداز بھی کیا ہو اور یہاں تو اُلٹے مقروض تھے۔

لیکن سب سے زیادہ ستم کی بات مرزا یوسف کے جنازے کی نماز میں عدم شرکت کا الزام ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ شیخ محمد اکرام صاحب کے نزدیک نماز جنازے میں شرکت غیر معمولی طور پر اہم بات ہے۔ اگر کوئی شخص کسی کے جنازے کی نماز میں شامل ہو تو گویا یہ قطعی ثبوت ہے اس کی میت سے محبت اور دوستی کا اور اگر وہ اس میں شامل نہ ہو (اگرچہ عدم شرکت کے لئے کوئی معقول عذر بھی ہو) تو ظاہر ہے کہ ان کے تعلقات ناخوشگوار تھے اور اسے مرحوم سے کوئی محبت نہیں تھی۔ یہ میں اس لئے لکھ رہا ہوں کیونکہ جناب شیخ صاحب نے رنجور اور میرزا کے تعلقات میں کشیدگی ثابت کرنے کے لئے بھی لکھا ہے کہ وہ رنجور کے جنازے کی نماز میں شریک نہیں تھے۔

لیکن یہ نماز جنازے کی بھی ایک ہی کہی! اجی حضرت کیسا جنازہ اور کیسی نماز جنازہ! میرزا یوسف کا انتقال ۱۸ اکتوبر ۱۸۵۷ء کی رات کو ہوا۔ یاد رہے کہ اس سے ایک ماہ پہلے انگریز دوبارہ دہلی پر قابض ہو چکے تھے اور انتقام کشی اور سخت گیری اپنے پورے شباب پر تھی۔ لوگوں کے لئے اپنے گھروں سے باہر قدم رکھنا محال تھا۔ میرزا نے "دستنبو" میں اس کی ایک مثال پیش کی ہے۔ لکھتے ہیں "پانی کا کنواں ہمارے کوچے کے باہر تھا۔ حالانکہ امن قائم ہو گیا تھا۔ پھر بھی ہم میں سے کسی کو جرأت نہیں ہوتی تھی کہ وہاں تک جا کر اپنی ضرورت کے لئے پانی ہی لا سکے۔ نہ معلوم ان غریبوں پر کیا گذرتی اگر خدا نے ان پر کرم کیا۔ موسلا دھار پانی پڑا اور ان لوگوں نے کپڑے تان تان کر گھر بھر کے برتن بھر لئے"۔ یہ تھی عام حالت جن دنوں میرزا یوسف کا انتقال ہوا ہے۔

ظاہر ہے کہ جن حالات میں سے شہر اس وقت گذر رہا تھا۔ دو چار آدمیوں کا مل کر کسی میت کو قبرستان تک دفن کرنے کے لئے جانا محال تھا۔ کفن اور گورکن کی تلاش مزید مصیبت۔ آخر ہمسایوں نے ان کی بے کسی پر رحم کھایا۔ میرزا کے دو تین ملازم اور مہاراجہ پٹیالہ کا ایک سپاہی ان کے ساتھ گئے۔ کفن کے لئے دو تین سپید چادریں میرزا نے اپنے یہاں سے دیں۔ ان لوگوں نے قریب کی مسجد میں گڑھا کھودا اور لاش کو اس میں اُتار کر مٹی سے پاٹ دیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

اوپر کا بیان کم و بیش میرزا کی اپنی تحریر سے ماخوذ ہے۔ کیا کوئی صاحب انصاف اس سے یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ میرزا دفن کرنے کے وقت ان لوگوں کے ساتھ نہیں تھے۔ یوں بھی یہ یاد رہے کہ ان کے ملازم اور ہمسائے تک تو ان کے بھائی کی تجہیز و تکفین میں شریک رہے ہوں اور یہ خود وہاں موجود نہ ہوں۔ نہ معلوم کیسے اس عبارت سے شیخ محمد اکرام صاحب اور ان کی نقل میں جناب اسد علی صاحب نے یہ اعتراض کیا ہے۔

بہرحال چونکہ دعوےٰ ان حضرات کا ہے اس لئے بار ثبوت بھی انہی کے سر ہے۔ میں اتنا لکھتا ہوں کہ یہ اعتراض غلط ہے۔

شیخ محمد اکرام صاحب نے آخری فقرے میں ایک اور عمومی اعتراض کر دیا ہے۔

"ان حالات کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد یہی خیال ہوتا ہے کہ اُن کی اپنی ضرورتیں اتنی بڑھی ہوئی تھیں کہ وہ کسی کی خاطر اپنے آرام کو قربان نہیں کرتے تھے اور نہ اپنے تئیں خطرے میں ڈالتے تھے۔"

اے کاش کہ وہ ایسے ہی ہوتے لیکن جہاں تک میں واقعات کا مطالعہ کر سکا ہوں۔ حقیقت بالکل اس کے برعکس نظر آتی ہے۔ دیکھئے

(۱) جن دنوں ان کی بسر اوقات صرف ساڑھے باسٹھ روپے پنشن پر تھی وہ یوسف علی خاں عزیز کو غالباً دس روپے ماہانہ بطور امداد وظیفہ دیتے رہے کیونکہ عزیز ان ایام میں بیکار تھے اور ان کے گذارے کی اور کوئی صورت نہیں تھی۔ اس کے علاوہ انہوں نے کوشش کی کہ عزیز کو کسی جگہ ملازمت مل جائے یا کوئی فتوح ہاتھ آ جائے۔

(۲) غدر کے دوران میں خود بھوکوں مر رہے تھے اور گھر کے برتن اور کپڑے بیچ بیچ کر اپنا اور بیوی بچوں کا پیٹ پال رہے تھے۔ لیکن اس حالت میں بھی ملازموں کو علیٰحدہ نہیں کیا۔ غدر کے بعد جب آمدنی صرف سو روپیہ ماہوار (وظیفہ رام پور) تھی۔ اس وقت بھی یہی حالت تھی۔ بلکہ ایک ملازم مدارہی چلا گیا تھا یا مر گیا تھا اور اس کے بیوی بچے ان کے ہاں تھے۔ انہوں نے ان کی مدد سے ہاتھ نہیں روکا۔ ایک دوسرا ملازم کلّمن نوکری چھوڑ کر چلا گیا۔ ایک مہینہ ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مار کے واپس آ گیا کہ صاحب کہیں جگہ نہیں ملی۔ آپ ہی آسرا دیں ورنہ بھوکا مرتا ہوں۔ میرزا کی مروّت نے اجازت نہ دی کہ انکار کر دیں۔ اچھا بھئی تم بھی رہو۔ اندر باہر میں آدمی کھانے والے اور سو روپیہ آمدنی۔

(۳) غدر کے بعد ایک موقعہ پر ریاست جے پور سے کچھ یک مشت عطیہ ملنے کی امید پیدا ہو گئی تھی۔ ان پھٹے حالوں میں بھی انہیں اپنے دوستوں کا خیال رہا۔ وہ میر مہدی کو لکھتے ہیں کہ اگر خدا کے فضل سے کچھ بافت ہوئی تو میں چاہتا ہوں آدھا آدھا تم سے بانٹ لوں۔

(۴) حسین مرزا ان کے نہایت عزیز دوستوں میں سے تھے۔ غدر نے ان کی امارت کا بھی خاتمہ کر دیا اور وہ بے چارے ایک زمانے تک ٹھوکریں کھاتے پھرے۔ اس ابتلا میں میرزا ان کی مدد کرنا چاہتے تھے۔ مگر بے بس تھے اور اس پر وہ اپنے دلی افسوس کا اظہار کرتے ہیں۔

(۵) حالی مرحوم نے لکھا ہے کہ ان کے ایک دوست ملنے کو آئے جو کسی زمانے میں اچھے کھاتے پیتے تھے۔ لیکن گردش ایام کے سبب نکبت کا شکار ہو گئے تھے۔ غالب نے نہایت سلیقے اور اسلوب سے ان کا معمولی کپڑے کا کوٹ اتروا لیا اور چلتے وقت اپنا قیمتی خرغل ان کی نذر کر دیا۔

کیا یہ حالات زیر نظر اعتراض کی تغلیط کے لئے کافی نہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ حد درجہ زمانہ شناس بزرگ تھے۔ وہ اپنے نفع و نقصان کو خوب سمجھتے تھے لیکن اس کے باوجود ان کی زندگی کے متعلق جو تھوڑی بہت واقفیت بھی ہمارے پاس ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ وہ دوستوں پر جان چھڑکنے والے اور ان کے دُکھ درد میں ان کی حامی بھرنے والے اور حتی الوسع ان کی مدد کرنے والے تھے۔ نواب شمس الدین احمد خاں والے واقعہ ہی کو لے لیجئے۔ میرزا کی ماہانہ پنشن اُن سے متعلق تھی اور اگر یہ نواب کی ہاں میں ہاں ملاتے تو نہ صرف یہ پنشن ہی بلکہ نواب احمد بخش خاں مرحوم کے زمانے کی فتوحات بھی جاری رہ سکتی تھیں۔ لیکن صریح نقصان کے یقین کے باوجود وہ فریق ثانی سے رشتہ نہیں توڑتے۔ آخر نواب شمس الدین احمد خاں کو ان سے لاگ تھی تو اسی وجہ سے نا کہ یہ نواب امین الدین احمد خاں اور نواب ضیاء الدین احمد خاں سے دوستی کا دم بھرتے تھے۔ ان کی سفارشیں کرتے اور ہر ممکن طریقے سے ان کی حمایت کرتے تھے۔ کیا جناب اسد علی ہمیں بتا سکتے ہیں کہ اس ترجیح کی کیا وجہ تھی۔ رشتہ برابر کا تھا۔ طاقت اور جاہ و منزلت نواب شمس الدین احمد خاں کی طرف تھے اور ان کے ساتھ رہنے میں فائدے کی کہیں زیادہ امید تھی۔ اس کے باوجود کیوں انہوں نے اپنی پنشن اور زندگی کو خطرے میں ڈال لیا۔ میں نے زندگی اس لئے کہا کیونکہ یقیناً مرزا نہ ولیم فریزر سے زیادہ قوی تھے نہ ان کی پشت پر کوئی حکومت تھی۔ ان کے لئے ایک نہیں دس کریم خاں پیدا ہو سکتے تھے۔ ہاں! کوئی ہمیں بتائے کہ آخر میرزا جو ان حضرات کے نزدیک "انتہائی خود غرض اور خود پسند آدمی تھے"۔ "جو کسی کی خاطر اپنے آرام کو قربان نہیں کرتے تھے اور نہ اپنے آپ کو خطرے میں ڈالتے تھے"۔ انہوں نے کیوں یہ خود کشانہ روش اختیار کی۔ اس کا ایک ہی جواب ہو سکتا ہے کہ وہ دوستی نبھانے کو اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

ان کے نزدیک "وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے۔" اور ان کے مذہب میں مصیبت کے وقت دوست کو اپنے حال پر چھوڑ دینا کفر ہے۔

دستنبو کی تصنیف | جناب اسد علی صاحب نے دستنبو کے متعلق بھی دو اعتراض کئے ہیں۔ انہیں کے الفاظ سنئے۔ فرماتے ہیں:۔

"غدر کی وجہ سے ہندوستانی بادشاہت کی بساط الٹ چکی تھی انگریز کی حکومت میں اب کوئی شبہ نہیں رہا تھا۔ سوچا اس انقلاب کے متعلق کچھ ایسا لکھوں کہ آیندہ چل کر اس کی وجہ سے اپنی بریت ثابت ہو بلکہ صاحبانِ انگریز سے رشتۂ یک جہتی استوار ہو تا کہ مددگاری اور وفاداری کے انعامات سے بہرہ ور ہو سکوں فارسی دانی اور ایرانی الاصل ہونے کا دعوے برسوں سے کر ہی رہے تھے۔ عربی یوں بھی کم جانتے تھے۔ ارادہ کیا کہ اس طرح کی کتاب ہو کہ سوائے فارسی اور کسی زبان کا لغت نہ آنے پائے یہ ارادہ کرنے کو تو کر لیا لیکن اس کے لئے ان کا وجدانی ذوق کافی نہ ہوا اور ہندی فارسی دانوں کی لغت کے بغیر کام نہ چلا۔ اس وقت ان کے پاس دساتیر اور برہان قاطع ان دو کتابوں کے علاوہ اور کوئی کتاب نہ تھی۔ انہی دو کتابوں کی مدد سے دستنبو لکھی گئی۔"

یعنی اول انہوں نے دستنبو اس خیال سے لکھی کہ آیندہ چل کر اس سے اپنی بریت ثابت کر سکیں جس سے انگریز ان کی مدد اور وفا کا صلہ انہیں عطا فرمائیں۔ دوم دستنبو انہوں نے دساتیر اور برہان قاطع کی مدد سے لکھی۔

یوں معلوم ہوتا ہے جناب اسد علی صاحب نے دستنبو کا مطالعہ نہیں کیا۔ ورنہ وہ یہ نہ لکھتے کہ میرزا نے یہ اپنی بریت اور انگریز سے وفاداری اور اس کے انعام سے بہرہ ور ہونے کی امید میں لکھی تھی۔ دستنبو کے دو حصے ہیں۔ پہلے میں انہوں نے غدر کے حالات اور باغیوں کے مظالم کا ذکر کیا ہے، اور دوسرے میں فتح دہلی کے بعد انگریزوں کی انتقام کشی اور سخت گیری کی داستان لکھی ہے۔ اگر انہوں نے تلنگوں کے بیان میں ان وحشیوں کی بربریت کا تفصیل سے ذکر کیا ہے تو دوسرے حصے میں بھی کسی لگی لپٹی کا اظہار نہیں کیا۔ اگر انہیں تملق اور رسوگیری منظور تھی تو وہ ایسا نہ کرتے۔ اس کے برخلاف انہوں نے نہایت صاف گوئی سے واقعات قلم بند کر دیئے ہیں اور یہ معلوم نہیں ہوا کہ یہ بریت کس جرم سے ثابت کرنا منظور تھی اور وفاداری اور مددگاری کا کون فعل تھا جس کو ظاہر کرنا دستنبو سے مقصود تھا۔ نہ انہوں نے کسی انگریز کو قتل کیا نہ کسی بنک گھر یا میگزین کو لوٹا اور نذر آتش کیا۔ پھر بریت کیسی! اور انہوں نے کونسا کام وفاداری یا رشتۂ یکجہتی استوار کرنے کا کیا؟ کیا کسی انگریز کو اپنے یہاں پناہ دی؟ کیا کسی انگریز عورت کو وحشی باغیوں کے ہاتھ سے نجات دلوائی؟ کیا غدر کے دوران میں وہ باغیوں کے خلاف جاسوسی کرتے رہے۔ اگر ان سب کا جواب نفی میں ہے تو بتایا جائے کہ انہوں نے کونسی مدد انگریزوں کی کی تھی جس کے صلے کی انہیں امید ہو سکتی تھی۔ انہوں نے خود نواب یوسف علی خاں بہادر والئی رام پور کے نام ایک خط میں لکھا ہے کہ میں نے غدر کے زمانے میں انگریزوں کی کوئی خاص خیر خواہی نہیں کی جو کسی انعام کا مستحق ٹھہروں۔ اور یہاں تو اور الٹا اثر ہوا۔ انعام کی جگہ پہلی پنشن بھی بند ہو گئی دربار و خلعت کا اعزاز چھن گیا اور ان پر الزام لگا کہ تم غدر کے دوران میں باغیوں سے اخلاص رکھتے تھے۔ اچھی کتاب تھی کہ نئے انعام کی جگہ پنشن بھی بند ہو گئی اور زمانہ بھر میں وہ بدنام بھی ہوئے —

دوسرا اعتراض بھی عجیب مضحکہ خیز ہے کہ انہوں نے "دستنبو" کو دساتیر اور برہان قاطع کی مدد سے لکھا۔ پہلے تو میری سمجھ میں نہیں آیا کہ واقعی ان کا مطلب کیا ہے۔ ان تینوں کا موضوع ایک نہیں کہ وجۂ اشتراک پیدا ہو۔ اس صورت میں دستنبو لکھنے کے لئے ان دو لغوی کتابوں سے کوئی مدد لینے کا امکان بھی تھا۔ اس کے بعد کیا کسی لغت کی کتاب سے آپ کوئی کتاب لکھ بھی سکتے ہیں۔ بالخصوص دستنبو کی تصنیف میں وہ ان کتابوں سے کیا مدد لے سکتے تھے۔ دستنبو کے آخر میں سو ڈیڑھ سو ایسے لفظوں کی ایک فہرست دی گئی ہے جو خالص پارسی زبان کے ہیں اور نا مستعمل ہونے کے سبب نامانوس اور بعید الفہم ہیں۔ جناب اسد علی صاحب مقابلہ کر کے دیکھ لیں کہ ان میں سے کتنے لفظ ان کی برہان قاطع میں موجود ہیں اور ان پر اس مدد کی حقیقت کھل جائے گی جو دستنبو کی تصنیف میں میرزا نے اس کتاب سے لی۔ دساتیر سے بھی مقابلہ کرنا چاہیں تو وہ میں مہیا کر دوں گا۔ کیا انہیں یہ معلوم ہے کہ دساتیر کا موضوع کیا ہے اور کیا اس میں ان لفظوں کے پائے جانے کا امکان بھی ہے؟

قاطع برہان کی تصنیف | حالات اور واقعات سے آنکھیں بند کر کے جناب اسد علی صاحب نے ایک اور دعوئے تصنیف فرمایا ہے۔

"مرزا غالب کے حالات ایسے رہے کہ غدر سے پہلے ان کو اتنا اطمینان نہ مل سکا کہ وہ قتیل وغیرہ سے پورا پورا انتقام لے سکیں ..... غالب نے قتیل اور دیگر فارسی دانوں کا سارا غصہ صاحب برہان قاطع پر اتارا۔ کچھ اس وجہ سے بھی کہ باوجود کوشش کے وہ قتیل کی تحریرات میں کوئی واقعی گرفت نہ کر سکے۔ بہرحال مرزا غالب نے برہان پر جا و بے جا اعتراضات کا طومار باندھ دیا۔"

میرزا کلکتہ سے نومبر ۱۸۲۹ء میں واپس دہلی پہنچے۔ غدر مئی ۱۸۵۷ء میں ہوا۔ جناب اسد علی صاحب فرماتے ہیں کہ اس ۲۸-۲۹ برس کے طویل زمانے میں انہیں اتنی فرصت بھی نہیں ملی کہ ڈیڑھ دو سو صفحے کی ایک کتاب لکھ سکتے۔ کیا یہ باور کیا جا سکتا ہے۔

پنشن کا مقدمہ ضرور ۱۸۴۴ء تک جاری رہا۔ لیکن کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ پندرہ برس کامل دن رات اس مقدمے کی پیروی ہی میں لگے رہے۔ اس دوران میں ۱۸۳۵ء میں انہوں نے اپنا فارسی کلیات اور ۱۸۳۹ء میں اردو دیوان مرتب کیا۔ کیا وہ قتیل اور دوسرے ہندوستانی فارسی دانوں کے متعلق ڈیڑھ دو سو صفحے کی کتاب لکھنے کی فرصت بھی نہیں نکال سکتے تھے؟

۱۸۴۷ء میں اسیری کا حادثہ پیش آیا۔ آخر ۱۸۴۴ء سے ۱۸۴۷ء تک وہ بالکل بیکار رہے۔ کیونکہ دیوان اردو کا پہلا ایڈیشن ۱۸۴۱ء میں اور کلیات فارسی کا پہلا ایڈیشن ۱۸۴۵ء میں شائع ہو گیا تھا۔ کیا ان تین برسوں میں یہ کام نہیں ہو سکتا تھا؟

۱۸۴۷ء میں وہ جون سے لے کر اگست تک قید رہے۔ رہائی کے بعد ۱۸۵۰ء جون تک وہ پھر بیکار رہے۔ کیا ان تین برسوں میں وہ یہ کام نہیں کر سکتے تھے!

جون ۱۸۵۰ء میں وہ ڈیوڑھی کے ملازم ہوئے اور مہر نیم روز کے لکھنے یا ترجمہ کرنے پر مقرر ہوئے۔ یہ مارچ ۱۸۵۲ء میں ختم ہو گئی۔ اس کے بعد غدر تک کم و بیش پانچ برس کی طویل مدت میں کیا وہ یہ کام نہیں کر سکتے تھے؟

یقیناً ظفر اور رمز اور خضر یا دوسرے شاگردوں کے کلام کی اصلاح اتنا وقت نہیں لے سکتی تھی کہ وہ ایک ایسے ضروری کام کے لئے بھی فرصت نہ نکال سکتے۔ جس کی تکمیل کی خواہش انہیں ۲۸-۲۹ برس سے تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے کبھی سنجیدگی سے ایسی کوشش کی ہی نہیں۔ برہان قاطع کے خلاف بھی انہوں نے جو کچھ لکھا یہ محض اتفاق کی بات تھی۔ غدر کے ایام میں ان کی خانہ نشینی۔ باہر کی آمد و رفت بند اور مطالعہ کے لئے صرف دو کتابیں۔ وقت کاٹنے کو وہ برہان قاطع کا مطالعہ کرنے لگے۔ شروع میں ان کا ارادہ کوئی مستقل کتاب لکھنے کا بھی نہ تھا۔ وہ محض اس کے حاشیے پر اعتراض لکھتے گئے۔ وہ بھی اشارۃً ہیں۔ غدر کے بعد انہوں نے ان اشارات کو قابل فہم طریقے پر جمع کر کے کاتب سے خوشخط لکھوا لیا۔ غالباً اب بھی ان کا ارادہ اسے شائع کرنے کا نہیں تھا۔ وہ تو جب بعض دوستوں نے اسے دیکھا تو اس کی اشاعت پر اصرار کیا اور اس طرح یہ تکمیل کے پورے دو برس بعد ۱۸۶۲ء میں پہلی بار چھپی۔ کیا یہ سہل انگاریاں کوئی ایسا شخص کر سکتا ہے جس کے دل میں انتقام کی آگ ۳۰-۳۲ برس سے سلگ رہی ہو۔ جناب اسد علی صاحب نے انسانی نفسیات کا مطالعہ کیا ہی نہیں۔

پھر یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ غصہ تو قتیل پر ہے اور نکالا جا رہا ہے محمد حسین دکنی پر اور یہ کیا فرمایا کہ "باوجود کوشش کے وہ قتیل کی تحریرات میں کوئی واقعی گرفت نہ کر سکے"۔ کیا ثبوت ہے اس امر کا کہ مرزا نے کوئی ایسی کوشش کی بھی! کیا جناب اسد علی صاحب کی یہ خواہش ہے کہ کوئی قتیل پر ضرور اعتراض کرے۔ اگر غالب کو یہ فرصت نہیں ملی تو ممکن ہے کہ کوئی اللہ کا بندہ اب ان کی یہ خواہش پوری کر دے لیکن اس سے فائدہ؟

کلام میں اغلاط آخر میں جناب اسد علی صاحب نے میرزا کے کلام نظم و نثر پر بھی متعدد اعتراض کئے ہیں۔ ان میں سے بیشتر ان کی زبان اور معانی و بیان سے ناواقفیت کا نتیجہ ہیں اور اگر ضرورت ہوئی تو انشاء اللہ ان کے متعلق پھر کبھی لکھا جا سکتا ہے۔ لیکن اس موقع پر مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا ہے آپ بھی سن لیجئے۔

۳۰-۳۵ برس کی بات ہے یعنی جس زمانے میں برنارڈ شا (مشہور انگریز ڈرامہ نگار) کچھ ایسا مشہور نہیں تھا اور نہ بہت زیادہ لوگ اس کے صورت آشنا تھے۔ وہ تھیٹر میں بیٹھا کھیل دیکھ رہا تھا۔ اس کے برابر میں ایک اور صاحب تشریف فرما تھے۔ ڈراما جو کھیلا جا رہا تھا وہ اس کا اپنا تھا۔ تماشے کے دوران میں ناظرین طرح طرح سے اپنی پسندیدگی کا اظہار کر رہے تھے۔ یہ دوسرے صاحب اس پر ناک بھوں چڑھاتے اور بڑبڑاتے اور جھک کر آہستہ سے برنارڈ شا کے (جو خاموش بیٹھا تھا اور جس کے معنی ان کے پڑوسی نے کچھ اور لئے) کان میں کہتے کہ عجب احمق لوگ ہیں یہ۔ آخر اس ڈرامے میں کونسی خوبی ہے جس پر یہ تالیاں بجا رہے ہیں۔ برنارڈ شا خاموشی اور استقلال سے سب

کچھ سنتا رہا۔ جب آخری سین ختم ہوا تو منتظمین میں سے ایک صاحب اسٹیج پر آئے اور کہنے لگے کہ خوش قسمتی سے ڈرامے کے مصنف خود بھی تھیٹر میں موجود ہیں۔ ہم ان سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ یہاں قدم رنجہ فرمائیں اور حاضرین سے خطاب کریں۔

اس پر برنارڈ شا اپنی جگہ پر سے اٹھا۔ اب ان صاحب کی کیفیت دیکھنے کے قابل تھی جو کھیل کے دوران میں اس میں کیڑے ڈالتے رہے تھے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ ان کا مخالف خود برنارڈ شا تھا۔ برنارڈ شا نے اسٹیج پر پہنچ کر ان حضرت سے مخاطب ہو کر کہا۔

"قبلہ! میں آپ سے متفق ہوں کہ اس ڈراما میں کوئی ایسی بات نہیں جس کی تعریف کی جائے۔ پلاٹ سو سست مکالمہ سو کمزور تمثیل سو غیر فطری۔ لیکن اسے کیا کیا جائے کہ ان سب خامیوں کے باوجود ان سینکڑوں ناظرین کے خیال میں یہ ڈراما بہت اچھا ہے۔ اب فرمائیے اتنے آدمیوں کے مقابلے میں ہم دو کی مخالفانہ رائے کیا وقعت رکھتی ہے۔"

میں بھی جناب اسد علی صاحب سے اتفاق کرتا ہوں کہ میرزا کا سارا کلام کیا نظم اور کیا نثر، کیا اردو اور کیا فارسی، اغلاط کا طومار ہے اس میں زبان و بیان کی بے شمار خامیاں ہیں۔ بیشتر کلام بے معنی ہے لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ ہندوستان بھر کے نقادانِ علم و فن اور صاحبانِ ذوقِ سلیم اور اس میں ماضی و حال کی کوئی قید نہیں، اسی پُر از اغلاط اور بے معنی کلام کو بقول مولانا آزاد مرحوم عینک کی طرح آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں۔ اب ان سب کے خلاف ہم دو کی آواز کہیں نقار خانے میں طوطی کی آواز ہو کر تو نہیں رہ جائے گی؟

خاتمہ: مضمون اچھا خاصا لمبا ہو گیا۔ واقعی مجھے جناب اسد علی صاحب کی جرأت پر تعجب ہے۔ اور مجھے افسوس ہے کہ مکتبہ جامعہ نے ایسی کتاب کو اپنی طرف منسوب کرنا منظور کیا جس میں واقعات غلط اور تاریخ غلط تر ہیں۔ جس کا طرزِ تحریر پریشان اور بیانات متضاد ہیں۔ جس کے مصنف کو مزاح اور تحقیق کے درمیان امتیاز تک کا سلیقہ نہیں۔ جس نے دوسری جگہ سے نقل کرتے وقت اتنا بھی خیال نہیں کیا کہ میں اصل کی غلطیاں ہی درست کر دوں۔ جس نے اپنے سارے گھروندے کی بنیاد ثانوی ماخذوں کی ریت پر رکھی ہے۔ کیا واقعی یہ تعجب کا مقام نہیں کہ غالب کی تصنیفات کے اقتباس اور حوالے ہیں اور ماخذ ایک جگہ بھی غالب کی اپنی کتاب نہیں بلکہ موقت الشیوع رسائل اور بعض انتخابات ہیں۔

مجھے تو قتیل پر رحم آتا ہے کہ انہیں وکیل بھی ملے تو وہ حضرت جنہیں اپنے موکل کا صحیح نام بھی معلوم نہیں۔ پھر شبہ ہوتا ہے کہ قتیل کا تو محض بہانہ تھا۔ کیونکہ کتاب کے ۱۳۰ صفحوں میں سے قتیل پر اعتراضوں کے جواب ۲۰ صفحوں میں آ گئے ہیں باقی سو صفحے غالب کے خلاف سیاہ کئے ہیں۔

انہیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا
اٹھے تھے سیرِ گل کو دیکھنا شوخی بہانے کی

مالک رام

دو نظمیں

زورِ خطابت

عرش سے اک ندائے کُن آئی — کائنات اُٹھی لے کے انگڑائی
کتنی پُرزور یہ خطابت تھی!

(۲)

ارادہ

میرے غم خانے میں جب تُو آئے گا
بیٹھ کر رو دُوں گا تیرے سامنے — اور بتاؤں گا نہ دُکھ اپنا تجھے!

سعید احمد اعجاز

خاکبازی

یہ ماحول کس کا بنایا ہوا ہے؛ مری روح پر کیوں یہ چھایا ہوا ہے؛
شکنجہ ہے بیرنگ فطرت نہیں یہ فریبِ تخیّل ہے صنعت نہیں یہ

چمن کیا ہے؛ اک دام ہے رنگ و بو کا بُرا حال ہے "بلبلِ جستجو" کا
کھنچے جا رہے ہیں نگاہوں کے دامن کہ ہے خاک ہی گویا ان کا مدفن

اُلجھ کر خس و خار میں رہ گئی ہے نظر جھاڑ جھنکار میں رہ گئی ہے
زمیں کے تلے آسماں ڈھونڈتی ہے، حقیقت کو ظالم کہاں ڈھونڈتی ہے!

دلِ زار کی نو نیازی نے مارا نگاہوں کی اس خاکبازی نے مارا
زر و زور کی راجدھانی بنی ہے طلسمات دنیائے فانی بنی ہے

یہ فرعون گردی، یہ قاروں نگاہی،
ٹلے گی بھی دنیا کے سر سے الٰہی؟

امینِ حزیں

غزل

پرسشِ پنہاں کو اک دنیا سمجھ بیٹھے تھے ہم
اس نگاہِ آشنا کو کیا سمجھ بیٹھے تھے ہم

رفتہ رفتہ غیر اپنی ہی نظر میں ہو گئے
واہ ری غفلت تجھے اپنا سمجھ بیٹھے تھے ہم

گوش بر آواز ہونا ہی شکستِ ساز ہے
اک سکوتِ غم کو ہنگامہ سمجھ بیٹھے تھے ہم

ہوش کی توفیق بھی کب اہلِ دل کو ہو سکی
عشق میں اپنے کو دیوانہ سمجھ بیٹھے تھے ہم

پردۂ آزردگی میں تھی وہ جانِ التفات
جس ادا کو رنجشِ بے جا سمجھ بیٹھے تھے ہم

صد پیامِ ہوش لائی سختیِ راہِ جنوں
غفلتوں کو عشق کا سودا سمجھ بیٹھے تھے ہم

کیا کہیں الفت میں رازِ بے حسی کیونکر کھلا
ہر نظر کو تیری غم افزا سمجھ بیٹھے تھے ہم

نیستی کی منزلیں بھی تھیں جہاں اندر جہاں
عاشقی کو تارکِ دنیا سمجھ بیٹھے تھے ہم

بے نیازی کو تری پایا سراسر سوز و درد
تجھ کو اک دنیا سے بیگانہ سمجھ بیٹھے تھے ہم

انقلابِ پے بہ پے ہر گردش و ہر دور میں
اس زمین و آسماں کو کیا سمجھ بیٹھے تھے ہم

اب سکون و بے حسی، رنج و خوشی کچھ بھی نہیں
عشق کو اک درد کی دنیا سمجھ بیٹھے تھے ہم

بھول بیٹھی وہ نگاہِ ناز عہدِ دوستی
اُس کو بھی اپنی طبیعت کا سمجھ بیٹھے تھے ہم

صاف الگ ہم کو جنونِ عاشقی نے کر دیا
خود کو تیرے درد کا پردا سمجھ بیٹھے تھے ہم

کان بجتے ہیں محبت کے سکوتِ ناز کو
داستاں کا ختم ہو جانا سمجھ بیٹھے تھے ہم

باتوں باتوں میں پیامِ مرگ بھی آ ہی گیا
ان نگاہوں کو حیات افزا سمجھ بیٹھے تھے ہم

اب نہیں تابِ سپاسِ حُسن اس دل کو جسے
بے قرارِ شکوۂ بے جا سمجھ بیٹھے تھے ہم

ایک دنیا درد کی تصویر نکلی۔ عشق کو
کوہکن اور قیس کا قصہ سمجھ بیٹھے تھے ہم

دیکھتا کیا ہوں کہ دنیا میں قیامت آ گئی
اس نظر کو یونہی اک فتنہ سمجھ بیٹھے تھے ہم

جلوۂ بے نقش و صورت کی بہاریں دیکھ لیں
موجِ رنگ و بو کو اک دھوکا سمجھ بیٹھے تھے ہم

رفتہ رفتہ عشق مانوسِ جہاں ہوتا چلا
خود کو تیرے ہجر میں تنہا سمجھ بیٹھے تھے ہم

حسن کو اک حُسن ہی سمجھے نہیں اور اے فراق
مہرباں نامہرباں کیا کیا سمجھ بیٹھے تھے ہم

فراق گورکھپوری

اندھیرا

وہ مردانہ ٹوپیوں کی دکان تھی۔ بلوری دروازے پر گہرے نیلے رنگ کا بورڈ آویزاں تھا۔ اُس پر ایک شیشے کی نلی بل کھاتی ہوئی "ٹوپی والا" بن گئی تھی۔ رات کے وقت اس شیشے کی نلی سے بنے ہوئے حروف میں ایک برقی چمک لپک کر یہاں سے وہاں تک دوڑ جاتی اور "ٹوپی والا" روشن ہو جاتا اور پھر آپ ہی آپ گُل ہو جاتی۔ دکان کی سامنی دیوار شیشے کی بنی ہوئی تھی تاکہ دُکان میں سجے ہوئے سامان کی نمائش ہوتی رہے۔ اس بلوری دیوار کی دونوں جانب نہ کیا ہوا ایک آہنی جنگلہ تھا جسے رات کو کھینچ کر مقفل کر دیا جاتا تھا۔ اور اس کے قریب دکان کا چوکیدار رات بھر پہرا دیا کرتا تھا۔

دکان میں ایک وسیع کمرا تھا۔ دودھیا دیواریں اور ستون گہرے نیلے رنگ کی پھولدار چھت سر پر اٹھائے کھڑے تھے۔ شیشے کی الماریوں میں گتے کے ڈبوں میں قسم قسم کی مردانہ ٹوپیاں رکھی تھیں۔ فرش پر نمائشی الماریوں میں رنگ رنگ کی ٹوپیاں چمک چمک کر آنے جانے کو سر ڈھانپنے کی دعوت دے رہی تھیں۔ قدآدم آئینوں پر سر اور ٹوپیوں کے متعلق دلچسپ ہدایات لکھی ہوئی تھیں "سولا ہیٹ پہنئے۔ اور اپنے سر کو ٹھنڈا رکھئے"۔ "سر کو ایک ٹوپی میں قید مت کیجئے"۔ "ہر سمجھدار سر مناسب موقع پر مناسب ٹوپی پہنتا ہے"۔ وغیرہ۔

دُکان میں یہاں وہاں چاروں طرف خدا جانے کس چیز سے بنے ہوئے روغنی پتلے سر پر ٹوپیاں رکھے کھڑے تھے۔ وہ سب کے سب مردانہ پتلے تھے۔ ہر پتلے کے سر پر مختلف قسم کی ٹوپی رکھی ہوئی تھی۔ سولا ہیٹ فیلٹ گاف کیپ۔ نائٹ کیپ۔ رومی۔ کالی کرسٹی۔ شکاری ٹوپی۔ اونی ٹوپی وغیرہ تاکہ لوگوں پر الماری میں رکھی ہوئی ٹوپی اور سر پر پہنی ہوئی ٹوپی کا فرق واضح ہو جائے۔ یا شاید اس لئے کہ یہ امر اُن کے ذہن نشین ہو جائے کہ ٹوپی سر پر پہنی جاتی ہے یا اس لئے کہ اُن کی قوت متخیلہ ناجائز طور پر پریشان نہ ہو۔

ان پتلوں کے روغنی متبسم چہرے اور خوشنما لباس بہت جاذب نظر تھے۔ رات کا وقت تھا۔ کمرے کے وسط میں ایک لٹکتی ہوئی برقی قندیل روشن تھی۔ آہنی جنگلے کے پرے چوکیدار کی پیٹھ دُھندلی دُھندلی نظر آ رہی تھی۔ ایک بھاری سے اوورکوٹ پر ایک لپٹی ہوئی پگڑی رکھی ہوئی تھی۔

دُکان کی دیوار پر گھڑی نے بارہ بجائے۔

سولا ہیٹ والے پتلے نے انگڑائی لی۔ آنکھیں ملیں۔ "اُف"! اُس نے دونوں باہوں کو سر کی طرف اٹھاتے ہوئے کہا "یہ کمبخت ٹوپی جو میرے سر پر چڑھی ہوئی ہے۔ میں اسے اٹھا اٹھا کر اکتا چکا ہوں۔ خدا کی قسم! یہ ملعون ٹوپی! دن رات اسے سر پر اٹھائے کھڑے رہنا جیسے زندگی کا مقصد صرف ٹوپی اٹھا کر کھڑے رہنا ہی ہوا"۔

"کون ہے؟ کون ہے؟" گاف کیپ والے نے آنکھیں کھول کر پوچھا۔

"وہی دیوانہ سولا ہیٹ والا۔ اور کون"۔ رومی ٹوپی والے نے جواب دیا۔

"کیا کہتا ہے۔؟"

"خدا جانے کیا بکتا ہے"

خدا کی قسم! مجھے شک ہے۔ مجھے تو اسی میں شک ہے کہ زندگی کا مقصد صرف یہی ہے کہ ہم ٹوپیاں اٹھا کر کھڑے رہیں"!

"ہا ہا۔ ہا ہا۔ ہا ہا" گاف کیپ والا اپنا تھیلا سنبھالتے ہوئے ہنسا خوب خوب! گویا زندگی کا مقصد صرف ٹوپی اٹھائے کھڑے رہنا ہے۔ پاگل! پاگل! ہا ہا۔ ہو۔ ہو۔ ہو ہو۔ ہی ہی! قسم ہے اگر اس کے سر پر ٹوپی نہ ہوتی تو بھی اسے گلہ ہوتا کہ اُسے اپنے شانوں پر سر اٹھانا پڑتا ہے یقین جانو"!

"ہاں۔ ہاں!" فیلٹ والے نے اپنی بکتائی کی گرہ کو سنوارتے ہوئے کہا۔ "اس فلسفی سے بھلا کوئی پوچھے کہ بڑے میاں اگر زندگی کا مقصد صرف ٹوپی اٹھائے کھڑا رہنا ہے تو تم نے اتنا لمبا اوورکوٹ کیوں پہنا ہوا ہے؟"

"ہاں ہاں، اوورکوٹ کیوں پہنا ہوا ہے؟"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔"

"اب کیوں نہیں بولتا؟"

"ارے دیوانہ ہے دیوانہ۔"

کمرے میں چاروں طرف سے آوازیں آرہی تھیں۔

"اوورکوٹ!" سولا ہیٹ والے نے نفرت سے کہا "کس نے کہا تھا کہ مجھے اوورکوٹ چاہئے۔ کون اوورکوٹ مانگتا ہے اوورکوٹ؟ ——— تمہیں کو یہ اوورکوٹ خوشنما نظر آتا ہوگا۔ میرے لئے یہ محض ایک مجبوری ہے۔ اوورکوٹ! ——— جسے میں اتار نہیں سکتا۔ خود پہن بھی نہیں سکتا۔ جو خواہ مخواہ میرے گلے کا ہار ہو رہا ہے۔ میری لاچاری کا زندہ ثبوت ہے۔ خدا کی قسم! زندہ ثبوت ——— اور یہ ملعون ٹوپی جو میرے سر پر چڑھی بیٹھی ہے۔ خدا کی قسم یہ دیدہ دلیر ٹوپی۔ آخ . . . . . ."

فیلٹ والے نے اپنے مکلف کالر سمیت گردن موڑی اور اُس دائمی مسکراہٹ کو جو اُس کے ہونٹوں پر مُہر کی طرح ثبت تھی۔ بھینچ کر کہا۔ "دیوانے تم زندگی کو کیا جانو؟ چھوٹا منہ بڑی بات۔ اتنی بڑی بات! ——— یہ دودھیا دیواریں۔ یہ خوبصورت ستون۔ یہ رنگا رنگ کے ڈبے۔ یہ روشنی کا فوارہ۔ آئینے۔ بلوری ساز و سامان ——— انہیں دیکھو۔"

"اہا!" سولا ہیٹ والا دیوانہ وار ہنسا۔ "انہیں دیکھو! کیسے دیکھوں؟ کیا دیکھوں؟ یہ دھندلی دھندلی دیواریں جو یہاں سے چل کر خدا جانے کہاں جا ختم ہوتی ہیں۔ یہ نیلے پیلے گتے کے ڈبے۔ جن کے متعلق ہم اتنا بھی نہیں جانتے کہ ان میں کیا ہے۔ اور یہ ٹمٹماتی ہوئی روشنی جو اندھیرے سے جھگڑ جھگڑ کر اکتا چکی ہے۔ اور اب۔ اب اپنی تھکی ہاری کرنیں سمیٹ رہی ہے۔ یہ سب کیا ہے؟ یہ روشنی، یہ اندھیرا، یہ کون سی جگہہ ہے؟

"ہم کون ہیں؟ کیوں ہیں؟ ہمیں بنانے والا کہاں ہے؟ اور ——— اور یہ ٹوپی خدا کی قسم! یہ ملعون ٹوپی۔"

"اس قدر کفرانِ نعمت۔ نعوذ باللہ! نعوذ باللہ!" رومی ٹوپی والا بولا۔ "یہ نعمتیں۔ یہ جوانی۔ اندھا ہے اندھا!"

"بھگوان دیا کرے" کالی ٹوپی والے نے کہا۔

"میں کہتا ہوں۔ بے چارہ معذور ہے" فیلٹ والے نے مسکراتے ہوئے کہا "جسے یہ ٹوپی کا بوجھ سمجھتا ہے۔ وہ درحقیقت اس کے پراگندہ خیالات کا بوجھ ہے۔"

کالی ٹوپی والے نے سر اٹھایا۔ "مگر مہاراج۔ اگنی کے متعلق ایسے شبد کہنا۔ بھگوان دیا کرے۔ بھگوان دیا کرے۔"

"ہاں ہاں۔ اس کے نور کے متعلق ایسی باتیں منہ پر لانا۔ استغفر اللہ! استغفر اللہ!" رومی ٹوپی والا بولا۔

"اتنا بھی نہیں سمجھتا کہ یہ جگہہ کون سی ہے جنٹلمین! یہ جگہہ ہمارے رہنے کے لئے بنی ہے۔ یہ سب خوشنما چیزیں ہمارے لئے ہیں۔ مجھے مجھے اس "گاف سٹک" کی قسم!" گاف کیپ والے نے اپنی سٹک گھماتے ہوئے کہا۔

"یہ سب کچھ ہمارے لئے ہے۔ یہ دھاری دار سوٹ ———"

"اس لئے کہ تم روشنی میں کھڑے ہونا۔ یہاں آکر دیکھو۔ اس کونے میں" دائیں کونے سے نائٹ کیپ والے کی آواز آئی۔ "جہاں ابھی طرح سے اُجالا۔ اندھیرے سے جدا نہیں ہوا۔ جہاں دودھیا دیواروں کی بجائے گدرے گدرے سائے گھیرا ڈالے کھڑے ہیں۔ ان دھندلی دسعتوں کو آکر دیکھو تو ——— تمہیں کسی کا مذاق اڑانے کا حق نہیں۔ تم اپنے آپ کے سوا اور کسی کو بھی سمجھ نہیں سکتے۔"

"خوب! اپنا آپ سمجھنا ——— واللہ! کیا خوب! اپنا آپ کون سمجھتا ہے؟ کون؟ اتنا بھی نہیں کہ ہم اپنے آپ کو ہی سمجھ سکیں۔ کیسا مذاق ہے جیسے دنیا کسی مداری کا تھیلا ہو۔ خدا کی قسم مداری کا تھیلا!" سولا ہیٹ والا قہقہہ مار کر ہنسا۔

"گڈ لارڈ۔" فیلٹ والے نے چیں بجبیں ہو کر کہا۔ "کون کہتا ہے کہ اپنا آپ سمجھو؟ ضرورت ہی کیا پڑی ہے کہ ہم اپنا آپ سمجھنے میں اپنی زندگی حرام کریں۔ جینا بذاتِ خود ایک نعمت ہے۔ چاہے تم اسے سمجھ سکو یا نہ سمجھ سکو۔ یہ سانس لینا۔ یہ سونا۔ یہ جاگنا۔ یہ چمکدار روشنی۔"

"خدا گواہ ہے کہ مجھے جینے پہ ناز ہے۔ الحمد للہ کہ میں جیتا ہوں۔ الحمد للہ کہ میں دیکھتا ہوں۔" رومی ٹوپی والے نے کہا۔

"کون کہتا ہے کہ زندگی کو سمجھو؟ کون کہتا ہے؟" گاف کیپ والے نے کہا۔ "میں کہتا ہوں۔ تم یا تو کیک کو کھا کر اس کی لذت سے محظوظ ہو سکتے ہو۔ اور یا اس کو سامنے رکھ کر اس پر غور و خوض کر سکتے ہو۔ تمہاری اپنی مرضی ہے۔ دونوں باتوں میں سے کوئی ایک چن لو۔ مگر ایک ہی وقت میں اس پر غور و خوض کرنا اور اُسے کھانے کی بھی خواہش رکھنا۔ حماقت ہے۔ زندگی کو سمجھنا اور جینا دو متضاد باتیں ہیں۔ سنا آپ نے مسٹر؟ ذرا غور کیجئے نا!"

فلیٹ والے نے ہاتھ جیب میں ڈالے اور اطمینان سے کہا۔ "جو کچھ ہم ہیں وہ تو ہیں ہی، بدل نہیں سکتے۔ پھر اس بات کے متعلق سوچنے سے فائدہ؟"

"حماقت! اور کیا؟"

"ایسے احمق بھی ہیں" اردوی ٹوپی والے نے کہا۔ "ایسے شرفا بھی ہوتے ہیں جو جب تک دانت ہوں بادام کو سامنے رکھ کر اس پر غور و خوض کرتے رہتے ہیں اور جب دانت گر جائیں تو اُسے کھانے کی ناکام آرزو پر اور اس حسرت پر کہ اُسے کیوں نہ کھا لیا کف افسوس ملتے رہتے ہیں ــــ اللہ جانتا ہے۔ یہ کفرانِ نعمت ہے۔ استغفر اللہ! استغفر اللہ!"

"غم خور!"

"دیوانے!"

"سب بھگوان کے روپ ہیں۔ سب بھگوان کے روپ ہیں" کالی ٹوپی والے نے سر اٹھا کر کہا۔ "ایک سے ایک نہیں ملتا۔ ایک سے ایک نرالا ہے۔ بھگوان کے روپ کا کیا انت ہے۔"

"گستاخی معاف۔ بندہ تو جینے کا قائل ہے۔"

"الحمد للہ! الحمد للہ!"

"بندہ بھی تو جینے کا قائل ہے۔"

"ہاں ہاں جیو۔ تمہیں جینے سے کون روکتا ہے؟" نائٹ کیپ والا چلایا۔ "خوشی سے جیو۔ مگر اس بھلے مانس کو سوچنے سے کیوں روکتے ہو۔ تم جیو۔ اسے سوچنے دو۔"

"ہاں ہاں اُسے سوچنے دو۔"

"ہمیں کیا پڑی ہے کہ سارے جہان کا درد اپنے سر لیں۔"

"ہماری بلا سے۔"

"دیوانے کو کیا کہئے۔"

(نہ ہر کوئی کچھ نہ کچھ بول رہا تھا)

"ہا ہا۔ ہا ہا۔ ہا ہا" سولا ہیٹ والا دیوانہ وار ہنسا۔ "گویا میں دیوانہ ہوں ــــ میں پوچھتا ہوں۔ کون ہے جو دیوانہ نہیں؟ کون ہے؟ تم سب جینے کے دیوانے ہو اور میں سوچنے کا۔ دیوانگی کیا ہے؟ کون بتا سکتا ہے کہ دیوانگی کیا ہے؟ خدائی قسم ہم اتنا بھی نہیں جانتے کہ عقل کیا ہے۔ اس رسمی دنیا میں نہ سوچنے والا احمق۔ ڈر ڈر کر۔ پھونک پھونک کر سوچنے والا عقلمند اور بے دھڑک سوچنے والا دیوانہ ہے۔ خدائی قسم عجب جھمیلا ہے۔"

"گڈ لارڈ!" گاف ٹوپی والے نے اپنی چھڑی کو ہوا میں گھماتے ہوئے کہا۔ "اس کمبخت نے ہماری زندگی حرام کر رکھی ہے۔"

"ہاں ہاں بالکل حرام کر رکھی ہے!"

"قطعی حرام!"

"اللہ جانتا ہے! اُف!"

"میں کہتا ہوں ذرا سوچو تو" نائٹ کیپ والے نے کہا۔ "اگر وہ چپ چاپ کھڑا رہے تو کیا تم سب گم صم کھڑے اکتا نہ جاؤ۔ کیا اس کے ایک شک نے ہماری زندگی دلچسپ نہیں بنا رکھی۔ شاید زندگی اسی جھمیلے کی وجہ سے اتنی دلکش نظر آتی ہو۔ کون جانتا ہے؟"

"دلچسپ۔ آخ!"

"ہماری زندگی ــــ"

"تمہاری زندگی!" سولا ہیٹ والے نے حقارت سے منہ بنا کر کہا۔ "جسے تم زندگی کہتے۔ کیا ہے؟ بارہ بجے جاگنا اور پھر چار بجے جب مشرقی دروازے میں سفید سفید سا دھواں اٹھتا ہوا نظر آتا ہے۔ سو جانا دن رات۔ دن رات ایک دوسرے سے دور۔ یہ ملعون ٹوپی اٹھائے کھڑے رہنا۔ اتنا بھی نہیں کہ دو قدم چل سکیں۔ اُن دھندلی دھندلی شکلوں کی طرح چل سکیں جو ساری رات جب ہم سوئے ہوئے ہوتے ہیں، ہمارے ارد گرد ناچتی ہیں خدائی قسم ہم سے تو بھتنے ہی اچھے ہیں جو ناچتے پھرتے ہیں۔ زندگی۔ ہا ہا۔ ہا ہا ہا۔ زندگی کے دیوانے۔ فرش میں گڑے ہوئے دیوانے!"

"زندگی کی حقیقت سمجھنے والے صاحب اگر تم اُسے مصیبت سمجھنے پر مصر ہو تو پڑے سمجھو۔ ہمارے لئے تو جینا ایک خوشنما مسکراہٹ

ہے" فیلٹ والے نے اپنی نکٹائی کی گرہ سنوارتے ہوئے کہا۔

"مسکراہٹ" سولاہیٹ والے نے مسکرا کر کہا۔ یہ بھی خوب رہی۔ اس مسکراہٹ پر ناز کرتے ہو جو تمہارے ہونٹوں پر کھدی ہوئی ہے جس طرح یہ فیلٹ تمہارے سر پر پڑی ہوئی ہے تم اسے اتار نہیں سکتے اپنے سوٹ کے علاوہ تمہیں اس مسکراہٹ کا بوجھ بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔ تم اسے ایک پھوڑے کی طرح اٹھائے پھرتے ہو۔ خدا کی قسم پھوڑے کی طرح ہاہا۔ ہاہا۔ ہاہا"

"پھوڑا ہی سہی" فیلٹ کیپ والے نے کہا "تمہاری نظروں میں پھوڑا ہے نا۔ ہر کسی کی مسکراہٹ۔ دوسرے کی آنکھوں میں خار بن کر کھٹکتی ہے۔ یہ تو اصولی بات ہے"

"بھئی واہ کیا پتے کی بات کی ہے۔ گر حضرت واضح ہو کہ بندہ تو جینے کا قائل ہے" گاف والے نے کہا۔

"علیٰ ہذالقیاس" فیلٹ والا بولا۔

"ہاں ہاں ٹھیک ہے" نائٹ کیپ والا مدھم آواز میں کہنے لگا "انہیں جینے دو۔ اُن کے لئے جینا واقعی ایک مسکراہٹ ہے۔ اس لئے کہ وہ روشنی میں کھڑے ہیں۔ اس لئے کہ ان کے ارد گرد بلوری سامان بکھرا ہوا ہے۔ روشنی میں بلور، بلور نظر آتا ہے اور روشنی میں کپڑوں پر رنگدار دھاریاں ابھر آتی ہیں۔ اور مسکراہٹیں خوشنما محسوس ہوتی ہیں۔ یہ رنگ یہ روپ یہ بلور یہ سب روشنی کا دھوکا ہے۔ روشنی کا فریب۔

"اُس کے نور کو دھوکا سمجھنا۔ توبہ ہے توبہ" رومی ٹوپی والا کہنے لگا "اُسی کے روپ ہیں۔ یہ اجالا یہ اندھیرا سب اسی کے روپ ہیں۔ بھگوان کے روپ کا کوئی انت نہیں۔

"یہ کہاں ہے اجالا! کہاں ہے اجالا؟" اوپر سے مدھم آواز سنائی دی جیسے دور اُن دھندلی وسعتوں میں کوئی کراہ رہا ہو۔ "یہاں گھٹا ٹوپ اندھیرا ہے۔ بوجھل اندھیرا۔ میرا اس اندھیرے میں دم رکتا ہے، میں کہاں ہوں۔ میری کالی ٹوپی اور ڈریس سوٹ کیا ہوئے۔ تم سب کہاں ہو؟ اُف یہ گہرا اندھیرا!"

کچھ دیر کے لئے کمرے میں موت کی سی خاموشی چھاگئی۔ گویا سب ڈر کے مارے گونگے ہو گئے تھے۔

"کون ہے؟"

"کون بولا ہے؟"

"سنا تم نے!"

"چپ۔ وہ کراہ رہا ہے"!

"سنو سنو"!

"آہ کبھی میں بھی روشنی میں تھا" اوپر سے وہی آواز آئی "مگر اب ——— اب میں اس اندھیرے کے بوجھ تلے دبا جا رہا ہوں۔ میرا دم رکتا ہے۔

"مالک۔ مالک"!

"سنا تم نے" نائٹ کیپ والے نے کہا۔

"کون ہے؟" فیلٹ والے نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے پوچھا۔

یہ وہ ہے جو کسی زمانے میں ڈریس سوٹ پہنے، کالی ریشمی ہیٹ لگائے اُس جگہ کھڑا تھا جہاں اب تم کھڑے ہو" نائٹ کیپ والے نے طنز بھرے انداز میں کہا۔

پھر اُس کی وہ مسکراہٹ جس پر تمہیں ناز ہے مدھم پڑگئی۔ اس کے چہرے کی سرخی اور چمک مدھم پڑگئی۔ پھر ——— پھر وہ یہاں سے اٹھوا دیا گیا اور اب خدا جانے کہاں پڑا ہے۔ جہاں تم کو بھی ایک روز جانا ہوگا"

"مجھے؟" فیلٹ ہیٹ والے نے اپنے کالر اور گردن کے درمیان انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔

"ہاں، تمہیں"!

گاف والے نے اپنا تھیلا چھاتی سے لگا کر بھینچ لیا۔

کالی ٹوپی والے نے خوف زدہ نگاہوں سے اوپر دیکھا۔

"ہے بھگوان"!

شکاری نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے۔ چھاتی پر صلیب کا نشان بنایا۔

کمرے میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

سولاہیٹ والا دیوانہ وار ہنسا "ڈر گئے! خدا کی قسم، سب ڈر گئے ——— سوچتے کیا ہو؟ جیو۔ پیٹ بھر کر جیو۔ یہ دودھیا دیواریں۔ یہ بلوری ساز و سامان۔ یہ روشنی کا فوارہ! خوب جیو ——— جو کچھ بھی تم ہو۔ وہ تو تم ہو ہی بدل نہیں سکتے۔ پھر بھلا سوچنے سے فائدہ؟ بادام کھالو، ورنہ دانت گر جائیں گے تو کف افسوس ملو گے۔ آج روشنی میں کھڑے ہو کر کل آنے والے اندھیرے سے ڈرنا حماقت ہے۔ دیوانگی ہے۔ خدا کی قسم دیوانگی!

ہا ہا۔ ہا ہا۔ ڈر گئے !!"

"چپ چپ" آہنی جنگلے کے پاس کھڑے شکاری نے کہا۔

"کون ہے؟"

"چپ۔ چوکیدار۔"

"چوکیدار ادھر دیکھ رہا ہے۔"

"چوکیدار؟"

"ہاں ہاں۔ وہ ادھر دیکھ رہا ہے۔"

جنگلے کے باہر چوکیدار کی دھندلی شکل نظر آرہی تھی۔ منہ پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔ دو اندر دھنسی ہوئی آنکھیں جن پر دو بھاری بھوریں بھویں ابھری ہوئی تھیں۔

"کون چوکیدار؟ جس چیز کو میں سمجھ ہی نہیں سکتا۔ اس سے کیوں ڈروں!" سولاہیٹ والا بولا۔ "اس کی شکل تو دیکھو جیسے کوئی بھیانک خواب ہو۔ جیسے یہ بھی کسی اندھیرے کے بوجھ تلے دبا ہوا ہو۔

خدائی قسم مجھے شک پڑتا ہے۔ مجھے شک پڑتا ہے کہ یہ شخص ہم سے بھی زیادہ دکھی ہے۔ وہ دیکھو اس کے سر پر کوئی ٹوپی سے بھی بھاری چیز رکھی ہوئی ہے۔"

"اونہوں۔ یہ چیز نہیں۔ اگر اس نے سن لیا تو" گاف کیپ والے نے کہا "سن لے۔ مجھے قطعی پروا نہیں۔ میں اس بھیانک شکل سے نہیں ڈرتا بے چارہ بھوت!

جنہیں تم بھوت کہتے ہو۔ جو رات کو جس وقت ہم سو رہے ہوتے ہیں۔ ہمارے ارد گرد پھرتے ہیں۔ دن کے وقت وہ ہمارے سامنے کیوں نہیں آسکتے؟ خدائی قسم مجھے یہ شبہ ہے کہ یہ بھوت ہم سے بھی زیادہ معذور ہیں۔ دکھی ہیں۔ ان کو بھی سر پر ٹوپیاں اٹھانی پڑتی ہیں۔ اف یہ ملعون ٹوپی!"

"انہیں کون نہیں جانتا۔ کون نہیں جانتا" فیلٹ والے نے چوکیدار کے جانے کے بعد کہا۔

"سبھی جانتے ہیں۔"

"ہاں ہاں۔ جانتے ہیں"

کتابوں میں صاف لکھا ہے کہ اس بلوری دروازے کے پرے بھوتوں کی نگری ہے۔"

"تم نے نہیں پڑھا مہاراج؟ اندھیر نگری چوپٹ راج۔"

بھوتوں کی بات نہ کیجئے صاحب۔ لاحول ولاقوۃ۔ رانڈے ہوئے

"پھر تم چوکیدار سے کیوں ڈرتے ہو؟" سولاہیٹ والے نے کہا۔

"کون ڈرتا ہے" گاف کیپ والا چھڑی گھما کر بولا۔

"بے چارہ چوکیدار!" فیلٹ والے نے اپنی نکٹائی کی گرہ کو سنوارتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں بے چارہ۔"

"ہماری خدمت کے لئے یہاں کھڑا رہتا ہے۔"

"نوکر جو ہوا۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔"

(سب بے دھڑک بول رہے تھے)

"گڈ نیس" سولاہیٹ والا حقارت سے چیخ اٹھا "ہمارا ہی خدمتگار اور ہمارے سر پر ہی ڈنڈا لے کر کھڑا رہے! خوب! آپ صاحبان کے کیا کہنے ہیں۔ آپ ہی کی خدمت کے لئے ایک بھوتوں کا جہان بنایا گیا ہے۔ آپ کی آنکھوں کو چکا چوند کرنے کے لئے یہ بلوری سامان بنا ہے۔ خدائی قسم آپ کے کیا کہنے ہیں۔ اپنے آپ کو بڑھ چڑھ کر سمجھنا۔ اشرف المخلوقات خیال کرنا، اپنی عظمت پر ایمان رکھنا یہی جینا ہے۔ خدائی قسم جینا سب سے بڑا جھوٹ ہے۔ دھوکا ہے۔ فریب ہے۔ تم واقعی جیتے ہو۔

جیو۔ پیٹ بھر کر جیو۔ گھر کو آگ لگا کر تماشا دیکھو۔ یہی زندگی ہے۔

ہا ہا۔ ہا ہا۔ ہا ہا۔"

"کون ہنستا ہے؟ کون ہنستا ہے؟ میرے دکھ پر کون ہنستا ہے؟"

اوپر سے آواز آئی۔

"سنو۔ سنو۔"

خدائی قسم یہ بھوت ہی ہم سے بہتر ہیں" سولاہیٹ والا اپنی ہی دھن میں چیخ رہا تھا "ان کے پاؤں میں حرکت ہے۔ وہ چل پھر سکتے ہیں۔ اور ہم؟ اس رنگین فرش پر یوں کھڑے ہیں۔ جیسے یہ ستون۔ ہم کیوں چل پھر نہیں سکتے؟ کیوں؟ خدائی قسم میں چلنا چاہتا ہوں۔ میں اپنے بنانے والے کو ڈھونڈ نکالوں گا۔ میں اس سے پوچھوں گا کہ یہ اندھیرا کیوں ہے؟ یہ دیواریں کہاں جا کر ختم ہوتی ہیں؟ اور یہ کمبخت ملعون ٹوپی . . . . ."

"خبردار حرکت نہ کرنا۔ حرکت گناہ ہے" رومی ٹوپی والے نے کہا۔

"شانتی . . . . . شانتی . . . . ." کالی ٹوپی والا گنگنایا "حرکت دھوکا ہے۔ آنکھ کا دھوکا۔ حرکت کے لوبھ میں نہ پڑو۔ تم بھوت بن جاؤ گے

تمہاری آتما کو شانتی نہیں ملے گی۔ شانتی ..... شانتی ...... شانتی .....
ہے بھگوان! سب تیرے ہی روپ ہیں۔ تو ہی حرکت ہے، تو ہی شانتی ہے
مگر ہمیں حرکت راس نہیں۔"

"کون کہتا ہے حرکت گناہ ہے گناہ کیا ہے؟ جو بات بس میں نہ ہو
وہ گناہ ہے، گناہ!"

گناہ اور ثواب سب دل کی تسلیاں ہیں۔ جینے کا سامان ——
خدائی قسم میں حرکت کروں گا میں اپنے پاؤں پر چلوں گا میں اس سے ملوں
گا۔ پوچھوں گا۔ یہ کیا کھیل کھیل رہے ہو؟ یہ کھلونے کیا ہیں؟

کیوں ہیں اور یہ کمبخت ٹوپی جو میرے سر پر چڑھی بیٹھی ہے۔ اس
کے کیا معنی ہیں؟"

"مجھے بچاؤ۔ مجھے بچاؤ" اوپر سے کسی کے کراہنے کی آواز۔

"ہاں ہاں، میں بچاؤں گا، میں آتا ہوں۔ چاہے حرکت کرنے میں میرا
سارا جسم ہی کیوں نہ صرف ہو جائے۔"

"کیا کہا؟ چلنا چاہتا ہے؟"

"میرے اللہ!"

"ارے ارے ارے!"

"ہے بھگوان!"

سولا ہیٹ والے کا منہ سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھیں قوت کے صرف
سے پھول گئی تھیں۔ وہ اپنی تمام قوت سے حرکت کی کوشش کر رہا تھا۔

(سب کی نگاہیں سولا ہیٹ والے پر جمی ہوئی تھیں)

"خدائی قسم اس کی ٹانگ ہل رہی ہے۔"

"وہ دیکھو۔ وہ دیکھو!"

"کہاں؟"

"وہ پھر ہلی"

"میرے اللہ اس کی ٹانگ اُٹھ رہی ہے"۔

"کیا کہا۔؟"

"وہ چل رہا ہے!"

"ہا ہا ہا ہا ہا ہا" سولا ہیٹ والے نے ایک قدم چل کر کہا "میں چل
—— میں چل سکتا ہوں۔ میں چل سکتا ہوں!
خدائی قسم میں چل سکتا ہوں۔ میں مالک سے ملوں گا میں اُس سے
پوچھوں گا یہ اندھیرا کیوں ہے؟ میں اُسے ڈھونڈ نکالوں گا"

"ہاں ہاں ہم بھی تمہارے ساتھ چلیں گے۔

"میں تمہارے ساتھ ہوں"۔

"ہاں۔ ہم پوچھیں گے۔ یہ اندھیرا کیوں ہے؟

"اگر مجھے بھی چلنا سکھا دو تو —— شکاری نے کہا۔

"ٹھیک ہے، ہمیں بھی چلنا سکھا دو"۔

"میں سکھاؤں گا۔ تم سب کو چلنا سکھاؤں گا بالکل آسان ہے۔
خدائی قسم بالکل آسان اپنے تمام ارادے سے چلنے کا خیال دل میں جما
لو۔ اپنی تمام قوت کو حکم دو کہ وہ تمہارے پاؤں میں آ جائے۔ اپنے دل میں یہ
ایمان پیدا کرو کہ تم چل سکتے ہو۔ ہاں کوشش کرو کوشش۔ چلو ....
چلو ....."

تمام پتلے اس کے کہے پر عمل کرنے لگے۔

"واللہ کیا خوب!" رومی ٹوپی والے نے پاؤں اٹھا کر کہا۔

"گڈ لارڈ!"

"ارے واہ!"

"بھئی خوب!"

(سب کے پاؤں آہستہ آہستہ ہلنے لگے۔ انہوں نے ایک ایک
قدم اٹھایا)

"ہاں ہاں ہم چل سکتے ہیں"۔

"خوب خوب"

(کلاک نے ساڑھے تین بجائے)

"اوہ! ساڑھے دس" سولا ہیٹ والے نے کہا۔ "ٹھہرو!" (وہ سب
اپنی اپنی جگہ پر ٹھہر گئے) اب رات ہو چکی ہے۔ آج نہیں۔ کل ہم سب
جائیں گے۔ کل ہم اپنے مالک اور بنانے والے کو ڈھونڈھ نکالیں گے۔
اُس سے پوچھیں گے کہ یہ اندھیرا کیوں ہے؟ خدائی قسم کل ضرور جائیں گے"

"ہاں ہاں ہمیں بھی ساتھ لے چلئے گا"

"جی ہاں۔ ہم سب کو"۔

"ہاں ہاں۔ یہ اندھیرا کیوں ہے؟"

"اور۔ اور یہ بوجھل تھیلا۔ میں اسے اُٹھائے اُٹھائے تھک گیا ہوں"۔
گاف والے نے کہا۔

"اور یہ ٹوپی"۔

"اور یہ دائمی مسکراہٹ جو میرے ہونٹوں پر ثبت کی گئی ہے۔

میری باچھیں اکڑ گئی ہیں"۔ فیلٹ والے نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"خاموش" سولا ہیٹ والا بول اُٹھا" اب اپنی اپنی جگہہ کھڑے ہو جاؤ۔ رات ہونے کو ہے۔ کل۔ کل خدائی قسم" اُس نے اپنی جگہہ واپس جاتے ہوئے کہا" یہ اندھیرا۔ اور۔ اُف یہ کم بخت ٹوپی" اس نے اپنی گرتی ہوئی ٹوپی کو سنبھالنے کی کوشش کی ـــــ

تڑاخ۔ ایک دھماکے کی آواز آئی۔ سولا ہیٹ والا پتلا فرش پر گر کر چور چور ہو گیا۔

"کیا ہوا؟"

"اُف!"

"ارے!"

"بھگوان!"

(تمام چہرے خوف سے بھیانک ہو رہے تھے)

اگلی رات وہ سب یوں بیدار ہوئے۔ جیسے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ کر جاگے ہوں۔ نائٹ کیپ والے کو سولا ہیٹ والے کے حادثے کا علم نہیں تھا۔ وہ وہیں اپنی جگہہ کھڑا چیخ رہا تھا۔

"میں کہتا ہوں۔ تم سب چپ کیوں ہو۔ جواب دو۔ کیا تم نے فیصلہ نہیں کیا تھا کہ آج مالک کو ڈھونڈ نکالیں گے۔ اس سے پوچھیں گے کہ یہ اندھیرا کیوں ہے؟ بھول گئے کیا؟ جواب کیوں نہیں دیتے؟"

"چلنا نہیں کیا؟"

"اونہوں۔ توبہ ہے"۔

"دیکھا سولا ہیٹ والے نے چلنے کی کوشش کی تھی۔ بے چارہ اپنی جان کھو بیٹھا"

"دیوانہ تھا۔ دیوانہ"

"میں نے تو کہا تھا۔ حرکت گناہ ہے"

"ارے! یہ کون" فیلٹ والے نے حیرانی سے چیخ کر کہا۔

"کیا کہا؟"

"کون ہے؟"

"کدھر ہے؟"

"وہ دیکھو" فیلٹ والے نے انگلی سے اشارہ کیا۔ سب کی نگاہیں اُدھر اُٹھ گئیں۔

اُس جگہہ جہاں کل سولا ہیٹ والا کھڑا تھا۔ ایک نیا عورت کا پتلا تھا۔ جس کے پاس ایک بچہ کھڑا تھا۔ بچے کے سر پر تنکوں کی ٹوپی تھی اس نے عورت کی انگلی پکڑ رکھی تھی۔ عورت کے بدن پر زرد رنگ کی ریشمی ساڑھی لپٹی ہوئی تھی۔ آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ مگر وہ کالی کالی پتلیاں دوڑتی ہوئی کونوں میں آ کر دیکھ دیکھ کر مسکراتیں۔ چہرے پر حیا کا کچھ ایسا عالم تھا۔ جیسے وہ ایک ہی وقت میں اپنی نمائش بھی چاہتی ہے اور اپنے کو چھپانا بھی۔

"گڈ لارڈ" ڈفسکاری نے کہا۔

"کتنی حسین ہے!" گاف کیپ والے کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"یہ ہے کون؟"

"روشنی سے بڑھ چڑھ کر خوبصورت ہے"

"دیوی ہے دیوی!"

"کہاں ہے روشنی؟" اوپر سے آواز آئی" میں خود آؤں گا۔ میں آؤں گا۔ مگر۔ آہ یہ اندھیرا۔ یہ اندھیرا"۔

"سنتے نہیں ہو؟ نائٹ کیپ والے نے کہا۔" اس کی مدد کرو۔ جواب نہیں دیتے؟ اچھا نہ سہی میں خود آؤں گا۔ میں اپنے پاؤں چلتا آؤں گا"

"آخا! فیلٹ والا چلا کر بولا" میں چل سکتا ہوں۔ میں چل سکتا ہوں"

"خوب خوب"

"ٹھہرو۔ میں بھی آتا ہوں"

وہ سب چل کر عورت کے پتلے کے ارد گرد آ کھڑے ہوئے۔

"تم کون ہو؟"

"دیوی!"

"کتنی سندر ہے!"

"تمہارا نام کیا ہے؟"

عورت نے اپنی آنکھیں اور بھی جھکا لیں" میں ناری ہوں"

انہوں نے یوں محسوس کیا جیسے کسی منور وادی میں کوئی راہ گیر چلتے چلتے آساوری کی تان مار گیا ہو۔

"آہ۔ ناری"

"کتنی پیاری ہو"

"او۔ ڈارلنگ"

ویوی!

"اوہ میں بھی چل سکتا ہوں۔ ہاں ہاں۔ میں آتا ہوں۔ میں آرہا ہوں"۔ ناہٹ کیپ والے کی آواز آئی۔ اور وہ لڑکھڑاتا ہوا اُن کے روبرو آکھڑا ہوا ——— "چلو چلو۔ ہم سب جائیں گے۔ چلو۔ ہم اُس سے پوچھیں گے۔ یہ اندھیرا کیوں ہے؟ تم نے وعدہ کیا تھا۔ چلو"

"ہاں ہاں۔ تم جاؤ۔ میں اور ناری یہاں ٹھہریں گے"۔ فیلٹ والے نے ناری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"ٹھیک ہے۔ تم جاکر پوچھ آؤ"۔

"ہاں ہاں۔ آخر ہم سب کو جانے کی کیا ضرورت ہے۔ کیوں ناری؟"

"بالکل!"

"بھائی میں تو جینا چاہتا ہوں۔ تم جاؤ۔ مجھے جینے دو۔ کیوں ناری؟" گاف کیپ والا بولا۔

"ناری۔ ناری۔ ناری کون ہے؟" نائٹ کیپ والے نے پوچھا۔ پھر اُس کی نگاہ عورت کے پتلے پر جا پڑی۔ "ارے میرے اللہ! تم کون ہو؟" وہ بھاگ کر آگے بڑھا۔ "اوہ! میں سمجھا۔ اب میں سمجھا۔ تم زندگی کا بھید ہو"۔ وہ عورت کے سامنے جھک گیا۔

"ہاں ہاں زندگی کا اُجالا!"

"سبحان اللہ سبحان اللہ"۔ رومی ٹوپی والا اپنا پھندنا سنوارتے ہوئے کہنے لگا۔

"سب بھگوان ہی کے روپ ہیں۔ یہ بالک یہ ناری یہ جیون یہ اجالا"۔ کالی ٹوپی والے نے کہا۔

عورت نے سر اٹھایا اور ہنس پڑی۔ انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے دور کوئی نقرئی گھنٹیاں بجا رہا ہو۔

"کہاں ہے اجالا؟ کہاں ہے اُجالا؟۔ اُف یہاں کتنا اندھیرا ہے"۔ اوپر سے کسی کے کراہنے کی آواز آئی۔

"کہاں ہے اندھیرا؟ کہاں ہے اندھیرا؟" نائٹ کیپ والا بولا۔

"ہاں ہاں۔ اندھیرا کہاں ہے۔ یہ روشنی یہ بلوری ساز و سامان یہ سندر ناری۔ زندگی کتنی دلکش ہے"۔

"سب اُجالا ہی اُجالا ہے۔ بھگوان تو اُجالا ہی اُجالا ہے۔ تیرے روپ کا کوئی انت نہیں"! کالی ٹوپی والے نے ناری کی طرف کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"جانتے ہو! خدا نے کہا، اُجالا ہو جائے۔ دفعتاً سب اُجالا ہی اجالا تھا۔ مقدس کتاب میں یہی لکھا ہے"۔ فیلٹ والے نے اپنی نکٹائی کی گرہ کو سنوارتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں، اندھیرا کہاں ہے؟ اندھیرا دل میں ہو تو ہو۔ یہاں تو اُجالا ہی اُجالا ہے"۔

"اُف یہ اندھیرا۔ اُف یہ اندھیرا ———"

عورت نے مسکرا کر بچے کو چوم لیا اور وہ سب اُسی کی طرف دیکھ رہے تھے!

ممتاز مفتی

سنگِ آستاں

سکھا نغمہ محبت کا، مجھے محسوس کرنے دے۔
جوانی کو۔
ہے نغمہ جن میں خوابیدہ اُنہیں تاروں کی حرکت سے۔
میں لے آؤں گا ہستی کو مجسّم شکل کی صورت۔
اُنہیں تاروں کو خوابوں سے جگانے دے مجھے، اے رات کے ساقی!
دکھانے دے مجھے جلوہ ستاروں کے اُلجھنے کا،
اُسی منظر کو لے آؤں گا میں پھر سے نگاہوں میں
جو ہے باقی۔
جو آویزاں ہے اب تک وقت کی دیوی کے آنچل میں۔

پکڑ کر ہاتھ میں پنچھی کو اس دھرتی کے جنگل میں
اسی خلوت کے محل میں
ترے دل میں
جگا دوں گا میں اپنی گرم آہوں سے۔
اُسی نغمے کو جو سویا ہے تیرے جسم کے محبوب تاروں میں

مجھے معلوم ہیں باتیں،
وہ باتیں جو اچھوتی ہیں، پرانی ہیں،
مگر نادان ہیں جذبے
ارادہ ہے کہ لے کر آج اِن جذبوں کو میں تاریک غاروں میں۔
بنوں گا ہم سفر تیرا۔

چل آ، رنگیں کہانی کو
شروعِ عشق کی منزل سے لے بھاگیں،
اُسے اِس رات کے پھیلے اندھیرے میں
وہاں پر لے کے پہنچا دیں
جہاں ہے گوہرِ مقصود پوشیدہ نگاہوں سے
سہانی گرم آہوں میں!

میراجی

غزل

ہوں دیدہ ورِ فریبِ تعیّن میں آؤں کیا!
پردے پڑے ہوئے ہی نہیں ہیں، اُٹھاؤں کیا!

بر روئے کار آہ کی تاثیر لاؤں کیا!
دل کی لگی کو، دل کی لگی سے بجھاؤں کیا!

گو مضطرب ہوں، ضبط کی قیمت گھٹاؤں کیا!
دل رو رہا ہے، آنکھ سے آنسو بہاؤں کیا!

نوکِ زباں پہ آبلۂ شوق لاؤں کیا!
افسانۂ گناہِ محبت سناؤں کیا!

ہے تشنگیٔ ذوقِ نظر بے حد و تمام
تسکینِ رنگ و بوئے گلستاں سے پاؤں کیا!

ہنس ہنس کے ڈوبنا بھی ہے حُسنِ شناوری
کشتی کو موجِ آبِ رواں سے بچاؤں کیا!

اے سوز بخشِ قلب و جگر، اضطرابِ روح
تجھ سے ہی تیرے درد کا عالم چھپاؤں کیا!

ناکام و نامراد ہی رہنے میں لطف ہے
اے بے کسی دعا کے لئے ہاتھ اُٹھاؤں کیا!

اپنی تجلّیوں کو سمیٹے ہوئے ہیں وہ
نقش و نگارِ زیست کو میں جگمگاؤں کیا!

اے اختیارِ حسن! تری قوّتیں بخیر
بے چارگیٔ عشق کو تجھ سے چھپاؤں کیا!

ہے کارگاہِ زیست بہ ہر رنگ دلفریب
آویزشوں سے دامنِ ہستی بچاؤں کیا!

میرا قصور ہے کہ نہیں ظرفِ کیفِ عشق
بے اعتبار تیری نظر کو بناؤں کیا!

وحدت پرست ہوں، مرا مسجود ایک ہے
ہر آستانِ ناز پہ نظریں جھکاؤں کیا!

گذرے گا کیا نہ کوئی حُدی خواں فضا شناس
تھک کر رہِ امید میں اب بیٹھ جاؤں کیا!

کم ہو چلی ہے گرمیٔ روحِ تمام شوق
پھر سازِ دل پہ نغمۂ جاں سوز گاؤں کیا!!

میں جانتا ہوں خندۂ گُل کا مآلِ کار
اتنی سی دیر کے لئے پھر مسکراؤں کیا!

اعجاز وہ بہارِ دل و دیدہ جب نہیں
اُجڑی ہوئی خیال کی دنیا بساؤں کیا!

اعجاز صدیقی

چوکیدار

رات کو جب گاؤں کے سب چھوٹے بڑے چین کی میٹھی نیند سوتے تو رام لال چوکیدار کندھے پر اپنی پرانی لاٹھی رکھ کر جھونپڑی سے باہر نکل آتا اور گاؤں کی اندھیری گلیوں میں پھرا کرتا۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ چلا اُٹھتا "جاگ کے سونا!" اس کی آواز بڑی ڈراؤنی تھی۔ بچے تو ڈر کر ماں کی چھاتی سے چمٹ جایا کرتے تھے۔ گاؤں کے لوگ کہا کرتے تھے۔ ہر رات یہ کمبخت خواہ مخواہ چیختا ہے۔ نہ چور نہ چور کا سایہ مگر یہ نیند ضرور خراب کرتا ہے۔ لوگوں نے اُسے سمجھایا بھی کہ رات بھر پھرنے کا کوئی فائدہ نہیں مگر رام لال کو بغیر گاؤں کا بار بار چکر لگائے چین ہی نہ آتا تھا۔

گاؤں کے کنارے مٹی اور پھونس کی جھونپڑی تھی یہی رام لال چوکیدار کا گھر تھا۔ گھر میں آٹھ سال کی ایک یتیم پوتی تھی اور دوسرا کوئی نہیں۔ وہ بیس سال سے چوکیداری کرتا تھا۔ پانچ روپے ملتے تھے۔ یہی اس کی آمدنی تھی۔ اسی میں وہ خوش تھا۔ پوتی سے اس کو بہت محبت تھی۔ لیکن جب گشت کا وقت آتا تو اس کو جھونپڑی میں چھوڑ کر نکل جاتا۔ لڑکی اکیلی ڈرتی۔ مگر اُس نے اس کا کبھی خیال نہیں کیا۔ اُس کا جب بیٹا مرا تھا، بہو جب مری تھی، اور سب سے بڑی بات تو یہ کہ جب اُس کی جیون ساتھی سدا کے لئے اُس سے الگ ہوئی تب بھی وہ گاؤں میں گھومنا نہ بھولا۔ موسلا دھار پانی برستے میں وہ چھاتا لے کر نکلتا تھا۔ جب بھی لوگوں نے اسے سمجھایا کہ رات بھر پھرنے کی کیا ضرورت ہے، ایک دو بار پھر کر دیکھ لو۔ تو رام لال نے بڑی سادگی سے یہی ایک جواب دیا۔

"ہم کو مشاہرہ اسی کا ملتا ہے۔"

اس کا جواب کسی کے پاس کچھ نہ تھا۔ بیس سال سے آندھی، طوفان جاڑا گرمی اور برسات میں وہ گاؤں کا چکر لگایا کرتا تھا۔ بھیگتا، ٹھٹھرتا۔ مگر جب تک بیمار نہ ہو جاتا پہرہ دینے سے جی نہ چراتا۔

آس پاس کے چوروں کو رام لال کے نام سے نفرت تھی۔ سب کے سب اس کے دشمن تھے۔ دو تین مرتبہ دو چار نے مل کر اس پر حملہ بھی کیا۔ لیکن رام لال خود طاقتور تھا۔ کچھ دیر تک ان کا مقابلہ کرتا رہا۔ پھر لوگوں کو مدد کے لئے بلایا اور چور اس کو مار بھی نہ سکے۔ سب اس کے مرنے کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔ لیکن اس گاؤں کی طرف مُنہ کبھی نہ کرتے۔

گاؤں کے زمیندار رام نرائن بابو کے بڑے بیٹے رام چندر بابو ڈپٹی مجسٹریٹ ہوئے۔ رام لال کو بڑی خوشی ہوئی کہ اس کے زمیندار کے بیٹے ڈپٹی ہو گئے۔ اب اس کی حالت یہ تھی کہ وہ سر اُٹھا کر چلتا تھا۔ جب تھانے میں حاضری دینے جاتا تو دوسرے چوکیداروں سے خود کو بڑا سمجھتا۔ کیونکہ اس کے زمیندار کے بیٹے ڈپٹی تھے اور دوسروں کے نہیں، وہ فخریہ لوگوں سے کہا کرتا "ڈپٹی صاحب تو میری گود کے کھلائے ہوئے ہیں۔ اب میں دفعدار ضرور ہو جاؤں گا۔" دوسرے چوکیدار اس کی باتوں کو سنتے اور ایک سانس بھر کر رہ جاتے۔ سب کو یقین تھا کہ رام لال ضرور دفعدار ہو جائے گا۔

ڈپٹی صاحب درگا پوجا کی چھٹیوں میں گھر آئے۔ رام لال نے اپنی وردی نکالی اور پہن کر سیدھا ڈیوڑھی پر پہنچا۔ ڈپٹی صاحب گھر میں تھے۔ رام لال باہر بیٹھا رہا۔ اس کی خوشی کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ڈپٹی صاحب آئیں گے۔ میں اُن کو اس طرح سلام کروں گا۔ وہ مسکرا کر جواب دیں گے اور پوچھیں گے "تو کیسا ہے"؟ میں کہوں گا "سرکار کی کرپا ہے"۔ ڈپٹی صاحب ہنس دیں گے رام لال اس خیال ہی سے خوش ہو گیا۔ جیسے اس کو بہت بڑی دولت مل گئی بڑے کی مہربانی کے ساتھ ایک ننھی ہی غریب کے لئے بہت بڑی دولت ہے۔ رام لال انہی خیالوں میں بیٹھا رہا اور گھنٹوں گذر گئے۔ پٹواری صاحب نے کہا۔

"ارے وہ ابھی تھکے آئے ہیں۔ سو گئے ہوں گے۔"

رام لال بولا:

"جب وہ سوکر اٹھیں گے تب ہی میں بھی جاؤں گا۔ آ گیا ہوں تو بغیر حاضری دیئے کیسے جاؤں؟"

پٹواری جی اپنے کاموں میں لگ گئے اور رام لال اپنے خیال میں مست بیٹھا رہا۔ صبح کے وقت آیا تھا۔ شام ہونے کو آئی تو ڈپٹی صاحب گھر سے باہر آئے۔ رام لال نے جھک کر سلام کیا۔ ڈپٹی صاحب نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ ایک معمولی چوکیدار کے سلام کا جواب کیسے دیتے وہ سمجھے کہ شاید کچھ انعام مانگنے آیا ہے۔ رام لال کھڑا ہی رہا کہ شاید اب وہ کچھ بولیں گے۔ لیکن ڈپٹی صاحب نے اس کی طرف دیکھا تک نہیں اور اپنے چند رشتہ داروں کے ساتھ باتیں کرنے لگے۔ رام لال اس امید میں بیٹھا رہا کہ اب ان کی بات ختم ہوگی اور ڈپٹی صاحب میری طرف دیکھیں گے اور باتیں کریں گے۔ ڈپٹی صاحب دوسروں سے باتیں کر رہے تھے لیکن رام لال خوشی میں یہ سمجھ رہا تھا کہ ڈپٹی صاحب اُسی سے باتیں کر رہے ہیں۔

جب اُن کے رشتہ دار چلے گئے تو ڈپٹی صاحب اُٹھے اور باہر آئے۔ رام لال نے پھر جھک کر سلام کیا۔ اب ڈپٹی صاحب کھڑے ہو گئے اور رام لال اُن کے چہرے کو دیکھنے لگا کہ ہونٹ اب ہلے کہ اب ہلے۔

ڈپٹی صاحب نے بڑے سوکھے طور سے کہا:

"کیا مانگتا ہے؟"

رام لال کا دل بڑھ گیا اور خوش ہو کر بولا:

"حضور حاضری دینے آئے تھے۔"

ڈپٹی صاحب بولے:

"دیکھ لیا۔ تم زندہ ہے۔ جاؤ اب۔"

رام لال سر جھکائے واپس چلا آیا۔ اس کو ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے اس کے دل میں چھری بھونک دی۔ اس کو وہ وقت یاد آ گیا۔ جب رام چندر بابو اُس سے کہا کرتے تھے۔ "رام لال، طوطے کا بچہ لاؤ" اور کہتے تھے۔ "جب ہم ڈپٹی ہو جائیں گے تو تم کو اپنا چپڑاسی بنائیں گے۔" اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ اُس کے دل میں اس کے سوا اور کوئی آرزو نہ تھی کہ ڈپٹی صاحب اس سے مسکرا کر ایک جملہ کہہ دیں۔ لیکن وہ سمجھا کہ اس میں بھی میری ہی کوئی خطا ہے معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے شکایت کر دی ہے کہ رام لال گشت نہیں کرتا اسی وجہ سے ڈپٹی صاحب خفا ہو گئے۔

رات ہوئی سب لوگ سو گئے۔ رام لال اپنے گھر سے لاٹھی لے کر نکلا اور گشت لگانے چلا گیا۔ اس کی اکلوتی پوتی کی طبیعت خراب تھی۔ رام لال دن بھر غائب رہا تھا اور وہ بھوک سے روتی رہی تھی۔ مگر رام لال کو اس کی بیماری کا خیال نہ ہوا۔ گھر سے نکل پڑا۔ گاؤں میں پہنچنے پر ایک بار کڑک کر اُس نے زور سے آواز دی "جاگ کے سونا" اور آگے بڑھ گیا۔ تھوڑی دور جا کر پھر آواز دی اور آگے بڑھ گیا۔ اسی طرح آواز دیتا گاؤں کا گشت لگا کر گھر واپس آیا۔

ایک گھنٹہ بعد پھر نکل کھڑا ہوا۔ اور سارے گاؤں کا چکر کاٹ کر واپس آیا اور اسی طرح رات بھر چکر لگاتا رہا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اب ڈپٹی صاحب ضرور خوش ہو جائیں گے اگر کسی نے شکایت کر دی ہوگی تو اُن کا غصہ ختم ہو جائے گا۔ اسی طرح کے دل کو خوش کرنے والے خیالوں میں مگن ہو کر سو رہا۔

صبح ہوئی، اُٹھا، منہ ہاتھ دھو کر بیٹھا ہی تھا کہ زمیندار کا پیادہ آیا اور بولا:

"تمہیں ڈپٹی صاحب بلاتے ہیں۔"

رام لال خوش ہو کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کو بڑی خوشی ہوئی کہ آخر ڈپٹی صاحب نے بلایا۔ رات کو پہرہ دیا ہے اس سے وہ خوش ہو گئے ضرور کسی نے شکایت کی تھی۔ اس لئے ناراض تھے۔ رام لال جھونپڑی کے اندر گیا اور اپنی پھٹی ہوئی پگڑی سر پر لپیٹ لی۔ ہاتھ میں لاٹھی لے کر پیادے کے ساتھ چل پڑا۔

زمیندار کے بنگلے پر آیا تو ڈپٹی صاحب برآمدے کے سامنے ہی کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ رام لال نے باری باری سب کو سلام کیا۔ ڈپٹی صاحب نے گرج کر کہا:

"تم بوڑھا ہو گیا، مگر بالکل گدھا ہے، رات بھر کاہے کو چلاتا پھرتا ہے؟ کوئی ڈاکہ والا تھوڑا ہی بیٹھا ہے۔"

رام لال بولا:

"سرکار ہم تو روز پہرہ دیتے ہیں۔"

ڈپٹی صاحب نے ڈانٹ کر کہا:

"ہاں پہرہ دیتا ہے۔ پاگل کہیں کا۔ رات کو سونے نہیں دیتا۔ خبردار جو آج سے آواز سنی۔ گھر سویا کیوں نہیں رہتا؟"

رام لال سر جھکائے گھر چلا گیا۔ اُس کا دل بہت کڑھا ہوا تھا

گر پھر بھی اپنے کاموں میں لگا رہا۔ غریب کو کام سے کب چھٹی ہوتی ہے اس رات سے رام لال نے گاؤں میں گھومنا بند کر دیا کسی نے اُس کی آواز نہ سُنی۔

ہونے والی بات اور دو چار دن کے اندر ہی ڈپٹی صاحب کے گھر میں چوری ہوگئی۔ صبح کو رام لال اُٹھا تو اس کو معلوم ہوا۔ جانے ہی کی فکر میں تھا کہ زمیندار کا پیادہ آیا اور بولا:-

"ڈپٹی صاحب بلاتے ہیں"

رام لال اس کے ساتھ چلا گیا۔ ڈر رہا تھا اور غریب ڈرتا کیسے نہیں جب پہرہ دیتا تھا تو بات سننی پڑتی تھی اور اب ڈپٹی صاحب کو تھوڑا ہی یاد ہوگا کہ انھی نے پہرہ دینے کو منع کیا تھا۔ اسی خیال میں الجھا ہوا رام لال بنگلے پر پہنچا، ڈپٹی صاحب کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے اور اُن کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ دیکھتے ہی غریب پر جھپٹ پڑے اور جتنی گالیاں دے سکتے تھے دیں۔ دو چار تھپّڑ بھی جو بوڑھے رام لال کی قسمت میں لکھے تھے مل گئے۔

تھانیدار آیا۔ چوری کی رپورٹ لکھائی گئی اور وہ چلا گیا۔ ڈپٹی صاحب رام لال کی جتنی شکائتیں کرسکتے تھے ختم کر دیں۔ نتیجہ اور تو کچھ نہ نکلا، البتہ رام لال کی نوکری جاتی رہی۔ اور اس کے بعد چوری روز کی بات ہوئی۔

یہ کہانی بہت پرانی ہے۔ اب نہ رام لال ہے نہ ڈپٹی صاحب مگر اس کہانی کو لوگ اب بھی دہرایا کرتے ہیں +

سہیل عظیم آبادی

شعر

اے امیرؔ اوّل تو وہ نا آشنا ملتا نہیں
مل گیا جس کو کہیں، اس کا پتا ملتا نہیں

امیر مینائی

اندھیری رات کے سناٹے میں

رات اندھیری ہے اور پُر اسرار
نبضِ فطرت کی سُست ہے رفتار
ساکت و بے صدا ہے سازِ نمود
ظلمتوں میں نہاں ہے رازِ نمود
تیرگی میں وہ جھنڈ پیڑوں کے
دُھندلے دھندلے خموش سائے سے
عالمِ ہُو فضا میں چار طرف
ایک چُپ سی ہوا میں چار طرف
بہ رہی ہے ندی، مگر خاموش
منتظر آب ہے سیاہی پوش
خامشی ہے کہ گائے جاتی ہے
اپنا بربط بجائے جاتی ہے
راہیں چپ چاپ آہیں بھرتی ہیں
دن کی کلفت کا شکوہ کرتی ہیں
اس خموشی میں ایک ٹیلے پر
دیکھتا ہوں میں یہ عجب منظر
آہ ایسی خموش خلوت میں
سونی راتوں کی گہری ظلمت میں،
دل میں بے چین یاد کس کی ہے
جو مجھے گھر سے کھینچ لاتی ہے
کون ہے وہ ندیمِ تنہائی
رُوح رہتی ہے منتظر جس کی؟

تاجور سامری



سیرولین ڈروچے لاؤ
سیرولین ڈروچے
کھانسی اور پھیپھڑے کیلئے دنیا کی بہترین دوا ہے

تغزل

ہر چیز اپنی اپنی جگہ پر ہے کامیاب
ذرّے بھی بے مثال، ستارے بھی لاجواب

اس طرح اُٹھ رہا ہے ترا گوشۂ نقاب
جلوے بھی کامیاب نگاہیں بھی کامیاب

ماتھا، نشاطِ حُسن سے کھلتا ہُوا کنول
عارض فروغِ مے سے مہکتے ہوئے گلاب

میں نے پڑھا جو شعر تو وہ مسکرا دیئے
اتنی ذرا سی بات میں جاتا رہا عتاب

قصداً تجلیوں کو دیا حُسن نے فروغ
دانستہ چشمِ شوق پہ ڈالے گئے حجاب

یہ بے تکلفی، یہ نوازش، یہ ربط ضبط
گستاخ کر نہ دیں، یہ کرم ہائے بے حساب

ذوقِ نمود ہی سے عبارت ہے زندگی
موجوں پہ تیرتے ہیں اُبھرتے ہوئے حباب

میری نگاہِ شوق کی سرمستیاں نہ پوچھ!
ان کو بھی آج خوب پلا دی گئی شراب

اب زندگی کا لطف بہ عنوانِ درد ہے
ماہرؔ بھی ہے حریمِ محبت میں باریاب

ماہر القادری

کھوئے ہوئے لمحے

برسات کی رُت، وہ اُمڈا ہوا بادل
وہ رات اندھیری، وہ برستا ہوا کاجل
وہ آپ کا ڈرنا، وہ مری چھیڑِ مسلسل
وہ حُسن کے اُڑتے ہوئے خاموش شرارے
اے کاش پلٹ آئیں وہ کھوئے ہوئے لمحے

ہر سمت وہ "رومان" کے بہتے ہوئے دھارے
اے کاش پلٹ آئیں وہ کھوئے ہوئے لمحے
پھر ہو نئے سرے سے وہی آغازِ محبت
پھر تارِ رگِ جاں سے چھڑے سازِ محبت
پھر رازِ محبت نہ رہے رازِ محبت

وہ آپ کا پہلو، وہ چمکتی ہوئی راتیں
وہ زلف کی خوشبو، وہ مہکتی ہوئی راتیں
وہ حسن کی مستی، وہ بہکتی ہوئی راتیں
ہم آپ چلیں پھر وہیں جمنا کے کنارے
پھر کاش پلٹ آئیں وہ کھوئے ہوئے لمحے

وہ چرخ پہ ہنستے ہوئے مخمور ستارے
اے کاش پلٹ آئیں وہ کھوئے ہوئے لمحے
پھر بہکی ہوئی ہوش کی بستی نظر آئے
چھائی ہوئی ہر چیز پہ مستی نظر آئے
پھر برقِ سرِ طور برستی نظر آئے

وہ برقِ تبسم کی گراتے ہوئے آنا
ساقی کی طرح ہوش اُڑاتے ہوئے آنا
شرماتے ہوئے جسم چُراتے ہوئے آنا
پھر آپ ہوں بیٹھے ہوئے شاعر کے دوارے
پھر کاش پلٹ آئیں وہ کھوئے ہوئے لمحے

علی احمد

دروازہ کھلنے پر

بعض اوقات بغیر جانے بوجھے ہم مختلف لوگوں کی زندگی کے ایسے ایسے واقعات اور تصویریں دیکھ لیتے ہیں کہ ان کی یاد ہمارے دل سے کبھی نہیں جاتی۔ کبھی کسی شاہراہ پر کھڑے کبھی کسی بازار میں گھومتے گھامتے کبھی ریل کے ڈبّہ میں اور کبھی سینما میں ہمیں دوسروں کی زندگی کے ایسے حالات اور واقعات معلوم ہوجاتے ہیں کہ اگر ہم خود ان کا پتہ لگانے کی کتنی بھی کوشش کرتے، ہمیں کبھی کامیابی نہ ہوتی۔ ان میں سے بعض واقعات نہایت دردناک ہوتے ہیں بعض افسوسناک اور رنجیدہ اور بعض ایسے کہ بے اختیار ہنسی آجاتی ہے۔ کئی واقعات ایسے ہوتے ہیں جن کی ابتدا ہمارے سامنے ہوتی ہے لیکن ان کا خاتمہ کہیں اور جاکر ہوتا ہے، ہماری نظروں سے دور۔ اور ہمیں اس کی حسرت ہی رہ جاتی ہے کہ کاش ان کا انجام بھی ہمیں معلوم ہوجاتا۔ بعض واقعات ایسے ہوتے ہیں جن کا ہم صرف آخری حصّہ دیکھتے ہیں اور ہمیں خواہش ہوتی ہے کہ اگر ان کے ابتدائی حصّے بھی معلوم ہوجاتے تو کیا اچھا ہوتا۔ اگرچہ یہ واقعات اور حالات ایک کہانی کی طرح مکمل نہیں ہوتے لیکن ان میں کچھ ایسا لطف ہوتا ہے کہ دوسروں کے سامنے چٹخارے لے کر بیان کئے جاتے ہیں۔

مثلاً اسی ایک واقعہ کو لیجئے۔ ایک رات میں دہلی سے کانپور جارہا تھا۔ سکینڈ کلاس کے ڈبّہ میں میرے علاوہ تین مسافر اور تھے۔ ان میں سے ایک بارعب اور خوبصورت آدمی تھا۔ جس کی عمر بیالیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔ اُس کے کپڑے نہایت عمدہ اور تازہ ترین فیشن کے مطابق تھے۔ داڑھی مونچھیں صاف، ٹیڑھی مانگ، آنکھ پر عینک، کلائی پر گھڑی، الغرض تہذیب جدید کا مکمل نمونہ تھا۔ باقی دو مسافر میاں بیوی تھے۔ میاں عمر میں بیوی سے کافی بڑا تھا، معلوم ایسا ہوتا تھا کہ ان دونوں میں کسی بات پر جھگڑا ہے۔ اس لئے کہ عورت اُداس اور غمگین تھی اور مرد غصّہ میں تھا چند منٹ تک ڈبّہ میں بالکل خاموشی رہی اور اس کے بعد دفعتاً اُس مرد نے اُس بارعب اور خوبصورت شخص سے باتیں شروع کردیں۔ غالباً وہ ایک دوسرے سے واقف تھے۔ اُس کی بیوی نے ان دونوں کی باتوں میں کسی قسم کی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا اور نہ اپنی ناراضگی اور خفگی چھپانے کی کوئی کوشش کی بلکہ وہ باہر اندھیرے میں دیکھتی رہی۔ یہاں تک کہ گاڑی ایک اسٹیشن پر رُکی اور وہ دونوں اُتر گئے۔ ہم دونوں اس جوڑے کو دیکھتے رہے۔ اور جب وہ نظروں سے غائب ہوگیا تو میں اُٹھ کر اپنے ہم سفر کے سامنے جا بیٹھا۔ اور نہ معلوم کیوں میں نے کہا" دونوں ناراض معلوم ہوتے ہیں مجھے چاہئے تھا کہ ان کو سمجھاتا،،

"ٹھیک ہے،، اُس نے آہ بھر کر کہا" مجھے بھی ایسا ہی کرنا چاہئے تھا مگر بعض حالات میں یہ ناممکن ہوتا ہے"۔

"یعنی آپ کا خیال ہے کہ وہ اپنے نیک و بد کو خود اچھی طرح سمجھتے ہیں"

"نہیں" اس نے جواب دیا" بات یہ ہے کہ شادی شدہ جوڑے کو کو مشورہ دینا یا نصیحت کرنا بے سود ہی ہے۔ بالخصوص اس وقت جب دونوں کے دماغ خراب ہوں۔ اگرچہ بعض اوقات صحیح دماغ والے بھی اچھے ارادے کے باوجود سخت غلطیاں کرجاتے ہیں۔ یہ آدمی اپنی بیوی کی کڑی نگرانی کرتا ہے۔ اسے تنہا کہیں نہیں جانے دیتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ اگر میں نے اُسے تنہا چھوڑ دیا تو نہ معلوم وہ کیا حرکت کر بیٹھے۔ یعنی کوئی نامعقول حرکت۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اُس سے سخت نفرت کرتی ہے۔ اور آخر میں اس کا انجام یہ ہوگا کہ جس حرکت سے وہ اس کو روکنے کی کوشش کرتا ہے وہی حرکت وہ یقیناً کر بیٹھے گی۔ میرے ذہن میں یہ بات آ ہی نہیں سکتی کہ عورت کو غلام کیسے رکھا جاسکتا ہے۔ خصوصاً آج کل کے زمانہ میں۔ اپنی بیوی کو پوری آزادی دے دیجئے، کچھ بھی نہیں ہوگا"

"آزادی!" میں نے کہا "بعض حالات میں یہ آزادی خطرناک ہوتی ہے۔ اور کوئی یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ کس وقت صورت حال کیسی ہے؟"

"نہیں اس میں کوئی مشکل نہیں" اس نے جواب دیا" بچپن ہی سے لڑکیوں کی سیرت کا پتہ لگ جاتا ہے۔ اور اگر ان کی عادتیں ٹھیک نہ ہوں تو ان پر شدید اور کڑی نگرانی کرنے سے ان کو سیدھے راستے پر نہیں لگایا جاسکتا۔

میں یہ نہیں کہتا کہ ایک بیوقوف اور نوجوان لڑکی کو شتر بے مہار کی طرح چھوڑ دینا چاہئے۔ نہیں ہرگز نہیں۔ لیکن اس کو فقط ایک ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے آقا اور مالک کی نہیں۔ اتحاد اور اعتماد دونوں طرف ضروری ہیں ورنہ عجیب حالت پیدا ہو جاتی ہے۔ جب میری شادی ہوئی تو میری اور میری بیوی کی عمر میں کوئی دس سال کا فرق تھا یعنی وہ مجھ سے دس سال چھوٹی تھی۔ خیر یہ کوئی بات نہیں لیکن اتفاق ایسا ہؤا کہ ہماری طبیعتوں میں بڑا اختلاف نکلا۔ میں خاموش زندگی کو پسند کرتا ہوں تاکہ شاعری اور فلسفہ میں اپنا وقت صرف کر سکوں۔ تفریحات میں وقت گذارنا بھی مجھے ناپسند ہے۔ اس کے برعکس میری بیوی پڑھنے لکھنے سے کوسوں دور بھاگتی ہے۔ اسے تفریحات اور دعوتیں بہت پسند ہیں۔ طبیعتوں کا یہ اختلاف فوراً ہی ظاہر ہو گیا۔ میں نے اس مسئلہ پر غور کر کے فیصلہ کیا کہ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ میں اپنی بیوی کو اس بات پر مجبور کروں کہ وہ بھی شاعری اور فلسفہ میں دلچسپی لے اور وہ مجھے تفریحات اور دعوتوں میں گھسیٹنے کی کوشش نہ کرے۔ ہم ایک دوسرے کو دل و جان سے چاہتے تھے لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں تاکہ ہم مجبوراً اپنی طبیعتوں کو بدل کر خواہ مخواہ اپنی زندگی کو جہنم بنالیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شادی میں طبیعتوں کا اتفاق ضروری ہے۔ اور ایک نعمت ہے لیکن اگر ایسا نہ ہو تو میں نہیں سمجھتا کہ لوگ پریشان کیوں ہوتے ہیں۔ حالاں کہ ان کو مسرت صرف اسی صورت سے حاصل ہو سکتی ہے کہ دونوں کا جو جی چاہے کریں تاکہ جب وہ آپس میں ملیں تو خوش و خرم ہو کر اور خوش و خرم ہی رہ سکیں الغرض میں نے اجازت دے دی کہ میری بیوی جو چاہے کرے اور ادھر میں جس طرح چاہوں وقت گذاروں یقیناً بعض اوقات میرا دل چاہتا تھا کہ میری بیوی میرے پاس گھر پر رہے اور میری شاعری کی تعریف کرے اور مجھے داد دے اور بعض اوقات میری بیوی کا دل چاہتا ہوگا کہ میں اس کے ساتھ کسی دعوت رقص یا تفریح میں جاؤں لیکن ہم نے کبھی ان خواہشات کا اظہار نہیں کیا۔

ایک دن اس کی کسی سہیلی کے یہاں رقص تھا۔ اس رقص میں یہ خصوصیت تھی کہ ہر ایک کو نقاب اوڑھ کر آنا تھا اور نقاب بھی ایسا کہ کوئی پہچان نہ سکے کہ یہ کون ہے۔ میری بیوی بھی اس رقص میں مدعو تھی۔ اور وہاں جانے کے لئے حد سے زیادہ بے تاب تھی۔ بے تابی اس لئے تھی کہ اس کے چند عزیز اور دوست بھی اس رقص میں شامل ہونے والے تھے۔ وہ چاہتی تھی کہ میں بھی چلوں اور اُس نے اشارہ بھی کیا لیکن میں نے یوں ظاہر کیا گویا اس اشارے کو میں سمجھا ہی نہیں کیوں کہ مجھے معلوم تھا کہ رقص میں شامل ہو کر خواہ مخواہ کی کوفت ہوگی۔

بہر حال میری بیوی اس رقص میں گئی۔ اُس نے آسمانی رنگ کا گون پہنا تھا، جس کے چاروں طرف سنہری حاشیہ تھا۔ نقاب خاکی رنگ کا تھا اور ہاتھ میں ایک پنکھا تھا۔ جس میں سبز جھالر لگی تھی۔ جب وہ جانے لگی تو اُس نے وعدہ کیا کہ وہ جلد ہی آجائیگی اور یہ کہ میں اس کا انتظار ڈرائنگ روم میں کروں۔

جب وہ چلی گئی تو نہ جانے کیوں میرا دل بیٹھ گیا۔ میں نے سگرٹ جلایا، کتاب کھولی اور پڑھنے بیٹھ گیا۔ لیکن آج پہلی دفعہ ایسا ہوا کہ پڑھنے میں میرا بالکل جی نہ لگا۔ میرا دل نہ معلوم کہاں کہاں گھومنے لگا۔ میں نے کتاب ہاتھ سے رکھدی اور سوچنے لگا۔

میں سوچنے لگا کہ میری بیوی اس وقت رقص میں کیا کر رہی ہوگی اور کیا اُس کے عزیز اور دوست اسے مل گئے ہوں گے۔ کہیں ایسا تو نہیں ہوا کہ وہ وہاں نہ آئے ہوں۔ اگر وہ وہاں نہیں آئے تو یہ ٹھیک نہیں، اس لئے کہ اس قسم کے رقص میں ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ نقاب کے باوجود میری بیوی کا حُسن اور جوانی نہیں چھپ سکتی تھی، ممکن ہے اسے ایسے لوگ تنگ کریں جن کا پیشہ ہی یہی ہے۔ ممکن ہے اس وقت وہ کسی نامعقول شخص کے ساتھ رقص کر رہی ہو۔ کیا مجھے اُسے تنہا جانے دینا چاہئے تھا

میں نے سگرٹ پھینک دیا اور بغیر کسی خاص خیال کے اٹھ کھڑا ہؤا۔ دفعتاً مجھے خیال آیا کہ ـــــ میرے پاس بھی ایک رقص کا لباس ہے اور اس کے ساتھ نقاب بھی۔ میں نے سوچا ابھی میری بیوی کو گئے زیادہ عرصہ نہیں ہؤا ہے کیوں نہ میں یہ لباس پہن کر رقص میں جا پہنچوں۔ میں نے ملازم کو بلا کر اس سے ٹیکسی لانے کو کہا۔

جب میں پہنچا تو رقص زور شور سے جاری تھا۔ میری قسمت ملاحظہ فرمائیے کہ جس عورت کو میں نے سب سے پہلے دیکھا وہ میری بیوی ہی تھی آسمانی رنگ کا سبز حاشیے والا گون خاکی رنگ کا نقاب اور سبز جھالر والا پنکھا میں نے اسے فوراً پہچان لیا۔ میں ہجوم کو چیر کر اس کی طرف بڑھا۔ جب قریب پہنچا تو میں نے محسوس کیا وہ مجھے آسانی سے نہیں پہچان سکتی اس نے مجھے اس لباس میں کبھی نہیں دیکھا تھا اور اسے غالباً یہ معلوم بھی نہیں تھا کہ میرے پاس ایسا لباس ہے۔ لیکن اس پر بھی جب میں اس کے قریب جا پہنچا تو اس نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ کیا یہ ممکن تھا کہ وہ کسی اجنبی کو اس بات کی اجازت دیتی کہ وہ اس سے گفتگو کرے، نہ صرف یہ بلکہ اپنے

روپیے سے اس کی ہمت افزائی بھی کرے؟ یہ خوفناک شبہ کچھ اس طرح پیدا ہؤا کہ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اس کا تجربہ کیا جائے گا۔ بغیر کچھ اور سوچے میں نے ذرا آواز بدل کر کہا "میرا خیال ہے آپ میرے انتظار میں ہیں۔ کہئے کہ میں ہوں"

"ہاں میں ہوں۔ اور میں چاہتی ہوں کہ کوئی دلچسپ ناچ ہو" اس نے بھی آواز بدل کر جواب دیا۔ "اس لئے کہ تنہا کھڑا رہنا..... اس میں کوئی دلچسپی نہیں"

ایک لمحہ کے لئے رقص کی ساری رونق کو میں بھول گیا۔ نہ میں کچھ دیکھ سکتا تھا نہ سن سکتا تھا۔ لیکن میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا اور کہا "کیا میں آپ کے ساتھ رقص کرنے کی عزت حاصل کر سکتا ہوں؟"

"ضرور" اُس نے جواب دیا اور فوراً میری بغل میں ہاتھ ڈال کر رقص کرنے لگی۔ اس کا انداز اتنا بیباک تھا کہ مجھے سخت تعجب ہؤا۔ جب رقص کا ایک دور ختم ہؤا تو اُس نے کچھ پینے کی خواہش ظاہر کی اور خود ہی مجھے ریفریش منٹ روم میں لے گئی۔ پینے پلانے کے بعد اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ہم ٹہلنے لگے۔ معلوم ایسا ہوتا تھا کہ وہ مکان کے کونے کونے سے واقف ہے۔ یہ بات بھی میرے لئے باعثِ تعجب تھی کیوں کہ شاید وہ پہلے یہاں کبھی نہیں آئی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا "کیا آپ اس سے پہلے بھی یہاں آچکی ہیں؟"

"پہلے بھی یہاں آچکی ہوں؟" اس نے جواب دیا "ہاں آچکی ہوں اور جب دل چاہتا ہے آجاتی ہوں"۔

"کیا آپ اپنے شوہر کو بھی یہاں آنے کے متعلق بتاتی ہیں؟"

"شوہر؟ مگر آپ کو کیسے معلوم ہؤا کہ میری شادی ہو چکی ہے"

"مجھے یقین ہے کہ آپ جیسی حسین اور خوبصورت لڑکی بغیر شوہر کے نہیں رہ سکتی" میں نے جواب دیا۔

"خوب۔ لیکن شوہر اور محبوب میں فرق ہی کیا ہے۔ عورتوں کو شادی کی ضرورت ہی کیا ہے جب وہ محبت کر کے روزی کما سکتی ہیں؟"

اس نے یہ کہہ کر میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لئے اور مسکرا کر مجھے دیکھنے لگی۔ کیا یہ وہی عورت تھی جسے میں ہر روز دیکھتا تھا۔ نہیں ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ مگر ہو کیسے نہیں سکتا؟ وہ اسی قسم کی باتیں کر رہی تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اُسے ایسی گفتگو کرنے کا بہت تجربہ ہے۔ اس کی باتوں سے کسی قسم کی شرم و حیا کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ پھر اُس نے گھر پر مجھے بتایا تھا کہ وہ پہلی بار یہاں جا رہی تھی۔ توبہ۔ کیسا سفید جھوٹ تھا! میں نے اپنے آپ کو بہت برا بھلا کہا کہ میں نے اسے یہاں تنہا کیوں آنے دیا۔ مگر پھر سوچا کہ یہ بھی اچھا ہؤا۔ مجھے کیسے معلوم ہوتا کہ وہ اتنی گر چکی ہے۔ میرے احباب کو یہ بات یقیناً معلوم ہوگی اور وہ میری بے خبری اور حماقت پر ہنستے ہوں گے اور میرا مذاق اڑاتے ہوں گے۔ آج کل کے دوست ایسا ہی کرتے ہیں، یہی دوستی کا معیار ہے۔ بہرحال میرے لئے یہ صدمۂ عظیم تھا....

لیکن اس پر بھی یقین تھا کہ میری بیوی ایسی نہیں۔ وہ ان باتوں سے زیادہ اور کسی حرکت کی جرأت نہیں کر سکتی۔ کیا وہ کر سکتی ہے؟

اس وقت اس کا ہاتھ میرے بازو پر تھا۔ ایک لمحہ کے لئے میں کچھ ہچکچایا پھر میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبا دیا۔ مجھے انتہائی تکلیف ہوئی جب وہ مسکرائی اور میرا ہاتھ بھی بڑے ناز سے دبایا گیا۔

"آپ بیدرد بھی ہیں" اس نے کہا "میں تو یہ محسوس کر رہی تھی کہ آپ بالکل سرد مہر اور عشق و محبت سے ناآشنا ہیں۔ میں ابھی ابھی آپ کے دل میں زندگی کی روح پھونکوں گی۔" اور یہ کہہ کر وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ اُس کی اس حرکت اور ان الفاظ سے مجھے سخت رنج ہؤا۔ مجھ میں بولنے کی سکت تک باقی نہ رہی۔ میرا دل بالکل ٹوٹ گیا۔ میں چاہتا تھا کہ بیٹھ جاؤں اور ایک بچے کی طرح چلّاؤں اور روؤں۔ اس وقت مجھے غصہ نہیں تھا بلکہ افسوس تھا۔ جب بالکل توقع ہی اُٹھ جائے اس وقت آدمی کو غصہ نہیں ہوتا بلکہ اس کا دل پاش پاش ہو جاتا ہے۔ اور اگرچہ مجھے معلوم تھا کہ اُمید کی کوئی صورت نہیں مگر ایک جواری کی طرح مجھے آخری پانسہ پھینکنا چاہئے تھا۔ میں اُسے آخری موقع دینے کے لئے ذرا اور آگے بڑھا۔

"آپ سے مل کر اتنی خوشی ہوئی ہے" میں نے کہا "کہ میں آپ سے جدا نہیں ہونا چاہتا۔ مگر یہاں تو بہت سے لوگ ہیں، آیئے یہاں سے چلیں۔ کیا آپ میرے غریب خانہ تک چل سکتی ہیں؟"

"غریب خانہ تک" اسنے پھر مجھ سے لپٹ کر کہا "ضرور۔ انکار کرنا میری فطرت کے خلاف ہے"

میں نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور ایک نوجوان عاشق کی طرح اسے باہر لے آیا۔ اُس نے الگ ہونے کی ذرا بھی کوشش نہ کی ہاں اتنا کہا کہ آپ بہت بے صبر ہیں۔ اور بے صبر واقعی میں تھا بھی۔ ہر لمحہ میرے لئے درد و کرب کا ایک گھنٹہ تھا اور میں چاہتا تھا کہ یہ تماشہ کسی طرح جلد سے جلد ختم ہو جائے۔ لیکن میں اسے اسی وقت وہاں نہیں ختم کر سکتا تھا۔ بھلا اتنے

بڑے مجمع میں یہ ذلت کون برداشت کر سکتا تھا؟ ٹیکسی میں بیٹھ کر اُس نے اپنا سر میرے شانے پر رکھ دیا اور میں نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔

جب ہم مکان کے قریب پہنچے تو اُس نے مجھ سے پوچھا "آپ کہاں رہتے ہیں۔ ابھی مکان کتنی دور ہے؟"

بس ہم پہنچ گئے ہیں" میں نے جواب دیا اور ٹیکسی ٹھہر گئی۔ میں نے اس کے بازوؤں میں ہاتھ ڈالا اور ہم نے سیڑھیاں چڑھنا شروع کر دیں۔ ڈرائنگ روم میں تاریکی تھی لیکن میں نے فوراً بجلی کا بٹن دبایا اور روشنی ہوگئی۔ پھر میں اس کی طرف مڑا۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ لیکن میں نے کوئی پروا نہیں کی اور سختی سے کہا "اچھا اب ہم اپنے نقاب الگ کر لیں"

میں نے اپنا جملہ ابھی ختم نہیں کیا تھا کہ اس نے اپنا نقاب اتار کر دور پھینک دیا۔

میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ میرا سر چکرانے لگا اور میں کرسی پر گر گیا۔ اس لئے کہ جو عورت میرے سامنے تھی وہ بالکل اجنبی تھی۔ اور اسے میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس قسم کی عورتوں میں سے تھی جنہیں "بازاری" کہا جاتا ہے مگر یقین کیجئے کہ میں گھٹنے ٹیک کر اس کے پاؤں چومنے کو تیار تھا۔ میں نے اطمینان کی ایک سانس لی۔ میں اس کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ چند منٹ تک تو میں اسے دیکھتا رہا۔ اور احمقوں کی طرح ہنستا رہا۔ میرے اس رویّہ سے وہ اور مغرور ہوگئی اور سمجھی کہ میں اس کے حسن سے مسحور ہوگیا ہوں۔

جب میرے ہوش وحواس بجا ہوئے تو پہلا خیال جو مجھے آیا وہ یہ تھا کہ اب اس سے کس طرح پیچھا چھڑانا چاہئے۔ مگر بغیر اسے ذلیل کئے یہ کیسے ممکن تھا۔ میں کوئی بہانہ ڈھونڈ رہا تھا کہ پیشتر اس کے کہ میں کوئی بہانہ بناتا میرے مکان کے سامنے ایک موٹر آ کر رکی۔ میں نے سیڑھیوں پر قدموں کی آواز سنی اور کپڑوں کی سرسراہٹ۔ میری بیوی جیسا کہ اُسنے وعدہ کیا تھا جلد ہی آگئی تھی اور سیدھی ڈرائنگ روم میں آرہی تھی۔ دروازہ کے پاس پہنچ کر اُس نے ہنڈل گھمایا اور دروازہ کھل گیا اور . . . . . .

یہاں پہنچ کر میرا ہمسفر رک گیا۔ گاڑی ایک اسٹیشن پر کھڑی تھی لیکن اس وقت ہمیں یہ نہیں معلوم تھا۔

"اوہو! اُس نے کہا مجھے تو یہاں اُترنا ہے" یہ کہکر اس نے دروازہ کھولا اور جلدی سے چلتی گاڑی سے اُتر گیا۔

اس کے بعد میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا اور نہ غالباً اسے کبھی دیکھوں گا۔ البتّہ مجھے اب تک یہ جاننے کی حسرت ہے اور عمر بھر رہیگی کہ جب دروازہ کھلا تو کیا ہوا۔

سید نصیر احمد

شعر

رشکِ دشمن بہانہ تھا، سچ ہے
میں نے ہی تم سے بے وفائی کی

مومن

کنارِ راوی

اک کیف سرمدی سا عالم پہ چھا رہا تھا
دنیا کا ذرہ ذرہ مستی میں آ رہا تھا!
ہر چیز چاندنی سے زر پوش ہو رہی تھی
گردوں سے ماہِ تاباں سونا لٹا رہا تھا۔
دو موسموں میں باہم تھا اتصال گویا
اک وقت آ رہا تھا، اک وقت جا رہا تھا!
راوی کے پل کے نیچے تھیں نغمہ بار لہریں
لہروں کا راگ دل کو بے خود بنا رہا تھا۔
موجوں سے ہلکے ہلکے گرداب پڑ رہے تھے
منظر یہ میرے دل میں طوفاں اٹھا رہا تھا
اُس رات کی نہ پوچھو اس رات کا نظارہ
احساس بن کے میرے دل میں سما رہا تھا

پل بھر میں دل کی لیکن حالت ہوئی دگرگوں
اس منظرِ حسیں سے دل دور جا رہا تھا
اک انقلاب آیا ہر شے کی دل کشی میں
جو دلنشیں تھا منظر اب دل کو کھا رہا تھا
اب منظرِ حسیں پہ جمتی نہ تھیں نگاہیں
کوئی دلِ حزیں کو پھر یاد آ رہا تھا

جگن ناتھ آزاد

نمودِ سحر

یہ نسیمِ صبحدم یہ صبحِ صادق کا سماں
ذرے ذرے سے عیاں ہے ازنیرنگِ جہاں
وجد میں اشجار ہیں اور جھومتی ہیں ڈالیاں
غنچہ و گل سے عیاں قدرت کی ہیں گلکاریاں
گوہرِ شبنم سے ہے معمور گویا کوہسار
ہے بھرا دُرِ عدن سے دامنِ ابرِ بہار
ماہ رُویوں کا وہ جمگھٹ اک طرف تالاب پر
دیکھتے ہی اوس پڑ جائے رخِ مہتاب پر
عندلیبانِ چمن مستِ ترنم ہو گئیں
ساری کلیاں باغ کی محوِ تبسم ہو گئیں

مظفر حسین شمیم

دنیائے ادب

تازہ ترین سالناموں کے اہم مضامین

(اس دفعہ تازہ سالناموں کے بعض اہم مضامین کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان سالناموں کے مضامین کی خوبی اور کثرت کے پیش نظر یہ انتخاب محدود ہے)

عالمگیر۔ خاص نمبر ۱۹۴۰ء

روزمرّہ اور محاورہ

اس قابل قدر مضمون میں مولوی بشیر احمد صاحب برہان پوری نے اردو زبان میں روزمرّہ اور محاورات کے عنصر اور درجے پر ایک تفصیلی نگاہ ڈالی ہے۔ سب سے پہلے انہوں نے ہماری زبان میں سلاست کے آغاز اور روزمرّہ کی ترویج کے تاریخی پہلو کا جائزہ لیا ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ وہ پہلا شخص جس نے زبان میں سادگی، سلجھاؤ اور روزمرّہ کو داخل کیا اور اس روش کی حوصلہ افزائی کی، جان گلکرسٹ تھا جس نے ۱۷۹۵ء میں اردو کی ایک لغت اور گرامر مرتب کی، اور انگریزوں کی تعلیم کی غرض سے بہت سے ایسے خطوط نما رسالے دستوری لیٹرز) لکھے جن کی زبان نہایت صاف، سلیس اور بامحاورہ ہے۔ مولوی صاحب کا خیال ہے کہ چونکہ گلکرسٹ کی نگرانی میں جو کتابیں تیار کی گئیں، مثلاً چہار درویش، آرائش محفل، خرد افروز، منتخبات ہندی وغیرہ، ان کی زبان میں سلاست کا بے حد خیال رکھا گیا تھا، اس لئے جو تصنیفات عین اس دور کے بعد معرض وجود میں آئیں وہ ان پہلی کتابوں کے اندازِ بیان سے ضرور متاثر ہوئیں اور بہت ممکن ہے کہ سرسید، غالب، آزاد اور نذیر احمد کے طرزِ تحریر پر گلکرسٹ کی سلاست ہی اثر انداز ہوئی ہو۔

دوسری جانب اُن کی نگاہ میر انشا اور اُن کے "دریائے لطافت" سے گذرتی ہوئی اور ناسخ و مصحفی کے دور کا جائزہ لیتی ہوئی خان آرزو، مظہر جانِ جاناں بلکہ ولی دکنی تک پہنچی ہے۔ ان کا بیان ہے کہ مرزا جان طپش نے ۱۲۰۷ھ ہجری میں (یعنی تقریباً اسی زمانے میں جب گلکرسٹ اپنا فرہنگ مرتب کر رہے تھے) شمس البیان نامی کتاب تالیف کی جس میں صدہا محاورات مع امثال اشعار دیئے گئے ہیں اور استناد دورِ مصحفی تک کے شعراء کے کلام سے کیا گیا ہے۔ غدر دہلی کے بعد مرزا نیاز علی بیگ نکہت نے محاورات کا ایک جامع لغت تیار کیا جس میں ہر محاورے کے ثبوت میں متعدد اشعار پیش کئے گئے تھے۔ چوتھے دور کے شعراء مثلاً داغ، امیر، جلال، سحر، سحر، ظہیر، انور، راسخ، اشک اور جان صاحب نے اپنے اشعار میں محاورات کا استعمال بڑی فیاضی سے کیا۔ بلکہ داغ اور جان صاحب تو اپنے روزمرّہ کے باعث ایک خاص امتیاز کے مالک ٹھہرے۔

اس دور کی ایک قابل ذکر خصوصیت یہ تھی کہ اہلِ ذوق کو لغت کی ترتیب کا خیال پیدا ہوا اور انہوں نے اردو کے روزمرّہ اور محاورات کو نہایت محنت سے مدوّن کیا اس باب میں بھی اوّلیت کا سہرا دانشورانِ فرنگ کے سر ہے چنانچہ فیلن، شیکسپیئر اور پلاٹ کی شہرۂ آفاق ڈکشنریاں اسی عہد کی یادگار ہیں۔ مولوی صاحب کے اس مضمون سے یہ دلچسپ انکشاف ہوا کہ شمس العلما مولوی سیّد احمد دہلوی صاحب فرہنگ آصفیہ مدت دراز تک اپنے رفیق لالہ چرنجی لال کے ساتھ ڈاکٹر فیلن کے دفتر میں بطور منشی کام کرتے رہے۔ مذکورہ بالا ڈکشنریوں کے علاوہ اس دور میں جو لغت کی کتابیں مرتب ہوئیں ان میں سے سرمایۂ زبانِ اردو

مرتبہ جلال لکھنوی، جو الفاظ و محاورات کا ایک بے مثال ذخیرہ ہے۔ امیر اللغات نامکمل صورت میں، ارمغان آردو، فرہنگ آصفیہ، محاورات ہندوستانی از لالہ چرنجی لال اور مولوی سبحان بخش کی محاورات ہند نامی کتاب قابل ذکر ہیں۔ اس سلسلے کی آخری کڑی نور اللغات ہے جسے نور الحسن صاحب نیر نے چار جلدوں میں طبع کیا ہے (یہاں صاحب مضمون نے جامع اللغات کا تذکرہ نہیں کیا)

آگے چل کر مولوی صاحب نے روزمرہ اور محاورہ کا فرق ظاہر کیا ہے اور اس فرق کو مختلف اساتذہ اور اہل الرائے اصحاب کے بیانات اور تشریحوں سے واضح کیا ہے۔ مثلاً لچھو بیگ عاشق اپنی تالیف بہار ہند کے دیباچے میں اس فرق کو یوں ظاہر کرتے ہیں:-

"روزمرہ سے مراد وہ خالص گفتگو لی جاتی ہے جو ہر طرح کے تصنع یا تعلّی اور مبالغہ سے خالی ہو۔ جیسے مندرجہ ذیل شعر

ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا　　دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

محاورہ ان الفاظِ مقررہ کو کہتے ہیں جو، خواہ قواعد صرف و نحو کے مطابق ہو یا مخالف، واضع نے جس طرح چاہا ان کو وضع کر لیا ہو جیسے "وہ بات کا دھنی ہے۔ اس کے چھکے چھوٹ گئے۔ بھاری پتھر چوم کے چھوڑ دیا۔ وغیرہ"

مولانا شبلی نے شعر العجم جلد دوم میں حافظِ شیراز کے روزمرہ کی بہت تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ ہندوستان میں بہ لحاظ روزمرہ ان کی ٹکر کا اگر کوئی شاعر ہوا ہے تو وہ صرف داغ ہے۔ روزمرہ اور محاورے کے فرق کو مولانا یوں بیان کرتے ہیں:-

"عموماً جو الفاظ اور ترکیبیں ہمیشہ استعمال میں آتی ہیں اور جن سے روزمرہ پیدا ہوتا ہے، وہی ہوتی ہیں جو فصیح، سلیس، نرم اور رواں ہوں اگر ان میں کسی قدر کمی ہوتی ہے تو وہ روزمرہ کے استعمال سے خارج سمجھی جاتی ہے۔ کیونکہ رات دن سنتے سنتے وہ الفاظ کانوں کو مانوس ہو جاتے ہیں۔ یہی حال محاورہ کا ہے۔ محاورہ اس وقت بنتا ہے۔ جب ایک گروہ کسی جملے کو کسی خاص معنی میں استعمال کرتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ یہ جملہ خود فصیح، سلیس، اور رواں ہو ورنہ وہ محاورات کے زمرے سے خارج ہو جائے گا۔"

مولانا حالی کی رائے اس باب میں شاید بہت صاف اور سلجھی ہوئی ہے فرماتے ہیں:-

"محاورہ لغت میں مطلقاً بات چیت کرنے کو کہتے ہیں۔ خواہ وہ بات چیت اہل زبان کے روزمرہ کے موافق ہو یا مخالف (لیکن) ہر محاورہ کے لئے روزمرہ کا صحیح ہونا لازم ہے، ورنہ محاورہ غلط مانا جائے گا۔ محاورہ سے یہ مراد ہے کہ اس کا مصدر مجازی معنوں میں لیا جائے۔ مثلاً کپڑا کھونٹی سے اتارنا۔ کوٹھے سے پلنگ اتارنا ان جملوں میں اتارنا اپنے اصلی معنوں میں استعمال ہوا ہے (مجازی میں نہیں) اس لئے بلحاظ روزمرہ صحیح ہے۔ مگر اس کو محاورہ نہ کہیں گے۔ محاورہ اس وقت صحیح ہوتا ہے جب مصدر کے مجازی معنی لئے جائیں۔ مثلاً کوئی نقشہ اتارنا۔ کسی کا پہنچا اتارنا کسی کو دل سے اتارنا۔ ان جملوں میں اتارنا کے مجازی معنی لئے گئے ہیں۔ اس لئے ان کا شمار محاورات میں کیا جائے گا۔"

شعرا میں روزمرہ لکھنے کا آغاز میر تقی سے ہوا اور داغ میں کمال کو پہنچا۔ داغ کے بعد جلیل اور ریاض خیرآبادی کا روزمرہ بھی قابل داد ہے۔ روزمرہ لکھنا کوئی آسان بات نہیں اس لئے بعض شعرا نے اپنے روزمرہ پر فخر بھی کیا ہے مثلاً میر انیس ؎

روزمرہ شرفا کا ہو سلاست ہو وہی　　یعنی موقع ہو جہاں جس کا عبارت ہو وہی

اور بہادر شاہ ظفر تو معشوق کی گالیوں میں بھی روزمرہ کا مزا پاتے تھے۔ لکھتے ہیں:-

گالیوں کا ہم پہ چلتا خوب چھرا صاف ہے　　کیا زباں ہے آپ کی کیا روزمرہ صاف ہے

سید انشا نے بھی دریائے لطافت میں اس قبیل کے روزمرہ کی چند مثالیں دی ہیں:-

"ہراتی بیگم۔ موتی بیگم سے کہتی ہے۔ اری او مونڈی کٹی باندی! تو اتنا جھوٹ کیوں بولتی ہے! اللہ کرے تیری بوٹی بوٹی اوپر والیاں لے جائیں۔ اُڑ جائے تو خیلا خندی۔ ستیاناس گئی۔ میں نے کب تیرے میاں کی جورو کا گلہ کیا تھا۔ کہنے والی کو علی کی سنوار۔ تیرے دیدے گھٹنے کے آئے آئے! بیٹھے بٹھائے اُشغلا اٹھایا ہے۔ ادھوری آفت کی پرکالہ۔ ہوائی دیدہ"

یہاں مولوی صاحب نے روزمرہ لکھنے کی مشکلات کا ذکر کیا ہے اور اساتذہ کے کلام سے روزمرہ کے استعمال اور اس کی صحت اور نادرستی کے نمونے بھی دیئے ہیں۔ ان کی رائے ہے کہ روزمرہ کے استعمال میں اچھے اچھے ماہرین ٹھوکریں کھا جاتے ہیں۔ مثلاً علامہ شبلی

کہ باکمال ادیب تھے. روزمرہ میں ماہر نہیں تھے۔ اور بقول سید سلیمان ندوی انہوں نے الہلال کلکتہ میں روزمرہ و مکالمہ لکھنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ خاطر خواہ بار آور نہ ہوئی۔ اور تو اور خود مرزا داغ سے بھی بعض اوقات روزمرہ میں غلطی کر جاتے تھے مثنوی فریادِ داغ میں ایک شعر کا مصرعہ ہے

آنکھوں آنکھوں میں رات کٹتی ہے

یہاں "آنکھوں" کی تکرار جائز نہیں آنکھوں کا لفظ ایک ہی بار کہنا چاہیئے تھا۔ جیسے سودا ؎

سودا تیری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات　　اب آئی سحر ہونے کو ٹک تو کہیں مر بھی

محاورے میں جہاں اس لفظ کی تکرار ہوتی ہے وہ موقعہ معانی کے لحاظ سے بالکل جداگانہ حیثیت رکھتا ہے مثلاً "آنکھوں آنکھوں میں اشارے ہو گئے" یا بقولِ جلیل ؎

کام لیتا ہے نگاہوں سے ہمارا ساقی
آنکھوں آنکھوں میں کئی جام پلا دیتا ہے

روزمرہ کی مثال اس کے برعکس بھی دیکھیئے جہاں تکرار چاہیئے تھی اور نہیں کی گئی۔ ایک مشہور اُستاد کا شعر ہے ؎

میں ہوں نامراد ایسا کہ بلک کے یاس روتی
کہیں پا کے آسرا کچھ جو امیدوار ہوتا

یہاں لفظ بلک کی تکرار کی جاتی تو روزمرہ کے عین مطابق تھا۔ اب نہیں۔ آزاد نے آبِ حیات میں ذوق سے ایک پُر لطف واقعہ منسوب کیا ہے کہ ایک دن بیت الخلا سے نکلے اور حافظ ویران سے کہنے لگے کہ

"سنیئے ایک مصرعہ استاد مرحوم کے کسی شاگرد کا ۲۳ سال سے مجھے کھٹکتا تھا کہ اس میں کسی ایک لفظ کی کمی ہے۔ بارے خدا کا شکر ہے کہ آج اس کی اصلاح ہو گئی۔ حافظ ویران نے کہا وہ مصرعہ کیا تھا۔ ذوق مرحوم نے اس طرح پڑھا ـ کھاتی کمر ہے تین بل اک گدگدی کے ساتھ۔ ویران نے کہا پھر آپ نے کیا اصلاح دی؟ ذوق نے اصلاح شدہ گرہ کو مصرعِ اولیٰ سمیت اس طرح پڑھا۔

بل ہے کمر کہ زلفِ مسلسل کے پیچ میں،
کھاتی ہے تین تین بل اک گدگدی کے ساتھ"

صاحبِ مضمون نے ان کے علاوہ اساتذہ کے کلام میں سے روزمرہ کے صحیح اور غلط استعمال کی متعدد مثالیں دی ہیں۔ ان میں سے اکثر بہت دلچسپ اور لطیف ہیں اور اس بارے میں جن صاحب الرائے بزرگوں سے استناد کیا گیا ہے ان میں ناسخ اور مولانا محمد حسین آزاد جیسے مسلّم الثبوت اہلِ زبان شامل ہیں۔ اس کے بعد مولوی صاحب نے اردو نثر میں روزمرہ کے رواج کا ایک اجمالی سا خاکہ پیش کیا ہے اور سید انشا کے ٹھیٹھ ہندی قصّے داستان کیتکی اور دریائے لطافت کے اُن حصّوں سے چل کر جو مختلف پیشہ وروں کی گفتگو اور میر غفر غینی اور بی نورن کے مکالمے پر مشتمل ہیں، اردو کے دورِ جدید کے نثر نگاروں پر بھی ایک نگاہ ڈالی ہے۔ اس ذیل میں انہوں نے جو نمونے دیئے ہیں۔ وہ مرزا رسوا پنڈت رتن ناتھ سرشار۔ مولانا آزاد۔ ڈپٹی نذیر احمد۔ مولانا راشد الخیری کی نثر سے ماخوذ ہیں اور ظاہر ہے کہ مولوی صاحب اردو روزمرہ کے لئے ان سے بہتر ماخذ تلاش نہیں کر سکتے تھے۔ جی چاہتا ہے کہ ان میں سے چند سے آپ کے ذوق کی تواضع کروں مگر مضمون کی طوالت کا خوف دامن گیر ہے بہر حال ایک آدھ چیز دیکھئے۔

"خانم کی نوجیوں میں خورشید کا جواب نہ تھا۔ پری کی صورت۔ رنگ میدا شہاب ناک نقشہ گویا صانع قدرت نے اپنے ہاتھ سے بنایا تھا۔ آنکھوں میں موتی کوٹ کوٹ کے بھرے تھے۔ ہاتھ پاؤں سڈول نور کے سانچے میں ڈھلے ہوئے۔ بھرے بھرے بازو گول کلائیاں۔ جامہ زیبی وہ قیامت کی کہ جو پہنا معلوم ہو کہ اسی کے لئے مناسب تھا۔ اداؤں میں وہ دلفریبی۔ وہ بھولا پن جو ایک نظر دیکھے ہزار جان سے فریفتہ ہو جائے۔

(امراؤ جان ادا از مرزا رسوا)

"فہمیدہ اچھے! خدا کے لئے ذرا مجھ کو اس کی صورت دکھا دو! میں نے سنا ہے کہ وہ سر سے ننگا ہے۔ پاؤں میں جوتی نہیں۔ کنکر تلووں میں چبھتے ہوں گے۔ کون سے وہ موئے سپاہی تھے۔ میرے بچے کے پکڑنے والے! گھورا ہو تو آنکھیں دیدے سے پھوٹیں! ہاتھ لگایا ہو تو خدا کرے پور پور سے کٹ کٹ کر جھڑے۔ صدقے کیا تھا وہ سپاہی اور قربان کیا تھا وہ کوتوال۔ میرا بچہ اور چوری کرنے کے قابل!"　　(توبۃ النصوح ڈپٹی نذیر احمد)

مولوی صاحب نے ایک لطیف نکتہ یہ بیان کیا ہے کہ روزمرہ کا اصلی راز تکرارِ لفظی اور حذفِ الفاظ میں مضمر ہے اور ان کی رائے میں بہ نسبت دورِ قدیم کے جدید دور میں حذفِ الفاظ کا رواج ترقی پذیر ہے۔ ہمارے

خیال میں مولوی صاحب کی یہ رائے اگرچہ درست ہے مگر روزمرہ کی تمام اصناف پر حاوی نہیں۔ اس امر کا ثبوت پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ اساتذہ کے دیوان اور انشاپردازوں کے کارنامے موجود ہیں۔ اہلِ ذوق خود دیکھ سکتے ہیں۔

آخر میں مولوی صاحب نے محاورات باندھنے کے سلیقے پر چند سطور لکھی ہیں اور چند لطیف نکات واضح کئے ہیں۔ مثلاً ایک نکتہ یہ ہے کہ ایک زبان کے محاورے کا دوسری زبان میں ترجمہ کرنا خلافِ فصاحت ہے۔ اس سلسلے میں آزاد کی زبانی ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ آزاد لکھتے ہیں کہ

"ایک روز راستے میں عبداللہ خاں اوج سے میری ملاقات ہوئی میں نے استاد ذوق کا یہ شعر پڑھا۔

مقابل اس رخِ روشن کے شمع گر ہو جائے
صبا وہ دھول لگائے کہ بس سحر ہو جائے

اوج نے شعر کی معمولی تعریف کی اور چلے گئے۔ چند روز کے بعد راستے میں مڈبھیڑ ہوئی۔ علیک سلیک کے بعد یہ شعر پڑھا۔

یاں جو برگِ گل خورشید کا کھڑکا ہو جائے
دھول دستارِ فلک پر لگے تڑکا ہو جائے

شعر پڑھنے کے بعد کہا کہ دیکھئے محاورہ اس طرح باندھا جاتا ہے اوج یہ بتانا چاہتے تھے کہ گو سحر اور تڑکا ہم معنی الفاظ ہیں۔ مگر محاورے میں صرف "تڑکا" ہونا ہی استعمال کیا جاتا ہے۔"

مولوی صاحب نے محاورہ کے غلط استعمال کی بھی چند مثالیں دی ہیں۔ مثلاً "دست و گریباں" ہونے کے معنے مخالف ہونے اور برسرِ پیکار ہونے کے ہیں۔ مگر مولانا آزاد نے اسے بالکل مختلف طور پر استعمال کیا ہے، جو غالباً غلط ہے۔ وہ آبحیات میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"اوّل یہ کہ زبان پر حاکمانہ قدرت رکھتے ہیں کلام کا زور مضمون کی نزاکت سے ایسا دست و گریباں ہے جیسے آگ کے شعلے میں گرمی اور روشنی۔"

مولانا بظاہر تشبیہ کے زور میں ایسے بہہ گئے کہ انہیں محاورے کے مجازی معنے کا خیال نہ رہا۔

مضمون اگرچہ مختصر ہے لیکن جامع ہے۔ ہمیں صرف اس قدر افسوس ہے کہ مولوی صاحب نے شعراء میں سے نظیر کا بالکل ذکر نہیں کیا جس کا کلام سراسر روزمرہ ہے۔ مگر شاید اس غریب کی قسمت میں یہی لکھا ہے کہ لوگ اسے اس میدان میں بھی نظرانداز کر دیں جس کا وہ مرد ہے مولوی صاحب نے نظیر کی طرح اکبر پر بھی توجہ نہیں فرمائی اور نثر نگاروں میں انہوں نے نہ صرف موجودہ دور کے نوجوانوں کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا بلکہ خواجہ حسن نظامی جیسے ادیب کو بھی نظرانداز کر دیا جو بامحاورہ اور سلیس زبان لکھنے میں خود صاحبِ طرز ہیں۔

سالنامۂ "ساقی" جنوری ۱۹۴۰ء

لالٹین

سعادت حسن صاحب منٹو کا یہ دل آویز مطالعہ افسانے سے زیادہ ایک لطیف نفسیاتی تجزیے کی حیثیت رکھتا ہے۔ جسے ان کے دلچسپ اور نرالے اندازِ بیان نے بے حد دلکش بنا دیا ہے۔ قصّے کا کا پلاٹ نہ ہونے کے برابر ہے۔ وزیر ایک آزاد پہاڑی لڑکی ہے۔ ہر طرح سے آزاد، قصّے کا ہیرو پنجاب کے میدانوں سے اس کے پہاڑی وطن میں موسمِ گرما بسر کرنے جاتا ہے۔ ساتھ کچھ احباب بھی ہیں۔ عام فہم و فراست کے لوگ، جو ان تیز اور نازک احساسات کی داد نہیں دے سکتے جن سے ہیرو کے دل و دماغ میں ایک زلزلہ سا پیدا ہو رہا ہے۔ وہ اُس آزادہ رو لڑکی کو بھی اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے۔ جس کے قہقہوں میں بھی ایک آہ پنہاں تھی، جس کی کامرانیوں میں بھی ایک تلاش جاری تھی۔ لیجئے پلاٹ ختم ہوا۔ باقی جو کچھ ہے وہی اس افسانے کی روح ہے۔ صاحبِ افسانہ نے قلم اٹھانے سے پہلے اپنے دل کی گہرائیوں میں جھانکا ہے، اور وہاں سے جو کچھ ان کے ہاتھ لگا ہے۔ اس سے انہوں نے اس مطالعے کے نقوش ابھارے ہیں۔ دیکھئے:۔

"میں زندگی زندگی پکارتا ہوں مگر مجھ میں زندگی کہاں! اور شاید یہی وجہ ہے کہ میں اپنی عمر کی پٹاری کھول کر اس کی ساری چیزیں باہر نکالتا ہوں اور جھاڑ پونچھ کر بڑے قرینے سے ایک قطار میں رکھتا ہوں اور اس آدمی کی طرح جس کے گھر میں بہت تھوڑا سامان ہو، ان کی نمائش کرتا ہوں ..... میرے پاس تھوڑا بہت جو کچھ بھی ہے غنیمت ہے، دنیا میں تو ایسے لوگ بھی ہوں گے جن کی زندگی چٹیل میدان کی طرح خشک ہے اور

میری زندگی کے ریگستان پر تو ایک بار بارش ہو چکی ہے...

.... اپنے موجودہ انتشار کو دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرا انجام چشمِ فلک کو بھی نم ناک کر دے گا ——— آہ! خرابۂ فکر کا انجام! وہ شخص جسے انجام کار اپنے وزنی افکار کے نیچے پس جانا ہے۔ یہ سطور لکھ رہا ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ وہ ابھی بہت سی سطریں لکھنے کی تمنا اپنے دل میں رکھتا ہے۔ میں ہمیشہ مغموم و ملول رہا ہوں۔ لیکن بشیر جانتا ہے کہ بچوّت میں میری آہوں کی زردی اور تپش کے ساتھ ساتھ ایک خوشگوار مسرت کی سرخی اور ٹھنڈک بھی تھی۔ وہ آب و آتش کے اس باہمی ملاپ کو دیکھ کر متعجب ہوتا تھا۔"

آپ نے دیکھا! جذبات کی شدت نے الفاظ کے لباس کو تار تار کر کے رکھ دیا ہے۔ "آہوں کی زردی" بظاہر ایک انوکھی بلکہ مہمل ترکیب معلوم ہوتی ہے۔ لیکن خدالگتی کہیئے اس نے اپنے تصور سے کس قدر انصاف کیا ہے۔ اسی طرح "عمر کی پٹاری کھولنا ——— زندگی کے ریگستان پر ایک بار بارش کا ہو جانا.... اور "خرابۂ فکر کا انجام" سچی اور زندہ نگارش کے کیسے تابناک پارے ہیں۔ افسانے کے ہیرو کو وزیر سے جو دلچسپی ہے، اس کی نوعیت اُس کے دوستوں کی سمجھ میں نہیں آتی، وہ اسے ایک خطرناک پہاڑی لونڈیا سمجھتے ہیں اور شاید ان کا یہ خیال درست ہو لیکن

"میں انہیں کیسے یقین دلاتا کہ میں اگر وزیر سے دلچسپی لیتا ہوں تو اس کا باعث یہ ہے کہ میرا ماضی اور حال تاریک ہے۔ مجھے اس سے محبت نہیں تھی اسی لئے میں اس سے زیادہ وابستہ تھا، وزیر سے میری دلچسپی اس محبت کا رہبر سل تھی جو میرے دل میں اس عورت کے لئے موجود ہے جو ابھی تک میری زندگی میں نہیں آئی میری زندگی کی انگوٹھی میں وزیر ایک جھوٹا نگینہ تھی لیکن یہ نگینہ مجھے عزیز تھا اس لئے کہ اس کی تراش، اس کا ماپ بالکل اس اصلی نگینہ کے مطابق تھا جس کی تلاش میں میں ہمیشہ ناکام رہا ہوں۔

وزیر سے میری وابستگی بے غرض نہیں تھی اس لئے کہ میں غرض مند تھا۔ وہ شخص جو اپنے غم افزا ماحول کو کسی کے وجود سے رونق بخشنا چاہتا ہو اس سے زیادہ خود غرض اور کون ہو سکتا ہے؟ ——— اس لحاظ سے میں وزیر کا ممنون بھی تھا اور خدا گواہ ہے کہ میں جب کبھی اس کو یاد کرتا ہوں تو بے اختیار میرا دل اس کا شکریہ ادا کرتا ہے۔

شہر میں مجھے صرف ایک کام تھا ——— اپنے ماضی حال اور مستقبل کے گھپ اندھیرے کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے رہنا اور بس! ——— مگر بچوت میں اس تاریکی کے اندر روشنی کی ایک شعاع تھی۔ وزیر کی لالٹین!"

اور اگرچہ وزیر بجائے خود افسانہ گو کے روحانی ظلمت کدے میں ایک شمع لرزاں تھی، لیکن اس روشنی نے ایک ظاہری لباس بھی اختیار کر لیا تھا، اور وہ وزیر کی لالٹین تھی جسے جلا کر وہ شائیں شائیں کرتی ہوئی رات کے اندھیرے میں نکل جاتی تھی۔ اور اس کی روشنی میں وہ بزعم خود اُس ہستی کی دیکھ بھال کرتی تھی جسے دشمن گزند پہنچانے پر تلے ہوئے تھے۔

"وزیر کو واقعی میری بہت فکر تھی بعض اوقات وہ مجھے بالکل بچہ سمجھ کر میری حفاظت کی تدبیریں سوچا کرتی، جیسے وہ خود محفوظ و مامون ہے اور میں بہت سی بلاؤں میں گھرا ہوا ہوں۔ میں نے اُسے کبھی نہ ٹوکا تھا اس لئے کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ اسے اس شغل سے باز رکھوں جس سے وہ لطف اٹھاتی ہے، اس کی اور میری حالت بعینہ ایک جیسی تھی۔ ہم دونوں ایک ہی منزل کی طرف جانے والے مسافر تھے۔ جو ایک لق و دق صحرا میں ایک دوسرے سے مل گئے تھے۔ اسے میری ضرورت تھی اور مجھے اس کی۔ تاکہ ہمارا سفر اچھی طرح کٹ سکے۔ میرا اور اس کا صرف یہ رشتہ تھا جو کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا.....

میں اور اکرام ہر شب مقررہ وقت پر ٹہلنے کو نکلتے۔ بشیر حویلی مکان کے پاس پہنچ کر شور کرتا۔ پھر اکرام صاحب کے بنگلے سے کچھ دور کھڑے ہو کر نعرہ بلند کرتا، وزیر لالٹین روشن کرتی اور اس کی روشنی کو ہوا میں لہرا کر ایک جھاڑی کے پیچھے بیٹھ جاتی۔ بشیر اور اکرام صاحب باتیں کرنے میں مشغول ہو جاتے اور میں لالٹین کی روشنی میں اس روشنی کے ذرے ڈھونڈتا رہتا جس سے میری زندگی منور ہو سکتی تھی۔ وزیر جھاڑیوں کے پیچھے بیٹھی نہ جانے کیا سوچتی رہتی!"

نفسیات کے اس نادر خاکے میں صاحب افسانہ نے کچھ ایسے رنگ بھی بھرے ہیں جن سے اُس گہری وابستگی کا اظہار ہوتا ہے جو نہیں مادر فطرت سے ہے۔ دیکھئے:

بھٹیارے کے یہاں رات کو کھانا کھانے کے بعد میں اور بشیر
ٹہلتے ٹہلتے اکرام صاحب کے بنگلے کے پاس پہنچ جاتے .....
رات کی خنک اور نیم مرطوب ہوا میں اس چہل قدمی کا بہت
لطف آتا تھا۔ سڑک کے دائیں بائیں پہاڑیوں اور ڈھلوانوں
پر مکئی کے کھیت رات کے دھندلکے میں خاکستری رنگ
کے بڑے بڑے قالین معلوم ہوتے تھے اور جب ہوا کے
جھونکے مکئی کے پودوں میں لرزش پیدا کر دیتے تو ایسا معلوم
ہوتا کہ آسمان سے بہت سی پریاں ان قالینوں پر اتر آئی ہیں
اور ہولے ہولے ناچ رہی ہیں۔"

تشبیہہ کی ندرت اور زندگی قابلِ غور ہے۔ منٹو صاحب نے اس چھوٹے سے افسانے میں اس قسم کی متعدد تشبیہیں پیش کی ہیں اور ہمارا خیال ہے کہ اپنے اچھوتے پن اور تازگی کے لحاظ سے وہ اپنی مثال آپ ہیں۔

ریڈیو ڈراما

یہ جامع اور دلچسپ مضمون سید بادشاہ حسن صاحب نے لکھا ہے اور حق یہ ہے کہ انہوں نے اپنے موضوع کے ساتھ پورا انصاف کیا ہے۔ بادشاہ حسن صاحب کا اندازِ بیان عموماً بہت صاف اور سلجھا ہوا ہوتا ہے مگر اس مضمون میں انہوں نے اس بارے میں غیر معمولی کامیابی حاصل کی ہے۔

سب سے پہلے انہوں نے ڈراما کا بحیثیت مجموعی جائزہ لیا ہے اور اصنافِ ادب میں ڈراما کی مقبولیت کا راز بیان کیا ہے۔ وہ ایک مغربی نقاد کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"ڈراما قومی شعور کی گہرائیوں کے بالکل قریب ہے، وہ مختلف
مذاق اور مختلف ماحول کے افراد کو یکساں متاثر کرتا ہے، وہ
تھیئٹر سے ملحق ہے جو انسانیت کے سارے طبقوں کی
یکجائی کا مرکز ہے وہ اپنے اغراض و مقاصد میں بہت زیادہ
سماجی ہے، اور وہ جذبات کو اکسانے کا موثر آلہ ہے ..
..... دراصل ڈراما کی یہی ہمہ گیری اس کی ہر دلعزیزی کا
باعث ہوئی۔"

ڈراما کے نشوونما کا جو تعلق اسٹیج کی ترقی سے ہے وہ شاید ہمارے ہاں تو کچھ زیادہ معنی نہیں رکھتا، کیونکہ یہاں سٹیج کی تعمیر نے ابھی فن کی ابتدائی منازل بھی طے نہیں کی تھیں کہ متحرک تصاویر اور ان کے بعد بولنے والے فلموں نے خود سٹیج ہی کو مٹا دیا لیکن مغرب میں اسٹیج کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے اور اس کے ارتقا کی تاریخ گویا خود ڈرامے کے نشوونما کی کہانی ہے۔ جوں جوں اسٹیج کی وسعت، آرائش اور اُن میکانکی ترکیبوں میں اضافہ ہوتا گیا، جو اسٹیج سے مختلف کام لینے میں بروئے کار لائی جاتی ہیں، توں توں ڈراما نگار ان سہولتوں سے فائدہ اٹھا کر اپنے فن میں نئی نئی خوبیاں پیدا کرتے گئے۔ یہ عمل نہایت سرعت سے جاری تھا کہ سینما ایجاد ہوا اور پھر کچھ عرصے کے بعد بولتے فلم کا سیلاب آ گیا۔ اس انقلاب کے ساتھ ڈرامائی اصولوں بھی مناسب تبدیلیاں ہوئیں سٹیج کی تنگی جب متحرک تصاویر کی وسعت سے بدلی تو یہ تبدیلیاں ناگزیر تھیں۔ اسی طرح جب خاموش فلمیں بولنے لگ پڑیں تو خاموش اداکاری کی ٹکنیک یکسر معدوم ہو گئی اور وہ فنِ لطیف جو جسمانی حرکات اور چہرے کے تغیرات کے ذریعے جذبات کی ترجمانی کرتا تھا اور جسے خاموش فلم نے کمال کی بلندیوں پر پہنچا دیا تھا۔ ترقی تمدن کی داستان میں ایک ورقِ پارینہ ہو کر رہ گیا۔ ادھر بولتے فلموں کے ساتھ ہی ساتھ ریڈیو ڈرامے کا آغاز ہوا جسے آپ صرف سن سکتے ہیں، دیکھ نہیں سکتے۔ اس حدبندی سے جہاں ڈرامے کے مجموعی اثر میں یک گونہ کمی واقع ہوئی۔ وہاں چند ایسے نئے لطف بھی حاصل ہوئے جن سے ہم پہلے قطعاً نا آشنا تھے۔ تفصیل ان کی اپنے موقع پر آئے گی۔

آگے چل کر صاحبِ مضمون نے اسٹیج اور ریڈیو ڈرامے کے لوازم کے باہمی فرق کو ظاہر کیا ہے اس لئے کہ اسے ظاہر کئے بغیر ریڈیو ڈراما لکھنے اور پیش کرنے کے اصول واضع نہیں ہو سکتے۔ اس سلسلے میں سب سے نمایاں تضاد منظر اور اس کے اثرات سے مرتب ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

"اسٹیج ڈراما میں سب سے پہلی چیز اسٹیج کی وسعت آرائش اور
ترتیب ہے۔ ظاہر ہے کہ سارے مناظر نقلی پیش کرنے پڑتے ہیں
لیکن پھر بھی نقل کو اصل کرنے کی کوشش بے حد و حساب
کرنی ہوتی ہے۔ مصور، بڑھئی، درزی اور روشنی کا مینیجر سب
سر جوڑ کر ماحول کی نقاشی میں منہمک ہوتے ہیں اور ہر فن کار اپنی
سی پوری کوشش کئے جاتا ہے اور کوئی چیز اٹھا نہیں رکھتا۔
آپ جانتے ہیں کہ ان سب کی مشترکہ کوشش یہی ہوتی ہے
کہ تماشائیوں کو خوش کریں۔ دھوکا تو وہ دے نہیں سکتے۔

اس لئے کہ سارے تماشائی یہ خیال لئے ہوئے تھیئٹر آتے ہیں کہ اسٹیج پر پردے لٹکتے ہیں.... یقین مانئے کہ ایک بھی تماشائی جنگل کا سین دیکھ کر یہ نہیں سمجھتا کہ واقعی اسٹیج پر جنگل سمٹ آیا ہے بلکہ اس کے منہ سے بے ساختہ صرف یہی جملہ نکلے گا "کیا اچھا پردہ ہے".... اور اکثر اوقات اس کے برعکس پردہ اٹھنے سے پہلے تماشائی کا تخیل کام کرنے لگتا ہے۔ اگر اس نے اتفاق سے افریقہ کا جنگل دیکھا ہے، برما کا جنگل دیکھا ہے یا کہیں اور کا تو وہ اسی قسم کے منظر کا متوقع ہوتا ہے۔ اتنے میں پردہ پیش ہوتا ہے تو ایک تنقیدی اور مقابلہ کرنے والی نگاہ ڈال کر تماشائی کہتا ہے "ونہہ تو یہی ہے جنگل کا سین؟ کس مصور نے رنگا ہے خدا جانے! ہمارے ہاں کے مصور بھی واللہ عجیب چیز ہوتی ہے ۔۔۔ اسٹوڈیو میں بیٹھے بیٹھے جنگل کے پردے رنگا کرتے ہیں"۔

ہر شخص کا چونکہ تخیل اور مشاہدہ جدا جدا ہوتا ہے اس لئے اسٹیج پر لگا ہوا پردہ سارے تماشائیوں کو بہ یک وقت خوش نہیں کر سکتا ۔۔۔ اس کے برخلاف ریڈیو ڈراما کے منظر کو لیجئے۔ آپ کہیں گے کہ ریڈیو ڈراما میں مناظر ہی نہیں ہوتے۔ میں عرض کروں گا کہ بے شک پردہ نہیں ہوتا لیکن ایک ماحول بہر حال ہوتا ہی ہے۔ فرض کیجئے دو افراد ڈراما جنگل میں گفتگو کر رہے ہیں۔ پیش کنندہ کوئی مادی چیز پیش نہیں کر سکتا بلکہ سننے والوں کے انفرادی تخیل ہی کو اس بات کا موقع دیتا ہے کہ وہ اپنے مشاہدات کی بنیاد پر تخیل ہی تخیل میں منظر مکمل کر لیں۔ اسٹیج پر تماشائی کے تخیل اور پردے میں تصادم ہوتا ہے لیکن ریڈیو ڈراما میں تخیل کو آزاد چھوڑ دینے کی وجہ سے تصادم نہیں ہوتا..... اس سلسلے میں دوسری بات قابلِ لحاظ یہ ہے کہ اسٹیج پر مناظر کشی محدود ہے۔ بہت سے مناظر ایسے ہیں جو قطعاً پیش نہیں کئے جا سکتے، ریڈیو ڈراما میں مصنف آزاد ہے۔ دنیا کا کوئی ایسا منظر نہیں جو سننے والوں کے تخیل میں سما نہ سکے خواہ وہ سمندر کا طوفان ہو خواہ ریگستان کی آندھی۔ ڈراما کی جائے وقوع بھی اسی طرح ہمالیہ کی چوٹی بھی ہو سکتی ہے اور کوئلہ کی کان بھی"۔

دوسرا بڑا فرق جو ایک طرف اسٹیج اور اسکرین اور دوسری جانب ریڈیو کے ڈراموں کے درمیان پایا جاتا ہے، اور جس میں ڈرامہ نگار کے نقطۂ نظر سے ریڈیو کی جیت ہوتی ہے، یہ ہے کہ اسٹیج اور فلم دونوں کے ڈراموں میں اکثر اوقات اداکار کی شخصیت اس کے کردار کی خصوصیتوں پر اس طرح چھا جاتی ہے کہ ڈرامہ نگار کا مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس ریڈیو میں اداکار کی شخصیت بالکل معدوم ہوتی ہے۔ اس لئے ڈرامہ نگار اپنے مکالمے کا پورا زور سننے والے کے تخیل پر ڈال سکتا ہے۔ اور اکثر اوقات اس کوشش میں کامیاب ہوتا ہے۔ بادشاہ حسن صاحب نے اس نکتے کی یوں وضاحت کی ہے:۔

"کتنے ڈرامے آپ نے دیکھے ہوں گے جن میں اداکار کی صلاحیتوں یا شخصیت نے بے چارے ڈراما نگار کو ہی پسِ پشت ڈال دیا۔ ظاہری آرائش و زیبائش سے لوگ مرعوب ہو جاتے ہیں یا اداکاری کے ایسے گرویدہ ہو جاتے ہیں کہ اصل ڈراما کو فراموش کر کے صرف اس کی یاد محفوظ کر لیتے ہیں۔ حسین اداکارہ سب ہی تماشائیوں کی آنکھوں میں کھُبی جاتی ہے اور بھلائے سے نہیں بھولتی۔ خواہ اس کے الفاظ کسی کو یاد رہیں یا نہ رہیں۔ بہر حال اس کی صورت کا نقش سب کے دلوں پر ضرور بیٹھ جاتا ہے۔ بعض دفعہ تو یہ خصوصیت ڈراما نگار کو ایک آفت میں مبتلا کر دیتی ہے اور وہ اس طرح، کہ لوگ ظاہری حسن میں محو ہو کر مکالمہ اور اس کے کردار کو فراموش کر جاتے ہیں یا سرے سے محسوس ہی نہیں کرتے ۔۔۔۔ ریڈیو ڈراما میں ان دونوں مشکلات سے سابقہ نہیں پڑتا نہ اداکار کا حسین چہرہ سننے والے کے سامنے ہوتا ہے اور نہ وہ اس کی شخصیت سے مرعوب ہوتا ہے۔ اسی طرح اداکار کے حرکات و سکنات سے بھی ریڈیو ڈرامے کا کوئی واسطہ نہیں۔ نہ زیادہ اداکاری کا اندیشہ ہے اور نہ کم کا۔ لے دے کر صرف لہجہ، تلفظ اور طرزِ ادا ہی پر ریڈیو ڈرامے کا دارومدار ہے بلاشبہ یہ باتیں اسٹیج کے اداکار کے لئے بھی درکار ہوتی ہیں لیکن اتنی اہمیت انہیں وہاں کبھی حاصل نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے کہ ان حالات کے ماتحت ڈراما نگار کی شخصیت اور ڈراما کا اصل مفہوم اور اس کا اصلی جوہر جوں کا توں جس طرح ریڈیو ڈراما میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح اسٹیج پر نہیں کیا جا سکتا"

اس کے بعد اسٹیج ڈراما میں منظر بدلنے کی دقتوں اور ان کے مقابل ریڈیو ڈرامے میں اس قسم کی آسانیوں کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کی مثالیں دی گئی ہیں۔ یہ دقتیں درحقیقت صرف اسٹیج تک محدود ہیں، اسکرین پر ان کا کوئی وجود نہیں۔ لیکن صاحبِ مضمون نے اس بات کا تذکرہ غالباً اس لئے نہیں کیا کہ وہ اپنے سامنے صرف سٹیج اور ریڈیو کو رکھ رہے ہیں اور انہیں کا مقابلہ انہیں منظور ہے۔ آگے چل کر وہ ریڈیو ڈرامے کے بنیادی اصول بیان کرتے ہیں اور ریڈیو میں جو حیثیت اناؤنسر (معلن) کو حاصل ہے اس کا تجزیہ کرتے ہیں۔ ان کی رائے میں لمبے ڈراموں یا خالص اسٹیج کے ڈراموں میں معلن کی واقعی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ مناظر کے باہمی رشتوں کو ملا سکے اور طویل ڈراموں کے غیر ضروری مناظر کا محض اعلان کر کے ڈراموں کے اختصار میں مدد دے سکے۔ لیکن بقول ان کے اس اعلان میں کوئی فنی خوبی نہیں بلکہ شکسپیئر کے زمانے کی اسٹیج کی حالت ہے۔ اس کے برخلاف خالص ریڈیو ڈرامے میں معلن کی دخل اندازی کو بہت کم موقعہ دیا جاتا ہے۔ اور ڈرامہ نگار مکالمے ہی میں ڈرامے کی بیرونی ضروریات پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ بادشاہ حسن صاحب نے اس کوشش کی چند دلچسپ مثالیں دی ہیں:۔

"مقامی اشارے مکالمہ میں کچھ اس طرح ملیں گے۔ "بندۂ خدا! یہ بھی کوئی خوابگاہ میں رہنے کا وقت ہے۔ کیا سچ مچ سو رہے تھے یا یوں ہی پلنگ پر پڑے کروٹیں بدل رہے تھے"۔ موسم کے اشارے اس طرح ہوں گے۔ "اُفوہ! مارے گرمی کے برا حال ہوا جا رہا ہے اور آپ ہیں کہ کمرے میں بند پڑے ہیں، میرے یار! دریچہ تو کم از کم کھلا رکھا ہوتا یا پنکھا ہی چلایا ہوتا"۔ وقت کا ذکر کچھ اس طرح ہوگا۔ "یہ مغرب رویہ دریچہ کھلا رکھتے تو غروبِ آفتاب کا رنگین سماں پیشِ نظر ہوتا"۔ لباس کے متعلق اشارے اس طرح ہوں گے۔ "چلو یار یہن بھی چکو کپڑے، اوہو آج تو خاص اہتمام ہو رہا ہے! اچھا میں سمجھا "ان" کی بھی دعوت ہوگی۔ واقعی اس شیروانی کا انتخاب خوب کیا تم نے! اگرچہ نارنجی رنگ ـــــ کیا یہ ان کا دل پسند رنگ ہے؟ سیاہ نہیں سرخ ترکی ٹوپی اچھی رہے گی"۔ اسی قسم کے اشارے کرداروں کی شخصیت کے متعلق بھی ملیں گے۔ مثلاً عمر کی نسبت "ارے بھئی ہم کو کون پوچھتا ہے، دس برس کی شادی شدہ زندگی نے جوانی کے رہے سہے آثار بھی مٹا دیئے۔ دیکھو پینتیس برس ہی میں سفید بال نکل آئے"۔

اسی طرح بوڑھے بچے اور جوان کا فرق آوازوں سے اور کرداروں کے باہمی رشتوں کا فرق اُن کے طرزِ خطاب سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ لیکن ان تمام قسم کے اشاروں کا استعمال نہایت احتیاط سے کرنا چاہئیے، اور اس باب میں اعتدال کو مدِنظر رکھنا ضروری ہے۔ ورنہ ڈرامہ نگار کی توجہ اشاروں کی طرف زیادہ ہوگئی تو مکالمہ کی چستی میں بھی یقیناً فرق آجائے گا۔ یہاں سے صاحبِ مضمون آواز کے اثرات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اور ریڈیو میں کام آنے والی مختلف آوازوں کا تجزیہ کرتے ہیں۔ اس ضمن میں عقبی آوازوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ گارڈن لی کی اس رائے کو پیش کرتے ہیں کہ سننے والوں کا ایک طبقہ عقبی آوازوں کو بالکل پسند نہیں کرتا۔ وہ مکالمے کے پس منظر کو بالکل خاموش اور ساکت رکھنا چاہتا ہے اس کے نزدیک ریڈیو کی عقبی زمین اگر خاموش ہو تو وہ ایک سیاہ مخمل کی عقبی زمین کے موافق ہے جس پر مکالمے کے الفاظ روپہلی تاروں کے گتھے ہوئے ستاروں کی طرح دمکتے ہیں"۔ لیکن غالباً ایسے تخیل پرست نسبتاً کم ہیں۔ سننے والوں میں بیشتر تعداد ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جو عقبی آوازوں سے اپنے تخیل کی تکمیل میں مدد لیتے ہیں بہرحال ان آوازوں کا استعمال بہت کچھ تجربے اور حسن مذاق پر منحصر ہے اور اس لحاظ سے ایک مستقل فن کی حیثیت رکھتا ہے۔ صاحبِ مضمون نے اُن طریقوں کا بھی مختصر سا ذکر کیا ہے جن سے ریڈیو میں کام آنے والی مختلف آوازیں پیدا کی جاتی ہیں۔ مثلاً ایک ماہر نے سگرٹ کی ڈبیا پر لپٹے ہوئے کاغذ کے مسلنے سے مائکروفون پر ایسی آواز پیدا کی جو الاؤ میں لکڑیوں کے چٹخنے کی آواز سے بہت مشابہ تھی۔

یہاں پہنچ کر صاحبِ مضمون نے آواز کے اتار چڑھاؤ اور ایک ماہر اداکار کی اس قدرت کا ذکر کیا ہے جو اُسے مختلف جذبات کے اظہار کے لئے آواز کے مختلف رنگ پیدا کرنے پر حاصل ہوتی ہے۔ ریڈیو کے اداکار کے لئے اس فن میں مشق بہم پہنچانا ایسا ہی ضروری ہے جیسے اسٹیج اور اسکرین کے کسی اداکار کے لئے اپنے چہرے کے نقوش اور جسم کی حرکات کے ذریعے کردار کی سچی ترجمانی میں کامیابی حاصل کرنا۔ مائکروفون پر وہی آرٹسٹ کامیاب ہو سکتا ہے جو اپنے لہجے کو مکالمے کے ہر رنگ کے ساتھ اسی طرح بدلتا جائے جس طرح ایک کامل موسیقار اپنے گلے کو راگنی کے مختلف سروں کی تشریح میں اوپر تلے کرتا ہے۔

آخر میں بادشاہ حسن صاحب نے ایک مختصر پیراگراف ریڈیو میں تلفظ کی اہمیت کے متعلق لکھا ہے۔ انہوں نے انگلستان کی ایک مستند مجلس کا ذکر کیا ہے جو بی بی سی کی طرف سے لسانیات کی تحقیقات کے لئے مقرر ہے اور جو الفاظ کے صحیح تلفظ کے متعلق چھان بین کرتی رہتی ہے۔ انہیں یہ مثال اس وقت کے لئے محفوظ رکھنی چاہئے تھی، جب ہمارے ہاں کے ریڈیو اسٹیشن اس بارے میں کچھ دلچسپی لینے کے لئے آمادہ ہو جاتے۔ ورنہ یہاں تو ابھی یہ عالم ہے کہ لسانیات اور تلفظ کی تحقیقات تو ایک طرف، زبان و قواعد کی بدیہی غلطیوں پر بھی بہت کم توجہ دی جاتی ہے۔ ہماری ناچیز رائے میں ریڈیو کو اپنی افادی اور اشاعتی حیثیت کے مدِنظر صحیح زبان کی ترویج میں مدد دینی چاہئے، اور اگر ابھی یہ ممکن نہ ہو تو کم از کم غلطیوں کی اشاعت سے تو ہاتھ روکنا بے حد ضروری ہے۔ انگریزی زبان میں تلفظ کے مختلف رنگ ہیں۔ رنگوں کے عکس ہیں، اور ان عکسوں کے مختلف حامی ہیں جو اپنی اپنی جگہ اپنے پسندیدہ تلفظ کے حق میں دلیلیں رکھتے ہیں ان کی ہم آہنگی کے لئے مجلسیں بنیں۔ لسانیات کے ماہر جمع ہوں اور اتفاق رائے سے کسی نتیجے پر پہنچیں یا بالفرض نہ ہی پہنچیں۔ یہ باتیں انہیں زیب دیتی ہیں۔ ہمارے ہاں کا مسئلہ بالکل جدا ہے۔ اردو زبان میں تلفظ کی ذراسی غلطی اکثر اوقات معنی ہی بدل دیتی ہے۔ اور اس قسم کی غلطیاں عام لوگ ہر فقرے میں کرتے ہیں۔ اب مصیبت یہ ہے کہ اکثر وہ لوگ بھی جو مائکروفون پر آتے ہیں۔ اس بارے میں احتیاط نہیں کرتے اور وہ ان غلطیوں کے مزید نشر و اشاعت کا موجب بنتے ہیں۔ ریڈیو کو اس قسم کی لغزشوں کا سختی سے سدباب کرنا چاہئے کیونکہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو وہ دن دور نہیں جب ہماری زبان میں ایسے نقائص و عیوب کا رواج اس کی خوبیوں اور نزاکتوں کا ستیاناس کر کے رکھ دے گا۔

ہمایوں۔ سالگرہ نمبر جنوری ۱۹۴۸ء

۱۔ کشمیر، اس کی تاریخ اور اس کے مسائل۔

میاں بشیر احمد صاحب ایڈیٹر ہمایوں کا یہ مضمون کشمیر کے متعلق ایک مختصر انسائیکلوپیڈیا کا حکم رکھتا ہے۔ یوں تو ہمایوں کے صفحات اکثر اس خطۂ جنت کے ذکر سے گل بداماں رہے ہیں لیکن زیرِ نظر مضمون اپنی جامعیت اور دلچسپی کے لحاظ سے ایک شاہ کار کی حیثیت رکھتا ہے اور میاں صاحب کے سادہ مگر دلکش اندازِ تحریر کا ایک نہایت اچھا نمونہ ہے۔

مضمون کے آغاز میں کشمیر کے طبعی اور جغرافیائی حالات کا جائزہ لیا گیا ہے، اس حصے کے مطالعے سے کشمیر کی وسعت اور قدرتی تقسیم، اس کے کوہ و دریا، وادیوں اور جھیلوں، اس کے مختلف موسموں، اس کی پیداوار اور صنعتوں، قوموں اور باشندوں، اور مشہور مناظر و مقامات کے متعلق قابلِ قدر معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اس ضمن میں بعض بہت دلچسپ باتیں معلوم ہوئیں، مثلاً یہ کہ کشمیری کشیدہ کاری کے پیچ و خم وادیٔ کشمیر میں جہلم کے بل کھاتے ہوئے راہ گذار کا چربہ ہیں اور کشمیر میں چھ قسم کے موسم بہار ہوتے ہیں اور یہاں کی موسمی تبدیلیاں بھی بہت مشہور ہیں جبھی تو ضرب المثل ہے کہ "کشمیر پنکھا پوستین"۔ اس سلسلے کی چند اور باتیں صاحبِ مضمون کی زبانی سنئے:۔

"کشمیری پنڈت اپنی ذہانت کے لئے مشہور ہیں۔ ہندوؤں میں موتی لال اور جواہر لال اور مسلمانوں میں ڈاکٹر اقبال اور کئی اشخاص کشمیری نسل سے ہیں۔ مشہور پہلوان غلام، کلو، امام بخش وغیرہ بھی کشمیری ہیں .... کلچہ کشمیر ہی سے پنجاب میں آیا، کشمیر کا "ہتو" مزدور سارے شمالی ہندوستان میں محنت مزدوری کرتا پایا جاتا ہے ...... اپنی شال کے لئے کشمیر مہابھارت کے زمانے سے مشہور تھا، مغلیہ زمانے میں، جب اس صنعت کو پھر فروغ حاصل ہوا، ایسی نفیس قسم کی شال بنتی تھی کہ ۱½ گز کا ٹکڑا لپیٹ کر ایک انگوٹھی میں سے نکل سکتا تھا.... پتھر کے کام کے نمونے قدیم ہندو مندروں میں اور لکڑی کے کام کے نمونے مسلمان بادشاہوں کی مسجدوں میں نظر آتے ہیں۔ اُس کے لئے مارتنڈ کے ستون دیکھو اور اس کے لئے جامع مسجد کے ۳۲۷ ستون، جن میں اکثر چالیس چالیس فٹ اونچے ہیں ..... کشمیری عموماً بہت توہم پرست واقع ہوئے ہیں، ہندوؤں کے توہمات عموماً چشموں سے وابستہ ہوتے ہیں اور مسلمانوں کے ان کے پیروں کے مقبروں سے۔ خاص کشمیر کی وادی کے تقریباً ۹۵ فی صدی رہنے والے مسلمان ہیں۔ یہ وادی اکثر ماہیوں کی "یا پیر دستگیر" سے گونجتی ہے ..... کشمیر میں بہت سی زبانیں ہیں۔ تقریباً چودہ لاکھ کشمیری بولتے ہیں، چھ لاکھ پہاڑی، ساڑھے پانچ لاکھ ڈوگری، ۳ لاکھ پنجابی، ۳ لاکھ گوجری، سوا لاکھ بلتی وغیرہ وغیرہ۔ ان سب کے لئے مشترک ملکی زبان اردو ہے۔ ... کشمیری زبان کے متعلق

کہا جاتا ہے کہ چھ سو سال ہوئے یہ ایک مکمل تحریری زبان تھی۔ کشمیر کا سب سے بڑا بادشاہ بڈشاہ یعنی زین العابدین خود کشمیری زبان میں شعر لکھتا تھا۔ ہندی کی طرح کشمیری شاعری میں بھی عشقیہ اشعار میں عورت سے مرد کی طرف خطاب ہوتا ہے۔ کشمیری شاعری پر بعد میں فارسی شاعری کا اور تصوف کا بہت اثر پڑا۔ یاس وحسرت کا عنصر اس میں بہت ہے اور نظم میں قافیوں کی کثرت ہوتی ہے بڈشاہ کے بعد فارسی کا رواج بڑھتا گیا، یہاں تک کہ بعض کشمیری فارسی شعرا، مثلاً غنی کشمیری نے اہل ایران تک کو اپنا قائل کر لیا ..... کشمیری زبان کے اس وقت کوئی اپنے حروف تہجی نہیں لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ہاں حروف دوسری زبانوں سے تعداد میں زیادہ ہیں۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اس میں ۲۷ حروف علت ہیں (کسی کشمیری کو بولتے دیکھو۔ وہ اُ اِ اُکے کئی قسم کی شکلیں بناتا معلوم ہوتا ہے) کشمیری زبان شیریں ہے اس میں ضرب الامثال اور کہاوتیں بہت ہیں کشمیری زبان کے متعلق بہت سے نظریے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ سنسکرت سے نکلی ہے فارسی کے الفاظ کی بھی اس میں بہتات ہے ..... دوسرا نظریہ یہ ہے کہ کشمیری رشتا زبان کی ایک شاخ ہے اور بعض کہتے ہیں کہ سرحد کی دادری زبان اس کا ماخذ ہے ایک اور نظریہ ہے کہ کشمیری سریانی اور عبرانی سے تیار ہوئی ہے۔ ایک یہودی قوم ترکستان سے یہاں آ کر بسی۔ اُن کی زبان عبرانی تھی جو بگڑ کر کشمیری ہو گئی۔"

اس کے بعد آفات ارضی وسماوی کا ذکر ہے جو زلزلوں طغیانیوں اور برف باریوں کی صورت میں زمانہ قبل از تاریخ سے لے کر خود ہمارے زمانے تک اس جنت ارضی پر نازل ہوتی رہیں۔ قحط اور وبائیں ان کے علاوہ ہیں جو باشندوں کی توہم پرستی اور جہالت کا سہارا لے کر اس سرزمین میں خوب پھولتی پھلتی ہیں۔ اس سلسلے میں باشندوں کی توہم پرستی کی چند دلچسپ مثالیں دی گئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ

"ویری ناگ سے دس میل پر ایک چشمے کی بعض مچھلیاں یک چشم ہیں اور اُس کے قریب ایک غار اتنا لمبا ہے کہ کہا جاتا ہے کہ ایک مشہور بیراگی اور فلسفی اپنے بارہ سو چیلوں سمیت اُس میں گیا اور پھر نہ لوٹا۔ کلگام سے ۵ میل کے فاصلے پر ایک گاؤں میں ایک گول چٹان کا ٹکڑا ہے اس کا وزن ایک من کے قریب ہے اُسے گیارہ مولوی مل کر اپنی سب سے چھوٹی انگلی سے گیارہ گیارہ پکارتے ہوئے اوپر کو اٹھا لیتے ہیں۔ چودھویں صدی ہجری میں اسلام کیا ایسے ہی معجزوں کا نام ہے؟"

جغرافیائی و تمدنی معلومات کے اس سمندر کو کوزے میں بند کرنے کے بعد صاحب مضمون کشمیر اور اس کے باشندوں کی تاریخ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور کشمیر کی وجہ تسمیہ کی تحقیقات میں اُن تمام نیم مذہبی اور اعتقادی روایات کا جائزہ لیتے ہیں جن سے کشمیر کے جنم کی داستان وابستہ ہے اور پھر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ علم الارض کی رُو سے بھی یہ ثابت ہے کہ زمانہ قبل از تاریخ میں کشمیر کی وادی ایک جھیل تھی۔ چنانچہ اس وادی کی بلندیوں پر اس جھیل کی نباتاتی پیداوار کے پتھرائے ہوئے اجزا اب تک ملتے ہیں۔

تاریخ کشمیر لکھنے کی پہلی کوشش کا سراغ ہمیں ۱۱۴۸ء میں ملتا ہے جب راجہ ہرشہ کے وزیر زادے کلہن نے سنسکرت نظم میں راج ترنگنی (رود شاہاں) کے شاعرانہ نام سے کشمیر کی ایک مبسوط تاریخ لکھی۔ اس کے وہ حصے جو قدیم تاریخ سے تعلق رکھتے ہیں، مؤرخانہ صحت سے عاری ہیں، راج ترنگنی کے دو انگریزی ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ پہلا آرل سٹائن نے ۱۹۰۰ء میں کیا اور دوسرا مسٹر آر سی پنڈت نے ۱۹۳۵ء میں لیکن اس کا سب سے پہلا ترجمہ سلطان زین العابدین (۱۴۲۰ء تا ۱۴۷۰ء) نے فارسی میں کرایا جس کی تکمیل بعد میں اکبر کے حکم سے ملا عبدالقادر بدایونی نے ۱۵۹۴ء میں کی۔ کلہن نے اپنی تاریخ میں جو پہلا سنہ بیان کیا ہے وہ ۸۱۳ء ہے۔ اس تاریخ کی مدد سے ساتویں صدی عیسوی سے لے کر بارھویں صدی تک کے حالات کا ایک خاصہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس سے پہلے زمانے کے متعلق موٹی موٹی مسلمہ باتیں یہ ہیں کہ اشوک نے کشمیر کو فتح کر کے یہاں بدھ مت پھیلایا اور غالباً اسی کے ہاتھوں پرانے سری نگر کی بنیاد موجودہ شہر سے چار میل کے فاصلے پر پڑی اشوک کے بعد کنشک کے عہد میں بدھ مت کو یہاں پھر فروغ حاصل ہوا لیکن اس کے بعد آہستہ آہستہ اس پر برہمنیت غالب آتی گئی۔ شنکرا چاریہ کا موجودہ مندر جو کشمیر میں خالص ہندو دیت کی نشاۃ الثانیہ کا ایک سنگ میل ہے للتا دتیہ کے عہد میں ۷۰۰ء کے قریب تعمیر ہوا اور بعد میں سلطان زین العابدین نے اس پر چھت ڈلوائی۔ ۶۳۱ء میں مشہور چینی سیاح ہیوان سانگ نے کشمیر کی سیر کی۔ وہ یہاں کے پھولوں اور میووں اور یہاں کے باشندوں کے حسن، بزدلی اور دغابازی کا ذکر تفصیل سے کرتا ہے۔ اسلام کی آمد سے قبل کشمیر ما نہ

تاریخ میں جو ہندو بادشاہ گذرے، ان میں سے للتادتیہ (۶۹۷ء تا ۷۳۹ء) اور آونتی ورمن (۸۵۵ء تا ۸۸۳ء) بہت مشہور اور نیک نام ہیں۔ متقدم الذکر ایک فاتح اور موخر الذکر ایک منتظم تھا۔ محمود غزنوی نے ۱۰۱۵ء اور ۱۰۲۱ء میں کشمیر پر دو ناکام حملے کئے۔ ۱۰۳۱ء میں مشہور مورخ البیرونی یہاں آیا، اور اس نے اس ملک کی نسبت بعض دلچسپ اور مفید معلومات چھوڑی ہیں۔ علاوہ یہاں کے علم و فضل کا ذکر کرتا ہے اور سری نگر کو اس لحاظ سے بنارس کا ہم پلہ ٹھہراتا ہے۔

کشمیر میں مسلمانوں کا دور تقریباً پانچ صدیوں تک رہا۔ قطب الدین (۱۳۷۳ء تا ۱۳۹۴ء) کے عہد حکومت میں مشہور اسلامی مبلغ شاہ ہمدان ایران سے آیا اور اس کی تبلیغ و تعلیم سے کشمیر میں اسلام نے بہت ترقی کی۔ کشمیر کی تاریخ میں سکندر بت شکن (۱۳۹۰ء تا ۱۴۱۴ء) کے علاوہ اور کسی بادشاہ نے غیر مسلموں پر سختی نہیں کی۔ اس کے جانشین سلطان زین العابدین نے (۱۴۲۰ء سے ۱۴۷۰ء) ان سختیوں کا نہایت فراخ دلی سے ازالہ کر دیا۔ ہرگوپال کول اپنی تاریخ گلدستۂ تاریخ میں لکھتے ہیں کہ "سلطان زین العابدین نے یہ حکم دے دیا کہ ہندوؤں کو جو یہ شکایت ہے کہ سلطان سکندر کے عہد میں اس کے نومسلم وزیر سہابتہ کے ایما سے بعض ہندو بہ جبر مسلمان بنائے گئے تھے اس کا ازالہ اس طرح کیا جائے کہ جو شخص بھی دوبارہ ہندو ہونا چاہے وہ بخوشی ہو سکتا ہے اس طرح بعض کشمیری پنڈت دوبارہ ہندو ہو گئے۔ یہ پہلی شدھی تھی جو ایک انصاف پسند مسلمان حکمران کے عہد میں عمل میں آئی۔" اس بادشاہ کے عہد میں کشمیری صنعتوں کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ شال سازی اور ریشم سازی میں ترقی کے علاوہ اس کے حکم سے سمرقند سے پیپر ماشی۔ قالین بافی اور کاغذ سازی کی صنعتیں لاکر پہلی بار کشمیر میں رائج کی گئیں۔

اکبر کے عہد میں کشمیر سلطنت مغلیہ میں شامل ہو گیا۔ ہری پربت کا قلعہ جو ملک سے قحط اور بے کاری دور کرنے کے لئے سوا کروڑ روپے کی لاگت سے تعمیر ہوا، اور نسیم باغ اکبری عہد کی یادگاریں ہیں۔ جہانگیر نے تو گویا کشمیر کو ہندوستان کا گرمائی دار السلطنت بنا دیا۔ ویری ناگ کا باغ، شالامار، اچھابل۔ مانس بل کے کنارے کی بارہ دری اور نور جہاں کی پتھر مسجد اور متعدد سرائیں اسی دور میں تعمیر ہوئیں۔ چنار اور سفیدے کے حسین درخت بھی اسی عہد میں ترکستان سے یہاں لائے گئے۔ شاہجہان کے عہد میں انگور اور گلاب کی کاشت کو ترقی دی گئی اور پری محل، باغ فیض بخش، چشمہ شاہی۔ اور آصف جاہ کا تعمیر کردہ نشاط باغ عہد شاہجہانی سے منسوب ہیں۔ اورنگ زیب کے عہد میں جامع مسجد دوبارہ تعمیر ہوئی۔ اس زمانے میں برنیر کشمیر آیا اور اپنا دل یہیں چھوڑ گیا۔ وہ کشمیری صنعت اور مغلوں کی رعیت پرور پالیسی کا بہت مداح ہے۔ وہ یہاں کے گلزاروں، اور ان باغوں کی جن میں نہریں بہتی تھیں بہت تعریف کرتا ہے۔ اس نے ایک مشاعرے کا حال بھی لکھا ہے جس کا موضوع کشمیر کے قدرتی مناظر تھے، اور جس میں ہندی اور کشمیری شعرا نے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ وہ کشمیری عورتوں کے حسن و جمال کا بھی بہت مداح ہے۔

۱۷۵۲ء میں کشمیر کو احمد شاہ ابدالی نے تسخیر کر کے یہاں افغانی حکومت کی بنیاد رکھی لیکن پچاس ساٹھ سال ہی میں اہل کشمیر افغان فرمانرواؤں کی زیادتیوں سے ایسے تنگ آ گئے کہ انہوں نے ۱۸۱۹ء میں سکھوں کو کشمیر فتح کرنے کی دعوت دی۔ مگر یہ تبدیلی انہیں بہت مہنگی پڑی کیونکہ سکھوں نے افغانوں سے بھی زیادہ بدعنوانیاں کیں چنانچہ مذکور ہے کہ اگر کوئی سکھ کسی غیر سکھ کو ہلاک کر دیتا تو اسے صرف ۲۰ روپے تک جرمانے کی سزا ہوتی۔ جس میں سے مقتول کے وارثوں کو ہندو ہونے کی صورت میں چار روپے اور مسلمان ہونے کی صورت میں ۲ روپے خوں بہا دیا جاتا۔

۱۸۴۶ء میں موجودہ ڈوگرا حکومت کا دور شروع ہوا جب مہاراجہ گلاب سنگھ والیٔ جموں نے پچھتر لاکھ روپے کا نذرانہ دے کر کشمیر انگریزوں سے خرید لیا۔

۱۹۳۱ء میں پہلے پہل کشمیر کی رعایا میں زندگی کی ایک خفیف سی جنبش ہوئی۔ جب حکومت ہند نے ریاست میں بیرونی اقتدار کے خلاف بے چینی کو محسوس کیا اور ریاست کو مشورہ دیا کہ نظم و نسق میں ملکی عنصر زیادہ کیا جائے۔ اسی زمانے میں مسز بیسنٹ کی کوششوں سے سری نگر میں ایک کالج قائم ہوا۔ موجودہ حکمران مہاراجہ ہری سنگھ کے عہد میں "پشتینی باشندہ ریاست" کے معنی مقرر ہو کر ان کے حقوق کی نگہداشت پر کچھ توجہ کی گئی لیکن راجپوت امرا اور فوجی عناصر ریاست کے نظام پر بدستور غالب رہے۔ ۱۹۲۹ء میں سر ایلبن بینر جی وزیر اعظم نے رعایا کی بے بسی اور حکومت کی بے پروائی سے متاثر ہو کر استعفے دے دیا اور ایک تاریخی بیان جاری کیا جس میں کشمیری کسان اور صناع کی ابتر حالت اور اقتصادی بدحالی کا موجب نظام حکومت اور رائے عامہ کی عدم ترجمانی کو قرار دیا۔ اس بیان کا اثر یہ ہوا کہ سنہ ۳۰ء میں اکثریت کی اشک شوئی کے لئے ملازمتیں دینے

کا ایک بورڈ بنایا گیا۔ مگر اس سے کوئی خاص فائدہ نہ ہوا۔ ہندوستان کی تحریک سول نافرمانی کشمیر کے سیاسی حالات پر اثر انداز ہوئے بغیر نہ رہی اور ۱۹۳۱ء میں تحریک کشمیر نے جنم لیا۔ جو اگرچہ پہلے پہل ایک خالص اسلامی تحریک تھی لیکن بعد میں اس نے قومی رنگ اختیار کر لیا۔ ہزاروں لوگ جیل خانے چلے گئے۔ اور ملک بھر میں ایک آگ سی لگ گئی۔ آخر گلینسی کمیشن مقرر ہوا جس نے کچھ حقوق رعایا کو دلوائے اور ملک میں دستوری اصلاحات کے نفاذ کی سفارش کی۔ ان سفارشات پر عمل کرنے میں حکومت کی طرف سے تساہل ہوا تو ایجی ٹیشن زیادہ ہو گیا۔ اور شیر کشمیر محمد عبداللہ کی سیادت میں تحریک پھر زور شور سے جاری ہو گئی۔ ۱۹۳۴ء میں پرجا سبھا کے انتخابات ہوئے جن میں عوام کی پارٹی کو اکثریت حاصل ہوئی۔ ۱۹۳۹ء میں مسلم کانفرنس کو با ضابطہ طور پر نیشنل کانفرنس میں تبدیل کر دیا گیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی سری نگر میں مسلم لیگ کی بنیاد پڑ گئی جو مسلمانوں کے مخصوص مفاد کی حفاظت کرنا چاہتی ہے۔

اس ضمن میں اگر ایک نگاہ رعایا کی شکایات اور مطالبات پر ڈال لی جائے اور دوسری طرف حکومت کا زاویۂ نگاہ بھی معلوم کر لیا جائے تو کشمیر کی موجودہ سیاسی کشمکش کا ایک سرسری اندازہ ہو جائے گا۔ قوم پرستوں کا کہنا ہے کہ والیٔ ریاست کا ذاتی خرچ بہت زیادہ ہے۔ اصلاحات برائے نام ہیں۔ کیونکہ وزارت اسمبلی کے روبرو ذمہ دار نہیں ہے تعلیم کے اعداد و شمار اگرچہ روبہ ترقی ہیں، لیکن ناخواندگی میں کوئی کمی دکھائی نہیں دیتی۔ صناعوں کا حال خراب ہے۔ کسانوں کی حالت مالیئے کی زیادتی کے باعث ناگفتہ بہ ہے۔ چنانچہ ان کو قوت لایموت بھی میسّر نہیں۔ ایک صاحب نادر مرزا کا بیان ہے کہ میں نے علاقہ وچھن پارہ تحصیل اننت ناگ میں ایک زمیندار کو ماہ ساون ۱۹۹۳ میں دیکھا کہ اُس نے اپنی آٹھ برس کی لڑکی اور چھ برس کے لڑکے کی ٹانگیں رسی سے باندھ رکھی تھیں کہ کہیں اُس کے کھیت میں سے جو مالیہ کے لئے گرو تھا بھٹے توڑ کر نہ کھالیں۔ قوم پرست مطالبہ کرتے ہیں کہ ملک میں ذمہ وار طرز حکومت کو رائج کیا جائے وزرا اسمبلی کے سامنے جواب دہ ہوں۔ مہاراجہ کے مخصوص اختیارات کو چھوڑ کر باقی اختیارات عوام کے نمایندوں کو دے دیئے جائیں۔ انتخاب اور اقلیتوں کے تحفظ کا طریقہ کانگرسی اصولوں پر نافذ کیا جائے اور عوام کو ان کے بنیادی شہری حقوق فوراً دے دیئے جائیں۔

ان مطالبات کے جواب میں حکومت نے ستمبر ۱۹۳۹ء میں ایک بیان جاری کیا جس میں اُن برکات کو شمار کیا ہے جو موجودہ حکمران کے دور میں رعایا پر نازل ہوئیں۔ مثلاً ۱۹۳۳ء میں زمینداروں کو مالکانہ حقوق دیئے گئے اور رندسانہ بھی معاف کر دیا گیا۔ انتقال اراضی کا قانون نافذ کیا گیا بیگار ایک بڑی حد تک موقوف کر دی گئی۔ امداد باہمی کی انجمنیں اور پنچایتیں بنائی گئیں۔ ۴۲ دیہات میں ریڈیو کے سٹ مہیا کئے گئے۔ ریشم سازی اور قالین بافی کی صنعتوں کو سرکاری امداد حاصل ہوئی۔ ۱۹۲۹ء سے ایک سالانہ صنعتی نمائش بھی منعقد ہوتی ہے۔ جس سے صنعت کی ترقی مقصود ہے۔ ملازمتیں عام طور پر ملکیوں کے لئے مخصوص کی گئیں۔ پریس کو آزادی ملی۔ چنانچہ اس وقت ریاست میں ۳۰ اخبارات ہیں جن میں ایک اُردو روزانہ اخبار ہے۔ اسمبلی کے ۷۵ ارکان ہیں جن میں ۴۰ منتخب شدہ ہیں۔ تعلیم کی طرف ریاست کی خاص توجہ ہے۔ چنانچہ ملک میں اب ۱۵۰۰ تعلیمی ادارے ہیں۔ جن میں ۲ کالج، ۲۲ ہائی اسکول اور ایک ہزار کے قریب پرائمری مدارس ہیں۔ اگرچہ اس پر بھی خواندہ مردوں کی تعداد ۸ء۵ فیصدی اور عورتوں کی صرف ۵ء فیصدی ہے۔ اس کے مقابل خواندگی کی نسبت ٹراونکور میں ۹۸ء۲۳ ہے) دیہاتوں میں ۱۲۵ لائبریریاں کھول دی گئی ہیں اور بالغوں کی تعلیم کے بھی دو ہزار مرکز کام کر رہے ہیں۔ ریاست کا سالانہ تعلیمی خرچ ۲۲ لاکھ تک پہنچ گیا ہے جو کل آمدنی کا تقریباً ۹ فیصدی ہے۔ اس سلسلے میں یہ امر خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ واردھا اسکیم کے طرز پر نئی تعلیم کا ٹریننگ اسکول اور اس کے ساتھ ایک بنیادی اسکول جاری کر دیا گیا ہے، اور کشمیر ہی وہ ریاست ہے جس میں نئی تعلیم کا تجربہ سب سے پہلے کیا جا رہا ہے۔

مذکورہ بالا تقابل سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ کشمیر کے مسائل کم و بیش ہندوستان کے مسائل ہیں۔ ہندوستان کی تحریک آزادی نے کشمیر کے حالات پر کافی اثر کیا۔ اور از بسکہ کشمیر اپنی سیاسی پستی کے لحاظ سے اپنی مثال آپ تھا اس لئے گذشتہ بیس برس میں جو ذہنی انقلاب وہاں آیا ہے، وہ پستی کے اس گہرے پس منظر پر بہت نمایاں ہے۔ صاحب مضمون لکھتے ہیں کہ وہ پہلے پہل ۱۹۰۷ء میں کشمیر گئے اور اب پانچویں بار ۱۹۳۹ء میں۔ انہیں اب بھی کشمیریوں کی مادی حالت میں چنداں فرق محسوس نہیں ہوتا۔ لیکن ایک بات انہوں نے شدت سے محسوس کی اور وہ یہ کہ کشمیری عوام کی ذہنیت پہلے کی بہ نسبت بہت بلند ہو گئی ہے۔ اب وہ آپ سے خوفزدہ نہیں ہوتے بلکہ انسانوں کی طرح بات کرتے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں خودداری کی جھلک اور ان کے چہروں پر خود اعتمادی کی رونق نظر آتی ہے۔ اور یہ اُس ذہنی انقلاب کا کرشمہ ہے جو ایک مرد مجاہد اور اس کے رفقا کی شبانہ روز کوششوں اور مسلسل قربانیوں سے ظہور میں آیا۔ آخر میں میاں صاحب نے

کشمیر میں معاشری اصلاح اور استیصالِ جہالت کی سخت ضرورت کا ذکر کیا ہے اس بارے میں باشندوں کو خود اپنی مدد کرنی پڑے گی۔ بیماری اور جہالت کا دور کرنا بڑی حد تک تمدنی اداروں کا کام ہے۔ عیسائی مشنوں نے اس میدان میں خوب کام کیا ہے لیکن اہلِ خطہ نے ان کی مثال سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا۔ حال میں ایک یورپین خاتون مسز فولڈز نے جو تامدا دیوی کے نام سے معروف ہیں۔ مزدوروں کی بہتری کے لئے گلڈز سسٹم جاری کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس کا مقصد ہے کہ مزدوروں کی انجمنیں ان کی مصنوعات فروخت کریں اور انہیں مزدوری کے علاوہ منافع سے بھی حصہ دیں۔ اس سے نہ صرف مزدوروں کی مالی حالت کی بہتری بلکہ اُن میں خود اعتمادی اور خودداری پیدا کرنا بھی مقصود ہے۔ سنا ہے کہ حکومت نے تامدا دیوی کی اس اسکیم کو مدد دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

واقعات اور حقائق کے اس ٹھوس بیان کا خاتمہ، صاحبِ مضمون نے ایک لطیف کشمیری نظم پر کیا ہے جو حب الوطنی کے جذبات کی ترجمان ہے۔ ہم اس نظم کے چند اشعار اور اُن کا ترجمہ آپ کی ضیافتِ طبع کے لئے ذیل میں درج کئے دیتے ہیں۔ "مہجور کا شمیری اپنے وطن کی جنت ارضی کو انسانی ہاتھوں سے پامال دیکھ کر انسانی ہاتھوں ہی سے پھر اسے حقیقی جنت میں تبدیل کیا چاہتے ہیں:"

دلوہا باغوانو نوبہارک شان پیدا کر پھلن گل گتھ کرن بلبل تتھی سلمان پیدا کر

اے باغباں آ اور اک نئی بہار کی شان پیدا کر دے ایسے سامان پیدا کر کہ پھول کھل جائیں اور بلبلیں رقص کرنے لگیں

چمن ویراں رواں شبنم زتتھ جامہ پریشاں گل گلن تے بلبلن اندر دوبارہ جان پیدا کر

چمن ویراں ہے شبنم رو رہی ہے پھول کپڑے پھاڑ کر پریشان ہو رہے ہیں۔ سو پھولوں اور بلبلوں میں تو دوبارہ جان پیدا کر دے

کری کُس بلبلا آزاد پنجرس منز ژہ نالاں چھک ژہ پنے دستہ پنن مشکلن آسان پیدا کر

تجھے کون اے بلبل آزاد کرے گا تو جو پنجرے میں نالاں ہے تو اپنے ہی ہاتھ سے اپنی مشکلیں آسان کر

چھ باغس جانور بولاں مگر آواز چھک بیو بیو بہندس آلہ وس یارب اثر یکساں پیدا کر

باغ میں پرندے بولتے ہیں مگر اُن کی آوازیں الگ الگ ہیں اے خدا اُن کی آوازوں میں یکسانیت پیدا کر دے

اگر وزہ ناوہ ہن بستی گلن منز ترا و زیر و بم بنیل کر داو کڑکڑا یہ کر طوفان پیدا کر

اگر تجھے پھولوں کی بستی جگانی ہے تو زیر و بم اور ساز تار چھوڑ دے۔ اور زلزلہ اور سندر کی ہوا اور بجلی کی کڑک اور طوفان پیدا کر دے

صلاح الدین احمد

ادب لطیف سالنامہ ۱۹۴۷ء

مجھ کو آپ سے شکوہ ہے

(مجھے کچھ شکائتیں ہیں، پتہ نہیں کس سے، میں آج کچھ لکھ رہا ہوں معلوم نہیں کیا، کیوں۔؟ (سلام)

پہلے جب دل رکھ ہی لیا تھا آپ نے پھر دل کیوں توڑا؟
پہلے جب کچھ آس دلائی، آپ نے پھر منہ کیوں موڑا؟
مجھ کو آپ سے شکوہ ہے!
مجھ کو آپ سے شکوہ ہے۔

میں نے آپ کو خط بھیجا تھا آپ نے بھی زحمت کی تھی
میں نے بھی اپنا سمجھا تھا آپ نے بھی الفت کی تھی
آپ کا رنگیں خط آیا تھا میں نے بھی جرأت کی تھی
آپ نے میرا دل رکھا تھا میں نے بھی حسرت کی تھی
اب جب میرا دل مضطر ہے یہ مدہوشی کیا معنی؟
اب میرے ہر خط کے بدلے یہ خاموشی کیا معنی!
مجھ کو آپ سے شکوہ ہے۔
مجھ کو آپ سے شکوہ ہے۔

جون کی رومانی راتوں میں رنگیں نظمیں کہتا تھا۔
یعنی اپنی ہی باتوں میں کچھ کھویا سا رہتا تھا۔
ہاں، یاد آیا، آپ کو میں نے اپنا "نغمہ" بھیجا تھا،
آپ نے کچھ دن بعد اُسی کو اپنی دھن میں گایا تھا
"جب بھی دیکھو، کھوئے کھوئے پژمردہ سے رہتے ہو"
آپ نے پوچھا تھا "پھر کیسے ایسی نظمیں کہتے ہو!"
کچھ دن پہلے آپ مرے نغمات سے کھیلا کرتے تھے
بھولے سے اک شاعر کے جذبات سے کھیلا کرتے تھے۔
اب جب میں نے دُکھ میں رنگیں نظمیں کہنا چھوڑ دیا۔
بیکس کا دل رکھنا کیسا، آپ نے بھی دل توڑ دیا۔
مجھ کو آپ سے شکوہ ہے
مجھ کو آپ سے شکوہ ہے

میں بھی اک دولت والا ہوں آپ نے شاید سمجھا تھا
میں بھی نازوں کا پالا ہوں آپ کو شاید دھوکا تھا
اچھی صحت ہے، شاعر ہوں اور فسانے لکھتا ہوں
بیس برس کا ایک جواں ہوں شوخ طبیعت رکھتا ہوں۔
آپ نے یہ سب سمجھا مجھ کو اور مجھے مانوس کیا۔
اب جب میری حالت دیکھی دل توڑا مایوس کیا۔
مجھ کو آپ سے شکوہ ہے
مجھ کو آپ سے شکوہ ہے۔

دولت، ثروت، عزت سے تو الفت کو کچھ کام نہیں
الفت کی افسردہ راتیں شادی کے ایام نہیں
آپ کو دولت سے الفت ہے میں اس سے آگاہ نہیں
آپ کو غربت سے نفرت ہے خیر، مجھے پرواہ نہیں۔
آپ یونہی سرگرم خوشی ہوں اور طبیعت شاد رہے
اچھا اب خاموش ہوں، چپ ہوں، لیکن اتنا یاد رہے
مجھ کو آپ سے شکوہ ہے
مجھ کو آپ سے شکوہ ہے

سلام مچھلی شہری

اس نظم سے ہندوستان کے نوجوانوں کی زندگی کے ایک ایسے پہلو پر روشنی پڑتی ہے جس کی تلخی اگر جلد ہی بڑے بوڑھوں اور ہمدردان ملک کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکی تو اس کا نتیجہ ہندوستان ہی کے حق میں برا ہوگا۔ تہذیب وتمدن کی الجھنوں کے بارگراں کے وزن سے ہمیشہ جنسی طور پر ایک بے اطمینانی پیدا ہو جایا کرتی ہے لیکن ہندوستان ایسے ملک میں جہاں مغربی اثرات کے باعث جوانی کو بھڑکانے کے سامان تو مہیا کئے جا رہے ہیں لیکن سماج میں اس کی تسکین کے طریقوں کی طرف توجہ نہیں دی جا رہی، یہ بے اطمینانی اور الجھن اور بھی شدت سے محسوس ہو رہی ہے لیکن اس کا احساس کسے ہے؟ صرف ان جوانان وطن کو جن کی زندگی میں ایسے رومان آتے ہیں جو موجودہ حالات کے ماتحت بہت کوشش ہی بنا سکتے ہیں یہ حقیقت بہت ہی افسوسناک ہے۔ سماج کے اس پہلو کی طرف کوئی بھی توجہ نہیں دے رہا اور اس سلسلے میں جو بھی قدم اٹھایا گیا ہے وہ جوانوں کی زبردستی اور بڑے بوڑھوں کی مجبوری ہی کی وجہ سے اٹھایا گیا ہے۔ اس وقت ہمارے بڑے بوڑھے لڑکوں کو نئی تعلیم دلا کر ان کے دلوں میں آزاد اور بہتر زندگی کی تمنا کو پیدا کر رہے ہیں لیکن اس کے لئے صحیح حالات نہیں پیدا کر رہے اور اس پر ستم یہ ہے کہ وہ لڑکیوں کو سطحی مغربی تعلیم کے بنجر میں چلنے پر تو اکسا رہے ہیں لیکن حالات کے لحاظ سے ان کی ذہنی تربیت کی طرف بہت کم توجہ دے رہے ہیں۔ اور ان سب باتوں کا نتیجہ جناب رشید احمد صدیقی کے الفاظ میں جیل خانے اور شفاخانے کی رونق بڑھاتا ہے۔ اگرچہ اس سلسلے میں سدھار کے لئے باقاعدہ جہاد کی ضرورت ہے لیکن اس جہاد کے لئے دلائل کے لحاظ سے یہ نظم ایک اچھی مثال ہے۔

میراجی

نقد و نظر

ارمغان جذب سوا سو صفحے کی یہ کتاب جناب راگھوندر راؤ جذبؔ کی رباعیات کا دوسرا حصّہ ہے۔ جسے ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن نے جناب ماہرالقادری کے دیباچے کے ساتھ شائع کیا ہے۔

ان رباعیات کا موضوع اخلاق و نصیحت ہے۔ ان میں سنسکرت کی قدیم ناصحانہ شاعری اور سعدی کے اخلاقی کلام کی جھلک قدم قدم پر نظر آتی ہے۔ اور اس لئے یہ کتاب سکولوں کے طلبا کے لئے رباعیات کا ایک اچھا مجموعہ کہی جا سکتی ہے۔ قیمت بارہ آنے ۱۲ر

پستالوزی آج سے سو سال پیشتر کے یورپ میں ایک ایسا شخص پیدا ہوا جس نے مغرب کی ذہنی ترقّی کے سلسلے میں ایسا نمایاں کام کیا جو ہر ملک کے افراد کے لئے قابلِ رشک و تقلید ہے۔ اُس زمانے میں یورپ کو جن مسائلِ حیات کا سامنا تھا، پستالوزی نے اُن تمام پر روشنی ڈالی لیکن اس کے خیالات صرف پہلے مسائل کا حل ہی نہ تھے بلکہ چند اور مسائل کے سمجھانے کا باعث بھی ہوئے جن کے بارے میں اُس وقت کے ماہرینِ تعلیم و تمدّن نے غور و تفکر شروع کیا۔ تعلیم و تمدن کے متعلق پستالوزی نے جو بنیادی اصول پیش کئے تھے اُن کو گذشتہ سو سال کے فکر کے بعد تسلیم کیا جا رہا ہے اور یوں موجودہ زمانے کے اصول و قوانینِ تہذیب و تعلیم بھی گویا اُسی شخصیت کے اثر کا کرشمہ ہیں۔

جناب ڈاکٹر عبدالحمید زبیری بی اے (جامعہ) ایم اے پی ایچ ڈی نے دو سو سولہ صفحے کی اس کتاب میں اس مغربی مفکّر کی شخصیت، سوانح حیات اور فلسفۂ تمدن، فلسفۂ مذہب اور فلسفۂ تعلیم کے متعلق اُس کے خیالات کا قابلِ قدر جائزہ لیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے قول کے مطابق اس وقت ہندوستان کا ماحول بھی اُنہی خصوصیات کا حامل ہے جن میں پستالوزی کی شخصیت پیدا ہوئی۔ اسی لئے اُس کے خیالات اور حالات کا مطالعہ ہمارے لئے بے حد مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر موصوف کا اندازِ بیان واضح اور صاف ہے۔ اور اُنہوں نے یہ کتاب تالیف کر کے ہندوستان کی تعلیمی اور تمدنی ترقی کے سلسلے میں ایک مستحسن قدم اُٹھایا ہے۔ ہمارے معلمین کو خصوصاً اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیئے لکھائی چھپائی بہت خوب۔ کتاب مجلد ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ نئی دہلی۔

خمسۂ کیفی یہ کتاب ملک کے مشہور ادیب جناب پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی کے تین مضامین اور دو نظموں کا مجموعہ ہے۔ دو مضمون براہِ راست زبانِ اُردو سے متعلق ہیں۔ (۱) اُردو ہماری زبان اور (۲) اُردو لسانیات، ایک مضمون ہندو مسلمانوں کے کلچرل تعلقات پر ہے۔ اور دو نظموں کے عنوان ہماری زبان اور ترقّیِ اُردو۔

شگفتگی، سلاست معلومات اور علمی گہرائی، یہ تمام خصوصیات علامہ کیفی کی تحریر کی خصوصیات ہیں اور ان مقالوں میں سے ہر ایک ان کا حامل نظر آتا ہے۔ ادبی دنیا کے پڑھنے والے بھی اس مجموعے کو حاصل کر کے خوش ہوں گے کہ اُنہوں نے جن مضامین کو ادبی دنیا یا اور رسائل میں علیحدہ علیحدہ پڑھا تھا۔ وہ اب پائیدار صورت میں یک جا مل سکتے ہیں۔ قیمت چار آنے حجم ۷۰ صفحات۔ ملنے کا پتہ:۔ انجمن ترقّیِ اردو (ہند) نئی دہلی

دو ڈاکٹر اسّی صفحات کی یہ مختصر کتاب سندباد جہازی یعنی جناب چراغ حسن حسرت کاشمیری کے دو سیرتی انگاروں پر مشتمل ہے جسے اُردو اکیڈیمی پنجاب لاہور نے شائع کیا ہے اور جو اُن سے ۸ر میں مل سکتی ہے۔

حسرت (سندباد جہازی) کی طنز نگاری اُردو خواں طبقے میں جس قدر مقبول ہے اس کا اظہار غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ مضامین اُن کی مذاح نگاری کے ایک خاص پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں۔ دیباچے میں جناب کرشن چندر ایم اے لکھتے ہیں۔ "مغرب میں سوانح نگاری ایک مستقل فن کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ لیکن اردو ادب نے اس سلسلے میں ابتدائی مدارج بھی طے نہیں کئے۔ ہمارے ہاں . . . . سوانح نگار جس شخص کے حالات لکھنے بیٹھتا ہے یا تو اُسے تمام غلطیوں اور

برائیوں سے پاک اور مبرا ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے یا اس کی تمام
خوبیوں پر یکسر سیاہی پھیر دیتا ہے۔ ...... مغرب کے موجودہ دور کے
سوانح نگاروں کی سیرت نگاری اور کردار نگاری کا کمال یہ ہے کہ ان کے
لکھے ہوئے سوانح حیات میں ایک بڑا سیاست دان، سپاہی، ادیب
یا فلسفی ایک انسان نظر آتا ہے۔ خوبیوں اور برائیوں کا مجموعہ ....
اگر آپ حسرت صاحب کی سوانح نگاری کو اس اصول پر پرکھیں گے تو
آپ کو معلوم ہوگا کہ پنجاب کے ان دو لیڈروں (ڈاکٹر ستیہ پال اور ڈاکٹر
محمد عالم) کے سوانحی حالات لکھنے میں ان کا مقصد ...... صرف اتنا ہے
کہ صحیح قسم کی سوانح نگاری کو فروغ حاصل ہو ...... یہ دو مضامین دو انسانوں
کے جیتے جاگتے مرقعے ہیں۔ ان میں زندگی کی لہر ہے۔ کشمکش اور اضطرار
دقیق سیاسی رموز مزاح کے لطیف پیرائے میں کچھ اس طرح بیان کئے
گئے ہیں کہ انہیں بار بار پڑھنے میں ایک نیا لطف حاصل ہوتا ہے۔"

ہمیں جناب کرشن چندر سے پورا اتفاق ہے۔

البتہ ایک افسوس ہے کہ اتنی اچھی کتاب میں کتابت کی بہت
سی غلطیاں رہ گئی ہیں۔

سائنس کے کرشمے

اس کتاب کو جناب میر حسن ایم اے نے مرتب کیا ہے اور اس کا دیباچہ اردو کے
مشہور نقاد جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے لکھا ہے۔
ایک سو بارہ صفحے کے اس مجموعے میں مختلف حضرات کے مندرجۂ ذیل
مضامین شامل ہیں۔

۱ ہوا۔ ۲ پانی۔ ۳۔ بجلی۔ ۴۔ ہوا بازی ۵۔ ٹیلی وژن ۶۔
کیمیائی جنگ اور۔ ۷۔ ربڑ

ان مضامین سے پہلے جناب مرتب نے ایک وضاحتی مضمون
"سائنس کیا ہے" کے عنوان سے لکھا ہے۔

یہ مجموعہ بھی طلباء کے لئے ایک اچھی چیز ہے۔

ملنے کا پتہ :۔ سب رس کتاب گھر۔ خیریت آباد حیدرآباد دکن۔

قیمتی باتیں

جناب فیض لدھیانوی نے بچوں کے پند و نصائح کا یہ دلکش منظوم مجموعہ مثنوی کے طور پر مرتب کیا ہے
اس کی زبان عام فہم اور سلیس اور بچوں کے لئے ازبس موزوں ہے۔
پند و نصائح کو منظوم صورت میں پیش کر کے بچوں کو خشک باتوں کی طرف
آسانی سے توجہ دلائی جا سکتی ہے۔ اس لئے ہمارے خیال میں یہ مجموعہ
سکولوں کے لئے بھی ایک مفید چیز ہو سکتا ہے قیمت ۲ر ملنے کا پتہ
ماسٹر فیض لدھیانوی۔ اسلامیہ ہائی سکول شیراں والا دروازہ۔ لاہور

مطالعۂ حافظ

شاید آپ نے بڑی بوڑھیوں کی نسبت یہ سنا ہوگا کہ وہ نوجوانوں کو دیوان حافظ کے مطالعہ سے روکتی ہیں اور
دلیل یہ کہ اس کے پڑھنے سے یا تو انسان ولی بن جاتا ہے یا مجنون۔ اب آپ
جناب محمد احتشام الدین حقی دہلوی کے نتائج تحقیق کو بھی دیکھئے جو انہوں نے
"مطالعۂ حافظ ـــــ اور اس سے کیا مستنبط ہوتا ہے" کے عنوان سے
اردو خواں طبقے کے سامنے پیش کئے ہیں۔ جناب حقی دہلوی اس کام کے لئے
موزوں بھی تھے کہ انہوں نے اس سے پیشتر دیوان حافظ کی چھ سو غزلوں کا
ہم قافیہ اور ہم آہنگ منظوم ترجمہ بھی کیا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس
ترجمے کے دوران میں ان پر حافظ کے اصلی مفہوم و معانی کے اسرار منکشف
ہوئے ہیں۔ اور چونکہ انہیں خود اس قدر گہرائی کے ساتھ دیوان کے مطالعہ کا
موقعہ ملا ہے اس لئے انہوں نے اس مطالعے کے نتائج کو اب کتابی صورت
میں اوروں تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔

فارسی کے مشہور شعراء میں سے خیام ہی ایک ایسا شاعر ہے جس
کے کلام اور شخصیت میں مغربیوں کو دلچسپی پیدا ہوئی۔ اور انہوں نے اس
کے متعلق جو کچھ تحقیق کی وہ ہم مغرب زدوں تک پہنچی۔ ہم نے اپنے طور پر اس
تک پہنچنے کی اس وقت کوشش کی جب مغرب والوں نے ہمیں سمجھایا کہ
تمہارے ہی برّاعظم میں ایک قابل قدر شاعر خیام بھی ہے لیکن حافظ کے
متعلق انگریزی نقاد ذرا پیچھے رہے۔ اس لئے اس کے متعلق مغربی ماخذ کی
تشنگی کی وجہ سے ہمیں خود حافظ کے متعلق کچھ نہ معلوم ہو سکا۔ جس کا ایک
ثبوت اس ریویو کے پہلے فقرے سے ظاہر ہے کہ بڑی بوڑھیوں میں کس
قسم کے توہم پرستانہ خیالات بار پا گئے حالانکہ ہمارے خیال میں کلام حافظ
ایک انسان کو صحیح طور پر ہوش مند بنا سکتا ہے۔

کلام حافظ کے سمجھنے میں بڑی دقت اس وجہ سے بھی ہو سکتی ہے
کہ اس کی زبان "بادہ و ساغر" کی زبان ہے۔ اور اصل مفہوم کا علیحدہ کرنا مشکل
کیونکہ کہیں تو "بادہ و ساغر" محض "بادہ و ساغر" ہی ہوتے ہیں۔ اور کہیں "مشاہدۂ
حق کی گفتگو کا پردہ"۔ "مطالعۂ حافظ" کے محقق نے الجھن کو دور کرنے کی ایک اچھی
کوشش کی ہے۔ نیز کلام حافظ ہی سے سوانح حافظ پر بھی روشنی ڈالی
ہے۔ بڑا سائز حجم ۱۶۰ صفحے۔ قیمت ایک روپیہ چار آنہ۔

ملنے کا پتہ :۔ کتب خانہ علم و ادب دہلی

مسولینی کی آپ بیتی

مترجمہ سید بادشاہ حسین حیدرآبادی۔
ناشر۔ ادارہ اشاعت اردو حیدرآباد دکن۔

حجم ۲۵۵ صفحے قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ۔ لکھائی چھپائی صاف اور اچھی۔

اگرچہ اُردو میں ابھی طبعزاد سوانح نگاری کا میدان شہسواروں کے لئے بیشتر خالی پڑا ہے لیکن گذشتہ چند سالوں میں مغربی سوانح عمریوں کے ترجمے جس کثرت سے ہماری زبان میں آرہے ہیں اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ موجودہ مغربی سیاسیات کی دلچسپی سوانح نگاری میں بھی لوگوں کے اشتیاق کو اس قدر پائدار بنا دے گی کہ جب ترجموں کا دور گذر جائے گا۔ تو ہمارے مصنفین طبعزاد سوانح نگاری کی طرف بھی اُس اشتیاق کے تقاضے سے مجبور ہو کر متوجہ ہوں گے۔ چونکہ مغربی سیاسیات کی دلچسپی ہی سوانح نگاری کی طرف توجہ کا باعث ہوئی ہے اس لئے زیادہ تر سیاسی مشاہیر کی سوانح عمریاں ہی ترجمہ کی جا رہی ہیں۔ اس سے پیشتر کمال اتاترک، ابن سعود، رضا شاہ پہلوی، ہٹلر وغیرہ وغیرہ حضرات کے حالات اُردو پبلک کے سامنے آچکے ہیں اور اب سید بادشاہ حسین صاحب کا شکریہ کہ انہوں نے مسولینی کی آپ بیتی کا ترجمہ کر کے ملک کی ایک مانگ کو پورا کیا ہے۔ اگرچہ مسولینی فاشیت کا علمبردار ہے اور ہٹلر "نازیت" کا، اور ہندوستان کو اشتراکی جمہوریت سے زیادہ دلچسپی ہے لیکن یہ دلچسپی بہت حد تک سطحی بھی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مغرب کی تمام سیاسی تحریکوں کا بغور مطالعہ کیا جائے۔ اُردو پبلک اس سے پہلے ہٹلر کی آپ بیتی کے ذریعے سے نازیت کا مطالعہ کر چکی ہے اور اب وہ مسولینی کی آپ بیتی کے ذریعے فاشیت کا مطالعہ کر کے دوسرے فائدوں کے علاوہ اس کا فیصلہ بھی کر سکتی ہے کہ کیا علامہ اقبال فاشیت کے حامی تھے یا نہیں۔

مغربی تصانیف کے اُردو تراجم

جناب میر حسن ایم اے۔ نے اس اہم موضوع کی طرف توجہ کی ہے۔ اُردو ادب کے ابتدائی دور ہی سے مغربی تصانیف کے تراجم ہمارے ادب کا ایک نمایاں حصہ بن گئے تھے۔ لیکن شروع شروع میں صرف چند درسی کتابیں اور عام پسند ناول ہی توجہ کا مرکز بنے رہے۔ رفتہ رفتہ مغربی ادب کے ہر شعبے کی طرف اُردو کے مترجمین نے رجوع کرنا شروع کیا۔ اور رسائل کی قبولیت اور بھرمار کے ساتھ تو مغرب کے ادب کی بہت سی اچھی چیزیں اُردو میں منتقل ہونے لگیں۔ موجودہ کتاب کے مؤلف نے ایسی تمام انفرادی اور اجتماعی کوششوں کا چھچھلتا سا جائزہ لیا ہے۔ اور تراجم کی اس کارگذاری کے مختلف دَور بتائے ہیں مثلاً ۱۸۰۰ء سے ۱۸۴۲ء تک قدیم ترین تراجم کا دور، اس کے بعد دوسرا دور ۱۸۴۲ء سے ۱۸۷۷ء تک، اس کے بعد ۱۸۷۷ء سے ۱۹۱۷ء تک کے ترجمے۔ اور آخر میں عہد حاضر یعنی ۱۹۱۷ء کے بعد کے تراجم۔

اگرچہ قدیم دور میں مؤلف کی تحقیق کافی حد تک اچھی ہے اور انہوں نے فورٹ ولیم کالج، دہلی کالج، سائنٹیفک سوسائٹی، سررشتۂ علوم و فنون اور سلسلۂ آصفیہ حیدر آباد و انجمن ترقی اُردو، دارالمصنفین اعظم گڈھ۔ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ، ہندوستانی اکیڈیمی اور اُردو اکیڈیمی کی کارگذاریوں کے ساتھ ساتھ ہر دور کی انفرادی کوششوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ لیکن انفرادی کوششوں کے باب میں اُن کی تحقیق مکمل نہیں رہی۔ خصوصاً عہد حاضر میں اُن کی نظر صرف حیدر آبادی حضرات کے دائرے تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ نیز انہوں نے رسائل کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی۔ ورنہ انہیں معلوم ہو سکتا تھا کہ تراجم کے سلسلہ میں وسط ہند اور خصوصاً پنجاب نے حیدر آباد کی بہ نسبت کچھ کم کام نہیں کیا۔ اُمید ہے کہ وہ آئندہ ایڈیشن میں اس کمی کو دور کرنے کی کوشش کریں گے۔

حجم ۲۱۵ صفحات۔ لکھائی چھپائی اچھی۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے عمر
ملنے کا پتہ:۔ دفتر ادارۂ ادبیات اردو۔ رفعت منزل۔ خیریت آباد (حیدر آباد دکن)

یادِ چکبست

۱۲ فروری ۱۹۳۹ء کو لکھنؤ میں یوم چکبست منانے کے لئے اُردو زبان کے شعراء اور نقاد جمع ہوئے۔ یہ کتاب اسی اجتماع کی یادگار ہے۔ تقریباً پونے دو سو صفحات میں چکبست کی شخصیت اور شاعری کے متعلق مختلف مضامین کے علاوہ اس میں مذکورہ بالا یوم چکبست کے مشاعرے کی تمام غزلیات بھی آخر میں دی گئی ہیں۔ مضامین میں تنوع ہے اور اُن سے جہاں چکبست پر روشنی پڑتی ہے وہیں مضمون نگاروں کے مختلف انداز بیان کا بھی اچھا اندازہ ہو سکتا ہے۔ چند عنوان دیکھئے۔ ۱۔ چکبست ایک شاعر کی حیثیت سے ۲۔ چکبست کی شاعری۔ ۳۔ پنڈت برج نرائن چکبست۔ ۴۔ چکبست کی انفرادیت۔ ۵۔ چکبست بہ حیثیت مصلح وطن پرست۔ ۶۔ چکبست کے کلام پر ایک سرسری نظر، چکبست پیامبر دور جدید۔ ۸۔ ادب اُردو اور چکبست۔ ان مضامین کے لکھنے والوں میں ذیل کے ادیب اور نقاد شامل ہیں:۔

ڈاکٹر عبدالحق۔ نیاز فتحپوری۔ مرزا جعفر علی خاں اثر۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی۔ ڈاکٹر تاراچند۔ سید سجاد حیدر یلدرم۔ حکیم آشفتہ لکھنوی۔

دیانرائن نگم۔ سید احتشام حسین رضوی۔

شروع میں جناب برج کرشن ٹوبہ دجج عدالت خفیفہ لکھنؤ اور آنریری سکریٹری چک لبست میموریل فنڈ کے قلم سے عرضِ حال ہے۔ اور اس کے بعد رائٹ آنریبل ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو کے قلم سے ایک مختصر تعارف۔ ڈاکٹر موصوف ہی اس انجمن کے صدر تھے۔

یہ مجموعہ چک لبست کے قدردانوں کو خصوصاً اور اُردو ادب کے طلباء کو عموماً حاصل کرنا چاہئے۔

کتابت اور طباعت کے حُسن کے لئے انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد کا نام ایک ضمانت ہے۔ کتاب مجلّد ہے اور اس پر ایک گردپوش لپٹا ہوا ہے۔ حجم ۱۷ صفحات۔ ملنے کا پتہ۔ انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد۔

میراجی

معذرت ۔ ہمارے انگریزی پریس میں آتشزدگی کے حادثے کی وجہ سے پرچہ ایک ہفتہ دیر سے شائع ہو رہا ہے کیونکہ سہ رنگی تصاویر آرٹ کے اشتہار دوبارہ چھپوانے پڑے ہیں ۔ مینجر

(اس شمارے کے تمام مضامین نظم و نثر کے حقوق محفوظ ہیں)

ڈاک کے ڈاکو ہر ماہ ہمیں خریداروں کی طرف سے شکایتیں موصول ہوتی ہیں کہ انہیں پرچہ نہیں ملا اور سینکڑوں خریدار ایسے بھی ہیں جو شکایت نہیں کرتے لیکن یہ فرض کر لیتے ہیں کہ پرچہ دفتر نے نہیں بھیجا۔ حالانکہ چھاپنا اور پھر خریدار کو نہ بھیجنا، بالکل پن اور تجارتی خودکشی سے کم نہیں۔ ادبی دنیا ہر ماہ کی ۲۰ تاریخ تک شائع ہو جاتا ہے اگر ۲۵ تک آپ کو پرچہ نہ ملے تو سمجھ لیجئے کہ کسی ڈاک کے ڈاکو کی نذر ہوا۔ بس ایک شکایتی کارڈ اپنے حلقے کے سپرنٹنڈنٹ پوسٹ آفس کو لکھئے اور ایک کارڈ ہمیں لکھئے تاکہ آپ کو پرچہ دوبارہ بھیجا جائے اور محکمہ ڈاک کے دروازے پر ایک اور دستک دی جائے۔ — مینیجر

فہرست مضامین ادبی دنیا لاہور

بابت ماہ اپریل سنہ ۱۹۴۰ء

جلد ۱۸ تصاویر:- ۱- جل پریوں کی بستی - ۲- بڑے بوڑھے - ۳- بچے بالے **نمبر ۴**

چندہ سالانہ مع محصول ڈاک اور وی پی پانچ روپے ممالک غیر سے دس شلنگ

گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام صلاح الدین احمد پرنٹر و پبلشر چھپ کر دفتر ادبی دنیا [illegible] مال لاہور سے شائع ہوا۔

دُنیائے کاروبار

چائے بنانے کے مختلف طریقے

یہ بڑے مزے کی بات ہے کہ الگ الگ ملکوں میں جہاں کی تہذیب و معاشرت جداگانہ ہے وہاں چائے بنانے کے طریقے بھی نرالے ہیں یہ طریقے عام طریقوں سے بہت ہی مختلف ہیں۔ عموماً لوگ چائے کو دودھ اور شکر کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ بہت سے لوگ دودھ اور شکر کے بغیر پیتے ہیں۔

بوہیمین۔ مگیار۔ ہنگرین چیکس اور وسط یورپ کے لوگ عام طریقے سے چائے میں رم (ایک قسم کی شراب) ملا کر پیتے ہیں۔ تبت کے باشندے جو کہ بہت پرانی چائے پینے والی قوم ہے اسے مکھن اور نمک کے ساتھ جوش دیتے ہیں۔ برما کے بعض علاقوں میں معلوم ہوا ہے کہ دولہا دلہن شادی کے موقع پر ایک ہی پیالی سے ایسی چائے پیتے ہیں۔ جن کی پتیاں تیل ملی ہوئی ہوتی ہیں۔ اُن کا اعتقاد ہے کہ اس سے دولہا دولہن میں میل ہوتا ہے۔ سیام کے لوگ چائے کو "میانگ" کہتے ہیں اور اُس کی پتیاں نمک اور مصالحہ ملا کر چباتے ہیں۔ کشمیر میں پھینٹی ہوئی تلخ چائے کچھ سرخ سجی سونف اور نمک ملا کر پینا پسند کرتے ہیں۔ ترکستان میں اُبلتی ہوئی سیاہ چائے میں ملائی ملاتے ہیں اور روٹیوں کے ٹکڑے بھگو کر استعمال کرتے ہیں۔ الجیریا کے لوگ چائے میں پودینہ اور شکر ڈالتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ عرب کے لوگ ایک چٹکی چائے اور ایک چٹکی شکر ملا کر ایک برتن میں ڈال دیتے ہیں اور اُس میں پانی ڈال کر ایک ساتھ اُبال لیتے ہیں۔

آسٹریلیا کے لوگ جنہوں نے اور قوموں کے بعد ہی چائے کا استعمال شروع کیا ہے۔ بڑی کڑی چائے بناتے ہیں اور اُسے 'بیلی' چائے کہتے ہیں کسانوں کی بڑی مرغوب چیز ہے۔ ایک ٹین جسے بیلی کہتے ہیں آگ پر چڑھا دیا جاتا ہے۔ اور اُس میں بہت سی چائے ڈال کر جوش دیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ہز رائل ہائینس ڈیوک آف گلاسٹر جب آسٹریلیا تشریف لے گئے تھے تو اس قسم کی چائے خود بنا کر نوش کی تھی۔

تبت میں نوروز کے موقع پر چائے کا پینا بہت ہی ضروری رسم ہے۔ ملک کے تمام دینی اور دنیوی پیشوا دلائی لاما کی سرداری میں اس رسم میں حصہ لیتے ہیں ایک ہیں جیسے برٹش سیاسی وفد نے جولاسا کو گئی تھی لکھا تھا اور اسٹیٹسمین کی یکشنبہ کی اشاعت میں شائع ہوا تھا اس رسم کو نہایت وضاحت سے دکھایا گیا ہے کہ کس طرح دلائی لاما اپنے تخت کے قریب جا کر نوروز کے رسومات ادا کرتا ہے۔

"وہ پہلے اپنی ٹوپی اُتار کر تخت کے سامنے تین مرتبہ جھکتا ہے اور رومال پیش کرتا ہے۔ اُس کے بعد دلائی لاما کے لئے سونے کی چائے پوچی میں اور دیگر شرکاء کے لئے چاندی کی چائے پوچی میں چائے لائی جاتی ہے ہر شخص اپنا لکڑی کا پیالہ نکالتا ہے اور چائے پینا شروع کرتا ہے۔ دلائی لاما کی چائے ایک خاص لاما چکھ لیتا ہے تاکہ زہر کا اندیشہ نہ رہے۔"

سن لائف انشورنس کمپنی آف کینیڈا

اس عظیم الشان کمپنی کے پالیسی ہولڈروں کی تعداد ایک کروڑ سے زیادہ ہے اور اس کی شاخیں دنیا بھر میں پھیلی ہوئی ہیں۔

مسٹر آرتھر جی وُڈ نے اپنی سالانہ تقریر میں ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے جس میں اُنہوں نے کمپنی کے عرصہ زیر نظر کے عالی شان کام کے اعداد و شمار کو سادہ زبان میں پیش کرتے ہوئے انسانی زندگی میں بیمے کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ اور بیمے کی موجودہ شکل و صورت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ بیمہ محض خاص وقتی امداد بہم پہنچانے کے علاوہ کچھ اور اہمیت بھی رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر اس کمپنی کے ۱۹۱۲ء کے اعداد و شمار موجودہ اعداد و شمار کا صرف ۲ فیصدی تھے کم و بیش ۱۸ ہزار لوگوں کو سالانہ رقوم دی گئی تھیں ان میں سے ۹۰۰۰ بوڑھے تھے۔

عرصہ زیر نظر میں کمپنی نے ۵۳۰۰۰ ہزار نئے پالیسی ہولڈر حاصل کئے اور تقریباً بائیس ہزار سابقہ بیمہ شدہ لوگوں نے اپنا زر بیمہ بڑھا دیا۔ اور اس وقت کم و بیش تین لاکھ تیرہ ہزار ان کارکنوں کی حفاظت سن لائف کے ذریعے ہو رہی ہے جو مختلف صنعتی اداروں میں کام کر رہے ہیں۔ گذشتہ جنگ کے مقابلے میں کلیمز غالباً کم ہوں گے۔ ۱۹۱۹ء کے مقابلے میں اس وقت بزنس تین گنا زائد ہے۔ کینیڈا میں کام اس وقت بہت زیادہ ہو رہا ہے۔

عرصہ زیر نظر میں پریمیم کی تعداد ۱۱۴۰۰۰۰۰ ڈالر ہے جو سال گذشتہ سے زائد ہے۔ جملہ اعداد و شمار کے مطالعے سے کمپنی کے عظیم الشان کارنامے کی تعریف کرنی پڑتی ہے

بزمِ ادب

پچھلے مہینے آغا شاعر قزلباش دہلوی اور پروفیسر اکبر حیدری اس جہانِ فانی سے رخصت ہوگئے۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔ آغا شاعر سن رسیدہ تھے لیکن اکبر حیدری ابھی زندگی کی درمیانی منزلیں طے کر رہے تھے۔ اردو ادب اور شاعری کو ان دونوں صاحبوں کی موت سے کافی نقصان پہنچا ہے۔ آغا شاعر، شاعری کے پرانے سکول کے نام لیوا تھے اور ان کی زبان اور روزمرہ کی صفائی اور برجستگی ایک خاص امتیاز کی مالک تھی۔ اشعار کے ایک گراں پایہ ذخیرے کے علاوہ قرآن مجید کا منظوم و با محاورہ ترجمہ اُن کی بہترین یادگاروں میں سے ہے۔

اکبر حیدری اپنی شاعری کی بعض اندرونی خصوصیات کے لحاظ سے ایک جدید شاعر تھے، اُن کی شاعری غالباً اس لئے کچھ زیادہ شہرت پذیر نہیں ہوئی کہ انہوں نے بعض دیگر شعراء کی طرح اسے ایک ہنگامہ نہیں بنایا۔

ہمیں ان دونوں صاحبوں کے اعزہ و احباب سے دلی ہمدردی ہے۔

اس اشاعت کے افسانوں میں عاشق حسین صاحب بٹالوی کا افسانہ "زندگی کی صبح" اور احمد ندیم صاحب قاسمی کا "انصاف" طبعزاد کہانیاں ہیں۔ عاشق صاحب کا دامن سیاسیات کے خارزار میں کچھ ایسا الجھ کے رہ گیا ہے کہ اب شعر و ادب کی سرزمین میں اُن کی واپسی کی بہت کم امید ہے۔ زیرِ نظر افسانہ بھی ان کی ایک پرانی کہانی ہے جو غالباً ۱۹۳۶ء کے آخری مہینوں میں ہمیں موصول ہوئی تھی۔ ارادہ تھا کہ اسے اس سال کے سالنامے میں جگہ دی جائے، لیکن سوءِ اتفاق سے مسودہ اِدھر اُدھر ہوگیا۔ اب کسی ضرورت سے پرانے کاغذات کا ایک بنڈل کھولا گیا تو اس میں سے یہ مسودہ ہاتھ آیا۔ لعلِ گم شدہ کو بقولِ حالی اپنا مال سمجھ کر ناظرین کی خدمت میں پیش کرنے کی مسرت حاصل کرتا ہوں۔

عاشق صاحب کے اندازِ نگارش سے ادبی دنیا کا حلقہ بخوبی واقف ہے۔ وہ عموماً اپنے افسانوں میں پلاٹ کو ثانوی حیثیت دیتے ہیں اور کردار خصوصاً مرکزی کردار کے مطالعے میں ایک بے مثال دقتِ نظر کا ثبوت دیتے ہیں۔ اور پھر منتخب الفاظ اور حسین تراکیب کے فن کارانہ استعمال سے اس مطالعے کے نقوش کو ایسا ابھارتے ہیں کہ کردار ایک جیتی جاگتی شخصیت بن کر ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اور اس کے جذبات و احساسات ہمارے اپنے جذبات و احساسات کی آئینہ داری کرنے لگتے ہیں۔ زندگی کی صبح میں اُن کی فن کاری اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ سوائے اس کے کہ اپنے معمول کے خلاف عاشق صاحب نے کردار نگاری کے ساتھ ساتھ پلاٹ میں بھی ایک ایسی دلچسپی پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے جو اُن کی عام افسانوی روش سے قدرے علیحدہ ہے اور جس سے قصے میں ایک قسم کی ڈرامائیت پیدا ہو گئی ہے۔ جگدیش کی زندگی میں صبح کی نمود کے دو منظر بڑے دلآویز ہیں۔ ایک پہلا وہ جب سراپا طلعت سوشیلا اُس کی خوابیدہ تمناؤں کے مشرق سے حسن و دل نوازی کی رنگینیاں بکھیرتی ہوئی طلوع ہوتی ہے اور دوسرا جب جگدیش اس ظلمت کدے میں عشق کی قربان گاہ پر متاعِ حیات کی نذر پیش کر کے اُس نو یزدان کی طرف بڑھتا ہے جو حسن و عشق دونوں کا سرچشمہ ہے اور اس کے سرہانے لٹکے ہوئے پنجرے میں سے اُس کی محبوب مینا پکار اٹھتی ہے "صبح ہوگئی"۔ حقیقت میں افسانہ نگار کا یہ ننھا افسانہ آرٹ کی فلک نما بلندیوں پر لے جاتا ہے۔

احمد ندیم صاحب قاسمی ہماری کہانیوں کی سبھا میں پہلی بار شریک ہو رہے ہیں۔ انہوں نے دیہاتی زندگی اور اس کے مسائل کا مطالعہ نظرِ غائر سے کیا ہے۔ مگر شہر ہو یا دیہات، فطرتِ انسانی کی نیرنگیاں ہر جگہ یکساں ہیں اور "انصاف" کا لفظ ہماری معاشرتی زندگی کی گوناگوں پیچیدگیوں اور مصلحتوں کی بدولت اُن الفاظ کی فہرست میں ایک ممتاز درجہ رکھتا ہے جو بہت کم شرمندۂ معنی ہوتے ہیں۔ احمد ندیم صاحب کا شاعرانہ اندازِ تحریر اُن کے افسانے میں بھی بدرجۂ غایت نمایاں ہے۔ "زیبو اپنا سبز آنچل سنبھالتی بگولے کی طرح کمرے سے باہر نکل گئی اور نیاز دیر تک ریشمی پردے کو لرزتے ہوئے دیکھتا رہا۔ سانس لیتے ہوئے اس کے سارے جسم میں ایک مبہم سا لوچ تیر جاتا تھا۔" "اور جی، جی کی تکرار! جیسے کوئی مغنی بیٹھے بیٹھے بربط کے کسی ایک ہی تار کو بار بار چھیڑ دیتا ہو"۔ ندیم اگر آہستہ آہستہ لکھتے رہے تو وہ دن دور نہیں جب وہ ایک خاص طرز کے کامیاب افسانہ نگار کہلائیں گے۔

بادشاہ حسن صاحب حیدرآبادی کا مضمون "ہندوستان اور جمہوریت" ایک نہایت پُراز معلومات اور فکر انگیز مقالہ ہے۔ صاحبِ مضمون نے بڑے معقول انداز میں اس بات پر بحث کی ہے کہ ہمارے ملک کے لئے اس کے مخصوص معاشرتی اور تاریخی حالات کے پیشِ نظر جمہوری طریقِ حکومت کہاں تک موزوں و مناسب ہوگا۔ مقالے کا علمی انداز اور تحقیقی نقطۂ نظر ایسا نمایاں ہے کہ صاحبِ مضمون پر کسی خاص سیاسی غرض مندی یا پاسداری کا گمان تک نہیں کیا جا سکتا۔ موضوع کی سنجیدگی کے باوجود اندازِ بیان نہایت دلچسپ ہے۔ امید ہے کہ اس مفید مضمون کو قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔

صلاح الدین احمد

(۲)

گئے مہینے کا جھگڑا ابھی ختم نہیں ہوا۔ سلام مچھلی شہری اور تخت سنگھ کی نظموں کے متعلق جو الجھن پیدا ہوئی تھی۔ اُس کے بارے میں میں نے جو کچھ لکھا وہ میرا اپنا اندازہ ہی تھا۔ اب تخت سنگھ لکھتے ہیں کہ اُن کی نظم سراسر طبع زاد ہے اس سے ایک ہی نتیجہ نکل سکتا ہے اور وہ نتیجہ قارئین نکال سکتے ہیں میں اپنے طور پر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ نظم تخت سنگھ کی اپنی نظم ہے۔

اگرچہ اب پھاگن کے بعد چیت بھی شروع ہو چکا لیکن اس کے باوجود اندر جیت کا "ہولی کا ترانہ" اس ماہ وقت کی راگنی سمجھا جا سکتا ہے۔

باقی نظموں میں سب سے بڑھ کر قابلِ ذکر روشن دین تنویر کی "دو نظمیں" ہیں۔ یعنی طنبورۂ کائنات اور چاندنی رات۔ ان دونوں کا تعلق ذہن کی مخصوص کیفیات سے ہے۔ تنویر کی شاعری کے دو نمایاں پہلو ہیں۔ ایک تو وہ ہلکی سی طنز جو شوخی کے درجے تک ہی جاتی ہے اور اُس میں شدید طنز کی تلخی سے بے مزگی نہیں پیدا ہوتی۔ دوسرے ایک گہری احساساتی کیفیت۔ یہ دونوں نظمیں اس دوسرے پہلو کی مثالیں ہیں۔ پہلی نظم کا عنوان اگرچہ "طنبورۂ کائنات" ہے لیکن موضوع یہ نہیں۔ یہ نظم خارجی نہیں بلکہ داخلی ہے "کائنات" شاعر کی اندرونی دنیا ہے۔ دل کی دنیا اور طنبورے کا استعارہ بھی دل ہی ہے ـــ دوسری نظم کی کیفیت کو ذہنی گرفت میں لانے کے لئے جلد بازی سے احتراز کی ضرورت ہے یعنی اس کے قلبِ شعری تک پہنچنے میں آہستہ رفتاری سے گریز لطف سے خارج ہوگا ـــ یوں چلئے ـــ ہاں، آگرے کے سفر میں تاج بھی دیکھا لیکن وہیں کے ایک دوست نے کہا کہ رات کو جانا بہتر ہوگا۔ رات کو گئے اور رات بھی چاندنی۔ دیر تک دیکھتے گھومتے پھرتے رہے، آدھی رات آن پہنچی۔ لوٹتے ہوئے دروازے پر جی چاہا کہ ایک نگاہِ آخری ڈالتے جائیے چاروں دوست کھڑے ہو گئے۔ معلوم نہیں وقت کی بات تھی کہ رات کا جادو تھا، یا کوئی پُراسرار طاقت جس نے چاروں کو کچھ دیر کے لئے خاموش کر دیا۔ تنویر صاحب کی نگاہ بڑے گنبد سے ہوتی ہوئی آسمان پر جا پہنچی اور ایک لمحے میں انہی نے خاموشی کو توڑا ـــ "یہ بارگہ شان شاعر کے دل سے پیدا ہوتا ہے یہ نورانی دھواں شاعر کے دل سے پیدا ہوتا ہے یہ مرمریا ہالہ شاعر کے دل سے پیدا ہوتا ہے۔۔" اور یونہی باقی نظم۔ اس کی داد کیا دی جاتی سب چُپ تھے اور میں بھی اتنا ہی کہہ سکا کہ "یہ انداز بیان شاعر کے دل سے پیدا ہوتا ہے"

معلوم نہیں تنویر نے یہ نظم کن حالات میں لکھی، میں نے تو اوپر بیان کئے ہوئے زاویۂ نگاہ ہی سے اسے پڑھا ہے۔

جلال الدین اکبر کی نظم کا قدامت پرستانہ عنوان "نذرِ عقیدت" ہو سکتا تھا۔ لیکن یہاں عنوان ہی سے شاعر نے عقیدت کے کم دلچسپ خیالات اور احساسات میں ایک شگفتگی اور جذب پیدا کر دیا ہے۔ ممکن ہے کہ عشقیہ شاعری کو پسند کرنے والی طبائع کے لئے تصوف، مرشد، عقیدت اور اسی قسم کے الفاظ اور اُن سے متعلقہ مفہوم اجنبیت لئے ہوئے ہوں لیکن اُنہیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ شاعری صرف عشقیہ جذبات ہی کے اظہار کا نام نہیں ہے۔ نیز ذہنی نشوونما کی ارتقائی منازل میں بہت سے مقام ایسے ہیں۔ جہاں پہنچ کر بظاہر غیر شاعرانہ باتوں میں سے رومانی تحریک پیدا ہو سکتی ہے اور شاعری کی تخلیق کا باعث بن سکتی ہے۔ نذرِ عقیدت کا شاعر اُسی منزل پر پہنچا ہوا ہے جو سطحی نظروں کے لئے غیر موجود لیکن باطن پرستوں کے لئے اپنے مناسب وقت پر موجود ہوتی ہے۔

قیوم نظر کے نعرۂ رندانہ کی بحر میں ایک اُبلتی ہوئی کیفیت ہے۔ جس نے موضوع اور بحر میں ایک مناسب ہم آہنگی پیدا کر دی ہے۔

باقی صدیقی، جلال ملیح آبادی اور ضمیر جعفری کی چیزیں ایک ہی بیت کی تین تانیں ہیں۔ "ایک اندھی ہوئی محبت" کا شاعر، ماضی کے متعلق بیداری کے خواب دیکھ رہا ہے اور "اصنامِ شام" کا شاعر حال کے متعلق بیداری کے خوابوں کی دلکشی میں ڈوب گیا ہے۔ بظاہر یہ دونوں نظمیں بیانیہ اور خارجی انداز لئے ہوئے ہیں لیکن ان دونوں میں داخلی تحریکِ شعری کارفرما ہے۔ "ترکِ محبت" کا شاعر معلوم نہیں، خود ساختہ فریب سے دل کو تسکین دے رہا ہے یا واقعے پر اُس کے دعویٰ کی بنیاد ہے یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ بعض اوقات نارسائی کے احساس کی شدت ذہن کو یقین دلا دیتی ہے کہ اے مرے دل! تو نے تو سب کچھ دیکھا بھالا ہے۔ تو نے اس پھول کو دیکھا، اُس پھول کو دیکھا، اگر ایک خاص پھول دیکھا نہیں تو کیا ہوا۔

میراجی

اس ماہ کے ہدیے

مضمون	سید بادشاہ حسین حیدر آبادی	دس روپے
افسانہ	عاشق حسین بٹالوی	دس روپے

آئینۂ عالم

فن لینڈ کا نوحہ

تاریخی اور جغرافیائی لحاظ سے فن لینڈ سکنڈے نیویا کے ممالک میں شمار ہوتا ہے۔ اس کا رقبہ ایک لاکھ پچاس ہزار مربع میل اور کل آبادی ۳۵ لاکھ افراد پر مشتمل ہے۔

فن لینڈ کے موجودہ باشندے والگا سے آئے تھے انہیں اہل بلغاریہ نے وہاں سے نکال دیا تھا۔ ان کے متعلق یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ یہ منگول نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ فنوں کے اس ملک میں آنے سے پہلے وہاں کئی اور قبائل بھی موجود تھے جن کو اُنہوں نے مطیع کر لیا۔

فن شروع شروع میں لامذہب تھے ۱۱۳۷ء میں اہل سویڈن کو وہاں عیسائیت پھیلانے کا خیال پیدا ہوا اور وہ اس مقصد سے یہاں آنے جانے لگے لیکن شروع شروع میں انہیں کامیابی حاصل نہ ہوئی اور وہ بددل ہو کر اپنے ملک کو واپس چلے گئے لیکن اپنے پادریوں کی ایک جماعت تبلیغ کے لئے وہاں چھوڑ گئے جو اپنے کام میں مشغول رہی۔ اگرچہ ان پادریوں کی ایک بڑی تعداد فنوں کے ساتھ لڑنے میں ضائع ہو گئی لیکن یہ مسلسل کوششیں اور قربانیاں پھل لائے بغیر نہ رہیں اور پہلی کوشش کے دو تین سال بعد فنوں نے نہ صرف عیسائیت کو ہی قبول کر لیا بلکہ سویڈن کے ماتحت بھی ہو گئے اور انیسویں صدی تک فن لینڈ سویڈن کا ایک حصہ رہا اور مدت تک سویڈن کے بادشاہ فن لینڈ کے بادشاہ کہلاتے رہے اس دور میں فنوں کو وہ تمام مجلسی معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی حقوق حاصل تھے جو سویڈن کی حکومت نے اپنی رعایا کو دے رکھے تھے۔ ان دونوں قوموں نے مل کر شمالی یورپ میں اُس تہذیب کی بنا ڈالی جس کے وہ اب تک علمبردار ہیں۔ اس تہذیب کے متعلق غیر ملکی مبصرین خیال کرتے ہیں کہ یہ دنیا کی کسی تہذیب سے بھی کم نہیں ہے۔ ان سات صدیوں کے دوران میں روس کی سویڈن اور فن لینڈ کے ساتھ کئی جنگیں ہوئیں جن میں ہمیشہ روس کو پسپا ہونا پڑا۔

آخر روس نے ۱۸۰۸ء میں ایک بار پھر اُس پر حملہ کیا۔ اور فن لینڈ کو مکمل طور پر فتح کر کے اپنی حکومت کا ایک صوبہ بنا دیا۔ اس وقت روس پر زار الیگزینڈر حکمران تھا اُس نے فنوں کی سیاسی اور معاشرتی آزادی کو کچلنے کی کوشش نہ کی اور ان کو وہی حقوق دے دیئے جو اُنہیں سویڈن کے ماتحت حاصل تھے۔ اس عرصے میں فنوں نے زندگی کے ہر شعبے میں نہایت سرعت کے ساتھ ترقی کی۔ لیکن جب روس کے تخت پر زار نکولس دوم حکمران ہوا تو اُس نے ۱۸۹۰ء میں فن لینڈ کی پرانی آزادی کو سلب کر لیا اور روس کی پارلیمنٹ کو فن لینڈ کے خلاف قانون پاس کرنے کا اختیار دے کر کئی ایسے قانون پاس کرا دیئے جو براہِ راست فن لینڈ کی آزادی پر اثر انداز ہوتے تھے سویڈن کی غلامی کے دوران میں بھی فنوں کی اپنی زبان حکومت کی دفتری زبان تھی مگر اب زار روس نے روسی زبان کی تعلیم اُن کے لئے لازمی قرار دیدی ان واقعات نے فن لینڈ کے باشندوں کو بہت برافروختہ کیا اور انہوں نے اس کے خلاف احتجاج کے طور پر پانچ لاکھ آدمیوں کے دستخطوں سے ایک درخواست مرتب کر کے زار روس کے دربار میں گزرانی اور ایک ڈپوٹیشن بھی اس غرض سے بھیجا لیکن زار پر نہ تو کچھ اس درخواست کا اثر ہوا اور نہ ڈپوٹیشن کی التجائیں کارگر ثابت ہوئیں بلکہ زار نے اُلٹا اس ڈپوٹیشن کو قید کر دیا اور فن لینڈ میں ایک فوجی آمریت قائم کر دی۔

فن لینڈ کی تاریخ میں یہ دور خاصی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ فنوں کی اس خاموش جنگِ آزادی میں لینن نے بھی ان کی مدد کی تھی وہ اس وقت مزدوروں کا ایک نمایاں لیڈر بن چکا تھا اُس نے زار کے ان قوانین کے خلاف سخت احتجاج کیا اور فنوں کے حق میں خوب پروپاگنڈا کیا اور اپنی پارٹی کے ارکان کو بار بار اس بات کے لئے اُبھارا کہ وہ فن لینڈ کو زار کی حکومت سے نجات دلائیں۔ لیکن اس کی یہ کوششیں کامیاب نہ ہوئیں۔ کیونکہ اُس وقت مزدور پارٹی کو روس میں کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں تھی۔

اس کے بعد جب سن ۱۹۰۵ء میں فنوں نے ایک بار پھر کروٹ لی تو اس وقت لینن کی پارٹی کافی مضبوط ہو چکی تھی اور لینن مزدوروں کا واحد رہنما بن چکا تھا اس وقت اُس نے ایک اخبار بھی جاری کر رکھا تھا اس مرتبہ لوگوں نے پھر ایک درخواست زار کے دربار میں گذرانی جس پر پانچ لاکھ فنوں کے دستخط تھے لینن نے اپنے اخبار میں فنوں کی حمایت میں کئی مضامین لکھے۔ مختلف مقامات پر زار کے خلاف تقریریں کیں اور فنوں کے مطالبے کو جائز مطالبہ قرار دے کر اپنی پارٹی کو فنوں کی مدد کے لئے اُبھارا۔ ان کوششوں نے زار کو مجبور کیا کہ وہ فوجی آمریت کو توڑ دے اور پھر آہستہ آہستہ ان کی پہلی آزادی بحال ہو گئی۔

اس واقعے نے لینن اور فن لینڈ کو ایک دوسرے کے بہت قریب کر دیا جب کبھی وہ زار کے مظالم کے خوف سے بھاگتا تو سیدھا فن لینڈ آ جاتا فن کھلے بندوں اُس کا استقبال کرتے اور زار کے خلاف ہر قسم کی مدد کرتے۔ لینن نے اپنی جلاوطنی کے ایام میں ایک بار یہاں سے ایک اخبار بھی جاری کیا تھا غرضکہ اس واقعے کی وجہ سے فن لینڈ اشتراکیت کی نشر و اشاعت کا مرکز بن گیا۔ لیکن شاید لینن نہیں جانتا تھا کہ ایک دن وہ بھی آئے گا۔ جب اُس کا دستِ راست سٹالن اُسی ملک کو غلام بنائے گا جس کی آزادی کے لئے اُس نے اتنی کوشش کی تھی اور انہی شہروں پر بمباری کرے گا جہاں وہ مصیبت کے دنوں میں پناہ لیا کرتا تھا۔ اگرچہ فن لینڈ کو اس واقعے کے بعد اپنے پہلے حقوق حاصل ہو گئے مگر ابھی تک مکمل طور پر آزاد نہیں ہوا تھا بلکہ ۱۹۰۸ء میں زار نے پھر اپنے مظالم کا سلسلہ شروع کیا جو جنگ عظیم تک دراز ہو گیا اس عرصے میں زار نے ان تمام فن لیڈروں کو جلاوطن کر دیا جو اپنے ملک کے لئے مکمل آزادی کے حقوق کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن جب روس میں اشتراکی انقلاب رونما ہوا تو فن آہستہ آہستہ اپنے ملک میں واپس آنے لگ گئے اسی زمانے میں فن لینڈ کی پارلیمنٹ نے ملک کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی اور ۶ دسمبر ۱۹۱۷ء کو اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ لیکن فن لینڈ اس اعلان کے باوجود بھی روس کی غلامی سے آزاد نہیں تھا۔ کیونکہ بالشویک اپنی فوجوں کو واپس بلانے کے لئے تیار نہیں تھے۔ آخر ایک زبردست خانہ جنگی شروع ہو گئی اور فنوں نے محسوس کیا کہ جب تک سرخ افواج فن لینڈ کو نہیں چھوڑتیں وہ صحیح معنوں میں آزاد نہیں ہو سکتے اس لئے انہوں نے فوجی قوت استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا اور جنرل منرہیم آزادی کی اس جدوجہد میں ایک راہنما کی حیثیت سے نمودار ہوا۔

جنرل منرہیم ایک قابل فوجی افسر ایک عالی دماغ مدبر اور بہترین منتظم ہے جس وقت اُس نے قوم کی قیادت کی باگ اپنے ہاتھ میں لی اُس وقت فن لینڈ کی عجیب حالت تھی اگرچہ ملک اپنی آزادی کا اعلان کر چکا تھا لیکن حکومت میں ابھی تک ایسے افراد موجود تھے جو کھلم کھلا روس کی مخالفت کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ مگر جنرل منرہیم نے اس کی کوئی پروا نہ کی اور رضاکار بھرتی کرنے شروع کر دیئے۔ اس دوران میں اُسے اپنی سرگرمیوں کا مرکز ہیل سنکی سے اٹرو تھونیا میں تبدیل کرنا پڑا۔ جہاں وہ فوج کے لئے رضاکار بھی بھرتی کرتا رہا اور روسی افواج کے خلاف شدید پروپاگنڈا بھی کرتا رہا۔ اس عرصے میں فن لینڈ کی باقاعدہ حکومت نے اُس کو کئی بار ان سرگرمیوں سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن اس نے ان باتوں کی کوئی پروا نہ کی۔ یہاں تک کہ جب ۱۹۱۸ء میں وہ پانچ روسی دستوں سے لڑ رہا تھا تو حکومت نے اسے ایک تار بھی دیا کہ جنگ فوراً روک دی جائے مگر اُس نے اس تار کی کوئی پروا نہ کی اور تار کو جیب میں ڈال کر اچانک روسی افواج پر جا پڑا اور نہ صرف روسیوں کو شکست دی بلکہ اُن کے اسلحہ پر بھی قبضہ کر لیا اور بیدھڑک آگے کو بڑھتا چلا گیا۔ اب حکومت نے بھی یہ دیکھ کر کہ منزل قریب آ چکی ہے۔ اس کی طرف امداد کا ہاتھ بڑھایا اور جرمنوں سے اعانت طلب کی آخر جرمنوں کی مدد سے وہ اشتراکی افواج کو فن لینڈ سے نکالنے میں کامیاب ہوئے۔ اور ملک میں قومی حکومت کی بنیاد ڈالی گئی۔ ۱۹۱۸ء کے بعد روس اور فن لینڈ کے تعلقات بالکل ختم ہو گئے یہاں تک کہ اُس کے لئے روس کی تجارت کی منڈی بھی بند ہو گئی اور اُسے اپنے لئے نئے گاہک تلاش کرنے پڑے۔ اس عرصے میں انگلستان اس کے مال کا چالیس فی صدی حصہ خریدنے لگ گیا۔

۱۹۲۰ء میں دونوں ممالک کے درمیان ایک معاہدہ ہوا اور ان کے باہمی تعلقات پھر سے اُستوار ہوئے ۱۹۳۲ء میں دونوں نے ایک دوسرے پر حملہ نہ کرنے کا معاہدہ کیا اس معاہدے میں یہ بھی طے پایا کہ اگر دونوں ممالک میں کوئی تنازعہ پیدا ہوا تو باہمی مشورے سے اُسے طے کرنے کی کوشش کی جائیگی اور جن امور کا فیصلہ نہ ہو سکے گا اُن کے لئے مشترکہ مصالحتی بورڈ قائم کیا جائیگا اس کے بعد دونوں ممالک کے تعلقات پھر خراب ہوتے گئے۔ ۱۹۳۸ء میں اُن کو از سرِ نو خوشگوار بنانے کی کوشش کی گئی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ آخر اکتوبر ۱۹۳۹ء میں فیصلہ طلب امور کا تصفیہ کرنے کی آخری کوشش کی گئی جس کے لئے روس نے فن لینڈ کے وزیرِ خارجہ کو ماسکو بلایا مگر کچھ ایسی شرائط پیش کیں جنہیں فن لینڈ نے منظور نہ کیا اور جنگ تک نوبت پہنچی۔ اُس وقت روس

نے مندرجہ ذیل تجاویز پیش کی تھیں۔

(۱) لینن گریڈ کی حفاظت کا انتظام کیا جائے۔

(۲) روس کو یقین دلایا جائے کہ فن لینڈ اُس کے ساتھ دوستانہ مراسم قائم رکھے گا۔

(۳) ایسے انتظامات کئے جائیں کہ خلیج فن لینڈ کے دونوں ساحلوں سے گولہ باری نہ ہوسکے اور دشمن کے جہاز خلیج فن لینڈ میں نہ آسکیں۔

(۴) ایسا انتظام بھی کیا جائے جس کی رُو سے ایسی دشمن طاقت خلیج فن لینڈ کے مغرب اور شمال مغرب میں واقع جزیروں تک نہ پہنچ سکے۔ کیونکہ اس طرح لینن گریڈ اس کی زد میں آسکتا ہے۔

(۵) خاکنائے کریلین پر فن لینڈ کی سرحد کو شمال اور شمال مغرب کی طرف ذرا پیچھے کر دیا جائے۔ کیونکہ فن لینڈ کی موجودہ سرحد سے لینن گراڈ پر بآسانی گولہ باری ہوسکتی ہے۔

(۶) ہانگو کی بندرگاہ اور اس کے ارد گرد کا علاقہ تیس سال کے لئے روس کو دے دیا جائے تاکہ روس وہاں اپنا بحری مرکز قائم کرے۔ اور روس کو ہانگو میں اپنی فوج رکھنے کی بھی اجازت دے دی جائے۔

(۷) روس اور فن لینڈ ایک دوسرے پر حملہ نہ کرنے کے معاہدہ کو پختہ کریں اور وعدہ کریں کہ مخالف طاقتوں کی امداد نہیں کریں گے۔

(۸) جانبین کے درمیان سرحد کی دونوں اطراف سے قلعہ بندی ہٹالی جائے۔

حکومت فن لینڈ نے روس کے ان مطالبات کے جواب میں لکھا کہ

(۱) اگر فن لینڈ کی پارلیمنٹ اجازت دے تو فن لینڈ خلیج فن لینڈ کے جزائر پیکاری سِنس ساری۔ لاون ساری۔ تھنا ہماری کے علاقے اس شرط پر روس کے حوالے کرنے کو تیار ہے کہ روس بھی فن لینڈ کے اُس نقصان کی تلافی کرے جو اُسے اُن جزائر سے علیحدگی اختیار کرنے کی صورت میں برداشت کرنا پڑے گا۔

(۲) چونکہ لینن گریڈ فن لینڈ کی سرحد کے قریب ہے اس لئے اس کی حفاظت کے انتظامات کرنے کے لئے فن لینڈ کی گورنمنٹ روس کا کچھ علاقہ دے کر خاکنائے کریلین پر سرحد میں تبدیلی کرنے کے لئے تیار ہے لیکن اس سرحد کی تبدیلی میں روس کی تجاویز کو منظور نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ جو علاقہ روس کو مطلوب تھا اُس میں کئی لاکھ فن آباد تھے اور روس کی تجویز ماننے سے وہ فن بے خانماں ہو جائیں گے۔

(۳) ہانگو کی بندرگاہ اور اس کے ارد گرد کے علاقے کو روس کے حوالے نہیں کیا جا سکتا اور فنی علاقے میں مسلح روسی افواج کا قیام بھی قبول نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ہانگو کی بندرگاہ اور اس کے ارد گرد کے علاقے کو روس کے حوالے کرنے سے غیر جانبداری کے قانون کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ اور فنی علاقے میں روسی فوجوں کا قیام اس واسطے قبول نہیں کہ ان افواج کو ہر وقت فن لینڈ کے خلاف استعمال کیا جا سکتا ہے۔

(۴) فن لینڈ کی حکومت ہر دو ممالک کے ایک دوسرے پر حملہ نہ کرنے کے معاہدے کے متعلق ہر وقت یہ یقین دلانے کے لئے تیار ہے کہ وہ نہایت ایمانداری سے اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرے گی۔

فن لینڈ کے اس جواب سے روس مطمئن نہ ہوا اس لئے اُس نے اُس پر چڑھائی کر دی۔ فن لینڈ نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ جس کا نتیجہ کشت و خون۔ قتل و غارت اور تباہی اور آخر کار فن لینڈ کی شکست کی صورت میں نمودار ہوا۔ لیکن اس موقعہ پر فن لینڈ کی بہادری اور استقلال کی داد نہ دینا بے انصافی ہوگی کیونکہ روس اور فن لینڈ کی فوجی طاقت کا کوئی موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ جب جنگ شروع ہوئی تھی اُسی وقت معلوم ہوگیا تھا کہ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ مگر فنوں نے نہایت بہادری سے مقابلہ کیا اور ایک چیونٹی نے متواتر تین ماہ تک ہاتھی کی بے پناہ یلغار کو روکے رکھا۔ اور بعض مقامات پر اُسے عبرتناک شکستیں بھی دیں۔ ممکن ہے فن لینڈ ابھی کچھ عرصہ تک جنگ جاری رکھتا مگر اُس کا اپنا ذخیرۂ جنگ ختم ہو چکا تھا اور باہر سے امداد ملنے کی توقع جاتی رہی تھی۔ سویڈن نے اتحادیوں کو اپنے ملک سے گذرنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ اس لئے فن لینڈ نے یہ سمجھ کر کہ اب جنگ بے فائدہ ہے ہتھیار ڈال دیئے۔ اور روس کے ساتھ صلح کر لی۔ لیکن جن شرائط پر صلح ہوئی ہے وہ ان مطالبات سے بھی زیادہ سخت ہیں جنہیں آج سے تین ماہ قبل فن لینڈ نے ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ اب ان شرائط کی رُو سے کریلین کا سارا علاقہ وی پوری سمیت جسے روسی افواج آخری دم تک فتح نہ کر سکیں روس کو مل گیا ہے۔ جھیل لاڈوگا جو فن لینڈ کی سب سے بڑی جھیل ہے۔ اپنے ساحلی علاقے سمیت روس کے قبضے میں آگئی ہے۔ ہانگو کی بندرگاہ کو بھی جو خلیج فن لینڈ کے دروازے پر واقع ہے روس نے تیس سال کے لئے ۸۰ لاکھ فن مارک سالانہ کے کرایہ پر لے لیا ہے۔ اس سے فن لینڈ کو سخت نقصان پہنچا ہے کیونکہ ہانگو کے روسی قبضے میں چلے جانے سے اس

کی تجارت اور آمدورفت روس کے رحم پر رہ گئی ہے۔ اس معاہدہ میں یہ بھی قرار پایا ہے کہ بحیرۂ شمالی میں فن لینڈ جنگی جہاز۔ آبدوز کشتیاں اور دیگر جہاز نہیں رکھ سکے گا۔ اُسے صرف ساحل کی حفاظت کے لئے چند چھوٹے چھوٹے جہاز رکھنے کی اجازت ہوگی۔ اس معاہدہ کی رُو سے روسیوں کو پٹامو کی بندرگاہ کو استعمال کرنے کی اجازت ہوگی اور وہ اس میں سے گذر کر ناروے اور سویڈن کی طرف بھی جاسکیں گے اور اس کے عوض میں فن لینڈ کو کوئی معاوضہ بھی نہیں دیا جائے گا۔ اور ان شرائط کی رُو سے روس کو بحیرہ ابیض کے ساحل پر اپنے بحری مستقر سے لے کر فن لینڈ میں خلیج بوتھنیا تک ریلوے لائن بنانے کا اختیار ہوگا۔ اس شرط کا یہ مطلب ہے کہ روس جب چاہے فن لینڈ کی راہ سے اپنی فوجیں گذار کر سویڈن پر حملہ کرسکتا ہے اس معاہدے میں سب سے اہم شرط یہ ہے کہ فن لینڈ کسی ملک کے ساتھ کوئی ایسا معاہدہ نہیں کر سکے گا جس میں روس کو نقصان ہو۔

یہ تھی فن لینڈ کی زندگی اور موت کی عبرت ناک داستان۔ اب ذرا اس کے اقتصادی اور جغرافیائی حالات کو دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ فن لینڈ جھیلوں اور جنگلات کا ملک ہے۔ اس چھوٹے سے ملک میں چھوٹی بڑی کئی ہزار جھیلیں ہیں سب سے بڑی جھیل لاڈگا ہے جو اب روس کے قبضے میں آگئی ہے۔ ملک میں جنگلات کی بھی کمی نہیں ہے اسی لئے لوگوں کے پیشے عام طور پر ایسے ہیں جن کا جنگلات سے تعلق ہے۔ مثلاً لکڑی کاٹنا لکڑی چیرنا۔ کاغذ بنانا وغیرہ وغیرہ۔ عمارتی لکڑی بھی یہاں بہت ہوتی ہے اور بیرونی ممالک میں بھیجی جاتی ہے۔ دیہاتی آبادی عام طور پر بھیڑ بکریاں پال کر گذارا کرتی ہے۔ ساحلی علاقے کی ۶۵ فیصدی آبادی کاشت کاری پر بسر کرتی ہے۔ گندم۔ رائی۔ جو اور آلو خوب ہوتے ہیں۔ سردیوں میں اتنی سردی پڑتی ہے کہ درجۂ حرارت صفر سے بھی کئی درجے نیچے گر جاتا ہے۔ اگرچہ گرمی کا موسم بہت مختصر ہوتا ہے لیکن درجۂ حرارت کافی بلند ہو جاتا ہے۔

فن لینڈ کا نظامِ حکومت جمہوری ہے صدر کا انتخاب چھ سال کے لئے ہوتا ہے ملک میں پارلیمنٹ بھی ہے جس کے ممبروں کی تعداد دو سو ہے۔ فن لینڈ دنیا کا سب سے پہلا ملک ہے جس نے عورتوں کو حقِ نمائندگی دیا۔

لوگوں میں تعلیم کا چرچا عام ہے ملک میں تین یونیورسٹیاں ہیں اور کئی کالج اور ثانوی تعلیم کے مدارس تو بے شمار ہیں اس کے علاوہ تعلیم نسواں اور تعلیم بالغان سے بھی غفلت نہیں برتی جاتی بلکہ اس کی طرف خاص توجہ دیہاتی علاقوں میں ہر طرف تعلیم بالغاں کے مرکز کھلے ہوئے ہیں۔

فن لوگ ادب اور آرٹ کے بہت دلدادہ واقع ہوئے ہیں۔ فن لینڈ کے ادب کو دنیا کے ادب میں ایک نمایاں جگہ حاصل ہے۔ گذشتہ سال لٹریچر کا نوبل پرائز ایک فن ادیب ہی نے لیا تھا۔ جس کی تصانیف دنیا بھر میں نہایت ذوق و شوق سے پڑھی جاتی ہیں اور اُن کو مغرب کی عشقیہ شاعری میں ایک ممتاز جگہ حاصل ہے۔ فن تعمیر۔ موسیقی اور مصوّری میں بھی فن کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ فن مصوروں نے دنیا کے سامنے ایسی تصاویر بھی پیش کی ہیں جنہیں دنیا کی بہترین تصاویر میں جگہ دی جاتی ہے۔

فن لینڈ میں دولت کی بہتات نہیں ہے لیکن ملک غریب بھی نہیں ہے اگرچہ اس کی اقتصادیات پر ہمیشہ غیر ممالک کا اثر رہا ہے۔ اس کا قومی قرضہ ایک کروڑ ستر لاکھ پونڈ ہے جس کا تیسرا حصہ غیر ممالک کا ہے۔ فن لینڈ ہمیشہ اپنا غیر ملکی قرضہ نہایت باقاعدگی کے ساتھ ہر سال ادا کرتا رہا ہے۔

امریکہ اور انگلستان کے تاجروں کے کروڑوں پاؤنڈ فن لینڈ کی صنعتوں میں لگ رہے ہیں۔ اور ان ممالک کی بہت سی کمپنیوں نے یہاں کاروباری جال پھیلا رکھے ہیں۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ برطانیہ اور امریکہ فن لینڈ کے مسئلہ میں گہری دلچسپی لیتے ہیں۔

تابش صدیقی

ایک بات کے دو شعر

ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے مختاری کی
چاہیں ہیں سو آپ کریں ہیں مفت ہمیں بدنام کیا

میر تقی

مختاری اس کو کہتے ہیں، مجبوری نام اسی کا ہے
جو تم نے چاہا ہو کے رہا، جو ہم نے چاہا ہو نہ سکا

سید احمد ترمذی حسرت

ہولی کا ترانہ

ہولی کا ترانہ گاتا ہے زمانہ آجا مرے ساقی محفل ہے یہ سونی
پھاگن نے بنایا کیا ٹھاٹ شہانہ اتنی تو کھنچاوٹ اچھی نہیں ہوتی
یہ شان یہ شوکت دلہن کا یہ بانا موسم ہے گلوں کا ہر شے پہ ہے مستی
اک اک کی زباں پر رنگیں ہے فسانہ اک جام پلا دے حسرت ہے یہ دل کی
گاتا ہے زمانہ ہولی کا ترانہ گاتا ہے زمانہ ہولی کا ترانہ

عشرت کے یہ دن ہیں راحت کے یہ دن ہیں پھر دیکھنا مجھ کو وہ رنگ جما دوں
ہے جوش لہو میں الفت کے یہ دن ہیں اس دل کی تمنا نغموں میں بہا دوں
عیش اور طرب کی لذت کے یہ دن ہیں روٹھوں کو منا دوں بچھڑوں کو ملا دوں
یعنی کہ خدا کی رحمت کے یہ دن ہیں گاتا ہے زمانہ
گاتا ہے زمانہ ہولی کا ترانہ ہولی کا ترانہ

اندرجیت شرما

دو نظمیں

۱۔ طنبورۂ کائنات

طنبورۂ کائنات چپ ہے چھایا ہوا پھر اندھیرا گھپ ہے
تاریک ہے آسماں سراسر
خاموش ہے سب جہاں سراسر
داماں فضا نوا سے بھر دوں اِن ظلمتوں کو منیر کر دوں۔
لیکن یہ چراغ بجھ گیا ہے! جُز دل مرے پاس اور کیا ہے؟
جل اُٹھتا تھا جب مرا ترانہ: اس بات کو ہو گیا زمانہ،
کچھ بھی نہیں ہے دکھائی دیتا
کچھ بھی نہیں ہے سنائی دیتا
طنبورۂ کائنات چپ ہے چھایا ہوا پھر اندھیرا گھپ ہے

۲۔ چاندنی رات

یہ مارِ کہکشاں شاعر کے دل سے پیدا ہوتا ہے
یہ نورانی دھواں شاعر کے دل سے پیدا ہوتا ہے
یہ مرمر کا جہاں شاعر کے دل سے پیدا ہوتا ہے

فضا میں چاندنی کا نشہ ہے یا تاج نکھرا ہے
کہ ممتاز محل کے دل سے نور اُٹھ کے بکھرا ہے
فنِ شاہ جہاں شاعر کے دل سے پیدا ہوتا ہے

ہیں تارے کچھ شرارے شعلۂ تخئیل شاعر کے
کہ پروانے منوّر ہو گئے قندیلِ شاعر کے
یہ راتوں کا سماں شاعر کے دل سے پیدا ہوتا ہے

روشن دین تنویر

کہی اور اَن کہی

سنا ہے پرانے زمانے میں لوگ اس لئے باتیں کیا کرتے تھے کہ ایک دوسرے پر اپنے خیالات کا اظہار کر سکیں اور شاید اسی لئے وہ زیادہ تر کم گو ہوتے تھے یا شاید اس لئے کہ اُن دنوں خاموشی دانشمندی کی دلیل سمجھی جاتی تھی۔ بہرصورت وہ کہنے والے نہیں بلکہ سننے والے لوگ تھے۔ اس کے برعکس آج کل ہمیں سننے کی کوفت گوارا نہیں ہم اپنی اپنی کہنے کے مشتاق ہیں۔

تہذیبِ حاضرہ کا یہ تقاضا ہے کہ کھانے کی میز پر، ہوٹلوں میں، دفتر میں، ریل گاڑی میں یا سڑک پر جہاں کہیں کوئی آشنا مل جائے۔ ہر شریف آدمی پر یہ لازم آتا ہے کہ وہ کوئی نہ کوئی بات چھیڑ دے یعنی خاموشی جہالت کا نشان سمجھی جاتی ہے اور ہر شخص کا یہ فرضِ اوّلیں ہے کہ وہ مہذب دکھائی دے۔ اس کے باوجود کوئی سے دو اشخاص کی باتیں سُن کر آپ محسوس کریں گے کہ اس لمبی چوڑی گفتگو میں دلچسپ ہونے کے باوجود حقیقتاً کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اور ہم سب اس لئے باتیں نہیں کرتے کہ اپنے خیالات کا اظہار کر سکیں بلکہ اس لئے کہ ان کی مدد سے ہم اپنے آپ کو لوگوں کے سامنے پیش کریں۔ یعنی دورِ حاضرہ میں صرف "ہونا" ہی زندگی کی دلیل نہیں۔ "ہونے" کے علاوہ اپنے آپ کو "پیش کرنا" بھی ضروری ہے۔

ویسے تو اپنے آپ کو پیش کرنا انسان کی بہت پرانی خواہش ہے اور وہ ہمیشہ اپنے آپ کو پیش کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے مگر پہلے پیش کرنے کا ذریعہ گفتگو نہیں بلکہ اعمال تھے۔ یعنی انسان کے دلی جذبات۔ خواہشات اور نیت سمٹ کر عمل کی شکل میں ظاہر ہوتے تھے۔ اس صورت میں "ہستی" اور "اظہار" کا براہِ راست باہمی تعلق ہوتا اور "اظہار" کا انحصار "ہستی" پر ہوتا اور یہ اسی کا محتاج رہتا۔

اس کے برعکس آج کل اپنے آپ کو گفتگو کے ذریعے سے پیش کیا جاتا ہے چونکہ زبان کو دلی کیفیت سے اتنا تعلق نہیں جتنا کہ باقی جسمانی اعضاء کو۔ اس لئے یہ بات ضروری نہیں کہ گفتگو میں ہم اپنے آپ کو ویسے ہی پیش کریں جیسے کہ ہم درحقیقت ہیں یعنی ہماری شخصیت اور ہمارا اظہارِ شخصیت دو قطعی مختلف باتیں ہیں جنہیں ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لئے ہم جیسے بھی الفاظ میں چاہیں اپنے آپ کو پیش کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے آپ کو رنگین صورت میں پیش کر سکتا ہے تو وہ سیدھی سادی صورت کیوں اختیار کرے نتیجہ! گفتگو اپنے متعلق ایک "پروپیگنڈا" ہے۔

اس لحاظ سے ہماری شخصیت کے دو پہلو ہوئے۔ ایک تو حقیقی اور دوسرے مصنوعی چونکہ ہمارے نفس کے کئی ایسے حصے بھی ہیں جنہیں ہم اوروں پر ظاہر کرنا نہیں چاہتے۔ اس لئے اپنے آپ کو پیش کرتے ہوئے ہمیں کئی ایک دلچسپ پہلو ایجاد ہی نہیں کرنے پڑتے بلکہ بہت سے دلخراش حقائق کی پردہ پوشی بھی کرنی ہوتی ہے۔ جیسے عورتوں کو پاؤڈر اور کاجل کے علاوہ گھونگھٹ کی بھی ضرورت پڑتی ہے جس کی مدد سے چہرے کا کوئی ناقابلِ اظہار حصہ چھپایا جا سکے۔ یا یوں کہئے کہ پاؤڈر اور کاجل زیبائشی چیزیں ہونے کے علاوہ چہرے کے عیب چھپانے کیلئے بجائے خویش ایک پردہ ہیں یعنی ہر نمائشی ایجاد کا مقصد پردہ پوشی کی ضرورت کا احساس ہے۔ پاؤڈر اور غازہ کالی عورتوں نے ایجاد کیا تھا۔ چونکہ انہیں ان کی ضرورت تھی۔ پھر جب گوریوں نے دیکھا کہ کالیاں بھی غازہ مل کر ان کی ہمسری کا دعویٰ کر رہی ہیں تو وہ بھی ملنے لگیں۔ حتیٰ کہ آج کل دونوں میں تمیز بھی مشکل ہو چکی ہے۔

مصیبت یہ ہے کہ ہماری شخصیت کا یہ پہلو خواہ ہم اُسے قابلِ

اظہار سمجھیں یا نہ سمجھیں، بنفسہٖ ہماری ناپسندیدگی کے باوجود اپنے اظہار پر مُصر ہے۔ اس لئے اس کا وہ حصّہ جسے ہم ناقابلِ اظہار سمجھتے ہیں کسی نہ کسی پیرائے میں ظاہر ہوتا رہتا ہے اور چونکہ ہمارے شعور کو مقابلتہً ہماری زبان پر زیادہ اختیار ہوتا ہے۔ اس لئے وہ حصّہ ہمارے جسم کے باقی اعضا کی گونگی زبان سے ظاہر ہوتا ہے یعنی ہر بات جو ہمارے منہ سے نکلتی ہے اس کا مقصد یا تو کچھ کہنا ہوتا ہے یا چھپانا اور عام طور پر ہر بات کے دو پہلو ہوتے ہیں یعنی ہر بات کچھ کہنے کے علاوہ کچھ چھپا رہی ہوتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہر بات کی اوٹ میں ایک اَن کہی بات چھپی ہوتی ہے۔

ہاں تو کوئی سے دو مہذب اصحاب کی باتیں سنئے۔ آپ یوں محسوس کریں گے جیسے ان کی باتیں دلچسپ ہونے کے باوجود حقیقت میں کچھ بھی نہیں کہتیں۔ ان باتوں سے آپ ان کی شخصیتوں کے متعلق کچھ بھی اخذ نہیں کر سکیں گے۔ گویا وہ ہاتھی دانت کی طرح کوئی نمائشی چیز ہوں یا جیسے آپ ہندوستانی چائے کا اشتہار پڑھ رہے ہوں جو گرمیوں میں نہایت ٹھنڈک پہنچاتی ہے یا پھر آپ یوں محسوس کریں گے کہ وہ صاحبان صرف اس ڈر سے کچھ نہ کچھ کہہ رہے ہیں کہ ایک دوسرے کو یہ علم نہ ہو جائے کہ ان کے دل میں کہنے کے لئے کوئی بات بھی نہیں یا جیسے وہ اُس خاموشی سے ڈرتے ہیں جو اُن کی بے مہری بے زاری یا ناقابلیت کا اظہار کرے گی۔

بے شمار باتیں کہنے اور سننے کے باوجود ہم میں ایسی قابلیت نہیں کہ ہر وقت نئی سے نئی نمائشی بات پیدا کر سکیں۔ عام طور پر ہر فرد نے کئی ایک چست اور دلچسپ نمائشی فقرے وضع کر رکھے ہوتے ہیں جو مناسب وقت پر چلا دیئے جاتے ہیں۔ جیسے ٹکسال سے سکّے یعنی ہماری نمائشی گفتگو کا ذخیرہ اُس شیشے کی الماری کی طرح محدود ہوتا ہے۔ جس میں ہر بڑی دکان کے سامنے خوبصورت اور دلکش چیزیں رکھی ہوتی ہیں تاکہ راہ چلتے لوگوں کے دل میں انہیں دیکھ کر خریدنے کا شوق پیدا ہو۔

عام طور پر میاں اور بیوی گھر پر خاموش بیٹھے رہتے ہیں۔ چونکہ وہ اپنی اپنی نمائشی باتیں ایک دوسرے کے روبرو اتنی بار دُہرا چکے ہوتے ہیں کہ انہیں سُن سُن کر اکتا جاتے ہیں جیسے ریکارڈوں کو بار بار سن کر طبیعت بیزار ہو جاتی ہے۔ اس لئے دونوں کو خاموش بیٹھ رہنے کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہیں ہوتا۔ اگر خاموشی سے اُکتا جائیں تو پڑوسیوں کے متعلق کوئی نہ کوئی بات چھیڑ لیتے ہیں تاکہ وقت کٹ جائے، یا اگر بیوی کے دل میں کوئی ایسی تازہ بات ہے جسے وہ میاں سے چھپانا چاہتی ہو تو وہ کسی نہ کسی کا ذکر چھیڑ دیتی ہے۔ اس لئے نہیں کہ اُسے مذکورہ بات میں کوئی دلچسپی ہے بلکہ اس ڈر سے کہ کہیں وہ ان کہی بات اُس کی زبان پر نہ آجائے۔ جیسے ہم گھر کی پرانی اور بے کار چیزیں اپنی ضرورت کی وجہ سے نہیں بلکہ اس ڈر سے سنبھال رکھتے ہیں کہ پھینک دینے کی صورت میں انہیں کوئی اور نہ اُٹھا لے جائے یا یوں کہئے کہ وہ ان کہی بات اس کی زبان کو گدگداتی ہے اور اس لئے وہ کچھ نہ کچھ کہنے پر مجبور ہو جاتی ہے اسی طرح اکثر مرتبہ ہم بھی اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہتے ہیں تاکہ ہمارے دل کی ان کہی بات جسے ہم چھپانا چاہتے ہیں۔ ہمارے منہ سے نکل نہ جائے۔ ایسے موقعے پر لیسا اوقات ہماری گفتگو کچھ کہنے کی بجائے کچھ چھپانے کی کوشش ہوتی ہے یعنی ہم خاموشی سے ڈرتے ہیں۔
بہر صورت اگر ان کے گھر میں کوئی مہمان آجائے تو دونوں میاں بیوی معًا اٹھ بیٹھتے ہیں اور اپنے اپنے نمائشی فقرے کہہ کر اس غریب کو اُن کے گھر آنے پر پشیمان کر دیتے ہیں۔ یہ خاموشی کا ڈر ان لوگوں کی باتوں میں بالکل واضح طور پر نظر آتا ہے۔ جو زبردستی مسلسل باتیں کرنے کے عادی ہوں۔ موجودہ تہذیب کے زیر اثر ایسے لوگوں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے اگر آپ کو کبھی کسی ایسے شخص سے گفتگو کا موقع ملا ہے تو آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ وہ شخص اس لئے باتیں نہیں کر رہا کہ اس کی باتیں سنی جائیں بلکہ اس لئے کہ وہ خود باتیں کر سکے اس کے علاوہ لوگ اس خیال سے بھی مسلسل گفتگو کرتے ہیں کہ کہیں سننے والوں کو انہیں جھٹلانے کا موقعہ نہ مل جائے۔ یا وہ کوئی نفیس نکتہ چینی نہ کر بیٹھیں یعنی ان کے دل میں ایک دھندلا سا احساس ہوتا ہے کہ اُن کی اپنی باتیں کھوکھلی اور بے معنی ہیں۔

مجھے کسی دفتر میں ایک ایسے صاحب سے ملنے کا اتفاق ہوا جو مسلسل بولے جانے کے بے حد مشتاق تھے۔ اُن کی باتیں ختم ہونے میں ہی نہیں آتی تھیں۔ وہ کسی کے منہ سے کچھ سُن کر جھٹ قطع کلام کر کے خود اسی موضوع پر کچھ نہ کچھ کہنا شروع کر دیتے اور پھر کسی کو حتی الوسع بات کرنے کا موقعہ ہی نہ دیتے۔ البتہ دوسروں کو زبردستی خاموش کر دینے کا معاوضہ یوں دیتے کہ بات بات پر "آپ کا خیال درست ہے" "آپ بجا فرماتے ہیں" "حقیقت بھی یہی ہے" جیسے خوشگوار اور خاموش کن فقرے دہراتے رہتے۔ حتیٰ کہ آپ اُن کی بات سننے پر مجبور ہو جاتے اور مزے کی بات یہ تھی کہ آپ کو یہ احساس نہ رہتا کہ آپ اُن کی باتیں سننے پر مجبور ہو چکے ہیں۔ یہ ایک جدا بات تھی کہ خوشگوار فقروں کے علاوہ اُن کا بیان

آپ کی تردید کرتا۔ مگر وہ تردید ایسے الفاظ اور انداز میں چھپی ہوتی کہ آپ اس کی کاٹ کو محسوس نہ کرتے۔ مجھے کئی دن تک سمجھ نہ آیا کہ آخر ایک عدیم الفرصت کلرک کو کیا مصیبت پڑی تھی کہ یوں بول بول کر اپنے آپ کو ہلکان کرتا پھرے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ دفتر میں ایک ایسی آسامی پر معمور تھے کہ انہیں محکمے کی خاص اور پس پردہ باتوں سے سروکار تھا یعنی رازداری کا فرض انہیں اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا یعنی اُن کی مسلسل گفتگو اس ڈر پر مبنی تھی کہ کہیں کسی کو اُن سے محکمے کی کوئی خفیہ بات پوچھنے کا موقعہ نہ مل جائے یا اُن کہی بات ان کی زبان پر نہ آ جائے۔ جیسے کسی خاص جگہ جانے کی ہم پہ بندش ہو تو ہم یوں ہی اِدھر اُدھر آوارہ گھومنے لگتے ہیں۔

معمّر لوگ بڑھاپے میں یا تو خاموش ہو جاتے ہیں یا مسلسل باتیں کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ انہیں باتیں کرتے سن کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی ڈوبتا کسی تنکے کا سہارا ڈھونڈنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا ہو۔ ان کے دل میں یہ شک ہوتا ہے کہ اُن کی باتوں کی وہ توقیر نہیں رہی یا سننے والے درپردہ ان کی باتوں پر ہنس رہے ہیں یا لوگ اُن کی باتیں سن ہی نہیں رہے۔ وہ سوچتے ہیں "میری اتنے سالوں کی جمع کی ہوئی عظمت ضائع ہو جائے۔ میرے ہاتھوں کے کھیلے ہوئے لونڈوں کی بات مجھ سے برتر سمجھی جائے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے"! اگر کوئی ان کی بات کاٹ دے تو وہ بے حد بگڑتے ہیں اور بار بار کہتے ہیں "تم سن رہے ہونا!" "میری بات سنو!" "سنو تو؟" "سمجھے؟" "ارے تم نے کیا شور مچا یا ہے۔ کسی کو بات تک کرنے نہیں دیتے"!

اکثر بزرگ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کی بجائے آپ بیتی کے قصّے سناتے ہیں یعنی وہ حال کی بجائے "ماضی" میں زندہ رہتے ہیں۔ کوئی گذرا ہوا واقعہ سناتے ہوئے وہ قطعی بھول جاتے ہیں کہ اسی واقعے کو کئی بار پہلے سنا چکے ہیں۔ اُسے بیان کرتے ہوئے ان کا انداز ایسا ہوتا ہے۔ جیسے انہیں اس کا احساس ہی نہ ہو کہ وہ مجلس میں بیٹھے ہیں۔ گویا وہ کسی جنگل میں بیٹھ کر کسی درخت سے کچھ کہہ رہے ہیں کسی رازداں سے بات کرتے ہوئے بھی ہمارا انداز ایسا ہی ہوتا ہے۔ آپ کہیں گے کہ اگر رازداں سے کچھ کہنا درحقیقت منہ سے کہہ دینے کی آرزو ہے جس میں سننے والا کوئی اہمیّت نہیں رکھتا تو پھر ہم کو یہ گلہ کیوں ہے کہ کوئی رازداں نہیں ملتا۔ شاید اس لئے کہ رازداں کے متعلق ہمیں صرف یہی فکر ہوتا ہے کہ وہ ہمارے راز کو افشانہ کر دے یعنی ہمارا سارا راز دل میں رکھے۔ یہ بالکل جدا بات ہے کہ اس وقت ہم خود اپنے راز کو کسی سے کہہ دینے کے لئے بے قرار ہوتے ہیں یعنی وہ اُسے سُنے یا نہ سُنے صرف اتنا کرے کہ فاش نہ کرے یعنی اُس کی شخصیت کسی درخت کی سی ہو جو مُنہ سے کہنا جانتا ہی نہیں اور اگر انسان میں یہ بات ممکن ہو تو پھر رازداں تلاش کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

بہر حال ایسے بزرگ جو بیتی ہوئی باتیں سنانے کے مشتاق ہیں اور ہر واقعے کو بار بار سنانا چاہتے ہیں۔ اُن کی طرف اِس خیال سے دھیان نہ دینا کہ وہ بات ہم نے سُنی ہوئی ہے ایک عام غلطی ہے۔ اگر ہم ان کی بات غور سے سنیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ہر بار کسی معمولی سے اضافے سے وہ اُس پرانی بات میں ایک نیا رنگ بھر دیتے ہیں۔

میرا اپنا تجربہ ہے کہ اگر مجھ سے یا میرے روبرو کوئی معمولی دلچسپ واقعہ ہو تو دل میں خیال آتا ہے کہ اگر اس واقعہ میں فلاں بات بھی ہوتی یا اس کا انجام یوں ہوتا تو یہ کس قدر دلچسپ ہوتا۔ اس کے بعد جب کبھی مجھے وہ واقعہ سنانا پڑے تو میں اس واقعہ میں اپنا خیالی نکتہ یا انجام بڑھا دیا کرتا ہوں۔ اس طرح کئی باتوں کو میں اتنی مرتبہ سنا چکا ہوں کہ مجھے اب اس کی بھی تمیز نہیں رہی کہ اس قصّے میں کہاں تک حقیقت ہے اور وہ کونسا نکتہ ہے جو میں نے اپنے تخیّل سے پیدا کیا تھا۔ حالانکہ میں سچّے دل سے قسم کھا سکتا ہوں کہ یہ تخیلی آمیزش صرف اسی لئے کرتا ہوں کہ سننے والے محظوظ ہوں یا اس لئے کہ اس زندگی کے عام اور بھدّے واقعات کو خوبصورت بنانا خلق خدا کو جینے کی ترغیب دینا ہے، یعنی لوگوں کی خدمت مگر سناتے ہوئے ایک ساعت کے لئے میری آنکھیں چمک اُٹھتی ہیں اور دل سے کوئی بے آواز بات نکلتی ہے "دیکھا میں وہ ہوں جس نے ایسے ایسے واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں"!

میرے ایک بزرگ ہیں۔ انہیں آپ بیتیاں سنانے کا بے حد شوق ہے۔ مثلاً اگر آپ کوئی بات سنا رہے ہوں اور وہ آ جائیں اور اس وقت آپ کہہ رہے ہوں کہ "وہاں ہم گھوڑوں پر سوار ہوئے" تو وہ جھٹ بول اٹھیں گے "گھوڑا۔ گھوڑے کی بھی سُن لو۔ میں اور مہاراج کا اردلی کھڑے تھے۔ . . . . ." اوّل تو ان کی بات سے بات نکلے گی حتیٰ کہ آپ کو جان چھڑانی مشکل ہو جائے گی، اگر اتفاقاً وہ گھوڑے کی بات پر ہی اکتفا کریں اور آپ کو اگلا فقرہ سنانے کی مہلت مل جائے اور آپ کہیں "راستے میں ایک گاؤں پڑتا تھا" تو وہ اسی سر تال سے کہیں گے "راستے

کی بات بھی بے حد دلچسپ ہے۔ کنور صاحب کا اپنا انتظام تھا۔
کھچّوں پر تمام سامان لدا تھا۔۔۔۔۔"

ہندوستان کی جوان لڑکیاں نمائشی باتوں پر نمائشی حرکات کو ترجیح دیتی ہیں۔ شاید اس لئے کہ وہ مغربی تہذیب سے اس قدر واقف نہیں ہوئیں کہ اِدھر اُدھر کی بظاہر بےتعلق باتوں کے ذریعے اپنی نمائش کر سکیں۔ اگر وہ نمائشی باتیں کرنے کی کوشش کریں تو ان میں نمائش عیاں نظر آتی ہے۔ عام طور پر جوان لڑکیوں کو غیر مردوں سے بات کرنے کا موقعہ ہی نہیں ملتا اور چونکہ لڑکیوں اور نوجوانوں کے درمیان ایک خلیج حائل رہتی ہے۔ اس لئے اپنی باتوں میں کشش پیدا کرنے کا لڑکیوں کو کوئی فائدہ ہی نہیں اور چونکہ حرکات کی اپیل آواز کی بہ نسبت زیادہ دور تک اثر رکھتی ہے۔ اس لئے وہ انہیں نمائشی گفتگو پر ترجیح دیتی ہیں۔ بہر صورت یہ تو ایک مسلّمہ امر ہے کہ اگر کسی کی باتوں سے خود ستائی مترشح ہو تو سننے والا اُکتا جاتا ہے۔ اس لئے نمائشی بات کا انداز اور موضوع کچھ ایسا ہونا چاہئے جس میں نمائش نمایاں نہ ہو بلکہ اس کے برعکس وہ بات بظاہر متکلم سے بےتعلقی ظاہر کرے۔ مغربی عورتوں نے نمائشی باتوں کو آرٹ کے درجے تک پہنچا دیا ہے۔

ہندوستانی عورتوں کی باتیں اپنی ہم جنسوں تک محدود رہتی ہیں لیکن عورتیں اپنی ہم جنسوں کے لئے جاذبیت پیدا کرنا نہیں چاہتیں اور نہ بذاتِ خود ان کی کشش محسوس کرتی ہیں بلکہ اس کے برعکس ان کا احساسِ برتری اس بات پر مبنی ہوتا ہے کہ اُن کی ہم جنسیں انہیں دیکھ کر جلیں۔ اپنی برتری قائم کرنے کے دو ہی طریقے ہیں۔ ایک تو اپنے آپ میں جاذبیت پیدا کی جائے اور دوسرے اَوروں پر نکتہ چینی کر کے اپنی عظمت ظاہر کی جائے۔ اپنی ہم جنسوں کے متعلق ان کی نمائشی باتیں ایسی نہیں ہوتیں جو اُن میں جاذبیت پیدا کریں۔ اس لئے وہ عام طور پر اڑوس پڑوس والیوں کی عیب جوئی میں لگی رہتی ہیں۔

بوڑھی عورتوں میں یہ خواہش اور بھی نمایاں ہو جاتی ہے۔ وہ زیادہ تر اپنی گذری ہوئی جوانی کے آسرے پر جیتی ہیں۔ اس لئے چونکہ ان کی جوانی بیت چکی ہوتی ہے اور وہ نوجوان لڑکیوں کو دیکھ دیکھ کر جلتی ہیں اس لئے وہ اپنی موجودہ عظمت کا دارومدار کسی ایسی بات پر قائم کرتی ہیں جس کے مطابق جوانی اور حسن عیب سمجھے جائیں۔ اسی وجہ سے عورتیں بڑھاپے میں رسمی نیکی اور بدی اور شرم و لحاظ کی قائل ہو جاتی ہیں اور ان کی نمائشی گفتگو اسی موضوع پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ اور ان کی ان کہی بات دل کی گہرائیوں میں جا بیٹھتی ہے

بہرحال یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ ہر بات جو کسی کے متعلق کہی جاتی ہے۔ مذکور کے بارے میں اس قدر اظہار نہیں کرتی جتنا کہ متکلم کی ان کہی بات کے متعلق۔

ہر شخص صبح سویرے جاگتے ہی اپنا الگ لگاؤ کا چشمہ پہن لیتا ہے اور معاً اس کی اپنی شخصیت قائم ہو جاتی ہے۔ اور دنیا اس کے سامنے نکھر کر واضح ہو جاتی ہے۔ اس چشمے میں ہم نے ایک درز اور ایک شیشے کا موٹا حصہ بنا رکھا ہے۔ تاکہ جس کو ہم کاٹنا چاہیں اس درز میں سے دیکھیں اور جسے بھی ہم چاہیں کہ وہ کبڑا نظر آئے۔ اُسے اس موٹے حصے میں سے دیکھیں۔

ہمارے جسم میں سب سے زیادہ مسحور کن حصہ آنکھ ہے اور دوسرے درجے پر زبان لوگوں کے دل میں کشش پیدا کرنے کے علاوہ تکلم سے اپنے آپ پر بھی اثر پیدا کیا جا سکتا ہے۔ ڈر کے مارے بچے اندھیرے میں اپنے آپ سے باتیں کیا کرتے ہیں تاکہ اپنی آواز سن کر دل میں حوصلہ پیدا ہو۔ بالغ لوگوں کے منہ سے نکلی ہوئی باتیں بھی انہیں اپنے متعلق حسن ظن پیدا کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ اگر آپ ہر صبح اُٹھ کر بہ آواز بلند بار بار کہیں۔ میں اس بات کی پروا نہیں کرتا۔ تو واقعی آپ میں عارضی طور پر اتنی ہمت پیدا ہو جائے گی کہ آپ اُس بات کی پروا نہ کریں۔ یا یوں سمجھئے کہ اپنی بات سن سن کر آپ کے دل میں یہ ایمان پیدا ہو جائے گا کہ آپ اُس کی پروا نہیں کرتے۔ ایک ان کہا خیال انسان پر اتنا اثر نہیں رکھتا جتنا کہ ایک اپنے منہ سے سنی ہوئی بات، بشرطیکہ وہ ان کہا خیال ایسا نہ ہو جسے آپ چھپانا چاہتے ہوں۔

کئی دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی سے گفتگو کرتے ہوئے ہمارے منہ سے کوئی ایسی بات نکل جاتی ہے جو ہمارے لئے قطعاً نئی ہوتی ہے۔ یعنی جو ہمیں عین اُسی موقعہ پر سوجھتی ہے اور ہم خود اس اپنے منہ سے نکلی ہوئی بات پر حیران رہ جاتے ہیں۔ میرا اپنا تجربہ تو یہ ہے کہ دورانِ گفتگو میں جتنے خیالات مجھے سوجھتے ہیں وہ گھر بیٹھ کر خاموشی میں نہیں سوجھتے۔ اس کے علاوہ خاموش خیالات میں وہ زور اور اثر نہیں ہوتا جو کہی ہوئی بات میں ہوتا ہے۔ کئی مرتبہ یوں بھی ہوتا ہے کہ میں کوئی بات شروع کر دیتا ہوں مگر مجھے قطعی معلوم نہیں ہوتا کہ میں کیا کہنے والا ہوں۔ شاید اس لئے کہ ایسے حالات میں خفت کا ڈر غالب ہوتا ہے، میں ایسی ایسی باتیں پیدا کر لیتا

ہوں کہ خود اپنی باتوں پر حیران ہوتا ہوں۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ صرف وہی باتیں کہی جا سکتی ہیں جو پہلے ہی سے دل میں موجود ہوں یعنی کیفیاتِ ذہنی کے لفظی ترجمے کا نام گفتگو ہے خواہ ہم کسی سے ہم کلام ہوں۔ پھر بھی زیادہ تر ہم اپنے آپ سے باتیں کرتے ہیں یعنی بہ آوازِ بلند سوچتے ہیں دورِ حاضرہ کے ڈراموں اور کہانیوں کے مکالمے پڑھ کر اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ اکثر کردار کچھ ایسی باتیں کرتے ہیں جنہیں سن کر یقیناً وہ خود حیران رہ جاتے ہوں گے۔ یہ اپنے آپ سے باتیں کرنے کی عادت بڑھاپے میں نمایاں ہو جاتی ہے اور بوڑھے اصحاب اکیلے بیٹھے بھی باتیں کیے رہتے ہیں۔

کٹے ہوئے نگینے کی طرح ہر شخصیت کے کئی پہلو ہوتے ہیں۔ شاید ایسے لوگ بھی ہوں جو ہر ایک کے سامنے اپنی شخصیت کے تمام پہلو ظاہر دیتے ہیں۔ عام طور پر تو ہم چاند کی طرح اپنا کوئی ایک پہلو ظاہر کرتے ہیں اور ہر شخص کے سامنے ایک مخصوص پہلو ظاہر کرتے ہیں یعنی ہر شخص سے ہمارے تعلقات ایک خاص قسم کا رنگ اور وضع اختیار کر لیتے ہیں اور جوں جوں تعلقات اس سے بڑھتے ہیں ہم پر یہ لازم ہو جاتا ہے کہ اس کے روبرو وہی روپ دھاریں یعنی جوں جوں ہمارے تعلقات بڑھیں گے ہم پر یہ لازم ہوتا جائے گا کہ اس شخص سے اپنی شخصیت کے چند ایک پہلو چھپائیں۔ تعلقات کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ حجاب کا بڑھنا لازمی ہے۔

ہر تعلق کے ہمراہ مخصوص پابندیاں بھی ہوتی ہیں اس صورت میں ایک اجنبی کے روبرو ہم متقابلتاً زیادہ آزاد ہوتے ہیں چونکہ ابھی ہمارے تعلقات کا کوئی خاص انداز قائم نہیں ہو چکا ہوتا۔ اور یہ ہماری اپنی مرضی پر منحصر ہوتا ہے کہ اس سے جس رنگ کے تعلقات چاہیں قائم کر لیں۔ البتہ ایک دفعہ کوئی مخصوص تعلقات قائم کر لینے کے بعد ہم پابند ہو جاتے ہیں کہ اس سے اسی مخصوص رنگ کے تعلقات بڑھائیں۔ گویا کسی اجنبی سے گفتگو کرتے ہوئے ہماری باتوں میں بہت روانی اور آزادی ہو سکتی ہے۔

جو لوگ اجنبیوں سے بات کرتے ہوئے جھجکتے ہیں انہیں یہ ڈر ہوتا ہے کہ کہیں وہ ایسی بات نہ کہہ بیٹھیں جس سے مخاطب کے دل میں ان کی قدر و منزلت نہ رہے۔ یا وہ اس سے بات کرنے سے پیشتر اسے پرکھنا چاہتے ہیں تاکہ انہیں یہ پتہ چل جائے کہ اس کے سامنے اپنی شخصیت کا کونسا پہلو پیش کرنا چاہیے جس سے وہ اس کے دل پر اپنا رعب بٹھا سکیں۔

بات چیت میں سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ وہ لفظوں کی مدد کے بغیر نہیں ہو سکتی اور دوسری مشکل یہ ہے کہ الفاظ اظہارِ خیال میں مدد ہی نہیں دیتے بلکہ کئی ایک مشکلات اور غلط فہمیاں بھی پیدا کرتے ہیں۔ الفاظ اور احساسات یا خیالات میں اگر کوئی تعلق ہے تو وہ محض بناوٹی اور خود ساختہ ہے۔

خدا جانے زبان کو یہ کیا علت ہے کہ جہاں دل نے دھڑکنا شروع کیا وہ گنگ ہو جاتی ہے۔ یعنی جذباتی ہیجان ہماری قوتِ تکلم اور بیان کا دشمن ہے زبان کی اس خامی پر شعرا ہمیشہ مرثیہ خوانی کرتے رہے۔ کوئی دیوان اٹھا لیجئے اس میں کہیں نہ کہیں اس بات کا رونا رویا گیا ہوگا۔ یعنی بناوٹی اور نمائشی باتوں میں تو لفظوں کی چستی اور لچک دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ مگر حقیقت کو بیان کرنے لگو تو الفاظ نہیں ملتے اور اکثر کیفیتوں کو ڈھیلے ڈھالے الفاظ میں کہنا پڑتا ہے۔ دنیا بھر کی رنگین اور بلند شخصیتوں کو یہ گلہ رہتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو پورے اور واضح طور پر ظاہر نہیں کر سکتیں اور جو کچھ وہ ظاہر کرتی ہیں وہ ان کی حقیقت کا ایک نامکمل اور دھندلا سا خاکہ ہوتا ہے۔

صرف یہی نہیں کہ الفاظ ہماری بات کے متعلق لوگوں کے دل میں غلط فہمیاں پیدا کر دیتے ہیں بلکہ اس کے علاوہ چونکہ ہم خود اپنی باتیں ان روزمرہ لفظوں میں ظاہر کرتے رہتے ہیں۔ اس لئے اپنے احساسات کے متعلق ہم کو خود بھی غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ ہم ان خود ساختہ الفاظ کے بھنور میں ایسے پھنس جاتے ہیں کہ اصل حقیقت ہمارے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے اور وہ مانوس لفظ ہماری عقل کو یوں بہلا پھسلا لیتے ہیں کہ ہم کو ان الفاظ کی تہ میں جھانک کر انہیں سمجھنے کا خیال ہی نہیں رہتا یعنی ہمیں یہ قطعی بھول جاتا ہے کہ ہر لفظ کے تلے ایک ان کہی بات چھپی ہے جیسے جلتے ہوئے چراغ تلے اندھیرا اور ہماری موجودہ جہالت کی وجہ یہی ہے۔ اسی لئے اس طرح نہایت مانوس چیزوں اور کیفیات سے ہم واقف نہیں ہو سکتے۔

ان کہی باتیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک تو وہ جو ہم جانتے ہیں کہ ہم چھپانا چاہتے ہیں اور دوسرے وہ جن کی موجودگی سے ہم واقف نہیں ہونا چاہتے اور اگر واقف ہو بھی جائیں تو ایسی صورت پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ ہم انہیں بھول سکیں۔

اتنی پردہ پوشیوں کے باوجود خدا جانے انسان کو یہ پردہ پوشی کیوں راس نہیں۔ یہ ان کہی باتیں ہمارے دل میں ایسے بھنور پیدا کر دیتی ہیں جن سے نکلنا ہمارے لئے ناممکن ہو جاتا ہے اور پھر عمر بھر ہم اسی بھنور میں ڈبکیاں کھاتے رہتے ہیں اور ہمیں یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ ہم بھنور میں ڈبکیاں کھا رہے ہیں بلکہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ترقی کر رہے ہیں!!

ممتاز مفتی

دل فدائے او شد و جاں نیز ہم

نہیں ہے بے سبب اپنی یہ نغمہ پیرائی
نہیں ہے بے سبب اپنی یہ خامہ فرسائی

دلِ حزیں کو ہے تجھ سے نیازِ بے پایاں
دلِ حزیں ہے محبت کا تیری سودائی

ترے لئے مرے اشعارِ نغز و شوخ و لطیف
ترے لئے مرے خامہ کی نادرہ زائی

مری دعا ترے لطفِ نگاہ کی خواہاں
تری ثنا مرے نغموں کی علتِ غائی

سخن اگر نہیں ارشاد کا ترے حامل
تمام قافیہ سنجی ہے بادپیمائی

مرا سزد کہ بخاک درت جبیں سائم
ترا سزد کہ بمن گنجِ فیض بخشائی

تو ہے وہ صاحبِ عظمت کہ سربلندوں کو
ہے وجہِ فخر ترے در کی ناصیہ سائی

ترے وجود سے رونق ہے بزمِ امکاں کی
تجھی سے ہے یہ ولایت کی مسند آرائی

تجھی کو پھبتا ہے دعوئے رضائے مولا کا
تجھی کو زیب ہے وحدت کی نکتہ آرائی

تری علالت و رنجوریٔ مسلسل سے
دلِ حزیں پہ ہے رنج و الم کی یغمائی

سرِ نیاز جھکا ہے جنابِ باری میں
خلوصِ قلب سے لب پر ہے یہ دعا آئی

"تنت بنازِ طبیباں نیازمند مباد
وجودِ نازکت آزردۂ گزند مباد" حافظ

جلال الدین اکبر

نارسائی

رات اندھیری، بَن ہے سُونا، کوئی نہیں ہے ساتھ
پَوَن جھکولے پیڑ ہلائیں تھر تھر کانپیں پات۔
دل میں ڈر کا تیر چُبھا ہے، سینے پر ہے ہاتھ،
رہ رہ کر سوچوں یُوں کیسے پوری ہو گی رات؟

برکھا رُت ہے اور جوانی، لہروں کا طُوفان،
پیتم ہے نادان، مرا دل رسموں سے انجان
کوئی نہیں جو بات سجھائے، کیسے ہوں سامان؟
بھگوان! مجھ کو راہ دکھا دے، مجھ کو دے گیان

چپّو ٹوٹے، ناؤ پرانی، دُور ہے کیون ہارا
بیری ہیں ندی کی موجیں اور پیتم اُس پار۔
سُن لے سُن لے دُکھ میں پکارے اک پریمی بے چارا
کیسے جاؤں، کیسے پہنچوں، کیسے جتاؤں پیار؟
کیسے اپنے دل سے مٹاؤں برہ اگن کا روگ؟
کیسے سُلجھاؤں پریم پہیلی، کیسے کروں سنجوگ؟
بات کی گھڑیاں بیت نہ جائیں، دور ہے اُس کا دیس۔
دُور دیس ہے پیتم کا اور میں بدلے ہوں بھیس۔

میراجی

غزل

سچ یہ ہے عیشِ دو عالم کی بھی پروا نہ کریں
وہ جو توہینِ غمِ یار گوارا نہ کریں

دل کی دھڑکن کو بھی اب کام میں لایا نہ کریں؟
کیا اس انداز سے بھی تم کو پکارا نہ کریں؟

وہ اگر مست نگاہوں سے اشارا نہ کریں
اُن کے میخوار کبھی ہوش میں آیا نہ کریں

ہو ہی جائے گی کسی طرح شبِ غم کی سحر
آپ میرے لئے تکلیف گوارا نہ کریں

ابھی اُمیدّ کو دینا ہے تصوّر کا فریب
دل کی دنیا کو ابھی وہ تہ و بالا نہ کریں

اور ہنستے ہیں مرے حالِ پریشاں پہ نہیں
آپ کو سب ہے خبر آپ تو ایسا نہ کریں

نو بہ نو رنگ بدلتی ہے تجلّی اُن کی
دیکھنے والے نگاہوں پہ بھروسا نہ کریں

دردِ دل آپ کی آنکھوں سے عیاں ہے ماؔہر
اس طرح آپ کوئی راز چھپایا نہ کریں

ماؔہر القادری

ملاح کی بیٹی

نیلے سمندر کی دور تک پھیلی ہوئی حدِ نظر پر روپا کی آنکھیں جمی ہوئی تھیں۔ گویا وہ سمندر کی ایک ایک لہر کا جائزہ لے رہی ہو، جیسے ان لہروں سے اس کا ہمیشہ سے کوئی گہرا تعلق رہا ہو۔ جیسے وہ اس کے لئے کوئی پُراسرار پیام لئے آ رہی ہوں۔

ابھی کل ہی کا ذکر ہے۔ روپا کے باپ نے اُسے ایک عجیب کہانی سنائی تھی۔ اس نے کہا تھا "روپا! اس جگہ جہاں لہریں کچھ چکر کھاتی نظر آ رہی ہیں۔ تیری ماں ڈوبی تھی۔ تیری ماں، تیری نانی اور تیری نانی کی نانی پشت در پشت سب اسی جگہ ڈوب کر مری ہیں، بیٹی! میں تجھے آگاہ کئے دیتا ہوں، پانی کی دوستی اچھی نہیں، تو اس سے کھیلنا چھوڑ دے۔"

روپا کے لئے یہ کتنی مشکل بات تھی۔ باپ کے محبت بھرے دل کو متفکر بنانا بھی اُسے گوارا نہ تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی سوچتی تھی کہ ایک ملاح کی بیٹی پانی سے نہیں تو اور کس سے دوستی کرے گی، اور وہ جگہ جہاں اس کی ماں ڈوبی اور جہاں اس کی نانی کی موت ہوئی۔ وہ تو اس کی پیاری جگہ، پیاری جھانجھری ہے۔ اس جگہ کی جھاگ اُگلتی ہوئی موجوں کے ساتھ کھیلنا اور وہاں کے پُرجوش گرداب سے دل بہلانا تو اس کی زندگی کا محبوب ترین مشغلہ ہے۔ وہاں کی موجوں اور گرداب کو دیکھ کر وہ وفورِ شوق سے دیوانی سی ہو جاتی ہے۔ یہ گرداب اس قدر خوفناک اور پُرہول تھا کہ لوگ اسے جل پری کے پیروں کے گھنگھروؤں سے تشبیہ دے کر اسے "جھانجھری" کہا کرتے تھے۔ روپا نہ جانے کتنی بار اپنی چھوٹی سی کشتی لے کر اس جھانجھری پر گئی ہے، اور اس سے لطف و سرور حاصل کیا ہے۔ اس جھانجھری میں اس کی ماں اور اس کی نانی میٹھی نیند سو رہی ہیں، وہ تو اس کی ماں کی مقدس آرام گاہ ہے۔ کیا بیٹی پیکے نہ جائے گی؟ اس میں ڈرنے کی کونسی بات ہے؟ لیکن اس کے ساتھ ہی روپا کے دل میں کوئی خیال پیدا ہوا۔ اُس نے باپ سے پوچھا۔

"بابا! ماں اور نانی سب شادی کے بعد ڈوبی تھیں نا؟"

باپ نے جواب دیا "ہاں۔"

روپا بولی "تو میں شادی ہی نہیں کروں گی اور جب شادی نہ کروں گی تو ڈوبوں گی کیسے؟"

باپ نے کہا "پگلی کہیں کی، لڑکیاں بھی کہیں کنواری رہتی ہیں؟"

روپا بولی "نہیں بابا، میں شادی نہیں کروں گی، جھانجھری کی محبت میرے دل سے نہیں نکل سکتی۔"

روپا کے باپ کو روپا کی ماں یاد آ گئی، کتنی نیک عورت تھی! وہ اس کی ہر بات برداشت کرنے کے لئے تیار رہتی لیکن تھی وہ بھی ایسی ہی ضدی، وہ خوب سمجھتا تھا کہ دباؤ ڈال کر روپا سے کسی بات کا منوانا ممکن نہیں، اس نے کوئی اور بات چھیڑ دی۔ لیکن روپا اپنے ہی خیال میں ڈوبی ہوئی تھی، وہ سوچ رہی تھی، ماں جھانجھری میں سو رہی ہے۔ شاید اسی لئے جھانجھری مجھے ہمیشہ بلایا کرتی ہے۔ اور بابا وہاں جانے سے منع کرتے ہیں، بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں وہاں نہ جاؤں؟ اس سے بہتر تو یہی ہے کہ میں شادی ہی نہ کروں۔"

روپا واقعی روپا تھی وہ اس کی سانولی سلونی رنگت اور   موزوں اعضا جن سے جوانی کا حسن پھوٹ پھوٹ کر نکل رہا تھا۔ گاؤں کے کئی نوجوان اس پر جان دیتے تھے۔ لیکن وہ دیوا اور سوما ہی کو سرمایۂ حیات سمجھتی تھی۔ روپا سمندر کے کنارے بیٹھی اپنی پیاری جھانجھری کو تک رہی تھی۔ اس کی نگاہیں جیسے کسی مسئلے کے سلجھانے میں اُلجھی ہوئی تھیں، دیوا اور سوما دونوں آنے والے تھے۔ روپا نے اُن سے جھانجھری پر ملنے کا وعدہ کیا تھا۔

ایک روز روپا ایک بڑی سی مچھلی کندھے پر رکھے اور چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کی ٹوکری سر پر لئے چلی جا رہی تھی۔ اور اس کے پیچھے پیچھے کندھے پر جال ڈالے دیوا بھی چلا جا رہا تھا۔ دیوا کی تشنہ آنکھیں روپا کی جوانی کے اُبلتے ہوئے چشمے سے شاداب ہو رہی تھیں۔ سر کی ایک مچھلی کے کھسک جانے سے روپا کا آنچل بھی ایک طرف ڈھلک گیا، دیوا اس کے سر سے کمر تک عریاں جسم کو دیکھ کر پاگل سا ہو گیا، روپا کی کمر کے   دل آویز خم   اور حسین پنڈلیوں میں بھی اسے ایک عجیب کشش اور دلآویزی نظر آتی۔ یُوں چلتے چلتے روپا کو ٹھوکر لگی اور مچھلی کی ٹوکری زمین پر آ پڑی۔ دیوا دوڑ کر آگے بڑھا۔ اور مچھلیوں کو اُٹھا اُٹھا کر ٹوکری میں رکھنے لگا، وہ

مچھلیاں بھی اُٹھاتا جاتا تھا اور روپا کی طرف دیکھتا بھی جاتا تھا۔ روپا بھی دیوا کے موزوں اور سڈول جسم کو مسرور اور کیف بار نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

دیوا بولا "روپا! تیرا نام روپا

رُوپا ۔ "کیا؟"

دیوا ۔ "تیرا نام رُوپا کس نے رکھا ہے؟"

"کیوں؟" رُوپا نے کہا۔

"اگر میں اُسے جان جاؤں تو ڈیڑھ من کی مچھلی پکڑ کر بھینٹ کر دوں"

——— دیوا بولا

"واہ واہ یہ کاہے کو؟" روپا نے آنکھیں مٹکا کر پوچھا۔

"اس لیے کہ تُو سچ مچ روپا ہے"

یہ کہہ کر دیوا روپا کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ وفورِ حیا سے روپا کا چہرہ گلنار ہو گیا۔

"پاگل مت بنو۔ میں کچھ ایسی ویسی نہیں ہوں" روپا نے ناز سے سر ہلا کر کہا۔

مگر دیوا روپا کی کب سنتا تھا۔ اُس نے دگنے جوش کے ساتھ کہا۔

"روپا، تو اتنی سندرتا کس کے لئے سنبھالے بیٹھی ہے؟"

روپا کچھ اور کہنا چاہتی تھی مگر زبان پر آئے ہوئے الفاظ کو چبا کر بولی

"اس . . . اس جھانجھری کے لئے"

جھانجھری سے روپا کی محبت گاؤں میں کسی سے چھُپی نہ تھی۔ اس لئے روپا کی بات پر دیوا کو مطلق تعجب نہیں ہوا، لیکن اسے جس جواب کی تمنا تھی وہ نہ ملا۔

دیوا اور سوما دونوں بچپن کے ساتھی تھے، دونوں میں حقیقی بھائیوں سے بھی زیادہ محبت تھی، دونوں ایک ساتھ مچھلی کے شکار کو جاتے، ایک ساتھ سمندر میں تیرتے، ایک ساتھ کشتی کی سیر کرتے۔ اور دن بھر میں کم سے کم ایک مرتبہ تو کھانا بھی ساتھ ہی کھاتے، اگر ایک کشتی کی سیر کا خواب دیکھتا تو دوسرے کو بھی وہی خواب نظر آتا۔ دونوں کے سینوں میں شباب کی لہریں اُٹھنے لگیں اور جوانی کی حد میں قدم رکھتے ہی دونوں نے اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کا مرکز بھی ایک ہی ذات کو منتخب کیا، اور وہ تھی روپا، وہی دونوں کے جذبۂ شوق کی محرک تھی۔

آج روپا کو دیکھ کر دیوا از خود رفتہ ہو گیا تھا، وہ سوچنے لگا سوما سے ملتے ہی روپا کی ملاقات کا مسرت آگیں واقعہ بیان کردوں گا۔ لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ آج ہی صبح سوما نے بھی روپا کو جال ڈالنے میں مدد دیتے ہوئے اس پر اپنے جذبۂ محبت کا اظہار کیا تھا جس پر روپا کچھ جواب دیئے بغیر مسکرا دی تھی۔

دیوا نے روپا سے سوال کیا "روپا ایک بات کہوں، خفا تو نہ ہوگی؟"

روپا خوب سمجھتی تھی کہ وہ بات کیا ہو سکتی ہے۔ مگر وہ اُس نشاط آگیں بات کو دیوا کے مُنہ سے سننا چاہتی تھی، اس نے بالوں سے ٹپکتے پانی کو آنچل سے پونچھتے ہوئے کہا "کہہ تو سہی، وہ ایسی کون سی بات ہے جسے سن کر میں خفا ہو سکتی ہوں؟"

"روپا تو مجھے بہت اچھی معلوم ہوتی ہے؟"

دیوا یہ کہنے کو تو کہہ گیا، لیکن مارے ڈر کے تھوڑی دیر کے لئے اُس کی آنکھیں بند ہو گئیں، وہ کچھ ٹھہر کر بولا۔

"روپا، میں تیرے باپ سے کہوں کہ وہ ہم دونوں کی شادی کر دے؟"

روپا نے اس طرح مڑ کر دیکھا، جیسے وہ کسی کو آتے دیکھ کر گھبرا گئی ہو، اُس نے کہا "دیوا! مگن اور کاہن جی آرہے ہیں۔ اُٹھا تو ٹوکری، سوموار کو تو اور سوما ٹھیک اسی وقت اپنی اپنی کشتی لے کر جھانجھری پر آجانا، سمجھے؟" یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

روپا سوچنے لگی۔ عجب مصیبت ہے۔ وہ کس کو منظور کرے اور کس کو نامنظور، کیا وہ دیوا کی محبت کو قبول کرے اور سوما کی محبت کو رد کر دے؟ اسے تو دونوں سے یکساں محبت ہے، اُس نے دونوں کو یکساں کیوں چاہا؟ کاش ایسا ہوتا کہ اسے ایک سے زیادہ محبت ہوتی اور دوسرے سے کم، اگر ایسا ہوتا تو آج اسے کشمکش میں کیوں مبتلا ہونا پڑتا۔ مگر اب یہ سب سوچنے سے کیا ہو سکتا ہے؟ سوموار کے روز دونوں کو بلایا ہے لیکن دونوں کو جواب کیا دیا جائے گا؟ اس اُلجھن کو سلجھانے کے لئے بابا ہی سے کیوں نہ رائے لی جائے، جس کے ساتھ وہ شادی کر دیں وہی اُس کا شوہر ہو اور اسی کے ساتھ وہ اپنی زندگی گزار دے، بس یہی صورت مناسب ہوگی، لیکن اگر بابا نے اس کو پسند نہ کیا تو؟ پھر کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ کسی سے شادی ہی نہ کی جائے، ہاں یہی ٹھیک ہے۔

روپا نے طے کر لیا کہ وہ کسی سے بھی شادی نہ کرے گی۔

(۳)

دیوا روپا کا ٹوکرا اُٹھا کر سوما سے ملنے چلا گیا، سوما دیوا کا انتظار ہی کر رہا تھا وہ بے چین تھا کہ کب دیوا آئے اور وہ اُس سے صبح کا سرور انگیز واقعہ بیان

کرے، دیوا کو دیکھتے ہی اُس نے شروع سے آخر تک سب بات سنائی جسے سُن کر دیوا کچھ اداس سا ہو گیا، اس کے بعد جب دیوا نے اپنا حال بیان کیا تو سوما پر بھی افسردگی طاری ہو گئی۔

دیوا نے کہا "سوما تو نے اب تک مجھ سے یہ بات چھپائی کیوں؟ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تُو روپا کو چاہتا ہے تو میں اُس سے ہرگز محبت نہ کرتا۔"

سوما نے جواب دیا "لیکن تیری زبان پر کبھی یہ بات کیوں نہیں آئی؟ اگر مجھے تم دونوں کی محبت کی خبر ہوتی تو میں کیوں اُس سے محبت کرتا؟"

دیوا بولا "ہم دونوں نے غلطی کی، ہم ایک دوسرے کے رازدار تھے لیکن اس معاملے میں ہم دونوں مجرم ہیں۔"

سوما: "پھر اب کیا کرنا چاہیئے؟"

دیوا: "کرنا کیا چاہیئے، ہم اس معاملے کو قسمت کے حوالے کر دیں، اگر وہ مجھ سے شادی کرنے پر راضی ہو تو تُو بُرا نہ مانے اور اگر اُس نے تجھ سے شادی کرنی پسند کی، تو میں برا نہ مانوں گا، ہماری محبت ہر حال میں ہمیشہ کی طرح قائم رہنی چاہیئے۔"

سوما: "بس، بس، یہی مناسب ہے، اگر روپا ہم دونوں بھائیوں میں پھوٹ ڈالنا چاہے تو ہمیں اُس سے صاف کہہ دینا چاہیئے کہ روپا اپنا راستہ پکڑ۔ لیکن دیوا، روپا کوئی ایسی ویسی معمولی عورت تو ہے نہیں۔ وہ ہم میں جدائی ڈالنے والی کوئی بات نہیں کر سکتی۔ تجھے یقین رکھنا چاہیئے کہ اگر وہ تیری قسمت میں ہے تو مجھے ہرگز رنج نہ ہوگا، البتہ پھر میں کسی دوسری عورت سے شادی نہ کروں گا۔"

دیوا: "لیکن تجھے ایک وعدہ کرنا ہوگا۔"

سوما: "کس بات کا وعدہ؟"

دیوا: "اگر روپا تیری ہو گئی تو روپا کا پہلا بچہ میرا ہوگا۔"

سوما: "کیوں؟"

دیوا: "اس لئے کہ اس بچے میں تم اور روپا دونوں موجود ہو گے، تو مجھ سے روپا کو چھین لے گا، اور روپا تجھ کو مجھ سے چھین لے گی لیکن وہ بچہ تم دونوں کو لے کر میرے پاس واپس آئے گا۔ اس لئے اگر وہ مجھے مل گیا تو وہی میری تسکین کے لئے کافی ہوگا۔"

"واہ، یہی میں بھی کہنے والا تھا، تو نے تو میرے دل کی بات چرا لی۔ ہم دونوں کے خیال میں کیسی یک رنگی ہے۔ اسی سے تو ہم دونوں ایک ہی عورت سے محبت کرتے ہیں۔" سوما نے اطمینان کا سانس لے کر کہا۔

سوموار کا دن تھا۔ روپا نے دیوا اور سوما دونوں کو جھانجھری پر بلایا تھا دونوں اکٹھے باتیں کرتے اُدھر چلے۔

سوما نے کہا "دیوا! ہم نے ایک دوسرے سے زبان تو ہار دی لیکن روپا سے پوچھا نہیں، مانا کہ تیری شادی اس سے ہو گئی اور اُس نے اپنا بچہ دینے سے انکار کیا تو؟"

"کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے؟"

"مانا کہ اگر وہ انکار ہی کر دے تو؟"

"ہم اس جھگڑے میں کیوں پڑیں؟ چل کر اُسی سے کیوں نہ پوچھ لیں، دیکھیں وہ کیا کہتی ہے۔"

دونوں نے سمندر کے کنارے پہنچ کر دیکھا کہ روپا ٹکٹکی باندھے جھانجھری کی طرف دیکھ رہی ہے۔

دیوا بولا "روپا، تو یہیں بیٹھی ہے، تو نے تو جھانجھری پر ملنے کو کہا تھا"

روپا بولی "ہاں، لیکن پھر سوچا یہیں بیٹھ کر تم دونوں کا انتظار کر دوں۔"

صبح کے آفتاب کی سنہری کرنیں سمندر کی لہروں پر عکس ریز ہو کر روپا کے حسن میں ایک عجیب دلآویزی پیدا کر رہی تھیں۔

سوما بولا "روپا! تیرے ہی ہاتھ ہمارا فیصلہ ہے۔ تجھے معلوم ہے کہ ہم دونوں سگے بھائیوں کی طرح ہیں، لیکن میں نے نادانی کی جو دیوا کو یہ نہیں بتایا کہ میں تجھ سے محبت کرتا ہوں، خیر اب ہم نے آپس میں طے کیا ہے کہ تُو ایک ہے اور ہم میں سے کوئی ایک ہی تیرا شوہر ہو سکتا ہے، اس لئے جس کی قسمت یاور ہوگی وہی تیرا پتی بنے گا، لیکن دوسرا اس سے بالکل نہیں جلے گا۔ اور ہم میں یہ بھی طے پایا ہے کہ تیرے پہلے بچے پر اُس کا حق ہوگا جو تجھے پانے سے محروم رہ جائے گا۔"

روپا بُت بنی خاموش سنتی رہی، اُسے ایسا معلوم ہونے لگا کہ اس نے اپنے متعلق جو فیصلہ کیا ہے اس سے وہ یک لخت منحرف ہوئی جا رہی ہے، اس نے اس لئے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ دونوں سے یکساں محبت کرتی ہے وہ کیسے قبول کرے گی اور کسے رد، اور اگر وہ دونوں کی بات ماننے سے انکار کر دیتی ہے تو دونوں کو صدمہ پہنچتا ہے، لیکن سوما

کی زبان سے بچے کی بات سُن کر اس کے دل میں ایک طوفان سا برپا ہوگیا۔

ردپا نے سمندر کی طرف دیکھا، اس کی بیشمار لہروں کو دیکھ کر اسے ایسا معلوم ہوا گویا لاکھوں بچے اپنے ننھے ننھے ہاتھ پھیلائے اُسے پکار رہے ہیں، اور اس کی طرف دوڑے چلے آرہے ہیں۔ ردپا سوچنے لگی، شادی نہ کرنے کا فیصلہ کرتے وقت اُسے اولاد کا خیال کیوں نہ آیا، ہاں ٹھیک تو ہے، فیصلہ کیا تھا اُس کے دل میں بسے ہوئے احساس زوجیت نے، لیکن اب تو اس کا جذبۂ مادری بیدار ہوگیا تھا۔ اسے کیا کیا جائے اور اسے کیوں کر تسکین دی جائے، کچھ دیر تک ایسا معلوم ہوتا رہا گویا چاروں طرف سے چھوٹے چھوٹے بچے اُسے گھیرے ہوئے ہیں۔ اور اس کے دل میں ایک عجیب سرور پیدا کر رہے ہیں۔ پھر ناگہاں اُس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ وہ دونوں سے محبت کرتی ہے دونوں کو چاہتی ہے کیا وہ ایک کی بیوی اور دوسرے کی بہن بن کر نہیں رہ سکتی؟ اور کیا وہ اس طرح دونوں کو خوش نہیں کرسکتی، انہوں نے خود کہا ہے کہ وہ دونوں بھائیوں کی طرح ہیں اور بھائیوں ہی کی طرح رہیں گے اُنہوں نے یہ بھی عہد کر لیا ہے کہ پہلا بچہ اُسے دیا جائے گا۔ جس سے میری شادی نہ ہوسکے گی پھر کیا ان کا عہد میرا عہد نہیں ہوسکتا؟

وہ بولی "اچھی بات ہے، مجھے تمہارا فیصلہ منظور ہے مگر ایک شرط میری بھی ہے میں شادی تو تم میں سے ایک ہی سے کروں گی لیکن ہم تینوں رہیں گے بھی ایک ساتھ، ایک شوہر اور دوسرا بھائی بن کر رہے گا۔ پہلا بچہ بھائی کا ہوگا منظور؟"

خوشی سے دونوں کا چہرہ شگفتہ ہوگیا۔ "منظور، منظور" دونوں نے ایک ساتھ کہا۔

اس کے بعد دونوں قسمت کے فیصلے کا انتظار کرنے لگے کہ دیکھئے جے مال کس کے گلے میں پڑتی ہے۔ دیوا اور سوما کے دل سکون پذیر ہوگئے، لیکن ردپا کے دل میں اُسی طرح جذبات و خیالات کا طوفان برپا تھا۔ وہ کھوئی ہوئی سی اتھاہ سمندر کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی کہ یکایک اسے جھانجھری یاد آگئی۔

اُس نے کہا "دیکھو جی میں تم دونوں سے یکساں محبت کرتی ہوں اسی لئے جھانجھری جو فیصلہ کردے گی اسی پر میرا عمل ہوگا، تم دونوں ایک ساتھ سمندر میں کودو جو پہلے جھانجھری پر پہنچے، وہ میرا شوہر اور جو بعد میں پہنچے وہ میرا بھائی۔"

دونوں نے ردپا کی شرط منظور کر لی اور کپڑے اُتار کر پاگلوں کی طرح ایک ساتھ سمندر میں کود پڑے اور جس طرح شیر دور اپنے شکار کو دیکھ کر اُس پر ٹوٹے یا تیر کمان سے نکل کر نشانے کی طرف چلے، دونوں خوفناک لہروں کا مقابلہ کرتے ہوئے جھانجھری کی طرف بڑھے۔ سمندر کی لہریں برابر بلند اور پست ہو رہی تھیں، جن پر جھولتا ہوا کبھی دیوا نظر آجاتا تھا کبھی سوما۔ ردپا کا دل دھڑک رہا تھا کہ نہ جانے دونوں میں سے کون آگے پہنچے اور کون پیچھے، اسے یہ بھی اندیشہ تھا کہ کہیں دونوں سے نہ ہاتھ دھو بیٹھے، وہ یہ بھی سوچ رہی تھی اگر دونوں اُسے مل بھی گئے تو جس حیثیت سے وہ ایک کو پائے گی۔ اس حیثیت سے دوسرے کو ہمیشہ کے لئے کھو دے گی، لیکن اس میں حرج ہی کیا ہے، کیا بیوی ہی بن کر محبت کی جاسکتی ہے۔ کیا بہن کی محبت کسی سے کم ہوتی ہے۔ اگر میرے کوئی بھائی ہوتا تو میں اس سے کتنی محبت کرتی، وہ تھک کر آتا تو میں اس کے بالوں میں انگلیاں پھراتے پھراتے اُسے سُلا دیتی۔ بس یہی ٹھیک ہے آج میرے دل کو تسکین ہوگئی۔ آج مجھے دونوں مل گئے۔

سوما اور دیوا سمندر کی وسیع سطح پر دو قطروں کی مانند دکھائی دے رہے تھے۔ لیکن بعد میں اُن کا اتنا نشان بھی ناپید ہوگیا۔ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ پہلے کون پہنچے گا۔

دیوا نے سوما کی طرف دیکھ کر پکارا "سوما! آج جھانجھری بدمست سی ہو رہی ہے۔ ایسے ہولناک بھنور تو کبھی دیکھنے میں نہیں آئے تھے!"

سوما "ہاں آج ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس میں تعجب کی کون سی بات ہے، آج ردپا جو ہمیں کنارے پر بیٹھی ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی ہے۔"

دیوا "ہاں یہ تو ٹھیک ہے لیکن آج یہ بھنور ہمیں اتنی تیزی سے اپنی طرف کیوں کھینچ رہے ہیں؟"

"دیوا، باتیں نہ کر نہیں تو پچھڑ جائے گا، ہاتھ بڑھا دیکھ وہ سامنے جھانجھری نظر آرہی ہے۔" ایک لہر پر چڑھتے ہوئے انگلی کے اشارے سے سوما نے کہا۔

دیوا نے تیز تیز ہاتھ چلانے شروع کئے، اسے معلوم ہونے لگا کہ آج پانی کی حالت اچھی نہیں ہے۔ موجوں اور گردابوں کے تیور بگڑے سے نظر آرہے ہیں، اس لئے پاگلوں کی طرح تیرتے چلے جانا اچھا نہیں۔

دیوا یہی سب سوچ رہا تھا کہ سوما اس سے دس ہاتھ آگے بڑھ گیا۔ اس کمی کے پورا کرنے کے لئے دیوا تیز تیز ہاتھ چلانے لگا، سوما آگے آگے چلا جا رہا تھا، اور دیوا اس کے پاس پہنچنا ہی چاہتا تھا کہ سوما جھانجھری کے ایک زبردست گرداب میں پھنس گیا، سوما نے اس سے نکلنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنا شروع کئے پھر بھی پرجوش جھانجھری اسے ایک بار اندر لے گئی اور پھر اوپر کی جانب پھینک دیا، دیوا گھبرا اُٹھا۔ اس نے سوچا وہ ردپا کو تو کھو ہی چکا۔ جھانجھری اس کے دوست کو بھی نگلے جا رہی ہے، وہ اس کو برداشت

نہ کر سکا اور بے اختیار پکار اُٹھا "سوما! روپا تیری ہو چکی۔ ادھر دیکھ، ادھر آ"
لیکن سوما کے حواس کہاں بجا تھے۔ وہ تو جھانجھری کے گرداب میں پڑا چکر کھا رہا تھا، دیوا تیزی سے سوما کے پاس پہنچا، سوما ڈوبنے ہی والا تھا کہ دیوا نے اُسے بائیں بازو پہ اُٹھا لیا، اور اپنے کو جھانجھری کے حوالے کر کے وہ اس کے بھنور کے ساتھ چکر کھانے لگا، سوما کی بدحواسی دور ہوئی وہ دیوا سے مخاطب ہو کر بولا۔

"دیوا روپا تیری ہے"

"کہیں ایسا بھی ہو سکتا ہے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر پہلے تو یہاں پہنچا اس لئے روپا تیری ہے۔" دیوا نے کہا۔

سوما بولا "نہیں ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا اگر تو آ کر میری مدد نہ کرتا تو میں ڈوب ہی چکا تھا۔ میں نے تو تیری بدولت نئی زندگی پائی، میں روپا کو تیرے حوالے کرتا ہوں۔"

دیوا: "دیوانوں کی سی باتیں نہ کر اب چل روپا انتظار کر رہی ہوگی۔"

یہ کہہ کر دیوا نے جھانجھری سے نکلنے کے لئے ہاتھ چلانا شروع کیا۔
تھوڑی ہی دیر میں دونوں کنارے پر پہنچ گئے، دونوں دوست ایک دوسرے کے کندھے پر ہاتھ دھرے ہوئے روپا کے پاس پہنچے۔

روپا کے چہرے پر اضطراب چھایا ہوا تھا، اُس نے ہنستے ہوئے سوال کیا: "میرا بھائی کون ہے اور شوہر کون؟"

دونوں ایک دوسرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے "یہ ہے تیرا شوہر"

روپا ہنس پڑی: "واہ!"

لیکن اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی دیوا بول اُٹھا: "روپا تیری شرط کیا تھی، یہی نا کہ جو پہلے جھانجھری پر پہنچے وہ تیرا شوہر، سوما پہلے جھانجھری پر پہنچا۔ اس لئے وہ تیرا شوہر ہے۔"

سوما: "روپا! دیوا نے پوری بات نہیں کی، یہ سچ ہے کہ میں پہلے جھانجھری پر پہنچا، لیکن میں تو ڈوب چکا تھا۔ دیوا نے پہنچ کر مجھے بچایا۔ اس لئے دیوا ہی کی جیت ہوئی۔"

روپا کچھ فیصلہ نہ کر سکی، وہ جس جھگڑے سے بچنا چاہتی تھی وہی پھر اس کے سر آ پڑا، اُس نے سامنے پڑا ہوا ایک ٹھیکرا اُٹھایا اور بولی: "کس کا گیلا کس کا سوکھا؟"

دیوا نے کہا: "بول سوما تیرا گیلا کہ سوکھا، تیرا گیلا تو میرا سوکھا۔"

"اچھا میرا گیلا سہی، روپا اُچھال تو ٹھیکرا" سوما بولا۔

روپا نے خوب زور سے ٹھیکرے کو اوپر پھینکا، نیچے گرتے ہی تینوں ٹھیکرے کی طرف دوڑے۔ روپا دیوا کے گال پر ہلکا سا چانٹا لگاتے ہوئے بولی

"بھیا تو نے تو میرے لئے اچھا شوہر چن دیا۔ چل ہم تینوں جھانجھری کو مبارکباد دینے چلیں۔ بھائی بہن اور بہنوئی۔"

روپا کی محبت آمیز باتوں سے دونوں کے دل خوش ہو گئے۔ سوما نے سوچا دونوں دفعہ قسمت نے میرے ہی حق میں فیصلہ دیا۔ اس لئے مجھے اُس فیصلے کو قبول ہی کرنا پڑے گا، دیوا کے دل نے بھی اسی طرح کی دلیلوں سے اس کی تسکین کر دی۔ تینوں کشتی میں سوار ہوئے۔ روپا دیوا کے پاس بیٹھ کر بولی۔

"ہم بھائی بہن ساتھ ہوں تو تجھے پاس بیٹھنے کا حق نہیں، تو کشتی کھے"
روپا نے سوما کی طرف چپو پھینک دیا۔

سوما ہنس کر بولا "واہ ری روپا واہ ابھی شادی بھی نہیں ہوئی اور تو لگی ابھی سے رعب جمانے، اچھا بھئی اچھا، پہلے تیرا بھائی اُس کے بعد میں۔"

روپا نے آنکھوں کی پتلیوں کو پھراتے ہوئے کہا: "ہاں پتی پتی ہے لیکن بھائی پھر بھی بھائی ہے۔ دیکھ تو اس جھانجھری میں میری ماں نظر آ رہی ہے وہ ہمیں دیکھ کر کتنی خوش ہے۔"

دیوا کی خلش دور ہو گئی، روپا کا ملائم ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا وہ اس پیارے ہاتھ پر اپنی انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا "روپا تیرا پہلا بچہ میرا ہوگا، یاد رکھنا۔"

"اور بھیا تیرے سارے بچے میرے ہوں گے تجھے بھی یاد ہے؟" روپا نے کہا۔ اس کی آنکھیں دیوا کی ہمدردی سے لبریز تھیں۔

دیوا نے کہا "میں شادی کروں گا، جب تو میرے بچے تیرے ہوں گے، تیری جیسی بہن کے ہوتے ہوئے میں بیوی کی محبت کو کس دل میں جگہ دوں گا۔"

روپا بولی: "نہیں بھیا، بھاوج کے بغیر میرا گذر نہ ہوگا۔ تم دونوں سمندر کے سفر کو جاؤ گے تو ہم دونوں نند بھاوج مل کر تمہاری راہ دیکھیں گی، اور تمہارے آنے پر ساگر دیوتا کی آرتی اتاریں گی۔"

دیوا نے بات کا پہلو بدل کر کہا: "روپا تو بھی عجیب ہے، تو نے ہمیں اس جھانجھری میں بھیج دیا جس میں ٹکرا کر بڑی بڑی کشتیاں سمندر کا لقمہ بن گئیں"
روپا جھانجھری کی طرف دیکھنے لگی۔

(۵)

[illegible] بعد سوما کی شادی ہو گئی۔ دیوا نے خوش رہنے کی انتہائی کوشش

کی۔ لیکن دل میں ایک خلش سی ہوتی رہتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زندگی کی سب سے بڑی متاع کھو گئی ہے۔ جو اب اسے کبھی نہیں مل سکتی۔ اس نے اپنے دل پر قابو پانے کی بہت کوشش کی مگر کسی طرح کامیاب نہ ہو سکا۔

رات کو اسے بہت دیر تک نیند نہیں آئی، اس کی آنکھوں میں روپا بسی ہوئی تھی۔ وہ خواب دیکھنے لگا۔

سوما اور وہ دونوں تیرتے ہوئے جھانجھری کی طرف چلے جا رہے ہیں، جھانجھری میں سے ایک فردوسی نغمہ بلند ہو رہا ہے گویا نہیں از خود رفتہ کئے دے رہا ہے۔ سورج کے ڈر سے نیلے آسمان کے پردے میں چھپے ہوئے بیشمار تارے بھی گویا وہ نغمہ سننے کے لئے بیقرار ہو رہے ہیں۔

سوما بولا "دیوا! یہ آواز تو کبھی سننے میں نہیں آئی۔ اس جھانجھری میں کون گا رہا ہوگا؟"

دیوا: "میری سمجھ میں بھی کچھ نہیں آ رہا"

سوما: "تو مانے یا نہ مانے لیکن مجھے تو یقین ہے کہ کوئی جل پری اس جھانجھری میں آ بسی ہے۔ اور وہی گا رہی ہے یہ کسی انسان کی آواز نہیں معلوم ہوتی۔"

اتنے میں جھانجھری سے ایک دلکش آواز سنائی دی "دیوا! ادھر دیکھ! ادھر!"

دیوا چونک پڑا اور اس نے لہر پر چڑھ کر جھانجھری کی طرف دیکھا۔ اسے ایسا معلوم ہوا جیسے روپا جھانجھری کی لہروں پر جھول رہی ہے اور اسے اشارے سے اپنے پاس بلا رہی ہے۔ اس کے سر کے بال اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے ہیں۔ جو کبھی موجوں سے کھیلتے ہیں۔ اور کبھی اس کے رخساروں کو چومتے ہیں۔ اس کے کانوں کے موتی اس طرح چمکتے ہیں کہ کبھی دیکھنے میں نہ آئے تھے روپا کا چہرہ ایک آسمانی نور سے جگمگا رہا تھا۔

جھانجھری سے پھر ایک دلکش نغمہ بلند ہوا "دیوا تو میرا ہے اور صرف میرا"

دیوا پاگلوں کی طرح آگے بڑھا اور برابر بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ روپا کے پاس پہنچ گیا، وہ روپا کو دیکھ کر حیران رہ گیا اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ ایک آدم زاد دوشیزہ ہے یا کوئی دیوبالا، اتنا حسن و جمال، اس قدر شوکت و جلال۔ اور اس قدر لبریز محبت آنکھیں۔

دیوا نے پھر سنا جیسے کوئی اسے پکار رہا ہے "دیوا دیوا میں ڈوبا"

دیوا گھبرا گیا اور مڑ کر دیکھا سوما آخری سانس لے رہا تھا، دیوا دوڑ پڑا، پھر روپا کی آواز سنائی دی "دیوا تو میرا ہی ہے میں تیرا انتظار کر رہی ہوں۔ جلد واپس آنا!"

دیوا جھانجھری کی طرف دیکھے بغیر نہ رہ سکا۔ لیکن روپا کا پتہ نہ تھا، صرف جھانجھری پاگلوں کی طرح شور کر رہی تھی۔ ایک بڑی سی مچھلی لہروں پر اٹھی اور پھر انہیں میں کھو گئی۔

"بھیا بھی عجیب سونے والا ہے۔ ابھی خواب میں ہنس رہا تھا ابھی رونے لگا۔ اٹھ، سورج نکل آیا، بڑی ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ آج تجھے ڈیڑھ من کی مچھلی لانی ہوگی، کہا تھا نا تو نے"

روپا دیوا کے بالوں میں انگلیاں ڈالے کہہ رہی تھی اور سوما اس کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔

دیوا جاگ اٹھا، لیکن وہ خواب تمام دن اس کے دماغ پر چھایا رہا۔

(۶)

روپا کی بیٹی بھی روپا ہی کی طرح خوبصورت پیدا ہوئی اس نے ننھی سی بچی کو دیوا کی گود میں دے کر کہا "لے بھیا یہ تیری ہے اس کا کیا نام رکھے گا؟"

دیوا نے اس کا نام منھی رکھا۔ منھی ایک سال کی ہوتے ہوتے دیوا سے اتنی ہل مل گئی کہ وہ بھوک ہی لگنے پر ماں کو یاد کرتی۔ دیوا کے لئے اب منھی ہی سب کچھ تھی۔

منھی کے پیدا ہونے کے بعد روپا بہت کچھ محتاط ہو گئی تھی۔ اب اس نے پہلے کی طرح جھانجھری میں دلچسپی لینا چھوڑ دیا تھا۔ اگر وہ کہیں جاتی تو اسے خیال لگا رہتا کہ دیر ہوئی تو اس سے دیوا پوری طرح بازپرس کرے گا، لیکن پھر بھی کبھی کبھی اس کا دل اس کے قابو سے باہر ہو جاتا، ایسا معلوم ہوتا گویا جھانجھری اسے ہاتھ اٹھا اٹھا کر بلا رہی ہے۔ جیسے اس نے اپنی پیاری جھانجھری کو بھلا کر اس کے ساتھ بڑی بے وفائی کی ہے۔

ایک روز رات چاندنی کھلی ہوئی تھی، روپا اپنی جھانجھری سے دور سمندر کے سینے پر لیٹی چاندنی کی سفید ساری کو دیکھ کر دیوانی سی ہو گئی۔ وہ ایسے حسین منظر کو چھوڑ کر جھونپڑی میں پڑی ہوئی ہے۔ اس وقت تو اسے اس جگہ ہونا چاہیئے جہاں بدمست چاندنی اٹھلا رہی ہے اور پرجوش موجیں اس کے ساتھ چھیڑ کر رہی ہیں، وہ سوچنے لگی۔ جب چاند نکھرے ہوئے صاف آسمان پر ہنس کی طرح خوش خرامی کر رہا ہے اور جب پر جوش نیلا سمندر دھاڑیں مار رہا ہے، روپا

جھونپڑے میں بیٹھی ہوئی ہے، کیا وہ اب بھی وہی روپا ہے جواب سے بہت پہلے تھی؟

روپانے سوما کی تھالی میں روٹی رکھتے ہوئے کہا۔ "سوما چل جھانجھری پر چلیں۔"

سوما۔ "آج نہیں روپا، میں بہت تھکا ہوا ہوں اگر تیرا ایسا ہی دل چاہتا ہے تو صبح سویرے ہی اُٹھ کر چلیں گے۔"

روپا: "سوما! تو بھی بالکل گیا گذرا معلوم ہوتا ہے۔ دیکھ تو ساگر کیسا ناچ رہا ہے۔"

سوما سمندر کی طرف دیکھنے لگا، اُس نے سوچا روپا ٹھیک ہی تو کہتی ہے۔ یہ سہانی رات تو واقعی سمندر کی سیر سے لطف اٹھانے کے قابل ہے نہ گیا تو روپا بھی بالکل مردہ دل خیال کرے گی، اتنے میں دیوا آگیا اور جال کو ایک طرف ڈال کر منھی کے جھولے کی طرف لپکا۔ وہ نیند کی گود میں پڑی میٹھی نیند سو رہی تھی، جس طرح ماتا بھری ماں اپنے بچے کو تشنہ نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ دیوا جھولے پر جھک کر منھی کو دیکھنے لگا۔

روپا بولی۔ "بھیا اتنی دیر کیوں ہوئی؟"

دیوا ۔ "منھی کے لئے سیپیاں جمع کر رہا تھا۔"

روپا ۔ "تو بھی کیسا پاگل ہے۔ یہ خیال نہ کیا کہ روٹیاں ٹھنڈی ہو جائیں گی۔"

روپانے دونوں کو کھانا کھلا کر دیوا سے کہا "چل جھانجھری پر چلیں"

دیوا بولا "مجھے تو سیپیوں کا ہار تیار کرنا ہے۔"

روپا ۔ "دیوا تو بھی لڑکی کے پیچھے بالکل لڑکی بن گیا ہے۔"

روپا کا خیال تھا کہ شاید دیوا اس طنز سے چلنے کے لئے تیار ہو جائے۔

دیوا ۔ "تو جو چاہے کہے، لیکن میں نہیں جا سکتا۔ اور یہ رات تو بیوی اور شوہر کے ساتھ ساتھ جانے کے قابل ہے۔ چلو میں تم دونوں کو کنارے تک پہنچا آؤں، لیکن دیکھنا دیر نہ کرنا۔ منھی کے جاگنے سے پہلے لوٹ آنا۔"

روپانے بہت اصرار کیا مگر دیوا ساتھ جانے پر تیار نہ ہوا۔ سوما اور روپا کشتی لے کر روانہ ہو گئے۔ دیوا چپ چاپ کھڑا دیکھتا رہا یکایک اس کے دل نے کہا "دیوا تو نے بہت بُرا کیا ہے جو ساتھ نہ گیا" اسے یاد آیا کہ منھی ڈیڑھ برس کی ہو چکی ہے۔ اس نے فوراً دوسری کشتی لی۔ اور تیز تیز ہاتھ بڑھا کر جھانجھری کی طرف چل پڑا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اُس کا دل کیوں دھڑک رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں اندھیرا سا چھانے لگا۔ جھانجھری کے پاس پہنچ کر دیوا نے دیکھا کشتی الٹی ہوئی ہے اور لہروں کے اوپر پچھاڑیں کھا رہی ہے۔ وہ چلا اُٹھا۔ "روپا! سوما!"

قہقہہ مارتی جھانجھری نے جواب دیا۔ "روپا! سوما"

دیوا پاگل ہو اُٹھا۔ اُس نے اپنے کو خطرے میں ڈال کر جھانجھری کی ایک ایک لہر ایک ایک بھنور کو چھان مارا۔ لیکن روپا اور سوما کا پتہ نہ چلا، اس کا دل قابو میں نہ تھا وہ چاہتا تھا کہ وہ بھی اس جھانجھری میں کود کر جان دے دے لیکن اسے یکایک منھی یاد آگئی، وہ جھونپڑی میں تنہا ہو گی۔ اور جاگ کر بھوک سے تڑپ رہی ہو گی۔ اُس کے منہ سے یاس اور مجبوری کی ایک آہ نکل گئی، اس نے کشتی کا رُخ کنارے کی طرف پھیر دیا۔

تنہا اور سنسان جھونپڑی، منھی اپنے جھولے میں پڑی سو رہی تھی دیوا یاس انگیز آنکھوں سے اسے دیکھنے لگا۔ پھر اس نے ایک غم آلود نگاہ جھانجھری پر ڈالی اور جلدی سے منھی کو سینے سے لگا کر فرطِ محبت سے اُس کا منہ چوم لیا، جھونپڑی کے باہر ٹوٹے ہوئے دل کی طرح چاندنی بکھری پڑی تھی۔ اور دُور جھانجھری ہمیشہ کی طرح شور کر رہی تھی۔

(گجراتی سے)

ابو محمد امام الدین رام نگری

ترکِ محبت

آپ نے ترکِ محبت کا دیا ہے پیغام
شکر ہے آپ کی پامال محبت کو سلام!

ترکِ الفت کی بھلا ہو گی شکایت کس کو؟
سچ یہ ہے آپ سے تھی دل سے محبت کس کو؟

اس پہ یہ تمکنت ترکِ محبت، کیا خوب!
اس پہ اُلٹی یہ ہمیں سے ہے شکایت کیا خوب!

آپ نفرت کریں اور عشق پہ تیار ہوں میں؟
آپ پر آج یہ واضح ہو کہ خود دار ہوں میں!

کتنا محبوب نگاروں میں ہوں معلوم بھی ہے؟
رشکِ خورشید ستاروں میں ہوں معلوم بھی ہے؟

کتنی زلفیں مرے شانوں پہ کھلی ہیں پیہم!
کتنی مہ پارہ جبینوں نے چھوئے ہیں یہ قدم

کتنے دیکھے ہیں دہکتے ہوئے رخسار میں نے
کتنے چومے ہیں مہکتے ہوئے گیسو میں نے

کتنی نظروں کو بہ حسرت نگراں دیکھا ہے
کتنی آنکھوں میں محبت کا سماں دیکھا ہے

کتنے رخ میرے لئے محوِ گل آرائی ہیں
کتنے پہلو مرے پہلو کے تمنائی ہیں

کتنے آئے ہیں قمر میرے شبستانوں میں
کتنے شامل ہیں سمن بر مرے ارمانوں میں

حُسن کو عشق کے قدموں میں جھکایا میں نے
غیرتِ بھول گئی، اپنا بنایا میں نے

نازنینوں سے بہت ناز کئے ہیں میں نے
کتنے دلبر نظر انداز کئے ہیں میں نے

حُسن پر رحم جب آیا ہے عنایت کی ہے
چند خوش بخت حسینوں سے محبت کی ہے!

جلال ملیح آبادی



پڑوسی

جوانی دیوانی ہوتی ہے، حماقتوں کا زمانہ اور دانائی کے لئے تجربے کی ضرورت ہے۔

جس کی پرورش اس نظریے کے ماتحت ہوئی ہو اس سے جوانی میں نادانیوں کے سوا کسی اور بات کی توقع رکھنا بھی ایک نادانی ہے۔ مجھ میں کوئی خاص خوبی تو تھی ہی نہیں بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ دنیا کو مجھ سے کسی قسم کی ترقی یا بہتری کی اُمید نہ تھی۔ نہ اس کی توقع تھی کہ میں کبھی سنجیدگی کے ساتھ زندگی پر غور کرنے کے قابل ہو سکوں گا۔ میرے دونوں ماموں، ایک خالہ، میرے مہربان والدین اور اُن کے مہربان دوستوں نے میرے بارے میں اکثر سیدھے سادے، صاف الفاظ میں اپنی مایوسی کا اظہار کیا تھا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ تیس برس کی عمر سے پہلے میرے لئے زندگی کی ٹھوس حقیقت کو سمجھنا محال ہے۔ مجھے اور کیا چاہئے تھا؟ تیس سال تک تو مزے تھے اُس کے بعد دیکھا جائے گا۔ لیکن اب جبکہ میں اُن کی قیاس آرائیوں کو عملی جامہ پہنا رہا ہوں تو اُنہیں رنج ہوتا ہے اور میں حیران ہوتا ہوں۔ اب بھلا انہیں رنجیدہ ہونے کا کیا حق ہے؟ وہ میرے فہم و فراست اور ذہانت کو تو مدّت سے جانتے ہیں۔ اُن کے خیال میں مجھ سے عموماً حماقتیں ہی سرزد ہوتی ہیں اور یہی زندگی ہے اس سے بہتر زندگی بسر کرنے کی میرے دل میں کبھی خواہش پیدا نہیں ہوتی نادانی واقعی شباب پر ہے۔ وہ مجھے بے وقوف بتاتے ہیں لیکن مجھے اس سے اختلاف ہے۔ میں اپنی حماقتوں سے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا رہا۔ بلکہ اپنی ذات کو بھی ہر خدشے سے محفوظ پاتا ہوں۔ ٹھہریئے میں سوچوں تو سہی کہ مجھے کس چیز سے خطرے کا امکان ہے؟ شراب سے؟ میرے ماموں خود پیتے ہیں۔ کھیل کود؟ ڈاکٹر اس کی ہدایت کرتے ہیں......

امرت۔ شاما، پُشپا۔ اُوشا.... حسن و نکہت کے یہ سب مختلف مجسمے؟ یہ بات البتہ بحث طلب ہے، لیکن اس بحث میں پڑنا ہی فضول ہے۔ اس مشغلے سے مجھے انکار کی ہمت نہیں ہے، ہاں اس کے حق میں میں دلائل مہیا کر سکتا ہوں، اور کروں گا۔ کالے بال اور کالی آنکھیں یا لمبے سنہرے بال اور شربتی آنکھیں، ان میں دلکشی بھی ہوتی ہے اور نگاہ کرم بھی۔ میں ان سے کیونکر دُور رہ سکتا ہوں اور میں دُور رہنا بھی نہیں چاہتا اور نہ رہوں گا۔ اور پھر وہ سب بھی تو مجھے دل سے پسند کرتی ہیں، چاہتی ہیں۔ پشپا۔ شاما اُوشا۔ امرت اور کئی اور۔ تو قصہ مختصر بات یہ ہے۔ اس میں بتائیے کیا حرج ہے؟ ہاں ایک اور بات، میں کوئی نمائشی اور سطحی انسان نہیں ہوں جیسے کہ پچھلے ہی دنوں کسی نے اشارۃً کہا تھا۔ کس نے کہا تھا؟ اس سے مجھے کیا غرض؟ مجھے یہ گھریلو زندگی کی اُلجھنیں اور انگشت نمائیاں ایک آنکھ نہیں بھاتیں۔ اس لئے اس بات کو بھی نظر انداز کر دیجئے۔ حالانکہ دراصل مجھ میں رکھ رکھاؤ کا سلیقہ ہے۔ اچھے بُرے لباس کی تمیز ہے اور میری عادات بھی سلجھی ہوئی تسلیم کی جاتی ہیں۔ ابھی اگلے ہی روز کی بات ہے کہ جگی نے کہا تھا کہ میری ہر بات سننے کے بعد یاد رکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں میرے ہر فعل میں کوئی نہ کوئی خوبی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اُسے صرف میری باتیں ہی قابلِ تحسین نظر آتی ہیں۔ میرا طرزِ عمل۔ بازار میں، کالج میں اور خالا کے گھر میں، غرض ہر جگہ قابلِ ستائش ہوتا ہے۔ اور اگر سچ پوچھئے تو خلوت میں، تنہائی میں اور سونے کے کمرے میں بھی میں نے تہذیب کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ میں اپنی گفتگو میں بہت محتاط ہوں اور بڑی کوشش کے ساتھ چہرے سے شرافت اور متانت کا اظہار کرتا ہوں۔ مجھے بس اپنی انہیں باتوں پر فخر ہے۔ میں جوان ہوں میں نے موجودہ زمانے میں پرورش پائی ہے۔ ہر بات کو سمجھتا ہوں اور فریبِ حیات اور زندگی کے نشیب و فراز سے خوب آگاہ ہوں....

زندگی کی بہار کا مجھے احساس ہے۔ اور اس بہار کی ہر وجد آفرین رنگینی میری رگ رگ میں سمائی ہوئی ہے۔ ہر سانس، ہر اشارہ میرے دل کی دھڑکن کو تیز کرتا ہے۔ میرے رنگین خواب اور میری نادانیاں کسی کے

ضرر کا سامان نہیں ہیں۔ میں کسی کو دُکھ نہیں پہنچاتا اور خود بھی دُکھ نہیں اُٹھاتا بلکہ مجھے ایسی زندگی سے ایک راحت حاصل ہوتی ہے۔ اگر میں کسی کو خوش نہیں کرسکتا تو کیا یہ کم ہے کہ میں آپ خوش ہوں اور اپنی خوشی میں ایک عافیت کا احساس پاتا ہوں؟

زندگی ..... کیا زندگی ایک فرض ہے؟ کیسا فرض؟ — اوروں سے ہمدردی کرکے مسرت حاصل کرنا؟ بس یہی فرض ہے؟ شاید یوں ہی ہو ..... مجھے کوئی شکایت نہیں، زندگی اگر ایک فرض ہے تو ہُوا کرے ..... فرض شناس لوگوں کی دنیا میں کمی نہیں مجھے اپنے حال میں مست اور اپنی خوشی میں مگن رہنے دیجئے میں نے زندگی کے راز کو پالیا ہے۔ زندگی کا راز مسرت کے حصول میں ہے یہ مانا کہ اس راز تک رسائی حاصل ہونے میں مجھے ان لوگوں کے تجربات سے استفادہ ہُوا ہے جنھوں نے اپنے فرائض کی بجاآوری کے لئے اپنی عمریں گذار دیں، لیکن میں ناشکرا نہیں، میں اُن سب کا ممنون ہوں۔

دیوالی آرہی ہے۔ میرے محافظانِ اخلاق مجھے ابھی سے اخلاقی معیار اور اُس کی بلندیوں سے آگاہ کر رہے ہیں۔ دیوالی کیا ہے۔؟ ایک وقت! اور وقت گذر ہی جایا کرتا ہے ایک ناپائدار چیز کا اتنا خوف! وہ کیوں؟ دیوالی آئی اور گذر بھی گئی۔ اب دوسرا دن ہے بس یہی بات تھی جس کے لئے اتنا شور تھا؟ یہ بات کس قدر قابلِ غور ہے کہ آج عمر کا ایک سال اور گذر گیا لیکن اگر سوچا جائے تو ہر وہ لمحہ جس میں یہ سوچا جائے کہ وقت گذر رہا ہے ایک سال کے گذر جانے کا احساس پیدا کرے گا۔ دیوالی کے بعد ہر شخص نے اگلے سال کے لئے کوئی نہ کوئی لائحہ عمل سوچا ہوگا۔ کتنی ارادے باندھے ہوں گے۔ کتنی نئی تجاویز پر غور کیا ہوگا — لیکن آخر میں نے کیا سوچا ہے؟ یہی سوچا ہے کہ ..... کچھ نہیں سوچا!

میرے پڑوس میں ایک بوڑھا رہتا ہے۔ پڑوسی کی حیثیت سے تو وہ ایک دلچسپ آدمی ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ مذہب کے معین اخلاقِ حسنہ کا وہ بہت قائل ہے بلکہ بعض دفعہ تو اس کی باتیں سن کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ گلدستۂ اخلاق، پند سود مند اور اسی قسم کی اور کتابیں ہر وقت اُس کے زیرِ مطالعہ رہتی ہوں گی۔ کل صبح مجھے ملا تو باتیں کرنے لگا، باتوں باتوں میں اچانک بول اٹھا "دیکھو بھائی انسان کا ہر فعل رفتہ رفتہ ایک عادت کی صورت میں تبدیل ہو جاتا ہے اور آپ نے یہ بھی تو محسوس کیا ہوگا کہ انسان کوئی اچھا کام کرے تو خود بخود دل کو ایک خوشی یا تسکین سی محسوس ہوتی ہے اور اسی طرح کسی بُرے کام سے اس کے الٹ احساس پیدا ہوتا ہے۔ بعض دفعہ انسان کوئی نیک ارادہ باندھتا ہے مثلاً جیسے آج دیوالی کے روز آپ نے بھی تو کوئی نہ کوئی ارادہ باندھا ہی ہوگا، کیوں؟"

"میں نے؟ — میں نے کیا ارادہ باندھنا تھا؟ ہاں، خوش رہنے کا ارادہ ہے۔ مثلاً آج رات میرا ارادہ ہے کہ حسن و نکہت کے ایک مجسمے کی ہمراہی میں دیوالی کا میلہ دیکھنے جاؤں گا۔ ویسے تو اور بھی کئی ایک کے ساتھ میں جا سکتا تھا، لیکن اُس کے ساتھ جانے کی ایک خاص وجہ ہے، دیوالی میں اور میری اُس دوست میں ایک بات یکساں ہے، دونوں کی درخشانی و تابانی آنکھوں میں ایک چکاچوند پیدا کر دیتی ہے۔ ارادہ تو یہی ہے کہ میلے کے بعد میں اُسے گھر پر چھوڑ آؤں لیکن ممکن ہے کہ میلے کی چہل پہل اور زندہ دلی ہمارے دلوں میں بھی کسی انہونی، اچھوتی بات کو جگا دے، اس صورت میں وہ مجھے گھر چھوڑنے آئے گی، اور ممکن ہے گھر میں بھی داخل ہو جائے، اسی سے یاد آیا کہ اگر وہ یہاں تک آگئی تو کیا آپ آج رات کے لئے اپنا نیچے کا کمرہ عنایت نہیں فرما سکتے؟" — یہ میں نے جان کر پوچھا۔ بڑے میاں پہلے ہی پہلو بدل رہے تھے اس غیر متوقع درخواست سے گھبرا سے گئے اور کہنے لگے "ہاں ہاں، لیکن امید ہے وہ — اچھا میں چلتا ہوں، ذرا بازار جانا ہے"۔

دیوالی کی رات۔ امنگوں کی رات کی طرح تھی، جوان اور روشن! رنگ رنگ کی ساڑھیاں روشنی اور سایوں میں دماغ کے سکون کو برہم کرتی تھیں۔ میری دوست کے گورے گورے سڈول جسم پر کالی ریشمی ساڑھی ہوش و حواس کی دشمن نظر آتی تھی۔ گویا اُجالے اور اندھیرے کا ملاپ تھا۔ فضا سہانی تھی اور ہواؤں میں ایک موسیقی، ایک رفعت تھی، ایک شوکت جس کو صرف محسوس ہی کیا جا سکتا تھا۔ ہم دونوں اس شوکت کے جادو میں ڈوبے ہوئے، اپنی بے پناہ مسرتوں کے بل پر نظاروں کے اس طوفان میں بہتے ہوئے، سوتے ہوئے جاگتے ہوئے چلے جا رہے تھے، میری خوشی کی کوئی حد نہ تھی۔ میں خوش تھا اور یہ نہ جانتے ہوئے خوش تھا کہ کیوں خوش ہوں اور یہ سب کیا ہو رہا ہے، کیوں ہو رہا ہے۔ پھر مجھے یاد نہیں کہ ہم کہاں تھے کہ رات کے بارہ بج گئے۔ دیوالی کی رات ختم ہو گئی۔ اب سوچتا ہوں کہ ہم کیا

کر رہے تھے تو کوئی بات یاد نہیں آتی نہ کوئی واقعہ، نہ کوئی حرکت، نہ ہنگامہ۔ اگر یاد ہے تو صرف اتنا کہ ہم خوش تھے۔ صرف خوش اور ــــ ایک نازنین میرے ساتھ تھی! تو گویا یوں یہ سال دوسرے سالوں سے زیادہ شان کے ساتھ شروع ہوا اور اسی خوشی میں میں اپنے زاہد دوست کی نصیحتوں کو بھول گیا۔ جتنی بھی مسرت مجھ سے حاصل ہو سکی میں نے کرلی اور گویا اپنے اردگرد اور پاس کی تمام چیزوں سے مسرت کو چوس لیا یا یوں کہئے کہ مسرت سمندر کی ایک لہر تھی اور میں ساحل وہ میرے جسم تک آکر مجھ میں جذب ہوگئی۔ صبح سویرے جب ہوش قائم ہوئے تو میں اکیلا تھا۔

جب میں رات کو لوٹا تو ــــ گلیوں میں خاموشی تھی۔ اور گھر کی طرف یوں تنہا چل کر آنے میں بھی ایک لطف تھا کیونکہ میں مطمئن تھا، میرے دل کو ایک تسکین حاصل تھی۔ چاند کی روشنی پہلے سے کچھ زیادہ تیز ہوگئی تھی۔ بادل کہیں نام کو بھی نہ تھے۔ رات کی خاموشی تنہائی اور ایک سیلاب نور روح کو گرما رہا تھا۔ داخل ہونے سے پہلے میں نے دروازے پر تامل کیا۔ اپنے اردگرد نگاہ دوڑائی۔ مکانوں کی چھتیں دیواروں کے طویل سائے چپکے چپکے خاموشی کے گیت گا رہے تھے۔ بہت ہی سہانا وقت تھا۔ مجھ پر ایک کیف و سرور کی سی کیفیت طاری تھی اور مجھے افسوس تھا کہ میں اپنے روحانی اطمینان کا اظہار کسی سے نہیں کر سکتا۔ اُس وقت مجھے اپنا پڑوسی یاد آیا۔ آدمی خوش اخلاق ہے میں نے اس کے گھر کا رُخ کر لیا۔ یہ بھی نہ سوچا کہ اتنی دیر ہو چکی ہے وہ سوتا ہوگا۔ بس اپنی خوشی کے احساس کو اُس تک پہنچانے کے اضطراب میں اُس کا دروازہ جا کھٹکھٹایا۔ نوکر نے دروازہ کھولا۔ میں ایک بڑے سے کمرے میں داخل ہوا۔ اس سے پہلے اس کمرے میں کبھی نہ آیا تھا۔ کمرہ بالکل خالی تھا۔ کمرے میں فرنیچر کی قسم سے کوئی چیز موجود نہ تھی۔ صرف ایک آرام کرسی تھی جس پر میں جا بیٹھا۔ اور پڑوسی کا انتظار کرنے لگا۔ دیوار پر ایک کیلنڈر لٹک رہا تھا جس پر نئے دن کی تاریخ نمایاں تھی دیر ہوگئی اور میرا پڑوسی مجھے ملنے کے لئے نہ آیا۔ میں کرسی میں آرام سے بیٹھا ہوا تھا۔ جاگتے رہنے سے جسم میں کچھ تھکن سی محسوس کر رہا تھا۔ آخر کار انتظار کرتے کرتے وہیں سو گیا۔ جب میں جاگا تو میرے خیالات غیر مبہم تھے اور اُن پر آخری شب کی دھند موجود نہ تھی۔ یہ یاد کرنے سے پہلے یا اس خواہش سے پہلے کہ یہ یاد کیا جائے کہ میں کہاں ہوں، مجھے اپنے ماحول کا علم ہو چکا تھا۔ لیمپ بجھا دیا گیا تھا مگر کھڑکی سے چاند کی کرنیں اندر جھانک رہی تھیں۔ چاند کا رنگ پھیکا تھا اور صبح ہونے میں ایک آدھ ساعت باقی تھی۔ ہر شے پر کامل سکوت طاری تھا۔ مجھے کسی قسم کی کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ کیلنڈر کھڑکی کے پاس لٹک رہا تھا۔ چاند کی روشنی اُس پہ پڑتی تھی۔ میں نے اچانک دیکھا، میں گھبرایا نہیں مگر حیران ضرور تھا کہ میرے علاوہ ایک اور شخص اُس کمرے میں موجود ہے۔ وہ دروازے کے پاس ایک کونے کے اندھیرے میں چپکے سے کھڑا تھا۔ وہ خوشی سے مسکرا رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کوئی بات نہ کی اور نہ میں نے سلسلہ کلام شروع کیا۔ اُسے معلوم نہ تھا کہ میں اُسے دیکھ رہا ہوں کیونکہ میں بے حس و حرکت خاموشی سے لیٹا ہوا تھا۔ وہ ٹہلتا ہوا آگے بڑھا۔ ہلکی ہلکی روشنی میں ایک جوان چہرہ نظر آیا۔ اُس چہرے میں ایک دلکشی تھی۔ اس کے عقب میں چاند کی روشنی سے ایک گہرا سایہ دیوار پر پڑتا تھا جو اس کی ہر حرکت کے ساتھ حرکت کرتا تھا۔ وہ بہت دیر تک خاموشی سے کمرے میں ادھر اُدھر دیکھتا رہا۔ وہ اب بھی مسکرا رہا تھا مگر میں خاموش رہا۔ میں اُس سے کچھ اس قدر مانوس ہو گیا کہ مجھے پھر نیند آنے لگی اور اُس کی موجودگی کا چنداں احساس نہ رہا۔ جوں جوں وقت گذرتا گیا میں نے یہی محسوس کیا کہ اس کے یہاں ہونے میں کوئی حرج نہیں ہے بلکہ یوں نظر آتا تھا کہ اگر وہ کمرے میں موجود نہ ہو تو کمرہ نامکمل نظر آئے گویا کمرے کی بناوٹ اور ساخت کے لئے وہ کوئی لازمی شے تھی۔ پھر معاً وہ مڑا اور کیلنڈر کی طرف بڑھا اور اُس نے ایک ورق پھاڑ ڈالا۔ وہ اسی طرح کرتا رہا اور ایک دن کے بعد دوسرے دن کے شمار کو علیحدہ کرتا گیا۔ اُس کے ہاتھوں کی جنبش میں مجھے لطف آتا تھا۔ وہ ایک مخصوص انداز سے ہاتھ بڑھاتا، اس کی رفتار ہمیشہ یکساں رہتی پھر ہر بار اُس کی انگلیاں پھیل کر کاغذ سے چمٹ جاتیں۔ کلائی اوپر اٹھتی اور ہاتھ ایک جھٹکے کے ساتھ نیچے آتا اور انگلیوں سے ایک دن پھسل کر نیچے گر پڑتا۔ دیوار پر ایک سایہ لرزتا ہوا حرکت کرتا اور ساکن ہو جاتا۔ وہ ایک مدت تک اسی عمل کو ایک شان بے نیازی اور بے خبری سے دہراتا رہا، اور اُس کی صورت سے ظاہر تھا کہ اُسے اس عمل میں ایک راحت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ خوش تھا۔ کمرہ اب بھی ساکن و خاموش تھا۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ کیلنڈر سے گرے ہوئے کاغذوں کا ڈھیر پھیلتے پھیلتے مجھ تک آ پہنچا ہے۔ پھر پھینکے جانے والا کاغذ

بڑھتے ہوئے ڈھیر سے پھسل کر میرے قریب آگرتا ہے۔ مگر میں نے اس کی پروا نہ کی کہ کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے میں نیم وا آنکھوں سے دنوں کے اس طرح معدوم ہونے کا لطف لیتا رہا۔ میرے اس لطف میں کوئی چیز بھی حائل نہ تھی اور یہی بات میرے اطمینان کا باعث تھی۔ مجھے اُس ہاتھ کی ہر بار ایک ہی قسم کی یکساں حرکت بہت پسند تھی۔ حتّٰی کہ دنوں کے بعد مہینے انگلیوں کی نذر ہو گئے۔ ہاتھوں کی جنبش تیز ہوتی گئی اور آخر انگلیاں ایک وحشیانہ انداز میں رقص کرنے لگیں۔ اس رقص کو میں کبھی نہ سمجھ سکا۔ اب تو کیلنڈر پر الفاظ بھی مشکل سے ہی دیکھنے کی فرصت ملتی تھی۔ میں اندازے ہی سے جان لیتا تھا کہ فلاں دن انگلیوں سے پھسل کر فرش پر جا پڑا ہے۔ میں نے اکتیس بار دیوالی کی شب کو کیلنڈر پر نمودار اور غائب ہوتے ہوئے دیکھا۔ اب مجھے دیوالی کے آنے اور جانے کے انتظار میں بہت لطف آتا۔ یہاں تک کہ دیوالی آئی بھی اور چلی بھی گئی لیکن ہاتھ کی جنبش میں فرق نہ آیا وہ انگلیاں بدستور اپنے کھیل میں مشغول رہیں۔ کئی بار دیوالی آئی اور چلی گئی۔ اب میں انگلیوں کی طرف نہ دیکھتا تھا بلکہ ایک زبردست ڈھیر پہ پھیلنے والے کاغذ ہی میرے لئے جاذبِ نگاہ تھے۔ وقت کو بہتے ہوئے دیکھا۔ سال گذرا۔ اُس کے بعد دوسرا گذرا اور اسی طرح کئی گذر گئے۔

اب مجھے اس کامل سکوت میں ایک مبہم سی آواز سنائی دینے لگی۔ اس سے پہلے میرے کان ایسی آواز سے مانوس نہ تھے۔ شاید پہلے یہ آواز نحیف تھی جسے میں سن نہ سکا تھا مگر اب ایک بے ترتیب سے شور میں ترتیب کے آثار پیدا تھے۔ میں نے اب پہچانا کہ یہ آواز کاغذوں کے پیہم گرنے کی سرسراہٹ ہے جن کی رفتار پہلے سے اس قدر تیز ہو چکی ہے کہ ایک کے گرنے سے پہلے دوسرا اُس پر آگرتا ہے۔ اب ان ہاتھوں میں بھی تھکن کے آثار نمایاں تھے۔ میں اب کچھ مضطرب سا تھا۔ میرے دل کی دھڑکن پہلے سے تیز ہو چکی تھی۔ میں نے کیلنڈر کی طرف غور سے دیکھنا چاہا۔ لیکن اب مجھے ہر شے کچھ دھندلی دھندلی دکھائی دیتی تھی اور کاغذوں کے گرنے کی آواز کا بھی محض ایک احساس باقی تھا۔ یوں جیسے تیزی سے پانی بہتا جا رہا ہو یا جیسے کسی درخت کی ٹہنیوں سے ٹکراتی ہوئی ہوا گذر جائے۔

میں نے اس نوجوان کے چہرے کو غور سے دیکھنے کی کوشش کی۔ اُس کے چہرے کے نقوش بھی دھندلے تھے۔ کیونکہ چاند کی روشنی مدھم ہو رہی تھی اور بہت ہی کم تھی۔ تاہم میں نے دیکھ ہی لیا۔ اب اُس کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ مفقود تھی۔ مگر وہ اپنے کام میں زیادہ متانت سے دلچسپی لے رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں کے نیچے گڑھے پڑے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھوں کی شگفتگی اور تازگی کی جگہ زردی اور جھریاں آگئی تھیں۔ تمام چہرہ بگڑا ہوا تھا۔ پچکے ہوئے گالوں میں گہری لکیریں نظر آتی تھیں۔ یہ لکیریں ڈھلکتی ہوئی اور بڑھتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ اُس کی صورت اور اس کے اطوار کے متعلق میں کوئی صحیح اندازہ نہ لگا سکتا تھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہُوا نظر آتا تھا۔ شاید اُسے بھی میری طرح دنوں کے بڑھتے ہوئے ڈھیر کا احساس تھا۔ پھر معاً میں نے ایک چیز دیکھی جو شاید آہستہ آہستہ معرضِ وجود میں آئی ہوگی۔ اس کے گالوں کا گوشت ڈھلکتے ڈھلکتے ایک تھیلی کی صورت میں اُس کی ٹھوڑی کے نیچے لٹک رہا تھا۔ میں ابھی دیکھ ہی رہا تھا کہ دیوار پر گہرے سائے بھی مدھم پڑ گئے۔ ان کی وضاحت جاتی رہی۔ صرف دھبے سے نظر آتے تھے۔ گردن اکڑی ہوئی تھی اور گھٹنے جھکے ہوئے۔ پھر یہ تمام منظر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور اس تیرگی میں صرف کاغذ کا سفید ڈھیر دکھائی دیتا تھا۔ کھڑکی سے چاند کی زرد زرد روشنی بہت ہی ہلکی اب بھی آ رہی تھی جس میں کاغذ گرتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ آخر کار کوئی بھاری چیز اس ڈھیر پر گری اور وہ ہلکی سی سرسراہٹ ہمیشہ کے لئے بند ہو گئی۔ کاغذوں کا اضطراب ختم ہو گیا۔ کہیں سے تند و تیز ہوائیں آئیں اور ڈھیر کو اُڑا کر بکھیر گئیں ہر طرف کمرے میں کاغذ ہی کاغذ پھیل گئے اور فضا میں تیرتے ہوئے نظر آنے لگے۔ کبھی کاغذ اوپر اٹھتے اور کبھی پھر فرش پہ جا گرتے۔ وہ ہاتھ اب بالکل ساکت تھا۔ اور چاند کی روشنی میں ایک کفن میں لپٹی ہوئی نعش پڑی تھی۔ چار آدمی داخل ہوئے اور انہوں نے نعش کو اٹھا لیا۔ پھر چارپائی پر رکھ دیا۔ کسی نے چہرے سے کپڑا اٹھایا۔ کپڑا میری آنکھوں اور کھڑکی سے آنے والی شعاعوں کے درمیان حائل ہو گیا اور میں کچھ دیکھ نہ سکا۔ میں نے اپنے سر کے پاس کسی کو کہتے سُنا۔

"پھول پرسوں گنگا میں بہلنے کو لے جائیں گے!"

(انگریزی سے)

مجید لشاری

غزل

نیک و بد کونین سے بیگانہ سمجھئے
دیوانہ سمجھئے مجھے دیوانہ سمجھئے

ابر آئے تو چلتا ہوا پیمانہ سمجھئے
یا دوش ہوا پر کوئی مے خانہ سمجھئے

شوریدہ سرِ عشق کو دیوانہ سمجھئے
جب حد سے گذر جائے تو فرزانہ سمجھئے

جو ترکِ محبت کے لئے کرتا ہو مجبور
دانا نہ سمجھئے اُسے دانا نہ سمجھئے

ناکام تمناؤں کی بستی ہے مرا دل
اِس کشورِ آباد کو ویرانہ سمجھئے

افسانۂ مجنوں میں سناؤں تمہیں کیونکر
افسانہ ہے افسانے کو افسانہ سمجھئے

ہر گام پہ سجدے کے لئے سر ہو خمیدہ
ہر ذرّے کو تابِ رُخِ جانانہ سمجھئے

پھوٹی ہوئی تقدیر نہ کہئے اُسے ہرگز
ٹوٹا ہوا شیشہ ہو تو پیمانہ سمجھئے

مسکن ہے ازل ہی سے مرے دل میں بتوں کا
کعبہ نہ سمجھئے اسے بُت خانہ سمجھئے

ہر سانس میں ہے موت کے امکاں کی حکایت
اِس ہستئ موہوم کو افسانہ سمجھئے

نکتہ ہے غزل میں یہی اے حضرتِ ساگر
ہر نقطے کو اُلفت کا اک افسانہ سمجھئے

بلونت کمار ساگر

نعرۂ رندانہ

نہ آ قریب ہم نشیں
مجھے ہے عشق آتشیں
خیالِ زندگی محال تلاشِ بے خودی خیال
لگا کے اپنے من میں آگ فنا کا گا رہا ہوں راگ
نہ آ قریب دور بھاگ
ہم نشیں
جلا نہ دوں تجھے کہیں
مجھے ہے عشق آتشیں

نکل رہی ہے آہ سرد
عجیب کیف زا ہے درد
بگاڑ دی جنوں نے بات سکونِ دل کی کائنات
رہا نہ کوئی اختیار نصیب اب کہاں قرار

نکل رہی ہے بار بار
آہ سرد
عبث نہیں ہے رنگ زرد
مجھے ہے عشق آتشیں

نگاہِ ناز بے نیاز
یہی ہے رازِ سوز و ساز
اسی میں ہے غم سرور حقیقتِ جہانِ طور
مگر ہو لاکھ دل فگار طلسمِ حسنِ سحر کار
نگاہِ ناز ہو ہزار
بے نیاز
مجھے ہے شوقِ جاں گداز
مجھے ہے عشق آتشیں

قیوم نظر

ایک گذری ہوئی صحبت

وہ چاند سے چہروں پہ تڑپتے ہوئے آنچل — بلور کی باہوں پہ وہ ریشم کے کنارے

بہکی ہوئی نظروں سے ابلتی ہوئی مستی — مستانہ نگاہوں سے برستے ہوئے تارے

وہ عارض گلرنگ کے بھڑکے ہوئے شعلے — رقصاں وہ فضاؤں میں شرارے ہی شرارے

رِستی ہوئی ہونٹوں سے مےِ ناب کی بوندیں — آنکھوں میں مچلتے ہوئے ارمان کے دھارے

رُکتی ہوئی نبضیں، وہ دھڑکتے ہوئے سینے — ملتی ہوئی نظریں وہ اشارے، وہ سہارے

ہمکی ہوئی سانسوں کا دل آویز ترنم — ہائے! وہ مچلتے ہوئے گیتوں کے طرارے

بنتا ہوا وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں فسانہ — شرمیلی نگاہوں کے وہ بے لاگ اشارے

ہر سمت وہ اُمڈی ہوئی پھولوں کی جوانی — ہر سمت چمکتے ہوئے، ٹوٹے ہوئے تارے

ہر سو وہ گل و رنگ کی نکھری ہوئی جنت — ہر سو وہ مے و شہد کے اُمڈے ہوئے دھارے

وہ کیف، وہ موسم، وہ جوانی، وہ محبت،
مت پوچھ کہ وہ لمحے کہاں میں نے گذارے!

(سید ضمیر جعفری)

دنیائے ادب

تازہ ترین رسائل کے اہم مضامین

کا تذکرہ اور جائزہ

اردو (جنوری ۱۹۶۱ء)

جدید ہندی کا سرمایۂ ادب

اس جامع اور دلچسپ مضمون میں گوری سرن لال صاحب سری واستو نے گذشتہ صدی کے نصف آخر اور موجودہ صدی کے پہلے چالیس سال کے ہندی ادب پر ایک گہری نگاہ ڈالی ہے۔ اور ان مختلف تحریکوں کا تجزیہ کیا ہے جن سے جدید ہندی کی نظم و نثر متاثر ہوئی۔ وہ لکھتے ہیں کہ غدر کے بعد جب ملک میں ایک مستحکم نظام حکومت قائم ہوا تو ہندوؤں نے یہ جان کر کہ اب ایک غیر معین عرصے تک انہیں انگریزی حکومت کے زیر سایہ زندگی بسر کرنا ہے، اپنی معاشرت اور اپنے ادب میں ایک نمایاں تبدیلی پیدا کر لی۔ مسلمانوں کی سیاسی قوت کا کمزور ہونا ملکی ادب میں ایک ردِ عمل کا آغاز تھا۔ اس ردِ عمل کی شدت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ہندو ادیبوں نے برج بھاشا کو جو اردو زبان کی تشکیل میں فارسی کے ہم پلہ بلکہ اس سے بھی کئی قدم آگے تھی یکسر ترک کر دیا اور اس کی جگہ کھڑی بولی کو رواج دیا جو فارسی اور عربی الفاظ سے قطعاً عاری اور نامانوس سنسکرت الفاظ سے معمور تھی۔ یہاں تک ہندی ادب کا تعلق ہے۔ گذشتہ اسی نوّے برس کی تاریخ اسی کھڑی بولی کے نشو و ارتقا کی کہانی ہے۔ صاحبِ مضمون نے یہ بات صاف نہیں کی کہ ادب میں اس تبدیلی روش کا عوام کی بول چال پر کیا اثر پڑا اور اگر نہیں پڑا تو اس کے اسباب کیا تھے، یہ ایک بہت دلچسپ بحث ہوتی مگر افسوس کہ سری واستو صاحب نے اسے بالکل نہیں چھیڑا۔ بہرحال کھڑی بولی یعنی موجودہ ہندی نے اردو سے علٰحدہ ہو کر اپنے لئے ایک نیا راستہ تجویز کر لیا اور زبان کے اختلاف کے ساتھ ساتھ خیالات بھی مختلف ہوتے گئے۔ سیاست اور مذہب کے اثرات اس پر مستزاد تھے۔ چنانچہ موجودہ ہندی زیادہ تر ایک خاص فرقے کے خیالات کی حامل ہو گئی، اگرچہ وقتاً فوقتاً اس میں ایسی چیزیں بھی ظاہر ہوئیں جیسے پیغمبر اسلام کی سیرت اور ایران اور عرب کے تمدن و معاشرت پر جامع اور قابلِ قدر تصانیف ہوئیں نظم میں خمریات وغیرہ۔ لیکن انہیں مستثنیات ہی سمجھنا چاہئے۔ ہندی میں نظم کی بہ نسبت نثر نے بہت زیادہ ترقی کی۔ مغربی زبانوں کے علاوہ بنگالی گجراتی اور مرہٹی سے خوب استفادہ کیا گیا، اور ان زبانوں سے متعدد تصانیف ترجمے کے ذریعے ہندی میں منتقل ہوئیں۔ اصطلاحات کا مسئلہ جب سامنے آیا تو سنسکرت سے مدد لی گئی۔ اور عربی فارسی سے قطعی طور پر پرہیز کیا گیا۔ زبان کے اس نئے انداز کی نسبت صاحبِ مضمون کے اپنے الفاظ ملاحظہ فرمائیے:۔

> "جدید ہندی میں معاشرتی رنگ زیادہ ہے، درباری رنگ بہت کم۔ ہندوستان کے محکوم ہونے کی وجہ سے راج دربار کی روایات فنا ہو گئیں۔ اس لئے صرف تمدنی مذہبی اور سیاسی تحریکوں پر سماج کی زندگی کا دار رہا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف قسم کی اصطلاحات ہماری روزانہ بول چال میں شامل ہو گئیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے زمانے میں دربار کی بول چال کی زبان فارسی تھی۔ کچھ تو فارسی کا رواج یوں ہی کم ہو گیا تھا۔ دوسرے ایسے مسلمانوں کے طبقے کی خاص زبان سمجھ کے ہندی والوں نے اسے دور ہی سے سلام کیا۔ اسی باعث ہندی اس سچ و سچ سے محروم رہی جو اردو کا حصہ ہے۔ فارسی کے وہ الفاظ جو ہماری عام بول چال میں رائج تھے، انہیں بھی دیس نکالا ملا۔ لیکن جب ان کی کمی محسوس ہونے لگی تو مجبوراً سنسکرت کے الفاظ کی بھرمار ہو گئی۔ یہ الفاظ یقیناً نامانوس تھے۔ لہٰذا زبان کا ڈھانچہ بدل گیا اور بعض ہندی مصنفین کی زبان چیستان بن کر رہ گئی۔"

یہاں پہنچ کر صاحبِ مضمون ہندی نظم کا جائزہ لینا شروع کرتے ہیں۔ ان کی رائے میں خالص شعریہ شاعری کے دور کا آخری شاعر بدیاکر تھا۔ جس کے نغمے اب تک دیہات کی فضاؤں میں گونج رہے ہیں۔ لیکن مغربی اثرات

کے ماتحت یہ دور انیسویں صدی کے نصف ثانی میں ختم ہوگیا۔ اور ہریش چندر نے بھارت درردشا نامی ایک ناٹک لکھ کر قومی شاعری کی بنیاد رکھی۔ اس واقعہ کو سری دستوا صاحب یوں بیان کرتے ہیں :۔

"وہ دن ہندی ادب کی تاریخ میں یادگار رہے گا۔ صدیوں کے سوئے ہوئے ادب نے کروٹ بدلی، انقلاب کی دھوم مچی، قوم کے منتشر اجزا کی شیرازہ بندی ہوئی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تمام ملک کے لئے ایک زبان بنانے کی کوشش شروع ہوئی۔۔۔۔۔ معمولی حسن و عشق کے خیالات کی جگہ حب الوطنی کا امنڈتا ہوا سمندر سامنے تھا۔ یہ تغیر در اصل عظیم الشان تھا۔ یہ ہندی ادب کی خوش قسمتی کا باعث ہوا۔ اسی وقت سے ہندی کے دن پھرے۔ آج ہمارے پاس جو کچھ بھی اعلیٰ درجے کا ادب ہے اس کا مبدا یہی زمانہ تھا۔"

اس بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ہریش چندر ہندی کا حالی تھا۔ حالی نے اردو نظم میں ایک بالکل نئی روش کا آغاز کیا اور ہریش چندر نے ہندی شاعری کی بہتی ہوئی ندی کا رُخ عشق و محبت سے وطنیت کی طرف پھیر دیا۔ ہریش چندر کے بعد کے شعرا سیاسی اور اصلاحی نظمیں لکھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسی نظموں کا ادب میں کیا درجہ ہو سکتا تھا۔ نہ صرف تخیل بلکہ زبان بھی ادنیٰ تھی کیونکہ ان کی ساری توجہ بقول صاحب مضمون شاعری کو قدیم زمانے کی غلامی سے آزاد کر کے اس میں حب وطن کا رنگ کوٹ کوٹ کر بھرنے میں لگ رہی تھی اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس قسم کی کوششوں کے لئے نظم کی بہ نسبت نثر بہتر ذریعہ ہے۔ کاش کہ ہمارے ترقی پسند شاعر ہندی کی اس مثال ہی سے کچھ سبق لیں اور اردو نظم پر رحم فرما کر اپنی توجہات کو غریب نثر تک ہی محدود رہنے دیں۔

ہریش چندر کے بعد پنڈت سری دھر پاٹھک اور پنڈت مہابیر پرشاد دویدی آتے ہیں۔ پاٹھک جی نے گولڈ اسمتھ کے "ڈزرٹیڈ ویلیج" اور "ٹریولر" کے تراجم ہندی میں کئے۔ دویدی مرہٹی ادب کے بہت شیدا تھے اور انہوں نے "کمار سمبھو" کو ہندی میں منتقل کیا۔ اب سوامی دیانند کا اثر زبان پر بھی پڑ رہا تھا اور ہندی پر سنسکرت کا غلبہ ہوتا جا رہا تھا جس کے باعث ہندی نظم سادگی سے عاری ہوتی جاتی تھی۔ اجودھیا سنگھ اُپادھیا کی شاعری اس رنگ کی روشن مثال ہے۔ اُپادھیا کے برعکس پنڈت گیا پرشاد سنہی کی زبان فارسی آمیز ہوتی ہے اور اس سلسلے میں ان کا مقابلہ اکثر ان کے ہمعصر سنسکرت نواز شاعر متیلی سرن گپتا سے کیا جاتا ہے۔ گپت رزمیہ نظمیں بہت خوب لکھتے ہیں اور انہیں تاریخی پس منظر سے آراستہ کرتے ہیں۔ تاریخی کرداروں کی سیرت نگاری میں انہیں بہت مہارت ہے اس لحاظ سے گویا وہ ہندی کے حفیظ ہیں۔ انہوں نے بنگالی کی بعض مشہور نظموں کو بھی ہندی میں منتقل کیا ہے جن میں "پلاسی یدھ" خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ گیا پرشاد سنہی، جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، اردو آمیز زبان میں سماجی موضوعات پر شعر کہتے ہیں اور اسی طرح لالہ بھگوان دین بہادران سلف کے کارنامے اسی آسان زبان میں بیان کرتے ہیں۔ صاحب مضمون اس موقعہ پر لکھتے ہیں کہ "قومی شاعروں کو ادبی زبان کی اتنی ضرورت نہیں ہوتی جتنی عوام کی بول چال کی۔ اس لحاظ سے ان دونوں شاعروں نے اپنے لئے مناسب زبان کا انتخاب کیا ہے"۔ ان کے اس لطیف قول میں ہندی اردو کے موجودہ جھگڑے کا ایک خوبصورت حل پنہاں ہے۔ پنڈت رام نریش ترپاٹھی قومی نظمیں لکھتے ہیں لیکن بقولِ جناب سری واستوا ان کی سیاست ان کے شعر میں روڑے اٹکاتی ہے۔ برج بھاشا اسکول کے زودمند شاعر کوی رتن اور جگن ناتھ داس رتناکر ہیں۔ کوی رتن کی شاعری کرشن بھگتی سے بہت متاثر ہے اور رتناکر شاعر فطرت ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے خیالات پر جدید نفسیات کا گہرا اثر پڑا ہے۔ گنگا اترن ان کی بہترین نظم ہے۔ روپ نرائن کی نظموں میں ایک رس ہوتا ہے جو ان کی جذباتی شاعری کو نہایت موثر بنا دیتا ہے۔ سیارام سرن گپت سماجی زندگی کے دردناک مرقعے پیش کرنے میں سب سے آگے ہیں۔ انوپ شرما شجاعت اور بہادری کے گیت گاتے ہیں۔ اور جے شنکر پرشاد کے منظوم ناٹک اپنے رسیلے گیتوں اور تاریخی عکاسی کے باعث بہت مقبول ہیں۔ سورج کانت ترپاٹھی نرالا کا ہندی نظم میں وہی انداز ہے جو اردو نثر میں مہدی الافادی کا تھا۔ وہ الفاظ کی مصوری کرتے ہیں اور ہندی میں نظم معریٰ کے بانی ہیں۔ مگر ان کے ہاں سنسکرت الفاظ اور ترکیبوں کی بھرمار ہوتی ہے۔ سمترا نندن پنت کی زبان میں ترنم ہے اور وہ اپنے موضوع فطرت سے مستعار لیتے ہیں۔ کھڑی بولی کے روکھے پن میں شیرینی پیدا کرنے کی کوششوں میں انہیں خاصی کامیابی حاصل ہوئی ہے اور مہادیوی ورما مشہور شاعرہ کی نسبت صاحب مضمون کا خیال ہے کہ

"جس درد اور کسک سے بے تاب ہو کر ان کی موسیقی پھوٹ پڑتی ہے وہ اس دنیائے آب و گل کی چیز نہیں، عالم بالا کی چیز معلوم ہوتی ہے یقیناً ان کی شاعری رباب دل کے ہر ہر تار کو چھیڑ دیتی ہے"۔

جدید ہندی شاعری ایک طرف مغرب کے رنگ میں رنگی جا رہی ہے اور دوسری جانب اردو کے زیر اثر اس میں قنوطی اور المیہ عنصر نمایاں ہوتا جا رہا ہے۔ صوفیانہ اور جذباتی شاعری کے علاوہ اب ہندی ادب میں قومی اور اشتراکی شاعری بھی اپنا دخل پیدا کر رہی ہے۔ اس بارے میں صاحب مضمون

کاقول ہے کہ جدید ہندی شاعری راج درباروں کے حدود سے نکل کر کارزارِ حیات میں آئی ہے۔ روپ رنگ کو چھوڑ کر وہ قلب اور روح کی طرف جھکتی اور عام زندگی کی آئینہ دار ہوتی جا رہی ہے۔ وہ حقیقت کی جھلکیاں دکھاتی اور انقلاب کا ناقوس بجاتی ہے"۔ جدید ہندی شاعری کے علم برداروں میں سری دھر پاٹھک، گیا پرشاد شکل، مادھو شکل۔ اور مکھن لال چترویدی، قومی شاعروں میں متھیلی سرن گپت، پریمی، اور رام نریش، صوفی شعرا میں جے شنکر پرشاد نرالا، سمترانندن پنت، لچھمی نرائن مصر اور راما شنکر بردے، جذبات نگاروں میں سیارام سرن۔ گورو بھگت سنگھ اور ہری بھاؤ اپادھیا، اور اشتراکی آتش نفسوں میں جگن ناتھ پرشاد۔ ہری کرشن پریمی۔ نوین۔ لگنے۔ نیپالی اور اودے شنکر بھٹ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

موجودہ ہندی نثر کے آغاز پر اس مضمون کے شروع میں کچھ اشارات دیئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ جو کچھ صاحبِ مضمون نے لکھا ہے وہ قدرے اُلجھا ہوا سا ہے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس کھڑی بولی نے برج بھاشا کو کب اور کیونکر عرصۂ زندگی سے نکالا بہرحال اس قدر صاف ہے کہ کھڑی بولی یا جدید ہندی کی ابتدا اردو ہندی کے جھگڑے سے ہوتی ہے۔ بقول صاحبِ مضمون" اتفاق سے خیال پیدا ہو گیا تھا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ اس وجہ سے اردو کے ہی نقشِ قدم پر ہندی کی بنیاد ڈالی گئی تاکہ ہندوؤں کے لئے بھی ایک زبان ہو جائے"۔

اس زبان کے اوّلین سرگرم سرپرست راجہ شیو پرشاد، ستارۂ ہند آف بنارس تھے۔ وہ مدارس کے ناظم تھے اور ہندی رسم الخط کے بہت بڑے حامی۔ انہوں نے ہندی میں خود بھی ریڈریں لکھیں اور دوستوں سے بھی لکھوائیں۔ مگر چونکہ ابھی جدائی نئی نئی تھی اس لئے ان کی ہندی خاصی فارسی آمیز تھی۔ رفتارِ زمانہ کے ساتھ ساتھ خلیج بڑھتی گئی۔ اِدھر ریڈروں سے بڑھ کر نوبت ادبی تصانیف تک پہنچی اور ہرلیش چندر نے متعدد بنگالی ناٹک ہندی میں ترجمہ کئے اور "ہریش چندر میگزین" اور "ہریش چندر چندرکا" کے نام سے ایک رسالہ اور ایک اخبار جاری کیا۔ اخبارات اور رسائل ہر زبان میں فروغِ ادب کے سب سے بڑے محرک ہوتے ہیں ہندی اس کلیے سے مستثنےٰ نہیں۔ چنانچہ چراغ سے چراغ جلنے لگا اور اچھے اچھے لکھنے والے کھڑی بولی کے شیدائیوں میں شمار ہونے لگے۔ ادھر سوامی دیانند کے زیرِ اثر آریہ سماج کے کارکنوں نے ہندی میں دینیات کی ترویج میں خوب زور لگایا۔ اس ذیل میں پنڈت بھیم سین شرما نے کئی ضخیم جلدیں آریہ سماجی لٹریچر کی تیار کر دیں اور تابعین کے لئے میدان صاف کر دیا۔ اسی زمانے میں ناگری پرچارنی سبھا کی بنیاد بنارس میں رکھی گئی اور رسالہ سرسوتی جاری ہوا اور مہابیر پرشاد دویدی اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ ناگری پرچارنی سبھا کی حیثیت ہندی میں وہی ہے جو اردو میں انجمن ترقی اردو کی ہے اور اس کے سہ ماہی رسالے ناگری پرچارنی پتر کا میں زبان و ادب کے متعلق گراں پایہ تنقیدی مضامین چھپتے ہیں۔ اس سبھا نے ہندی کے فروغ میں بہت کوشش کی۔ چنانچہ نہ صرف بہت سے قدیم مسودے جدید رنگ میں مقدمات سے مزین ہو کر زیورِ طبع سے آراستہ ہوئے بلکہ اس انجمن نے مصنفین کو بیش قیمت انعامات دے دے کر مختلف علوم و فنون پر گراں پایہ کتابیں لکھوائیں۔ ان میں سے "ہندی شبد ساگر" آٹھ جلدوں میں ایک مستند اور جامع لغت ہے جس میں قدیم و جدید ایسے ہر قسم کے الفاظ ہیں جو ہندی میں رائج ہیں یا ہو سکتے ہیں۔ عربی اور فارسی الفاظ بھی ان میں آگئے ہیں۔

جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں ناگری پرچارنی سبھا کا قیام ہندی ادب کی شاہ راہ پر ایک نہایت اہم سنگِ میل کا حکم رکھتا ہے۔ اس سبھا نے نہ صرف ہندی زبان کو لغت، گرامر، تاریخ و تنقیدِ ادب اور مغربی علوم کے تراجم سے آراستہ کیا، بلکہ اس نے اطراف ملک میں زبردست پروپیگنڈے سے پشاور سے آسام تک ہندی پڑھنے کا شوق پیدا کر دیا۔ یہ اس سبھا ہی کے پروپیگنڈے کا نتیجہ تھا کہ انگریزی لکھے پڑھے لوگ بھی ہندی کی طرف مائل ہو گئے۔ طلب کے ساتھ رسد کا بڑھنا ضروری تھا۔ چنانچہ ادب میں متعدد اسالیب کی بنیاد پڑی اور ظرافت، طنز، بحث مباحثہ، تمثیل، سنجیدہ مقالہ نگاری غرض کہ ہر قسم کی تحریریں زبان کی رونق اور قوت میں اضافہ کرنے لگیں۔ ادھر سیاسی تحریک نے زبان کو کلچر کا مظہر قرار دے کر طے کیا کہ ہندی ساری قوم کی زبان کہلائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مدارس میں اس کی تعلیم لازمی ہو گئی اور ہر قسم کے علوم و فنون پر اوریجنل تصانیف کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

ہندی ادب میں تنقید کا خاصہ اہم حصہ ہے۔ اس صنف کے متقدمین میں سے مہابیر پرشاد دویدی اور مصر برادران خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مصر برادران کا سب سے بڑا کارنامہ "ہندی ادب کی تاریخ" ہے شاعری کے نقادوں میں پدم سنگھ شرما اور کرشن بہاری مصر کے نام معروفِ خاص و عام ہیں۔ پنڈت رام چندر شکل کا اندازِ تنقید مغربی ہے انہوں نے جائسی، تلسی داس اور سور داس کے کلام پر بصیرت افروز مقالے لکھے ہیں۔

ہندی میں تمثیل نگاری نے کچھ ایسا فروغ نہیں پایا۔ صاحبِ مضمون نے اس کی وجہ یہ ظاہر کی ہے کہ "ہندی کے لئے ابھی تک پارسی اسٹیج کے علاوہ کوئی ٹھکانا نہیں ۔۔۔۔ پارسی کمپنیوں کی زبان نہایت مصنوعی قسم کی ہوتی ہے

ہندی کمپنیاں تیوہاروں کے علاوہ شاید کبھی اپنا کھیل نہیں دکھاتیں" ہماری ناچیز رائے میں سری واستو صاحب نے یہاں ایک لغزش کی ہے۔ وہ بھول گئے ہیں کہ ڈراما ہی ادب کی ایک ایسی صنف ہے جس میں کامیابی کا انحصار قبولِ عام پر ہے۔ تنقید، شاعری، تاریخ، سیاست، اور اس قسم کے دیگر مباحث پر آپ اپنی پسندیدہ زبان میں لکھیے۔ آپ کو کون روک سکتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ آپ کے پڑھنے والوں میں کم علم لوگوں کی تعداد کم ہوگی لیکن ڈرامے میں آپ ایسا نہیں کر سکتے۔ جب تک آپ گیلری کے ہمزبان نہیں ہوں گے، آپ کامیاب نہیں ہو سکتے۔ کھڑی بولی ایک علمی زبان بن سکتی ہے، لیکن عوام کی بول چال سے اسے کوئی نسبت نہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ خالص ہندی میں ڈرامے کا نشو و نما توقع کے مطابق نہیں ہوا۔ ہندی ڈرامہ نگاروں میں گووند بلبھ پنت، بدری ناتھ بھٹ، جوالا پرشاد سری واستو اور بے شنکر پرشاد نے نام پیدا کیا ہے پریم چند مرحوم نے بھی "سنگرام" اور "کربلا" دو ناٹک لکھے لیکن اس میدان میں انہیں قابلِ رشک کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ گووند بلبھ پنت کی "ورمالا" اور بے شنکر پرشاد کی "کامنا" اور "ایک گھونٹ" مقبول تمثیلیں ہیں لیکن موخرالذکر کا اندازِ نظر بے حد تنوطی ہے، اور ان کے پلاٹ کہانی کے اتار چڑھاؤ سے محروم ہیں۔ اس لئے یہ ڈرامے سٹیج کے مطالب کے نہیں ہیں۔ بحیثیت مجموعی ہندی حشر یا طالب بنارسی کا کوئی حریف نہیں پیش کر سکتی۔

ناول نگاری میں ہندی مصنفین کو نسبتاً زیادہ کامیابی ہوئی ہے۔ یہاں بھی ابتدا تراجم سے ہوئی، اور جیسا کہ اکثر ہوتا ہے۔ پہلے دور میں جاسوسی ناول بہت زیادہ لکھے گئے۔ طبعزاد ناول نگاروں میں کشوری لال گوسوامی بہت پُر نویس ہیں، لیکن ان کے ناول نہ صرف زبان بلکہ فن کے لحاظ سے بھی معمولی درجہ رکھتے ہیں۔ دیوکی نندن کھتری کا ناول "چندر کانتا سنتتی" بے حد مقبول ہوا اور کہتے ہیں کہ اسے پڑھنے کے لئے بہت سے لوگوں نے ہندی سیکھی۔ منشی پریم چند کی ناول نگاری ہندی میں ایک شاندار دور کا آغاز کرتی ہے۔

سیوا سدن (بازارِ حسن)، رنگ بھومی (چوگانِ ہستی)، پریم آشرم، کایا کلپ، پرتگیاں، نرملا اور غبن، ہاتھوں ہاتھ لئے گئے۔ ان کا آخری ناول گئو دان بھی بے حد مقبول ہوا۔ پریم چند کا سا گہرا مطالعہ اور شگفتہ اندازِ نگارش ہندی کے کسی اور ناول نگار کے حصے میں نہیں آیا۔ یہ قابلِ ذکر بات ہے کہ پریم چند کے جوہر کی نشو و نما اردو میں ہوئی، اگرچہ قدردانی ہندی نے زیادہ کی اور یہ بھی معتبر ذرائع سے معلوم ہوا کہ وہ اپنی اکثر چیزیں پہلے اردو میں لکھتے تھے بعد میں انہیں ہندی کا لباس پہنا دیتے تھے۔ پریم چند سے اتر کر دوسرا درجہ بے شنکر پرشاد کو حاصل ہے جن کا ناول کنکال واقعات نگاری اور معاشرتی مصوری کا ایک اچھا نمونہ ہے۔

افسانہ نویسی کے میدان میں ہمیں اچھے لکھنے والوں کا ایک خاصہ گروہ نظر آتا ہے۔ ہندی افسانہ نگاری پر مغربی ٹکنیک نے بڑا اثر کیا ہے۔ سماجی اور تاریخی مسائل پر لکھنے والوں کی زیادہ توجہ ہے۔ نفسیاتی کہانیوں کی بھی کمی نہیں۔ مختصر افسانے کی ابتدا اگر جا کمار گھوش سے ہوتی ہے اور ان کے بعد بے شنکر پرشاد، جوالا دت، پریم چند، بشمبھر ناتھ شرما، سدرشن، اور سہردیش وغیرہ آتے ہیں بے شنکر پرشاد اپنی اکثر کہانیوں کا مواد قدیم تاریخ کے اوراق میں تلاش کرتے ہیں۔ پریم چند کے اسلوب سے اردو والے اچھی طرح آشنا ہیں اس لئے ان کی نسبت کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے۔ واقعہ نگاری پر انہیں حیرت انگیز قدرت حاصل ہے۔ اور سماج کے پس ماندہ طبقے کی نفسیات پر انہیں پورا عبور ہے۔ پھر زبان و بیان کی خوبی میں بہت کم لوگ اُن کے ہمسر ہیں۔ بشمبھر ناتھ شرما کی کہانیوں کا تعلق خانگی معاشرت سے ہے اور وہ اس میدان میں اپنا کوئی حریف نہیں رکھتے، گو یادہ ہندی کے نیاض محسود ہیں۔ سہردیش کی کہانیوں میں شاعری اور زبان میں شعریت ہے۔ وہ واقعات نگاری کی چنداں پروا نہیں کرتے۔ چتر سین شاستری، رائے کرشن داس، ونود شنکر ویاس اور بیچن شرما اگر بھی معقول افسانہ نویس ہیں۔ آخر الذکر کی زبان بہت اچھی ہے۔ مگر معلوم نہیں اس سے کیا مراد ہے۔ عام فہم ہے یا ادیب نواز۔ ہمیں کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صاحبِ مضمون افسانہ نگاروں کے زمرے میں بعض قابلِ ذکر لوگوں کو نظر انداز کر گئے ہیں۔ مثلاً انہوں نے اُن نوجوان افسانہ نگاروں کا ذکر نہیں کیا جو یہ دگر لیسود ترقی پسند کہانیاں لکھ رہے ہیں، اور جن کی تعداد کم از کم یوپی میں قابلِ لحاظ ہے یا اردو کے بعض مقبول مصنفین کا جو ہندی میں بھی لکھتے ہیں، مثلاً عظیم بیگ چغتائی یا ایسے افسانہ نگاروں کا جو اگرچہ یوپی سے تعلق نہیں رکھتے لیکن اعلیٰ پایہ کے ہندی رسائل میں ہمیشہ لکھتے رہتے ہیں، مثلاً اُپندر ناتھ اشک۔ بہرحال چونکہ ہندی کی نسبت ہماری اپنی معلومات کچھ قابلِ فخر نہیں ہیں، اس لئے ہم صاحبِ مضمون کے انتخاب یا فروگذاشت پر حرف گیری نہیں کر سکتے ہاں، جینندر، بلراج ساہنی۔ واتسائن۔ اودیش پال ایسے نام ہیں جو اکثر سننے گئے ہیں۔

مقالہ نگاری میں ہندی نے وہ ترقی نہیں کی جو ایک زندہ زبان کے شایانِ شان ہو۔ بقولِ صاحبِ مضمون ہندی ادب کی یہ صنف ابھی تشنہ اور توجہ کی مستحق ہے۔ رام چندر شکل نفسیاتی مضامین بہت خوب لکھتے ہیں۔ سردار پورن سنگھ ٹھوس چیزیں لکھتے تھے لیکن اب وہ ہندی سے جدا ہو کر

انگریزی کی طرف چلے گئے ہیں۔

آگے چل کر سری واستو صاحب نے ہندی نظم و نثر کی مشہور کتابوں اور ان کے مصنفین کی ایک فہرست دی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر اہم صنفِ ادب میں سینکڑوں ہزاروں اچھی کتابیں تصنیف یا ترجمہ ہو چکی ہیں۔ یہاں اس قدر گنجائش نہیں کہ ان کا ایک سرسری تذکرہ بھی کیا جا سکے۔ بہرحال چند چیدہ کتابوں کا ذکر ضروری ہے۔

ڈراموں میں سری نواس کا پہلاد اور سنجوگتا سوئمبر۔ بدری نرائن کا بردھ ولاپ اور بھارت سوبھاگ۔ کیشو رام کا شمشاد سوسن۔ امان سنگھ کا مدن منجری۔ رادھا کرشن کا پدماوتی اور پرتاپ، دیوکی نندن کا بے نر سنگھ کی ہولی اور کلجگ کی بواہ اور کامیشور پرشاد کا دینس کا سوداگر قابلِ ذکر ہیں۔

تراجم کے ذیل میں روس فرانس اور جرمنی کے افسانوی ادب اور معاشیات اور تعلیمات نے زیادہ توجہ حاصل کی ہے۔ ہندوستانی لیڈروں کی لکھی ہوئی سیاسی کتابوں کو بھی ایک خاص درجہ حاصل ہے۔ مہاتما گاندھی کی تمام انگریزی اور گجراتی تصانیف ہندی میں منتقل ہو چکی ہیں اور کچھ انہوں نے خود ہندی میں لکھی ہیں پنڈت جواہر لال نہرو کی تمام تصانیف مثلاً میری کہانی، دنیا کا رنگ منچ۔ پتا کے پتر پتری کے نام ہندی میں آ چکی ہیں۔ اسی طرح لالہ لاجپت رائے کا دکھی بھارت سبھاس چندر بوس کا بھارت کا سنگھرش اور سی آر داس۔ رابندر ناتھ ٹیگور۔ رمیش چندر دت۔ سریندر ناتھ بینرجی اور راج گوپال اچاریہ کی متعدد تصانیف کو ہندی میں لیا جا چکا ہے۔

بعض مشہور انگریزی ناول نگاروں مثلاً میری کوریلی، اور کونن ڈائل کی اکثر تصانیف کے تراجم شائع ہو چکے ہیں۔ اگرچہ ان کا ادبی درجہ چنداں بلند نہیں۔ بنگالی کے اکثر مصنفین مثلاً بنکم چندر چیٹرجی، ٹیگور، شرت چندر۔ ڈی ایل رائے کی تصانیف کے کثرت سے ترجمے ہوئے ہیں۔ مغربی افسانہ نگاروں میں سے میکسم گورکی، ترجنیف۔ ڈیوما۔ موپساں اور کسی حد تک ٹالسٹائی ہندی میں منتقل ہو گئے ہیں۔ ان کے علاوہ اناطول فرانس، برنارڈ شا۔ گوئٹے ڈرائڈن۔ کولرج۔ براؤننگ سے بھی ہندی مترجمین نے استفادہ کیا ہے

کتابوں کی ایک بڑی تعداد عام سیاسی اور معاشرتی مسائل پر بھی موجود ہے۔ ان میں سے چند کے نام سنئے :۔ آج کا روس۔ کانگریس کا اتہاس جاپان کی باتیں۔ بہادر شاہ کا مقدمہ۔ بیگموں کے آنسو۔ فرانس کی راج کرانتی۔ ہمارے گاؤں کا سدھار اور سنگھٹن۔ ہند سوراجیہ۔ فاشزم اور نازی ازم۔

ہندی میں سوانح عمریوں کا بہت رواج ہے اور تقریباً ہر بڑے آدمی کی سوانح عمری لکھی جا چکی ہے۔ مذہب اور روحانیات کو بھی توجہ کا ایک حصہ ملا ہے اور حال میں عورتوں اور بچوں کے لئے بھی آسان کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ عورتوں نے خود تصنیف و تالیف میں کافی دلچسپی لی ہے۔ اور نظم و نثر دونوں میں انہیں کامیابی حاصل ہوئی ہے

> "ہندی انشا پردازی میں ابھی پختگی نہیں آئی ہے لیکن اس کی امید ضرور ہے۔ ہندی زبان اور ادب کی موجودہ صورت دراصل بہت امید افزا ہے۔ اس میں ایسے بیج ضرور ہیں جو وقت پا کر پھولیں پھلیں گے۔ ...... ہندی کو سرمایہ داروں سے کافی مدد پہنچی ہے۔ چنانچہ ناگری پرچارنی سبھا، ساہتیہ سمیلن، بھارتی ساہتیہ پریشد اور دکشن راشٹر بھاشا پرچارک سنگھ یہ سب مالدار ادارے ہیں اور اپنا اپنا کام بفراغت چلا رہے ہیں اور بیش قیمت انعامات کے ذریعے ہندی مصنفین کا دل بڑھایا جا رہا ہے ..... ان انعامات کے باعث بہت اچھی کتابیں ہندی میں شائع ہو سکیں جن میں اجات شترو، کامائنی، پریم پرداس۔ دیہست پستی در شبنم ادبی شاہکار ہیں"

مندرجہ بالا اقتباس پر یہ قابلِ قدر مضمون جو کم و بیش چالیس صفحات پر پھیلا ہوا ہے ختم ہوتا ہے اور اردو والوں کے لئے فکر و توجہ کا ایک طویل لمحہ یادگار چھوڑتا ہے۔

نگار۔ جنوری ۱۹۴۷ء

نظیر میری نظر میں۔ یہ دلچسپ مضمون جو جناب نیاز فتح پوری کے قلم سے نگار کے نظیر نمبر میں شائع ہوا ہے۔ نظیر کی شخصیت اور اس کی شاعری کا ایک اجمالی سا جائزہ ہے۔ سب سے پہلے صاحبِ مضمون نے نظیر کے اس شعر سے کہ

> سب جانتے ہیں چٹکلے بازی نظیر کی
> اس کے تو ہر سخن میں ہے اے یار چٹکلا

نظیر کی افتادِ طبیعت اور اس کی شاعری کی گوناگوں کیفیات کا تعین کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ

> "اس کا کوئی کلام ایسا نہیں جس میں کچھ چھیل بل نہ ہو کوئی الوٹ نہ پائی جاتے اور ایک قسم کی اینڈ موجود نہ ہو لیکن ان سب کے ملنے کے

بعد جو چیز بنتی ہے اسے کس لفظ سے تعبیر کر سکتے ہیں، یہ بات سمجھ
میں نہ آتی تھی جب نظیر کے مقطع نے سمجھا دیا کہ اسے چھچھلے بازی کہتے
ہیں اور نظیر ایک چھچھلے باز شاعر تھا۔"

چھچھلے بازی کا جو مفہوم معروف ہے، اسے نظیر ایسے غمّازِ فطرت کی شاعری پر چسپاں کرنا کچھ زیادتی سی معلوم ہوتی ہے۔ نظیر کا بیشتر کلام مطالعے کی گہرائی اور بیان کی رنگینی کا ایک دلکش امتزاج ہے۔ اس نے اپنے تاثرات کو الفاظ کا جامہ پہنانے میں ایک باکمال مصور کی سی باریک بینی اور حسن کاری دکھائی ہے اور نہ صرف اپنے وقت کی معاشرت اور اس کے لوازم و مسائل کی آئینہ داری کی ہے بلکہ زندگی کے گوناگوں مناظر اور بوقلموں کیفیتوں کو ایک سادہ مگر دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ ایسے فن کار کو چھچھلے باز کہنا کچھ موزوں معلوم نہیں ہوتا، مگر آگے چل کر صاحبِ مضمون نے چھچھلے باز کی ایک جامع تعریف بھی پیش کی ہے اس کے چند فقرے ملاحظہ ہوں:۔

"چھچھلے باز ہماری سوسائٹی کا وہ انسان ہے جو بچوں سے لے کر بوڑھوں تک، غریبوں سے لے کر امیروں تک ہر عمر و طبقہ کی محفل میں جگہ پیدا کر لیتا ہے جو کبھی بار خاطر نہیں بلکہ ہمیشہ یار شاطر ثابت ہوتا ہے اور جس کی ہنسی تکلف و تصنع سے بالکل پاک ہوتی ہے۔ اس کی زندگی کا رجائی پہلو ہمیشہ نمایاں رہتا ہے اور خود وہ ہنسے یا نہ ہنسے لیکن دوسروں کو ہنسانے کی کوشش ضرور کرتا ہے۔ وہ ایک ایسا مرنجاں مرنج، البیلا، کھلنڈرا اور چونچال لیکن بے ضرر انسان ہوتا ہے کہ وہ ہر شخص سے محبت کرنا چاہتا ہے اور ہر شخص اس سے محبت کرنے لگتا ہے۔ وہ مردِ مرتاض بننے کا دعوےٰ کبھی نہیں کرتا۔ وہ مذہب کی تنگ نظری سے ہمیشہ علٰحدہ رہتا ہے، وہ ایک نہایت دلچسپ قسم کا رند ہے جو دنیا کو دوسروں کی نگاہوں سے دیکھنے کا زیادہ شائق ہوتا ہے اور اپنے آپ کو سوسائٹی کے اندر جذب کر کے اپنی انفرادیت کو بھی اجتماعی چیز بنا دیتا ہے۔ دوسروں کے ساتھ گھل مل کر زندگی بسر کرنا اس کا نصب العین ہوتا ہے اور دل پر چوٹیں کھانے کے بعد بھی ہر وقت مسکراتے رہنا اس کا شعار..... اس کی زندگی یکسر نغمہ و رقص ہے جس میں سوائے قہقہۂ نشاط اور زمزمۂ زندہ دلی کے کچھ نہیں۔"

کلامِ نظیر کی داخلی شہادت سے یہ اندازہ لگانا کہ اُس کی زندگی قہقہۂ نشاط تھی یا گریۂ یاس، ہماری ناچیز رائے میں اتنا آسان نہیں جس قدر صاحبِ مضمون نے سمجھا ہے۔ ہمارے ہاں تجزیۂ نفس کی مشق ابھی اس درجے پر نہیں پہنچی کہ ہم گفتار سے کردار کی صحیح کیفیت معلوم کر سکیں۔ چارلی چپلن پردۂ فلم پر دنیا کا سب سے خوش وقت انسان نظر آتا ہے لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ اس کی زندگی غم و الم کا ایک حسرت ناک مرقع ہے۔ اسی طرح آگے چل کر ایک جگہ صاحبِ مضمون نظیر کے ان اشعار سے کہ

گہنے سے چاندنی میں جھمکتا ہو گلبدن   اور چاند کی جھلک سے وہ گورا سا اُس کا تن
دکھلا رہا ہو کرتی وانگیا کی جالیاں   جب چاندنی کی دیکھئے راتیں اجالیاں

یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ

"گویا وہ شخص جس نے خود اس منظر کو نہیں دیکھا کبھی یہ کہہ سکتا ہے کہ
اور چاند کی جھلک سے وہ گورا سا اس کا تن
دکھلا رہا ہو کرتی وانگیا کی جالیاں
صحبتِ بادہ میں بھی اتنا ہوش کہ گورے بدن کی چھوٹ سے کرتی
اور انگیا کی جالیوں کو دیکھ لے اور اُس کو نظم میں بھی لے آئے۔
بیک وقت رندی و شاعری کا اتنا عجیب و غریب امتزاج
ہے کہ اس کی مثالیں دنیائے شعر میں خال خال نظر آتی ہیں۔"

نظیر کا مطالعۂ جذبات واقعی حیرت انگیز ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ کیفیت شاعر پر ضرور گذری ہے اور اسی لئے وہ عالمِ مدہوشی میں بھی "گورے بدن کی چھوٹ" سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا۔ غور کیجئے تو بے شمار لوگ ایسے ہیں جنہیں اس قسم کے رنگین مناظر سے بارہا سابقہ پڑتا ہے۔ لیکن ان میں سے کتنے ہیں جو شعوری طور پر ان سے متاثر ہوتے اور اپنے تاثرات کا اظہار کرنے پر قادر ہوتے ہیں؟ ایک شاعر اور ایک عام انسان میں یہی فرق ہے کہ شاعر مشاہدہ، تصور اور تخیل کی مدد سے ایک ایسا دل رُبا صنم تیار کر لیتا ہے جسے ایک عام انسان جب دیکھتا ہے تو بے اختیار پکار اٹھتا ہے کہ یہ تو پہلے ہی سے میرے دل میں موجود ہے۔ ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ سمجھا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

ہم نیاز صاحب کی اس رائے سے بالکل متفق ہیں کہ نظیر کے ہاں مباحث کا تنوع بدرجۂ غایت پایا جاتا ہے اور معیشت کا کوئی پہلو اور احساسات و تاثرات کا کوئی منظر ایسا نہیں جسے اُس نے چھوڑ دیا ہو

اُس کا ذخیرۂ الفاظ بھی نہایت وسیع ہے اور اس کی شاعری خارجی و داخلی دونوں حیثیتوں سے مکمل ہے۔

نظیر کی سیرت کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ ہمیں اُس کی زندگی کے واقعات اور اس کے شخصی حالات کی نسبت بلاواسطہ کچھ معلوم نہیں لیکن اس کے کلام سے ہم اس کے افکار و مشاغل کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ اس ذیل میں انہوں نے نظیر کا ایک مسدس درج کیا ہے جو اُن کے دعوے کے مطابق غیر مطبوعہ ہے اور جس میں وہ اپنے محبوب کو مخاطب کر کے اپنے مختلف احوال کا تذکرہ کرتا ہے مسدس کے دو بند ملاحظہ فرمائیے۔

شیشیں میں مدتوں تک ہم نے پلنگ اتارا ۞ کتنے پری رخوں کو جا پیرنے میں مارا
تصویریں بیچنا بھی کتنے دنوں بچارا ۞ اب دیکھنے کو تیرے ہو کر فقیر، یارا
اک دم کو آ گئے ہیں منہ مت چھپائے ہم سے
ٹک ہنس کے اوپری رو آنکھیں لڑائے ہم سے

کشتی میں ہم نے کتنی مدت بدن کو توڑا ۞ سو گلبدن کے تن کو من مانتا مروڑا
جو ڈھب تھا اس ہنر کا کوئی نہ ہم نے چھوڑا ۞ اب خوبرو کا پیارے دنیا میں دیکھ توڑا
اک دم کو آ گئے ہیں منہ مت چھپائے ہم سے
ٹک ہنس کے اوپری رو آنکھیں لڑائے ہم سے

خرّادی ہو کے ہم نے لٹو چکئے بنائے ۞ اس میں بھی کتنے لڑکے خرّاد پر چڑھائے
پھر ہو کے سر مے والے سرمے بہت لگائے ۞ ریچھوں تلک لڑائے بندر تلک نچائے
اک دم کو آ گئے ہیں منہ مت چھپائے ہم سے
ٹک ہنس کے اوپری رو آنکھیں لڑائے ہم سے

غرض اس طرح کے اور بیسیوں پیشے اور فن گن وائے ہیں۔ صاحبِ مضمون لکھتے ہیں کہ

"اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے شعراء کی طرح مہ رخوں کے لئے اُس نے مصوری ہی نہیں سیکھی بلکہ اور بہت سے جتن کئے یہاں تک کہ ریچھ اور بندر بھی نچایا، آم جامن کے ٹوکرے بھی سر پہ اٹھائے دال موٹھ اور پاپڑ کی بھی دکان لگائی۔ الغرض بقول انہیں کے "سو کر دفن بنانا سو رنگ روپ بھرنا" ان کا شعارِ زندگی رہا"۔

گویا آپ کے نزدیک نظیر ایک صاحبِ نظر اور فطرت شناس شاعر نہیں بلکہ ایک مسخرا بہروپیا تھا جس کی تمام عمر سوانگ بھرنے میں گذری۔ جب تک ہمارے پاس یہ امر باور کرنے کی خارجی وجوہ نہ ہوں ہمیں محض اس کے ایسے اشعار سے جن میں زمانے کی معاشرت کے چربے نہایت پرکاری سے اتارے گئے ہیں یہ نتیجہ نکالنے کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ خود عمر بھر ہر قسم کے بازاری تحریکوں میں مبتلا رہا۔ نیاز صاحب کہتے ہیں کہ "یہ وہ خصوصیت ہے جو نظیر کے علاوہ ہندوستان کے کسی شاعر کو نصیب نہیں ہوئی"۔ خدا نظیر کی روح کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اگر وہ سچ مچ تمام عمر یہی کرتا رہا ہے تو یقیناً ہم اُس سے یہ امتیاز نہیں چھین سکتے اور اگر اس کی حیرت انگیز حقیقت نگاری اس کے آرٹ اور گہرے مطالعے کی منت کش تھی، بعینہٖ اسی طرح جیسے شیکسپیئر یا ڈکنس کی کردار نگاری تو خدا ہمیں اس کے فن کی بہتر تنقید کی توفیق بخشے۔

ہاں! ایک بات اور یاد آئی۔ مندرجہ بالا مسدس کی نسبت نیاز صاحب نے لکھا ہے کہ یہ غیر مطبوعہ ہے۔ حالانکہ یہ مطبع نول کشور لکھنؤ کے چھپے ہوئے کلیات نظیر سنہ ۱۹۲۲ء والے ایڈیشن میں موجود ہے۔ اسی طرح انہوں نے ایک اور مسدس کو جو بھیروں کی شان میں ہے، غیر مطبوعہ بتایا ہے اور یہ اسی ایڈیشن کے صفحہ ۴۰۸ پر جلی حروف میں چھپا ہے۔

آگے چل کر صاحبِ مضمون نے لکھا ہے کہ نظیر طبقۂ خواص کا بھی شاعر تھا۔ فرماتے ہیں کہ

"وہ حضرات جنہوں نے صرف اس کی سادگیٔ بیان اور سیدھی باتوں کو دیکھ کر اس کے عوامی شاعر ہونے پر حکم لگایا ہے وہ غالباً یہ سُن کر حیرت کریں گے کہ نظیر جب فارسی تراکیب اور لفظی شان و شوکت کا اہتمام کرتا ہے تو وہ بالکل غالب اور مومن بلکہ موجودہ زمانے کا شاعر نظر آتا ہے"۔

اور اس کے بعد انہوں نے نظیر کی "غیر مطبوعہ" غزلیات کے خواص پسند قسم کے چند اشعار دئیے ہیں۔ ان اشعار کا اسلوب نظیر کے معروف اشعار سے قدرے علٰحدہ ہے۔ دیکھئے۔

اے صفِ مژگاں تکلف برطرف — دیکھتی کیا ہے الٹ دے صف کی صف
دیکھ وہ گورا سا مکھڑا رشک سے — پڑ گئے ہیں ماہ کے منہ پر کلف
آ گیا جب بزم میں وہ شعلہ رو — شمع تو بس ہو گئی جل کر تلف
ساقی بھی یوں جام لے کر رہ گیا — جس طرح تصویر ہو ساغر بکف

آخری شعر داد کے قابل ہے۔ تصویر کا ساغر بکف ہونا ساقی کی انتہائے حیرت کی تصویر ہے اور یقیناً ایک اچھوتا اور نادر تصور ہے۔

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ چونکہ نظیر نے تقریباً ایک سو برس کی عمر پائی۔ بچپن میں ولی دکنی کے شہرۂ سخن سے آشنا ہوئے اور غالب کی جوانی تک بقیدِ حیات رہے۔ اس لئے انہوں نے مرزا مظہر، شاہ حاتم، سودا، میر،

سوز، قائم، حسرت۔ رنگین۔ شاہ نصیر۔ ممنون۔ غالب۔ ذوق۔ جرأت۔ انشا مصحفی۔ ناسخ سب کا زمانہ دیکھا، اور اسی لئے اگر ان کے کلام میں مذکورہ بالا شعراء کی خصوصیات کے تمام رنگ جھلکیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں بلکہ تعجب یہ ہے کہ ان سے متاثر ہونے کے قوی امکانات کے باوجود نظیر کا انفرادی رنگ ان سب سے جدا رہا۔

اور پھر اُن کی غزلیات میں سے ایسے اشعار کا انتخاب دیا ہے جن میں صاحبِ مضمون کی رائے کے مطابق بیک وقت متقدمین و متوسطین و متاخرین تمام شعراء کا رنگ جھلکتا ہے۔ دیکھئے، مگر یہ خیال رکھئے کہ یہ اشعار "غیر مطبوعہ" ہیں:۔

شرمندہ رفو نہیں عاشق کا چاک جیب   کس باغباں نے گل کا گریباں سِلا دیا

ہمیں ہیں دیکھ جو قدموں پہ گر پڑے ہیں ترے   وگرنہ یاں سے میاں ہاتھ کون مل نہ گیا

ابھی کہیں تو کسی کو نہ اعتبار آوے   کہ ہم کو راہ میں اک آشنا نے لوٹ لیا

تیشہ کی کیا مجال تھی جو یہ تراشے بےستوں   تھا وہ تمام دل کا زور جس نے پہاڑ ڈھا دیا

سن کے ہمارا عرضِ حال یار نے یک بیک نظیر   ہنس کے کہا کہ بس جی بس تم نے تو پھر رُلا دیا

دیکھ لے اس چمن دہر کو دل بھر کے نظیر   پھر ترا کاہے کو اس باغ میں آنا ہوگا

تمہارے ہاتھ سے کل ہم بھی رو لئے صاحب   جگر کے داغ جو دھونے تھے دھو لئے صاحب

کل اس صنم نے کہا دیکھ کر ہمیں خاموش ق کہ اب تو آپ بھی ٹک لب کو کھولئے صاحب

برس سکے ہیں نے نظیر اس سے یوں کہا ہنس کر   جو کوئی بولے، تو البتہ بولئے صاحب

کہیں بیٹھنے دے دل اب مجھے جو حواس ٹک میں بجا کروں ؛ نہیں تاب مجھ میں کہ جب تلک تو پھرے تو میں بھی پھرا کروں

جو نگہ سے چاہ کے دیکھوں ٹک تو چڑھا کے تیوری کہتا ہے ؛ تری اس نگہ کی سزا ہے یہ کہ بس اب میں تجھ سے چھپا کروں

مجھے مدتوں سے ہے دردِ دل جو کہا کچھ اس کا علاج کر ؛ تو کہا کہ اس کی دوا یہ ہے تو کہا کرے میں سنا کروں

کوئی بولا تم نے نظیر کو نہ صبر کر دیا، تو کہا میاں ؛ دل و جاں سے مجھ پہ ہے وہ فدا تو کس طرح میں خفا کروں

نہ دن کو چین نہ راتوں کو خواب آنکھوں میں   بھر آ رہی ہے ترے غم سے آب آنکھوں میں

بعد مدہ ...   بھری ہے شوخ کے ایسی شراب آنکھوں میں

تمنا نہ اشک، نہ نیند آئی، نا پلک جھپکی   بسا ہے جب سے وہ خانہ خراب آنکھوں میں

شتابی آن کے محبوبو بچھڑیاں رنگ لو   نظیر لایا ہے بھر کر شہاب آنکھوں میں

سرشکِ چشم سے موتی بہت پرو ئے گئے   ولے یہ داغ جگر کے کبھی نہ دھوئے گئے

نظر کیا ہی مزا تھا کہ کل خوشی سے ہم   گئے تھے یار کو لینے سو آپ ہی کھوئے گئے

یوں کارواں شباب کا گذرا کہ گوش زد   آواز پا ہوئی نہ صدائے درا ہوئی

جب سنتا ہے احوال مرا یوں کہتا ہے عیاری سے   ہے کون وہ اس سے ہم کو تو کچھ جان نہیں پہچان نہیں

کچھ بن نہیں آتا کیا کیجے کس طور سے ملئے اے ہمدم   وہ دیکھ ہمیں رک جاتا ہے اور ہم کو چین اک آن نہیں

گر ہم نے دل صنم کو دیا پھر کسی کو کیا   اسلام چھوڑ کفر لیا، پھر کسی کو کیا

کیا جانے کس کے غم میں ہیں آنکھیں ہماری لال   اے ہم نے گو نشہ بھی پیا، پھر کسی کو کیا

آبھی کیا ہے ہم نے گریباں کو اپنے چاک   آپ ہی سیا سیا نہ سیا، پھر کسی کو کیا

صاحبِ مضمون کے نزدیک نظیر کی غزل پر اس کے رنگِ نظم کا کافی اثر پڑا ہے یعنی جس طرح وہ نظم میں جزئیات کا مطالعہ نہایت خوبی سے کرتا ہے۔ اسی طرح اس کی غزل بھی باریک نگاہی اور تغزل کا ایک دلکش مجموعہ ہوتی ہے نظیر نے بہت اچھے اچھے سراپا بھی لکھے ہیں۔ ایک جگہ سمدھن کا سراپا لکھنے میں نقاشی کا کمال یوں دکھایا ہے:۔

سراپا حسنِ سمدھن گویا گلشن کی کیاری ہے   پری بھی اب تو بازی حسن میں سمدھن سے ہاری ہے

کھنچی کنگھی، گندھی چوٹی، جمی پٹی لگا کاجل   کماں ابرو نظر جادو نگہ ہر اک دلاری ہے

جبیں مہتاب، آنکھیں شوخ شیریں لب گہر دنداں   بدن موتی دہن غنچہ، ادا ہنسنے کی پیاری ہے

نیا کمخواب کا لہنگا، جھمکتے تاش کی انگیا۔   کچیں تصویر سی جن پر لگا گوٹا کناری ہے

ملائم پیٹ مخمل سا، کلی سی ناف کی صورت   اٹھا سینہ، صفا پیڑو، عجب جوبن کی ناری ہے

سرین نازک کمر پتلی، خطِ گلزار رد مادل   کہوں کیا آگے اب اس کے مقامِ پردہ داری ہے

لٹکتی چال، مدھ ماتی چلے بچھوؤں کو جھنکاتی   ادا میں دل لئے جاتی عجب سمدھن ہماری ہے

بھرے جوبن پہ اتراتی جھمک انگیا کی دکھلاتی   کمر لہنگے سے بل کھاتی، لٹک گھونگھٹ کی بھاری ہے

اس کے بعد صاحبِ مضمون نے کلامِ نظیر کے چند اور محاسن بیان کئے ہیں مثلاً یہ کہ وہ صنائع اور بدائع سے مالامال ہے اور تشبیہات و استعارات

سے لبریز۔ اُس کی مرکب تشبیہات میں نزاکت خیال بدرجۂ غایت پائی جاتی ہے۔ دیکھئے عاجزی و فتادگی کے اظہار میں کیسی خوبصورتی سے کام لیا گیا ہے۔ ؎

وہ نیازِ عجز تھا اس کی نگہ سے آشکار   جس طرح سے تھک رہے طائر کہیں بِرا ہو

ایک اور شعر جسے آپ اوپر بھی ملاحظہ فرما چکے ہیں نزاکتِ تشبیہ کی ایک نادر مثال ہے

ساقی بھی یوں جام لے کر رہ گیا   جس طرح تصویر ہو ساغر بکف

پھر وہ بعض دفعہ موقعہ محل کے لحاظ سے ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے کہ معانی کی کیفیات آوازوں سے ظاہر ہو جاتی ہیں۔ مثلاً برسات کا سماں بیان ہو رہا ہے ؎

روز مزوں سے رات کو برسے تھا مینہ جھمک جھمک

بوندیں پڑیں ٹپک ٹپک، پانی پڑا چھپک چھپک

جام رہے چھلک چھلک، شیشے رہے بھبک بھبک

ہم بھی نشوں میں خوب چھک لوٹتے تھے بہک بہک

نظیر کے آرٹ کی ایک نہایت ممتاز خصوصیت الفاظ کا حسن انتخاب ہے۔ وہ موضوع کی سنجیدگی اور لطافت، بلندی اور پستی، گرانی اور سبکی۔ غرضکہ معانی کے ہر رنگ کے مطابق الفاظ چنتا ہے اور انہیں نہایت چابکدستی سے استعمال کرتا ہے۔ اس کی تقریباً ہر نظم موضوع اور زبان کی ہم آہنگی کی ایک روشن نظیر ہے یہاں چند اشعار اُس کی ایک مشہور نظم سے جو بھیروں دیوی کی تعریف میں کہی گئی ہے مثالاً درج کئے جاتے ہیں ؎

آنکھوں میں چھا رہا ہے تیرا سروپ کالا   تن میں بھبھوت گہرا، گلے بیچ زنڈ مالا

آنکھیں دیا سی روشن، ہاتھوں میں اک پیالا   ہو دل سے داس تیرا من آمری پیالا

غصہ میں جب تو آکر اپنی جٹا ہلا دے   دھرتی اکاس پربت، پاتال دہل جاوے

سرکاٹ راچھسوں کا چوٹی پکڑ جھلاوے   جھانکے کلال خانے، کتّے کو خوں چٹاوے

آپ نے دیکھا الفاظ اور موضوع میں باہم کس قدر یک رنگی ہے۔ نظیر نہ صرف فطرت کا نقاش تھا، بلکہ مناظرِ قدرت سے ایسے اثرات قبول کرتا تھا جو اس کی شاعری میں آرزوؤں کی لہریں بن بن کر مچلتے ہیں۔

ایک مسدس کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے:۔

جس دم چمن میں چاند کی ہوں خوش نمائیاں   اور جھومتی ہوں باغ میں پھولوں کی ڈالیاں۔

بہتی ہوں مے کے جوش سے عشرت کی نالیاں   کانوں میں نازنیں کے جھمکتی ہوں بالیاں

عیش و طرب کی دھوم نشوں کی بحالیاں

جب چاندنی کی دیکھئے راتیں اُجالیاں

بیٹھی ہو چاندنی سی جو وہ شوخِ گلعذار   اور بادلے کا تن میں جھمکتا ہو تار تار

ہاتھوں میں گجرا، بالی میں کلیاں گلے میں ہار   ہر دم نشے میں پیار سے ہنس ہنس کے بار بار

ہم چھیڑتے ہوں اُس کو وہ دیتی ہو گالیاں

جب چاندنی کی دیکھئے راتیں اجالیاں

نکھرا ہو چاند نور میں ڈھلتی چلی ہو رات   پھولوں کی باس آتی ہو ہر دم ہوا کے سات

وہ نازنیں کہ چاند بھی ہوتا ہو جس سے مات   بیٹھی ہو سو بناؤ سے ڈالے گلے میں ہات

گاتی ہو اور نشے میں بجاتی ہو تالیاں

جب چاندنی کی دیکھئے راتیں اجالیاں

جناب نیاز اگر مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کے بارے میں ذرا زیادہ تحقیق سے کام لے لیتے، خصوصاً ایسے موقع پر جب وہ اس اہتمام سے نگار کا نظیر نمبر نکال رہے تھے، تو اس مضمون کی قدر و منزلت میں کافی اضافہ ہو جاتا۔ بہرحال زیرِ نظر مقالہ نظیر کی شاعری پر ایک نہایت اچھا اجمالی تبصرہ ہے اور نظیر نمبر کے بہترین مضامین میں سے ہے۔

صلاحُ الدّین احمد

ادب لطیف۔ تاثرات۔ احمد ندیم قاسمی

چھت پہ یوں آنچل ہلا دینا بھی کوئی بات ہے؟

آمری باہوں پہ بکھرا دے اندھیری کا کلیں

سارا عالم دم بخود ہے، رات ہے، برسات ہے

آ اکٹھے طے کریں کون و مکاں کی منزلیں

(۲)

کچی دیواروں پہ رقصاں ہے دیئے کی روشنی

چھت کے اک سوراخ سے اُٹھتا ہے رہ رہ کر دھواں

کس کی آمد ہے کہ دروازے پہ ہیں بیٹھے ہوئے

بھولے بچے، مست دوشیزائیں اور بانکے جواں

(۳)

وہ ننھے سے اسٹیشن پہ اک گاڑی رُکی

سینہ تانے اک جواں اُترا ہے کس انداز سے

پاس ہی بوڑھی سی بیری کے تلے اک خوبرو

جھینپتی، ڈرتی، سمٹتی اُٹھ رہی ہے ناز سے

(۴)

ہاں انہی ترچھی ہوئی راہوں پر اکثر وقتِ شب

ہم اُڑا کرتے تھے ہو کر مست اُونٹوں پہ سوار

اِس کھنڈر میں بیٹھ کر آنسو بہائے بے سبب
اُن چٹانوں پہ کھڑے ہو کر ہنسے بے اختیار

اُردو کی جدید (بلکہ جدید ترین) شاعری میں مغربی تہذیب اور علم و ادب کے اثر سے بیان کی جو ندرتیں آج کل پیدا ہو رہی ہیں اُن کے لحاظ سے احمد ندیم قاسمی کے مندرجہ بالا چار قطعات قابلِ غور ہیں۔ پہلا قطعہ مشرق اور مغرب کے ملاپ کا نمونہ ہے۔ پہلے مصرعے کی سدز تو حقیقت اُس آنچل کی طرح لہرا رہی ہے اور جاذبِ توجہ ہے جو اس تحریکِ شعری کا باعث ہوئی۔ شہری زندگی میں ایسے واقعات نواب مرزا شوق کے زمانے سے ہوتے آ رہے ہیں دل میرا بیٹھے بیٹھے گھبرایا سیر کرنے کو بام پہ آیا اور ہلتا ہوا آنچل دیکھا۔ لیکن "چھت پہ یوں آنچل ہلا دینا بھی کوئی بات ہے"؛ شاعر موجودہ زمانے کا مادی انسان ہے۔ ایسی اضطراری اور رومانی حرکات سے اُس کی تشفی نہیں ہو سکتی۔ اُس کا دل کسی کو "زلف سیاہ رخ پہ پریشاں کئے ہوئے" "صرف لب بام پر" نہیں مانگتا۔ اُس کے نفس غیر شعوری میں غالب ہی کا ایک اور شعر ہے "نیند اُس کی ہے دماغ اُس کا ہے راتیں اُس کی ہیں" —— اس لئے وہ بھی کہتا ہے کہ "آ مری باہوں پہ بکھرا دے اندھیری کاکلیں"۔ زلفوں کو باہوں پہ بکھرانے کے لئے چوری کی ملاقات ہو گی، چوری کی ملاقات کے لئے رات کی ضرورت ہے۔ وہ بھی ہے، "سارا عالم دم بخود ہے" —— اور برسات کا موسم ہے۔ یہاں تک شاعر بہت کامیابی سے شعر کی منزلیں طے کرتا ہے لیکن اس کے بعد اُس کے نفس غیر شعوری سے پھر وہی مشرقیت جاگ اُٹھتی ہے اور وہ اس دعوت کی تکمیل کے صحیح مقصد کو "کون و مکاں کی منزلوں" کے استعارے سے پھیکا کر دیتا ہے۔

دوسرے قطعے میں سے اگر "کس کی آمد ہے" کا ٹکڑا نکال دیا جائے تو یہ محض بیانیہ شاعری بن کر رہ جاتا ہے اور وہ کوئی بڑی بات نہیں لیکن شاعر کو اس بیانیہ شاعری میں ایک لرزتی ہوئی کیفیت پیدا کرنی ہے (جو احمد ندیم قاسمی کی خصوصیت ہے) اُسے قاری سے یہ کہلوانا ہے کہ "ختم ہوا وہ گیت مگر اب تک نغمے کی گونج فضا میں باقی ہے" —— اور اس لئے چار مختصر الفاظ قطعے میں شامل ہو گئے "کس کی آمد ہے"۔ یوں فائدہ یہ ہوا کہ ذہن قطعے کے اختتام پر ساکن نہ ہوا۔ چلتا رہا۔ یہ بات بیانیہ شاعری میں عموماً نادر ہوتی ہے۔

تیسرا قطعہ ایک مکمل تصویر ہے۔ ایک مکمل کہانی۔ اس میں اسم صفت اور متعلق فعل کا استعمال قابلِ ستائش ہے۔ "ننھا اسٹیشن" —— "بوڑھی سی بیری" —— "سینتا نے" —— "جھینپتی، ڈرتی، سمٹتی" —— گویا واقعی کوئی فوٹو بیری کے تلے سے اُبھر رہی ہے!

پہلے قطعے میں حال اور مستقبل کی بات ہے۔ دوسرے میں بھی حال اور مستقبل کی بات ہے۔ تیسرے میں ماضی اور حال کا فسانہ ہے اور چوتھے میں صرف اُس ماضی کی داستان ہے جس کا نوحہ شعرا کا محبوب ترین شغل ہے۔ "مڑتی ہوئی راہیں —— مست اونٹ —— کھنڈر —— چٹانیں ——" یہ سب منظر کے جزئیات ہیں اور مقامی رنگ کے معاون۔ اور بے سبب آنسو بہانا اور بے اختیار ہنسنا وہ کیفیت افروز ٹکڑے ہیں جن سے "ہم" کی دونوں شخصیتوں کے باہمی تعلق اور ذاتی سیرت کی نشو و نما ہوتی دکھائی دیتی ہے۔

اس ماہ مختلف رسائل کی نظموں کے مطالعہ کے بعد میں آپ کی توجہ کے لئے ان چار قطعوں کو چُنتا ہوں۔

میراجی

نقد و نظر

ریزۂ مینا اس نام سے جناب شاہد احمد بی اے آنرز دہلوی نے اپنے مجلّہ ساقی کے گذشتہ دس سال کے پچاس افسانوں کا ایک انتخاب شائع کیا ہے۔ حجم تقریباً چھ سو صفحات لکھائی چھپائی اچھی قیمت مجلد تین روپے۔ ملنے کا پتہ:۔ ساقی بک ڈپو دہلی۔

اس مجموعے کو صرف افسانوں کا مجموعہ کہنا صحیح نہ ہوگا۔ کیونکہ اس میں جہاں بہت اچھے مختصر افسانے موجود ہیں وہاں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جنہیں افسانے نہیں کہا جا سکتا۔ اُن میں سے کچھ تو سنجیدہ مضامین ہیں اور کچھ مزاحیہ طرز انشا کے نمونے۔ گویا یہ انتخاب "ساقی" کے گذشتہ دس سال کے افسانوں کا نہیں بلکہ ملی جلی سب چیزوں کا ہے۔ اس لئے بہتر ہوتا اگر ترتیب میں مضامین، مزاحیہ اور دوسرے افسانوں کو الگ الگ ابواب پر منقسم کیا جاتا۔ موجودہ ترتیب میں مرتب نے ہر چیز کی تاریخ اشاعت کے اعتبار سے تقدّم و تاخّر کا خیال رکھا ہے۔

صاحب طرز انشا پردازوں میں سے چند کے نام لکھنا ہی کافی ہوگا کیونکہ وہ سب اپنے اپنے میدان کے ماہرین تسلیم کئے جا چکے ہیں مثلاً میر باقر علی داستان گو، علامہ راشد الخیری، خواجہ حسن نظامی، خواجہ ناصر نذیر فراق، مولوی عنایت اللہ دہلوی، آغا حیدر حسن دہلوی۔ سید عذیر حسن دہلوی اور رشید احمد صدیقی۔

مزاحیہ نویسوں میں سے مرزا فرحت اللہ بیگ، ناکارہ حیدر آبادی، مرزا عظیم بیگ چغتائی، مرزا فہیم بیگ گوالیاری اور علامہ مضحک دہلوی قابل ذکر ہیں۔

افسانہ نگاروں میں منشی پریم چند، مرزا محمد سعید دہلوی، سلطان حیدر جوش، سید امتیاز علی تاج، سدرشن، ڈاکٹر اعظم کریوی، رفیعی اجمیری، قیسی رام پوری، صادق الخیری، پروفیسر احمد علی، سعادت حسن منٹو، اختر حسین رائے پوری، ممتاز مفتی اور محترمہ عصمت چغتائی وغیرہ کی تخلیقات اُردو مختصر افسانے کے ارتقا کی تمام منازل کو ظاہر کرنے کے لئے موجود ہیں۔

اس کتاب کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ اس میں اُس محبوب شہر یعنی پرانی دلّی کے متعلق بہت سے مضامین موجود ہیں جو اب محض لوگوں کی یادوں ہی میں باقی رہ گئی ہے مثلاً فقیر کا تکیہ، دربار اکبری کی ایک جھلک جب ساقی کے ہاتھ میں جام تھا، لال قلعہ کی ایک جھلک، اسیر گلمنزد (؟) شاہی خاندان دہلی کی بپتا، قلعہ معلّٰی کی ایک جھلک وغیرہ

اُمید ہے کہ دوسری اشاعت کے وقت جناب مرتب ترتیب میں افسانوں اور مضامین وغیرہ کو علیحدہ کر سکیں گے اور ہمیں توقع ہے کہ بہت جلد اس اچھی کتاب کی دوسری اشاعت کا موقعہ بھی آ جائے گا۔

امیر العروض مؤلف بزمی انصاری بی اے (انبالوی) ناشر شیخ غلام علی اینڈ سنز بک سیلرز کشمیری بازار لاہور سائز باتگ در اولا حجم ۲۰۷ صفحے لکھائی چھپائی خاصی۔ قیمت ایک روپیہ بارہ آنے۔ کتاب کے شروع میں جناب عبد المجید سالک مدیر روزنامہ انقلاب نے مقدمے کے عنوان سے جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اُن سے ہمیں قریباً قریباً اتفاق رائے ہے اس لئے اس کے چیدہ فقرات درج کئے جاتے ہیں۔ تاکہ ایسی کتابوں کے مقاصد اور منافع کی دلیل مہیا کی جا سکے۔

"شاعر کو تخیل کی اہلیت آسمان سے ملتی ہے لیکن زبان اور آہنگ زمینی چیزیں ہیں . . . ان کے حصول کے لئے زبان اور آہنگ کے ماہر کی رہنمائی کا محتاج ہونا پڑتا ہے . . . آج کل نئی تعلیم کے اثرات نے زندگی اور آرٹ کے ہر شعبے میں سرکشی اور بغاوت اور آزادی کی سپرٹ پیدا کر دی ہے . . . یہ ضروری نہیں کہ تعمیر سے پہلے تخریب کو مکمل کر لیا جائے . . . اسی لئے ضروری ہے کہ فن شعر میں بھی ہم اس اصول کو مدّ نظر رکھیں . . . حضرت بزمی انصاری کی یہ کتاب اس اعتبار سے قابل داد ہے کہ انہوں نے چند صفحات کے اندر عروض و قافیہ اور محاسن و معائب سخن کی بحث کو جمع کر کے کوزے میں دریا کو بند کرنے کی کوشش کی ہے . . . ہو سکتا ہے کہ "اُن کے" بعض اصول و دعاوی سے کسی کو اختلاف بھی ہو . . . لیکن جہاں تک مبتدیوں کی ضروریات کا تعلق ہے، مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب بہت مفید ثابت ہوگی۔" بزمی صاحب نے اس کتاب کے تین حصے کئے ہیں پہلا عروض و قوافی، دوسرا علم القوافی اور تیسرا نقد سخن۔ پہلے حصے میں اقسام بیت

اجزائے بیت، اوزان بحور، زحافات، قواعد تقطیع، بحور مستعملہ، رباعی، مثنوی
مستزاد اور دیگر اصناف سخن کے عنوان ہیں۔ دوسرے میں حرکات قافیہ،
عیوب قافیہ، ردیف اور اقسام قافیہ باعتبار تقطیع، اور تیسرے حصے
میں پہلے متروکات کا ذکر کر کے پھر معائب سخن، محاسن سخن اور اصلاح
سخن کا بیان کیا ہے۔

ہمیں امید ہے کہ ضرورت مند حضرات اس کتاب سے فائدہ اٹھائیں گے۔

شاعر کی دنیا کے نام سے جناب عظیم الدین محبت بی اے (عثمانیہ) نے جدید حیدر آباد کے چالیس شعراء کا کلام مع حالات
زندگی درسی سائز کے ۹۶ صفحات میں مرتب کیا ہے۔ سرورق سے معلوم
ہوتا ہے کہ یہ اس سلسلے کی پہلی جلد ہے۔ اس لئے امید ہے کہ آئندہ
جلدوں میں جناب مرتب حیدر آباد سے نکل کر اردو کے دوسرے شعرائے
جدید کی طرف بھی توجہ کریں گے۔ اس جلد کا پیش لفظ جناب ماہر القادری نے
لکھا ہے جو خود حیدر آباد کے شاعر اور اردو کے نہایت شگفتہ غزل گو ہیں۔
چالیس شعراء کے انتخاب میں جہاں کل ہند شہرت کے شاعر ہیں وہاں محض
حیدر آباد کے نوآموز حضرات بھی جلوہ فرما ہیں۔ لیکن ان میں سے بعض
کا کلام خوب ہے۔ مشہور شعراء میں سے حضرات استاذ السلطان جلیل، امجد
حیدر آبادی، فانی بدایونی۔ ماہر القادری اور علی اختر کے نام قابل ذکر ہیں۔
کتاب کی ترتیب حروف ہجا کے مطابق ہے۔ کلام کے انتخاب میں محنت
اور دقت نظر سے کام نہیں لیا گیا۔ کیونکہ مثلاً جناب امجد حیدر آبادی، جناب
فانی بدایونی اور جناب علی اختر کا جو کلام درج کیا گیا ہے۔ اس سے کہیں بہتر
چیزیں یہ حضرات کہہ چکے ہیں۔

سب سے پہلے جناب عبدالقیوم خاں باقی قابل ذکر ہیں جنہوں نے
گوئٹے کے فاؤسٹ کے حصہ اول کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ اسی کے آغاز کے
پہلے منظر کا ایک جزو اس جگہ بھی درج کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک غزل
کے بعد "زمین" کے عنوان سے جناب باقی کی ایک نظم بھی درج ہے جسے
اچھا کہا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد آگے چل کر جناب فرید احمد حرماں کا کلام ہے جن
کے تغزل کا اندازہ ذیل کے اشعار سے کیا جا سکتا ہے۔

اک نگاہ ناز اُس کی دل کو کیا برما گئی
زندگی بن کر سمائی، روح بن کر چھا گئی
حادثوں میں زندگی کے ساغروں کا کیا ملال
موج ہی تو تھی کسی طوفان سے ٹکرا گئی
اس سے پہلے بھی تو آخر بزم مہر و ماہ تھی
آج ہی کیوں انجمن کی انجمن شرما گئی

حرماں کے بعد سید احمد ترمذی حسرت تخلص کا تغزل قابل ذکر ہے۔
چند شعر ملاحظہ ہوں۔

نہ دل کچھ کہے گا نہ آہیں کہیں گی — مرا راز میری نگاہیں کہیں گی
نہ دیکھو مجھے تم کہ راز محبت ! — نگاہوں سے مل کر نگاہیں کہیں گی
چھپائے سے چھپتا نہیں راز دل کا — جو دل چپ رہے گا نگاہیں کہیں گی

تینوں شعر ایک ہی قافیے میں ہیں!
ایک اور شعر دیکھئے، میر تقی کا انداز ہے۔

مختاری اس کو کہتے ہیں، مجبوری نام اسی کا ہے
جو تم نے چاہا ہو کے رہا، جو ہم نے چاہا ہو نہ سکا

اس کے بعد ایک قابل ذکر نظم "چاندنی" کے عنوان سے ہے جو
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ اس نظم کا مطالعہ ہمیں اس
لئے بھی تعجب میں ڈالتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف کو ہم اس سے پہلے
صرف اردو زبان کے ایک قابل قدر نقادی کی حیثیت سے جانتے ہیں
یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ اچھی نظمیں بھی لکھتے رہے ہیں۔ ڈاکٹر زور کے بعد جناب
علی حسنین زیبا کی ایک غزل ہے جس کے تین شعر ملاحظہ ہوں ؎

حسن بن کر بھی رہی چاک گریباں کی ادا — جوش وحشت نے بہت عیب لگانا چاہا
مجھ پہ اک اور شب غم یہ قیامت ٹوٹی — مسکراتے ہوئے تاروں نے ہنسانا چاہا
بر محل ان کی نگاہوں میں تبسم دیکھا! — ہم نے جب درد کا احساس چھپانا چاہا

جناب زیبا کے کلام میں ایک کیفیت ہوتی ہے۔
اس کے بعد قابل ذکر شاعر جناب بہبود علی صفی ہیں۔ ان کے تغزل
میں داغ کی شوخی جگہ جگہ نمایاں ہے۔ مثالیں دیکھئے۔

بے احتیاط اس کو بھی برباد کر گئے — بدنام ہے زمانے میں اب نام چاہ کا
سو مہربانیوں کے عوض مسکرا دیا — سرکار نے کمال کیا اختصار میں
محبت کی ذرا سی بات پہ اتنے خفا کیوں ہو — ہوا کرتی ہیں آخر سینکڑوں باتیں محبت کی
اچھے گن دیکھ، اچھی شکل نہ دیکھ ! — سنکھیا بھی سفید ہوتی ہے !
شکریہ تشریف لانے کا بڑی زحمت ہوئی — اب یہاں سے آپ اپنے گھر اکیلے جائیے
پھر مسکرا کے پیار سے دیکھا مری طرف — پھر اک ذرا سی آس پہ جینا پڑا مجھے

اس کے بعد جناب حکیم میر عابد علی خاں غیور کی ایک نظم "نوحہ" جدید
شاعری کی اچھی مثال ہے۔ آخر میں جا کر جناب مخدوم محی الدین ایم اے کی نظم
"موت کا گیت" بھی قابل ذکر ہے۔

اس مجموعے میں دو باتوں کی کمی خصوصاً کھٹکتی ہے۔ایک یہ کہ شعراء کے حالات زندگی اگرچہ تمام تر مختصر ہیں لیکن اکثر جگہ جناب مرتب نے محض ایک ایک فقرے پر ہی اکتفا کی ہے۔ دوسرے اس کتاب میں فہرست نہیں ہے۔جناب مرتب کی تصویر بھی شامل کتاب ہے۔قیمت درج نہیں۔

ملنے کا پتہ:۔ ایم اے ربن سوبرو نظامت کروڑ گیری حیدرآباد دکن۔

ڈاچی کے نام سے اُردو بک سٹال بیرون لہاری دروازہ لاہور نے جناب اوپندر ناتھ اشک بی اے ایل ایل بی کے تیرہ افسانوں کا مجموعہ شائع کیا ہے حجم دو سو آٹھ صفحات (درسی سائز) مجلد۔ اور جلد پر ایک خوشنما گرد پوش قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ۔

"ادبی دنیا" کے قارئین جناب اشک کی پُراثر افسانہ نگاری کے کئی نمونے دیکھ چکے ہیں اس لئے اُن پر مصنف کی خوبیوں کا جتانا کچھ فالتو معلوم ہوتا ہے۔ البتہ اُن لوگوں کے لئے جنہوں نے اشک صاحب کے افسانوں کو اب تک نہیں دیکھا کچھ لکھا جاسکتا ہے۔لیکن یقین نہیں آتا کہ کوئی ایسا ادبی ذوق رکھنے والا بھی موجود ہے۔ جسے اشک کی افسانہ نگاری کی خوبیوں کا قائل کرنے کے لئے دلائل کی ضرورت ہے۔کیونکہ اشک کے افسانے گذشتہ دس سالوں سے ملک کے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہو رہے ہیں اور پھر ہر زبان میں یعنی اُردو، ہندی، گجراتی، مرہٹی وغیرہ۔اور اگرچہ اس عرصے میں چند سالوں کے لئے اشک کی تخلیقات صرف ہندی زبان تک محدود ہو چکی تھیں لیکن مقامِ مسرت ہے کہ وہ صبح کے بھولے شام کو پھر اُردو کے گھر آگئے۔

اس مجموعے میں بیشتر افسانے سیاسی ہیں۔ اور اکثر اشک کی ابتدائی جراتوں کا نتیجہ ہیں اس لئے ممکن ہے کہ ان میں قاری کو وہ پختگی کہیں کہیں نہ دکھائی دے جو اب اشک کی تحریر کا لازمہ بن چکی ہے مگر اس کے باوجود اشک کی بنیادی خصوصیات یعنی سادگیٔ بیان اور تاثر ان میں بھی اُسی طرح جلوہ فرما ہے جیسے کہ اُن کے تازہ ترین افسانوں میں۔ اشک کے افسانوں کے تاثر سے کوئی منکر نہیں ہو سکتا۔ اور اگر ثبوت درکار ہو تو منشی پریم چند ایسی ہستی کی رائے بھی پیش کی جاسکتی ہے۔

ان افسانوں کی زبان کی وضاحت کرتے ہوئے عرض حال میں مصنف نے ایک ایسی بات کہی ہے جو قابل توجہ ہے۔یعنی اُردو میں ایک حلقہ ایسا ہے جس کا دائرہ ملحوظ اتنا تنگ ہے کہ وہ مصنف کو ذرا سی ڈھیل بھی دینے کو تیار نہیں ہے ____ بہتر ہوتا کہ اس کے ساتھ ہمارے محترم افسانہ نگار اگر اُردو کے اُس حلقے کا ذکر بھی کر دیتے جو زبان و بیان کی ترقی اور وسعت کے ہر اقدام کا حامی ہے۔خصوصاً اس لئے بھی یہ ذکر ضروری تھا کہ موجودہ حالت میں اُردو کا یہ آزاد خیال حلقہ ہندی کے متعصب اور تنگ نظر مصنفوں اور سیاسی لیڈروں سے تعداد میں کہیں زیادہ ہے۔ظاہر ہے کہ ہر ترقی یافتہ زبان کی لغت آئے دن بڑھتی رہتی ہے اور اس میں نئے نئے مفہوم و معانی پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مصنفین جو الفاظ چاہیں استعمال کرتے چلے جائیں۔افسانہ نگاروں کو ہر قسم کے الفاظ کے استعمال کی آزادی ہے لیکن یہ نقادوں اور ماہرین زبان کا فرض ہے۔ کہ وہ اُنہیں افراط و تفریط سے باز رکھنے کی کوشش کریں۔ایسی روک تھام تنگ نظری کا ثبوت نہیں ہو سکتی۔ نئے الفاظ کے استعمال کا جواز پیدا کرنے کے لئے لسانی اصولوں کے علاوہ ذوق سلیم کی بھی اشد ضرورت ہے جو بہت ہی کم لوگوں کو حاصل ہوتا ہے۔ لیکن یہ ایک ضروری جملہ معترضہ تھا۔

اس مجموعے کے تقریباً تمام افسانے دلچسپ اور پُراثر ہیں البتہ زبان کہیں کہیں کھٹکتی ہے۔معلوم نہیں وہ کتابت کی غلطیاں ہیں یا کیا۔کیونکہ بعض جگہ کتابت کی غلطیوں سے بھی دوچار ہوا جاسکتا ہے کتابت اور طباعت خوب ہے۔ اور ہر طرح سے یہ مجموعہ قابل خرید ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ادبی دنیا کے قارئین بھی اس مجموعے کو حاصل کریں گے تاکہ وہ ادبی دنیا میں شائع شدہ اشک کے افسانوں کے ساتھ ساتھ مقابلے کے طور پر اس مجموعے کے افسانوں کا مطالعہ بھی کر سکیں۔

م

ڈاک کے ڈاکو ہر ماہ ہمیں خریداروں کی طرف سے شکایتیں موصول ہوتی ہیں کہ انہیں پرچہ نہیں ملتا اور بیسیوں خریدار ایسے بھی ہیں جو شکایت نہیں کرتے لیکن یہ فرض کر لیتے ہیں کہ پرچہ دفتر نے نہیں بھیجا۔ حالانکہ پرچہ چھاپنا اور پھر خریدار کو نہ بھیجنا پاگل پن اور تجارتی خودکشی سے کم نہیں۔ ادبی دنیا ہر ماہ کی [illegible] تاریخ تک شائع ہو جاتا ہے اگر ... تک آپ کو پرچہ نہ ملے تو سمجھ لیجئے کہ کسی ڈاک کے ڈاکو کی نذر ہو گیا۔ ایک شکایتی کارڈ اپنے حلقہ کے سپرنٹنڈنٹ پوسٹ آفس کو لکھئے اور ایک کارڈ ہمیں لکھئے تاکہ آپ کو پرچہ دوبارہ بھیجا جائے اور محکمہ ڈاک کے دروازے پر ایک اور دستک دی جائے۔

مینیجر

فہرست مضامین ادبی دنیا لاہور

بابت ماہ مئی ۱۹۴۰ء

جلد ۱۸ — نمبر ۵

تصاویر: ۱۔ بادلوں کے جھولے پر ۲۔ ایملی جین برنٹی ۳۔ شارلوٹ برنٹی ۴۔ این برونٹی

چندہ سالانہ مع محصول ڈاک اور وی پی پانچ روپے ممالک غیر سے دس شلنگ

گیلانی الیکٹرک پرنٹنگ پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام صلاح الدین احمد پرنٹر و پبلشر چھپ کر دفتر ادبی دنیا منٹگمری ہال لاہور سے شائع ہوا۔

دنیائے کاروبار

میسور کے دیہاتیوں میں بیداری

"دیہات سدھار کے کام کی یہ قابل تعریف صورتِ حال دراصل ویلج پنچایت کا شعبہ جاتی افسروں کی راہنمائی میں دلی اتفاق کے ساتھ کام کرنے کا نتیجہ ہے۔ اس سلسلے میں قابل ذکر یہ امر ہے کہ سرکار کی دیہات سدھار کے کام میں امید اور بڑی بڑی کوششیں جو مختلف قریوں میں باقاعدہ کام کاج پر مبنی ہیں۔ اس وقت دیہاتیوں کو گرویدہ اور متاثر کر رہی ہیں جس کے ثبوت میں لوگوں سے دن بدن متواتر درخواستیں آرہی ہیں کہ ان کے قریوں کو بھی منتخب شدہ دیہات میں شمار کر لیا جائے۔ یہ ظاہر ہے کہ دیہاتیوں میں دیہات سدھار کے پروگرام میں یقین اور اپنے اپنے قریوں کو ماڈل ویلج بنانے کی خواہش بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ لہٰذا یہ امید کرنا بے جا نہ ہوگا کہ قریہ کی زندگی کے لئے دیہات سدھار کے کام کو عام طور پر ایک نہایت ضروری چیز قرار دے دی جائے گی۔"

یہ ہیں وہ خیالات جو ڈپٹی کمشنر صاحب کڈور نے انتخاب شدہ قریوں کے کام کی ۳۱۔ دسمبر ۱۹۳۹ء کی ششماہی اختتامی رپورٹ میں ظاہر کئے ہیں۔

ترقی کے جوش و خروش کا عام ہونا۔ اور ایک کامیاب اور کامل زندگی بسر کرنے کا تقاضا محسوس کرنا دراصل قریوں کے کام وکاج سے زیادہ اہم ہے۔ ترقی کی یہ رفتار دیکھ کر خود گورنمنٹ کے مختلف شعبوں کے افسر جو ان قریوں میں زندگی کی نئی روح پھونک رہے ہیں متعجب ہیں۔ مثال کے طور پر لیجیے ہاسن میں ایک قریہ شعبۂ صنعت و تجارت کی جانب سے اس لئے انتخاب کیا کہ اس کو کام کاج کے ترقی یافتہ و آسان طریقوں سے روشناس کرایا جائے اور ہینڈلوم HAND LOOM کے کام کرنے والوں کو کچھ مہلت ملے۔ اسی جگہ ایک سوت کی ڈپو قائم کی گئی جس کا باعث ہینڈلوم جولاہوں کو مقامی ساہوکاروں کے پنجوں سے نجات دلائی گئی ہے۔ جہاں غریبوں کو سوت مہنگی قیمت پر دے کر تیار شدہ مال سستا خرید کرتے تھے۔ عمدہ قسم کے سوت کا استعمال اور مروج نمونوں کے روشناس کرانے سے جولاہوں کی مزدوری میں ماہانہ چار روپے سے لے کر آٹھ روپیہ تک کا اضافہ ہوا ہے بعض جولاہے تو اعلیٰ ساز و سامان جن کی قیمت چار سو روپیہ تک ہوتی ہے۔ خرید کئے ہیں۔

اسی قسم کے نمائشی مرکز دوسرے دیہات میں بھی ایجاد ہونے والے ہیں ایک گاؤں میں دس مسلم پردہ نشین عورتیں اور ۴۲ مرد ٹریننگ پر ہیں۔ غرض ہینڈلوم ویونگ اور دوسری صنعتیں ترقی پذیر ہیں۔ بہت سارے گاؤں بوریا بافی کا کام کر رہے ہیں۔ بوریا بافی کا ماہر لوگوں کو اس کی صنعت سکھاتا ہے۔ ناریل کے کاشتکاروں کو اب رسی بنانے کا کام سود مند نظر آرہا ہے۔

دیہات کو پاک و صاف اور خوش حال بنانے کے کام کا زور یقیناً سرکاری افسروں سے ہی ہونا چاہئے۔

کڈور میں اس خیال سے کہ دیہات سدھار کا کام محض رسمی بن کر نہ رہ جائے مختلف ڈپارٹمنٹ کے افسروں کی ایک میٹنگ ہوئی جس میں سال کے شروع ہی سے لے کر ایک خاص بنائے ہوئے پروگرام پر کام کرنے کی تجویز قرار پائی ہے ڈپارٹمنٹ کے افسروں پر یہ بات واضح کر دی گئی۔ بنائے ہوئے نیم سالہ پروگرام کے مطابق کام مدت معینہ میں ختم ہو جانا چاہئے۔ اور اگر متوقع ترقی نہ ہو تو اس ناکامیابی کے صحیح اسباب کا امتحان کیا جائے میٹنگ میں کام کے متعلق یہ نظریہ اور بحث و مباحثہ بہت سود مند ثابت ہوا ہے جس کا باعث ویلج پنچایتوں پر کام کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔ اپنی گزشتہ غفلت سے بیداری۔ اور اب ترقی کرنے کا احساس پایا جا رہا ہے۔ نیز ۱۲۵ گاؤں میں خاکروبوں کو ملازمت دی گئی ہے۔ بدرچنوں کا نکلنا بھی دیہات سدھار کا ایک قابل اعتنا رخ ہے۔ ۵۵ گاؤں میں اس قسم کے محلے ہیں۔ ایک گاؤں میں نارنگی کے درخت لگائے جا رہے ہیں۔ غرض دیہات سدھار کا ہر کام خاص قواعد پر مبنی ہے۔ ایک گاؤں جو اپنے میٹرنٹی وارڈ سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا رہا تھا۔ ان سے روشنی اور صفائی کے لئے چندہ فراہم کیا ہے۔

یہ صرف شعبۂ زراعت کے کام کاج کا نتیجہ ہے جس کا سبب آج کل کسانوں کے نئے ساز و سامان۔ بیج اور کھاد کے استعمال کرنے کی قدر دانی ہے ✦

بزم ادب

(۱)

موجودہ اشاعت کے دو افسانے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں "شیشم کے پتے" اور "مذاق"۔ پہلا افسانہ حسن نذیر صاحب ایم اے نے لکھا ہے۔ یہ صاحب ہماری بزم میں پہلی مرتبہ شریک ہو رہے ہیں۔ مگر آثار بتائے دیتے ہیں کہ وہ بہت جلد اس کے صدر نشینوں میں جگہ پالیں گے۔ زیرِ نظر افسانہ ایک گہرا اور نہیں نفسیاتی مطالعہ ہے۔ جس کے رنگ سے اگرچہ مغربیت عیاں ہے لیکن "تار و پود" سراسر مشرقی ہے۔ اردو افسانہ تکنیک کی دشوار منزلیں بڑی تیزی سے طے کر رہا ہے اور ہمارے ہاں اب ایسی چیزیں بھی آ رہی ہیں جنہیں ہم ان کی جدید ترین فن کاری کے لحاظ سے بین الاقوامی ادبیات کی سبھا میں بلا تامل پیش کر سکتے ہیں۔ "شیشم کے پتے" درحقیقت ایک لمحۂ فکر یہ ہے جو گھڑی کی ایک ٹِک اور دوسری ٹِک کے درمیان بجلی کی سی سرعت کے ساتھ تحت الشعور پر چھا جاتا ہے آرٹسٹ نے اس لمحے کو پھیلا کر شعور کا لباس پہنا دیا ہے اور سوچنے والی کے خیالات میں ہمیں بھی شریک کر لیا ہے۔

"**مذاق**" ایک سنجیدہ مطالعہ ہے جو اختر انصاری صاحب کی باریک بینی کا مرہون ہے۔ اختر صاحب احتسابِ نفس کا غیر معمولی ملکہ رکھتے ہیں اور اس کی مدد سے وہ اپنے کردار کو ایک جیتی جاگتی ہستی بنا دیتے ہیں اُن کا روزمرّہ نہایت سلجھا ہوا اور انداز بیان بالکل فطری ہوتا ہے اس لئے ان کی کہانیوں میں ایک ایسی دلکشی ہوتی ہے جو بہت کم افسانہ نگاروں کے حصے میں آئی ہے۔ موجودہ افسانے کا ہیرو ایک نوجوان وکیل ہے۔ جو ہنسی ہنسی میں محبت کا جاں گسل آزار مول لے لیتا ہے اور اگرچہ وہ پہلے ایک بار ناکام محبت کی تلخیوں سے آشنا ہو چکا ہے اور افسانہ نگاری کے معمولات کے مطابق یہ اس کی پہلی اور آخری محبت ہونی چاہئے تھی۔ مگر نہیں، حقیقت نگار افسانہ نویس اسے اس جادۂ دشوار پر پھر سے قدم قدم چلاتا ہے اور ہر گام کی رنگینیاں اور ہر جنبش کی نیرنگیاں ہمارے سامنے بکھیرتا چلا جاتا ہے۔ اس افسانے میں ایک خاص بات یہ ہے کہ ٹریجڈی ہونے کے باوجود اس کی فضا پر ایک دل افزا اور نشاط انگیز کیف آغاز سے انجام تک برابر چھایا رہتا ہے۔

اختر انصاری صاحب کے چند بہت اچھے افسانوں کا مجموعہ "اندھی دنیا" کے نام سے شائع ہو چکا ہے ہمارا ارادہ ہے کہ آئندہ ماہ ناظرین کو اس سے تفصیلاً متعارف کرائیں۔

میراجی نے دنیا کی شاعری پر تنقیدی مضامین کا جو سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ اس میں چند ماہ سے التوا ہو گیا تھا۔ اب انہوں نے اسے پھر سے جاری کر دیا ہے۔ "انگلستان کی تین شاعر بہنیں" اس کی تازہ ترین اور نہایت دلچسپ کڑی ہے۔ ایملی برونٹی اور اس کی دو بہنیں انیسویں صدی کی دنیائے شعر و رومان میں ایک خاص حیثیت رکھتی تھیں۔ ان کی شاعری اور افسانہ نگاری ان کی رومانی زندگی کے دو رُخ تھے اور انہوں نے نہ صرف اپنے آرٹ بلکہ اپنی شخصیت سے اپنے عہد کی ادبیات پر نہایت گہرا اثر ڈالا۔ ایملی برونٹی کا ناول "وِدرنگ ہائٹس" ایک کلاسیکی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ جن اصحاب نے اسے حال ہی میں پردۂ فلم پر دیکھا ہے۔ وہ اس مقالے میں ایک مزید دلچسپی پائیں گے۔

صلاح الدین احمد

---

(۲)

اس شمارے میں بہت سے لوگ احمد حسین امجد کی نظم "زندگی" کو دیکھ کر دل میں کہیں گے کہ یہ شاعری نہیں ہے۔ لیکن انہی لوگوں کو اس نظم کی طرف خصوصاً توجہ دلانا ہے۔ شاعری احساسات اور خیالات کے موثر اظہار کا نام ہے جو کسی موسیقانہ (یا غیر نثری) ذریعے سے کیا جائے۔ اس میں موضوع کے عشقیہ ہونے کی تخصیص نہیں، نہ دل پسند ہونے کی قید ہے۔ پسند ایک اضافی تصور ہے، اور یہ کہنے کی تو ضرورت ہی نہیں کہ عشقیہ احساس ہی تک تخیلِ شعری محدود نہیں۔ ہماری قدیم شاعری کی محبوب ترین صنف غزل ہے اور اسی میں (اس کی ہیئت کی وسعت کے باعث) نظم سے پہلے ہر قسم کے موضوع بیان کئے جاتے رہے تصوف اور اخلاق یا اور اسی قسم کے کسی اور خشک (؟) موضوع کی طرف اگر کوئی شاعر توجہ کرتا تو غزل کے بعد اکثر رباعی ہی اس کا ذریعۂ اظہار ہوتی تھی لیکن نظم کے بڑھتے ہوئے اقتدار کے ساتھ موضوعات

بہت وسیع ہوگئے، اور اب عملی طور پر تقریباً ہر موضوع کی کھپت نظم میں ہوسکتی ہے۔ گزشتہ دس سال میں امجد اور یگانہ اردو کے دو نمایاں رباعی گو شاعر ہمیں دکھائی دیتے ہیں اور ان میں بھی تصوّف کا موضوع امجد ہی کا حصہ رہا ہے۔ لیکن اُس نے اس موضوع کو رباعی کے علاوہ نظم کے ذریعے سے بھی مقبول بنانے کی کامیاب کوششیں کی ہیں۔ آج کی نظم امجد کے مخصوص رنگ کے علاوہ حیاتیات کے جدید تصورات کے لحاظ سے بھی قابلِ توجہ ہے۔ زندگی اور تخلیق سے بڑھ کر کوئی موضوع شعری خصوصیات نہیں رکھتا کیونکہ عشق بھی اُسی جذبے کا ایک عام نام ہے جو زندگی کے بعد پیدا ہوتا ہے اور پھر نئی زندگی کو پیدا کرنے کی وجہ بنتا ہے۔

لیکن یہ صرف داخلی طور پر مفکرانہ باتیں ہیں۔ اس وقت دنیا میں زندگی کے ہر شعبے پر اقتصادیات کے کرشموں کا غلبہ ہے اور شاعر بھی چونکہ اپنے ماحول کا ترجمان ہے۔ اس لئے اُسے بھی کشمکشِ حیات میں ہر پھر کر یہی بات اپنی طرف متوجہ کرلیتی ہے۔ باقی صدیقی کی نظم "صدمہ" ہمارے موجودہ ماحول کی سچی ترجمانی کر رہی ہے۔ اس نظم کے بعض مصرعے باقی نظم کے ساتھ مل کر اُس تضاد کو پوری طرح ظاہر کر رہے ہیں جس سے اس وقت ہمیں زندگی میں دو چار ہونا پڑ رہا ہے۔

مثلاً "گاہ بھر دیتا ہے دل کے جام میں زہرِ ملال" اور "گاہ یاد آکر اٹھا دیتا ہے اک وحشی سی ہوک" ایسے مصرعے اپنے اندازِ بیان سے ذہن میں جذباتی قسم کے تصور پیدا کرتے ہیں۔ لیکن ساتھ کے مصرعے "نادرا لڑکی کا تصور اور بیٹے کا خیال" اور "دوستوں کی سرد مہری، رشتہ داروں کا سلوک" اس پہلے تصور کو دھندلا کر یک قلم ذہن کو زندگی کے تلخ حقائق تک لے آتے ہیں اور پھر دوسرے جذباتی مصرعے از سرِ نو ایک متضاد کیفیت کی تخلیق کرتے ہیں۔ یوں قاری کے ذہن میں شاعر کی ذہنی کشمکش سے ملتی جلتی ایک کشمکش پیدا ہوتی ہے، اور وہ اس ہم آہنگی کی وجہ سے شاعر کے دل کی چوٹ کو اُسی کے اندازِ نظر کے ساتھ محسوس کرسکتا ہے اور اگرچہ اُس ماحول میں جو اس نظم کی تحریک کا باعث ہوا "دلکشی قائم کسی نغمے کی رہ سکتی نہیں" لیکن اس نظم میں ایک تلخ دلکشی ضرور ہے۔

موجودہ فضا اور راہ و رسمِ منزلہا سے تنگ آکر ہی مخمور جالندھری "فتنہ و فسانہ" کے عنوان سے للکارتا ہے۔ لیکن اُسے پھولوں کی سرخی بھی خونِ انسانی کے چھینٹے دکھائی دیتی ہے۔ مادی لحاظ سے یہ غلط نظری ہے۔ اس کے مقابل میں "صدمہ" کے الفاظ میں جس سادگی سے بات کی بات میں صورتِ حال پر تبصرہ کیا گیا ہے وہ زیادہ تلخ اور موثر ہے۔ اور ماحول کا صحیح احساس دلاتا ہے۔

لیکن احمد ندیم قاسمی شاید ماحول سے تنگ آکر ہی اپنی پہلی رومانیت کو پسِ پشت ڈال کر میدانِ جنگ میں جا پہنچا ہے۔ اگرچہ اس کا رومانی رجحان جس انداز سے "گولیوں کو سُبک بوندیاں" بنا لیتا ہے وہ قابلِ غور ہے۔ اس نظم کا سپاہی مورچے میں کھڑا ہے۔ میدانِ جنگ کی تمام ہولناکیاں اس کے سامنے ہیں لیکن وہ ایک طرح سے اُن سے علیٰحدہ ہے اور مورچے کی پناہ میں ہے یہ حفاظت اُسے کافی حد تک محسوس نہیں ہوتی اور اُس کا تصور اُسے دکھاتا ہے کہ اس کا مرکزِ نظر اس مورچے کی حفاظت سے باہر ہے۔ باہر کا ماحول زندگی کا قاتل ہے اور وہ اپنے مرکزِ خیال کے تصور کو اپنے میں جذب کرلینا چاہتا ہے۔ مثنوی کی بحر نے اس نظم میں ایک بیانیہ بہاؤ پیدا کر دیا ہے۔ نیز مورچے میں بیٹھے ہوئے سپاہی کی میدانِ جنگ کے ماحول سے آزادی قابلِ غور ہے۔

آزاد نظم کی قبولیت کا ایک اور ثبوت اس بار ضیا فتح آبادی نے دیا ہے۔ اُس کی پہلی آزاد نظم "طوفان" فن کی بیشتر خصوصیات کی حامل ہے تصورات کی گہرائی اور کثرت اور بیان کی سادگی نے آزاد نظم کا تاثر اس نظم میں کافی حد تک پیدا کر دیا ہے۔ سعید احمد اعجاز کے تصوّر میں وہی نزاکت ہے اور وہی نفاست جس کا اُس نے آپ کو عادی بنا رکھا ہے۔

عبدالعزیز فطرت کی غزل میں ایک محو سننے والی کیفیت ہے خصوصاً اس شعر کی موسیقی غور کے لائق ہے۔

بوئے گلِ تر بن کر بادِ سحری آئی
بادِ سحری آئی، پیغامِ جنوں لائی

میراجی

آئینۂ عالم

لینن افسانوں کے دُھندلکے میں

دنیا میں ہیرو پرستی نے جہاں بعض دفعہ انسان کو مفید کاموں پر مائل کیا ہے وہاں کئی بار غلط رستوں پر بھی ڈالا ہے۔ مغرب کی موجودہ آمرتیں ہیں اس کا ثبوت آج بھی مل سکتا ہے لیکن ذیل کے مضمون میں زیادہ تر ایسے دلائل مل سکیں گے جن کے بعد کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ مشرق ہی ایک ایسا خطہ ہے جہاں توہم پرستی کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔

سوویٹ روس میں لینن کے نام اور کام کو آج ایک ایسا درجہ دیا جا رہا ہے جو ہمارے ہاں الف لیلہ اور جن و پری کی داستانوں کا ہے۔ لینن کے متعلق بے شمار ایسی حکایات کا جال تیار کیا گیا ہے جن میں اُسے محیر العقول کارناموں کا ہیرو دکھایا گیا ہے۔ ان کہانیوں کا بنیادی مواد روس کی پرانی داستانوں کے انبار میں سوویٹ حکومت سے بہت پہلے سے موجود تھا۔ اُسی پرانے مواد اور کہانیوں کے ڈھانچوں کو لے کر اُنہیں اپنے حسب مطلب ڈھالا گیا ہے اور اُن میں اپنے خاطر خواہ کردار پیدا کر لیئے گئے ہیں۔

انقلاب کی وجہ سے وہاں کے کارکنوں کو اس بات کی ضرورت لاحق ہوئی کہ وہ تہذیب و تمدن کے اُن پہلوؤں کی تنظیم بھی چند مہینوں یا سالوں میں اپنے دلخواہ کر لیں جن کی قدرتی نشوونما میں صدیاں گذر جاتی ہیں۔ اور یوں پُرانے تصورات کی بجائے نئے خیالات کو لوگوں کی زندگی کا جزو بنا دیں۔ اور اس لئے پروپاگنڈا کو ایک ایسی مشین کی طرح چلایا گیا جو پرانے نظام کو ملیا میٹ کرنے کے ساتھ ساتھ نئے اصولوں کو زبردستی رائے عامہ پر طاری و ساری کر دے۔ لیکن اس سلسلے میں بھی جب لوگوں پر سوویٹ خیالات کا اثر بڑھانے میں دیکھا کہ قصے کہانیوں کے ذریعے سے یہ کام نسبتاً آسانی سے پورا ہو سکتا ہے۔ تو روسی کارکنوں نے ایک حیرت ناک باقاعدگی کے ساتھ اپنی تمام تر توجہ اس شعبۂ کار کی طرف کر دی۔

مرکزی روسی جمہوریتوں میں انقلاب سے پہلے بھی باشندوں کا کچھ حصہ لکھنے پڑھنے کے قابل تھا۔ ان علاقوں میں جو فسانہ طرازی کی گئی ہے اُس میں لینن کو صرف حیوانات کی مدد سے مذہب اور زار روس سے مقابلہ کرتے دکھایا گیا ہے جنوں اور چڑیلوں کو ان قصوں سے الگ رکھا گیا ہے۔ مثلاً

"جب حیوانات کو معلوم ہوا کہ لینن اور سٹالن کو گرفتار کر لیا گیا ہے اور کسی کو اُس مقام کا علم نہیں جہاں اُنہیں چھپا کر قید رکھا گیا ہے تو چڑیوں نے ارادہ کیا کہ وہ جا کر اُس جگہ کا پتہ چلائیں گی۔ چنانچہ اُنہوں نے ہر قیدخانے کے گرد و پیش اور اندر باہر اُڑ اُڑ کر کھوج لگانا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ وہ اُس کوٹھڑی تک جا پہنچیں۔ جہاں لینن اور سٹالن کو زنجیروں میں باندھ کر قید کیا گیا تھا۔ چڑیوں نے ایک دم قیدخانے کے تمام چوہوں کی تنظیم کی اور اُن کے ذریعے سے قیدیوں کی زنجیروں کو کتر کر کاٹنے کا انتظام کیا۔ چوہوں نے اُود بلاؤں کو اس بات پہ آمادہ کیا کہ وہ جیل کی موٹی دیواروں میں لینن اور سٹالن کی کوٹھڑی سے لے کر باہر تک ایک سرنگ بنا دیں۔ اور جیل سے نکل کر اُن دونوں کو ایک بہت بڑا زبردست عقاب ملا جو اُنہیں اُڑا کر پہاڑوں کی آزاد سرزمین کی طرف لے گیا۔"

۱۹۱۷ء سے سنہ ۱۹۲۱ء تک روس میں جو خانہ جنگی ہوتی رہی اس کے متعلق بھی بہت سی کہانیاں بنائی گئی ہیں۔ ذیل کی کہانی جس کا تعلق زار روس اور لینن سے ہے بہت مقبول ہے۔

"زار روس کے دربار میں ایک روز اُس کا ایک سپہ سالار باریابی کے لئے حاضر ہوا اور دست بستہ عرض کی کہ حضور کی سلطنت سے باہر ایک ایسا آدمی رہتا ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ بہت چالاک اور ہشیار انسان ہے نہ تو وہ کہیں ملازم ہے اور نہ اُسے کسی نے کوئی خطاب دیا ہے۔ اُس کا نام لینن ہے اور وہ یہ ڈینگ مارتا پھرتا ہے کہ وہ حضور معظم کے خلاف جنگ کر سکتا ہے۔ اُسے ایک خفیہ لفظ معلوم ہے۔ اور اگر کہیں وہ جہاں پناہ کے سپاہیوں کو وہ لفظ سکھا دے۔ تو تمام سپاہی فوج شاہی کو چھوڑ کر اُس سے جا ملیں گے۔ اور وہ خود بھی یہ کہتا ہے کہ وہ اسی ایک لفظ کے ذریعے سے آپ کی حکومت کو ملیا میٹ کر کے ہم سب کو خاک میں ملا سکتا ہے۔

"زار روس یہ سن کر ڈر گیا اور بولا۔ ایک دم اس آدمی کو جسے نہ کوئی خطاب دیا گیا ہے اور جو نہ کہیں ملازم ہے۔ ہماری طرف سے یہ پیغام بھیجو کہ وہ ہرگز ہرگز اس خطرناک لفظ کو ہمارے یا ہمارے سپہ سالاروں کے خلاف استعمال نہ کرے اور اگر اُس کی تسلی یوں ہو سکتی ہو تو میں اپنی آدھی سلطنت اُسے دینے کے لئے تیار ہوں۔

زار کے وزیروں نے جلد سے جلد یہ پیغام لینن تک پہنچایا۔ اور اس کے جواب میں لینن نے کہا اے زار! معلوم ہوتا ہے کہ اب تو اپنی سلطنت میں مجھے

بھی حصہ دینے کو تیار ہے۔ لیکن جب تک تو میری شرائط قبول نہ کرے۔ یہ ممکن نہیں ہے۔ میری شرائط یہ ہیں کہ اپنے افسروں کو تُو اپنے ماتحت رکھ۔ اُن کے بلّے تمغے مجھے نہیں چاہئیں۔ ملک کے امیروں رئیسوں کو بھی تو اپنے پاس رکھ اُن کا مال خزانہ اور ہیرے جواہر مجھے درکار نہیں۔ اور اُن بڑے بڑے سوداگروں کو بھی تُو اپنے ماتحت رکھ جن کی دولت بنکوں میں جمع ہے اور کارخانوں کے مالکوں کو بھی تُو اپنے ہی لئے سنبھال۔ لیکن ان کے علاوہ باقی تمام لوگ میرے ماتحت ہونے چاہئیں۔ سپاہی، کسان اور مزدور لوگ، اور ان کے ساتھ مجھے ڈھور ڈنگر اور تھوڑے سے غلّے کی بھی ضرورت ہے۔

"زار کے لئے یہ سودا بہت دلپسند تھا۔ وہ بول اُٹھا۔ لینن کو لکھ دو کہ ہمیں اُس کی شرائط منظور ہیں۔ عجب احمق معلوم ہوتا ہے کہ آدھی سلطنت کے مقابلے میں ان ہیچ سی چیزوں کو ترجیح دیتا ہے اور سپاہیوں کی مجھے کیا پروا ہے جب تک روپیہ ہمارے پاس ہے ہم ہر وقت دوسرے ملکوں سے بھاڑے کے ٹٹو منگوا سکتے ہیں اور اُنہیں سپاہی بنا سکتے ہیں۔

جب لینن زار کے سپاہیوں، کسانوں اور مزدوروں سے ملا تو اُس نے اُن سے کہا۔ ہم سب ایک دوسرے کے ساتھی ہیں اور جو کچھ بھی ہم کمائیں گے آپس میں برابر بانٹ لیں گے۔ سپاہیوں اور مزدوروں نے اُس کی رائے سے اتفاق کیا۔ لیکن کسانوں کے خیال میں لینن زار سے دھوکا کھا گیا تھا۔ وہ کہنے لگے کہ لینن کو چاہیئے تھا امیروں کا مال خزانہ اُن کے پاس نہ رہنے دیتا۔ اگر وہی مال خزانہ ہم لوگوں میں بانٹ دیا جاتا تو ہمارے کھیت اور ہم بہت خوش حال ہو جاتے۔

"لیکن لینن یہ سن کر ہنس دیا۔ اور بولا اپنے کھیتوں پر محنت سے کام کرو تو خوشحالی ہی خوشحالی ہے۔ اُن لوگوں سے اگر میں تمام سونا جواہرات بھی لے لیتا تو وہ ہم لوگوں میں بٹ بٹا کر کچھ بھی نہ رہتا۔ کیونکہ وہ بہت کم لوگ ہیں۔ اور ہم تعداد میں بہت زیادہ ہیں لیکن اگر میں اپنا بڑا اسرار لفظ مُنہ سے نکال دونگا تو یہ لوگ اپنی دولت کے باوجود باہر کے لوگوں کو بھاڑے کا ٹٹو نہیں بنا سکیں گے اور پھر سمجھ لینا کہ ان کی تباہی یقینی ہے۔

"اس کے کچھ عرصہ بعد ہی لینن کو زار سے اس مضمون کا ایک خط موصول ہُوا کہ اے لینن تو نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ تو تمام کام کرنے والے آدمیوں کو میرے پاس سے لے گیا ہے۔ سپاہیوں کے بغیر میرے تمام افسر بالکل نکمے ہو کر رہ گئے ہیں۔ اُن کو تو صرف کھانے پینے سے کام ہے اور روز بروز کاہل ہوتے جا رہے ہیں۔ اور کارخانوں کے مالک تو جلد ہی مشینوں کا ستیاناس کر دیں گے۔ اُنہیں کتابوں سے ہی مشینری کا علم حاصل ہے لیکن عملی طور پر وہ کلوں کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے اور بیرون ملک کے غریب غربا ہمارے سپاہی بننے کو تیار نہیں ہیں کیونکہ وہ تیرے اُس بڑا اسرار لفظ کو سننے کی راہ تک رہے ہیں۔ اب میرے پاس صرف ایک راستہ رہ گیا ہے اور وہ یہ کہ میں تیرے خلاف جنگ کا اعلان کر دوں تاکہ میں تمام لوگوں کو پھر اپنی طرف لے آؤں۔"

ایسی کہانیوں سے پہلے بہت سے کسان ایسے تھے جنہوں نے انقلاب کے باوجود لینن کا نام تک نہ سُنا تھا۔ ان کے ذریعے سے اُنہیں پہلی بار اس کی شخصیت کا علم ہُوا۔ اشتراکی معلم ان کسانوں کو تعلیم کے ساتھ ساتھ ایسی کہانیاں سناتے تھے اور ان کہانیوں کو اُن کی ذہانت کے بالکل مطابق بنا لیتے تھے۔

ٹنڈرا اور پامیر کے علاقوں میں ایسا پروپاگنڈا بہت مشکل تھا کیونکہ وہاں تو زار کے زمانے میں بھی زار سے زیادہ طاقتور تیمور اور سکندر اعظم کو سمجھا جاتا تھا۔ نہ وہاں کوئی پڑھنے لکھنے کے قابل تھا کہ کتابوں سے ان کہانیوں کو پڑھ لیتا۔ وہاں کے بھاٹ تیموری اور سکندری داستانوں کو سنایا کرتے تھے اور انہیں بھاٹوں کے ذریعے سے یہ نئی کہانیاں بھی اُن لوگوں تک پہنچائی جانے لگیں۔ پہلے وہ جنّوں اور پریوں کی کہانیاں سنتے تھے۔ اس لئے ان کہانیوں کو اُن کے لئے اُسی پرانے رنگ میں ڈھالا گیا۔ اسی قسم کی ایک کہانی دیکھئے۔

"ایک دفعہ کا ذکر ہے اور ابھی اس بات کو تھوڑا ہی عرصہ گذرا ہے کہ ہم لوگ امیروں کے ظلم سے نالاں تھے۔ اور اُن سے تنگ آکر سورج اور ستاروں سے اپنی فریادیں کر رہے تھے۔ لیکن جب لینن نمودار ہُوا تو کھلے میدانوں نے ستاروں سے سرگوشی میں کہا، یہی وہ انسان ہے جو ہمیں مکتی دلائے گا اور دنیا کو اپنے ہاتھوں سے ایک نئی صورت دے دے گا۔

"امیروں کو جب اس کا پتہ چلا کہ اُن سے ہمارا انتقام لینے والا آموجود ہُوا ہے تو اُنہوں نے لینن کو مار ڈالنے کا ارادہ کر لیا۔ اُس زمانے میں ایک شیطانی جادوگر تھا۔ امیروں نے اس قتل کے لئے اُس کی مدد چاہی۔ اور اُسے کہنے لگے تو نے ہمیں امیر بننے میں مدد دی تھی۔ اور دوسروں کو دبا کر ہم امیر بنے اور تو بھی امیر بن گیا۔ اب تو ہی لینن کو مارنے میں ہماری مدد کر اگر تُو نے یہ کام کر دیا تو ہم تیرے لئے ایک سونے کا محل بنا دیں گے۔ جس میں جواہرات سے نقش و نگار بنے ہوں گے۔ اور اس کے علاوہ ہم چالیس حسین و جمیل دوشیزائیں بھی تیری خدمت میں پیش کریں گے۔

"لیکن اُس جادوگر نے ایک سو سونے کے محل اور سولہ ہزار حسین و

جمیل دوشیزائیں اس کام کے لئے طلب کیں۔ امیر لوگ اس پر بھی راضی ہو گئے اور اس کے علاوہ اُن سب نے ایک ایک انگوٹھی بھی اُسے دی۔ ان میں سے ایک انگوٹھی ایسی تھی کہ اُسے پہننے والا دوسروں کو دکھائی نہ دے سکتا تھا۔ جادوگر نے وہ انگوٹھی پہن لی اور ایک بگولے کی صورت اختیار کر لی اور لینن کو اپنے زور سے اٹھا کر پہاڑ سے دے مارا۔ لیکن لینن نے پہاڑ کو اس زور سے لات ماری کہ چٹانیں گونج اُٹھیں۔ اور آسمان پر بجلی چمکنے لگی۔

"چونکہ جادوگر نظر نہ آ سکتا تھا اس لئے اس بات کا خطرہ تھا کہ اس کشمکش میں لینن تھک جائے گا لیکن اس کے باوجود لینن کے ماتھے سے پسینے کا ایک قطرہ جادوگر کے ہاتھ پر جا پڑا۔ پسینے کے اس قطرے میں اتنی گرمی تھی کہ اُس نے جادوگر کے ہاتھ کو ہڈی تک جلا ڈالا اور وہ درد کے مارے اپنے ہاتھوں کو بھینچنے اور ملنے لگا۔ اس طرح انگوٹھی اُس کی انگلی سے نکل کر گر پڑی اسی دوران میں پہاڑوں نے بڑے بڑے پتھر جادوگر پر پھینکنے شروع کر دیئے اور لینن نے اُس کی پیٹی اور تلوار اُس سے چھین لی اور اس پیٹی میں سے اُسے وہ طلسم حاصل ہوا جس سے بنی نوع انسان کو دُکھ سے رہائی دلائی جائے۔ لیکن جادوگر ابھی مرا نہ تھا۔ اُسے جنوں نے بچا لیا تھا۔ اُس نے اب کی بار ایک بہت ہی خوبصورت عورت کا روپ دھارا اور لینن کے دل میں دو تیر لگا دیئے۔ اس کے بعد وہ سانپ ظاہر ہوا جس کا زہر دنیا کے ہر زہر کا علاج ہے اور جو ہر صدی میں انسان کے علاج کے لئے ظاہر ہوا کرتا ہے۔ اس سانپ نے لینن کا علاج کیا اور اُسے مرنے سے بچا لیا۔ اور وہ جادوگر اس کے بعد گندھک کا دھواں بن کر رہ گیا۔"

سویٹ حکومت نے ایسی کہانیوں ایسی تمام حکایتوں اور دوسرے انقلابی فسانوں اور گیتوں کو اکٹھا کرنے کے لئے ایک خاص کمیٹی مقرر کی ہے تاکہ یہ تمام چیزیں زمانے کے ساتھ معدوم نہ ہونے پائیں۔ اور روس کا مشہور شاعر اور ناول نگار میکسم گورکی اس کمیٹی کا صدر ہے۔

بسنت سہائے

غزل

وہ باتیں تری، وہ فسانے ترے — شگفتہ شگفتہ بہانے ترے

حکایات کی مجھ کو خو پڑ گئی — بڑے لطف زا تھے فسانے ترے

بس اک جرمِ سجدہ مری کائنات — جبینیں تری آستانے ترے

فقط زخمِ نظارہ حصہ مرا — بہاریں تری آشیانے ترے

کسی نے نہ اسرار سمجھے ترے — کسی نے نہ احوال جانے ترے

ضمیرِ صدف میں کرن کا مقام — انوکھے انوکھے ٹھکانے ترے

یہ دیر و حرم کے تعین کا خبط — یہ حیرت گری کے بہانے ترے

بہار و خزاں کم نگاہوں کا وہم — بُرے یا بھلے سب زمانے ترے

فقیروں کا جمگھٹ گھڑی دو گھڑی — شرابیں تری بادہ خانے ترے

عدم بھی ہے تیرا حکایت کدہ
کہاں تک گئے ہیں فسانے ترے

عدم

سپاہی — مورچے میں

دھڑکتا ہے دل، سنسناتا ہے دل   خدا جانے کیوں لوٹ جاتا ہے دل،
برستی ہیں آنکھیں ترستے ہیں لب   لرزتے ہیں کیوں دست و پا بے سبب
مرا جسم کیوں کپکپاتا ہے آج   لہو دل میں کیوں سرسراتا ہے آج
مری روحِ خوابیدہ تھرّا گئی،   یہ کس کی مجھے آج یاد آگئی؟

گرجتا ہے ہر لمحہ میدانِ جنگ   نرالے ہیں دشمن پہ حملوں کے ڈھنگ
بڑھیں گولیاں سنسناتی ہوئی   بہت تیز، سیٹی بجاتی ہوئی
وہ اک توپ کا گولہ آکر پھٹا   وہ اک نوجواں چیخ کر مرگیا
فضاؤں سے گرتے ہیں بم پے بہ پے   دھواں بن کے وہ مورچے اُڑ گئے
رگڑتا ہے اک توپچی ایڑیاں   لہو مُنہ میں، اور لب پہ ہے "میری ماں"
سنا ہے کہ یہ چاندنی رات ہے   مگر چاند پر موت کا ہات ہے!
یہ عالم ہے، لیکن مرے دل کے پاس   صبُوحی کھڑی ہے حزیں اور اداس
وہ آنکھوں سے دریا بہاتی ہوئی   وہ زلفوں میں چہرہ چھپاتی ہوئی
پریشاں نگاہیں، ہراساں ہے دل   حسیں جسم بے رنگ اور مضمحل
یہ محزوں جوانی، یہ غمگیں شباب   یہ ویران آنکھوں میں ماضی کے خواب

اِدھر مورچے میں دبک جا کہ تُو   نہیں جانتی تُند گولوں کی خُو
خدا کے لئے سر اُٹھا کر نہ دیکھ   مری سمت گردن بڑھا کر نہ دیکھ
دہانے وہ توپوں کے پھر کھُل گئے   وہ نظارے پھر خاک سے دُھل گئے
سمٹ جا مری روح میں میری جاں،   مری روح ہے عالمِ بے کراں

یہاں گولیاں ہیں سبک بوندیاں
یہ ہے عشق کا معبدِ جاوداں!

احمد ندیم قاسمی

انگلستان کی تین شاعر بہنیں

اہل مشرق اور خصوصاً ہندوستانی ہمیشہ سے کہتے آئے ہیں کہ عورت کے بھید کو کوئی نہیں پا سکتا، اور شاعر کی ہستی بھی دنیا کی نظروں میں نفسیاتِ جدید کی دریافت تک پُراسرار رہی۔ ان خیالات کے ہوتے ہوئے اگر کسی شاعرہ کے متعلق کچھ کہنا ہو تو یہ خدشہ لاحق ہو سکتا ہے کہ آگہی کے دام کے باوجود کہیں عالمِ تحریر کا مدّعا عنقا نہ ہو جائے۔ دنیا کی بڑی شاعر عورتوں میں سے یونان میں سیفو اور ہندوستان میں میرا بائی کی زندگی پر بھی اسی طرح کا ایک روایتی دھندلکا چھایا ہوا ہے۔ اور انگلستان کی شاعرہ ایمیلی برونٹی بھی اُنہی کے پہلو بہ پہلو کھڑی ہے، اس بات کے ہوتے ہوئے کہ اُس کا زمانہ آج سے صرف سو سال پہلے کا ہے۔

لیکن پہلے ایک وضاحت کر لی جائے۔ عنوان میں تین بہنوں کا ذکر ہے، اور مضمون میں صرف منجھلی بہن ایمیلی برونٹی کی شاعری کا بیان ہوگا۔ اس دُہری تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ ان تین عورتوں کی زندگی کے فسانے ایک دوسرے کے حالات میں اس قدر گھلے ملے ہوئے ہیں کہ انہیں الگ کرنا نامناسب معلوم ہوتا ہے اور اگرچہ نظم کی صنف میں تینوں نے حصہ لیا ہے بلکہ اُن کے بھائی نے بھی نظمیں لکھی ہیں لیکن شاعری کا اصلی جوہر صرف ایمیلی میں تھا۔ بڑی بہن شارلوٹ کا صحیح درجہ ایک ناول نویس کا ہے اور چھوٹی بہن آین بھی اسی صنف سے تعلق رکھتی ہے، رہا بھائی تو اس کی شخصیت اس خاندانی فسانے میں ایک متضاد کیفیت رکھتی ہے یا اگر استعارہ ذرا سخت نہ ہو تو کہا جا سکتا ہے کہ ان تین ذہین بہنوں کا یہ بھائی باوجود اپنے گھر والوں کی اُمیدوں کے اپنے آپ کو ابنِ نوح ہی ثابت کر سکا۔

انگریزی ادب کے گلزار میں برونٹی خاندان کی کہانی باغ کا ایک ایسا کونہ ہے جس میں زنگار رنگ کے اچھوتے پھول کھلے ہوں۔ ایسے پھول جن کا رنگ و بو صرف اُن کے ذاتی ماحول اور ذہانت کا ممنون ہو۔ لیکن ایمیلی کی شاعرانہ حیثیت ایک ایسا پھول ہے جسے پورے باغ میں خواہ کوئی ممتاز درجہ نہ ملا پھر بھی وہ اپنی انفرادی خصوصیات کی بنا پر ایک ناقابلِ انکار دلکشی رکھتا ہے۔ مختلف نقادوں اور دوسرے مصنفوں کی آرا کو اگر قابلِ اعتبار سمجھا جائے تو بہت سے ہیں جو اس مسئلے کے متعلق متفق الرائے ہیں۔

ایمیلی کے شاعرانہ جوہر کو سب سے پہلے اُس کی بڑی بہن شارلوٹ نے تسلیم کیا۔ ستمبر ۱۸۴۸ء میں وہ لکھتی ہے" مجھے اس کلام کی تعجب انگیز خوبیوں کا گہرا احساس ہے اور یہ احساس مجھے اُسی وقت سے ہے جب پہلی بار مسودہ اتفاقیہ میرے ہاتھوں میں آیا۔ یہ نظمیں چھوٹی چھوٹی ہیں لیکن ان میں اخلاص ہے۔ انہوں نے میرے دل پر بالکل اسی طرح اثر کیا جیسے سنکھ کی آواز کانوں تک پہنچ کر انسان کو ایک دم متوجہ کر لیتی ہے .... مجھے کسی ایسی عورت کا علم نہیں ہے جس نے ایسا کلام لکھا ہو۔ جمی ہوئی شکنتی، صفائی، تکمیل ___ انچھا پر زور تاثر ___ یہ اس کلام کی خصوصیات ہیں"

اور بعد کے لکھنے والے بھی کم و بیش اسی رائے کے حامی ہیں۔ آرتھر بنسن لکھتے ہیں" یہ ماننا پڑے گا کہ دلچسپی کا مرکز ایمیلی ہی کا کلام ہے اور اگر اس میں وہ شاعرانہ جوہر نہ ہوتا جو اس سے صاف طور پر عیاں ہے تو باقی تینوں کی شاعری کو آج کوئی بھی نہ جانتا" مشہور شاعر جان ڈرنک واٹر لکھتا ہے" شارلوٹ اور این کے متعلق سیدھی سی بات تو یہ ہے کہ وہ شاعر ہی نہیں ہیں۔ اُن کی شاعری میں صرف ایک سوانحاتی دلچسپی ہی ہو سکتی ہے۔ اُن کے کلام سے اُن عورتوں کی سیرت کا خلاص نمایاں ہے جنہوں نے ادب کی ایک اور صنف میں پائیدار کام کیا۔ ایمیلی کی نظموں میں بھی اُس کی سیرت کا صاف نقش موجود ہے اور اُس کی سیرت باقی تینوں کی بہ نسبت زیادہ نادر اور اثر انگیز تھی"۔

البتہ آرتھر بنسن کی رائے میں ایمیلی کے کلام میں فنّی خوبیاں بھی موجود ہیں لیکن جان ڈرنک واٹر کو اس سے اختلاف ہے۔

برونٹی خاندان کی ان تین بہنوں کے مداحوں کو دو مختلف گروہوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جنہیں اُن کی مصنفانہ حیثیت میں دلچسپی ہے، اور دوسرے وہ جو اُن کی ذات میں دلچسپی لیتے ہیں۔ یہ دوسرے حضرات پہلے گروہ کے لئے بعض اوقات ایک رُکاوٹ بن جاتے ہیں کیونکہ انہوں نے برونٹی خاندان کی شخصیتوں کے اردگرد ایک فریب انگیز دھندلکا پیدا کر دیا ہے۔ کسی شاعر کے سوانح حیات اُس کے کلام کے مطالعے میں اُسی حد تک معاون ثابت ہو سکتے ہیں

جس حد تک کہ وہ اُس کی ذہنی نشو ونما پر روشنی ڈالیں۔ ذاتی حالات میں غیر معمولی دلچسپی سے یہ نقصان دہ پہلو نکل سکتا ہے کہ ہم افسانہ پرست بن کر رفتہ رفتہ اُس کے کلام کی حقیقت سے دور ہوتے جائیں گے۔ اور پھر کلام کی صحیح جانچ میں الجھن پیدا ہو جائے گی۔

ایمیلی برونٹی کی ذہانت کا جوہر اپنی بڑی بہن شارلوت کی بہ نسبت کم متنوّع اور کم اختراعی تھا لیکن اس کی وجہ سے اس کی تخلیق ادبی میں ایک بڑھا ہوا اعتماد تھا، اور اُس کا ذہن زیادہ مفکرانہ خصوصیات کا حامل بن گیا تھا۔ چنانچہ اُس کے کلام سے جو نکتے نکلتے ہیں اُن میں سوانحاتی اثرات سے بہت کم اُلجھن پیدا ہوتی ہے۔ اگرچہ بعض انگریزی نقادوں نے اُس کی شخصیت کو ایک معمہ کہا ہے لیکن یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ اُس کی زندگی بہت سیدھی سادی تھی۔ اُس کا کوئی راز تھا ہی نہیں، کم سے کم ایسا کوئی راز نہ تھا جو فسانہ پرست طبائع کے لئے دلچسپی اور توجہ کا سبب بن سکتا لیکن بات کہیں یک طرفہ نہ بن جائے اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ برونٹی خاندان کے یہ افراد انگلستان کے ادب میں محض تاریخی حیثیت ہی نہیں رکھتے بلکہ یہ تینوں بہنیں خود بھی ایک ایسے افسانے کے کردار ہیں جس کے مطالعے سے قاری کے ذہن پر ایک ملال انگیز کیفیت چھا جاتی ہے۔ اُن کی سیرت میں ماحول سے ایک ایسی ہم آہنگی ہے، ایک ترشی ترشائی نفاست ہے، ایک یکسانیت ہے جو اکثر ادبی شاہکاروں میں نظر آتی ہے۔ کسی بڑے ناول کے کرداروں نے حقیقتاً کوئی زندگی ہی نہیں گذاری ہوتی اور اس لئے وہ کبھی مر بھی نہیں سکتے۔ اُسی قسم کی ایک لافانی خصوصیّت اِن بہنوں کی سیرت میں بھی پائی جاتی ہے اور یہ لافانی خصوصیّت ایمیلی میں زیادہ ہے کیونکہ اُس کا جوہرِ ذہنی باقی بہنوں سے برتر تھا اور اس کی وجہ آسودہ تجربات کا وہ اجتماع تھا جو خداداد جوہر کا لازمہ ہوتا ہے۔

بچپن ہی سے ایمیلی کو ایک شدید احساسِ تنہائی کسی مہلک مرض کے جراثیم کی طرح لاحق تھا۔ ابتدائی کلام میں وہ ایک جگہ لکھتی ہے:۔

"میں اکیلی ہوں، اکیلی۔
"میرے انجام کو پوچھے گا نہ کوئی،
"کوئی بھی آنکھ بہائے گی نہ آنسو،
"میں اکیلی ہوں، اکیلی!"

اس زمانے کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر مناسب موقعہ مہیا ہو گیا تو ان اشعار کے لکھنے والی ادب کے افق پر ایک روشن ستارہ بن سکے گی اور چند ہی سالوں میں یہ اُمید پوری ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن پہلے اس کی زندگی کا خاکہ پیشِ نظر کر لینا چاہئے۔

شارلوت اور اس کے بھائی برین ویل نے اپنے دوستوں کے نام جو خطوط لکھے اُن سے اُن کی سیرت اور ذاتی حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ چھوٹی بہن این کے متعلق اُس کے محبوب شاگردوں اور اُن لوگوں کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے جن کے ہاں وہ ملازم رہی لیکن ایمیلی نے کسی کو دوست نہ بنایا، وہ لوگوں کی واقفیت سے کتراتی رہی اور اُس کی یہ کم آمیزی اور بھی نمایاں محسوس ہوتی ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ اپنے خاندان میں بھی، اگرچہ اُسے اپنے بھائی سے کسی قدر تعلقِ خاطر تھا، وہ این کے سوا باقی افراد سے زیادہ خلاملا نہ رکھتی تھی لیکن این نے کوئی ایسی تحریر نہ چھوڑی جس سے ایمیلی کی ذہنی خلوت کا کچھ علم ہو سکے۔ اس سلسلے میں صرف اس کا کلام اور ایک یادگار ناول ہی باقی ہے جس سے اُس کی نفسی کیفیتوں کا اظہار ہو سکے۔ یا اُس کے سوانح حیات میں سے صرف چند سیدھی سادی باتیں ہی محفوظ ہیں۔

شارلوت کی دوست ایلن نسی ایک جگہ ایمیلی کا حلیہ بیان کرتی ہے جبکہ وہ ابھی پندرہ سال کی تھی —— "نازک، شائستہ جسم، بالوں میں ایک فطری حُسن تھا، اور اُن کی تزئین وہ بہت سیدھے سادے انداز میں کئے ہوئے تھی، چہرے کا رنگ روپ پھیکا، روشن، دردمند آنکھیں جن کا رنگ کبھی سیاہی مائل بھورا محسوس ہوتا تھا اور کبھی سیاہی مائل نیلا، لیکن وہ کبھی کسی سے آنکھ ملا کر بات نہ کرتی تھی کیونکہ اُس کی طبیعت کم آمیز اور محتاط تھی۔"

بعض جذباتی مصنفوں نے ایمیلی کو خوبصورت بیان کیا ہے۔ لیکن اگرچہ اُس کے بھائی کی تیار کی ہوئی تصویر سے اُس کے حسن کا اندازہ لگانا مناسب نہ ہوگا۔ کیونکہ وہ کوئی اچھا مصوّر نہ تھا، پھر بھی اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ایمیلی نہ صرف خوبصورت تھی بلکہ اُس میں کوئی نسوانی دلکشی بھی نہ تھی کیونکہ اگر ایسی کوئی بات بھی اُس میں ہوتی تو اس کا کوئی نہ کوئی ہمعصر ضرور اس کا ذکر کرتا۔ پہلی نظر میں تو اُسے کسی قدر بے ڈھب صورت کا بھی سمجھا جا سکتا تھا۔ برونٹی خاندان کی ناک حسن کے لحاظ سے کبھی بھی قابلِ توجہ نہیں کہی جا سکتی۔

شارلوت کی صورت ہی کو لیجئے۔ اس کے نقش بے قاعدہ سے ہیں، اُس کی ناک برونٹی خاندان کی غیر نسائی خصوصیت لئے ہوئے ہے۔ اس کے بال بھورے ہیں اور اُس کی بڑی بڑی روشن آنکھیں ہی چہرے کی باقی خامیوں کو چھپا کر اُس کی صورت میں ایک دلکشی پیدا کر دیتی ہیں۔ اُسے خود بھی اپنی بدصورتی کا یقین تھا۔ لیکن اُس کی دلکشی کا اعتراف اس کے بہت سے دوستوں نے بھی کیا ہے اور اس سے بھی ثابت ہے کہ تمام عمر میں چار مردوں نے اُسے اپنی رفیقۂ حیات بنانا چاہا۔

پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے کہ برونٹی خاندان کے افسانے میں زیب داستاں کے لئے بھی بہت سی رنگ آمیزی کی گئی ہے۔ لیکن اُس رنگ آمیزی کو نظرانداز کرنے کے بعد بھی اس کہانی کی دلکشی میں کوئی فرق نہیں آتا اور اس کی وجہ اس کہانی کے کرداروں کی انفرادی گہرائیاں ہیں۔

ایمیلی کے باپ کا نام پیٹرک برونٹی تھا۔ اُس کے مزاج میں کافی حد تک سنک موجود تھی بے لاگ قسم کی خشک طبیعت جسے اپنے بچوں سے بھی کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ پیٹرک برونٹی ۱۷ مارچ ۱۷۷۷ء کے روز آئرلینڈ میں پیدا ہوا۔ اس کے اپنے ماں باپ کسان تھے۔ جب تک آئرلینڈ میں رہا پہلے بافندگی اور بعد میں معلّمی کا کام کرتا رہا۔ بعد ازاں کیمبرج یونیورسٹی سے اس نے پادری بننے کے لئے دینیات کا امتحان پاس کر لیا اور مختلف مقامات پہ کیوریٹ کی خدمت انجام دینے کے بعد ۱۸۰۵ء میں یارک شائر کے علاقے میں ایک گرجا کی امامت شروع کر دی۔ ۱۸۱۲ء میں اُس نے ایک کارنش عورت سے شادی کر لی جس کا نام میریا برین ویل تھا۔ یہاں اُن کے ہاں دو لڑکیاں پیدا ہوئیں جن کے نام علی الترتیب میریا اور الزبتھ رکھے گئے۔ اس کے بعد پیٹرک برونٹی تھارٹن ٹرن کے مقام پر جا پہنچا یہاں چار بچے اور پیدا ہوئے سب سے پہلے شارلوت پھر ایک لڑکا پیٹرک برین ویل برونٹی اور پھر ایمیلی اور این۔ چھوٹی لڑکی ابھی تین ماہ کی تھی کہ برونٹی خاندان نے تھارن ٹرن کو چھوڑ کر ہاورتھ کے مقام پہ اقامت اختیار کر لی۔ ہاورتھ علاقہ یارک شائر میں ایک دور دراز علیحدہ سا سنسان گاؤں ہے، جو ہاں کی بنجر سرزمین کے کنارے پہ واقع ہے۔ یہاں کے محنت کش باشندے تہذیب و تمدن کی نفاست سے دور اور اکھڑ گنوار قسم کے ہیں۔ اس گاؤں کے ماحول نے برونٹی خاندان کی ذہنی نشوونما پر ایک خاص اثر کیا اور وحشیانہ، بیراگی انداز والی ایمیلی تو گویا اس جگہ ہی کا ایک حصّہ تھی۔ چنانچہ جب کبھی اسے آئندہ زندگی میں اپنے اس گھر سے دور جا کر رہنا پڑا تو وہ کسی ایسی ڈال کی طرح مرجھا کر گرنے لگی جسے پیڑ سے علیحدہ کر دیا جائے۔

ہاورتھ کا نام انگلستان میں ہمیشہ کے لئے برونٹی خاندان کے رومانی افسانے سے منسلک ہو چکا ہے۔ یہاں پہنچنے کے بعد ۱۸۲۱ء میں پیٹرک برونٹی کی بیوی اپنے بچوں کو زندگی کے حوادث کے سپرد کر کے مر گئی۔ بیوی کے مر جانے پہ پیٹرک نے اپنی سالی الزبتھ برین ویل کو اپنے ہاں رہنے کے لئے بُلا لیا، تاکہ وہ بچوں کی نگہبانی کر سکے۔ اور وہ تمام عمر ان بچوں کی پرورش اور نگہداشت آخری دم تک نہایت دلسوزی سے کرتی رہی۔ پہلی چار لڑکیاں قریب کے کسی اور گاؤں کے سکول میں پڑھتی تھیں اور ان کا رہنا سہنا بھی وہیں تھا۔ اس سکول کے انتظامات کچھ ایسے اچھے نہ تھے کیونکہ یہاں معمولی لوگوں کے بچے پڑھتے تھے۔ ایک بار وبائی بخار کی وجہ سے یہاں بہت سی لڑکیاں مر گئیں اور اسی زمانے میں یہاں کے انتظام میں اور بے ترتیبی پھیل گئی۔ طالبات کو خوراک اچھی طرح نہ ملتی رہی اور اس لئے میریا اور الزبتھ میں دق کی علامتیں نمودار ہو گئیں۔ جس کی وجہ سے انہیں سکول چھوڑ کر گھر لوٹنا پڑا۔ شارلوت اور ایمیلی تعلیم سے کسی حد تک فارغ ہونے کے بعد آئیں۔ لیکن میریا اور الزبتھ اس دوران میں مر چکی تھیں۔ شارلوت ایمیلی اور این اپنی خالہ کی نگرانی میں مطالعے اور گھر کے کام کاج میں وقت گذارنے لگیں۔ اُن کے دلوں میں اس بچپن کے زمانے ہی سے ادبی امتیاز حاصل کرنے کی اُمنگیں تھیں۔ چنانچہ وہ اپنے دلی شوق سے جو چھوٹی چھوٹی کتابیں لکھتی رہیں وہ سب آج تک ہاورتھ کے برونٹی میوزیم میں محفوظ ہیں۔ ان میں کہانیاں نظمیں اور مضمون سبھی کچھ ملتے ہیں۔ لیکن یہ سب بہت ہی باریک خط میں لکھے ہوئے مسوّدے ہیں اور کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کون سی چیز کس نے لکھی تھی۔

شارلوت سولہ سال کی تھی کہ نیو بیری میں مس مارگریٹ وُولر کے سکول میں داخل ہو گئی لیکن ایک سال کے بعد ہی گھر پر اپنی بہنوں کی تعلیم میں مدد کے لئے لوٹ آئی۔ اس سکول میں اُس کی دو ہم جماعتیں دوست بنیں۔ ایک میری ٹیلر اور دوسرے ایلن نسی۔ تمام عمر شارلوت نے ان دونوں سے خط و کتابت جاری رکھی اور ایلن کے نام جو خطوط لکھے گئے زیادہ تر انہی سے اُس کی زندگی کے حالات کا پتہ چلتا ہے۔ آئندہ تین سال ہاورتھ میں رہنے کے بعد وہ پھر مس وُولر کے سکول میں اُستانی کی حیثیت سے گئی اور ایمیلی کو تعلیم کی تکمیل کے لئے ساتھ لیتی گئی لیکن ایمیلی وہاں جا کر اداس رہنے لگی۔ اُس کے دل کو ہاورتھ کے ماحول سے کچھ ایسی فطری مناسبت تھی کہ وہ اس سے الگ اور دُور رہ کر گویا آرام کا سانس ہی نہ لے سکتی تھی۔ چنانچہ ابھی اُسے وہاں تین مہینے ہی گذرے تھے کہ مجبوراً گھر لوٹنا پڑا۔ اور اُس کی بجائے سب سے چھوٹی بہن این وہاں چلی گئی۔ لیکن شارلوت کو اپنے گھر سے محبت بھی تھی اور نفرت بھی۔ وہ اس اداس مقام سے دور بھی رہنا چاہتی تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی اس بات کی بھی خواہشمند تھی کہ سب بہنیں یک جا رہیں، ہاورتھ میں رہنے سے وہ اپنی اُمنگوں اور تجویزوں کو تکمیل تک نہیں پہنچا سکتی تھی اور اس سے دور رہ کر اُسے مکمل یکسوئی حاصل نہ ہوتی تھی اس کا خیال گھر کے محبوب افراد کی طرف بٹا رہتا تھا۔ چنانچہ ۱۸۳۱ء میں شارلوت پھر ہاورتھ میں آ گئی۔

اس آمد کے کچھ عرصہ بعد ہی اُسے اپنی سہیلی ایلن نسی کے بھائی ہنری نسی کی طرف سے شادی کی درخواست پیش کی گئی۔ لیکن شادی کے علاوہ اور بہت سی باتیں اُس کے ذہن سے زیادہ قریب تھیں۔ اس درخواست کے کچھ عرصہ بعد ایک اور صاحب نے بھی خواستگاری کی لیکن شارلوت نے دونوں بار انکار کر دیا اور یارک شائر کے علاقے ہی میں ایک کے بعد ایک دو مختلف گھرانوں میں اُستانی کی خدمت اختیار کر لی۔ یوں چند روز کی اقتصادی خود مختاری نے اس کے دل میں اُمنگ پیدا کر دی کہ وہ اپنی اس آزادی کو اور بڑھائے اور اپنا ایک علیحدہ سکول قائم کر کے اُس میں پروفیسر کی حیثیت میں کام کرے۔ اس کے لئے اُسے ضروری معلوم

ہوا کہ وہ انگلستان سے باہر نکل کر فرانسیسی اور جرمن زبانوں کے علم کو تکمیل تک پہنچائے۔ اُس کی خالہ نے اس کام کے لئے روپیہ دینا منظور کیا۔ اور وہ اپنی بہن ایمیلی کو ساتھ لے کر برسیلز کے مقام پر ایک بلجین استاد ایم ہیگر کی درسگاہ میں جا پہنچی۔ یہاں دونوں بہنوں نے محنت اور توجہ سے کام کیا اور یوں اس درسگاہ کے بڑے معلّم ایم ہیگر کی نظروں میں جلد ہی اپنے لئے ایک خاص جگہ پیدا کر لی۔

لیکن جلد ہی انہیں یہاں سے بھی وطن کو لوٹنا پڑا کیونکہ اُن کی خالہ کی اندیشہ ناک بیماری کی خبر اُن تک پہنچی۔ ان کی خالہ اُن کے گھر پہنچنے کے بعد ۲۹ اکتوبر ۱۸۴۲ء کو اس دنیا سے چل دی۔ لیکن وہ اپنی جمع کی ہوئی جو پونجی اپنی بھانجیوں کے لئے ورثے میں چھوڑ گئی اُس کی سہارے پر انہیں موقع ملا کہ وہ از سرِ نو اپنی زندگی کو کسی باقاعدہ بنیاد پر قائم کریں۔

انہوں نے سوچا کہ بجائے کسی اور جگہ کے اپنے گھر پر ہی کیوں نہ ایک درسگاہ معمولی پیمانے پر شروع کر دی جائے تاکہ وہ اپنے باپ کے ساتھ بھی رہ سکیں۔ لیکن شارلوت ابھی اپنے غیر زبانوں کے مطالعے سے مطمئن نہ ہوئی تھی اس لئے جب ایم ہیگر نے استانی کی حیثیت میں اپنے سکول کے لئے بلایا تو اُس نے جھٹ منظور کر لیا۔ لیکن اس اجنبی درسگاہ کے ماحول میں بھی تنہائی کے احساس نے اُسے نہ چھوڑا اور اگرچہ یہاں دوبارہ آنے سے اُس کی ذہنی وسعت میں فرانسیسی ادب کے مطالعے سے ایک وسعت پیدا ہوئی، پھر بھی وہ ۱۸۴۴ء میں ہاورتھ اپنے باپ کے گھر لوٹ آئی اور تینوں بہنیں پھر اُسی پہلی درسگاہ کے قیام کی تجویز کے امکانات پر غور کرنے لگیں۔

قواعد و ضوابط تیار کر کے شائع کئے گئے لیکن کسی شاگرد نے رجوع نہ کیا۔ اس کی دو وجہیں تھیں۔ پہلی تو یہ کہ ہاورتھ کا گاؤں دوسرے مقامات سے ایک علیحدہ اور دور دراز جگہ تھی، دوسرے ان کا بھائی برین ویل اب لوگوں میں ایک پکّا شرابی مشہور ہو چکا تھا۔ لوگ ایسے گھر میں جہاں وہ موجود ہو اپنی بچیوں کو بھیجنا پسند نہ کرتے تھے۔

برین ویل اپنی خالہ اور بہنوں کا لاڈلا تھا اور اگرچہ شارلوت اس کے اطوار اور نامناسب چلن کی وجہ سے اُس سے برگشتہ خاطر ہو گئی تھی لیکن ایمیلی کے دل میں اس کے لئے اب بھی جگہ تھی۔ ابتدائی تعلیم اس نے اپنے باپ کی نگرانی میں حاصل کی تھی اور شروع ہی سے اس کی طبیعت میں فنکارانہ رجحانات کا اظہار موجود تھا لیکن اس کی شخصیت میں برونٹی خاندان کا کمزور پہلو نمایاں تھا۔ اس میں ایک فطری دلکشی بھی تھی لیکن اُس نے نیچ قسم کے قابلِ اعتراض لوگوں کی صحبت اختیار کر لی اور مقامی سرائے میں شراب خوری کے لئے ہر روز شام کو جانا شروع کر دیا۔ شارلوت کے الفاظ میں وہ گھر کے ذرائع آمدنی پر ایک بار تھا، اور گھر کی خوشی کے راستے میں ایک [illegible] اگرچہ شروع شروع میں اُس نے اپنی قابلیت سے کام لینے کی کوشش کی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ عملی زندگی کو کامیاب بنانے کے ناقابل تھا اور مختلف کاموں میں محض وقت ہی ضائع کرتا رہا۔ کچھ عرصہ وہ اپنی چھوٹی بہن این کے ساتھ اُسی خاندان میں اتالیق بھی رہا جہاں وہ استانی کی خدمت انجام دے رہی تھی۔ لیکن وہاں آپ کے دل میں اپنی مالکن سے عشق کا جذبہ جاگ اٹھا مالکن کے لئے یہ بات کوئی رغبت دلانے والی نہ تھی آپ کی طبیعت میں ایک وحشت تو تھی ہی چنانچہ جلد ہی اپنے چلن کی بنا پر وہاں سے جدا کر دیئے گئے اور گھر آن کر آپ نے بزعم خویش افیون اور شراب کے نشے میں اپنی ناکام محبت کو بھلانا اور غم غلط کرنا شروع کر دیا۔

جان ڈرنک واٹر کی رائے میں برین ویل میں شاعری کا اچھا خاصا ممتاز جوہر موجود تھا جسے تسلیم کرنے سے اخلاق کے اصولوں پر کسی طرح کی آنچ نہیں آتی اور اس بات کا ثبوت اُس کی زندگی کے چند واقعات سے بھی ملتا ہے۔ ۱۸۳۵ء میں اس کے خاندان نے اپنے ذرائع کی کمی کے باوجود اُن اُمنگوں کی تعبیر کو دیکھنے کے لئے جوں توں کر کے اُسے لندن کی رائل اکیڈمی میں مصوّری کی تحصیل کے لئے بھیجا۔ لیکن برین ویل وہاں ایک ماہ تک دادِ عشرت دے کر گھر لوٹ آیا۔ کچھ عرصہ وہ لیڈس میں بھی مصوّری کا مطالعہ کرتا رہا لیکن اُسے کوئی مستقل کام نہ ملا۔ اس لئے وہ مختلف جگہوں پر مختلف کام کرتا ہوا آخر اس خاندان میں جا پہنچا جہاں اس کی چھوٹی بہن ملازم تھی۔ لیکن یہ قصہ اوپر بیان ہو چکا۔ اس کا انجام ہاورتھ ہی میں لکھا تھا اور یہاں سے نکل کر وہ ہاورتھ میں آ پہنچا۔ جہاں بغیر کسی طرح کا دنیوی امتیاز حاصل کئے ہوئے آخر وہ اپنے گھر والوں کی امیدوں کو جھٹلاتا ہوا ۱۸۴۸ء میں راہی عدم ہوا۔

سب سے بڑھ کر وہ اپنے باپ کی امیدوں کا مرکز تھا۔ اور ابتدائی سالوں میں اُس نے نظم و نثر دونوں کی طرف توجہ بھی کی لیکن کسی قسم کی ترقی حاصل نہ کر سکا۔ بعض نادان نقاد یہ سمجھتے ہیں کہ اپنی بہنوں کی ادبی تخلیقات میں بھی اس کا حصہ تھا۔ لیکن یہ یکسر غلط ہے۔ اس کی بہنوں کی امیدیں جلد ہی اس کے چلن کی وجہ سے ختم ہو چکی تھیں۔ خود شارلوت ایک جگہ لکھتی ہے کہ اُن کے بھائی کو معلوم ہی نہ تھا کہ بہنیں ناول نگاری میں مصروف ہیں وہ تو خصوصاً زندگی کے آخری سالوں میں شراب میں ہی دُھت رہتا تھا۔

حقیقت میں برین ویل کو اپنی بہنوں کی کارگزاری کا کچھ نہ کچھ اندازہ تو ضرور تھا لیکن وہ اس کی اہمیت اور صحیح نوعیت سے ناواقف تھا۔

انہی سالوں میں لڑکیوں کے لئے ادب کے میدان میں ایک راستہ نکل آیا۔ ایک روز کسی چیز کی تلاش میں شارلوت نے اتفاقیہ ایمیلی کی میز کے دراز میں نظموں کا ایک مسودہ دیکھا اور مطالعے پر وہ اُن کے جوہر سے بہت متاثر ہوئی اور اُن کی اشاعت کا ارادہ کیا۔ ایمیلی جس نے اپنی نظموں کو اس وقت تک چھپا کر رکھا ہوا

تھا اشاعت پر کسی طرح راضی نہ ہوتی لیکن شارلوٹ کے عزم نے فتح پائی خصوصاً جب این نے بھی چند نظمیں پیش کر دیں تو تجویز یہ قرار پائی کہ تینوں بہنیں اپنے کلام کا ایک مجموعہ شائع کریں۔ البتہ یہ فیصلہ ہوا کہ اسے فرضی مردانہ ناموں سے شائع کیا جائے۔ اس مجموعے کی اشاعت پر اُن کے پچاس پاؤنڈ صرف ہوئے۔ کیونکہ ناشر نے اسی شرط پر مسودہ لیا۔ لیکن صرف دو جلدیں فروخت ہوئیں۔ ریویو بھی بہت کم ہوئے اور صرف ایک نقاد نے اتنا تسلیم کیا کہ ایمیلی والی نظموں میں ایک اچھوتی انفرادیت موجود ہے۔

لیکن ان اولوالعزم عورتوں نے اس ناکامی سے ہمت نہ ہاری۔ تینوں نے ایک ایک ناول تیار کر رکھا تھا۔ چنانچہ ناولوں کے مسودے لندنی ناشروں کے ایک دروازے سے دوسرے دروازے تک سرگرم سفر ہوئے۔ انہی ناولوں میں ایمیلی کا وہ مشہور عالم ناول "وُدرنگ ہائیٹس" ہے جو انگریزی ناول نگاری کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

ایمیلی کے ناول "وُدرنگ ہائیٹس" کے متعلق مشہور شاعر رِدزیٹی کہتا ہے کہ اس کا ماحول دوزخ میں بسایا گیا ہے۔ ہم اسی سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس داستان میں جذبات کی کیسی کچھ کشمکش ہوگی۔ اور محبت کے سیدھے سادے احساس کو ایک پیچیدہ صورت دے کر کس طرح ایک ایسی نفسی کیفیت پیش کی ہوگی کہ پڑھنے والے کے دل پر ایک ملول ہیبت چھا جاتی ہے۔ ایمیلی دنیوی لحاظ سے کوئی تجربہ کار عورت نہ تھی لیکن اُس میں ایک اندرونی شدید زندگی ضرور تھی اور اُس نے اپنی اس فطرت سے جس میں گھر بار اور آزادی کے لئے ایک تند و تیز جذبہ تھا۔ ایسے احساسات کی تصویر اپنے ناول میں کھینچی جن کے سامنے دوسرے تمام جذبات ماند پڑ جاتے ہیں۔ اس ناول میں اُس نے اپنی روح کے ساتھ "عورت" کی روح کو نکال کر رکھ دیا ہے۔ اس کتاب کا بنیادی نظریہ وہی پرانا خیال ہے کہ محبت "عورت" کی تمام ہستی ہے۔ چنانچہ ناول میں ایک جگہ ہیروئن کہتی ہے۔

"میں ہی ہیتھ کلف (ہیرو) ہوں، وہ ہر وقت، ہمیشہ میرے ذہن میں بسا ہوا ہے، اُس کا ہونا کسی خوشی کی علامت نہیں ہے، بالکل ایسے جیسے میرا ہونا میرے لئے کوئی خوشی نہیں، میں صرف "ہوں" اور یونہی وہ بھی مجھ میں صرف "ہے"۔

اپنے ناول وُدرنگ ہائیٹس میں اُس نے جو کردار تخلیق کئے ہیں اُن کے دلوں میں بچپن کی ایک ضد ہے۔ اُن کی محبت اور نفرت ایک طفلانہ غیر معقولیت لئے ہوئے ہے، وہ ظلم پر اُتر آتے ہیں تو بچوں ہی کی طرح آگا پیچھا نہیں دیکھتے اور ہیرو تو گویا اُس تنہائی اور اُداسی اور اُس غیر جنسی لیکن ہیجان انگیز محبت کی تڑپ اور تشنگی کا ایک مجسمہ ہے جس کا اظہار اُس کے شاعرانہ کلام میں ہر جگہ گونج رہا ہے اور اُس کی قریباً ہر نظم پر چھایا ہوا ہے۔

بہت جگہوں کے چکر لگانے کے بعد آخر کار ایک ادارے نے شارلوٹ کے ناول کو پسند کیا۔ لیکن اُن کی رائے میں یہ ناول بہت چھوٹا تھا اور اس زمانے کے رجحان کے لحاظ سے یہ بات درست نہ تھی۔ انہوں نے لمبے ناول کی فرمائش کی۔ شارلوٹ اس کے لئے بھی تیار ہو چکی تھی۔ لمبا ناول بھی آن پہنچا اور شائع ہونے پر بہت مقبول ہوا۔ اسی دوران میں ایمیلی اور این کے ناول بھی شائع ہوئے۔ اور ایمیلی کے ناول کے موضوع کی اجنبیت کے باوجود ان دونوں نے بھی قبولیت حاصل کی بہت سے لوگوں نے یہ خیال کیا کہ یہ تینوں ناول ایک ہی قلم سے نکلے ہیں اور اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے شارلوٹ اور این نے لندن کا سفر بھی کیا۔ اسی زمانے میں اُن کے بھائی کا انتقال ہوا۔

برین ویل کی موت کے کچھ عرصہ ہی بعد سے ایمیلی بھی گھلنا شروع ہو گئی۔ کھانسی کی کیفیت روز بروز بدتر ہونے لگی اور دق کے اثرات ایک بار پھر اس خاندان میں نمایاں ہونے لگے۔ لیکن ایمیلی نے دوا دارو سے مطلق انکار کر دیا اور کسی بیمار ہرنی کی طرح وہ ہر طرح کے میل جول سے کھنچ کر اپنے کمرے کی خلوت میں گوشہ نشین ہو گئی اور علاج کی مدد سے انکار کرتے ہوئے برین ویل کی موت کے تین ماہ بعد مر گئی۔ موت کو اُس نے خوش دلی سے لبیک کہا کیونکہ زندگی میں بھی تو اُسے کوئی خوشی نظر نہ آئی تھی اور وہ بھائی جس سے اسے تھوڑی بہت دلبستگی تھی بھی، وہ بھی اب یہاں سے جا چکا تھا۔ وہ آزادی کی طالب تھی، اس دارالمحن سے آزادی ہی اس کا مطمحِ نظر تھا۔ ۱۹ دسمبر ۱۸۴۸ء کو اس کا انتقال ہوا۔

گویا تیس سال کی عمر میں انگلستان کی یہ نحیف و نزار طال انگیز شاعرہ مر گئی زندگی میں اُس کی شخصیت گھر والوں کے لئے ایک معمّا ہی رہی اور موت کے بعد وہ دنیائے ادب میں ایک پُراسرار سی ہستی بن گئی۔ اور اُس کی نفسی زندگی اور خیالات کے متعلق ہمیں جو بھی علم حاصل ہو سکتا ہے وہ اس کے ایک ناول اور کچھ نظموں ہی کے ذریعے سے حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن ان مختصر ادبی تخلیقات کے باوجود بھی ہم اُس کی کم آمیز، خاموش اور محتاط طبیعت اور اُس کے کلام کی خوبیوں کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

ایمیلی کے بعد ہی این بھی بیمار ہو گئی۔ شارلوٹ اسے سکاربرو کے ساحلی مقام پر اس خیال سے لے گئی کہ سمندر کی ہوا سے شاید کچھ افاقہ ہو سکے۔ لیکن وہ بھی وہاں پہنچ کر ۲۸ مئی ۱۸۴۹ء کو مر گئی۔ گویا آٹھ ماہ کی قلیل مدت کے اندر اندر شارلوٹ اکیلی رہ گئی۔ صرف اس کا بوڑھا باپ اس کا ساتھی رہ گیا، جس کی نظر اب بڑھاپے کی وجہ سے کمزور ہو چکی تھی۔

اس کے بعد شارلوٹ کی زندگی لندن آنے جانے اور نئے ناولوں کے لکھنے میں گذرنے لگی۔ ایک نیسوتے شخص نے بھی اس زمانے میں اس سے مناکحت کی درخواست کی لیکن اس کا حشر بھی وہی ہوا جو پہلے خواستگاروں کی توجہ کا ہو چکا تھا۔ آخر چوتھا آدمی کامیاب ثابت ہوا اور شارلوٹ نے ۲۹ر جون ۱۸۵۴ء کے روز آرتھر بیل نکلس سے شادی کرلی جو بہت عرصے سے باوجود ناامیدی کے اب تک اس کا خواستگار تھا۔ مس وولر اور مس نسی، دلہن کی سہیلیاں اس شادی کی گواہ تھیں۔ شادی کے بعد دولہا دلھن نے ہنی مون آئرلینڈ میں منایا۔ اور پھر دونوں ہاورتھ میں آکر دلھن کے باپ کے ساتھ رہنے لگے لیکن شارلوٹ ۳۱ر مارچ کو اپنی مسرت کا مختصر زمانہ دیکھ کر ایام زچگی میں مرگئی اور ان سب سے آخر ۱۸۶۱ء میں اس کا باپ بھی اپنے تمام خاندان کے بعد اس دنیا سے روانہ ہوا۔

یہ ہے برونٹی خاندان کا موت کے متواتر ذکر سے پر نیا المناک افسانہ لیکن اس کی دلچسپی اور اس کی اثر انگیزی کے اظہار کو اس کا یہ سیدھا سادا بیان کافی نہیں ہے۔ اس خاندان کی سوانح نگار مسز گیسکل نے جس انداز میں اس داستان کو بیان کیا ہے وہ اپنی دلچسپی میں کسی ناول سے کم نہیں ہے۔ لیکن ان تین بہنوں کی ادبی تخلیقات کے صحیح مرتبے کو تسلیم کرنے کے لئے کسی طرح کے رومان کی ضرورت نہیں رہتی۔

برونٹی خاندان کا افسانہ موت کا افسانہ ہے۔ ایملی کے علاوہ شارلوٹ پر بھی موت کے اس مستقل احساس نے ایک گہرا اثر کیا اور بچپن ہی سے اُس کے دل میں اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کے لئے ایک مادرانہ شفقت کا جذبہ پیدا کر دیا۔ شارلوٹ کے لئے اپنے آپ کو دنیا کے مطابق بنا لینا آسان تھا۔ لیکن ایملی کے لئے مشکل کیونکہ اُس کی فطرت میں اُس قسم کی عامیانہ ہمدردی اور اُنس و التفات کی کمی تھی جس سے زندگی کی دلچسپی کے اضافے میں مدد ملتی ہے۔ اگرچہ اپنے گردو پیش کے لوگوں سے ایملی کا رویہ مہربانی آمیز تھا۔ پھر بھی وہ ان سے میل جول کی کوئی کوشش کبھی نہ کرتی تھی۔

ایلن نسی لکھتی ہے کہ بچپن میں ایملی اور این میں بہت ہم آہنگی تھی ہمیشہ وہ اکٹھی رہتیں اور آپس میں بولتی چالتیں۔ اس کا ثبوت وہ نظمیں بھی ہیں جو انہوں نے مل کر لکھی تھیں۔ شارلوٹ سے وہ کبھی گھل کر نہ رہ سکتی تھی کیونکہ وہ اس قسم کی بڑی بہن تھی جس سے ایملی سی خشمیلی حساس اور کم آمیز ذہانت ہم آہنگ ہو کر اپنے دل کی بات نہیں کہہ سکتی۔ شارلوٹ کا ذہنی رجحان عملی، انتقادی اور خاموش طریق پر درد مندانہ تھا لیکن وہ گھر کی ہر بات میں برتری اور تفوق حاصل کرنے کی عادی تھی۔ ایملی اور اس میں بہت سی باتیں متضاد تھیں۔

برونٹی خاندان کے بچوں کو بچپن ہی سے گھریلو آزادی مل گئی تھی جو بھی جس کے جی میں آئے کرے، جیسی کتابیں جس کا جی چاہے پڑھے اور اپنے ملازموں سے گاؤں کے قصے کہانی اور گپ شپ سُنے۔ ایسے حالات تخیل اور ذہانت کے ساتھ مل کر ادب اور آرٹ کی تخلیق بھی کر سکتے ہیں اور بچوں کو دنیوی لحاظ سے بگاڑ بھی سکتے ہیں۔

بچوں میں اکثر دیکھا گیا ہے کہ جب انہیں ذہنی اور جسمانی لحاظ سے ہر قسم کی آزادی مل جائے اور دنیا کے تجربات کو وہ اپنے طور پر حاصل کرنے لگ پڑیں تو وہ اپنے لئے ایک خیالی دنیا کھڑی کر لیتے ہیں، اور رفتہ رفتہ یہ دنیا حقیقی دنیا کی مانند اُن کے لئے اصلیت اختیار کر لیتی ہے۔ اس میں بھی روزمرّہ زندگی ہی کی طرح ایک ہنگامہ ہر وقت گھر کی رونق کا باعث بنا رہتا ہے۔

برونٹی خاندان کے بچّوں نے بھی اپنے لئے ایک ایسی دنیا بنائی۔ اور بچپن کے سب سے بڑھ کر خوشی سے بھرپور لمحے انہوں نے اسی دنیا میں گذارے اس دنیا میں وہ خواب دیکھنے کے عادی ہو گئے۔ بہت سے لوگوں کے لئے یہ طفلانہ جہان تخیل طفلی ہی تک رہتا ہے اور بلوغ کے ساتھ ہی دھندلا کر ایک دوری اختیار کر لیتا ہے کیونکہ ایک تو اُن کی پرواز تخیل کافی حد تک ناکارہ ہو جاتی ہے اور دوسرے ان کی روزمرّہ زندگی کے جھمیلے اپنی دلچسپی یا کثرت کی وجہ سے خوابوں کے لئے وقت نہیں رہنے دیتے۔ لیکن ایک شاعر کے ذہن میں یہ دنیا کبھی نہیں مٹتی اس کی پرواز تخیل جاری رہتی ہے اور بلوغ کے بعد بھی روز بروز ایک بڑھتی ہوئی وسعت اختیار کرتی جاتی ہے۔ کیونکہ اس کے لئے تخیل کی زندگی ہی حقیقی زندگی ہوتی ہے۔ اور اسی میں اُسے سچّا اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ یہ دنیا گویا اس کی ہستی کا ایک حصّہ بن جاتی ہے۔ ایملی کی بھی یہی کیفیت تھی۔ اُس کے لئے ہاورتھ گاؤں ایسے سنسان مقام اور اُس کے گردو پیش کے مناظر اور قریب کے بنجر پتھریلے علاقے میں ہی ایک اہمیت تھی، ایک حسن تھا، اور یہ حسن اُس کے لئے محبت کی شدت لئے ہوئے تھا۔ اور یہ ایک بات خصوصاً اُسی کی فطرت کا لازمہ تھی یعنی دنیوی تجربے کے محدود ہونے کے باعث وہ بڑی ہو کر بھی ایک بچّہ ہی تھی۔ بڑے ہو کر بھی اُس کے دل میں اپنے ماحول نے بچپن کی مبہم اور جذبات انگیز اُمنگیں پیدا ہوتی تھیں۔ چنانچہ اُس کی شاعری میں بھی دو باتیں بہت نمایاں نظر آتی ہیں۔

پہلی اُسے تنہائی کا ایک ایسا احساس تھا جو بعض اوقات شدید ہو کر ہیبت ناک صورت اختیار کر لیتا تھا۔ دنیا اسے خالی اور تاریک دکھائی دیتی تھی۔ لیکن یہی احساس بعض دفعہ اُسے بہجت افروز نظر آتا تھا اور وہ اپنے آپ کو قدرت کی بنیادی طاقتوں سے ہم آہنگ پاتی تھی۔

دوسرے اُس کے دل میں ایک ہر شے کو جذب کر لینے والی محبت کی آرزو تھی۔ اس محبت کا خاصہ ملکیّت کا جذبہ تھا، حصول کی خواہش، لیکن اس میں

جسم کو کوئی اہمیت نہ تھی۔ یہ محبت بیک وقت جذبات انگیز بھی تھی اور اس میں جنس کا دخل بھی نہ تھا۔

لیکن ایمیلی اپنے ان طفلانہ تصورات میں صرف خواب ہی نہ دیکھتی تھی۔ وہ سوچتی بھی تھی اور اس لحاظ سے بھی اس کا ذہن اچھوتی اور پُر زور خصوصیات کا حامل تھا۔ اُسے اپنے گرد و پیش کے مناظرِ قدرت میں ایک اہمیت اور ایک حسن کا احساس ہوتا تھا لیکن اپنے گرد و پیش کے لوگوں کی زندگی میں، اُن کی محبت میں اُن کی مسرتوں میں اور ان کے غموں میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ پالتو جانوروں سے اسے دلچسپی تھی۔ لیکن بچوں سے وہ الگ رہتی تھی۔ انسانوں کی اُسے پروا نہ تھی۔ اُسے اُن کے ذہنوں کی حرکات پر غور کرنا نہ بھاتا تھا۔ اُسے یہ تجسس نہ تھا کہ لوگ کیا سوچتے اور کیا چاہتے ہیں اور اپنے ذہن کی حرکات کو وہ جبلّی طور پر دوسروں پر ظاہر ہونے سے بچاتی رہتی تھی۔ وہ محفل میں خلوت کی بہ نسبت زیادہ تنہا تھی۔ کیونکہ خلوت کو وہ انجمن سمجھتی تھی اور اپنے مختصر خیال ہی سے اُسے بسا لیتی تھی۔ صرف گاؤں کے پاس کے بنجر علاقے ہی میں وہ اپنے خارجی ماحول سے اپنے آپ کو ہم آہنگ پاتی تھی۔

اس قسم کی کشمکش سے عموماً فطرت باغیانہ خصوصیات کو پرورش کر لیتی ہے۔ داخلی اور خارجی زندگی کا ایسا تضاد انسان کو ماحول سے بغاوت پر مجبور کر دیتا ہے لیکن ایمیلی میں ایسی کوئی بغاوت نہ تھی۔ اُس نے زندگی کے حقائق کو خاموشی کے ساتھ ایک فلسفیانہ انداز میں قبول کر لیا تھا۔

شارلوٹ لکھتی ہے کہ میری بہن کی طبیعت قدرتاً عزلت پسند نہ تھی۔ حالات نے اُس کی تنہا پسندی کو پرورش کر کے نشو و نما دی۔ گرجا جانے یا سیر کو نکلنے کے علاوہ وہ کبھی گھر کی دہلیز سے باہر قدم نہ رکھتی تھی۔

لیکن وہ کون سے حالات تھے جنہوں نے اُس کی طبیعت کو ایسا بنا دیا تھا؟ اس غیر معمولی سنجیدگی کو پیدا کرنے والے موت کے خیالات تھے۔ ابھی وہ تین سال سے کچھ ہی بڑی تھی کہ اس نے ماں کی موت کو دیکھا۔ اس نقصان سے اس پر ایک اور اثر بھی ہوا یعنی وہ زیادہ تر اپنے سخت مزاج باپ کے اثر کے نیچے آ گئی۔ ماں کا نرم اثر اس پر نہ رہا اور اس لئے اس اثر نے اس کی طبیعت میں سے اُس قدرتی لچک کو دور کر دیا جو بچپن اور نسائیت کا خاصہ ہوتی ہے۔ سات سال کی تھی کہ دونوں بڑی بہنیں میریا اور الزبتھ بھی بہت تھوڑے وقفے سے مر گئیں وہ قبرستان جس میں خاندان کے یہ تینوں فرد سپردِ خاک کئے گئے۔ اُن کے گھر کے بالکل ساتھ ہی تھا۔ گھر کے ساتھ باغ تھا اور باغ سے نکل کر ایک چھوٹے سے لکڑی کے دروازے سے ہوتے ہوئے قبرستان میں پہنچا جا سکتا تھا۔ بسا اوقات ایمیلی کے ننھے ننھے پاؤں ان قبروں سے ٹکرائے ہوں گے۔ لیکن اس باغ میں ایک اور دروازہ بھی تھا۔ باغ کے ایک طرف ایک سرسبز گلی سی تھی جس میں سے نکل کر انسان یکدم کھلے پھیلے ہوئے پتھریلے بنجر علاقے کی طرف پہنچ سکتا تھا۔ اس کھلے علاقے میں ایک یکسانیت تھی۔ جب ایمیلی زندگی اور اس دنیا سے بیزار ہو کر اس طرف سیر کو نکل جاتی تو یہ کھلی اور پھیلی ہوئی یکسانیت جس کے مختلف کونوں کھدروں کے حسن کا صرف اُسی کے دل کو احساس اور علم تھا، ایک تسکین کا تحفہ لئے موجود ہوتی اور اس منظر پر آسمان ہمیشہ اپنا شامیانہ تانے رہتا۔ یہاں قدرت اپنے اصلی رنگوں میں اُس کے لئے چشم براہ تھی۔ یہیں اسے ہر قسم کے بندھنوں سے آزادی نصیب ہوتی تھی۔ یہاں پہنچ کر ایمیلی ایک اچھوتی اور نئی ہستی کا بھیس دھار لیتی۔ اُس کی کم آمیزی اور جھجک دور ہو جاتی یہاں وہ اپنے بھائی کے ساتھ بچپن کی شوخیوں میں حصّہ لیتی۔ پانی میں بڑے بڑے مینڈکوں کو تنگ کر کے اِدھر اُدھر بھگاتی اور پھر کمزور اور مضبوط، حاکم اور محکوم، ظالم اور مظلوم کے مسئلے پر خیال آرائی کرنے لگتی لیکن اس ماحول میں کوئی تنوع نہ تھا اور اس ماحول کا یہ اثر ہوا کہ موضوعات اور تصورات کی ایسی ہی یکسانی اُس کی نظموں میں بھی نمایاں نظر آتی ہے۔

اُس کی ذات اِس ماحول کا ایک حصّہ بن گئی تھی۔ وہ اس ماحول کی پیداوار تھی۔ یہاں تک کہ ان مناظر سے دور رہ کر وہ زندہ نہ رہ سکتی تھی۔ دو بار وہ گھر سے دور گئی۔ پہلی بار اُس کی صحت پر اس کا اتنا برا اثر ہوا کہ اُسے جلد لوٹنا پڑا۔ گھر پر بھی وہ اکیلی ہی تھی۔ اس کی کوئی سہیلی نہ تھی، اور خواہ اس سے رومان پسندوں کو ناامیدی ہی کیوں نہ ہو، اُس کا کوئی نوجوان مرد دوست بھی نہ تھا۔ اس کے ذہن کی تمام توجہ کا مرکز اس کا گھر اور اس کا ماحول تھا۔ گھر میں اس کے بھائی بہن بھی اپنے اپنے کاموں اور مشغلوں میں مصروف رہتے تھے اور وہ تنہا گھر بار کا کام کاج کرتی مطالعہ کرتی یا لکھتی لکھاتی رہتی۔ لکھنے لکھانے کے لئے وہ بسا اوقات اس باغ میں جا بیٹھتی جہاں سے قبرستان اور پتھریلے بنجر علاقے کے مناظر اُسے نظر آتے رہتے۔

عورت کی نفسی ذہنیت کی نشو و نما اور اُس کے محبوب خیالی کے متعلق لکھتے ہوئے ایک مغربی ماہرِ نفسیات نے لکھا ہے کہ اکثر لوگوں نے اہتمام اور التزام کے ساتھ اپنی ایک خیالی دنیا بنا رکھی ہوتی ہے جس میں اس دنیا سے دور کوئی تنہا جزیرہ ہوتا ہے یا کسی آبادی سے الگ سرزمین میں کوئی اکیلا محل جس میں وہ اُس وقت جا کر تنہا یا اپنے پسندیدہ کرداروں کے ساتھ اطمینان اور چین کی من مانی زندگی گذارتے ہیں جب انہیں یہ حقیقی دنیا اور اس کی زندگی بے مزہ

اور مشکل نظر آتی ہے۔ اس خیالی دنیا میں خواہشات کی تکمیل میں آسانی ہوتی ہے اور اس لئے یہ نفسی جہان ایک ایسی دلکشی لئے ہوئے ہوتا ہے کہ انسان ذرا ذرا سے بہانے پر حقیقت سے گریز کر جاتا ہے اور جس قدر وہاں کے تصورات سے دل بستگی بڑھتی جاتی ہے اُسی قدر اُس کی ترغیب کو رد کرنا مشکل ہوتا جاتا ہے۔ اس خیالی دنیا کی تخلیق کا باعث بھی ایک خیالی کردار ہی ہوتا ہے۔

بلوغ کے ساتھ انسان میں چاہنے اور چاہے جانے کا جذبہ بیدار ہوتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ ہر مرد کو من مانی پریتم اور ہر عورت کو من مانا پریمی آسانی سے نہیں مہیا ہو سکتا۔ ذہنِ انسانی بھی عجب کار ساز ہے۔ حقیقت کی کمی اور خامی کو پورا کرنے اور سدھارنے میں اس کا عمل بظاہر سادہ لیکن بباطن حیرت ناک ہے۔ وہ اپنا خیالی محبوب پیدا کر لیتا ہے۔ "دلِ بے تاب کو تسکین یوں ہی دے لیں گے" یہ خیالی محبوب جسے عورت کے سلسلے میں عاشق کہیں گے ہر عورت کے لئے ایک زندہ حقیقت کا درجہ رکھتا ہے اور اس کی طاقت اور دلکشی اس لئے ناقابلِ رد ہوتی ہے کہ یہ ذہن کی نفسی کیفیتوں کا ایک اہم جزو ہوتا ہے۔ چونکہ یہ پریمی عورت کا ایک حصہ ہوتا ہے اس لئے اس کا بندھن کسی صورت ٹوٹ نہیں سکتا اور مندرجہ بالا خیالی دنیا اسی محبوب ہستی کے رہنے اور اُس سے ملنے کے لئے بنائی جاتی ہے۔

ایمیلی نے اپنے نفسِ غیر شعوری سے اپنے ذہن کے اس خیالی عمل کو اپنے ناول میں کمال زور و تاثر اور وضاحت سے ظاہر کیا ہے۔ نیز اُس کی نظموں میں بھی ایک ایسی ہی پکار، ایک ایسے ہی خیالی محبوب کی پیاس کا اظہار اور اس سے ملنے مِلانے کی باتیں موجود ہیں۔ ذیل کی نظم میں جو تڑپ ہے وہ اسے رادھا کی بے قراری سے ہم آہنگ کرتی نظر آتی ہے۔

تشفّی

میں آؤں گی، میں آؤں گی جب تو دُکھیا ہو، بے چین،
نور اُجالا لے آؤں گی جیسے چندا والی رین۔
پیتم! جب خوشیوں کے جھُرمٹ تجھ کو تج کر کھو جائیں
اور ہنسی کی لہریں تیرے رُخ سے غائب ہو جائیں۔
شامیں آئیں غم کی دن خوشیوں کے سارے سو جائیں۔
میں آؤں گی، میں آؤں گی جیسے چندا والی رین
نور اُجالا لے آؤں گی جب تو دُکھیا ہو، بے چین،

میں آؤں گی جب تیرے جیون میں پت جھڑ آ جائے،
ٹہنی ٹہنی سوکھے، ہر اک پھول کلی مُرجھا جائے،
روح تری سُونے مندر جیسی صورت جب پا جائے،
میں آؤں گی جیسے دیوی آئے، سُکھ اور چین،
نور اُجالا لے آؤں گی جیسے چندا والی رین۔

دیکھ، یہی لمحہ ہے پیارے! دیکھ! یہی لمحہ ہے، جان!
تو غمگیں ہے، دُکھ سے تیرا ننھا جیون ہے ہلکان۔
تیری روح سے اُمڈے ہیں احساس انوکھے، اِک طوفان!
لے میں آئی، لے میں آئی، کیوں دُکھیا ہے؟ کیوں بے چین!
نور اُجالا لے آئی میں میرے چندا! تیری رین!

ہر شاعر ایک طرح سے دہری زندگی بسر کرتا ہے۔ لیکن کم و بیش اُن دونوں زندگیوں میں کچھ نہ کچھ تعلق ضرور رہتا ہے۔ لیکن ایمیلی برونٹی کی عملی اور تخئیلی زندگی میں جو اختلاف ہم دیکھتے ہیں اس قدر گہرا فرق کسی شاعر کی زندگی میں بھی کم ہی ہوتا ہے۔ اُس کی دہری زندگی کی لہریں بالکل مخالف رو میں بہتی تھیں اور اُن دونوں کے احساساتی رنگوں میں گویا زمین اور آسمان کا فرق تھا۔

ایمیلی کی ڈرامائی یا دوسری چند نظموں کو چھوڑ کر اگر صرف ذاتی نظموں کو دیکھا جائے تو ان کے لہجے میں صرف ایک موضوع کارفرما نظر آتا ہے۔ موت۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنی ایک یادداشت کی تحریر کے مطابق اپنے آپ کو صحت مند اور خوش و خورم اور مطمئن ظاہر کرتی ہے۔ اُس کی عملی زندگی گھر کے کام کاج اور گھریلو دل بستگیوں پر مشتمل تھی اور اس میں وہ مطمئن تھی۔ لیکن اس کی تخئیلی زندگی میں ہر وقت موت کے خیالات کا ایک اضطراب چھایا ہوا تھا اور صرف یہی ایک ایسا اختلاف نہ تھا جو اُس کی فطرت کا جزو بن چکا تھا بلکہ اور متضاد باتیں بھی ایسی تھیں جو اس اختلاف سے کہیں عجیب تر تھیں۔

گوئٹے کے الفاظ میں وہ کہہ سکتی تھی کہ میں اپنے لئے تو خوش ہوں، صرف دوسروں کے لئے میں خوش نہیں ہوں۔ روزمرّہ کے گھریلو کام کاج میں اس کے لئے خوشی تھی، علم کی جستجو میں اس کے لئے خوشی تھی، موسم بہار کے صاف آسمان میں اُس کے لئے خوشی تھی، لیکن یہ باتیں اس کی تحریکِ شعری کی معاون نہ ہوتی تھیں اُس کے تخیّل میں اگر گونج پیدا ہوتی تھی تو صرف انسانی دکھ درد اور موت ہی سے ہوتی تھی۔ مگر اُس کے دل میں کوئی ایسا جذبۂ ترحم موجود نہ تھا جیسا کہ انسانیت پرست لوگوں کے دلوں میں ہوتا ہے۔ اس کے جگر میں سارے جہان کا درد نہ تھا۔

اس کے دل پر اگر کوئی جذبہ کبیر چھایا ہوا تھا تو وہ گھر کی محبت تھی، اس گھر کی محبت جس میں اس نے اپنا بچپن گذارا تھا۔ اس کی فطرت ایک محدود لیکن شدید فطرت تھی جس پر بچپن کے تجربات ایک ایسا گہرا نقش چھوڑ جاتے ہیں جس کے سامنے بعد کے تمام تجربات ایک پرکاہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے دل میں بچپن کے سب سے پیارے، مسرت سے لبریز سالوں کی یاد ہمیشہ تازہ رہی لیکن یہ یاد ایک ایسی مسرت تھی جس کی نوعیت درد سے ملتی جلتی ہو۔ درد اور مسرت کا یہ گہرا تعلق انسانی تجربے میں ازلی اور بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مسئلے کو نفسیاتِ جدید کے ماہرین نے بہت حد تک سلجھایا ہے لیکن اس وضاحت کا یہ موقعہ نہیں۔ البتہ اتنا جتا دینا ضروری ہے کہ موت کے موضوع سے اس قدر وابستگی کے باوجود ایمیلی کو موت بنفسہٖ مرغوب نہ تھی۔ یہ کہنا اس لئے ضروری ہے کہ اُس کی نظموں میں بعض دفعہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ جانتی ہے کہ موت کو بلاوا دینا ایک بزدلانہ پکار ہے جو ایک کمزور قوتِ ارادی کا فعل ہے۔ ایسے ارادے اور ذہنیت کا فعل جسے اس کی اُمید ہی نہیں رہتی کہ وہ اپنی روح کے تصور کو تازہ دم بنا سکے گی۔ اُس تصور کو تازہ دم بنا سکے گی۔ جس میں کبھی تازگی، شادابی، شگفتگی اور زندگی جلوہ گر تھی، اُس کی جان تھی، اُس کی روح رواں تھی۔ اور اس کا ثبوت اُس کی اپنی زندگی بلکہ اس کا آخری وقت ہے جس کے متعلق اُس کی بہن شارلوٹ کہتی ہے کہ ایسا محسوس ہوتا تھا گویا اُسے ایک پُرمسرت زندگی سے زبردستی علٰحدہ کیا جا رہا ہے۔

ایمیلی کی فطرت میں سب سے بڑا تضاد یہ ہے کہ وہ گرہستی طبیعت کے باوجود اپنے دل کی گہرائی میں ایک صوفی تھی، ایک بیراگن تھی۔ وہ میرابائی کی طرح یہ نہیں کہتی کہ "کھان پان موہے نہ بھاوے" وہ گھر کی ہر بات میں دلچسپی لیتی ہے لیکن وہ تصور میں احساسِ مذہبی کرتی ہے۔ اُس کے لئے وجد و حال کی کیفیت جانی پہچانی بات ہے۔ یہاں یہ کہہ دینا بھی بے جا نہ ہوگا کہ تصوف، بیراگ یا وجد و حال کی کیفیت ایک فلسفہ نہیں بلکہ ایک تجربہ ہے۔ یہ تجربہ انسانی زندگی میں نادر ضرور ہے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ ہر شخص گیان کا دیا جلا کر تصور کے اس تجربے کے ذریعے سے روح الابد سے ہم آہنگ نہیں ہوا کرتا۔ ایمیلی اپنے نفس کی خیالی دنیا میں جس محبوب سے ملنے کی مشتاق تھی وہ یہی روح الابد تھی۔ یہ سب نظریہ اگرچہ تصور کا کرشمہ ہے لیکن اس کی حقیقت کو اس سائنٹیفک زمانے میں بھی آسانی سے نہیں جھٹلایا جا سکتا۔

اگر ہم غور کریں تو یہ ہماری زندگی بھی کوئی مسئلہ یا فلسفہ نہیں بلکہ ایک تصور ہی ہے۔ یہ زندگی کا تصور کوئی غیر مرئی چیز نہیں ہے جیسا کہ سادھو سنت خدا کی رحمت* سے کبھی کبھار دیکھ لیتے ہیں بلکہ یہ ایک معین تصور ہے جسے ہر طبیعت اپنے لئے از سر نو تخلیق کرتی ہے۔ شاعرانہ طبائع اس بات کو آسانی سے سمجھ سکتی ہیں۔ بیرونی دنیا اگر ہمارے شعور میں شامل نہیں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُس کی ہستی ہی ناپید ہے اور ہر تصور کی تخلیق اسی بنیاد پر ہوتی ہے۔ شاعر فطرت کا آئینہ ہے وہ اپنی طبعی خصوصیات میں فطرت کے عکس کو دیکھتا ہے۔ اور اُسی عکس یا تصور کا وہ پجاری ہوتا ہے۔ ایمیلی برونٹی نے اپنی طبیعت کے آئینے میں اپنے بکھرے ماحول اور اپنی زندگی کے اُن واقعات کا عکس دیکھا جس میں موت کے ذکر و بیان کو بہت زیادہ دخل تھا اور یوں اُس نے اپنے تخیل کے اظہار سے اپنی فطرت کو ازلی فطرت سے ہم آہنگ بنایا۔

یہاں میں چاہتا ہوں کہ ایک صوفی یا بیراگی کی ذہنی کیفیات کے متعلق بھی کچھ لکھوں تا کہ زیادہ واضح طور پر ایمیلی کی نفسی ذہنیت کے بارے میں اندازہ لگایا جا سکے کہ اُس میں کہاں تک بیراگی لوازم موجود تھے۔

صوفی یا بیراگی ایک ایسی سرزمین میں بستا ہے جو اس دنیا سے الگ ہوتی ہے، وہ سرزمین تمام تر آسمان کی صاف اور منزہ فضا میں بھی نہیں ہوتی اور تمام تر اس دنیا کی آلودگی میں بھی نہیں ہوتی اور اس جگہ رہتے ہوئے وہ اس جہان کی زبان و بیان اور تصورات اور استعاروں کو مفہوم کی ایک روحانی نفاست کا لباس پہنا کر اُن کیفیات کا اظہار کرتا ہے جن کے بیان کے لئے اسے حقیقتاً اس دنیا کی زبان میں الفاظ ہی میسّر نہیں آتے اور یہی وجہ ہے کہ زبان اور مفہوم کے ماخذ میں جو اختلاف ہے وہ ہمیں اُس کے دلی معانی تک پہنچنے میں ایک روک نظر آتا ہے۔

صوفی یا بیراگی ایک ایسے ابدی اصول کا تصور رکھتا ہے جس کی بنا پر انسانی روح ایک سمجھوتے کی آرزو کرتی ہے اور اپنے سے علاوہ کسی اور شے میں مدغم ہو جانا چاہتی ہے۔

تصوف یا بیراگ اصل میں ایک فن ہے جس کی مدد سے ہم اپنی اندرونی قوتوں اور کیفیتوں کے نظام کو باقاعدہ بنا سکتے ہیں اور اس تعین اور باقاعدگی سے ہم کائنات کو جزوی اعتبار کی بجائے کلی طور پر اپنی ذہنی گرفت میں لا سکتے ہیں۔ اس بلند درجے تک پہنچنے کے لئے بعض دفعہ بیراگی کو مختلف ذرائع سے اپنی ذہنی زندگی میں ایک سادگی پیدا کرنی پڑتی ہے۔ یہ ذرائع فاقہ کشی، عزلت نشینی منشیات کا استعمال اور اسی طرح کے اور ذرائع بے خودی ہیں جن کے وسیلے سے ایک بہجت افزا کیفیت ذہن پر چھا جاتی ہے۔ صوفی یا بیراگی کو انتہائی درد یا انتہائی مسرت اُس منزل تک پہنچاتی ہے جس کا تعلق نہ کلیتہً جسم سے ہے نہ روح

ہے۔ لیکن تصوف صرف اس طرح کسی خاص کیفیت کو سمجھنے ہی کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک طریقِ حیات بھی ہے۔ کیونکہ صوفی کو جب ہستی کی وحدت کا احساس ہو جاتا ہے، جب وہ اپنے آپ کو ہر شے سے ہم آہنگ پاتا ہے تو اُس کے جذبات و احساسات میں ایک یک رنگی پیدا ہو جاتی ہے، ایک طمانیت، ایک سکون۔ ایک شفاف مسرت سے اُس کا مستقل ساتھ ہو جاتا ہے۔ اُسے دنیوی جھمیلے کسی طرح تنگ یا بے دل نہیں کر سکتے۔

ایک شاعر بھی اگر اسی قسم کے طریقوں کو شعوری یا غیر شعوری طور پر اختیار کرے تو وہ داخلی طور پر ایک صوفی ہی کہلائے گا۔ لیکن شاعر اور صوفی میں ایک فرق بھی ہے۔ شاعر ہمیشہ اپنی خیالی دنیا ہی میں کھویا رہتا ہے لیکن ایک صوفی یا بیراگی کی یہ کیفیت نہیں ہوتی۔ اُس کی ہستی تلخیص کی ہستی ہے اور اس لئے اس کی ذات پر کسی طرح کا خارجی دباؤ باقی نہیں رہتا۔ وہ جن محرّکات کو قبول کرتا ہے ان کا میدان شاعر کی بہ نسبت وسیع تر ہوتا ہے اور اس لئے اس کی طرف سے ہونے والے ردِعمل کی وسعت بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔

ایمیلی کی شاعرانہ فطرت میں بھی اسی سے ملتا جلتا تصوف اور بیراگ کا ایک حصّہ شامل تھا۔ اُس کے حالات اور ماحول نے جلا دے کر اُسے تحریکِ شعری کا باعث بنا دیا۔ دیکھا گیا ہے کہ اس قسم کی صوفیانہ راحت اور بیراگی بہجت کا ساتھ امراض، موت کے مستقل احساس اور نا داری اور غربت سے ازل ہی سے رہا ہے۔ مختلف مذاہب کے بانیوں کے سوانح حیات اس کا ثبوت ہیں۔ ہمیشہ غریب اور عصبی مزاج انسانوں ہی نے آسمانی بلندیوں کو حاصل کیا ہے اور پھر مضبوط اور صحت مند لوگوں نے اُن کے تجربات سے اصول و قوانین کے جال بنا لئے ہیں۔

شعراء میں اس کی ایک بہت اچھی مثال جرمنی کے دیوانے شاعر ہولڈرلن کی شخصیت ہے۔ وہ ایک حسّاس، نرم اور جذباتی طبیعت کا مالک تھا اور اس لئے اُسے ذاتی حفاظت کی ایک شدید ضرورت کا احساس تھا، چنانچہ اُس کی فطرت ہی مذہبی قسم کی تھی۔ اپنی ایک نظم میں وہ لکھتا ہے:-

"جنگل کے سایوں کے نیچے جہاں دوپہر کا عظیم الشان سورج اپنی درخشاں
کرنوں کا جال پتّوں اور ٹہنیوں پر ڈالے ہوئے ہے،
میں چپ چاپ اکیلا بیٹھا ہوں،
دُنیا کے توہین آمیز رویے نے مجھے رنجیدہ کر دیا ہے،
میں آوارہ گردی کرتا ہوا جنگل میں آنکلا ہوں،
اُے قدرت! تیرے شاعر بہت زود رنج ہوتے ہیں۔
وہ بہت جلد آنسو بہانا اور نوحہ کرنا شروع کر دیتے ہیں۔
یہ برکت والے شاعر اُن بچوں کی طرح ہیں
جنہیں ماتا کی ماری ماں سینے سے چمٹا لیتی ہے۔
اگر یہ تمام شاعر جو بد دماغ ہیں اور مالکانہ خود ارادیوں سے لبریز ہیں،
تھوڑے عرصے کے لئے چپ چاپ خاموشی سے بھی راستے پر چلتے جائیں تو جلد ہی پھر بھٹک جائیں گے۔
یہ تجھ سے کشمکش کرتے ہوئے جلتے ہیں لیکن تو انہیں چھوڑتی بھی نہیں
اے محبوب قدرت!
اگر ان پر مہربانی کی نظر رکھی جائے تو یہ خوش اور نیک رہتے ہیں۔
اور بہت خوشی سے ہر ایک حکم بجا لاتے ہیں،
اُے ماں! تو ہی جس طرح چاہتی ہے نرمی کے ساتھ ان کی رہنمائی کرتی ہے۔"

ایمیلی برونٹی بھی اسی قسم کے احساسات رکھتی ہے۔ بیٹھے بیٹھے اُس کے دل میں ایک درد اُٹھتا ہے:-

"..... کیا یاد آیا"

کہاں گئے تھے تم سارے، اور کہاں گیا تھا تو؟
میں نے نیناں دیکھے، جیسے تیرے چمکتے نین!
لیکن اُس ماتھے پہ بل کھاتے، کالے گیسو!
اُس کی ترچھی نظریں گاتی دکھ کے پیلے بین۔

اک سپنے جیسے سُکھ سے یہ دل اور سوکھے نین
ایسے بھرے جیسے بھیدوں سے سُونی، اندھیری رَین۔
کانپتے کانپتے، تھر تھر کرتے میں نے کان لگائے،
تاکہ اس کا نام میرے کانوں میں پل بھر آئے
وہ آواز نئی تھی لیکن ہر اک بیتی بات
اک دم کہہ کر لَوٹی جیسے آ کر جائے رات۔
وہ منظر تھا یا تھی وہ بیتے لمحوں کی باس،
گرم آنسو آنکھوں میں آئے اور لے آئے یاس۔

اور پھر درد کے احساس کے بعد وہ بہجت کے حصول میں اپنی مجبوری کو محسوس کرتی ہے اور اُس کے دل میں اس دنیا کی حقیقت کو چھوڑنے کے

خلاف ایک جذبہ بیدار ہوتا ہے، وہ اس دنیا سے الگ نہیں ہونا چاہتی خواہ اُسے مسرّت اور فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کے لئے ہی یہ کام کرنا پڑے۔

مجبورِ زیست

گہری، کالی رات کی گود میں کھوئی ہے میری ہستی
وحشی اور بے مہر ہوا میں جوشیلی، اندھی تیزی
میری ہر قوّت کو اک ظالم جادو نے جکڑا ہے
آہ! نہیں جاسکتی ہیں تو، آہ! نہیں میں جاسکتی!
اُونچے اُونچے دیووں جیسے پیڑ جھکے ہیں رستے میں
ہر بوجھل ڈالی مجھ پر گر جائے گی ان دیکھے میں
طوفاں آنے والا ہے، آیا — آیا، لو، اب آیا،
لیکن میں کیسے جاؤں؟ افسوس! نہیں میں جاسکتی!
کالے کالے بادل جھرمٹ بن کر سر پر چھائے ہیں،
گھر تک کہ ندی نالے، دریا رستوں میں آئے ہیں،
لیکن ان سب کے ڈر سے کیسے چھوڑوں گی میں دھرتی؟
میں نہیں جاؤں، میں نہیں جاؤں آہ! نہیں میں جاسکتی

اور پھر وہ اپنے کو تسلّی دیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ روحانی مسرّت کے لئے ایک ذہنی دنیا کی طرف وہ اب مسافر کی مانند جا رہی ہے۔

دور، بہت ہی دور ہے بستی راحت کی

دُور، بہت ہی دُور ہے بستی راحت کی،
سو میلوں کا پھیلا جال۔
اونچے اونچے پربت رستہ روکے ہیں،
لمبے، سونے صحرا چپکے سوئے ہیں،

تھکا ہوا، پژمردہ راہی چلتا ہے،
آنکھیں دھندلی ہیں اور دل میں اندھیرا ہے۔
کوئی نہیں ہے آس، نہ ساتھی ہے غم کا،
رُکتے رُکتے، گرتے، سنبھلتے بڑھتا ہے۔
گاہ نظر جاتی ہے نیلے منڈل پر،
گاہ پہنچتی ہے رستے کے جنگل پر،
اکثر جی کہتا ہے بیٹھے، ستالے،
اور جیون کا دُکھیا بوجھ بدل ڈالے۔

کیوں بے چینی؟ کیوں بے ہوشی؟ ہوش ذرا!
دیکھ ذرا، پچھلا رستہ خاموش پڑا۔
پچھلا رستہ، جو تو چل کر آیا ہے،
بڑھتا جا، منزل آئی، کیوں رُکتا ہے؟
ناامیدی پر قبضہ پا، ہمت سے،
یاس کی سرگوشی گم کر دے، قوت سے۔
تُو پہنچے گا، پہنچے گا تو منزل پر،
چلتا جا، محنت کا قابو رکھ دل پر۔

عموماً ایملی ایسے کم آمیز اور حسّاس انسان اپنے آپ کو انسانیت اور دنیوی ماحول سے ہم آہنگ نہیں بنا سکتے خواہ لوگ اُن سے کیسی ہی ہمدردی سے کیوں نہ پیش آئیں۔ اگر ایک اس قسم کا انسان جو گہرے احساسات سے عاری ہو اپنے آپ میں اپنی ہستی کو سمیٹ کر گرد و پیش سے علیحدہ کر لے تو وہ اپنی شخصیت کو اجنبی، المناک اور قابلِ رحم حد تک خود کام بنائے گا۔ لیکن اگر اسی قسم کا کوئی اور انسان جو فن کارانہ رجحانات رکھتا ہو اور گہرے احساسات کا اہل ہو اپنی ہستی کو اپنے آپ میں سمیٹ کر دنیا سے علیحدہ کرے تو وہ اپنی اندرونی وابستگی اور اُنس کے احساس کی حاجت روائی کے لئے اس جہان سے جدا ہو کر اپنا ایک الگ جہان آباد کرے گا۔ جہاں اُس کے نازک تصوّرات کی تکمیل میں کوئی رکاوٹ نہ ہوگی۔ جہاں کوئی ہمسایہ نہ ہوگا اور کوئی پاسبان نہ ہوگا جہاں دوسری کسی ہستی کے ارادے اُس کے احساسات اور تصوّرات کے قدرتی بہاؤ میں حارج نہ ہوسکیں گے۔ وہ ماضی کے کسی ایسے زمانے میں اپنا گھر بنائے گا جو اس کے لئے رغبت رکھتا ہو، وہ کتابوں میں کھو جائے گا، وہ کسی فن کی باریکیوں میں گم ہو جائے گا، اور ان سب سے بڑھ کر وہ مظاہرِ قدرت کے ایسے حُسن میں اپنے آپ کو گھُلا مِلا دے گا۔ جو انسانی دسترس کے مصنوعی اثرات سے دور ہو، جہاں تک تہذیب و تمدن کا ہاتھ نہ پہنچا ہو اور دوسرے فن کاروں کی بہ نسبت ایسے انسانوں میں شعراء کی تعداد شاید سب سے زیادہ ہے۔ وہ دنیا میں رہتے ہوئے بھی دنیا الگ اسی لئے رہتے ہیں کہ انہیں یہاں کی ہوا راس نہیں آتی۔ حالی کو نیچرل شاعر کہا جاتا ہے لیکن وہ نیچرل شاعر کیونکر بنا؟ — اُس نے دیکھا کہ اس دنیا میں جس ماحول میں اس کی ہستی کا اظہار ہوا ہے اُسے کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی جو تکلّف سے بری اور اسلام کے بنیادی اصولوں کے مطابق ہو۔ چنانچہ اس کی طبیعت حالات سے برگشتہ ہو گئی اور وہ نیچرل شاعری کا بانی بن گیا۔ ادب میں بھی اُسے جذبات کا بے ساختہ بہاؤ معدوم نظر آتا تھا۔ اردو

کے موجودہ انقلابی شاعر بھی حالات ہی سے بدظن ہو کر اپنی ایک علحدہ دنیا بسائے بیٹھے ہیں جس میں اشتراکیت ہے، مساوات ہے اور نہ جانے کیا کچھ ہے۔ وہ دنیا بھی ویسی ہی ناکارہ ہے جیسی کہ پرانے شعراء کی خیالی دنیا کیونکہ اس میں بھی عمل کا فقدان ہے اور باتوں کی کثرت۔ اس لحاظ سے صرف اقبال اردو کا ایک ایسا شاعر ہے جو صحیح راہ پر چلتے ہوئے ایک نئی دنیا بسانا چاہتا ہے۔ کیونکہ وہ ہر وقت عمل پر مُصر رہتا ہے۔

ماحول کے ناپسندیدہ ہونے کی صورت میں اگر اُس کی فطرت باغیانہ نہ ہو تو شاعر صوفی یا بیراگی بن جاتا ہے اور باغیانہ صورت میں عمل کے ساتھ مصلح ملک وقوم بن سکتا ہے۔

ایمیلی برونٹی کی زندگی بھی اس نظریے کے پہلے رخ کی ایک بہت اچھی مثال ہے

آور اب ایک دو نظمیں۔

ذیل کی نظم میں ایمیلی جس لہجے میں ماضی کی مسرت یا مسرت کے تصور کے گذر جانے اور لوٹ کر نہ آسکنے کا نوحہ کرتی ہے اس سے بے اختیار ہائینے کی نظموں کا لہجہ یاد آتا ہے۔ فرق اس قدر ہے کہ ہائینے کا ماضی نسلاً د نسلاً آسودہ تھا۔ اور ایمیلی کا ماضی اُس کا زمانۂ طفلی کیونکہ اُس کی فطرت میں اس طرح کی الجھی ہوئی نفسی کیفیتیں نہ تھیں جیسی ہائینے کی ذہانت میں۔

رائگاں

اے خوابِ ابتدا اب تو ہے کہاں؛ — دن بیتے، سال بھی بیت گئے۔
جب دیکھا آخری بار تجھے — تیری پیشانی سے تھا عیاں
نور ایسے ہی دھندلاتا ہے
اور تاریکی بن جاتا ہے

افسوس ہے حالت پر میری، — تیری نورانی صورت سے
میں اِتنی بات نہ جان سکی — یاد عاری ہوگی راحت سے۔
سورج کی کرن، اندھا طوفاں، — اور موسم پیارا بہاراں کا
راتوں کی سکوں بردوشی ہوا — اور صاف چمکتا چندرماں،
ان سب کا ساتھ تجھی سے تھا۔

اے خوابِ منوّر! اب مجھ کو — دکھ یاد تو ہے، سکھ بھول گیا۔
گم گشتہ تصوّر! اب مجھ کو — احساس ہے تلخ حقیقت کا۔
احساس ہے اتنی اذیت کا
افسوس نہ اب تو آئے گا

اور اس نظم کا لہجہ بھی ہائینے ہی کا معلوم ہوتا ہے۔ جہاں ہائینے اور ایمیلی میں موت کے ذکر کا تو اثر یکساں طور پر نمایاں ہے وہیں یہ بات بھی ملتی جلتی ہے کہ کبھی کبھی دونوں کو ایک ہلکی سی جھلک اُمید کی دکھائی دے جاتی ہے یا وہ آپ ہی اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ ذرا سے اجالے میں تسکین کا تصور پیدا کریں۔

بدلتی ہوئی بات

ماہ بہ ماہ، سال بہ سال
ساز کی لَے میں اک ملال ——— ہی رہا!
آج وہ گیت نکلا ہے
چلتی ہوئی ہے جس کی لَے ——— دیکھنا!

سارے ستارے چُھپ گئے
ماہِ تمام بھی چُھپا ——— مٹ گیا!
صبح کی دھند میں ملے
کُہر میں کھو گئی فضا ——— سب فضا!

تحفے تھے وہ تو رات کے
رات گئی، چلے گئے ——— کیا ہُوا؟
اے مری روحِ ناتواں!
آگیا دن کا اب سماں — غم نہ کھا!

بوڑھا بیراگی

دولت کی مری نظروں میں ذرا بھی قدر نہیں، کچھ قدر نہیں،
اور عشق و محبت کی باتوں پر قہقہہ ایک لگاتا ہوں۔
شہرت کی ہوس اک سپنا تھا، اک بے معنی سا خواب حسیں،
جو طفلی کے پردے میں چُھپا، روپوش ہوا بچپن کا جنوں۔

گر آج مرے ہونٹوں پہ کوئی آتی ہے دعا تو اِتنی ہے
اور اس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی بھی تمنا مجھ کو نہیں۔
اُس دل کی مجھ کو ضرورت ہے رہنے دے۔ یونہی اس دل کو رہے
اُس کی ہی مدد سے دیکھوں گا میں آزادی کا ردِ حسیں!"

جیسے جیسے جیون کے دن انجام سے ملتے جاتے ہیں۔
پہلے سے زیادہ کثرت سے یہ لفظ زباں پر آتے ہیں۔
"اک ایسی ہمت میری روح کے ہر پردے پر چھا جائے
جو موت و حیات کے رستوں پر اک دُھن میں مجھ کو چلا جائے!"

شامِ اور شامِ حیات

جنگ کے ختم ہوئے ہنگامے
شام چُپ چاپ چلی آئی ہے
نورِ شفّاف کو پہلو میں لئے
سر پہ اک گنبدِ مینائی ہے

گھاس پتھر پہ پڑے ہیں ہر سُو
سینکڑوں جسم جو مردہ ہیں تمام
کچھ سسکتے ہیں کہ بہتا ہے لہو
اُن کا انجام ہے دن کا انجام۔

ذیل کی نظم سے اس بات کا پورا اظہار ہو رہا ہے کہ ایملی موت کے خیالات کی گرانباری کے باوجود اس کوشش میں رہتی تھی کہ زندگی کی کوئی صورت پیدا ہو جائے اور یوں اُس کے ذہن کی اُلجھنیں دور ہو جائیں، مٹ جائیں لیکن ماحول کا اثر اُس پر چھایا ہوا تھا اور موت کا ایک دن معیّن ہونے کے باوجود اسے نیند رات بھر نہ آتی تھی۔

فقدانِ حیات

نیند لاتی ہی نہیں کوئی مسرت دل کی
یاد مرتی نہیں، ہر وقت بڑھے جاتی ہے۔
وقف ہے روح مری درد و الم ہی کے لئے
آہ پر آہ وہ ہر لمحہ کئے جاتی ہے

نیند لاتی ہی نہیں کوئی بھی راحت دل میں
ہر گھڑی موت کے سایوں نے مجھے گھیرا ہے
آتے ہیں خواب میں، کھو جاتے ہیں بیداری میں
ایسے سایوں کا مری سیج پہ ہی ڈیرا ہے۔

نیند لاتی نہیں اُمید کا جلوہ کوئی
ایسے سائے ہی مرے پاس چلے آتے ہیں۔
اُن کے غمناک تصوّر سے مری آنکھوں میں
پہلے دکھ درد کے رنگ اور بڑھے جاتے ہیں

نیند دیتی ہی نہیں کوئی بھی طاقت دل کو
کوئی طاقت مری ہمت کو بڑھاتی ہی نہیں
ایک طوفانی سمندر میں ہے میری کشتی۔
پہلے سے بڑھ کے ہے موجوں کی ہر اک چین جبیں

نیند لاتی ہی نہیں کوئی تمنّا میں نئی
دل مرا ایک تمنّا ہی سے گھبرایا ہے
ایک ہی دل کی تمنّا ہے کہ موت آ جائے۔
بھولے ہر بات کہ جس نے مجھے اُلجھایا ہے

میراجی

شعر

جب بنانے کا خیال آ کر رہوں ہوں زلف و رخ دکھلا گئے
برسوں مجھ کو [illegible] صبح و شام تنہا گئے

نقی

دو آزاد نظمیں

طوفان

اُٹھا طوفاں ——
گرجتے بادلوں نے آسمان پر کر لیا قبضہ
چمکتی بجلیوں میں چھپ گیا جلوہ ستاروں کا۔
نظر آتا نہیں مہتاب کا تابندہ چہرہ بھی،
قریب و دور ہر جانب
اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔

بہت تاریک ہے ماحول گردابِ حوادث کا
ہوائیں چیختی ہیں اور موجیں تلملاتی ہیں۔
سکوں دھوکا ہے ہستی اک مسلسل کشمکش کا اسمِ ثانی ہے۔

بہی جاتی ہے کشتی خود بخود موجوں کے دامن میں
کہاں ہے ناخدا اِس کا؟
کبھی پانی کی چادر میں یہ چھپ جاتی ہے نظروں سے
کبھی یہ پھر اُبھر آتی ہے سطحِ آب پر گویا
اثر اِس پر نہیں ہوتا ہے طوفانی تھپیڑوں کا،
بہی جاتی ہے کشتی خود بخود موجوں کے دامن میں۔

کہیں ساحل بھی ہے یا رب؟
لئے جاتی ہیں کشتی کو بہا کر کس طرف موجیں
شبِ تاریک میں، ظالم اندھیرے میں؟
کبھی وہ وقت بھی آئے گا جب خورشید مشرق سے طلوع ہو گا
نویدِ دورِ نَو لے کر؟
کٹیں گے بندِ مجبوری!

ضیا فتح آبادی

آرزوئیں!

کاش میں ہوتا ترے اندامِ سیمیں کے لئے
اک معطر ریشمیں ملبوس (جس پر تو کیا کرتی ہے ناز)
مُسکرا اُٹھتا میں اپنے طالعِ بیدار پر
دیکھتا میں جب تجھے آغوش میں!

کاش میں ہوتا تری مہکی ہوئی زلفوں کا تار!
جب سحر کے وقت صحنِ باغ میں،
چھیڑتی اگر مجھے موجِ نسیم،
جھومتا فرطِ طرب میں اور چھو لیتا ترے رخسار کو!

کاش میں ہوتا کفِ نازک پہ تیرے جامِ مے!
جب لگاتی تو مجھے ہونٹوں سے پینے کے لئے،
چُومتا تیرے رسیلے ہونٹ ہر چُسکی کے ساتھ!

کاش میں تالاب کے پانی میں ہوتا اِک کنول!
تو اُترتی نیلگوں لہروں کے اندر غسل کرنے کے لئے،
اور میں ——
چُپکے چُپکے دیکھ لیتا —— پتیوں کی آڑ سے
تیرے جسمِ مرمریں کی دلرُبا عریانیاں!!

سعید احمد اعجاز

دوپابند نظمیں

فتنہ و فساد

خرابۂ غم و حسرت ہے رزمگاہِ حیات
فساد و فتنہ سے دہلی ہوئی ہر راہِ حیات
تباہ کاریٔ سازش ہے ذرّے ذرّے میں
ستم طرازیٔ شورش ہے گوشے گوشے میں
جبیں پہ گردشِ ایام کی تباہی ہے
شگفتہ چہروں پہ تکفیر کی سیاہی ہے
فجور و فسق سے لبریز ہے فضا ساری
ہوائے تند میں ہے سیلِ ابتلا جاری
قدم قدم پہ ہیں درپیش سو نشیب و فراز
وہ شرک ہے نہیں گنجائشِ وضو و نماز!
گلوں کے رنگ میں چھینٹے ہیں خونِ انساں کے
سکون میں بھی تھپیڑے ہیں موجِ طوفاں کے
بھرے ہوئے ہیں ہلاکت کا روپ تصویریں
نظر میں تیرِ اجل ہے نفس میں شمشیریں
وجودِ ہستیٔ مغرور ہے یزید مزاج
کہ شہریار ضعیفوں سے لے رہے ہیں خراج
جہاں میں اتنی کمی ہے خدا شناسوں کی
کہ تشنگی نہیں بجھتی لہو کے پیاسوں کی

مخمور جالندھری

صبوحی

ترا نام لے لے کے جیتا رہا ہوں
ترا نام لے لے کے جیتا رہوں گا
دل و جاں ہی دے دے کے جیتا رہا ہوں
دل و جاں ہی دے دے کے جیتا رہوں گا
اسی دام میں پھنس کے جیتا رہا ہوں (۲)
اسی دام میں پھنس کے جیتا رہوں گا
مجھے نوکِ خارِ محبت کی سوگند
محبت میں ہنس ہنس کے جیتا رہوں گا
تصوّر ترا مونسِ دل رہا ہے (۳)
تصوّر ترا مونسِ دل رہے گا
یہ دل نورِ لیلیٰ کا محمل رہا ہے
یہی نورِ لیلیٰ کا محمل رہے گا
ترا ذکر دن رات کرتا رہا ہوں (۴)
ترا ذکر دن رات کرتا رہوں گا
زباں سے یہی بات کرتا رہا ہوں
زباں سے یہی بات کرتا رہوں گا

امین حزیں

مذاق

یہ سب ایک مذاق تھا لیکن کتنا قیامت خیز اور کتنا خوفناک!

میں ایک شام کیفے میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ اس زمانے میں میرے پاس وقت گذارنے کی ایک یہی صورت تھی۔ کیونکہ زندگی ہر نوع کے افکار و مشاغل سے آزاد تھی۔ ہنگاموں سے خالی! غم سے مبرا! پرسکون! مطمئن!

چائے مع تمام لوازمات کے سامنے رکھی ہوئی تھی لیکن پینے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ چائے بھی کوئی کہاں تک پی سکتا ہے! ہاتھ میں ایک نئی خریدی ہوئی کتاب تھی اور میں لایعنی طور پر اس کے اوراق کو الٹ پلٹ کر رہا تھا۔

صدیق ایک گرجتے ہوئے طوفان کی مانند کیفے میں داخل ہوا۔ زور زور سے زمین پر قدم رکھتا ہوا اور ہاتھوں کو دولاتیوں کی طرح فضا میں لہراتا ہوا! جیسے کوئی باولا یا آسیب زدہ خبطی۔ وہ یونیورسٹی کا طالب علم تھا، اور میرا بے تکلف دوست۔

اُس نے مجھے دیکھتے ہی ایک بے ہنگم قہقہہ لگایا۔

"آپ ڈٹے ہوئے ہیں حسب معمول! جیتے رہو میرے شیر!" یہ کہہ کر وہ بیٹھ گیا اور چائے بنانے لگا۔

"اماں تمہیں کوئی کام نہیں ہے؟ جب دیکھو کیفے میں۔ جب دیکھو کیفے میں۔ آخر کیا قصہ ہے یہ؟"

"کام؟" میں نے کہا "مجھ جیسے نوجوان وکیل کے پاس بھی کوئی کام ہو سکتا ہے؟"

"اور جب تم جیسے نوجوان وکیل کا باپ ڈسٹرکٹ جج ہو تو صبح سے شام تک چائے پینے کے سوا اور کیا کام رہ جاتا ہے! کیوں؟"

میں ہنسنے لگا۔

"بھئی بات اصل یہ ہے" میں نے اُسے بتایا "کہ مئی میں والد کی چھٹی ختم ہو رہی ہے اور وہ لکھنؤ آ رہے ہیں۔ میں بھی لکھنؤ منتقل ہو جاؤں گا اور وہیں پریکٹس شروع کر دوں گا۔ دو چار مہینے یہاں اور ہوں......"

"تو اس سے کیا ہوتا ہے؟"

"اس سے یہ ہوتا ہے کہ بس اب اکٹھا لکھنؤ میں کام کروں گا۔ جب یہاں سے جانا ہی ہے تو یہاں کام کرنے سے فائدہ؟"

"بہت خوب! اچھی منطق ہے ——— غرضکہ مئی تک آپ بالکل خالی ہیں اور دن دن بھر کیفے میں بیٹھے رہا کریں گے؟"

"کیفے میں بیٹھوں یا نہ بیٹھوں، بہر حال مئی تک بالکل خالی ہوں۔"

"مزے ہیں بھائی تمہارے۔ کئے جاؤ عیش ——— ایک ہم ہیں۔ کولھو کے بیل کی طرح ہر وقت جُتے رہتے ہیں۔ ایک چھوڑ دو دو ٹیوشنیں ہیں۔ سارے دن بھاگے بھاگے پھرتے ہیں۔"

"دو ٹیوشنیں کس طرح ہیں؟"

"ایک تو وہی پرانی رام نگروالی ٹیوشن ہے اور اب اسکول میں ایک لڑکے کو پڑھانے جاتا ہوں۔"

"اچھا! اُس لڑکی کو ابھی تک پڑھا رہے ہو؟"

"ہاں کیوں نہیں، وہ تو ہماری مستقل ٹیوشن ہے۔"

"بڑے خوش قسمت ہو یار!"

"خوش قسمت!"

"ہاں اور کیا۔ ایک لڑکی کو پڑھانے سے زیادہ دلچسپ مشغلہ اور کیا ہو سکتا ہے!"

"رہنے دے یار ———" اس کے ہونٹوں پر طنز کی ایک لہر دوڑ گئی۔

"کیوں؟ کیا میں غلط کہتا ہوں!" میں نے پوچھا۔

"میاں تم اس چکر میں نہیں پڑے ہو۔ سمجھے؟ ساری دلچسپی دھری رہ جاتی ہے۔ جب آدمی کو دو دو گھنٹے کتے کی طرح بھونکنا پڑتا ہے ——— یہ رومان نہیں ہے بھائی صاحب! اس کا نام مزدوری ہے! مزدوری!"

"ایک آدھ ٹیوشن مجھے بھی دلوا دو نا" میں نے اس کی تلخ گفتگو کو رد کرنے کے لئے کہا۔

"جی بہت کی آپ نے ٹیوشن!"

"معاوضہ کچھ نہیں لوں گا اور پردے کے پیچھے بیٹھ کر پڑھا دیا کروں گا" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ ہنسنے لگا۔

اس گفتگو کے تین چار دن بعد کا ذکر ہے کہ صدیق مجھ سے کوٹھی پہ ملنے آیا میں شام کے کھانے سے فارغ ہو کر چند دوستوں کے ساتھ بیٹھا ہوا باتیں کر رہا تھا۔ اتفاق سے اس وقت یونیورسٹی کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی طلبہ کے سیاسی رجحانات زیرِ بحث تھے۔

"آؤ صدیق بیٹھو۔ تمہارے ہی مذاق کی گفتگو ہو رہی ہے" میں نے اس سے کہا

"ابھی میں بیٹھوں گا نہیں۔ معاف کرنا۔ مجھے فوراً ہوسٹل پہنچنا ہے۔ ورنہ کھانا نہیں ملے گا تم سے ایک ضروری بات کرنی تھی"۔

"وہ کیا؟"

"ذرا ایک منٹ کے لئے ادھر آجاؤ۔ صرف ایک منٹ کے لئے" یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر جانے کے لئے مڑا۔

میں اپنے مہمانوں سے اجازت لے کر اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

باہر پہنچ کر پہلے تو وہ اپنے مخصوص انداز میں ہنسا۔ پھر بولا، "ارے بھئی! ــــــ وہ ــــــ تم ٹیوشن کرنا چاہتے تھے نا ــــــ اس کا انتظام ہو گیا ہے"۔

پہلے تو میں اس بات کا مطلب نہیں سمجھا، لیکن پھر فوراً ہی وہ کیفے والی گفتگو یاد آگئی اور میں بے اختیار ہنس پڑا۔

"ہنسی کی بات نہیں ہے"، اُس نے کہا "میں معاملہ طے کر آیا ہوں"۔

"معاملہ طے کر آیا ہوں" میں نے ہنستے ہوئے اُس کے الفاظ کو دہرایا۔

"واقعی مذاق کی بات نہیں ہے ــــــ دیکھو اب پیچھے نہ ہٹنا ورنہ مجھے بڑی شرمندگی اٹھانی پڑے گی ــــــ منہ دکھلانے کے قابل نہیں رہوں گا"۔

"او ہو" میں مصنوعی انداز میں اچھل پڑا۔ "اچھا تو کہاں معاملہ طے کر کے آئے ہو؟"

وہ میرے اس فقرے پر قدرے مسکرایا اور پھر بولا۔ "وہ حسین ہے نا؟ حسین الدین، تم تو جانتے ہو اُس کو، وہی جو تین سال سے بی اے میں فیل ہو رہا ہے۔ جس کے ساتھ تم اُس دن سینما جا رہے تھے؟"

"ہاں ہاں وہی۔ اس کی بہن اس سال ہائی اسکول کا امتحان دے رہی ہے وہ انگریزی میں ذرا کمزور ہے۔ اس کو انگریزی پڑھانی ہوگی"

"مگر۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"مگر وگر کچھ نہیں۔ اب تو تمہیں پڑھانا ہی ہوگا قصہ یہ ہے کہ اس روز تم سے کیفے میں باتیں ہوئی تھیں نا؟ اتفاق سے اُسی دن رات کو حسین سے ملاقات ہوئی کہنے لگا، میری بہن ہائی اسکول کے امتحان میں بیٹھ رہی ہے۔ اس کو تین چار مہینے قبل اس لئے بلا لیا تھا کہ یہاں تیاری اچھی ہو جائے گی لیکن ایک مہینہ ہونے کو آیا، ابھی تک کوئی مناسب ٹیوٹر ہی نہیں ملا ہے۔ بڑی پریشانی ہے۔ میں کسی یونیورسٹی سٹوڈنٹ سے پڑھوانا نہیں چاہتا اور اسکول کے ٹیچر چالیس پچاس سے کم پر راضی نہیں ہوتے اُس نے یہ کہا تو مجھے فوراً تمہاری بات یاد آگئی۔ میں نے کہا، میرے ایک دوست ہیں۔ وکیل! مئی میں وہ یہاں سے جا رہے ہیں اور اس وقت تک بالکل خالی ہیں۔ میں اُن سے کہوں گا۔ وہ پڑھا دیں گے۔ کہنے لگا، لیں گے کیا؟ میں نے کہا، کچھ بھی نہیں۔ یوں ہی پڑھا دیں گے۔ میرے دوست ہیں اور آسودہ حال ہیں۔ انہیں لینے دینے سے کیا واسطہ! ۔ ۔ ۔ ۔"

"کیا کہنے ہیں میری آسودہ حالی کے"۔ میں بیچ میں بول اٹھا۔ "اتنا تو کما نہیں سکتا کہ سگریٹوں کا خرچ نکل آئے"۔

صدیق نے میری بات کو جیسے سنا ہی نہیں۔ وہ اپنی داستان سرائی میں مصروف تھا۔ "پھر میں نے حسین کو تمہارے متعلق تفصیل کے ساتھ بتایا۔ وہ تم سے واقف ہے۔ میرے ساتھ تمہیں دو ایک دفعہ دیکھ چکا ہے۔ اب اس دن سے میرے کمرے کے برابر پھیرے کر رہا ہے۔ مگر مجھے فرصت ہی نہیں ہوئی۔ یہاں آنے کی۔ تم رہتے بھی تو ہو اللہ میاں کے پچھواڑے ۔ ۔ ۔ ۔"

"ابھی وکیل صاحب!" کمرے میں سے آواز آئی میں بھول گیا تھا کہ چند ملاقاتی اندر بیٹھے ہوئے ہیں۔

"اچھا تو بات پکی ہے نا" صدیق نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر رخصت ہوتے ہوئے کہا۔

"بھئی میں سوچوں گا"

"لاحول ولا قوۃ! اس میں سوچنے کی کیا بات ہے؟ اور اب سوچنے کی گنجائش ہی کہاں ہے؟ میں اُس سے وعدہ کر چکا ہوں"۔

"مگر بھئی میں تو مذاق کر رہا تھا"

"ہاں ہاں بابا تم مذاق کر رہے تھے۔ مانا تم مذاق کر رہے تھے۔ مگر اب یہ مذاق نہیں رہا۔ اب تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"اور میرے پاس وقت ہی کہاں ہے؟"

"جی ہاں" اس نے جی کو کھینچ کر کہا۔ "آپ کے پاس بھلا وقت کہاں ہے۔ دن دن بھر کیفے میں میں ہی تو بیٹھا رہتا ہوں"!

میں انفعال آمیز ہنسی ہنسنے لگا۔ پھر میں نے کہا "لیکن صدیق! یہ روز روز پڑھانے جانا تو بہت تکلیف دہ ثابت ہوگا۔ میں اس مصیبت کو کیسے بھگتوں گا"!

"روز نہ جا سکو تو نہ سہی ایک دن بیچ کر کے چلے جایا کرنا۔ ہفتے میں تین چار دن پڑھا دینا کافی ہوگا"۔

"یہ ٹھیک ہے" میں نے کہا۔

اچھا خدا حافظ! کل بن حسین کو ساتھ لے کر آؤں گا۔ باقی گفتگو اُس کے سامنے ہوگی۔ ابھی وقت بھی تو طے کرنا ہے ــــــ خدا حافظ!" یہ کہہ کر وہ اپنی سائیکل پر سوار ہو گیا۔

"اُس کا نام کیا ہے؟ نام تو بتاتے جاؤ" میں نے پکار کر کہا۔

"مجھے نہیں معلوم"، صدیق نے دور سے جواب دیا۔

یوں میں عشرت کا ٹیوٹر مقرر ہوا اور یوں وہ ایک بات جو میں نے مذاق اور چہل کے طور کہی تھی رنگ لائی۔

میں نے عشرت کو انگریزی پڑھانی شروع کر دی!

اب تک میں نے صرف پڑھا ہی تھا۔ پڑھانے کی کبھی نوبت نہیں آئی تھی۔ یہ میری زندگی میں اپنی قسم کا پہلا تجربہ تھا، اور جس قدر نیا تھا اُسی قدر پُر لطف بھی! چنانچہ پہلے دن جب میں نے عشرت کو اس کی کتاب کے دو ابتدائی صفحے پڑھائے تو مجھے ایک عجیب و غریب خوشی کا احساس ہوا۔ میں سوچنے لگا کہ کسی کو پڑھانا ــــ اپنے ذہن کا ایک حصہ کسی دوسرے کے ذہن میں منتقل کرنا ــــ کیسا دلفریب مشغلہ ہے! کتنا روح پرور کتنا مسرت انگیز! پھوہی نہیں۔ مجھے اپنی بعض پوشیدہ صلاحیتوں کا بھی احساس ہوا۔ میں نے خیال کیا کہ میں انگریزی کتنی اچھی بول سکتا ہوں، کس خوبی کے ساتھ جملوں کی تشریح کر سکتا ہوں، اور پیچیدہ نکات کو حل کرنے کی کتنی عمدہ قابلیت مجھ میں پائی جاتی ہے۔

پہلے دن میں عشرت کو پڑھا کر رخصت ہونے لگا تو میری روح وجد کر رہی تھی اور گو میرے قدم زمین پر پڑ رہے تھے، میں خود آسمان کی فضا میں پرواز کر رہا تھا۔

صدیق اور حسین نے کہا تھا کہ ہفتے میں تین چار دن پڑھانا کافی ہوگا لیکن میں تقریباً روزانہ جانے لگا۔ میرا ذوق و شوق ترقی کر رہا تھا اور میری دلچسپی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ چند دن کے اندر ہی اندر یہ حالت ہو گئی کہ تمام دوسری مصروفیات سے جی اکتانے لگا۔ اور عشرت کو پڑھانا زندگی کا دلچسپ ترین مشغلہ اور اصل ترین مقصد معلوم ہونے لگا۔ میں شب کو سات بجے پڑھانے جاتا تھا۔ دن بھر دل کی یہ کیفیت رہتی کہ جیسے مجھے کسی کا انتظار ہے، جیسے کوئی خوبصورت چمکتی ہوئی چیز جس کے تصور سے دماغ کا گوشہ گوشہ جگمگا رہا ہے، مجھے کہیں سے ملنے والی ہے۔ وہ دو گھنٹے جو میں عشرت کو پڑھانے میں صرف کرتا، جنت سے چُرائے ہوئے لمحے معلوم ہوتے!

ایک دن میں حسبِ معمول اُس کو انگریزی کی کتاب پڑھا رہا تھا۔ اکبرِ اعظم کا بیان تھا۔ لکھنے والے نے اکبر کی عظمت پر روشنی ڈالی تھی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی انشا پردازانہ عظمت کو بھی نہیں بھولا تھا۔ میں اس کے بھاری بھرکم پُر مغز جملوں کی تشریح کر رہا تھا۔ لفظوں کے معنی بھی بتاتا جاتا تھا اور عبارت کا مفہوم بھی۔ ایسے موقعوں پر، یعنی جب میں لمبی لمبی تشریحات پیش کیا کرتا، عشرت کتاب کو سامنے میز پر رکھ کر اپنی نظریں میرے چہرے پر گاڑ دیا کرتی۔ جب تک میں بولتا رہتا وہ نظروں میں نظریں ڈال کر سنتی اور سر کی خفیف جنبش سے گویا یہ کہتی جاتی "میں سمجھتی ہوں ــــ میں آپ سے متفق ہوں!" لیکن آج میں اس میں کچھ تبدیلی پا رہا تھا۔ آج اُس کی نظریں کچھ جھکی جھکی سی تھیں۔ اُس کی نگاہ میں وہ چند روز قبل والا بے باکانہ انداز نہیں تھا۔ چہرے پر ایک حیا افروز منفعلانہ کیفیت چھائی ہوئی تھی۔ میں یہ رنگ دیکھ کر حیرت زدہ ہو گیا۔ "میرے اللہ! یہ کیا!" میں نے اپنے دل میں کہا، "یہ ایکا ایکی عشرت کو کیا ہو گیا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ میری آنکھوں نے اپنی خاموش زبان میں اُس سے کچھ کہہ دیا ہو، یا کوئی خوفناک راز اُس تک پہنچا دیا ہو! یقیناً ایسا ہی ہے۔ خدا سمجھے اِن آنکھوں کو! یہ ہمیشہ اور ہر جگہ مجھ کو آفت میں مبتلا کر دیا کرتی ہیں لیکن آخر وہ کیا بات ہے جو انہوں نے عشرت سے کہہ دی ہے؟ وہ کون سا راز ہے؟" اُس وقت مومن کا یہ شعر خود بخود لوحِ ذہن پر اُبھر آیا:۔

دل نے دنیا نئی بنا ڈالی
اور ہمیں آج تک خبر نہ ہوئی

اور اب مجھے معلوم ہوا کہ عشرت کو پڑھانے میں جو لطف مجھے حاصل ہو رہا تھا، اُس کا سبب صرف یہی نہیں تھا کہ پڑھانا بذاتِ خود ایک دلچسپ مشغلہ ہے، بلکہ یہ بھی کہ میں عشرت جیسی غیرتِ ماہ دوشیزہ کو پڑھا رہا تھا۔ "طاعت" میں "مے و انگبیں" کی لاگ بھی تھی۔

عشرت کی یہ محجوب نگاہی ایک مستقل ادا ثابت ہوئی۔ اب ہمیشہ اُس کی آنکھیں جھکی جھکی رہنے لگیں۔ میں پڑھاتا یا پڑھائی کے سلسلے میں کوئی دوسری بات کہتا تو وہ نظریں نیچی کئے سنا کرتی۔ جب وہ نظروں میں نظریں ڈال کر میرے سامنے بیٹھتی تھی، اور بِلا پلک جھپکائے بغیر مجھے دیکھتی رہتی تھی، تو مجھے اس کی آنکھیں ایسی معلوم ہوتی تھیں جیسے گرمیوں کے موسم میں صبح کے وقت آسمان کی ٹھنڈی اور صاف و شفاف فضا۔ اب اگر اتفاق سے وہ کبھی اپنی نظریں اوپر اٹھاتی اور لمحہ بھر کے لئے مجھے دیکھتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ فضائے آسمانی میں بہار جھوم رہی ہے اور گھٹائیں رقص کر رہی ہیں۔ اُس وقت آنکھوں کے سامنے ایک بجلی سی کوند جاتی اور میں

برق زدہ سا ہو کر رہ جاتا۔

کبھی ایسا بھی ہوتا کہ بیٹھے بیٹھے عشرت کا دوپٹہ سر سے ڈھلک جاتا اور اس کے چمکتے ہوئے سیاہ بال بے نقاب ہو جاتے۔ اُس وقت میری نظریں بے اختیار اس کے چہرے سے ہٹ کر بالوں پر جم جاتیں، اور جم کر رہ جاتیں۔ میں بالوں کی چمک اور آرائش دیکھ کر اس درجہ متاثر ہوتا کہ میری گفتگو کی روانی میں فرق آجاتا، اور زبان لڑکھڑانے لگتی۔ عشرت اپنے سر کو دوبارہ ڈھانپنے میں عمداً دیر کرتی جب میں اپنے آپ کو سنبھال لیتا اور لڑکھڑاتی ہوئی زبان کو قابو میں لے آتا تو وہ ایک دلفریب ادا کے ساتھ اپنا ہاتھ پشت کی جانب لے جاتی اور دوپٹے کا دامن دوبارہ سر پر ڈال لیتی۔

ایک دن عشرت کچھ تحریری کام کر رہی تھی اور میں بیٹھا خاموشی کے ساتھ سگریٹ پی رہا تھا۔ یکایک میں نے اپنے قدموں میں ایک چوڑی کا ٹکڑا پڑا ہوا دیکھا۔ اُسے دیکھ کر مجھے چندماہ پیشتر کا ایک معمولی سا واقعہ یاد آگیا۔ میں اپنے دو دوستوں کے ساتھ دہلی کی ایک ننگ ڈنار یک ایلکن روم میں بیٹھی ہوئی گلی میں سے گذر رہا تھا۔ زمین پر دو تین چوڑیوں کے ٹکڑے پڑے ہوئے دکھائی دیتے۔ میں نے جھٹ ان کو موتیوں کی طرح چن لیا اور جھاڑ پونچھ کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔ اس پر وہ دونوں دوست مجھ پر خوب ہنسے لیکن میں ایسی چیز کو جس کا تعلق نسائیت اور دوشیزگی سے ہو زمین پر پڑا ہوا نہیں دیکھ سکتا تھا چنانچہ یہاں بھی جب میں نے چوڑی کا ایک ٹکڑا فرش پر پڑا ہوا دیکھا تو جھک کر اُسے اٹھا لیا اور اپنے سامنے میز پر رکھ لیا۔ پھر قدرتاً میرا ذہن عشرت کے ہاتھوں کی جانب منتقل ہوا۔ اُس کا اس کا داہنا ہاتھ جس میں وہ پنسل تھامے ہوئی تھی کھلا ہوا تھا میری نظر فوراً اس پر پڑی ساتھ ساتھ عشرت نے بھی اس طرف دیکھا۔ اس میں شربتی رنگ کی دو لہریئے دار چوڑیاں تھیں۔ دوسرا ہاتھ میز کے نیچے تھا اور میں اس کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ لیکن تھوڑے سے توقف کے بعد عشرت نے اس ہاتھ کو بھی دوپٹے سے باہر نکالا اور کاپی پکڑنے کے بہانے سے میز پر رکھ لیا۔ اُس ہاتھ میں صرف ایک چوڑی تھی۔

اس دن جب میں رخصت ہونے لگا تو میں نے میز پر سے اپنے فاؤنٹن پن اور سگرٹ کیس کے ساتھ اُس چوڑی کے ٹکڑے کو بھی اٹھا لیا، اور عشرت کے سامنے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ یہ ایک شوخی تھی، مگر آہ، ایسی شوخی جس میں محبت کی ہزاروں مجبوریاں اور لاچاریاں چھپی ہوئی تھیں۔

اگلے دن وہاں پہنچا تو اپنی شوخی کو بالکل بھول چکا تھا۔ مگر تھوڑی دیر بعد پڑھاتے پڑھاتے مجھے ایسا محسوس ہوا کہ کانچ کی کوئی چیز پاؤں کے نیچے دب کر ٹوٹ گئی۔ جھک کر جو دیکھا تو ایک ٹوٹی ہوئی چوڑی قدموں میں پڑی ہوئی نظر آئی۔ نگاہیں دیوانہ وار عشرت کے ہاتھوں کی طرف لپکیں۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں صرف ایک ایک چوڑی تھی۔

اُس وقت میرے دل کی کیا حالت ہوئی، یہ میں نہیں بیان کر سکتا کسی طرح نہیں بتا سکتا۔ اگر عمر بھر جذبات کی ترجمانی کا فن سیکھتا رہوں تب بھی نہیں بتا سکوں گا۔

ایک دن پڑھانے کے دوران میں میں نے سگرٹ سلگایا، اور ایک لمبا سا کش لے کر سارا دھواں عشرت کی طرف پھینک دیا۔ اگر اس کو میری یہ حرکت پسند نہ آتی تو وہ اپنی پیشانی پر ایک ہلکی سی شکن ڈال کر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر سکتی تھی لیکن اُس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ دھوئیں سے قدرے پریشان ضرور ہوئی، مگر اُس کے ساتھ ساتھ ایک نہایت خفیف مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں سے پھوٹ کر سارے چہرے پر دوڑ گئی۔

اس کے بعد میں اکثر یہ شرارت کیا کرتا، اور اُس کو سگرٹ کے دھوئیں میں نہلا دیا کرتا۔ معلوم نہیں اس سے میرا کیا مقصد ہوتا تھا۔ شاید میں اس طرح اُس کو اپنے سے قریب تر محسوس کرتا تھا، گویا سگرٹ کا دھواں میرے بازو تھے جو اُس کے گرد حلقہ کر لیتے تھے اور اُس کے حسین چہرے کو اپنی آغوش میں لے لیا کرتے تھے۔ یا غالباً میں یہ سمجھتا تھا کہ میرے سگرٹ کا دھواں میری سلگتی ہوئی روح کا پیغام بن کر اُس تک جائے گا، اور میری لب نا آشنا محبت کا افسانہ اس سے کہے گا۔ بہر حال مقصد سے قطع نظر، جب کبھی میں ایسا کرتا، وہ بے انتہا حسین معلوم ہوتی، گویا ایک سبک روح پری ہے جو بادلوں میں اُڑتی چلی جارہی ہے!

مارچ کا آغاز تھا۔ مچھروں کی بھنبھناہٹ گرمی کی آمد کا اعلان کر رہی تھی۔ ایک مچھر عشرت کے رخسار پر آکر بیٹھ گیا۔ میں بھلا یہ کیونکر دیکھ سکتا تھا کہ کسی جاندار کا جسم عشرت کے جسم سے مَس کرے، اور وہ بھی خون چوسنے کی خاطر! میں نے کہا "تمہارے چہرے پر مچھر بیٹھا ہے"۔ (رخسار کا لفظ میں استعمال نہ کر سکتا تھا) عشرت نے ہاتھ کی ایک جنبش سے اُسے اڑا دیا۔ اسی طرح ایک دن ایک مچھر اُس کے کھلے ہوئے بازو پر آن بیٹھا۔ میرے ہاتھ میں پنسل تھی۔ میں پنسل کو اُس کے قریب لے گیا اور وہ اڑ گیا۔

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ عشرت میرے لکھائے ہوئے اردو جملوں کا انگریزی میں ترجمہ کر رہی تھی۔ داہنے ہاتھ سے تو ظاہر ہے کہ وہ لکھ رہی تھی اور بائیں ہاتھ سے کاپی کو تھامے ہوئے تھی۔ یہ ہاتھ چونکہ ایک جگہ رکھا ہوا تھا اور جنبش نہیں کر رہا تھا۔ اس لئے اُس کی پشت پر ایک مچھر آکر بیٹھ گیا اور اپنا ڈنک جسم کے خون

چوسنے لگا۔ عشرت نے بجائے اس کے کہ اُس کو اُڑا دے یا وہیں کچل ڈالے نیچی نظروں
سے مجھے دیکھا۔ اُس کو مچھر سے چھٹکارا پانے کے لئے میری مدد کی ضرورت تھی، یا
شاید وہ مجھے خدمت کا موقع دے رہی تھی۔ مگر میں بڑی مشکل میں تھا نہ تو اس سے یہ
کہہ سکتا تھا کہ تمہارے ہاتھ پر مچھر بیٹھا ہوا ہے، اُس کو اُڑا دو، اور نہ خود اپنا ہاتھ
بڑھا کر ایسا کر سکتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اتفاق سے اُس وقت حسین ہمارے برابر بیٹھا
ہوا کچھ لکھنے لکھانے کا کام کر رہا تھا لیکن بہر حال مچھر کا عشرت کے ہاتھ پر بیٹھنا
میرے لئے قطعی ناقابلِ برداشت تھا۔ اس لئے اور بھی کہ وہ خون پی پی کر موٹا ہوتا
جا رہا تھا۔ میں نے اپنے کوٹ کی اوپر کی جیب سے اپنے رومال کو اس طرح جھٹکا
دے کر کھینچا کہ وہ فضا میں لہراتا ہوا عشرت کے ہاتھ کی طرف گیا۔ یہ کہنے کی ضرورت
نہیں کہ مچھر اڑ گیا۔

غرض اسی طرح شوخیوں، آہوں اور حسرتوں کے درمیان تین مہینے گذر
گئے تین مہینے جو صبحِ بہار کی طرح مختصر بھی تھے اور شبِ فراق کی طرح طویل بھی، جو
میرے لئے سامانِ نشاط بھی لائے اور سامانِ اذیت بھی میں اکثر اپنے دل میں سوچا کرتا کہ اللہ! جس دن
میں نے مذاق کے طور پر عشرت کو پڑھانے کا کام اپنے ذمے لیا تھا، اُس دن مجھے
کیا معلوم تھا کہ یہ آنے والے چند مہینے میری زندگی کا ایک نیا دور ثابت ہوں گے
اور میرے دل کی سونی بستی کو بہار کی مسرت اور خزاں کے خوف سے معمور کر دیں گے
پھر مجھے چار سال بیتے کا زمانہ یاد آ جاتا، وہ زمانہ جب میں نے ایک ماہ پیکر دوشیزہ سے
محبت کی اور اپنے شباب کی تمام شیفتگی اور سارا والہانہ پن اُس پر نثار کرنے کے
بعد بھی ناکام رہا۔ اُس وقت میں یہ سمجھتا تھا کہ یہ میری پہلی اور آخری محبت ہے، اور آئندہ
میرے دل کے ٹوٹے ہوئے ساز میں کبھی اتنی صلاحیت نہ ہو گی کہ اُس پر محبت کا گیت
گایا جا سکے۔ مگر اب مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ قبل از وقت بجھائی ہوئی شمع بہت جلد
اور بہت تیزی کے ساتھ آگ پکڑتی ہے اور پہلے کی بہ نسبت زیادہ شدت کے
ساتھ جلتی ہے۔ محبت کی چوٹ کھایا ہوا دل مزید زخموں اور نئی نئی جراحتوں کی
تلاش میں رہتا ہے، اور انہیں زخموں اور جراحتوں کو وہ زندگی کا درماں سمجھتا ہے۔
چنانچہ وہ زخمی ہوتا ہے، اور زخم مندمل نہیں ہونے پاتا کہ پھر زخمی ہوتا ہے۔ پھر زخمی
ہوتا ہے۔ پھر زخمی ہوتا ہے۔ زندگی ایک رِستا ہوا ناسور بن کر رہ جاتی ہے۔

اس طرح میں دن دن بھر اور رات رات بھر عشق کے فلسفے پر اور اپنی
رہینِ محبت زندگی پر غور کیا کرتا اور پھر جب عشرت کو پڑھانے جاتا تو ساری فلسفہ
دانی اور خیال آرائی بھول کر اُس کو دیکھنے میں محو ہو جاتا۔ کتاب پڑھاتے وقت تو میرا
ذہن بہت مصروف ہوتا تھا، لیکن جب زبانی سبق ختم ہو جاتا اور وہ کچھ لکھنے
لکھانے کا کام کرنے لگتی تو مجھے فرصت کے ساتھ اس کو دیکھنے کا موقع ملتا تھا۔
میں اپنی نظریں اُس کے چہرے پر گاڑ دیتا اور بے دردی کے ساتھ مسلسل اس کو
دیکھے جاتا۔ وہ اپنی جھکی ہوئی نظروں کے باوجود میرے دیکھنے کو محسوس کر لیتی۔ اُس
کے ہونٹوں پر ایک انتہائی نازک مسکراہٹ کھیلنے لگتی اور چہرے کے شہابی رنگ
میں سرخی کی ایک اور جھلک پیدا ہو جاتی۔ گویا ایک گلاب کا پھول ہے جو سورج کی
تیز کرنوں کو برداشت نہیں کر سکتا اور تمتما رہا ہے۔ میں پھر بھی اُسے دیکھے جاتا۔ اُس
کا شاداب چہرہ، صبیح گردن اور صندلی بانہیں دیکھ کر یہ شدید خواہش ــــ چڑھتے
ہوئے دریا کے طوفان کی طرح شدید خواہش ــــ میرے دل میں پیدا ہوتی کہ کتاب،
کاپی اور پنسل اس سے چھین لوں، اور اُس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں
لے کر اس سے کہوں، "عشرت! میری روح! میری زندگی! مجھے تم سے محبت ہے"!
لیکن ظاہر ہے کہ میں ایسا نہ کر سکتا تھا۔ مجھے اپنی خواہش کو دبانا پڑتا۔ اور
اُس کے دبانے میں ایک غیر معمولی ــــ فوق الانسانی ــــ قوت سے کام
لینا پڑتا۔ پھر میں اپنے دل میں سوچتا کہ کیا واقعی میری محبت محتاجِ اظہار ہے؟ کیا
وہ ظاہر نہیں ہو چکی؟ اور کیا عشرت نے محبت کا جواب محبت سے نہیں دیا؟ بیشک
میری زبان پر کوئی لفظ نہ آیا، اور عشرت نے بھی اپنی زبان سے کچھ نہ کہا، لیکن کیا
واقعی ہمارے درمیان کوئی گفتگو نہیں ہوئی؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ایک دوسرے
سے کچھ نہ کہنے کے باوجود ہم نے پیار اور محبت کی باتیں کی ہیں، عشق کی منزلوں کو
دوش بدوش طے کیا ہے، ایک دوسرے کو پہچانا ہے، سمجھا ہے؟ کیا کوئی دوسرا
مرد ہے جو میری طرح عشرت کے قلب و روح کی گہرائیوں کو سمجھتا ہو، جو اُس سے
اس قدر اور اتنا واقف ہو جتنا میں ہوں؟ پھر میں تصور کی آنکھوں سے عشرت کو
ایک خوفناک دیو، اُس کے ہونے والے شوہر کی آغوش میں دیکھتا، اور میری حالت
اُس شخص کی سی ہو جاتی جو خواب میں ایک ہیبت ناک منظر دیکھ کر چیخنا چاہتا ہو، اور
نہ چیخ سکتا ہو۔ اتنے میں عشرت اپنی کاپی میری طرف بڑھا دیتی یا کوئی سوال کر بیٹھتی
اور میں اس ڈراونے خواب سے بیدار ہو جاتا۔

وقتاً فوقتاً صدیق سے بھی ملاقات ہوتی رہتی۔ کبھی وہ باتوں باتوں میں پوچھ
بیٹھتا "کہو بھئی! پڑھائی ہو رہی ہے"؟

"ہاں! ہو تو رہی ہے"۔ میں جواب میں کہتا۔

"کیسا کام ہو رہا ہے؟ پاس ہو جائے گی"؟

"ہاں انگریزی میں تو ہو جائے گی اور مضمونوں کی نہیں کہتا۔۔۔۔
نہیں ــــ میرے خیال سے نکل ہی جائے گی امتحان میں، بڑی
ذہین لڑکی ہے"، میں بے تعلقی کے انداز سے کہتا۔

ایک دن یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ صدیق یکایک بولا "اب تو تمہیں اُس سے
اچھی خاصی محبت ہو گئی ہوگی"!

میرا دل دھک سے ہو گیا۔ میں نے تیزی سے اُس کی طرف دیکھا۔ اس

کے ہونٹوں پہ ایک شرارت آمیز مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں شوخی کی چمک!

"محبت کر کے میں اُس سے کیا لے لوں گا" میں نے بے پروائی سے کہا

وہ ہنس پڑا اور بات ختم ہو گئی۔ مجھے یہ خیال کر کے خوشی ہوئی کہ میں نے اپنے راز کو بہت کامیابی کے ساتھ چھپایا اور چہرے سے کسی کیفیت یا جذبے کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔

صدیق نے یہ بات محض شرارتاً کہی تھی، اور وہ حقیقت سے بالکل بے خبر تھا۔ مگر اُس نے لاعلمی میں میری دل کے نازک ترین تار پہ انگلی رکھ دی۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ میں اُس سے کھل جاتا۔ اور کہتا "کم بخت! خدا تجھے غارت کرے! تو نے مجھے بیٹھے بٹھائے کس آفت میں مبتلا کر دیا؟ مذاق ہی مذاق میں دل کا خون ہو گیا" لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں اس باب میں اس سے کچھ نہ کہہ سکتا تھا، اور خاموش رہنے پر مجبور تھا۔ وہ بے شک میرا بے تکلف دوست تھا، لیکن حسین سے بھی اُس کے روابط بہت گہرے تھے، اور یہ کسی طرح مناسب نہ تھا کہ میں اُس سے عشرت کے متعلق اپنے جذبات کا ذکر کرتا۔

محبت انسان کی زندگی کا ایک بہت بڑا فریب ہے۔ یہ فریب کتنا ہی حسین اور کتنا ہی دلچسپ کیوں نہ ہو، ہے بہر حال فریب! میں بھی اس فریب میں مبتلا تھا جانتا تھا کہ عشرت کبھی میری نہیں ہو سکتی، پھر بھی اُس کی محبت میں سرشار تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ بہت جلد وہ دن آنے والا ہے جب میں اُس کو انگریزی کا ایک آخری سبق پڑھا کر اُس سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جاؤں گا، پھر بھی ایک پُر رومان مستقبل کے خواب دیکھ رہا تھا۔ لیکن رومان حقیقت کو تو نہیں جھٹلا سکتا! چنانچہ وہ دن بھی آ ہی گیا —— وہ دن جب میں عشرت کو آخری سبق پڑھانے کے لئے گیا۔

کورس تو پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ میں اُس کو کتاب کے بعض اہم اور مشکل مقامات سمجھاتا رہا۔ کوئی غیر معمولی بات ظہور پذیر نہ ہوئی۔ سوائے اس کے کہ دل جدائی کے خیال سے کانپ کانپ اٹھتا تھا، اور عشرت کی آنکھیں پہلے سے زیادہ جھکی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ جب چلنے کا وقت قریب آیا تو ایک فوری جذبے کے ماتحت میں نے عشرت سے کہا "ذرا اپنی کاپی دو۔ ترجمے کے لئے جملے لکھ دوں"۔ اُس نے کاپی دے دی اور حسب ذیل جملے بے اختیار میرے قلم سے ٹپک پڑے:۔

"زندگی اور ناکامی ایک ہی بات کے دو نام ہیں۔

تدبیر کی چلتی نہیں تقدیر کے آگے۔

"بعض دفعہ دل کی باتیں صورت سے بھی ظاہر ہو جاتی ہیں"۔

میرا خیال ہے کہ جس وقت میں یہ جملے لکھ رہا تھا، اُس وقت یقیناً میرے ذہن کا پرتو میرے چہرے پر پڑ رہا ہو گا۔ گویا میں ان جملوں کو صرف عشرت کی کاپی پر ہی نہیں بلکہ اپنے چہرے پر بھی تحریر کر رہا تھا۔ یہ میں اس لئے کہتا ہوں کہ لکھنے کے دوران میں میری نظر عشرت پر پڑی تو میں نے اُس کے چہرے پر حسن کی ایک نئی بہار دیکھی۔ اُس وقت اُس کی حالت بالکل اُس دوشیزہ کی سی تھی جس سے پہلی بار محبت کا اظہار کیا جا رہا ہو۔ رخسار حیا کی سرخیوں سے گلستاں بنے ہوئے تھے، ہونٹوں پہ محبت رقص کر رہی تھی، اور آنکھوں میں جوانی انگڑائیاں لے رہی تھی۔

لکھ چکا تو کاپی عشرت کی طرف بڑھا دی۔ اُس نے جملوں کو پڑھا اور اتنی تیزی کے ساتھ کہ اُس کی نظر صفحے پر دوڑتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ پڑھ کر اُس کے چہرے کی کیفیات شدید تر ہو گئیں۔ رخسار دہکتے ہوئے انگارے بن گئے۔ ہونٹوں پہ ایک موج برق نمایاں ہوئی اور وہیں ساکت ہو کر رہ گئی۔ آنکھیں یک لخت چمکیں اور جھک گئیں، گویا ایک بتکدے کا دروازہ کھلا اور بند ہو گیا۔

میں نے محسوس کیا کہ اب صورتِ حال میری برداشت سے باہر ہے، اور وہ غیر معمولی اور فوق الانسانی قوتِ ضبط جس سے میں اب تک کام لیتا رہا ہوں جواب دے رہی ہے۔ اس لئے میں کرسی سے اٹھا اور عشرت پر نظر ڈالے بغیر خدا حافظ کہتا ہوا، وہاں سے چلا آیا۔

یہ آخری سبق تھا جو میں نے عشرت کو پڑھایا!

امتحان سے لے کر نتیجہ برآمد ہونے تک کا زمانہ ایک طویل دورِ کرب تھا۔ جس کی تفصیل نہ میں پیش کرنا چاہتا ہوں، نہ کر سکتا ہوں۔

مئی میں نتیجہ شائع ہوا۔ عشرت پاس ہو گئی۔ وہ ابھی وطن واپس نہیں گئی تھی اور نتیجے کے انتظار میں یونیورسٹی ہی میں ٹھیری ہوئی تھی جس دن نتیجہ ظاہر ہوا اُسی دن دوپہر کو میں مبارکباد دینے اس کے مکان پر گیا۔ مئی کے مہینے کی ایک دوپہر جیسی کچھ گرم اور شعلہ بار ہو سکتی ہے ویسی وہ دوپہر تھی لیکن جسم کو جلانے والی آگ اس آگ کے مقابلے میں کچھ بھی نہ تھی۔ جو میرے دل کو آتشکدہ بنائے ہوئے تھی اور روح کو پھونکے ڈالتی تھی۔

مکان پر پہنچ کر اپنی آمد کی اطلاع کرائی۔ حسین دوڑا ہوا باہر آیا۔ وہ معمول سے زیادہ خوش تھا اور اپنی ممنونیت کے اظہار میں مبالغے سے کام لے رہا تھا۔ مجھے گھر کے اندر لے گیا۔ میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اُس کمرے میں داخل ہوا جس میں میں اپنی جوانی دفن کر چکا تھا۔ عشرت گوناگون جذبات کا مجسمہ بنی ہوئی دروازے

کے قریب کھڑی تھی۔

حسین اُسے دیکھ کر ہنسنے لگا۔ میں نے مسرت ناک لہجے میں کہا "بھئی مبارک ہو! پاس ہوگئیں تم"۔

"یہ آپ کی مہربانی کا نتیجہ ہے" اس نے جواب دیا۔

پھر میں نے حسین سے کہا "حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے بہت ہی زیادہ محنت کی تھی۔ یہ واقعی کامیابی کی مستحق تھیں"۔

"جی نہیں۔ محنت اِس نے خاک نہیں کی" حسین بولا "بس یوں ہی اتفاق سے پاس ہوگئی"۔

"یہ زیادتی ہے آپ کی" میں نے کہا، "آپ ان کی تعریف کرنے میں بخل سے کام لے رہے ہیں۔ انہوں نے جی توڑ کے محنت کی تھی ——— اچھا اب آپ ان کو کیا انعام دے رہے ہیں امتحان پاس کرنے کے صلے میں"؟

"انعام وِنعام کچھ نہیں ملے گا۔ غلط بات ہے" حسین نے کہا۔

"کیوں عشرت!" میں نے استادانہ شفقت کے ساتھ پوچھا "کیا انعام ملنا چاہیئے تمہیں"؟

غرض اس طرح ہنس ہنس کر زور زور سے باتیں کرتا رہا۔ میرا دل سینے کے اندر ماتم کر رہا تھا لیکن میں اُس کی فریاد کو اپنی آوازوں اور قہقہوں کے شور میں ڈبو دینا چاہتا تھا۔ میری حالت اس شخص کی سی تھی جو اپنے گھر کو آگ لگا کر شعلوں کے دلفریب منظر سے لطف اٹھائے، یا خودکشی کا تہیہ کر کے مرنے سے پہلے جھوٹی خوشی اور مصنوعی زندہ دلی کا اظہار کرے۔

اس ملاقات سے فارغ ہو کر میں نے کمرے سے باہر قدم رکھا تو میری حالت عجیب تھی۔ یہ معلوم ہو رہا تھا کہ میں کہیں سے زخمی ہو کر آ رہا ہوں۔ محبت کی چوٹ روح کی گہرائیوں تک محسوس ہو رہی تھی۔

یہی وہ چوٹ تھی جو آج تین سال گذرنے کے بعد بھی تازہ ہے، جو شاید عمر بھر تازہ رہے گی۔

اور یہ سب ایک مذاق تھا۔ اف! خدا کی پناہ!!

اختر انصاری دہلوی

غزل

مدّت سے غمِ دل تھا تسکیں کا تمنائی
ساقی کی نگاہوں نے کی حوصلہ افزائی

کس دیدہ دلیری سے خورشید نے اپنائی
اک آئینہ سیما کی شانِ سحر آرائی

میں غنچۂ بے مایہ میں لالۂ صحرائی
اور اُن کی نگاہوں کو ذوقِ چمن آرائی

بوئے گل تر بن کر بادِ سحری آئی
بادِ سحری آئی، پیغامِ جنوں لائی

پاکیزہ سرشت الفت ہے پھول کی ہم قسمت
گریہ گہر افشانی۔ خندہ چمن آرائی

تم خندۂ بے پروا۔ میں گریۂ مجبوری
محرومِ نظر دنیا، خاموش تماشائی

میرے غمِ پنہاں کے دریا کو میسر ہے
ہر موج کی بے تابی، ہر بحر کی گہرائی

یہ برقِ تبسم کی تاثیر نہ ہو فطرت
بے نور ہے بینائی، خاموش ہے گویائی

عبدالعزیز فطرت

محبت کا گیت

اُبلتی آگ کے شعلے خراماں ہیں،
فضائے لامکانی ہیں،
مگر انسان اُن کو دیکھ سکتے ہیں۔
اِسی دنیائے فانی میں۔

ترے دل میں کئی مبہم ارادے ہیں،
اور اُن پر احتیاط و وہم کے سنگیں لبادے ہیں!
مگر میں اپنے جذبِ دل کی قوّت سے
اِک احساسِ حسیں کی نرم راحت سے
اُنہیں معدوم کر دوں گا۔
میں اُن کو آرزوؤں کے گلستاں میں
بہارِ نو سے بھر دوں گا۔
جنونِ عشق ساماں ہیں
تجھے لے جاؤں گا اِس کائناتی دَور سے باہر،
وہیں پائے گا تسکینِ ابد میرا دلِ مضطر!

یہ حد بندی پسند آتی نہیں مجھ کو،
گرفتاری ذرا بھاتی نہیں مجھ کو،
میں تجھ کو محبتِ بے باک کا نغمہ سناؤں گا،
تجھے اک اَور ہی منظر دکھاؤں گا،

جو بے حد مختلف ہے دہر کی اس نغمہ خوانی سے،
جو بے حد پُرسکوں ہے وقت کی اَن مِٹ روانی سے،
کہیں دلکش ہے ہستی کی پرانی سی کہانی سے،
کہیں شیریں ہے خونِ نوجوانی سے؛
میں اُن انمول لمحوں کو
ترے قدموں کی محرابِ جبیں پر لا کے رکھ دوں گا،
میں اُن مدہوش نغموں کو،
مسلسل خواب سے بیدار کر دوں گا۔

میراجی

شیشم کے پتّے

بستر پر لیٹے لیٹے نجمہ نے کھڑکی کی طرف نگاہ اُٹھائی۔ باہر شیشم کے بے شمار پتّے ایک عجیب سرسراہٹ پیدا کر رہے تھے۔ ماما بولی "بی بی، ڈاکٹر آیا تھا"۔

نجمہ نے پوچھا "کیا کہا اُس نے"؟

"یہی کہ تم بہت جلد تندرست ہو جاؤ گی اور آج کے بعد تمہیں دوا بھی نہیں دی جائے گی۔ یہ آخری خوراک ہے"۔ اتنا کہا اور ماما نے شیشی میں سے دوا انڈیل کر نجمہ کی طرف بڑھا دی۔ نجمہ اُٹھ بیٹھی۔ اُس نے پیالی بائیں ہاتھ میں تھام لی۔ اُس کی لمبی لمبی پتلی سی اُنگلیاں کانپنے لگیں۔ آنکھیں جھکا کر اُس نے غور سے پیالی کے اندر دیکھا۔ اُس کے گلابی ناخن زرد ہو چکے تھے۔ ہاتھوں کی سپید جلد کسی قدر سیاہ پڑ گئی تھی۔ پیالی کے پیندے میں دوا کی شفّاف سطح پر سے دو سیاہ آنکھیں اس کی طرف گھورنے لگیں۔ ان آنکھوں کے گرد گہرے سیاہی مائل حلقے نجمہ کو عجیب و غریب معلوم ہوئے اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کی روح ایک نئی زندگی ایک نئی ہیئت اختیار کر رہی ہے۔

میز پر رکھی ہوئی گھڑی مسلسل ٹِک ٹِک کئے جا رہی تھی۔

ہوا تیز چلنے لگی۔ شیشم کے پتوں کی سرسراہٹ اور بھی تیز ہو گئی۔ نجمہ نے سوچا یہ پتّے بھی انسان کی زندگی کے دنوں کی طرح بظاہر بے شمار ہیں لیکن حقیقت میں ہیں بہت کم۔ آج امی کو گذرے کئی سال ہو گئے، وقت کی تیز آندھی دنوں اور سالوں کو شیشم کے پتّے جان کر اُڑاتی چلی گئی۔ ہاں! شیشم کے پتّے ہر سال ایک نئی زندگی پاتے رہے۔ لیکن گذرا ہوا وقت دوبارہ زندگی حاصل نہ کر سکا۔ ایسا ہو سکتا تو امّی ہمیشہ کے لئے نہ بچھڑ جاتی۔ وہ دن بھی کتنے سہانے تھے۔ جب زندگی گڑیا کے بیاہ کی طرح مکمّل اور بے عیب تھی ..... اور ایک روز گڑیا کے بیاہ پر بھی کیا ہی ہنگامہ بپا ہوا تھا۔ اس نے گڑیا کا بیاہ رچا رکھا تھا۔ محلہ بھر کی لڑکیاں جمع تھیں۔ اتنے میں ابا آئے۔ کہنے لگے "نجمہ سچ سچ بتاؤ میری عینک کا شیشہ کس نے توڑا ہے! نجمہ نے کہا "ابا میں نے تو نہیں توڑا۔ اظہر بھائی لئے پھرتے تھے"۔ پھر ابا نے آگے بڑھ کر گڑیا کے کپڑوں کی پٹاری کو ٹٹولا اور کچھ سوچ کر پٹاری اُلٹ دی۔ نجمہ کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ پٹاری کا اُلٹنا تھا کہ شیشے کے ٹکڑے سب کے سامنے آ رہے۔ ابا بہت ناراض ہوئے۔ پھر ایک چھڑی لے کر ننّھی نجمہ کو خوب دھمکایا اور کہنے لگے "اب اگر کبھی تو نے جھوٹ بولا تو گردن میں رسّی ڈال کر شیشم سے لٹکا دوں گا اور تو چیخ چیخ کر مر جائے گی۔ ابا نے اُس کی سب سہیلیوں سے کہا کہ وہ اپنے اپنے گھر چلی جائیں۔ "آج گڑیا کا بیاہ نہیں ہوگا۔ نجمہ نے جھوٹ بولا ہے اس کو سزا ملے گی"۔ محلّہ بھر کی لڑکیاں تھوڑی ہی دیر میں رخصت ہوئیں۔ نجمہ سسکیاں لیتی رہی۔ امّی نے بہتیرا پیار کیا۔ تسلّی دی مگر نجمہ روئے جاتی تھی۔ رات کو سونے سے پہلے ابا نے پھر وہی کہا۔ "اب اگر تو نے کبھی جھوٹ بولا تو گردن میں رسّی ڈال کر شیشم سے لٹکا دوں گا"۔ اس رات بے چاری نجمہ نے نہ کچھ کھایا نہ پیا بھوکی ہی سو رہی۔ آنکھ لگتے ہی اُس نے خواب میں دیکھا کہ شیشم کی ہر ٹہنی کے ساتھ ایک ایک ننّھی سی گڑیا لٹک رہی ہے شیشم کے بے شمار پتّے اُن گڑیوں کے گرد تڑپ تڑپ کر ناچ رہے ہیں۔ سب گڑیاں چیخ رہی ہیں رو رو کر گردن سے رسّی نکالنا چاہتی ہیں مگر نہیں نکلتی۔ محلّے بھر کی تمام سہیلیوں کی گڑیاں مر گئیں۔ نجمہ کی گڑیا اظہر بھائی کا نام لے لے کر پکارتی رہی مگر اظہر بھائی اُس وقت گیند بلّا کھیل رہے تھے، وہ نہ آئے اور پھر نجمہ کی گڑیا بھی آپ ہی آپ روتے روتے چُپ ہو گئی۔ نجمہ گھبرا کر چیختی ہوئی خواب سے چونک اٹھی۔

"امّی امّی میری گڑیا مر گئی"۔ امّی نے کہا "کہیں گڑیا بھی مرتی ہے! یہ دیکھ تیرے پاس تو رکھی ہے"۔ کچھ دیر بعد ابا نے پوچھا "بیٹی تو کیوں ڈر گئی؟" نجمہ نے کہا "شیشم کا درخت میری گڑیا کو کھا رہا تھا"۔ ابا نے ہنس کر کہا "بھولی بیٹی!"

اس کے چند ہفتے بعد وہ ہولناک دن آیا۔ جب امّی چپ چاپ سو رہی تھی۔ سب لوگ اس کو جگاتے تھے وہ نہیں جاگتی تھی۔ امّی ناراض تھی، سب لوگ رونے لگے نجمہ بھی رونے لگی پھر وہ آپ ہی آپ امّی کے بستر کے پاس گئی۔ اور کہنے لگی "امّی جاگ اٹھو۔ ہم سب رو رہے ہیں" مگر امّی نے کچھ جواب نہ دیا۔ پاس ہی سے ایک بڑھیا بسورتی ہوئی چیخ اٹھی "بیٹی وہ سوتی نہیں مر گئی ہے۔ وہ اب کیوں جاگنے لگی"۔

نجمہ نے کہا "کہیں امّی بھی مرا کرتی ہیں وہ میرے سامنے تو بیٹھی ہیں"۔ یہ بات سن کر اپنوں اور پرایوں میں ایک کہرام مچ گیا۔ نجمہ سہم گئی۔ اس نے جانا امّی سچ مچ ناراض ہو گئی ہیں۔ وہ اب نہیں آئیں گی، سب لوگ انہیں بلاتے ہیں وہ نہیں

بولتیں اوروں کو روتا دیکھ کر نجمہ بھی بے اختیار رونے لگی اور پھر سب کو چھوڑ کر اسی کھڑکی کے پاس آ کھڑی ہوئی، وہ اکیلی آسمان کی طرف ٹکٹکی لگائے اپنے آنسوؤں کے قطروں میں سے شیشم کی برہنہ ٹہنیوں کو دیکھ دیکھ کر دیر تک روتی رہی۔ تھوڑے سے پتے درخت پر باقی تھے۔ زرد، خشک اور مرجھائے ہوئے ایک زرد پتا ٹوٹ کر ہوا میں لڑکھڑاتا اُس کی طرف اُڑتا ہوا آیا اور اُس کے سنہری بالوں میں اٹک گیا۔ اُس نے جھنجھلا کر اس پتے کو نوچ کر الگ کر دیا۔ پھر اُس نے شیشم کی طرف آنکھیں پھاڑ کر دیکھا اور بولی "اللہ کرے تو مر ہی جائے۔ تو نے ہی میری گڑیا کھائی تھی۔" کچھ دیر وہ خاموش کھڑی آنسو بہاتی رہی، شیشم کے زرد پتے ہوا میں پھڑپھڑاتے رہے۔ پھر وہ آپ ہی آپ چیخ اٹھی۔ "امی ابی تم کو شیشم نے تو کچھ نہیں کہا!" اتنے میں اظہر بھائی بھی روتے ہوئے قریب آ گئے انہوں نے نجمہ کو دلاسا دینا چاہا لیکن دونوں ایک دوسرے کو روتا دیکھ کر اور زیادہ رونے لگے . . . . .

دو سال ہوئے اظہر بھائی نے کہا تھا "خزاں کا موسم ہمارے کنبے کے لئے بہت منحوس ہے۔" نجمہ نے پوچھا "وہ کیسے؟" کہنے لگے "امی ابا جان اور بڑی آپا خزاں ہی کے موسم میں تو فوت ہوئے تھے۔" نجمہ نے کہا "یہ شیشم کا درخت بھی تو بہت بڑی نحوست ہے"۔ اظہر نے پوچھا "وہ کیونکر؟" نجمہ نے کہا "یوں کہ جب اس درخت کے پتے کم ہو جاتے ہیں تو کوئی نہ کوئی رنج دہ واقعہ ہو ہی جاتا ہے۔"

اظہر بولے "وہی بات ہوئی نا، خزاں کا موسم بڑا نحس ہے۔"

"تو پھر اس درخت کو کٹوا ہی کیوں نہ دیں"

"اُس درخت کا بھلا کیا قصور ہے؟ آخر موسم بھی تو خزاں کا ہے؟ پچھلے سال اسی درخت کے نیچے پڑوسی کے لڑکے کی برات بھی بیٹھی تھی۔ آخر اُس وقت نحوست کہاں تھی اس کی؟"

کھڑکی کے اس پار ایک خوبصورت نوجوان کا چہرہ تیرتا ہوا، اُڑتا ہوا ایک متحرک تصویر کی طرح گذر گیا۔ سامنے کے مکان میں چند مہینوں سے ایک اجنبی کنبہ آ بسا تھا۔ اسی گھر کا جوان لڑکا کبھی کبھار آتے جاتے آنکھ اٹھا کر کھڑکی پر نگاہ ڈال لیتا تھا۔ نجمہ حیا کے مارے ہمیشہ اوٹ میں ہو جاتی۔ اب اس نے ایسا محسوس کیا جیسے کسی نے اپنا ایک ہاتھ کھڑکی کی چوکھٹ پر رکھا اور دوسرے ہاتھ سے نجمہ کا ہاتھ تھام کر چوم لیا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایک لمحہ کے سکوت کے بعد کہا "نجمہ! تم کتنی حسین ہو!"

وہ کچھ جواب نہ دے سکی۔ کچھ دیر تک وہ اُس کے بالوں سے کھیلتا رہا۔ نجمہ خاموش اُس کا منہ تکتی رہی۔ اُس نے شیشم کا ایک خشک پتہ ٹٹول کر اس کے ملائم بالوں میں سے نکالا اور بولا "نجمہ تمہارے بالوں میں شیشم کا ایک پتہ اُلجھ رہا ہے۔"

وہ کچھ جواب نہ دے سکی اور آن کی آن میں وہ ہاتھ، وہ چہرہ اور وہ آنکھیں نظروں سے غائب ہو گئیں . . . . . .

تھپ! تھپ! تھپ!!

اظہر بھائی کمرے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے ایک اُچٹتی ہوئی نگاہ اپنے اردگرد ڈالی پھر وہ سیدھے آگے بڑھے اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا عکس دیکھتے دیکھتے کسی وہم میں کھو گئے۔ شیشے میں سے عکس بولا "کیوں! اظہر بھائی کس بات کی سوچ ہے؟"

اظہر نے کہا "میں ایک بہت بڑی اُلجھن میں گرفتار ہوں ان دنوں۔"

عکس نے کہا "مجھے بھی تو معلوم ہو۔"

اظہر بولا "میں ابا میاں کا قرض اتارنے میں کچھ ایسا محو ہوا کہ اور تمام باتیں بھول بیٹھا۔ مجھ پر ایک بہت بڑا قرض باقی ہے۔"

عکس نے کہا "جہاں تک میں جانتا ہوں اب تم ابا میاں کے قرض سے سبکدوش ہو چکے ہو۔ اب یہ الجھن کیسی ہے؟"

"مجھے نجمہ کی فکر ہے۔"

"فکر کی کیا بات ہے۔ اب تو وہ تندرست ہو چکی ہے۔ ہاں پہلے کی طرح اب اُسے دن رات سینے پرونے میں نہ لگے رہنے دینا بڑی مشکل سے جان بچی ہے اُس کی۔"

"میں نجمہ کے بیاہ کی فکر میں ہوں تم نہیں جانتے۔"

"اچھا یہ بات ہے؟ تو کیا سوچا ہے تم نے؟"

"یہی تو مجھے اُلجھن ہے"

"تو میں ایک تجویز پیش کرتا ہوں اگر تم اس پر عمل کر سکو۔"

اظہر بھائی نے بے تابی سے پوچھا "وہ کیا تجویز ہے جو تم بتانا چاہتے ہو؟"

عکس نے کہا "یہ جو سامنے کے مکان میں ڈپٹی صاحب آ کر چند مہینوں سے بسے ہیں شاید تمہیں علم نہیں ہمارے ابا کے بہت پرانے دوست ہیں۔"

"ہاں ہاں میں جانتا ہوں۔ میری بھی راہ و رسم ہے اُن سے کیا بات ہے اُن سے متعلق؟"

"یہی کہ اُن کے ہاں سلسلہ جنبانی کر دیکھو۔"

"نجمہ کے رشتے کے لئے؟"

"ہاں"

"یہ نہ ہو گا، کوئی معقول بات کرو، مجھ سے یہ نہ ہو گا۔"

"خیر نہ سہی، اگر تم ہی نجمہ سے تو مشورہ کر دیکھو۔"

اظہر بھائی نے آئینے کے سامنے کھڑے کھڑے رخ پھیر لیا۔ آئینے میں سے عکس غائب ہو گیا اور کھڑکی کے اُس پار ایک حسین عورت تیرتی ہوئی ایک متحرک تصویر کی طرح گذر گئی۔ نجمہ کھڑکی کے پاس کچھ دیر ٹھہری رہی۔ اتنے میں وہی چہرہ واپس کھڑکی کے قریب آ کر رُکا اور کہنے لگا۔ "دیکھنا نجمہ، ننھے کو سیڑھیوں تک نہ جانے دینا۔ اُس روز کی طرح گر جائے گا۔"

ننھے نے کہا "امّی امّی مجھ کو گود میں اٹھا لو" نجمہ نے ایسا ہی کیا

ننھے نے پھر کہا "امّی مجھے کھڑکی کے سامنے لے چلو۔ میں چاند دیکھوں گا"

نجمہ نے ایسا ہی کیا۔ ننھا بچہ پھر بولا "اچھی امّی تم مجھ کو چھوڑ دو میں کھڑکی میں سے ہو کر شیشم کی شاخوں پہ جا بیٹھوں گا، پھر وہاں سے اڑ کر چاند کے پاس جاؤں گا"

نجمہ بولی "نہیں میرے لال تو شیشم پہ سے گر جائے گا"

اُس نے بچے کو اپنی گود میں مضبوطی سے تھام لیا۔ نہیں معلوم کیونکر، لیکن وہ بچہ اڑ کر شیشم کی ٹہنیوں پر جا بیٹھا۔ وہ روکتی رہی۔ پھر اُس نے حسرت بھرے لہجے میں کہا "آ جا میرے لال" لیکن بچہ قہقہے لگاتا ہوا آسمان کی طرف اُڑ گیا۔ نجمہ دیکھتی رہی، پھر وہ چاند میں بیٹھ کر اپنی امّی اور ابّا کو بلانے لگا.....

نجمہ نے دیکھا خزاں کا موسم بڑھا چلا آتا ہے اور درخت کے پتے آہستہ آہستہ جھڑ رہے ہیں اس نے جانا کہ جوں جوں یہ پتے کم ہو رہے ہیں۔ اُس کی زندگی کے دن بھی اُسی رفتار کے ساتھ ختم ہوتے جاتے ہیں کبھی کبھی وہ کھڑکی میں سے آسمان کی طرف دیکھنے لگتی۔ راتوں کی تنہائی میں اس طرف تاروں بھرا آسمان اور اس طرف ایک برہنہ درخت جس کی خشک شاخوں پر زرد پتے ایک مسلسل رقص میں مصروف تھے۔ نجمہ سوچتی، اُس کے گذرے ہوئے عزیزوں کی روحیں اُن تاروں میں سے زمین کی طرف جھانک رہی ہیں۔

زرد پتے ایک ایک کر کے ٹوٹنے اور فضا میں رقص کرتے ہوئے زمین پر آنے لگے۔ درخت اپنی برہنہ شاخیں اٹھائے آسمان کی طرف گویا دستِ دعا پھیلائے۔ اُس نے سوچا شاید شیشم بھی اُس کی طرح زندگی کی کٹھن مشکلوں سے تنگ آ کر آسمان کی طرف پرواز کرنا چاہتا ہے۔

پتوں کی سرسراہٹ اور بھی دھیمی ہو گئی۔ نجمہ نے بھائی سے کہا "میں ان پتوں کے ساتھ ختم ہو جاؤں گی"

بھائی نے کہا "تمہیں بھی کیسا وہم ہے۔ تم بہت جلد تندرست ہو جاؤ گی۔ اور میں تمہارا بیاہ رچاؤں گا"

شیشم کے پتے اور بھی کم ہو گئے۔ شاخوں میں سے گذرتی ہوئی ہوا ٹھنڈی آہیں بھرنے لگی۔ نجمہ نے دیکھا اور اُس کا دل دھڑکنے لگا۔ اُس وقت درخت کی سب سے اونچی ٹہنی پر صرف ایک پتہ معلق تھا اور شاید اپنی زندگی کو برقرار رکھنے کی خاطر سرکش ہواؤں سے آمادہ پیکار تھا۔ نجمہ نے کہا "بھائی جان، او دیکھئے، درخت پر صرف ایک پتہ باقی ہے۔ میری زندگی اسی سے وابستہ ہے، جس وقت یہ ہوا سے گر جائے گا۔ میری روح بھی پرواز کر جائے گی"

اظہر بھائی نے کہا "یہ غلط ہے تمہیں وہم ہے"

شام ہو چکی تھی۔ چاندنی چھٹک رہی تھی۔ کھڑکی میں سے سامنے شیشم کے درخت کے عین اوپر چاند اس طرح نظر آ رہا تھا گویا وہ مریضہ کو آخری نظر دیکھنے کے لئے کھڑکی کی طرف لپکا ہے اور شیشم کی خزاں زدہ شاخوں میں اٹک کر رہ گیا ہے۔ ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ درخت کی چوٹی پر آخری پتے نے اپنی پوری قوت سے مدافعت کی اور شاخ کے ساتھ ہی تڑپ تڑپ کرتا چلتا رہا۔ نجمہ کے جسم و روح لرز اُٹھے۔ ایک لمحے کے بعد وہ خاموش، ساکت اور بے حس و حرکت ہو گئی۔ اظہر نے جھک کر دیکھا نجمہ کی زرد پیشانی پر ایک زرد پتہ چپکا ہوا تھا۔ اُس نے کہا "اچھی بہن، تو سو رہی ہے؟" لیکن اسے کچھ جواب نہ ملا۔ اُس کی نظر کھڑکی کی طرف اٹھ گئی۔ درخت کی زندگی کا آخری نشان غائب تھا۔ اُس نے جھک کر بہن کی پیشانی کو چھوا اور اُس کے منہ سے بے ساختہ ایک چیخ نکل گئی۔ "آہ ...... نجمہ"

اظہر نے سنا دور کسی سمت سے شادی کے باجوں کی آواز کھڑکی میں سے چھن چھن کر آ رہی تھی۔

. . . .

نجمہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یکایک میز پر رکھی ہوئی گھڑی ٹک ٹک کرنے لگی۔ نجمہ کے بائیں ہاتھ میں پیالی تھی اور دوا کی سطح پر سے دو سیاہ اجنبی سی آنکھیں اس کی طرف گھور رہی تھیں۔ صحن میں شیشم پہ بے شمار پتے ایک عجیب سرسراہٹ پیدا کر رہے تھے۔ ماما بولی "بی بی دوا پی لو۔ اگر کڑوی ہے تو کیا ہوا بچوں کی طرح آنسو نہ بہاؤ۔"

کھڑکی کے اس پار ایک حسین نوجوان کا چہرہ تیرتا ہوا [illegible] متحرک تصویر کی طرح نجمہ کی نگاہوں کے سامنے سے گذر گیا۔

حسن نذیر۔ ایم۔ اے

بغاوت

غرض کیا ہے مجھے پھولوں کے رنگا رنگ شعلوں سے
مجھے اب جیتے جی دل کی مسرت مل نہیں سکتی
وہ غنچے جو چٹکتے ہیں سحر کو گلستانوں میں
مرے دل کی کلی کو اُن کی قسمت مل نہیں سکتی
وہ نغمے تیرتے ہیں جو دماغ و دل کے سوتوں میں
اُنہیں نغموں سے اب خوں کو حرارت مل نہیں سکتی
وہ رنگیں تتلیاں جو ناچتی ہیں مرغزاروں میں
مرے غم کو کبھی اُن کی بشاشت مل نہیں سکتی
وہ دل آویز چہرے جو نگاہوں سے گزرتے ہیں
حقیقت ہے کہ ان سے میری صورت مل نہیں سکتی
تو پھر کیوں ان مناظر میں نظر کو اپنی الجھاؤں
اگر سچ ہے کہ اس الجھن میں راحت مل نہیں سکتی
جہاں کے حُسنِ رنگیں سے بغاوت کرنے والا ہوں!

(۲)

تخیّر کی حرارت سے محبّت کے اشاروں سے
چمکنے والی گونجوں سے تھرکنے والے تاروں سے
بہکنے والی الفت سے، سنکنے والے شعلوں سے
فسوں بر سر ہواؤں سے چمن در بر بہاروں سے
فرشتوں سے جو نادانی کی مشعل لے کے چلتے ہیں
نہیں واقف جو خود سے اُن خرد کے رازداروں سے
سکوں آمیز خوابوں سے، تبسم ریز جلووں سے
سکوتِ شام میں آتش بداماں ابر پاروں سے
تبسم سے کہ اُس کی گود میں پلتی ہے سرشاری
جوانی سے کہ اُس کی ابتدا ہے لالہ زاروں سے
کتابوں سے جو دل کو زندگی کا درس دیتی ہیں
محبت سے کہ اُس کی ابتدا ہے بے قراروں سے
میں اِن راحت کے عنوانوں سے نفرت کرنے والا ہوں۔

(۳)

محبت "اُف! نہ لو تم نام بھی اس کا مرے آگے
مجھے نفرت ہے اس سے یہ مجھے پہروں رُلاتی ہے
محبت ہاں! محبت دل کے احساسات سے باغی
یہی تو زندگی کو ہر قدم پر آزماتی ہے
محبت، آہ بن بن کر نکلتی ہے نگاہوں سے
محبت درد کی صورت میں شب کو مسکراتی ہے
محبت چوٹ کھاتی ہے محبت وار کرتی ہے
محبت نوجوانی میں گلوں کی بے ثباتی ہے
محبت توڑ دیتی ہے دلوں کے آبگینوں کو
محبت اپنے ہاتھوں سے جوانی کو مٹاتی ہے
محبت سے نہ دیکھو تم کسی معصوم کی جانب
کہ یہ دولاں دلوں کی حسرتوں سے لطف اٹھاتی ہے
مجھے دیکھو کہ میں بھی تو محبت کرنے والا ہوں!

یوسف ظفر

دربارِ اودھ کا یوروپین نائی

انتزاع سلطنت مغلیہ انیسویں صدی عیسوی کا آغاز ہے۔ بابر کی بنیاد ڈالی ہوئی، اکبر کی مستحکم کی ہوئی، اور اورنگ زیب کی وسعت دی ہوئی سلطنت مغلیہ کا چراغ حیات دہلی کے قلعہ میں ٹمٹما رہا ہے اور صرف باد مخالف کے ایک خفیف جھونکے کا منتظر ہے۔ حکومت کی قبا کی دھجیاں اُڑ چکی ہیں۔ شہنشاہ دہلی، سچ پوچھئے تو ایک شاہ شطرنج ہے جس کو پیلے اور گھوڑے تو درکنار چھوٹے سے چھوٹا مہرہ پیادہ تک مات دینے پر تلا ہوا ہے۔ باجگذار ریاستیں کیسی؟ صوبے کہاں؟ نصف صدی سے زائد ہو چکی۔ دکن نے کوہ وندھیا کی دیوار کے پیچھے اپنی چھوٹی سلطنت مغلیہ علیحدہ قائم کر لی۔ بنگال بہار میں پہلے نواب ناظم بنگالہ کا دور دورہ ہوا، پھر "ہر فرعونے راموسے" سرکار کمپنی نے خلیج بنگالہ سے دریائے گنگا تک اپنی داغ بیل ڈال دی پنجاب سے سکھ، راجپوتانہ سے راجپوت اور مہاراشٹر سے مرہٹے آستینیں چڑھائے بڑھے چلے آ رہے ہیں۔ البتہ ایک اودھ کی پرانی صوبہ داری ہے جو سعادت علی خاں[۱] تک نام لینے کو "نواب وزیر اودھ" کے لقب سے تاریخ میں جگہ پائے ہوئے ہے مگر کب تک؟ اور سچ پوچھئے تو اودھ ہی کب دہلی کا زیر نگیں تھا؟ شجاع الدولہ جیسے منچلے سپاہی نے کب کا جوا اتار پھینکا تھا۔ صرف "نواب وزیر" کا خطاب ایک ٹٹی کی آڑ تھا۔ ۱۸۱۹ء میں آڑ بھی باقی نہیں رہی اور لارڈ ہیسٹنگز[۲] نے غازی الدین حیدر (۱۸۱۴ء سے ۱۸۲۷ء کو تخت نشینی کے پانچ سال بعد شاہ اودھ اوّل بنا ہی دیا۔ غازی الدین حیدر نے ۱۸۲۷ء میں داعی اجل کو لبیک کہا تو ان کا فرزند نصیر الدین حیدر تخت اودھ پر متمکن ہوا۔

اودھ کی بادشاہت اور شاہ نصیر الدین حیدر ذرا سا نصیر الدین حیدر کا سراپا ملاحظہ ہو۔ جنرل جی سی منڈی (General G. C. Mundy) کو ۱۱ دسمبر ۱۸۲۷ء کو دربار اودھ میں باریابی کا شرف حاصل ہوا۔ منڈی اس وقت کے کمانڈر ان چیف لارڈ کیمبرمیر (Lord Combermere) کا اے ڈی سی تھا۔ وہ لکھتا ہے۔

"بادشاہ کوئی ۲۶ سالہ نوجوان ہے اور صورت شکل سے کوئی دبدبۂ شاہی نہیں ٹپکتا۔ تقریباً ۵ فٹ ۹ انچ کا قد ہوگا۔ رنگ کالا نہیں تو گورا بھی نہیں۔ سانولا کہئے۔ بادشاہ کی دماغی قابلیت اور اس کے مشاغل تفریحات اس کے شایانِ شان نہیں، البتہ وزیر غضب کا زیرک و ذہین ہے مگر دنیا میں کوئی نہیں جو اس سے تنفر نہ کرتا ہو۔ ایک بادشاہ سلامت ضرور اُس کو اپنا دست راست سمجھتے ہیں اور اس پر کورانہ اعتماد کرتے ہیں۔"

یہ جلوس کا پہلا سال ہے۔ سنین مابعد کا مرقع آپ کو مشہور تصنیف "ایک مشرقی بادشاہ کی پرائیویٹ زندگی"[۳] میں ملے گا جو سب سے پہلے ۱۸۵۵ء میں پھر ۱۸۵۷ء میں لندن میں شائع ہوئی۔ خدا جانے مصنف کون ہے؟ کہتے ہیں کہ کوئی گھر کا بھیدی ہے۔ روزنامہ ٹائمس لندن کی رائے میں "کتاب کیا ہے الف لیلے ولیلہ کی داستان کا ایک ورق ہے" اکثر کا خیال ہے کہ ولیم نائٹن William Knighton اس کا اصل مصنف ہے، بہرکیف کوئی بھی ہو ۱۸۵۵ء کی اشاعت میں کسی مصنف کا بھی نام نہیں،

بادشاہ پر یوروپین اثرات ۔ اس کتاب کے صفحہ ۱۲ پر نصیر الدین حیدر کے پانچ یوروپین ارکان دربار کے وجود کا پتہ چلتا ہے۔ ایک ان میں بادشاہ کا استاد۔ دوسرا داروغہ کتب خانہ۔ تیسرا جرمن مصور و مغنی۔ چوتھا کپتان باڈی گارڈ اور پانچواں حجام تھا۔

نصیر الدین حیدر کی تصویر پر نظر کیجئے۔ نہ مشرقی بادشاہوں کے ایسی زلفیں ہیں نہ پٹے۔ نہ اسلامی سلاطین کی نورانی ڈاڑھی ہے۔ نہ سپاہیانہ رعب وداب پیدا کرنے والی مونچھیں ہیں۔ بال خشخشی کئے ہوئے، خط صاف، مونچھیں اس قدر مہین کتری ہوئی گویا مسیں بھیگ رہی ہیں۔ لباس شاہانہ سے تو مجبور ہیں۔ مگر اس میں بھی جدید طرز کی تراش خراش موجود ہے۔ لیکن پرائیویٹ زندگی میں انگریزی کپڑے بے تکلف پہنتے ہیں۔ بدقسمتی سے کوئی تصویر لکھنؤ کے عجائب خانہ میں ایسی دستیاب نہیں ہوتی جس میں بادشاہ انگریزی لباس میں ہو مگر تذکرہ سے ثابت ہوتا ہے کہ بادشاہ کو اس زمانہ کی یوروپین چھجے دار ٹوپی پہننے میں بھی کوئی عار نہ تھا۔

۱۔ ۱۷۹۷ء تا ۱۸۱۴ء

۲۔ Lord Hastings

۳۔ The Private Life of an Eastern King: London 1855

ان پانچ یوروپین مصاحبین یا ارکانِ سلطنت (ارکان سلطنت اس وجہ سے کہ ان لوگوں کے اقتدار کے سامنے کسی کی نہ چلتی تھی) کا اثر بادشاہ کی زندگی پر اس قدر پڑا تھا کہ انہوں نے اپنی معاشرت ہی بدل دی تھی۔ دوپہر کو خاصہ میز کرسی پر انگریزی طریقہ سے چھری کانٹوں کے ساتھ نوش فرمایا جاتا۔ اور شراب بھی فرانس کی بہترین شرابوں میں سے پسند کی جاتی۔ عمارات کی تعمیر میں یوروپین طرز کو ہندوستانی وضع پر ترجیح دی جاتی۔ شاہی محلات کا فرنیچر بھی نیم مغربی اسلوب کا تھا۔ کچھ انہیں پانچ افراد پر اکتفا نہیں تھی بلکہ ان کے علاوہ داروغہ مطبخ بھی یوروپین بلکہ نائی کا بھائی تھا۔

اچھا اب اول الذکر چار کو بھلا دیجئے اور صرف "نائی" کے وقائع حیات پر اپنی نظر کی جولانیوں کے راستہ کو مسدود کر دیجئے۔

نائی کی ابتدائی زندگی۔ نائی کا نام ڈی رزٹ De Russet تھا وہ کلکتہ میں ایک جہاز پر نوکر ہو کر آیا تھا۔ لندن میں وہ ایک حجام کی دوکان پر کام کرتا تھا اور کچھ سیکھا بھی تھا۔ لہٰذا کلکتہ پہنچ کر اُس نے خط تراشی شروع کی۔ اور بہت جلد نام و نمود حاصل کر لیا ۔ جب پنچے ٹک گئے اور فکر فردا نہ رہی تو حوصلے بڑھنے لگے ۔ پہلے بڑے بڑے دریاؤں کے ذریعہ سے یوروپین تجار تجارت کیا کرتے تھے اور چھوٹے چھوٹے جہازوں اور کشتیوں میں لاد لاد کر سامان تجارت لے جایا کرتے تھے۔ رزٹ بھی ان تجار کے ساتھ ہو لیتا اور شہروں شہروں کی سیر کرتا پھرتا۔ اسی طرح پھرتا پھراتا وہ لکھنؤ میں وارد ہوا اور ریذیڈنٹ تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ غالباً ٹامس ہربرٹ میڈاک[1] Thomas Herbert Maddock) اس وقت ریذیڈنٹ تھا۔ رزٹ نے ریذیڈنٹ کے کچھ اس خوبصورتی سے بال تراشے کہ اُس کا چہرہ نکھر آیا اور وہ نائی سے اس قدر خوش ہوا کہ آخر کار بادشاہ کے حضور میں پیش کر دیا۔ بادشاہ اس نعمت غیر مترقبہ کو پا کر باغ باغ ہو گیا اور اس روز سے پھر نائی کو وہ عروج ہوا کہ اللہ غنی۔

دربار اودھ میں رسائی۔ قسمت نے یاوری کی بخت نے ساتھ دیا۔ پھر کیا تھا سب کچھ قدموں سے لگا ہوا تھا۔ خسروانہ عنایات، شاہانہ ملاطفات، دن رات کرم کی بارش، چند دنوں میں رزٹ مالا مال ہو گیا۔ سرفراز خاں کے خطاب کے ساتھ شاہی آبدار خانہ کی داروغگی مرحمت ہوئی۔ اب تو رزٹ کی آمدنی کے متعدد دروازے کھل گئے۔ کوئی شراب شاہی میز پر اُس وقت تک نہ چنی جاتی جب تک اس انگریز حجام کی مُہر اس پر ثبت نہ ہوتی اور کوئی شراب اس وقت تک بادشاہ کے حضور میں نہ پیش کی جاتی جب تک یہ نمک حلال دو چار گھونٹ اس کے پہلے نوشِ جان کر لیتا۔ یورپ سے جتنی شراب آتی وہ رزٹ ہی منگاتا اور اس کی قیمتوں میں دونا چوگنا نفع کماتا۔

عروج ۔ رزٹ نے بادشاہ کا اس قدر اعتماد حاصل کر لیا تھا کہ بادشاہ اپنے رازِ دل کو سوائے اُس کے وزیر اعظم تک سے نہ بیان کرتا اور شاہی مزاج میں اُس کو اس قدر دخل حاصل ہو گیا تھا کہ جس بات پر بادشاہ نہیں کہہ دیتا۔ رزٹ "ہاں" کہلا دیتا تھا۔ ڈی رزٹ کے لئے آداب دربار کی پابندی بھی اُٹھ گئی تھی۔ اور وہ بے تکلف دسترخوان پر بادشاہ کے ساتھ خاصہ تناول کرتا۔ اور تمام رنگ رلیوں میں شریک رہتا۔ اس کی شہرت ہندوستان کے عرض و طول میں پھیل چکی تھی اور وہ عوام کے طعن و تشنیع کا نشانہ بنا ہوا تھا۔ چنانچہ کلکتہ ریویو کی تیسری جلد میں اودھ کے متعلق ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں رزٹ کو سفلہ و کمینہ سے خطاب کیا گیا ہے لیکن اُس کو اس کی مطلق پروا نہ تھی کیونکہ وہ زرپاشی سے دنیا کا منہ بند کر سکتا تھا۔ اُس زمانہ کے چند اخبارات میں "آگرہ اخبار" اس کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا۔ لیکن اُس کے خاموش کرنے کے لئے رزٹ نے ریذیڈنٹ کے دفتر کے ایک یوروپین کلرک کو اس کام کے لئے مامور کیا کہ وہ آگرہ اخبار کے مضامین کا جواب کلکتہ کے اخبار[2] میں دیا کرے۔

کتاب "ایک مشرقی بادشاہ کی پرائیویٹ زندگی" کے دوسرے باب میں رزٹ کا پھر تذکرہ آتا ہے۔ اس باب میں بادشاہ کے مشاغل پر بحث کی گئی ہے۔ شاہی دسترخوان ٹھیک ۹ بجے شب کو بچھ جاتا تھا۔ بادشاہ وسیع ہال میں جس میں کھانا چنا ہوتا تھا، اس شان سے داخل ہوتا تھا کہ وہ اپنے اس حجام رفیق کے کاندھے سے سہارا دیئے ہوتا تھا۔ بادشاہ بہ نسبت نائی کے زیادہ طویل القامت تھا اور چہرہ سے بھی زیادہ رعب دار معلوم ہوتا تھا لیکن حجام نہایت بد قطع تھا اور اس کے بشرہ سے چھچھورا پن ٹپکتا تھا۔ دونوں ایک ہی طرح کا لباس پہنے ہوئے ہوتے تھے اور محض لباس سے محمود و ایاز میں تمیز کرنا ناممکن تھا۔ دسترخوان کی نگرانی ایک فرانسیسی کے سپرد تھی اور باورچی بھی کلکتہ کلب کا ایک ہوشیار یوروپین تھا لیکن سوائے نائی کے کسی یوروپین کی مجال نہ تھی کہ وہ دسترخوان پر بیٹھ سکے۔

ارکانِ سلطنت بادشاہ کی اس سفلہ نوازی سے عاجز آ گئے تھے اور وہ اس گھات میں تھے کہ موقع پا کر اس نائی سے دربار کو پاک و صاف کریں۔ مگر

[1] Late Sir Thomas Herbert Maddock C.B. M.P. یہ شخص ایک مصنف گزرا ہے ۱۸۵۲-۵۷ء تک ممبر پارلیمنٹ بھی رہا اور ۱۵ جنوری ۱۸۷۰ء میں اسی سال کی عمر میں فوت ہوا۔ [2] کلکتہ کے اخبار سے غالباً جام جہاں نما کی طرف اشارہ ہے۔ جس میں ولیم بروٹ کا اسعد کلام بھی شائع ہوا ہے۔

اُن کی کوئی چال نہ چلتی تھی اور ہر قدم پر سوائے ندامت کے کچھ حاصل نہ ہوتا دوسرے یورپینوں میں رزنٹ کے خلاف رقابت کی آگ بھڑک اٹھی تھی اور وہ اس کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے لیکن قبل اس کے کہ ان کا وار رزنٹ پر چل سکے رزنٹ نے ایک ایک کر کے سب کو ذلت و خواری کے ساتھ دربار سے نکلوا دیا اور جب کہ وہ تن تنہا رہ گیا تو اُس کی مطلق العنانی اور خودسری کی انتہا نہ رہی۔

رزنٹ کا انجام آخر ہر عروج کے لئے زوال ہے۔ رزیڈنٹ بھی دربار کے یہ کرشمے برسوں سے دیکھ رہا تھا اور بادشاہ کو متعدد بار متنبہ کر چکا تھا۔ لیکن بادشاہ نے اب تک رزنٹ کی شکایات کی طرف اعتناء نہیں کی تھی۔ مگر چونکہ شاہ اودھ پر ریذیڈنٹ کا خوف اس وجہ سے غالب رہتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ شہزادہ سے ساز کر کے اس کو تخت سے معزول کر دے اس وجہ سے مجبوراً اُس کو ریذیڈنٹ کے اشاروں پر چلنا پڑتا تھا۔ آخر وہ وقت بھی آ ہی گیا اور بادشاہ کے عتاب کی بجلی جو بہت دنوں سے کوند کوند کر رہ جاتی تھی رزنٹ کے سر پر آ گری۔

"تم نے میرے مخلص مشیروں کو مجھ سے چھڑایا اور پھر فریب سے اپنی وفاداری کا سکہ میرے دل پر جمایا۔ ریذیڈنٹ سچ کہتا ہے۔ تم غلط فہمی میں مبتلا ہو جس کو تم بہت جلد محسوس کر دگے۔"

یہ الفاظ تھے جو بادشاہ نے غیض میں کہے۔ نائی یہ سنتے ہی حواس باختہ ہو گیا اور پردۂ شب میں سر پہ پیر رکھ کر کانپور فرار ہو گیا۔ صبح کو بادشاہ کو اُس کے فرار ہونے کی خبر پہنچ گئی اور شاہی حکم سے رزنٹ اور اُس کے بھائی کی تمام جائداد ضبط کر لی گئی۔ رزنٹ کا لڑکا اور بھائی قید کر لئے گئے اور شاید تلوار کے گھاٹ بھی اتار دیئے جاتے مگر وزیر اور ریذیڈنٹ کے سمجھانے سے بادشاہ نے اُن کی جان بخشی کر دی۔

کہتے ہیں کہ رزنٹ کم از کم چوبیس لاکھ روپیہ کے جواہرات لے کر نکلا۔ جن کو اُس نے لندن میں فروخت کر کے تجارت شروع کی اور آخر عمر تک عیش کی زندگی بسر کرتا رہا۔ ۱۸۵۰ء تک اس کے زندہ ہونے کا ثبوت لندن ڈائرکٹری سے ملتا ہے۔ اس کے بھائی اور بیٹے کا افسانہ طویل ہے۔ لیکن انتزاع سلطنت تک پھر اس خاندان کے کسی فرد کا نام اودھ کی تاریخ میں نہیں آتا۔

سید شہنشاہ حسین

شعر

دیکھ شمشیر ہے یہ، ساز ہے یہ، جام ہے یہ
تو جو شمشیر اٹھا لے تو بڑا کام ہے یہ

مجازؔ

دنیائے ادب

تازہ ترین رسائل کے اہم مضامین

کا تذکرہ اور جائزہ

نیا ادب اور کلیم (سہ ماہی مختتمہ مارچ)

نئے ادب میں غزل کی جگہہ۔ پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق نے اس مضمون میں اردو غزل کے ماضی، حال اور مستقبل پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی ہے اور اگرچہ یہ نگاہ کہیں کہیں غلط انداز بھی ہوگئی ہے لیکن بحیثیت مجموعی اُن کے افکار خیال انگیز ہیں۔ فراق صاحب جو کچھ درحقیقت کہنا چاہتے ہیں یعنی یہ کہ ہمارے آئندہ ادب میں غزل کا انداز کیا ہوگا۔ اسے کہنے کے لئے انہوں نے مضمون کا دو تہائی حصہ اس بحث میں صرف کر دیا ہے کہ موجودہ غزل نے کن کن تبدیلیوں میں سے گذر کر موجودہ صورت اختیار کی۔ کیا اچھا ہوتا اگر صاحبِ مضمون ہر دور یا ہر اسکول کا علٰحدہ علٰحدہ ذکر کر کے اُس کے ممتاز شعراء کی غزلیات کے نمونے بھی ساتھ ساتھ پیش کرتے اور پھر ان کا مقابلہ نئے ادب کی تخلیقات سے کر کے مطالب کو آئینہ کر دیتے۔ ہمیں افسوس ہے کہ فراق صاحب نے ایسا نہیں کیا ورنہ اُن کا مضمون عام ناظرین کے لئے بہت زیادہ پُرمطلب اور دلچسپ ہو جاتا۔

وہ مضمون کا آغاز اپنے بچپن کے تاثرات سے کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ آج سے تیس سال پہلے (کم از کم لکھنؤ کے اطراف میں) اس قسم کے اشعار کا چرچا تھا ؎

نہیں بچتا دلِ پُر داغ اُس کی زلفِ پیچاں سے
یہ وہ ناگن ہے جو طاؤس کو اُڈار کے ڈستی ہے

یا ؎ جب تلک تھے تم کشیدہ دل تھا شکووں سے بھرا
تم گلے سے لگ گئے سارا گلہ جاتا رہا

اگرچہ حالی اور ان کے انداز میں لکھنے والے چند اور شعراء بھی غزلیں کہہ رہے تھے لیکن "نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ چونچلوں کے سامنے اصلی حسن کی کب چلتی ہے۔ حالانکہ امیر اور داغ ہی کے زمانے میں

اگر ایک طرف سارے ملک میں جہاں جہاں ہندوستانی بولی جاتی ہے، ہزاروں جوان اور بوڑھے وہی چوماچاٹی والی شاعری کر رہے تھے۔ اور وہ بھی بالکل جھوٹی اور بناوٹی تو دوسری طرف حالی، شیفتہ شاد عظیم آبادی، آسی غازی پوری اور کچھ لوگ بھی کم سے کم شاعری میں سچ تو بولتے تھے اور جہاں تک پریم اور سندرتا کا تعلق ہے اور کئی بار جہاں تک زندگی کے دوسرے معاملوں اور پہلوؤں کا سنبندھ ہے کچھ آپ بیتی اور کچھ جگ بیتی اپنی غزلوں میں ضرور کہتے تھے لیکن کنوئے میں بھنگ پڑی تھی۔ ہماری مجموعی ادبی زندگی کے دوسرے پہلوؤں کا کیا ذکر۔ پریم اور بھوگ بلاس سنجوگ۔ بیوگ کسی پہلو کی طرف نہ کان لگاتی تھی نہ آنکھ اٹھاتی تھی۔ اس زمانے میں غزل نام ہی پڑ گیا تھا جھوٹی اور بناوٹی باتوں کا۔ سچی بات کتنی ہی بھاؤ بھری رنگین اور رسیلی ہو لوگوں کے دل کو لگتی ہی نہیں اور سچی غزل غزل سمجھی ہی نہیں جاتی تھی۔"

اس اقتباس سے جہاں یہ پتہ چلتا ہے کہ صاحبِ مضمون کا غزل کے ناسخ اسکول کے متعلق کیا نظریہ ہے۔ وہاں یہ دلچسپ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ فراق ایسے شعراء بھی جن کی بلندیِ فکر غزل کی وسعتوں میں فارسی اور عربی کی بلاغت کو بھی خاطر میں نہیں لاتی، آج کل کے مخصوص حالات میں جب نثر لکھنے بیٹھتے ہیں تو کس تکلف سے تعلق کی جگہہ "سنبندھ" عیش و نشاط کی جگہہ بھوگ بلاس، اور وصال و فراق کی جگہہ سنجوگ بیوگ کے نامانوس الفاظ استعمال کرنے لگ جاتے ہیں۔ کچھ روز یہی عالم رہا تو ہمیں تعجب نہ ہوگا اگر فراق صاحب اپنے موجودہ تخلص کو بیوگ کے لفظ پر در شبہہ سے بدل لیں۔ خیر آگے چل کر وہ کہتے ہیں کہ دلی اسکول کے شاعروں میں شاہ حاتم اور مظہر جانجاناں سے لے کر داغ کے زمانے تک کے شعراء نے غزلوں میں عشقیہ زندگی

سے اس دور میں رونما ہوتے ہیں۔ وہ ایک بڑی چیز ہے اور نئی چیز ہے اردو غزل گوئی آج ..... نئی آزمائش اور نئی ڈسپلن، نئی بے چینی اور نئی شانتی، نئی مجبوریوں اور نئی آزادیوں، نئی خوشی اور نئے غم، نئی امید اور نئی ناامیدیوں، نئے دن اور نئی رات سے گذر رہی ہے اس دور کو ہم اردو غزل میں رومانیت کا نشاط ثانیہ (نشاۃ الثانیہ؟) کہہ سکتے ہیں ......"

اس کے بعد سوال کیا گیا ہے کہ آیا اس دور کی اردو غزلوں نے ہمارے خون میں روانی اور ہمارے دلوں میں دھڑکن پیدا کر کے ہماری زندگی یا کم از کم زندہ رہنے کی اہلیت کا ثبوت بہم پہنچایا ہے یا نہیں اور جواب اثبات میں دیا گیا ہے۔ کیا خوب لکھتے ہیں کہ

"اگر یہ سچ ہے کہ ہماری نئی زندگی کے انگڑائی لے کر اٹھنے کی ادائیں اس کی ہوشیاریاں اور جماہیاں اس دور کی اردو غزل میں موجود ہیں تو ہمارے نئے ادب میں بھی غزل کی ایک جگہ ہے یاد رہے کہ زندگی اور ادب میں کئی چیزیں آتش انقلاب بظاہر نہ ہوتے ہوئے بھی آلۂ انقلاب ہوتی ہیں کیونکہ اس تازگی، اس سرگرمی اس ابھار اور اس سنجیدگی اور جوش کی وہ حامل ہوتی ہیں جس کے بغیر ہمہ گیر انقلاب کا تصور ہم کر ہی نہیں سکتے۔ جس بیداری کا ثبوت اس دور کے ناولوں، افسانوں، نظموں اور ادب کی دوسری شکلوں میں ملتا ہے۔ اسی بیداری کا انداز اس دور کی غزل میں بھی ہم کو ملتا ہے۔ اس دور میں حسن اور عشق کی کہانی عیاشی نہیں ہے نہ زندگی کی کہانی تقدیر کا رونا ہے ۔

اٹھ کہ خورشید کا سامانِ سفر تازہ کریں
نفسِ سوختۂ شام و سحر تازہ کریں

یہ الفاظ ہیں اقبال کے جنہیں اس نے بالِ جبریل کے سرورق پر لکھا ہے"

زیرِ نظر مضمون کے مندرجہ بالا اقتباسات سے اس کی روح آشکار ہو جاتی ہے۔ فراق کا حسنِ بیان ان میں اپنی پوری آب و تاب سے موجود ہے اور انہوں نے غیر معمولی سلیقے سے اپنے مطالب کی وضاحت کی ہے۔ کاش کہ ان کا یہ انداز مضمون کے دوسرے حصوں میں بھی قائم رہ سکتا۔

یہاں سے آگے چل کر وہ یہ دعوے کرتے ہیں کہ رومانیت کا دور ۱۹۳۶ء میں ختم ہو گیا۔ اور واقعیت کے دور اور کلاسیکی دور نے سوا سو برس کے بعد نئی صورت میں جنم لیا۔ اس جنم کی سب سے بڑی علامت ملک کی سیاسیات میں اشتراکی خیالات کی نمود تھی اور صاحبِ مضمون اس نمود کو اردو ادب اور اس کی صنفِ غزل میں ایک دور رس انقلاب کا پیش خیمہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن بجز ایک شاعر کے انہیں ابھی تک اس انقلاب کا کوئی نقیب نظر نہیں آیا۔ یہ شاعر پنڈت آنند نرائن ملا ہیں جن کے غزلیہ کلام کو دورِ رومانیت اور دورِ واقعیت کی درمیانی کڑی قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن بقولِ فراق "آج حسرت موہانی اور ان کا ہم عمر گروہ یا ہم اور آپ کسی تیس پینتیس سال تک کے ایسے شخص کو نہیں جانتے جسے آنے والا بڑا غزل گو تسلیم کیا جائے۔"

اور پھر سوال کرتے ہیں۔

"تو کیا ہماری نئی زندگی اور نظم اور نثر کے ہمارے نئے ادب کے سرد اور گرم جھونکوں نے غزل کا چراغ ہمیشہ کے لئے گل کر دیا یا ہماری غزل گوئی ابھی رات کے پردوں میں چھپی ہوئی ہے اور ہماری نئی صبح وطن میں سات رنگ کے دکھ کی کرنوں کے ساتھ ایک رنگ غزل کے دکھ کی کرن کا بھی ہوگا!

نگاہوں میں فراق آثار ہیں صبحِ قیامت کے
لہو میں ڈوب کر آب پھوٹنے کو ہے کرن کوئی"

اور خود ہی جواب دیتے ہیں۔

"نہ جانے کیوں، لیکن یہ کہنے کو بھی چاہتا ہے کہ نئی زندگی اور نئے ادب میں غزل کا دور ملتوی ضرور ہو گیا ہے لیکن ختم نہیں ہوا اور کچھ زمانے کے بعد نئی شراب اور نئے پیمانوں کے ساتھ اور نئے انداز کے ساتھ یہ دور پھر شروع ہوگا۔"

ان کا کہنا ہے کہ ہمارے بڑے بڑے غزل گو جس ماحول سے متاثر ہوئے تھے وہ اب بدل چکا ہے۔ ہمارا سماج کامل طور پر اپنی تکمیل کو پہنچ رہا ہے اور اس نئے مستقبل میں معمولی اور سطحی غزل گوئی کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے "نئے زمانے کی غزل گوئی میں میر اور غالب سے بھی کام نہیں چلے گا۔ نہ آتش اور داغ سے کام نکلے گا اور نہ حسرت اور فانی سے" دست نادک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں!) فراق صاحب کا یہ دعوے اس وقت تک بے ثبوت رہے گا جب تک کہ کوئی شعلہ نوا ہمارے پارینہ متاع غزل کو اپنے سوزِ سخن سے آگ نہیں لگاتا۔ اور یہ ان کا اپنا قول ہے کہ وہ شعلہ نوا ابھی پیدا نہیں ہوا۔ نئی غزل کا معیار تو اسی وقت معلوم ہوگا جب اس معیار کی غزلیں ہمارے سامنے آئیں گی۔ اس وقت تک بقول صاحبِ مضمون ہمیں غزل کے موجودہ امکانات کی طرف متوجہ ہونا چاہئے۔ زندگی اور دنیا کے بے شمار راز ایسے ہیں جنہیں دنیا کا ادب ختم نہیں کر سکا ہے۔ پھر غزل کا دامن کیوں تنگ رہے وہ کہتے ہیں کہ

"انقلاب کے بعد ہماری نئی زندگی جس تہذیب کو قائم کرے گی اس سے انسان کو ایک نیا مزاج ملے گا۔ انسان کی آتما میں ایک نئی تھرتھراہٹ

اور نیا ٹھہراؤ پیدا ہوگا اور ہماری غزلوں میں اس تھرتھراہٹ اور
ٹھہراؤ کا ثبوت ملے گا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نئے زمانے کا غزل گو نئی دنیا اور نئے
ہندوستان میں رہ کر پرانے مشہور غزل گو شاعروں کے کلام سے مطلقاً
طور پر متاثر ہوتا ہوا آگے بڑھے گا۔ اور حسن و عشق، زندگی اور کائنات کی
کہانی وہاں سے چھیڑے گا جہاں اب تک کی غزلوں کے نغمے فضا
میں گونجتے ہوئے سکوتِ ابدی میں تھرتھرا رہے ہیں"۔

مگر غزل کے اس مہدی کا ظہور آخر کب ہوگا؟ صاحبِ مضمون اس بارے میں
ہمیں فقط اس قدر تسلی دیتے ہیں کہ دیر ہے اندھیر نہیں۔ ادب میں ہر صنف کی رفتار
یکساں نہیں رہتی کبھی کوچ ہے تو کبھی مقام۔ آج کل کارواں منزل میں ہے تب تک
آپ نئے ادب کی "بے" پکارتے رہیئے۔

فراق صاحب کا یہ قابلِ قدر مضمون ہمیں کچھ قبل از وقت معلوم ہوتا ہے۔ پرانی
بساط سمٹنے سے پہلے نئی آرائش کا کچھ سامان ہو جاتا تو ہم لوگ دیدۂ دل فرشِ راہ
کئے اُن نو بہارانِ ناز کے منتظر رہتے جن سے نئی شاعری کی محفلیں رونق پائیں
گی۔ مگر افسوس ہمارے جیتے جی اس کی امید نہیں۔

ہائے[1] وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا۔

ساقی (مارچ)

بھورہ۔ کچھ عرصے سے اردو میں حیوانات کے متعلق اچھے اچھے افسانے
شائع ہو رہے ہیں اور ہمارے افسانوی ادب میں جدید راہیں کھل رہی ہیں۔ ناظرینِ
ادبی دنیا اس قسم کا ایک بہت اچھا افسانہ "تماکو" گذشتہ سالنامے میں دیکھ چکے ہیں جسے
شاہد احمد صاحب مدیرِ ساقی نے انگریزی سے اردو میں کیا تھا۔ گذشتہ جولائی کے
دنیائے ادب میں ہم نے اسی قسم کی ایک اور دل آویز کہانی کا تذکرہ کیا تھا جو سید رفیق حسین
صاحب نے "بیرو" کے نام سے لکھی تھی۔ سید رفیق حسین نے جانوروں کی زندگی کو اپنا
مستقل موضوع بنا لیا ہے اور وہ اس انداز میں زبان کی ایک بڑی خدمت انجام
دے رہے ہیں۔

زیرِ نظر افسانہ سراج الدین احمد صاحب دہلوی کا نتیجۂ فکر ہے اور کہانیوں کی اس
مخصوص قسم میں ایک نہایت کامیاب اور قابلِ قدر اضافہ ہے۔ زبان و بیان کی خوبیوں
نے افسانے کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ پلاٹ سادہ لیکن بے حد دلچسپ اور خیال انگیز
ہے۔ پڑھنے والا اپنے آپ کو اُس بے زبان مخلوق کے نہایت قریب پاتا ہے جسے
اُس نے آج تک اپنے غور و فکر کا ایک لمحہ بھی عنایت نہیں کیا تھا۔ وہ کہانی پڑھتے پڑھتے
جابجا شدتِ تاثر سے تڑپ اٹھتا ہے اور اپنے کلیجے میں درد کی ایک عجیب و غریب
کسک محسوس کرتا ہے۔ ایسی جس سے آج تک اس کا پہلو ناآشنا تھا۔

بھورہ چمپا کی بھینس کا کٹرہ ہے جو غربت کے نازوں میں پلا اور اپنی مختصر
زندگی کے دُکھ اٹھا اٹھا کر اُس بہیمیت کی نذر ہو گیا جسے دولت مندی اور حکومت جنم دیتی
ہے۔ انسان اس زندگی اور اس کی گوناگوں کیفیتوں۔ اس کے احساسات کو صرف اپنی
نوع کے لئے مخصوص سمجھتا ہے۔ اور نوعِ حیوانات کو ہر قسم کے جذبات و احساسات
سے عاری۔ افسانۂ زیرِ نظر میں اس سنگ دلانہ نظریے کی نہایت معقول اور موثر تردید
کی گئی ہے۔ بھورے کی پیدائش کا بیان نہایت دلچسپ اور زبان کی لطافتوں سے
معمور ہے۔ بوڑھی چمپا اور اس کی ہمسائیوں نے اس نومولود کا استقبال جس انداز سے
کیا وہ دیکھنے کے قابل ہے:۔

"انارکلی، ہردئی اور دوسری پڑوسنیں چمپا کی خوشی میں شریک ہوگئیں۔ گویا
چمپا کی نہیں انہی کی بھینس بیائی تھی۔ "اری بہنا! میں تو پوچھوں ہوں اگ
کٹرہ ڈالا کہ کٹری" رتمو نے داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔
"دِکھانہ ابھی تو" چمپا نے جواب دیا اور انارو سے کہا "اری گھر گھسی اٹھا کے
دیکھے نہ ہے، انا کٹرہ ہے کٹری"
"بھورا ہے بھورا" انارو نے نومولود کو اٹھاتے ہوئے کہا۔ "ہے تیرا ناس
جائے"۔ "انارو بولی کٹرہ ڈالا ہے" نخصمی نے کٹرہ" اس اعلان نے چمپا کی خوشی
میں کمی کر دی۔ کیونکہ کٹیا کی قیمت بہ نسبت کٹرہ کے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ مگر
زچہ پر اس ریمارک کا کوئی اثر نہ ہوا۔
"اری چمپا او بہری پٹ" انارو نے بڑھیا کو جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ "اری
سنے نہ ہے۔ اری موکا برتن لادے پیوسی نکال دوں۔ ہم تو باٹ دیکھ رہے
تھے کہ تیری بھینس بیائے پرے تو ہم پیوسی کھائیں"۔
"مجھے بھی دیجو" ہردئی نے چیخ کر کہا۔
"ہے گھر گھسی۔ مجھے نہ دے گی تنک سی" رتمو نے پکار کر کہا۔
اتنے میں گاؤں کے بنئے کا بیٹا موتی بڑی سی ٹوکنی لئے داخل ہوا۔
"ہے بڈی! او بہری!! بالو نے کہا ہے مہورت نہ بگاڑیو سب سے
پہلے ہمیں پیوسی دیجو"
بڑھیا کا بشاش چہرہ بنئے کے خیال سے اپنی اصلی حالت پر آگیا۔

بھینس کے دودھ کی حیات افزا اور جان بخش دھاروں کا اثر بھورے
پر کم ہوا اور سرجو بنئے پر زیادہ۔ بھورے کو دودھ ہی کتنا ملتا تھا گنتی
کی دھاریں، اگر وہ کٹیا ہوتا تو شاید امید فردا پر بڑھیا اس کو اپنی
ماں کے تھنوں سے پندرہ بیس روح افزا دھاریں اور پی لینے

[1] غالب کی روح سے معذرت کے ساتھ!

دیتی، مگر بھورے کا سب سے بڑا جرم یہ تھا کہ قدرت نے اسے نر پیدا کیا تھا اور ایسے نروں کی سماج کو بہت کم ضرورت تھی۔ تاہم بھورا کچھ تو ماں کے دودھ سے اور کچھ محض اس کی آس امید میں پلتا بڑھتا رہا، پٹتا کٹتا رہا اور خوب گھسیٹا جاتا۔ ایسا کہ گلا گھٹ کر رہ جاتا۔ اس کے سپرد بس ایک ہی خدمت تھی۔ صبح وشام اپنی ماں کو ہونک مار مار کے اور دُم ہلا ہلا کر پواسنا۔ اور جب ماں پواسی جاتی تو اس کو کھینچ کر گھسیٹ کر کھونٹے سے باندھ دیا جاتا ....!

اور پھر بھورے کا بچپن یوں بسر ہوتا ہے:۔

"یہ بہت تلملاتا زور لگاتا اور دیکھتا کہ تاکہ دودھ کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیا گیا۔ دودھ نکال لینے کے بعد اس لغو خیال کے ماتحت کہ ماں بچے کے لئے دودھ چڑھا کر اور چرا کر کسی خاص جگہ بچا رکھتی ہو بھورے کو ایک دفعہ پھر چھوڑ دیا جاتا۔ مگر اب ان خالی چار سونتے ہوئے تھنوں کو خواہ مخواہ مچوانا ماں کو ناگوار گزرتا اور وہ لات مار کر اپنے چاہتے بیٹے کو ہٹا دیتی۔ بھورے کو ماں کی آغوش سے کھینچکر دُور کھونٹے سے باندھ دیا جاتا جہاں وہ نہایت مایوسی سے نڈھال پڑا دوسرے وقت کا انتظار کیا کرتا۔ کسی مسخرے نے کٹرے کو ایسی ہی مایوسی میں پڑا دیکھ کر پوچھا کہ کہو میاں کٹرے کیا حال ہے؟ کٹرے نے اپنی چیپڑ بھری آنکھوں کی اپنے لمبے لمبے کانوں سے مکھیاں اڑاتے ہوئے کہا "بھیا ہم فاقہ کشتوں کا کیا حال پوچھتے ہے۔ ہم بھوک کے ماروں کا بس اتنا فسانہ ہے۔

ہم اس کی بھینس پواس دے ہیں وہ ہمیں پولی میں پڑا رہنے دے ہے"

دراصل اس ناداں کو معلوم ہی نہ تھا کہ بھینس کو پواسنا اور پولی میں پڑا رہنا اس کی زندگی کا بہترین دور ہے۔ کھونٹے کی بندش سے لاچار اور بھوک کی حالت میں پولی جیسی محفوظ جگہ میں مایوسانہ طور پر اپنی ماں کے دودھ بھرے زم زم گداز اور چکنے تھنوں کو تکتے رہنا آئندہ آنے والی مصیبتوں کے مقابلے میں واقعی زندگی کا زریں دور ہے"!

آپ نے دیکھا! صاحبِ افسانہ نے ایک نہایت پیش پا افتادہ اور روز مرہ نظر آنے والے معمول کو کیسی چابک دستی سے کریدا ہے ایک آرٹسٹ کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ وہ بظاہر نہایت معمولی اور بے رنگ چیزوں میں اپنے فن کے اعجاز سے ایک نئی روح، ایک جدید معانی اور اچھوتی زندگی داخل کر دیتا ہے۔ اور وہی مردہ موضوع جس کی طرف ہماری توجہ پہلے کبھی مائل نہیں ہوئی تھی۔ اب ایک حقیقتِ عظمٰے بن کر ہمارے رگ دپے میں سما جاتا ہے اور ہمیں زندگی کے نئے معنوں سے آشنا کر دیتا ہے۔ ہمارے مردہ احساسات از سرِ نو بیدار ہو جاتے ہیں اور غفلت کے موٹے موٹے پردے ہماری آنکھوں کے سامنے سے ایک ایک کر کے ہٹنا شروع ہو جاتے ہیں تا آنکہ ہم زندگی کو فن کار کی آنکھوں سے دیکھنے لگ جاتے ہیں اور اس کا درد ہمارا درد اور اُس کا احساس ہمارا احساس بن جاتا ہے۔

اب بھورے کی زندگی کا کٹھن دور شروع ہوتا ہے۔ وزارت کے ایک رکن کو شیر کے شکار کی سوجھتی ہے۔ باپ نہ ماری پدڑی بیٹا تیر انداز۔ لیکن حکومت کی گدی ملی تو حکومت کے لوازم کا مہیا ہونا بے حد ضروری تھا۔ مچان، ہانکا اور کٹرے شیر کے شکار کے ارکانِ ثلاثہ ٹھہرے۔ داروغہ جی کی وساطت سے منی لال سپاہی برائے نام قیمت پر آٹھ کٹروں کی فراہمی پر مقرر ہوا اور اسے تاکید کی گئی ایک ایک کٹرہ خاص طور پر چھوٹا ہو تاکہ:۔

"جنگل میں باندھنے سے خوب رمبنکے اور شیر اس کی آواز پر لپک پڑے۔ منی لال کو سات عدد کٹرے ڈیڑھ دو سال کی عمر کے مل گئے مگر کم عمر کٹرے کو حاصل کرنے میں اس کی دھونس ابھی تک کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ جوئندہ یابندہ آخرکار منی لال ڈھونڈتے بھالتے عیسٰی پور بھی جا نکلے، جہاں بوڑھی چمپا کی لاڈلی بھینس کا اکلوتا بھورا اپنی ماں کے سایہ عاطفت میں پل رہا تھا عیسٰی پوریوں بھی افلاس زدہ قصبہ تھا اور پھر لاوارث چمپا کی حمایت کر کے کون مفت میں پولیس کے مگرمچھ سے بیر باندھتا۔ البتہ چمپا کو روتے اور پچھاڑیں کھاتے دیکھ کر سب ہی دل میں کڑھ رہے تھے۔ منی لال نے ایک پرچے پر بھورے کا حلیہ لکھا۔ "ایک کٹرہ نام بھورا، ولد بیجو ذات بھینس، عمر سات ماہ، پیشہ پولی میں کھڑا رہنا، ساکن قصبہ عیسٰی پور علاقہ ہذا بہ قیمت پانچ روپے مسماۃ چمپا بیوہ پھڈو نے بدست منی لال نائک فروخت کیا۔ قیمت وصول پائی" بڑھیا کا نشان انگوٹھا لیا، گانٹھ سے تین روپے اور منہ سے دس گالیاں نکال کر بڑھیا کو دے بھورے کو کھول کھال مارتا پیٹتا ہانک چلا"!

بھورے تو اُدھر روانہ ہوئے اور اِدھر بڑھیا پچھاڑ کھا کر گری۔ مگر اس کی کون سنتا تھا بھینس بھی رسا تڑا کر بھاگی اور کٹرے کے ساتھ ساتھ ہوئی مگر منی لال نے بھینس کی وہ کٹائی کی کہ اُس کا منہ پھیر دیا اور گاؤں والے اسے مارتے پیٹتے واپس لے آئے۔

"نتیجے کا بیان تک ہٹرکا کیا کہ ہتھنی سی بھینس گھُل کر نرا ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گئی بڑھیا کے دل پر بھینس کے گھلنے کا اور بیٹے کے بڑھتے ہوئے سود کی فرقی کا جس میں بھینس قرق کر لی گئی تھی کچھ ایسا دھکا ہوا کہ دل کی حرکت بند

ہو جانے سے مسلسل نصف صدی کی صعوبتوں کا خاتمہ ہوا۔ بہت جلد اُس کی لاڈلی بھی جس کو اُس نے مثل اولاد کے پالا تھا بڑھیا سے ایک اور ہی دنیا میں جا ملی۔ ایسی دنیا میں جہاں نہ جور و استبداد کی منسٹری تھی، نہ ظالم پولیس کی دھونس اور نہ بر جو جیسے خون آشام وحشی درندے۔"

منی لال بھورے کو چکدار سنٹی سے مارتے پیٹتے تھانے لے گئے اور وہاں سے دوسرے دن سات اور بڑے کٹڑوں کے ساتھ ان کا چالان جنگل کی طرف کر دیا گیا، جہاں وزیر صاحب بہادر اگلے دن شیر کا شکار کھیلنے والے تھے۔ ان کے کوچ کا نظارہ بہت دلچسپ ہے ایک جھلک دیکھئے۔

"آخر یہ کٹڑے بھی بھینس کے پوت تھے۔ بہت جلد تھک گئے اور لگے بغلیں جھانکنے اور کچھ اِدھر اُدھر کا سبزہ بھی اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ مگر چتیا اور فتیا دائیں بائیں فرشتوں کی طرح تعینات تھے۔ بڑھ کر تھوتھڑے پر ایسا لٹھ دیتے کہ منہ پھر جاتا۔ یوں بھی اچھے خاصے چلتے چلاتوں کی خواہ مخواہ پٹائی ہوتی جا رہی تھی۔ صرف اس لئے کہ وہ تیز گام نہ تھے۔ ... کٹڑوں کو مار مار کر انہوں نے سچ مچ کھال اڑا دی۔ سب سے زیادہ مار اس غریب بھورے پر پڑی کیونکہ ان میں سب سے یہی چھوٹا تھا اور بہت چھوٹا اس لئے اس کا قدم بھی چھوٹا تھا۔ اور سب سے پیچھے ٹہنے کے لئے رہ رہ جاتا تھا۔ ٹھائیں سے کولھے کی ہڈی پر لکڑی پڑی۔"

غرض اس انداز میں چلے جا رہے تھے۔ رات کو ایک گاؤں میں مقام ہوا۔ مگر کھانے کے نام سے ایک تنکا نہ ملا۔ دوسرے دن پھر کوچ اور پہلے سے بڑھ کر بدسلوکی شام مقتل پر جا ہی پہنچے۔ دوسرے کٹڑوں کی کہانی سے ہمیں واسطہ نہیں۔ بے چارے ایک ایک کر کے شیر کا لقمہ بنے۔ بھورے کو بڑے صاحب کے مچان کے نیچے باندھا گیا تھا مگر وہ دو دن لیٹ ہو گئے اور بھورے کی زندگی بھی بقدر اس میعاد کے بڑھ گئی۔

"جب یہ لوگ مچان پر بیٹھ گئے تو ایک قلی بھورے کو کھینچتا اور دوسرا لیول پر سنٹیاں اڑاتا لایا۔ ... تنہا رہ جانے پر بھورے نے بھاگنا چاہا اور گرا جو ہے تو تھوتھنی اس زور سے پتھر پر لگی کہ منہ میں دانت ہوتے تو قطعی ٹوٹ گئے ہوتے۔ اس کو معلوم ہی نہ تھا کہ گردن کے علاوہ پیر بھی باندھ دیا جاتا ہے۔ تنہائی سے گھبرا کر اُس نے وحشت سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اپنی بساط سے زیادہ زور لگایا گھومنے سے رسّا بل کھا کر اور بھی چھوٹا ہو گیا۔ بھورے کو پہلی بار قیدِ تنہائی ہوئی تھی۔ ... جس طرف چمار چلے گئے تھے اس طرف یہ بھی جانا چاہتا تھا اُسی طرف مُنہ اٹھا کر اور کان تھوتھنی کی طرف بڑھا کر رہنکنا شروع کیا اور جواب کا متوقع بھی رہا۔ اتنے میں بڑے صاحب جو انجینیر صاحب کے ساتھ دم بخود بیٹھے تھے کھانسی کو ضبط نہ کر سکے۔ بس پھر کیا تھا کٹڑے نے مچان پر آدمیوں کو دیکھ لیا۔ اس کی وحشت دور ہو گئی اور رہنکنا بند کر دیا۔ انجینیر صاحب کو بڑے صاحب پر نہیں بلکہ کٹڑے کی خاموشی پر بہت غصہ آیا۔ انہوں نے سیٹی دی۔ چماروں کے آنے پر ان کو حکم دیا کہ کٹڑے کا کان چاقو سے پھاڑ دو اور اس میں مرچ بھر دو۔ یہ کمبخت رہنکتا نہیں۔ حکم پورا کیا گیا۔ ترکیب لاجواب تھی۔ بھورا پوری طرح ڈکرایا اور مسلسل ڈکراتا رہا۔ شیر نے دور پہاڑ پر سے بھورے کی آواز سنی اور لپکا۔"

اب ہمیں شیر کے آنے اور بڑے صاحب کے گھبرا کر فارغ ہو جانے سے غرض نہیں۔ اگرچہ یہ بیان بجائے خود بہت دلچسپ ہے۔ شیر انسان کی آہٹ پا کر واپس چلا گیا۔ صاحب بہادر بنگلے کو چلے گئے جہاں سردی سے حفاظت کے لئے دھڑا دھڑ آگ جل رہی تھی۔ بھورے کو وہیں بندھا رہنے دیا گیا کہ شیر مارے۔ مگر شیر کہاں! دوسرے دن صبح کو

بھورے زندہ تھے مگر مردوں سے بدتر۔ ہاتھ پیر اس درجہ اکڑ گئے تھے کہ چماروں نے اٹھانے کی بہتیری کوشش کی اور خود کٹڑے نے بھی، مگر ہاتھ پیروں میں سکت ہی باقی نہ تھی۔ رات بھر کی بھوک شدید سردی، ڈر، خوف اور کان کی تکلیف سے بھورا آدھا رہ گیا۔ چماروں کا مشورہ یہی ہوا کہ چونکہ گذشتہ شب شیر ادھر سے نہیں نکلا اس لئے آج رات ضرور آئے گا اور بھورے کو یہاں ہی بندھا رہنے دو۔ آج ضرور مارے گا۔ ایک چمار کو رحم آیا اُس نے کٹڑے کو اور اس کی سات پشتوں کو گالیاں دیں اور اس کے حق میں دعائے خیر کی کہ آج رات شیر تجھے کھا جائے اور تھوڑے سے روہنی کے پتے توڑ کر اس کے آگے ڈال دیئے۔ رات کو زور کرنے کی وجہ سے بھورے کا اگلا پیر بہت سوج گیا تھا اور اس شدت کا درد تھا کہ اس کی جان نکلی جاتی تھی۔ اپنی ماں کی آغوش اور بوبی کے امن کو یاد کر کے وہ کس بری طرح رو رہا تھا۔ مگر چشم ظاہر سے نہیں۔ اس کی آتما رو رہی تھی۔"

دوسرے کٹڑے مارے گئے بھورا شیر کے انتظار میں ابھی زندہ تھا کہ ناگاہ بڑے صاحب شکار سے واپس ہوئے۔ اب کسے جلدی پڑی تھی کہ بھورے کی خبر لیتا۔

دوپہر کی دھوپ سے اس میں جان سی پڑ گئی تھی۔ ایک کروٹ پڑے پڑے پتھر اس کے جسم میں گڑ گئے تھے۔ وہ اس مریض کی طرح اٹھا جو مرنے

سے چند گھنٹے قبل سنبھالا لیتا ہے۔ پیاس سے بے چین، آنکھوں کے سامنے ترنم سے بہتا ہوا پانی اس کی پیاس کو اور بھی بھڑکا رہا تھا۔ کتّے نے اپنے متورم پیر سے جو پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ ناحق زور کر کے اپنے دکھ میں اضافہ کیا اور آخر کار بےبس ہو کر رہنی کے پتوں پر حسرت و یاس کے عالم میں دھڑ سے گر پڑا ......

آفتاب انسانی جور و ظلم پر خون کے آنسو رو چکا تھا جنگلی مرغ پیڑ دل میں پہنچ کر اپنے پر پھڑپھڑا کر رات کا خیر مقدم کر رہے تھے ......

اندھیرا امنڈ گھمنڈ کر چھا رہا تھا۔ تاریکی بلا کی بھیانک تاریکی، ایسی تاریکی جس میں کائنات جذب ہو کر رہ گئی ہو۔ اس تاریکی سے رات کا سانس پھول رہا تھا...... کبھی کبھی مینڈک کی غڑاپ اور سنگ ریزوں کا گنگناتے ہوئے چشمے میں ترنم پیدا کرنا رات کے سیاہ سناٹے میں لہر سی پیدا کر دیتا ...... اس خوفناک ماحول میں پابستہ بھورا اب بھی زندہ تھا۔ مگر اس کے ہوش و حواس زائل ہو چکے تھے۔ شبیر اس کے پاس سے گذرا۔ بھورے کی بو نے شبیر کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ شبیر نے دیکھا کہ سوکھا سہا، بھوکا پیاسا، جاڑے پالے کا مارا، ہڈیوں کی پوٹ بہت ہی بےبسی اور بےکسی کی حالت میں دم توڑ رہا ہے۔ وہ کتّے کی طرف منہ کر کے بیٹھ گیا۔ بلا یک کتّے میں جنبش ہوئی۔ اکڑے ہوئے ہاتھ پیر از خود پھیل گئے۔ گردن کھنچ گئی۔ منہ میں کف بھر گئے۔ خفیف سی ڈکرانے کی آواز نکلی۔ جسم کے بال کھڑے ہوئے اور پھر پڑ گئے۔ روئیں روئیں کی جان نکل گئی۔ شبیر بھورے کی لاش کے پاس بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا"!

انجام! کس قدر حسرت ناک انجام! زبان کی نزاکتوں سے صاحب افسانہ کی حیرت انگیز آگاہی اور ان کے بیان کی غیر معمولی لطافت افسانہ کی سب سے ممتاز خصوصیات ہیں۔ انسان کی مجرمانہ عیاشیاں اور اس سے محض ایک درجہ کم رکھنے والی مخلوق کی حیرت انگیز قربانیاں شاید ایسی خوبی سے بہت کم بیان کی گئی ہیں مگر اس بلند پایہ افسانہ میں ہمیں کہیں کہیں ایک کمزوری بھی کھٹکی اور وہ صاحب افسانہ کا فلسفیانہ اور واعظانہ انداز تفکر ہے جس کا اظہار کہانی میں دو تین جگہ بے ضرورت کیا گیا ہے۔ مثلاً ایک اُس جگہ جہاں جانوروں کے دودھ پر انسان کے ناجائز تصرف کا ذکر ہے۔ اور پھر آخر میں جہاں شبیر ایک فلاسفر کی طرح انسان کے اعمال اور کردار کا جائزہ لیتا ہے یہ اور اس قسم کا ایک آدھ اور ٹکڑا اگر اس افسانے سے خارج کر دیا جائے تو افسانے کی ٹکنیک سے ایک بڑی خامی دور ہو جائے گی۔ افسانہ نگار کا فرض صرف حقیقت کو پیش کرنا ہے۔ اس سے نتائج اخذ کرنا نہیں۔ یہ نقص ایک اچھے افسانے کو اس کی بلند فنی سطح سے گرا کر اخلاقی پروپیگنڈے کی پستیوں تک لے آتا ہے۔ اور ہمارے نزدیک یہ ایک بہت بڑی کمزوری ہے۔ ہمیں امید ہے کہ سراج الدین احمد صاحب اپنے آیندہ افسانوں میں زیادہ احتیاط سے کام لیں گے۔

صلاح الدین احمد

نقد و نظر

آہنگ ملک کے نوجوان شاعر جناب اسرار الحق مجاز کا پہلا مجموعہ کلام ہے جسے ترقی پسند مصنفین کے سلسلے میں حلقۂ ادب لکھنؤ نے شائع کیا ہے۔ یہ ۲۲×۲۹/۱۶ کی تقطیع پر ۱۰۴ صفحے کی ایک مختصر سی جاذب نظر کتاب ہے۔ جس کے شروع میں "زیبِ داستان" کے عنوان سے جناب سجاد ظہیر نے ایک مختصر تعارف لکھا ہے۔ جس میں اُنہوں نے انقلابی شاعری اور ترقی پسند ادب کے متعلق اظہار خیال کیا ہے۔ اور آخر میں چند سطروں میں مجاز کو ایک انقلابی شاعر کہا ہے۔ لیکن "انقلابی" کے مفہوم کی جو وضاحت اُنھوں نے کی ہے اُس کے لحاظ سے میرے خیال میں مجاز انقلابی شاعر نہیں ہے کم سے کم اُس کا یہ مجموعۂ کلام تو یہی ظاہر کرتا ہے کہ وہ اسی جذبۂ جنسی کے کرشموں کا اظہار اپنے کلام میں کرتا ہے جس کی طرف آج تک ہر اچھے شاعر کی توجہ ہوتی رہی ہے۔ (اور مجاز ایک اچھا شاعر ہے)

تمام مجموعے میں صرف چھ یا سات نظمیں ایسی ہیں جنھیں اس مفہوم کے لحاظ سے انقلابی کہا جا سکتا ہے جس کا تعین جناب سجاد ظہیر نے کیا ہے۔

سب سے پہلے تو انتساب ہی اس اشارے کا حامل نظر آتا ہے کہ مجاز کی شاعری عشقیہ جذبات کی مرہونِ منت ہوگی کیونکہ اس کے تین مختصر لفظ یہ ہیں "کسی کے نام" اس کے بعد تعارف (زیب داستاں) ہے اور پھر مجاز کا ایک اپنا شعر ـــــ دیکھ شمشیر ہے یہ، ساز ہے یہ، جام ہے یہ

تو جو شمشیر اُٹھالے تو بڑا کام ہے یہ

لیکن اس مجموعے کے مطالعے سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ شاعر نے شمشیر کو نظر انداز کر کے ساز اور جام کی طرف توجہ کی ہے اور یوں اگرچہ اپنی نظروں میں "بڑا کام" نہیں کیا لیکن میری نظروں میں اُس کا یہ کام بھی بڑا ہی ہے کیونکہ اُس کی طبیعت کا بنیادی اور پروپاگنڈا سے بری رجحان ساز اور جام ہی کی طرف ہے بلکہ ساز اور جام کی محفل میں "رونق محفل" کی جنسی حیثیت اُس کی ذہانت کا مرکز ہے۔

تعارف کے عنوان سے مجاز نے سب سے پہلے اُنہیں شعر درج کئے ہیں اور میرے خیال میں یہ منظوم تعارف پہلے منثور تعارف سے کہیں زیادہ صحیح ہے۔

خوب پہچان لو اسرار ہوں میں ۔۔۔ جنسِ الفت کا طلبگار ہوں میں

عشق ہی عشق ہے دنیا میری ۔۔۔ فتنۂ عقل سے بیزار ہوں میں

اہلِ دنیا کے لئے ننگ سہی ۔۔۔ رونق انجمنِ یار ہوں میں

اور آخری دو شعر ہیں۔

محفلِ دہر پہ طاری ہے جمود ۔۔۔ اور وارفتۂ رفتار ہوں میں

اِک لپکتا ہوا شعلہ ہوں میں ۔۔۔ ایک چلتی ہوئی تلوار ہوں میں

ممکن ہے کہ ان آخری شعروں سے جناب سجاد ظہیر کو دھوکا ہوا ہو کہ مجاز کی شاعری انقلابی شاعری ہے لیکن شاید اُنہوں نے ان اشعار کو اُس کے کلام پر پوری طرح منطبق کر کے نہیں دیکھا۔ مجاز کی شاعری میں (اُس وقت بھی جب کہ وہ غزلیہ باتیں ہی کہہ رہا ہوتا ہے)، ایک ایسی تڑپ اور جوانی کا ایک ایسا اُبھار ہے کہ اُس پر ایک ہنگامے کا دھوکا ہوتا ہے اور یہ ہنگامہ محفل دہر کی حرکت کو اپنی تیز تر حرکت سے ایک جمود ہی بنا کر رکھ دیتا ہے۔ لیکن یہ حرکت یا ہنگامہ کسی پروپاگنڈے کا ہنگامہ نہیں، یہ مجاز کی انفرادیت کا ہنگامہ ہے۔

دوسری نظم کے دو عنوان ہیں۔ "نذرِ دل اور اُن کے نام"۔ یہ نظم بھی داخلی عشقیہ جذبات کی ترجمان ہے۔ ایک شعر ہے۔

دفن کر سکتا ہوں سینے میں تمہارے راز کو ۔۔۔ اور تم چاہو تو افسانہ بنا سکتا ہوں میں

اور اس سے بعد کی نظم میں جس کا عنوان ہے "کس سے محبت ہے؟"

ـــــ مجاز اس راز کو افسانہ بنانے پر بھی تُلا نظر آتا ہے لیکن پہلی نظم سے جو خیال پیدا ہوتا ہے کہ مجاز کی مرکز نظر کوئی خاص ہستی ہے اُسے اس نظم سے تقویت ملتی ہے۔ شاید اُس کے سامنے عورت کا ایک آدرشی نقشہ ہے جس کے رنگ اُس کی آسودہ ذہانت سے اُبھرے ہیں۔ اس نظم کی عورت دنیا کی عام عورتوں سے بہت مختلف ہے کیونکہ اُس کے ؎

لبِ لعلیں پہ لالی ہے نہ رخساروں پہ غازہ ہے

جبینِ نور افشاں پر نہ جھومر ہے نہ ٹیکا ہے

جوانی ہے سہاگ اُس کا تبسم اُس کا گہنا ہے!

نہیں آلودۂ ظلمت سحر داماںیاں اُس کی

اور اس کے بعد آخری بند میں تو اس آدرشی عورت کی پوری وضاحت ہو جاتی ہے ؎

کوئی اُس بارگاہِ ناز تک جا ہی نہیں سکتا !
کوئی اُس کے لبِ شیریں کی مے پا ہی نہیں سکتا
کوئی اُس کے جنوں کا زمزمہ گا ہی نہیں سکتا
جھلکتی ہیں مرے اشعار میں جولانیاں اُس کی

حقیقت میں اس قسم کی آدرشی عورتوں کو صنبیت سے تعلق نہیں ہوتا شاعر کے تصور میں صرف اُن کی ایسی خوبیوں ہی کا اجتماع ایک نفسی کیفیت کی صورت میں موجود ہوتا ہے جن کی حیثیت یکسر مادی نہیں ہوتی اور یکسر تخیلی بھی نہیں ہوتی۔ روس کے شاعر الگزانڈر بلاخ کی بھی ایسی ہی ایک خیالی عورت ہے اور اُسی پر کیا موقوف، ہر شاعر کے ذہن میں خواہ ابتداءً اُسے تحریکِ شعری کسی مادی ہستی سے ہو، رفتہ رفتہ وہ عورت ایک خیالی درجہ حاصل کر لیتی ہے اور فراق کی صورت میں تو یہ نفسی عمل بہت جلد نشو و نما پا کر پختہ ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد "آج کی رات" "مجبوریاں" اور "ایک غم گین یاد" بھی اسی قسم کی داخلی نظمیں ہیں۔ ان کے بعد شاعر خارجی اندازِ بیان اختیار کرتا ہے۔ "اصنامِ نمائش" مجاز کی ایک قابلِ ذکر نظم ہے۔ اس کا قصہ زندگی کا ایک عام منظر ہے۔ آج کل کے نمائشی زمانے میں نمائش کس نے نہیں دیکھی۔ لیکن ایسی نظم کم لوگوں نے لکھی ہوگی جس منظر سے اس نظم کی تحریک شاعر کو ہوئی ہے اُس کی تخصیص کچھ نمائش ہی کے ساتھ نہیں ہے۔ ایسے ذہانت کو متحرک کرنے والے مناظر آج کل کی مغربی انداز کی زندگی میں ہر جگہ نظر آ سکتے ہیں لیکن ہر شخص میں تحریک لینے والی ذہانت کا فقدان ہے۔ مجاز کے حواسِ باصرہ اور شامہ کی پختگی کی دلیل بھی اس نظم میں موجود ہے۔ نظم شروع ہوتی ہے۔

وہ کچھ دوشیزگانِ ناز پرور ! کھڑی ہیں اک بساطی کی دُکاں پر
سنہرا کام رنگیں ساریوں پر بساطِ آسماں پر ماہ واختر
وہ خوشبو آ رہی ہے پیرہن سے فضا ہے دُور تک جس سے معطر

اور ان اشعار کی پاکیزگی قابلِ توجہ ہے۔ اگرچہ ان کی تشبیہ بھی کچھ کم نہیں!

وہ محرابیں سی سینوں پر نمایاں فضائے نور میں کیوپڈ کے شہپر
نفس کی آمد و شد سے تلاطم شبِ مہتاب میں جیسے سمندر

اور ذیل کے اشعار سے شک گزرتا ہے کہ یہ "دوشیزگانِ ناز پرور" شاید کسی کالج کی طالبات ہیں ؎

کوئی آئینہ دارِ حسنِ فارس کسی میں حسنِ یونانی کے جوہر
کسی میں عکسِ معصومِ کلیسا کسی میں پرتوِ اصنامِ آذر
یہ شیریں ہے وہ نوشابہ ہے شاید نہیں یاں فرقِ فرہاد و سکندر

اور پھر نظر کا وہی گہرا مطالعہ

وہ جنبش سی ہوئی کچھ آنچلوں کو وہ لہریں سی اُٹھیں کچھ ساریوں پر

اور آخر میں

خرامِ ناز سے نغمے جگاتی ! وہ چل دیں ایک جانب مسکرا کر
کسی کی حسرتیں پامال کرتی کسی کی حسرتیں ہمراہ لے کر

اور

ادھر ہم نے بھی آہِ سرد کھینچی ہنسی پھر آ گئی اپنے کئے پر

یہ ہنسی شاید اس لئے آئی کہ بجنوری مرحوم کے الفاظ میں "مجھے کیا پتہ کہ ہے اب کہاں + تجھے کیا خبر گئی کس کی جاں" تک نوبت نہ پہنچے۔

اس کے بعد کی نظم "نورا" ایک مثنوی ہے لیکن اس مثنوی میں جدید رنگوں کی جھلک ہر جگہ موجود ہے۔ یہ مثنوی ایک نرس کی چارہ گری سے متعلق ہے لیکن یہ چارہ گری محض جذباتی ہے۔ اس میں کوئی ایسی تلخی شامل نہیں جس کا احساس تجربہ کار حضرات کو نرسوں کے سلسلے میں ضرور ہوا ہوگا۔ آخری شعر جس میں ہسپتال سے اخراج کے بعد کا بیان ہے اور جسے شاعر کے نقطۂ نظر سے خلد سے اخراج بھی کہا جا سکتا ہے، بہت شوخ ہے

یہ پیغام آتے ہی رہتے ہیں اکثر
کہ کس روز آؤ گے بیمار ہو کر

اس کے بعد کی نظم "اربابِ نشاط" ہے۔ اس میں ایک ایسی محفل کا بیان ہے جہاں نسائی پیکروں کا ہجوم جذبات کے لئے وجہِ تسکین و اضطراب ہو رہا تھا اس نظم میں بھی مجاز کی شادابیِ کلام موجود ہے جس کے ثبوت میں صرف دو ایک مصرعے درج کرتا ہوں۔

چست پیراہن، نمایاں جسمِ سیمیں کی تراش
گیسوئے شبرنگ پیچ و خم میں افسانے لئے
آنچلوں کی سرسراہٹ زمزمے گاتی ہوئی

اس کے بعد "اُن کا جشنِ سالگرہ" "دلی سے واپسی" اور "طفلی کے خواب" بھی اچھی نظمیں ہیں لیکن "انقلابی" نہیں۔ آخری نظم میں بچے کی نفسیات کا اچھا مشاہدہ ہے۔ اس نظم کے آخری شعروں سے شاید کسی کو دھوکا ہو کہ وہ انقلابی (روسی) رنگ لئے ہوئے ہیں لیکن وہ دھوکا ہی ہوگا۔ نظم میں کہا جا رہا ہے کہ "طفلی میں آرزو تھی کسی دل میں ہم بھی ہوں" اور

اِک لشکرِ عظیم ہو مصروفِ کارزار!
لشکر کے پیش پیش مقابل میں ہم بھی ہوں
چمکے ہمارے ہاتھ میں بھی تیغِ آب دار
ہنگامِ جنگ نرغۂ باطل میں ہم بھی ہوں
قدموں پہ جن کے تاج ہیں اقلیمِ دہر کے
اُن چند کشتگانِ غمِ دل میں ہم بھی ہوں!

اِن اشعار میں بچپن کی اُن ہماتی رجحان والی امنگوں کا عکس ہے۔ جن کی بنا پر نفسیاتِ جدید کے ماہرین نے اذیت پرستی کو ملکیت ہی کی طرح بنیادی جذبہ قرار دیا ہے۔

"رات اور ریل" ایک بہت اچھی نظم ہے اور اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ تہذیبِ مغرب اور سائنس کے لوازم بھی اب ہمارے شاعروں کو اُسی زور د تأثر کے ساتھ تحریکِ شعری دینے لگ پڑے ہیں جیسے کبھی "گل و بلبل" بھڑکایا کرتے تھے۔ یہ نظم لمبی ہے لیکن مجازؔ کے فن کا اظہار کرنے کے لئے چند اشعار درج کئے بغیر مجھ سے نہ رہا جائے گا۔ نظم شروع ہوتی ہے۔

پھر چلی ہے ریل اسٹیشن سے لہراتی ہوئی   نیم شب کی خامشی میں زیرِ لب گاتی ہوئی
تیز جھونکوں میں وہ چھم چھم کا سرودِ دلنشیں   آندھیوں میں مینہ برسنے کی صدا آتی ہوئی
نازسے ہر موڑ پر کھاتی ہوئی سو پیچ و خم   اِک دلہن اپنی ادا سے آپ شرماتی ہوئی
رات کی تاریکیوں میں جھلملاتی، کانپتی   پٹڑیوں پر دور تک سیماب جھلکاتی ہوئی
منتشر کر کے فضا میں جا بجا چنگاریاں   دامنِ موجِ ہوا میں پھول برساتی ہوئی
سینۂ کہسار پر چڑھتی ہوئی بے اختیار   ایک ناگن جس طرح مستی میں لہراتی ہوئی
اِک ستارہ ٹوٹ کر جیسے رواں ہو عرش کر   رفعتِ کہسار سے میدان میں آتی ہوئی
ایک رخشِ بے عناں کی برق رفتاری کے ساتھ   خندقوں کو پھاندتی ٹیلوں سے کتراتی ہوئی
جستجو میں منزلِ مقصود کی مستانہ وار   اپنا سر دھنتی فضا میں بال بکھراتی ہوئی
آگے آگے جستجو آمیز نظریں ڈالتی   شب کے ہیبت ناک نظاروں سے گھبراتی ہوئی
ایک مجرم کی طرح سہمی ہوئی سمٹی ہوئی   ایک مفلس کی طرح سردی میں تھراتی ہوئی
زد میں کوئی چیز آ جائے تو اُس کو پیس کر   ارتقائے زندگی کے راز بتلاتی ہوئی
الغرض اُڑتی چلی جاتی ہے بے خوف و خطر   شاعرِ آتش نفس کا خون کھولاتی ہوئی

یہ صرف اس نظم کا انتخاب ہے لیکن اس سے بھی مجاز کے تشبیہ و استعارہ کی خوبیوں کا اندازہ آپ کو ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد کی نظموں کے واضح بیان کی اس جگہ گنجائش نہیں۔ البتہ سرسری طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ان چیزوں کے علاوہ جن کا بیان ہو چکا "مسافر، آوارہ، ننھی پجارن، پردہ اور عصمت اور بربطِ شکستہ" مجاز کے عام رنگ کی نظمیں ہیں۔ "نذرِ علی گڑھ، نذرِ خالدہ اور مزارِ رہنما" عقیدت کا اظہار کرتی ہیں۔ اور "ایک جلاوطن کی واپسی، اندھیری رات کا مسافر، ایک سفید پوش انگریز، انقلاب، سرمایہ داری، ہمارا جھنڈا اور غدار" —— یہ سات چیزیں انقلابی ہیں۔ آخر میں چھ غزلیں بھی "شوقِ گریزاں اور شکستِ ساز" کے عنوان سے دے رکھی ہیں۔ مختلف جگہوں پر تمام کتاب میں پھیلے ہوئے اشعار بھی ہیں۔ اس کتاب کی قیمت ایک روپیہ ہے اور میرے خیال میں اُردو شاعری کے ہر دلدادہ کو یہ شگفتہ مجموعہ اپنے پاس رکھنا چاہیئے۔

ملنے کا پتہ:- حلقۂ ادب لکھنؤ

اقبال نامہ

عام کتابی سائز۔ ڈیڑھ سو صفحے حجم۔ سادہ جلد اور سادہ گرد پوش۔ قیمت ایک روپیہ۔ مرتب چراغ حسن حسرت۔

ناشرین:- ہونہار بک ڈپو۔ ریلوے روڈ۔ لاہور

علامہ اقبال کی وفات کے بعد بہت سے رسائل و جرائد نے اُن کی یاد میں اپنے اپنے خاص نمبر نکالے تھے اور اس سلسلے میں جناب سندباد جہازی کے ہفت نامے "شیرازہ" نے بھی زمانے کے ساتھ ایک قدم اُٹھایا۔ اس کی قبولیت کا عالم مجھے یاد ہے کہ جلد ہی دفتر میں اس کی کوئی کاپی باقی نہ رہی تھی۔ اب اسی نمبر کے مضامین کو ہونہار بک ڈپو نے جناب سندباد جہازی کے دیباچے کے ساتھ جناب چراغ حسن حسرت سے مرتب کرا کے شائع کیا ہے۔ اس خاص نمبر کے مضامین کے علاوہ بھی "شیرازہ" میں وقتاً فوقتاً جو چیزیں علامہ مرحوم کی ذاتِ گرامی کے متعلق شائع ہوتی رہی ہیں اُنہیں بھی اس مجموعے میں شامل کر لیا گیا ہے۔ خاص پہلو اس کتاب کا یہ ہے کہ اس میں اُن کی شخصیت کے سوانحی پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے اور اس لحاظ سے علامہ کے وفادار ملازم علی بخش کی زبان سے جو مضمون شامل کیا گیا ہے وہ خصوصاً قابلِ غور ہے۔ اس مضمون میں نہ صرف اس شاعرِ اعظم کے متعلق اُن کے ملازم کے تجربے اور یادداشت کی باتیں محفوظ ہو گئی ہیں بلکہ اس کا اندازِ بیان بھی اپنی دلچسپی کے اعتبار سے ایک جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔

بعض مضمون اس مجموعے میں شائع کرنے کے قابل نہ تھے لیکن اُنہیں بھی غالباً اس لئے شامل کیا گیا ہے کہ اُن کے لکھنے والوں نے سنی سنائی باتوں کی بجائے اپنے مشاہدات درج کئے ہیں۔

آخر میں چار نظمیں اور قطعاتِ تاریخ بھی درج ہیں۔ یہ قطعات جناب حفیظ ہوشیارپوری کے قلم سے ہیں جن میں سے ایک کی خوبی اُسے یہاں درج کرنے پر مجھے مجبور کر رہی ہے۔

آنکہ گفتا "در بالِ جبریل"   اقبال از تقدیرِ الٰہی
من ہم بگفتم باچشمِ گریاں   ہر شے مسافر ہر چیز راہی
گ = ۲۰   ۱۳۳۷ + ۲۰ = ۱۳۵۷ھ

لے ایک ہی تلوار کی دو دھاریں ——!





عہد حاضر کے بڑے لوگ حصہ دوم، سوم اور چہارم

دہلی کے دانتو

ادبیہ دنیا گنج نے مندرجہ بالا نام سے کتابوں کا ایک مفید سلسلہ شائع کیا ہے اس سلسلے کی پہلی جلد کا ذکر انہی صفحات میں چند ماہ پہلے قارئین ادبی دنیا کی نگاہوں سے گذرا ہو گا۔ اب ہمیں اس سلسلے کی دوسری تیسری اور چوتھی جلدیں موصول ہوئی ہیں۔ اس سلسلے کے افادی پہلو پر ہم بیشتر لکھ چکے ہیں۔ اس لئے یہاں صرف ان کے مواد کے متعلق ہی لکھتے ہیں۔

دوسری جلد میں چین اور ایران کے مشاہیر کو لیا گیا ہے۔ مؤلف کتاب جناب محمد مرزا دہلوی نے ان ممالک سے مارشل چیانگ کائی شیک اور رضا شاہ پہلوی کو چُنا ہے۔ یہ دونوں قابل قدر ہستیاں اپنے ملکوں کی تعمیر نَو میں اپنی مثال آپ ہیں۔ جناب مؤلف نے صرف اُن کے کارناموں ہی کا ذکر نہیں کیا بلکہ اُن کے الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ "چیانگ کائی شیک کے تذکرہ میں چین اور جاپان کی موجودہ کشمکش پر پوری تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ اور اس کشمکش سے یورپ کی موجودہ متلاطم سیاست کا جو تعلق ہے اس پر نہایت جامعیت کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسی طرح رضا شاہ پہلوی کے حالات میں ایران قدیم اور ایران جدید کا موازنہ کیا ہے۔ اور پہلوی عہد کی برکتوں اور رضا شاہ پہلوی کی ذاتی کمزوریوں پر ناقدانہ انداز میں گفتگو کی ہے۔"

تیسری جلد میں عراق و عرب کے مشاہیر کا جائزہ ہے۔ ان ممالک سے امیر فیصل اور سلطان ابن سعود کو لیا گیا ہے۔ عراق و عرب کی ان دونوں مشہور شخصیتوں کے متعلق بہت سے حضرات جانبداری سے آلودہ ہوئے بغیر نہیں لکھ سکتے لیکن مقام مسرت ہے کہ جناب مؤلف نے دیانتداری اور انصاف کو اپنی سوانح نگاری میں ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

چوتھی جلد مصر و مراکش کے مشاہیر کے تذکرے پر مشتمل ہے یعنی اس میں سعد زغلول پاشا اور غازی عبدالکریم کا بیان ہے۔ یہ دونوں افراد وہ اولوالعزم احرار تھے۔ جنہوں نے مغرب کی بہت بڑی طاقتوں کا مقابلہ کیا سعد زغلول مصر کے مہاتما گاندھی تھے اور غازی عبدالکریم شمالی افریقہ کے شاندار مرد مجاہد۔ ان کے سوانح آزادی کی جستجو میں مشعلِ راہ کا کام دے سکتے ہیں۔

ہر جلد کی قیمت آٹھ آنے ہے۔ اور حجم سوا اور سوا سو صفحات کے درمیان۔ ہر جلد پر خوشنما گرد پوش ہے اور کتابت اور طباعت بھی جاذبِ نظر لیکن ان سب سے بڑھ کر [illegible] کا انداز تنقید اور طرز بیان قابلِ توجہ ہے۔ (م)

زندگی کی بولتی چالتی تصویروں کا رنگین مرقع

نظارے

از

کرشن چندر ایم۔اے

کرشن چندر ایم۔اے نے بہت جلد ملک کے چوٹی کے افسانہ نگاروں میں اپنے لئے ممتاز جگہ پیدا کر لی ہے۔ ان کے بیشتر افسانے ادبی رسائل میں شائع ہو کر خراجِ تحسین وصول کر چکے ہیں۔ یہ مجموعہ ان کے

تیرہ ۱۳ بہترین افسانوں پر مشتمل ہے

کرشن چندر کا جادو نگار قلم رومانی دنیا کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ اُن صحیح قلبی کیفیات کے نقوش کو بھی قلم بند کرتا ہے جو تمدن کے سٹیج پر معاشرتی تفریق و امتیاز کے باوجود بھی ہر انسان محسوس کرتا ہے۔ ان نقوش کی تہ میں انسانی زندگی کے مختلف پہلو جھلکتے ہیں۔ ان پہلوؤں میں بسا اوقات

حسن و عشق کی رنگین دنیا

کے نظاروں کے علاوہ شکستہ قلب انسانی کی سسکیاں اور آنسوؤں کے وہ ابلتے چشمے بھی نظر آتے ہیں جو دنیا میں سرمایہ داروں کے مرہونِ منت ہیں غرضکہ بیسویں صدی کے انسان کے مکمل مطالعہ کے لئے اس نوجوان ادیب کے ان افسانوں کا مطالعہ اشد ضروری ہے۔ کاغذ دبیز حجم تقریباً ۲۴۰ صفحہ
قیمت ایک روپیہ محصول ڈاک علاوہ

کتب خانہ "ادبی دنیا" دی مال لاہور

سے طلب کیجئے

فرانس کی رنگین زندگی کا حسین مرقع
فطرتِ انسانی کا حیرت انگیز تجزیہ
محبت کی ولولہ انگیز داستانیں
امید و بیم کی کش مکش
جذبات و احساسات کا ارتعاش

یہ سب مناظر

سحر فرانس میں

ملاحظہ فرمایئے۔

جو

فرانس کے شہرۂ آفاق افسانہ نگار گائی دموپساں کے

۲۲ دلکش افسانوں کا مجموعہ ہے

جس کا

ترجمہ:۔ طاہر قریشی بی۔اے نے کیا ہے۔
تعارف:۔ جناب عاشق بٹالوی بی۔اے۔ ایل۔ ایل بی نے سپرد قلم کیا ہے اور موپساں کی افسانہ نگاری پر ایک مبسوط محققانہ
مقالہ:۔ حضرت شاہد احمد بی۔اے آنرز ایڈیٹر ماہنامہ ساقی دہلی کے قلم کا مرہونِ منت ہے۔
اعلیٰ درجہ کی کتابت و طباعت۔ دلکش سرورق۔ خوشنما جلد
ضخامت۔ سو تین سو صفحات۔ ظاہری و باطنی محاسن سے آراستہ

قیمت

ایک روپیہ چار آنے (عہ؍)

کتاب میں مصنف و مترجم کی تصویریں بھی شامل ہیں

منگانے کا پتہ

منیجر "ادبی دنیا" دی مال لاہور

ڈاک کے ڈاکو ادبی دنیا ہر ماہ کی ... تاریخ تک خریداروں کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ اگر اس تاریخ تک آپ کو پرچہ نہ ملے تو ایک کارڈ اپنے حلقے کے سپرنٹنڈنٹ پوسٹ آفس کو لکھئے اور ایک کارڈ ہمیں تاکہ پرچہ آپ کو دوبارہ بھیجا جائے

فہرست مضامین ادبی دنیا لاہور

بابت ماہ جون ۱۹۴۰ء

جلد ۱۸ تصاویر:۔ (۱) ایک مطالعہ (۲) ایک اور مطالعہ نمبر ۶

چندہ سالانہ مع محصول ڈاک اور وی پی پانچ روپے ممالک غیر سے دس شلنگ

گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام صلاح الدین احمد پرنٹر و پبلشر چھپ کر دفتر ادبی دنیا ... لاہور سے شائع ہوا

مٹھے رسیلے مدھ بھرے اور رس میں ڈوبے ہوئے

گیتوں کا مجموعہ

گیت مالا

مرتبہ:-

صلاح الدین احمد اور میراجی

زندگی ایک کٹھن منزل ہے اور ہمارے دل کی بدلتی ہوئی کیفیتیں اس سفر کو اور مشکل بنا دیتی ہیں۔ لیکن اگر ہمیں اپنے دل کی پکار میں کوئی ہم نوا مل جائے تو بوجھ بہت حد تک ہلکا ہو جاتا ہے۔ یہ گیت اس بوجھ کو ہلکا کرنے کے لئے اکٹھے کئے گئے ہیں۔

گیتوں کے لکھنے والے وہ شاعر ہیں جن کا کوئی نہ کوئی گیت آپ نے کبھی نہ کبھی ضرور پڑھا ہوگا۔

اس مجموعے میں آپ کو مقبول حسین احمد پوری، اندر جیت شرما۔ امرچند قیس، حفیظ ہوشیارپوری۔ ضیا فتح آبادی۔ حامد علی خاں۔ قیوم بسنت سہائے۔ وقار انبالوی، لطیف انور۔ میراجی۔ ساقی۔ راج کماری بکاؤلی، سبھی کے گیت ملیں گے۔

قیمت

صرف چھ آنے

کتب خانہ ادبی دنیا سے

طلب کریں

فرانس کی رنگین زندگی کا حسین مرقع ــــــ فطرتِ انسانی کا حیرت انگیز تجربہ ــــــ محبت کی ولولہ انگیز داستانیں ــــــ اُمید و بیم کی کشمکش

جذبات و احساسات کا ارتعاش

یہ سب مناظر

سحر فرانس

میں ملاحظہ فرمائیے

جو

فرانس کے شہرہ آفاق افسانہ نگار گائی دموپساں کے

بائیس دلکش افسانوں کا مجموعہ ہے

جس کا

ترجمہ:- طاہر قریشی بی اے نے کیا ہے۔

تعارف:- جناب عاشق بٹالوی بی اے ایل ایل بی نے سپرد قلم کیا ہے اور موپساں کی افسانہ نگاری پر ایک مبسوط محققانہ

مقالہ:- حضرت شاہد احمد بی اے آنرز ایڈیٹر ماہنامہ ساقی دہلی کے قلم کا رہینِ منت ہے۔

اعلیٰ درجہ کی کتابت و طباعت دلکش۔ سرورق خوشنما جلد

ضخامت۔ سواتین سو صفحات۔ ظاہری و باطنی محاسن سے آراستہ

قیمت ایک روپیہ چار آنے (عہ)

کتاب میں مصنف و مترجم کی تصویریں بھی شامل ہیں۔

منگانے کا پتہ:-

مینجر "ادبی دنیا" دی مال لاہور

دُنیائے کاروبار

گرمی کو شکست

قابل نوش اشیاء میں چائے ایک ایسی چیز ہے جو ہر موسم میں پی جاسکتی ہے اور نوشیدنی میں اپنا مقابلہ نہیں رکھتی۔ چائے نوشی کے ہر موسم میں کیا کیا فوائد ہیں یہ اکثر ثابت کئے جاچکے ہیں۔ جن لوگوں نے چائے کے فوائد نہایت آزردہ حالات میں بھی معلوم کئے ہیں اُن کے درج کردہ تجربوں کے ضخیم دفتر میں ایک تازہ سرگزشت بیان کرنے کی ضرورت ہے جو جنوبی افریقہ کے خطوط سرطان میں واقع ہوئی ہے مسٹر جیک ہائینس جاپان گورنمنٹ کے ایک ملازم ہیں۔ اُنھوں نے دریائے اسٹریکلینڈ کا چشمہ جس کی راہ آج تک کسی نے دریافت نہیں کی ہے پہنچنے کی سعی کی تھی۔ ان کے زبانی ایک نئے تجربہ کا حال معلوم ہوا ہے (جس سے چائے کی فضیلت کا اندازہ ہوسکتا ہے) سفر کے حالات اس خطہ میں صحت کے لئے اس قدر مضر ہیں کہ بہتیرے یورشی بیمار ہوگئے۔ مسٹر ہائینس اور اُن کے ساتھیوں کی اس وقت یہ صلاح ٹھیری کہ اگر زندہ واپس پہنچنا مقصود ہو تو اس کی ایک ہی صورت ہوسکتی ہے وہ یہ کہ دریا کا راستہ اختیار کریں جو چھ سو میل بہا کر ساحل تک پہنچاتا ہے۔ مریضوں کو اُٹھانے کی ضرورت ہونے کی وجہ سے گولے بارود اور کھانے پینے کی چیزیں چھوڑ جانی پڑیں۔ پھر کئی دن جو کشتیاں بنانے میں گذرے اس عرصہ میں وہ لوگ صرف چائے اور سیکرین کی گولیوں پر بسر کرتے رہے چھ سو میل کا سفر اُنھوں نے پندرہ دن میں طے کیا۔ مگر اس دوران میں اُنہیں بھنوروں اور تیز رفتار دھاروں کے سپرد ہوکر دریا کی روانی کے ساتھ بہہ جانے کی خوفناک آزمائش کا سامنا کرنا پڑا۔ اور اس مصیبت میں اُن کا صرف چائے ہی ایک ہمدرد سہارا تھا۔

انگلستان سے بھی ایک اسی عام فہم امر کی تصدیق کا ثبوت فراہم کیا گیا ہے کہ گرمی کی تاثیر کو کاٹنے کے لئے اور پیاس بجھانے کے لئے چائے بہترین شے ہے۔ مسٹر سیرلڈ نبٹینگ وہلی شیفیلڈ انڈیپنڈنٹ میں کوئلے کی کانوں کے مسئلوں پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ ٹھنڈی چائے کے خرچ کا مقدار کانوں کے ٹمپریچر اور زیر زمیں کام کرتے وقت رطوبت کی کمی پر منحصر ہے۔ مضمون نگار کے خیال میں لنکاشائر میں کوئلے کی کانیں سب سے زیادہ گرم ہوتی ہیں۔ یہاں ٹمپریچر کم وبیش ۹۹ ڈگری ہوتا ہے اور جنوبی ویلس میں شیفیلڈ کے علاوہ یارک شائر میں سب سے ٹھنڈی کانیں واقع ہیں۔ جن کا ٹمپریچر ۵۵ ڈگری ہوا کرتا ہے لہٰذا لنکاشائر میں ہر سرنگ ساز ۹ ، ۱۱ پائنٹ چائے روزانہ پیتا ہے اور یارک شائر میں صرف ۹۔۴ پائنٹ روزانہ چائے پی جاتی ہے۔ ٹھنڈی چائے کی اتنی زیادہ مقدار بھی کانوں میں زمین کے اندر کام کرنے والے کے جسم کی رطوبت کو دور کرنے کے لئے کافی نہیں ان مزدوروں کو ساڑھے پانچ گھنٹے تک اونچے ٹمپریچر میں کام کرنا پڑتا ہے۔

مسٹر نبٹینگ کے مضمون کو پڑھ کر ہنری کالنس کا خیال آتا ہے۔ یہ کیب ٹاؤن میں ۴۶ سال سے آہنگر کا کام کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ سب سے گرم کام انہیں کا ہے کیونکہ انہیں ایک سوچھ ڈگری گرمی میں کام کرنا پڑتا ہے اس ٹمپریچر کے مقابلہ میں گرم سے گرم دن کی ہوا بھی ٹھنڈی معلوم ہوگی۔ ہنری کالنس کے متعلق بیان ہے کہ اُن کے پاس ٹھنڈے رہنے کے لئے ایک عجیب وغریب نسخہ ہے وہ گرم پانی سے غسل کرتے ہیں۔ اور پیاس بجھانے کے لئے خوب گرم چائے پیا کرتے ہیں۔

کتب خانہ ادبی دنیا ہم نے ادبی دنیا اور علم وادب کی خدمت کے ذرائع کو وسعت دینے کے لئے کتب کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ اب تک سوز ناتمام، گیت مالا اور سحر فرانس شائع ہوکر مقبول ہوچکی ہیں۔ اس سلسلے کا تازہ کام "نظارے" کی اشاعت ہے "نظارے" ملک کے مشہور اور قابل قدر افسانہ نگار جناب کرشن چندر ایم اے کے دلفریب افسانوں کا مجموعہ ہے جن کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ مصنف موصوف کی سحر کاری کا ایک زمانہ قائل ہوچکا ہے لیکن جو لوگ ان کی خوبیوں کو ادبی تنقید کی عینک سے دیکھنا چاہتے ہوں۔ اُن کے لئے اس مجموعے میں صلاح الدین احمد ایڈیٹر ادبی دنیا کا ایک مفصل مقدمہ بھی شامل ہے۔

مینیجر

ایک ضروری تصحیح ادبی دنیا کے شمارہ بابت مئی ۱۹۴۰ء میں اورینٹل انشورنس کمپنی کے اشتہار میں برانچ سیکرٹری لالہ گوپال داس سونی، ایف سی آئی (ایڈنبرگ) ایف۔ آر۔ ای۔ ایس (لندن) کا نام رہ گیا تھا۔ قارئین کرام نوٹ فرمائیں

بزم ادب

ــ دل صاحب اولاد سے انصاف طلب ہے۔

ادبی حلقوں میں یہ خبر نہایت رنج واندوہ سے سنی جائے گی کہ میاں بشیر احمد بارایٹ لا، ایڈیٹر ہمایوں کے نوجوان اور ہونہار صاحبزادے میاں اصغر بشیر آکسفورڈ میں کشتی چلاتے ہوئے ڈوب گئے۔ اور ان کی نعش بھی دستیاب نہ ہوئی۔

اصغر بشیر ۲۱ سال کا جوانِ رعنا تھا اور اپنے خاندان کا چشم وچراغ۔ میاں بشیر احمد نے ہر چند چاہا کہ وہ فی الحال اپنی تعلیم ملتوی کرکے ہندوستان واپس آجائے۔ یورپ میں جنگ کے شعلے جوں جوں بھڑکتے تھے۔ دور افتادہ ماں باپ کے دل یہاں بے قرار ہو ہو اُٹھتے تھے مگر مرحوم کے ذوقِ علم نے گوارا نہ کیا کہ وہ اپنے مقاصد کی تکمیل کئے بغیر وطن لوٹ آئے۔ میاں صاحب نے کئی بحری تار دیئے مگر اُس جواں مرگ نے ہمیشہ یہی جواب دیا کہ یہاں کسی قسم کا خطرہ نہیں مجھے دو چار مہینے اور ٹھیر جانے دیجئے۔ آہ کسے خبر تھی کہ آکسفورڈ کے نیچے بہنے والی پہاڑی ندی اُسے ماں کی گود سے چھڑا کر اپنے آغوش میں لینے کو مضطرب تھی۔ اور وہ اپنے عزم میں کامیاب ہوئی۔

ہمیں اس حادثۂ جانکاہ میں میاں صاحب، ان کی بیگم صاحبہ، محترمہ بیگم شاہ نواز اور مرحوم کے اعزہ واحباب سے دلی ہمدردی ہے اور ہماری دعا ہے کہ خدائے پاک مرحوم کی روح کو فردوسِ نعیم کی سرزمیں عطا کرے اور اُس کے غم نصیب والدین اور بہن بھائیوں کے مجروح دلوں کو تسکین بخشے۔

اسی ماہ معزز معاصر مصور بمبئی کے نامور مدیر سعادت حسن منٹو کی والدہ ماجدہ سفرِ آخرت اختیار کرکے منٹو صاحب کو اپنے سایۂ عاطفت اور مہرمادری سے محروم کرگئیں۔ ماں انسان کے لئے دنیا کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے۔ اگرچہ اس سرمایہ کی قدر بسا اوقات لُٹنے کے بعد ہوتی ہے۔ وہ لوگ درحقیقت بڑے خوش قسمت ہیں جنہیں روز وشب ماں کی دعائیں حاصل ہوتی ہیں۔ کاش کہ وہ ان کی قدر پہچانیں۔ ہم سعادت حسن صاحب کے اس نقصانِ عظیم پر اُن سے اپنی گہری اور پُرخلوص ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔ خدا مرحومہ کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

اس شمارہ کے مضامین میں عبدالسلام صاحب خورشید کا مضمون حشر سے پہلے اُردو ڈرامانگاری ایک دلچسپ اور مفید سلسلے کا آغاز کرتا ہے۔ خورشید صاحب کے دو اور مضامین **حشر اور اُردو ڈرامانگاری اور حشر کے بعد اُردو ڈرامانگاری** ادبی دنیا کے آئندہ شماروں میں چھپ کر اس سلسلے کی تکمیل کریں گے۔ یہ مضامین اگرچہ اپنی اپنی جگہ مکمل ہیں۔ لیکن جب یہ سلسلہ پورا ہو جائے گا تو آپ دیکھیں گے کہ صاحب مضمون نے اُردو ڈرامہ نگاری کا نہایت خوش اسلوبی سے جائزہ لیا ہے۔ اور ایک عام ناظر کو جسے ضخیم کتابیں پڑھنے کی فرصت نہیں۔ ادب کی اس اہم صنف سے صرف چند مضامین کے ذریعے اچھی طرح متعارف کر دیا ہے۔

اُردو ادبیات میں انشائے لطیف (ادب لطیف نہیں)، کو ابھی وہ درجہ نہیں ملا جو اس کا حق ہے۔ انگریزی زبان میں ESSAY اور خصوصاً LIGHT ESSAY ادب کی ایک نہایت مقبول صنف ہے۔ ہمارے ہاں مضامین اور مقالات لکھنے کا رواج عام ہے۔ سرسید اسکول کے بعض تابعین نے ESSAY بھی لکھے، لیکن (LIGHT ESSAY) انشائے لطیف کو بہت کم لوگوں نے چھیڑا ہے۔ اب چند سالوں سے اس طرف توجہ ہو رہی ہے اور مقامِ مسرت ہے کہ ہمارے **حلقے** کے چند ادیبوں نے بھی اس طرف قدم بڑھایا ہے۔ آپ ادبی دنیا کے گذشتہ دو نمبروں میں ممتاز مفتی کی کہی اور اَن کہی اور کرشن چندر کی مانگے کی کتابیں دیکھ چکے ہیں۔ اس دفعہ خیالی پلاؤ ملاحظہ فرمائیے۔ انور اعجاز صاحب کی اس کوشش کو ایک بڑی حد تک کامیاب کہا جا سکتا ہے۔ اور ہمیں امید ہے کہ ان کی آئندہ تخلیقات موجودہ سے بھی اچھی ہونگی۔

چکر ایک دلچسپ اور لطیف طنزیہ کھیل ہے جسے شیر محمد صاحب اختر نے بڑی خوبی سے اُردو کا جامہ پہنایا ہے۔ اس میں ہابیل اور قابیل کے کردار گویا انسانی فطرت کے دو پہلو ہیں، خیالی اور عملی۔ تخیل نے فنونِ لطیفہ اور عمل نے سائنس کو فروغ دیا۔ مشرق اور مغرب نے اپنے اپنے کام پورے کئے۔ مصنف مغربی نژاد ہونے کے باعث عمل کی طرف زیادہ راغب ہے اور اُس نے عمل کے بقا اور ہابیل کی موت سے تخیل کی ہیچ مقداری کو ثابت کیا ہے۔ اگرچہ گناہ وثواب کے متعلق اس کا نظریہ مشرقی ہی معلوم ہوتا ہے۔ اختر صاحب نے ترجمے میں اصل کی خوبیاں زائل نہیں ہونے دیں۔ ہمارے ہاں کے ادبی تراجم میں یہ ایک صحت مند اضافہ ہے۔

صلاح الدین احمد

(۲

اس شمارے کے حصۂ نثر میں انور اعجاز قیصر نے "خیالی پلاؤ" کے عنوان سے خیال کی ستم ظریفیوں کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ خیال کی ندرت لے تھی۔ حصۂ نظم میں تخت سنگھ کی نظم "تخیل" بلمپت لے ہے۔ اس نظم کا قابلِ غور پہلو اس کا پلاٹ ہے۔ کیا نشیبِ دریا پہ صرف شاعر کھڑا ہے اور باقی سب تخیل ہے؟ کیا وہ عورت جو "اک کیفِ بے خودی میں ڈوبی ہوئی اکیلی کھڑی تھی" تخیل کا استعارہ ہے؟ کیا وہ جادوگر اجنبی جس کی وہ عورت منتظر تھی ایک واہمہ ہے، محض تخیل؟

رات، اندھیرا، دریا کا کنارا، لمبی لمبی گھاس (سرسرا رہی ہوگی!) ایک مرد، ایک عورت، ٹمٹماتا ہوا دیا، بنسری، ——— یہ سب لوازم لمبی سست رفتار لیکن باقاعدہ بہتی ہوئی بحر میں ایک ایسی ہم آہنگی پیدا کر رہے ہیں جو تاثر میں ایک بہترین معاون ثابت ہو رہی ہے۔

میرے خیال میں بیراگ کی شاعری کے لحاظ سے یہ ایک بہت اچھی نظم ہے۔ لیکن بیراگ کی شاعری میں جو ایک ہر شے سے برگشتہ کرنے والی کیفیت ہوتی ہے وہ اس میں نہیں ہے بلکہ اسے پڑھ کر تو یہ خیال آتا ہے کہ کاش نشیبِ دریا پہ ہم ہوتے اور اس نادر واقعے اور اس کی کیفیتِ ذہنی سے لطف اندوز ہو سکتے۔

مراتب علی تائب کی غزل میں بھی اسی قسم کی مبہم سی کیفیت چھائی ہوئی ہے ؎ فطرت ابھی بیتاب ہے معلوم نہیں کیوں! یا رب کوئی بے خواب ہے معلوم نہیں کیوں؟ اور ؎ ملتا نہیں بحرِ غمِ الفت کا کنارا، اک عالمِ گرداب ہے، معلوم نہیں کیوں! ——— اور اس شعر میں کیا خوب بالواسطہ حسنِ تعلیل آئی ہے ؎ دنیا کوئی معبد نہیں لے گنبدِ گرداں، تو صورتِ محراب ہے معلوم نہیں کیوں! ——— معبد، گنبد، محراب، کیا تصور ہے، کیا تخیل ہے!

مخمور عثمانی اور ساغر جیلی دونوں ماضی کے نوحہ خوان ہیں لیکن ساغر ایک خاص شام کی یاد میں ڈوبا ہوا ہے اور مخمور اُن لمحوں کی حسرت کا ترجمان ہے جو صرف اس کے تصور ہی میں سہانے خواب بن کر آتے رہے اور اُن کی تعبیرِ حقیقت کبھی میسر نہ ہوئی۔ ممکن ہے کہ مسرت کے جویا افراد کو ان نظموں کی الم پرستی گوارا نہ ہو لیکن اُنہیں ظفر تاباں کا کہا یاد رکھنا چاہیئے کہ

کیوں نم آلودہ نہ ہوں اہلِ نظر کی آنکھیں + چھوڑ کر دامنِ دریا کو کہاں جائے گداز

ظفر تاباں کی غزل کے متعلق بھی اُس کا اپنا ہی ایک شعر پیش کیا جا سکتا ہے ؎

عام ہے مبداءِ موسیقیٔ فطرت کی عطا + بخشے جاتے ہیں مگر نغمے باندازۂ ساز

ظفر تاباں میں تغزل کا صحیح رجحان ہے اور اس کے ساتھ ہی جس بلندی سے وہ فکرِ سخن کرتا ہے اس سے اُس کے کلام کا درجہ اور بھی اونچا ہو جاتا ہے۔

قیوم نظر نے اس دفعہ اپنی روش سے ہٹ کر غزل گوئی کی ہے۔ معلوم نہیں اُس کی غزل میں ہندی الفاظ کی وجہ سے ہندی تصورات آ گئے ہیں یا ہندی تصورات اور روایات کی وجہ سے اُس نے ہندی الفاظ کا انتخاب کیا ہے۔ بہر حال خوب دادِ تغزل دی ہے۔ اور جس طرح "رت بیت چکی ہے برکھا کی اور بیت کے مارے بیٹھے ہیں، روتے ہیں، رونے والوں کی آنکھوں میں ساون رہتا ہے" اُسی طرح کہا جا سکتا ہے کہ "اب ختم ہوئی ہے نظر کی غزل سننے والے سر دُھنتے ہیں، کیا شعر ہیں! پڑھنے والوں کے ذہنوں میں تغزل رہتا ہے"

علی احمد کے شگفتہ تصور نے "محبت کی پہلی رات" میں جو رومان پیدا کیا ہے اُس کی سادگی ہی میں ایک ناقابلِ مدافعت دلکشی ہے۔ جس میں الفاظ کی نفاست نے اپنا ایک علیحدہ لطف پیدا کر دیا ہے۔ "اُفق کا گھاٹ" "متوالا چاند" "تاروں کی شہنائی" ——— کے تصورات میں ایک عجیب کیفیت ہے۔ محاکاتی لحاظ سے یہ مصرعے کیا خوب ہیں ——— "تم آنچل کو اُڑاتی سر پہ جلدی جلدی آئی تھیں" "تم آئیں اور آ کر چھپ گئیں پھر میرے دامن میں" اور پھر آخر میں "مچل کر میں بڑھا دامن تمہارا تھام لینے کو، شرابی جیسے اُٹھے گرتی مینا تھام لینے کو" ———

مسعود شاہد کی نظم کا موضوع سکوت ہے لیکن عنوان "چپ چاپ" اور یہ عنوان اُس فضا سے پوری طرح ہم آہنگ ہے جو اس نظم کے مطالعے سے قائم ہو جاتی ہے۔ لکھا تو اور بھی جا سکتا تھا لیکن اس نظم کے تاثر نے ساکت و خاموش کر دیا ہے۔

میراجی

آئینۂ عالم

جاپان میں مزدوروں کی حالت

جاپان میں مزدوروں کے حالات کا صحیح علم کم لوگوں کو ہے۔ جاپانی سسٹم کے مخالف کہتے ہیں کہ وہاں مزدوری بہت کم دی جاتی ہے، کام کا وقت بہت زیادہ ہے، مزدورانہ تنظیم میں خامیاں ہیں، اور اسی طرح کے اور بہت سے الزامات عاید کرتے ہیں، اور جاپانی کہتے ہیں کہ اُن کی سماج ہم آہنگ ہے اُس میں اس بات کی ضرورت ہی نہیں پیدا ہو سکتی کہ مغرب کی طرح کوئی طریقہ مزدوروں کے حقوق کی حفاظت کا قائم کیا جائے، وہ کہتے ہیں کہ جاپانی مزدوروں کا مالک اپنے کارندوں کو اسی نظر سے دیکھتا ہے جس نظر سے باپ اپنی اولاد کو دیکھتا ہے اور اسی لئے مخالفانہ مقاصد کی اُلجھن کبھی پیدا ہی نہیں ہوتی۔

لیکن یہ حامی اور مخالف دونوں انتہائی رائیں رکھتے ہیں۔ ان کے انداز نظر میں اعتدال نہیں ہے، اور اگر یہ لوگ جاپانی مزدوروں کو عجیب چیز سمجھنے کی بجائے دوسرے ملکوں کی سماجی تاریخ پر ذرا بھی غور کریں تو اپنی انتہا پرستی کو چھوڑ دیں۔

جاپان ایک ایسا ملک ہے جس میں صنعتی رجحانات کی نشو و نما کو ابھی بہت کم عرصہ ہوا ہے اور اس لئے اُس کے معاملات پر غور کرتے ہوئے اُن ممالک کی مثال ذہن میں نہیں لانی چاہئے جو بہت عرصے سے ترقی کر چکے ہیں۔ جاپان کی آبادی کا بہت کم حصہ بڑے کارخانوں میں مصروف کار ہے۔ آدھے کے قریب باشندے تو زراعت یا ماہی گیری کا کام کرتے ہیں اور صنعت و حرفت کے فروغ کی مثالیں بھی بہت سی چھوٹی چھوٹی دکانیں ہیں۔ بڑے کارخانوں میں جو لوگ کام کرتے ہیں اُن کی اکثریت دیہات سے آتی ہے۔ اور وہ لوگ چند سال تک کارخانوں میں کام کرنے کے بعد گھر کو لوٹ جاتے ہیں اور ان کے علاوہ دوسرے لوگ بھی جو مستقلاً صنعت و حرفت کے کام میں مصروف ہیں ابھی دس سال پیشتر زراعت پیشہ ہی ہوا کرتے تھے۔ ان وجوہ کی بنا پر جاپانی کارخانوں کا ایک عام مزدور ابھی صحیح معنوں میں مزدور ہی نہیں ہے۔

کپڑے کے کارخانوں میں تین چوتھائی کاریگر وہ نوجوان عورتیں ہیں جو اپنے دیہاتی گھروں کو چھوڑ کر روزی کمانے کے لئے آتی ہیں۔ انہیں کارخانوں میں ملوں کے دلال ملازم رکھتے ہیں۔ یہ دلال دیہات میں رہتے ہیں اور وہیں سے اپنے کارخانوں کے لئے بھرتی کا کام کئے جاتے ہیں یہ دلال عورتوں کے والدین سے شرائط کر لیتے ہیں۔ یہ شرائط ایک معین عرصے پر حاوی ہوتی ہیں۔ شادی کی عمر کو پہنچنے پر یہ کام کرنے والی لڑکیاں اپنے گھروں کو لوٹ جاتی ہیں۔ ان لڑکیوں کی آمدنی اُن کے غریب اور نادار گھرانوں کی مدد کے لحاظ سے ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ ملازمت کے دوران میں ان لڑکیوں کے کھانے اور رہنے کا انتظام بھی کارخانہ ہی کرتا ہے۔

بڑے کارخانوں میں سے اکثر اور چھوٹے کارخانوں میں سے بعض میں کھانے اور رہنے کا انتظام ان لڑکیوں کے دیہاتی گھروں کی نسبت بہتر ہوتا ہے اور اُن کی یہ کام کاج کی زندگی بھی اُس گھریلو زندگی سے زیادہ دلچسپ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ان کارخانوں میں ملازم ہونے کی مشتاق ہوتی ہیں اور اگرچہ بعض کارخانوں کے متعلق شک کیا جا سکتا ہے کہ وہاں کا انتظام ناقص ہے لیکن وہ انتظام بھی اُن لڑکیوں کے دیہاتی گھروں سے بہتر ہی ہوتا ہے۔ مل کی ان کام کرنے والیوں کو اُن کی آمدنی کا کافی حصہ بونس اور جنس کی صورت میں ادا کیا جاتا ہے اور اسی طرح بڑے کارخانوں میں مرد کاریگروں کو بھی اُن کے روزینے کے علاوہ اضافے کے طور پر بونس دیا جاتا ہے اور اگر وہ شادی شدہ ہوں تو ان کے مالکوں کی طرف سے انہیں کم کرائے پر مکان بھی مہیا کیا جاتا ہے۔ مالک کے گھر میں کوئی خاص بات ہو یا کسی بچے کی پیدائش ہو تو تمام کام کرنے والوں کو تحفے کے طور پر ایک مقررہ رقم دی جاتی ہے اور یوں مالک اور مزدور کا تعلق ایک طرح سے باپ اور اولاد کا تعلق بن جاتا ہے۔

مزدوری کے دام انفرادی طور پر فیصلہ کئے جاتے ہیں اور کوئی مالک اگر کسی کاریگر کو برخاست کرنا چاہے تو وہ مزدوری کے علاوہ معاوضہ دیئے بغیر اُسے اپنے کارخانے سے نہیں نکال سکتا۔ انفرادی کارگزاری پر بونس میں بھی

کے طریقے کو گذشتہ چند سالوں سے جاپان میں عموماً اختیار کیا جا چکا ہے اور یہ طریق کاران صنعتوں یا کارخانوں میں زیادہ تر رائج ہو چکا ہے۔ جہاں وقت کے لحاظ سے مزدوری دینے کا رواج ہے اور یوں لو ہے کے بعض بڑے کارخانوں میں مزدور اپنی عام مزدوری سے دُگنا کما لیتے ہیں۔

جاپان میں مزدوری کے طریق کی ایک اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہاں کام کے داموں میں حقوق کے لحاظ سے بہت اختلاف ہوتا ہے یعنی اکثر ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ایک ہی کام کو دو آدمی کر رہے ہیں اور ان دونوں کی قابلیت بھی یکساں ہے لیکن بڑی عمر والے کو زیادہ اور کم عمر والے کو کم مزدوری مل رہی ہے۔

کام کا وقت مغرب کے کارخانوں کی بہ نسبت زیادہ ہے۔ ایسی فیکٹریوں میں جہاں دس یا دس سے زیادہ کام کرنے والے ہوں، عورتوں اور سولہ سال سے کم عمر کے لڑکے لڑکیوں کے کام کا وقت گیارہ گھنٹے ہے۔ اس میں ایک گھنٹے کی درمیانی چھٹی بھی شامل ہے بعض خطرناک کاموں میں بھی اسی طرح گیارہ گھنٹے کی پابندی ہے۔ اور ۱۹۳۱ء سے یہ پابندی ان تمام کپڑے کے کارخانوں پر بھی عاید کر دی گئی ہے جو بجلی کا استعمال کرتے ہیں کام کے وقت کی زیادتی ہماری نگاہوں میں اتنی خاص بات نہیں ہو سکتی جتنی یہ بات کہ جاپان میں ہفتہ وار آرام کے لئے ایک روز کی کوئی رخصت نہیں دی جاتی۔ عورتوں اور نابالغوں کو فیکٹری ایکٹ کے مطابق مہینے میں دو روز کی رخصت دی جاتی ہے اور زیادہ تر صنعت و حرفت کے کارخانوں میں اس کے سوا اور کسی قسم کی رخصت نہیں ملتی

اُن کارخانوں میں کام کا وقت واقعی بہت زیادہ ہے جو فیکٹری ایکٹ کے ماتحت نہیں ہیں۔ بارہ سے چودہ گھنٹے تو ایک عام بات ہے۔ لیکن یہ وقت کی زیادتی کام سے ایک نسبت رکھتی ہے یہ قدرتی بات ہے کہ جن کارخانوں میں وقت زیادہ صرف کرنا پڑتا ہے وہاں کے کام کرنے والے اُس تندہی اور شدت سے اپنے فرائض کو پورا نہیں کرتے جیسے کہ منظم کارخانوں کے مزدور۔ لیکن ان غیر منظم کارخانوں کے حالات بھی خطرناک معلوم ہوتے ہیں اور ماہرین اور ذمہ دار حضرات اس بات پر غور کرنے لگ پڑے ہیں کہ یوں قومی لحاظ سے جاپانی جسم پر بُرے اثرات کا زبردست خطرہ ہے۔

بعض ماہرین کہتے ہیں کہ جاپان کے مزدوروں کے معاوضے کا مقابلہ ہمیں دوسرے ممالک سے نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ وہاں اوسط آدمی کا معیار حیات ملکی لحاظ سے خاص اور سستا ہے اور اس لئے وہاں ایک آدمی اتنی رقم میں بآسانی زندگی گذار سکتا ہے جو ہمیں بہت ہی کم نظر آتی ہے۔ کیونکہ مغرب میں تو ایک مزدور کو بہت سی فالتو قسم کی ضروریات کو بھی پورا کرنا ہوتا ہے۔ لیکن یہ مسئلہ اتنا اہم نہیں کہ ایک جاپانی کا موجودہ معیارِ حیات کیا ہے، اہم مسئلہ یہ ہے کہ وہ معیار گھٹ رہا ہے یا بڑھ رہا ہے۔ کیونکہ ان مقامات پر جو جاپان کے بڑے شہروں سے قریب تر ہیں۔ گذشتہ سالوں میں معیارِ حیات پہلے کی بہ نسبت بڑھ چکا ہے۔ اور مغربی اثرات کی فتح کے ساتھ یہ معیار ہر جگہ بڑھتا ہی جائے گا۔

جاپان کا اقتصادی نظام، وہاں کا صنعتی تعلقات کا نظام اور وہاں کے سیاسی اثرات ـــــ یہ تمام باتیں وہاں کسی قسم کی زبردست مزدورانہ تنظیم کے خلاف ہیں اور اگرچہ ابھی وہاں مزدورانہ تحریک ابھی اپنی نشو و نما کی ابتدائی منزل میں ہے، وہاں کے مزدور، خواہ وہ تجارتی اور مزدورانہ انجمنوں سے متعلق ہوں یا نہ ہوں، ابھی اس قابل نہیں ہیں کہ وہ کارخانہ داروں پر کسی قسم کا دباؤ ہڑتالوں کے ذریعے سے ڈال سکیں۔ البتہ وہاں کے سرمایہ داروں کو رائے عامہ کا بہت زیادہ خیال رہتا ہے اور یہ نکتہ اُن کے حق میں اکثر کام کر جاتا ہے۔

مزدوروں کی انجمنوں میں سے اکثر سرمایہ دارانہ سسٹم کی قائل ہیں۔ اور اپنی عام سماجی پالیسی میں قدامت پسند ہیں لیکن بعض ایسی انجمنیں بھی ہیں جنہوں نے مارکس کی تعلیم کو اپنا مطمح نظر بنا لیا ہے۔ گذشتہ جنگِ عظیم کے بعد کے پہلے دس سالوں کے شروع شروع میں مارکس کی تعلیم نے مزدوروں اور طلبا پر بہت اثر کیا اور یہ اثر اس قدر بڑھنے لگا کہ حکام کو خرابی کا خطرہ لاحق ہوا اور انہوں نے ۱۹۲۸ء میں ایسی تمام انجمنوں کا خاتمہ کر دیا، اس کے چند سال بعد پھر وہی خیالات لوگوں کے دلوں میں بار پانے لگے اور اگرچہ مزدوروں اور طلبا میں ہی ان خیالات کی ہما ہمی تھی پھر بھی انہیں کبھی کسی قسم کی سیاسی اہمیت حاصل نہیں تھی۔

لیکن ۱۹۳۱ء سے ہر قسم کی انقلابی اور اشتراکی انجمنوں کو ملیامیٹ کر دیا گیا ہے اور ان انجمنوں کے صدہا حامیوں کو گرفتار کر کے اُن کے خیالات سے انحراف کرنے پر مجبور کیا گیا۔ اس بات کا اندازہ لگانا ناممکن ہے کہ اب بھی وہاں کسی نہ کسی دبی ہوئی صورت میں انقلابی خیالات موجود ہیں یا مکمل طور پر انہیں لوگوں کے دلوں سے خارج کر دیا گیا ہے۔ آئے دن کسی نہ کسی سیاسی قسم کی گرفتاری کی جو خبریں جاپانی اخبارات میں شائع ہوتی رہتی ہیں اُن سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اشتراکی خیالات ابھی جاپانیوں کے دلوں سے یکسر محو نہیں ہوئے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود وہاں کسی قسم کا انقلاب ممکن نہیں۔ جاپان اپنے ہی اعتقادات پر کاربند رہیگا۔ اور وہاں کے مزدوروں کے دلوں میں بھی اگر کسی قسم کی تبدیلیٔ حالات کی تمنا ہے تو وہ اس تمنا کی تکمیل اشتراکی خیالات کی بجائے اپنے اندرونی انقلاب ذہنیت سے چاہتے ہیں۔

چینی خواتین ـــ زندہ باد!

چین میں آج سو چاؤ کی ایک عورت کا نام عزت سے لیا جاتا ہے۔ اس عورت نے اپنے خاوند کو پولیس کے حوالے کر دیا تھا۔ بات یوں تھی کہ اس کے خاوند نے کئی بار چینیوں کے خلاف جاپانیوں کی مخبری کی اور اسی طرح کی ایک اطلاع کی بنا پر جاپانیوں نے ایک ہوائی حملہ کیا اور بارود اور اسلحہ کی بہت سی گاڑیاں تباہ کر دیں۔ اس غدارِ وطن کی بیوی نے پہلے تو اُسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ نہ مانا تو ایک روز اُسے اس غداری سے باز رکھتے ہوئے وہ تنگ آکر زور سے چلا اٹھی "غدار! غدار" اور ہمسایوں نے اس کی پکار سن لی۔

جب اُس کے خاوند کو گولی مار دی گئی تو ہمسایوں نے اس عورت سے پوچھا کہ تمھیں اپنے کئے پر پشیمانی تو نہیں؟ ـــ اور اُس نے جواب دیا، نہیں! میں نے ایک خاوند کو کھو کر اپنے ملک کے بہت سے آدمیوں کو بچا لیا ہے، اس لئے میرا دل مطمئن ہے۔

چین وہ ملک ہے جہاں صدیوں سے عورت مرد کے مقابلے میں سماجی حقوق کے لحاظ سے ایک صفر کی حیثیت رکھتی تھی۔ کنفیوشس کی تعلیم ہی یہ تھی کہ عورت کی انفرادی زندگی کچھ بھی درجہ نہیں رکھتی وہ اپنے خاندان کی تابع ہے۔ لیکن اب زمانے اور وقتی ضروریات کے ساتھ ساتھ کنفیوشس کا معیارِ اخلاق بدل رہا ہے سو چاؤ کی اس عورت نے اپنے خاندان سے غداری کی اور اپنے خاوند کی جان کی پروا نہ کی۔ لیکن اس کے باوجود اُس نے کنفیوشس ہی کی تعلیم کو ایک اور طریق پر پورا کر دکھایا۔ اُسے خاوند کی موت پر افسوس نہ ہوا، اُس کے دل میں کسی طرح کا ذاتی رنج و غم پیدا نہ ہو سکا، اُس نے اپنے ملک کے لئے یہ فعل کیا۔ اور یوں اپنی انفرادی حیثیت کو ایک نئی صورت میں اجتماع کے لئے مٹا دیا۔

چینی عورتوں میں کردار کی بعض اعلیٰ خصوصیات موجود ہیں اور اُن کی سیرت میں ایک ایسا سکون ہے جو اُسی صورت میں پیدا ہو سکتا ہے کہ انسان کو اپنے جذبات اور احساسات کی بالکل پروا نہ ہو۔ مغربی عورتوں کی بہ نسبت چین کی عورتوں کا دائرۂ عمل بہت تنگ رہا ہے۔ لیکن جاپان کے جاگیردارانہ نظام میں عورتوں کی جو کیفیت تھی اس کے مقابلے میں وہ بہت آزاد رہی ہیں۔ چین میں اگر عورتوں پر دباؤ تھا تو اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہاں عورتوں کو جنسی لحاظ سے کوئی کم درجہ دیا جاتا تھا۔ بلکہ چین میں تو کنفیوشس کی تعلیم ہی نے زندگی کے ہر پہلو پر دباؤ ڈال رکھا تھا کیونکہ اس کے لحاظ سے انفرادی زندگی خاندان اور حکومت کی تابع ہونی چاہئے۔ بیٹوں کی وہاں اس لئے قدر تھی کہ وہ نسل کو قائم رکھتے ہیں اور بیٹیاں ایک معمولی قسم کی چیز سمجھی جاتی تھیں اور ان پرانے نظریوں میں جو انقلاب پیدا ہوا وہ ملک کے صنعتی انقلاب کی وجہ سے تھا۔ صنعتی ترقی کے ساتھ کارخانوں کی بہتات ہوئی اور ان کارخانوں نے عورتوں کی زندگی میں ایک وسعت پیدا کر دی اور انہیں خاندانی غلامی سے رہا کر کے ایک نئی قسم کی غلامی دی۔ ۱۹۲۷ء میں جب قومی فوجیں شمال کی طرف جانے لگیں تو اچانک ایک بم کی طرح عورتوں کی آزادی کی ایک تحریک سی پھوٹ پڑی۔ ان دیہاتی لوگوں میں بھی جو اپنا پیٹ پالنے کے لئے اپنی بیٹیوں کو بیچ دیا کرتے تھے اور جن کی بیویاں خاوند کی موت کے بعد تمام عمر علیحدگی کی زندگی گذارتی تھیں، انہی لوگوں میں ایسی عورتیں اور لڑکیاں پیدا ہو گئیں جنہوں نے مغرب کی پیروی میں اپنے بال کٹوا دیئے اور وردیاں پہن کر قومی فوجوں کے ساتھ ساتھ پروپیگنڈے کے لئے گھروں سے نکل پڑیں اور انہوں نے اس نظریے کی تبلیغ شروع کر دی کہ مرد عورت دونوں یکساں ہیں۔ ان عورتوں نے ملک میں ایک بیداری پیدا کر دی، عورتوں کی انجمنیں بنائیں اور بعض نے اپنے خاوندوں سے چھٹکارا پانے کے لئے طلاق کا یہ سیدھا اور نہایت آسان طریقہ اختیار کر لیا کہ اخبار میں اپنی آزادی اور علیحدگی کا اعلان کر دیں۔ اس تحریک آزادیٔ نسواں سے بہت سی قابل ہستیاں چین میں خود ابھریں۔ سونگ خاندان کی دو بہنوں کو تو ایک زمانہ جانتا ہے جن میں سے ایک بہن مشہور چینی رہنما ڈاکٹر سن یٹ سین کی بیوہ ہے اور دوسری بہن مشہور عالم چینی جرنیل چیانگ کائی شیک کی بیوی ہے۔ پہلی بہن سے زیادہ محبوبِ خلائق عورت اس وقت چین بھر میں اور کوئی نہیں کیونکہ اس نے اپنی زندگی ہی خدمتِ ملک کے لئے وقف کر دی ہے اور اپنے خاوند کے بنائے ہوئے پروگرام کو تکمیل تک پہنچانے میں جان و مال اور صحت کسی بات کا خیال نہیں کیا اور میڈم چیانگ کائی شیک کی قابلیت اسی سے ظاہر ہے کہ اُس سے بڑھ کر طاقت ور عورت اس وقت دنیا کے کسی ملک میں نہیں۔

لیکن چین کی جنگِ آزادی میں عورتوں نے جو نمایاں خدمات سرانجام دی ہیں اس کی دلیل کے لئے ان خاص عورتوں کی مثال کی ضرورت ہی نہیں تھی مزدور عورتیں، کسانوں کی عورتیں، تاجروں اور کاروباری افراد کی عورتیں ـــ سبھی نے اپنے ملک کو بچانے کے لئے وہ وہ کام کئے ہیں کہ بے اختیار تحسین و ستائش کا کلمہ منہ سے نکل جاتا ہے۔ وہ عورتیں جو اس جنگ سے پیشتر ہنکاؤ اور شنگھائی میں صرف موزوں کے کارخانوں میں کام کر کے روزی کماتی تھیں انہوں نے بھی ملکی اور قومی مفاد کے لئے انجمنیں بنائی ہیں۔ شنگھائی کی انجمن کی لیڈر ایک ایسی عورت

ہے جو جنگ سے پیشتر شبانہ محفلوں کی جان سمجھی جاتی تھی۔ ان اربابِ نشاط نے اپنے ہوٹلوں یا رقص گاہوں کے مالکوں کو بھی مجبور کر دیا ہے کہ وہ اپنی عمارتوں کو پناہ گزینوں کے لئے وقف کر دیں یا ہسپتال بنا دیں اور ان ہسپتالوں میں یہ گانے اور ناچنے والیاں خود مرہم پٹی کرتی اور زخمی سپاہیوں کی خدمت میں معروف رہتی ہیں۔ ہنکاؤ کی گانے والیوں نے پرانے عشقیہ گیتوں کو بدل کر چین کے رزمیہ کارناموں کا ذکر ان گیتوں میں ملا لیا ہے۔

چینی عورتوں نے میدانِ جنگ میں بھی جو خدمات سرانجام دی ہیں ان کی اہمیت ذیل کے واقعے سے واضح ہوتی ہے:۔

سپاہیوں کا ایک پورا دستہ میدانِ جنگ سے بھاگ نکلا۔ افسروں کے احکام کی پروا نہ کرتے ہوئے اور اپنی بندوقیں پھینکتے یا یونہی بار دھراؤ دھرے معنی طریق پر چلاتے ہوئے وہ بھاگے۔ ان کے فرار کے راستے میں ایک گاؤں پڑتا تھا۔ اُن کی فرار کی خبر سن کر شنگھائی کی مزدور عورتوں کی ایک انجمن کی لڑکیاں جن کی لیڈر ایک معنذ مس ہولان شیع تھی اُس گاؤں میں جا پہنچیں تاکہ اُن بھاگتے ہوئے سپاہیوں کو کسی طرح روکا جائے۔ سب سے پہلے تو انہوں نے جاتے ہی اس گاؤں کے لوگوں کو اپنے ساتھ ملا لیا اور وہاں زخمیوں کی امداد کا ایک مرکز قائم کر دیا اور سب کے لئے چائے کا انتظام بھی کر لیا۔ اس کے بعد جب سپاہی اس گاؤں تک پہنچے تو انہوں نے اپنی خدمات پیش کیں۔ مرہم پٹی اور چائے نوشی کے دوران میں وہ اُن سے میدانِ جنگ کے متعلق باتیں کرنے لگیں اور انہیں یونہی بتلانے لگیں کہ کس طرح چینی افواج کامیابی سے دشمن کا مقابلہ کر رہی ہیں اور پھر پوچھا کہ تم لوگ کہاں سے آ رہے ہو اور اب کدھر کا رُخ ہے؟ جب انہوں نے جواب دیا کہ ہم میدان سے گریز کرتے ہوئے آ رہے ہیں تو لڑکیوں نے بہت حیرانی ظاہر کی اور اُن کی بات ماننے سے انکار کیا اور بولیں کہ اگر تم لوگ اور پیچھے ہٹتے گئے تو ان بہادر سپاہیوں کا کیا حال ہو گا جو نہایت تندہی سے دشمن کے مقابلے میں ڈٹے ہوئے ہیں؟

ان لڑکیوں نے اُن بھگوڑے سپاہیوں کو بُرا بھلا نہ کہا انہوں نے صرف میدان والے سپاہیوں کی حالت پر اظہارِ افسوس ہی کیا۔ سپاہی چند گھنٹوں تک تو گاؤں ہی میں رہے اور آپس میں صلاح مشورہ کرتے رہے اور پھر چپکے سے گاؤں سے نکل کر باہر اکٹھے ہوئے اور میدانِ جنگ کی طرف چلے گئے۔

بسنت سہائے

غزل

پھر بہار آئی نظامِ سنبلستاں دیکھئے
پردۂ ہر گُل میں پھر چاکِ گریباں دیکھئے

فصلِ گُل ہے، ابرِ باراں ہے، ہوا ہے عطربار
آئیے اور میری بربادی کے ساماں دیکھئے

خون ہر اک نوکِ مژگاں پر چھلک کر آ گیا
میرے اشکوں میں مری حسرت کا عنواں دیکھئے

مطربوں کے جانفزا نغموں سے جی اُکتا گیا
اب کسی دن چھیڑ کر سازِ رگِ جاں دیکھئے

جو لبِ راوی پہ دیکھا تھا کبھی آنکھوں نے خواب
دل یہ کہتا ہے وہی خوابِ پریشاں دیکھئے

وسعتِ صحرا ہر اک ذرے کے دل کو ہے نصیب
ڈوبئے گر ایک قطرے میں تو طوفاں دیکھئے

دیدۂ ظاہر سے حالِ دل پڑھا جاتا نہیں
چشمِ باطن سے مرا شوقِ فراواں دیکھئے

آج اختر پھر چمن دیتا ہے پیغامِ جنوں
ٹکڑے ٹکڑے آج پھر جیب و گریباں دیکھئے

اختر ہوشیارپوری

حشر سے پہلے اُردو ڈراما نگاری

شاہانِ اسلام میں سب سے پہلے فرخ سیر نے ایک شخص نواز نامی کو حکم دیا کہ وہ کالیداس کے شہرہ آفاق ڈرامے شکنتلا کو اردو کا جامہ پہنائے، ترجمہ تو ہوگیا لیکن بالکل نایاب ہے۔ آخر واجد علی شاہ کے زمانے میں امانت نے "اندرسبھا" لکھی۔ یہ ایک ڈراما ہے جو تمام کا تمام نظم میں لکھا گیا ہے۔ اس کے متعلق ادبی حلقوں میں بہت اختلافات ہیں۔ اور اس کی تصنیف کے متعلق کئی نظریات ہیں۔ جن میں سے ہم دو کا بیان کرتے ہیں۔

(۱) واجد علی شاہ کے حضور میں ایک فرانسیسی آیا۔ مختلف سامان تعیش کے بارے میں اُس نے اوپیرا کا ذکر کیا۔ چنانچہ واجد علی شاہ نے امانت کو حکم دیا کہ وہ ایک اوپیرا تیار کرے۔ امانت نے "اندرسبھا" تیار کیا۔ بادشاہ نے اسے قیصر باغ میں سٹیج کیا۔ خود "اندر" کا پارٹ لیا اور درباریوں کو دوسرے پارٹ دیئے گئے۔ اس نظریئے کو نور الٰہی محمد عمر صاحبان مصنفین ناٹک ساگر اور پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی کی تائید حاصل ہے۔

(۲) دوسرے نظریئے کے مطابق واجد علی شاہ یا شاہی خاندان کے کسی اور رکن نے "اندرسبھا" میں حصہ نہیں لیا۔ بلکہ واجد علی شاہ نے کنہیا جی کی دل نواز زندگی کو دیکھ کر ایک طبعزاد ڈراما تیار کروایا جس میں خود "کنہیا پیا" بنتے اور منتوعات گوپیاں بنتیں۔ لوگوں نے شاہی ڈراموں کی دیکھا دیکھی "اندرسبھا" جیسے ڈرامے کرنے شروع کر دیئے۔ مولانا شرر مرحوم اس نظریئے کے حامی تھے۔

اصل میں بات یہ ہے کہ یہ دونوں نظریات غلط ہیں۔ واجد علی شاہ کے ایما پر اندرسبھا نہیں لکھی گئی۔ اور نہ "اندرسبھا" کبھی شاہی ڈراما بنا۔ نیز یہ کہنا کہ واجد علی شاہ نے کنہیا جی کی زندگی کو دیکھ کر خود ایک ڈراما لکھا۔ اور اس میں حصہ لیا یہ بھی غلطی سے خالی نہیں۔

یہ کہنا کہ واجد علی شاہ کے حضور میں ایک فرانسیسی آیا۔ سراسر مضحکہ خیز ہے۔ کیونکہ واجد علی شاہ کے زمانہ میں فرانسیسی حکومت ختم ہو چکی تھی۔ اور ہندوستان کی بساطِ حکمت عملی پر اُن کے تمام مہرے پٹ چکے تھے اور واجد علی شاہ کے مقربین میں کسی فرانسیسی کا ہونا سراسر ناممکنات سے ہے۔

اب مسئلہ بحث یہ ہے کہ اندرسبھا کس کی فرمائش پر لکھی گئی۔

یہ تو صاف ظاہر ہے کہ امانت کی دربار تک رسائی نہ تھی کیونکہ اگر ہم امانت اور واجد علی شاہ کی زندگیوں کا مطالعہ کریں۔ تو اس کا کافی ثبوت مل جاتا ہے۔ امانت ۱۲۳۱ھ میں پیدا ہوا اور واجد علی شاہ ۱۲۴۲ھ میں۔

۱۲۵۱ھ میں امانت کی طاقتِ گفتار میں فرق آگیا۔ تقریباً دس سال اسی طرح گزرے صحت ہوگئی۔ لیکن زبان میں لکنت باقی رہی۔ اُن کی طبیعت گوشہ پسند اور تنہائی کی عادی تھی۔ اس لئے گھر سے بہت کم باہر نکلے۔ ملاحظہ ہو شرح اندرسبھا "وضع کے خیال سے کہیں جاتا تھا نہ آتا تھا۔ زبان کی وابستگی سے گھر میں بیٹھے بیٹھے جی گھبراتا تھا۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ حاجی مرزا عابد علی عبادت نے کہا کہ بیٹھے بیٹھے گھبرانا عبث ہے۔ ایسا کوئی جلسے کے طور پر طبعزاد قلم کیا چاہیئے۔ کہ دو چار گھڑی دل لگی کی صورت ہوئے اور خلق میں شہرت ہوئے۔"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امانت کی صحت تک واجد علی شاہ سترہ اٹھارہ برس کے ہو چکے تھے۔ گو تخت نشین نہ ہوئے تھے لیکن موسیقی اور شاعری میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت تک امانت واجد علی شاہ کے حضور میں نہیں گیا تھا کیونکہ جب زبان کی وابستگی اور لکنت احباب کے ہاں جانے کے مانع تھی تو دربار شاہی میں اس حالت میں وہ کیسے جا سکتا تھا۔ صحت کے چھ سات سال بعد ایک دوست حاجی عابد علی عبادت کی فرمائش پر اندرسبھا لکھی جانی شروع ہوئی۔ اور ۱۲۷۰ء میں تیار ہوئی۔ چنانچہ حاجی مرزا عابد علی عبادت نے جن کی فرمائش پر اندرسبھا تیار ہوئی، یہ تاریخ نکالی۔

کہی خوب تاریخ تُو نے عبادت   رقیع امانت کی اندرسبھا ہے

جب اندرسبھا تیار ہوئی۔ تو کئی لوگوں نے اس میں پارٹ لینا چاہا جس پر جھگڑا بھی پڑ گیا۔ لیکن بعد میں فیصلہ ہوگیا۔

حضرات نور الٰہی محمد عمر نے سٹیج اور پردوں کو فرانسیسی سنگیت (اوپیرا) کا اثر ظاہر کیا ہے۔ حالانکہ سٹیج سنسکرت ڈراما نے صدیوں پہلے سے متعارف کر رکھا تھا اور پردوں کے متعلق یہ عرض ہی کافی ہے کہ ان پردوں سے مراد منظر نہیں ہے بلکہ وہ پردے جو سفید یا کسی ایک رنگ میں رنگے ہوئے ہوتے تھے۔ اور جن کی ضرورت صرف اس لئے محسوس ہوتی تھی کہ سٹیج پر اداکار بن ٹھن کر تیار ہو جائیں اور پھر پردہ اُٹھا دیا جائے۔ پردوں سے اُس وقت پس منظر کا کام نہیں لیا جاتا تھا۔

بعض لوگوں کی رائے ہے کہ واجد علی شاہ "رہس" میں کنہیا جی کا پارٹ

ادا کرتے تھے۔ حالانکہ اگر واجد علی شاہ کی اُس تصنیف کا مطالعہ کیا جائے جس کا نام "بنسی" ہے اور جس میں اس قسم کے تمام جلسوں کا ذکر ہے۔ تو اُس میں اس بات کا نام ونشان بھی نہیں ملتا کہ وہ کنہیا جی کا پارٹ ادا کرتے تھے اور جب وہ کنہیا جی کا پارٹ نہیں ادا کرتے تھے تو راجہ اندر کا پارٹ کیسے ادا کرتے ہونگے؟

نیز "امانت" تو واجد علی شاہ کا درباری شاعر یا مصاحب بھی نہ تھا۔ کیونکہ بادشاہ کی متعدد تصانیف میں سے کسی میں بھی امانت کا ذکر نہیں۔

مندرجہ بالا سطور سے یہ واضح ہوگیا ہے کہ "اندر سبھا" واجد علی شاہ کے ایما پر تیار نہیں ہوئی۔ نہ اسے شاہی سرپرستی حاصل ہوئی۔ نہ کسی فرانسیسی نے واجد علی شاہ سے سنگیت (اوپیرا) کا ذکر کیا۔

اندر سبھا کا خلاصہ یہ ہے کہ راجہ اندر دربار لگائے بیٹھا ہے۔ پکھراج پری نیلم پری اور لال پری یکے بعد دیگرے گاتی اور رقص کرتی ہیں۔ سبز پری کے آنے تک اندر سو جاتا ہے۔ سبز پری اپنے باغ سے اڑ کر ہند کی طرف نکلی۔ اُس کی نظر ایک باغ پر پڑی۔ یہاں ایک حسین اور نوجوان شہزادہ "گلفام" سویا ہوا تھا۔ پری کو اُس سے محبت ہوگئی۔ واپس آکر سبز پری نے کالے دیو سے کہا "کہ وہ "گلفام" کو لے آئے۔ وہ اُسی وقت گیا اور اُسے لے آیا۔ شہزادہ خواب سے چونک کر اپنے آپ کو ایک نئی دنیا میں دیکھتا ہے سبز پری اُسے تمام کہانی سناتی ہے اور حرف مدعا زبان پر لاتی ہے۔ گلفام اندر کے دربار کی سیر کی خواہش کرتا ہے۔ پری کے ہاتھوں کے طوطے اڑ جاتے ہیں۔ شہزادہ کو سمجھانے کی کوشش کرتی ہے کہ وہاں آدمی زاد کا دخل ناممکن ہے۔ شہزادہ گلفام اُسے طعنہ دیتا ہے کہ ؎

تو کسی دیو کی خدمت میں وہاں جاتی ہے۔ اس لئے مجھ کو سبھا میں نہیں لے جاتی ہے

وہ اس پر بہت سیخ پا ہوتی ہے اور دیو کو گالیاں دیتی ہے۔ شہزادہ کہتا ہے کہ اگر اُسے اندر پوری میں نہ لے جایا گیا۔ تو وہ خودکشی کرے گا۔ پری اُسے لے جا کر ایک درخت کی آڑ میں چھپا دیتی ہے اور پھر اندر کی سبھا میں رقص کرتی ہے لال دیو گلفام کو دیکھ کر راجہ سے مخبری کرتا ہے۔ راجہ پری زاد اور آدمی زاد کی محبت کو نہایت قابلِ اعتراض قرار دیتے ہوئے گلفام کو ایک اندھے کوئیں میں قید کر دیتا ہے۔ اور سبز پری کے بال و پر نوچ کر اُسے جلاوطن کر دیتا ہے۔

سبز پری ایک جوگن بن کر گلفام کی تلاش میں صحرا نوردی کرتی ہے۔ ایک دن کالا دیو اُس کا ایک گیت سن لیتا ہے اور اُسے اندر کی سبھا میں لے جاتا ہے۔ اندر اُس کے گانے کو پسند کر کے اُسے منہ مانگی مراد دینے کا وعدہ کرتا ہے۔ وہ گلفام کو مانگتی ہے۔ گلفام اُسے مل جاتا ہے۔ دونوں کی ملاقات ہوتی ہے۔ پریاں مبارکبادی گاتی ہیں اور پردہ گر جاتا ہے۔"

اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ "امانت" نے اس ڈرامے کا پلاٹ کہاں کہاں سے لیا۔

میر حسن کی مثنوی "سحر البیان" میں جو قصہ بیان کیا گیا ہے۔ اُس کے کئی واقعات "اندر سبھا" کے واقعات سے ملتے ہیں۔ ذیل میں "سحر البیان" کا خلاصہ بھی دیا جاتا ہے۔ تاکہ ہر دو قصص کا موازنہ کیا جا سکے۔

"ایک بادشاہ کی نرینہ اولاد نہ ہوتی تھی۔ نجومیوں سے دریافت کیا۔ تو معلوم ہوا کہ لڑکا پیدا تو ہوگا۔ لیکن عمر کے بارھویں سال اُسے ایک خطرہ کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ لڑکا پیدا ہوا۔ نام "بینظیر" رکھا گیا۔ اس کی عمر کے بارھویں سال اُسے بہت احتیاط سے رکھنا شروع کیا گیا۔ ایک چاندنی رات میں وہ اپنے محل کے بام پر سویا ہوا تھا کہ ایک پری نے اُسے دیکھ لیا۔ وہ اُس پر عاشق ہوگئی۔ اور اُسے وہاں سے اُٹھا لے گئی۔ پرستان جا کر شاہزادہ کو ایک کل کا گھوڑا دیا۔ ایک دفعہ سیر کرتے ہوئے شاہزادہ بدر منیر کے باغ میں پہنچ گیا۔ بدر منیر کو اُس سے محبت ہو گئی۔ کئی روز تک آمدورفت جاری رہی۔ ایک دیو نے پری کو تمام قصہ سنا دیا۔ پری کو سخت غصہ آیا۔ اُس نے بینظیر کو کنوئیں میں قید کر دیا۔" بدر منیر" کی سہیلی نجم النساء ایک جوگن کا بھیس بدل کر نکلتی ہے۔ جنوں کے بادشاہ کے لڑکے فیروز بخت کو اُس سے محبت ہو جاتی ہے۔ وہ اُسے بادشاہ کے پاس لے جاتا ہے۔ بادشاہ اُس کے گیت سن کر بہت خوش ہوتا ہے۔ موقع پا کر نجم النساء فیروز بخت سے بےنظیر کا ذکر کرتی ہے۔ فیروز بخت کی مدد سے بےنظیر مل جاتا ہے۔ بےنظیر بدر منیر سے جا ملتا ہے اور نجم النساء اور فیروز بخت مل جاتے ہیں۔"

ان ہر دو قصص میں مندرجہ ذیل واقعات مشترکہ ہیں۔

(۱) چاندنی رات میں گلفام کی خواب گاہ اُس کا حسن اور سبز پری کا اُس پر عاشق ہونا بالکل "سحر البیان" والی چاندنی رات، بےنظیر کی خواب گاہ، اُس کے حسن اور پری کے اُس پر عاشق ہو جانے سے ملتا ہے۔

(۲) گلفام سبز پری کے پاس پہنچ کر اُس سے حیرت سے پوچھتا ہے کہ میں کہاں ہوں کس فضا میں ہوں۔ اور کیسے آیا ہوں۔ بےنظیر بھی پری سے یہی سوال کرتا ہے۔

(۳) کوہ قاف کے کنوئیں میں دونوں شہزادوں کا قید ہونا اندر سبھا اور سحر البیان دونوں میں مشترک ہے۔

(۴) جوگن کا بھیس اور گانے کا ذکر دونوں قصوں میں ایک ہے۔

(۵) دونوں کا خاتمہ بھی ایک ہی سا ہوتا ہے۔ ...

... نہ صرف واقعات ہی مشترکہ ہیں۔ بلکہ خیالات اور عبارت بھی ایک ہیں۔

نیز مندرجہ ذیل اشعار" بدر منیر" سے اخذ کر کے مختلف مقامات پر اندر سبھا میں درج ہیں ؎

کرم مجھ پہ رکھیو سدا میری جان   میں دل چھوڑے جاتی ہوں اپنا نشان

چاندنی کے سماں کے متعلق حسن کے دو اشعار نقل کئے گئے ہیں ؎

وہ چھٹکی ہوئی چاندنی جا بجا   وہ جاڑے کی آمد وہ ٹھنڈی ہوا

وہ نکھرا فلک اور مہ کا ظہور   لگا شام سے صبح تک وقت نور

جوگن کے حسن کے متعلق بھی ایک شعر نقل کیا گیا ہے ؎

کرے حُسن کو کس طرح کوئی ماند   چھُپے ہے کہیں خاک ڈالے سے چاند

اور جب جوگن کو زبردستی لے جاتے ہیں تو وہاں بھی حسن کا ایک شعر درج ہے ؎

زمین سے اُڑا آسماں کے تئیں   وہ کتنا کہا کی نہیں رے نہیں

اس تمام بحث سے مقصود یہ ہے کہ اُردو ڈراما کا آغاز مثنوی سے ہوا۔ نہ کہ بقول کسے اوپیرا کی تقلید سے۔

اب اندر سبھا کے متعلق ایک اور امر قابل بیان ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ اندر سبھا میں راجہ اندر کے پردہ میں واجد علی شاہ کے دربار کا منظر پیش کیا گیا ہے اس لئے ممکن ہے کہ یہ ڈراما واجد علی شاہ کے حکم پر لکھا گیا ہو۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہر ڈرامانگار فسانہ نویس یا شاعر خواہ کسی دوسرے زمانے کو ظاہر کرتے ہوئے کوئی ڈراما یا افسانہ یا نظم لکھے ضروری ہے کہ وہ عمداً یا بے ارادہ اپنے ماحول اور فضا کا ذکر کرے۔ یہی وجہ ہے کہ جب عباداتت کی طرف سے" اندر سبھا" کے لکھنے کی فرمائش ہوئی تو امانت کو واجد علی شاہ کے دربار کا خیال آگیا۔ مثنوی" بدر منیر" میں میر حسن کے زمانہ کے طریق بود و باش اور معاشرت کا نمونہ پیش کیا گیا ہے اور میر حسن نے تمام کرداروں کو اپنی سوسائٹی کے رنگ میں رنگا ہے۔

" اندر سبھا" کا درجہ اس حیثیت سے کہ یہ اُردو کا سب سے پہلا ڈراما ہے بہت بلند ہے۔ مولانا حسرت موہانی کی رائے میں" اندر سبھا مغرب کے اکثر ڈراموں سے بہتر ہے"۔

اندر سبھا میں امانت کی چند دلفریب غزلیں بھی ہیں۔ جن کی شوکتِ الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ موجودہ زمانہ میں لکھی گئی ہیں۔ امانت کے تخیل کی بلند پروازی نے اندر سبھا کا معیار بہت بلند کر دیا ہے۔ نیز اس میں استعارات اور تشبیہات کی پختگی بھی قابل ذکر ہے۔

" اندر سبھا" کی تعریف میں ایک صاحب لالہ کنور سین ایم اے بیرسٹر ایٹ لا نے فرمایا ہے کہ اس کی نثر بلا تصنع سلیس، با محاورہ اور قافیہ بندی سے آزاد ہے" حالانکہ اس ڈراما میں نثر کا نام و نشان بھی نہیں۔ سوائے ان مقامات کے جب امانت منظر کے ظاہر کرنے کے لئے ایک یا دو سطریں نثر میں لکھتا ہے۔

اب اندر سبھا کے ایک چھوٹے سے دلچسپ منظر کو دیکھئے۔

سبز پری کے پاس جب کالا دیو گلفام کو لے آتا ہے تو گلفام سبز پری سے پوچھتا ہے کہ وہ کہاں ہے اور جب حالات سے واقف ہوتا ہے تو سبز پری سے کہتا ہے۔

گلفام :- میرا تجھ سی زمانہ میں نہ ہوگی زنہار   آپ بدنام ہوئی مجھ سے چھڑایا گھر بار

بھیج کر دیو مجھے کھینچ بلایا تُو نے   آدمی زاد کو پھندے میں پھنسایا تُو نے

سبز پری :- زندگی کا ہے مزہ ایسی ملاقاتوں میں   پھر نکلے مجھ سے بگھار و نہ ذرا باتوں میں

دیکھ پچھتائے گا میرا جو بُرا دل ہوگا   وصل تجھ کو نہ پری کا کبھی حاصل ہوگا

گلفام :- گھر کے چھٹنے کا ہے غم آہ و فغاں کرتا ہوں   وصل کا وعدہ میں اس شرط سے ہاں کرتا ہوں

اندر سبھا کے اکھاڑے کا ذکر کرتے ہوئے

ساتھ اپنے مجھے لے چل وہی جلسہ دکھلا   راجہ اندر کے اکھاڑے کا تماشہ دکھلا

سبز پری :- ایسی باتوں کا زباں پر نہیں لانا اچھا   جان آفت میں نہیں مفت پھنسانا اچھا

آفت آجائے گی تجھ پر ارے اک آن کے بیچ   آدمی زاد کا کیا کام پرستان کے بیچ!

کوئی راجہ کو خبر جا کے لگا دیوے گا   پھونک دے گا وہ مجھے، تجھ کو جلا دیوے گا

اس پر گلفام اُسے بھڑکاتا ہے۔

گلفام :- تو کسی دیو کی خدمت میں وہاں جاتی ہو   اس لئے مجھ کو سبھا میں نہیں لے جاتی ہے

سبز پری :- بات ہرگز یہ زباں سے نہ نکالو صاحب   ہوش میں آؤ، ذرا مُنہ کو سنبھالو صاحب

میں پری ہو کے اور ایسے پہ فدا جان کروں   ایڑی چوٹی سے موئے دیو کو قربان کروں

گلفام :- واں نہ لے جائے گی تو جی سے گزر جاؤں گا   میں ابھی اپنا گلا کاٹ کے مر جاؤں گا

سبز پری :- تھک گئی ہونٹ کہاں تک لیے سمجھا دوں میں   چل لگا رعب تجھے اندر کا دکھلاؤں میں

گلفام :- کوئی اُٹھ چلنے کی تدبیر بتا دے مجھ کو   پر کسی دیو کے تو فوج کے لادے مجھ کو

سبز پری :- تھام او پایہ مرے تخت کا اب ہاتھ سے تم   چھوٹ جانا نہ کہیں راہ میں پر ساتھ سے تم

کسی آفت میں یکایک اگر آ نا جانی!   یاد رکھنا کہ مجھے بھول نہ جانا جانی

مداری لال نامی ایک کائستھ نے بھی اندر سبھا لکھی۔ لیکن چنداں مقبول نہ ہوئی۔

لکھنؤ میں جو ہنگامہ ہوا تو وہاں سے اندر سبھا چل کر بمبئی پہنچی۔ جہاں یہ میلوں تہواروں پر دکھائی جانے لگی اور اتنی مقبول ہوئی کہ ہر ایسی جگہ پر اسے کھیلا جانے لگا۔ جہاں کوئی پبلک مقام ہوتا۔ اکثر ایسے ڈرامے ہوتے جو ہندوؤں کے تاریخی واقعات سے متعلق تھے۔ اُن سے عوام کو دلچسپی نہ تھی۔ کیونکہ وہ ہندی زبان کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ اُدھر پارسی نوجوانوں کو خیال آیا کہ کیوں نہ وہ اپنے قومی کارناموں کو سٹیج کریں۔ یوں تفریح بھی ہو جائیگی اور ساتھ ہی تبلیغی کام بھی ہوتا رہیگا۔ چنانچہ چند پارسی نوجوانوں نے" رستم اور سہراب" کو سٹیج کیا۔ یہ کھیل بہت مقبول ہوا۔ گو ابتداء

میں اسے نہایت ہی معمولی سامان سے تیار کیا گیا تھا پھر بھی وہ لوگ جنہوں نے یہ سب کے ڈراموں کو دیکھا ہوا تھا۔ اس سے دلچسپی لینے لگے اور اُنہوں نے تنقید و تعریض کے علاوہ مفید مشورے بھی دیئے۔

جب پارسیوں نے یہ دیکھا کہ کاروباری نکتہ نگاہ سے بھی ڈراما بہت اچھی چیز ہے تو اُنہوں نے دہلی، بمبئی اور کلکتہ میں تھیٹریکل کمپنیاں کھولی ہیں۔ سب سے پہلی کمپنی سیٹھ پیسن جی فرام جی نے "اوریجنل تھیٹریکل کمپنی" کے نام سے قائم کی۔ اس کمپنی کے بڑے بڑے ایکٹر خورشید جی بالی والا، کاؤس جی کھٹاؤ، سہراب جی اور جہانگیر جی تھے چونکہ اس کمپنی کے قیام کا مقصد مالی تھا۔ اس لئے اس کے ڈراموں میں ایک خاص قسم کی زبان اُردو استعمال کی گئی۔ جو گجراتی، پوربی، ہندی اور بنگالی وغیرہ کے امتزاج سے پیدا ہوئی۔ ڈراموں میں زیادہ تر نظم ہی استعمال ہوئی۔ اس کمپنی کے اولین ڈراما نگار منشی محمد میاں رونق تھے۔ مصنفین ناٹک ساگر نے انہیں بنارسی لکھا ہے۔ لیکن احسن لکھنوی کی رائے میں وہ دکنی تھے۔ آپ نہایت ذکی الحس اور طباع تھے آپ کے تخیلات بہت بلند تھے۔ آپ کی شاعری بھی تخیل کے اعتبار سے پاکیزہ اور گراں قدر تھی۔ آپ کے ڈراموں میں مغربی تخیل موجود تھا۔ یا تو آپ خود انگریزی جانتے تھے یا کسی اور کی معرفت مغربی ڈرامہ نگاروں کے تراجم مل گئے ہوں گے۔ آپ کے دو مشہور ڈرامے "گل بصنوبر" اور "عاشق کا خون" ہیں۔

آپ کے بعد حسینی میاں ظریف نے اس کمپنی کے لئے متعدد ڈرامے لکھے۔ چند ڈراموں کے نام درج کئے جاتے ہیں۔ نتیجۂ عصمت، گل بکاؤلی، چترا بکاؤلی، بدر منیر، حاتم طائی، شیریں فرہاد، نیرنگ عشق، عشرت سبھا، اندر سبھا فرخ سبھا وغیرہ۔ آپ لحیم و شحیم بلند بالا وجیہہ آدمی تھے۔ مسٹر فرودزجی پرپی کے خاص منشی تھے اور غالباً ایک ورنیکلر سکول کے مدرس بھی رہے تھے۔ آپ کی تصانیف کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ لیکن نظم و نثر میں خامیاں بھی بہت تھیں۔ فن کے اعتبار سے بھی آپ کے ڈراموں کی کوئی خاص وقعت نہ تھی۔ احسن لکھنوی کے قول کے مطابق "میاں ظریف اصول سے اس درجہ نا واقف تھے کہ جو کچھ کہتے وہ خود بھی نہ سمجھتے"۔ بہر حال آپ نے زبانِ اُردو کو بہت تقویت دی اور اسے بہت مقبول بنایا۔ آپ کے ڈراما نیرنگِ عشق میں سے ایک منظر کا ایک حصہ پیش کیا جاتا ہے۔

نزن:۔ ابھی سنتے ہو یا نہیں؟

گورو:۔ ہاں سنتا تو ہوں۔ کہو کیا کہنا ہے؟

نزن:۔ ہائے ہائے اب کیا کریں، کہاں تک بھوکے مریں۔ اوپاس اوپاس کرتے کرتے بدحواس ہو گئی۔ مارے بھوک کے پران جاتے ہیں۔ جل پی پی کے سوتی ہوں تو آنکھوں میں نیند بھی نہیں آتی۔ افسوس تم دام دام جپا کرتے ہو نیکی پر مرتے ہو۔ مگر یہ زمانہ کچھ اور ہے۔ نرالا طور ہے۔ مکر و فریب کا دور ہے یہ سب نیکیاں گنگا جی میں بہا دو۔ دریائے بدی کے غوّاص بنو۔ کیھوں یا جوار لا دو۔ جس سے جان بچے۔

گورو:۔ واہ واہ تم نے سچ کہی۔ اپنا اوپاس کرنا اور تپس کرنا گیا آتش بھوک میں تپنا ہے اور جگ سوگ ہر نام کا سپنا ہے۔ بہتر تو یوں ہے کہ رام رام جپنا پرایا مال اپنا۔ سن تو اب ایک فریب نادر کرتا ہوں۔ دو تھالیاں لے لے۔ ایک کے پیچھے کالا رنگ لگا دے اور ایک آئینہ بھی دے۔ میں جا کر ضرور روپے پیدا کر لیتا ہوں۔

نیرنگ عشق سے اُنہوں نے ہر ڈراما میں مزاحیہ سین دوسرے مناظر کے ساتھ ساتھ داخل کرنے شروع کر دیئے۔ مندرجہ بالا منظر کا لکھا ہے اور اصل ڈرامہ وہ ہمیشہ نظم میں لکھا کرتے تھے۔ ۱۸۸۵ء تک جتنے ڈرامے لکھے گئے وہ تمام نظم میں تھے۔ سوائے اُن حصوں کے جو کامک ہوتے تھے۔

بالی والا وکٹوریا ناٹک کمپنی کے واحد مالک تھے اور آپ کو ایک کامیڈین ہونے کی حیثیت سے بہت شہرت حاصل تھی۔ ۱۸۸۱ء میں لارڈ لٹن کے دربار دہلی میں اس کمپنی نے بہت روپیہ کمایا۔ پھر لندن گئے۔ لیکن وہاں بہت نقصان ہوا اس کمپنی کی مشہور ایکٹرس مس مہتاب، مس خورشید اور مس میری فینٹن تھیں ایکٹروں میں رستم جی نمایاں تھے۔

اس کمپنی کے ڈرامے منشی ونایک پرشاد طالب بنارسی لکھتے تھے۔ آپ پہلے کلکتہ کے ڈاک خانہ میں ملازم تھے۔ مضمون لکھنے کا شوق تھا۔ پنجاب کے نامور مرحوم رسالہ "مخزن" میں آپکے متعدد مضامین چھپتے رہے ہیں، نہایت خلیق اور شریف الطبع تھے آپ راسخ دہلوی کے شاگرد تھے اور اُن کے شاگردوں میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ آپ پہلے شخص تھے جنہوں نے ڈراموں میں نثر کو بھی داخل کیا ہے۔ ہندی گانوں کے بجائے اُردو گانے رائج کئے۔ اُن کے ڈراموں میں مزاحیہ عنصر زیادہ تھا۔ اور آپ مزاحیہ عنصر کو نمایاں کرنے پر مجبور تھے۔ کیونکہ وکٹوریہ کمپنی کے مالک بالی والا نہایت ہر دلعزیز طربیہ اداکار تھے اور عوام محض اُن کی طربیہ اداکاری سے محظوظ ہونے کے لئے تھیٹر کو کھچا کھچ بھر دیتے تھے۔ آپ کچھ انگریزی بھی جانتے تھے۔ اسی لئے آپ نے لٹن کے مشہور ناول لیلے اینڈ موزنگ کے پلاٹ کو اخذ کر کے لیل و نہار کے نام سے ایک ڈراما لکھا۔ یہاں اُن کے ایک مشہور ڈرامے گوپی چند سے ایک منظر دیا جاتا ہے۔

"داب اوّل سین دسواں۔ دیوان خانہ۔ رانی مینا وتی کو منانے ہوئے گوپی چند کا آنا"

گوپی چند۔ اگر یوں نہ ہو۔ تو میری رانی نے تجھے کچھ بدسخن سنایا ہوگا۔

میناوت۔ نہیں گوپی چند نہیں تیری رانی ایسی بے ادب نہیں جو میرا دل دکھائے
میں نے کسی کو کبھی نہیں ستایا۔ پھر کوئی مجھے کیسے بیزار کرے۔

گوپی چند۔ شاید کسی نوکر نے تیری نافرمانی کی ہوگی۔

میناوت۔ سب نوکر بڑی ہوشیاری سے میرا ہر ایک فرمان بجالاتے ہیں۔ میں نوکروں
کی بھی ستائی ہوئی نہیں ہوں۔

گوپی چند۔ میری رعیت میں سے کسی نے تجھ پر نظر اُٹھائی یا دربار کے کسی امیر
نے تیرے روبرو بے ادبی کی ہے۔

میناوت۔ بے گناہ رعیت کو میں بے ادبی کا داغ لگانے سنددگی اور نمک حلال
درباریوں کے نام بھی خطا کا چھینٹ ڈالنا مناسب نہیں۔

گوپی چند۔ ماتا پیاری پھر کس نے تجھے آزردہ کیا۔ کیا وہ تقصیروار میں تیرا نابکار بیٹا ہوں
بتائیے کہ میں معافی چاہوں۔

میناوت۔ بیٹا کیوں ضد کرتا ہے میں نے ایک بار کہا کہ میں غمگین نہیں ہوں اور
اگر ایک بار کسی غم نے مجھ پر چنگل بھی مارا ہو تو بھی مجھ کو سزاوار نہیں کہ اپنے
رنج کے مرض سے تجھے میں ہلاک کر دوں۔

گوپی چند۔ نیک مادر۔ یہ کیسے سخن کیا میں تیرے دُکھ سکھ کا ساتھی نہیں ہوں؟
تجھ پر گرتی ہوئی آفت کی بجلی مجھے اپنے سر پر روک نہ لینا چاہیئے۔ ماتا
تو ہرگز اپنی رنجیدگی کا سبب نہ چھپا۔ تجھے میری جان کی قسم۔ جلد بتا۔

میناوت۔ افسوس کہ تیری قسم سے دل کا بھید تجھے کہنا ہی پڑا۔ سن گوپی چند۔ مجھے
یہ رنج ہے کہ اس چند روزہ دنیا میں تو نے ابھی تک کوئی کامل مرشد نہیں
کیا جو تجھے راہ نجات کی بتا دے اور اس مکار دنیا کے دامِ فریب سے
بچائے اس لئے بیٹا کوئی گرو کرتا کہ سکھ دونوں میں رہے۔

گوپی چند۔ مگر اس جھوٹی دنیا میں سچا گرو کون ہے میں کسی گرو کو نہیں پہچانتا۔ میرا
گرو وہی کرتار سرجن ہار ہے۔

میناوت۔ سچا ہے بیٹا سب گرو کا گرو تو وہی کرتار سرجن ہار ہے پر اس کرتار کو پانے
پہچاننے کو دنیا کا کوئی کامل مرشد کرنا ضروری ہے جیسا کہ راجہ تک پہنچنے
کو درباری سے ملنا ضروری ہے۔

گوپی چند۔ گانا بھوپالی غزل

فضل ہے خدا کا مجھ پہ تیری مہربانی ہے
وقتِ شادمانی ہے بخت یار جانی ہے
گلشنِ جہاں پھر کیوں نہ پیوں جامِ عشرت!

موسم بہار آیا عالم جوانی ہے
عیش غنیمت جس کو غم سے دی زمانے نے فرصت
عالمِ فنا میں اپنی تھوڑی زندگانی ہے!
جتنے ہیں جہاں میں گرو میں کسی سے کم نہیں
مرشدوں کی باتیں ساری حرفِ لنترانی ہیں

میناوت۔ گوپی چند تکبر سے باز آ۔ تیری بات نے ثابت کر دیا ہے کہ سچے راستے سے
تو بالکل بے خبر ہے اگر تو باہر ہوتا تو یہ غرور تیرے منہ سے ظاہر نہ ہوتا۔
بیٹا ابھی تو نادان بے شعور ہے۔ اس لئے کسی گرو کا اپدیش لینا تجھے
ضرور ہے۔

گوپی چند۔ ماں شیری۔ تیرا کہنا میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا میں راج پاٹ چھوڑ دنیا سے
منہ موڑوں۔

میناوت۔ خدا سے دل لگا رکھ آپ کو مشغول دنیا میں
جس طرح کانٹوں میں رہ کر پھول دنیا میں
نہ اپنا فرض اے بیٹا تو ہرگز بھول دنیا میں
خدا کی بندگی کا رکھ سدا معمول دنیا میں
یہ دنیا نقش فانی ہے یا کہ کھیل پانی میں
رہو اس طرح دنیا میں کہ جیسے تیل پانی میں!

گوپی چند۔ سوچ کے اس بات کو خدمت میں پھر آؤں گا میں
ہو سکا مجھ سے تو آنکھوں سے بجالاؤں گا میں

میناوت ——— جا میرے لختِ جگر تجھ کو خدا توفیق دے
راہِ حق پر چلنے کی مولا تجھے توفیق دے

الفریڈ کمپنی۔ اس تھیٹر کو کاؤس جی نے قائم کیا تھا اور سب سے پہلے
ڈرامہ نگار منشی کریم الدین تھے۔ منشی کریم الدین نے ساٹھ سال کی عمر میں وفات پائی۔
احسن لکھنوی کے ایک دوست نے ان کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے، سانولا
رنگ، میانہ قد، لاغر اندام، ڈھیلا پیدار پاجامہ، دردامن گوٹ کا انگرکھا، دلی
کے سامنے چڑے کا جوتا۔ ایک رومال گز بھر لمبا کاندھے پر پڑا رہتا تھا۔ چہرہ پر
پوری داڑھی اور نہایت شوخ مزاج زندہ دل ظریف تھے۔ آپ دہی ڈرامانگار
تھے اور ڈراموں میں رینالڈ کے خیال کی جھلک تھی۔ خاندانِ ہامان، خداداد، چترا بکاؤلی
آپ کے کارنامہ ہیں۔

منشی مراد علی مرآد۔ آپ مولینا احسن لکھنوی کے ہم عصر تھے۔ پہلا الفریڈ
کمپنی میں رہے۔ پھر سہراب جی کی نیو الفریڈ کمپنی کے لئے ڈرامے لکھنے لگ گئے۔

تعجب ہے کہ جناب طالب عروض اور قافیئے کے ابتدائی اصولوں سے بھی واقف نہیں تھے یا یہ اُردو ڈراموں کے مسخ شدہ نسخوں کا کمال ہے جو جاہل ایکٹروں کی زبانی بے درد پبلشروں تک پہنچے تھے۔ (ادارہ)

فیض آباد کے رہنے والے تھے۔ معمولی تعلیم تھی۔ اوراد نٰے درجے کے ڈرامے لکھتے تھے۔ اُن کے ڈراما فسانۂ عجائب نے بہت شہرت پائی۔

سید مہدی حسن احسنؔ لکھنوی۔ آپ نواب میرزا شوق مصنف مثنوی زہرِ عشق کے پوتے ہیں۔ آپ پہلے پہل ۱۸۹۳ء میں بمبئی آئے۔ مسٹر رتن جی دادا بھائی ٹھوٹھی نے منشی کریم الدین کی وفات پر آپ کو ملازم رکھا۔ آپ کا پہلا ڈرامہ چندراولی تھا۔ بعد میں ہیملٹ، دلفروش، گلنار فیروز، بھول بھلیاں اور شریف بدمعاش لکھے۔ پھر الفریڈ کمپنی سے کنارہ کشی کر لی۔ کئی سالوں کے بعد آپ نے چلتا پرزہ لکھا جو نہایت مقبول ہوا۔ آپ کے زیادہ تر ڈرامے شیکسپیر سے ترجمہ کئے ہوئے ہیں۔ آخر عمر میں ڈرامہ نگاری چھوڑ کر مرثیہ گوئی شروع کی۔ نیز آپ نے مشہور اردو مرثیہ نگار انیسؔ کے سوانح حیات قلمبند کئے۔ ذیل میں ہم "ناٹک ساگر" سے نقل کرتے اُن کے ایک ڈرامے "خونِ ناحق" کا ایک مختصر سا منظر پیش کرتے ہیں۔ یہ ڈرامہ "شیکسپیر" کے "ہیملٹ" کا چربہ ہے۔

(ہیملٹ اپنے باپ کی روح سے ملتا ہے)

ہیملٹ (جہانگیر) یا اللہ کیسا دہشت ناک خواب ہے۔ جس سے دل کمبے حد
اضطراب ہے۔ میں جاگتا ہوں یا سوتا ہوں یا اپنے باپ کی روح سے
مقابل ہوتا ہوں۔ اے میرے باپ کا بھیس بدلنے والی روح تُو نیک ہے
یا بد ہے۔ مگر میرے لئے غیبی مدد ہے للہ مہر خاموشی دور کیجئے مغموم
دل کو مسرور کیجئے کچھ فرمایئے ملکِ عدم کی کہانی سنایئے ؎

اپنی حسرت کا نہ معلوم تھا انجام ہمیں + کس لئے چھوڑ دیا آپ نے ناکام ہمیں

روح - مر گئے پر نہ ملا قبر میں آرام ہمیں + شرم آتی ہے بتاتے ہوئے انجام ہمیں

پیارے جہانگیر میں تیرے باپ کی روح بیقرار ہوں اور بڑے عذاب میں
گرفتار ہوں۔ اگر میرے اعمال بد کا کفارہ ہو تو مجھ کو اس عذاب الیم
سے چھٹکارا ہو۔

جہانگیر - ہم تو آپ کو آرام سے کنجِ لحد میں سلا گئے تھے۔ یہ خزانہ تہ زمین دبا
گئے تھے اس خاک کو سونپے ہوئے جسم میں کیونکر جان آئی ؎

آپ کے بعد جہاں میں مجھے راحت نہ ملی + ہوں وہ بسمل کہ تڑپنے کی اجازت نہ ملی

بیتابؔ - پنڈت نرائن پرشاد بیتابؔ الفریڈ تھیٹریکل کمپنی کے لئے ڈرامے لکھا کرتے تھے۔ جن میں سے "قتلِ نظیر" خاص طور پر مقبول ہوا۔ بمبئی سے شیکسپیر نامی ایک رسالہ بھی شائع کیا کرتے تھے۔ لیکن یہ رسالہ کامیاب نہ ہو سکا۔ آپ کو اُردو کے علاوہ ہندی اور سنسکرت پر بھی کافی عبور تھا۔ نیز بعدہٗ ڈرامانگاری کے فکرِ سخن بھی کیا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں وہ سردار محمد طالبؔ تلمیذ غالبؔ اور منشی نظیر حسین سخاؔ سے اصلاح لیا کرتے تھے۔

ان ڈراما نگاروں کے علاوہ کئی اور حضرات نے بھی قدیم رنگ میں اُردو ڈرامے لکھے جن میں مندرجہ ذیل حضرات خاص طور پر مشہور ہیں۔

حافظ محمد عبداللہ۔ میرزا نظیر بیگ اکبرآبادی۔ غلام علی دیوانہ۔ محشر انبالوی۔ منشی رحمت علی۔ دوارکا پرشاد افق لکھنوی۔ آغا شاعر قزلباش مرحوم وغیرہ

قدیم ڈرامہ نگاری کی خصوصیات:۔ اب ہم قدیم اُردو ڈرامہ نگاری کی خصوصیات کو مختصر طور پر قلمبند کرتے ہیں۔ قدیم اُردو ڈراموں میں کئی مشترکہ خصوصیات ملتی ہیں۔ مثلاً گانوں کی بھرمار۔ ڈراما شروع ہوتا ہے تو گانوں سے۔ ختم ہوتا ہے۔ تو تب بھی گانا ہوتا ہے۔ بادشاہ سلامت ہوں تو وہ بھی گا رہے ہوتے ہیں۔ کوئی ان پڑھ شخص ہو۔ تو اُس کی زبان سے بھی اشعار ادا کرانے ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ دمِ نزع بھی گانے کے سوا اور کوئی چارا نہیں ہوتا۔ مثلاً "لیلیٰ مجنوں" میں لیلیٰ اپنے سینے میں خنجر مار کر گر جاتی ہے۔ چارپائی پہ لیٹتی ہے تو نہایت زور شور سے گانا شروع کر دیتی ہے اور گاتی گاتی مر جاتی ہے۔

جہاں گانا ناممکن نظر آتا ہے۔ وہاں منظوم گفتگو ہوتی ہے۔ مثلاً "بیتابؔ" نے "دو رنگی دنیا" میں مندرجہ ذیل منظوم مکالمہ لکھا۔

انور :- عجب ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔
گوہر :- یہ پنکھے نسیمِ سحر جھل رہی ہے۔
منوہر :- شفق سے ہوئی کیسی خوش رنگ بدلی۔
گوہر :- کسی ماہ وش نے ہے پوشاک بدلی۔

(بحوالہ اُردو ڈراما نگاری مصنفہ بادشاہ حسین حیدرآبادی)

اس قسم کی کئی اور مثالیں آپ کو نیرنگ عشق۔ گوپی چند اور خونِ ناحق کے اقتباسات سے ملیں گی۔ جو ہم نے اسی مقالے میں درج کئے ہیں۔

پہلے گانے، پھر منظوم مکالمے ہوتے اور جو عبارت باقی رہ جاتی۔ اُنہیں مقفیٰ اور مسجع کر دیا جاتا تھا۔ اس کی مثالیں بھی آپ ملاحظہ کر چکے ہیں۔

ڈراموں کی کہانیاں اکثر عشق و محبت کے واقعات پر مبنی ہوتیں۔ اور مزاح کا عنصر نہایت سوقیانہ ہوتا تھا۔ سیرت نگاری میں کسی قسم کے غور و فکر کی ضرورت محسوس نہ کی جاتی تھی۔ اُدھر زبان کی خامیاں اتنی ہوتیں کہ الامان۔ بات یہ تھی کہ معمولی طور پر پڑھے لکھے لوگ تھیٹریکل کمپنیوں میں "منشی" بن جاتے۔ ان لوگوں کی اصلاح کرنے والا کوئی نہ ہوتا تھا۔ انہیں تنخواہ بھی واجبی ہی ملتی تھی۔ اس لئے محنت کرنے سے احتراز ہی کرتے تھے۔

حشرؔ پہلے قدیم روش پر چلا۔ لیکن جلد ہی اُس نے اس روش سے ہٹ کر اُردو ڈرامانگاری میں ایک نئے دور کی طرح ڈالی۔ اس کا ذکر ہم آئندہ مقالے میں کریں گے۔

عبدالسلام خورشید

غزل

ماتھے پر ٹیکا صندل کا اب دل کے کارن رہتا ہے
مندر میں مسجد بستی ہے، مسجد میں برہمن رہتا ہے

ذرّے میں سورج، اور سورج میں ذرّہ روشن رہتا ہے
اب من میں ساجن رہتے ہیں اور ساجن میں من رہتا ہے

رُت بیت چکی ہے برکھا کی اور پریت کے مارے بیٹھے ہیں،
روتے ہیں، رونے والوں کی آنکھوں میں ساون رہتا ہے

اک آہ نشانی جینے کی باقی تھی، مگر جب وہ بھی نہیں
کیوں دُکھ کی مالا جپنے کو یہ تنکا سا تن رہتا ہے

اے مجھ پر ہنسنے اور کسی کو دیکھنے والو! یہ تو کہو
یوں کب تک جان پہ بنتی ہے، یوں کب تک جوبن رہتا ہے؟

دل توڑ کے جانے والے سُن دو اور بھی رشتے باقی ہیں
اک سانس کی ڈوری اٹکی ہے اک پریم کا بندھن رہتا ہے

قیوم نظر

تخیل

نشیبِ دریا پہ لمبی لمبی سی گھاس تھی۔ شب کی تیرگی میں
کیا سوال اُس سے میں نے "ڈوبی ہوئی عجب کیفِ بے خودی میں
تو اس پُر اسرار شب میں کیوں ئے بدست، اکیلی یہاں کھڑی ہے؟
کسی کی رہ تک رہی ہے؟ ——— وہ ایسا کون جادو گر اجنبی ہے،
جو کھینچ لایا ہے اس اندھیرے میں بھی تجھے اتنی دُور گھر سے؟"
وہ میری سمت ایک لمحے تک دیکھتی رہی شک بھری نظر سے۔
پھر ایک ہلکی سی آہ بھر کر کہا کہ ندی پہ آئی تھی میں
سُئے ہوئے اوٹ اپنے دامن کی یہ دیا ساتھ لائی تھی میں
خیال تھا گر کنارِ دریا پہ اتفاقاً اُسے ملوں گی
چراغ کی روشنی میں جی بھر کے اس کے چہرے کو دیکھ لوں گی۔
اگر وہ نغمے کا حکم دے گا، وہ گیت چھیڑوں گی بانسری پر
جو چند لمحوں میں ایک جادو سا بن کے چھا جائے اُس کے جی پر
مگر نجانے کہ منتظر کیوں ہے میری چشمِ پُر آب اب تک
سرودِ عشق آفریں بھی ہے قلب نے میں مصروفِ خواب اب تک
تھکے ہوئے انجم اونگھنے لگ گئے ہیں، اور رات ڈھل رہی ہے
مگر صد افسوس اِس پہ، اب تک یہ شمع بیکار جل رہی ہے
پھر اُس کے دل میں نہ جانے کیا بات آئی، خاموش ہو گئی وہ،
وہیں کھڑی، چند لمحوں تک سر جھکائے، کچھ سوچتی رہی وہ۔
سنبھال کر آخر آنچل اک سمت کھوئی کھوئی سی چل پڑی وہ
خموش، سنسان گھاس کچھ اونگھتی تھی، بس اُس میں کھو گئی وہ۔

تخت سنگھ

چکّر

افراد

(۱) آدم (۲) حوّا ——— (۳) قابیل (۴) ہابیل

مقام:۔ باغِ عدن

پہلا سین

(باغ عدن کا ایک بلند مقام، جہاں سے سمندر نظر آرہا ہے اور اوپر نیلا شفاف آسمان بھی دکھائی دیتا ہے۔ دائیں طرف آدم ایک درخت کے سائے تلے بیٹھا نظر آتا ہے۔ اُس کی نگاہیں آسمان کی طرف ہیں اور وہ پرندوں کے نغمات کی نقل اتارتے ہوئے گنگنا رہا ہے۔ آدم کافی مضبوط اور مطمئن انسان دکھائی دیتا ہے۔ تھوڑے وقفے کے بعد بائیں طرف سے حوا داخل ہوتی ہے۔ وہ دراز قد ہے اُس کے خدوخال میں سختی اور بے اطمینانی ہے۔ وہ رُکتی ہے اور آدم پر ایک حقارت آمیز نگاہ ڈالتی ہے)

حوّا۔ (سختی سے) گرمی کے بعد خزاں اور سردی کے بعد خزاں!

آدم۔ (حیران ہو کر) گرمی کے بعد خزاں اور سردی کے بعد خزاں؟ ——— حوا! یہی نظامِ قدرت ہے (آہستہ سے) گرمی خزاں ——— سردی، خزاں! کتنا خوبصورت مضمون ہے۔ اگر ہابیل یہاں ہوتا تو وہ اس مضمون کو شعر میں خوب باندھتا۔

حوّا۔ خوب باندھتا! ——— مگر اس کا فائدہ؟

آدم۔ (لطف اندوز ہوتے ہوئے) گرمی کے بعد خزاں! ———

حوّا۔ اور سبز پتے زرد ہو جاتے ہیں۔

آدم۔ مگر خزاں بھی تو پرلطف ہوتی ہے

حوّا۔ (طنزاً) جی ہاں! پرلطف!! ——— زرد پتے گر پڑتے ہیں۔ درخت بے برگ، دن اداس، اور ہوا بے کیف اور خنک (تیزی سے) یاد ہے گذشتہ سال جب ہم سارا موسم ہوا کی ناموافقت کے باعث باغ میں چل پھر نہ سکے؟

آدم۔ ہاں پچھلے سال تو کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔

حوّا۔ ہم وقت کا زیادہ حصہ بے کار پڑے سوتے رہے اور کوئی کام نہ کر سکے۔

آدم۔ بالکل! ——— (خوشی سے) لیکن جب موسم بہار آیا تو ہر طرف زندگی کی ایک لہر دوڑ گئی (طربیہ) موسم بہار!! ——— جدھر دیکھو سبزہ ہی سبزہ! نیلا اور شفاف آسمان، پرندوں کا چہچہانا اور . . . .

حوّا۔ (قطع کلامی کرتے ہوئے) اور سردی میں پھر یہی پرندے زمین پر مردہ نظر آتے ہیں۔ حیوان سردی سے اکڑے پڑے ہوتے ہیں اور اسی طرح ——— ہمیں بھی مرنا ہو گا!

آدم۔ ہاں ہمیں بھی ایک دن مرنا ہی ہو گا۔ میں نے اس کے بارے میں کئی بار سوچا ہے ——— حوا، ہم مر جائیں گے۔ مگر نسلِ انسانی جاری رہے گی۔ ہمارے بعد قابیل اور ہابیل زندہ رہیں گے۔ ان کی بیویاں ہوں گی اور پھر ان کے بچے پیدا ہوں گے اور یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا۔ اس لئے موت سے ہم کیوں خائف ہوں؟

حوّا۔ تو آپ کو موت کا ڈر ہی نہیں کیا۔

آدم۔ ہرگز نہیں، پیاری حوّا! ——— مجھے یقین ہے کہ پرندے موت سے نہیں ڈرتے۔ جب ان میں سے ایک جدا ہوتا ہے تو وہ محسوس نہیں کرتے۔

(پس منظر میں پرندوں کے نغمات سنائی دیتے ہیں)

ذرا ان کے دلکش نغمات سنو! ——— جب اُن کا مقررہ وقت آتا ہے وہ موت کے اتھاہ سمندر میں غوطہ زن ہو کر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جاتے ہیں۔

(آدم پھر لیٹ جاتا ہے اور پرندوں کی طرح چہچہانے لگتا ہے حوّا
اُسے مترحم نگاہوں سے دیکھتی ہے)

حوّا۔ انسان ـــــ مگر سر میں پرندوں کا دماغ ہے شاید!

آدم۔ کاش میں اُن کی طرح چہچہا سکتا!

حوّا۔ اس لیس و پیش کے نظام میں کس قدر مطمئن ہیں یہ!

آدم۔ پیاری حوّا، جب دن آتا ہے تو ہر روز ایک نئی صبح لے کر آتا ہے اور رات
ـــــ پیاری رات ہمیں اپنی گود میں لوری دے دے کر سلا دیتی ہے
تاکہ دوسری صبح ہم تر و تازہ ہو کر جاگیں۔

حوّا۔ جانوروں کی بھی تو یہی زندگی ہے۔ کاش آپ اس سے کچھ بلند ہونے
کی کوشش کرتے!

آدم۔ اس کی ضرورت نہیں!

حوّا۔ (غصّہ سے) کاش آپ محسوس کرتے ـــــ سردی سے بچنے کے
لئے ہمیں ضرورت ہے کہ ہم کچھ انتظام کریں اور ......

آدم۔ (اُٹھ بیٹھتا ہے قطع کلامی کرتے ہوئے) انتظام خود قدرت کر رہی
ہے۔

حوّا۔ (تیزی سے) مگر آپ بھی تو کچھ سوچیں! ہم کب تک جنگلی بنے رہیں گے؟

آدم۔ مگر قدرت .....

حوّا۔ ہاں ہاں قدرت کے اسباب کو کام میں لاکر زیادہ آرام حاصل کیا جا
سکتا ہے!

آدم۔ تم اگر مطمئن نہیں تو اس میں میرا کیا قصور؟

حوّا۔ کس کا قصور ہے پھر؟

آدم۔ یہ الٹی سمجھ ہے تمہاری ورنہ یہاں کیا نہیں ہے؟ پھل پھول، باغات
چشمے، پرندوں کے نغمات آرام، سکھ ـــــ بھلا اس جنتِ ارضی
میں کس چیز کی کمی ہے؟

(وہ پھر لیٹ جاتا ہے)

حوّا۔ تو گویا آپ ہمیشہ کے لئے اس محدود باغ پر ہی قناعت کر رہے ہیں؟
ـــــ اے سبحان اللہ!

آدم۔ چھوٹا سا باغ مگر ہر طرف اطمینان ہی اطمینان ہے!

حوّا۔ کبھی آپ نے اس پہاڑی کی چوٹی سے سمندر کا نظارہ بھی کیا ہے؟
(پہاڑی کی طرف اشارہ کرتی ہے)

آدم۔ (آہ بھر کر) ہاں، کئی بار، کتنا دلکش منظر ہے اور ......

حوّا۔ (بات کاٹ کر) کبھی آپ نے یہ بھی سوچا کہ اس کے پار کیا ہے؟

آدم۔ لیکن میں سمندر کو پار کیسے کر سکتا ہوں! ـــــ جو بات ناممکن ہو اس کے
بارے میں سوچنا مفت کا دردِ سر مول لینا ہے ـــــ ایک بار
مجھے بھی خبط سمایا تھا کہ اگر میں بادلوں کے سمندر میں جا کر تیر سکوں تو
باغِ عدن کا نظارہ کس قدر دلفریب ہو لیکن پروں کے بغیر اڑنا
ناممکن تھا۔ اس خیال نے مجھے دیوانہ بنا دیا ـــــ خدا نے میری رہنمائی
کی اور اب تو میں نے قسم کھالی ہے کہ ایسے دیوانگی کے خیالات کو کبھی
نزدیک نہ آنے دوں گا۔ توبہ توبہ!

حوّا۔ سمندر کے اس پار ممکن ہے کہ باغِ عدن سے خوبصورت جگہ ہو۔

آدم۔ ہو گی ـــــ مگر ہم مچھلی تو نہیں کہ سمندر میں تیر سکیں۔

حوّا۔ سمندر پار کرنے کے اور بھی تو ذرائع ہو سکتے ہیں، تیرنا ضروری نہیں!

(آدم زور زور سے قہقہے لگاتا ہے)

آدم۔ حوّا آج تم کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو!

حوّا۔ کیا آپ نے قابیل کو نہیں سنا؟ وہ کہہ رہا تھا کہ اگر درخت کا تنا
کاٹ کر اسے کھوکھلا کر لیا جائے تو اس میں بیٹھ کر پانی میں تیرا جا
سکتا ہے۔

آدم۔ میں نے سنا ان سنا ایک کر دیا تھا! قابیل ہمیشہ دور ہی کی لاتا ہے!

حوّا۔ وہ کشتی بنا رہا ہے تاکہ اس کے ذریعے سمندر کو پار کر سکے۔

آدم۔ ہاں ـــــ اور یہی کشتی اُسے لے ڈوبے گی۔

حوّا۔ (غصّے سے اٹھ بیٹھتی ہے) آپ بھی عجیب ہیں۔ ہر نئی چیز سے آپ کو وحشت
ہوتی ہے۔ لیکن میں ـــــ میں زندگی کے اس چکّر سے تنگ آ گئی
ہوں۔ وہی باغ، سارا دن بیکار پڑے رہو ـــــ وہی ایک منظر اور
بس ـــــ میں باغِ عدن سے بھاگ جانا چاہتی ہوں۔ مجھے تو یہ باغ
کاٹنے کو دوڑتا ہے۔

آدم۔ (اٹھ کر بیٹھ جاتا ہے) لیکن کیوں؟

حوّا۔ میرے اندر سے کوئی چیز مجھے پکار پکار کر کہہ رہی ہے ـــــ حوّا! ایک
اور بھی دنیا ہے۔ نئی دنیا! اس دنیا سے مختلف، جہاں زیادہ
آرام ہے ـــــ پتوں کے لباس کی جگہ اور لباس ملے گا ـــــ
نئی دنیا ـــــ بالکل نئی!

آدم۔ (مسکراتے ہوئے سمجھا) میری حوّا اس سادہ زندگی سے تنگ آ گئی ہے
ـــــ ہاں، لیکن خدارا یہ خیالات قابیل کے دماغ میں نہ بھر دینا۔

عورت کے دماغ میں ان خیالات کا ہونا زیادہ خطرناک نہیں لیکن نوجوان مرد کو تو یہ خیالات دیوانہ بنا دیں گے اور وہ خطرے میں کود پڑے گا۔

حوا۔ قابیل میرے لئے خطرے میں کود سکتا ہے!

آدم۔ یہی تو خطرناک بات ہے۔ عورت ہی مرد کو بہلا کر تباہی کے گڑھے میں دھکیلتی ہے۔

حوا۔ آپ ہمیشہ بات کا تاریک پہلو لیتے ہیں۔ کیا عورت مرد کو کامیابی کی طرف نہیں لے جا سکتی؟

آدم۔ (نفی میں سر ہلاتے ہوئے) ہرگز نہیں! ــــ خواہ وہ درخت کے تنے میں بیٹھ کر سمندر کیوں نہ پار کرلے۔

حوا۔ (بات کا رخ بدلتے ہوئے) ابھی آپ نے کہا تھا کہ انسان مرسکتا ہے مگر نسل انسانی باقی رہے گی؟

آدم۔ مجھے یہ خیال خواب میں آیا تھا۔

حوا۔ مگر آپ نے یہ بھی سوچا کہ قابیل اور ہابیل باپ کیسے بن سکتے ہیں جب بیویاں نہ ہوں گی!

آدم۔ (اس غیر متوقع سوال سے حیران ہو کر) کیا کہا تم نے؟

حوا۔ وہی جو آپ نے سنا!

آدم۔ (چکرا کر) کہ وہ بیوی کے بغیر باپ کیسے بن سکتے ہیں؟

حوا۔ جی ہاں ــــ ان کا باپ بھی حوا کے بغیر باپ نہ بن سکا!

آدم۔ ہاں! میں نے ــــ میں نے کب کہا ہے کہ ــــ لیکن ...... (رکتا ہے)

حوا۔ لیکن کیا؟

آدم۔ یہی کہ اگر ــــ تم نہ ہوتیں تو شاید خدا اپنی قدرت سے کوئی اور اسباب پیدا کر دیتا۔

حوا۔ اور اسباب؟ کیسے؟

آدم۔ آ ــــ یہ ذرا سوچنے والی بات ہے! ــــ لیکن کچھ نہ کچھ ہوتا ضرور ــــ!

(سٹیج پر روشنی کم ہو جاتی ہے کیونکہ بادل کا ایک ٹکڑا ابھرتا ہوا سورج کے سامنے آجاتا ہے)

سورج کے سامنے بادل! ــــ اب ان بے ہودہ سوالوں کو رہنے دو (سردی سے کانپتے ہوئے) کیسی سردی ہو رہی ہے!

(اٹھ کر ادھر ادھر ٹہلتا ہے تاکہ جسم میں گرمی پیدا ہو)

حوا۔ اگر نسل انسانی کو باقی رہنا ہے تو تمہارے بیٹے ضرور سمندر کو عبور کریں گے۔

آدم۔ (غصے سے) عبور کریں گے! ــــ مجھے کہا! (حوا کے نزدیک آکر تاکہ اپنے استدلال پر زور دے سکیں) یا وہ پرندے کہاں سے آتے ہیں؟

حوا۔ اڑ کر کہیں سے!

آدم۔ مگر مادہ خرگوش! ــــ وہ بھی اڑ سکتے ہیں؟ بلی! ــــ وہ تیر سکتی ہے!

حوا۔ واہ! یہ کیسی منطق ہے!

آدم۔ یہ جانور آخر آتے کہاں سے ہیں؟

حوا۔ میں کیا جانوں!

آدم۔ ذرا اپنے حضرت سانپ سے یہ بھی پوچھ لیا ہوتا۔

حوا۔ میں کبھی ایسے سوال نہیں کیا کرتی!

آدم۔ جی ہاں! مگر صرف اس کے مزیدار قصے سنا کرتی ہیں آپ! ــــ نئی دنیا۔ جہاں دودھ اور شہد ملتا ہے۔ وہاں ــــ خوشی، آرام لباس، نئے گھر غرض کیا کیا تجاذبات ہیں۔ تم اس دنیا میں پہنچ کر ایک نئی نویلی سجی سجائی دلہن بن جاؤگی! (ذرا تیز ہو کر) بھلا سنجیدہ سوال سے سانپ چکرا نہ جائے گا ــــ وہ مکار، جو دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے! جو راحت سادگی میں ہے وہ تصنع اور آرائش میں میسر نہ ہوگی!!

حوا۔ (طنزاً) یعنی آپ کو اور ہابیل کو حاصل ہے!

آدم۔ بالکل بالکل!!

حوا۔ عورت اس راحت سے مطمئن نہیں ہو سکتی۔

آدم۔ سمجھا! ــــ عورت کے لئے راحت اس میں ہے کہ وہ ساری دنیا کو حاصل کرلے۔ مرد بے چارہ خواہ اس کی خواہشات کو پورا کرتے کرتے جان تک گنوا بیٹھے۔ یہ راحت نہیں خود غرضی اور لالچ ہے ــــ اور یہی انجام قابیل کا ہوگا!

حوا۔ مجھے قابیل پر فخر ہے!

آدم۔ اس لئے کہ وہ تمہاری موہوم آرزوؤں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے زندگی کو خطرے میں ڈال رہا ہے

حوا۔ اگر یہ خطرہ ہی ہے تو بھی وقت کے اس طرح بے کار ضائع ہونے

سے بہتر ہے جیسے ہابیل چقماق کے ٹکڑوں سے زمین پر شکلیں
بنا کر کرتا ہے۔ اس کا نام آپ کے نزدیک تصویر ہے۔ وہ جب اس
سے اُکتا جاتا ہے تو پھر الفاظ کو کھینچ تان کر الاپتا ہے یہ کیا ہے؟ نغمہ!
——— اور شاعری! ——— گویا باغ عدن میں زندگی کا منتہائے
نظر یہی ہے، مصوری اور شعر؟

آدم۔ ہابیل یونہی مطمئن ہے۔

حوّا۔ بے وقوف انسان ہمیشہ مطمئن رہتا ہے! اس کے دل میں کوئی
تمنا یا آرزو نہیں ہوتی مطمئن باپ کا مطمئن بیٹا!!

آدم۔ دونوں بچے ہمارے نورِ نظر ہیں۔ ایک سے زیادہ پیار اُن میں نفرت
پیدا کر دے گا۔

حوّا۔ لیکن قابیل سے میں کب زیادہ پیار کرتی ہوں؟

آدم۔ پیار کی بھی ایک ہی رہی! ——— ہفتوں سے تم قابیل کی تعریف
میں رطب اللسان ہو۔ رات دن قابیل قابیل کرتے تمہاری زبان
سوکھ رہی ہے۔ وہ بہادر ہے، کتنا بہادر! ———

حوّا۔ بہادر بچے کی حوصلہ افزائی ضروری ہے تاکہ اس کا دل بڑھے۔ ہابیل
کو آپ کی تن آسانی نے نکما بنا دیا ہے!

آدم۔ ان باتوں کو چھوڑو۔ سردی کے دن ان بے کار باتوں کے لئے موزوں
ہوتے ہیں۔ اب تو موسم بہار ہے (آسمان کی طرف نگاہ اٹھاتا ہے)
بادلو! ——— ہٹ جاؤ۔ مجھے سردی محسوس ہو رہی ہے۔
(بادل ہٹ جاتے ہیں اور سٹیج پر روشنی زیادہ ہو جاتی ہے
آدم کھڑا ہو کر دھوپ سینکتا ہے۔ ہابیل ہانپتا ہوا داخل ہوتا
ہے۔ ایک خوبصورت، نوجوان اپنی دھن میں مست ———
وہ اونچی جگہ پر دوڑ کر چڑھ جاتا ہے اور سمندر کی طرف اشارہ
کرتا ہے)

ہابیل۔ (خوف زدہ لہجے میں) ابّا! ——— امّاں!! ——— وہ دیکھئے ———
دیکھئے قابیل بھیّا پھر کشتی ———
(آدم اور حوّا بھی تیزی سے اونچی جگہ کی طرف لپکتے ہیں)

آدم۔ (دونوں ہاتھوں کو منہ کے پاس رکھ کر تاکہ آواز بلند ہو سکے) اے ———
قاااابی ی ی ل!! اے ۔۔۔۔

حوّا۔ (درد کتے ہوئے) چلائیے مت! اس کا دھیان بٹ جائے گا۔!
(وہ حوصلہ افزائی کرتے ہوئے ہاتھ ہلاتی ہے)
شاباش، میرے بچے! ——— شاباش ——— بہادر بنو!!

ہابیل۔ امّی! اگر لکڑی الٹ گئی تو ———؟
(قابیل کشتی میں سوار ہو رہا ہے کشتی لہروں کے تھپیڑوں
سے ڈانواں ڈول ہو رہی ہے۔ سب دم بخود ہیں)

آدم۔ یہ بھی ایک معجزہ ہے!

حوّا۔ قابیل کا دماغ کتنا اچھا ہے کیسی پھرتی سے کشتی چلا رہا ہے
(گویا ماحول سے بے نیاز ہو کر) میرے لال! ——— میرے بچے!! تمہاری
ماں آج کس قدر خوش ہے۔ اُسے فخر ہے کہ اُس کا بیٹا کتنا بہادر ہے!

ہابیل۔ بھیّا پھر کنارے کی طرف آ رہے ہیں (آدم سے) ابّا! آپ ہی انہیں
روکئے، شیطان انہیں بہکاتا ہے۔

آدم۔ بیٹے میں اُسے کیا روکوں جب خود تمہاری امّی اُسے کہتی ہے کہ جاؤ
اور کشتی چلاؤ۔

ہابیل۔ امّی خود اُسے کہتی ہے؟ مگر اس کا فائدہ؟

حوّا۔ بیٹا تم بھی اپنے بھائی کے ساتھ بہادری کے کاموں میں شریک
رہا کرو۔

ہابیل۔ امّی مجھے تو باغ ہی سے دلچسپی ہے!

حوّا۔ (طنز سے) اور زمین پر تصویریں بنانے سے؟

ہابیل۔ امّی! میں ایسی چیزیں بناتا ہوں جن سے مجھے راحت ہوتی ہے
میرا دماغ تخیّل کے پروں پر اُڑتے ہوئے آسمانوں کی سیر کرتا ہے
تخیّل کی اس پرواز کی روئداد میں لکیروں کے ذریعے زمین پر کھینچتا
ہوں۔ میرے خوابوں میں یہی تصویریں مجھے میرے نغمے سناتی ہیں۔
امّی! یہ دنیا کتنی پیاری ہے، میں تو یہاں بہت ہی خوش ہوں!

آدم۔ بیٹا! تم غار میں جا کر آرام کرو ——— ہاں تو سنو یہ تم آج عورت کی
کم نظری اور زبان درازی کے متعلق اشعار لکھنا!

حوّا۔ (ٹکٹکی باندھے قابیل کو دیکھ رہی ہے) میرا بہادر بچہ! آؤ، میرے لال
(قابیل سینہ پھیلائے داخل ہوتا ہے۔ آدم اور ہابیل کو حقارت
سے دیکھتا ہے۔ سانولا رنگ، مضبوط بدن اور چہرے سے ارادے
کی پختگی ظاہر ہوتی ہے)

قابیل۔ (فخریہ) کیوں ماں! میں نہ کہتا تھا؟

حوّا۔ (اس کی تائید کرتے ہوئے) ہمتِ مرداں مددِ خدا!

آدم۔ قابیل! بندر کی سی یہ شرارتیں چھوڑ دو۔

قابیل۔ بندر کی سی شرارتیں! —— کیوں؟
آدم۔ ان کا انجام خطرناک ہے۔
قابیل۔ ہوتا رہے، مجھے تو اسی میں لطف آتا ہے!
آدم۔ بیٹا، نادان نہ بنو! —— اگر تم شیر کا شکار کرو تو یہ بہادری ہے۔ اس سے ہمیں دشمن سے نجات مل جائے گی مگر یہ اُچک کر درخت پر جا بیٹھنا اور سمندر میں تیرنا خود موت کے منہ میں جانا ہے، فائدہ معلوم!
ہابیل۔ بھیا! ایک دفعہ تو تم ڈوب ہی چلے تھے!
قابیل۔ بھولے بھگت، وہ تو میں نے جان کر کیا تھا تاکہ تمہیں اپنی پختہ کاری کا ثبوت دوں۔
حوّا۔ قابیل بیٹا اب پھر کب کشتی چلاؤ گے؟
قابیل۔ (فخریہ لہجے میں) امیّ! —— کل سمندر کے اُس پار جاؤں گا اور سامنے جو جزیرہ سا معلوم ہوتا ہے اس کا پتہ لاؤں گا۔
ہابیل۔ اگر تمہیں راستہ بھول گیا تو واپس کیسے آؤ گے؟
قابیل۔ میں اُسی جزیرے میں رک جاؤں گا جب تک کہ راستہ نہ ڈھونڈ نکالوں (طنز سے) اور اس وقت تک میرا بھائی ہابیل دوسری کشتی تیار کرے گا اور مجھے لینے آئے گا!
ہابیل۔ میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں! بھلا کون احمق اس باغ کو چھوڑ کر ایک موہوم امید پر سمندر کے تھپیڑوں سے لڑتا پھرے؟
حوّا۔ قابیل! کل تم دونوں بھائی جاؤ۔
قابیل۔ معاف کیجئے! میں اکیلا ہی جاؤں گا۔
حوّا۔ کیوں! بیٹا؟
قابیل۔ ابّا جان! کشتی کا خیال مجھے آیا میں نے اُسے بنایا۔ اب کامیابی کا فخر بھی میں ہی حاصل کروں گا۔
آدم۔ بیٹا، ماں کی طرح ہو تم بھی بڑے منکسرالمزاج (چلتے ہوئے) اوہ! اس بحث نے تو مجھے تھکا دیا ہے۔ اب مجھے جاکر سونا ہے! (دائیں طرف جاتے ہوئے) ایک گہری نیند اور دل خوش کن خواب!
(رہ جاتے ہیں ہابیل ایک درخت کے سائے میں جا بیٹھتا ہے اور پتھر نکال کر زمین پر لکیریں کھینچنے میں مصروف ہو جاتا ہے)
قابیل۔ (سمندر کی طرف دیکھتے ہوئے گویا خواب دیکھ رہا ہے) کل میں اُس جزیرے میں جاؤں گا۔ کل ——!
حوّا۔ (ہابیل سے) بیٹا! کیا تم بھی بھائی کے ساتھ جاؤ گے؟

ہابیل۔ ماں، مجھے اور بہت سے کام ہیں۔
قابیل۔ کام ہیں! تم تو نرے بُدھو ہو بُدھو! بزدل!!
ہابیل۔ بھیا یہ بات نہیں۔ مگر......
قابیل۔ (بات قطع کرتے ہوئے) تمہیں ڈر ہے کہ سمندر میں کہیں طوفان نہ آجائے اور کشتی کو بہا لے جائے، کیوں؟
ہابیل۔ یہ نہیں! تم آخر کس لئے سفر کرنا چاہتے ہو؟ اس لئے کہ تم اور ادنیٰ چیزوں کو حاصل کر سکو؟ —— باغ عدن میں کس چیز کی کمی ہے؟ لالچ تمہیں لئے جارہا ہے اور اس کا نتیجہ تباہی ہوگا۔
قابیل۔ (طنز سے) ابا جان کی طرح تم بھی کتنے سادہ اور مطمئن ہو اور —— مجھے اس سے نفرت ہے (فخریہ لہجے میں) میں جارہا ہوں، سمندر کے پار نئی دنیا کو ڈھونڈنے کے لئے! میں نئی دنیا کا مالک بنوں گا —— وہاں کے باغات اور خزانے سب میرے ہوں گے اور میں اُن کا مالک اور بادشاہ!
حوّا۔ اور بیٹا تمہاری ماں ایک ملکہ ماں بن کر ان باغات میں داخل ہوگی!
قابیل۔ ہاں ہاں! میری مملکت میں!
حوّا۔ میرا شاہانہ خیر مقدم ہوگا —— ایسی خوش نصیب ماں کب بوڑھی ہوسکے گی (قابیل کی پیشانی کا بوسہ لیتی ہے) شب بخیر میرے بیٹے! صبح جب تم نئی دنیا کی تلاش میں جانے لگو تو مجھے مل لینا —— اچھا شب بخیر!
(رہبار بیٹے کی نگاہیں ماں پر نخ۔ یہ پڑتی ہیں۔ وہ دائیں طرف سے باہر چلی جاتی ہے۔ قابیل اپنے بھائی ہابیل کی طرف ترحم کی نگاہوں سے تک رہا ہے۔ ہابیل زمین پر شکلیں بنانے میں مصروف ہے)
ہابیل۔ (اچانک نگاہ اٹھا کر) قابیل بھیا!
قابیل۔ کیا ہے؟
ہابیل۔ بھیا! کل رات میں نے ایک خواب دیکھا۔
قابیل۔ خواب دیکھنے کے سوا تمہیں اور کام ہی کیا ہے؟
ہابیل۔ عجیب و غریب خواب تھا وہ!
(ہابیل کا لب و لہجہ موثر ہے قابیل اس کے نزدیک جا کھڑا ہوتا ہے)
(میں نے پتھر کا ایک ٹکڑا لے کر اسے گول سا تراش لیا سارا دن میں ایسا ہی کرتا رہا اور اسی خیال میں سو بھی گیا۔

قابیل ۔ حضرت! ان چھوٹے چھوٹے پتھر کے ننھے ننھے ٹکڑوں سے کھیلنا چھوڑیئے اور کوئی کام کیجئے کام! اب آپ انشاء اللہ جوان ہیں۔

ہابیل ۔ کشتی بنانے سے خوشی حاصل ہوتی ہے آپ کو بھیا!

قابیل ۔ خوشی! بے حد! لیکن کشتی بنانا بے مقصد نہیں۔ میں سمندر کا کلیجہ چیر کر پار جاؤں گا اور نئی دنیا کو ڈھونڈوں گا لیکن تمہارا یہ پتھر ۔۔۔ پتھر ہی ہے نا آخر! ہاں، تو وہ خواب!

ہابیل ۔ خواب! ۔۔۔۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ آسمان سے اتر کر میرے پاس آیا ہے۔ اُس نے ہیرا گول تراشا ہوا پتھر اپنے ہاتھ میں اٹھالیا اور تھوڑی دیر کے بعد یوں کہا ۔۔۔۔ تو نے ایک ایسی چیز تیار کی ہے جو انسانیت کی تاریخ کو بدل دے گی!" (قابیل دلچسپی کا اظہار کرتا ہے اور ہابیل کے سامنے دوزانو ہو جاتا ہے)
"ابنِ آدم تُو نے چکّر بنایا ہے"!

قابیل ۔ چکّر! ۔۔۔۔ عجیب سا نام ہے!!

ہابیل ۔ ہاں بھیا! اللہ نے کہا تھا چکّر ۔۔۔۔ پھر اس نے اس چکّر کو نرم نرم گھاس پر لڑھکا دیا اور وہ دور تک چکر لگاتا گیا۔ یکایک خدا نے مجھ سے کہا آسمان کی طرف دیکھ! ۔۔۔۔ میں نے عجیب تماشا دیکھا بڑے بڑے چکّر زمین کو گھما رہے ہیں۔ آسمان پر پرندوں کی طرح کلوں کے جانور اڑ رہے تھے۔ اُن پر عجیب سی مخلوق، بالکل ہماری طرح بیٹھی تھی ۔۔۔۔ میری نگاہ ان پر نہ جم سکی ۔۔۔۔ پھر میں نے سمندر کی طرف دیکھا عجیب عجیب کشتیاں، کئی ہمارے باغ سے بھی بڑی بڑی، چکّروں کے ذریعے تیر رہی تھیں ۔۔۔۔ بہت تیز! ۔۔۔۔ مچھلی کی طرح ادھر اُدھر دوڑ رہی تھیں ۔۔۔۔ (تیز تیز بولتے ہوئے) بڑے بڑے مکانات میں چکّر کے ذریعہ، زمین کی تہ میں سے خزانے نکالے جا رہے تھے! ۔۔۔۔ مجھے ایسا معلوم ہونے لگا کہ ہر طرف چکّر ہی چکّر ہیں اور میں خود ایک چکّر کے ساتھ گھوم رہا ہوں!

قابیل ۔ (جوش سے) ہا!!

ہابیل ۔ بھیا! پھر خدا نے مجھ سے کہا ابنِ آدم! تُو نے چکّر بنالیا۔ مگر یہ دو دھاری تلوار کا کام دے گا۔ نیک بندے اس سے مفید کام لیں گے لیکن برے لوگ ۔۔۔۔ اُن کا لالچ دنیا کو تباہ کر دے گا! پھر خداوند تعالیٰ نے اس پر کچھ لکھا!

قابیل ۔ کیا لکھا؟

ہابیل ۔ (رمز دارانہ لہجے میں) "تم دو معبودوں کی عبادت نہیں کر سکتے ۔۔۔۔ یزداں اور اہرمن کی"!

قابیل ۔ یزداں اور اہرمن! ۔۔۔۔ یزداں کون؟

ہابیل ۔ خود خدا۔

قابیل ۔ اور اہرمن؟

ہابیل ۔ اہرمن ۔۔۔۔ لالچ اور خود غرضی!

قابیل ۔ تم ۔۔۔۔ تم اب اس چکّر کو کیا کرو گے؟

ہابیل ۔ توڑ دوں گا اسے!

قابیل ۔ مجھے دے دو، ہابیل!

ہابیل ۔ یہ نہ ہوگا۔

قابیل ۔ کیوں؟

ہابیل ۔ مجھے کسی پر اعتبار نہیں ۔۔۔۔ اور پھر آپ بڑے خطرناک ارادے رکھتے ہیں۔ یہ میں آپ کو نہیں دوں گا!

قابیل ۔ ہابیل! ۔۔۔۔ مجھے دے دو!!

ہابیل ۔ نہیں! صرف دکھا سکتا ہوں۔

قابیل ۔ دکھا ہی دو۔

(ہابیل بائیں طرف جاتا ہے۔ قابیل کھڑا ہو جاتا ہے)

قابیل ۔ چکّر! ۔۔۔۔ عجیب سا نام ہے ۔ چکّر!!

(ہابیل چھوٹا سا پتھر کا چکّر لئے داخل ہوتا ہے۔ قابیل بے تابی سے اُس کی طرف لپکتا ہے، ہابیل چکّر اُسے دے دیتا ہے۔ وہ اُسے بڑے اشتیاق سے ہتھیلی پر گھماتا ہے)

خدا نے اسے گھاس پر کیسے گھمایا تھا؟

(ہابیل چکّر لے کر ایک زانو پر جھکتا ہے۔ قابیل دوزانو ہو جاتا ہے۔ ہابیل چکّر کو گھاس پر چلاتا ہے۔ قابیل انہماک سے محوِ تماشا ہے۔ تھوڑی دور جاکر چکّر رکتا ہے اور ایک طرف گر جاتا ہے۔ قابیل حیرت زدہ ہو کر تکتا ہے)

قابیل (گویا خواب دیکھ رہا ہے) بڑی بڑی چیزیں زمین پر چکّر کے ذریعے سے دوڑ رہی ہیں ۔۔۔۔ بجلی کی طرح تیز! سمندر میں بڑی بڑی کشتیاں تیر رہی ہیں ۔۔۔۔ ہمارے باغ سے بھی بڑی! ۔۔۔۔ ہوا میں کل کے پرندے اُڑ رہے ہیں ۔۔۔۔ چکّر کے سہارے سے ۔۔۔۔ زمین کی چھاتی چیر کر خزانے نکالے جا رہے ہیں ۔۔۔۔ چکّر کی مدد سے!

—— چکر!! —— فضا میں ہر طرف چکر گھوم رہے ہیں —— ہر طرف!!

(وقفہ —— قابیل چکر کو غور سے دیکھ رہا ہے۔ ہابیل قابیل کو تک رہا ہے۔ اچانک قابیل بڑھ کر چکر کو زمین سے اٹھا لیتا ہے ہابیل بھی بڑھتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں)

ہابیل۔ بھیا! میرا چکر مجھے دے دو۔

قابیل۔ یہ چکر!—— اس کا مالک عقلمند ہو سکتا ہے نہ کہ بے وقوف!

ہابیل۔ اسے میں نے بنایا ہے!—— یہ میری سوچ بچار کا نتیجہ ہے۔ یہ میرا ہے!

قابیل۔ خدا نے تمہیں ضرور کہا ہوگا کہ یہ قابیل کو دے دو۔

ہابیل۔ خدا نے مجھے اس سے روکا تھا! تم دنیا میں ——

قابیل۔ چکر میرا ہے!

ہابیل۔ ضد نہ کرو بھیا! یہ خدا کی امانت ہے۔ تم اس کے ذریعے سے فساد پیدا کرو گے۔ مجھے دے دو! میں ابھی اسے توڑے دیتا ہوں۔

قابیل۔ (سختی سے) یہ میرا ہے۔ تم نے مجھے اس کے متعلق باتیں کرتے سن لیا ہوگا اور میرے تخیّل کو چرا لیا ہوگا۔

ہابیل۔ جھوٹ بولنے سے فائدہ؟ (سختی سے) مجھے واپس کر دو یہ چکر!

قابیل۔ بیدعب کسی اور پر جمانا! چلو ہٹو، بھاگو یہاں سے۔

(ہابیل بڑھتا ہے۔ دونوں گتھم گتھا ہو جاتے ہیں۔ ہابیل فوراً عاجز آ جاتا ہے اور آخری بار کوشش کرتے ہوئے چکر پر جھپٹتا ہے قابیل پوری قوت سے پتھر کا چکر اس کے ماتھے پر رسید کرتا ہے ہابیل ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ لڑکھڑاتا ہوا گر جاتا ہے اور ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ قابیل حیرت زدہ ہو کر ہابیل کے مردہ جسم کو غور سے دیکھتا ہے اور پھر اس کی لاش پر جھکتا ہے)

یہ تو مر گیا!—— سردی میں پرندے بھی یوں ہی شاخوں سے گر پڑتے ہیں۔!!

(کبھی چکر کی طرف دیکھتا ہے اور کبھی لاش کی طرف۔ اس کی نگاہیں چکر پر گڑ جاتی ہیں)

(زیرِ لب) کل —— کل صبح مجھے ——

(وہ سیدھا کھڑا ہو جاتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ بلندی کی طرف بڑھتا ہے اور وہاں کھڑے ہو کر دور جزیرے کو دیکھتا ہے۔ آسمان رفتہ رفتہ سرخ ہوتا جاتا ہے اور وہ سرخی میں ایک دھبہ سا معلوم ہونے لگتا ہے)

(ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے) کل مجھے وہاں جانا ہوگا ——!

(پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

دوسرا سین

مقام۔ باغِ عدن

وقت۔ دوسرے دن صبح۔

منظر۔ وہی —— سٹیج بالکل خالی ہے۔ ہابیل کی لاش اسی حالت میں پڑی ہے جیسے کل شام تھی۔ پس منظر میں پرندوں کے چہچے سنائی دے رہے ہیں۔ قابیل بائیں طرف سے تیزی اور بے کلی سے داخل ہوتا ہے۔ وہ بلندی کی طرف بڑھتا ہے اور سمندر کو دیکھتا ہے اس وقت وہ بہت پرجوش نظر آ رہا ہے۔ اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد وہ لاش کی طرف جاتا ہے اور اس کے قریب دوزانو ہو جاتا ہے)

قابیل۔ (دبی ہوئی آواز میں) ہابیل! —— ہابیل تم سو رہے ہو؟

(وہ لاش کا شانہ ہلاتا ہے لیکن جواب نہیں پاتا)

بے وقوف! تم مجھ سے چکر چھیننا چاہتے تھے میں تم سے طاقتور تھا —— اور دنیا میں طاقت ہی ہمیشہ فتح پاتی ہے! (کھڑا ہو جاتا ہے) زندگی میں تم میرے کبھی دوست نہ بن سکے۔ تم بالکل ابا کی طرح تھے۔ اور تمہیں ہمیشہ اماں سے محبت رہی ... تم ہمیشہ خواب دیکھا کئے اور میں حقیقت! —— لیکن یہ چکر تم نے کیسے بنایا —— ؟ حیرت ہے!

(کسی کے پاؤں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ وہ لاش کو کھینچ کر ایک درخت کے نیچے کر دیتا ہے اور خود بلندی کی طرف بڑھتا ہے۔ حوا داخل ہوتی)

حوا۔ بیٹا! تم ابھی تک یہیں ہو؟ میں سمجھی تم جا چکے ہو گے (ہابیل کو دیکھ کر) ہابیل ابھی تک سو رہا ہے؟

قابیل۔ (واپس آتے ہوئے) جی ہاں!

حوا۔ یہ لڑکا بھی عجیب ہے۔ بہت دیر تک سوتا ہے اور تمہارے ابا جی تو ابھی تک سو رہے ہیں۔

قابیل۔ سو رہے ہیں؟

حوا۔ ہاں بیٹا۔

قابیل۔ اماں جب میں اس جزیرے میں آپ کے لئے نیا مکان بنالوں گا تو پھر آپ وہیں آجانا ماں کہ لمبی تان کر سونے دیں!

حوّا۔ ضرور بیٹا تم کتنے سعادتمند ہو۔ دیکھنا (۔۔) ہاں مجھے کسی طرح کی تکلیف نہ ہو (اس کے ہاتھ میں چکر دیکھ کر) یہ کیا ہے بیٹا؟

(قابیل چکر ماں کو دکھاتا ہے)

قابیل۔ یہ چکر ہے ماں۔

حوّا۔ چکر؟

قابیل۔ ہاں —— میں نے یہ رات بھر بیٹھ کر بنایا ہے ماں۔

حوّا۔ اوہ!

قابیل۔ دیکھنا! (وہ دوزانو ہو جاتا ہے۔ حوّا اسے دیکھ رہی ہے) جس کو! (چکر کو آہستہ سے زمین پر گھماتا ہے۔ تھوڑی دور جاکر وہ ایک طرف گر پڑتا ہے۔ حوّا حیرانی سے یہ نظارہ دیکھ رہی ہے) ماں! میں اس سے کیا کچھ بناؤں گا۔ جانتی ہیں آپ! —— ایک گاڑی جو اس چکر کے اوپر چلے گی —— میں اس کے آگے دو بیل جوتوں گا —— اس پر تمام دنیا میں گھوم آؤں گا —— تمام دنیا میں! (ہاتھ سے چاروں طرف اشارہ کرتا ہے) ایک دن آئے گا کہ ہوا میں عجیب و غریب کل کے پرندے —— اُڑن کھٹولے اُڑیں گے —— سمندر میں اس لکڑی کی کشتی کی بجائے —— بڑے بڑے —— جزیرے تیریں گے اور ماں جانتی ہو کیسے؟ —— اسی چکر کے ذریعے سے!

(حوّا حیرت زدہ ہو کر قابیل کا منہ تک رہی ہے)

حوّا۔ بیٹا! یہ سب کچھ کس لئے ہوگا؟

قابیل۔ میں دنیا کا بادشاہ بنوں گا اور یہ سب کچھ میرے آرام و آسائش کے لئے ہوگا۔

حوّا۔ تم نے یہ سب کچھ کیسے جان لیا؟

قابیل۔ خدا مجھے خواب میں آیا تھا ماں! —— اُس نے کہا "ابنِ آدم! میں نے تجھے چن لیا"

حوّا۔ خدا —— خواب میں آیا؟

قابیل۔ ہاں اماں۔ اس نے کہا "ابنِ آدم! —— میرے منتخب! —— جا ایک نئی دنیا کو ڈھونڈھ نکال۔ یہ چکر تجھے مدد دے گا اور تو فاتح ہوگا —— پھر اماں۔ اس نے مجھے باغِ عدن چھوڑنے کا حکم دیا —— دنیا بڑی وسیع ہے! اور خزانوں سے مالامال —— میں جا کر اُن کو حاصل کروں گا —— اس خشک اور بے کیف زندگی سے تو میں اکتا گیا ہوں —— آرام اور آسائش مجھے پکار پکار کر بلا رہے ہیں —— اماں میں جاؤں گا!

حوّا۔ (قابیل کو دیکھتی ہے اور خوشی محسوس کرتی ہے۔ پھر ہابیل پر مایوسانہ نگاہ ڈالتی ہے) ہابیل! —— میرے پیارے بچے! تم اپنا سارا وقت سونے میں ضائع کرتے ہو اور تمہارا ہی بھائی حیرت انگیز کام کر رہا ہے —— کاش تم بھی ایسے ہی ہوتے!

(وہ بڑھ کر ہابیل کو جگانا چاہتی ہے لیکن قابیل اُسے روک لیتا ہے)

قابیل۔ اماں اسے سونے دیجئے —— شاید میرے اس طرح چلے جانے سے اس کو سمجھ آجائے اور وہ بھی کچھ کام کرنے لگے۔

حوّا۔ اچھا بیٹا!

(آدم داخل ہوتا ہے)

آدم۔ تم آج ہی جانے والے ہو؟

قابیل۔ جی ہاں!

آدم۔ بادل اور ہوا تیز ہو رہے ہیں۔

قابیل۔ میں ہواؤں سے نہیں ڈرتا۔

آدم۔ شاید ہوا تم سے ڈرتی ہو۔

حوّا۔ سنتے ہو۔ رات خدا نے قابیل کو جلوہ دکھایا!

آدم۔ خدا نے؟

حوّا۔ جی ہاں!

آدم۔ کیوں؟

قابیل۔ اُس نے مجھے بتایا کہ میں دنیا پر حکومت کروں گا —— اُس نے مجھے منتخب کر لیا!

حوّا۔ اس چکر کے ذریعے سے۔

(حوّا آدم کو چکر دکھاتی ہے)

آدم۔ (اچانک ڈر جاتے ہیں) اسے مجھ سے دور رکھو! —— دُور! اسے توڑ دو اسے!! —— فوراً توڑ دو اسے اس پر کیا لکھا ہے جانتی ہو؟ —— موت!! تباہی!! جنگ!! خون!! فساد اور —— دوزخ!!!

قابیل۔ (طنزاً) ابّا جان آپ خدا سے زیادہ جانتے ہیں گویا؟

آدم۔ بے ہودہ نہ بکو! اسے فوراً توڑ دو —— توڑ دو۔ — یہ دنیا میں فساد پیدا کرے گا —— فساد خون، جنگ، آگ، اور بربادی —— اسے فوراً توڑ دو!!

(آدم اسے چھیننا چاہتا ہے۔ قابیل آدم کو بھی ضرب لگانے کے لئے ہاتھ اٹھاتا ہے)

حوّا۔ قابیل!

قابیل۔ (ہاتھ روک لیتا ہے) امّاں، یہ میرا ہے!

(آدم خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹ جاتا ہے)

حوّا۔ (آدم سے) آپ کیوں خواہ مخواہ قابیل کے منہ آتے ہیں —— آخر نادان لڑکا ہے۔

آدم۔ (زیرِ لب) خدا اسے منتخب نہیں کر سکتا!

حوّا۔ کیوں نہیں؟ —— یہ دلیر اور شجاع ہے! —— ہابیل کو چن لیتا جواب تک محوِ خواب ہے!

آدم۔ محوِ خواب ہے مگر کسی کو ایذا نہیں پہنچاتا —— لیکن جاگنے والا تو خود اپنی تباہی کو مول لینے جا رہا ہے!

حوّا۔ (قابیل سے) خدا حافظ بیٹا! —— خدا تمہیں جلد کامیاب واپس لائے!

قابیل۔ خدا حافظ امّاں —— اگر خدا نے چاہا تو جلد کامیاب آؤں گا!

(دونوں آدم کی طرف دیکھتے ہیں)

آدم اچھا —— اچھا بیٹا جاؤ! —— صبح کی سہانی ہوا اور پُرسکون فضا تمہاری محافظ ہو۔ چاند کی چاندنی تمہاری مشعلِ راہ بنے —— شام کا سہانا سماں تمہارے لئے امن و امان کا پیام لائے اور رات کی آرام دہ گھڑیاں تمہیں اپنی گود میں سلایا کریں —— بیٹا! باپ کی دعائیں تیرے شاملِ حال ہوں —— جاؤ! خدا کے حوالے!!

حوّا۔ خدا حافظ!

قابیل۔ خدا حافظ!!

(قابیل حوّا کی طرف ایک لمحہ کے لئے دیکھتا ہے اور پھر ہابیل کی طرف اس کی نگاہیں خود بخود اٹھتی ہیں، وہ سمندر کی طرف دوڑ جاتا ہے۔ آدم کو اس کے جانے کا افسوس ہے۔ حوّا بلندی پر جا کر اسے ہاتھ سے خدا حافظ کہہ رہی ہے)

حوّا۔ (چلا کر) خدا حافظ بیٹا —— خدا حافظ!

قابیل۔ (دور سے آواز آتی ہے) —— خدا حافظ امی! (حوّا وہیں کھڑی رہتی ہے)

حوّا۔ قابیل ہرن سے زیادہ پھرتیلا ہے؛ اس کا بدن کتنا سڈول ہے —— اس کا دل —— اس کا دل شیر سے زیادہ دلیر ہوگا —— دلیر بیٹے کی ماں کتنی خوش نصیب ہوتی ہے۔ قابیل، میرے لال! (وہ پھر ہاتھ ہلاتی ہے اور قابیل کو اشارے سے خدا حافظ کہتی ہے) وہ جا رہا ہے۔ صرف میرے لئے —— میرے آرام و آسائش کے لئے، ایک نئی دنیا کو ڈھونڈنے —— مجھے فخر ہے کہ میرا بیٹا کس قدر سعادت مند ہے، کس قدر فرمانبردار!! میرا دل آج خوشی سے لبریز ہے!!

(آدم حیرت زدہ ہو کر ہابیل کی لاش کو دیکھ رہا ہے)

آدم۔ ہابیل! ہابیل جاگو! دیکھو تمہارا بھائی چلا گیا (جواب نہ پا کر حوّا کو بھی تشویش ہوتی ہے) ہابیل!

(آدم ہابیل کی لاش کی طرف بڑھتا ہے۔ حوّا حیرانی سے دونوں کو تک رہی ہے)

بیٹا! دن چڑھے تک سونا بری بات ہے! اٹھو ہابیل، جاگو!! (حوّا بھی خود بخود دو قدم آگے بڑھ آتی ہے) دیکھو تو اس کا چہرہ کیسا سفید ہو رہا ہے!

(حوّا قریب تر ہو جاتی ہے۔ آدم لاش پر جھکتا ہے اور اسے شانے سے آہستہ آہستہ ہلاتا ہے) بیٹا! —— جاگو!! (اس کے ماتھے کو چھوتا ہے) (حوّا سے) کتنا سرد ہے یہ!

حوّا۔ (ہراساں ہو کر) ہابیل، اب تو اٹھو ——!

آدم۔ دیکھو اس کے سر سے خون بہا ہے۔ خون! (زخم کو دیکھتا ہے) ہابیل! —— ہابیل!!

حوّا۔ اس کے چہرے پر خون کا نام نہیں رہا ——!

آدم۔ (تحمّل سے) ہابیل مر چکا ہے!!!

(آدم کھڑا ہو جاتا ہے گویا وہ موت کے خیال سے خوفزدہ ہے۔ حوّا جھک کر لاش کو دیکھتی ہے)

حوّا۔ بیٹا! تم امّاں سے بھی نہ بولو گے —— تمہاری ماں ہے۔ آواز بھرا جاتی ہے۔ وہ بے اختیارانہ لاش پر گر جاتی ہے اور آہ و زاری شروع کر دیتی ہے۔ آدم بلندی کی طرف جاتا ہے)

آدم۔ (دور کسی چیز کو دیکھتے ہوئے) وہ بھی گیا —— اس کی کشتی سمندر کی لہروں میں غائب ہو چکی ہے! وہ بھی اب اپنے بھائی کو نہ دیکھ سکے گا!!

(وہ گردن موڑ کر حوّا اور ہابیل کو دیکھتا ہے۔ اور پھر یکایک قابیل کو زور سے چلا کر پکارتا ہے)

اب سمجھا! —— خدا نے کسے چن لیا تھا! —— قابیل! تم نے جھوٹ بولا —— تم نے قتل کیا قابیل، اور چکّر چلا کر لے گئے!! —— جاؤ، جاؤ، یہی چکّر تمہاری تباہی کا باعث بنے گا —— اور جس چیز کی تلاش میں تم جلتے ہو وہی تمہارے لئے وبالِ جان ہوگی —— ! یہ چکّر تمہارے لئے ایک لعنت ثابت ہوگا! (وہ تھک جاتا ہے اور آہستہ آہستہ بلندی سے نیچے اترتا ہے) ہابیل! —— میرے بھولے بچّے!! —— دنیا میں چکّر کی سب سے پہلی بھینٹ!!!

(سر جھکا لیتا ہے)

(پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

(جوگوری)

شیر محمد اختر

رباعی

مانا کہ مئے عشق پی رہا ہوں ہمدم
اس آگ کے ساگر کو پی کے جی رہا ہوں ہمدم
پھاڑے ہیں جنوں میں نے جیب و دامن اپنے
تنہائی سے کیا کیا سی رہا ہوں ہمدم

ہما ہرنالوی

ادھورے لباسوں کا نغمہ

یہ نور چمکتا ہے نظروں کے سامنے، اور کھو جاتا ہے۔
اے کاش بن مجھے کرنوں کے پکڑنے کی قوت حاصل ہوتی
خوشبوئیں لہروں میں بہہ کر آتی ہیں اور چھپ جاتی ہیں،
اک نغمہ سنائی دیتا ہے، خاموشی میں سو جاتا ہے۔
یہ نغمہ اور خوشبوئیں بھی تو میری نظر میں کرنیں ہیں۔
(میرے احساس کے جھرمٹ میں اک بے بس الجھن پیدا ہے)

(یہ کرنیں دھندلی دھندلی ہیں،
یا میری نگاہوں پر ہلکا سا ایک دھندلکا چھایا ہے
بے آس جوانی کی مرجھائی، پھیکی، سوکھی تمنّا کا؟)
یہ کرنیں دھندلی دھندلی ہیں،
جیسے ہوں میلے پیراہن،
(میلے، لیکن بدزیب نہیں۔)
اور یہ دھندلی دھندلی کرنیں۔
چپکے، گھونگٹ کی اوٹ لئے،
میری پوجا کو ٹھکرائے،
راتوں کی گہری خاموشی میں غیر کے در پر جاتی ہیں۔
اُس کے لہو کو سیمیں کرکے،
اپنا دامن دودھ سے بھر کے،
میری نگاہوں سے اوجھل اپنے گھر کو لوٹ آتی ہیں۔

میں ٹھنڈی آہیں بھرتا ہوں، اور اپنے سر کو جھکاتا ہوں،
کچھ سوچ کے طیش میں اُٹھتا ہوں اور پھر رک کر رہ جاتا ہوں،
یوں دو مردوں کی قسمت میں تفریق نہیں منظور مجھے،
اک جسم کی خلوت کو دیکھے اور اک سادہ پیراہن کو!

اک پیراہن خوشبو والا لہراتا ہے، بل کھاتا ہے،
اور میرے تاریکی میں کھوئے چہرے کو سہلاتا ہے،
اور دل میں جو الا پھوٹتی ہے، یہ دھیان مجھے آجاتا ہے

یہ دنیا تو ہے کشمکشوں کی، لغزش کی، ناکامی کی،
گمراہی اور بے راہ روی نے اپنا جال بچھایا ہے،
آج اُگل دے جو بھی تیرے دکھیا دل میں سمایا ہے،
پریت کو چھوڑ کے ریت بنا لے اب سے مے آشامی کی،
ایسے کھیلوں ہی میں چین ملے گا تیری ہستی کو،
تو بولے گا اب تو دن بھی میرا ہے اور رات مری۔
دل کی اُلجھن مدھ میں ڈبو دے حاصل کر لے مستی کو،
یوں ہی دکھوں سے مُکتی ہوگی، سوچ سمجھ لے بات مری۔
سنتا ہوں میں شہر کے ایک محلّے میں
نفس کی پوجا کرنے والی اک آوارہ عورت ہے،
اور سستا ہے اُس کا کرایہ، ہاں، سستے ہیں اُس کے دام۔

میراجی

شامِ رخصت

وہ دمِ رخصت تری کافر جوانی، ہائے ہائے! اور اک مجبور دل کی خونفشانی ہائے ہائے!

عارضِ گلگوں پہ تیرے وہ بہارِ جاوداں اس پہ چشمِ تر کی وہ شبنم فشانی ہائے ہائے!

وہ ترے معصوم رخ سے دعوتِ جوشِ جنوں وہ سکوت آمیز لب کی گل فشانی ہائے ہائے!

دوش پر بکھرے ہوئے وہ عنبریں گیسو ترے اور وہ تیرے تنفس کی روانی ہائے ہائے!

وہ تری رفتار میں اک ارتعاشِ حشر خیز وہ ترے اعضا میں اک دردِ گرانی ہائے ہائے!

کیوں یکایک شام کو تو دے کے پیغامِ فراق
لے گئی میرا سکونِ زندگانی؟ ہائے ہائے!

کون ہوگا جلوہ آرا اب شبِ مہتاب میں؟ وہ بہاریں حیف! وہ راتیں سہانی ہائے ہائے!

کون بن کر آئے گا محفل میں جانِ زندگی؟ کون لائے گا نویدِ کامرانی ہائے ہائے!

کس کی نظریں مجھ کو دیں گی دعوتِ کیفِ نظر کون ہوگا وجہِ تسکینِ جوانی ہائے ہائے!

کون دے گا داد میرے آتشیں جذبات کی اور کرے گا التجائے شعر خوانی ہائے ہائے!

یاد ہے تیری محبت کا وہ لطفِ بے پناہ اور اک آشفتہ سر پر مہربانی ہائے ہائے!

وہ نسیمِ صبح کی مانند گلگشتِ چمن! وہ جوابِ خندہ ہائے بوستانی ہائے ہائے!

وہ ترے رنگیں تکلم کی حیات افروزیاں وہ تبسم کی بہارِ جاودانی ہائے ہائے!

وہ گلاب افشاں جبیں پر رونقِ ماہِ تمام! وہ نگاہوں میں شرابِ ارغوانی ہائے ہائے!

وہ ترے نغماتِ تسکین سماعت، حیف حیف! وہ مری دیرینہ آشفتہ بیانی ہائے ہائے!

وہ محبت، وہ عنایت، وہ فراغت حسرتا! وہ جوانی، کامرانی، شادمانی ہائے ہائے!

یہ دلِ خوں گشتہ، ہاں یہ مرقدِ ارمان و شوق! رہ گئی عہدِ محبت کی نشانی ہائے ہائے!

کھائے جاتا ہے ابھی تک منظرِ "شامِ فراق" ہے وہی خونابۂ دل کی روانی ہائے ہائے!

وہ جواں ساغر، کہ تھا رامشگرِ سازِ وفا!
اب رگِ جاں پر ہے محوِ نوحہ خوانی ہائے ہائے!

ساغر جلیلی

خیالی پلاؤ

آپ نے کبھی نہ کبھی اگر کسی سے نہیں تو اپنے دل میں تو ضرور کہا ہوگا۔ "میں خیالات سے عاجز آچکا ہوں" مجھے آپ سے ہمدردی ہے کیونکہ خیالات کی عادات واقعی باعث پریشانی بن سکتی ہیں۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ انہیں نوعِ انسانی کو ستانے میں اگر راحتِ قلبی نہیں ملتی تو کم از کم لطف تو ضرور آتا ہوگا بعینہٖ اسی طور پر جیسے کسی شریر لڑکے کو اس اجنبی لڑکے کی چند یا پر تھپڑ مار کر بھاگ جانے میں آتا ہے جو بچارا اتفاقاً اُس کے محلے میں سے گذر رہا ہو۔ اول الذکر صاحبزادے کی تو تفریح ہو گئی اور موخر الذکر حملہ آور کو غائب پا کر اپنے غم و غصے کا زمین پر ایک شدید ٹھوکر سے صرف نامکمل اظہار کر کے آگے بڑھے، لیکن ایک خیال زدہ انسان اپنے جذبات کا کیسے اظہار کرے!

ایک صاحب کے دماغ میں کوئی افسانہ عرصے سے چکر لگا تا رہا ہے مگر چونکہ افسانے میں بہت سی الجھنیں اور پیچیدگیاں تھیں، صاحبِ دماغ نے اس کو صفحۂ قرطاس پہ منتقل کرنا مناسب نہ سمجھا بلکہ اس کام کو ملتوی کرتے چلے گئے۔ حتیٰ کہ ایک دن انہیں یکایک روشنی دکھائی دی۔ انہیں قطعی یقین ہو گیا کہ افسانے کی تمام مشکلات حل ہو گئیں اور اس کی کڑیاں مکمل۔ اس وقت ان کی خوشی کا صحیح اندازہ لگانا بہت دشوار تھا۔ وہ سمجھے کہ میدان مار لیا۔ بھاگے بھاگے گئے اور کاغذ قلم دوات لے بیٹھے۔ افسانے کی بنیاد رکھی گئی۔ افسانے کی ابتدا نہایت موزوں اور دلکش عبارت سے کی گئی۔

"کالی کلوٹی اور—زمانے کی نظروں میں—پرلے درجے کی بے باک لڑکی مالا کے بھی دل تھا جو صدہا بار رات کے اس پہر میں جب دنیا غافل سوتی ہے اس کو ایک ناقابلِ بیان تڑپ سے بے تاب کر دیتا تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ جاتی اور جب اُسے چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی دکھائی دیتی اور اپنے لئے روشنی کی کرن بھی نظر نہ آتی تو اس کے گرم گرم گالوں پر آنسوؤں کی ندیاں بہہ نکلتیں ....

سطروں کی تعداد بڑھتی گئی یہاں تک کہ پورے تین صفحے ختم ہو گئے۔ افسانہ نگار نے دم لینے کے لئے لمحہ بھر کو قلم ایک طرف رکھ دیا۔ ایک جماہی لی اور پھر قلم اٹھایا — اور بس! ایک حرف نہ لکھ سکے! حضرتِ خیال انہیں اس لمحے میں ہی جب انہوں نے قلم کو چھوڑا تھا چکمہ دے گئے تھے۔ اب افسانہ نگار صاحب ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر خیالات کو واپس بلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اول تو سب قسم کے خیالات نے ایسی مکمل ہڑتال کی ہے کہ اُن کے قریب تک نہیں پھٹکتے اور اگر اُن میں سے چند آ بھی جاتے ہیں تو وہ اس لئے کہ انہیں معلوم ہے کہ افسانہ نگار صاحب اُن کو پکڑنے کی قطعی کوشش نہ فرمائیں گے کیونکہ وہ اُن کے افسانے کے لئے بے کار ہیں۔ اسی لئے وہ بھی بے کھٹکے ان کے دماغ میں پریڈ کرتے رہتے ہیں۔ افسانہ نگار حضرت آنکھیں بند کر لیتے ہیں، اس امید پر کہ شاید نہیں سوتا سمجھ کر وہ غیر ضروری پتلے اپنا ناچ بند کر دیں گے۔ مگر یہ پتلے بھی بلا کے ذہین ہیں، اس چال میں نہیں آتے اور بدستور اپنا شغل جاری رکھتے ہیں۔ مجبوراً افسانہ نگار کو اپنی آنکھیں کھولنا پڑتی ہیں۔ ایک دفعہ اور اپنے سامنے لکھی ہوئی عبارت کے آخری فقرے کو پڑھا جاتا ہے۔ شاید خیالات کا تانتا پھر بندھ جائے!

مگر خیالات اگر ستم ظریف نہیں تو کچھ بھی نہیں! دور کھڑے بچارے افسانہ نگار کی زبوں حالی پر مسکراتے ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی زیادہ دلیر ہوا تو وہ چپکے سے افسانہ نگار کے دماغ میں آ کر گدگدی کرنے لگتا ہے۔ مگر جہاں افسانہ نگار نے اسے قابو کرنے کے لئے ذرا سی بھی حرکت کی وہ وہاں سے بھاگا اور اپنے ساتھیوں میں جا ملا۔ افسانہ نگار حضرت سر پیٹ کر رہ جاتے ہیں۔ مجبوراً کرسی سے اٹھ کر کمرے کی فرش پیمائی شروع کر دیتے ہیں۔ اس طرح کہ ایک ہاتھ پیشانی پر ہوتا ہے اور گردن نگوں۔ ان کی حالت قابلِ رحم ہوتی ہے۔ مگر خیالات کو تو صرف ستانے رلانے اور دل دکھانے ہی میں ہی مزہ ملتا ہے۔

افسانہ نگار کی آنکھ جو گھڑی پر پڑتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ساڑھے بارہ بجنے کے بعد بھی دس منٹ گذر گئے۔ مسلسل ناکامیاں بڑے بڑوں کا حوصلہ توڑ دیتی ہیں اور یہ تو بچارے محض ایک افسانہ نویس ٹھہرے! ادھر طاقت جواب دے دیتی ہے، اُدھر محترمہ نیند بصد ناز انہیں اپنے آغوش کی طرف کھینچتی ہیں اور کہتی ہیں کہ آؤ میں تمہارے تھکے ہوئے جسم اور دماغ کو پیار سے سہلاؤں گی اور تم اپنی تمام کلفتیں بھول جاؤ گے۔ مگر جونہی یہ بتی گل کر کے یا بجلی بند کر کے بستر پر دراز

ہوتے ہیں اور نرم نرم نامعلوم انگلیاں ان کی آنکھوں کو بند کرنے لگتی ہیں وہی خیالات جن کی انہیں اپنے افسانے کے لئے اشد ضرورت تھی ایک ایک کر کے دبے پاؤں ان کے دماغ میں وارد ہوتے ہیں اور ایک قطار میں خدام کی مانند اس طرح مود بانہ سر جھکا کر کھڑے ہو جاتے ہیں گویا وہ صرف ارشاد کے منتظر ہیں اور ان کی تعمیل میں ذرا دیر نہ لگائیں گے۔ گویا وہ بالکل معصوم ہیں اور انہوں نے اپنے آقا کو کبھی کسی قسم کی شکایت کا موقع ہی نہیں دیا! افسانہ نگار لکھنے کی خفیف سی کوشش کرتا ہے۔ گر نیند اب انہیں اپنے آغوش سے کہاں جانے دیتی ہیں! اپنا آخری آلۂ تسخیر کام میں لاتی ہیں یعنی افسانہ نگار کی آنکھوں کو دو شیریں بوسوں سے بالکل بند کر دیتی ہیں۔ افسانہ دھرا رہ جاتا ہے!

خیالات کی جفا کاریاں صرف افسانہ نویسوں کو ہی اپنا تختۂ مشق نہیں بناتیں یہ زندگی کے ہر شعبے میں گل کھلاتی ہیں۔ فرض کیجئے آپ کو کسی ادبی یا سیاسی محفل میں مدعو کیا گیا ہے۔ آپ وہاں پہنچتے ہیں اور محفل کی کارروائی میں حصہ لیتے ہیں چونکہ ایسی مجالس میں آج کل کوئی ٹھوس یا پائیدار کام کرنا یا کسی اہم مسئلے کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرنا یا پھر اس امر پر غور کرنا جس کے لئے محفل منعقد کی گئی ہو گناہ قرار دے دیا گیا ہے اور صرف چائے یا سگریٹ پینا، اصل مقصد سے ہٹ کر کسی گمنام راہ پر گام زن ہونا، لفاظی کے بحر قلزم میں غوطے لگانا یا سب سے بڑھ کر، لوگوں اور ان کے افعال پر نکتہ چینی کرنا ہی خوش ذوقی کے مظاہر سمجھے جاتے ہیں، اس لئے ہوسکتا ہے کہ دورانِ گفتگو میں کوئی صاحب آپ پر ہی فقرہ چست کریں اور ہر طرف سے داد حاصل کریں۔ ایسے موقع پر اول تو آپ کو کوئی چٹ پٹا جواب سوجھے گا ہی نہیں اور اگر سوجھا بھی تو ایسا جس کو آپ ڈرتے ڈرتے لفظی جامہ پہنائیں گے مگر آپ کی توقعات کے مطابق جہاں لفظ آپ کی زبان سے لڑکھڑاتے ہوئے نکلے مجلس میں ایک اور قہقہہ بلند ہوا اور آپ پسینہ پسینہ۔ خیالات آپ سے چند قدم کے فاصلے پر ہی خوشی سے جھومتے ہوں گے۔ انہیں تو ایسے موقعے خدا دے کہ آپ کو ان کی ضرورت ہو اور وہ عین وقت پر آپ سے دانستہ ہی دل لگی کر جائیں! طرفہ یہ ہے کہ بعد ازاں آپ کے دماغ میں داخل ہو کر وہ اس بات کا بیّن ثبوت دے دیتے ہیں کہ انہوں نے آپ سے کسی وقت دل لگی کی تھی! ان کا یہ طریقۂ کار تو بالکل ناقابلِ عفو و برداشت ہے۔ اگر کوئی خیال آپ کی دماغی حدود میں آیا ہی نہ ہو اور اسی بنا پر آپ ایک وقت پر لاجواب ہو جائیں تو خیر یہ تو بات ہی جدا ہے، اگر کسی خیال کا یہ رویہ کہ وہ منہ پھٹ آپ کو آکر بتائے کہ میں تو آپ کے دماغ کی سرحد پر حاضر تھا مگر آپ نے میری خدمات حاصل ہی نہ کیں، ایک بے مثل گستاخی ہے۔ مثلاً جب آپ غسل فرمانے لگتے ہیں اور چہرے پر صابن کی جھاگ کے تودے بنانے میں مصروف ہوتے ہیں تو یکایک دو تین خیال اٹھکھیلیاں کرتے ہوئے آتے ہیں اور آپ فوراً بول اٹھتے ہیں:۔

"اوہو! محفل میں اُس فقرے کا جواب ان الفاظ میں دیا جا سکتا تھا۔ بیچارے ——— صاحب دوبارہ مجھ پر فقرہ آزمائی کرنے کی جرأت نہ کرتے" مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔ آپ دانت پیس کر رہ جاتے ہیں اور خیالات خوش و خرم جدھر سے آئے تھے اُدھر چل دیتے ہیں!

امتحان میں خواہ وہ طلبا کا ہو یا عشاق کا خیالات خاص طور سے اپنی ہٹ دھرمی کا ثبوت دیتے ہیں (اس اعتبار سے طلبا اور عشاق میں بے حد مناسبت ہے!) تین ماہ سے آپ ایک مضمون کی تیاری میں دن رات ایک کرتے رہے ہیں اور امتحان کے دن تک آپ کو کامل بھروسہ ہے کہ آپ اس مضمون کے تمام نشیب و فراز سے اتنی ہی واقفیت پیدا کر چکے ہیں جتنی کہ وہ قیدی اپنی کوٹھڑی سے پیدا کر لیتا ہے جو مسلسل تین ماہ تک اس میں بند رہا ہو! امتحان کے کمرے میں داخل ہونے کے بعد بھی آپ کو یقین ہے کہ آپ پیچیدہ سے پیچیدہ سوال کا نہایت تسلی بخش جواب لکھیں گے۔ مگر ہوتا کیا ہے؟ پرچے کے دوسرے سوال کے جواب میں ہی آپ ایک ایسے مقام پر آکر اٹک جاتے ہیں جو آپ کو پانی کی طرح "حفظ" تھا۔ آپ لاکھ سر ماریں مگر وہ خیال آپ کے بس کا نہیں۔ اس نے پہلے سے ہی آپ کے ساتھ کھیلنے کا تہیہ کر رکھا تھا! آپ کسی قدر ملول امتحان کے ہال سے باہر نکلتے ہیں۔ ایک درخت پر اتفاقاً نظر پڑتی ہے اور ساتھ ہی (جیسے درخت کا خیال سے کوئی تعلق ہو!) آپ کو وہ جواب جس کے لئے آپ نے ہال میں بیٹھے بیٹھے کئی قیمتی منٹ سوچنے میں ہی ضائع کئے تھے لفظ بلفظ یاد آ جاتا ہے۔ آپ خیالات کو جتنا جی چاہے کوسیں، مگر انہوں نے آپ کی پریشانی سے جو لطف اٹھانا تھا اٹھا لیا۔

عاشق کا امتحان اس وقت ہوتا ہے جب اُسے بارگاہِ حسن میں تنہا پہنچ کر اپنا عشق جتانا پڑے۔ عشاق کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کے "لبوں پر مہر خاموشی دلوں میں یاد کرتے ہیں"۔ دوسرے وہ جو محبوب کے سامنے ماجرائے دل کے بیان کی ہوس رکھتے ہیں اور طرح طرح کے تصورات سے مدد لے کر گوناگوں نقرے گوشِ محبوب کے لئے تراشتے ہیں۔ مگر جب "اُن" کے پاس پہنچتے ہیں تو آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتے۔ دل شدت سے دھڑکنے لگتا ہے۔ لب جنبش نہیں کرتے۔ قوت گویائی سلب ہو جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ سب رعبِ حُسن کا نتیجہ ہوتا ہے۔ مگر یہ نظریہ اتنا ہی غلط ہے جتنا کہ فرسودہ۔ یہ سب حضرتِ خیال کی کارستانیاں ہیں! عاشق نامراد دل ہی دل میں خیالات کو بلاتا ہے، منت سماجت کرتا ہے۔ کہ ایسے موقع پر تو میرے ساتھ یہ برتاؤ نہ کرو۔ مگر سب بے سود۔ عشاق کی اس ابدی

مصیبت کے ذمہ دار یہی ظالم خیالات ہیں جو کسی کے جذبات کی پروا نہیں کرتے!

کبھی کبھی شبہ ہوتا ہے کہ خیالات بھی نسل انسانی کے خورد سالوں کی طرح بے سمجھ بچے ہیں جو ایک دوسرے کو دور سے ہی کوئی دل پسند چیز دکھا کر للچاتے ہیں۔ مراد یہ ہوتی ہے کہ دیکھو ہمارے پاس کیسی اچھی، کیسی خوبصورت شے ہے جو تمہارے پاس نہیں! اور اس کی بجائے انگوٹھا دکھاتے ہیں۔ مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ تو محض دل لگی تھی، ہمارا ارادہ اس چیز سے جدا ہونے کا تھوڑے ہی تھا۔ یہی عادت خیالات کی ہے۔ بظاہر تو کہتے ہیں "لو۔ آؤ۔ ہم یہاں ہیں ہمیں لے لو!" مگر جونہی آپ نے ان کی بات کو باور کر کے ایک قدم اُن کی جانب اُٹھایا۔ وہ نہایت صفائی سے غائب ہو جاتے ہیں۔ انہیں آپ کو چھت پر پہنچا کر نیچے سے زینہ کھینچ لینے میں ہی مزا آتا ہے!

مگر دوبارہ غور کرنے پر یہ شبہ غلط معلوم ہوتا ہے اور اس کی جگہ ایک اور شبہ مستحکم ہو جاتا ہے۔ عشوہ طراز مہ جبینوں کی بھی تو یہی عادت ہوتی ہے! انہیں بھی تو نوعِ انسانی کو ستانے میں لطف آتا ہے! کیسے کیسے دلربایانہ انداز سے وہ آپ کی تمام توجہ کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی آپ کو ہر ممکن طریقے سے اپنے قریب آنے سے باز رکھتے ہیں! کبھی آ کے منظر عام پر، کبھی ہٹ کے منظر عام سے آپ کو اپنے جمالِ جہاں تاب کی ایک جھلک دکھا جاتے ہیں اور پھر آپ کی حسرت دید سے بھری ہوئی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ آپ لاکھ آہیں بھریں۔ مدتوں انتظار کریں مگر اُن کو آنا ہے نہ آئیں گے۔

کیا خیالات بھی عشوہ طراز حسین ہیں؟

ہیں تو سہی۔ مگر ان میں ایک وصف ہے (شاید یہ وصف وصف نہ ہو) — وہ کبھی نہ کبھی آپ کی پریشان حالی پر ترس کھا کر آ تو جاتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے نزول کے اوقات نرالے ہیں۔ مثلاً کسی وقت آپ نسان کی اعانت سے چند تشبیہیں تراشیں۔

"وہ اتنا مقبول ہو گیا ہے جتنا کہ لاہور کے درزیوں میں سے سراج طلبار کے حلقے میں!"

"میرے حالِ دل کا مضمون اس ظالم نے مدبرانہ بے نیازی سے نامنظور کر دیا۔"

"ان کا ہر قدم ایک افسانہ ہے!"

وغیرہ وغیرہ۔ اب کسی موقع پر آپ کو ان تشبیہوں کی ضرورت پڑی آپ کاغذ پنسل لئے بیٹھے اس فکر میں ہیں کہ فلاں نقرہ یاد آئے تو اُسے جھٹ لکھ ڈالیں مگر یاد کیسے آئے؟ آپ کے خیالات نے یہی وقت غمزہ و عشوہ وادا" کے لئے موزوں سمجھا ہے۔ "وہ اتنا مقبول ہو گیا جتنا — جتنا کہ اندھوں میں کانا راجہ"! لاحول ولا قوۃ! آپ کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی آپ کی بے بسی پہ قہقہے لگا رہا ہے۔ بالآخر آپ مجبوراً کاغذ پنسل پٹک دیتے ہیں۔

مگر آپ کے پیارے پیارے فقرے۔ محبوب تشبیہیں۔ دلنشیں استعارے آپ سے ہمیشہ کے لئے جدا نہیں ہوئے۔ یہ مفارقت محض عارضی ہے۔ آپ کو اُن کے "تغافل ہائے تمکین آزما" سے گھبرانا نہ چاہئے۔ وہ واپس آئیں گے۔ خیالات اُنہیں خود آپ کے پاس پہنچائیں گے۔ لیکن کب؟ آپ بے صبری سے پوچھتے ہیں۔ جب آپ کو انفلوانزا ہو گا یا سردرد یا بخار اور آپ زندگی کے ان جابر مہمانوں کی خوشنودی کے لئے چارپائی پر آنکھیں بند کئے خاموش پڑے ہوں گے یا آہستہ آہستہ کراہتے ہوں گے! جب آپ بیت اُل — مگر آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ اشارہ کس ناگزیر مقام کی طرف ہے! ہاں۔ تو جب آپ مجبوراً اسی مقام پر ڈائری کے بغیر بیٹھے ہوئے دنیا اور مافیہا کے دقیق ترین مسائل پر غور فرما رہے ہوں گے، یہ آئیں گے اور آپ کو محو پا کر آپ کے دماغی چور دروازے کی راہ سے نہایت اطمینان سے اندر گھس جائیں گے۔ اس وقت آپ کو نہ صرف تمام بھولی ہوئی باتیں یکے بعد دیگرے یاد آ جائیں گی بلکہ کائنات کے عجیب راز ایک ایک کر کے آپ کی آنکھوں کے سامنے بے نقاب ہونے لگیں گے کبھی آپ ایک شاعرِ آتش کلام کا جنہ پہن کر فلک پیمائیاں کریں گے اور کبھی ایک سیاسی لیڈر بن کر خاموش مجمعوں میں وہ پتے کی باتیں کہہ جائیں گے جو کسی کے فرشتوں کو بھی نہ معلوم ہوں کبھی آپ ایک سائنسدان بن کر گریز پا شباب کو روکنے کی آخری ترکیب ڈھونڈھ نکالیں گے اور کبھی ایک ماہر نفسیات بن کر دلوں کے سربستہ راز اس آسانی سے بتا دیں گے جیسے کوئی نجومی مستقبل کا پردہ آن واحد میں اٹھا ڈالتا ہے! آپ افسانہ نویس بنیں گے تو افسانوں کے پلاٹ آ آ کر آپ کے قدم چومیں گے۔ مصلح بنیں گے تو دنیا کو اپنے اشاروں کا منتظر پائیں گے۔ مزدور بنیں گے تو کسی خستہ حال جھونپڑی میں بیوی سمیت تین تین دن فاقہ کشی میں ہی کٹ جائیں گے اور کوئی پرسانِ حال نہ ہو گا۔ انشا پرداز بنیں گے، تو چاروں طرف اپنے ہی نام کا ڈنکا بجتا سنیں گے۔ ایک مایوس و بے روزگار نوجوان بنیں گے تو سماج کی بے توجہی سے تنگ آ کر اپنی جانِ عزیز کو کسی دریا کے سپرد کر کے ہی چین لیں گے۔ آپ کیا کچھ نہیں بنیں گے! خیالات آپ کو سب کچھ بنا ڈالیں گے سب کچھ دکھا ڈالیں گے اور سب کچھ آپ سے کروا ڈالیں گے! یہ ایسے موقعوں پر بھی آ دھمکیں گے جب آپ آئینہ سامنے رکھ کر داڑھی مونڈ رہے ہوں۔ جھک کر بوٹ کا تسمہ باندھ رہے ہوں۔ کسی بزرگ کے پاس بیٹھے اس کی

باتیں ہمہ تن گوش ہو کر سن رہے ہوں روٹی کا نوالہ منہ میں ڈال رہے ہوں کسی اشد ضروری کام کے لئے کسی سمت کو بہ عجلت چلے جا رہے ہوں۔ خدا کے حضور میں اس کی حمد و ثنا کے لئے حاضر ہوں اور ——— اور ——— یہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ خیالات میرے ساتھ بھی داؤں کھیل گئے ہیں اور کیا کیا کہنا چاہتا تھا۔ مگر دماغ یکا یک کورا ہو گیا ہے اور حضرت خیال کافور! کہیں چھپے ہوئے میری بے بسی پر زیر لب مسکراتے ہوں گے۔ خوب مسکرایئے۔ بلکہ ٹھٹھے مار کر ہنسیئے۔ یہ تو آپ کا پرانا شیوہ ہے!

مگر آخر ان مشکلات کو حل کرنے کے لئے اور خیالات کو شکار کرنے کے لئے کیا کیا جائے؟ چند ترکیبیں میرے ذہن میں آئی ہیں۔ ذیل میں درج کئے دیتا ہوں۔ شاید کارآمد ثابت ہوں:

ا۔ ایک پرائیویٹ سیکرٹری (خواہ وہ عورت ہی کیوں نہ ہو) کی خدمات حاصل کی جائیں۔ سیکرٹری کو ہدایات ہوں کہ وہ ہر وقت سائے کی مانند آپ کے ساتھ رہے اور جونہی آپ کے دماغ میں کوئی خیال وارد ہو وہ آپ سے پوچھ کر فوراً ایک نوٹ بک میں درج کر لے تاکہ بوقت ضرورت کام آئے۔ مگر اس ترکیب میں ایک دو قباحتیں ہیں۔ اول تو یہ کہ جن حضرات کے ہاں خیالات کی فراوانی ہوتی ہے وہاں عموماً چاندی کی گول ٹکلیوں کی قلت ہوا کرتی ہے اور ان کمبخت ٹکلیوں میں کچھ ایسی جاذبیت ہے کہ ان کے بغیر کوئی سیکرٹری ایسے شدید فرائض تو کجا ہلکے سے ہلکے کام بھی کرنے کو تیار نہ ہوگا / ہوگی۔ دوئم یہ کہ آپ نے سیکرٹری رکھ بھی لیا تو وہ آپ کے ہمراہ غسل خانے اور اس قسم کے دیگر تفریحی مقامات پر کیسے جا سکے گا / گی!

ب۔ کوئی ایسا آلہ ایجاد کیا جائے کہ ادھر آپ کو کوئی خیال آیا۔ ادھر ایک کاغذ پر وہ خیال الفاظ کی صورت میں خود بخود اتر آیا جیسے وزن کرنے کی مشین میں جہاں آپ نے اکنی ڈالی ایک ٹکٹ جس پر آپ کا وزن نہایت خوبصورتی سے چھپا ہوتا ہے۔ کھٹ سے باہر نکل آیا۔ مگر اس ایجاد کا سہرا شاید کسی آئندہ صدی کے سر ہی بندھے۔ بہر صورت آپ کے لئے اس سے مستفید ہونے کا بہت کم امکان ہے!

ج۔ آپ کی یادداشت ایسی تیز ہو کہ آپ جہاں اور جس وقت چاہیں مائل بہ عشوہ خیالات آپ کے پاس کھنچے چلے آئیں۔ مگر افسوس! ایسی یادداشت تو الف لیلہ کے ایک وزیر کی تھی!

د۔ آپ زندگی سے کوچ فرما جائیں۔ اس صورت میں یہ تمام مشکلیں یک دم حل ہو جائیں گی۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری!

نوٹ:۔ ظاہر ہے کہ موخر الذکر ترکیب ہی سب سے زیادہ موثر ہو سکتی ہے۔ ضرورت مند حضرات توجہ فرمائیں۔

انور اعجاز قیصر

غزل

جن کی فطرت میں ودیعت ہے مذاقِ تگ و تاز
ہیں پر و بال بھی اُن کے لئے ننگِ پرواز

کیوں نم آلودہ نہ ہوں اہلِ نظر کی آنکھیں
چھوڑ کر دامنِ دریا کو کہاں جائے گداز!

چشمِ آگاہِ تماشا جنہیں بخشی تُو نے
پردۂ رُخ بھی ترا اُن کے لئے جلوہ طراز

ایک ہستی نظر آتی ہے تماشا فرما
ہم کو ادراکِ حقیقت ہے نہ احساسِ مجاز

تیری عزت کے لئے رند فنا ہو بھی چکے
شیخ ہے اب بھی تری یاد میں مصروفِ نماز

عام ہے مبداءِ موسیقئِ فطرت کی عطا
بخشے جاتے ہیں مگر نغمے باندازۂ ساز

غم نہیں کچھ بھی ہو انجامِ محبت یارب
ہاں محبت کا مگر یاد نہ آئے آغاز!

جلوۂ حُسن پہ موقوف نہیں گرمئ دل
اس سے پہلے بھی یہی تھا مری فطرت میں گداز

ہائے میں خود بھی نہیں واقفِ اسرارِ وجود
ہے مری خاک کا ہر ذرّہ جگر گوشۂ راز

حُسن اس درجہ دل آویز کہاں اے تاباں
یہ بھی ہے ایک مرے حسنِ نظر کا اعجاز

ظفر تاباں

ایک تضمین اور ایک ترجمہ

تضمین

محتاج و غنی میں جو تفاوت ہے مٹا دو انسان کو انسان کا ہمدرد بنا دو
اربابِ رعونت کو رعونت کی سزا دو اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو

کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو!

پیدا کرو انوارِ عمل روئے زمیں سے بڑھ کر ہوں چمک میں جو ستاروں کی جبیں سے
تعمیر ہو اک عالمِ پائندہ یہیں سے گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے

کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو!

ہر لب پہ ہے آزادیٔ کامل کا ترانہ اس دور میں شاہوں کی حکومت ہے فسانہ
درکار ہے اس قصر کے گرنے کو بہانہ سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ

جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو!

یہ عالمِ نو جانبِ الحاد رواں ہے، بے اعتمادی اس کی تباہی کا نشاں ہے،
افزائشِ سامانِ طرب کاوشِ جاں ہے، تہذیبِ نوی کارگہِ شیشہ گراں ہے،

آدابِ جنوں شاعرِ مشرق کو سکھا دو!

جگن ناتھ آزاد

بلاوا

چلی بھی آؤ اے جانِ جہاں خوف و خطر کیا ہے
چمک کر راہ میں جگنو تمہیں رستہ بتائیں گے
ستارے بھی شبِ تاریک کو روشن بنائیں گے
طیورِ شب تمہاری راہ میں آنکھیں بچھائیں گے
چلی بھی آؤ اے جانِ جہاں خوف و خطر کیا ہے

تمہارے پاس مور و مار آ سکتے نہیں ہرگز
خیالِ دشمنی کو دل میں لا سکتے نہیں ہرگز
کسی صورت غرض تم کو ستا سکتے نہیں ہرگز
چلی بھی آؤ اے جانِ جہاں خوف و خطر کیا ہے

یہ معمولی سی آہٹ پر ٹھہر جانا نہیں اچھا
ذرا سی سرسراہٹ پر ٹھہر جانا نہیں اچھا
ہوا کی سنسناہٹ پر ٹھہر جانا نہیں اچھا
چلی بھی آؤ اے جانِ جہاں خوف و خطر کیا ہے

نہ ہو گر چاندنی زینت نہیں ہے رہگزاروں کی
تمہارے واسطے کافی ہیں یہ شمعیں ستاروں کی
تصدق ہر قدم پہ ہو گی رنگینی بہاروں کی
چلی بھی آؤ اے جانِ جہاں خوف و خطر کیا ہے

یہ وقتِ شب یہ آہستہ خرامی جوئباروں کی
یہ نغمہ ریز مستانہ صدائیں آبشاروں کی
یہ خاموشی، یہ خوابیدہ جوانی سبزہ زاروں کی
چلی بھی آؤ اے جانِ جہاں خوف و خطر کیا ہے،

(رابرٹ ہیرک)

کوکب شادانی

نیشنل لیبارٹریز لاہور کی شہرت اب پنجاب سے نکل کر ہندوستان کے کونے کونے میں پھیل گئی ہے

کیونکہ اس کی بنائی ہوئی تمام چیزیں اپنی عمدگی اور قیمت کی کفایت کے لحاظ سے ولایتی اشیا کو مات کرتی ہیں

نیشنل لیبارٹریز

کے اورینج اور لیمن سکوئش عرقیات - عطر سینٹ تیل - کریم اور انٹی سپٹال سوپ اپنے مقابلہ کے ولایتی مصنوعات سے ہزار درجہ بہتر اور قیمت میں بھی باکفایت ہیں یہی وجہ ہے کہ تمام معقول دوکاندار اس کا سٹاک رکھتے ہیں اور اپنے گاہکوں کی ضروریات کو پورا کرتے ہیں

مونا سنو

پُرجلال بادشاہ سے لے کر بے خانماں گداگر تک خوبصورتی کا خواہشمند ہے - اس کے چند روزہ استعمال سے کیل چھائیاں جھریاں اور ہر قسم کے داغ دور ہو جائیں گے - اور چہرہ چاند کی مانند نکل آئے گا - ایک دفعہ ضرور استعمال کریں -

شاعروں کا مقولہ توڑ دیا گیا

دردِ سر کے واسطے کہتے ہیں - صندل ہے مفید اس کا گھسنا اور لگانا دردِ سر یہ بھی تو ہے صندل آئل جس کے استعمال سے دائمی دردِ سر دور ہو جاتا ہے - دماغی کام کرنے والوں کے لئے ایک بے نظیر تحفہ ہے -

سول ایجنٹ :-

بیلی رام اینڈ برادرز - سوداگران ادویات ---- انارکلی ---- لاہور

هوں ...... بہتر ہے کہ آپ اِس بچہ کو سِرولن دیں -

روغن سِرولن

بچوں اور بڑوں کے لئے کھانسی کو دفع کرنے اور پھیپھڑوں کو قوت بخشنے والی دُنیا کی سب سے زیادہ سریع الاثر دوا

ایک لاکھ شیشیاں مفت تقسیم ہونگی

سُکھ سنچارک کمپنی متھرا

کو قائم ہوئے پچاس سال پورے ہو گئے ہیں اسی خوشی میں ہم "سدھا سندھو" کے نمونہ کی ایک لاکھ شیشیاں مفت تقسیم کریں گے -

"سدھا سندھو" کف، کھانسی، ہیضہ دمہ، پیچش وغیرہ کی تیر بہدف دوا ہے اپنا پورا نام و پتہ کارڈ پر لکھ کر منگائیے -

سُکھ سنچارک کمپنی متھرا

ماتم دلبری

آتشدان میں سوکھی ہوئی سخت لکڑیاں چٹاخ چٹاخ جل رہی تھیں کمرے میں اداسی چھائی ہوئی تھی۔ دو دوست طعام شب ختم کر چکے تھے۔ داؤد نے اٹھ کر ہوٹل کے دریچے میں سے جھانکا۔ ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا اُس کے بدن سے مس کرتا ہوا گذر گیا۔ سڑک لوگوں سے کھچا کھچ بھری تھی۔ اُس نے سگرٹ کا بچا ہوا ٹکڑا کھڑکی کی چوکھٹ پر مسل کر نیچے پھینک دیا اور لمبی سانس لے کر کہا "آہ۔ میں بوڑھا ہو رہا ہوں کس قدر اداسی ہے" یہ کہہ کر وہ مڑا اور آتشدان کے قریب اپنی کرسی پر آ بیٹھا جہاں اُس کا دوست پرویز سر جھکائے سگار پی رہا تھا۔ داؤد نے اُسے مخاطب کر کے کہا "قبل ازیں میں ایسی ہی شام کو اپنے بدن میں اک آگ سی محسوس کیا کرتا تھا مگر اب ——؟ بجھی ہوئی راکھ، تاسف، حسرت۔ زندگی کتنی تیز رفتار ہے پرویز"!

پرویز نے جو جسم کا لاغر عمر میں اُس سے بڑا نسبتاً زیادہ خوش دل اور بذلہ سنج تھا۔ سر کو یوں اٹھاتے ہوئے گویا کوئی خواب دیکھ رہا تھا جواب دیا۔ "داؤد میں نے اپنے بڑھاپے کو دنیا میں سب سے کم محسوس کیا ہے۔ میں ہمیشہ مسرور رہا ہوں میں نے اپنے اوقات ہنسی خوشی اور قہقہوں میں بسر کئے ہیں۔ اگر کوئی ہر روز بلا ناغہ اپنے آپ کو آئینے میں دیکھتا رہے تو وہ کار کنانِ عمر کی تبدیلیاں جو وہ ہر لحظہ کر رہے ہیں محسوس نہیں کر سکتا کیونکہ اُن میں آہستگی اور باقاعدگی ہوتی ہے اور چہرے کے خد و خال دھیرے دھیرے اس طرح بدلتے رہتے ہیں کہ یہ انقلاب ہمیں اَن دیکھا معلوم ہوتا ہے۔ یہ اس انقلاب کا احساس ہی تو ہے جو روز بروز ہمارے دل و دماغ پر ایک تکلیف دہ صورت میں اثر پذیر ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس انقلاب کو اگر صحیح طور پر محسوس کرنا ہو تو چھ مہینے تک آئینے کے نزدیک نہ جاؤ۔ پھر دیکھو۔ مگر عورت! کتنی قابلِ رحم ہستی ہے۔ اس غریب کی مسرت، زندگی، تکبر، طاقت صرف اس کی خوبصورتی میں مضمر ہے اور پھر ستم ظریفی یہ کہ اِس نعمتِ عظمےٰ کی عمر صرف دس برس۔ —— تم یہ سن کر حیران ہو گے کہ میں آج تک اسی خیال پر ادھار کھائے بیٹھا رہا کہ میں ابھی جوان ہوں گو میری عمر کا یہ چالیسواں برس گذر رہا ہے"۔

"مگر تمہارے سر کے بال تو اکثر و بیشتر سفید ہو چکے ہیں"؟ داؤد نے کہا

"اسی مرمریں قبر میں میری جوانی دفن ہے۔ وہ کیونکر دفن ہوئی۔ یہ بھی ایک واقعہ ہے۔ تم نے مجھے کیوں چھیڑ دیا داؤد"؟

داؤد نے اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "بوڑھوں کی زندگی میں اپنی جوانی کی تلاش مشترکہ بات ہوا کرتی ہے منہ پر آئی بات رکنی نہیں چاہئے"۔

پرویز سگار کو لبوں سے الگ کرتے ہوئے بولا "میں ہمیشہ مسرور و شادماں رہا ہوں۔ مگر آہ! اس تنزل کا حال مجھ پر اس قدر اندوہناک صورت میں منکشف ہوا کہ مجھ پر کوئی چھ مہینے تک لطف زیست حرام ہو گیا۔ میں نے بھی لوگوں کی طرح زندگی میں کئی بار محبت کی ہے۔ نہیں نہیں ایک بار صرف ایک بار۔ انسان زندگی میں صرف ایک ہی بار صحیح محبت کر سکتا ہے۔

"یہ بمبئی کا واقعہ ہے۔ ایک شام میں اور میرا ایک ہم جماعت دوست وجے گھوش ایک قہوہ خانہ میں بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ ہمارے قریب کی میز پر ایک نوجوان لڑکی ایک مرد اور ایک ادھیڑ عمر یورپین عورت آ بیٹھے۔ ہم نے اندازہ لگایا کہ وہ لڑکی اُن کی بیٹی تھی اور یہ اندازہ صحیح نکلا۔ آہ یاد ایام!!! داؤد، بعض حسین و جمیل صورتیں پہلے ہی دار میں فتح حاصل کر لیتی ہیں اور اُن کی لمبی لمبی سرمگیں پلکوں سے نکلی ہوئی کوتاہ نگاہ "قلب کی انتہائی گہرائیوں میں اُتر کر ہی چین لیتی ہے۔ اُس نوجوان لڑکی کی آنکھوں میں ایک ایسی دلکشی پنہاں تھی جسے ایک بار دیکھ لینا اور پھر جان و دل سلامت بچا کر لے جانا انسان کے لئے بہت دشوار تھا میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس واقعہ کے تیسرے روز بعد وجے گھوش نے مجھے کالج لائبریری میں آ کر یہ خوشخبری دی کہ وہی لڑکی اپنے باپ کے ساتھ کالج کے دفتر میں ایم اے کی فیس ادا کر رہی ہے اور پھر طرہ یہ کہ وہ اُن سے کالج کے متعلق کچھ اسمی باتیں بھی کر آیا ہے۔ میں اور وہ تیزی سے سیڑھیاں اُترے۔ میرا دل خوشی سے دھک دھک کر رہا تھا۔ ہم نے انہیں کالج کے برآمدے میں جا لیا۔ اُس لڑکی کا باپ ہم سے دو چار باتیں کرنے کے بعد موٹر میں سوار ہو کر چلا گیا۔ باقی ہم تینوں، میں، گھوش اور وہ لڑکی وہیں گھاس پر ٹہلنے لگے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اُس کا نام ساحرہ سراج الدین ہے۔ اُس کی ماں یورپین ہے اور باپ ہندوستانی مسلمان۔ ہم نے پہلی ہی ملاقات میں بھانپ لیا کہ اُس کا مذاق سلجھا ہوا ہے اور وہ نہایت خوش خلق اور شائستہ مزاج لڑکی ہے ——

ایم اے میں ہم سات لڑکے تھے۔ ساحرہ کی ملنساری اور خوش خلقی نے ہم سب کو دنوں میں اپنا گردیدہ کر لیا۔ کبھی ہم اُسے مدعو کرتے کبھی وہ ہمیں اپنے ہاں بلا لیتی چائے بے تکلفی سے اڑتی۔ دنیا بھر کے موضوعات پر بحث کی جاتی اور بار ہا سینڈوچز تو ادنٹ کے منہ میں زیرہ ہو کر رہ جاتیں اور بعض اوقات باتوں سے ہی پیٹ بھر لیا جاتا ۔۔۔ آہ کیا دن تھے وہ ۔۔۔ چھٹی کا دن سمندر کے کنارے بسر ہوتا کئی مرتبہ ساحرہ کی ماں اور باپ بھی ہمارے ساتھ ہوتے۔ ساحل سمندر پر عورتوں کا ایک جم غفیر موجود رہتا اور وہ مختصر سا قطعہ اُن کی چمکیلی رنگدار پوشاکوں سے ایک چمن زار بنا رہتا۔ آفتاب اپنی پوری تابانی سے زنگار رنگ کے چھاتوں اور نیلگوں سمندر کی امواج مضطرب پر چمکتا رہتا، ہر طرف سے مسرت اور خوش دلی ٹپکا کرتی۔ ہر شے مسکراتی معلوم ہوتی۔ زن و مرد چھوٹی چھوٹی ہلکی کف آلود موجوں میں داخل ہوتے ہی ایک گونہ تیز قدمی سے سمندر کے ٹھنڈے پانی میں کودتے اور فضا ہلکے ہلکے قہقہوں سے گونج اٹھتی۔ ساحرہ نہانے کا لباس پہن کر ہمارے ساتھ ساتھ سمندر کی ریت پر بھاگا کرتی۔ اس کا خوبصورت سڈول جسم مجھے اب تک یاد ہے وہ موزونیت کا مجسمہ معلوم ہوتی تھی۔ اُس کی جوانی میں مجھے اپنی زندگی حرکت کرتی ہوئی محسوس ہوتی ۔۔۔ داؤد، میں نے زندگی میں پہلی بار محسوس کیا کہ پھول اور موسیقی کا دوسرا نام عورت ہے۔ میں کبھی یہ نہ سمجھ سکا کہ اُس کے تابدار پردہ رخسار کے پیچھے اس کے رسیلے لبوں کی ایک معمولی جنبش میں بناگوش کی گولائی کے اندر اور اُس کی خوش وضع ناک کی اٹھان میں یہ زہد شکن حسن کہاں چھپا بیٹھا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ میری زندگی اور میری پیدائش کا مقصد صرف ساحرہ کی محبت ہے۔ وہ میرے دل و دماغ پر حکومت کرنے لگی۔ اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے مجھے اُس کا خیال رہنے لگا۔ اس طرح محبت کے ہاتھوں ایک عورت کا غلام بن جانا کتنا عجیب اور پر کیف مشغلہ ہے۔ ہم اسے ایک طرح کی سزا بھی خیال کرتے ہیں مگر ہائے اُس بربادیٔ شادماں پر ہزاروں شاد کامیاں قربان اور لاکھوں مسرتیں فدا۔

اُس کا قد رعنا اس کے پتلے پتلے ہونٹ اُس کے ہوا میں لہراتے ہوئے سیاہ گیسو اور چہرے کے بے عیب خد و خال میرے دل کی دھڑکن کو اس قدر تیز کر دیتے کہ مجھے اس کے دھڑکتے دھڑکتے رک جانے کا احتمال ہونے لگتا اُس کا جنون میری رگ رگ میں سرایت کرتا گیا۔ یہاں تک کہ اُس کی ہر شے میں مجھے وہ خود دکھائی دینے لگی۔ میں کتنی ہی دیر تک صرف اُس کے اُس خاص دلربایانہ انداز کو دیکھنے کی اُمید پر کھڑا رہتا کہ وہ کب اپنے دستانے اتار کر اپنے پہلوؤں میں ایک دل آویز لچک اور بازوؤں میں ایک ساحرانہ خم پیدا کرتے ہوئے انہیں بنچ پر رکھ دے۔ خدا کی قسم اُس کی سی نظر افروز اور خوشنما ساڑھیاں کالج کی کسی لڑکی کے پاس نہ تھیں۔ آہ بالآخر وہی ہوا جو ہوا کرتا ہے یعنی کچھ عرصے کے بعد اُس کی شادی ہو گئی ۔۔۔ میں نے ایک بیش قیمت تحفہ پیش کیا مگر وہ تحفہ جو ساحرہ کی طرف سے مجھے دیا گیا۔ برسوں میرے پاس موجود رہا روح کا درد، ایک داغ ناتمام اور ایک بے نام سی خلش۔ اُس کی شادی کے بعد میرے لئے بمبئی میں کوئی دلچسپی نہ رہی۔

"اور میرا آب و دانہ مجھے رنگون لے گیا۔ میرا قلب ملول اور دماغ افسردہ رہنے لگا۔ اُس کے تصور سے اپنی ذہنی قوتوں کو ایک لمحہ کے لئے آزاد کرنا میرے بس کی بات نہ رہی مگر رفتہ رفتہ میری طبیعت میں ایک سکون سا پیدا ہوتا چلا گیا اور میرے دماغ میں صرف ایک محبت آمیز یاد باقی رہ گئی دنیا کی ایک دلفریب حسین اور عزیز ترین ہستی کی یاد جس کو واقعاتِ زندگی نے میری راہ میں لا ڈالا تھا۔

"اٹھارہ سال ایک عمر ہے مگر کسی نے اسے کبھی محسوس کیا؟ ایک برس دوسرے کے پیچھے دوسرا تیسرے کے بعد سبک روی سے گذرا جاتا ہے۔ یہ طویل مدتیں کبھی کسی نے محسوس کیں؟ ماضی پر نظر ڈالو تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کل ہی کی بات ہے مگر یہ سفید بال کہاں سے نمودار ہو گئے۔ ہماری اتنی عمر کیونکر کٹ گئی۔ سچ کہتا ہوں مجھے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ چند مہینوں کا ذکر ہے جب میں نے بمبئی کو الوداع کہی تھی۔

"پانچ سال ہوئے میں الہ آباد میں تھا وہاں کی آب و ہوا کا اثر تھا یا معلوم نہیں کیا سبب۔ میری مونچھوں کے دو چار بال سفید ہو گئے جنہیں دیکھ کر میرے دل کو ایک دھچکہ سا لگا اور میں کسی قسم کی تاخیر کئے بغیر ڈاکٹر سے جا ملا۔ اُس نے ایک پیٹینٹ دوا کھانے کے لئے اور ایک تیل سا بالوں پر لگانے کے لئے تجویز کیا۔ چنانچہ میں اسی وقت شہر کے مشہور دوا فروش کی دکان پر پہنچا۔ وہاں حسب معمول بہت بھیڑ تھی۔ میں نے اپنا نسخہ دے دیا اور خود ملحقہ ڈیوڑھی میں بچھی ہوئی کرسیوں میں سے ایک کرسی پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ میرے دل کو اس خیال سے تسکین ہوتی رہی کہ ڈاکٹر قابل ہے۔ اُس نے یقین دلایا ہے کہ اس دوا کے استعمال سے بالوں کو تقویت پہنچے گی اور سفید بال دنوں میں سیاہ ہو جائیں گے سر کی تو خیر ہے مونچھوں میں سفید بال آنے سے تو میں واقعی بوڑھا ہو جاؤں گا میرے دائیں ہاتھ کی انگلیوں میں غیر ارادی طور پر جنبش ہوئی اور میں نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دے دے کر دیکھنا شروع کیا کہ آیا سفید بال اس طرح بھی نظر آتے ہیں یا نہیں۔ اتنے میں ایک موٹی سی گول مول عورت جو دو کرسیاں چھوڑ کر

بیٹھی ہوئی تھی میری ساتھ والی کرسی پر آبیٹھی اور بیٹھتے ہی بولی معاف کیجئے گا۔ کیا آپ مسٹر پردیز تو نہیں؟

"جی ہاں"، —— یہ سنتے ہی اُس کے لبوں پر مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ مگر اس کی مسکراہٹ اداسی کی ایک نامعلوم سی جھلک کو چھپا نہ سکی۔

"آپ نے مجھے پہچانا نہیں شاید؟" میں کچھ بوکھلا سا گیا۔ یہ چہرہ بہت آشنا معلوم ہوتا تھا مگر کہاں دیکھا تھا۔ کب؟ کچھ یاد نہ آتا تھا۔

"جی ہاں۔ ن ن نہیں میں نے پہچان لیا ہے مگر آپ کا نام گرامی یاد نہیں آتا۔"

"اُس نے آنکھیں نیچی کرلیں اور کچھ شرما کر کہا "ساحرہ علی حسن"

"مجھ پر بجلی گر پڑی۔ ایسا تلخ حادثہ مجھے عمر بھر پیش نہ آیا تھا۔ میرا خون رگوں میں رک گیا۔ میری آنکھوں کے آگے دھواں آگیا۔ دل سینے میں ڈوبنے لگا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میری آنکھوں کے سامنے سے ایک نقاب دھجیاں ہو کر اڑگیا اور یوں محسوس ہوا گویا میں ایک تلخ ترین حقیقت کی خون آشامیوں اور ہلاکتوں سے آشنا ہو رہا ہوں —— آہ کہاں وہ ساحرہ حسن کی تمام دلفریبیوں اور دلکشیوں کا مرقع اور کہاں یہ ساحرہ بھاری بھر کم موٹی سی جادوگرنی۔

"میں نے دیوانوں کی طرح اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا "تم ساحرہ ہو؟" میں اتنا ہی کہہ سکا جیسے میرے لبوں پہ مہر لگ گئی ہو۔ میرا دماغ ابل رہا تھا میری آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ میں اس معمر عورت سے واقف نہ تھا۔ میں صرف اُس کی خوبصورت جوانی کو جانتا تھا جو مر چکی تھی۔ میرے دو ڈھلکے ہوئے آنسو اُس کے ہاتھ پر ٹپ سے گرے۔ وہ بھی انسان تھی لرز گئی۔ الفاظ اُس کے منہ سے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر نکلنے لگے "م م میں بہت بدل گئی ہوں نا۔ اتنے طویل عرصہ کے بعد آخر ہم کیا توقع رکھ سکتے ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں میں اب ماں بن گئی ہوں صرف ایک اچھی ماں۔ الوداع ماضی۔ وہ بسر ہو چکا۔ ختم ہو چکا۔ اُف یہ میرے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ اگر ہم زندگی میں کبھی ملے بھی تو آپ مجھے پہچان نہ سکیں گے۔ آپ بھی تو آخر وہ نہیں رہے۔ آپ کو دیکھ کر میں کتنی دیر یہی سوچتی رہی کہ کہیں مغالطہ نہ ہو۔ سر بھی تو سفید ہو گیا ہے آخر اٹھارہ سال کا عرصہ۔ میری بڑی لڑکی کی عمر اٹھارہ برس کی ہو گئی ہے۔

"کُل کتنے بچے ہیں؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"چھ۔ چار لڑکیاں دو لڑکے" —— اتنے میں دکان کے ایک ملازم نے دواؤں کے دو چار بندھے ہوئے ڈبے لا کر ساحرہ کو دے دیئے۔ میں نے پوچھا "خیر تو ہے؟"

"میری طبیعت کچھ عرصے سے اچھی نہیں رہتی۔"

"کیا شکایت ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ایک شکایت ہو تو بتاؤں۔ عورتوں کی بیماریاں گنائی نہیں جاسکتیں۔" وہ مسکرائی۔ مجھے اُس کا کالج کا مسکرانا یاد آگیا۔ اُس کے دانت موتیوں کی طرح چمکا کرتے تھے جواب پائیوریا کی وجہ سے ماند پڑ گئے تھے۔ جب وہ اُٹھی تو میری نظر اس کے بالوں پر پڑی جو کالج کے زمانے میں اس کی کمر تک آیا کرتے تھے۔ مگر اب ان کی جگہ سیاہ و سفید ملے جلے بالوں کا ایک مختصر سا گچھا رہ گیا تھا۔ میں اُسے باہر تک چھوڑنے گیا۔ موٹر میں بچے ہل چل کر رہے تھے۔ ایک بسکٹ کھا رہا تھا۔ ایک چھوٹی سی بچی منہ بسورے ہوئے موٹر کی نشست پر سے گرے ہوئے چاکلیٹ اٹھا رہی تھی۔ ان چھوٹی چھوٹی جانوں نے اپنی ماں کی طرح مجھے اور زیادہ حیرت میں ڈال دیا۔ ماں کے چہرے کے کچھ نقوش اُن کے چہروں میں نشو و نما پا رہے تھے۔ لڑکیاں قد میں ابھی سے لانبی تھیں۔ انہوں نے ماں کی جگہ لے لی تھی۔ مگر وہ خود اب کیا تھی؟ وہ جو کبھی نخوت و ناز کا گہوارہ تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں نے اُسے کل ویسا ہی دیکھا ہے اور آج ایسا دیکھ رہا ہوں۔ اس کے جسم کی خوبصورت بناوٹ، چہرے کی جانفزا رونق، آنکھوں کی دلکشی اور بھرے ہوئے گالوں کی چمک اب ختم ہو چکی تھی۔ میرے سینے میں ایک شدید قلق ایک رنج جاگ اٹھا۔ میرا دل فطرت کے یہ ہلاکت خیز فرائض اور ناپائدار و بے رحمانہ مشغلے دیکھ کر باغی ہو گیا۔

"ساحرہ نے سب سے بڑی لڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا "میری سب سے بڑی لڑکی"

"میں نے لڑکی کی طرف نگاہ پھیری۔ اُس کے نوخیز حسن میں کچھ کچھ وہی دلکشی، وہی سحر تھا جو کبھی اُس کی ماں کی ملکیت تھا۔ اگرچہ سحر میں ابھی وہ پختہ نکھار نہ آیا تھا۔ تاہم اُس کی صورت بتا رہی تھی کہ وہ عنقریب اپنی ماں سے بہت کچھ ورثہ میں لے گی۔

"ساحرہ موٹر چلاتی ہوئی میری نظر سے اوجھل ہو گئی اور میں وہیں کھڑا رہا۔ مجھے انسانی زندگی اُس وقت بالکل موٹر کی مانند معلوم ہوئی جو تیز و تند دوڑی جا رہی ہو۔ میں اُس شام کو اپنے کمرے میں تن تنہا آئینے میں اپنا عکس خدا جانے کتنی دیر تک دیکھتا رہا۔ آہ داؤد، اس واقعہ کے بعد میں نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی ہزار کوشش کی لاکھوں جتن کئے مگر میرے بال یکے بعد دیگرے سفید ہوتے چلے گئے اور آج تم دیکھ رہے ہو کہ میں واقعی بوڑھا ہوں"۔ پردیز نے ایک لمبی سانس لیتے ہوئے کہا "آہ! بڑھاپا" اور سگار کا بچا ہوا ٹکڑا آتشدان میں پھینک دیا جہاں سوکھی ہوئی چٹاخ پٹاخ کرنے والی سخت لکڑیاں بھی وقت کے ہاتھوں جل کر ٹھنڈی ہو چکی تھیں۔

بابر بٹالوی

غزل

فطرت ابھی بے تاب ہے معلوم نہیں کیوں | یارب کوئی بے خواب ہے معلوم نہیں کیوں

ملتا نہیں بحرِ غمِ الفت کا کنارا | اک عالم گرداب ہے معلوم نہیں کیوں

عرصہ ہوا برباد ہوئی عشق کی دنیا | اب بھی شبِ مہتاب ہے معلوم نہیں کیوں

دیکھا مجھے کس نے کہ مری خاک میں اب تک | بجلی کوئی بے تاب ہے معلوم نہیں کیوں

پیتا تھا کبھی خون بھی میں اشک کے بدلے | اب اشک بھی زہراب ہے معلوم نہیں کیوں

آئینہ ہوں تیرا مجھے معلوم ہے یارب! | جوہر مرا بے آب ہے معلوم نہیں کیوں

ہر خواب کی تعبیر نہ کر اے غمِ اُمید! | تعبیر بھی اک خواب ہے معلوم نہیں کیوں

دنیا کوئی معبد نہیں اے گنبدِ گرداں! | تو صورتِ محراب ہے معلوم نہیں کیوں

یکساں[۱] ہیں ہمارے سحر و شامِ تمنا | خورشید جہانتاب ہے معلوم نہیں کیوں!

یہ محفل بیدار نہیں میکدہ تائبؔ
تُو ہے کہ گراں خواب ہے معلوم نہیں کیوں!

مراتب علی تائب

۱؎ یہ شعر طالب آملی کے اس مطلع پر ہے کہ
نومیدیٔ ما گردشِ ایام ندارد | روزے کہ سیہ شد سحر و شام ندارد
تائب

کے بعد حمو ہاشم کے گھر پیدا ہوا تو وہ ہر وقت اپنے سوتیلے بھائی کو گلے سے چمٹائے
پھرتی اور اس کے کانوں میں اپنے معصومانہ گیت گنگناتی رہتی۔ اس منظر نے
کبھی اُسے متاثر نہ کیا۔ اس کو وہ شام یاد آگئی جب عائشہ ایک کتے سے خوف
کھا کر اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی تھی اور اس نے ننھی بچی کو جھنجھوڑ کر ایک طرف
پٹک دیا

کرتی تھی۔ اُس کی خود فراموشی اور کفایت شعاری کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ اپنے نمبردار
کے بعد سارے گاؤں میں سب سے زیادہ آسودہ حال سمجھا جانے لگا۔
عائشہ نے گھی روئی اور دوسری اجناس جو پہلے مفت میں ضائع ہو جاتی تھیں
بیچ بیچ کر اس کا سارا قرضا اتار دیا تھا۔ اب اس کے گھر میں کچھ رقم بھی پس انداز ہو
گنوار اس کو چودھری ہاشم کہہ کر بلاتے تھے۔ مگر اس نے کبھی
کر

ابھرتا تھا اُفق کے گھاٹ سے جب چاند متوالا
تم آنچل کو اُڑاتی سر پہ جلدی جلدی آئی تھیں
سنبھلتی، لڑکھڑاتی، کسمساتی جھینپتی آئی تھیں
میں پیپل کے تلے بیٹھا ہوا کچھ گنگناتا تھا
تخیل سے حسیں خوابوں کی اک دنیا بناتا تھا
تم آئیں اور آ کر چھپ گئیں پھر میرے دامن میں
ہو طائر جیسے آسودہ کوئی آ کر نشیمن میں
مرا پہلو تھا، تم تھیں، خامشی تھی اور تنہائی
فضا کی سنسناہٹ، چرخ کے تاروں کی شہنائی
مرے شانے پہ تم سر اپنا رکھ کر سو گئی جاتی تھیں
مجھے بھی کھو رہی تھیں اور خود بھی کھوئی جاتی تھیں
بسایا تھا تمہاری زلف کو پھر میں نے پھولوں میں
جھلایا تھا محبت کی حسیں بانہوں کے جھولوں میں
نہ جانے کب تک اس عالم میں ہم تم وقفِ مستی تھے
جوانی کی جواں لہروں میں گم اجزائے ہستی تھے
یکایک لے کے اک انگڑائی تم جانے کو اُٹھ بیٹھیں
مجھے مضطر بنانے، میرے تڑپانے کو اُٹھ بیٹھیں
مچل کر میں بڑھا دامن تمہارا تھام لینے کو
شرابی جیسے اُٹھے گرتی مینا تھام لینے کو
مگر آنسو تمہاری آنکھ میں لہرائے جاتے تھے
فسانہ اپنی مجبوری کا کچھ دہرائے جاتے تھے
محبت کی وہ پہلی رات تم کو یاد ہے شہنا

علی احمد

غزل

...رہٹ کی

...ں مدوں میں جذب ہورہی ... بکائن کے گھنے درختوں سے زرد مرجھائے ہوئے پتے ٹہنیوں سے جدا ہو کر سنبھلتے ہوئے کنوئیں کے ادھر اُدھر گر رہے تھے۔ غریب بیل جن کو تاروں کی چھاؤں میں جوتا گیا تھا۔ تھک کر چُور ہو گئے تھے اور آہستہ آہستہ لڑکھڑاتے ہوئے قدم اُٹھا رہے تھے۔ ایک دفعہ وہ چلتے چلتے رُک گئے تو بوڑھا ہاشم جو اپنی نشست پر بیٹھا اُونگھ رہا تھا چونک پڑا اور "اخ! اخ!!" کی کرخت آواز کے ساتھ انہیں لکڑی سے پیٹنے لگا وہ چل پڑے تو اُس نے اپنی میلی چادر ہٹا کر ایک طرف رکھ دی اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ پانی کے بھرنے کے پاس جا کر بیٹے کو آواز دی "رحمو! کتنا باقی ہے؟"

مشرق کی طرف نیشکر کے کھیت سے ایک پندرہ سولہ سال کے لڑکے نے جو کدال سے پانی کا راستہ صاف کر رہا تھا۔ سر اُٹھا کر جواب دیا "بس ختم ہُوا چاہتا ہے۔"

ہاشم نے اطمینان کا لمبا سانس لیا اور بائیں طرف مڑ کے گاؤں کی جانب دیکھنے لگا۔ اس کی نگاہیں ایک نوجوان لڑکی پر جم گئیں۔ وہ سر پر چھاچھ کا برتن اور روٹیاں اُٹھائے تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی آرہی تھی۔ رحمو بھی اُسے آتے دیکھ کر کنوئیں پر آگیا۔ قریب پہنچ کر اُس نے پاس پڑے ہوئے پیال پر موٹے کپڑے کی صاف ستھری دھجی کھول کر بچھا دی اور دو پیالوں میں چھاچھ اُنڈیل کر پاس ہی رکھ دی۔ باپ بیٹا آمنے سامنے بیٹھ کر کھانے میں مشغول ہو گئے۔

"عائشہ! آج دیر سے آئی ہو" ہاشم نے ایک بڑے نوالے کو چھاچھ کے گھونٹ سے حلق کے اندر دھکیلتے ہوئے کہا۔ عائشہ نے شرمیلے انداز سے نیچے دیکھتے ہوئے جواب دیا "بانو نائن نے ٹھیرا لیا تھا۔ وہ کہتی تھی مجھے ایک دفعہ جوڑا پہن کر دکھاتی جاؤ۔"

یہ سن کر ہاشم کے چہرے پر فکر کے آثار نمودار ہو گئے۔ اُس کے ماتھے کی جُھریاں سمٹ گئیں اور گہری لکیریں دکھائی دینے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد اس نے ایک نگاہ عائشہ کے حنا آلود ہاتھوں کی طرف ڈال کر بڑبڑاتے ہوئے کہا "دو دن ہی باقی رہ گئے ہیں۔"

عائشہ سر جھکائے سمٹی سمٹائی اپنی جگہ بیٹھی تھی یہ سن کر اُس نے دوپٹے کے آنچل سے اپنا منہ چھپا لیا اور ادھر دوسری طرف چلی گئی۔

"پرسوں رات برات آرہی ہے نا" رحمو نے کھانے سے فارغ ہو کر باپ سے پوچھا اور جواب نہ پا کر خود ہی کہنے لگا "کپڑے تو سب تیار ہو گئے۔ ابھی تک موچی نے میرا جُوتا نہیں دیا آج نہ دیا تو کب دے گا۔"

"بیلوں کو کھول کر لے جاؤ" ہاشم نے اپنے مخصوص درشت لہجے میں کہا رحمو چلا گیا تو عائشہ درختوں کے پیچھے سے نمودار ہوئی اور جُھک کر پانی سے برتن صاف کئے پھر کنکھیوں سے ہاشم کی طرف جو ذرا فاصلے پر بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا دیکھ کر کہنے لگی "آج ساگ لے جاؤں۔"

"ہاں" ہاشم نے اُس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔ عائشہ جانے لگی تو وہ اپنی جگہ بے حس و حرکت بیٹھا ٹکٹکی باندھ کر اُس کی طرف دیکھتا رہا حتٰی کہ وہ جوار کے کھیت کے پیچھے غائب ہو گئی۔

"اخاہ" بے اختیار اس کے منہ سے نکلا اور اس کے ابرو سکڑ گئے۔ جیسے وہ گذشتہ زمانے کا تصور کر رہا ہو۔ دوپہر کی دھوپ میں اُس کے سامنے پھیلے ہوئے کھیت موجود تھے۔ مگر اس وقت اس کی نیم وا آنکھوں کے سامنے چار پانچ سال کی ایک لڑکی کا غمناک چہرہ جھلملا رہا تھا۔ عائشہ اس کی بیوی کے پہلے خاوند سے پہلوٹھی کی اولاد تھی۔ وہ ماں کے ساتھ اس کے گھر آئی تو اُس کے دل میں اس معصوم بچی کی طرف سے سخت نفرت کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ عائشہ اُسے ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ اس خیال سے وہ سخت پیچ و تاب کھاتا تھا کہ ایک غیر شخص کی بیٹی یوں آکر اُس کے گلے کا ہار بن جائے۔ جوں جوں دن گذرتے گئے اس کی نفرت میں اضافہ ہوتا گیا۔ وہ اس سے بات کرنا بھی اپنی ہتک سمجھتا تھا۔ جب کبھی وہ اُسے دودھ دوہنے کا برتن اُٹھا کر دیتی تو وہ برتن کو اس کے ہاتھوں سے اس طرح جھٹک کر پکڑتا جیسے چھین رہا ہے کئی بار اُس نے عائشہ کی ماں کو محض اس لئے زدوکوب کیا کہ وہ کیوں اپنی بیٹی کو ددھیال نہیں بھیج دیتی۔ اس خاموش اور اداس چہرے والی لڑکی کو دیکھ کر اس کا خون کھول اُٹھتا تھا۔ جب وہ آنکھیں نکالتا ہوا دروازے میں داخل ہوتا تو ادھر اُدھر تھرکتی ہوئی لڑکی بھاگ کر ماں کے گھٹنے . . . . . . سے لگ کر بیٹھ جاتی۔ شاید اُسے مرغی کے بے پر و بال چوزے کی طرح یہ خوف لاحق رہتا تھا کہ ادھر وہ ماں سے دور ہوا اُدھر چیل نے اُسے اُچک لیا۔ جب دو سال

کے بعد جمو ہاشم کے گھر پیدا ہوا تو وہ ہر وقت اپنے سوتیلے بھائی کو گلے سے چمٹائے
پھرتی اور اس کے کانوں میں اپنے معصومانہ گیت گنگناتی رہتی۔ اس منظر نے
کبھی اُسے متاثر نہ کیا۔ اس کو وہ شام یاد آگئی جب عائشہ ایک کتے سے خوف
کھا کر اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی تھی اور اس نے ننھی بچی کو جھنجھوڑ کر ایک طرف
پٹک دیا تھا۔

بوڑھے ہاشم نے ایک گہرا سانس لیا اور مضطرب نگاہوں سے ادھر
اُدھر دیکھنے لگا۔ پھر اُسے خیال آنے لگا کہ ماں کی وفات کے بعد سے آج تک
عائشہ نے کس تندہی سے باپ بیٹے کی خدمت کی تھی۔ اُس نے سارے گھر
کا کام اپنے سر پر اُٹھائے رکھا۔ وہ دو ہل کی کھیتی کرتا تھا دو بھینسیں گھر میں رکھی
تھیں اور ہاتھ بٹانے والی دوسری عورت بھی کوئی نہ تھی۔ وہ دن رات اپنے دھندے
میں مشغول رہتی تھی۔ صبح سویرے اُٹھ کر چکی پیسنا دودھ بلونا۔ مویشیوں کا گوبر سنبھالنا
کنوئیں سے پانی لانا۔ روٹی پکا کر کھیت پر لے جانا۔ وہاں سے بیلوں کے چارے
کا گٹھا اُٹھا کر واپس آنا۔ اسی چکر میں دن گذر جاتا تھا۔ جب تک رحمو لڑکپن کے
دور میں رہا عائشہ چرواہے کا کام بھی خود ہی کرتی رہی۔ وہ دوپہر کے وقت ہل
چھوڑ دیتا اور روٹی کھا کر کسی سایہ دار درخت کے نیچے سو رہتا۔ عائشہ بیلوں کو
دوسرے چارپایوں کے ساتھ ہانکتی ہوئی چراگاہ میں لے جاتی اور وہاں جیٹھ
اساڑھ کی چلچلاتی دھوپ میں اُن کی رکھوالی کیا کرتی۔ بیساکھ میں گیہوں کی
کٹائی کے موقع پر اُسے کبھی دوسرے آدمی کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ وہ
خود اُس کے ساتھ مل کر فصل کاٹتی تھی۔ ان دنوں اس کی انگلیاں بسا اوقات درانتی
سے زخمی ہو جاتیں مگر وہ جسمانی تکلیف کے احساس سے بے پروا تھی۔ اُس نے
کبھی عائشہ کو اپنی ہم عمر لڑکیوں کی طرح ہنسی مذاق کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ گاؤں
کی عورتیں اس چُپ چاپ جفاکش لڑکی کی جانب حیرت کی نگاہوں سے دیکھتی
تھیں۔ دن بھر کی دوڑ دھوپ کے بعد رات کو جب چاروں طرف سناٹا چھا جاتا
اور لوگ میٹھی نیند میں مست خراٹے لے رہے ہوتے۔ عائشہ مٹی کا دیا جلا کر
پاس رکھ لیتی اور آدھی رات گئے تک چرخہ کاتتی رہتی۔ وہ ہر سال گھر کا سُوت
تیار کر کے باپ بیٹے کے کپڑے بنواتی اور خود اُن کے پھٹے پرانے کپڑوں کو مرمت
کر کے پہنے رکھتی۔ اُن کی روٹیاں مکھن میں گوندھ کر پکاتی اور اپنی خشک روٹی مرچ
کے اچار کے ساتھ کھاتی تھی۔ اس نے ایک بار کہا بھی تھا۔

"عائشہ! تم بھی تھوڑا مکھن لے لیا کرو۔"

بوڑھے ہاشم کو اب یاد نہ تھا کہ عائشہ نے اس کا کیا جواب دیا
تھا۔ مگر یہ بخوبی جانتا تھا کہ وہ ہل چلانے سے بدرجہا زیادہ محنت برداشت
کرتی تھی۔ اُس کی خود فراموشی اور کفایت شعاری کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ اپنے نمبردار
کے بعد سارے گاؤں میں سب سے زیادہ آسودہ حال سمجھا جانے لگا۔
عائشہ نے گھی روئی اور دوسری اجناس جو پہلے مفت میں ضائع ہو جاتی تھیں
بیچ بیچ کر اس کا سارا قرضہ اتار دیا تھا۔ اب اس کے گھر میں کچھ رقم بھی پس انداز ہو
گئی تھی۔ آج کل سب گنوار اس کو چودہری ہاشم کہہ کر بلاتے تھے۔ مگر اُس نے کبھی
دبی زبان سے بھی عائشہ کی خدمات کا اعتراف نہ کیا نہ زندگی بھر اُسے محبت کے
لہجہ میں مخاطب کیا بلکہ اُلٹا اُس پر احسان جتایا کرتا تھا کہ میں ہی تھا جس نے
تم جیسی لاوارث لڑکی کو پرورش کیا۔ اُسے کئی دفعہ اُسے بے وجہ بیگناہ سخت سست کہا
اور گالیاں دیں۔

ہاشم نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ کیا وہ بھی اُسے اپنا
باپ سمجھتی تھی؟ شاید ہی کوئی لڑکی اپنے سگے باپ کی اتنی خدمت کرتی ہوگی۔ وہ
بغیر پوچھے اس کی چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کا پتہ لگا لیتی تھی۔ صبح سویرے
ابھی وہ بستر پر کروٹیں لے رہا ہوتا کہ عائشہ چلم بھر کر اُس کے سامنے لا رکھتی جاڑے
کی راتوں میں وہ بار بار اُٹھ کر اُس کا لحاف درست کرتی تھی۔ اگر وہ کنوئیں پر
پیاس محسوس کرتا تو عائشہ بھاگی بھاگی گاؤں جا کر اُس کے لئے دودھ لے آتی
کبھی برسات کے دن وہ جھنجھلا کر اُسے برا بھلا کہنے لگتا کہ میں تو بھوک سے
مر رہا ہوں خبر نہیں وہ گھر میں بیٹھی کیا کر رہی ہے۔ آخر جب وہ آکر گھی میں تلی
ہوئی میٹھی ٹکیاں اُس کے سامنے رکھتی تو اس پر دیر کی حقیقت کھل جاتی۔ ایک
دفعہ وہ گاؤں کے فساد میں سخت زخمی ہوا اور دو ماہ تک قصبے کے شفاخانے میں
پڑا رہا۔ عائشہ اتنی مدت ہر روز سات میل کا سفر طے کر کے اپنے گاؤں سے
اس کے لئے دودھ لے جاتی رہی۔ اس کے کراہنے کی آواز سن کر وہ ساری
ساری رات اس پر جھکی رہتی تھی۔ جب وہ درد سے بیتاب ہو کر چلانے لگتا
تو وہ اُس کی پائنتی پر سر رکھ کر خاموش بیٹھی آنسو بہایا کرتی تھی۔ جب وہ صحت یاب
ہو کر واپس گھر میں آیا تو اپنے مزاج کا چڑچڑا پن عائشہ پر نکالا کرتا اور معمولی معمولی
باتوں پر اسے جھڑک دیا کرتا تھا۔

ہاشم کو اپنے جسم میں جھرجھری سی محسوس ہوئی وہ حقے سے منہ لگا کر
جلد جلد کش پہ کش لگانے لگا۔ حتیٰ کہ اس کے سامنے دھوئیں کا بادل سا
چھا گیا۔

سورج غروب ہونے کے قریب تھا۔ ہاشم کا مکان گاؤں کے مرد عورتوں
سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ برات کے رخصت ہونے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ڈھول

کی دُھوم دھام اور لوگوں کی چیخ پکار سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ عائشہ دلھن بنی ہوئی لڑکیوں کے جُھرمٹ میں سرنگوں بیٹھی تھی۔ براتی گھوڑوں پر سوار ہو کر مکان کے احاطے کے باہر گلی میں جمع ہو گئے تو کہاروں نے پالکی لا کر صحن میں رکھ دی۔ جب عائشہ کی سہیلیاں اُسے چاروں طرف سے تھام کر پالکی کے پاس لائیں تو وہ چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔ باری باری سب نے اُسے گلے سے لگایا اور دلاسے دے کر پالکی میں بٹھا دیا۔ ہاشم پاس ہی کھڑا تھا۔ اُس نے جُھک کر اپنا سر پالکی کے اندر کیا اور جلد جلد تسلی کے کچھ الفاظ کہنے کی کوشش کی مگر نہ کہہ سکا۔ جب کہاروں نے پالکی اُٹھائی تو بوڑھی عورتوں نے مل کر پُرسوز آواز میں دلہن کا الوداعی راگ الاپنا شروع کیا۔

"اے میرے باپ اپنی چہیتی بیٹی کو واپس بُلا لے۔"

"یہ اجنبی مجھے تیری چوکھٹ سے دُور لے جائیں گے"

"اے میرے باپ آج تیری بیٹی مسافر ہو کر پردیس میں جا رہی ہے۔"

"تیرے گھر میں اس کا دانہ پانی ختم ہو گیا۔"

پالکی باہر نکل گئی تو سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے گئے ہاشم دروازہ کے پاس کچی دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا براتیوں کو جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہیں پالکی پر گڑی تھیں جو براتیوں کے درمیان آہستہ آہستہ ہچکولے لیتی ہوئی جا رہی تھی۔ جب وہ شام کے دھندلکے اور گرد کے غبار میں نظروں سے اوجھل ہو گئی تو بوڑھا دہقان نقاہت سے مجبور ہو کر اسی جگہ بیٹھ گیا اور چادر کے سرے سے اپنی آنکھیں پونچھنے لگا مگر آنسو تھے کہ بے اختیار اُمڈے چلے آتے تھے

سید علی عباس جلالپوری

چُپ چاپ

فضا خموش، ہوا سرد، دشت خوابیدہ
نگاہِ شاعرِ غمگیں اُداس، غمدیدہ

یہ سُرخ غنچۂ گُل ہے کہ شمع سوزاں ہے
سحر کے وقت خموشی سے جو فروزاں ہے

یہ جھک کے کان میں غنچے کے کہہ رہا ہے گُل
ذرا بھی آج کرے گا فگارِ دل بلبُل

ہر اک چٹک پہ کلی کی ہوا لرزتی ہے
ہر ایک خندۂ گل پر فضا لرزتی ہے

حسین عارضِ گُل پر ہے قطرۂ شبنم
گلُوں کی آنکھ کو کرتے ہیں اشکِ کوکب نَم

فلک پہ ساکن و مبہوت ابر کے ٹکڑے
ہیں مرغزار میں گلّے سپید بھیڑوں کے

فضائے چرخ میں بادل تھکے سے کھوئے سے
لحافِ برف لئے میٹھی نیند سوئے سے

خموش و ساکن و مدہوش اس قدر ہے فضا
کلی چٹک کے ذرا دیکھ لے کہ شور ہوُا

عجب سکوں ہے فضا میں ہوا ہے یوں خاموش
وفورِ نکہتِ گُل سے ہے خامشی مدہوش

یہ سبز پتّوں سے ہو کر گذر رہی ہے ہوا
کہ شور ہوتا ہے خاموشیوں کی آہوں کا۔

مسعود شاہد

ایک غزل اور ایک نظم

غزل

نالوں میں مرے اثر نہیں ہے
اب رونا بھی کارگر نہیں ہے

کیا تجھ سے کہوں فسانۂ غم
تو اتنا تو بے خبر نہیں ہے

دل ہے مرا اور ہجوم اندوہ
تسکیں کا یہاں گذر نہیں ہے

آوارۂ دشتِ زندگی ہوں!
مجھ کو غمِ رہگذر نہیں ہے

واقف ہے وہ رازِ دو جہاں سے
اپنی جسے کچھ خبر نہیں ہے

دن میرے لئے ہے رات محسنؔ
خوفِ ستمِ سحر نہیں ہے

محمد ایوب محسنؔ

مزدور

(ایک سانٹ)

جب گرانباریٔ محنت سے میں تھک جاتا ہوں
میرے سینے میں سلگ جاتی ہے احساس کی آگ
خشک ہونٹوں سے بھڑک اٹھتی ہے افلاس کی آگ
جادۂ صبر و قناعت سے بھٹک جاتا ہوں
مجھ کو محسوس یہ ہوتا ہے کہ میں زندہ نہیں
موت پر کھولے ہوئے چھائی ہے ارمانوں پر
بوجھ ہے جبر و تشدّد کا مرے شانوں پر
گویا پردیسی ہوں اس دیس کا باشندہ نہیں
زندگی کے رُخِ روشن پہ سیہ خال ہوں میں۔
زرِ خالص مری ہمّت سے اُگلتی ہے زمیں
پھر بھی افکارِ معیشت نے دبا رکھا ہے
کثرتِ کار پہ بھی بھوک سے بے حال ہوں میں
پیٹ بھرنے کو نہیں ملتی مجھے نانِ جویں
ہائے میرے لئے اس دہر میں کیا رکھا ہے!

م۔ ر۔ تبسّم قریشی

عورت

صبح نو بجے کا وقت تھا۔ میں اپنے ملاقاتی کمرے میں بیٹھا سگرٹ کا دھواں چھت کی طرف چھوڑ رہا تھا۔ کسی کی یاد تصور پر چھائی ہوئی تھی۔ طبیعت غیر معمولی طور پر مضطرب اور بے چین تھی۔ فرقت کی گھڑیاں تو اس کا سواں حصہ بھی پریشان کن نہیں ہوتیں جتنا کہ انتظار کے آخری لمحے۔

گاڑی آنے میں ابھی ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا لیکن مجھے خیال آیا کہ آہستہ آہستہ اسٹیشن کی طرف چلوں۔ بازار میں موٹروں اور تانگوں کے شور و شر اور سبزی فروشوں اور خوانچے والوں کی ہم آہنگ آوازوں سے ہی کچھ طبیعت بہلے گی اور گاڑی کے وقت اسٹیشن پر بھی جا پہنچوں گا۔

یہ سوچ کر میں نے ایک انگڑائی لی اور اٹھ کر باہر آیا۔ چند قدم کے فاصلے پر مالی اور مالن بیٹھے دھوپ سینک رہے تھے۔ مالی نہ جانے کیا شرارت کیا چاہتا تھا کہ مالن نے اس کا ہاتھ جھٹک کر مصنوعی غصّے سے کہا "بس۔ مجھے مت چھیڑو۔"

"کیوں نہیں؟ میں تو چھیڑوں گا!" یہ کہتے ہوئے مالی نے جھپٹ کر اس کی کلائی پکڑ لی اور پھر کہا: "ایسی کون سی تو حور پری آگئی کہ تجھے نہ چھیڑوں!"

مالن نے پہلے تو کلائی چھڑانے کی کوشش کی مگر اس کی مضبوط گرفت سے چھوٹتے نہ دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا: "تمہارے لئے تو حور پری ہی ہوں"

"اونھ حور پری! صورت تو دیکھ بندریا کی سی"۔ مالی نے جواب دیا۔ "اور تمہاری صورت ۔ ۔ ۔ ۔" مالن بولی۔

وہ آگے کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ اس کی نگاہ مجھ پر پڑی اور اس نے حیا سے سرخ ہو کر گردن جھکا لی۔ مالی نے بھی کلائی چھوڑ دی۔ شرماتا ہوا میری طرف آیا اور ہاتھ کی ہتھیلیاں ملتے ہوئے جھجکتے جھجکتے پوچھا۔ "بابو جی کہاں جا ـــ ت ـــ ؟"

"میں اسٹیشن کو جاتا ہوں۔ جگو آئے تو اسے کہنا کہ ٹھیک ساڑھے دس بجے [illegible] لے کر اسٹیشن پر پہنچ جائے۔"

"اچھا بابو جی کہہ دوں گا!" اس نے جواب دیا اور پھر آہستہ سے پوچھا "آج مالکن آئیں گی کیا؟"

"ہاں مالکن آئے گی!" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ مالی بھی سمجھ گیا کہ میں کیوں مسکرا رہا ہوں۔ وہ آنکھیں جھکا کر پاؤں کے انگوٹھے سے مٹی کریدنے لگا اور بولا۔ "پھر آپ بھی تانگے میں چلے جائیے۔"

"نہیں مجھے راستے میں کام ہے۔ میں تو چلتا ہوں۔ اسے ضرور کہہ دینا۔ بھولنا نہیں۔"

. . . .

میں کوٹھی کے پھاٹک سے نکل کر سڑک پر آیا۔ آگے آگے ایک ریوڑ جا رہا تھا۔ بکریاں بکھری ہوئی ساری سڑک پر چل رہی تھیں جس سے تانگوں اور موٹروں کے گذرنے میں بڑی دقّت ہوتی تھی۔ گڈریا انہیں ایک طرف رکھنے کی بہتیری کوشش کرتا تھا مگر ایک بکرا اچھل کود کر انہیں پھر بکھیر دیتا تھا۔ میں کافی دور تک ریوڑ کے ساتھ ساتھ چلتا رہا اور اس شریر بکرے کی بکریوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ اور شوخیوں میں دلچسپی لیتا رہا لیکن کرشن نگر سے نکل کر جوں ہی ہم بڑی سڑک پر پہنچے ریوڑ تو باہر کی طرف چلا گیا اور میں بازار کی طرف۔

جب میں گورنمنٹ کالج کے قریب پہنچا تو کالج کا گھنٹہ بج رہا تھا۔ پیچھے سے دو لڑکے بغلوں میں کتابیں دبائے جلد جلد قدم اٹھاتے چلے آرہے تھے۔ اور ان میں سے ایک کہہ رہا تھا ۔۔۔۔۔ "رنگ سانولا سہی۔ مگر اس کے خد و خال ستم ڈھاتے ہیں۔ آنکھیں تو دیکھو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔!"

یہ کہتے ہوئے لڑکے تو آگے نکل گئے۔ مگر میرے لئے ایک معمہ چھوڑ گئے کہ ـــــ انہیں جلد جلد چلنے پر مجبور کرتا ہے کالج کا گھنٹہ "اور ستم ڈھاتے ہیں کسی کے خد و خال۔ عجیب ماجرا ہے۔ آخر یہ ہے کون! ـــــ کالج کی کوئی لڑکی سرلا، کملا، روہنی یا موہنی۔ جسے یہ کن آنکھیوں سے دیکھتے ہوں گے اور وہ کھنچی کھنچی دور دور رہتی ہوگی۔ میرے دل میں بھی آرزو پیدا ہوئی کہ میں بھی دیکھوں کہ وہ آنکھیں کیسی ہیں جنہیں وہ نہ معلوم کس چیز سے تشبیہ دے رہے تھے اور جو انہیں ان کے مطالعہ میں بھی پریشان کرتی رہتی ہیں۔ آخر مجھے بھی تو کسی کی آنکھوں نے ہی مسحور کیا ہے وہ آنکھیں ان آنکھوں سے اچھی تو نہیں ہو سکتیں۔

میں نے کلائی کی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ سوا نو بجے تھے اور گاڑی کو ساڑھے

دس بجے آنا تھا۔ آہ! وہ بڑی بڑی پیاری پیاری آنکھیں۔

میں اُنہیں آنکھوں کا تصوّر کرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ ان آنکھوں میں حسن کیف کی دنیا آباد تھی۔ ان آنکھوں نے دو دن ہی میں مجھے اس قدر اپنا بنا لیا تھا کہ اُن کے بغیر دنیا سونی تھی اور اب انہیں کی کشش مجھے سٹیشن کی طرف لئے جا رہی تھی کہ سامنے دو نوجوان آزاد منش لڑکیاں نظر پڑیں۔ وہ بیش قیمت ساڑھیاں زیب تن کئے اور بنی ٹھنی ہاتھوں میں رومال تھامے خراماں خراماں چلی آ رہی تھیں اور دائیں طرف سے ایک تانگہ آ رہا تھا۔ اب ہمیں ایک چوراہے میں سے گذرنا تھا لڑکیاں، تانگہ اور میں بیک وقت وہاں اکٹھے ہو گئے۔ تانگے والے نے ایک اُچٹتی سی نظر لڑکیوں پر ڈالی۔ اس کے دل میں گدگدی پیدا ہوئی جس طرح طوفان کی لہریں سمندر کے مرکز سے اٹھتی ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اُس کی وسعتوں پر محیط ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح اس کے دل میں مردانہ جذبات نے کروٹ لی اور ریشم زدن میں اس کے رگ و ریشہ میں جاری و ساری ہو کر ہونٹوں تک آ گئے اُس نے ایک میٹھی جھرجھری لی اور گھوڑے کی لگام کو جھٹک کر اُسے چابک سے سہلاتے ہوئے کہا "او چل،

تینوں لے جان وَلیتت دیاں پریاں!"

یہ اس کے جذبات کا اظہار تھا اور اس کے لئے اس کے پاس اس سے بہتر الفاظ نہیں تھے یہ فقرہ جہاں موجودہ تمدن پر کڑی تنقید تھا۔ وہاں اس کی معاشی حیثیت کا بھی آئینہ دار تھا۔ بلکہ اگر اس کے نفسیات کا بغور تجزیہ کیا جائے تو اس کی تہ میں پہلی کی بہ نسبت دوسری بات زیادہ کارفرما تھی۔ کیونکہ وہ کوئی خشک ریفارمر نہیں تھا جو یہ چاہتا کہ مشرق کی حیا پرور خاتون مغرب کی بے باک دوشیزہ بن کر سڑکوں پر نہ نکلے۔ وہ ایک سیدھا سادہ مزدور تھا۔ اس منظر سے اسے اپنی کم مائگی اور طرفِ ثانی کی بے اعتنائی کا غیر شعوری احساس ہوا تھا۔ اس بات کو اس کا حسن پرست دل بھی گوارا نہ کر سکا اور زندگی کی اس تفاوتِ راہ کے باعث جنسی لگاؤ ایسا احساسِ لطیف بھی طنز بن کر رہ گیا۔

میں یہی سوچتا ہوا موچی دروازے تک پہنچ گیا اور وہاں جہاں باغ کے چوبی جنگلے پر بہت سے پرانے کوٹ لٹکے رہتے ہیں۔ یوں ہی ٹھہر گیا۔ شاید اس لئے کہ وقت ہی تو گذارنا ہے۔ ایک جھلتی سی نظر کوٹوں پر ڈال کر میں باغ میں دیکھنے لگا۔ ایک مرغ اور دو تین مرغیاں "چیخ چیخ" کرتے پھر رہے تھے اور پنجوں سے مٹی کرید کرید کر خوراک کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ مرغ نے ایک بڑے اور پرانے درخت کی جڑ میں چونچ ماری اور "کٹ کٹ" کر کے مرغیوں کو مدعو کیا۔ مرغیاں دوڑتی آئیں درخت کی جڑ میں دیمک نے بانبی بنا رکھی تھی۔ وہ اسے چونچ بھر بھر کر کھانے لگیں اور مرغ سینہ تان کر فخر سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

میں انہیں دیکھتے دیکھتے ایک مبہم سے انداز میں آگے سرکنے لگا۔ ایک موٹی اور کھردری سی آواز کان میں پڑی "کیوں بابو جی ٹیسن کدھر ہے؟"

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو قریب ہی ایک ستائیس اٹھائیس سال کا مضبوط دیہاتی نوجوان یہ سوال کر رہا تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "میرے ساتھ ساتھ چلے آؤ۔"

"دیکھو جی، پہلے کسی نے اُس طرف بھیج دیا" اس نے شکایت کی۔

"شرارت کی ہوگی۔"

"اور کیا! پردیسی سمجھ کر کھول کر دیا۔"

"اچھا۔ اب کہاں جانا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"جالندھر اُتروں گا۔ وہاں سے پانچ کوس پر گاؤں ہے میں نے سوچا کہ آیا تو ہوں۔ لاہور بھی دیکھ چلوں۔ اس لئے اُتر پڑا۔" وہ رک رک کر یہ باتیں کرتا رہا اور پھر گردن ہلا کر کہنے لگا "اچھا شہر ہے!"

"اس سے پہلے بھی کہیں آئے گئے ہو؟"

"جی ہاں۔ بار میں گیا تھا وہاں رشتے ناتے کے لوگ ہیں۔ انہیں ملے بہت دن ہو گئے تھے۔ ملنے کو بہت جی چاہتا تھا۔ سو مل ہی آیا۔"

"تمہاری شادی تو ہو چکی ہو گی؟" میں نے معلوم نہیں کیوں یہ سوال کر دیا۔

"جی نا!" اس نے حسرت کے لہجے میں جواب دیا۔

"تو پھر کراؤ گے؟"

"جی ہاں" اس نے بڑے اشتیاق سے کہا۔ اس کا چہرہ اس طرح کھل گیا تھا جس طرح خزاں رسیدہ پودے کو بادِ بہاری کا جھونکا لگا ہو۔ گویا میرے سوال سے اسے کچھ امید ہو چلی تھی اس کی شادی کا دن بھی کبھی آ ہی جائے گا۔

"تو اب کہیں اڑوس پڑوس میں گانٹھ سانٹھ لگی ہوگی" میں نے تحقیق جاری رکھی۔ "نہیں بابو جی" اس نے پھر افسردہ سا ہو کر جواب دیا اور دلیل پیش کی۔ "بیگانے پیاسے پیاس نہیں بجھتی۔"

"پیاس نہ بجھے۔ جی تو بہل جاتا ہے۔" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"کیا ہوا بابو جی۔ بیگانہ بیگانہ ہی رہتا ہے۔ اپنی چیز ہو تو جب چاہو برت لو۔"

میں نے بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کی۔

ہم دونوں پہلو بہ پہلو باتیں کرتے جا رہے تھے اس کی باتوں میں بے تکلف خلوص تھا گویا اپنے کسی عزیز دوست سے باتیں کرتا جا رہا ہو مجھے لطف

آرہا تھا۔ اس لئے اس کے دل کی تھاہ لینے کے لئے کہا: "تم تو یہ سب باتیں جانتے ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہیں ضرور آنکھ لڑی ہے۔"

"نہیں بابوجی آپ سے سچ کہتا ہوں۔ ہم ایسے آدمی نہیں۔ داہگرو کا دیا سب کچھ ہے۔ تیس چالیس بیگھے گھر کی جمین ہے ـــــ بس ایک ہی بات کی کمی ہے۔"

ہم اسی طرح باتیں کرتے اسٹیشن تک پہنچ گئے۔

مجھے تو پہلے ہی مسافرخانہ سے پلیٹ فارم ٹکٹ لے کر اندر جانا تھا اس لئے میں ادھر کو چلا لیکن وہ بھی ہمراہ ہولیا جیسے میرے ساتھ سی دیا گیا ہو۔ میں نے اُسے دونوں کندھوں سے پکڑ کر گھمایا اور دوسرے مسافرخانے کی طرف اشارہ کر کے کہا:۔

"وہاں جاؤ اور اپنا ٹکٹ خریدو۔"

اس نے اپنے میلے اور پیلے دانت دکھلائے اور عقیدت مندانہ انداز میں پرنام کر کے ادھر کو چل دیا۔

. . . .

گاڑی آنے میں ابھی پندرہ بیس منٹ باقی تھے۔ آسمان پر بادل کے ننھے ننھے سفید ٹکڑے تیرتے پھرتے تھے۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ سردی کا زور کم ہوگیا تھا ٹین کے شیڈ پہ جنگلی کبوتروں کا ایک جوڑا مصروفِ نازونیاز تھا اور انجن شنٹ کر رہے تھے۔ پلیٹ فارم پہ مسافروں کی بھیڑ لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی تھی۔ میں اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا اور اپنے خیالات کو ایک مرکز پر لانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ایک حسینہ اور اس کا خاوند قلی سے سامان اُٹھوائے ہوئے آئے۔ سامان رکھوا کر حسینہ تو ٹرنک پہ بیٹھ گئی اور اس کا خاوند اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔

حسینہ سے تھوڑے ہی فاصلے پہ ایک جٹا دھاری لنگوٹ بند سادھو بھبوت رمائے بیٹھا تھا۔ اس نے اپنی گانجے سے سُرخ آنکھیں حسینہ کے چہرے پر گاڑ دیں۔ لوگوں کو اپنے سامان کی فکر تھی۔ جدا ہونے والے احباب سے بہت کچھ کہنا سُننا تھا۔ اور گاڑی کا انتظار تھا۔ ایک تارک الدنیا سادھو کو نظارے بازی کا اس سے بہتر اور کونسا موقع مل سکتا تھا۔ وہ حسینہ کی صورت کی طرف دیکھے جاتا تھا اور مسکرائے جاتا تھا۔

میں نے اس کی اس حرکت کو تاڑ لیا اور اپنی شرارت پسند نگاہیں اس کی حریصانہ نگاہوں میں ڈال دیں۔ وہ بےچارہ کھسیانا ہو کر رہ گیا اور شرمندگی مٹانے کے لئے ایک [illegible]یہ مسکراہٹ ہونٹوں پہ لا کر بولا:۔

"بابوجی ناری تو دستو ہی ایسی ہے۔ اس پر تو نارو منی جیسے تپستوی بھی ڈول گئے۔"

وہ اتنا کہہ کر تردید کے خوف سے اُفق پر دیکھنے لگا لیکن میں اس کی تردید کیسے کرتا جس گتھی کو میں بڑی دیر سے سلجھانے کی کوشش کر رہا تھا اسے اس کے ان الفاظ نے بہت خوبی سے سلجھا دیا تھا میں مسکراتے ہوئے ایک طرف کو چل دیا۔ گاڑی سگنل کے اندر داخل ہو رہی تھی اور میرے دل کی گہرائیوں میں بسنے والی ناری کے خدوخال اُجاگر ہو رہے تھے۔

رہبر بی اے

یاس کا سکون

(ایک خط کے جواب میں)

وہ تذکرے، ــــ وہ سہانی کہانیاں میری
جو حفظ ہیں مری دنیا کے چاند تاروں کو
مرے عزیز! ــــ نہ چھیڑ اب انہیں خدا کے لئے
کہ بجھ رہے ہیں تو بجھنے دے ان شراروں کو

یہ ساز پھینک بھی دے، اس میں اب رہا کیا ہے
یہاں تو "نغمۂ دل" کی شکست ہو بھی چکی
جس آرزو میں کبھی جاگتی تھیں امیدیں
وہ آرزو تہِ دامانِ یاس سو بھی چکی

ترے خلوص کے قرباں! ذرا سمجھ تو سہی
یہ زندگی کی کہانی کسے سناتا ہے؟
یہاں تو راکھ بھی باقی نہیں رہی دل کی
تو پھر یہ آگ بتا دے کہاں لگاتا ہے؟

کوئی امید مری جب کبھی نہ بر آئی
تو میرے واسطے اب یاس بھی حرام نہیں
یہ سچ کہ زیست مری نام کی ہے زیست، مگر
یہ کم نہیں ہے کہ میں زیست کا غلام نہیں

بڑے مزے کی مجھے زندگی ملی ہے اب
نہ اس میں فکرِ تمنا ــــ نہ خوفِ محرومی
مجھے نشیب و فرازِ جہاں سے کیا مطلب؟
مری حیات میں ہے موت کی سی معصومی

مرے خیال و نظر کی حدیں اُسے نہ ملیں
وہ روح بن کے مری انتہا کو پا نہ سکی
میں جس طرح سے تڑپتا تھا، آہ کرتا تھا
وہ اس ادا سے کبھی گیت کوئی گا نہ سکی

یہ سچ کہ سامنے اُس کے مری زباں نہ کھلی
مگر سکوت نے سب کچھ اُسے بتا ہی دیا
بدل کے آخری آنسو کی شکل میں دل کو
اُداس آنکھوں میں لا کر اُسے دکھا ہی دیا

مگر عزیز! ــــ اُسے آج تک یہ شکوہ ہے
کہ مجھ سے قیمتِ لطف و کرم ادا نہ ہوئی
اب اُس سے کیسے کہوں؟ ذوقِ لذتِ غم سے
مری حیات کو مہلت کبھی ذرا نہ ہوئی

وہ اس "یقینِ تباہی" کو چھین لے مجھ سے؟
نہیں عزیز مرے! ــــ اب یہ ہو نہیں سکتا
اسی جنوں سے تو پائی ہے میں نے اصلِ حیات
میں زندگی کی حقیقت کو کھو نہیں سکتا

جو خواب میں نے کبھی جاگتے میں دیکھے تھے
نیاز و شوق کے وہ خواب راس آ نہ سکے
مرا نصیب تصور کی حد سے بڑھ نہ سکا
قریب ہو کے بھی وہ میرے پاس آ نہ سکے

مجھے نہ ڈھونڈھ کہ سب کوششیں فضول ہیں اب
ملے گی تجھ کو نہ پژمردہ پھول سے خوشبو
بہانہ اشک مری مرگِ روح و دل کے لئے
مرے جہاں میں ہے بے سود شغلِ ہا و ہو

اور اب تو بے حسی اس درجہ بڑھ گئی ہے عزیز!
خبر نہیں ہے کہ مرتا ہوں میں کہ جیتا ہوں!
سکونِ یاس کی کیا پوچھتا ہے؟ رہنے دے!
بس اک شراب سی پیتا ہوں ــ خوب پیتا ہوں!

حیات مجھ پہ ہے اک جبرِ فطرتِ معصوم
میں جانتا ہوں مگر ڈھنگ صبر کرنے کا
کسی کی یاد کو سینے میں "دل" بنائے ہوئے
بہانہ ڈھونڈتا پھرتا ہوں اپنے مرنے کا

مخمور عثمانی

غزل

تو میرے سامنے ہنس، چشم کو پُرآب نہ کر
قرار دے مجھے مجبورِ اضطراب نہ کر

زبان دے کے تماشائے اضطراب نہ کر
الم نصیب کو غم چھین کر خراب نہ کر

نظر اٹھا کے غریقِ خُمِ شراب نہ کر
خرابِ گردشِ افلاک کو خراب نہ کر

گل و گہر تو تری خاکِ پا سے کمتر ہیں
تو اُن کو شاملِ آرائشِ شباب نہ کر

جو دیکھتے ہیں تری آنکھ کو تو کہتے ہیں
ہمیں تباہ اب اے جانِ انقلاب نہ کر

یہ کہہ رہی ہے تری شانِ مغفرت مجھ کو
گناہگار کو محشر میں لاجواب نہ کر

تو دیکھ رحمتِ عالم پناہ کا عالم
مرے گناہوں کا اے لم یزل حساب نہ کر

سرور و کیف بنا ہر نماز کو واعظ
نہیں یہ تاب تو پھر مے سے اجتناب نہ کر

نبرد گاہ میں آ، دل کو مدرسے سے ہٹا
یہ شیرِ حق ہے اسے کرمکِ کتاب نہ کر

علاجِ تشنگیٔ دل نہیں جمال کے پاس
دیارِ آئینہ میں جستجوئے آب نہ کر

جہاں میں مردِ خود آگاہ کا اصول ہے یہ
تو اپنے خوں میں نہا التجائے آب نہ کر

یہ حُسن و عشق میں دائم ٹھنی رہے یا رب
ہمیں شکست نہ دے اُس کو فتحیاب نہ کر

یہی کلیدِ درِ خُلد شادمانی ہے
نظیرؔ ترکِ غمِ ابنِ بُوترابؓ نہ کر

اصغر حسین خان نظیرؔ

دنیائے ادب

تازہ ترین رسائل کے اہم مضامین

کا تذکرہ اور جائزہ

جامعہ۔ مارچ و اپریل

احساسِ کمتری۔ یہ جامع اور دلچسپ مضمون ہمارے دوست شبیر محمد صاحب اختر نے لکھا ہے اور حقیقت ہے کہ انہوں نے وقت کے ایک نہایت اہم نفسیاتی مسئلے پر قلم اٹھا کر اور اسے اپنے سلیس اور شگفتہ انداز میں پیش کر کے زبان و ادب کی ایک مفید خدمت انجام دی ہے۔

جدید علم النفس کے حکماء میں سے فرائڈ کے بعد ایڈلر نے غالباً سب سے زیادہ انقلاب آفریں نظریات پیش کئے ہیں۔ فرائڈ نے اپنے مشہور تجزیۂ نفس کے ذریعے انسانی ذہن اور کردار کی مختلف پیچیدگیوں کو جنسی اثرات کے تابع قرار دیا اور ایڈلر نے ہماری بہت سی کلفتوں اور اخلاقی الجھنوں کا منبع اس عجیب و غریب کیفیت کو مانا ہے جسے وہ احساسِ کمتری کے نام سے منسوب کرتا ہے۔ مقالۂ زیرِ نظر میں ایڈلر کے اس نظریئے کی تشریح اور توضیح کی گئی ہے۔

صاحبِ مضمون نے سب سے پہلے بچے کے جذبات و احساسات کا جائزہ لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہماری جذباتی زندگی کی تکمیل طفولیت کے ابتدائی ایام ہی میں ہو جاتی ہے اور بچے کا دماغ اپنے ماحول سے مخالفت یا ہم آہنگی کے ایسے مختلف تاثرات قبول کر لیتا ہے جو اَن مٹ ہوتے ہیں۔ یہ تاثرات نشوونما حاصل کر کے زندگی کی آنے والی منزلوں میں ابھرتے ہیں اور انسان کے کردار اور خصلت کی تعمیر میں حصہ لیتے ہیں۔ ویسے تو فروتری کے احساس کا بچپن کی بے چارگیوں کے ساتھ چولی دامن کا سا تعلق ہے لیکن تربیت کی بعض غلطیاں اور ماحول کی ناسازگاریاں اس احساس کو تیز تر اور پائندہ تر کر دیا کرتی ہیں۔

"بہت سے ترقی پسند ادیبوں کا خیال ہے کہ ہمارے موجودہ زمانے کی نصف سے زیادہ خرابیاں اس بات کا نتیجہ ہیں کہ مرد اور عورتیں دیر سے جوان ہوتے ہیں اور انہیں خود مختارانہ کام کی طاقت حاصل نہیں ہوتی اور چونکہ انہیں بھیڑوں کا ایک گلہ بنا دیا جاتا ہے اسی لئے ہر ملک میں آمر پیدا ہو رہے ہیں۔"

کسی بچے کی جسمانی کمزوری یا نقص اس کے ذہن میں کمتری کا شدید احساس پیدا کر دیتا ہے اور وہ اپنے ہمجولیوں میں کھویا کھویا سا نظر آنے لگتا ہے۔ بعض دفعہ کمزوری اور اس سے پیدا ہونے والی ذلت کا احساس اس کی زندگی تلخ کر دیتا ہے۔ ایسے موقعہ پر اسے عزت نفس اور خودداری کی تعلیم نہ دی جائے تو یہ احساس عمر بھر اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا اور زندگی کی اکثر ناکامیوں کا موجب بنتا ہے۔

بعض بچوں کو بڑے لاڈ پیار اور احتیاط سے پالا جاتا ہے نتیجتاً نہ صرف وہ اپنی ہر ضرورت کے لئے دوسروں کا سہارا لینے کے عادی ہو جاتے ہیں بلکہ اس اہمیت کو جو انہیں اپنے محدود اور تنگ ماحول میں حاصل ہوتی ہے اپنی سوسائٹی کے وسیع تر ماحول پر عائد کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور جب لازمی طور پر وہ اس غلط کوشش میں ناکام رہتے ہیں تو ان پر اپنی ناقابلیت کا ایک نہایت تلخ انکشاف ہوتا ہے، جو انہیں مدۃ العمر کمتری کے ایک عذاب ناک احساس میں مبتلا رکھتا ہے۔

"بدقسمتی سے اگر لاڈلے بچے کو اپنی زندگی آپ بنانے پر حالات مجبور کر دیں اور اس کے لئے جرأت اور سرگرمیٔ عمل کی ضرورت ہو تو اکثر نوجوان ایسے حالات میں شکستہ دل اور مایوس ہو جاتے ہیں۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ انہیں ایسے حالات کے لئے تیار ہی نہیں کیا گیا۔ جس دنیا کے وہ باشندے تھے وہ دنیا اس کشمکش کی دنیا سے

> بالکل الگ تھلگ تھی۔ چونکہ وہ مشکلات کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس لئے وہ یہی خیال کرتے ہیں کہ ہتھیار ڈال دیں۔ زمانے کے چیلنج کو وہ سمجھ ہی نہیں سکتے۔ چند ناکام کوششوں کے بعد وہ یقیناً آپ کو اس مایوس گروہ کا ایک رکن سمجھنے لگتے ہیں جو ہمارے سماجی نظام میں بہت سی مشکلات کا موجب بن چکا ہے۔ سماجی طفیلیے، دغاباز اور راز افشا کرنے والے ڈاکو جواری، غلاظت یا منشیات کی ناجائز فروخت کرنے والے وغیرہ وغیرہ سب اسی گروہ کے افراد ہوتے ہیں۔ زندگی کی حقیقتوں سے بھاگے ہوئے نوجوان مرد اور عورتیں اسی راستے پہ چلنا اپنے لئے بہتر سمجھتے ہیں، کیونکہ سماجی زندگی میں تو انہیں اخلاقی قوت سے کام لینا پڑتا ہے۔ بحیثیت ایک رکن ہونے کے سوسائٹی ان سے توقع رکھتی ہے کہ وہ اپنی بقا کے لئے جرأت اور ہمت سے کام لیں اور یہی جوہر ان میں مفقود ہوتے ہیں۔ ذرا قمار خانوں اور بدمعاشی کے اڈوں پہ جا کر وہاں کے آنے جانے والوں کا نفسیاتی تجزیہ کیجئے، آپ کو وہاں شریفوں اور نجیبوں کے نور نظر اور چشم و چراغ ملیں گے جنہیں لاڈ نے تباہ و برباد کر دیا۔ جو زندگی کے میدان سے اس لئے بھاگ نکلے کہ وہ مصائب اور مشکلات کا مقابلہ نہ کر سکے اب وہ آرام سے بیٹھے زندگی بسر کر رہے ہیں،،

جسمانی نقائص کا احساس، بے جا لاڈ پیار، اور بدسلوکی خواہ وہ والدین کی طرف سے ہو یا استاد کی جانب سے، بچے کی سیرت پہ ایک تباہ کن اثر ڈالتی ہے اور وہ عمر بھر ایک شدید ذہنی عذاب میں گرفتار رہتا ہے اس کے علاوہ غیر معمولی طور پر ہوشیار بچے جن سے اُن کے ہم جماعت حسد کے باعث قطع تعلق کر لیں یا ایسے بچے جن کی تربیت میں سختی برتی جائے اور جن کی خود اعتمادی جبر اور توہین کی تاب نہ لا کر فنا ہو جائے، یا پھر ادنیٰ گھرانوں کے وہ بچے جو اچھی تربیت کے باوجود بڑے ہو کر اپنی سماجی پستی سے واقفیت حاصل کریں، احساس کمتری کے یقینی طور پہ شکار ہو جاتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ بعض نہایت قابل لوگ بھی مجالس اور محفلوں میں کھوئے کھوئے سے رہتے ہیں، اور بعض بڑے آدمی اپنے غریب رشتہ داروں سے گریز کرتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اپنی فطری یا سماجی کمتری کا احساس زندگی بھر ایک الم ناک وہم میں مبتلا رکھتا ہے۔ اسی طرح بعض وہ لوگ جو کبھی کوئی خاص قصور یا جرم کر بیٹھے ہوں یا کسی ناقابلِ بیان راز کو سینے میں دبائے پھرتے ہوں، یا کسی معاشرتی حادثے مثلاً محبت میں ناکامی، دولت کی بربادی، یا وجاہت کی شکست سے دوچار ہو چکے ہوں، اپنے گذشتہ واقعات و حالات سے اس درجہ متاثر ہوتے ہیں کہ اُن کے دل و دماغ ہمیشہ کے لئے فروتری کا احساس قبول کر لیتے ہیں۔ آپ بعض ایسے اشخاص کو بھی جانتے ہوں گے جو ذرا سی بات کو اپنی بہت بڑی توہین سمجھ لیتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی انانیت ذرا سی ٹھیس بھی برداشت نہیں کر سکتی مگر ان کی ہمت ان کے عزائم کا ساتھ نہیں دیتی۔ نتیجتاً وہ ایک پیچیدہ قسم کے احساس فروتری میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور ان کی زود رنجی ان کے اس ابتلا کی سب سے بڑی دلیل ہوتی ہے۔

بچپن کی غلط تربیت سے جو ناقص احساسات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اُن میں سے بعض اپنے اظہار کی بڑی دلچسپ صورتیں اختیار کرتے ہیں اور یہ صورتیں کیا ہیں احساس کمتری کے مختلف مظاہرے ہیں۔ مثلاً کسی خاص مقصد کے بغیر سرگرم اور مضطرب نظر آنا۔ سوسائٹی میں لوگوں سے آنکھیں چرانا۔ کسر نفسی، سریع الحسی، سطحی پن، کم گوئی، بسیار گوئی اور عیب جوئی۔

بے مقصد اور اضطراب آمیز سرگرمی سے ہمیشہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شخص اس خوف میں مبتلا ہے کہ اُسے کچھ زیادہ کام کرنا چاہئے تھا۔ جو اس سے ہو نہیں سکا یا اس سے کوئی ایسا قصور سرزد ہو چکا ہے جسے وہ سرگرم کار رہ کر بھلانا چاہتا ہے۔ بعض اوقات یہ خوف تحت الشعور میں ہوتا ہے، لیکن اس کے نتائج اور اثرات میں کمی نہیں آتی۔ ایک مسلسل بے چینی اور اضطراب اور بعض دفعہ بے خوابی فرد پر غالب آ جاتی ہے اور وہ احساس کمتری کی ایک شدید صورت کا شکار ہو جاتا ہے۔

بعض لوگوں کو زندگی میں کبھی کوئی تلخ سماجی تجربہ ہوتا ہے اور وہ اپنا ایسا شدید اثر اُن کے ذہن پر چھوڑ جاتا ہے کہ پھر وہ ہر قسم کی سماجی دلچسپیوں اور مجلسی ہنگاموں سے پرہیز کرنے لگتے ہیں۔ وہ پبلک میں ظاہر ہونے سے اس قدر گھبراتے ہیں گویا اُن کا دم نکل جائے گا۔ ایسے لوگ ہجوم والے مقامات حتیٰ کہ بارونق بازاروں میں سے بھی گذرنا پسند نہیں کرتے۔ احساس کمتری کا یہ ایک بڑا دلچسپ اظہار ہے۔

خردہ گیری اور عیب جوئی کی عادت بھی فروتری کے احساس سے پیدا ہوتی ہے۔ اکثر اوقات اپنے عیب چھپانے کے لئے بلکہ ان کے احساس کو دبانے کے لئے دوسروں کے عیب ڈھونڈے جاتے ہیں اور رفتہ رفتہ یہ ایک مستقل عادت سی بن جاتی ہے بعض لوگ دنیا کی ہر چیز سے بیزار رہتے ہیں اور اس طرح وہ اپنے اس احساس کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو سوسائٹی کا ایک مفید حصہ نہیں بنا سکے۔ یہ احساس بھی درحقیقت فروتری کا احساس ہے۔ ایسے نقاد جو ہر چیز کے بُرے پہلو کو نمایاں کرتے ہیں اور اپنی تنقید میں کوئی تخلیقی عنصر داخل نہیں ہونے دیتے شدید طور پر کمتری کے احساس میں مبتلا ہوتے ہیں۔ روزمرہ کی زندگی میں آپ نے دیکھا ہو گا کہ چھوٹے قد کے آدمی

عموماً تن کر چلتے ہیں۔ کم علم لوگ جب کبھی اپنے سے کسی قابل تر آدمی سے ملتے ہیں تو بڑے اہتمام اور تکلف سے گفتگو کرتے ہیں اکثر کم رُو عورتیں لباس نہایت بھڑکیلا اور شاندار پہنتی ہیں جسمانی طور پر کمزور مرد اور عورتیں عموماً بڑی ڈانٹ ڈپٹ سے گفتگو کرتے ہیں۔ کئی لوگ اپنے آپ کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں بلکہ بعض تو خود کو یکتا خیال کرتے ہیں۔ بعینہ اسی طرح جیسے اُن کی مائیں انہیں بچپن میں سب بچوں سے زیادہ خوبصورت اور ذہین سمجھتی رہی تھیں، یہ سب احساس کمتری کی کسی نہ کسی صورت میں گرفتار ہوتے ہیں۔ صحیح دماغ لوگ اپنے آپ اور اپنے سے کم یا زیادہ رتبہ رکھنے والے لوگوں میں چنداں فرق نہیں سمجھتے۔ لیکن وہ لوگ جو دوسروں سے نفرت کرتے ہیں اور اسی بنا پر اپنی یکتائی کا دعویٰ رکھتے ہیں درحقیقت ایک زبردست احساس کمتری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ جرمنی کی یہود دشمنی ایک قومی پیمانے پر اسی احساس کمتری کا اظہار ہے۔ بیویوں پر ظلم و جبر کرنے والے شوہر، گالیاں دینے والے آقا اور بات بات پر سزا دینے والے باپ اسی گروہ کے افراد ہیں جو اپنی اندرونی کمزوریوں کے احساس کا اظہار جبر و تشدد کے پیرائے میں کرتے ہیں۔

احساسِ فروتری درحقیقت ایک قسم کا وہم ہے اور از بسکہ اوہام ہماری شخصیت کا حصہ نہیں ہوتے، اس لئے انہیں اپنے سے جدا کر دینا ناممکن نہیں ہے۔ کوشش یہی ہونی چاہیئے کہ وہم آپ کے دل دماغ پر قابو نہ پالے۔ ورنہ نتیجہ عموماً یہ ہوتا ہے پہلے پہل جب آدمی وہم سے جنگ آزما ہوتا ہے تو اس کے اعصاب میں ایک تھکن سی محسوس ہونے لگتی ہے۔ جو بڑھتے بڑھتے ضعف اعصاب کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یہ دراصل ایک روحانی بیماری ہے۔ عوام اس کا جسمانی علاج کرتے ہیں مقویات کا استعمال صحت افزا مقامات کی سیر، آفتابی غسل وغیرہ اس وقت تک مطلق فائدہ نہیں دے سکتے جب تک کہ بنیادی ذہنی خرابیوں کا ازالہ نہ کیا جائے۔

> ایک شخص خواہ وہ جج ہو یا ڈاکٹر، وزیر ہو یا معمولی انسان، بہر حال اپنے لئے اپنے ذہن میں ایک خاص معیار اپنی زندگی اور حلقۂ اثر کے متعلق قائم کر لیتا ہے اور اس کا برقرار رکھنا ہی اس کی زندگی کا مقصد ہوتا ہے۔ لیکن جب وہ محسوس کر لیتا ہے کہ اس کی خواب کی دنیا تباہ ہو رہی ہے یا وہ اپنا اثر کم ہوتا دیکھتا ہے تو اس تذلیل اور اپنی شکست کا احساس اس کے اندر ایک جذباتی کشمکش پیدا کر دیتا ہے۔ اس کا نتیجہ اعصاب کی کمزوری اور جسمانی طاقت کا زیاں ہوتا ہے بعض حالات میں یہ کشمکش اس قدر خطرناک صورت اختیار کر لیتی ہے کہ وہ شخص زندگی کی حقیقت سے خوف زدہ ہو کر دیوانہ ہو جاتا ہے یا خودکشی کر کے ہی مخلصی پا سکتا ہے۔"

احساس فروتری کی ایک اور اہم خصوصیت زندگی کا تعطل اور اس تعطل سے پیدا ہونے والے عوارض ہیں۔ نکمے، نشہ باز، دوسروں پر بوجھ بننے والے اور راز افشا کر کے روپیہ لینے والے لوگ جان بوجھ کر ایسے نہیں بنتے۔ ان کے دل زندگی کی طرف سے مایوس ہو چکے ہوتے ہیں اور انہیں اپنے آپ پر اعتماد نہیں رہتا۔ ایسے لوگ جو اپنے قریب ترین ماحول میں بے حد قدر و قیمت رکھتے تھے لیکن جب وہ دنیا کے بازار میں داخل ہوئے تو ان کی قابلیت کے کوئی دام نہ اٹھے، یا ایسے لوگ جو ہمیشہ ایک رسوا کن ماحول میں گھرے رہے، زندگی اور اُس کی ممکنات سے مایوس ہو کر ایک بے کار سی زندگی اختیار کر لیتے ہیں۔ یہی حال بعض ایسے لوگوں کا ہوتا ہے جو کاروبار یا عشق میں ناکامی کو شدید طور پر محسوس کرتے ہیں اور پھر ہمیشہ کے لئے اپنے آپ کو مایوسی کی آغوش میں ڈال دیتے ہیں۔ وہ توہم پرست لوگ جو قوتِ بازو کی بجائے سحر، منتر یا ٹوٹکوں کے ذریعے کاربرآری کرنا چاہتے ہیں۔ احساس فروتری کی ایک اور دلچسپ مثال پیش کرتے ہیں۔

یہاں پہنچ کر صاحبِ مضمون احساس کمتری کا افادی تجزیہ کرتے ہیں۔ اور اس کا علاج پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ احساس کم و بیش ہر فرد بشر میں پایا جاتا ہے لیکن اصل چیز احساس نہیں بلکہ اس کے متعلق ہمارا رویہ ہے۔ اگر ہم اس پر اپنا تسلط جما لیں تو ہمیں زندگی کی کوئی مشکل آگے بڑھنے سے روک نہیں سکتی۔ اور اگر ہم اسے اپنے آپ پر مسلط کر لیں تو پھر ہمارے جسمانی اور ذہنی قوٰے کا جو حشر ہوگا وہ ناگفتہ بہ ہے۔ انہوں نے عصمت انونو، مہاتما گاندھی اور پریذیڈنٹ روزولٹ کی مثالیں پیش کی ہیں۔ اول الذکر بہرے، ثانی الذکر جسمانی طور پر کمزور اور آخر الذکر بھی اوائل عمر میں جسمانی عوارض کا شکار تھے لیکن دورِ حاضر کے ان تینوں مجاہدوں نے فروتری کے احساس پر غلبہ پا کر دنیا کی تاریخ پر اپنی مہریں ثبت کر دیں۔ آدمی کی اصلی خوبی اس کا ذاتی جوہر اور کمال ہے۔ قدرتی نقائص اور جسمانی عیوب کا اس کی شخصیت یا احساسات پر کوئی اثر نہیں پڑنا چاہیئے۔ انسانی برادری کا ایک مفید فرد ہونا، دوسروں کے کام آنا اور سماج میں تعاون اور اشتراک سے اپنی جگہ پیدا کرنا کامیاب زندگی کا راز ہے اور احساس فروتری کا سب سے مؤثر علاج۔ انسان کو اپنے سامنے بلند لیکن قابلِ عمل نصب العین رکھنا چاہیئے۔ خوابوں کی دنیا میں رہنے کا خمیازہ اکثر ایک نہایت تلخ بیداری کی صورت میں اٹھانا پڑتا ہے۔ احساسِ کمتری کو دور کرنے کا ایک نہایت مفید طریقہ محاسبۂ نفس ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کو اپنے نفس

کا محاسبہ کرنا چاہیئے اور احتساب کے بعد نگاہ زندگی کے روشن پہلو پر رکھنی چاہیئے۔ ہم میں سے ہر ایک میں بہت سی خوبیاں اور صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ اگر ہم خوف، حسد، اور فرار کی عادتیں ترک کرکے خود کو سماج کا ایک مفید رکن بنانے کی کوشش کریں تو کمتری کے احساس پر بہت جلد غالب پالیں گے اور پھر ہماری زندگی کا روشن پر زور اور پاکیزہ دور شروع ہو جائے گا۔

جیسا کہ صاحب مضمون نے خود اعتراف کیا ہے، ہم میں سے ہر شخص کسی نہ کسی حد تک احساس کمتری میں مبتلا ہے، نہ صرف افراد بلکہ اقوام بھی اس لعنت میں گرفتار ہیں، فرائڈ اور ایڈلر نے فردی نفسیات کا تجزیہ کیا اور اس احساس کو ہماری بہت سی پستیوں کا ذمہ دار گردانا لیکن حکیم مشرق کی نگاہِ دوررس نے قوموں کے عروج و زوال میں بھی اسی احساس کی کارفرمائی دیکھی۔ اقبال کا فلسفۂ خودی احساس کمتری کے لئے پیغام موت ہے۔ اور اس کا مخاطب نہ صرف فرد بلکہ ایک پوری قوم ہے۔ وہ بار بار ہمیں خودشناسی کی تلقین کرتا ہے۔ وہ ہر لحظہ ہمیں خودی کو بلند کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ اس کا ہر نفس ایک شعلۂ آتشیں ہے جو کمتری کے خس و خاشاک کو پھونک کر رکھ دیتا ہے۔ وہ برملا کہتا ہے ؎

کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو۔
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے

یہ اور بات ہے کہ ہم گم کردہ راہ لوگوں کی نگاہیں اس وادی میں بھی رہبر کی تلاش میں اٹھتی ہیں تو افق مغرب کی طرف ...... اور یہ بجائے خود احساس کمتری کی ایک نہایت روشن مثال ہے۔

ادب لطیف - افسانہ نمبر

شیر گل۔ جناب ابوسعید قریشی کے اس چھوٹے سے مطالعے میں ژرف نگاہی اور خوش بیانی کے بہت سے جواہر ریزے بکھرے نظر آتے ہیں۔ شیر گل ایک مرد آزاد ہے جو سرحد پار کی آزاد سرزمین سے غلام آباد ہند میں روزی کمانے آنکلا ہے وہ ایک چھوٹے سے پہاڑی جنگل کا محافظ ہے جنگل میں کشمیری مزدور اور چند پنجابی کاریگر مقیم ہیں اور ان کے اوپر ٹھیکیدار کا پنڈت منشی ہے۔ جو کشمیری الاصل ہونے کے باوجود ان انسان نما بھیڑوں کے گلے پر ایک شکاری کتے کی طرح مسلط ہے۔ پٹھان چوکیدار سے اس کی نہیں بنتی اور ان دونوں میں اکثر نوک جھونک رہتی ہے۔ شیر گل کی فطری آزادی، درشتی، اور وسیع النظری کشمیری مزدوروں کے غلامانہ توکل، اور بزدلانہ مسکنت کے پس منظر پر خوب کھلتی ہے۔ دیکھئے:۔

"اور جب میں نے اسے ایک کشمیری گانے کا مطلب سمجھایا جسے وہ اکثر رات کے وقت الاؤ کے گرد بیٹھے ایک ٹوٹے ہوئے کنستر کی تال کے ساتھ گایا کرتے، تو اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ گانا یہ تھا:۔

زعفران کے کھیتوں میں بہار آگئی۔ کلیاں چٹکیں اور پھول بن گئیں۔ آہ ہمارا پسینہ انہیں نمی پہنچاتا رہا لیکن عنقریب وہ ٹھیکیدار کے ہاں پہنچ جائیں گے ---- دیکھ لو، صمد و بھائی، انہیں جی بھر کے دیکھ لو، کیونکہ یہ چند دنوں کے مہمان ہیں"۔

"گانے کے آخر میں ان کی آواز ایک لمبی 'ہو' کی شکل اختیار کرلیتی، جیسے کئی ایک گرسنہ بھیڑیے ہم آواز ہو کر آسمان کی طرف منہ اٹھائے چیخ رہے ہوں۔ الاؤ کی روشنی میں ان کے سر جو اخروٹ کھا کھا کر گنجے ہو چکے تھے۔ انڈوں کی طرح چمکا کرتے اس سبب موٹی 'کو وہ دن کے وقت گول گول کٹوروں ایسی ٹوپیوں سے ڈھانپ چھوڑتے، اور عام طور پر انہیں وضو کرتے وقت ہی اتارتے۔ اور وضو کے بعد ان کی پیشانی کے محراب اور بھی زیادہ نمایاں ہو جاتے ---- محراب، ان کے سجدوں کے نشان، عقیدت کی مہریں جن کے متعلق خوش عقیدہ لوگوں کا خیال ہے کہ قیامت کے دن یہ چودھویں کے چاند کی طرح چمکیں گے ---- بظاہر انہیں اس دنیا کی نسبت اپنی عاقبت کا زیادہ خیال تھا" ---- وہ مرئیل سے نظر آتے، اور ان کے چہروں سے ان کا تن بتقدیر ہونا ٹپکا کرتا۔

۔۔۔۔ "تن بتقدیر" ---- بے عملی کا بہانہ ---- نامردوں کا فلسفہ۔ اگر شیر گل کی قوم اس فلسفے پر عمل کرتی تو وہ اب تک مٹ چکی ہوتی۔ غلام نظر آتی۔ بخدا "وہ کہا کرتا تھا یہ لوگ مرد نہیں مردہ ہے"۔

اور شیر گل جس کی متانت بعض دفعہ اداسی کی حد تک پہنچ جاتی ایک اکھڑ سی حس مزاح بھی رکھتا تھا۔

"جب کبھی اسے موقعہ ملتا، وہ مشہور پنجابی مقولے 'کہنا مٹی کو اور سنانا بہو کو' پر عمل کرتے ہوئے اور اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کسی رحیم جو یا منیر جو سے مخاطب ہو کے کہتا:"

"تو رحیم جو، دیکھو مونچھ مرد کا نشانی ہے جس کا مونچھ نہیں وہ مرد نہیں" اس پر پنڈت جس کی مونچھیں چٹ تھیں، لیکن

جو شیر گل کی پٹھانیت سے ڈرتا تھا۔ رحیم جو کو ڈانٹتا!
دیکھو رحیم جو باتوں میں وقت ضائع نہ کرو۔ خاموشی سے اپنا کام
کئے جاؤ! لیکن شیر گل کا قہقہہ پنڈت کے رعب کا گلا دبا دیتا....."

ہندوستان کے کوہستانی مقامات جہاں اپنی گل پوش وادیوں اور جنت نما سبزہ زاروں کے لحاظ سے معروف جہاں ہیں وہاں اپنے حسن نسوانی کے باعث بھی کچھ کم ممتاز نہیں لیکن یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ یہی حُسن یہاں کی شاید سب سے ارزاں جنس ہے۔ صدیوں کی غلامی اور غلامی سے پیدا ہونے والی فلاکت نے غیرت اور عفت کے احساس کو پیس کر رکھ دیا ہے۔ صاحبِ فن افسانہ نگار نے قلم کی ایک ہی جنبش سے آزادی اور غلامی کی عُسرت کے دو مختلف مناظر ہمارے سامنے یوں پیش کئے ہیں۔

"وہ گُدے ہوئے گال اور وہ ہلالی ابروؤں کے سائے میں موٹی موٹی
سیاہ آنکھیں جنہیں دیکھ کر مندروں کی دیواروں پہ بنی ہوئی راجپوتی
تصویریں یاد آجاتیں، انہیں دیکھ کر پنڈت کی آنکھوں میں ایک وحشیانہ
سی چمک پیدا ہو جاتی اور وہ اکثر اپنی زبان میں ایک شعر پڑھا کرتا جس
کے آخر میں مرگ نین آتا تھا یعنی چشم آہو ــــ پنڈت کی حریصانہ
نگاہوں کو دیکھ کر شیر گل کہا کرتا۔ "تخدا اس پنڈت کا تشقہ دیکھو اور
اس کا کرتوت دیکھو . . . ." اور ایک "خوں" کے ساتھ وہ اپنے لُچ
کا لمبا سا کش لگاتا، اور دھواں پی جاتا جیسے وہ اپنا غصہ پی گیا ہو۔
. . . یہ عورتیں کوئلے سے بھری مخروطی ٹوکریاں کمر پہ لادے شہر میں
بیچنے لے جاتیں اور یہ بات قریب قریب ایک امرِ مسلّمہ ہو چکی تھی کہ یہ
کوئلہ والیاں اکثر نوجوان "زمان پرست" رئیس زادوں کا شکار ہو
جاتی تھیں جو اس علاقے میں صرف "تماش بینی" کو مدنظر رکھ کر آتے تھے
اور اپنے پیچھے گھناؤنی بیماریوں کے جراثیم چھوڑ جاتے تھے ــــ
یہ لوگ جو برف کی پاکیزگی، ہواؤں کی لطافت آبشاروں کے راگ،
غنچوں کے تبسم اور وادیوں کی وسعت سے ناآشنا تھے، اور
جن کی زندگی کا مقصد صرف شہوانی جذبات کی تسکین تھا ــــ"

اور اب قبل اس کے کہ تصویر کا دوسرا رُخ آپ کے سامنے آئے ذرا منظر نگاری کا اعجاز دیکھئے۔

"جنگل کے اختتام پہ، ایک بلند چٹان سے ہم وادی کا نظارہ کیا کرتے
ــــ دھان کے سبز کھیت یوں نظر آتے جیسے کسی سپنے کے محل
کی سیڑھیاں اور مکی کی سنہری داڑھیوں والی فصل جیسے پگھلا ہوا
سونا اور پھر وہ سفیدے کے درخت اور مٹی کے گھروندے اور
پگھلی چاندی کی طرح بہتا ہوا سانپ سا دریا ــــ سارا منظر،
گویا خواب کا منظر تھا جیسے کسی چابکدست مصور نے رنگوں کے
چھینٹوں سے ایک دیو قامت تصویر بنا دی ہو"!

اور اس منظر کا فائدہ اٹھا کر چابک دست افسانہ نگار ہیرو پہ اس کا ردِ عمل کیسی خوبصورتی سے دکھاتا ہے:۔

"شیر گل اس چٹان پہ کھڑا اکثر اپنی لانبی باہنہ کو اپنے گرد نصف دائرے
کی جنبش دیتے ہوئے کہتا:
"خو دنیا کتنا وسیع ہے ..... ساری عمر چلتا رہے پھر بھی ختم نہ
ہوا!"

کیسا سادہ، کتنا پُر زور، اور کس قدر سچا تصور! انسان کا وہ ابتدائی جذبہ جسے اُس نے صبحِ تاریخ کے دھندلکے میں تسخیرِ عالم کی عظیم الشان مہم پر روانہ کیا تھا۔

ــــ اور اب گریز ملاحظہ ہو:۔

اور اس چٹان پہ بیٹھے اُس کا تخیّل اُسے اُن سبز پوش وادیوں اور
دلفریب مناظر سے دور اُس کے دیس کی برہنہ چٹانوں اور سبزہ و گُل
سے تہی اور نالۂ بلبل سے پاک، فضا میں لے جاتا۔ جہاں محبت ایک
مقدس کھیل ہے اور حُسن رسوا نہیں ــــ "تخدا" وہ کہتا "ہمارا
وطن میں بھی وہ چشم غزال ہے کہ چشمِ غزال بھی اس کے مقابلے میں نہ
ٹھہر سکے ..... لیکن کیا مجال جو کوئی نظر بد سے دیکھ پائے .....
پھر وہ ان دوشیزاؤں کے قصے سناتا جو اپنی عزت کو بچانے کے لئے
جان پر کھیل جاتی ہیں۔ جو رائفل کندھے پہ ڈالے اکیلی بکریاں چراتی
ہیں، جن کا نشانہ کبھی نہیں چوکتا اور جن کے خنجر کا وار کبھی خالی نہیں
جاتا۔"

اور آخر وہ سنگ زادہ اس وادی کی مسحور کن اور خواب آور فضا میں زیادہ ٹھہرنے کی تاب نہ لا یا اور ایک دن۔

"جب میں شہر سے کچھ لے کر لوٹا تو شیر گل اپنے بستر کا سہارا لئے
راستے میں بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ جا رہا
ہے۔"
"کدھر جاؤ گے" میں نے پوچھا۔
"دنیا بہت وسیع ہے" اس نے جواب دیا "مرد کا بچہ بھوکا نہیں مر سکتا
..... شاید پھر کہیں ملے گا۔ دنیا . . . ."

یہ کہتے ہوئے وہ دھند میں میری نظروں سے اوجھل ہو گیا اور آبشار کی آواز کے ساتھ اس کے آخری الفاظ دیر تک میرے کانوں میں گونجتے رہے اور اب بھی جب کبھی میں اس جگہ جاتا ہوں جہاں وہ مجھ سے رخصت ہوا تھا تو میرے کانوں میں وہی صدا آتی ہے۔ "دنیا بہت وسیع ہے"۔

"جیسے اس کی صدائے بازگشت اب تک وہاں تیر رہی ہو"

آپ نے دیکھا فن کار نے ایک ہی تصویر میں فطرت نگاری تاثر پیمائی اور نفسیاتی مطالعے کے کیسے مختلف، گہرے اور خوش آئند رنگ بھرے ہیں۔ جو نہ صرف ایک دوسرے برعکس انداز میں بلکہ اپنے مقابل کو ابھارتے ہیں۔ زبان و بیان کی خوبی نے اس مطالعے کو چار چاند لگا دیتے ہیں۔ تشبیہات کی نزاکت کی ایک دو مثالیں آپ نے ان اقتباسات میں ملاحظہ فرمالیں۔ ایک آدھ اور دیکھئے۔ مزدوروں کا حلیہ بیان کیا جا رہا ہے، "ان کے چہروں کی جھریاں ان راہوں کی طرح تھیں جن پر ان کی زندگی کی گاڑی دھنستی چلی گئی تھی"۔ ایسی خوفناک تشبیہہ اپنی حقیقت اور شدت کے لحاظ سے ہمارے ادب میں یقیناً بے مثال ہے اور آرٹسٹ کی نزاکت احساس کی ایک نہایت روشن نظیر۔ افسوس ہے کہ زبان کی بعض لغزشیں بھی اس نفیس مطالعے میں نظر آئیں۔ مثلاً "پانی کوئی ہفتہ بھر کی جھڑی کے بعد کھلا تھا"۔ "وہ کھسیانا ہو کر وہاں سے کھسک جاتا"۔ "بہ نسبت" کی بجائے "صرف نسبت" وغیرہ وغیرہ۔ امید ہے کہ فاضل افسانہ نگار اپنی آئندہ تحریروں میں زیادہ احتیاط سے کام لیں گے۔

صلاح الدین احمد

مندرجہ ذیل نظموں کا جائزہ لیا گیا ہے:۔

(۱) بوادئی کہ دراں خضر را عصا خفت است — عطاء اللہ سجاد (ہمایوں)

(۲) طلوعِ آفتاب — ایمن حزیں سیالکوٹی (عالمگیر)

(۳) ایسا کیوں ہوتا ہے — سلام مچھلی شہری (ادب لطیف)

بظاہر اردو شعرا کے دو بڑے گروہ اس وقت ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ایک گروہ اپنے کو ترقی پسند سمجھتا ہے اور اسی کی اس تقسیم سے باقی تمام شاعر دوسرے گروہ میں آ جاتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ دوسرے شاعر ترقی پسند نہیں بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ پہلے گروہ میں تالاب کو گندا کرنے والی مچھلیاں دوسرے گروہ کی بہ نسبت زیادہ ہیں۔ اس گروہ میں ایسے شعرا کی کثرت ہے جن کے جذبات و خیالات اپنے نہیں، جن کے اپنے پاس کوئی خیال ایسا نہ تھا جسے وہ شعر کے ذریعے پیش کرتے اور اس لئے انہوں نے چند تبلیغی باتوں کو جو نثر میں بہتر طریق پر ادا کی جا سکتی تھیں۔ ایک سطحی اور کم و بیش غیر موثر انداز میں ظاہر کرنا شروع کیا ہے۔

لیکن مجھے اس وقت دوسرے گروہ کی کارگذاریوں سے تعلق ہے۔ ان کے کلام میں زندگی محدود ہو کر نہیں رہ گئی۔ یہ جو کچھ کہتے ہیں فطری تحریکِ شعری کی بنا پر ہی کہتے ہیں۔ اسی لئے ان کے کلام میں زندگی کے ایک حقیقت نما پہلو کی بے ساختگی ہے۔ عطاء اللہ سجاد سرِ راہے کسی بھکاری لڑکے کی صدا سنتا ہے۔ "عشق دی گلی وچوں کوئی کوئی لنگھدا" اور اس کی ذہانت جاگ اٹھتی ہے۔ اسے یاد آتا ہے کہ ایک زمانے میں وہ بھی اس گلی سے نکلا تھا۔

"میں نے اک بار محبت کی تھی۔
"لذت اندوز تھا دل غم کی فراوانی سے۔
"زندگی میری عبارت تھی غزل خوانی سے
"آہ وہ کیف میں ڈوبے ہوئے دن رات مرے۔
"رفعت عرش پہ رہتے تھے خیالات مرے
"کسے معلوم کہ میں نے بھی یہ جرأت کی تھی۔
"وادیٔ عشق میں پرواز کی ہمت کی تھی"

لیکن اسے احساس ہے کہ "عشق کی راہ میں آتے ہیں بہت سخت مقام"
اور اسی لئے اس گلی میں سے گذرنے والے افراد کم ہوتے ہیں۔

"نارسائی مری تقدیر میں تھی۔
"ہمسفر چھوڑ گئے ساتھ مرا۔
"تھام لیتا ہیں اسے کاش! کوئی ہاتھ مرا"

اور ہاتھ کے تھامنے والے کی ضرورت بھی تھی، کیونکہ

"راہ انجانی، نشیب اور فراز
"منزل دور و دراز
"تیرگی چار طرف اور بلاؤں کا ہجوم
"راہ روِ خستہ المناک نواؤں کا ہجوم

ایسی حالت میں کہ کوئی سہارا نہ ہو یہ کیفیت لازمی تھی کہ

"خوف آلام و شدائد سے میں گھبرا ہی گیا۔
تیرے ماتھے پہ عرق آ ہی گیا۔
بُزدلی پاؤں کی زنجیر بنی
عزم نے چھوڑ دیا ساتھ تمناؤں کا۔
دُہ مِرا جوشِ سفر ختم ہُوا۔
اَور اب طاقتِ رفتار کہاں
اَب سبک گام مرے شوق کا رہوار کہاں
تم نے بھیجا بھی تو کس وقت محبت کا پیام!"

اگرچہ یہ نظم محبت کی ناکامی کا ایک عام نوحہ ہے لیکن اس میں شاعر جس ترتیبِ خیال سے حال کو چھوڑ کر ماضی میں کھو گیا ہے وہ قابلِ غور ہے۔ راستہ چلتے ہوئے شاعر کسی بھکاری لڑکے کی صدا سنتا ہے کہ عشق کی گلی میں سے ہر کوئی نہیں گذرا کرتا"۔۔۔۔۔ وہ ٹھٹھک کر رک جاتا ہے۔ گویا سڑک پر ایک تنہا ستون ہو لیکن اُس کے ذہن میں حرکت پیدا ہوتی ہے۔ اُس کا ذہن گویا الٹے پاؤں آہستہ آہستہ اپنے ساتھ ہمیں بھی اس گلی میں لے جاتا ہے۔ جہاں شاید کبھی ہمارا بھی گذر ہُوا ہو۔

آخری مصرعے پر پہنچ کر شاید شاعر کا ذہن نارسائی، تیرگی، بلاؤں کے ہجوم، آلام و شدائد اور المناک صداؤں سے بیزار ہو گیا اور اُس کے آسودہ نفسی پہلو نے یکایک کروٹ لی "تم نے بھیجا بھی تو کس وقت محبت کا پیام"۔۔۔۔۔ یوں قاری کا ذہن جو شاعر کے ساتھ ساتھ اُس کے یا اپنے ماضی کی طرف جا کر گذرے ہوئے زمانے کی یاد میں ڈوب گیا تھا۔ یک دم پھر حال میں آن پہنچا حقیقت پرستی کے لحاظ سے یہ پلٹنا صحیح نہیں۔ کیونکہ غیر جانبداری سے دیکھا جا سکتا ہے کہ "محبت کا پیام" فریبِ نفس سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہے۔ یوں فنی لحاظ سے بھی اگر نظم اس مصرعے سے پہلے مصرعے پر ختم ہو جاتی (اور اب طاقتِ رفتار کہاں، اب سبک گام مرے شوق کا رہوار کہاں) تو ایک ایسی لرزتی ہوئی کیفیت پیدا ہو سکتی جو ذہن کو ماضی سے دور لے جا کر تینوں زمانوں کی پابندی سے سے آزاد کر دیتی اور اُن لرزتے ہوئے ماضی میں کھو جاتے ہوئے سُروں کا اثر زیادہ ہوتا۔

عطاء اللہ سجاد نوحہ کناں تو نہیں لیکن ایک حسرت بھرے انداز سے سوچ رہا تھا کہ محبت کا سورج چھپ گیا۔ لیکن امین حزیں (سیالکوٹی)، مادّی سورج کی طرف رجوع ہے اُسے ہر روز صبح نکل کر شام کو چھپ جانے والا سورج اپنی طرف متوجہ کئے ہوئے ہے۔

اللہ کا فٹ بال فرشتوں نے اُچھالا
یا خُم سے مئے نور کا نکلا ہے پیالا
یا اوڑھ کے انوارِ تجلّی کا دوشالا
سر حور نے جنّت کے دریچے سے نکالا

تھا چاند کی کرنوں میں ابھی نور کا دم خم
تاروں میں سے اکثر نہ ہوئے تھے ابھی مدھم
در نیم سحر نے ابھی کھولا ہی تھا پرچم
سر اپنا سیاہی سے سفیدی نے نکالا

بہنائے افق سے تھیں اٹھیں نور کی امواج
یہ نور کی امواج تھیں یا نور کی افواج
یلغار کئے آتا تھا پورب کا مہاراج
کرتے ہوئے ظلمت کی صفوں کو تہ و بالا

آتے ہیں جو یہ صبح و مسا ہم کو نظر رنگ
دن رات میں چھڑتی ہے جو یہ شام و سحر جنگ
منظر ہیں یہ قدرت کے قوانین کی فرہنگ
ہے شرط مگر دل ہو کوئی دیکھنے والا

اقوام کا آغاز بھی انجام بھی خوں ہو
ہے ایک جنوں وہ بھی اگر یہ بھی جنوں ہو
وہ جذبۂ بے باک ہے یہ حال زبوں ہے
فطرت نے گرایا بھی اُسے جس کو اُچھالا

اس نظم میں بعض باتیں قابلِ غور ہیں۔ سورج کو "اللہ کا فٹ بال" کہنا ایک تجدید ہے، شاید اس استعارے کا لطف ہر شخص کو نہ آ سکے لیکن اس کی وجہ تشبیہ کا اچھوتا پن ہے اس کی خامی نہیں "سر اپنا سیاہی سے سفیدی نے نکالا"، "منظر ہیں یہ قدرت کے قوانین کی فرہنگ" اور "یلغار کئے آتا تھا پورب کا مہاراج"۔۔۔۔۔ اپنے زورِ بیان کی دلیل آپ ہیں۔ کُل نظم میں ایک ایسی شوکت

الفاظ ہے جو طلوعِ آفتاب کے شکوہ سے پورے طور پر ہم آہنگ معلوم ہوتی ہے۔

جس طرح ابنِ حریص کی نظم میں ایک دو باتیں اچھوتی ہیں اُسی طرح سلام مچھلی شہری کی نظم میں [illegible]

دوسروں کی مغرور خوشی سے میں بھی اثر لے ہی لیتا ہوں
دوست جب آپس میں ہنستے ہیں میں بھی اُن میں ہنس دیتا ہوں
ایسی صورت میں کیا جانے آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟
رات کو جب ناول کے رنگیں باب پہ آنے لگتا ہوں میں
موسیقی سی رومانی جذبات میں پانے لگتا ہوں میں
ایسی صورت میں کیا جانے آخر ایسا کیوں ہوتا ہے
فلم کے پردے پر جب کانن رقصاں ہو ہو کر گاتی ہے
میرے آنسو ہنس دیتے ہیں میری دنیا کھو جاتی ہے
ایسی صورت میں کیا جانے آخر ایسا کیوں ہوتا ہے
چاہے دن بھر کتنا ہی افسردہ بھوک سے ہوتا ہوں میں
لیکن خواب بہت کیف آگیں ہوتے ہیں جب سوتا ہوں میں
ایسی صورت میں کیا جانے آخر ایسا کیوں ہوتا ہے
تاج محل کے رہبر جس دم پچھلے قصے دہراتے ہیں
شاہی کا دشمن ہوں لیکن پھر بھی آنسو آ جاتے ہیں
ایسی صورت میں کیا جانے آخر ایسا کیوں ہوتا ہے
سوچتا ہوں دیہاتوں میں کیوں یہ دلکش دنیا غمگیں ہے
کیا دل کے بہلانے کو ان کا خدا کوئی بھی نہیں ہے
ایسی صورت میں کیا جانے آخر ایسا کیوں ہوتا ہے
خونی پرچم کے نیچے مزدوروں کے جب آتا ہوں میں
اپنی قوت سے خوش ہو کر باغی نغمے گاتا ہوں میں
ایسی صورت میں کیا جانے آخر ایسا کیوں ہوتا ہے۔

اس نظم میں شاعر کا ذہن ایک سیدھے خط میں نہیں چلتا۔ سجاد کی نظم میں جب ایک بار ذہن ماضی کی طرف رجوع ہوتا ہے تو آخری مصرعے سے پہلے تک ماضی ہی کی طرف چلا جاتا ہے۔ گویا ہر نیا شعر پہلے شعر میں گھلتا جاتا ہے اور اثر کو گہرا کرتا ہے، لیکن یہ نظم اُن بنگالی گیتوں کی مانند ہے جو ہر مصرعے پہ بدلتی ہوئی راگنی کے سانچے میں ڈھلتے چلے جاتے ہیں۔

اس نظم کے شاعر کا ذہن ایک ایسے نوجوان کا ذہن ہے جسے غور و تفکر کا مادہ ملا ہے اور وہ دنیا کی مختلف باتوں سے اثر لے رہا ہے۔ عنوان سے تو یہ ظاہر ہے کہ اُسے ایک خلش سی ہے۔ ایک استفسار سا اُس کے دل میں کھٹک رہا ہے (ایسا کیوں ہوتا ہے؟) وہ زندگی کی ندی میں بہتا جا رہا ہے۔ کیوں بہتا جا رہا ہے؟ اس لئے کہ اس کے دائیں بائیں آگے پیچھے ہر شے بہتی جا رہی ہے" دوست (میرے دوست) جب آپس میں ہنستے ہیں، میں بھی ان میں ہنس دیتا ہوں" گویا یہ ہنسی بے ساختہ نہیں، ایک نقالی سی ہے۔ اُس کا جی نہیں چاہتا کہ وہ ہنسے، یہ بے دلی کیوں؟ کیا اُسے اپنے ماحول سے تسکین حاصل نہیں ہوتی؟ اگلا تصور بے ساختہ احساس کا حامل ہے۔ جب شاعر (وہ نوجوان)، رات کو ناول پڑھتا ہے تو خود بخود دل میں امنگیں پیدا ہوتی ہیں، کیسی اُمنگیں؟ ۔۔۔ وہ اُمنگیں جن کو ایک ناول کے "رنگیں" باب سے تحریک ہو سکتی ہو۔ نفسیاتی نقطۂ نظر سے اس بند میں آغازِ بلوغ کی کیفیت کا اظہار ہے۔ تصور پھر بدل جاتا ہے۔ ناول سے اس کے دل میں جو بے چینی پیدا ہوتی ہے اُس کی ایک ادھوری تسکین فلم کے پردے پر ہوتی ہے۔ ایک لمحے کے لئے اس لئے ذہن کی مرکز کانن بالا بن جاتی ہے اور ناول کے رنگین باب نے جن آنسوؤں کو بیدار کر دیا تھا۔ وہ پلکوں سے گر پڑتے ہیں۔ "میرے آنسو ہنس دیتے ہیں، میری دنیا کھو جاتی ہے"۔ "میری دنیا" ۔۔۔ کون سی دنیا؟ کیا وہ دنیا جس میں دوستوں کے ساتھ محض ظاہری ہنسی کا دخل ہے یا وہ دنیا جس کی ایک ہلکی سی جھلک ناول کے رنگین باب سے دکھائی دی تھی۔ ہمیں اس سے غرض نہیں۔ ہمیں اتنا ہی کافی ہے کہ فلم کے پردے سے شاعر کے دل میں وہ امنگیں جو ناول سے پیدا ہوئی تھیں زیادہ شدید صورت اختیار کرتی ہیں۔ امنگوں کی یہ شدت کسی لفظ سے ظاہر نہیں ہوتی۔ بلکہ اس بند اور اس سے اگلے بند کی درمیانی خلا میں ایک نفسی وضاحت پوشیدہ ہے۔ فرائیڈ کے چیلوں نے نفسیات کی بحثوں میں کہا ہے کہ جنسی ناکامی انسان کو مناظرِ قدرت کا متوالا بنا دیتی ہے (اور ایک نقاد نے تو انگریزی شاعر ورڈز ورتھ کی زندگی کے حالات کا تجزیہ کر کے ماہرینِ نفسیات کے اس نظریے کو ثابت کیا ہے۔ ہمارے ملک میں بھی حالی کی قدرتی شاعری کے سلسلے میں ایسے تجزیے کی ضرورت ہے) کہتا ہوں نیچر میں کھو کر یہ نظارے میرے ہوتے، کاش یہ کلیاں میری ہوتیں۔ کاش یہ تارے میرے ہوتے" ۔۔۔ ان ستاروں میں کچھ بھی نہیں، نہ ان کلیوں میں کوئی بات ہے۔ یہ تلازمِ خیال اور اندازِ نظر کا مسئلہ ہے، "کانن بالا" یا "ناول کے رنگیں باب کی عورت یا وہ" اگر مجھے مل سکتی تو ان کلیوں سے لطف اندوز ہوا جاتا، اس تاروں بھری رات میں وقت گنوایا جاتا ۔۔۔ لیکن یہ کلیاں میری نہیں، یہ تارے میرے نہیں، یعنی میرے لئے بے کار ہیں۔ "کاش یہ میرے ہوتے"۔ یہ "کاش" بہت بامعنی

لفظ ہے۔ اس میں حسرتوں کا انبار چھپا ہوا ہے۔ اس سے مناظر پرستی کی غلط غائی کا بھید کھلتا ہے۔

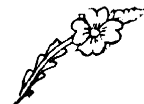
تھا ہے دن بھر کتنا ہی افسردہ بھوک سے ہوتا ہوں میں — بھوک سے افسردہ ہونے کا تصور اس تخیل پرستانہ نظم کو یکدم حقیقت کے قریب لے آتا ہے۔ آج کل کے نوجوان بے کار ہیں، ناول پڑھتے ہیں، پردہ سیمیں پر کانن بالا کو دیکھتے ہیں، باغوں میں پھرتے ہیں، کلیوں کو دیکھ دیکھ کر غمگیں ہوتے ہیں، چاندنی راتوں میں آوارہ گردی کرتے ہیں، ستاروں سے اکتساب غم کرتے ہیں

رات کو گھبرا کے پھر ناول

پڑھتے ہیں اور سو جاتے ہیں۔ اس نظم کا نوجوان بھی اسی قسم کا ایک مرد بیکار ہے۔

تاج محل کی سیر کو جاتا ہے تو اُسے صرف ممتاز محل کا المناک فسانہ ہی متاثر کر سکتا ہے، پرانے بادشاہوں کی شان و شوکت اُس کے جمہوری احساس کو جگاتی ہے' اس کا انداز نظر موجودہ ہندوستان کے سیاسیات سے آلودہ نوجوان کا انداز نظر ہے۔ اخباروں کے مطالعے نے اُسے بتایا ہے کہ ہندوستان کی آبادی کی اکثریت کسان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگلے بند میں اُسے کسانوں کے مصائب کا ایک بے نام سا احساس ہوتا ہے اور پھر وہ ایک خالص نوجوان کی طرح خدا کے بھی خلاف چند لفظ کہتا ہے اور آخر میں زمانے کے فیشن کے مطابق مزدوروں کے پرچم کے نیچے جا کر کھڑا ہو جاتا ہے لیکن یہ پرچم خونی کیوں ہے! اس کی وضاحت اس مختصر جگہ میں نہیں کی جا سکتی۔ یہ بات لمبی ہے جس کا اختصار یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں جس قدر انقلابی تحریریں (خواہ وہ پروپیگنڈا کی ہوں، خواہ ادب و شعر کی) پیدا ہو رہی ہیں ان کے تحت میں ایک ازلی اصول کارفرما ہے۔ یہ اصول اذیت پرستی کا ہے۔ مغرب کی موجودہ جنگ اذیت پرستی ہی کا مظاہرہ ہے، اور انسان کے ہر عمل میں اسی اصول کی کارروائی کی موجودگی کی دلیل دی جا سکتی ہے۔ لیکن اگر شاعری مقصود ہو تو کہا جا سکتا ہے کہ مزدوروں کا پرچم اس نوجوان کے خونِ آرزو سے سرخ ہے

میراجی



نقد و نظر

مکتوبات شاد عظیم آبادی

شاد عظیم آبادی کے شاعرانہ کمال کا ایک زمانہ معترف ہے۔ ادارۂ ادبیات اردو نے جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ سے مرتب کرا کے شاد مرحوم کے اڑسٹھ خطوط کا یہ مجموعہ شائع کیا ہے اور اگرچہ یہ خطوط (ایک کے علاوہ) تمام تر سید ہمایوں مرزا مرحوم یا اُن کی رفیق حیات صغرا بیگم صاحبہ کے نام ہیں، پھر بھی ان خطوط سے شادؔ کی شخصیت پر کافی سے زیادہ روشنی پڑتی ہے۔ خطوط انسانی طبائع کا بے ساختہ اظہار ہوتے ہیں اور اُن میں کسی طرح کے دنیوی تصنع کو دخل نہیں ہوتا خصوصاً ان خطوط میں جو کسی مہربان دوست کے نام لکھے جائیں۔ شادؔ کے ان خطوں کی بھی یہی کیفیت ہے۔ یہ تمام خط ایسے صاحبوں کے نام لکھے گئے جنہوں نے عمر بھر شاد عظیم آبادی کے دوستانہ اور مشفقانہ سلوک کیا اور اس سلوک میں بھی اگرچہ شادؔ کی بعض دفعہ غیر مدلّل حد تک بڑھی ہوئی خودداری حارج ہوتی رہی پھر بھی خود شادؔ ان کے حسن اخلاق کا معترف ہے، ان خطوط میں سب سے زیادہ دلچسپی قاری کو شاد کی خودداری کے پہلو ہی میں محسوس ہوتی ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ مستقبل میں شاد پر لکھنے والوں کے لئے یہ مجموعہ ایک اچھی مدد ثابت ہوگا۔ نیز شادؔ کے مشتاقوں کے لئے بھی اس میں دلچسپی کا سامان ہوگا۔ شروع میں اردو کے مشہور نقاد ڈاکٹر زورؔ نے ایک مختصر لیکن دلچسپ اور معلومات سے پُر مقدمہ تحریر کیا ہے۔

حجم تین سو صفحات۔ قیمت ۱۲؍۔ لکھائی چھپائی صاف کاغذ اچھا ملنے کا پتہ:۔ سب رس کتاب گھر رفعت منزل خیریت آباد۔ حیدرآباد (دکن)

دنیا کی کہانی

پروفیسر محمد مجیب بی اے آکسن کی دلچسپ اور معلومات سے پُر تقریروں سے ریڈیو کے سننے والے خوب آگاہ ہیں۔ یہ مجموعہ سترہ ایسی تقریروں پر مشتمل ہے جو موضوعی لحاظ سے ایک دوسرے سے گہرا تعلق رکھتی ہیں اور یوں یہ کتاب مختلف مضامین کی بجائے ایک مسلسل حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ دیباچے میں پروفیسر موصوف لکھتے ہیں کہ اِسے تاریخ کہتے ہوئے شرم آتی ہے، اور کہانی میں جو دلچسپی چاہیے وہ بھی اس میں نام کو نہیں۔ ناظرین کے سامنے یہ صرف اس امید میں پیش کی جاتی ہے کہ یہ انہیں شاید بہتر کتابیں پڑھنے کا شوق دلائے، اور وہ اس دھندلے سے خاکے میں جو کچھ غلط سمجھیں اُسے مٹا کر، جو کچھ صحیح ہو اُسے قائم رکھ کر اسے بنتے بنتے ایک تصویر بن جانے کا شرف بخشیں۔"

ہمارے خیال میں اگر تاریخ کو طلبا کے سامنے بھی اسی انداز میں پیش کیا جائے جسے جناب محمد مجیب نے اختیار کیا ہے تو درس و تدریس کی خشکی کے باوجود طلبا تاریخ کے علم میں کہیں زیادہ دلچسپی لیں۔ کہانی کی دلچسپی بھی ان مضامین میں کسی طرح کم نہیں ہے اور اس کی وجہ پروفیسر صاحب کا سلجھا ہوا سیدھا سادا طرز بیان ہے۔ اُن کی ذہانت میں داستان گوئی کا ایک فطری رجحان ہے جس نے ان تقریروں کو بہت دلچسپ بنا دیا ہے۔ اگرچہ یہ کتاب بنفسہٖ بہت وسیع مطالعے کا نتیجہ ہے اور معلومات کے لحاظ سے ہر طرح مطمئن کرتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی بہتر کتابوں کے پڑھنے کا شوق بھی دلاتی ہے اور ان تصویروں میں کسی طرح کی رنگ آمیزی کی ضرورت ہی نہیں بلکہ ان کی رنگینی میں کھو جانے کا احساس بہت جلد ہو جاتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ مولف کی توقعات کو یہ کتاب بطریق احسن پورا کرے گی۔

لکھائی چھپائی کتابت اور کاغذ عمدہ۔ حجم کتابی سائز کے سوا دو سو صفحات قیمت دو روپے (یہ قیمت ہمارے خیال میں بہت زیادہ ہے) ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ دہلی۔

دوشیزۂ صحرا

کتب خانہ علم و ادب دہلی نے انگریزی ناول نگار مس جون کون کوسٹ کے ایک ناول کا ترجمہ شائع کیا ہے۔ مترجمہ جناب صادق اخیری۔ حجم دو سو سولہ صفحات۔ سائز کتابی لکھائی چھپائی کاغذ اچھا کتاب مجلد ہے اور جلد پر ایک جاذب نظر گرد پوش موجود ہے۔ جناب مترجم نے پیش لفظ میں جون کون کوسٹ کے متعلق جو تمہیدی فقرے لکھے ہیں۔ ان سے ہمیں پورا اتفاق ہے۔ مس جون کون کوسٹ انگریزی کی نسبتاً گمنام

ناول نگار ہیں، اگرچہ ان کے ناول اپنی بعض قابلِ رشک خصوصیات کی بنا پر ہر طرح اس لائق ہیں کہ ان کو انگریزی زبان کے صفِ اول کے ناولوں میں شمار کیا جائے۔ یہ ضرور ہے کہ ہندوستانی ناولوں کے مقابلے میں ان کی مقبولیت بے انتہا ہے اور وہ ہزاروں کی تعداد میں درجنوں بار شائع ہو چکے ہیں لیکن در حقیقت مغربی ادب میں ان کو وہ درجہ اب تک حاصل نہ ہو سکا جس کا وہ حق رکھتے ہیں۔"

جناب صادق الخیری اس سے پیشتر مس جون کون کونسٹ کے ایک اور ناول 'یورپ کا پریمی' کا ترجمہ کر چکے ہیں اور ہمیں امید ہے کہ وہ اسے بھی جلد ہی کتابی صورت میں شائع کرا دیں گے۔ راقم الحروف بھی مس موصوفہ کے جس ناول سے انگریزی ادب میں سب سے پہلے روشناس ہوا وہ 'یورپ کا پریمی' ہی تھا۔ اور اس کے مطالعے سے یہ کہ اب تک مجھے اس طلسمی اثر کا احساس ہے جسے پیدا کرنے میں جون کون کونسٹ ہمیشہ کامیاب رہتی ہے یہ فقط مسرت ہے کہ ناولوں کے ترجمے کے سلسلے میں جناب صادق الخیری نے عمومیت سے بچتے ہوئے ایک ایسی مصنفہ کو منتخب کیا ہے جو حقیقتاً ایک کامیاب ناول نگار ہے اور یہ امر اور بھی مسرت کا باعث ہے کہ جون کون کونسٹ کو اردو میں ایک لائق ترجمان ملا۔

قیمت ایک روپیہ چار آنے۔ ملنے کا پتہ۔ کتب خانہ علم و ادب، دہلی

ناموران اسلام جناب محمد حسین حسان جامعی اڈیٹر پیام تعلیم نے مکتبہ جامعہ کے زیرِ اہتمام مذکورہ بالا نام سے ایک مفید کتاب تالیف کی ہے۔ جیسے کہ مولف نے خود تمہید میں لکھا ہے یہ کام مشاہیر اسلام کی کثرتِ تعداد کے مدنظر آسان نہ تھا لیکن مولف اپنے انتخاب میں کامیاب ثابت ہوا ہے۔ انتخاب علوم و فنون کے لحاظ سے کیا گیا ہے اور ہر علم و فن یا اس کے کسی شعبے سے کم سے کم دو اور زیادہ سے زیادہ پانچ افراد چنے گئے ہیں۔ یوں اس کتاب میں ایک جامعیت پیدا ہو گئی ہے اور مفسر، محدث، فقیہ، علما، مصلحین، صوفیا، خلفا، سلاطین، وزرا، سپہ سالار، جہازران، مورخین، فلسفی، طبیب، سائنس دان، سیاح، شعرا، ادیب اور مدبرین سبھی لوگوں کا تذکرہ یہاں آ گیا ہے۔ اندازِ بیان صاف اور سیدھا ہے۔ کتابت طباعت اور کاغذ خوب ہے۔ کتاب مجلد ہے اور ایک سادہ گرد پوش اسے اور بھی محفوظ بنائے ہوئے ہے۔

ہمارے خیال میں سکولوں کے طلبا کے لئے یہ کتاب بہت مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ عوام کے لئے بھی یہ مشاہیر اسلام کی ایک چھوٹی سی حفظ العلوم معلوم ہوتی ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے اور ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ دہلی۔

محمد حسین آزاد اُردو ادب میں مولانا محمد حسین آزاد مرحوم کی ہستی نہ صرف ادبی نقطۂ نظر سے توجہ کے لائق ہے بلکہ اُن کی شخصیت بھی کچھ کم دلچسپ نہیں۔ سیرتی مطالعہ کے لحاظ سے غدر کے بعد مرزا رسوا کے علاوہ اگر کوئی ادیب ہمیں اپیل کرتا ہے تو وہ آزاد مرحوم ہیں۔

غالباً ادارۂ ادبیات اُردو حیدر آباد کی یہ کتاب اس بینظیر ادیب کے حالاتِ زندگی کے متعلق پہلی کوشش ہے جسے محترمہ جہاں بانو بیگم (نقوی) ایم اے نے تالیف کیا ہے۔ اس سوانح عمری میں نہ صرف آزاد کے حالاتِ زندگی بیان کئے گئے ہیں بلکہ اُن کی تصنیفات اور کلام پر بھی تبصرہ کیا گیا ہے۔

مؤلف نے کتاب کو مختلف ابواب میں تقسیم کر دیا ہے۔ مثلاً آزاد کے حالاتِ زندگی، (۲) آزاد کی دہلی کالج میں تعلیم، (۳) اساتذہ اور احباب، (۴) آزاد کی تصانیف، (۵) آزاد کی شاعری، (۶) آزاد کا پیرایۂ تنقید اور (۷) اُردو ادب میں آزاد کا درجہ۔

اگرچہ مواد کے فراہم کرنے میں مؤلف نے کافی جستجو اور محنت سے کام لیا ہے لیکن تحقیقی انداز نظر نے بعض جگہ لغزش کھائی ہے۔ بہرحال ان لغزشوں سے قطع نظر اندازِ بیان نے اکثر جگہ آزاد مرحوم کو قاری کے لئے ایک جیتی جاگتی چلتی پھرتی اور بولتی چالتی مورت بنا دیا ہے۔

ہمیں امید ہے کہ دوسرے اڈیشن میں زیادہ دقتِ نظر سے کام لے کر اس کتاب کو اور بھی مفید بنا دیا جائے گا۔ حجم تقریباً دو سو صفحے کتابی سائز کاغذ معمولی قیمت (عہ/) یہ قیمت ہمارے خیال میں زیادہ ہے۔

ملنے کا پتہ:۔ ادارہ ادبیات اُردو۔ رفعت منزل۔ خیریت آباد (حیدر آباد دکن)

"م"

ڈاک کے ڈاک کو ادبی دنیا ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ تک ... کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ اگر اس تاریخ تک آپ کو پرچہ نہ ملے تو ایک شکایتی کارڈ ... سپرنٹنڈنٹ پوسٹ آفس کو لکھو اور ایک کارڈ ... کہ پرچہ آپ کو دوبارہ بھیجا جائے اور محکمۂ ڈاک کی رسید ... ایک ... ہی جائے۔ منیجر

فہرست مضامین ادبی دُنیا لاہور

بابت ماہ جولائی ۱۹۴۰ء

جلد ۱۸ — نمبر ۷

تصاویر:- ۱۔ صبح جوانی ۲۔ شام جوانی۔

چندہ سالانہ مع محصول ڈاک و وی پی پانچ روپے ممالک غیر سے دس شلنگ

گیلانی پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام صلاح الدین احمد پرنٹر و پبلشر چھپ کر دفتر ادبی دنیا ... لاہور سے شائع ہوا۔ تصاویر ... پریس لاہور میں چھپیں۔

دُنیائے کاروبار

اورینٹل انشورنس کی سالانہ رپورٹ

اورینٹل گورنمنٹ سکیورٹی لائف انشورنس کمپنی لمیٹڈ ہندوستان کی سب سے بڑی اور سب سے مضبوط بیمہ کمپنی ہے۔ گذشتہ مئی میں اس کا پینسٹھواں سالانہ جلسہ بمبئی میں منعقد ہوا جس میں گذشتہ سال کی کارگذاری کی رپورٹ اور حسابات پیش کئے گئے۔ سر پرشوتم داس ٹھاکر داس سی آئی۔ ای جلسے کے صدر تھے۔ اس موقعہ پر صاحب صدر نے ایک فاضلانہ تقریر فرمائی۔

اپنی تقریر کے دوران میں سر پرشوتم داس نے فرمایا کہ سال زیر نظر میں نیا بزنس کچھ کم ہوا ہے تو اس کے کئی اسباب ہیں۔ سب سے اہم باعث جنگ کا آغاز ہے۔ جس کے باعث عام بے چینی بڑھ گئی ہے اور لوگ اطمینان سے کسی بات پر غور نہیں کر سکتے۔ دوسرا سبب شاید یہ ہے کہ ملک میں چند ایسے قوانین نافذ ہو گئے ہیں جن کے زیر اثر بعض خاص فرقوں کی آمدنیاں کم ہو گئی ہیں۔ مثلاً ساہوکاروں کی اور اس طبقے سے حاصل ہونے والا بزنس قدرتی طور پر کم ہو گیا ہے۔ ایک اور سبب غالباً یہ ہے کہ نئے ایکٹ کے ماتحت بہت سے ایجنٹ (تقریباً ۱۵ فی صدی) بے کار ہو گئے ہیں۔

آگے چل کر آپ نے کہا کہ امید افزا بات یہ ہے کہ جنگ کے غیر معمولی اثرات اب آہستہ آہستہ زائل ہو رہے ہیں۔ اور ایسے نئے ایجنٹ بھی بھرتی ہو رہے ہیں جنہیں لائسنس لینے میں کوئی مشکل نہ ہو گی۔ ایسے حالات میں اُمید ہے کہ صورت بہتر ہو جائے گی۔ اور بزنس بڑھ جائے گا۔

کمپنی نے ایکٹ کے نافذ ہونے سے پہلے پانچ پانچ سو روپے کی پالیسیاں بھی جاری کر دی تھیں چنانچہ ۱۹۳۶ء میں ایسی چھ ہزار پالیسیاں جاری تھیں اب جدید ایکٹ کے ماتحت یہ بھی بند ہو گئی ہیں۔

کمپنی کا روپیہ برابر فائدہ مند کفالتوں میں لگایا جا رہا ہے اور اوسط آمدنی اس وقت چار روپے چھ آنے فی سینکڑہ ہے۔ کمپنی کے ڈائرکٹروں کی رپورٹ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سال زیر نظر میں تقریباً ساٹھ ہزار تجاویز بیمہ کمپنی کے دفتر میں موصول ہوئیں جن میں سے تقریباً چالیس ہزار منظور کی گئیں۔ ان کی مجموعی مالیت پونے آٹھ کروڑ روپے کے قریب تھی اور سالانہ آمدنی بیالیس لاکھ روپے کے قریب۔ اس وقت چار لاکھ سے زائد پالیسیاں جاری ہیں جن کی مجموعی مالیت اسی کروڑ روپے کے قریب ہے۔ اس سال کمپنی نے ڈیڑھ کروڑ روپے کے قریب ایسے مطالبات میں ادا کئے۔ جو پالیسی ہولڈروں کی اموات یا پالیسیوں کی تکمیل کے نتیجے میں پیدا ہوئے۔ اموات کی تعداد پونے تین ہزار کے قریب تھی مرنے والوں میں دو ہزار تین سو ہندو اور دو سو تیرہ مسلمان تھے۔ کمپنی کے اخراجات اور آمدنی کا باہم تناسب ۲۲٫۶ رہا۔ جو نہایت کم ہے اس سال کمپنی نے اپنے حصہ داروں کو ۱۲۵ روپے فی حصہ منافع دیا اور سب ملازمین کو ایک ایک ماہ کی تنخواہ انعام میں دی۔

مندرجہ بالا اعداد و شمار سے ثابت ہوتا ہے کہ کمپنی کی پوزیشن بے حد مضبوط اور تسلی بخش ہے اور ہمیں اُمید ہے کہ یہ قومی کمپنی آئندہ سال اس سے بھی شاندار نتائج دکھائے گی۔

لاہور سیف ڈیپازٹ

آج کل کے ہراس انگیز دنوں میں جان سے زیادہ مال کا خطرہ محسوس کرنے والوں کے لئے لاہور میں ایک دور اندیش کمپنی نے لاہور سیف ڈیپازٹ کے نام سے ایک بہت بڑا اور بے حد مضبوط تہ خانہ بنوایا ہے جہاں پبلک کی قیمتی اشیاء اور کاغذ حفاظت سے رکھے جا سکتے ہیں۔ اس قلعہ نما تہ خانہ کی عمارت نہایت مضبوط ہے جس پر کسی قسم کا بیرونی صدمہ اثر نہیں کر سکتا۔ دروازے نہایت بھاری لوہے کے بنائے گئے ہیں اور اندر ہر قسم کے سیف اور تجوریاں لگی ہیں جو نہایت کم کرایہ پر پبلک کو کرایہ پر دی جاتی ہیں کرایہ دار اپنی مرضی سے دن میں جتنی مرتبہ چاہے تہ خانہ میں جا کر اپنی چیز رکھ سکتا ہے یا لے جا سکتا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس قسم کے مفید تہ خانے ہر بڑے شہر میں کھولے جائیں تاکہ لوگ رات کو چین کی نیند سو سکیں۔

لاہور سیف ڈیپازٹ مال روڈ اور میکلوڈ روڈ کے جنکشن پر ادبی دنیا کے دفتر کے پیچھے واقع ہے۔ مینجر صاحب نہایت ہوشیار اور با اخلاق ہیں اور گاہکوں کی ہر قسم کی مدد کو ہر وقت تیار رہتے ہیں۔

مینجر

بزمِ ادب

اس دفعہ ہماری بزم میں ایک نوجوان مفکر شریک ہو رہے ہیں ۔ نریندر ناتھ سیٹھ ۔ مفکر ہم نے اس لئے کہا کہ ان کی تحریر میں فکر کی پختگی اور سب عناصر پر غالب ہے ۔ نریندر صاحب نے ایک جامع مضمون ایک ایکٹ کے ڈراموں پر سپردِ قلم کیا ہے ۔ اور ڈرامے کے جدید نظریات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ مضمون اردو میں ایک ایکٹ کے ڈراموں پر غالباً سب سے پہلا مضمون ہے ۔ صاحبِ مضمون نے ایک ایکٹ کے ڈرامے کا ارتقا ایسی خوبی سے بیان کیا ہے کہ کوئی اہم بات نظرت اوجھل نہیں ہونے دی اور اس کے ساتھ وہ نہایت عمدگی سے ایسی تمام غیر ضروری تفاصیل سے اجتناب کر گئے ہیں ۔ جن سے ناظرین کی توجہ موضوع کے مرکز سے ہٹ جاتی ۔ نریندر صاحب کا یہ سلیقہ یقیناً قابلِ داد ہے ۔ انہوں نے سب سے پہلے ایک ایکٹ کے ڈرامے کے ارتقا پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی ہے ۔ اور ادب اور آرٹ میں اس کی اہمیت اور تدریجی ترقی کا جائزہ لیا ہے ۔ پھر ذرا تفصیل سے انہوں نے اس صنف کی ٹکنیک بیان فرمائی ہے اور مثالیں دے دے کر اپنے مفہوم کو واضح کیا ہے ۔

مضمون کا سب سے مفید حصّہ وہ ہے جہاں انہوں نے اردو میں ایک ایکٹ کے ڈرامے کی ممکنات پر بحث کی ہے ۔ اور اس کی مختلف صورتوں کے موجودہ رجحانات واضح کئے ہیں ۔ اس ضمن میں آج کل کے ریڈیو ڈراموں کے متعلق انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ یقیناً ہم سب کی توجہ اور غور کا مستحق ہے ۔ ہم اُن کی اس رائے سے پوری طرح متفق نہیں ہیں کہ ہمارے ہاں ایک ایکٹ کے ڈرامے کی سٹیج قائم کرنے کے قوی امکانات ہیں ۔ ہماری ناقص رائے میں ابھی ہمارے عوام اس قدر ترقی یافتہ نہیں ہوئے کہ یہ سٹیج قائم ہو کر زندہ بھی رہ سکے ۔ ابھی اس میدان میں بہت کچھ کرنا باقی ہے ۔ بہر حال ہمیں امید ہے کہ نریندر ناتھ صاحب کا یہ قیمتی مضمون نہایت دلچسپی اور توجہ سے پڑھا جائے گا ۔

دھرم پرکاش صاحب آنند جو ہندی حلقوں میں پرکاش کے نام سے معروف ہیں ۔ صحیح معنوں میں ایک ترقی پسند مصنّف ہیں ۔ اس شمارے میں آپ ان کا ایک ڈراما نما افسانہ سرآب ملاحظہ فرمائیں گے ۔ مغرب میں مختصر افسانے نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ بعض ایسے افسانے بھی لکھے گئے ہیں جن میں کوئی کردار نہیں ہے ۔ یورپین مصنفین افسانوی ادب میں نت نئی راہیں تلاش کرتے رہتے ہیں آنند صاحب کا یہ افسانہ بھی ایک اسی قسم کی کوشش ہے ۔ اسے ہم نہ تو افسانہ کہہ سکتے ہیں اور نہ ڈراما ۔ بہر حال ہے مزے کی چیز ۔ مصنّف نے فن کی کچھ حدود توڑی ضرور ہیں لیکن ان کی یہ بے راہ روی پڑھنے والے کو گراں نہیں گذرتی ۔ نفسِ مضمون کے لحاظ سے یہ ایک بہت اچھا مطالعہ ہے مگر ہماری ناچیز رائے میں جس معیاری ایکٹرلیس کو انہوں نے پیش کیا ہے وہ ابھی ایک اوسط درجے کے ہندوستانی سٹوڈیو میں ذرا دیر سے آئے گی ۔ ممکن ہے کہ آنند صاحب کا تجربہ اس کے خلاف ہو اور جس زاویے سے انہوں نے فلمی زندگی کا مطالعہ کیا ہے وہاں سے یہی کچھ نظر آتا ہو جس کی عکاسی انہوں نے سرآب میں کی ہے ۔

صلاحُ الدین احمد

(۲)

انتظار کا عالم ایک ایسی اشارتی کیفیت ہے جس میں اندیشہ ناک اور خوش کن امکانات کا انبوہِ عظیم پوشیدہ و پنہاں ہوتا ہے ۔ ایک شاعر یا عاشق عموماً اس کیفیت میں خیال کی جن پروازوں سے دو چار ہو سکتا ہے ان کا کچھ شمار ہی نہیں اور ان کی نوعیت تو ہر دم یکسر غیر متوقع رہتی ہے ۔ تسلسلِ خیال اُسے نہ جانے کہاں سے کہاں لے جاتا ہے ۔ [illegible] سامری کی نظم انتظار اس لحاظ سے قابلِ غور ہے ۔ اس نظم کے [illegible] کا کردار ہے جو شاعر سمجھئے یا کوئی عاشقِ زار ۔۔۔ انتظار کا نقشہ کھینچ رہا ہے ۔ وقتِ شام اور شام کے ساتھ ہی ملتی ہوئی [illegible] ہے جس کے متعلق شاعر فی ایک جگہ کہتا ہے کہ اُفق کی سرخ

بدلیوں پہ عکس ڈالتی ہے وہ، مجسمے بنا رہی ہے رات مل کے شام سے" — ماحول کسی گاؤں کا ہے اور مجسمے بنانے والی "شام" سے جدا ہو کر "رفتہ رفتہ رات ہوتی جا رہی ہے خوفناک" اور اس سارے ماحول پر سکوت اس شدت سے طاری ہے کہ "راستے نقوشِ رہرواں" کی گنتی میں مشغول ہیں انہیں اپنے سینوں پر چلنے والوں کے بار سے فراغت ملی ہے۔ زمین کا یہ حال ہے اور آسمان پر ستاروں نے اپنا راگ چھیڑا ہے — یہاں تک منظر کشی ہے۔ اس کے بعد تخیل کی پرواز شروع ہوتی ہے۔" ذہن میں عجیب خیالات (رہ رہ کر) آتے ہیں" کیونکہ ذہن کو تحریک دینے کے بہت سے سامان موجود ہیں "محفلِ انجم" میں "روح کا ترانہ" ہے، دور و قریب ایک مسلسل راگ چھایا ہوا ہے، "تاریکی میں اسرارِ مہیب لہراتے ہیں اور نقوشِ کارواں کو گنتے ہوئے راستے ذہن کو ماضی کی طرف لے جاتے ہیں (ان رستوں پر کون کون چل چکے ہوں گے!) ماضی وہ زمانہ ہے جب اسی گاؤں میں کبھی کبھار، عمرِ عزیز میں ایک دو بار یا شاید اکثر مہاراج ادھیراج، دیس کے ان داتا آیا کرتے تھے۔ اُن کی آمد بھی گاؤں کے لوگوں کو ایک ایسی انتظار کی کیفیت میں مبتلا کر دیتی تھی جیسی آج شاعر کے دل پر چھائی ہوئی ہے۔ مہاراج سونے کے رتھ پر سوار ہو کر آیا کرتے تھے اور گاؤں کے ساتھ ہی جو اونچا مندر ہے وہاں اُن کا دربار لگا کرتا تھا۔ گاؤں دلہن کی طرح سجایا جاتا تھا، ہر طرف چراغاں کا عالم ہوتا تھا۔ اور اُس دربار میں سب کی فریادیں سنی جایا کرتی تھیں۔ وہ زمانہ ختم ہو چکا، نہ وہ راجہ رہے نہ سونے کا رتھ نہ وہ مندر۔ آج اہلِ دیہہ کسی کے منتظر نہیں ہیں۔ لیکن شاعر کو تو آج بھی اسی طرح انتظار ہے، اس کے دل کا مندر موجود ہے، لیکن وہ جس کا منتظر ہے وہ نہیں آتا، اگر اُس کی فریاد نہیں سنتا — یہ سب کچھ بین السطور ہے) — یہاں تخیل ماضی سے مراجعت کے بعد پھر حال میں آپہنچتا ہے "ہوا کے تیز جھونکوں نے دیئے گل کر دیئے" "البتہ" اک دیا باقی ہے" شاید یہ شاعر کے دل کی اُمید کا دیا ہے۔ شاید وہ اپنے دیہاتی مکان کی دہلیز پر اب بھی کسی کی آمد کا متوقع بیٹھا ہے۔

اس نظم میں تخیل نے آسودہ نفسی کیفیتوں کے ساتھ مل کر جن اُلجھے ہوئے سروں کو چھیڑا ہے وہ اس کی سب سے اچھی زینت ہیں۔

اور چونکہ شعراء عموماً ماضی ہی کے نغمہ خواں ہوتے ہیں اس لئے ماہرالقادری بھی یہی کہتا سنائی دے رہا ہے کہ

میری راتوں کا اُجالا ہی کیا
چند تاروں سے شناسائی ہے۔

اثر لکھنوی کا بھی یہی حال ہے۔ وہ بھی کہہ رہا ہے کہ خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا — اُسے بھی کل کی حقیقت ہی متوجہ کئے ہوئے ہے جو آج افسانہ نظر آتی ہے۔ یہ افسانہ ایک سراپا کی یاد ہے۔ اس کا قصہ ماحول اور دوسری متعلقہ باتیں صرف ذیلی حیثیت رکھتی ہیں۔ ایک تشبیہہ دیکھئے۔

آنکھوں میں کاجل پھیلا پھیلا — یا پی پی کے کنول رس، بھنورا
رات گئے کچھ اُڑنے ہی کو تھا — پلکوں نے لیکن جال میں پھانسا

آنکھوں کی سیاہی اور سفیدی کو کس خوبی سے جتایا ہے اور جو گداز اُن آنکھوں میں تھا وہی اس تشبیہہ میں بھی ہے۔

احمد ندیم قاسمی بھی "بانسری کی دُھن" سے تحریک لیتا ہے اور ماضی کے چند خوش کن لمحوں کی یاد اُسے آ جاتی ہے اور اُس کے ذہن میں وہ مناظر جاگ اُٹھتے ہیں کہ "محتسب کی روح جن کی تاب نہیں لا سکتی" — اور اس یاد کی شدت اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ بانسری والے کو رکنے کے لئے کہتا ہے — لیکن شاعر کے ذہن کو گریز کی ضرورت تھی اور وہ اُسے ماضی کی یاد سے حاصل ہو گیا۔

اس شمارے کے یہ تمام شعراء جن کا ذکر اوپر آیا ہے حال سے مطمئن نہیں ہیں، وہ اس موجودہ حالت سے رہائی چاہتے ہیں اور اس لئے ماضی کی طرف رجوع ہوتے ہیں کہ ماضی کی بہت سی باتیں انہیں معلوم ہیں۔ اگر انہیں مستقبل کے حالات معلوم ہوتے تو وہ آئندہ زمانے کی طرف بھی پلٹا کھا سکتے تھے۔ لیکن یہ بات نہیں ہو سکتی۔ موجودہ دور کے "انقلابی" شعرا بھی "حال" سے مطمئن نہیں لیکن وہ ماضی کی بجائے اس زمانے میں گریز کے جویاں ہیں جب دنیا کے تختے پر انسان نہ رہیں گے بلکہ ہر طرف مزدور ہی مزدور نظر آئیں گے۔ وہ زمانہ یقینی نہیں اسی لئے اُن کی شاعری میں احساس و جذبات کی وہ شدت اور حقیقی رنگ موجود نہیں ہوتا جو اُن شعراء کے کلام میں نظر آتا ہے جو ماضی کی طرف گریز کرتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ دونوں گروہ انقلابی ہیں۔ حال سے بھاگنا چاہتے ہیں لیکن ایک اپنے فرار کی بنیاد ماضی کی حقیقت پر رکھتا ہے اور دوسرا گروہ مستقبل کے تخیل پر۔

میراجی

آئینۂ عالم

سائنس، جنگ اور امن عالم

اس مادی زمانے میں سائنس کے علم کا تصور بھی ہمارے ذہنوں میں مادی ہوکر رہ گیا ہے۔ ہم میں سے اکثر یہی سمجھتے ہیں کہ سائنس چیزوں کو بنانے کا دوسرا نام ہے اور یہی وجہ ہے کہ جب ہمیں امن کی باتیں دکھائی دیں تو ہم سائنس کی تعریف کرتے ہیں اور جب بدامنی اور جنگ وجدال کا دور دورہ ہو تو اسی علم کو گالیاں دینے لگتے ہیں۔ ریل گاڑیوں اور ہوائی جہاز کی سیر کرکے، سینما میں بیٹھ کر، ریڈیو سُن کر، ہسپتالوں سے شفا حاصل کرکے، اور بجلی کے پنکھوں کی ہوا اور برقی روشنی کا لطف لے کر ہم سائنس کے معترف بن جاتے ہیں۔ لیکن جب ہم بم اور گیس کی تباہ کاریوں کا حال سنتے ہیں تو سائنس کے مخالفوں میں ہم سے برتر درجہ کوئی نہیں رکھتا۔

لیکن سائنس ایک ایسا مداری ہے جس کے تھیلے میں دونوں قسم کی چیزیں ہیں، اچھی بھی اور بری بھی۔ یہ مداری اپنے تھیلے ہی سے پھول پودے اُگا کر بھی ہمیں دکھا سکتا ہے اور اُسی تھیلے میں سے اُس افعی کو بھی نکال سکتا ہے جو اگر چھوٹ جائے تو ہماری زندگی کے خاتمے کا باعث ہو۔

سائنس سے ہمیں اس لئے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں ہے کہ ہماری زندگی میں کوئی خاص فرق اس کے کرشموں سے نہیں پڑتا۔ پہلے جولاہے بہتر سے بہتر کپڑا بناتے تھے اب مل کی مشینیں یہ کام کرتی ہیں۔ کپڑا ہمیں تب بھی مل سکتا تھا اور اب بھی مل سکتا ہے۔ فائدہ صرف وقت کی بچت کا ہوا۔ بلکہ وہ بھی ایک طرح کا نقصان ہی ہے۔ پہلے ہم کپڑا بنانے میں کافی دیر تک مصروف رہتے تھے اور مصروفیت ہمیں ماحول سے بیزار نہ ہونے دیتی تھی۔ اب مل سے بنا بنایا کپڑا آجاتا ہے اور اس طرح جو وقت بچتا ہے اُس میں ہمیں کسی اور مشغلے کی تلاش کی کوفت اُٹھانا پڑتی ہے ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ سائنس نے ہمارے سامنے نئے مقاصد پیش نہیں کئے ہمارے دلوں میں نئی اُمنگیں نہیں پیدا کیں، ہماری نظروں کے سامنے ایک ایسی نئی دنیا لاکر نہیں کھڑی کر دی جس کے سمجھنے اور جس کی چھان بین میں ہم دلچسپی محسوس کرسکیں۔

لیکن اگر ہم ذرا بھی حالات کو سطح سے نیچے جاکر دیکھنے کی کوشش کریں۔ تو ہمیں معلوم ہوگا کہ یہی کام سائنس کر رہی ہے اور آج سے بہت عرصہ پیشتر دُوربین سائنسدان جانتے تھے کہ یہ علم ہمیں ایک نئی دنیا میں لے جائے گا۔ گذشتہ صدی کے عالی مرتبت ماہر حیاتیات ٹی ایچ ہکسلے نے ایک جگہ کہا تھا کہ میرے زمانے میں سائنس نے جو انقلاب خارجی دنیا میں پیدا کیا ہے اس سے کہیں بڑا انقلاب آئندہ صدی میں اُن علوم سے پیدا ہوگا جن کے عمل کا تعلق براہِ راست انسان اور اُس کے ذہن سے ہوگا اور یہ شاندار پیش گوئی آج پوری ہوتی دکھائی دے رہی ہے۔ علم حیاتیات کی وجہ سے ہماری زندگی کافی حد تک بدل چکی ہے حیاتیاتی تحقیق نے ظاہر کر دیا ہے کہ ہم آج تک پورے طور پر زندگی ہی نہیں بسر کرتے رہے اور جس طرح کم روشن چراغ کے اُجالے کو تیل کے اضافے سے زیادہ روشن کیا جاسکتا ہے اُسی طرح بعض غدودوں کی تحریک سے ہمارے ذہنوں اور جسموں کے اُن حصوں میں ایک نئی روح پھونکی جاسکتی ہے جو آج تک بالکل بیکار پڑے رہے ہیں جن میں اکثر زندگی کی رمق دکھائی ہی نہیں دیتی۔

لیکن یہ غدودوں والا معاملہ ذرا ٹیڑھا اور خطرناک معلوم ہوتا ہے۔ اچھی بات! اپریشن سے ڈر معلوم ہوتا ہو تو اسے جانے دیجئے۔ سائنس نے آسان طریقے بھی دریافت کئے ہیں۔ آپ اپنے کھانے پینے کی چیزوں میں ایک خاص تبدیلی پیدا کیجئے۔ بعض چیزیں زیادہ کھائیے، بعض کم کھائیے، اور بعض کو منہ تک نہ لگائیے اور پھر دیکھئے کہ دسترخوان کے یہ معمولی سے قواعد وضوابط کس قدر حیات افروز ثابت ہوتے ہیں۔ جب سے سائنس نے جسم کے بعض غدودوں سے کھانے پینے کی چیزوں کے حیاتین کے تعلق کا تجزیہ کیا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج تک ہم کھانا بھی نہ جانتے تھے۔ یوں کھانے کو ہم اتنا کھا لیتے تھے کہ پیٹ پھٹنے کو آئے، یوں کھانے کو ہم گندم اور گوشت سے لے کر انگور دودھ اور سیب تک ہر چیز کھا لیتے

تھے لیکن اس کے باوجود ہماری حالت فاقہ کشوں کی سی تھی۔

ایک مثال لیجئے۔ سائنس نے ہمیں بتایا ہے کہ ہمارے بلغمی غدودوں کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک حصہ ہم میں ہمسعانہ طاقت پیدا کرتا ہے اور دوسرا حصہ ہمیں مرد مہری کے ساتھ متجسس ہونے کی تحریک دیتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ یہ دونوں حصے ہماری خوراک میں سے مختلف اجزا کو استعمال کرتے ہیں۔ اس علم کی بنا پر ہم اپنی احساساتی زندگی کو ایک خاص نظام کے ماتحت لا سکتے ہیں۔ آج ہمیں کسی کی عیادت کے لئے جانا ہے، الماری کے طاق سے ایک شیشی لی، چائے کی پیالی میں چند قطرے ڈالے اور تمام دن کے لئے ہمارا اندازِ نظر اور رجحانِ ذہنی ہمدردانہ ہو گیا۔ کل کسی لیڈر کو جلسے میں پہنچ کر دھواں دھار تقریر کے ذریعہ سے کسی کی مخالفت کرنی ہے، ایک دوسری شیشی لی، چند قطرے پیئے اور جلسے میں پہنچ کر مخالفوں کی وہ دھجیاں بکھیریں کہ حاضرینِ جلسہ عش عش کر اُٹھے۔

لیکن حیاتیات اور حیاتیاتی کیمیا بھی بالواسطہ علوم ہیں۔ وہ ہماری بعض کلوں کو مروڑ دیتے ہیں اور کچھ عرصے کے بعد ہم اپنے میں ایک تبدیلی پانے لگتے ہیں، لیکن اس میں دو اور دو چار قسم کے کوئی اصول ہمیں نہیں معلوم ہیں۔ ہمیں اپنے میں ہونے والی تبدیلی کا درجہ شدت اور نوعیت نہیں معلوم ہو سکتی۔ لیکن ایسے علوم بھی ہیں جن کی کارفرمائی ہمارے ذہن اور شعور کی تفہیم اور عمل کے سلسلے میں براہِ راست ہے۔ یہ علوم ہمیں حقیقتاً بدل کر رکھ دیں گے، ہماری اہلیتوں کو وسعت دیں گے، ہمارے دائرۂ نظر کو بڑھائیں گے، اور یوں ہمارے گرد و پیش کی دنیا کو بدل دیں گے، اور ہمیں وہ طاقت عطا کریں گے جس سے ہم آئندہ از سرِ نو اس بدلی ہوئی دنیا کو بدل سکیں گے۔

اگرچہ بہت سے لوگوں کو اس بات کا احساس نہیں ہوا ہے لیکن یہ ایک آنے والی حقیقت ہے کہ سائنس عنقریب ہمارے ماحول میں ایک زبردست انقلاب پیدا کرنے کو ہے جس سے نہ صرف ہمارے حالات بدل جائیں گے بلکہ ہماری ہستی ہی ایک نئی صورت اختیار کرلیگی۔

لیکن ایسا انقلاب لانے والے وہ علوم آخر ہیں کون سے؟ اگر آپ مذاق نہ سمجھیں تو میں کہوں کہ یہ علوم ہیں معاشیات اور اجتماعی نفسیات۔ یہ نام ادق ہیں اور ایک عام انسان کے لئے لق و دق صحرا کی سی کیفیت رکھتے ہیں۔ لیکن معاشیات اُس علم کا نام ہے جس کے ذریعے سے ہم لوگوں کے اجتماعی چلن کا مطالعہ اور تجزیہ کر سکتے ہیں۔

انیسویں صدی کے آغاز سے ہی کرۂ ارض کے مختلف حصوں میں چند بہت ہی عجیب باتیں رونما ہوئی ہیں۔ آج تک ماہرین کو علم کے کسی شعبے میں ایسے مشاہدات کے مطالعے کا موقعہ نہیں میسر آیا۔ یہ عجیب باتیں سماجی حیثیت رکھتی ہیں۔ یعنی اجتماعی ہنگامے ہیں۔ گذشتہ جنگِ عظیم کے بعد سے جو تحریکیں یورپ میں بادِ سموم کی طرح چھا گئی ہیں۔ اُن کی پیشگوئی کا شرف کسی کو حاصل نہ ہو سکا۔ جس طرح آسمان پر اچانک کوئی ستارہ ٹوٹتا ہے اُسی طرح یہ تحریکیں بھی ذہنِ انسانی کے اُفق پر یکدم نمودار ہوئی ہیں لوگوں کو اشتراکی تحریک کے انقلاب کی توقع تو تھی، لیکن اشتراکی تحریک صرف شروع شروع میں ہی جاذبِ توجہ رہی۔ اس کے علاوہ روس کی پہلی حالت تو ایسی تھی گویا وہاں کوئی نعدد دار حکومت قائم ہی نہ ہوا اور اس لئے اشتراکیت کو اپنے سامنے جیتنے کے لئے تقریباً ایک کھلا میدان مل گیا۔ البتہ اشتراکیت کے زور شور کے بعد چند ایسی نئی باتیں ہوئیں جن کی پیش گوئی اگر کوئی شخص پہلے کرتا تو اُس کے کہنے کا کسی کو یقین ہی نہ آتا۔ پہلے مسولینی نے اطالیہ میں اپنا کمال دکھایا، پھر ہر یموٹے ہسپانیہ میں تاریخ کے ایک ایسے باب کا آغاز کیا جو ابھی تک اپنے منطقی انجام کو نہیں پہنچا اور ان کے بعد المانیہ میں نازیوں کی کارگذاری نے تو ایک عالم کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔

سائنس کو پسند اور ناپسند سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مندرجہ بالا حقائق روزِ روشن کی حیثیت رکھتے ہیں خواہ یہ خوشگوار ہوں خواہ تلخ۔ اور سائنس کا کام اُنہیں سمجھنے کی کوشش کرنا ہے۔ ان بڑی سیاسی تحریکوں کے علاوہ ذہنِ انسانی کو بعض دوسری باتوں سے بھی دوچار ہونا پڑا ہے جن میں سے صرف ایک مثال کافی ہوگی۔ تحریکِ عریانی۔

سائنس کا کام نہ صرف پریشان کن مشاہدات کا پرسکون مطالعہ ہے بلکہ یہ بھی اُس کے فرائض میں داخل ہے کہ فعل و عمل کے گرد و غبار سے اصلیت اور اُس کے متعلقات پر جو پردہ پڑ جائے اُسے بھی وہ اُٹھانے کی کوشش کرے۔ ایک ماہرِ معاشیات کے لئے ان تمام تحریکوں میں ایک بات یکساں ہے، اور اُس کی نظروں میں ان تمام شاخوں کی ایک ہی زبردست جڑ ہے اور وہ ایک بات اس قدر اہم ہے کہ اُس کے سامنے تمام سطحی اختلافات ـــــ مثلاً یہ کہ ان تحریکوں کے پیرو ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں اور باہم دگر کوئی مماثلت نہیں پاتے ـــــ کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ وہ مماثلت یہ ہے کہ ان تمام تحریکوں کے پیرو ایک زبردست تگ و دو میں مصروف ہیں اور اس تگ و دو میں یہ تمام کامیاب ہیں خواہ وہ اس کامیابی کے باوجود جن مقاصد کو پیشِ نظر رکھ کر چلے تھے اُنہیں حاصل نہ کر سکے ہوں۔ آپ پوچھیں گے کہ وہ تگ و دو کس بات کی ہے۔ سنئے۔ وہ تگ و دو ہے شعورِ نفس سے رہائی حاصل کرنے کی۔

فاشیت کے علم برداروں کو سیاہ قمیص پسند ہے۔ نازی کو ہٹلر سے محبت اور یہودی سے نفرت ہے اور تحریکِ عریانی کا پیرو اُس جامے کو حاصل دنیا

ودیں سمجھتا ہے جس کا اُلٹا سیدھا ہی آج تک دریافت نہیں ہو سکا۔ یہ تمام لوگ ایک ہی کپڑے کے مختلف رنگ ہیں جس کا تار و پود ایک ہے۔ صرف ظاہری جھلکیاں اختلاف کا اظہار کرتی ہیں۔ یہ گروہ ایک زمانے کے انجام کا اشارہ کر رہی ہیں۔ ایک دور کے گذر جانے کا نشان ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز ہی سے ذہن انسانی میں ایک زلزلہ سا آ رہا ہے اور ہم اُس زلزلے کے تماشائی ہیں۔ ہماری نگاہوں کے سامنے ہی ہماری فطرت میں ایک تبدیلی رونما ہو رہی ہے۔ آج تک پڑھے لکھے اور روشن خیال لوگ کسی غیر مدلل یا نامعقول بات کے ارتکاب سے گھبراتے اور شرماتے تھے۔ لیکن اب وہ گھبراہٹ اور وہ شرم مٹ چکی ہے۔ گویا دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ تحت الشعور، شعور پر غالب آ چکا ہے۔ بہت سے تعلیم یافتہ لوگ اور اکثر سائنس دان یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ تبدیلی انسانیت کے لئے ایک تباہی ہے وہ سمجھتے ہیں کہ اس تبدیلی سے سائنس اور تہذیب و تمدن کا خاتمہ ہو جائے گا۔

لیکن کیا واقعی خاتمہ ہو جائے گا؟ کیا اس طرح خاتمہ ہو بھی سکتا ہے؟ سب سے پہلے ہمیں اس بات کو یاد کرنا چاہیئے کہ یہ سائنس ہی تھی جس نے تحت الشعور کے دبے ہوئے جزیرے کو ذہن انسانی کے سمندر سے نکال کر لوگوں کو اس کا احساس دلایا تھا۔ ابھی ہمارے ڈکٹیٹروں نے اس کا نام بھی نہ سُنا تھا، ابھی اُنہوں نے اس کی طاقتوں کو اپنے لئے مفیدِ مطلب نہ بنایا تھا کہ سائنس دانوں نے تحت الشعور کو دریافت کیا۔ اس کے علاوہ ماہرینِ سائنس کو حاکموں اور سیاست دانوں سے پہلے اس بات کا احساس تھا کہ تحت الشعور کی دریافت ایک ضروری چیز ہے۔ کیونکہ زندگی کے عملی پہلو پر نظر رکھتے ہوئے یہ بات صاف ظاہر تھی کہ جب تک ذہن انسانی پر قابو پانے کے طریقے دریافت نہ کر لئے جائیں گے، انسان سائنس کی عطا کردہ غیر معمولی طاقتوں کو آسانی سے ہضم نہ کر سکے گا۔ گویا انسانیت کی گاڑی کو بریک کی ضرورت تھی اور ماہرینِ علم و فن کو اس کا احساس تھا۔ اور اسی طرح نفسی پہلو پر نگاہ ڈالتے ہوئے سائنس کو یہ معلوم ہوا کہ وہ تحت الشعور کی کس قدر محتاج ہے اور اُس نے یہ بھی جانا کہ اس محتاجی کے بغیر یعنی تحت الشعور کی خفیہ طاقتوں سے مدد لئے بغیر اُس کی اپنی ہستی کے مٹ جانے کا امکان ہے۔

سائنس دان یہ سمجھتے تھے کہ ہر بات کا تجزیہ کرنے ہی سے جانچ پڑتال ہو سکتی ہے۔ ایک چیز کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے ہی سے حقائق ایک نئے قانون کی روشنی میں دکھائی دینے لگتے ہیں۔ لیکن جب اُنہوں نے سوچ بچار اور ذہنی حرکات کے متعلق سوچا تو اُنہیں معلوم ہوا کہ یہ طریقہ کچھ صحیح نہیں دکھائی دیتا۔ سائنٹیفک سوچ بچار کا ایک تحت الشعوری پہلو بھی ہے۔ اور یہی وہ تاریک خطہ ہے جو بعض اوقات حیرت ناک سحرکاریوں کا موجب بنتا ہے۔ کئی بار ایسا ہوا ہے کہ کوئی مشہور حساب دان یا ماہرِ سائنس کسی مسئلے کو سوچ سوچ کر عاجز آ گیا اور اُس نے سوچنے ہی سے ہاتھ اُٹھا لیا۔ لیکن بعد میں اچانک اُس مسئلے کا حل اُس کے تحت الشعور سے انگڑائی لے کر اُٹھا اور ایک پل میں ساری مشکل دور ہو گئی۔ گویا اس طرح سائنس بھی آرٹ اور ادب کی طرح تخلیقی خصوصیات رکھتی ہے اب وہ تحقیق جس کی بنیاد صرف حقائق پر ہوگی۔ اس قدر مفید ثابت نہیں ہو سکے گی جس قدر کہ تخلیقی تحقیق۔

اس سلسلے میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ جرمنی کے باشندے اپنی سائنٹیفک تحقیقات میں بغیر سوچے سمجھے ہوئے حقائق کے اجتماع پر ہی زور دیتے رہے ہیں، لیکن یہی لوگ ہیں جنہیں اصولوں پر اس قدر اندھا دھند اعتقاد ہے کہ وہ اپنے اس ردِ عمل میں سائنٹیفک دلیل و برہان کے قائل ہی نہیں رہتے۔

ہم اس وقت ایک زبردست ہنگامہ پرور دور سے گذر رہے ہیں ہمارے سامنے ذہن کا ایک نیا حصہ نمودار ہو رہا ہے۔ لیکن اگر اس نمود کے ہنگامے سے ہم عہدہ برآ ہو گئے تو ہم ایک نئی دنیا میں جا پہنچیں گے، جہاں نئے خیالات ہونگے نیا اندازِ نظر اور نئی طاقتیں۔ اب تک گویا یہ کیفیت تھی کہ ہم خیالات کو سطح آب پر پھینک دیتے تھے، وہ لہروں کے نیچے ڈوب جاتے تھے اور ہم اُن کے از سرِ نو نمودار ہونے کا انتظار کھینچتے تھے۔ اب ہم آپ بھی اُن خیالوں کے ساتھ ہی ساتھ اس تمام عمل کا جائزہ لے سکیں گے۔

لیکن لوگوں میں آسانی سے بھڑک اُٹھنے والی ایک خصوصیت پیدا ہو چکی ہے کیا اس کی وجہ سے جنگیں نہ ہونے لگیں گی اور اُن جنگوں سے ذہنی ترقی کے اس میدان میں ہماری تمام کارگذاری ملیامیٹ نہ ہو جائے گی؟ — اس سوال سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ابھی تک ہم نے اُس انقلاب کی اہمیت ہی کو پورے طور پر نہیں سمجھا ہے جو تحت الشعور کی دریافت سے ہماری ذہنی زندگی میں آ چکا ہے۔ تحت الشعور کی دریافت ایک ایسی زبردست حقیقت ہے کہ اگر جنگوں پر جنگیں ہونے بھی لگیں۔ تو اُن کی باہمی نوعیت اس قدر مختلف ہوگی کہ ہم اُنہیں دیکھ کر یہ نہ کہہ سکیں گے۔ کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔

اُن جنگوں میں تشدد ہوگا لیکن تشدد میں بھی زبردست انقلاب آ جائے گا۔ کیونکہ اب اپنی بات منوانے کا ایک بالکل نیا طریقہ دریافت ہو چکا ہے اور یہ طریقہ اس قدر نیا اور کارگر ہے کہ اس کے سامنے پہلی جنگوں کا تشدد بالکل بے اثر اور بے معنی سی چیز معلوم ہوتا ہے۔ جنگ کے پرانے طریقوں کے ہیبت ناک انجام سے تو اُس کیفیت کے پیدا ہونے کا خطرہ ہوتا ہے کہ جنگ

کے بعد نہ تو من تیل ہوگا اور نہ امن و تہذیب کی راہ ہا نچ سکے گی۔ لیکن اس نئے طریقے سے تیل کی ایک بوند بھی ضائع نہیں ہونے پائے گی۔ اس کے ساتھ ہی یہ نیا طریقہ اس قدر زوردار اور مؤثر ہے کہ اگر اسے تشدد کی بجائے استعمال کیا گیا تو اس کے نتائج جسمانی تشدد سے بھی کہیں زیادہ بُرے ہوں گے۔

بعض لوگوں نے ایک بے معنی سی اصطلاح بنا رکھی ہے۔ براہِ راست عمل۔ اور اس سے وہ جسمانی تشدد کا مفہوم لیتے ہیں۔ یعنی جسمانی تشدد ایک براہِ راست عمل ہے۔ لیکن یہ لفظوں کا غلط استعمال ہے کیونکہ جسمانی تشدد تو ایک بالواسطہ عمل ہے۔ باپ بچے کو چھڑی سے پیٹتا ہے یا صرف دھمکی دیتا ہے اور بچہ اُس کے کہنے پر چلتا ہے۔ یہ بچے کو اپنی مرضی کے مطابق عمل کرنے پر مجبور کرنے کا طریقہ بالواسطہ عمل ہے۔ اصلی براہِ راست عمل وہی عمل ہے جس کے ذریعے سے ہم کسی کی قوتِ ارادی پر حملہ کریں اور اس کی سب سے مکمل صورت ہپناٹزم ہے۔ اس حالت میں قوتِ ارادی بے کار ہو جاتی ہے اور جسم مدافعت نہیں کر سکتا۔

جرمنی میں یہی کچھ ہو رہا ہے بلکہ کافی سے زیادہ حد تک ہو چکا ہے اور اُن دوسرے ممالک میں بھی یہی کچھ ہو رہا ہے جہاں خیالات کو منوانے کا ذریعہ پروپاگنڈا کو بنایا گیا ہے۔ پروپاگنڈا قوتِ ارادی پر براہ راست عمل ہے۔ اُن ممالک کے افراد کی بھی بالکل ایسی ہی کیفیت ہے جیسی اُن ملکوں کی جو ابھی جہالت کے دام میں گرفتار ہیں، جہاں بربریت کا دَور دَورہ ہے اُن ممالک میں کوئی شخص اس کا خیال تک نہیں کر سکتا کہ وہ روایات کے بندھن سے رہائی حاصل کر سکے۔ لیکن یورپ کی موجودہ کیفیت بربریت کی نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک انوکھی طاقت کی نمودِ ثانی ہے جس کے بغیر تہذیب و تمدن اور سائنس کا کاروبار چل ہی نہیں سکتا۔ ایک ایسی طاقت کی نمودِ ثانی جس پر صرف سائنس ہی قابو پا سکتی ہے اور اُسے مفید اور تخلیقی بنا سکتی ہے۔

اس نئی طاقت کی وجہ سے سائنس ترقی کے راستے میں ایک ایسا قدم اُٹھائے گی جو اُس کی پہلی تمام فتوحات کو ہماری نگاہوں میں ہیچ بنا دے گا۔ اب تک چند ضروری باتیں سائنس کو حاصل نہ تھیں، لیکن اب وہ حاصل ہو چکی ہیں۔ یہ باتیں تین ہیں۔

فرد میں اُس کی قوتِ ارادی پر قابو پانے کی طاقت پیدا کی جائے تاکہ وہ اپنے افعال کا ارتکاب ایک مکمل ذمہ داری کے ساتھ کرے۔

فرد کو اپنے جسم پر قابو پانے کی طاقت دی جائے، تاکہ وہ اپنے آپ پر شعور کے ساتھ وہ اثرات ڈالے جو آج اُس پر ہپناٹزم کے ذریعے سے ڈالے جا رہے ہیں۔

اور تیسرے سائنس کو ایک ایسی طاقت عطا کی جائے جس کے ذریعے سے وہ اپنی پہلی حالت کو بدل کر ایک حقیقی سائنس بن جائے۔ اور شعور کے ساتھ مکمل طور پر نئی باتیں دریافت اور ایجاد کرے۔

اس وقت تمام دنیا اور خصوصاً یورپ میں جو ہنگامہ برپا ہے یہ سائنس کے لئے ایک سنہری موقع ہے کہ وہ ایک ایسی جیت حاصل کرے جس کی بدولت نااہلوں پر قابو پایا جا سکے۔

سائنس کو اس کارِ عظیم میں جیت کی اُمید ہے اور ہمیں بھی سائنس پر بھروسہ ہے۔

بسنت سہائے

دو نظمیں

محبّت

میری محبت تیری محبت ہیں یہ دو معصوم فرشتے
بھولے بھولے پیارے پیارے سندر صورت موہن مکھڑے
بوئے گُل کی صورت ہر سو بھرتے ہیں گلشن میں طرارے

خواہش

میری خواہش، تیری خواہش دونوں زبانیں، دونوں شعلے
آگ کے شعلے، برق کے پارے ہر سو اُٹھتے، ہر سُو گرتے
دور خموشی ان سے کوسوں
اونچا روتے، اونچا ہنستے

مسعود شاہد

دو غزلیں

مرا شوقِ دیدار، پھر جوش پر ہے
یہاں سے وہاں تک نظر ہی نظر ہے

خدا کے لئے، اک ذرا مُسکرا دو
شبِ غم کو پھر انتظارِ سحر ہے

مرے ذوقِ سجدہ کا عالم نہ پوچھو
نظر آسماں پر، جبیں خاک پر ہے

اِدھر آرزوئیں، اُدھر آرزوئیں
جوانی کی منزل بہت پُر خطر ہے

زباں پر مری آ کے جو رُک گیا تھا
وہ افسانہ اب کو بکو دربدر ہے

مرے حال پر اور اتنی نوازش!
وہ کیوں مہرباں ہیں خدا کو خبر ہے

جو چمکی تھی فاران کی چوٹیوں پر
وہ برقِ صفا آج تک جلوہ گر ہے

تمہاری عنایت سے ناشاد ماہر
شہیدِ تبسم قتیلِ نظر ہے

کس قیامت کی گھٹا چھائی ہے
دل کی ہر چوٹ اُبھر آئی ہے

میں ترے حُسنِ تصور کے نثار
ہر جگہ انجمن آرائی ہے

آج ایک ایک سرشکِ خوں میں
دل کی تصویر اُتر آئی ہے

درد بدنام، تمنا رسوا
عشق رُسوائی ہی رُسوائی ہے

اُس نے پھر یاد کیا ہے شاید
دل دھڑکنے کی صدا آئی ہے

میں ہوں اور کشمکشِ دردِ فراق
وہ ہیں اور ذوقِ خود آرائی ہے

زلف و رخسار کا منظر، توبہ!
شام اور صبح کی یکجائی ہے

ہم سے چھُپ چھُپ کے سنورنے والے
چشمِ آئینہ تماشائی ہے

دل تمنا سے ہے یکسر بیزار
ٹھوکریں کھا کے سمجھ آئی ہے

حُسن و مستی کو جُدا کون کرے!
تُو ہے یا یہ تری انگڑائی ہے

میری راتوں کا اُجالا ہی کیا!
چند تاروں سے شناسائی ہے

تم سے ماہر کو نہیں کوئی گلہ
اُس نے قسمت ہی بُری پائی ہے

ماہر القادری

انتظار

رفتہ رفتہ رات ہوتی جا رہی ہے خوفناک
دور تاریکی میں لہراتے ہیں اسرارِ مہیب
راستے چپ چاپ گنتے ہیں نقوشِ رہرواں
اک مسلسل راگ سے معمور ہیں دور و قریب
محفلِ انجم میں چھڑتا ہے ترانہ روح کا
ذہن میں آتے ہیں رہ رہ کر خیالاتِ عجیب

لوگ کہتے تھے کہ آج آئے گا اپنا بادشاہ
اپنے شاہی طنطنے سے سونے کے رتھ پر سوار
اونچے مندر میں لگے گا ایک دربارِ عظیم
جس جگہ سب کی سنی جائے گی فریاد اور پکار
سب نے بستی کو سجایا اور دئیے روشن کئے
میں نے مندر کو کیا فردوس کا آئینہ دار

راہ تکتے تکتے آخر سو گئے سب اہلِ دِہ
اور ہوا کے تند جھونکوں نے دئیے گل کر دئیے
میری آنکھوں کی طرح ہے نور فرسا لیں ہوئیں
اک دیا باقی ہے اپنی ہلکی ہلکی ضو لئے
آہ ایسی تیرگی اور یہیں سراپا انتظار
بیٹھا ہوں دروازے پر دل کو قتیلِ غم کئے

تاجور سامری

ایک ایکٹ کے ڈرامے

ڈرامانگاری ایک قدیم فن ہے اور سماجی اور تمدنی ماحول کے مطابق اس فن میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ دنیا کے ہر تمدن میں عبرت ونصیحت اور تفریح و تسکین کے لئے ہمیشہ سے قصّوں حکایتوں اور ڈراموں کے کہنے سننے اور دیکھنے کا رواج رہا ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف تمدنوں میں ان چیزوں نے بھی مختلف صورتیں اختیار کیں۔ موجودہ مشینی معاشرت کے تمدن میں افسانہ نویسی اور چھوٹے چھوٹے ڈرامے لکھنے کا رواج زوروں پر ہوا۔ کیونکہ موجودہ مشینی معاشرت میں عوام الناس کو اپنا بیشتر وقت زندگی کی ضروریات حاصل کرنے میں صرف کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے اُن کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ تفریح طبع کے لئے لمبے لمبے ناول پڑھیں یا ساری رات ڈراما دیکھ کر صبح کو پھر روزانہ محنت و مشقت میں مصروف ہو جائیں۔ انہیں تو تازہ دم ہونے کے لئے روزمرّہ کی مشقت کی زندگی میں تفریح کے چند چھینٹے چاہئیں۔

ایک ایکٹ کے ڈرامے کو بھی موجودہ سماجی ماحول میں ہی فروغ حاصل ہوا اور تھوڑے ہی عرصے میں ادب کی اس صنف نے مغربی دنیا میں عام قبولیّت حاصل کرلی۔ شروع شروع میں تو ایک ایکٹ کے ڈرامے یورپ میں انگلستان کو چھوڑ کر دوسرے ملکوں میں زیادہ کامیاب ہوئے۔ لیکن بعد ازاں انگلینڈ کی سٹیج پر بھی ایک لمبے ڈرامے کی بجائے دو تین ایک ایکٹ کے ڈرامے کھیلے جانے لگے۔ موجودہ معاشرت میں ادب بھی ایک تجارتی جنس ہے۔ جس کی تخلیق یا تخریب مانگ کے بڑھنے یا گھٹنے پر مبنی ہے اور ادب کی کسی شق کے مستقبل کے متعلق رائے قائم کرنے کے لئے اقتصادیات کے اصولوں کو بھی مدنظر رکھنا پڑتا ہے۔ ان اصولوں کے تحت یہ یقینی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ ایک ایکٹ کے ڈراموں کا مستقبل نہایت روشن اور شاندار ہے۔ یہاں تک کہ افسانوی ادب سے بھی زیادہ۔

اس سائنس اور یکسانیت کی تہذیب نے فنونِ لطیفہ کے پردے میں بہت سی دلچسپیوں کا اضافہ کر دیا ہے۔ ہر جا انسانوں کی جگہ مشینوں نے لے لی ہے۔ پہلے ہم انسانی گانا سنا کرتے تھے۔ اب مشینی گانا سنتے ہیں۔ پہلے ہم سٹیج پر زندہ انسانی ایکٹروں کے تماشے دیکھا کرتے تھے۔ اب ان کی جگہ فلم کا مسالے سے بنا ہوا جادو پردہ سیمیں پر موجود ہے لیکن سائنس کی ان تمام ایجادات یعنی گراموفون فلمیں۔ ریڈیو وغیرہ کے باوجود انسان اپنی فطرت کو نہیں دبا سکتا۔ ان سب کے باوجود فن کو اُس کے اصلی انسانی رنگ میں دیکھنا چاہتا ہے۔ آج بھی اگر کوئی مشہور اداکار اپنے فن کی نمائش کے لئے سٹیج پر آئے اور اُس کے مقابلے میں کوئی بہترین فلم دکھائی جائے تو لوگوں کا رجحان زیادہ تر اداکار کی طرف ہی ہوگا۔[۵] اس کے علاوہ اگر کوئی مشہور فلمی اداکار سٹیج پر آکر لیکچر یا گانا یا ناچ سنائے یا دکھائے تو اُس کے سننے یا دیکھنے کے لئے لوگوں میں ازحد اشتیاق پایا جاتا ہے۔ لیلا ڈیسائی سٹیج پر زیادہ جاذب ہے۔ بہ نسبت "کپال کنڈلا" فلم کے دیکھنے سے تو فلم میں بھی اداکار انسان ہی دکھائی دیتے ہیں لیکن مشین پر آنے سے اُن کا اصل انسانی پہلو تلف ہو جاتا ہے فلم میں ڈرامائی فن چاہے اپنے کمال پر کیوں نہ پہنچ جائے وہ اس خوبی سے انسانی کیفیتوں کو بیان نہیں کرسکتا جس طرح ایک انسانی کردار اپنے اصل روپ میں۔ وہ نفسیاتی رابطہ وہ روحانی اور رومانوی شرکت جو ایک ایکٹر اور اس کے سامعین میں ہونی لازمی ہے مفقود ہو جاتی ہے۔ اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ جس طرح فوٹوگرافی کے باوجود فنِ مصوّری زندہ ہے۔ اسی طرح اس مشینی تفریح اور مشینی فن کے باوجود ڈرامانگاری اور اس کے لئے سٹیج بھی زندہ رہے گی۔ بلکہ میرا تو یہ خیال ہے کہ سائنس کی ترقی کے ساتھ ساتھ ایک ایکٹ کے ڈراموں کو زیادہ توسیع حاصل ہوگی۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے لئے ایک اور جگہ پیدا ہو رہی ہے یہ نیا میدان ریڈیو ہے۔ ریڈیائی ڈرامے ضرورت کے مطابق صرف ایک ایکٹ پر ہی مشتمل ہوسکتے ہیں بلکہ ان میں تو سین بھی ایک سے زیادہ ہونا قریباً قریباً ناممکن ہے۔ ریڈیو کے علاوہ بہت ممکن ہے کہ بہت جلد ٹیلی ویژن کے تجربات بھی مکمل طور پر کامیاب ہو جائیں

[۵] بشرطیکہ چار آنے والا ٹکٹ وہاں بھی ہو! (ادارہ)

اُس صورت میں سننے کے علاوہ ریڈیو سے ہم ڈرامے دیکھ بھی سکیں گے اور چونکہ ٹیلی ویژن کے ڈراموں کی نوعیت تقریباً وہی رہے گی جو ریڈیائی ڈراموں کی ہے اِس لئے ایک ایکٹ کے ڈراموں کی مانگ بہت بڑھ جائے گی۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ایک ایکٹ کے ڈرامے کی بنیاد آج سے بہت عرصہ پہلے تھیئٹر کی تخلیق کے ساتھ ہی رکھی گئی تھی۔ اُن کے خیال میں ڈراما شروع ہونے سے پیشتر جو ایک چھوٹا سا فارس یا نقل یا مذاحیہ منظر پیش کیا جاتا تھا۔ وہی ابتدائی سین ایک ایکٹ کے ڈرامے کی اوّلین صورت تھی لیکن در اصل جس طرح مختصر افسانوی ادب وقتی ماحول کے مطابق پیدا ہوا۔ اسی طرح ایک ایکٹ کے ڈراموں کی بنیاد بھی وقتی ضرورت کے مطابق ہی رکھی گئی ایک ایکٹ کے ڈرامے نہ تو فارس سے کوئی مطابقت رکھتے ہیں اور نہ نقل یا مذاحیہ منظر سے۔ ایک ایکٹ کا ڈراما ہر کسی موضوع پر لکھا جا سکتا ہے۔ اس میں طنزیہ۔ طربیہ۔ عشقیہ۔ سماجی کسی بھی موضوع کی قید نہیں۔ اس قسم کا ڈراما ایک پوری کیفیت پر مبنی ہوتا ہے۔ زندگی کے کسی ایک پہلو کی ایک مکمل تصویر۔ اس میں "وحدتِ عمل" اسی طرح پائی جاتی ہے جس طرح ایک مکمل ڈرامے میں۔ ایک ایکٹ کے ڈرامے کو ایک مکمل ڈرامے کا اختصار نہیں کہا جا سکتا۔ جس طرح ایک افسانہ ناول کا اختصار نہیں ہو سکتا اور جس طرح افسانہ نویسی بذاتِ خود ایک مکمل فن ہے۔ اسی طرح ایک ایکٹ کی ڈراما نگاری ادب کی ایک مستقل، اہم اور مکمل صنف ہے یہ ہو سکتا ہے کہ ایک ایک ایکٹ کا ڈراما اور ایک لمبا ڈراما ایک ہی خیال سے متاثر ہو کر لکھا جائے۔ لیکن دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہوگا یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں کا موضوع ایک ہی ہو لیکن دونوں کی فن کاری میں فرق ہوگا۔ بہت سی تفصیلی اور تمہیدی چیزیں آپ کو ایک ایکٹ کے ڈرامے میں نہیں ملیں گی۔ ایک ایکٹ کے ڈرامے میں پہلے ہی سین میں کہانی کی ابتدا ہو جاتی ہے اور اِس کا عروج عام طور پر ڈرامے کے اختتام پر ہوتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود کردار نگاری۔ کیفیتِ نفسی یا وحدت میں کسی قسم کا فرق نہیں ہوتا۔

کہا جاتا ہے کہ پہلے پہل ۱۸۹۰ء میں فرانس کی ایک گیس فیکٹری کے ایک ملازم آندرے انتوئن نے اپنے بچے ہوئے چند فرانکس کے محدود سرمائے سے ایک چھوٹا تھیئٹر قائم کیا جس میں ایک لمبے ڈرامے کی بجائے دو تین چھوٹے چھوٹے ڈرامے دکھانے کا انتظام کیا۔

فن ڈرامانویسی دوسرے فنون سے اس بات میں مختلف ہے کہ یہ زندگی کی "عملی" تصویر اور تفسیر ہے نہ کہ "بیانیہ"۔ ایک افسانہ نویس یا ناول نگار زندگی کے واقعات کو بیان کرتا ہے لیکن ڈراما نگار آپ کے سامنے زندگی کو جوں کا توں لے آتا ہے۔ ڈراما میں زندگی کا بیان نہیں ہوتا بلکہ اس میں زندگی اپنے اصل رنگ میں دکھائی جاتی ہے۔ چلتی پھرتی۔ بولتی چالتی یا ہنستی روتی۔ آسودہ یا تھکی ہوئی زندگی زندہ انسانی کرداروں کے ذریعہ آپ کے سامنے اپنی اصلی صورت میں پیش کی جاتی ہے۔ ڈراما میں اگر کردار کچھ بیان بھی کرتے ہیں تو وہ بیان بھی عمل ہی کی ایک صورت ہوتی ہے۔ اس لئے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ڈراما زیادہ تر کھیلنے کے لئے لکھا جاتا ہے نہ کہ پڑھنے کے لئے بلکہ اگر پڑھا بھی جائے تو ذہن میں ایک سٹیج کا ہونا لازمی ہے۔ ان حالات میں ایک ڈرامانویس کے لئے سامعین اور سٹیج کے تمام لوازم اور رسوم کو مدِنظر رکھنا ایک ضروری امر ہے۔

یوں تو ہر ایک ڈرامے میں یہ لازمی ہے کہ ایک منٹ بھی کسی فضول یا غیر ضروری واقعہ تفصیل یا کیفیت کو بیان کرنے میں صرف نہ کیا جائے۔ تاکہ سامعین کی توجہ تھوڑی دیر کے لئے بھی کسی اور چیز کی طرف منعطف نہ ہو۔ لیکن ایک ایکٹ کے ڈرامے کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ اس میں ضائع ہونے کے لئے کوئی فالتو وقت بچتا ہی نہیں۔ ایک ایکٹ کے ڈرامے میں پردہ اُٹھتے ہی پلاٹ کا آغاز ہو جانا چاہیئے اور اس کے بعد ڈراما نویس کی کامیابی اس امر پر منحصر ہے کہ وہ سامعین کی توجہ پوری طرح سے اور پورے وقت کے لئے اپنی طرف مبذول رکھے۔ ایسا کرنے کے لئے تین باتوں کی بہت ضرورت ہے۔

سب سے پہلے سامعین کو امید و بیم کی حالت میں رکھنا لازمی ہے۔ لوگوں کو اس بات کا اشتیاق ہونا چاہیئے کہ "اب کیا ہوگا"! تماشائی اسی اشتیاق میں اپنے آپ کو یکسر کھو دیں اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ ڈرامے کے پلاٹ کے متعلق سامعین کی قیاس آرائیاں درست ثابت نہ ہوں۔ اور اگلے سین میں جس نتیجے یا واقعے کی وہ توقع کرتے ہوں دراصل اس کے بالکل برعکس ہوا در آہستہ آہستہ استعجاب کی مدد سے اُن کا اشتیاق بڑھتا جائے۔ ایک ایکٹ کے ڈرامے میں تعجب یا حیرت کا ہونا لازمی ہے۔

تیسری چیز ڈرامے میں تیاری ہے حاضرین ڈراما کردار یا واقعات یا میلان میں کسی قسم کی اچانک تبدیلی گوارا نہیں کر سکتے۔ ہر ایک موقع کو تبدیل کرنے کے لئے پہلے سے ان کو تیار کرنا چاہیئے۔ ڈرامے کے پلاٹ میں تسلسل کا ہونا لازمی ہے۔ اس کی ابتدا اور انتہا میں ترتیب کا ہونا بھی ضروری ہے۔ اصل میں پلاٹ کا مطلب ہے واقعات کی ترتیب مناسب سلسلے کے ساتھ اور ایک ڈرامہ نویس سرنگ اڑانے والے اُس مزدور کی طرح ہے جو آہستہ آہستہ اپنا راستہ صاف کرتا ہوا اس جگہ جا پہنچتا ہے جہاں اُسے ڈائنامیٹ

سلم ہمارے خیال میں ٹیلی وژن کے ڈرامے بولتے فلموں سے زیادہ مماثلت رکھیں گے۔ ادارہ

کی ضرورت پیش آتی ہے اور ڈرامائیٹ مکو کردہ جھٹک سے پہا لو اُٹھا دیتا ہے
ڈرامے میں یہ مقام عروج یعنی کلائی میکس کہلاتا ہے۔ اور ایک ایکٹ کے ڈراموں
میں عام طور پر یہ مقام آخر میں ہی آتا ہے (اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایک ایکٹ کے
ڈراموں میں عروج اختتام کے سوا اور کسی مقام پر نہیں آسکتا) ایک کامیاب
ڈرامانویس کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس مقام تک گومگو کی حالت قائم رکھے۔
ایک ایکٹ کے ڈراموں میں یہ عام غلطی ہوتی ہے کہ بہت سے مصنفین وقت
کا بیشتر حصہ کردار نگاری یا کسی تفصیل میں ضائع کر دیتے ہیں اور اس کے بعد
جب انہیں اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ ڈرامے کا اختتام نزدیک ہے۔
تو وہ ایک غیر مکمل اور غیر معقول عروج پر پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں جس میں وہ
بہت بُری طرح سے ناکام ہوتے ہیں۔ اس طرح سے ڈرامے میں تناسب
اور وحدت تلف ہو جاتی ہے۔ وحدت کا وجود ہر ڈرامائی پلاٹ میں نہایت
ضروری ہے۔ ہیرو یا کسی اور کردار کی وحدت نہیں بلکہ عمل کی وحدت یعنی
سارے اعمال کو ایک مرکزی عمل کے گرد گردش کرنا اور انہیں عملی طور پر اس
خاص بنیادی عمل سے وابستہ ہونا چاہیئے۔ اِسی کو وحدتِ عمل کہتے ہیں۔

ایک ایکٹ کے ڈرامے میں سب سے مشکل کام کردار کو قائم کرنا ہے۔
ایک لمبے ڈرامے میں ہر ایک کردار کو کافی وقت ملتا ہے کہ وہ اپنا تعارف حاضرین
سے کرائے اور اپنی شخصیت اُن پر اچھی طرح سے واضح کر دے لیکن ایک
چھوٹے ڈرامے میں اگر وہ اپنا تعارف کرانے میں ذرا بھی دیر کر دے تو باقی پلاٹ
کے مناسب انکشاف کے لئے وقت نہیں بچتا اور توازن ٹوٹ جاتا ہے۔
اس لئے عام طور پر ایک ایکٹ کے ڈراموں میں کردار کو سٹیج پر آتے ہی اپنا تعارف
کروا دینا چاہیئے تاکہ سامعین کو معلوم ہو جائے کہ پلاٹ کا اُس کے ساتھ کیسا
تعلق ہے۔ لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کردار کے سٹیج پر وارد ہونے
سے پہلے ہی سامعین اُس کو دیکھنے کے لئے اس قدر بے تاب ہوتے ہیں
کہ اُسے اپنا تعارف کرانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔

ایک ایکٹ کے ڈرامے میں زندگی کے مختلف تضاد اور اختلافات کو
پیش کرنا بھی ضروری ہے۔ اُس کے لئے تصادم یا کشمکش کا ہونا لابد ہے۔ لمبے
ڈراموں میں چیخوف نے چند ایسے کامیاب ڈرامے لکھے ہیں جن میں تصادم نام
کو بھی نہ تھا لیکن ایک ایکٹ کے ڈراموں میں یہ بات قریباً قریباً ناممکن ہے۔
کیونکہ جدید ڈرامانگاری میں ایک اہم خصوصیت واقعیت بھی ہے۔ عصرِ جدید کے
ڈرامانگار زندگی کے مسئلوں سے بحث کرتے ہیں اور اُس کی سچّی تصویر کھینچتے ہیں۔
اور یوں انہیں زندگی کے اختلافات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پھر انسان اور سماج کا
تصادم۔ انسان اور ماحول کا تصادم۔ ایک خاص جماعت کا دوسری جماعت
سے تصادم۔ عقائد اور اصول کا تصادم۔ انسان کے متضاد رجحانات کا تصادم
وغیرہ وغیرہ نمایاں طور پر نظر آتے ہیں اور ایک ڈرامانگار کے لئے یہ ضروری ہے
کہ وہ زندگی کی کشمکش کے مختلف پہلوؤں کو اچھی طرح سے واضح کرے۔ چونکہ
ایک ایکٹ کے ڈرامے میں ایک وقت میں صرف ایک ہی پہلو نمایاں کیا
جاسکتا ہے۔ اس لئے اس میں تصادم یا کشمکش کا ہونا ضروری ہے۔

ایک ایکٹ کے ڈرامے میں تمہید ایک غیر ضروری عنصر ہے۔ شیکسپیئر
اپنے ڈراموں کی ابتدا کسی دہشت انگیز سین سے کیا کرتا تھا۔ اُس کا ڈراما "طوفان"
جہاز کی تباہی کے منظر سے شروع ہوتا ہے اور ہملٹ میں ابتدائی سین کا آغاز
ایک بھوت سے ہوتا ہے اس سے مراد یہ نہیں کہ ایک ایکٹ کے ڈرامے بھی
دہشت انگیز منظر سے شروع کئے جائیں۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ سامعین میں
پہلے ہی منظر سے دلچسپی پیدا ہو جائے اور آخری منظر تک قائم رہے۔ آپ جس
واقعے، حقیقت یا صورت حال کا انکشاف ڈراما میں کرنا چاہتے ہیں وہ جلد از جلد
حاضرین کے سامنے آ جانا چاہیئے اور اس کے انکشاف میں اس کی دلچسپی آخر
تک قائم رہنی چاہیئے۔

مکالمہ ڈرامے کی جان ہوتا ہے اور ایک ایکٹ کے ڈرامے کا تو پلاٹ
بھی مکالمے کے ذریعے ہی سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ اس لئے مکالمہ لکھنے میں خاص
احتیاط کی ضرورت ہے۔ بعض مصنفین مکالمے سے عمل[1] کا کام لینا چاہتے ہیں۔
لیکن مکالمہ کسی بھی صورت میں عمل کا بدل نہیں ہو سکتا۔ دونوں چیزیں اپنی
اپنی جگہ ضروری ہیں۔ مکالمہ لکھنے سے پیشتر اس بات کا خیال ہونا چاہیئے کہ
آپ کے ڈرامے کا پلاٹ ایک سڑک کے نقشے کی طرح ہے اور مکالمہ ایک
سچّے رہبر کی طرح سامعین کو راستہ بتا رہا ہے اور ہر رہبر کا کام ہے کہ سفر کو
دلچسپ بنانے کی کوشش کرے، صحیح راستہ بتائے اور راہ میں کسی قسم
کی رکاوٹ پیدا نہ کرے۔ مسافر کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو اور وہ ہر منزل پر یہ پکار
اُٹھے "کتنا دلکش منظر ہے مجھے اس کی ہرگز امید نہ تھی"۔

ایک ایکٹ کا ڈراما لکھتے وقت ڈرامے کا اختتام مدِ نظر ہونا
چاہیئے تاکہ مناسب تسلسل قائم رہ سکے بعض حالتوں میں دیکھا گیا ہے کہ بعض ڈراموں
کی ابتدا تو نہایت شاندار، دلچسپ اور فنی نقطۂ نگاہ سے بہترین ہوتی ہے لیکن
اُن کا اختتام اُن کی تمام خوبیوں کو مٹا دیتا ہے۔

ایک ایکٹ کے ڈراموں میں عام طور پر ایک ہی سین ہونا چاہیئے اور
کرداروں کو بار بار اپنا لباس تبدیل کرنے کی ضرورت لاحق نہ ہونی چاہیئے۔

[1] مجھے ایک ایسا امریکی فلم دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے جس میں مکالمے کی ادائیگی کی تیز رفتاری سے عمل کا کام لیا گیا تھا۔ (رہبر آبی)

اس سے یہ مراد نہیں کہ ایک ایکٹ کے ڈرامے صرف ایک ہی سین پر مشتمل ہو سکتے ہیں۔ دو یا تین سین میں بھی اچھے چھوٹے ڈرامے لکھے جا سکتے ہیں۔ لیکن ایسا کرنے میں ڈراما نویس کو فن پر پوری طرح حاوی ہونے کی ضرورت ہے۔

ایک ایکٹ کے ڈرامے کی فنی اور ادبی سربلندیاں دیکھنی ہوں تو ایک ایکٹ کے چند مغربی ڈراما نگاروں کے شاہکار پڑھنے چاہئیں۔ چند مغربی ڈراما نگاروں کے نام یہ ہیں:-

امریکن ڈراما نگاروں میں ڈنسانی (DUNSAIY) یوجن نیل (Eugeon o. Neil) جارج مڈلٹن (George Midilton) پرسیول وائیلڈ (Percival Wilde) کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان مصنفین کے ڈرامے ٹیکنیک کے لحاظ سے بہترین شمار کئے گئے ہیں۔ فرانس جرمنی وغیرہ کے بہترین ایک ایکٹ کے ڈراما نگار جن کے شاہکار انگریزی میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔ اُن میں سے چند، فرانسس ڈی کرل "(Francis De Curl) پال ہرویو (Paul Hervein) لیویڈان (Leveden) رومان رولاں (Romain Roland) الفریڈ کاپس (Alfred Calius) ویڈکائنڈ (Wede Kind) شنلر (Schigler) اور آرنسٹ ٹرولر (Earnst Trallar) قابلِ ذکر ہیں۔ انگریزی میں اے اے ملنے (A.A. Milne) ہیرلڈ برگ ہوس (Herold Brighouse) ہرلیڈ ربنسٹین (Herold Rubinstine) جے ٹالباٹ (J. Tallbot) جے۔ ایم باری (J. M. Bairy) اور کلفرڈ بیکس (Califfard Bax) عصرِ جدید کے بہترین ڈراما نویس ہیں۔

ہندوستان میں فنِ ڈرامہ و اداکاری ہزارہا سال قبل اپنے عروج پر تھا آریہ تہذیب سے بھی پہلے جنوبی ہند میں دراوڑی تہذیب کے عروج کی یادگار آج بھی "کتھا کلی" کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ ہندوستانی ڈراموں کی روشن تاریخ میں آج بھی کالی داس اور بھوبھوتی زندہ ہیں اور اُن کا فن بھی ابد تک زندہ رہے گا۔ لیکن آج اُسی ہندوستان میں ڈرامائی ادب پستی اور انحطاط کے گڑھے میں گر گیا ہے نہ تو اُس میں سنسکرت ڈرامے کی خوبصورت روایات ہیں اور نہ جدید ڈراما نگاری کی خوبیاں۔ ہندوستانی ڈراما یا تو مغرب کے فن کاروں کے ترجمے پر محدود ہے یا تواریخی اور مذہبی نقلوں پر جن کو ادبی زبان کا لباس پہنا کر ڈرامے کی صورت میں پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اُردو زبان میں تو ڈراما نویسی ابھی عالمِ طفلی ہی میں ہے اور کوشش کے باوجود معیاری ڈرامے بہت کم ملتے ہیں۔ دورِ اول کے ڈراما نگار جو زیادہ تر تین یا چار ایکٹ کے ڈرامے لکھتے تھے۔ مثلاً ناظر بیگ۔ رونق بنارسی۔ احسن لکھنوی بیتاب دہلوی۔ آغا حشر کاشمیری وغیرہ۔ وہ مختلف تھیٹریکل کمپنیوں کے ساتھ وابستہ تھے اور شاید تمثیل کی فنی خصوصیات سے بالکل ناواقف تھے۔ اُن کے ڈراموں کا معیار ان کی مالک کمپنیاں اپنے تجارتی اور دوسرے ماحول کے مطابق مقرر کرتی تھیں اور اُن کا موضوع زیادہ تر مذہبی روایات یا عشقیہ اور تواریخی حکایات تک ہی محدود تھا۔ ان ڈراما نویسوں میں سے آغا حشر کاشمیری کے ڈرامے سب سے زیادہ مقبول عام ہوئے اور کئی لوگ تو حشر کو انڈین شیکسپیئر کے نام سے ہی یاد کرنے لگے لیکن فن کے لحاظ سے اُن کے ڈراموں کا معیار کوئی بلند نہ تھا[1]۔ اردو ڈراما نویسی کے دورِ اول کے متعلق ایک علیحدہ فنی اور تواریخی مقالے کی ضرورت ہے لیکن اس وقت تو زیرِ بحث موضوع[2] ایک ایکٹ کے ڈرامے ہیں۔

ایک تو اردو ادب میں معیاری ڈرامے ویسے ہی بہت کم ہیں۔ لیکن ایک ایکٹ کے ڈرامے تو تقریباً نایاب ہیں۔ اب کچھ عرصے سے ریڈیو کی سرگرمیوں کی وجہ سے چند ریڈیائی ڈرامے ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ لیکن سُنا جاتا ہے کہ ریڈیو والوں کو بھی یہی شکایت ہے کہ انہیں اُن کے مطلب کے ڈراما نویس ملتے ہی نہیں اور اس لئے انہیں بار بار صرف چند اشخاص سے استدعا کرنی پڑتی ہے کہ "برائے خدا ہمارے لئے ڈرامے لکھئے" اور اسی وجہ سے انہیں چند محدود دادیبوں کے قلم سے انگریزی ڈراموں کے چربوں یا ترجموں پر ہی اکتفا کرنی پڑتی ہے۔

اردو میں ایک ایکٹ کے جو ڈرامے لکھے گئے ہیں وہ زیادہ تر انگریزی یا دوسری مغربی زبانوں سے اخذ شدہ ہیں بعض مصنفین تو ببانگِ دہل اس بات کا اعلان بھی کر دیتے ہیں کہ یہ ہمارا طبعزاد ڈراما نہیں بلکہ فلاں انگریزی یا کسی اور مصنف سے ترجمہ کیا گیا ہے لیکن بہت سے حضرات تو اُسے مقامی رنگ دے کر بالکل اپنا بنا لیتے ہیں۔ ریڈیو سے بھی جو ڈرامے نشر کئے جاتے ہیں ان میں سے اکثر ڈرامے اخذ شدہ ہی ہوتے ہیں[3] اگر کہیں کوئی طبعزاد ڈراما مل بھی جائے تو وہ فن کاری کے لحاظ سے ناقص ہوتا ہے اور عام طور پر اُس کے پلاٹ کا مرکزی موضوع ایک ہی ہوتا ہے۔ مذہبی۔ تواریخی اور عشقیہ ڈراموں کے علاوہ ایسے ڈرامے بھی موجود ہیں جن میں نیکی اور بدی فرض اور محبت یا کردار اور مافوق الفطرت کا تصادم دکھایا گیا ہو۔ ان کے علاوہ اور کسی موضوع پر اردو زبان میں ڈرامے نہیں

[1] حشر کے بارے میں یہ کچھ زیادتی معلوم ہوتی ہے۔ (ادارہ)

[3] ادارہ اس کا برا پہلو یہ ہے کہ پبلک کو اس دھوکے سے بے خبر رکھا جا رہا ہے (ادارہ)

[2] اس فہرست میں جناب ضیاء الاسلام حور رشید تا معروف حضرات اردو ڈراما نگاری بھی شامل ہونا چاہئے (ادارہ)

لکھے گئے. مثال کے طور پر فضل حق قریشی جن کے اکثر ڈرامے دہلی ریڈیو سٹیشن سے نشر ہو چکے ہیں۔ اُن کے ڈراموں میں بھی یہی چیزیں نظر آئیں گی۔ ان کے ڈراموں میں جو کشمکش دکھائی گئی ہے۔ زندگی میں بہت کم موجود ہوتی ہے بلکہ بعض اوقات تو آپ نے خارجی عمل اور روحانی تاثرات سے ڈرامے کو بالکل ناقابلِ یقین بنا دیا ہے۔ آپ کے چند ڈراموں میں مقام عروج بھی موجود نہیں ہوتا اور وہ محض ایک مکالمہ بن کے جاتے ہیں۔

انصار ناصری کے ڈرامے فن کاری کے لحاظ سے بہت اچھے ہیں لیکن پلاٹ میں اُن کے بھی یہی خامی ہے۔ ہندوستانی زندگی میں جو تصادم اور مصنفوں کے لئے جو خام مواد موجود ہے۔ اُس کا فائدہ ناصری صاحب نے نہیں اٹھایا اور اگر اٹھایا بھی ہے تو بہت کم۔ شاید اس لئے کہ اصل واقعیت کی زندگی ریڈیو والوں کو نہیں بھاتی اور ادب کی تخلیق اس کی مانگ پر مبنی ہے۔

امتیاز علی صاحب تاج کے قلم میں روانی ہے اور وہ ڈرامے کی ٹیکنیک پر بھی پورے طور پر حاوی معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اُن کے زیادہ تر ڈرامے انگریزی یا کسی اور زبان سے ہی اخذ شدہ ڈرامے ہیں۔ کاش کہ وہ اردو میں طبعزاد ایک ایکٹ کے ڈرامے لکھنا شروع کریں۔ ادب اُن کی اس خدمت کا احسان مند رہے گا۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی ڈراما نویس ہیں جن کا نام ریڈیو سٹوڈیو کی حدود سے باہر نہیں آیا اب کئی افسانہ نویسوں نے ڈراما نگاری کی طرف رجوع کیا ہے۔ اِن میں سے ترقّی پسند مصنّفین نے چند کامیاب ڈرامے لکھے بھی ہیں لیکن وہ معیاری ڈرامے نہیں کہلائے جا سکتے اور پھر وہ اس قدر بکھرے ہوئے ہیں کہ اُن کے متعلق مکمل طور پر کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ اگر کوئی ادارہ انہیں کتابی صورت میں لانے کی ہمّت کرے تو یہ ادب کی ایک خدمت ہوگی۔

آج تقدیر کی حکومت کا زمانہ نہیں۔ آج انسان نے وہ کچھ کر دکھایا ہے اب سے دو ہزار یا ایک سو سال پہلے وہ اُس کا خواب بھی نہ دیکھ سکتا تھا۔ وہ چیزیں جو انسان کے لئے پُراسرار تھیں اور جنہیں وہ کسی مافوق الفطرت قوت کے ساتھ وابستہ کیا کرتا تھا۔ آج پُراسرار نہیں ہیں۔ اُن کی اصلیت آج انسان پر ہویدا ہو گئی ہے اور وہ عقدے جو تقدیر کی پُراسرار تاریکیوں میں اُلجھے ہوئے تھے آج انسان نے خود حل کر لئے ہیں۔ آج سائنس کی دنیا میں ہمیں تقدیر کی دنیا کے سحر اور جادو معجزہ اور دعا اور بد دعا سے کوئی دلچسپی نہیں رہی ہمارے پیشِ نظر صرف انسان ہے اور اس کی کمزوریاں اور استواریاں۔ اس لئے ڈرامے میں بھی بنیادی تصادم انسانی نفس کے مختلف پہلوؤں میں یعنی کردار کے رجحانات اور احساسات کے درمیان ہونا چاہئے۔ یا دوسرے الفاظ میں اصلی کشمکش انسان اور اس کے ماحول کے درمیان ہونا ٹھیک ہے بلکہ موجودہ فن ڈراما نگاری کے متعلق تو یہاں تک کہا گیا ہے کہ اس کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ خارجی حرکت کا اس میں بالکل فقدان ہو اس لئے ہندوستانی ڈراما نگاروں کے لئے بھی یہ لازمی ہے کہ وہ بجائے قدرت اور قسمت کو مخاطب کرنے کے زندگی کے مسائل کا اصل حل ڈھونڈنے کی کوشش کریں اور اخلاقی اور نفسیاتی مسائل کی دنیا میں خارجی دنیا کا بدل تلاش کریں۔ اس صورت میں وہ ہندوستان میں فن ڈراما نگاری کی توسیع کر سکتے ہیں۔

ایک ایکٹ کے ڈرامے تھوڑے ہی عرصے میں یورپ اور امریکہ کی سٹیج پر قابض ہو گئے۔ باوجود اس بات کے کہ وہاں فن فلم سازی ہندوستان سے کہیں بہتر اور وسیع پیمانے پر ہے۔ لیکن ہندوستان میں جب سے پردۂ سیمیں پر فلمیں وارد ہوئیں تھیٹر ختم ہو گیا۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ ایک تو فنی لحاظ سے فلمیں جو امریکہ اور یورپ سے بھی درآمد ہوتی ہیں، بدرجہا بہتر ہیں اور بتدریج ترقی کر رہی ہیں اور دوسرے ہندوستانی سٹیج لمبے ڈراموں کا بدل پیش نہ کر سکی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈرامے کھیلنے کا رواج قریباً قریباً بند ہو گیا ڈراموں کی مانگ نہ رہی اور اس وجہ سے ہندی یا اردو میں فن ڈراما نویسی کو فروغ حاصل نہ ہو سکا۔ جب کسی چیز کی مانگ ہی نہ ہو تو اس تجارتی نظام میں اس کو فروغ کیسے حاصل ہو سکتا ہے۔ آج کل وہ زمانہ نہیں کہ ادیب چند امراء کو خوش کرنے کے لئے لکھتے جائیں اور اُن کے ٹکڑوں پر پڑے رہیں۔ آج کل ادیبوں کو اپنی شکم پروری بھی کرنی ہے اور ڈرامے جو کھیلنے کی چیز ہے لیکن اُس کے لئے سٹیج موجود نہیں ہے اُن کی اس پہلو میں مدد نہیں کرتے۔ لیکن ریڈیو کے آنے سے حالات کچھ امید افزا ہو رہے ہیں اور ممکن ہے کہ سائنس کی اس ایجاد کی وجہ سے ہندوستان میں بہترین ڈرامے لکھے جا سکیں۔ اور موجودہ مغربی ڈراما نگاری اور قدیم سنسکرت ڈرامے کی روایات کے امتزاج سے وہ فن پیدا کیا جا سکے جو اِبسن اور برنارڈ شا سے کہیں بڑھ کر ہے۔

لیکن اس کے لئے محض ریڈیو ہی کافی نہ ہوگا۔ ایک تو ریڈیو سیاسی پروپیگنڈا کی قید سے آزاد نہیں اور وہ ایک سرکاری محکمہ ہونے کی وجہ سے ادب کی اتنی خدمت نہیں کر سکتا اور دوسرے ریڈیائی ڈرامے اور سٹیج پر کھیلے جانے والے ڈرامے میں کافی فرق ہوتا ہے۔ ایک محض سننے سے تعلق رکھتا ہے اور دوسرا دیکھنے سے۔ اس لئے ڈراما نگاری کو فروغ دینے کے لئے سٹیج

پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اردو ڈرامانگاری کو عالمِ طفلی سے عالمِ جوانی تک لے جانے کے لئے ہندوستانی سٹیج کا ہونا لازمی ہے۔ ڈراما اور سٹیج لازم و ملزوم ہیں اور ایک کے بغیر دوسری چیز بے معنی ہے۔ ہندوستانی سٹیج پیدا کرنا تجارتی نقطۂ نظر سے بھی کوئی گھاٹے والا سودا نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اگر کوئی کلب کسی انگریزی یا انگریزی سے اخذ شدہ ڈرامے کو سٹیج کرے تو لوگ اسے دیکھنے کے لئے بے قرار ہوتے ہیں اور بہتوں کو ہال بھر جانے کی وجہ سے ناکام لوٹنا پڑتا ہے اور یوں بھی تو تفریحِ طبع کے لئے سینما یا دنگل کافی نہیں ہندوستانی زندگی ابھی مکمل طور پر ایک سوشل زندگی نہیں بنی لیکن سوشل زندگی بننا چاہتی ہے اور ہندوستانی سٹیج اُسے اس معاملے میں کافی مدد دے سکتی ہے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر چند مصنفین خود ہی یہ خدمتِ ادب بجالائیں۔ اور خود ہی ہندوستانی ڈرامے کے لئے سٹیج بناڈالیں۔ وہ خود کچھ ایسے کلب قائم کریں جو ایک ایکٹ کے ڈرامے سٹیج کرے۔ اس سے ایک تو وہ اپنا صحیح مفہوم سٹیج کے ذریعے سے پیش کرسکیں گے اور دوسرے ہندوستانی زندگی کو سوشل بنانے میں معاون ثابت ہوں گے۔

نریندر ناتھ

قطعات

بہار [illegible] صورتِ غنچہ یہاں [illegible] گیا

[illegible] کھلی [illegible] کھلی

[illegible] باغ [illegible] گیا

کھلتی [illegible] کلی [illegible]

[illegible]

[illegible]

برسات کی رات

موسم برسات ہے کھوئی کھوئی رات ہے

گر رہی ہیں بوندیاں راگ سے پُر ہے جہاں

جاگ اُٹھا ہے سازِ فطرت خواب سے

چھیڑتی ہے کیوں پھوار دل بہت ہے بے قرار

جیسے بجتا ہو ستار

جب اُسے چھیڑے کوئی مضراب سے

آہ! کیوں تنہا ہوں میں ہائے! کیوں تنہا ہوں میں

کیوں نہیں ہمدم مرا سب مزے ہیں بے مزا

بے مزہ ہے کس قدر یہ رات بھی

کاش یہ عالم نہ ہو کاش یہ موسم نہ ہوا

جب کوئی ہمدم نہ ہو

کاٹتا ہے موسمِ برسات بھی

روشن پروین تنویر

حقیقت یا افسانہ

تازہ محبت سادہ سادہ پاس وفا کا حد سے زیادہ
قامتِ زیبا مطلعِ جامی حُسن سراپا کیفِ تمامی
موجِ تبسم، موجِ بادہ پھولوں سے بکھرا عشق کا جادہ
بوئے سمن سی مست خرامی لکھا صبا نے خطِ غلامی

دل میں اُمنگیں لب پہ ترانہ دل میں اُمنگیں لب پہ ترانہ
کل تھی حقیقت آج فسانہ کل تھی حقیقت آج فسانہ

حال کی پرسش میں موسیقی ہونٹوں کی جنبش میں موسیقی
لہجے میں نرمی لوچ صدا میں شائبہ اک شوخی کا حیا میں
پلکوں کی لرزش میں موسیقی خون کی گردش میں موسیقی
سو سو ادائیں ایک ادا میں ناز و کرشمہ لطف و عطا میں

دل میں اُمنگیں لب پہ ترانہ دل میں اُمنگیں لب پہ ترانہ
کل تھی حقیقت آج فسانہ کل تھی حقیقت آج فسانہ

آدھی رات اور سیر چمن کی چاند پہ بدلی ہلکی ہلکی
آنکھوں میں کاجل پھیلا پھیلا یا پی پی کے کنول رس بھنورا
زلف کسی نے چہرے سے جھٹکی بدلی چھنٹی اور چاندنی چھٹکی
رات گئے کچھ اڑنے ہی کو تھا پلکوں نے لیکن جال میں پھانسا

دل میں اُمنگیں لب پہ ترانہ دل میں اُمنگیں لب پہ ترانہ
کل تھی حقیقت آج فسانہ کل تھی حقیقت آج فسانہ

اثر لکھنوی

سراب

افراد

۱۔ ایکٹر ۲۔ ایکٹریس۔ ۳۔ مینجر۔ ۴۔ فلسفی۔ ۵۔ ہیرو

مقام: بمبئی۔ ایک مشہور فلم کمپنی کا سٹوڈیو۔ سٹوڈیو کا دفتر۔ **وقت** ۱۱ بجے دن۔ دفتر ایک چھوٹا سا کمرہ ہے جو باہر والان میں کھلتا ہے۔ دالان کے بائیں طرف گانے کا کمرہ ہے۔ جہاں گانوں کی ریہرسل ہُوا کرتی ہے۔ کمرے میں ایک طرف ذرا ہٹ کر ایک میز لگی ہے اور کچھ کرسیاں۔ دیوار پر دو تین ایکٹر اور ایکٹریسوں کی تصویریں لٹکی ہیں۔ اس وقت دفتر میں چار افراد بیٹھے ہیں۔ میز کے پیچھے دیوار کی طرف بیٹھے کمپنی کا مینجر ہے۔ سامنے کرسی پر دروازے کی طرف منہ کئے ایکٹریس بیٹھی ہے۔ مینجر کے سامنے میز کی دوسری طرف دو اور آدمی بیٹھے ہیں۔ ایکٹر اور فلسفی۔ ان کی نہ تو پشت دروازے کی طرف ہے نہ پورا چہرہ۔ مینجر ایک رجسٹر کے صفحے اُلٹ رہا ہے۔ ایکٹریس بے دلی سی بیٹھی باہر دالان کے پرے باغ اور آسمان کی طرف دیکھ رہی ہے۔ ایکٹر ایک چہرے پر ملنے والی کریم کی شیشی سامنے میز پر رکھے اس سے کھیل رہا ہے۔ فلسفی ٹانگیں پسارے، اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں ٹکراتے ہوئے چھت پر خیالی نقشے بنانے میں مشغول ہے۔ اس ڈرامے کا ماحول یہ چار افراد ہیں کمرہ نہیں۔ اس لئے کمرے کو اور وضاحت سے بیان کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن ان افراد کی بابت ہمیں کچھ کہنا ہے۔ اُن کے چہرے اُن کے ماضی، اُن کے عادات اور اُن کے حالات کا آئینہ ہیں۔

مینجر نے ابھی چالیسویں سال میں قدم نہیں رکھا لیکن اس کا شمار بوڑھوں میں ہونے لگا ہے۔ اُس کے سر کا اوپر کا حصہ ہاتھ کی ہتھیلی کی طرح صاف ہے۔ عمر کے تقاضے کی وجہ سے اُس کی کنپٹیوں کے سب بال سفید ہو گئے ہیں۔ فلم کمپنی کا آغاز ہوا تو آپ کو بھی مینجری ہاتھ آ گئی۔ مینجر اپنے مالک کے چیدہ "جی حضور" دوستوں میں سے تھے۔ دوسرے سیٹھوں کی طرح اس مالک کے گھر میں بھی ہر روز شراب سے ہولی کھیلی جاتی تھی۔ سیٹھ جی کا گھر ہر قسم کے دوستوں کے لئے چلتا ہوا میخانہ تھا اور طوائفوں کے لئے پیسے کی ٹکسال۔ ایسے سیٹھوں کو دوستوں کی کمی نہیں ہوتی لیکن وہ ان سب کی قیمت کو پہچانتے ہیں۔ اُن کا معتمد چیلا ہر کوئی نہیں ہوتا۔ شراب کے امیر بچاریوں کو ایک ایسے آدمی کی ضرورت ہوتی ہے جس پر وہ کبھی کبھار اپنے غصے کا غبار نکال سکیں۔ جب بوتل اور گلاس خالی ہو کر زمین پر لڑھکنے لگتے ہیں تب وہ اپنی مادی ہستی کو بھول کر اپنے خیالوں کے سمندر میں غوطہ زن ہو جاتے ہیں۔ اُن کے جسم میں ایک عجیب قسم کی پھرتی سی آ جاتی ہے۔ اُن کے دل میں باتیں کرتے رہنے کی بس باتیں کرتے کرتے ہی زندگی گذار دینے کی ایک پُرزور تمنا جاگ اٹھتی ہے۔ ایسے وقتوں میں وہ کسی کو بتانا چاہتے ہیں کہ انہیں پیسے کی پروا نہیں ہے۔ نیز انہیں اپنی عورت کے چال چلن پر شک ہے۔ یا اُن کے سب دوست انہیں لوٹنے پر تلے ہوئے ہیں لیکن اُن میں سے ایک بھی ایسا نہیں جو کسی پھڑکتی ہوئی دوشیزہ کو پھانس کر لا سکے، نیز عورت کا لطف سترہ اور بیس برس کے درمیان ہے۔ ورنہ اُسے بڑھیا ہی سمجھنا چاہیئے۔ نشے میں جھوم کر سیٹھ جی کہنا چاہتے ہیں کہ ہاتھ میں پیالہ ہو اور بغل میں کوئی ماہ لقا بیٹھی ہو، ایک ہو، دو ہوں، دس ہوں۔ اب ہوں۔ کل ہوں۔ ہمیشہ رہیں اور ایسی سب باتیں سننے کے لئے انہیں دیوار کی مانند ایک آدمی چاہیئے جو گالیاں بھی سنے لعن طعن بھی سہے۔ تلوے بھی سہلائے لیکن

مسکراتا رہے اور اس کی زبان پر صرف ایک کلمہ ہو "جی ہاں، جی ہاں"۔ سیٹھ جی کو بھی منیجر ایسا ہی ملا تھا منیجر کی طرح کے لوگوں کو پیسے کی کمی نہیں ہوتی۔ کیونکہ ایسی باتوں میں سیٹھوں کے دل دلیر ہوتے ہیں۔ پی کر کچھ بکتے ہیں، کچھ گالیاں سناتے ہیں، لیکن ساتھ ہی ایک دس روپے کا نوٹ بھی اُس کے آگے پھینک دیتے ہیں کہ "جا بٹیرے موج کر" عام طور پر ایسے "جی ہاں" کرنے والوں کو سیٹھ لوگ "بٹیرا" کہہ کر پکارا کرتے ہیں۔ پتہ نہیں کیوں۔ بٹیرے کو شراب ملتی ہے اور مرغ پلاؤ بھی۔ اُسے ہمیشہ اچھے اچھے کپڑے پہننے پڑتے ہیں۔ لیکن سب سیٹھ جی کے خرچ پر۔ سیٹھ جی کا دل بہلانے کے لئے۔ آہستہ آہستہ بٹیرے کے احساسات کند ہونے لگتے ہیں محسوس کرنے کی طاقت ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔ وقت کے ساتھ یہ طاقت بالکل مفقود ہو جاتی ہے۔

سیٹھ جی عیش و عشرت میں خلوت کے قائل نہیں۔ جب زہرہ جان یا اختری بائی کے سامنے محبت کے گیت گانے میں مشغول ہوتے ہیں تب بھی بٹیرا اُن کے پاس ہی رہتا ہے۔ اُسے پاس رہنا پڑتا ہے۔ لیکن دوشیزہ سے دور۔ اُس کے پاس بٹیرے کی پہنچ نہیں ہو سکتی وہ اُسے پیاسی نگاہوں سے ہی دیکھ کر رہ جاتا ہے۔ زبان سے ہونٹوں کو چاٹ کر اپنی ہوس کو مٹا لیا کرتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اُس کی آنکھوں میں حسرت ــــ تمناؤں کے کھنڈر ــــ پیدا ہو جاتے ہیں۔

مردوں کے لئے بٹیرے کے دل میں حسد کی آگ روشن ہو جاتی ہے۔ لیکن منہ پر "جی ہاں" رہتی ہے اور عورتوں کے لئے ـــ جو اُس کی نظروں کے سامنے ہو کر بھی اُس سے کوسوں دور رہتی ہیں۔ ایک بیزاری، ایک نفرت اُسے اپنے دامن میں لپیٹے رہتی ہے اور یہ سب خیالات بٹیرے کے چہرے پر دریا کے کنارے کے درختوں کے سائے کی طرح لہراتے رہتے ہیں۔ منیجر کا چہرہ بھی ان خیالات کا آئینہ ہے۔ آنکھوں میں حسرت، ہونٹوں پر نفرت، دل میں حسد۔

ایکٹر کی چال ڈھال اور ہی قسم کی ہے۔ وہ کئی چھوٹی موٹی ایکٹرسوں سے لطف اندوز ہوا ہے لیکن ابھی تک کسی ایسی ایکٹرس تک بار نہیں پا یا جو اچھے گھر کی ہو اور ہیروئن ہو یا ہیروئن بننے والی ہو۔ اس کو اپنے گھر بار کا اتا پتا بتلاتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے اس لئے اس کی تمنا ہے کہ کسی اونچے گھر کی بہو بیٹی کو اپنی محبت کے جال میں پھانس لے۔ وہ ابھی تک ذات پات کے بندھنوں میں جکڑا ہوا ہے اور گھرانے پر مرنے والوں میں سے ہے۔ وہ جن جن عورتوں سے آج تک گھلا ملا ہے اُن سے اُسے کوئی محبت نہ تھی۔ وہ اُس کے لئے محض وقت کٹنی کا ایک ذریعہ تھیں۔ لہٰذا اُس کے چہرے سے ایک بیزاری سی ٹپکتی ہے۔ لیکن ہماری ایکٹرس کو دیکھ کر اُس کا دل ہوا میں پتے کی طرح لرزنے لگتا ہے۔ اُس نے ایکٹرس کو اپنی محبت سے بھری ہوئی کلیوں کی سوغات بھینٹ چڑھانے کے لئے اپنے من مندر کی دیوی بنا لیا ہے۔ ممکن ہے کہ اُس کی یہ محبت بھی دوڑتے ہوئے بادل کی طرح دو دن کی ہو لیکن آج کل تو ایکٹرس کی تصویر کو اپنے دل کے ساتھ لگائے پھرتا ہے۔ اُس کے گھر کی دیواریں اُس کے میز پر پڑا ہوا البم ایکٹرس کی سینکڑوں تصویروں سے بھرا ہوا ہے۔ ایکٹرس بہت خوبصورت ہے۔ اُس کا فوٹو عام طور پر اخباروں میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ ایک چہرے پر ملنے والی کریم کے اشتہار کے لئے۔ اُس نے اس کریم کا خود تو کبھی استعمال کرنا ضروری نہیں سمجھا لیکن کریم والوں نے اُسے بہت سا روپیہ دیا ہے یہ کہنے کے لئے کہ میرے چہرے کی تازگی اور شگفتگی اسی کریم کی وجہ سے ہے اس میں شک نہیں کہ وہ ان تصویروں میں بہت خوبصورت معلوم ہوتی ہے، اور اصل میں وہ ہے بھی کھلی ہوئی کلی سی۔ ایکٹر اُس کریم کی ایک شیشی ہمیشہ جیب میں رکھتا ہے۔ اور سٹوڈیو میں اکثر اوقات اس کو استعمال میں لایا کرتا ہے۔ اُس نے ایکٹرس سے ظاہرا طور پر تو یہ کبھی نہیں کہا کہ میں اس کریم کا مشتاق اس لئے ہوں کہ یہ تمہاری پسندیدہ چیز ہے لیکن یہ سچ ہے کہ جب کبھی ایکٹرس اُس کے پاس ہو تو وہ کریم کی شیشی کسی بہانے سے باہر نکال کر میز پر رکھ دیتا ہے یا اُسے ہاتھ میں لے کر کھیلا کرتا ہے اس حرکت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ شیشی کو دیکھ کر ذرا مسکرائے اور جان لے کہ یہ سب اُسی کی خاطر ہے۔ اب تو ہمارے ایکٹر نے اپنا پہناوا بدل دیا ہے۔ پہلے تو وہ اچھا بھلا ہوا کرتا تھا۔ کوٹ پتلون سب کچھ پہنتا تھا۔ نکٹائی بھی لگاتا تھا لیکن اس نے دیکھا کہ ان کپڑوں کا اُس کے دل کی رانی پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ اب ان سب کو چھوڑ کر وہ ایک بنگالی آرٹسٹ کا نمونہ بن گیا ہے۔ ریشمی کرتا، سفید دھوتی۔ اور سفید ریشمی پٹکا۔ منہ میں پان۔ بال لمبے اور پیچھے کو پھینکے ہوئے۔ بات کرتا ہے تو گلے میں سوز پیدا کر کے اور ایک ہاتھ دل پر رکھ کر۔ یہ تمنا۔ یہ ہوس۔ یہ ایکٹرس کو پالینے کی خواہش اُس کے چہرے پر جھلکتی ہے۔ وہ جو کام کرتا ہے موقعہ دیکھ کر۔ مسکراتا ہے تو یہ سوچ کر کہ کیا اس وقت میری ایکٹرس مجھے مسکراتے دیکھنا چاہتی ہے یا غمگین۔ بات کرتا ہے تو رُخ دیکھ کر کہ اب میری رانی بات کا کون سا پہلو صحیح سمجھے گی۔ وہ ہنستی ہے تو اور بھی زور سے ہنس کر اُس کے ہنسنے کی داد دیتا ہے۔ وہ چپ ہو جاتی ہے تو اُس کے وقار اور ضبط کی تعریف کرتا ہے۔ وہ چھینکے بھی تو جھٹ سے اپنا رومال نکال کر پیش کرتا ہے۔ ہمیشہ اس انتظار میں رہتا ہے کہ ایکٹرس کی کوئی چیز گرے اور میں اُسے اُٹھا کر دوں۔ وہ کرسی سے اُٹھنے لگتی ہے تو یہ پہلے ہی اُٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ "آیئے" کہہ کر راستہ دکھاتا ہے اُسے موٹر تک چھوڑنے جاتا ہے۔ اُس سے بات کرتا ہے تو ڈرامائی انداز سے اُس کی ہر بات میں اُسے شعریت نظر آتی ہے۔ وہ بولے تو منہ سے پھول جھڑتے

معلوم دیتے ہیں۔ وہ ہنسے تو ایکٹر کے دل پر بجلی گرتی ہے۔ یہ گلا۔ یہ زبان۔ یہ مسکراہٹ!

اور اس مسکراہٹ اور اس گلے کی تعریف میں پاگل ہونے والا صرف ہمارا ایکٹر ہی نہیں ہے۔ ہم بھی تعریف کئے دیتے ہیں لیکن اتنا ہوتے ہوئے بھی قانون قدرت کے مطابق ایکٹریس ایکٹر کو بھوریں تان کر دیکھتی ہے۔ اس کا بس چلتا تو ہمارے ایکٹر کو چابک مار مار کر سٹوڈیو سے باہر نکال دیتی۔ اگر اتنی آسانی سے عاشق اور معشوق میں باہمی محبت کا بیج پھوٹ پڑے تو قدرت کو فن کار کون کہے۔ ایکٹریس کا اپنا خاوند ہے۔ لیکن ہیرو اُس کو بے اعتنائی سے دیکھتا ہے۔ اس کی بدقسمتی! ہمیں تو ہماری ایکٹریس بہت بھلی معلوم ہوتی ہے۔ اُس کی آنکھیں بڑی بڑی ہیں۔ وہ یا تو اُنہیں نیم وا رکھتی ہے جس سے ان میں سے ایک نشہ سا نکل کر چاروں طرف پھیلنے لگتا ہے۔ وہ آنکھیں اپنے اندر زندگی کے راز کو منعکس کرتی معلوم دیتی ہیں۔ محبت بھری مست۔ رومانی۔ وہ گردن کو ذرا خم دئے رکھتی ہے جس سے اُس کے کانوں میں لٹکتے ہوئے گول طرز کے آویزوں میں سے ایک تو قریب قریب کندھے تک آکر جھومنے لگتا ہے اور دوسرا تھوڑا سا اوپر اُٹھ کر اُس کے رخسار، بائیں رخسار کو چومنے لگتا ہے ـــــ وہ رخسار جس پر پاؤڈر کی ہلکی سی تہہ ہے اور اس پر غازے کی میٹھی سی بارش ہے۔ ریشمی گلابی ساڑی پہننے سے اُس کے گالوں کا نقلی رنگ اور بھی نکھر آیا ہے۔ لب۔ مسکراتے لبوں پر لپ سٹک کا استعمال اس صفائی سے کیا گیا ہے کہ وہ نم دار ہوگئے ہیں اور وہ لمبی سفید گردن! ہیرو کی بدقسمتی کہ اس کو ان انمول چیزوں کی قدر نہیں کرنی آتی۔ لیکن خیر اُس کی کم نصیبی میں ہی ہماری خوش قسمتی پنہاں ہے کیونکہ اگر وہ دونوں ایک دوسرے سے مل جل جاتے تو ممکن ہے یہ ایک ایکٹ کا ڈراما مصنف کے دماغ میں ہی رہ کر ضائع ہو جاتا۔

فلسفی ایک دُبلا پتلا آدمی ہے، کوئی پچیس سال کا۔ دیس دیس گھوم آیا ہے۔ اس صحرا نوردی کا اُس پر گہرا اثر ہوا ہے۔ بدقسمتی سے اُس نے بہت عالی دماغ پایا ہے اور اپنے ذہن کے متواتر استعمال سے اُسے اتنا تیز کر لیا ہے کہ جذبات یکسر مفقود ہو کر رہ گئے ہیں اور وہ ایک فلسفی بن گیا ہے۔ دنیا کی ہر ایک شے کو نقاد کی گہری نظر سے دیکھنے لگا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ دنیا کی رنگینی، چلبلاپن، مستی، سبھی نے اُس سے ہمیشہ کے لئے منہ پھیر لیا ہے۔ اس دنیا میں خوش رہنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے۔ آنکھیں بند کئے اپنی عقل حیوانی کا پیچھا کرتے رہنا اور جذبات کے سمندر میں غوطے لگاتے رہنا۔ خشک فلسفے سے آج تک کوئی شخص دُنیوی مسرت حاصل کرتے نہیں دیکھا گیا

فلسفیوں کی خوشی اسی تصور میں ہے کہ وہ اپنے آپ کو دوسروں سے اونچا سمجھتے رہتے ہیں۔ اُن کی ساری زندگی دوسروں کی حیوانیت، بے وقوفی اور جہالت پر رحم کرنے اور آنسو بہانے میں ختم ہو جاتی ہے۔ لطف تو یہ ہے کہ دنیا اس دُکھی اور ادھوری زندگی کو کامیاب زندگی کہتی ہے۔

ہمارے فلسفی کو آج تک ہر جگہ سراب، مایا، دھوکے کے سوا اور کچھ نہیں ملا۔ اُس نے محبت کی۔ دوشیزہ اُسے چاہتی تھی۔ بہت چاہتی تھی۔ اُس میں روپ تھا۔ گُن تھا۔ شگفتگی تھی۔ ذہانت تھی۔ لیکن ایک ہی مہینے میں فلسفی اس نازنین سے بیزار ہونے لگا۔ جب وہ اُس سے ملتا اُسے اُس دوشیزہ کی خوبصورتی غیر قدرتی معلوم ہوتی اور اُس کی نزاکت ایک فریب۔ اُس کا علم سطحی دکھائی دیتا اور اُسی کے گُن ایک زمانہ سازی۔ اس کا دل اس سے پرے ہٹتا اور پرے ہی ہٹتا چلا گیا۔ لیکن ظاہری طور پر اُس میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ کبھی کبھی ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر چاندنی رات میں باہر گھومنے جایا کرتے۔ ویران جگہوں پر، سمندر کے کنارے، جہاں لہروں کا گیت دل میں سما جاتا ہے اور محبت کا چشمہ پھوٹ پڑتا ہے۔ کبھی کبھی محبت کے جوش میں دوشیزہ اس کا ہاتھ دباتی یہ بھی ہاتھ دبا کر اس کا جواب دیتا۔ دونوں کے جسموں میں بجلی سی دوڑ جاتی لیکن یہ حالت کچھ دن ہی رہی۔ اور اُسے اپنی بے وقوفی پر ہنسی آنے لگی۔ چاندنی رات اور سمندر کا کنارا! شاعروں نے ایسے ماحول کو محبت کی کامیابی کے لئے لازمی قرار دیا ہے۔ یہ شاعر کا تصور ہے۔ ہماری اصلیت میں بھی تصور کی بڑی آمیزش ہے۔ ٹھیک تو یہ ہے کہ اصلیت کے اسی خیالی حصے کو ہم رومان کہتے ہیں اپنی محبوبہ سے بار بار ملنے پر یہ رومان گم ہو گیا اور اُس کی معشوقہ بھی اور لڑکیوں کی طرح ایک معمولی لڑکی نظر آنے لگی، ایک دوسرے کے ہاتھ کو دبانا ویسے ہی جاری رہا۔ لیکن وہ بجلی اور شوق جس سے اُس کا سارا جسم اور دماغ تھرا اُٹھتا تھا، جاتا رہا۔ اب تو فلسفی صرف اپنے دل کو تسلی دینے کے لئے سوچتا کہ سبھی عاشق ایسے ہاتھ دبانے کا ڈھونگ رچاتے ہیں۔ میں بھی ان کی پیروی کرتا ہوں۔ آخر اس میں حرج ہی کیا ہے۔

کچھ وقت اور گذر گیا۔ فلسفی کو ایک نئی بات محسوس ہونے لگی۔ اُس نے دیکھا کہ اُس کے دل میں اپنی محبوبہ کے ساتھ چاندنی رات میں سمندر کے کنارے گھومنے کی پُر زور خواہش رہتی ہے اور جب تک رات نہیں پڑتی اس کے ساتھ گھومنے کے خیال سے اُس کے سارے جسم میں ایک برقی لہر دوڑتی رہتی ہے لیکن جب وہ اپنی محبوبہ سے چاندنی میں سمندر کے کنارے ملتا ہے تو اُسے کچھ لطف نہیں آتا۔ اپنی محبوبہ سے ملنے کی تمنا اُسے تمام دن

ستاتی رہتی ہے۔ لیکن ملاپ پھیکا ثابت ہوتا ہے۔ اُسے اپنے دل کو بزور منانا پڑتا ہے کہ وہ اس ملاپ سے مسرت حاصل کر رہا ہے۔ لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہ اپنے تصوّر کی محبوبہ کی محبت میں مطمئن رہ سکتا ہے اور یہ ختم نہ ہونے والی خوشی اُسے اُسی وقت تک دھوکے میں رکھ سکتی ہے جب تک اس کی محبوبہ مجسّم شکل میں اُس کے سامنے نہیں آتی۔ تب وہ بھی اور لڑکیوں کی طرح ایک عام لڑکی بن جاتی ہے۔ اس طرح اپنی دماغی طاقت کے صرف سے وہ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ اصل میں حقیقت تو تصوّر اور تخیل میں ہے۔ بیرونِ تخیل سب دھوکا ہے۔ وہ بڑی امیدوں کے ساتھ مشہور فن کاروں اور مصنفوں کے پاس گیا۔ انہوں نے زمانے بھر کی گندی اور بھدی باتیں کیں۔ وہ سادھو مہاتماؤں کے پاؤں پر شردھا اور بھگتی کے پھول چڑھانے گیا۔ اُس نے انہیں لاعلمی اور جہالت کے مجسّمے پایا۔ وہ بلند توقعات لے کر اپنے دوستوں سے ملنے گیا۔ ایک کو اس نے ہمیشہ اپنے دفتر کی فائلوں پر جھکے ہوئے پایا اور اُسے دو گھنٹے تک دوست کی بیوی سے اپنے بچّوں کی خوش اطواری کے متعلق لکچر سننے پڑے ایک دوسرے دوست کی بیوی کو اس نے ہمیشہ اپنے خاوند سے پوچھتے پایا کہ میں تم سے کتنا پیار کرتی ہوں، کرتی ہوں، یا نہیں؟ اور ایک تیسرا دوست بھی ہے جو زیادہ بات کرنا ہی نہیں جانتا۔ ایک آدھ بات کو ہی بار بار دہرائے جاتا ہے اور ہر دس منٹ بعد کہتا رہتا ہے "آؤ کچھ کھیلیں۔ میں تاش بھی لے آیا ہوں اور شطرنج بھی"۔ اس کو وقت گزارنے کا کوئی طریقہ ہی نہیں نظر آتا۔ یہ سب باتیں دیکھ دیکھ کر فلسفی کے دل میں ساری دنیا کے لئے ایک ہلکی سی نفرت پیدا ہو گئی ہے۔ رفتہ رفتہ اُسے دنیا کے رہنے والے لاعلمی کے جنگل میں گمراہ بھیڑوں کی طرح بھٹکتے ہوئے معلوم ہونے لگے ہیں جو ابھی تک اصلیت کو نہیں سمجھ سکے رفتہ رفتہ اُسے اپنی برتری کا یقین ہونے لگا ہے۔ اس کے ہونٹوں پر ہمیشہ ایک گہری مسکراہٹ کھیلتی رہتی ہے۔ وہ دنیا کی برائی بھلائی کو دیکھتا ہے۔ نازنینوں اور نوجوانوں کو آپس میں محبت کرنے کی کوشش کرتے دیکھتا ہے۔ چھوٹوں کو بڑا بننے کا راستہ ڈھونڈتے دیکھتا ہے۔ لوگوں کو ایک دوسرے کو ٹھگنے کے ذرائع سوچتے ہوئے دیکھتا ہے اور وہ مسکراتا رہتا ہے ـــ اپنی برتری کی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر رہتی ہے۔

"مایا ہے سب مایا ہے" کی جھلک فلسفی کے چہرے سے صاف عیاں ہے۔ اُس کے دُبلے پتلے چہرے پر منطق کی مہر لگی ہوئی ہے۔ آنکھیں مست سی رہتی ہیں اور یوں معلوم ہوتا ہے گویا کسی چیز کو ڈھونڈھ رہی ہوں۔

ایکٹریس کے متعلق اور کیا کہیں! وہ تو اپنے لفظوں سے اپنا حال خود ہی بتا دے گی۔ بعض افراد کو اس ڈرامے میں گونگے بنے رہنا ہے اُن کی حالت پر رحم کھا کر ہم نے اُن کی بابت کچھ کہہ دیا ہے۔ جس وقت یہ ڈراما شروع ہوتا ہے، ساتھ کے گانے والے کمرے سے گانے کی آواز آ رہی ہے۔ ہلکی سی۔ میٹھی سی۔ سٹوڈیو کا مالک، ہیرو وغیرہ سبھی اس موسیقی کے کمرے میں ہیں ایک نئی ایکٹریس کے گانے کی آزمائش ہو رہی ہے۔ اچانک گانا بند ہو جاتا ہے۔ تالیوں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ پھر خاموشی چھا جاتی ہے۔ ایکٹریس، مینیجر، ایکٹر ٹھٹک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں فلسفی یونہی چھت کی طرف دیکھنے میں مشغول ہے۔ گانے کی آواز پھر شروع ہو جاتی ہے۔ ایکٹریس اپنی کرسی میں پہلو بدلتے ہوئے کہتی ہے)

ایکٹریس:۔ "اپنے آپ کو دھوکا دینے کی بھی حد ہوتی ہے ....."

(ایکٹر او توجّہ سے سننے لگتا ہے مینیجر ایک بار آنکھیں اُٹھا کر ایکٹریس کی طرف دیکھتا ہے، پھر اپنا رجسٹر دیکھنے لگتا ہے فلسفی آنکھوں کو چھت سے ہٹا کر انہیں ایکٹریس کے چہرے پر گاڑ دیتا ہے)

"..... اپنے آپ کو دھوکا دینے کی بھی حد ہوتی ہے۔ یہ شمشاد بائی ہے نا! وہی جو سلور ٹاکیز میں کام کرتی تھی۔ شاید اپنے کو ادا کاروں کی پہلی صف میں سمجھتی ہے۔ وہ کون سی تصویر تھی مینیجر جس میں اس نے ابھی ابھی کام کیا ہے؟ وہی جو پربھات سینما ہاؤس میں چل رہی تھی، بھولی بھالی یاد۔ کیا نہیں پرانی یاد"۔ اُس میں اس نے ہیروئن کا کام کیا ہے نا! ہیرو کی محبوبہ بنتی ہے۔ بڑے گھر کی بہو، یہ خوب! یہ بازار کی چھوکری۔ یہ کیا جانے اونچے گھر کی لڑکیوں میں کیا قدرتی نفاست ہوتی ہے۔ کتنے ہاتھ پاؤں چلاتی تھی۔ کیسے آنکھوں کو مٹکاتی تھی۔ نخروں سے بھی کبھی کوئی بڑا بنا ہے۔ لیکن اس بے چاری کو کیا معلوم۔ وہ تو سمجھتی ہوگی میرے ایکٹنگ میں جادو ہے۔ تصویر دیکھ کر تو مجھے خود شرم آ رہی تھی لیکن اُس پر غصّہ آنا بیکار ہے۔ وہ اس قابل ہی نہیں۔ ہاں مجھے یہ افسوس ضرور تھا کہ ڈائرکٹر کی عقل پر کیا پتھر پڑ گئے تھے۔ اُس نے شاید اس کے گلے کی مٹھاس پرست ہو کر اس کو ہیروئن کا پارٹ دے دیا (گانے کی آواز تیز ہو جاتی ہے) گانا! چلو مینیجر، ہم بھی سُنیں، گانا تو بُرا نہیں معلوم ہوتا .....

(ایکٹریس اُٹھ کر چلنے لگتی ہے۔ ایکٹر بھی اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور ایکٹریس کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ مینیجر اور فلسفی بیٹھے رہتے ہیں۔ صرف نگاہوں سے دونوں جانے والوں کا پیچھا کرتے ہیں۔ ایکٹریس دروازے تک پہنچ کر رُکتی ہے، ایکٹر بھی ٹھہر جاتا ہے۔ وہ مُڑ کر مینیجر اور فلسفی کی طرف دیکھتی ہے مینیجر کی آنکھوں میں نفرت ہے۔ گویا کہہ رہی ہوں "میری طرف سے جہنّم

میں جاؤں، مجھے کیا؟ [فلسفی کی آنکھوں سے مہربانی اور ہمدردی ٹپکتی ہے ...]
ایکٹریس [کچھ سوچ کر] کیا جانا ہے۔ جاکر اپنے آپ کو ہی ذلیل کروں گی۔ یہ "سلور مووی ٹون" تو ہے نہیں جہاں محض گانے کے بل پر کسی کو ہیروئن کا پارٹ دے دیا جائے گا [واپس اپنی جگہ پر آتے ہوئے] ہمارے ہیرو کو یوں ایک ہی چھلانگ میں چوٹی پر پہنچ جانا ٹھیک نہیں لگتا۔ اُس کا کہنا ہے کہ چھت پر جانے کے لئے آہستہ آہستہ ایک ایک سیڑھی چڑھ کر جانا ضروری ہے۔ اچھی طرح سے سوچ سمجھ کر، ہر ایک سیڑھی پر پیر جما کر، یوں گرنے کا ڈر نہیں رہتا۔ قابلیت سے چوٹی پر پہنچے ہوؤں کو لڑھکنے کا خدشہ نہیں ہوتا [فلسفی اور منیجر کی طرف دیکھ کر] تمہیں پتہ نہیں ہے فلسفی! کہ ہمارا ہیرو کی ہستی طبیعت کو کس قدر جِلا دیتی ہے، سمندِ طبع کے لئے ایک تازیانہ کا حکم رکھتی ہے۔ میرے فلموں میں آنے کی وجہ بھی تو وہی ہے [چہرے پر چمک آجاتی ہے۔ اپنے ہینڈ بیگ میں سے آرام سے ہیرو کا ایک چھوٹا سا فوٹو نکال کر اُسے بڑی عزت اور پیار کی نگاہوں سے دیکھتی ہے] میں اُس کی کتنی ممنون ہوں۔ اُس نے مجھے اپنی دلی خواہشوں کو پورا کرنے کا موقع دیا۔ ہیرو کے ایکٹنگ کا مجھ پر گہرا اثر تھا۔ جس جس فلم میں اُس نے کام کیا میں اُسے بار بار دیکھا کرتی تھی۔ مجھے یہ خیال ہونے لگا تھا کہ ہیرو دل میں بہت دکھی ہوگا۔ میرے خیال میں اُسے آج تک ایسی کوئی ہیروئن نہیں ملی تھی جو اپنے باکمال ایکٹنگ سے ہیرو کی دبی ہوئی طاقتوں کو اُکسا سکے۔ اسی لئے مجھے ہیرو کا کام ہمیشہ اچھا تو معلوم ہوا لیکن اس میں کسی الہامی کیفیت کی کمی تھی۔ وجہ یہ کہ اگر کوئی ہیروئن گانا اچھا جانتی تو اداکاری میں بالکل کوری ہوتی۔ کوئی صرف خوبصورت ہوتی کسی کا صرف تلفظ ٹھیک ہوتا لیکن سبھی دلی جذبات کو خوش اسلوبی سے ظاہر کرنے میں ناکامیاب رہتیں۔ میں ہیرو کی فلموں کو بار بار دیکھتی گھر پر آتی تو اپنے کو ہیروئن سمجھ کر ایک خیالی ہیرو کے ساتھ پارٹ ادا کرتی ۔ آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر تصویر کے واقعات کو دہراتی۔ ہیروئن کو یوں کرنا چاہیئے تھا، یوں۔ تب تصور میں سوچتی کہ کیسے میرے اعلیٰ ایکٹنگ سے ہیرو کے فن کی برتر طاقتیں خواب سے بیدار ہو رہی ہیں۔ کیسے وہی تصویر جو ہیروئن کی لاعلمی کی وجہ سے ایک معمولی فلم تھی، اب بڑھتے بڑھتے فن کے لحاظ سے ایک اونچے درجے کا کھیل بن گئی ہے۔ بس ہیرو کو ایک مجھ جیسی پڑھی لکھی ہیروئن کی ضرورت ہے۔ آئینے کے سامنے کھڑی کھڑی میں اپنے فن کی قابلیت کے نشے میں جھومنے لگتی اور انہی دنوں جب میں نے تازہ تازہ بی۔اے پاس کیا تھا اور جب میرے دل میں آرٹ اور فن کو ترقی دینے کا جوش تھا۔ مجھے سہارا دینے کے لئے ہیرو خود آ پہنچا۔ میری آرزوؤں کو مجسم صورت دینے کے لئے ایک دیوتا کی طرح نمودار ہوا۔ پردہ سیمیں پر وہ صرف ایک خوبصورت فن کار معلوم ہوتا تھا۔ لیکن حقیقت میں وہ اس سے بھی بڑھ کر نکلا میں تو اس پر شیفتہ ہو کر رہ گئی۔ میں فلموں میں آنا چاہتی تھی۔ لیکن اس سے پہلے مجھے ڈر معلوم ہوتا تھا۔ میں سمجھتی تھی کہ ایک اچھے گھر کی لڑکی کے لئے سٹوڈیو سے بڑھ کر دوسری کوئی بُری جگہ ہو ہی نہیں سکتی، یہ خوف اب دور ہو گیا جس فلم کمپنی میں ہیرو جیسا سادہ لوح اور اچھا فن کار ہو وہاں برائی کبھی نہیں آسکتی۔ میرے خیال میں ہیرو سے کسی بُری حرکت کی اُمید کرنا ہی گناہ تھا، اس بات کا مجھے پورا یقین ہو گیا اور ایک بات ایسی ہوئی کہ میرا فلم کمپنی میں جانے کا ارادہ اور بھی پختہ ہو گیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ ہیرو اور کمپنی کا مالک ہمارے شہر میں ایک خاص کام کے لئے آئے ہیں۔ دونوں کا خیر مقدم کرنے کے لئے کچھ لوگوں نے چائے پارٹی دی۔ اُن کو سپاسنامہ بھی پیش کیا گیا۔ اس کے جواب میں ہیرو نے اُٹھ کر شہر کے لوگوں کا شکریہ ادا کیا کہ اُس کے لئے شہر والوں کے دل میں اتنی عزت ہے۔ اس کے بعد ہیرو نے کہا، کہ میں تو ہمیشہ یہی کوشش کرتا رہا ہوں کہ کسی نہ کسی طرح آرٹ کی خدمت کرسکوں۔ مجھے خوشی ہے کہ شہر میں فن کی قدر کرنے والے اور اسے سمجھنے والے موجود ہیں میرا دل دھڑک اٹھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا گویا ہیرو کا اشارا میری ہی طرف ہے۔ گویا وہ میری طرف ہی دیکھ رہا ہے اور یہ سن کر تو میں جھوم اٹھی کہ وہ وقت آپہنچا ہے جب فلم کمپنیوں کو بے علم اور جاہل آدمیوں سے اور بازاری عورتوں کی گندگی سے صاف کر دیا جائے۔ سینما بھی ایک آرٹ ہے باقی فنون سے برتر کیونکہ اس میں ہم ہیرو اور ہیروئن کو دیکھ سکتے ہیں۔ اُن کے سُکھ دُکھ ہماری نگاہوں کے سامنے ہوتے ہیں۔ ہم اُن سے ہم آہنگ ہوسکتے ہیں۔ آج تک ہندوستان کے سینما کی بُری حالت اس لئے رہی ہے کہ ابھی تک شریف گھرانے کی بہو بیٹیاں اس میں آنے سے جھجکتی رہی ہیں۔ میں انہیں یقین دلانا چاہتا ہوں کہ اب فلم کمپنیوں میں گندگی کا زمانہ ختم ہونے کو ہے۔ جوان لڑکیاں اپنے گھر کے اصولوں کو۔ اپنے ولولوں کو۔ اپنی عصمت کو کسی قسم کے ڈر اور خطرے کے بغیر محفوظ رکھ سکیں گی۔...کم سے کم ہماری فلم کمپنی میں تو کوئی خدشہ نہ ہوگا۔ اب احیائے قومی کا وقت ہے۔ سبھی فنون میں ایک نئی زندگی کا موقع ہے۔ اُدے شنکر کو دیکھئے سادھنا بوس کو دیکھئے انہوں نے ناچ کے فن کو بازاری عورتوں کے پنجے سے چھڑا کر ایک قومی فن کا درجہ دیا ہے۔ دشنو دگمبر اور اونکار ناتھ کو دیکھئے انہوں نے موسیقی کو میراسیوں کے پنجے سے چھڑایا ہے۔ اور یہ سب لوگ اچھے گھرانوں کے ہیں۔ ملک و قوم اور فن کی ترقی کے لئے انہوں نے اپنا سب

کچھ قربان کر دیا۔ اور آج ہر گھر میں طبلہ اور گانا سکھایا جاتا ہے۔ ایسے ہی اب فلمی صنعت میں بھی قربانی کی ضرورت ہے۔ طوائفوں اور بازاری عورتوں سے تو اس آرٹ کی ترقی ہو چکی۔ اس نئی زندگی کے لانے میں جب تک اچھے گھر کی بہو بیٹیاں حصّہ نہیں لیں گی اس فن کی کتنی معلوم! کتنا بھڑکانے والا پیام تھا۔ مجھے یوں معلوم ہونے لگا کہ مجھے بلاوا آپہنچا ہے۔ میرے دل سے ایک آواز آئی "اُٹھ! جا! ایک قومی صنعت کو تیری خدمات کی ضرورت ہے۔ سماجی بندھنوں کو توڑ ہمت اور حوصلے سے کچھ کر کے دکھا" ہیرو خود اچھے گھر کا لڑکا تھا۔ وکالت پاس کر چکا تھا اور اب اُس نے اپنا سب کچھ فلمی صنعت کے لئے وقف کر دیا تھا۔ میرا سر اُس کے قدموں پر جھکنا چاہتا تھا۔ میرے دل میں اپنی برتری کا طوفان اُمڈا پڑتا تھا۔ کچھ کر کے دکھانے کی تمنا میرے دل میں تھی۔ دنیا میں نام پیدا کرنے کی مجھے خواہش تھی۔ اس سے اچھا کونسا موقع ہو سکتا تھا۔ میں نے ہیرو سے فلمی صنعت میں جانے کی خواہش ظاہر کی۔ اُس نے مسکرا کر "ہاں" کہا۔ فلسفی، مجھے اب تک یاد ہے کہ "ہاں" کہتے وقت ہیرو کی آنکھوں میں ایک عجیب چمک سی آ گئی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس نے بھی مجھ میں اپنی دلی ہیروئن کو پہچان لیا ہو۔ میں خوشی سے پھولی نہ سمائی۔ گھر والوں نے کچھ کہا سنا۔ نگار خانے کے گندے ماحول کا ذکر کیا۔ باپ دادا کے نام اور آبرو کا واسطہ دلایا۔ لیکن میں تو فیصلہ کر چکی تھی۔ میری آرزو یہ تھی کہ ان سب کو دکھا دوں کہ ایک کامیاب ایکٹریس بننے کے لئے اپنی عصمت کو پچانا یا اپنے کو ذلیل کرنا ضروری نہیں ہے۔ میں انہیں یہ بتا دینا چاہتی تھی کہ اصلی فن اور بلند خیالات ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کئے جا سکتے۔ اور فلسفی، میں خوش ہوں کہ میں چلی آئی۔ میں نے ابھی تک اپنی عزت پر آنچ نہیں آنے دی۔ خوشی سے گھر کا کاروبار بھی چلا رہی ہوں اور رفتہ رفتہ فلمی دنیا میں بھی نام پیدا کر رہی ہوں۔ ہیرو نے کہا تھا۔ "دھیرے دھیرے قدم اٹھانا" میں اُس کی نصیحت پر عمل کر رہی ہوں۔ پہلی تصویر میں میں نے نوکرانی کا پارٹ ادا کیا تھا۔ دوسری میں بھکارن کا۔ پچھلی تصویر میں میں ہیروئن کی سہیلی بنی تھی۔ آہستہ رفتاری ہے لیکن یقیناً میرے قدم آگے بڑھ رہے ہیں۔ ایک دن میری تمنا بر آئے گی۔ ایک دن جب میری اداکاری پختہ اور بے عیب ہو جائے گی تو ہیرو مجھے اپنے ساتھ ہیروئن کا پارٹ دے گا۔ تب دنیا دیکھے گی کہ آرٹ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا کسے کہتے ہیں اور آج یہ بازار کی چھوکری ہیروئن بننے آئی ہے۔ ہمارے ہیرو کے ساتھ بلبلیں بھی جنت کے خواب دیکھنے لگیں۔ یہ خوش! قہقہہ۔ [ایکٹریس ہیرو کے فوٹو کو ہاتھ میں تھامے کرسی میں پیچھے کو سر پھینک کر قہقہہ لگاتی ہے۔ اس کی گردن ــــ لمبی حسین گردن اور بھی حسین دکھائی دینے لگتی ہے۔ فلسفی اس کی طرف ہمدردی اور رحم کی نظروں سے دیکھ کر کہتا ہے]

فلسفی۔ تم کبھی ہیروئن نہیں بنو گی۔ اگلی تصویر کی ہیروئن شمشا دبائی ہو گی۔۔

[ہیروئن کی ہنسی یکایک رُک جاتی ہے۔ وہ فلسفی کی طرف دیکھ کر کہتی ہے]

ایکٹریس۔ نہیں یوں کبھی نہ ہو گا، یوں بھلا کیوں ہونے لگا!

فلسفی۔ تم نے ہیرو سے اپنے جسم کو محفوظ رکھا، تم کبھی ہیروئن نہیں بنو گی۔۔۔۔۔۔۔

ایکٹریس۔ آہ! [ایکٹریس زور سے ہنسنے لگتی ہے۔ پھر ایک دم رُک جاتی ہے۔ اُس کے چہرے پر ایک خلا سی آ جاتی ہے۔ جوں جوں فلسفی کی بات کا مطلب اس کی سمجھ میں آنے لگتا ہے۔ آنکھیں اور بھی کھل جاتی ہیں] جسم، فلسفی (وہ بھولی ہوئی سی ایکسٹرا اور مینیجر کی طرف دیکھتی ہے پھر ہاتھ میں تھامی ہوئی ہیرو کی تصویر پر نگاہ ڈالتی ہے اور پھر تھرائی ہوئی آنکھوں سے کچھ دیر تک فلسفی کی طرف دیکھتی رہتی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ اپنے آپ پر قابو پا کر کہتی ہے] جسم! فلسفی میں نے ابھی تک اپنا جسم نہیں بیچا۔ تم ٹھیک کہتے ہو میں ہیروئن نہیں بنوں گی۔ اب ساری باتیں میری سمجھ میں آنے لگی ہیں کتنی کھوکھلی ہنسی تھی اس کی جب میں نے اُسے پہلی دفعہ بتایا تھا کہ میری شادی ہونے لگی ہے وہ ایک منٹ تک! بالکل گم سم ہو کر میری طرف دیکھتا رہا تھا پھر ایک پھیکی سی ہنسی کے ساتھ اس نے کہا تھا "بڑی اچھی بات ہے۔ میری طرف سے مبارکباد قبول کیجئے" مجھے کیا معلوم تھا۔ یہ ہنسی اس فلم کمپنی میں میری ترقی کی موت کا وارنٹ ہے۔ میں تو شادی کر کے ہمیشہ کے لئے اپنے جسم کو اپنے خاوند کے سپرد کر چکی تھی۔ میں ہیروئن کیسے بنتی! ہیرو میری بے وقوفی پر ہنستا ہو گا۔ میں کتنی بھولی نکلی تھی میں نے ایک چالاک آدمی کی باتوں پر یقین کر لیا تھا۔ [ایک پھیکی مسکراہٹ چہرے پر لا کر] اور تمہیں پتہ ہے فلسفی کہ میں نے شادی کیوں کی تھی۔ ہیرو نے کہا تھا کہ ہمیں باعصمت اور عزت والی عورتیں چاہئیں۔ مجھے اپنی عزت کو محفوظ رکھنا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ بدقسمتی سے میں خوبصورت تھی۔ میری پہلی فلم کے بعد ہی میرے دوستوں کا حلقہ بہت بڑھ گیا۔ سبھی مجھ کو اپنا بنانا چاہتے تھے۔ اُن کے خیال کے مطابق تو سینما میں کام کرنے والی سبھی عورتیں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ انہیں کیا معلوم کہ ایکٹریس بھی عصمت اور عزت کی قدر کرنے والی ہو سکتی ہیں۔ اپنے آپ کو بچانے کے لئے میں نے بیاہ

کر لیا۔

فلسفی میں بھول گئی کہ زبان تو چالاک آدمیوں کے پاس اپنے خیالات کو چھپانے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ انہیں ظاہر کرنے کا نہیں۔ مجھے ہیرو کی باتوں نے کتنا دھوکا دیا تھا۔ اُس نے کہا تھا ہم اپنے نگار خانے میں اچھے اخلاق والوں کو پسند کرتے ہیں اور دوسری بھولی لڑکیوں کی طرح میں بھی سمجھ بیٹھی کہ مرد جو کچھ زبان سے کہتا ہے اُس کے دل کا مطلب بھی وہی ہوتا ہے۔ اُس نے کہا تھا "ہندوستان کی فلم کمپنیوں کی نجات اسی میں ہے کہ اِن کو بُرے اثرات سے پاک کیا جائے اور یہ تبھی ہوگا جب اچھے گھرانوں کی لڑکیاں پردے سے باہر آکر ہماری تحریک میں شامل ہوں۔ میں انہیں یقین دلانا چاہتا ہوں ہمارے ہاتھوں میں اُن کی عزت محفوظ رہے گی۔ اُن کو ہماری کمپنی میں آکر پچھتانے کا موقعہ نہیں ملے گا"۔ مجھے اس سے زیادہ اور کسی ضمانت کی ضرورت ہوسکتی تھی؟ میں اُس کے جھانسے میں آگئی۔ اب قصوروار کس کو ٹھہراؤں؟ میں خود یہ دھوکا کھانا چاہتی تھی۔ میں اُس کے برتاؤ سے شکل وصورت سے اور علم سے مرعوب ہوگئی تھی۔ اُس نے میری کمزوریوں کا پورا فائدہ اٹھایا۔ تم نے میری آنکھیں کھول دی ہیں فلسفی! مجھے آئے ہوئے دو سال ہو گئے ہیں لیکن آج تک میں ہیروئن نہیں بن سکی۔ ہیرو برابر مجھے ٹالتا ہی رہا ہے۔ کبھی کچھ کہہ کر، کبھی کچھ کہہ کر، اب سمجھی ہوں کہ ایسا کیوں ہوتا رہا۔ اُس کی خواہش تھی کہ میں اپنے آپ کو اُس کے حوالے کر دوں۔ پھر میری قسمت کا ستارا جھٹ عروج پر آجاتا۔ لوگوں نے مجھ سے کہا تھا کہ ہیرو جتنا دیکھنے میں بھولا بھالا ہے اتنا دل کا صاف نہیں ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ میری ساری زندگی خراب ہو جائے گی۔ سینما میں —— آج کل کے ہندوستانی سینما میں تو ترقی کا واحد راستہ اپنے حُسن سے ناجائز فائدہ اٹھانے میں ہے۔ ہوتا ہوگا میں نے کہا تھا اب اصلاح کا زمانہ ہے۔ اب فنونِ لطیفہ کو طوائفوں اور بدمعاشوں کے ہاتھوں سے بچانے کا موقعہ آپہنچا ہے۔ اپنے آپ میں گُن ہوں، حوصلہ ہو، تو سب کچھ ہوسکتا ہے۔ مجھے سیٹھ کی طرف سے تو کچھ اُمید نہ تھی۔ وہ تو کمزوریوں کا پتلا تھا۔ اُس کی تو ساری زندگی صرف عورتوں کے جسم دیکھنے ہی میں گزر رہی تھی لیکن مجھے ہیرو پر بھروسہ تھا۔ وہ میرے تصوّر کا دیوتا تھا۔ اُس کے خلاف میں کوئی بات سننے کو تیار نہ تھی۔

ہیرو نے کہا تھا سیڑھی کے پہلے زینے سے کام شروع کرو۔ بنیاد پختہ ہونی چاہیئے۔ مجھے بھی ایک دفعہ فلم کا درخشاں ستارہ بن کر پھر ہمیشہ کے لئے غروب ہو جانا پسند نہ تھا۔ لیکن اب معلوم ہوا بات تھی جس کے لئے وہ مجھے پہلے زینے سے کام کرنے کو کہتا تھا تاکہ میں اچھی طرح سے اس کے شکنجے میں پھنس جاؤں۔ فلم میں کام کرتے وقت میں نے اپنی طرف سے کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ لوگوں نے بھی میرے کام کو بہت پسند کیا تھا۔ نقادوں نے خاص طور پر میرے کام کی تعریف کی تھی انہوں نے مجھے پردۂ سیمیں کا ہونہار ستارہ کہا تھا۔ ہیرو نے بھی مجھے بتایا "تم اچھا کام کرتی ہو۔ ایک نہ ایک دن تمہیں ضرور ہیروئن کا پارٹ ملے گا"۔ لیکن یہ سب میری شادی سے پہلے کی باتیں ہیں۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ یہ سب سُکھ کے خواب تھے ہیروئن اب ایک دوسری عورت بنے گی۔ سنو اُس کا گانا [گانے کی آواز بلند ہو رہی ہے۔ آدھ منٹ تک سب خاموشی سے سنتے ہیں۔ ایکٹریس پھر مینجر کی طرف دیکھ کر کہتی ہے) خوش ہو جیئے مینجر صاحب آپ کے ہیرو کو ایک نئی ہیروئن ملی ہے اور آپ کو بھی۔ اب تو اگلے فلم میں چاندی ہی چاندی ہے (ہنستی ہے لیکن قہقہہ کچھ کھوکھلا سا ہے) ہمارا ہیرو اور یہ ہیروئن ایک کی صورت اچھی۔ اپنے کام کا ماہر ہے، من موہن ہے دوسرے کی زبان میں مٹھاس ہے، چال ڈھال میں نزاکت۔ فلم بہت کامیاب رہے گی۔ ایک تو اتنا مشہور ڈائرکٹر اور پھر یہ ہیرو اور ہیروئن کی جوڑی۔ میں کہتی ہوں مینجر صاحب سیٹھ تو نہال ہو جائے گا۔ آپ کو بھی ترقی مل جائے گی۔ سیٹھ نے جو نیا سٹوڈیو بنانے کا ارادہ کیا تھا وہ بھی پورا ہو جائے گا۔ میرے ہیروئن بننے سے بھلا یہ باتیں کہاں ہو سکتی ہیں ۔۔۔۔۔

ایکٹر: ۔ نہیں نہیں میری رانی، تم ہیروئن بنو گی۔ میں کہے دیتا ہوں سیٹھ کو تمہیں ہیروئن بنانا پڑے گا۔ میں کمپنی کو چھوڑ جانے کی دھمکی دے دوں گا۔ تمہیں فکر کس بات کی ہے میری رانی؟ یہ بازاری چھوکری ۔۔۔۔۔

ایکٹریس: ۔ [بات کاٹی جانے کی وجہ سے غصّے سے بھری ہوئی ایکٹر کی طرف دیکھتی ہے پھر مینجر کو مخاطب کرکے اپنی بات جاری رکھتی ہے] میں ٹھہری ایک معمولی عورت۔ مجھے اداکاری بھلا کہاں سے آئے۔ میں کچھ قربانی کئے بغیر ہیروئن بننا چاہتی تھی۔ آنف

حوصلہ . . . . . !

ایکٹر:- نہیں میرے دل کی رانی تم اب بھی میری ہیروئن بنو گی۔ تم . . . .

ایکٹریس:- [اچانک اُس پر جھپٹ کر] چپ رہ بدتمیز! کل کے چھوکرے! تو بھی مذاق کرنے چلا ہے۔ مجھے اپنی ہیروئن بنائے گا۔ یہ خوب! جس کو بنانا چاہیئے تھا وہ تو اوروں کے تلوے چاٹتا پھرتا ہے۔ اور اب آپ میرے ہیرو بنیں گے! اُس نے تو مجھے ہیروئن بنانے کا معیار میرے جسم کو ٹھہرایا تھا، تم کیا چاہتے ہو؟ کچھ نہیں؟ جھوٹا! بکتے ہو۔ آدمی ہمیشہ عورتوں سے ایک ہی چیز مانگا کرتے ہیں۔ وہ قیمت ادا کئے بغیر کوئی عورت کامیابی کی منزل تک نہیں پہنچ سکتی۔ یہ دنیا آدمیوں کی بنائی ہوئی ہے۔ یہاں مردوں کو اپنے حلوے مانڈے سے کام ہے عورت دوزخ میں جائے یا بہشت میں "کُتا تبھی ہاتھ چاٹتا ہے کہ اُسے ہڈی کی امید ہو۔ تم لوگ طرح طرح کے جال پھیلاتے ہو۔ مگر تم سب کی منزل ایک ہی ہوتی ہے۔ تمہارے ہیرو ہی کے ہاتھوں میں اس کمپنی میں نوکری ڈھونڈنے والی عورتوں کی قسمت ہے۔ اس کو اپنی طاقت کا علم ہے۔ ایک کے بعد کئی عورتیں یہاں ہیروئن بننے کے لئے اپنی قیمت چکانے آتی ہیں۔ وہ سیر ہو چکا ہے۔ نواب کو دھن کی کھوج میں نہیں جانا پڑتا۔ امیر بننے کے خواہشمند خود ہی اس کے پاس کھنچے چلے آتے ہیں۔ ہیرو بھی اپنی طاقت کے نشے میں مست پھرتا ہے۔ صرف شروع میں اپنا جال پھیلاتا ہے کہ بھولی عورت پھنس جائے۔ پھر اُسے بھول جاتا ہے وہ آپ ہی اُس کے پاؤں چومنے آئے گی۔ اُس نے میری کمزوریوں سے پورا فائدہ اٹھایا ہے اور لڑکیوں کی طرح مجھے بھی سینما کا شوق تھا خوش کن تصورات اور تمنائیں سب کی زندگی میں ہوتی ہیں۔ ہر کسی کی زندگی میں ایک ایسا وقت آتا ہے جب تخلیقی کام کرنے کی خواہش بہت شدت اختیار کر جاتی ہے۔ یہ تغیر کا وقت ہوتا ہے۔ بہت خطرناک! زندگی کی کشمکش میں کودنے سے پہلے ہی ایسے موقعے آیا کرتے ہیں اور پھر کشمکش ہر کسی کو ایک عام انسان بنا دیتی ہے۔ میں بھی زندگی کے ایسے ہی دَور سے گذر رہی تھی میں اپنی چھپی ہوئی طاقتوں کی نمائش چاہتی تھی۔ ہیرو نے کہا "چلو چلو میرے ساتھ بمبئی چلی آؤ"۔ اور یہاں لاکر اُس نے مجھے خود راستہ ڈھونڈنے کے لئے چھوڑ دیا۔ جب کبھی کوئی ایکٹریس اُس کے پاس ہیروئن بننے آئے گی تو وہ اُسے اِس بلند مقام کی قیمت بتا دے گا۔ شادی کر کے میں تو اپنے خاوند کی ہو چکی تھی۔ لیکن تم تو ابھی ہیرو نہیں ہو۔ تمہارے ہاتھوں میں ابھی کسی کی قسمت کے بنانے یا بگاڑنے کی طاقت نہیں ہے۔ تم یہ سوچ کر کہ عورتیں خود بخود تمہارے پاس دوڑی آئیں گی، آرام سے نہیں بیٹھ سکتے۔ تمہیں خود اُن کے پاس جانا پڑتا ہے۔ اُن کی تعریف کرنی پڑتی ہے۔ اپنے آپ کو ذلیل کرنا پڑتا ہے۔ تمہیں خیال ہے تم اونچے درجے والی عورت چاہتے ہو۔ لیکن تم اپنے کو اور دنیا کو دھوکا دے رہے ہو۔ اصل میں تم خواہش کر رہے ہو ایسی عورت کی جو تمہیں آسانی سے نہیں مل سکتی۔ جو تمہاری پہنچ میں ہیں اُن کی تم پروا نہیں کرتے۔ آسانی سے ملے ہوئے پھل کو چکھنے سے دل کی ہوس نہیں مٹتی۔ تمہاری مردانگی کو صدمہ پہنچتا ہے جب تمہیں خیال آتا ہے کہ ابھی تک تم کسی اچھے گھر کی لڑکی کو نہیں پھانس سکے اور تم اُن کی محبت کا ڈھونگ رچاتے پھرتے ہو۔ آدمی ہمیشہ اپنے آپ کو طاقت اور عقل کا واحد نگہبان اور رکھوالا سمجھتا ہے۔ ہر ایک پر اپنا سکہ جمانا چاہتا ہے اور اس کے لئے کیا کیا جال بچھاتا ہے۔ ہیرو اپنی طاقت کے رعب سے شکار پھانستا ہے لیکن تمہارے پاس کچھ نہیں ہے۔ اس لئے تم ناک رگڑ کر یہ کام نکالنا چاہتے ہو۔ کسی اور کے پاس پیسہ ہوگا وہ پیسے کا لالچ دے کر اپنا جال پھیلائے گا۔ اُس کو اپنی دولت ہی اپنی سب سے بڑی طاقت نظر آئے گی۔ مجھے تو حیرانی ہوتی ہے کہ مردوں کی اصلی تمنا کتنی محدود ہوتی ہے۔ سب کی ایک ہی منزل ہوتی ہے۔ عورت۔ عورت نہیں۔ عورت کا جسم۔ چشت [اپنے ہاتھ میں ہیرو کی تصویر کی طرف دیکھتی ہے] یہ تمہارا ہیرو ہے۔ سارے مردوں کا نمائندہ۔ سب جھوٹ! مایا! کسی زمانے میں یہ میرا دیوتا ہوا کرتا تھا۔ دیوتا بھی کبھی کبھی دھوکا دے دیا کرتے ہیں۔ اس کا انجام یہی ہے۔

[تصویر کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے زمین پر پھینک دیتی ہے اور اُسے پاؤں تلے روندتی ہے۔ ایکٹر جو ایکٹریس کے اس طرح پھوٹ بہنے سے ہکّا بکّا رہ گیا تھا، اب بھی ویسے ہی منہ کھولے کھڑا رہ جاتا ہے۔ مینجر بھی اس واقعہ سے کسی قدر حیران ہوتا ہے۔ فلسفی ویسے ہی غور سے ایکٹریس کی ہر بات، ہر اشارے کو دھیان سے دیکھ رہا ہے اور کچھ سوچ کر مسکرا رہا ہے۔

اچانک گانے کی آواز بند ہو جاتی ہے۔ پھر ہیرو رہرسل کے کمرے سے نکل کر تیزی سے دالان کی دوسری طرف جاتا ہے۔ ایکٹریس جو ابھی تک کھڑی ہے دھڑکتے ہوئے دل سے اس کی طرف دیکھنے لگتی ہے۔ ایک لمحہ بعد ہیرو پھر اسی تیزی سے ایک پانی کا گلاس لئے ہوتے رہرسل کے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ ہمارے کمرے میں خاموشی ہے۔ سبھی اپنی آنکھوں سے ہیرو کی ہر حرکت کا پیچھا کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ کچھ وقت یوں ہی گزر جاتا ہے۔ اتنے میں گانے کی آواز پھر شروع ہو جاتی ہے۔ مینجر کہتا ہے [

مینجر۔ پانی کا گلاس ـــــ آج تو ہیرو نئی ہیروئن کو اپنے ہاتھوں سے پانی پلا رہا ہے! کیا بات ہے ہیرو کی!

(سب چپ رہتے ہیں)

مینجر:۔ ہماری ایکٹریس کے اب آخری دن آگئے ہیں۔ چلو جھگڑا ختم ہوا۔۔۔

ایکٹریس:۔ چلو جھگڑا ختم ہوا۔ [آہستہ آہستہ اپنی کرسی پر جا بیٹھتی ہے]

چلو۔۔۔۔۔ جھگڑا۔۔۔۔ ختم ہوگیا۔ ایک اور عورت کی زندگی میں اصلیت کا دخل ہوا۔ ایک اور عورت کی کشتی کشمکش کے بھنور میں پھنس کر ٹوٹ گئی۔ قصور کسی کا نہیں۔ میں نے دنیا کو ایماندار اور اچھا سمجھا تھا۔ اسی غلطی کا خمیازہ بھگت رہی ہوں۔ اپنی سادگی پر منسوں یا آنسو بہاؤں اور آج میں اپنی ایک نئی تصویر ہیرو کو دکھانے کے لئے لائی تھی [اپنے بیگ سے اپنا ایک فوٹو نکالتی ہے]

اپنے خیال میں تو بہت ناز سے تصویر کھچوائی تھی۔ گردن تھوڑی سی جھکی ہوئی آنکھیں آدھی بند، کانوں میں نئی قسم کے کانٹے۔ لبوں پر مسکراہٹ۔ کس کے لئے؟ (مسکراتی ہے) یہ تصویر اخباروں میں جانی تھی۔ آدرش کریم کے اشتہار کے لئے۔ کریم والوں نے مجھے بہت خوبصورت سمجھا تھا نا۔ کہنے لگے تمہاری بھی شہرت ہوگی۔ اور ہماری کریم بک جانے میں بھی سہولت ہوگی۔ شہرت! میرے لئے دنیا کی نگاہوں میں شہرت حاصل کرنا ضروری تھا نہ۔ لوگوں میں مشہور ہوئے بغیر ہیرو مجھے ہیروئن کا پارٹ کیسے دیتا (تصویر کو مخاطب کر کے) کیوں میری ہیروئن! تم نے اپنا شوق پورا کر لیا؟ بہت تمنائیں، بہت ولولے ساتھ لے کر آئی تھیں۔ تم نے سوچا تھا، میری بھولی ہیروئن! کہ زندگی کا راز تخلیقی جوہر میں ہے۔ تمہاری خواہش تھی کہ یہ جو دل میں کچھ کام کرنے کی امنگیں اٹھ رہی ہیں اُن کی مدد سے دنیا کو پستی سے بلند کر دو۔ پیشتر اس کے کہ یہ امنگیں زندگی کی کشمکش کے دور میں آکر بجھ جائیں۔ تم زندگی کے اُس مرحلے سے گزر رہی تھیں جب دل چاہتا ہے کہ دنیا کے قواعد کی زنجیروں کو توڑ کر آدمی کہے "میں آزاد ہوں میں آزاد ہوں"۔ اے سماج کے ٹھیکیدارو! ہمارے مذہب اور ایمان کے نگہبانو! اے مکر و فریب کے مجسمو! جنہوں نے خدا کی دی ہوئی آزادی کو پاؤں تلے مسل دینے میں کوئی کسر نہیں رکھی، میں تمہیں ٹھینگا دکھاتی ہوں۔ میرے جی میں جو آئے گا وہی کروں گی۔ سماج کے مردہ جسم میں پھر سے روح پھونکوں گی، ایسی روح جس سے سماج کی زندگی میں پھر سے رونق آجائے۔ آدمی کے دل کے باغ میں پھر سے روحانی موسم بہار آجائے۔ خدا خود ایک خالقِ جزو کل ہے۔ اس نے ہمیں اس لئے دنیا میں بھیجا تھا کہ اپنی طاقت سے کوئی نئی چیز پیدا کر کے اپنی زندگی کو مکمل بنانے کی کوشش کریں۔ اُس نے ہر انسان کو پیدا کرنے کی طاقت عطا کی ہے۔ کوئی اپنے اندر سائنس کی چیزیں پیدا کرنے کی آگ چھپائے پھرتا ہے۔ کوئی فنون کی۔ اس طاقت کا صحیح استعمال کر کے ہی ہم اپنے پیدا کرنے والے تک پہنچ سکتے ہیں۔ مالا پھیرنے والوں نے جو دنیا کی پیدا کرنے والی طاقتوں کو مار دیا ہے اس سے دنیا کا بھلا نہیں ہوگا۔ میری لاڈلی ہیروئن! تو سنسار کا بھلا کرنے نکلی تھی۔ جا اب تیرا کام ختم ہوگیا۔ آرام سے گھر میں اپنے خاوند کے ساتھ بیٹھ جب بوڑھی ہو جائے گی تو رام نام کی مالا جپنا اور اپنے بچوں کو سکھانا کہ سکھ سبزی کی طرح اُگنے میں ہے، چھنے میں نہیں۔ ان سے کہنا "میرے بچو! آندھی کا سامنا خم ٹھونک کر نہ کرنا اس کے آگے دمے کے مریض کی طرح جھک جانا۔ اسی میں خیریت ہے۔ جب کبھی بھی دل میں تمنائیں خواہشیں پیدا ہوں والے اٹھیں اُن کو لوہے کے ہاتھ سے دبا دینا"۔ چلو جھگڑا ختم ہوگیا۔ تو میرے کس کام کی میری ہیروئن اب تو نہیں رہ۔

[یہ کہہ کر اپنی تصویر کو پھاڑنے لگتی ہے پھر رک جاتی ہے۔ ایک منٹ تک حسرت بھری نگاہوں سے اسے دیکھتی رہتی ہے تصویر بہت خوبصورت ہے پھر اچانک میز پر دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام کر سسکیاں بھرتے ہوئے رونے لگتی ہے۔ ایکٹر گھبرا کر کمرے میں اِدھر اُدھر چلتا ہے۔ مینجر بے پروائی کے انداز سے ایکٹریس کی طرف دیکھتا ہے۔ فلسفی کی آنکھوں میں ہمدردی اور رحم ہے۔ دوسرے کمرے میں گانا ابھی جاری ہے۔ ایکٹریس کی سسکیوں کی آواز گانے کی آواز میں گم ہو جاتی ہے۔ پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے]

دھرم پرکاش آنند

سخن ہائے گفتنی و ناگفتنی

فراق گورکھپوری کی یہ نظم موضوع اور فن کاری دونوں کے لحاظ سے ذرا وضاحت طلب ہے۔ فن کاری کے لحاظ سے تو صرف اسی قدر کہنا ہے کہ اس میں زحافات کا آزادانہ استعمال کیا گیا ہے۔ البتہ موضوع کے لحاظ سے بہت سے "سخن ہائے گفتنی" ہیں۔

موسیقی میں عوام کی پہنچ صرف غزل، گیت اور قوالی تک ہی ہے۔ بڑی مار کی تو ٹھمری میں بھی تھوڑا بہت لطف اٹھا لیں۔ دھرپد اور خیال کی باریکیاں صرف خواص ہی کے لئے مخصوص ہیں، شاعری کا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے۔ ہر شعر ہر کسی کے لئے نہیں لکھا جاتا۔ اردو میں تو ولی دکنی سے لے کر بہت عرصے تک واضح شاعری ہی ہوتی رہی۔ غالب وہ پہلا شاعر تھا جس نے چند منتخب افراد کو اپنا مخاطب بنایا، اگرچہ زوال دلّی کے باعث ماحول کی تن آسانی اُس کی مخالف رہی۔ غالب کے بعد جب ملکی نظام از سر نو قائم ہوا تو بہت عرصے تک لوگوں کو حالی کی فطرت پرستی ہی سے نجات نہ حاصل ہو سکی لیکن جوں جوں مغرب کے اثرات چھاتے گئے۔ ادب میں بھی نت نئی ترقیوں کے ساتھ ساتھ ایک باقاعدگی آتی گئی۔ البتہ مغربی ادب کے جدید ترین رجحانات کی نشو و نما اور تجربے اردو میں گذشتہ دس پندرہ سالوں سے شروع ہوئے اور ہیئت اور موضوع کے لحاظ سے اردو شاعری میں انقلابات آئے حفیظ جالندھری ہیئت کے لحاظ سے انقلاب لاہلیں مہاشہ ہیئت اور موضوع دونوں لحاظ سے ایک مثالی شاعر کہا جا سکتا ہے لیکن فراق گورکھپوری اس سلسلے میں ایک اجتماعِ ضدین ہے ہیئت کے لحاظ سے اُس کی محبوب صنفِ شعری غزل ہے۔ جو ہمارے ادب کی قدیم ترین اور بنیادی چیز ہے۔ لیکن موضوع اور ادائے بیان کے لحاظ سے اس میں چند ایسی باتیں ہیں جو صرف فرانس اور انگلستان کے مخصوص شعرا میں پائی جاتی ہیں۔ اپنی غزل کے متعلق لکھتے ہوئے ایک جگہ وہ کہتا ہے "میری غزلیں طویل ہو جاتی ہیں اور رنگینی کے لحاظ سے یہ بات مستحسن نہیں۔ لیکن میں فن برتنے کے لئے غزل نہیں کہتا۔ ہر غزل کی زمین میرے لئے ان تمام وجدانی کیفیات اور محرکات کی جولانگاہ بن جاتی ہے جو میری زندگی کے عناصر ہیں اور جو اس بحر اور ان قافیوں اور ردیفوں میں مئے سرجوش کی طرح چھلک آتے ہیں۔ میری شاعری کو صنفِ غزل سے بیک وقت ہم آہنگی بھی ہے اور طوالت کے لحاظ سے بغاوت بھی لیکن غزل کے علاوہ شاید میں نظموں میں اپنی زندگی اور اپنے وجدان کی حقیقی ترجمانی اتنی اچھی طرح نہ کر سکوں" ــــ اور اسی مضمون میں اپنے نظریۂ شاعری کے متعلق کہتا ہے "میرے نزدیک شاعری کا مقصد فطری جذبات اور احساسات کا اظہار نہیں ہے بلکہ اس کا اصلی مقصد ان جذبات اور احساسات کو کچھ اور بنا دینا ہے" ــــ اگر ہم فراق کے کلام کو اس نظریے کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کریں تو ان کیفیات تک ہماری پہنچ ہو سکتی ہے جن کے تحت شاعر کہتا ہے اور جن تک ہمیں پہنچانا ہی اُس کا مقصود ہے۔

ایک بات اس نظم کی زبان کے متعلق بجا بجا محاورات کے استعمال سے کہیں کوئی صاحب یہ نہ کہیں کہ "نظم ہے یا مجمع الامثال" ــــ کیونکہ اس نظم کی زبان بھی "فراقی کیفیات" کے عین مطابق ہے۔ ایک عام سیدھا سادہ سا لفظ مفہوم کی وہ گہرائیاں نہیں رکھتا جو کسی محاورے یا کہاوت میں ہوتی ہیں۔ محاورے یا کہاوت میں رنگوں اور سایوں کا ایک ایسا اجتماع پوشیدہ ہوتا ہے جو ترجمانی میں ایک سچا مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔

میراجی

پوچھ نہ جینے والوں کا حال (۱) ایک جان لاکھوں کا جنجال

دیکھیو اس بازی کا مآل ۲ حسن کی شہ ہے عشق کی چال

گرتی دنیا لے جو سنبھال ۳ ہے کوئی مائی کا لال

آج تو اُس نے بھی پوچھا حال ۴ اہلِ غم کے بڑے اقبال

کون ہے اصل اور کون مثال ۵ حسن و عشق میں فرق محال

باتوں باتوں میں پوچھ لے حال ۶ آج دلوں کا چور نکال

عشق کو لب پانا ہے محال ۷ ہم بھی تجھ سے چل گئے چال

کیا ہے جواب اور کیا تھا سوال ۸ اُسی ڈال سے پھر بیتال

ملکِ بقا کا چھوڑ خیال ۹ موت کے گھر میں ڈیرے ڈال

باطل وحق کا جواب محال ۱۰ تیری مثال نہ میری مثال

کل تھا عشق کا قحطِ رجال ۱۱ آج پڑا ہے حُسن کا کال

حُسن پہ عشق کا جادو ڈال ۱۲ کافر کو سانچے میں ڈھال

چکا چوند کا پوچھ نہ حال ۱۳ کوند رہی ہے برقِ جمال

مدبھری آنکھیں الھڑ چال ۱۴ او متوالے! ہوش سنبھال

پوچھ نہ اس کے حسن کا حال ۱۵ دل کا شکیب اور جی کا وبال

دور کی کوڑی لائی وہ آنکھ ۱۶ نیّت پانا اس کی محال

عشق ہیں غافل آنکھ تو کھول ۱۷ اک سپنا ہے ہجر و وصال

دل کو آنکھوں آنکھوں میں تول ۱۸ عشق کو باتوں باتوں میں ٹال

دل کی دھڑکن دے نہ سنائی ۱۹ اتنا کان میں تیل نہ ڈال

موت بھی نکلی ہے منہ پھیرے ۲۰ عشق ہے آج بہت بے حال

حسن کے رخ پر بڑھنے والے ۲۱ مات نہ دے تجھ کو یہ چال

جو بھی لگے ہوں عشق کے بھاؤ ۲۲ دام کے دام بکا یہ مال

تین ہاتھ میں تینوں لوک ۲۳ عشق کی ناپ کا پوچھ نہ حال

کوہِ طور تھا اک ٹھوکر کا ۲۴ عشق کی اوکھڑ کھابڑ چال

اہلِ ہوس کو مول نہ لے ۲۵ گراں پڑے گا کچّا مال

لوہا لوہے سے کٹتا ہے ۲۶ عشق کو آ ہی گیا جلال

چاند کٹورا چاندی کا ۲۷ سورج اک سونے کا تھال

حسن سے لڑلے جھگڑلے آج ۲۸ کل کو یہ بھی ہوگا محال

عین حقیقت جلوۂ رُخ ۲۹ زلف کے حلقے مایا جال

جان اور ایماں حُسن کا مول ۳۰ چوکھی قیمت چوکھا مال

اس کی ایک نگاہ میں ہیں ۳۱ مستقبل اور ماضی و حال

یاد نہیں یہ بھی کہ تری ۳۲ کیسی تھی صورت کیا خدّ و خال

ہم بھی تو اپنے نہ رہے ۳۳ کس کو پرکھتے آپت کال

گھوڑے بیچ کے سوئے ہیں ۳۴ پس ماندوں کا پوچھ نہ حال

گر تو عشق سے ہے چکنا چور ۳۵ بعد چڑھائی کے ہے وہ ڈھال

سُن کے شہادتِ عشق کا ذکر ۳۶ اہلِ ہوس کو بھی آیا حال

عشق سے حُسن، وفا کیا کرتا ۳۷ پہلے چُمّا کاٹا گال

اک دنیا میں سناٹا ہے ۳۸ اب غصّے پر پانی ڈال

اہلِ ہوس نے بڑھنا چاہا ۳۹ تجھ کو سمجھ کے پرایا مال

نکل گیا کچھ منہ سے اس کے ۴۰ اتنا دل میں کر نہ ملال

حُسن کا قول یہ تُو نے سنا ہے! ۴۱ اپنا وہی جو سب کا حال

دبا دبا سا درد اُٹھتا ہے ۴۲ ماہ بہ ماہ کہ سال بہ سال

ہم شاید اچھا ہی بتاتے ۴۳ تُو نے پوچھا تو ہوتا حال

واسطہ تیری مستی کا ۴۴ خود بھی سنبھل مجھ کو بھی سنبھال

اب اپنے انجام کو سوچ ۴۵ میرا مٹنا تو ہے محال

کل تھا بے سروساماں عشق ۴۶ آج حُسن بھی ہے کنگال
جس کی لاٹھی اُس کی بھینس ۴۷ دنیا کیا ہے اسی کی مثال
مارے گھٹنا پھوٹے آنکھ ۴۸ حُسن کی زد کا پوچھ نہ حال
فرقِ وفا و جفا مت پوچھ ۴۹ کون نکالے بال کی کھال
ٹھہرے ٹھہرے آنسو دیکھ ۵۰ گرتے گرتے خود کو سنبھال
ایسی لسنبک رفتاری آہ ۵۱ کر نہ دو عالم کو پامال
درد کی دولت بے پایاں ہے ۵۲ عشق کو کردے مالا مال
آج اس کی بے خبری سے ۵۳ پوچھ لے دنیا بھر کا حال
چھوڑ محبت کا کھٹراگ ۵۴ اس کا پانا امرِ محال
حیرت میں ہے تغافل بھی ۵۵ آج کہاں ہے تیرا خیال
ایک ہی عالم ایک ہی وقت ۵۶ عشق کی عمر میں ماہ نہ سال
جس کا ہو سکتا ہو جواب ۵۷ ناداں وہ بھی ہے کوئی سوال
جامِ شباب چھلک ہی گیا ۵۸ آ ہی گیا اس مے میں اُبال
صاف جبیں پر ڈال نہ بل ۵۹ دیکھ آئینے میں آئے نہ بال
آنکھ برابر کون کرے ۶۰ کس کی ہمت کس کی مجال
بنّا ہے تو مٹنا سیکھ ۶۱ چھوڑ یہ بحثِ کمال و زوال
عشق میں ڈھونڈھ نہ صبر و شکیب ۶۲ اے دل دیکھ یہ روگ نہ پال
آج دکھا تلوار کے ہاتھ ۶۳ اہلِ وفا کو کردے نہال

اپنی بلندی پستی دیکھ ۶۴ کیا آکاش اور کیا پاتال
عشق ہیں کھا نہ فریبِ شکست ۶۵ دیکھ ابھی ہتھیار نہ ڈال
معرکہ آرائی کے نثار ۶۶ تو بھی نڈھال اور میں بھی نڈھال
روز نہیں رُوٹھے گا عشق ۶۷ آج کے کام کو کل پہ نہ ٹال
گھر گھر میں اندھیر مچا دے ۶۸ دنیا بھر میں ہل چل ڈال
مال مفت دل بے رحم ۶۹ اہلِ حکومت کا ہے یہ حال
بیٹھنے والے بیٹھے رہے ۷۰ چلنے والے چل گئے چال
کیا ہے دیارِ حسن جہاں ۷۱ گلتی نہیں کسی کی دال
حُسن سے بدظن ایک جہان ۷۲ اُلٹی بات اور ٹیڑھی چال
مجھ سے عہدِ وفا مت باندھ ۷۳ عشق کو اس دھوکے میں نہ ڈال
تلخ کام تیرے کیا کھائیں ۷۴ نیم کی پتی نیم کی چھال
ایک بگولا نخلِ عشق ۷۵ اس برداکے پات نہ ڈال
جنسِ حُسن کا مول نہ پوچھ ۷۶ بازاروں میں ہے ہڑتال
قرض کا کھانا یوں ہی ہے جیسے ۷۷ تاپے کوئی جلا کے پوال
ننھے دلوں میں جوشِ محبت ۷۸ جیسے باسی کڑھی میں اُبال
خاک تری برباد نہیں ۷۹ عشق میں تو کچھ نام اچھال
قد ہے ترا یا فتنۂ حشر ۸۰ چال تری یا ہے بھونچال
دیکھ بدلتی دنیا دیکھ ۸۱ پوچھ نہ عشق کے غم کا مآل

کیونکہ حشر انگریزی سے ناآشنا تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے دوست انہیں شیکسپیر کے بعض ڈراموں کا ترجمہ سناتے تھے اور حشر شیکسپیر کے قصوں کو اردو ڈرامے کے قالب میں ڈھال لیا کرتے تھے چنانچہ ان ڈراموں اور شیکسپیر کے اصلی انگریزی ڈراموں میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ بہرحال مندرجہ ذیل ڈرامے اس عہد کی یادگار ہیں۔

۱۔ شہید ناز[1]	MEASURE FOR MEASURE
۲۔ مرید شک۔	OTHELLO
۳۔ صید ہوس۔	KING JOHN
۴۔ سفید خون۔	KING LEAR.

اب ہم ان ڈراموں کا علیحدہ علیحدہ ذکر کریں گے۔

۱۔ **شہید ناز**:۔ اس ڈرامے کو نیو الفریڈ کمپنی نے ۱۹۰۲ء میں سٹیج کیا۔ اس میں حشر نے کئی تبدیلیاں کر لی تھیں۔ جن کا مقصد تماشائیوں کو خوش کرنا تھا کسی جگہ کچھ بڑھا دیا اور کہیں کچھ حذف کر دیا۔ ڈراما حسب معمول اس منظر سے شروع ہوتا ہے کہ ایک باغ میں چند سہیلیاں بہار کے نغمے گاتی ہیں۔

۲۔ **مرید شک**:۔ اس ڈرامے کو ۱۸۹۹ء میں الفریڈ کمپنی بمبئی نے سٹیج کیا۔ اس کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسے احسن نے لکھا ہے۔

۳۔ **صید ہوس**:۔ یہ ڈراما "کنگ جون" کا ترجمہ ہے۔ اسے بمبئی پارسی کمپنی نے ۱۹۰۷ء میں سٹیج کیا۔ ویسے تو حسب معمول اردو ترجمے میں بے شمار تبدیلیاں کی گئی ہیں لیکن اس ڈرامے کے انجام کو تو بالکل ہی بدل دیا گیا ہے تیسرے ایکٹ میں آرتھر اپنے رفقا سے مل کر چڑھائی کرتا ہے۔ ظالم کے تمام منصوبے بیکار ثابت ہوتے ہیں۔ اور وہ پابہ زنجیر کر لیا جاتا ہے پھر آرتھر تخت پر بیٹھتے ہی بلانشے (BLANCHE) سے شادی کر لیتا ہے اور بیوی کی خواہش پر ظالم کو عمر قید کی سزا دیتا ہے یہ تو ہوئی شیکسپیر کی المیہ میں تبدیلی۔ اس کے علاوہ FALCON BRIDGE والی مزیدار ظرافت کے بجائے ایک اور ادنیٰ قسم کا ذیلی قصہ شامل کر دیا گیا ہے۔

۴۔ **سفید خون**:۔ سفید خون "کنگ لیئر" کا ترجمہ ہے۔ اس ڈرامے کو لوگ انگریزی میں بھی طربیہ ہی سمجھتے رہے۔ چنانچہ اس کے جتنے ترجمے اردو میں ہوئے ان میں اس کا انجام اچھا ہی ظاہر کیا گیا۔ یہی حال حشر کے ترجمے کا ہوا۔ اس ڈرامے کو ۱۹۰۷ء میں بمبئی پارسی کمپنی نے سٹیج کیا۔

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ حشر انگریزی زبان سے ناواقف تھے اور دوستوں سے شیکسپیر کے ڈراموں کے قصے سن کر ان پر اپنے ڈرامے تعمیر کر لیتے تھے۔ جن میں بڑی بڑی تبدیلیاں بھی کر لیتے۔ مثلاً ایک تبدیلی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ شیکسپیر کے ڈراموں میں المیہ سے متعلقہ کردار طربیہ پارٹ بھی ادا کرتے تھے۔ اور وہ قصے کا جزو ہوتے تھے۔ لیکن حشر نے یہ تبدیلی پیدا کی کہ المیہ کے کرداروں کو طربیہ کے کرداروں سے کوئی تعلق نہ ہو یعنی بیک وقت دو ڈرامے دکھائے جاتے تھے۔ ایک المیہ۔ دوسرا طربیہ میرے خیال میں یہ جدت قابل تعریف ہے۔ کیونکہ اگر کسی موقع پر متین اور سنجیدہ طبقے کو حشر کا کوئی المیہ دکھانا مقصود ہو تو اسے بغیر کسی مزاحیہ حصے کے دکھایا جا سکتا ہے۔ اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ حشر کے ڈرامے عوام الناس اور بلند ادبی ذوق رکھنے والوں میں یکساں مقبول ہوئے۔

حشر کو "انڈین شیکسپیر" بھی کہا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حشر نے شیکسپیر کے ڈراموں کو اردو کے قالب میں ڈھالا۔ نیز اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان میں حشر کو وہی رتبہ حاصل ہے۔ جو انگلستان میں شیکسپیر کو ہے۔[2]

دوسرا دور:۔ اب ہم حشر کی ڈراما نگاری کے دوسرے دور کی طرف آتے ہیں۔ اس دور میں حشر نے قدیم طرز میں ڈرامے لکھے۔

حشر نے پہلے پہل اسی طریقے کی تقلید کی جو اس سے پہلے احسن بیتاب۔ اور طالب نے اختیار کیا تھا یعنی کردار پہلے کچھ نثر اور پھر اشعار میں باتیں کرتے نیز ان کی نثر نہایت مقفیٰ و مسجع ہوتی۔ اس قسم کے ڈراموں میں حشر نے اپنی قادر الکلامی اور ادبی صلاحیتوں کا نہایت وسعت قلب کے ساتھ مظاہرہ کیا ہے۔ میں نے اپنے گزشتہ مقالے میں قدیم ڈراما نگاری کی خصوصیات بیان کر دی ہیں۔ اس لئے یہاں اس پر زیادہ لکھنا بے سود ہے۔ اب میں حشر کے ایک ڈرامے "اسیر حرص" کا ایک اقتباس پیش کرتا ہوں جس سے آپ اس بات کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ حشر نے قدیم طرز میں کیسے ڈرامے لکھے۔

چنگیز کے سامنے اس کا چچا زاد بھائی ناصر پابہ زنجیر کھڑا ہے۔ چنگیز اسے ہر ممکن طریق سے ذلیل کرنا چاہتا ہے۔ لیکن بہادر ناصر اپنی جان کا خوف نہ کرتے ہوئے انصاف کی طرفداری کرتا ہے۔

چنگیز۔ کہئے اے شہباز زمانہ۔ آپ نے اس ناچیز خادم کو پہچانا؟

ناصر۔ پہچانا! پہچانا! شیطان کو کون شخص نہیں جانتا۔ بلکہ ہر شخص پہچانتا ہے

شکل و صورت دیکھ لی کبر و رعونت دیکھ لی
نام پہلے ہی سنا تھا آج صورت دیکھ لی

[1] ہمیں اس کی صحت میں شک ہے (ادارہ) [2] (؟) (ادارہ)

چنگیز۔ مغرور! تو زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ مگر اب بھی یوں اکڑا ہوا ہے ؎

سر سے غرورِ مسندِ محمل نہیں گیا
رسی تمام جل گئی پر بل نہیں گیا

ناصر۔ عزت والے مصیبت سے کب ڈرتے ہیں، تارے اکثر رات کے عوض دن کو نکلتے ہیں ؎

بھری برسات میں جن ندی نالوں میں روانی ہے
انہیں گرمی میں دیکھو تو نہ موجیں ہیں نہ پانی ہے
مگر دریا کو اس تابش کا ہرگز غم نہیں ہوتا
لگا دو آگ بھی اُس میں تو پانی کم نہیں ہوتا

اور ——

عطر کی مٹی میں بھی مل کر مہک جاتی نہیں
توڑ بھی ڈالو تو ہیرے کی چمک جاتی نہیں
سختیاں ہوں لاکھ پر جوہر نہ جائیں گے کبھی
قید میں کچھ شیر کی شیرانہ خو جاتی نہیں

چنگیز۔ تو تو نے بادشاہی اس لئے چاہی کہ مجھ سے کرے برائی۔ میں تیرا کون تھا؟

ناصر۔ کون تھا؟

چنگیز۔ چچا زاد بھائی!

ناصر۔ بھائی؟ اُف بھائی کا نام لے کر تو نے میرے مرحوم چچا کی روح کو تڑپا دیا۔ قبر میں سوتے ہوئے کو خواب راحت سے جگا دیا۔ مجھ کو تو کہتا ہے بھائی اور بھائی سے یہ کج ادائی۔ لعنت ہے او ناسزائی

جن کی گود میں پلا دشمن انہی کا ہو گیا
تو نہیں پیدا ہوا اک سانپ پیدا ہو گیا

تیسرا دور۔ اب ہم تیسرے دور کی طرف آتے ہیں اس دور کے اچھے ڈرامے بلوا منگل، بن دیوی، ترکی حور، آنکھ کا نشہ، اور سنسار چکر ہیں۔ ان تمام ڈراموں میں حشر نے ہمارے معاشرتی نقائص کو قلمبند کیا۔ نیز ہمیں تمدنی اصلاح کی تعلیم دی۔

اس دور میں حشر کے طرز انشا میں ایک انقلاب پیدا ہو گیا۔ گانوں میں ایک حد تک تخفیف کی گئی۔ مقفیٰ و مسجع عبارت کو بند کر [illegible] یت صاف ستھری ہو گئی۔ مثال کے طور پر میں بلوا منگل اور آنکھ کے نشے کا ایک ایک منظر پیش کروں گا۔ پہلے بلوا منگل کا مختصر سا پس منظر ملاحظہ ہو۔

بلوا منگل ایک نوجوان تعیش پسند شخص ہے اس کے باپ کا نام رام داس ہے۔ بلوا منگل کی بیوی "رمبا" نہایت حسین و جمیل ہے۔ لیکن وہ اُس سے محبت نہیں کرتا۔ بلکہ اُسے "چنتا" نامی ایک بازاری عورت سے محبت ہو گئی۔ رمبا ایک نہایت وفادار لڑکی ہے۔ رام داس بسترِ مرگ پر پڑا ہے آج پورے دس دن گھر سے باہر رہ کر بلوا منگل واپس گھر آیا ہے۔ رام داس اُسے سمجھانے کی کوشش کرتا ہے ....

رام داس:۔ بلوا! آدمی کھیت بوتا ہے پھل کھانے کے لئے۔ سیوا کرتا ہے آرام پانے کے لئے۔ محنت کرتا ہے لابھ اٹھانے کے لئے۔ اب میں تم سے یہ پوچھتا ہوں کہ میں نے تمہیں پالا۔ دکھ بیماری میں سنبھالا تم کو آدمی بنانے کے لئے اپنے آپ کو مٹا ڈالا اُس کا تم نے کیا بدلہ دیا۔ ان خدمتوں اور مہربانیوں کا مجھے کیا پرتی دان ملا۔

بلوا منگل:۔ تو مجھے ان مہربانیوں سے کب انکار ہے۔ میں مانتا ہوں کہ میرا بال بال آپ کا قرضدار ہے۔

رام داس:۔ تو پھر یہ قرض؟

بلوا منگل:۔ ضرور ادا کروں گا۔

رام داس:۔ کب۔ کس دن۔ کس طرح۔ کس چیز سے۔ دل تھا وہ اپوتر چاردل کو ارپن کیا۔ پیار تھا وہ ایک بازاری ونیشیہ کو دے ڈالا دھرم تھا سو ادھرم کو بھینٹ دیا۔ اب تمہارے پاس میرا قرض ادا کرنے کے لئے رکھا ہی کیا ہے۔ اگر کچھ ہے تو لاؤ دو میں آج تم سے اپنی سیوا۔ اپنے پیار اپنے اُپکار ہر چیز کا بدلہ چاہتا ہوں۔

بلوا منگل:۔ آپ بدلے میں کیا چاہتے ہیں؟

رام داس:۔ دھن۔ دولت۔ سیوا۔ کچھ نہیں۔

بلوا منگل:۔ پھر؟

رام داس:۔ ادھر دیکھ۔ یہ بھارت کی ہندو لڑکی جس کی جات میں پرماتما نے شکنتلا کی خوبصورتی۔ سیتا کا پتی برت دھرم اور رادھا کا پریم جمع کر دیا ہے۔ اس کے لئے محبت کا برتاؤ اور اپنے واسطے آگیا کاری سوبھاؤ۔

بلوا منگل:۔ محبت کے سوا اس کے لئے اور سب کچھ کر سکتا ہوں۔

رام داس:۔ لیکن وہ محبت کے سوائے تم سے کچھ نہیں مانگتی۔

؎ قافیہ شیر نے شیر پہ کر لیا ہے کیا! (ادارہ) اس کے اس ٹکڑے میں تو مقفیٰ عبارت قائم ہے (ادارہ)

بلوا منگل: میرے پاس سب کچھ ہے محبت ہی نہیں!

. . . .

بلوا منگل: ایک کی چیز بغیر فریب کے دوسرے کے ہاتھ میں نہیں آ سکتی جب تک یہ چنتا مٹی کر ان آنکھوں کو دھوکا نہ دے۔ اس دل میں کبھی جگہ نہیں پا سکتی۔

رام داس: چنتا! چنتا!! چنتا!!! ارے وہی بازاری ویشیہ۔ وہی دنیا کی تھی۔ وہی ہزاروں منہ کا اگلا ہوا نوالہ۔ وہی سینکڑوں کامی کتوں کی چچوڑی ہوئی ہڈی جس کا آدھا پاپ اور رات نرک ہے۔ جس کا ایشور روپیہ جس کا بیشہ بدکاری۔ جس کی زندگی بے شرمی۔ اس کا ڈراچار نی کے کارن اس ستی ناری کی طرف سے آنکھیں بند کرتا ہے۔ ہیرے کو ٹھوکر مار کر کنکر پسند کرتا ہے۔[1]

دیکھئے بازاری عورت کی جو گھناونی صورت حشر نے پیش کی ہے وہ آج تک کسی ڈرامانگار یا شاعر نے پیش نہیں کی۔[2] اس سے آپ حشر کے ڈراموں کی زبردست اخلاقی اہمیت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

اب "آنکھ کا نشہ" کا ایک منظر ملاحظہ ہو۔

کام لتا نامی طوائف کی نائکہ بعض تماشائیوں سے حیلے سے روپیہ وصول کرنا چاہتی ہے۔ مندرجہ ذیل گفتگو میں کام لتا طوائف۔ اس کی نائکہ راج کنور۔ اس کا سازندہ سدا رنگ اور دو تماشائی بینی اور جنگل شامل ہیں

بینی اور جنگل کی موجودگی میں راج کنور محفل سے اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔

راج کنور: سدا رنگ جی۔ کندن لال سیٹھ کی گدی آٹھ بجے بند ہو جائیگی میں ذرا ہو آؤں۔

بینی: راج کنور جی جاسے سونا کرکے کہاں چلیں۔

راج کنور: (کام لتا کی طرف اشارہ کرکے) کیا کروں۔ یہ تو بچے کی طرح ہٹ کر بیٹھی ہے۔ آج ایک گلابی ساٹن پر کارچوبی کام کی پشواز بکنے آئی تھی (کام لتا کو دیکھ کر) وہ دیکھئے آنکھ مار کر منع کر رہی ہے نہ باوا میں نہ کہوں گی۔

کام لتا: کہہ دو۔ کہہ دو۔ یہ سن کر کیا مجھے پھانسی دے دیں گے؟

بینی: تمہارے ہی روکنے سے تو چلتی موٹر میں پنکچر ہو گیا۔ بائی جی۔ اب تو تمہیں کہنا ہی پڑے گا۔

راج کنور: سرکار آج ان سدا رنگ جی کے بہنوئی ایک نئی پشواز بیچنے کے لئے لائے تھے۔ مال تو ہزار سے اوپر کا نہ تھا۔ مگر چھوٹی بائی جی نے جھٹ بارہ سو دام لگا دیئے۔ کہنے لگیں بسنت پنچمی ہے۔ یہی پشواز پہن کر سرکار لوگوں کے سامنے ناچوں گی۔

بینی: سو جھی تو اچھی۔ ان کی سمجھ کبھی بے تال نہیں چلتی۔

راج کنور: بس آپ ہی لوگوں نے نخرے اٹھا اٹھا کر اس کا مزاج بگاڑ دیا ہے یہ بھی تو سوچنا چاہئے کہ گھر میں بنک کی طرح ہر وقت روپے نہیں رکھے رہتے۔ کندن لال سیٹھ نے چار آنے بیاج پر بھی روپے نہ دیئے تب بائی جی۔ نئی پشواز پہن کر سرکار لوگوں کو کیسے خوش کرو گی۔

سدا رنگ: بڑی بائی جی۔ یہی دن ان کے اوڑھنے پہننے کے ہیں۔ گھر کے لوگوں سے کیا شرم ہے۔ باہر نہ ملے تو سرکار سے ادھار لے لو۔

کام لتا: استاد جی۔ کہیں ڈال کے سرکار کو لوٹ نہ لو۔ انہی باتوں سے تو طوائفوں اور میراسیوں کا نام بدنام ہو گیا ہے۔ دیکھو جی تم یا تم ایک پیسہ بھی دو گے تو میں بگڑ جاؤں گی۔

جنگل: پیسہ دوں گا تب بگڑو گی نا۔ میں تو روپے دوں گا۔ راج کنور بائی یہ لو۔

راج کنور: جیو۔ دولت بڑھتی ہو۔ روپوں کو بنک میں سمجھا میں بیاج کے ساتھ مول لوٹا دوں گی۔

جنگل۔ مول معاف ہے اور بیاج میں ان کی مہربانی چاہتے۔

کام لتا: دیکھا۔ مول معاف ہے۔ یہ سنتے ہی بڑھاپے پر جوانی آ گئی۔ اری نائکا تم بڑی پیسے کی لوبھی ہوتی ہو۔

دیکھئے۔ اب حشر کتنے فطری مکالمے لکھنے لگ گیا۔ "آنکھ کا نشہ" حشر کا شاہکار تصور کیا جاتا ہے کیونکہ یہ اردو ڈرامانگاری میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

ہم نے حشر کی ڈرامانگاری کے مختلف ادوار کا مطالعہ کر لیا۔ آئیے اب ہم مجموعی طور پر اس کے اسلوب نگارش کا تجزیہ کریں۔

حشر کی ڈرامانگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے بعض مصنفین نے انتہائی بے انصافی سے کام لیا ہے "ناٹک ساگر" میں حشر پر طرح طرح کی چوٹیں کی گئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ حشر ہندی سے نابلد تھے۔ اور اُن کے ہندی ڈرامے کسی پنڈت [illegible] د کا نتیجہ ہیں حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ حشر مرحوم جوانی کے زمانے میں [illegible] کے پنڈتوں سے اکثر مناظروں میں حصہ لیا کرتے تھے۔ وہ ہندی پڑھے ہوئے تھے اس لئے وہ

[1] مقفّٰی عبارت تو اس تمام ٹکڑے میں اکثر نظر آ رہی ہے (ادارہ)

[2] اس سے ہمیں اختلاف [illegible] ہے یہ تصویر تو ابھی کچھ بھی نہیں اس سے کہیں زیادہ موثر اور رنگین دنیا (؟) تصویر (بازاری عورت کی) دوسرے مصنفین نے پیش کی ہے مثال کے طور پر اناطول فرانس کی تائیس [illegible] اور ہماری [illegible] کی کئی کے علاوہ پیش کی جا سکتی ہے ایسی ڈراموں کی مثالیں ہم پیش نہیں کرتے۔ جو سلوی سے شروع ہو کر نہ جانے کہاں ختم ہوں گی۔ (ادارہ)

ان پنڈتوں کا بخوبی مقابلہ کر سکتے تھے۔

اسی کتاب میں حشر کو طالب۔ احسن اور بیتاب کی صف میں کھڑا کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ حشر کے اسلوبِ نگارش اور ان تمام حضرات کے طرزِ تحریر میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

حشر کی ظرافت کے متعلق ایک اعتراض بجا طور پر کیا جاتا ہے کہ ان کی ظرافت نہایت ادنیٰ قسم کی ہوتی تھی۔ مثلاً "سلور کنگ" سے ایک اقتباس پیش کرتا ہوں۔

(سلور کنگ۔ باب اوّل۔ منظر چہارم گانا)

مرزا۔ بی بی ہے مجھے کیسی چٹخارے دار۔
زلفن۔ میاں ملا ہے مجھے کیسا ہی مزیدار۔
ایک توے کی روٹی۔ کیا چھوٹی کیا موٹی۔
مرزا۔ تیرا میرا جوڑا جیسے دھوتی اور لنگوٹی۔
زلفن۔ تو جگنو میں بیر بہوٹی۔
مرزا۔ ارچھی۔ برچھی۔ الم۔ غلم۔ بلم۔ ہر دم لڑنے کو تیار۔
زلفن۔ میں گھا گھر اپلٹن کی میجر اور تم صوبیدار۔
مرزا۔ بی بی ہے مجھے کیسی چٹخارے دار۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کی ظرافت مذاق سلیم پر بہت گراں گزرتی ہے اور یہی نہیں کہ یہ منظر یا کوئی خاص ڈراما ایسی ظرافت کا حامل ہے بلکہ جب بھی حشر مرحوم نے کوئی ظریفانہ چیز لکھی۔ اس میں وہ ہر قسم کی بازاری باتیں لکھ دیتے تھے۔

میں نے حشر کے ایک دوست اور مداح سے پوچھا کہ کیا آپ یہ بتا سکتے ہیں کہ حشر مرحوم طربیہ ڈرامے لکھنے میں کیوں ناکام رہے اور ان کی ظرافت کیوں اتنی عامیانہ اور بازاری ہے؟ ان کا جواب گو تسلی بخش تو نہ تھا۔ بہرحال دلچسپ ضرور تھا۔ ملاحظہ ہو۔

"حشر جب بھی کوئی ظریفانہ ڈراما لکھتے تو وہ عام لوگوں کو مثلاً گنڈیریاں بیچنے والوں یا دوسرے دکانداروں کو اپنے پاس بلا کر انہیں اپنے ظریفانہ ڈرامے سناتے۔ اگر وہ لوگ ایسے ڈرامے سنتے ہوئے بے ساختہ طور پر ہنس پڑتے تو حشر اسے اپنا کامیاب ڈراما سمجھتے۔ لیکن اگر ان لوگوں کے لبوں پر تبسم نہ آتا تو حشر یہ سمجھتے تھے کہ یہ ڈراما ظریفانہ معیار [illegible] اترتا میں نے پوچھا آخر اس کی وجہ کیا ہے کہ آپ ظریفانہ چیزیں عام [illegible] مذاق کے مطابق لکھتے ہیں انہوں نے کہا کہ میرے ڈراموں کو دیکھنے والے زیادہ تر وہی لوگ ہوتے ہیں جو آٹھ آنے دے کر تھیئٹر دیکھتے ہیں۔ اس لئے میں عام لوگوں کی پسند کے ڈرامے لکھتا ہوں"۔

حشر کے لکھے ہوئے مکالمے نہایت زور دار ہوتے ہیں بعض نقاد اس زورِ بیان اور بلند آہنگی پر اعتراض کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ حشر کے مکالمے غیر فطری ہیں۔ لیکن یہ کہتے ہوئے وہ اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ مکالموں کا مطابقِ فطرت ہونا ڈرامے کے لوازم میں سے نہیں ہے۔ کیونکہ ڈراما ایک آرٹ ہے اور آرٹ میں بہت سی ایسی خوبیاں موجود ہیں۔ جن سے فطرت محروم ہے۔ اگر ڈرامے میں ہمارے گردوپیش کے حالات فطری رنگ میں پیش کئے جائیں تو ڈراما ہمارے لئے دلچسپی کا باعث نہ رہے گا کیونکہ روزمرہ کے واقعات کا مشاہدہ تو ہم ہمیشہ کرتے رہتے ہیں۔ اس لئے حشر کے مکالموں کی بلند آہنگی ایک اہم خصوصیت ہے۔ بلند آہنگ مکالموں سے ہمارے قلب پر اثر پڑتا ہے اور ہم ایک نئی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں[1]

حشر کی ڈراما نگاری کی بعض اور خصوصیات بھی ہیں جو اُسے دیگر ڈراما نگاروں سے ممیّز کرتی ہیں۔

قصے کے انتخاب میں وہ اس بات کا خاص خیال رکھتے تھے کہ اوّل تو یہ قصہ عوام میں مقبول ہو۔ دوسرے انہیں اس میں اپنی ادبی صلاحیتوں کے مظاہرے کا موقع مل سکے۔ نیز وہ ایسا ڈراما لکھتے جس کے سٹیج کرنے میں غیر معمولی دقتوں کا سامنا نہ کرنا پڑتا تھا۔ وہ اتحادِ زمان اتحادِ مکان اور اتحادِ کردار کا خاص خیال رکھتے تھے۔ ان کے المیہ ڈراموں کا انجام ہمیشہ موت پر ہوتا تھا اور طربیہ ڈراموں کا انتہائی خوشی پر۔

اردو ڈراما نگاری کا پہلا دور وہ تھا جب کہ امانت نے اندر سبھا لکھی اسی دور میں طالب اور احسن نے ڈرامے لکھے جن میں مکالموں کا مقفّٰی و مسجّع ہونا۔ شعروں کی کثرت۔ گانوں کی زیادتی وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر خصوصیات ہیں حشر نے اپنی ڈراما نگاری کے پہلے دور میں ایسے ہی ڈرامے لکھے۔ چنانچہ بیتاب۔ محشر وغیرہ نے اس کی تقلید کی۔ حشر نے تو کچھ عرصہ بعد ترقی کر کے اردو ڈراما نگاری میں ایک نئی طرح ڈال دی لیکن اُس کے مقلد اُسی پرانی راہ پر گامزن رہے۔ حشر کے بعد اردو ڈراما نگاری کا جدید دور شروع ہوتا ہے جس میں سید امتیاز علی تاج۔ حکیم احمد شجاع۔ پنڈت کیفی۔ محمد عمر نور الٰہی وغیرہ ممتاز ہیں۔ اس دور کا ذکر آئندہ مقالے میں کریں گے۔

عبدالسلام خورشید

[1] حشر کے مکالموں کی ڈرامائیت کے جواز کی یہ دلیل ہمارے خیال میں درست نہیں ہے کیونکہ اس کی علت غائی بھی زمانے کی روش ہی تھی۔ اس زمانے کے تماشائی انہی باتوں سے محظوظ ہوتے تھے جو فطرت سے دور تھیں۔ لیکن جوں جوں زمانہ بدلتا گیا حشر نے بھی مکالموں کا رنگ بدلنا شروع کر دیا یہاں تک کہ ان کا آغا حشر کا ذکر اب بھی اگر سٹیج کیا جائے تو بعض حصوں میں یہ قسم کا کہنا محسوس ہو۔ (ادارہ)

چودہ مئی کی رات

اب کچھ نہ رہا مٹی میں ملا، جو دھن تھا پاس وہ دُور ہوُا،
وہ دھن بھی دھیان کی موج ہی تھی، مچلی، اُبھری، ڈوبی کھوئی۔
وہ پہلی، اچھوتی سندرتا، نیند آ ہی گئی اُس کو، سوئی،
نادان جوان مرے دل کا ــــ نشّہ تھا نیا ــــ مخمُور ہوُا۔
اک گیان کی موج اُٹھی، چنچل اچپل، البیلی سی ناری،
جو بات بتائی اس نے مجھے وہ بات لگی دل کو پیاری۔
کچھ سوچ نہیں، کچھ سوچ نہیں، کیوں سوچ میں کھوئے دل میرا؟
کیوں اپنے لہو کی بوندوں سے آنکھوں کو دھوئے دل میرا؟
اب رنگ لہو کا اور ہوُا، اب رنگ لہو کا اور ہوُا۔
کیسو کی کلیاں مرجھائیں، اک کھیت کپاس کا پھُولا ہے،
من سوچ کرے تو گیانی نہیں، اگیانی ہے من بھُولا ہے۔

اس جگ کی ریت ہے یہ ناداں، ہر بات بدلتی رہتی ہے،
رُت آتی ہے، رُت جاتی ہے، یوں وقت کی ندّی بہتی ہے۔
بچپن آیا، کیسا ننھا سماں! جگ کی ہر بات نرالی تھی،
من اپنا بھولا بھالا تھا، سب دنیا بھولی بھالی تھی۔

پھر من کی دھارا پھوٹ بہی، میٹھی رُت آئی جوانی کی،
من میں تھیں اُمنگیں پیتم کی، آشائیں پریم کہانی کی۔
یہ دنیا ایک شکاری تھی، کیا جال بچھایا تھا اِس نے!
دو روز میں ہم نے جان لیا سکھ اور کا ہے اور دُکھ اپنا،
سنجوگ کے دن گنتی میں نہیں اور پریم کی راتیں ہیں سپنا۔
یہ دنیا اک بیوپاری تھی، کیسا بہکایا تھا اِس نے!

من جال میں پھنس کر جب تڑپا، جھنجلا اُٹھّا، جھنجلا اُٹھّا،
اک رات کے جادو میں کھو کر پھر آیا جوانی کا ریلا،
دل میں اُلجھن تھی، آنکھوں میں اک رنگ لہو سا چھایا تھا،
دو پل کو مدماتے ہو کر دیکھا ہم نے، انوکھا میلہ،
اک گیان کی چنچل موج اُٹھی، اِس جگ میں جیون دو دن کا!
اب من کو کیسے سوچ آئے، انجانی ہولی کیوں کھیلا

میراجی

نغمۂ فردوس

"آخر نیند کے ملتے ایک طویل خوشگوار خواب کے بعد بیدار ہو جائیں گے۔ اور ان کا گھر اس کثیف دنیا کی بجائے جنت الفردوس میں ہو گا۔ جہاں دور، بہت دور کوئی لطیف اور سہانی آواز نغمہ ریز ہو گی . . . . !"

مریض نے یہ الفاظ بآواز بلند کہے اور کروٹ لے کر آنکھیں کھولیں تو اپنے معالج کی سرد اور روکھی نظروں کو دیکھا جو گھڑی ہاتھ میں لئے، جھکا ہوا اس کا مطالعہ کر رہا تھا۔

ڈاکٹر نے آنکھیں میچتے ہوئے کہا "ہوشیار ہو! نبض دیکھیں!"

مریض نے کلائی آگے بڑھا دی۔ "ٹھیک ہے۔ نہ جانے ابھی آپ بحران میں کیا بک رہے تھے، مسٹر ڈینور!"

ڈینور کے چہرے پر ایک غمگین مسکراہٹ آئی اور وہ آہ سرد بھر کر بولا "واقعی! میں تو شاید خواب دیکھ رہا تھا ـــــ" وہ ذرا رک گیا اور پھر اپنا فقرہ پورا کیا "جنت کے متعلق!"

ڈاکٹر نے گھڑی جیب میں رکھ لی اور اپنی ٹوپی اور دستانے اٹھانے کے لئے مڑا۔ "ہوں!" وہ رکھائی سے کہنے لگا "خواب اکثر ہوتے تو دلچسپ ہیں۔ مسٹر ڈینور! ابھی اس دوا کو جاری رکھئے، اس سے آپ کے درد میں افاقہ ہو گا فی الحال اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ ذرا آپ میں طاقت آ جائے تو پھر آپریشن کا سوچیں، اس وقت تو جراحی غیر مفید رہے گی۔"

ڈینور کی گہری اداس آنکھیں اس پر جم گئیں "ڈاکٹر صاحب! ذرا ٹھیرئیے، میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔ مجھے سرسام نہیں ہے میں بالکل اپنے آپ میں ہوں۔ میرے ہوش و حواس بجا ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ میرا مرض لاعلاج ہے۔ سرطان دیر یا سویر، ضرور میرا خاتمہ کر دے گا۔ لیکن آپ بھی تو فانی ہیں۔ ایک وقت آئے گا کہ آپ بھی اسی راستے پر گامزن ہونے لگے جس پر میں چل رہا ہوں۔ میری کشتی کنارے آ لگی ہے . . . . . جھوٹی تسلی تشفی دے کر مجھے دھوکے میں رکھنے سے کچھ فائدہ نہیں۔ مجھے آپ ایمانداری سے بتا دیجئے کہ آپ کا دوزخ جنت پر اعتقاد ہے؟"

ڈاکٹر نے صاف صاف جواب دیا "اگر جنت سے آپ کی مراد کوئی مافوق الفطرت شے ہے تو قطعی نہیں۔ انسان کے لئے جنت کے صرف یہی معنی ہیں کہ دل و دماغ میں کچھ ایسے احساسات پیدا ہوں جن کی لذت سے اس پر مسرت طاری ہو جائے۔ اسی لئے مثل مشہور ہے کہ جنت کوئی مقام نہیں، بلکہ ایک ذہنی کیفیت ہے۔"

ڈینور نے آہستگی سے پوچھا "پھر تو آپ کی رائے میں موت کے بعد انفرادی یا شعوری زندگی ناممکن ہے؟"

ڈاکٹر زچ ہو گیا۔ ویسے بھی وہ بہت بڑا ڈاکٹر تھا۔ بیسیوں لوگ اس کے زیر علاج تھے۔ "یہ سوال آپ پادری سے کیجئے۔ میں اس مسئلے پر کچھ نہیں کہہ سکتا میں نے تھوڑی سی سائنس پڑھی ہے۔ اس لئے میں صرف یہ جانتا ہوں کہ موت مریض اور تھکے ہوئے انسان کا قدرتی انجام ہے، اور جب وہ مر جاتا ہے تو پھر اس کی کسی قسم کی بقاء حیات کا ذرہ بھر امکان نہیں۔"

جون ڈینور نے اسے نگاہ بھر کر دیکھا۔ پھر قدرے رک کر بولا۔ "آپ پڑھے لکھے آدمی ہیں، ڈاکٹر صاحب آپ کو معلوم ہونا چاہئے تھا۔ میں ہمیشہ سے جاہل ہوں لیکن جب لڑکپن میں میں پیٹ پالنے کے لئے کانوں کی گہرائی میں کام کرتا تھا اور رات کی تاریکی میں کبھی کبھی مجھے تاروں سے جھلملاتے ہوئے آسمان کو دیکھنے کا موقع ملتا تو میں سمجھتا تھا کہ وہیں جنت ہے اور خدا ان تاروں کے کہیں بیچ میں رہتا ہے۔ بے شک یہ خیال واہیات تھا۔ مگر کاش اب بھی میرے وہی اعتقادات ہوتے اور میں یہ روحانی کرب آسانی سے سہہ لیتا۔"

ڈاکٹر تنگ آ گیا۔ یہ داستان اس کے لئے پرانی تھی۔ بہت سے مریض اس سے اس قسم کی گفتگو کر کے اسے پریشان کر دیا کرتے تھے اور جون ڈینور اگر غریب ہوتا تو وہ حسب معمول اس کی بات کا جواب تکسدہ دیتا

لیکن لکھ پتی لوگ ڈاکٹروں کے دام میں روز روز تھوڑی پھنستے ہیں۔

آپ پادری کو کیوں نہیں بلا لیتے؟" اس نے پوچھا۔ "شاید وہ آپ کا اعتقاد پھر ویسے ہی کر دے۔"!

ڈینور نے افسوسناک لہجے میں جواب دیا۔ "پادری؟ اس کو ارضی آرام و آسائش کی فکر ہی سے کہاں فرصت ہے جو وہ سماوی لطف و انبساط کا خیال کرے۔ آخری بار جب وہ مجھ سے ملا تو اس نے گڑگڑا کر کہا کہ آپ اپنی وصیت میں کچھ اثاثہ گرجے کے لئے بھی وقف کر دیجئے۔ کہنے لگا" مجھے یہ سن کر افسوس ہوا کہ آپ کا مرض لاعلاج ہے۔ مگر مجھے یقین ہے، آپ کی یہ خواہش ضرور ہوگی کہ آپ کی تھوڑی سی دولت اُس قادرِ مطلق کے کام آجائے۔" گویا انسان کی دولت واقعی خالقِ موجودات کے کام آسکتی ہے! نہیں ڈاکٹر صاحب! میں جس آزمائش میں مبتلا ہوں، پادری اس میں کوئی مدد نہیں دے سکتے۔ میں سب کچھ خود ہی برداشت کروں گا۔ مجھے اب آپ کو بھی زیادہ نہیں ٹھیرانا چاہئے۔ خدا حافظ

ڈاکٹر جلدی سے دروازہ بند کرکے باہر نکل گیا۔ وہ خوش تھا کہ اُسے اس مجذوب کی بڑ سے چھٹکارا مل گیا ہے۔

جون ڈینور اب اکیلا رہ گیا تھا تنہائی سے گھبرا کر اس نے وسیع کمرے میں نظر دوڑائی جس کے ٹھاٹ امیرانہ تھے۔ سامنے کے ایک دریچے میں سے اُسے دُور دُور تک پھیلے ہوئے سرسبز و شاداب باغات نظر آئے جو اس کی ملکیت تھے۔ ...ا ہوتے ہوتے اگلی پچھلی تمام باتیں اس کی نگاہوں کے سامنے پھر گئیں۔ ... وہ وقت یاد آگیا۔ جب وہ موجودہ دولت و امارت کے حصول کے لئے اپنا خون پسینہ ایک کرتا اور محنت و استقلال سے کبھی جی نہ چراتا تھا۔ پھر خدا نے اُسے چھپر پھاڑ کر دولت دی اور سان نہ گمان، ایک روز اُسے کسی خام چاندی کی کان کا پتہ چلا جس نے اُسے دنیا کے امیر ترین لوگوں کی صف میں لا کھڑا کیا اور جب سے روپے کی ریل پیل ہوئی، سوسائٹی کی جھوٹی چمک دمک اور مطلبی دوستوں نے اُسے آگھیرا۔ پھر اُسے اُس خوبصورت دوشیزہ کا خیال آیا جس سے اس نے شادی کر لی تھی ——— وہی دوشیزہ جس نے اُسے یقین دلایا تھا کہ وہ اس پر دل و جان سے فدا ہے لیکن شادی ہوتے ہی اس نے کینچلی بدل لی اور اپنی اصلیت پر آگئی، یعنی ایک فیشن پسند اور دولت پرست عورت! جس کے لئے سوسائٹی والوں کی خوشنودی سے بڑھ کر کوئی چیز اہم نہیں تھی اور جس کا دل دولت کے بوجھ سے دب کر پتھر سے زیادہ سخت ہو گیا تھا۔ پھر وہ اپنی اولاد کے متعلق سوچنے لگا۔ مگر ان میں سے بھی کسی کو اس سے کبھی ہمدردی یا بے غرض محبت نہیں ہوئی ——— ایک لڑکا تھا جو اسے صرف اپنے اخراجات کا کفیل سمجھتا تھا۔ ایک لڑکی تھی جو ہر وقت منچلے نوجوانوں میں رہا کرتی تھی تاکہ کسی خطاب یافتہ نواب کو پھسلا کر اپنا شوہر بنا لے اور اسے احساس نہیں تھا۔ کہ اس کا باپ ایک لاعلاج مرض میں گرفتار بسترِ مرگ پر پڑا ہے۔ ان تمام تکلیف دہ باتوں کی یاد سے اُسے بڑا صدمہ ہوا اور اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے" اے خدا! میں نے اپنی زندگی میں کیا کمایا! اور اگر موت لابدی ہے تو زندگی کا مقصود کیا ہے"!

دروازے پر کسی نے دستک دی اور پیشتر اس سے کہ وہ اُسے اندر آنے کی اجازت دیتا، ملاقاتی خود بخود کمرے میں آگیا اور اس نے مدھم، شیریں لہجے میں کہا۔ "میرا خیال تھا۔ تم اس وقت تنہا ہی ہو گے، جون ڈینور! مجھے باغ میں تمہاری بیوی ملی تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ ڈاکٹر ابھی ابھی تم کو دیکھ کر گیا ہے۔"

ڈینور نے آہستہ سے اثبات میں گردن کو جنبش دی۔ اس وقت وہ بڑی تکان محسوس کر رہا تھا۔ یوں بھی وہ اپنے اس عجیب و غریب دوست کے سامنے بہت کم زبان کھولتا تھا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ پال والسکی، جس پر لوگ دہشت پسند روسی ہونے کا شبہ کرتے تھے، غیر معمولی وجاہت اور رعب داب کا آدمی تھا۔ مزید برآں اُس کے بشرے میں کچھ ایسے مقناطیسی اثرات پنہاں تھے کہ بہت سے لوگ اس کشش کے زیرِ اثر اُسکی طرف کھنچے چلے آتے تھے اور بعض اس سے دور ہی رہنے میں عافیت سمجھتے تھے۔ وہ پست قد اور زرد رو تھا۔ لیکن اس کی سنہری مائل آنکھیں اس کے چہرے کے لئے بے پناہ حسن کا خزانہ تھیں جن سے ناظر کبھی مسحور ہوئے بغیر نہ رہتا۔ اس نے ڈینور کو دیکھا۔ اس کی نظروں میں حد درجہ رحم اور ہمدردی تھی۔

"تو زندگی کا چراغ گل ہو چلا ہے! سب کو ایک دن یہاں سے جانا ہوگا!" والسکی نے محبت بھری آواز میں کہا" لیکن زندگی میں بہت سی چیزیں موت سے بدتر بھی ہیں"!

ڈینور کے لبوں پر مُہرِ خاموشی لگی ہوئی تھی۔

اس کا ملاقاتی قدرے ٹھیر کر بولا" تمہیں موت عزیز نہیں ہے! مقبرے کی تنہائی اور خاموشی تم پسند نہیں کرتے! تم کچھ بے چین معلوم ہوتے ہو مگر تم تو بہادر ہو ——— تم کو موت سے نہیں ڈرنا چاہئے"!

ڈینور نے استقلال سے جواب دیا" نہیں میں نہیں، میں تو بس ——— متأسف ہوں"!

"متأسف! کیوں"!

اس لئے کہ میں نے اپنی زندگی کی قدر نہیں کی۔ میرا سارا وقت صرف دولت جمع کرنے میں گذرا اور اس کا نتیجہ؟ ــــ ایک نفع باطل، ایک مضطرب کن نفع، کیونکہ میری گاڑھی کمائی میرے کام نہیں آئی، یہ دھن دولت میرے مرض کا علاج نہیں کر سکتی نہ اس سے موت کو پرے دھکیلا جا سکتا ہے، اور پھر بدقسمتی سے" وہ رُکا اور آہ سرد بھر کر کہنے لگا "مجھے کسی کی محبت و ہمدردی بھی تو حاصل نہیں۔ دیکھ لو، میں یہاں اپنی بدنصیبی کو بھگتنے کے لئے تن تنہا پڑا ہوں۔ پھر کیوں نہ مجھے مرنے کا افسوس ہو! اس خوبصورت دنیا سے جانے کا مجھے سخت رنج ہے۔ اس نیلے آسمان اور چمکدار دھوپ سے عنقریب محروم ہو جانے کا بڑا قلق ہے ــــ" دفعتہً اُس نے بات کا رُخ بدلا "لیکن پال! اگر مجھے تمہاری طرح حیاتِ بعد الموت کا یقین ہو جائے اور جو خواب میں نے ابھی گھنٹہ بھر ہوا دیکھا تھا، حقیقت ہو تو پھر مجھے مرنے کا کوئی افسوس نہیں بلکہ خوشی ہو گی۔"

والسکی نے ہمدردی سے استفسار کیا "کونسا خواب؟ کیا دیکھا تھا تم نے؟"

"میں نے دیکھا کہ میں جنّت میں ہوں۔" ڈینور کا بے چین لیکن روحانی وجدان سے چمک اُٹھا۔ "لیکن اس جنّت میں نہیں جس کا ذکر پادری کرتے ہیں وہ جگہ تو اس دنیا سے ملتی جلتی تھی۔ ہاں اس سے زیادہ وسیع اور حسین ضرور تھی۔ مجھے یہ محسوس ہوا کہ میں یکایک گہری نیند سے بیدار ہوا ہوں، اور جب میں جاگا تو مجھے ایک سہانی آواز سنائی دی ــــ ایسی آواز جس سے زیادہ لطیف اور شیریں آواز کا تصور ناممکن ہے ــــ معلوم نہیں وہ روح پرور نغمہ کون گا رہا تھا، مگر پال، مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں اس نادیدہ مغنّی کو جانتا اور چاہتا ہوں۔"

پال دریچے کے پاس رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ یہ سُن کر وہ کھڑا ہوا اور اس کے پلنگ کے قریب آ کر اُس نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ اس کے پہنچے پر رکھ دیا۔

"تو تم نے دوسری دنیا کی آواز سُن لی ہے، میرے دوست!" پال نے اس کی نظر اپنی بے پناہ اور پُر سحر نگاہوں سے گرفت میں کر لی "اور پھر بھی تمہیں شبہ ہے! تم جانتے ہو کہ بعض اوقات غیر مرئی دنیا کے پردے میری آنکھوں کے سامنے سے اٹھ جاتے ہیں۔ لوگوں نے مجھے ساحر روحانی اور خبطی سمجھ رکھا ہے کیونکہ مجھ پر وہ راز منکشف ہو جاتے ہیں جن تک ان معمولی دنیاداروں کی پہنچ نہیں ہوتی۔ لیکن مجھے اُن کی کیا پروا ہے! موت کے وقت میری روح کو سکون و اطمینان ہو گا اور ان لوگوں کی مادیّت خوف و ہراس سے تھرّائے گی۔ جو آواز تم نے سنی ہے، کیا وہ اس جیسی تھی ــــ؟"

اس نے ایک ہاتھ بلند کر کے ہلایا ــــ اور دور بہت دور، نغمے کی ایک کرن پھوٹی، دھیمی، شیریں اور صاف، گویا آسمان سے بارش غنا ہو رہی ہے۔

ڈینور چونک پڑا "یا رالہ! یہ تو وہی ہے ــــ بالکل وہی! پال! اس کا کیا مطلب ہے؟"

والسکی نے سمجھا سمجھا کر کہا "اس کا یہ مطلب ہے، میرے دوست! کہ تم دوام و بقا کے کنارے آ پہنچے ہو اور مجھے، جو ایک معمولی واسطہ ہوں، حکم دیا گیا ہے کہ تم کو اس حقیقت کا یقین دلا دوں جو جنّت تم نے خواب میں دیکھی وہ اصلی ہے جو آواز تم نے سنی وہ واقعی ہے۔ اور مغنّی تمہارے انتظار میں ہے تاکہ وہ تمام محبت جس سے تم اب تک اپنی زندگی میں محروم رہے ہو، تم پر نچھاور کر دے۔ تم چاہے مجھ پر اعتبار کرو یا نہ کرو، لیکن میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ سچ ہے۔ فانی انسان جس شے کو موت کہتے ہیں وہ تم کو ایسی بے پایاں مسرّت عطا کرے گی جو انسانی ذہن اور اندازے سے باہر ہے، لیکن اس کے ساتھ مجھے یہ بھی کہہ دینا چاہیے کہ تمہیں انتخاب کا حق حاصل ہے۔ جو کچھ میں نے تمہیں بتلایا اُسے جانتے ہوئے بھی تم یہ فیصلہ کرنے کے لئے بالکل آزاد ہو کہ تم موت کو پسند کرو یا زندگی کو ترجیح دو۔"

حیرت سے ڈینور کی آنکھیں، کھلی کی کھلی رہ گئیں "تم تو پہیلیاں بجھواتے ہو، پال! زندگی کو ترجیح دوں؟ میں! میری تقدیر تو طے ہو چکی ہے، میرا وقت تو آیا چاہتا ہے۔ مانا کہ تم ماہرِ روحانیات ہو لیکن تم کر کچھ نہیں سکتے۔ موت کو بھلا تم کیسے ٹال دو گے؟"

والسکی نے اٹل انداز میں کہا "تم اگر زندگی کو پسند کرو، تو تم زندہ رہو گے میں اس کا ذمہ لیتا ہوں، کیونکہ مجھے اس کا حکم ملا ہے۔ سرطان تمہیں موت کے گھاٹ نہیں اتارے گا اور نہ کوئی اور بلا تمہارا رشتۂ حیات منقطع کرے گی۔ لیکن اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو میں موت کو زندگی پر ترجیح دیتا۔"

اس نے آہستہ سے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا "تم ــــ تم میری زندگی کا وعدہ کرتے ہو؟ اگر میں جینا چاہوں تو کیا مجھے اس کی مہلت مل جائے گی؟"

"ہاں، ضرور۔ میں اس کی قسم کھاتا ہوں! میں آج اسی غرض سے تو تمہارے پاس آیا تھا۔ مگر فیصلہ کرنے سے پہلے خوب غور کر لو ــــ آخرت کے دروازے ایسے میں تمہارے استقبال کو کھلے ہوئے ہیں۔ اگر تمہاری

ہی مرضی سے یہ بند ہو گئے تو جو آواز تم نے سنی ہے، پھر کبھی نہ آئے گی۔"

ڈینیور کی پُرتجسس اور متعجب نگاہیں اپنے دوست کے زرد چہرے کا جائزہ لینے لگیں جس کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک اور روشنی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ خالی الذہن ہو گیا۔ آخر یہ انہونی بات کیسے مان لے! لیکن معاً اُسے خیال آیا کہ واسکی کے متعلق بے شمار روحانی روایات مشہور ہیں۔ نیز اس کے پُر یقین اندازِ گفتگو سے متاثر ہو کر اس نے ایکا ایکی فیصلہ کر لیا اور جھٹ بول اٹھا "میں جیوں گا ——— کیا خبر آخرت محض خواب و خیال ہو۔ کون جانے وہ سہانی آواز جس نے میرے دل پر قبضہ کیا، فریب ہو! اس کے مقابلے میں یہ دنیا سچ مچ کی ہے۔ قابلِ لمس ہے۔ یہاں ہم چلتے پھرتے ہیں، سانس لیتے ہیں، سوچ بچار کرتے ہیں جب تک میرے بس میں ہے، میں تو یہیں رہوں گا! اگر تم میں واقعی وہ طاقت ہے جو بظاہر معلوم ہوتی ہے تو مجھ پر صرف کرو اور مجھے زندگی دے دو ——— یہ زندگی! یہی میرا انتخاب ہے، جنّت نہیں بلکہ یہ دنیا! میں زندہ رہنا چاہتا ہوں!!"

واسکی آہستگی سے، اس کے بستر سے پرے ہٹ گیا اور اس نے حقارت و ہمدردی کی ملی جلی نظروں سے ڈینیور کو سر تا پا دیکھا۔ "یہی سہی۔" اس نے جواباً کہا "بس تو زندہ رہو اور کوشش کرو کہ اس زندگی میں تمہیں خوشی، سکون اور محبت میسّر آ جائے۔ میرے دوست! افسوس تم نے غلط انتخاب کیا! تم نے آفات سے لبریز جہانسے میں آ کر جلیل المرتبت حقیقت کو ٹھکرا دیا ہے۔ خیر، جب تم اپنے انتخاب سے تنگ آ جاؤ، تو مجھے اطلاع کر دینا۔ اچھا اب خدا حافظ!"

دروازہ آہستہ سے بند ہو گیا ——— وہ جا چکا تھا۔

جوں ڈینیور کئی گھنٹے تک آنکھیں کھولے بے حس و حرکت پڑا رہا۔ اپنے اس عجیب و غریب ملاقاتی کی حیرت ناک گفتگو اس کو شروع سے آخر تک بار بار یاد آتی رہی اور وہ سوچنے لگا، کیا یہ سچ ہے کہ مجھے زندگی کی ایک اور مدت عطا کر دی گئی ہے، یا واسکی محض شیخی بگھار کر گیا ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ طویل نیند کے آغوش میں دنیا و مافیہا سے غافل ہو گیا۔

اگلے روز وہ بیدار ہوا تو اُس کے درد کو آرام تھا اور ایک ہفتے کے اندر اندر وہ اس قابل ہو گیا کہ پلنگ سے اُٹھ کھڑا ہوا اور روزمرّہ کے کام سرانجام دے لے۔ وہ بڑا ڈاکٹر جو اس کے علاج سے مایوس تھا، اس کی صحتیابی سے حیرت میں رہ گیا۔ اب پتہ چلا کہ اُسے سرطان کی کوئی تکلیف نہیں تھی۔ گویا ایک بار پھر ثابت ہو گیا کہ بڑے سے بڑے معالج کی تشخیص بھی غلط ہوتی ہے۔ واسکی کے وعدے کے مطابق ڈینیور موت کے منہ سے واپس آ گیا، لیکن زندگی کے اس نئے عرصے میں اس کی آنکھوں نے کیا کیا دیکھا ——— اس کے بیٹے کو کسی شخص کے جعلی دستخط کرنے کے جرم میں قید ہوئی۔ اس کی بیٹی نے ایک نام نہاد نواب سے شادی کی جو حد درجہ بدمعاش، شرابی اور جواری تھا۔ اس کی بیوی بے وفا نکلی، کیونکہ اُسے تو اُس کی موت کی تمنا تھی، اب اس کی تطویلِ حیات سے اس کے ارادوں پر پانی پھر گیا۔ اس سے زیادہ یہ کہ ڈینیور نے خون پسینہ ایک کر کے کمائی ہوئی دولت کو مطلبی "دوستوں" اور نمک حرام ملازموں پر لٹایا اور لُٹا دیا، حتیٰ کہ اس کی آنکھیں کھلیں اور اسے اپنے ہی ہم جنسوں کی کی چھوٹی خوشامد، کمینہ پن اور خود غرضی کا پورا پورا احساس ہو گیا۔ گویا یہی اس نئی زندگی کے تحفے تھے! سات سال اسی طرح بیت گئے۔ ایک شام وہ اکیلا اپنے وسیع و شاندار کتب خانے میں بیٹھا ہوا افکار میں غلطاں و پیچاں تھا اور اس کی نظریں باہر چاندنی میں ملفوف سبزے پر جمی ہوئی تھیں، کہ وہ سوچنے لگا "کہ یہ عرصۂ حیات بھی ناکام اور بے فائدہ گزرا!" اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چشمے ابل پڑے۔ "کاش! میں جنّت کا پھر خواب دیکھوں اور بیدار ہو کر وہی حسین و محبوب نغمہ ایک بار اور سنوں!"

معاً اس نے قلم اٹھایا اور پال واسکی کو مندرجہ ذیل سطور لکھیں:۔

"رفیقم ——— تم نے مجھ سے کہا تھا کہ جب میں اس زندگی سے تنگ آ جاؤں تو تمہیں مطلع کر دوں۔ تو سنو، میں اس جینے سے بیزار ہو گیا ہوں۔ اس زندگی نے مجھے کچھ نہیں دیا اور تم نے جو کچھ کہا تھا وہ حرف بحرف سچ نکلا۔ بیشک میرا انتخاب غلط تھا ..... اگر تم جنّت کے معتقد ہو تو خدارا مجھے بھی اس کا یقین دلا دو! جو آواز میں نے اُس دن سُنی تھی اگر وہ حقیقی ہے، اگر یہ اس کی ہے جو رحیم، صادق اور رحمان ہے، تو کیا میں اسے اب کبھی نہ سُن سکوں گا؟ تم پر بہت سے راز ہائے سربستہ منکشف ہیں، بہت سے اعتقادات واضح ہیں۔ اگر یہ تطویلِ حیات تمہارے ہی باعث ہوئی ہے، تو میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ اپنی عنایت واپس لے لو اور مجھے اسی دوام و بقا کے کنارے چھوڑ دو، جہاں میں سات سال پہلے پہنچ گیا تھا، اور جہاں سنہرے دروازے میرے لئے وا تھے!"

کئی دن گذر گئے۔ اس کی بے چینی اور بے صبری روز بروز بڑھنے لگی آخر کار جواب آیا جس سے اُس کی پُرشور طبیعت قدرے سکون آشنا ہو گئی

لکھا تھا۔ "میرے دوست! جنّت اب بھی ویسی ہی ہے۔ اندھے دنیاداروں کی خاطر کہ وہ اس کے متعلق شبہ کرتے ہیں، اس نے اپنا نقشہ یا مقام نہیں بدلا۔ جو سات سال تم نے گذارے وہ جنّت والوں کے نزدیک محض سات لمحظے ہیں ——— یا اس نغمے میں جو تم نے سُنا تھا ایک ننھا سا وقفہ! مطمئن رہو ——— جس رات تمہیں یہ خط ملے گا، وہی نغمہ پھر سنائی دے گا اور تم معنی سے واقف ہو جاؤ گے۔"

خط ہاتھ میں لئے، جون ڈینور خواب آلود نگاہوں سے کھڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دنیائے رنگ و بو غروبِ آفتاب کی گلابی روشنی میں نہائی ہوئی معلوم ہوتی تھی اور ایک بلبل ہزار داستان شمشاد کی ٹہنی پر جھولتی ہوئی نغمۂ شام الاپ رہی تھی۔ اس نے سنا۔ ایک غیر معیّن مسرّت چھا چلی تھی۔ وہ بالکل تنہا تھا ——— کیونکہ بہت عرصہ ہوا اس کی شریکِ حیات تک اُسے چھوڑ کر اپنے کسی عاشق کے ساتھ چلی گئی تھی۔ یہ کیا! یہ تو عجیب و غریب احساس سرایت کر رہا ہے! وہ محسوس کرنے لگا کہ وہ دودئی میں رنگا جا رہا ہے گویا وہ، یعنی جون ڈینور تو محض جو کھٹا یا خول ہے کسی لافانی شخصیت کا، جو اب تک تکالیف اور صعوبتیں اٹھانے کے لئے آب و گِل میں مقید رہی، لیکن اس وقت آزادی اور مسرتِ بے پایاں حاصل کرنے کے لئے اس قید خانے کی زنجیریں ایک جھنکار کے ساتھ توڑ پھینکنا چاہتی ہے۔

اس نے نیم بلند آواز میں کہا "لیکن جنّت اگر ہو بھی تو مجھے اس میں جانے کا کیا حق ہے! میں نے کوئی ایسا کارِ ثواب نہیں کیا جو اس کا مستحق ہوں۔ بیشک میں نے اپنی طرف سے ہمیشہ اچھا ہی کام کرنے کی کوشش کی۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے؟ یہ ٹھیک ہے کہ میں دنیا میں محبت سے محروم رہا، لیکن میں یہ توقع کیوں کروں کہ آخرت میں یہ مجھے حاصل ہو جائے گی؟ وہ کسی کہتا ہے کہ خدا کا کارخانہ مساوات پر قائم ہے اور ہر انسان کا جوڑا اتارا گیا ہے۔ کسی کو اپنا رفیق یہیں مل جاتا ہے، کسی کو بعد الموت ملتا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے ——— اگر یہ صحیح ہو سکتا ہے تو پھر شاید خدا کے قانون کے مطابق جس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی، مجھے وہی فردوسی نغمہ نوازش جائے!"

عین اسی ساعت ایک دلنواز اور قلب کے پار ہو جانے والی آواز نے خاموشی کو توڑا جس کی شیرینی کو دنیا کا کوئی ارگن یا پرندہ کی ساری بلبل بھی نہیں پہنچ سکتی تھی۔ جون ڈینور ——— وہ دنیوی تفکرات سے تھکا اور مایوسیوں کا ستایا ہوا انسان ——— ایکا ایکی سرو قد کھڑا ہو گیا، زرد رو اور متوقع! اس نے گھبرا کر کمرے میں جمع ہونے والے بے شمار سایوں کو مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔ دنیا اور دنیا کے منافع تو سراب ثابت ہوئے ——— کیا آخرت کی امید بھی اسی طرح خیالِ خام ثابت ہوگی؟

اُس کے مُنہ سے، خوشی میں آپے سے باہر ہوتے ہوئے نکلا "وہی نغمۂ مقدس ہے! وہی محبوب نغمہ جسے میں نے پہلے سنا تھا! ...... ایلو وہ پھر گونجا! ایسی شیرینی آواز نہیں دے سکتی۔ یہ قطعی خدا کی صداقت کا یقین دلا رہی ہے!"

اس نے آنکھوں پر زور دے کر، دم بدم بڑھنے والی تاریکی کو پھر دیکھا ...... کہیں تخیّل تو کارفرما نہیں ہے؟ اور یا یہ سچ مچ کوئی فرشتہ ہے جس کی صورت حد درجہ دلکش، ستارے کی مانند تابناک اور محبت و معصومیت کی تصویر ہے! اس نے آپ ہی آپ اپنے ہاتھ بڑھا دئیے ...... یہ استعجاب، یہ مسرّتِ بے پایاں اس میں کہاں سے آئی؟

"یہ سچ ہے!" اس نے کہا "دنیاداروں کی تنگ نظری اور تشکوک کے باوجود، خدا انصاف والا ہے اور جنّت کا وجود ہے ——— محتاجوں، گنہگاروں اور جاہلوں تک کو روحانی تسکین عطا کی جائے گی! کیونکہ موت، موت تھوڑی ہے، یہ تو حیاتِ تازہ ہے!"

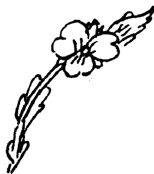
اس کے پاؤں لڑکھڑائے ——— اس کا تنفّس اس کا ساتھ چھوڑنے لگا ——— وہ کرسی پر گرا اور گرتے ہی اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ الہامی آواز گونجتی رہی جس کی بے پناہ موسیقی کا سیلاب پیمانۂ سکوت کو لبریز کئے جا رہا تھا۔ وہ سنتا رہا اور مسکرائے گیا۔

"طویل نیند کے بعد ہم جنّت میں بیدار ہوں گے اور ایک حسین نغمہ ہماری روح کو محظوظ کرے گا" اس نے زیرِ لب کہا اور اس کے بعد وہ خاموش ہو گیا۔

——— اور اس طرح جون ڈینور کو موت کی نیند آ گئی، اور اگر اعتقادات جنون و خبط نہیں ہوتے تو اسی طرح وہ بیدار بھی ہوا ہوگا۔

(میری کوریلی)

صادق الخیری



بانسری کی دُھن

یہ گجردم کس نے بستی میں بجائی بانسری — دل میں اک بے نام چنگاری سی لہرانے لگی
روح نے انگڑائی لی آنکھوں میں آنسو آ گئے — ننھے تارے دیکھتے ہی دیکھتے دُھندلا گئے
اک ہیولےٰ ذہن میں اُبھرا، اُبھر کر کھو گیا — دل کی دھڑکن رُک گئی، ادراک بے بس ہو گیا!
کِھچ گئے آنکھوں میں وہ نظارہ ہائے دلنشیں! — محتسب کی روح جن کی تاب لا سکتی نہیں
جنبشِ مضراب سے جب تھرتھرا اُٹھتے تھے تار — راگ کی مستی سے ہو جاتی تھیں آنکھیں سوگوار
جب دھواں بن کر مچلتا تھا جہانِ رنگ و بو — مسکراتی تھی ستارہ بن کے دل کی آرزو
وہ جھُکی آنکھوں کے وعدے، مست نغموں کے پیام — کپکپاتے لب، دھڑکتا دل، نظر محوِ کلام
ہائے وہ شرمیلے آنسو، ہائے وہ تپتے دماغ — پتلیوں میں جھلملاتے تھے محبت کے چراغ
میری باہیں اُن کی زلفیں، میرا دل اور اُن کے ناز — ہائے وہ گیسوئے مشکیں، اُف وہ چشمِ نیم باز
اب نہ گا اے بانسری والے! تجھے اپنی قسم، — راگ کے پردوں میں واپس آ رہا ہے درد و غم

پربتوں کی آڑ سے اُبھریں سنہری برچھیاں
جانے کیا باعث کہ پیلا پڑ گیا ہے آسماں!

احمد ندیم قاسمی

حیرت میں ہے

شاندار ترقی!

۱۹۳۲ء تا ۱۹۴۰ء

سنلائٹ انشورنس کمپنی کی ترقی پبلک کی طرف سے اس کی خدمات کی بڑھتی ہوئی قدردانی کا نتیجہ ہے



سنلائیٹ کی ہیڈ آفس بلڈنگ واقع مال روڈ۔ لاہور

(جو کہ زیر تعمیر ہے)

سنلائیٹ کی کامیابی کی وجوہات

مطالبات کی فوری ادائیگی۔ جدید ترین مقبول عام سکیمیں پالیسی کی آزادانہ شرائط
کفائت شعارانہ انتظام مستحکم مالی پوزیشن اور سب سے بڑھ کر کھرا لین دین

کل مکمل شدہ کاروبار زائد از دو کروڑ روپیہ

سنلائٹ کے وظائف میٹرک کے بعد کی پڑھائی کے لئے

سنلائٹ کی ایک بے نظیر خصوصیت۔ بغیر کسی زائد ادائیگی

سنلائٹ آف انڈیا انشورنس کمپنی لمیٹڈ

ہیڈ آفس۔ لاہور — کناٹ سرکس نیو دہلی — کلائیو سٹریٹ کلکتہ — لال باغ لکھنو۔ — بندر روڈ کراچی

ودّیاساگر

(لی کاک سے معذرت کے ساتھ)

خوشامد پسندی اور خودستائی ایک حد تک ہر انسان کی فطرت میں داخل ہیں ۔ مجھے نہ فرشتہ ہونے کی غلط فہمی ہے اور نہ شیطان کہلانے کا شوق۔ اس لئے اس امر کا صاف اعتراف ہے کہ بعض اوقات دوسروں کے منہ سے اپنی تعریف سن کر میں بہت خوش ہوتا ہوں کبھی کبھی "ناقدریِ ابنائے روزگار" سے تنگ آکر مجھے اپنی شان میں خود منشور قصیدے بھی تصنیف کرنے پڑتے ہیں لیکن مجموعی حیثیت سے میں بڑا انکسار پسند اور نیاز مند قسم کا نوجوان واقع ہوا ہوں اور نہ مجھے اپنی ذات کے متعلق کچھ زیادہ حسنِ ظن بھی نہیں ہے ۔ لیکن اس کے باوجود بعض بزرگوں کا خیال ہے کہ میں بے حد مغرور ہوں ۔ اپنے آپ کو بہت قابل سمجھتا ہوں اور دوسروں کو خاطر میں ہی نہیں لاتا ۔

ڈاکٹر متین صاحب ہی کا قصہ سنئے ۔ آپ پچھلی جنگ میں کسی ہندوستانی پلٹن کے ساتھ ایک کمپاونڈر کی حیثیت میں فرانس تشریف لے گئے تھے ۔ اللہ کو ہندوستان کی بہتری مقصود تھی کہ جہاں اس جنگ میں لاکھوں افراد ہلاک ہوئے متین صاحب کا بال بھی بیکا نہ ہوا ۔ آپ نے پنجاب واپس آکر چیچوکی ملیاں میں پریکٹس شروع کر دی ۔ کچھ عرصہ بعد وہاں سے لاہور اٹھ آئے ڈاکٹر صاحب بات بات میں فرانس کا ذکر کرتے ہیں ۔ کہیں سڑک پر کوڑے کرکٹ کا ڈھیر دیکھا تو جھٹ منہ پر رومال رکھ کر فرمانے لگے " فرانس میں یہ بیہودگی ہم نے کہیں نہیں دیکھی " کہیں کوئی سکول ماسٹر کسی بچے کو پیٹتا نظر آیا تو فوراً بول اٹھے " فرانس کے ابتدائی مدرسوں میں یہ منظر آپ کو کہیں نظر نہ آئے گا " کہیں دیکھا کہ بارش کا پانی جمع ہے اور نکاس کی کوئی صورت نہیں تو بڑی حسرت سے ارشاد فرمایا " پیرس میں شہری غیر ذمہ داری کا یہ نظارہ کبھی نہیں " یعنی پیرس اور فرانس کی یادیں اس طرح گاہے گاہے آہیں بھرنے اور ٹھنڈے سانس لینے کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ ہر شخص کا یہی خیال ہے کہ ڈاکٹر متین نے طب کی تعلیم فرانس میں حاصل کی ہے اور آپ کافی عرصہ تک اس ملک میں رہے ہیں ۔ بات تو ہم ایسے دو چار نیاز مند ہی جانتے ہیں کہ حضرت قبلہ کس سلسلے میں وہاں تشریف لے گئے تھے اور وہاں سے کیا سیکھ کر آئے ۔

ڈاکٹر متین کا معمول ہے کہ شام کو اپنی دوکان بند کر کے سیر کو نہیں جاتے بلکہ بغداد ہوٹل میں آبیٹھتے ہیں ۔ شہر کے کچھ ادب شعار مزاج لیکن بیکار حضرات وہاں پہلے سے ہی سے جمع ہوتے ہیں ۔ دو چار اخبار نویس بھی آنکلتے ہیں ۔ ایک مختصر سی محفل جم جاتی ہے ۔ بات کسی کی ہو ۔ ڈاکٹر صاحب کسی نہ کسی طرح فرانس کا ذکر ضرور چھیڑ دیتے ہیں ۔ اور اسی ضمن میں دنیا بھر کے ادب اور سیاست پر بھی تنقید فرما جاتے ہیں ۔

بغداد ہوٹل میں آنے والے لوگ ڈاکٹر صاحب کے تبحر علمی سے بہت مرعوب ہیں ۔ جب آپ کسی مسئلے پر اظہارِ خیال فرما رہے ہوتے ہیں تو بیچارے بڑے ادب سے ان کے منہ کی طرف تکتے رہتے ہیں ۔ اب اسے میری بد قسمتی سمجھئے یا ڈاکٹر متین کی بے احتیاطی کا نتیجہ کہ مجھے کسی نہ کسی طرح یہ پتہ چل چکا ہے کہ آپ کے سفرِ فرانس کی علتِ غائی کیا تھی ۔ محض یورپ ہو آنا میرے نزدیک علم و فضل کی کوئی سند نہیں ۔ اس لئے کوشش کے باوجود میں اپنے دل میں ڈاکٹر صاحب کے لئے وہ جذبۂ احترام پیدا نہیں کر سکا جس کے وہ مجھ سے متوقع ہیں ۔ اس وجہ سے ان کا خیال ہے کہ میں بے حد مغرور واقع ہوا ہوں ۔ بزرگوں کا ادب نہیں کرتا ۔ انگریزی کے چار حرف پڑھ کر اپنے آپ کو بہت قابل سمجھتا ہوں ۔ حالانکہ مجھے شیکسپیئر کے ڈراموں سے بھی پوری طرح واقفیت نہیں ۔

اب ذرا شیکسپیئر کے ڈراموں سے میری ناواقفیت کا ثبوت بھی سن لیجئے ۔ کبھی کبھی میں بھی بغداد ہوٹل جا نکلتا ہوں ۔ ایک شام جو وہاں پہنچا تو میرے پاس شیکسپیئر کا ڈراما "مرچنٹ آف وینس" تھا ۔ اتفاق کی بات سمجھئے کہ اس وقت ڈاکٹر متین کے حلقۂ احباب میں سے کوئی شخص بھی ہوٹل میں موجود نہ تھا اس لئے مجبوراً انہیں مجھے شرفِ تکلم بخشنا پڑا ورنہ وہ عام طور پر کالج کے لڑکوں سے بہت کم گفتگو فرمایا کرتے ہیں ۔ کیونکہ ان کا خیال ہے کہ کالج کے لڑکے پرلے درجے کے کم علم، کم سواد اور نالائق ہوتے ہیں لیکن اپنے آپ کو سمجھتے بہت کچھ ہیں ۔ اور ڈاکٹر صاحب کو جس بات سے سب سے زیادہ

نفرت ہے وہ یہی ہے کہ کوئی شخص جہل مرکب ہونے کے باوجود اپنی قابلیت کے زعم میں کسی کو خاطر میں نہ لائے۔ وہ فرمایا کرتے ہیں کہ ہمیں ساری دنیا علامہ دہر اور دریا ساگر سمجھتی ہے لیکن ہم نے کبھی کسی محفل میں اپنی کسی بات سے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ ہمیں بھی اللہ نے علم کی دولت بخشی ہے۔ لیکن یہ کالجوں کے لڑکے دنیا بھر کے معاملات پر اس تیقن کے ساتھ تنقید کر جاتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ اب میری اور پروفیسر دریا ساگر کی اس دن کی گفتگو سنئے۔

"اختر صاحب یہ کونسی کتاب ہے آپ کے پاس؟"

"شیکسپیئر کا ایک ڈراما ہے جی۔ مرچنٹ آف وینس۔"

ڈاکٹر صاحب قہقہہ لگا کر بولے:

"مرچنٹ آف وینس! بھئی بہت خوب لکھا ہے ظالم نے۔ قلم توڑ دیا ہے۔ دنیا بھر کے ادب میں اس کے پائے کا کوئی ڈراما نہیں۔"

"جی ہاں بہت اچھی چیز ہے۔"

"بہت اچھی چیز ہے! ارے میاں بے نظیر کہو بے نظیر۔ کسی کتاب کا نام لے سکتے ہو جو مرچنٹ آف وینس کے مقابلے میں پیش کی جا سکی؟"

"خود شیکسپیئر کے اکثر ڈرامے اس سے بدرجہا اچھے ہیں۔"

ڈاکٹر صاحب پہلے سے زیادہ زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے بولے۔

"آخر شیکسپیئر کا نام ہی لیا نا! شیکسپیئر تو خلاقِ معانی ہے۔ کردار کا بادشاہ۔ مرچنٹ آف وینس کے کرداروں کو ہی لیجئے۔ انطونیو، شائیلاک سلونیو۔۔۔۔"

میں نے فرطِ حیرت سے ڈاکٹر متین کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"سلونیو ڈاکٹر صاحب! غالباً آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے۔ اس ڈرامے میں بسانیو ہے۔ ایک سلانیو بھی ہے لیکن سلونیو تو کسی کردار کا نام نہیں۔"

ایک لمحہ کے لئے ڈاکٹر متین کی آنکھوں میں شبہ کی جھلک پیدا ہوئی لیکن وہ شخص جو کئی سال تک فرانس میں چھچھوروں کی مرہم پٹی کر چکا ہو۔ اپنی غلطی کا اعتراف کب کرتا ہے؟ ڈاکٹر متین چمک کر بولے۔

"بھئی خوب۔ میاں اگر تم اسی طرح کتابیں پڑھ کر بھول جاتے رہے تو ایم اے میں پاس ہو چکے۔ ہمارے حافظے کا یہ حال ہے کہ آج سے بیس برس پہلے پیرس کے کسی رسالے میں نپولین پر ایک مضمون پڑھا تھا۔ اب تک اس کا ایک ایک حرف یاد ہے اور ——"

یہ سوچ کر کہ اگر فرانس کا ذکر شروع ہو گیا تو میرا ہار جانا یقینی ہے۔ میں نے کہا: "ڈاکٹر صاحب قطع کلام معاف۔ لیکن "مرچنٹ آف وینس" میں کوئی "سلونیو" نہیں ہے۔ میں نے یہ ڈراما کوئی چھ بار پڑھا ہے۔"

"کیا احمقانہ بات ہے۔ بالکل احمقانہ۔ کالج کے لونڈوں کی طرح احمقانہ"

بات یہ تھی کہ اس گفتگو کے دوران میں ڈاکٹر متین کے بعض عقیدت کیش بھی آ پہنچے تھے اور ان لوگوں کے سامنے میرا اس طرح ان کی بات جھٹلانا ڈاکٹر صاحب کو بہت ناگوار گزرا۔ میں ڈاکٹر صاحب کی اس کمزوری کو بھانپ گیا۔ اس لئے ذرا مسکراتے ہوئے بولا: "ڈاکٹر صاحب جو جی میں آئے کہہ لیجئے۔ لیکن اس ڈرامے میں سلونیو کا وجود ثابت کرنا مشکل ہے۔"

"اب میں آپ سے کیا مغز کھپائی کروں! میں نے خود یہ ڈراما پڑھا ہے۔ اپنی آنکھوں سے سٹیج ہوتے دیکھا ہے۔ سب سے اہم پارٹ ہی سلونیو کا ہے۔ سلونیو کا وجود ثابت کرنا مشکل ہے! بھئی خوب!! کالج کے لڑکے ہر بات اس تیقن کے ساتھ کرتے ہیں کہ الامان۔ اچھا صاحب یہ انطونیو کا دوست کون ہے جو بسانیو کے دشمن ہو جانے کے باوجود اس کا ساتھ نہیں چھوڑتا۔ اوفیلیا کو شائیلاک سے کون چھڑاتا ہے! لارٹیز کو اس کی بہن کے متعلق کون بدظن کرتا ہے! اور آپ فرماتے ہیں کہ مرچنٹ آف وینس میں سلونیو نام کوئی کردار ہی نہیں۔"

میں سمجھ گیا کہ دریا ساگر میں طغیانی آ چکی ہے اور ہر چیز مرکزِ ثقل سے ہٹ چکی ہے۔ حتیٰ کہ ڈاکٹر متین کا دماغ بھی —— ورنہ "ہیملٹ" کے لارٹیز کو "مرچنٹ آف وینس" کے دامن میں پناہ نہ لینی پڑتی۔ میں نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا "ڈاکٹر صاحب میں پھر کہتا ہوں کہ اس ڈرامے میں کوئی سلونیو نہیں۔ اور مجھے یقین ہے کہ آپ بھی یہ بات جانتے ہیں۔"

لیکن ڈاکٹر متین میں ایک خوبی ہے کہ انہوں نے اپنی غلطی کا کبھی اعتراف نہیں کیا۔ وہ تڑپ کر بولے "سنئے۔ سلونیو۔ "مرچنٹ آف وینس" کا سب سے اہم کردار ہے۔ وہ نمونہ ہے نمونہ۔ انگریزی میں اس قسم کے کرداروں کو ٹائپ کہتے ہیں۔ آپ تو انگریزی کا ایم اے کر رہے ہیں۔ یہ ابتدائی باتیں آپ کو معلوم ہونی چاہیئے تھیں" میں نے جی میں کہا۔ میری لاعلمی کا تو گلہ ہی فضول ہے۔ اس سلونیو کا علم تو بے چارے شیکسپیئر کو بھی نہیں ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب فرما رہے تھے۔

"سلونیو ٹائپ ہے مکمل اطالوی جنٹلمین کا۔ وہ ایک مثال ہے۔ ایک ——"

میں اسی اثنا میں ڈراما کے افراد کی فہرست نکال چکا تھا۔ میں نے کتاب

ڈاکٹر متین کے سامنے رکھ دی اور کہا "دیکھئے ڈاکٹر صاحب ڈراما کے افراد کی فہرست ملاحظہ فرمائیے۔ آپ کا سلونیو اس میں نہیں۔"

ڈاکٹر صاحب اس پر بھی نہیں گھبرائے بلکہ فرمانے لگے۔

"تو یہ کس کم بخت نے کہا کہ اس کا نام کرداروں کی فہرست میں ہے؟ حضرت یہی تو شیکسپیئر کا آرٹ ہے۔ کمال تو یہی ہے کہ سب سے اہم کردار کا نام اس فہرست میں نہیں ہے۔ شیکسپیئر! شیکسپیئر!! خلاق معانی!!! کرداروں کا بادشاہ شیکسپیئر!!!! میاں صاحبزادے یہ باتیں تمہاری سمجھ سے بالاتر ہیں۔ ڈرامے کا آرٹ سمجھنے کے لئے شئے لطیف کی ضرورت ہے شئے لطیف کی ضرورت"

میں نے سوچا کہ اب اس بڈھے سے مزید بحث بیکار ہے۔ تنہائی میں جب سوچے گا تو خود بخود اسے اپنی حماقت کا احساس ہو جائے گا۔ لیکن سلونیو ڈاکٹر متین کے اعصاب پر سوار ہو چکا تھا۔ اور ڈاکٹر صاحب انتہائی فصاحت سے اس مثالی کردار کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈال رہے تھے۔ سلونیو کا موجودہ معاشرت سے تعلق۔ سلونیو اور صنف نازک سلونیو کے پاکیزہ اخلاق۔ سلونیو اور ہیملٹ۔ غرضکہ کوئی موضوع نہ تھا جس پر ڈاکٹر صاحب نے طبع آزمائی نہ کی ہو۔

تنگ آکر میں نے ڈراما ڈاکٹر صاحب کے سامنے پٹک دیا اور عرض کیا کہ افراد کی فہرست نہ سہی۔ ساری کتاب میں سے کہیں سلونیو کا نام نکال دکھائیے۔ ڈاکٹر صاحب تھوڑی دیر ادھر ادھر صفحے الٹنے کے بعد بولے "یونیورسٹی کی بدمذاقی کی کوئی انتہا ہے۔ سلونیو کا سارا پارٹ ہی کتاب میں سے نکال دیا ہے۔ سلونیو کی گفتگو ذرا بے باک ضرور تھی۔ مگر اخلاق سے گری ہوئی نہ تھی۔ مگر ان یونیورسٹی والوں کے اخلاقی معیار بھی نرالے ہیں۔ سارا پارٹ ہی خارج کر دیا۔ تبھی تو ڈراما بالکل بے جان بن کر رہ گیا ہے۔ کہیں اس طرح بھی نوجوانوں کے اخلاق کی حفاظت کی جا سکتی ہے۔ اخلاق کی خاطر ادب کا ستیاناس ......"

مجھے دراصل کالج پہنچنا تھا۔ اس لئے میں ڈاکٹر متین کا پورا فقرہ سنے بغیر اٹھ کر چلا آیا۔ بعد میں لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ ڈاکٹر متین رات کے دو بجے تک بغداد ہوٹل میں سلونیو کی شخصیت۔ یونیورسٹی کی بدذوقی اور کالج کے لڑکوں کی نالائقی پر تقریر فرماتے رہے۔

حمید نظامی

کیا ایسا ہی ہوا کرتا ہے؟

صبح کو کوئی پھول جو دیکھا میں نے جانا تم خنداں ہو پیارا، غیر سے بڑھ کر نکلا
دن کو کوئی موتی چمکا میں نے جانا تم تاباں ہو پھول تو اُف اِک پتھر نکلا
رات کو کوئی تارا ٹوٹا میں نے جانا تم رقصاں ہو دیوتا، ایک ستمگر نکلا کیا الفت کے خواب یہی ہیں
لیکن جب کچھ غور کیا تو کیا ایسا ہی ہوا کرتا ہے؟

اُف! وہ پھول تو اک کانٹا تھا گھومنے کو گلزار میں آئے میں نے دل کا بُوٹا سمجھا
موتی، آنسو کا قطرہ تھا چمبیلی کے ہار میں آئے میں نے دل کی مالا سمجھا
تارا تو اک انگارا تھا کیا الفت کے خواب یہی ہیں گھنگرو کی جھنکار میں آئے میں نے دل کا نغمہ سمجھا
کیا ایسا ہی ہوا کرتا ہے؟ لیکن جب کچھ غور کیا تو

پیارے پیارے نظاروں میں میں نے تم کو پیارا سمجھا غم کی کلی بھی پھوٹ چکی تھی
رنگیں رنگیں گلزاروں میں میں نے تم کو چمپا سمجھا دل کی مالا ٹوٹ چکی تھی
اُودے اُودے کہساروں میں میں نے تم کو دیوتا سمجھا گیتوں کی لے چھوٹ چکی تھی کیا الفت کے خواب یہی ہیں
لیکن جب کچھ غور کیا تو کیا ایسا ہی ہوا کرتا ہے؟

سلام مچھلی شہری

تقسیم

بابو سیتلا پرشاد دفتر سے لوٹے تو پہلے ہی اُن کی تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں گھر میں آ کر انہوں نے اپنی چارخانے کی ٹوپی اور اچکن اتاری ہی تھی کہ ان کا سب سے چھوٹا بچہ تین سالہ پرمود مٹی کھاتا کیچڑ میں لت پت آ کر ان سے لپٹ گیا۔ ان کی اچکن پر جا بجا کیچڑ کے نشان بن گئے۔ پہلے تو وہ دور ہی سے "ہاں ہاں" کرتے رہے۔ اور کمرے بھر میں بچنے کے لئے بھاگنے لگے۔ لیکن پرمود نے سمجھا کہ بابوجی "ہم بھاگیں تم چھوؤ" کھیل رہے ہیں۔ وہ بھی اپنے ننھے ننھے پیروں سے ان کا تعاقب کرنے لگا۔ بچے کو بری طرح پیچھے پڑا ہوا دیکھ کر سیتلا پرشاد ایک مغرور افسر کی طرح پیشانی پر بل ڈال کر اور سنجیدہ صورت بنا کر کھڑے ہو گئے۔ وہ متوقع تھے کہ ان کی یہ اداکاری کچھ کارگر ہو گی۔ لیکن پرمود نے ایک نہ مانی اور لپک کر انہیں کیچڑ میں لت پت کر دیا۔ انہوں نے اُسے کرخت آواز میں چیخ کر ڈانٹا۔ اور پھر بھی بھولے پرمود کے نہ ملنے پر زور سے اس کا کان مروڑ دیا اور وہ اسے روتا اور "اماں اماں" کہتا ہوا چھوڑ کر باہر چلے گئے۔

بچے کو چیختا سن کر اس کی ماں جو اندر باورچی خانے میں مچھلی تل رہی تھی۔ دوڑ کر باہر آئی اور اپنے کلیجے کے ٹکڑے پرمود کو روتا دیکھ کر چراغ پا ہو گئی۔ اس نے سب سے بڑے لڑکے — دینو کو زور سے پکارا — "دینو! دینو!! ادھر چلو جاؤ اپنے بابوجی کو باہر سے بلا لاؤ۔"

اس نے شوہر کی اچکن لٹکتی دیکھ لی تھی —

"تم نے میرے پرمود کو کیوں مارا؟"

"میرے منع کرنے پر بھی مجھ پر چڑھ کر اس نے کیوں میرے کپڑے خراب کئے؟"

"وہ بچہ ہے۔ اتنا نہیں سمجھتے؟"

"اچھا تو بچے کے لاڈ پیار کے لئے ہر روز نئی اچکن کہاں سے آئے گی؟ ذرا سنوں تو؟"

"تو کیا بے سمجھ بچے کو مار کر اس کی جان لے لوگے؟"

"کیوں جھوٹ موٹ مجھے الزام دیتی ہو؟ میں نے جان لینے کو کب کہا؟"

"یہ جان لینا نہیں تو اور کیا ہے؟ کہنے نہ کہنے کی بحث تھوڑی ہے۔"

"واہ تمہارے جیسے سمجھنے والے ہوں تو سمجھ لیں ——"

"سمجھ کیا لیں۔ میں خوب سمجھتی ہوں۔ دودھ پیتی بچی تو ہوں نہیں۔"

"سمجھو چاہے نہ سمجھو۔ اس سے مجھے کیا؟ اگر پھر وہی حرکت کرے گا تو پھر اسی طرح سے مار کھائے گا۔"

"اُفوہ! یہ مزاج؟ بڑے آئے کہیں کے مارنے والے!"

"مزاج نہیں تو اور کیا۔ اگر وہ تمہارے کلیجے کا ٹکڑا ہے تو اسے منع کیوں نہیں کر دیتیں کہ میرے پاس آ کر فضول پریشان نہ کیا کرے۔ مجھے پریشان ہونا پسند نہیں۔"

"پریشان ہونا کسے پسند ہو سکتا ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے لیکن اس کے کان مروڑنے سے کیا ملا؟ کیا اس کی جان کی قیمت دو پیسے بھی نہیں دو پیسے میں آپ کی اچکن بگلے کی طرح سفید ہو کر آ جاتی۔ یا میں ہی صاف کر دیتی لیکن یہ بات میری سمجھ میں مطلق نہ آ سکی کہ آپ نے اسے مارا کیوں؟"

"سیدھی سی تو بات ہے۔ اس نے مجھے پریشان کیا۔ میں نے اسے مارا۔ میں اپنے آرام کے بارے میں کسی کا ساجھا نہیں چاہتا۔ سمجھیں؟ آخر آدمی کی طبیعت ہی تو ہے تنگ ہو نا برداشت ہو کر نہ ہوا۔"

اپنی سمجھ سے سیتلا پرشاد نے بڑی نرمی سے اپنی صفائی پیش کی تھی — ان کی نقل اتارتے ہوئے ان کی بیوی نے اسی لہجے میں جواب دیا —— "یہ جلن کسی اور کو دیجئے گا۔ میں یہ سمجھے بیٹھی ہوں۔ آخر آدمی کی طبیعت ہی تو ہے برداشت ہوا نہ ہوا۔ پرمود نے کچھ کیا اور آپ کی طبیعت پر فالج گرا۔ اور [illegible] جو بھی کرے [illegible] برداشت پر ذرا بھی اثر نہیں پڑتا۔ ٹھیک کہتی ہوں نا؟ ذرا ایمان سے کہئے [illegible] ساری اچکن اکیلے پرمود نے خراب کی ہے؟"

اس سے پہلے کہ بابو سیتلا پرشاد بغلیں جھانکنے سے فرصت پائیں پرمود

نے انگلی کے اشارے سے بتادیا کہ اس نے کہاں کہاں گلکاری کی ہے اور عزیزم
دینو نے بھی یہ دیکھ کر کہ اچکن خراب کرنے کی ساری داد پرمود ہی سمیٹے جا رہا ہے
اس نے اپنے لگائے ہوئے دھبوں کو بتاتے ہوئے بڑے فخر سے کہا ——
"باقی یہ سب تو میں نے لگائے ہیں"۔

اب بابو سینلا پرشاد کا منہ پھیکا پڑ گیا لیکن جیسے انہوں نے اپنے
بچے کے لئے بات ڈھونڈھ نکالی اور بولے —— "ارے پرمود نے جب پہلے
اچکن خراب کر ہی دی تو پھر بچا ہی کیا! میں نے سوچا اب بچا کر کیا بنالیں گے
لگ جائے جتنی لگنی ہے"۔

"میں یہ منطق خوب سمجھتی ہوں۔ یہ سوال "لگ جائے جتنی لگنی ہے"
کا نہیں ہے۔ یہ معاملہ پرمود اور دینو کا ہے۔ اسے آپ مجھ سے چھپا نہیں
سکتے"۔

"تو بھی میں چھپانا چاہتا کب ہوں؟ اگر تمہارے کلیجے کا ٹکڑا پرمود
ہے تو میرا لخت جگر دینو ہے۔ اسے میں چھپاتا ہی کب ہوں اور یہ بات
نہ تم ہی چھپا سکتی ہو۔ چاہے کچھ کر لو ..."

بابو صاحب کی بیوی نے چراغ پا ہو کر کہا —— "آپ جو چاہیں کہیں
لیکن میں ایسی کمینی نہیں ہوں۔ میں پوچھوں گی بھی ..."
اتنا کہتی ہوئی کچھ سوچ کر چپ ہو گئی
پھر اس نے پرمود کی طرف دیکھ کر کہا —— "کیوں بیٹا تجھے
دوسروں کے ہاں جوتے کھانے! کیا میں مر گئی تھی جو چلا گیا کہیں اور؟
بڑے کمین کے لڈو رکھے تھے نہ وہاں۔ کھا لیا جوتا تو چلا آیا روتا کیوں ...؟"
دوسرے ہی لمحے اسے چمکارتی ہوئی اس کی ماں نے کہا —— "جانے
دو بیٹا ان لوگوں کو۔ ان سے اب نہ بولنا۔ نہ ان کے پاس جانا۔ چل تجھے
خوب مزے کی تلی ہوئی مچھلی کھلاؤں۔ دینو بھی مچھلی مانگنے آئے گا تب پوچھوں
گی اس سے۔ بدمعاش کمین کا گلی گلی مارا مارا پھرتا ہے۔ ہے نا بیٹا؟"
بابو سینلا پرشاد نے بیوی کے سُر میں سُر ملا کر کہا —— "چلو بیٹا تمہیں
پنو بابو کے ہاں سے چاکلیٹ اور لیمن ڈراپس کھلاؤں۔ ماں جانے دے ان
کی سڑی ہوئی مچھلی۔ کیسی بدبو آ رہی ہے۔ پرمود بھی چاکلیٹ مانگنے آئے گا۔ تو
اس سے پوچھوں گا کہ مچھلی کیسی تھی؟ ہے نہ مُنا۔ وہ لگتا ہے بات بات پر رونے"
دینو اپنے باپ کے ساتھ باہر چلا گیا اور پرمود ماں کے ساتھ باورچی
خانے میں جا گھسا۔
بھلا بچے کی طبیعت مچھلی کھائے بغیر کیسے مانتی؟ دینو آدھ گھنٹے کے
بعد باورچی خانے میں پہنچا اور بولا —— "اماں مجھے بھی مچھلی دو"۔
ماں نے تیور بدل کر کہا —— "اب آیا ہے بڑا ماں کا سگا بننے؟ ابھی
تو نواب بنا گھومتا تھا۔ جا بھاگ جا میرے پاس سے۔ تجھے مچھلی نہیں مل سکتی
جب تا کیوں نہیں اپنا چاکلیٹ فاکلیٹ"۔
دینو مچل گیا اور زمین پر لوٹ کر رونے کی تیاری کرنے لگا۔
ماں نے اور بگڑ کر کہا —— "رو رو، خوب رو، تجھے مچھلی کے یہی کانٹے
نہ چبھوئے تو تو بھی کیا کہے گا"۔
اس ڈر سے کہ کہیں ماں اپنے قول کو عمل کا جامہ بھی نہ پہنا دے دینو
بھاگ کر باہر اپنے باپ کے پاس چلا گیا۔ اس کی ماں نے سچ مچ ایک روز اسے
چٹکی کاٹ لی تھی۔

. . . .

اس تقسیم کی دستاویز میرے پاس نہیں ہے۔ بہت ممکن ہے دینو
سینلا پرشاد کو اور پرمود اپنی ماں کو پڑا ہو!

آسی رام نگری

دو غزلیں

(۱)

ظلماتِ ممکنات میں پھینکا گیا ہے دل
جانے خضر کہ چشمۂ آبِ بقا ہے دل

فطرت ہے اس میں اور یہ فطرت میں خود نما
کیا جانیں وہ ہے آئنہ یا آئنہ ہے دل

ارض و سما میں دھاک ہے جس کی وہی تو ہے
لاریب مشتِ خاک اترا ہی بلا ہے دل

اس کا اک ایک قطرہ ہے طوفان دربغل
معمورِ بجلیوں سے ہے جو وہ گھٹا ہے دل

سمجھے ہوئے ہوں میں تو یہی اس کی ماہیت
اک حسنِ لاجواب کی رنگیں ادا ہے دل

اک اہلِ دل نے کیا ہی پتے کی کہی ہے بات
حقدار دل کا ہے وہی جس نے دیا ہے دل

یہ کائنات آئنہ خانہ ہے اور امیں
مجبوریوں کے زیرِ اثر خود نما ہے دل

صدا

(۲)

اک برق ہے ہجومِ تقاضا لئے ہوئے
جانے میں آگیا ہوں یہاں کیا لئے ہوئے

محمل کی اوٹ میں لب لیلیٰ شفق فروش
دشتِ جنوں میں قیس ہے غوغا لئے ہوئے

اک تو کہ بے حجاب نہ ہونا تری ادا
اک میں کہ شوقِ دید کی دنیا لئے ہوئے

اک تو کہ اپنے حسن کی ہے آپ ہی دلیل
اک میں کہ تیرے عشق کا دعویٰ لئے ہوئے

اک تو کہ تیری مست نگاہوں کے میکدے
اک میں کہ لب پہ حسرتِ صہبا لئے ہوئے

مقصود امتحان ہے رندوں کے ظرف کا
پھرتا ہوں بزم بزم میں مینا لئے ہوئے

اتنا اثر تو شیخ کی صحبت کا ہے امیں
ہاتھوں میں جام لب پہ ہوں توبہ لئے ہوئے

امین حزیں

روشنی کا مینار

رحیم کو مار کر سمندر میں پھینک کر اختر رہنے کے کمرہ میں داخل ہوا اور آتش دان کے نزدیک بیٹھ گیا۔ پہلے اُس کا ارادہ رحیم کو مار ڈالنے کا نہ تھا۔ اُس نے رحیم سے منت سماجت کے ساتھ اس امر کی خواہش کی تھی کہ دوسرے روز جب اُن میں سے ایک کو مینارہ سے خشکی پر لے جانے کے لئے کشتی آئے تو وہ اپنی تعطیل کو اُس کے ساتھ بدل کر اُسے شہر میں جانے دے۔ اس کے عوض میں اُس نے رحیم کو اپنی پورے ماہ کی تنخواہ دینے پر رضامندی ظاہر کی تھی لیکن اُس پر اپنا یہ ارادہ ظاہر نہ کیا تھا کہ وہ خشکی پر پہنچ جانے کے بعد پھر کبھی اُس منارے پر واپس نہ آئے گا۔ مگر ضدی رحیم نے اُس کی ایک نہ سنی۔

رحیم نے اصرار کے ساتھ کہا "اس مرتبہ میری باری ہے۔ تم اپنی تعطیل گذار چکے ہو اور اب میری تعطیل بھی مجھ سے لینے کی اُمید رکھتے ہو"

اختر نے دروغ گوئی کے ساتھ جواب دیا "صرف اس مرتبہ۔ میری ماں بیمار ہے۔ آئندہ تم دو تعطیلیں ایک ساتھ لے لینا"

رحیم نے سر ہلا کر کہا "مجھے بھی شہر میں کام ہے۔ کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ میں اپنی تمام زندگی اسی منارے پر بسر کر دوں؟"

اختر نے جب یہ سنا تو اُس نے اپنے دل میں سوچا "مجھے تعجب ہے کہ رحیم اور کیا کرے گا۔ کیا اُس نے اپنی زندگی کے پندرہ سال وہیں بسر کئے تھے اور کیا اُس سے پہلے دس سال دوسرے منارے پر نہیں گذارے تھے؟ اُس کا یہ کہنا کہ اُس کو بھی شہر میں کچھ کام ہے کتنا مضحکہ خیز ہے جبکہ اُس نے اُس چھوٹے سے کمرے میں رہ کر، ہوا کی سنسناہٹ اور موجوں کا شور سن کر، جہازوں کو فاصلے پر گذرتے ہوئے اور اُن کا دھواں چمنیوں سے ایک باریک فیتے کی طرح اُٹھتے ہوئے دیکھ کر، یا اُن خانہ بدوش چڑیوں کو دیکھ کر جن کے رنگین پر سورج کی روشنی میں چمک اُٹھتے ہیں اور جو منارہ کے جنگلے پر تھوڑی دیر آرام کر کے سال میں دو مرتبہ گرم ملک کو سفر کیا کرتی ہیں، ایک چوتھائی صدی بڑے اطمینان سے کاٹی ہے۔

اُس نے کہا "لیکن تمہاری تو شادی نہیں ہوئی؟"

رحیم نے ہنس کر کہا "شادی؟ میری شادی؟ میری مہینوں کی غیر حاضری میں میری بیوی کیا کرتی؟ نہیں دوست! یہاں کی نوکری کرنا صرف غیر شادی شدہ مردوں کا کام ہے لیکن ایک غیر شادی شدہ شخص کے بھی دوست احباب ہوتے ہیں اور بعض اوقات وہ اُن سے ملنا چاہتا ہے"

اختر نے رحیم کو کمرے سے باہر جاتے ہوئے دیکھا۔ اُس نے دروازہ بند کر دیا تاکہ طوفانی سمندر کی موجوں کے چھینٹے اندر نہ داخل ہوں۔ اُس نے ہوا کی سنسناہٹ کے درمیان رحیم کی سیٹی کی باریک آواز سنی۔ وہ آتشدان کے قریب بیٹھ گیا اور حسینہ کی تصویر نکال کر دیکھنے لگا۔ حسینہ کی پہلی ملاقات کا منظر اُس کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔

رخصت ہوتے وقت اُس نے حسینہ سے کہا تھا "ایک ماہ بعد پھر آؤں گا"

حسینہ نے اُس کا بازو پکڑ کر پوچھا تھا "پھر تو مینار کو واپس نہ جاؤ گے؟ ایسی حالت میں جب کہ تم سال کا تین چوتھائی حصہ منارہ پر بسر کرو۔ اور میں تنہا ایک فرش فروش سے آراستہ مکان میں پڑی رہوں ہماری ازدواجی زندگی اطمینان و مسرت سے نہیں گذر سکتی" اُس نے جواب دیا تھا "نہیں۔ میں شہر ہی میں کہیں کوئی کام تلاش کرونگا" حسینہ یہ سن کر اُس سے لپٹ گئی تھی۔ وہ کتنا خوش نصیب تھا کہ اپنی تعطیل کے دوسرے ہی روز وہ حسینہ سے اچانک ملاقات ہو جانے کی مسرت حاصل کر سکا تھا۔ وہ ضرور واپس جائے گا۔ وہ اپنی تمام زندگی اُس بے وقوف بڈھے رحیم کے ساتھ رہ کر بسر نہیں کر سکتا جو یہ سمجھتا ہے کہ منارہ میں روشنی کرنے اور ہر وقت سمندر کو دیکھنے ہی میں راحت ہے۔ زندگی! کیا اسی کا نام زندگی ہے جب وہ منارہ کو لوٹا تو دوسری تعطیل تک ایک ایک دن گنتا رہا۔ درحقیقت اس مرتبہ رحیم کی رخصت کی باری تھی لیکن اُس نے اس کا کچھ خیال نہ کیا کیونکہ رحیم کو منارہ سے محبت تھی۔ اُس کی تمام چیزیں وہیں تھیں جو مختلف الماریوں میں رکھی تھیں یا کھونٹیوں پر لٹک رہی تھیں تاکہ جس وقت وہ نوکری سے علیحدہ ہو تو ایک چھوٹی سی جھونپڑی آراستہ کرنے کے لئے کافی سامان مہیا ہو سکے۔ اُس کا خیال تھا کہ رحیم کو تعطیل کی باری بدل لینے میں ذرا بھی پس و پیش نہ ہوگا اور جس وقت وہ خشکی پر پہنچ جائے گا۔ تو حسینہ سے شادی کر کے شہر میں کوئی کام تلاش کر لے گا۔

اب تک اُس کو یہ دقت تھی کہ اُس کی کوئی ... ایسی زندگی نہ تھی جو اُس کی

حوصلہ افزائی کرتی لیکن اب حسینہ . . . اُس کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ اب اُس کی زندگی آرام سے کٹے گی حسینہ کو اپنی شریکِ حیات بنا کر وہ بہت سکھی ہوگا اگر وہ کوشش کرے گا تو شہر میں ضرور کوئی مستقل کام مل جائے گا۔ وہ ایک اچھے مکان میں رہے گا سامنے ایک چھوٹا سا باغیچہ بھی لگائے گا اور آئندہ شاید بچے بھی . . .

لیکن رحیم نے اُس کی درخواست یہ کہہ کر ٹھکرا دی "مجھ کو بھی کام ہیں۔ تم پچھلی مرتبہ رخصت پر جا چکے ہو"

اُس کے بعد اختر نے اپنی ترکیب سوچ کر اُس کو عملی جامہ پہنانے کا پختہ ارادہ کر لیا۔ جو کچھ وہ کرنے والا تھا اُس کے متعلق اُس کو ذرا بھی وحشت نہ ہوئی۔ رحیم آخر ایک بڈھا آدمی ہی تو تھا وہ اپنی زندگی کی بہاریں ختم کر چکا تھا خشکی پر کوئی مستِ شباب اُس کی منتظر نہ تھی۔ اُس سے قبل بہت سے آدمی منارہ پر سے گر کر سمندر میں موت کے مُنہ میں جا چکے تھے۔ وہ زیادہ انتظار نہ کر سکتا تھا کیونکہ دوسری رخصت کئی مہینوں کے بعد آنے والی تھی۔ اُس وقت تک خدا جانے کیا صورتِ حال درپیش ہو۔ ممکن ہے حسینہ اُس کی آس چھوڑ بیٹھے یا کوئی دوسرا شخص اُس کے راستے میں حائل ہو جائے۔ ممکن ہے حسینہ کی نوکری جاتی رہے اور وہ شہر چھوڑ کر بے پتہ ہو جائے۔

اس میں شبہ نہ تھا کہ رحیم بڈھا اور ناتواں تھا۔ اختر نے اکثر اُس کو سیڑھیوں پر ٹھوکر کھاتے ہوئے دیکھا تھا اور وہ اپنے ہاتھ کو دائیں کان کے نیچے لگا کر اختر سے پوچھا کرتا "کیا تم نے بھی کچھ سنا؟" اختر کو اُس کا وجود بیکار سا معلوم ہوتا تھا۔

جس وقت رحیم جنگلے پر جھکا ہوا تھا اختر نے اُس کے سر پر ایک ضربِ کاری لگائی۔ بڈھا آدمی بیہوش ہو کر گر پڑا۔ اُس کا مُنہ ذرا سا کھُلا رہ گیا۔ اُس کے چہرے پر حیرت چھا گئی جیسے کہ وہ متعجب سا ہو رہا تھا اور اس معمہ کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ چوٹ کیسے لگی؟

اختر خاموشی کے ساتھ اُس کو دیکھ رہا تھا۔ اُس نے ایک قسم کا اطمینان محسوس کیا اور اُس کو اُس بے حس و حرکت نعش میں حسینہ تک پہنچنے کا صاف راستہ نظر آ رہا تھا۔ اُس نے نعش کو اُٹھایا۔ اُس کو سخت حیرت ہوئی کہ رحیم کتنا ہلکا تھا گویا اُس کے جسم میں خون اور گوشت تھا ہی نہیں بلکہ ایک ایسے شخص کا پوست ہی پوست تھا جس کی زندگی کو سمندر اور برسوں کی تنہائی نے چوس کر کھوکھلا کر دیا ہو۔ اُس نے اُس بے جان جسم کو جنگلے کے اوپر سے سمندر میں پھینک دیا۔ دو آبی چڑیاں اُس کے پیچھے جھپٹیں۔ تھوڑی دیر تک جسم پانی پر تیرتا رہا اور پھر ڈوب گیا۔ اختر نے پانی کے اندر جسم کو چٹانوں کے ساتھ ٹکراتے ہوئے دیکھا اور پھر اندر چلا گیا۔

اُس نے ایک سگریٹ جلایا اور رحیم کی کرسی، صندوق اور کپڑوں کو دیکھا۔ اُس نے بلند آواز سے کہا "معمولی بات ہے بہت سے آدمی سمندر میں بہہ گئے ہیں اور آخر وہ "بوڑھا" تھا۔ اُس نے اس لفظ کو کئی بار دُہرایا گویا اُس کو اس لفظ میں اپنے جذبات کے لئے کچھ سکون و آرام معلوم ہوتا ہو لیکن اُس نے کسی خوف یا جُرم کا احساس نہ کیا۔ دوسرے دن جب کشتی آئے گی وہ اس حادثے کی اطلاع کر دے گا اور چوبیس گھنٹوں کے بعد اُس کے اعصاب پر جو گہرا اثر ہوا ہوگا اُس سے نجات اور سکون دلانے کے لئے اُس کی جگہ دوسرا آدمی آ جائے گا۔ اور اُس کو چند روز کے لئے خشکی پر بھیج دیا جائے گا۔ اُس نے سگرٹ پھینک دیا۔

اُس نے باہر ہوا کا شور، چٹانوں سے ٹکراتے ہوئے سمندر کی غضب ناک پھنکار اور طائرانِ آبی کی تیز چیخ پکار سنی۔ اُس کو یاد پڑا کہ رحیم نے کہا تھا کہ اُس رات کو سمندر میں طوفان آئے گا۔ طوفان؟ وہ مسکرایا۔ اُس کو طوفان کی کیا پروا تھی جبکہ بہت جلد وہ ہمیشہ منارہ سے چلا جائے گا اور رحیم کی طرح کوئی دوسرا بیوقوف شخص آکر روشنی کیا کرے گا، سمندر کی طوفانی آواز سُنے گا اور اپنے کو اس مینار کے ماحول کے لئے لازمی و ناگزیر تصور کرے گا۔ وہ اپنی خواب گاہ میں گیا اور رحیم کی چیزوں کو دیکھنے لگا۔

۲

اختر نیم خوابی کی حالت میں تھا جس وقت اُس نے جہاز کے بگل کی آواز سنی، وہ بستر پر نہ لیٹا تھا بلکہ کرسی پر دراز ہو گیا تھا۔ رحیم کی چیزیں اُس کے ارد گرد بکھری ہوئی پڑی تھیں۔ اُس کو بڑھتے ہوئے طوفان کا شور کچھ کچھ سنائی دے رہا تھا۔ آواز کے سنتے ہی اُس نے بے چینی کے ساتھ حرکت کی اور اُس نیم بیہوشی کی حالت میں اُس کو خیال ہوا کہ رحیم روشنی کے پاس موجود ہوگا۔ اور اُس کو اُٹھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

ان معاملات میں رحیم کو اُس سے زیادہ تجربہ تھا وہ کسی خاص حیوانی شعور کی مدد سے صحیح طور پر جان لیتا تھا کہ کس وقت بگل بجانا اور روشنی کو گردش دینا چاہیئے لیکن اختر نے خیال کیا اس میں کونسی تعجب خیز بات تھی جب کہ روشنی خود بخود گردش کرتی رہتی تھی اور اُس کی مشین کو سمجھ لینے کے بعد ایک بچہ بھی اُس کو کام میں لا سکتا تھا۔

اُس نے کروٹ بدلی۔ جہاز کے بگل نے پھر شور مچایا۔

اچانک اختر کو یاد پڑا کہ رحیم وہاں موجود نہیں۔ وہ مر چکا ہے اور سمندر میں بہہ کر اُس کا جسم اب تک دریائی جانوروں کی خوراک بن چکا ہوگا۔

وہ فوراً کرسی سے اُٹھ بیٹھا۔ نیند کی وجہ سے اُس کی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ اُس نے اپنی آنکھوں کو مَلا۔ بگل کی آواز پھر سنائی دی۔ سمندر کا شور بڑھ گیا تھا۔ موجیں چٹانوں سے ٹکرا رہی تھیں گویا وہ اُن کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے منارہ کو اپنے ساتھ بہا لے جائیں گی۔

اختر نے اپنا کوٹ پہنا اور اُوپر سے برساتی لپیٹ لی۔ اُس کو اس بات پر غصہ آ رہا تھا کہ آخر اتنا شور و غل کیوں ہو رہا ہے۔ جہازران کچھ اندھے نہ تھے وہ روشنی

کو دیکھ سکتے تھے کیونکہ کہر اتنی گہری نہ تھی کہ روشنی نہ دکھائی دے۔ یا غالباً اُن کو کوئی حادثہ پیش آیا ہے۔ یا شاید اس طوفانی سمندر میں جہاز کو گھمانے والا پہیہ ٹوٹ گیا ہو۔ جب اُس نے دیوار سے ٹکراتے ہوئے پانی کی آواز سنی تو اُس کے جسم میں خوف کی وجہ سے لرزہ پیدا ہو گیا۔ اُس کے دل میں اک بارگی اُس شخص کے لئے جس نے روشنی کے میناروں کی طرزِ ساخت سوچی تھی ایک جذبۂ تشکر پیدا ہوا کیونکہ وہ مدوّر تھے اور اُن میں کوئی پہلو نہ تھا جہاں پانی اپنا قبضہ جما سکے۔

اگر رحیم زندہ ہوتا تو ایسے طوفانی جوش و خروش میں بھی فوراً معلوم کر لیتا کہ آواز کس سمت سے آ رہی ہے اُس نے دروازہ کھول دیا اور باہر آیا۔ ایک لمحے کے لئے ہوا نے اُس کو بے قابو بنا دیا اور پیچھے کی طرف دھکیل کر دیوار سے ٹکرا دیا۔ اُس نے اپنی تمام طاقت لگا کر دروازے کو بند کرنا چاہا۔ اس کوشش سے وہ ہانپنے لگا اور دیوار کے سہارے کھڑا ہو کر اپنے کو تاریکی کا عادی بنانا چاہا۔ رات کی دہشت ناک تاریکی میں اُس کے چہرے پر پانی کے تھپیڑے لگ رہے تھے۔

اُس نے اپنی آنکھوں کو پھاڑ کر اپنے آگے کی طرف نگاہ ڈالی۔ تقریباً آدھ میل کے فاصلے پر شمال کی طرف اُس نے جہاز کی مدھم روشنی کو پانی میں ڈوبتے اور پھر اُبھرتے ہوئے دیکھا۔ اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ ایک جہاز راں نہ تھا۔ اُس کو اس کام سے سخت نفرت تھی۔ پھر بھی اُس کو معلوم ہو گیا کہ جہاز سیدھا چٹانوں کی طرف آ رہا ہے۔ اور چوتھائی میل کے بعد وہ اُن سے ٹکرا جائے گا۔ اُس کا زیریں حصہ پاش پاش ہو کر اُس میں پانی بھرنا شروع ہو گا۔ اُس نے سوچا۔ "بیوقوف! کتنے بیوقوف! روشنی ہو رہی ہے وہ اُس کو دیکھ سکتے ہیں۔ اُن کو ضرور دیکھنا چاہئے۔ پھر بھی سیدھے اسی طرف چلے آ رہے ہیں۔"

اُس نے اُوپر نظر ڈالی۔ وہاں روشنی نہ تھی! وہ روشنی کرنا بھول گیا تھا! اپنی عجلت اور گھبراہٹ میں اُس کو روشنی کا بالکل خیال ہی نہ آیا جس کو رحیم ہمیشہ دیکھ لیا کرتا تھا۔ جہاز سیدھا اُس کی طرف آ رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں وہ چٹانوں سے ٹکرا جائے گا۔ آدمی لقمۂ اجل بن جائیں گے۔ آدمی جن کی بیویاں ہوں گی۔ نوجوان، جو حسینہ کی طرح دلربائیں رکھتے ہوں گے۔ آہ حسینہ! اُس کا بھائی بھی جہاز میں نوکر ہے۔ غالباً وہ بھی اُسی جہاز میں ہو۔ اختر پیچھے پھرا۔ اور دیوار سے ٹکرا گیا۔

اُس نے زور لگا کر دروازہ کھولا اور اُس کھونٹی کی طرف دوڑا جہاں روشنی کے کمرے کی کنجی لٹکی رہتی تھی۔ کنجی وہاں نہ تھی؛ وہ ایک مفلوج شخص کی طرح وہاں کھڑا رہ گیا اور اُس کو حیرت ہوئی کہ آخر کنجی کیا ہوئی؛ رحیم ہمیشہ اُس کو کھونٹی سے اُتار کر اپنے پاس رکھ لیا کرتا تھا۔ جس وقت اختر نے رحیم کے سر پر ضرب کاری لگائی تھی اُس سے ذرا ہی پہلے رحیم نے کنجی اپنی جیب میں رکھ لی تھی۔ کنجی رحیم کی جیب میں تھی!

اُس نے جہاز کے بگل کی آواز نزدیک آتے ہوئے سُنی۔ چند لمحوں میں جہاز چٹانوں سے متصادم ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ آدمی مر جائیں گے اور اُن کی بیویاں خشکی پر اُن کا انتظار کر رہی ہوں گی۔ حسینہ کا بھائی . . . اور کنجی — رحیم کے پاس تھی جس کا جسم چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو چکا تھا۔

پانی دروازے سے اندر آ رہا تھا۔ چھت سے لٹکی ہوئی لالٹین اِدھر اُدھر جھول رہی تھی۔ اختر نے لالٹین کو دیکھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اُس وقت کیا کرے۔ وہ مجبور تھا۔ وہ صرف رحیم کا قاتل ہی نہیں بلکہ دوسرے لوگوں کی بھی جان لے گا جن کے ساتھ اُن کو کوئی مخاصمت نہ تھی۔ جنہوں نے اُس کا کچھ بگاڑا نہ تھا اور جن کی بیویاں تھیں اور وہ بھی ایک شریکِ حیات بنانے کی اُمید میں تھا۔

اُس نے لالٹین پکڑی اور باہر کی طرف دوڑا۔ ہوا نے اُس کو پھینک دینا چاہا لیکن اُس نے دیوار کو پکڑ لیا۔ وہ ہانپنے لگا اور آگے نہ بڑھ سکا۔ تب وہ آگے کی طرف جھپٹا۔ جنگلے کو ایک ہاتھ سے مضبوطی کے ساتھ پکڑ کر دوسرے ہاتھ سے لالٹین کو اپنے سر کے اوپر ہلانے لگا جو اُس کے اردگرد طوفانی جوش و خروش میں ایک کرن کی طرح روشنی پھینک رہی تھی۔ اُس نے جہاز کو قریب تر آتے دیکھا۔ جنگلے کو چھوڑ کر وہ دیوانہ وار لالٹین ہلانے لگا اور طوفان خیز ہوا کی سنسناہٹ میں اُس نے چلّانا شروع کیا۔ اُس نے جہاز کے بگل کی آواز سُنی اور اُس کی روشنی کو دیکھا۔ اُس وقت اُس کو کسی چیز کی پروا نہ تھی۔ اُس کو صرف دو کام کرنے تھے ـــــ اُس لالٹین کو پکڑ کر اُس کی مختصر اور جھلملاتی ہوئی روشنی کو تاریکی میں اہلِ جہاز کو دکھلانے کی کوشش کرنا اور اُس غضب ناک طوفان میں چلّاتے رہنا تاکہ اُس کی کمزور آواز سنائی دے سکے اُسے اُن آدمیوں کو حسینہ کے بھائی ایسے آدمیوں کو موت کے مُنہ سے بچانا تھا جن کے لئے عورتیں ـــــ حسینہ کی طرح عورتیں منتظر ہوں گی۔

موجوں کے تھپیڑوں نے اُس کو دیوانہ بنا دیا۔ وہ زور زور سے ہانپنے لگا لالٹین اُس کے ہاتھ سے چھوٹی جا رہی تھی لیکن اُس نے زور سے اُس کو پکڑا اور پھر ہلانا شروع کیا۔ وہ چیخنے لگا۔ اُس کا مُنہ سمندر کے نمکین پانی سے بھر گیا۔ اُس کا سر چکرایا۔ اُس کے چاروں طرف ہوا اور پانی کے شور نے اُس کو بہرا بنا دیا۔ جہاز تیزی کے ساتھ گھوما۔ اختر نے ایک لمحہ کے لئے اُس کی روشنیوں کو جھلملاتے ہوئے دیکھا۔ پھر وہ غائب ہو گئیں۔ بیشمار دوسری روشنیاں نظر آئیں بگل کی آواز سنائی دی۔ لیکن اب اُس کو ذرا بھی خوف نہ تھا۔ جہاز چٹانوں سے دور

رہ کر دوسری طرف مڑ گیا تھا۔ اس مشقت سے اُس کا جسم مردہ ہو چکا تھا اُس نے لالٹین پھینک دی۔ ایک لمحہ کے لئے اُس نے لالٹین کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی کو دیکھا پھر وہ بجھ گئی۔ جُوں ہی اختر لالٹین اُٹھانے کے لئے جُھکا طوفانی ہوا نے اُس کے خستہ جسم کو اُٹھا کر جنگلے سے ٹکرا دیا اور پھر اُس کے اُوپر پھینک دیا۔ اُس نے ایک ہیجم ماری اور نیچے گر پڑا!

محمود یار خاں اثر

احتیاط

کب تھے فردوسِ سماعت نغمہ ہائے آبشار
کب تھا میرے واسطے دلچسپ موجوں کا ستار
کب تھے فوّارے چمن کے لطف بار و کیف بار
کب تھے غنچے مائلِ صد خندۂ بے اختیار
کب تھا خوابیدہ سرورِ جاوداں میں سبزہ زار
کب نویدِ زندگی تھا جوشِ عنوانِ بہار
کب تھا ناواقف تمنّائے الم انجام سے
کب بسر ہوتی تھیں راتیں چین سے آرام سے
کب ہوا کرتی تھی اُلجھن کثرتِ آلام سے
کب ٹھہر جاتی تھی طبعِ منتشر اک جام سے
کب برستی تھی فضا سے بے خودی گلزار پر
کب مئے گلرنگ سے لبریز تھا جامِ نظر
کب چھٹکتی چاندنی رعنائیوں میں ڈوب کر
کب مچلتی روح، بوئے عطرِ گل پر رات بھر
شام کے غمّاز سنّاٹے تھے کب فرحت اثر
صبح کے ٹھنڈے دھندلکے کب تھے تسکینِ نظر
کہہ تو دوں لیکن یہ ڈرتا ہوں کسی کا راز ہے
اور وہ، جس سے قرارِ خاطرِ ناساز ہے

سحر رام پوری

اعرابیوں کا جنگی گیت

یورش میں سبک سیر ہیں ہم پیکِ قضا سے
آزاد ہیں پابندیٔ ہنگامِ وغا سے
کرتے ہیں فنا قصرِ شہی جنبشِ پا سے
اے غرب کے شاہانِ عجم آثار خبردار

ہم اطلس و سنجاب کے بستر نہیں کرتے
مرتے ہیں تو سو پردوں میں چھپ کر نہیں مرتے
بے نوحۂ احباب جہاں سے ہیں گزرتے
سنتے نہیں اولاد کی ہم آہِ شرر بار

سوتے ہیں تو خیمے کی طنابوں کے سہارے
چڑھتے ہیں بیک بانگِ دواعی کے اشارے
شمعیں ہیں ہماری مہ و انجم کے شرارے
اور بادِ مخالف سے نہیں ہم کو سروکار

ہم ہند سے لے تا بہ سرِ سرحدِ بلغار
ہر کشورِ خودسر سے ہوئے مائلِ یلغار
اب روم پہ لائے ہیں چمکتی ہوئی تلوار
اور اخترِ اقبال کہ ہے چرخِ بریں پر

تھے سندھ سے چڑھ کر گئے ہسپانیہ پر ہم
اور جائیں گے واللہ وہاں بار دگر ہم
وہ بحرِ نحوست[1] کہ سدا رہتا ہے برہم
ساحل سے تھے کبھی اس کے بھی جولانگہِ خاور!

ویراں کدہ تھا ہم نے تجلوکہ[2] کو بنایا
وہ شہر کہ تھا جس نے عساکر کو ڈرایا
چھایا تھا وہاں چار طرف موت کا سایا
بجز خنجرِ خونخوار نہ تھا واں کوئی رہبر!

نیزوں کو تھا صحرا میں جنوں چارہ گری کا
زہرہ تھا وہاں آب جوانانِ جری کا
لاکھوں کا ہوا دور مرض ناموری کا
پی کر مے تلخاب ہوئے غرقِ جہنم!

ناداں کے حق میں سپر از بسکہ زیاں تھی
جو چشمۂ صحرا کی طرح نور فشاں تھی
جاں کوہ ستنبول[3] وہ ہر دل پہ گراں تھی
برپا صفِ اعدا میں تھا جب حشر کا عالم!

جب جنگ کے قلزم میں تلاطم ہوا برپا
بزدل بھی جواں مرد بھی غرقاب تھے یکجا
مردوں کو کیا ہم نے سپردِ دربسر صحرا
اور گا کے بڑھے حمدِ خداوندِ معظم!

(ماخوذ از جے اے فلیکر)

فضل شاہ اویسی

[1] بحرِ اوقیانوس [2] میدانِ زیس جلوریک کے مقام پر عرب نے ہسپانیوں کو شکستِ فاش دی تھی [3] استنبول۔

ایک نظم اور ایک غزل

وقتِ رفتہ

تم بھول گئے لیکن
ہے یاد مجھے اب تک
وہ چاندنی راتوں میں جمنا کے کنارے پر
چھائی ہوئی مدہوشی
بہتی ہوئی موجوں کی دلچسپ سی خاموشی
عالم کی نگاہیں تھیں فطرت کے اشارے پر
میں بھول نہیں سکتا
ہے یاد مجھے اب تک
تم بھول گئے لیکن۔

کیا یاد نہیں تم کو
چھیڑا تھا کبھی تم نے
سازِ دلِ ناداں کو مضرابِ محبت سے
ہر سمت سے گھر آئے بادل کے حسیں ٹکڑے
گلزارِ جوانی پر نغموں کی ہوئی بارش
جذبات کے پھولوں میں
فردوس نظر آیا

تم مجھ سے جدا ہو کر مجھ کو ہی بھلا بیٹھے
یا تم ہی نہیں ہو وہ
یا میں ہی نہیں ہوں وہ
جو وقت گذر جائے کب لوٹ کر آتا ہے
گذرے ہوئے لمحوں کا کیوں ذکر کیا جائے
یہ ذکر ہے لاحاصل
حاصل ہے محبت کا ناکامی و بربادی
کر لینا محبت تو آساں ہے بہت لیکن
دراصل محبت کا دشوار نبھانا ہے۔

ضیا فتح آبادی

غزل

بات کرتے ہی یہ کہہ اُٹھتے ہو منشا کیا ہے؟
بات کرنے کا تمہارے یہ طریقہ کیا ہے؟

ضد پر آجاؤں تو جی بھر کے ستا کر چھوڑوں
تو نے اسے چھیڑنے والے مجھے سمجھا کیا ہے؟

اس نے تو عرضِ تمنا کی اجازت دے دی
میں ہوں اس سوچ میں یارب کہ تمنا کیا ہے؟

درد تو بخش دیا خیر کوئی بات نہیں
اب ذرا یہ تو کہو اس کا مداوا کیا ہے!

تم سے کرتا ہے شکایت جو کوئی کرنے دو
اس میں سچ پوچھو تو نقصان تمہارا کیا ہے؟

ایک اظہارِ محبت پہ یہ غصہ؟ توبہ!
جانے بھی دیجئے ان باتوں میں رکھا کیا ہے

میں کبھی یہ نہ کہوں گا کہ کرم کیجئے آپ
آپ خود سوچئے الفت کا تقاضا کیا ہے

رنج اٹھاتے ہیں ستم سہتے ہیں چپ رہتے ہیں
جانتے ہیں کہ شکایات سے ہوتا کیا ہے

رنج دن رات کا دیکھا نہیں جاتا اختر
نہیں معلوم کہ اس عشق میں ہونا کیا ہے

اختر بریلوی

دنیائے ادب

تازہ ترین رسائل کے اہم مضامین

کا تذکرہ اور جائزہ

اردو - بابت سہ ماہی اپریل تا جون۔

گریہ و تبسم - شام کے جواں فکر شاعر خلیل بن جبران کے کلام سے ناظرین ادبی دنیا ایک حد تک آشنا ہیں۔ کچھ عرصہ گذرا ملک عطاءاللہ صاحب کلیم نے ان اوراق میں جبران کے چند جواہر پارے پیش کئے تھے۔ اور ان کی حیرت ناک تازگی اور فکر انگیزی نے اکثر اہل ذوق کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔ خلیل جبران کی بعض مختصر تحریریں کتابی صورت میں بھی اردو کا لباس پہن چکی ہیں۔ مثلاً المجنون جس کا ترجمہ پاگل کے عنوان سے بشیر مہندی صاحب نے کیا، النبی جسے قاضی عبدالغفار صاحب نے "اس نے کہا" کے نام سے اور الارواح المتمردہ۔ جسے ابوالعلا صاحب چشتی نے "سرکش روحیں" کے نام سے اردو میں منتقل کیا۔ زیر نظر مضمون میں جناب محمد رضا انصاری نے جبران کی کتاب "دمعتہ وابتسامہ" پر ایک نظر ڈالی ہے اور اس کے جستہ جستہ مقامات سے اچھے اچھے اقتباسات پیش کئے ہیں۔ مضمون کے شروع میں جبران کے مختصر سوانح حیات ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے اپنی نوجوانی کا بیشتر حصہ شام سے ترک وطن کرکے امریکہ میں بسر کیا اور مغربی خصوصاً انگریزی ادب کا غائر نگاہ سے مطالعہ کیا۔ عربی اس نے بعد میں وطن واپس آکر سیکھی۔ اور پھر قدرتی طور پر اسی زبان کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ جبران نے عربی میں ایک نئے اسلوب بیان کی بنیاد رکھی اور قدیم طرز کے تکلف و تصنع کو ترک کرکے براہ راست انسانی فکر و احساس سے رشتہ پیدا کیا زیر نظر تصنیف اس کے اوائل عمر کا کارنامہ ہے جب اس کے دل و دماغ پر رومانیت کا غلبہ تھا اور فکر و تخیل پختہ نہیں ہوئے تھے۔ لیکن نزاکت احساس اور زور بیان کے لحاظ سے یہ تصنیف بھی ایک شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔ گریہ و تبسم نفس مضمون کے اعتبار سے اگرچہ ایک رومانی فرار تھا۔ لیکن اس کے اسلوب بیان کی جدت اور تازگی ادب میں ایک نئے دور کا پیش خیمہ ثابت ہوئی اور پہلی بار لوگوں کے سامنے ایک صحیح معیار آیا جس سے ادیب و شاعر پرکھا جا سکتا تھا۔"

جبران پر یہ رومانی رنگ ۳۰ برس کی عمر تک چڑھا رہا لیکن "سنہ ۱۹ء میں جب وہ اپنی سیاحت ختم کرکے نیویارک میں آکر رہ پڑا تو اس وقت وہ ایک جذباتی نوجوان نہیں تھا، وہ خیالی دنیا میں چکر لگاتا تھا...... اب وہ ایک انقلابی ادیب اور آتش نگار انقلابی تھا۔ بعد کے تمام مضامین میں یہ حقیقت نمایاں ہے۔

سب سے زیادہ مسرت کی بات یہ ہے کہ خود جبران کو اپنے خیالات کی تبدیلی کا پورا احساس رہا اور ایک بنیادی ادب پر جس وقت اس نے آکر دم لیا تو تمام اپنے ابتدائی کارناموں کو بے کار اور مہمل سمجھتا ـــــ ایسا بہت کم ہوتا ہے۔

"اس کے ایک دوست نے گریہ و تبسم کی اشاعت کے لئے اصرار کیا تو اس نے یہ شعر پڑھا۔

ذاک عہد من حیاتی قد مضیٰ   بین تشبیب و شکوی و نواح

یہ میری زندگی کا وہ حصہ ہے جو عشق و عاشقی، شکوہ و شکایت آہ و فغاں میں گذر گیا۔"

اب اس زمانے کی یاد بے کار ہے۔

اس کے دوست نے جواب دیا "آپ کے لئے تو وہ عہد گذر گیا لیکن دوستوں اور عقیدت مندوں کے لئے اب تک ہے۔ اور ہمیشہ رہے گا۔"

جبران گریہ و تبسم لکھنے والا نوجوان، خیالات کی وادیوں میں بھٹک بھٹک کر مر گیا۔ اب اس کی قبر کھودنے سے حاصل!

دوست، نوجوان نے مرنے سے پہلے اپنے نغمے سنائے تھے۔

وہ جیسے بھی ہوں ہمارا فرض ہے کہ ان نغموں کو ضائع ہونے سے بچائیں!
جبران، - تمہارا جو جی چاہے کرو مگر ساتھ ہی یہ نہ بھولنا کہ اس نوجوان کی
روح اب ایک ایسے آدمی کے جسم میں منتقل ہو گئی ہے جو جذبات
اور خیالات کا نہیں، طاقت کا پجاری ہے!! جو تخریب کا اسی طرح
دلدادہ ہے جس طرح تعمیر کا!"

جبران کے اس حقیقت پرستانہ دور کی چند تصانیف کے نام حسب ذیل ہیں: -

(۱) المواکب (۲) الموسیقی (۳) عرائس المروج (۴) الاخبحۃ المتکسرہ
(۵) الارواح المتمردہ - (۶) العواصف (۷) البدائع والطرائف۔

ان کے علاوہ کچھ تصانیف انگریزی میں بھی ہیں۔ جن میں اکثر عربی اور دیگر زبانوں میں منتقل ہو چکی ہیں۔ ان میں سے جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے
THE MADMAN & HIS PARABLES اور
THE PROPHET اردو کا جامہ بھی پہن چکی ہیں۔

اب مجموعہ زیر نظر کے چند لطیف اقتباسات ملاحظہ فرمائیے: -

گریہ و تبسم۔ رات آتی ہے تو شگوفہ اپنی پنکھڑیوں سے لپٹ کر جذباتِ شوق کو گلے لگائے سو جاتا ہے اور جیسے ہی صبح ہوتی ہے اپنے دونوں ہونٹ آفتاب کی کرنوں کو بوسہ دینے کے لئے کھول دیتا ہے۔

شگوفوں کی زندگی شوق و وصال ——— گریہ و تبسم ——— ہے

سمندر کا پانی بخار بن کر اٹھتا ہے اور چڑھتا چلا جاتا ہے، پھر ایک جگہ جمع ہو کر بادل بن جاتا ہے اور ٹیلوں اور وادیوں کے سروں پر سے گذرتا رہتا ہے اور نالیوں کے ذریعے اپنے وطن ——— سمندر ——— کو واپس چلا جاتا ہے۔

بادلوں کی زندگی ہجر و وصل ——— گریہ و تبسم ——— ہے۔

اسی طرح نفسِ انسانی "روحِ کل" سے جدا ہو کر مادی دنیا میں آتا ہے اور بادلوں کے مانند غموں کے پہاڑوں اور خوشی کی وادیوں پر گذرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ موت کی لطیف ہوائیں اس سے ملتی ہیں تو وہ لوٹ جاتا ہے! جہاں پہلے تھا!! محبت و جمال کے بحرِ بیکراں ——— پروردگارِ عالم ——— کی طرف

محبت کی زندگی: -

بہار: -

آ! اے میری محبوبہ آ، ہم دونوں مل کر ٹیلوں کے درمیان سیر کریں اب برف پگھل چکی ہے اور زندگی اپنی خوابگاہوں سے بیدار ہو کر وادیوں اور گھاٹیوں میں خراماں خراماں ٹہل رہی ہے -
...... آ، ہم دونوں بارش کے باقی ماندہ آنسوؤں کو نرگس کے پیالوں میں پئیں۔ اپنے دلوں کو خوش و خرم چڑیوں کے گیتوں سے مسرور کریں اور نسیمِ سحری کی عطرفشانی کو غنیمت جانیں۔
ہم دونوں کو، اس چٹان کے قریب ——— اس طرح کہ بنفشہ نہ دیکھ پائے ——— بیٹھ کر محبت کے بوسوں کا تبادلہ کرنا چاہئے۔

گرمی۔ آ، اے میری محبوبہ! میرے ساتھ کھیتوں تک چل۔
فصل کٹنے کا زمانہ آگیا ہے کھیتی اپنے شباب پر پہنچ گئی ہے اور فطرت کے ساتھ سورج کی محبت کی تپش نے انہیں پختہ کر دیا ہے
...... آ، ہم دونوں درختوں سے پھلوں کو چنیں اسی طرح جیسے ہمارے دلوں کی گہرائیوں میں محبت کے بوئے ہوئے دانے کے بیجوں سے "نفس" "سعادت کے دانے" چنتا ہے ......

خزاں۔ اے میری محبوبہ! ہم دونوں کو انگور کی بیل تک جا کر انگور نچوڑنا چاہئیں ——— اصل ——— حقیقت ——— کی بجائے نقل ——— مجاز ——— ہی پر اکتفا کرنا چاہئے آ، اب گھر لوٹ چلیں اب تو درخت کے پتے تک زرد ہو گئے ہیں اور ہوا نے انہیں منتشر کرنا شروع کر دیا ہے۔ گویا وہ ان پھولوں کو پتوں کی پھیلی ہوئی چادر سے کفنانا چاہتی ہے جو گرمی کے رخصت ہو جانے پر سوزِ فراق سے جھلس کر مُردہ ہو گئے ہیں ....

جاڑا۔ قریب ہو اے شریکِ حیات! برف کی ایسی ٹھنڈی سانسوں کو اس کا موقع نہ دے کہ وہ ہمارے جسموں کو جدا کر دیں اس انگیٹھی کے سامنے میرے پہلو میں آکر بیٹھ جا۔ آگ ہی جاڑے کا سب سے مزے دار میوہ ہے .... میرے کان ہوا کی آہوں اور عناصر کے نالوں سے تھک گئے ہیں۔ کھڑکیوں اور دروازوں کو بند کر دے، فضا کا غضب ناک چہرہ مجھے مغموم کرتا ہے، شہر ——— ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے نوحہ کرنے والیاں برف کے شامیانہ کے نیچے بیٹھی ہوتی ہیں .....

چراغ میں تیل ڈال دے، اے رفیقِ زندگی! وہ بجھنے والا ہے، اس کو اپنے قریب ہی کہیں رکھ دے تاکہ میں، وہ نقوش دیکھ سکوں

جو روزگار نے تیرے چہرے پر بنا دیے ہیں.....

صراحی لے آ، ہم دونوں شراب پئیں اور شراب نچوڑنے کا زمانہ یاد کریں، اور قریب ہو اور قریب ہو، اے محبوبہ! لو آگ بجھ گئی اور راکھ اسے دبائے دے رہی ہے۔ مجھے چھپا لے، لو، چراغ بھی گل ہو گیا، اور اندھیرا چھا گیا ہے۔ دیکھو ہماری آنکھوں کو نیند کے خمار نے بوجھل کر دیا ہے، میری طرف دیکھ! اس آنکھ سے جسے نیند نے سرمگیں بنا دیا ہے۔ گلے لگ جا، قبل اس کے کہ نیند آ کر گلے لگا لے۔ ایک پیار کر، برف ہر چیز پر ــــ سوائے تیرے پیار کے ــــ چھا گئی ہے۔

آہ اے محبوبہ!! نیند کا سمندر کتنا گہرا ہے!!!

آہ! اس دنیا میں!! صبح کتنی دور ہے!!!

آخری پارہ اپنی شدتِ تاثر اور کیفیت نگاری کے اعتبار سے ایک شاہکار کا درجہ رکھتا ہے۔ مشرق میں اس کا جواب شاید ٹیگور کے ہاں ملے تو ملے ورنہ ایسی صحیح عکاسی اور حسن کاری نایاب ہے۔ جبران کے اس مجموعے کی غالباً سب سے نمایاں خصوصیت اس کے وہ دل آویز نوشتے ہیں جو اس نے سماج کی بے انصافیوں سے متاثر ہو کر حوالۂ قلم کئے ہیں۔ ان میں سے "دو بچے" اور "بے کس دوست" خاص طور پر توجہ کے لائق ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

دو بچے۔

تصویر کے دو رُخ:۔

اپنے عالی شان محل کی برجی پر کھڑے ہو کر اس نے عظیم الشان مجمع کی طرف جو اس کے پائیں باغ میں کھڑا ہوا تھا۔ خطاب کرتے ہوئے کہا میں تم لوگوں کو اور تمام اہالیان ملک کو مبارک دیتا ہوں اور خوش خبری سناتا ہوں کہ میری ملکہ نے بچہ جنا ہے جو میرے محترم خاندان کی عزت کو زندہ کرے گا، تم لوگوں کے لئے قابلِ فخر اور پشت پناہ ہو گا۔ اور ان تمام چیزوں کا وارث ہو گا جو میرے نامور اجداد بطور میراث چھوڑ گئے ہیں۔ خوش ہو اور شکر ادا کرو۔ تمہارا مستقبل ایک نجیب الطرفین بچے سے وابستہ ہو گیا ہے۔

مجمع نے پر زور نعرے لگائے۔ فضا خوشی اور مسرت کے نغموں سے گونج اٹھی۔ اس خیال سے کہ بچہ ناز و نعمت کی گود میں پرورش پائے گا اور اعزاز و احترام کے منصب پر جوان ہو گا۔ اس کے بعد مخلوقِ خدا پر حاکم مطلق ہو جائے گا، ان کے جسموں کا حقدار اور جانوں کا مالک ہو گا۔ اس لئے لوگ خوشیاں منا رہے ہیں۔ مسرت کے گیت گا رہے ہیں اور خوشی کے جام پر جام لنڈھا رہے ہیں۔

عین اس وقت ــــ جب کہ اہالیان شہر سطوت و جبروت کے گن گا کر اپنی پستی کا اعلان کر رہے تھے اور ملائکہ ان کی حقارت پر آنسو بہا رہے تھے۔ ایک معمولی بوسیدہ مکان میں ایک عورت بسترِ مرگ پر پڑی ہوئی اپنے سلگتے ہوئے سینے سے اپنے نوزائیدہ بچے کو جو چند سڑی گلی دھجیوں میں لپٹا ہوا تھا چمٹائے ہوئے تھی۔

یہ ایک لڑکی ہے جو مفلسی اور بدبختی کا شکار ہے۔

یہ ایک مظلوم کی بیوی ہے جس کو ظالم کے ظلم نے تباہ کر ڈالا ہے یہ عورت اکیلی ہے۔ اس کے پاس آج کی رات دنیا کے پالنے والے نے ایک چھوٹا سا رفیق بھیج دیا ہے جس نے محنت اور مزدوری کی طرف سے اس کے ہاتھ باندھ دیئے ہیں۔

جب سڑکوں پر شور و غل ختم ہو چکا تھا، غریب لڑکی نے اپنے بچے کو گود میں اٹھا لیا اور اس کی چمکتی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر رونے لگی گویا وہ اپنے گرم آنسوؤں سے بپتسمہ دینا چاہتی ہے۔ ایک دل خراش آواز میں اس نے کہا۔ لختِ جگر، تو عالمِ ارواح کو چھوڑ کر کس لئے یہاں آیا ہے؟ کیا میری تلخ زندگی میں حصہ بٹانے کے لئے؟ یا میری بیکسی پر رحم کھانے کے لئے؟ ملائکہ اور وسیع فضا کو چھوڑ کر اس تنگ اور ذلت و بدبختی سے بھری ہوئی زندگی کو تو نے کیوں اختیار کیا؟

اے میرے اکلوتے بچے، میرے پاس گرم آنسوؤں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کیا دودھ کے بدلے اس کو غذا بنائے گا! کیا میری ننگی باہیں دیبا اور رادن کی بجائے تیرا لباس ہوں گی!

آہ چوپایوں کے بچے گھاس چرتے ہیں اور اپنی بھاڑیوں میں چین سے رات بسر کرتے ہیں، پرندوں کے بچے دانا چگتے ہیں۔ اور شاخوں کے درمیان بہت آرام سے سوتے ہیں مگر ــــ اے میرے بچے تیرے لئے ٹھنڈی آہوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

اس نے بچے کو اپنے سینے سے بہت بھینچ کر چمٹا لیا گویا وہ دونوں جسموں کو ایک کرنا چاہتی ہے۔ پھر آنکھیں اوپر اٹھائیں اور زور سے چلائی۔ رحم۔ اے پروردگار عالم رحم۔

جب چاند سے بادل چھٹ گئے، ایک لطیف شعاع جھرو کے

سے اندر داخل ہوئی اور وہ بے حس و حرکت جسموں پر پھیل گئی۔

بے کس دوست

اے وہ شخص جو بدنصیبی کے گہوارے میں پیدا ہوا ذلت کی گود میں پلا اور پرورش ہوا اور ظلم و استبداد کے محل کے سائے میں جوان ہوا۔ اپنی سوکھی روٹی ٹھنڈی سانسوں کے ساتھ کھاتا ہے اور میلا پانی جس میں آنسوؤں کے قطرے شامل ہیں۔ گھٹ گھٹ کر پیتا ہے۔

اے وہ سپاہی جس کے اوپر انسان کے قانون کی رو سے یہ فرض ہے کہ اپنی بیوی، بچوں اور دوست احباب کو چھوڑ کر موت کے میدان کی طرف جائے لالچیوں کے ظلم کی آگ بجھانے کے لئے، جس کا نام انہوں نے واجب، اور فرض رکھ چھوڑا ہے۔

اے دوست جو اپنے وطن میں مسافروں کی طرح اور دوستوں میں غیروں کی طرح زندگی بسر کرتا ہے اور قلم دوات کے علاوہ دنیا کی نعمتوں سے صرف بقدر ایک نوالہ زندہ رہنے کے لئے راضی ہے۔

اے وہ قیدی جو تاریکی میں ڈال دیا گیا ہے ہمعمولی غلطی پر جس کو ان لوگوں کی جہالت نے جو بدی کا مقابلہ بدی سے کرتے ہیں بہت برا سمجھ لیا ہے اور اُن کی عقلوں نے جو اصلاح چاہتے ہیں۔ فساد کے ذریعے سے حیرت انگیز خیال کر لیا ہے۔

اے خوبصورت غریب لڑکی جس کے حسن و جمال کو مہذب اور تعلیم یافتہ نوجوان نے دیکھا اور پیچھے لگ گیا تیرے افلاس پر اپنی ریاست سے غلبہ پا لیا اور تو نے اپنے کو اس کے حوالے کر دیا، اس کے بعد اس نے تجھ کو مجروح شکار کی طرح چھوڑ دیا اور اب تو ذلت اور بدبختی کے جنگل میں کانپ رہی ہے۔

تم لوگ اے بے کس دوستو۔ انسانی شریعت کے شکار ہوئے ہو تم لوگ بدنصیب ہو اور تمہاری بدنصیبی زبردست کی بغاوت، حاکم کی ناانصافی، سرمایہ دار کے ظلم اور بندۂ ہوس کی سرکشی و انانیت کا نتیجہ ہے۔

تم لوگ شگوفوں کے مانند ہو جو سرما میں اُگ آئے ہیں عنقریب لطیف ہوائیں چلیں گی اور تمہارے بچوں کو آفتاب کی روشنی میں لے جائیں گی تم وہاں خوبصورت زندگی پاؤ گے۔

تم لوگ ان بے برگ و ثمر درختوں کی طرح ہو جو جاڑے کی برف سے بوجھل ہو گئے ہیں۔ بہار کا زمانہ آنے والا ہے جو تم کو تروتازہ پتوں کا لباس پہنائے گا۔ بہت جلد حقیقت آنسوؤں کے نقاب کو تمہارے تبسم سے الٹ دے گی۔

میں تمہیں پیار کرتا ہوں۔ اے دوستو اور تمہارے ظلم کرنے والوں پر لعنت)

صلاح الدین احمد

حصۂ نظم

رس بھرے ہونٹ

از ڈاکٹر تاثیر پی ایچ ڈی۔ نیرنگ خیال جون ۱۹۴۱ء

۱ رس بھرے ہونٹ، پھول سے ہلکے
۲ جیسے بلّور کی صراحی میں
۳ بادۂ آتشیں نفس چھلکے
۴ جیسے نرگس کی گول آنکھوں سے
۵ ایک شبنم کا ارغواں قطرہ
۶ شفقِ صبح سے درخشندہ
۷ دھیرے دھیرے سنبھل سنبھل ڈھلکے

۸ رس بھرے ہونٹ یوں لرزتے ہیں
۹ یوں لرزتے ہیں جس طرح کوئی
۱۰ رات دن کا تھکا ہوا راہی
۱۱ پاؤں چھلنی، نگاہ متزلزل،
۱۲ وقت صحرائے بے کراں، کہ جہاں
۱۳ سنگِ منزل نما، نہ آج نہ کل

۱۴ دفعتاً دُور، دُور، آنکھ سے دور
۱۵ شفقِ شام کی سیاہی میں
۱۶ قلب کی آرزو نگاہی میں
۱۷ فرش سے عرش تک لپک اُٹھے
ایک دھوکا، سراب، منبعِ نور

۱۹ رس بھرے ہونٹ دیکھ کر تاثیر
۲۰ رات دن کے تھکے ہوئے راہی
۲۱ یوں لرزتے ہیں، یوں ترستے ہیں

اردو شاعری میں جب کبھی کسی شاعر نے عورت کے اعضا کی خوبیاں کو جتایا ہے تو عموماً سراپا بیان کیا ہے اور اگر کسی ایک حصۂ جسم کی تعریف کی ہے تو کسی نفسی کیفیت کو بیان کرنے کی کوشش نہیں کی، اُس تعریف میں ناظر کے احساساتی ردِ عمل کو کم ہی دخل رہا ہے۔ میرتقی نے لکھا ہے، "میر ان نیم باز آنکھوں میں، ساری مستی شراب کی سی ہے" لیکن یہ نہیں لکھا کہ اُس مستی کا میر تقی کے ذہن پر کیا اثر ہوا، دوسرے لفظوں میں یوں کہیئے کہ شاعر کا ذہن نیم باز آنکھوں سے ماورا نہیں جاسکا اور یوں شعر محض بیانیہ ہو کر رہ گیا۔ اسی طرح کیفیت اس کے لب کی کیا کہیئے، پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے"۔ یہاں بھی وہی عالم ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ تشبیہ اور استعارے کے تصوّرات سے جو کام مغربی خصوصاً فرانسیسی شعرائنے لیا، اس سے ہمارے شاعر واقف نہ تھے۔ دوسرے شاید ان اشعار سے بالواسطہ تاثر پیدا کرنا مقصود ہے۔

تاثیر کی مندرجہ بالا نظم کے موضوع کا تعین ذرا مشکل ہے، کیا اس کا موضوع "رس بھرے ہونٹ ہیں"؟ —— اُن ہونٹوں کی "لرزش" ہے؟ —— یا موجودہ تہذیب و تمدن کے "جنسی فاقہ کش" جنہیں "رات دن کے تھکے ہوئے راہی" کہا جاسکتا ہے؟ —— بہرحال شاعر ہونٹوں کو دیکھتا ہے۔ ان ہونٹوں کو جو "پھول سے ہلکے" ہیں، دوسری تشبیہ (جیسے بلوّر کی صراحی میں بادۂ آتشیں نفس چھلکے) رنگ کی ہے لیکن اس وقت شاعر کو ہونٹوں کی حرارت کا بھی احساس ہے (آتشیں نفس) اور ساتھ ہی اُس گداز سے لبریز نمی کا احساس بھی ہے جس کا تلازمِ خیال شاعر کو "شبنم" کے اُس ارغوان قطرے" تک لے جاتا ہے جو "شفق صبح سے درخشندہ" ہو اور "نرگس کی گول آنکھوں سے دھیرے دھیرے سنبھل سنبھل کر ڈھلک رہا ہو" —— اب تک شاعر کی نگاہوں میں صرف ایک عورت کا حسین چہرہ تھا۔ اور اس چہرے میں بھی اُس کی توجّہ کو صرف "رس بھرے ہونٹ" ہی متوجہ کئے ہوتے تھے۔ اچانک ان ہونٹوں میں ایک لرزش پیدا ہوتی ہے اور وہ سوچتا ہے، یہ لرزش کیسی! —— کیا ایسی کسی لرزش سے شاعر پیشتر آگاہ ہے! —— ہاں، یہ لرزش تو اُس رات دن کے تھکے ہوئے راہی کی لرزش سے ملتی جلتی ہے جس کے پاؤں عملی ہیں، جس کی نگاہ منزل ازل درجو وقت کے ایک ایسے صحرائے بے کراں میں چلا جا رہا ہے جہاں نہ کوئی سنگِ منزل نما ہے، نہ آج نہ کل۔ یہاں وقت اور فاصلے کے تصوّرات ایک دوسرے میں اُلجھ گئے ہیں صحرائے بیکراں کہ جہاں سنگِ منزل نما نہیں ہے، وقت نہ آج نہ کل یہاں اُس تھکے ہوئے راہی کی حیثیت بھی عالمگیر ہوگئی ہے۔

نظم کے اس مقام تک ہونٹوں کی لرزش سے جو تلازم خیال پیدا ہوا اُس کے تصوّرات کی تکمیل ہوگئی۔ لیکن اُس لرزش کو دیکھ کر یا اُن ہونٹوں کو دیکھ کر ایک خواہش بھی شاعر کے ذہن میں پیدا ہوئی تھی اور چونکہ وہ اس لرزش سے ملتی جلتی لرزش کے خیال میں کھو گیا تھا۔ اس لئے وہ خواہش ذہن ہی میں آسودہ ہوگئی تھی۔ اب ملتی جلتی لرزش کا خیال ختم ہوگیا تو وہ آسودہ آرزو جاگی لیکن اس صحرائے بے کراں اور اس کے تھکے ہوئے راہی کا اثر ذہن پر گہرا ہے اس لئے انہی اثرات کے ماتحت اس آرزو کا اظہار، ایک جھجکتا ہوا اظہار ہوتا ہے۔

یہاں پہنچ کر اگر ہم نظم کو از سرنو پڑھیں تو اچھا ہو، کیونکہ آٹھ سے تیرہ تک کے مصرعے اس دفعہ ہمارے لئے کارآمد نہیں ہیں۔ گویا ہمارا تصوّر اب یوں ہونا چاہیئے کہ شاعر کی نگاہوں میں ایک عورت کا حسین چہرہ ہے۔ اور اس چہرے میں بھی اُس کی توجّہ کو وہ "رس بھرے ہونٹ" ہی متوجہ کئے ہوئے ہیں جو پھول سے ہلکے ہیں، جن کا رنگ ارغوانی ہے اور جن میں گداز سے لبریز ایک نمی ہے، اور حرارت بھی ہے۔ ان ہونٹوں کو دیکھ کر ان سے جو کام لیا جا سکتا ہے۔ اس کا خیال آجاتا ہے۔ لیکن اس آرزو کی تکمیل ایک دھوکا ہے، ایک سراب۔ صرف وہ ہونٹ، وہ منبع نور ایک شعلے کی مانند لپک اُٹھتے ہیں یعنی ایک شعلہ سا لپک اٹھتا ہے، اور یہ لپک شاعر کو اپنے آپ سے بہت ہی دور محسوس ہوتی ہے گویا اس نے ہونٹ دیکھے تھے، ایک منبع نور دیکھا تھا، اُن میں لرزش پیدا ہوئی تھی، ایک شعلہ سا لپک اٹھا تھا، اور اب شاعر تنہا ہے اور اُسے صرف اُس لرزش کا احساس ہے جو اس منظر کو دیکھ کر اُس کے اپنے دل میں پیدا ہوئی تھی۔

نظم کے شروع میں شاعر کا ذہن صرف ہونٹوں کا شگفتہ تصور لئے ہوئے ہے اس لئے "شبنم کا ارغوان قطرہ" "شفق صبح سے درخشانی" میں بڑھ جاتا ہے یعنی شاعر ہونٹوں کی نمی کو صبح کے تازہ، شگفتہ اور ٹھنڈک پہنچانے والے منظر سے ماثل پاتا ہے، لیکن آگے چل کر جب رات دن کے تھکے ہوئے راہی کا تصور نظم پر چھا جاتا ہے تو تاثر کے لحاظ سے بھی ذہن میں ایک تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے

ہونٹ۔ صبح کا سادہ اور سکوں پرور منظر ہیں لیکن ہونٹوں کی لرزش ایک
شعلہ ہے جو شفق شام کی سیاہی میں لپک اُٹھتا ہے۔ صبح اور شام کو اُفق
کے منظر میں جو رنگ اور احساس کا فرق ہے اُس سے شاعر کے ذہن نے
یہاں خاطر خواہ کام لیا ہے۔

میرے خیال میں فنی لحاظ سے اس نظم میں ایک عیب بھی ہے اور وہ
تخلص کا استعمال ہے تخلص غزل کی پیداوار ہے اور غزل تک ہی اسے
محدود رہنا چاہئے۔ کیونکہ غزل میں اس کی کھپت بہت خوبی سے ہو جاتی ہے
نظم میں اس کے استعمال سے تسلسل میں فرق پڑتا ہے۔ خصوصاً اس نظم میں
جس کی خوبی اس کے تصورات کا بہاؤ ہے۔

رباعیات

از جوش ملیح آبادی۔ زمانہ مئی ۱۹۴۱ء

خاتم سے علیحدہ نگیں ہو، ہے ہے!
روتی ہوئی چشم سرگیں ہو، ہے ہے!
جھونکوں میں کراہنے کی ہیں آوازیں!
یہ کون ہے، کیا تم ہو؟ نہیں ہو، ہے ہے!

(۲)

اے دردِ نہاں! دو چند ہو جا، للہ!
اے موجِ الم! بلند ہو جا، للہ!
ہاں اے حرکت جوش کے دل کی حرکت!
غیرت ہو اگر تو بند ہو جا للہ!

جوش کی نفسیاتی شاعری کو اُس کی انقلابی شاعری نے عرصے
سے پس پشت ڈال رکھا تھا۔ ادبی کی رباعیاں ایک نوید کا درجہ رکھتی ہیں کہ شاید
اب ہم پھر جوش کی نفسیاتی بلندیوں کا مطالعہ کر سکیں گے۔

پہلی رباعی میں شاعر اکیلا بیٹھا ہے، وقت خواہ دن کا ہے یا رات
کا، ایک بات لازمی ہے، سکون ہے، خاموشی ہے مکمل۔ ناگہاں اُسے رہ رہ
کر کراہنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ آواز کی نزاکت سے ظاہر ہے کہ کوئی عورت
ہے جسے کسی انجانے دُکھ نے بے چین کر رکھا ہے کراہنے والے کی جنس کا
تعین شاعر نے آواز سے کیا ہے لیکن ہم شاعر کے الفاظ "چشم سرگیں" سے
کرتے ہیں۔ اس خاموشی، سکون اور تنہائی میں جب شاعر کو ایک عورت،
ایک حسین عورت۔ حُسن شاعر کا مفروضہ ہے، کے کراہنے کی آواز آتی ہے تو
اس کے احساس مردانگی کو تحریک ہوتی ہے اور اُس کے ذہن میں تاسف کی
تخلیق ہوتی ہے اُسے افسوس ہوتا ہے کہ چشم سرگیں تو رونے کے لئے نہیں
بنی، یہ ظلم کیوں ہو رہا ہے۔ یہ تو ایسی ہی بات ہے کہ انگوٹھی سے نگینے کو علیحدہ کر کے
ایک حسین چیز کو ضائع کیا جائے ـــــ اور پھر یک دم اُسے احساس ہوتا
ہے کہ یہ آواز تو مانوس معلوم ہوتی ہے اور تجسس پیدا ہوتا ہے کہ یہ کون ہے؟!
ـــــ اُسے شک ہے کہ یہ آواز اُس عورت کی ہے جس سے اُسے نسبت
رہی ہے۔ اسی لئے وہ سوال کرتا ہے "کیا تم ہو؟" ـــــ رہ رہ کر کراہنے کی آواز اب
بھی آرہی ہے اور اُس کا شک یقین سے بدل جاتا ہے "نہیں ہو" ـــــ اور
تاسف کا جو نغمہ اُس کے سازِ دل سے چھڑا تھا اس کے سُر روپے ہو جاتے ہیں

اس رباعی کی اشارتی حیثیت بہت بلند ہے۔ ہم اس کے قصے کو
کسی طرح فرض کر سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ کراہنے کی کوئی آواز نہ آرہی ہو۔ صرف
شاعر کے دل ہی میں غم و الم کے احساس چھائے ہوئے ہوں اور اُس کا
ذہن کسی محبوب ہستی کی طرف چل پڑا ہو اور ایک طرح کی ذہنی پیغام رسانی
کے ذریعے سے اُس نے پہلے اپنے غم و الم کو اپنی محبوب ہستی کا غم و الم
بنایا ہو اور پھر اُس کے دُکھ پر خود اظہار تاسف کر کے اپنی ہمدردی کو دوسرے
کی ہمدردی کے پردے میں پورا کیا ہو۔

دوسری رباعی کو موضوعی لحاظ سے پہلی سے کافی حد تک ہم آہنگی
حاصل ہے ممکن ہے کہ پہلی رباعی میں جو درد و الم ایک پُراسرار کیفیت لئے ہوئے
ہے اُسی کو مخاطب کر کے شاعر کہہ رہا ہو کہ اے دردِ نہاں! دو چند ہو جا ـــ
دو چند کیوں ہو جائے؟ اس لئے کہ یوں اُس کا شعوری احساس ہو سکے گا
بھید کا رنگ مٹ جائے گا پہلی دھندلی کیفیت باقی نہ رہے گی۔
موجِ الم کے بلند ہونے ہی سے اُسے معلوم ہو سکے گا کہ یہ درد کیسا ہے اور کیوں
ہے۔ شاعر اپنے دل کی حرکت کے بند ہو جانے کا طلبگار کیوں ہے؟ شاید
اس لئے کہ یوں اس دردِ نہاں سے چھٹکارا حاصل ہو جائے۔ لیکن چوتھے
مصرعے میں "غیرت" کا لفظ بہت اُلجھانے والا ہے۔ غیرت کس بات کی؟ ـــ
اور اسی لفظ کی بنا پر اس رباعی کا تعلق پہلی رباعی سے پیدا ہو سکتا ہے۔ شاعر
کی محبوب ہستی دُکھ میں ہے۔ اُس کے دُکھ سے شاعر بھی دُکھی ہے۔ لیکن
ان دونوں کے درد کی نوعیت پُراسرار ہے، یہ درد ایک بھید کی بات ہے
ایک پیچیدہ نفسی احساس۔ البتہ اتنی بات کا شاعر کو اب یقین سا ہو چکا ہے
کہ ایک محبوب عورت بے چین ہے لیکن وہ اُس کے درد کا مداوا کرنے
سے عاجز ہے اُس کے احساس مردانگی کو اس درد کے علم سے جو تحریک ہوتی
ہوتی ہے۔ وہ اُس کی تسکین نہیں کر سکتا اور اسی لئے کہتا ہے کہ اے جوش کے
دل کی حرکت! (اپنے درد کی تو بات ہی الگ، تو اُس کے درد کو بھی نہیں مٹا
سکتی اگر تجھے ذرا بھی) غیرت ہو تو بند ہو جا۔

میراجی

نقد و نظر

حیات جاوید - از مولانا الطاف حسین حالی مرحوم - حجم ۷۹۵ صفحات ضمیمے اور انڈکس کے سوا سو صفحات اس کے علاوہ ہیں - سائز آب حیات کا ۲۰×۲۶/۸ - لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ - مولانا حالی اور سرسید کی دو بڑی عکسی تصاویر بھی شامل ہیں -

انجمن ترقی اردو نے سرسید مرحوم کی اس مستند سوانح عمری کو دوبارہ نئے اہتمام سے شائع کر کے اردو زبان کی ایک خدمت انجام دی ہے۔ "حیات جاوید" کی تالیف میں حالی کے مدنظر صرف وہی سرسید نہ تھے جنہوں نے ملک و قوم کی خدمت کی اور مسلمانوں کو تعلیم کے زیور سے مالا مال کرنے میں بے مثل خدمات انجام دیں بلکہ اُن کا سیرتی پہلو زیادہ اہمیت رکھتا تھا - حالی کے قول کے مطابق سرسید نے اُس زمانے میں ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے اپنی قابل تقلید زندگی کا نمونہ پیش کیا جب نو سو سال کے فرمانرواؤں کی حیاتِ قومی میں ایک انقلاب عظیم آگیا تھا اور وہ عملی طور پر یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ "علم اور لوگوں کا کام ہے اور باورچی گری اور لوگوں کا"۔

دیباچے میں حالی نے لکھا ہے "جس قدر زیادہ زمانہ گذرتا جائے گا اُسی قدر سرسید کے کاموں کی زیادہ قدر اور اُن کے حالات کی زیادہ چھان بین ہوتی جائے گی۔ متعدد لوگ اُن کی بائیوگرافی لکھنے پر قلم اُٹھائیں گے - اور صدیوں تک اس ہیرو کا راگ ہندوستان میں گایا جائے گا۔" یہ بات بالکل صحیح ہے - لیکن یہ بات بھی کم صحیح نہیں کہ حالی نے خود سرسید کی جو سوانح عمری لکھی ہے اُس کی حیثیت بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے پائیدار ہو چکی ہے - (قیمت کتاب پر درج نہیں ہے)

ملنے کا پتہ ، انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی -

سلطان محمود غزنوی از مولوی محمد حبیب صاحب بی اے (آکسن) پروفیسر تاریخ مسلم یونیورسٹی - مرتبہ سید جمیل حسین صاحب ایم اے علیگ

حجم ۱۳۸ صفحات - لکھائی ٹائپ کے حروف میں - کاغذ اچھا -

غزنوی کی ہندوستان پر چڑھائی ہماری تاریخ کا ایک اہم اور دلچسپ واقعہ ہے۔ ہندوستانی نقطۂ نظر سے اُسے حادثہ بھی کہا جا سکتا ہے - ایسے تاریخی حقائق عموماً جانبداری کے سیلاب میں ڈوب کر دھندلا جاتے ہیں لیکن اس کتاب کے مؤلف سے ہمیں یہ اندیشہ نہیں ہونا چاہئے - کیونکہ دیباچے ہی میں مؤلف نے لکھ دیا ہے کہ "یہ کتاب ہماری عہد وسطیٰ کی تاریخ کے ایک نہایت ہی پُرآشوب دور کو پیش کرتی ہے - ایک بادشاہ اور فاتح کی حیثیت سے محمود غزنوی کے کارنامے نے بعد کی نسلوں پر اس قدر گہرا اثر ڈالا ہے کہ ان کی نظریں لامحالہ ہمیشہ اس پر پڑتی رہیں گی۔ اس لئے اس کی سیرت کے متعلق بھی مختلف خیالات کا پھیلنا لازمی ہے - نہ معلوم مجھے اس عظیم الشان فاتح کے ساتھ کسی جذبۂ ہمدردی نے متاثر کیا - یا نفرت نے لیکن کچھ دنوں سے بعض ہندی مسلمانوں کا رجحان اس طرف ہو گیا ہے کہ محمود کو اولیاء اللہ کے مرتبے پر پہنچا دیں - اُن حضرات کو البتہ اس کے کارنامے اور حکمت عملی کی تحقیق ناگوار گذرے گی - میں اپنی صفائی میں صرف ایک بات عرض کرتا ہوں - مذہبی اعتبار سے اسلام احکام قرآنی اور سنتِ رسول صلعم کی پیروی کا نام ہے - اگر سلطان محمود اور اس کے عمالِ سلطنت صراطِ مستقیم سے بھٹکے تو یہ اُن کی بدقسمتی ، ہم بتوں کے پرستار نہیں ہیں"۔

ہمارے خیال میں محترم مؤلف کو یہ تاویل پیش کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی کیونکہ جس غیر جانبداری سے انہوں نے اس متنازعہ فیہ مسئلے پر اپنی قابلِ قدر تحقیقِ علمی سے روشنی ڈالی ہے وہ اپنا جواز آپ ہے ، اور ذیلی حوالوں نے کہیں بھی زور دلائل میں کمزوری نہیں پیدا ہونے دی -

کتاب کو چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے - ۱- اسلامی دنیا دسویں صدی عیسوی میں - ۲- سلطان محمود کا عہدِ حکومت ، غزنوی سلطنت کی ابتدا محمود کی سیرت ، ہندوستان پر حملے ، وفات - ۳- محمود کے کارنامے کی نوعیت اور اہمیت اور ۴- غزنوی سلطنت کا زوال اور خاتمہ - سلطان مسعود سلجوقی -

محترم مؤلف کا انداز بیان علمی تحقیق کی سنجیدگی کے ساتھ ساتھ ایک داستان گو کی دلکشی بھی لئے ہوئے ہے جس سے کتاب کی دلچسپی میں معتدبہ اضافہ ہو گیا ہے - قیمت - ایک روپیہ - ملنے کا پتہ ہندوستانی اکیڈیمی - الہ آباد - یوپی -

نقوشِ سلیمانی مجموعہ مقالات علامہ سلیمان ندوی۔ ناشر: مکتبہ جامعہ دہلی۔ حجم ۴۷۴ صفحات۔ آب حیات والا سائز۔ کاغذ چکنا ولایتی۔ جلد اور گرد پوش۔ قیمت درج نہیں ہے۔

اُردو ادب میں علامہ سلیمان ندوی کی بزرگی کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ اُردو ادب کی جو خدمات اُنہوں نے سرانجام دی ہیں۔ ماہنامہ معارف اس کی زندہ مثال ہے۔ مقام مسرت ہے کہ مکتبہ جامعہ نے علامہ موصوف کے چند خطبات، مقالات اور مقدمات کا یہ بیش قیمت مجموعہ نہایت دیدہ زیب انداز میں حسن کتابت و طباعت کے ساتھ شائع کیا ہے۔ دیباچے میں سید صاحب نے مضامین کی نوعیت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے "آج کل ملک میں زبان کے مسئلے سے جس دلچسپی کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ اُس کو دیکھ کر یہ خیال آیا کہ ہندوستانی زبان و ادب کے متعلق اب تک جو تقریریں میری زبان سے اور جو تحریریں میرے قلم سے نکلی ہیں۔ اُن کو ایک جگہ شائع کر دیا جائے تاکہ لوگوں کو اس مسئلے کے ہر پہلو کے سمجھنے میں مدد ملے، بعد کو جب مجموعہ چھپنے لگا تو مجموعے کے خیال سے کچھ اور چیزیں بھی اس میں بڑھا دی گئیں۔

خطبات والا حصہ زیادہ تر اُردو زبان کے مسئلے سے تعلق رکھتا ہے مقالات والے حصے میں زبان سے متعلقہ مسائل کے علاوہ دوسرے مضامین بھی ہیں مثلاً اکبر کا ظریفانہ کلام۔ انڈیا آفس لائبریری میں اُردو کا خزانہ۔ ہاشم علی کا مجموعہ مراثی، بعض پرانے لفظوں کی نئی تحقیق، جواہرالاسرار میں کبیر کی بات چیت۔ مقدمات والے حصے میں شبلی، مہدی، امجد، شاد عظیم آبادی۔ جگر مراد آبادی، حالی اور دوسرے شعرا کی کتابوں کے مقدمے شامل ہیں۔

ہمارے خیال میں اس قیمتی اور قابلِ قدر کتاب کو اُردو علم و ادب کے ہر طالب علم کے پاس ہونا چاہیئے۔

"م"

اس شمارے کے تمام مضامین نظم و نثر کے جملہ حقوق محفوظ ہیں۔

ڈاک کے محکمے کی وجہ سے ادبی دنیا ہر ماہ کی ۔۔ تاریخ تک خریداروں کے پاس پہنچ جاتا ہے اگر اس تاریخ تک پرچہ نہ پہنچے تو ایک شکایتی کارڈ اپنے ضلع کے سپرنٹنڈنٹ پوسٹ آفس کو لکھئے اور ایک کارڈ ہمیں تاکہ پرچہ آپ کو دوبارہ بھیجا جائے اور محکمہ ڈاک کے دستک دی جائے۔ مینیجر

فہرست مضامین ادبی دنیا لاہور

بابت ماہ اگست سنہ ۱۹۴۰ء

جلد ۱۸ — تصویر: از پئے جاناں جاں ہم رفت ؟ — نمبر ۸

چندہ سالانہ مع محصول ڈاک و روی پی پانچ روپے ممالک غیر سے دس شلنگ

گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام صلاح الدین احمد پرنٹر و پبلشر چھپ کر دفتر ادبی دنیا موہنی ہال لاہور سے شائع ہوا۔ تصاویر اوریئنٹل البائیڈ پریس لاہور میں چھپیں۔

دنیائے کاروبار

نیشنل لیبارٹریز لاہور

میسرز بیلی رام اینڈ برادرز سوداگران ادویات" اس مشہور عالم اور معتبر فرم نے جو ہندوستان میں ترقی کی ہے وہ محتاج بیان نہیں اس کی دیانتداری اور خوش اخلاقی اور معاملہ فہمی تمام ہندوستان کے کونے کونے میں پھیل گئی ہے نیشنل لیبارٹریز کی بنائی ہوئی تمام ادویات ۔ عمدگی ۔ صفائی اور قیمت کی کفایت کے لحاظ سے ولائتی اشیاء پر سبقت لے گئی ہیں ۔ اور نیشنل لیبارٹریز اس فرم کا ایک صنعتی شعبہ ہے ۔ جس کے روح رواں مسٹر بالک رام بالی ہیں ۔ جو نہایت معتمد ہوشیار و با اخلاق ہیں ۔

ملک میں روز بروز بڑھتی ہوئی بیکاری سے متاثر ہو کر انہوں نے اس صنعتی شعبے کی داغ بیل ڈالی جو اس وقت سے اب تک نہایت کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے اس کی تیار کردہ اشیاء مثلاً موناسنو، موناکریم، اورینج اور لیمن سکویش، عرقیات، عطر، سینٹ، تیل ۔ کریم اور اینٹی سپٹال سوپ اپنے مقابلے کے ولائتی مصنوعات سے صفائی اور ہر خوبی سے ہزار درجہ بہتر ہیں اور قیمت میں بھی با کفایت ۔ خصوصاً موناسنو کے استعمال سے چہرے کی تمام کیل چھائیاں، جھریاں اور ہر قسم کے داغ دھبے دور ہو جاتے ہیں اور چہرہ چاند کی مانند نکل آتا ہے ۔

صندل آئل یہ بھی ایک نہایت ہی اعلیٰ درجہ کا تیل ہے جس کے لگانے سے دائمی دردسر دور ہو جاتا ہے ۔ دماغی کام کرنے والوں کے لئے یہ ایک بے نظیر تحفہ ہے ۔

مندرجہ بالا اوصاف کی بنا پر اس دوکان سے تمام معزز دکاندار اس کا سٹاک اپنے پاس جمع رکھتے ہیں اور اپنے گاہکوں سے ان کے استعمال کی سفارش کرتے ہیں ۔

لٹن واچ کمپنی

عہد حاضر میں سائنس کی ترقی کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی میں بھی باقاعدگی پیدا کرنے کے لئے گھڑی کا احساس شدت سے پیدا ہو چکا ہے جس کی وجہ سے گھڑی کا وجود ہماری ضروریات زندگی کے لئے از بس ضروری ہو چکا ہے ۔

لٹن واچ کمپنی ۱۴ ڈلہوزی اسکوائر کلکتہ ۔ انسانی ضروریات کے عین مطابق نہایت اعلیٰ قسم کی پائیدار گھڑیاں فروخت کرنے میں امتیازی حیثیت حاصل کر چکی ہے ۔

لٹن گھڑیاں شکل و صورت کے اعتبار سے نہایت خوبصورت ہوتی ہیں ۔ صحیح وقت دینا خوشنمائی، دلکشی اور نفاست ان گھڑیوں کی ممتاز ترین خصوصیات ہیں جن کی بنا پر یہ غیر معمولی شہرت حاصل کر چکی ہیں ۔ ان گھڑیوں کی ساخت میں بے نظیر خوبی اور ناقابل انکار امتیاز کے بلند معیار کو مدنظر رکھا گیا ہے ۔ ہر مذاق کے لوگوں کے لئے دلکش نمونوں اور سائزوں میں مل سکتی ہیں ۔ قیمتیں نہایت واجبی ہیں اور خریدار کو اس کے روپے کا پورا پورا بدل دیا جاتا ہے ۔ ہم ناظرین سے پر زور سفارش کرتے ہیں کہ لٹن واچ کی گھڑیاں خرید کر اپنے پاس رکھیں

مکمل فہرست اس پتے سے طلب فرمایئے ۔
لٹن واچ کمپنی ۱۴ ڈلہوزی اسکوائر ۔ کلکتہ ۔

فضل الٰہی

مہتمم اشتہارات ادبی دنیا ۔ مال لاہور

بزمِ ادب

ادبی حلقوں میں یہ خبر رنج اور افسوس سے سنی جائے گی کہ خواجہ عبدالروف صاحب عشرت کا لکھنؤ میں انتقال ہو گیا۔ خواجہ صاحب مرحوم ہمارے اُن اُدبا میں سے تھے۔ جنہوں نے مشرقی دربار داری اور تمدن کی آخری جھلک دیکھی تھی۔ آپنے متعدد گراں پایہ تصانیف کے علاوہ جن میں سے بیشتر شاعری اور تنقید سے متعلق ہیں۔ ایسے مضامین کا ایک نادر مجموعہ بھی یادگار چھوڑا ہے جن کو دربار اودھ اور امرائے اودھ کی معاشرت کے بے نظیر مرقعے کہا جا سکتا ہے۔ خواجہ صاحب کی وفات سے ہماری محفل میں ایک ایسی نشست خالی ہو گئی ہے جو شاید اب خالی ہی رہے گی۔

بعض مضمون نگار حضرات اور شعرائے کرام میں جہاں اور دلچسپ خصوصیات ہیں وہاں یہ بات بھی پائی جاتی ہے کہ وہ اپنی تخلیقات کو لوگوں کے سامنے فرضی ناموں سے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ ادبی دنیا کا مسلک ایک عرصے سے اس روش کے خلاف تھا۔ ہمارے ہاں اگر کوئی فرضی نام شائع بھی ہوا ہے تو اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ مصنف اپنی پرائیویٹ زندگی میں بھی اسی نام سے معروف ہے۔ لیکن بعض اصحاب ہمیشہ اپنے فرضی ناموں کی اشاعت پر اصرار کرتے رہے۔ اس اصرار کی روز افزوں شدت کو دیکھ کر آئندہ کے لئے ہم نے فرضی ناموں کے متعلق پابندی ہٹا دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ کیونکہ آخر یہ مضمون نگار یا شاعر کی اپنی مرضی ہے کہ وہ اپنی تخلیق کسی اور نام سے منسوب کرے۔

اس ماہ کے تینوں مضامین اپنی اپنی جگہہ نہایت دلچسپ اور خیال افروز ہیں۔ انشائے لطیف (ESSAY) کے سلسلے میں جو چند ماہ سے ادبی دنیا میں جاری ہے، ممتاز مفتی صاحب کا بیش قدر مضمون **جھوٹ** خاص طور پر توجہ کے قابل ہے۔ مفتی صاحب نے اپنے شگفتہ اندازِ تحریر میں، جو کبھی بیزار کن نہیں ہوتا، ہماری اس سب سے دلچسپ عادت کا جائزہ لیا ہے۔ اور ایسے ایسے لطیف نکتے پیدا کئے ہیں کہ آئندہ جھوٹ بولتی دفعہ شاید ہم اس کے نفسیاتی پہلو پر غور کرتے رہ جائیں گے اور جھوٹ بولنا بھول جائیں گے۔

اقبال اور اس کے نقّاد لکھ کر جناب مبشر علی صدیقی نے ایک دلکش انداز میں ان نکات و مسائل پر روشنی ڈالی ہے جو اقبال کی شاعری اور اس کے پیغام سے تعلق رکھتے ہیں۔ مسئلۂ زیرِ بحث اگرچہ خاصہ دقیق تھا۔ لیکن مکالمے کی شگفتگی نے اسے ایک واضح اور عام فہم صورت دے دی ہے۔ امید ہے کہ علمی مسائل کی توضیح و تسہیل کا یہ انداز ناظرین کو بہت پسند آئے گا۔

ترقی پسند ادب اور مزدور ایک بصیرت افروز مقالہ ہے جسے جنابِ مسعود جالندھری نے، معلوم ہوتا ہے، کہ نہایت غور و فکر کے بعد لکھا ہے۔ یہ بیش قیمت مضمون اُس افراط و تفریط سے قطعاً مبرا ہے جو ترقی پسند ادب کے حامیوں اور مخالفوں کی تحریروں میں عموماً نظر آتی ہے۔ مسعود صاحب نے ترقی پسند ادب کا صحیح مقام واضح کرنے میں اپنے حسنِ مذاق اور دقّتِ نظر کا نہایت روشن ثبوت دیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ وہ اس دلچسپ مسئلے پر آئندہ بھی لکھتے رہیں گے۔

محمد حسن صاحب عسکری کا مطالعہ "گھر سے کالج تک" مزاح نگاری کی ایک کامیاب مثال ہے۔ زندگی کے بعض مسائل ایسے خار دار ہوتے ہیں کہ ہم اپنی سنجیدہ تحریروں میں اُن کے متعلق صاف بیانی سے کام نہیں لے سکتے۔ لیکن مزاح کے پردے میں وہ سب کچھ "بلا تکلف عرض کیا جا سکتا" ہے۔ جو عام طور پر کہنے سے ہم لوگ ہمیشہ ہچکچاتے ہیں۔ زیرِ نظر مطالعہ میں آپ کو صاف بیانی کی چند دلچسپ مثالیں نظر آئیں گی۔

ایشور سنگھ کے نقوش اب مستقلاً ادبی دنیا کی زینت ہوتے جا رہے ہیں۔ توقع ہے کہ یہ نقوش اردو دان طبقے کو اپنے ملکی مصوروں میں دلچسپی لینے پر مائل کریں گے۔

صلاح الدین احمد

(۲)

موسموں کے تاثرات یوں تو ہر ملک اور قوم کے لوگوں پر کم و بیش ہوتے ہی ہیں لیکن ہندوستان کے ساون کی دلکشی اور انفرادی "خصوصیات کی وجہ سے ہمارے لئے یہ تاثرات ایک خاص حیثیت رکھتے ہیں۔ ساون کا موسم جذبات انگیز ہے اور اس دفعہ ساغر جلیلی کی نظم "برسات کا بلاوا" موسم کی ہمنوائی کر رہی ہے۔ اس نظم میں جو نیاز کی باتیں ہیں ان کی کیفیت نزاکت ہلکی ہلکی پھوار کی مانند ہے لیکن بحر کا زیر و بم اور موسیقی یوں ہے گویا لگاتار جھڑی لگ رہی ہو۔ بوندوں کا ساز چل رہا ہو اور دل —— لیکن دل کے متعلق خاموشی ہی بہتر ہے۔

علی احمد ساون کے ماحول سے بے نیاز ہے۔ بلکہ وہ "بادِ بہاری کی رخصت اور خزاں کے دورِ حکومت" کے تاثرات کا بیان کر رہا ہے جب "دنیا ایک بے لذت راگ" بن کر رہ جاتی ہے۔ ایسے سمے میں دل میں جو ایک انتشار سا محسوس ہوتا ہے اس کے تاثر میں اپنی محبوب کو بھی ہمنوا بنانا چاہتا ہے۔ اور دلیل یہ دیتا ہے (اگرچہ بہ آواز نہیں کہتا) کہ جس طرح بادِ بہاری رخصت ہو چکی اسی طرح جوانی بھی چلی جاتی ہے اس لئے "عشق و الفت کی صہبا سے حیاتِ کیف آور کے جاموں کو بھر لینا چاہئے" —— اس چھپی ہوئی دلیل کا اشارہ اس نظم کی صرف ایک خوبی ہے اور پھر آخر میں جا کر بھی شاعر ایک دلکش کنائتی انداز اختیار کرتا ہے۔ جب اُسے اپنی محبوب کے عارض پر آنسو دکھائی دیتے ہیں۔ یہ آنسو کیسے ہیں؟ کیا خزاں کے تاثر کی وجہ سے یا شاعر کی باتوں کے تاثر کی وجہ سے یا . . . . یعنی اس آخری کنائے میں بہت سے امکانات پوشیدہ ہیں اور جس طرح خزاں کے ماحول میں ذہن ایک سکون اور خاموشی میں کھو کر کچھ سوچنے لگتا ہے اسی طرح کا اثر اس آخری کنائے سے ہم پر ہوتا ہے۔ ہم کچھ سوچنے لگتے ہیں۔

کوکب شادانی اور میراجی کی نظموں میں فنی پہلو کی طرف توجہ کیجئے گا۔ اردو میں لمبی بحروں کو میر تقی کی بحریں بھی کہا جا سکتا ہے لیکن میر تقی کی بحروں میں عموماً ساڑھے سات رکن استعمال ہوتے ہیں —— یہاں کوکب کی غزل میں شاعر نے پورے آٹھ رکن استعمال کر کے موسیقی میں ایک تجدید سی پیدا کی ہے اسی طرح "ایک گیت کے دو بھاؤ" میں آٹھ کی بجائے ساڑھے آٹھ ارکان کے استعمال سے ہیئت میں ایک تبدیلی پیدا ہو گئی ہے۔ یہ تبدیلی ابھی محض ایک تجربہ ہے۔

زیرِ نظر شمارے میں احتشام حسین کی نظم خصوصاً توجہ کے لائق ہے۔

اس نظم کی حیثیت انفرادی ہے لیکن انفرادیت ہی سے شاعر نے اجتماعی تفکر کی جانب گریز کیا ہے اس کی بحر میں جو ایک اُفتاں خیزاں اور ڈھیلی سی کیفیت نظر آتی ہے وہ ہماری سماج کے ماحول سے ہم آہنگ ہے۔ آج سے بیس پچیس سال پیشتر جب ابھی بین الاقوامی حالات نے بہت سے نئے زاویے ہماری نظروں کے سامنے نہیں پیش کئے تھے۔ ہم اپنے خوابوں ہی میں کھوئے ہوئے تھے۔ ماضی کے خوابوں میں اور اب نئے زاویوں نے ہمیں نئے خواب مہیا کر دئیے ہیں مستقبل کے خواب۔ یہ نظم حال کی حقیقت سے ہٹتے ہوئے مستقبل کے خوابوں کا آئینہ ہے اور ظاہر کرتی ہے کہ حالات خواہ کتنے ہی بدل جائیں انسان بنیادی لحاظ سے ہمیشہ سپنوں ہی کا عادی رہے گا۔

سعید احمد اعجاز "شگفتِ گل" میں صرف خیال کی نزاکت ہی کو ظاہر کر رہا ہے لیکن جلد ہی وہ حقیقت کی طرف آتا ہے اور "شکر"، "تجربۂ ناگوار" اور "واردات" تینوں نظموں میں اُس تلخی کا اظہار کرتا ہے جس سے ہمیں "اس درد کی ماری دنیا" میں عموماً دوچار ہونا پڑتا ہے۔

اور سب سے آخر لیکن ہر طرح بہتر اختر شیرانی کا تغزل اس بار ادبی دنیا کے صفحات کی زینت ہے۔

اس دفعہ کی تصویر | بظاہر دنیا میں دو ہی غم نظر آتے ہیں، غمِ عشق اور غمِ روزگار۔ غالب کہتا ہے کہ اگر ایک غم نہ ہو تو دوسرے کا ہونا لازمی ہے اور سعدی اس تلخ حقیقت کا اظہار اپنے ایک شعر میں کرتا ہے کہ دمشق میں ایک بار ایسا قحط پڑا کہ یاروں نے عشق ہی کو فراموش کر دیا۔ آج کل کی دنیا میں بھی کچھ ایسی "دمشقی کیفیت" ہی چھائی ہوئی ہے جس کے سب سے بڑے نقیب ترقی پسند ادیب ہیں۔ اس ماہ کی تصویر کا موضوع بھی انہی کے رجحانات سے تعلق رکھتا ہے۔ اور ظاہر کرتا ہے کہ روزگار ایک ایسی "جاناں" ہے جس کے لئے لوگ جان کی پروا کئے بغیر مصروفِ تگ و دو ہیں۔ شاید امیر خسرو کو بھی جب وہ ڈھینکے کی دُھن کو لفظوں کی قید میں لا رہے تھے تو غیر شعوری طور پر اس پیشے کے عام پہلو کا احساس تھا۔ ورنہ ان الفاظ کے کیا معنی کہ "از پئے جاناں جاں ہم رفت"؟

میراجی

آئینۂ عالم

جاپان، ہندوستان اور چین

جاپان کے ملک الشعرا کا نظریہ

جاپان گذشتہ کچھ عرصے سے جہانگیری کا جو عظیم الشان خواب دیکھ رہا ہے اور اُسے شرمندۂ تعبیر کرنے کی جو کوششیں اُس نے مختلف صورتوں میں اب تک کی ہیں وہ ایک ایک کرکے ہمارے سامنے آچکی ہیں۔ چین پر حملہ بھی اسی خواب کا ایک جزو تھا جسے اب تک جنرل چینگ کائی شک نے پورا نہیں ہونے دیا۔ جاپان کے مدبرین کی طرح جاپان کے موجودہ ملک الشعرا، "یان نوگُچی" نے بھی جاپان کے اس اقدام کو حق بجانب ثابت کیا ہے۔ اور اپنی نئی کتاب "جاپان جدید" میں اسی مسئلے پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ

"اس وقت ایشیا بھر میں صرف جاپان ہی ایک ایسا ملک ہے جو کسی غیر ملکی اثر و اقتدار سے آزاد ہے۔ اس کے سوا ایشیا کے باقی تمام ممالک ایک ایک کرکے مغربیت کے آگے سرِ تسلیم خم کرکے اپنی آزادی کھو چکے ہیں۔ اس لئے موجودہ صورتِ حال میں ہم یہ چاہتے ہیں کہ ایشیا میں ایک نیا نظام قائم کریں۔ اور ہم اسی غرض سے چین کی طرف بڑھ رہے ہیں جس میں ہمیں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی ہے اور ہم نے نصف سے زیادہ چین پر قبضہ کرلیا ہے۔ مگر جنرل چینگ کائی شیک اور اس کے دوسرے ساتھی جو مغربی قوتوں کے آلۂ کار ہیں، ہمارے اس عزم کو پاش پاش کرنے پر تلے بیٹھے ہیں لیکن ہم ان باتوں سے گھبرانے والے نہیں۔ ہم نے ایک عزم کیا ہے اور اُسے پورا کرکے چھوڑیں گے خواہ راستے میں ہمیں کیسے ہی مصائب سے دوچار کیوں نہ ہونا پڑے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس جنگ میں جو ہم نے چین کے خلاف جاری کر رکھی ہے۔ دن رات بہت سی چینی جانیں ضائع ہو رہی ہیں۔ اگر اتلافِ جان کا معیار یہی رہا تو یقیناً ہمارا پروگرام پورا نہیں ہو سکے گا۔ ان کو میرا جواب یہ ہے کہ ایسا صرف اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ ہماری جنگ چین کے عام لوگوں کے خلاف ہو۔ ہم تو جنرل چینگ کائی شیک کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ کیونکہ اُس نے اور اُس کے ساتھیوں نے جو ہمیشہ مغربی طاقتوں کے اشارۂ چشم و ابرو پر ناچتے رہے ہیں، جاپان کی مخالف تحریکات میں نہایت سرگرمی سے حصّہ لیا ہے۔"

ہندوستان جاپان اور چین کے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہوئے جاپانی شاعرِ اعظم نے کہا کہ کچھ عرصہ ہوا ایک ہندوستانی نوجوان نے بھی اسی قسم کے اندیشے کا اظہار کیا تھا جس کے جواب میں میں نے کہا تھا کہ چین اور جاپان کی مثال انگریزوں اور ہندوستانیوں کی سی نہیں ہے کہ دونوں کی زبان تمدن اور کلچر علٰحدہ علٰحدہ ہے۔ بلکہ چین اور جاپان تو در اصل ایک ہی درخت کی دو شاخیں ہیں ہم دونوں ایک ہی نسل سے ہیں۔ ہمارا ایک جیسا رنگ ہے اور ہم بہت مدت تک بدھ بادشاہوں کے زیرِ سایہ زندگی بسر کرتے رہے ہیں اُس زندگی میں ایک سکون تھا، چین تھا، آرام تھا، موجودہ دور کی بے اعتمادی اور بے اطمینانی نہیں تھی۔ اس زمانے میں ہم ایک دوسرے کو بدھ کے مجسّمے بطور تحفہ دیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں کئی چینی جاپان میں آئے اور وہیں کے ہو رہے۔ دونوں ممالک کے بادشاہوں نے ایک دوسرے کے ممالک میں بدھ کے مندر بنائے جو آج بھی اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ ہم ایک ہیں، اور بدھ مذہب نے تو ہمیں ہندوستان کے قدموں میں بھی لا ڈالا تھا۔ اگر ہم نیرا کے ہوردجی مندر کو دیکھیں تو اُس سے ٹنگ ہنگ کے چینی مندر یاد آجاتے ہیں اور ساتھ ہی ہمارا ذہن اجنٹا کے مندروں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جس کا یہ عکس معلوم ہوتے ہیں۔ اس زمانے میں چین اور جاپان میں جو مورتیاں بنائی گئیں وہ شیو جی اور کالی دیوی کی شکل

کی تھیں۔

اس سے صاف طور پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ چینی اور جاپانی مندروں کے تعمیر کرنے والے ہندوستانی تھے۔ اُس وقت ہندوستان جاپان کے کتنا قریب تھا۔ مگر ہمارے یہ دوستانہ تعلقات زیادہ دیر تک قائم نہ رہے۔ ان کو منقطع کرنے کی طرف تیرھویں صدی میں سب سے پہلے مغلوں نے ہاتھ بڑھایا جو جاپان پر حملے کی صورت میں تھا۔ اس واقعے کے بعد ہندوستان، چین اور جاپان آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے دور ہوتے گئے۔

ہم پھر انہی پرانے تعلقات کو قائم کرکے ایشیا میں ایک نیا نظام قائم کرنا چاہتے ہیں۔ مگر مغربی قوتیں جو یہ جانتی ہیں کہ اس طرح ان کے تجارتی مفاد کو سخت دھکا لگے گا، اُن کی منڈیاں ماند پڑ جائیں گی اور جاپان کو زیادہ منافع ہوگا ہمارے اس ارادے کی مخالفت کر رہی ہیں۔ اور جنرل چیانگ کائی شیک اُن کی طرف سے اس سلسلے میں ہماری مخالفت کرنے میں پیش پیش ہے۔"

ملک الشعرائے جاپان کے مندرجہ بالا خیالات جاپان کے خوابِ ملوکیت کا صحیح آئینہ ہیں جن کی روشنی میں بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس کی آواز تمام جاپان کے سرکاری اور غیر سرکاری حلقوں کی آواز ہوگی۔

دراصل اس خواب کو جاپان انیسویں صدی کی ابتدا سے دیکھ رہا ہے اسی کی تکمیل کے لئے اس نے پہلے روس سے جنگ چھیڑی، مانچوریا کو اپنے قبضے میں کیا اور پھر چین کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ لیکن کیا اس کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوگا؟ اس کے متعلق یقین کے ساتھ ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ بین الاقوامی صورتِ حال اس سرعت سے تبدیل ہو رہی ہے کہ کوئی یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ آج شام کو کیا ہوگا اور کل صبح جب دنیا بیدار ہوگی تو اخبارات کی کونسی خبر ہماری توجہ کو اپنی طرف مبذول کرے گی۔

روس کا نظامِ حفظانِ صحت

روس کی خارجی حکمتِ عملی سے کسی کو اختلاف کیوں نہ ہو اشتراکیوں کے مذہبی تصورات اور ان کے نظامِ حکومت کا کوئی کتنا ہی مخالف کیوں نہ ہو لیکن اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں کسی کو باک نہ ہوگا کہ دنیا کی کسی حکومت نے حفظانِ صحت کی طرف روس سے بڑھ کر توجہ نہیں کی۔ سوویٹ حکومت نے برسرِ اقتدار آتے ہی مخالفین کے قتل سے فارغ ہونے کے بعد سب سے پہلے جس محکمے کی اصلاح کی طرف قدم اٹھایا وہ محکمۂ حفظانِ صحت تھا۔

زاروں کے زمانے میں روسیوں کو سب سے بڑی تکلیف یہی تھی کہ ملک کی بڑی آبادی کے مقابلے میں ڈاکٹروں کی تعداد بہت کم تھی۔ زار خود تو دن رات عیش و عشرت میں مشغول رہتے تھے لیکن اُن کو اپنی رعایا کی تکالیف کا احساس نہ تھا۔ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ ان کی حکومت کا دارومدار رعایا پر ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی ملک میں طاعون، ہیضہ یا دیگر متعدی امراض پھیلے تو آنِ واحد میں بڑے بڑے شہروں کا صفایا ہو جاتا اور حکومت ان کے انسداد کی طرف توجہ ہی نہ کرتی اور اگر توجہ کی بھی جاتی تو محض اس لئے کہ امراء کے طبقے کو نقصان نہ پہنچے۔ ۱۸۹۷ء میں محکمۂ حفظانِ صحت کے اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ روس جیسے وسیع و عریض ملک میں تمام سند یافتہ ڈاکٹروں کی تعداد ۶۹۵۹ تھی اس کے علاوہ تعویذ گنڈا کے ذریعے علاج کرنے والوں اور نیم حکیموں کی تعداد تیرہ ہزار تھی اور ایسے معالج طاعون اور دیگر امراض سے بھی زیادہ نقصان کا باعث تھے۔ اُس زمانہ میں چیچک بہت پھیلی تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ہر سال صرف چیچک سے ہی ایک لاکھ آدمی مر جاتے تھے۔

اشتراکی چونکہ برسرِ اقتدار آنے سے پہلے ان لوگوں میں ہی شمار ہوتے تھے جن کے متعلق یہ خیال کیا جاتا تھا کہ یہ لوگ امراء کو راحت پہنچانے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ اس لئے اُنہوں نے عوام کی تکالیف کو محسوس کرتے ہوئے حکومت کا نظام ہاتھ میں لیتے ہی بیماریوں کے انسداد کی طرف توجہ کی۔ ملک میں ہسپتال بنائے اور ان میں ہر مرض کا علاج کیا جانے لگا۔ آج کل اگر کوئی کسی پرانے زار کے زمانے کا روسی قبر سے نکل آئے اور روس کی حالت کو دیکھے تو اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آئے گا۔ کہاں وہ روس جب بیمار سسک سسک کر مر جاتے تھے مگر کوئی اُن کو پوچھنے والا نہ ہوتا تھا اور کہاں آج کا روس کہ ملک میں ہر طرف ہسپتال کھلے ہوئے ہیں جن میں ہر بیماری کا علاج مفت ہوتا ہے۔

۱۹۳۴ء تک روس میں جتنے ہسپتال تھے ان میں بیک وقت چھ لاکھ پچاس ہزار مریضوں کے علاج کا انتظام تھا اور آج کل تو اور بے شمار ہسپتال بھی بن چکے ہیں۔ اشتراکیوں نے صرف اپنے ہی ملک میں ہسپتالوں کا جال نہیں پھیلایا بلکہ اپنی نوآبادیوں کو بھی اس نعمت سے مالا مال کرنے کی کوشش کی ہے۔ زاروں نے اپنے ملک میں تو کچھ ہسپتال بنا دیئے تھے مگر نوآبادیوں میں کئی کئی سو میل کے فاصلے پر کوئی ہسپتال نہیں ملتا تھا۔ مگر اشتراکیوں نے اپنی نوآبادیوں کی ضروریات کو محسوس کرتے ہوئے انہیں پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔

زاروں کے روس میں بازاری عورتوں کے اڈے بھی بازاروں میں بہت زیادہ تھے۔ یہ عورتیں بھی نوجوانوں کی صحت کو خراب کرنے کا باعث بنتی تھیں اور بہت لوگ خفیہ امراض کا شکار ہوا کرتے تھے۔ اشتراکیوں نے آتے ہی عورتوں کے اڈے بازاروں سے اٹھوا دیئے اور اُن عورتوں کو جو محض روزی کمانے کے لئے یہ پیشہ اختیار کرتی تھیں۔ کارخانوں، فیکٹریوں اور دیگر کاموں میں لگا دیا۔ تاکہ یہ افعال شنیعہ ان سے چھوٹ جائیں اور مردوں کو اُن کی پالی ہوئی بیماریوں سے اماں ملے۔ یہی وجہ ہے اب روس میں پہلے کی نسبت یہ امراض بہت کم رہ گئے ہیں۔

حفظانِ صحت کے چند معمولی مسائل طے کرنے اور ہسپتال بنانے کے بعد اشتراکیوں نے تپ دق کے انسداد کی طرف توجہ کی۔ زاروں نے اسے بھی پھیلنے پھولنے کے لئے چھوڑ رکھا تھا۔ ان کے زمانے میں صرف چند ہی تپ دق کے ہسپتال تھے اور وہ حکومت کے خرچ سے نہیں چلتے تھے بلکہ ملک کے چند اداروں نے انہیں قائم کیا ہوا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ تپ دق سے اموات کی تعداد برابر بڑھ رہی تھی۔

اشتراکیوں نے نظامِ حکومت ہاتھ میں لیتے ہی اس لعنت کو دور کرنے کی کوشش کی۔ اس وقت روس میں ایک ہزار اعلیٰ درجہ کے ہسپتال قائم ہیں۔ جن میں بیک وقت بیس لاکھ مریضوں کا علاج ہو سکتا ہے۔ تپ دق کے مریضوں کے لئے صحت افزا مقامات بھی ہیں جہاں بیتالیس ہزار مریض بیک وقت ٹھہر سکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ماسکو میں ۱۹۳۶ء میں ۱۹۱۴ء کی بہ نسبت جب کہ روس پر زار کی حکومت تھی۔ تپ دق کے مریضوں کی تعداد پہلے کی بہ نسبت ۵۰ فی صدی کم تھی۔ ابھی حکومت نے اس کی روک تھام کی تدابیر ترک نہیں کیں۔ بلکہ ابھی تپ دق کے علاج کے مزید موثر اور سہل طریقے معلوم کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔ اس کام کے لئے اٹھارہ بڑے بڑے ادارے قائم ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ۱۹۱۴ء میں زار کی حکومت سارے محکمہ حفظانِ صحت پر بارہ کروڑ اسی لاکھ روبل خرچ کیا کرتی تھی مگر آج کل صرف تپ دق کے انسداد پر ہی دس ارب روبل خرچ کئے جاتے ہیں غالباً اتنی بڑی رقم دنیا کی کوئی حکومت بھی حفظانِ صحت پر یا اُس کے کسی شعبے پر خرچ نہ کرتی ہوگی۔

چونکہ سوویٹ نظام مزدوروں کے بل پر قائم ہے۔ اس لئے ان کی صحت کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ ہر کارخانے اور فیکٹری کے ساتھ چھوٹے چھوٹے شفاخانے بنے ہوئے ہیں جہاں فوری حادثات کے علاوہ ہر بیماری کا علاج ہوتا ہے۔ ان کے کام کرنے کے اوقات مقرر ہیں۔ اور تفریح کے لئے بھی ان کو چھٹی دی جاتی ہے ہر کارخانے کے ساتھ تفریح گاہیں ہیں اور ان میں تفریح کا سامان بھی موجود ہے۔ علاوہ ازیں ان کے لئے آرام گاہیں بھی بنی ہوئی ہیں۔ زاروں اور اُمراء کے محلات کو ایک فرمان کے ذریعے ریسٹ ہاؤس میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔

بچوں اور صنفِ نازک کی صحت پر جتنا روپیہ یہاں خرچ کیا جاتا ہے اتنا یورپ کے کسی ملک میں خرچ نہ کیا جاتا ہوگا بیان کیا جاتا ہے کہ اس سلسلے میں وہ برطانیہ فرانس امریکہ اور جرمنی سے بھی بڑھا ہوا ہے جتنے زچہ خانے اور بچہ خانے اور عورتوں کے لئے مشورہ گاہیں یہاں ہیں اتنی تمام ممالک میں بھی نہ ہوں گی۔

جب عورت کے وضع حمل کا وقت قریب آتا ہے تو اُسے زچہ خانے میں لے جاتے ہیں جہاں بچہ پیدا ہونے کے کچھ دنوں کے بعد عورت کو معمول کے کام پر روانہ کر دیا جاتا ہے اور بچے کی حفاظت اور نگہداشت حکومت اپنے ذمے لے لیتی ہے اس سے عورت کے روزانہ کام میں بھی حرج نہیں ہوتا اور بچے کی نگہداشت بھی اچھی طرح ہو سکتی ہے۔

آخری زار کے زمانے میں عورتوں کے علاج کی مشورہ گاہیں صرف نو ۹ تھیں اور بچہ گاہوں میں صرف ۵۵۰ بچوں کی نگہداشت کا انتظام تھا اور وہ بھی امراء کے بچوں کے لئے۔ مگر آج کل ان بچہ گاہوں میں جو شہروں میں ہیں ستر لاکھ بچوں کی بیک وقت نگہداشت ہو سکتی ہے علاوہ ازیں تینتالیس ہزار مشورہ گاہیں بھی ہیں اور ہر سال ان کو اور وسعت دی جا رہی ہے۔

ان بچہ گاہوں میں اعلیٰ درجہ کی دائیاں ملازم ہیں۔ بچوں کو جو دودھ پینے کے لئے دیا جاتا ہے وہ سائنٹیفک طریقوں سے صاف کیا جاتا ہے۔ ۱۹۱۴ء کی تمام زچہ گاہوں میں ۶۸ ہزار عورتوں کے لئے انتظام تھا مگر ۱۹۳۶ء میں ایک لاکھ نو ہزار عورتوں کے واسطے انتظام کر دیا گیا اور ۱۹۳۷ء میں حکومت نے جدید وضع کے زچہ خانوں پر پچاس کروڑ روبل خرچ کئے۔

روس کو بچوں کی صحت کا بہت زیادہ خیال ہے "سب کچھ بچوں کے واسطے" اشتراکیوں کا نعرہ ہے۔ اسی واسطے زچہ خانوں اور بچہ خانوں کے علاوہ ایسے بھی بہت سے مرکز بنائے گئے ہیں جہاں صرف بچوں کے امراض کا علاج کیا جاتا ہے اور حکومت نے بچوں کو سرکاری خرچ پر دیہات اور صحت افزا مقامات پر بھیجنے کا انتظام کر رکھا ہے . . . . ۱۹۳۷ء میں تریسٹھ کروڑ ساٹھ لاکھ روبل بچوں کو صحت افزا مقامات پر بھیجنے میں خرچ کئے گئے تھے۔

ان ہی حالات کے پیشِ نظر آج کل طبی سائنس کو بھی بہت زیادہ ترقی دی جا رہی ہے۔ زاروں نے اس کی طرف سے بھی غفلت برتی تھی اور ایک بار تو ایک ڈاکٹر کو دماغی امراض کے متعلق ایک کتاب لکھنے کے جرم میں قید کر دیا تھا۔

اور اس طرح اس کو اس کی خدمات کے باوجود جو اس نے طب کے شعبے میں سرانجام دی تھیں ان کو میڈیکل اکیڈیمی کا ممبر بھی نہیں بننے دیا گیا تھا۔ مگر موجودہ حکومت اس سے قطعاً بے پرواہ نہیں ہے بلکہ حکومت ڈاکٹروں کی ہمت افزائی کر رہی ہے اور میڈیکل ریسرچ کا کام اعلیٰ پیمانہ پر ہو رہا ہے اور اس پر حکومت پانی کی طرح روپیہ خرچ کر رہی ہے اور لیبارٹریوں کو جدید ساز و سامان سے آراستہ کر رہی ہے مثلاً ۱۹۳۲ء میں حکومت نے پانچ کروڑ روبلز کے خرچ سے ماسکو میں ایک تجربہ گاہ بنائی تھی جس میں چھ ہزار پانسو کمرے ہیں اور جہاں روس کے بڑے بڑے ڈاکٹر دن رات تجربے کرتے رہتے ہیں اور ۱۹۲۶ء میں ایک انسٹی ٹیوٹ قائم کیا گیا جہاں خون کے متعلق تجربے کئے جاتے ہیں۔ روس میں آج کل دو سو سے زیادہ ریسرچ گاہیں ہیں، جہاں نئی نئی باتیں اور بیماریوں کے نئے نئے علاج معلوم کئے جاتے ہیں اور ان کو عملی طور پر اختیار کیا جاتا ہے تاکہ قوم کی صحت کا معیار بلند کیا جائے۔

صحت کا معیار بڑھانے کے لئے فلموں کو بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ سب سے زیادہ مسرت کی بات یہ ہے کہ کسی شخص کو شراب خانوں سے باہر شراب پینے کی اجازت نہیں ہے اور نوجوانوں کو خاص طور پر اس لعنت سے بچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

غرضیکہ حفظانِ صحت کے سلسلے میں اس وقت روس دنیا کے تمام ممالک سے بڑھا ہوا ہے اور اس سلسلے میں اس نے جو ترقی کی ہے وہ دیگر ممالک کے لئے مشعلِ راہ کا کام دے گی۔

تابش صدیقی

دو شعر

کسی کا کون رہا یوں تو عمر بھر پھر بھی!
یہ حسن و عشق تو دھوکا ہے سب ـــ مگر پھر بھی!

ہزار بار ادھر ہی سے لوگ گذرے ہیں
نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہگذر پھر بھی

فراق گورکھپوری

برسات کا بلاوا

آکاش پہ اُودی اُودی اور سرمست گھٹائیں تیرتی ہیں
ساون کے جھُولوں پر بھیگی بھیگی سی ہوائیں تیرتی ہیں
ان کالی کالی راتوں کو فردوس نور بنا دونا!
سلمیٰ! وہ جبیں، مہتاب آلودہ جبیں اک بار دکھا دونا!!

اک کیف جہاں پر طاری ہے اک سُکر فضا میں ساری ہے
اک بزمِ رامش و رنگ بپا، اک جشنِ مسرت جاری ہے
میرے بھی دلِ غم دیدہ کو مرہونِ کیف بنا دونا!
ان مست گھٹاؤں کے سایوں میں چھپ کر اک جام پلا دونا!!

وہ دن کیسے رنگین تھے جب مدہوشِ عشق جوانی تھی!
جب دَورِ زمیں افسانہ تھا، اور گردشِ چرخ کہانی تھی!
سلمیٰ! پھر پریم کے دھیمے دھیمے سے گیت سنا دونا!
پھر آرزوؤں کی سوئی ہوئی دنیا میں حشر اُٹھا دونا!!

کچھ شغل نہیں، کچھ کام نہیں، اب ہر دم یاد تمہاری ہے!
دن بیت رہے ہیں ساون کے، آنکھوں سے برکھا جاری ہے!
ایسے میں تو اے سلمیٰ! آ کر وہ سندر روپ دکھا دونا!
اک غم کے تلاطم میں جشنِ الفت کی نوید سنا دونا!!

ساغر جلیلی

غزل

نہ سازو مطرب، نہ جام و ساقی، نہ وہ بہار و چمن ہے باقی
نگاہِ شمعِ سحر کے پردے پہ نقشِ انجمن ہے باقی

زمانہ گذرا وہ یاسمن بُو، جدا ہوئی ہمکنار ہو کر
مگر ابھی تک ہمارے پہلو میں نکہتِ یاسمن ہے باقی

بھلا چکی دل سے شامِ غربت، ہر ایک نقشہ ہر ایک صورت
ہماری آنکھوں میں لیکن اب تک فروغِ صبحِ وطن ہے باقی

حباب آسا محیطِ ہستی میں جو ہے، مٹنے کو بن رہا ہے
ہے انقلاب اک نمود ایسی جو زیرِ چرخِ کہن ہے باقی

مٹا دیئے بے ستونِ چرخِ کہن نے شیریں لقا نہ رو دل
مگر محبت کے لب پر اب بھی ترانہ کوہ کن ہے باقی

زمانہ بدلا، مٹی جوانی، نہ وہ محبت، نہ زندگانی۔
بس ایک بھولی سی یاد ہے جو برنگِ داغِ کہن ہے باقی

غمِ زمانہ کی تلخیوں سے ہوئی ہے پامال طبعِ اختر
نہ وہ نشاطِ کہن ہے باقی، نہ وہ مذاقِ سخن ہے باقی

اختر شیرانی

بیماری کی خبر

جب خط میں تم لکھ دیتی ہو کچھ حال اپنی بیماری کا
میں بیٹھ کے تنہائی میں نہ جانے کیا کیا سوچا کرتا ہوں
کچھ اندھے، کوڑھی، دیوانے آنکھوں میں سمانے لگتے ہیں
کچھ قحط زدہ بھوکے پیاسے، جاں دے دے کر خاموشی سے
دنیا میں مفلس ہونے کی تعزیریں پانے لگتے ہیں!
کٹتے ہیں جن کے شام و سحر اک قابلِ نفرت خواری سے
جو مرتے ہیں آسانی سے اور جیتے ہیں دشواری سے
خوں چوس لیا ہے غیروں نے بیمار بھی ہیں نادار بھی ہیں
جینے کی تمنا دل میں ہے اور جینے سے بیزار بھی ہیں

اس درد کی ماری دنیا میں ایسے انساں کیوں بستے ہیں
جو ساری عمر ضرورت کی چیزوں کے لئے بھی ترستے ہیں؟
گو ایسے لوگ بھی ہیں جن کو آسائش ہی آسائش ہے
وہ سب ہے مہیّا ان کے لئے جس چیز کی اُن کو خواہش ہے
جن کے لئے سونا مٹی ہے جن کے لئے موتی سستے ہیں

لیکن مجبور انسانوں کو حق کیوں نہیں حاصل جینے کا؟
طوفان ہی کے قبضے میں کیوں پتوار ہے ان کے سفینے کا؟
کب تک بے بس انسان یونہی تقدیر کا رونا روئے گا
کب تک بے کچھ بھی پائے ہوئے اپنا ہی سب کچھ کھوئے گا؟
کب تک اندھی بھیڑوں کی طرح یہ اپنی راہ نہ پائے گا؟
کب تک یہ موت کے آگے سے پیچھے ہی ہٹتا جائے گا؟

پھر خود ہی دل بول اُٹھتا ہے اب وقت بدلنے والا ہے
ذرّے سورج بن جائیں گے وہ دور بھی آنے والا ہے
امیّد کی اک ننھی سی کرن مایوسی پر چھا جاتی ہے۔
اور اُس کی ضَو میں ایک نئی دُنیا بازو پھیلاتی ہے
سوئی سی رگوں میں چبھتی ہے آنکھوں میں آنسو آتے ہیں
دل بے قابو ہو جاتا ہے جینے کی ہوس بڑھ جاتی ہے
جاں وقفِ تپش ہو جاتی ہے اور عزم بغاوت کرتی ہے
اُس وقت اک سَیل ارادوں کی سینے سے ہو کے گذرتی ہے
دنیا کو خُلد بنانے کا جو دھیان سا دل میں آتا ہے
ایسی خبروں کے سننے سے وہ اور قوی ہو جاتا ہے
جب خط میں تم لکھ دیتی ہو کچھ حال اپنی بیماری کا
میں بیٹھ کے تنہائی میں نہ جانے کیا کیا سوچا کرتا ہوں
ہم جنگ کریں گے فطرت سے فطرت پر قابو پائیں گے
اور فطرت پر قابو پا کر اک روز امر بن جائیں گے۔

(سید) احتشام حسین

اقبال اور اُس کے نقّاد

(ایک ادبی مکالمہ)

افراد:۔ اقبال۔ ماہرِ تعلیم۔ علامہ۔ پروفیسر۔ طالب علم۔

وقت:۔ آج کل کا زمانہ۔

(اقبال اپنے کچھ اشعار گنگنا رہے ہیں)

خرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ — سکھائی عشق نے مجھ کو حدیثِ رندانہ

نہ بادہ ہے نہ صراحی نہ دورِ پیمانہ — فقط نگاہ سے رنگیں ہے بزمِ جانانہ

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ — کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ مے خانہ

کلی کو دیکھ کہ ہے تشنۂ نسیمِ سحر — اسی میں ہے مرے دل کا تمام افسانہ

مقامِ عقل سے آساں گذر گیا اقبال — مقامِ شوق میں کھو یا گیا وہ فرزانہ

ماہرِ تعلیم:۔ آخری شعر آپ نے بہت خوب کہا۔

مقامِ عقل سے آساں گذر گیا اقبال — مقامِ شوق میں کھو یا گیا وہ فرزانہ

آپ کی شاعری کا مقصد اس شعر سے خوب واضح ہو جاتا ہے۔ آپ نے عقل و عشق کا مقام کس خوبی سے سمجھایا ہے۔

علامہ:۔ آج کل فلسفے کا زمانہ ہے۔ ہر چیز اور ہر شخص کا فلسفہ نکالا جاتا ہے حتیٰ کہ اقبال کا شیطان، اقبال کا انسان، ان سب کا فلسفہ نکالا گیا ہے۔ اور ان ماہرِ تعلیم نے تو غضب ہی کر دیا۔ اقبال کے کلام سے تعلیم کا ایک فلسفہ اخذ کر کے پوری ایک کتاب لکھ ڈالی۔ حیران ہوں یہ فلسفے اقبال کے ہیں یا ان حضرات کے۔ دیکھئے پروفیسر صاحب بھی تشریف لے آئے ہیں۔ انہوں نے اقبال کے شیطان کا فلسفہ مرتب کیا ہے۔

پروفیسر:۔ علامہ۔ اس میں آخر کیا مضائقہ ہے کہ اقبال کے کلام سے چند فلسفے مرتب کر لئے جائیں۔ انہوں نے سوائے فلسفۂ خودی کے اور کسی فلسفہ کا گو صریح اظہار نہیں کیا لیکن ان کے کلام میں بعض دوسرے فلسفوں کے متعلق اشارے ملتے ہیں۔ اگر ماہرِ تعلیم نے اور میں نے ایک نیا فلسفہ اقبال کے کلام سے مرتب کر لیا تو کیا غضب ہوا؟ بہتر ہوگا اگر اقبال خود اس مسئلے پر روشنی ڈالیں۔ وہ یہاں موجود ہیں اور اس بات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔

اقبال:۔ معاف فرمائیے۔ آپ حضرات میرے گنگنانے میں خلل انداز ہوئے۔ یہ سلسلہ تو خیر اب منقطع ہو گیا لیکن آپ کی بحث بہت دلچسپ ہے۔ میں اپنا اظہارِ خیال سب سے آخر میں کروں گا۔

طالب علم:۔ دنیا کہتی ہے کہ اقبال ایک فلسفی شاعر ہے۔ فلسفہ اور شاعری تو متضاد چیزیں ہیں۔ بھلا یہ دونوں ایک جگہ کیسے جمع ہو سکتی ہیں۔

پروفیسر:۔ آپ غلط سمجھے۔ اقبال کا کلام تو آبِ حیات ہے جس سے ہر شخص اپنی استعداد کے مطابق زندگی حاصل کرتا ہے۔ وہ تو امرت ہے جس سے روح کو بالیدگی اور دل کو توانائی ملتی ہے۔ اُن کا کلام فلسفیانہ اس نقطۂ نظر سے ہے کہ وہ زندگی کا ایک مکمل تصور پیش کرتا ہے۔ وہ پڑھنے والے کو الفاظ کی بھول بھلیاں یا تخیل کی بلند پروازی میں نہیں چھوڑ جاتا بلکہ وہ اُسے زندگی کے حقائق سمجھاتا ہے۔ اقبال کو ہم فلسفی شاعر اس نقطۂ نظر سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ ہمارے سامنے زندگی کے متعلق چند نظریئے پیش کرتے ہیں اور ان کا ایک مخصوص پیغام ہے

طالب علم:۔ ان کے نظریئے کیا ہیں۔

پروفیسر:۔ ہر بڑے شاعر کی طرح اقبال بھی اپنے زمانے کا ترجمان ہے۔ حالی نے قوم کا مرثیہ پڑھا، وہ وقت مرثیہ خوانی ہی کا تھا۔ ظرافت و طنز نے اکبر کو نقیب اور نقاب دونوں کا کام دیا۔ وہ اس پردے میں سیاست و تہذیب پر بڑی بڑی چوٹیں کر گئے۔ یہ بھی ان کے زمانے کا تقاضا تھا۔ اقبال نے عمل اور جد و جہد کی تعلیم دی۔ انہوں نے "دوش" کے "آئینے" میں "فردا" کو دیکھ لیا۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ حالی ماضی کے شاعر ہیں، اکبر حال کے اور اقبال مستقبل کے۔ خود ان کا کلام اس کی ترجمانی کرتا ہے۔ حالی کہتے ہیں:

ہیں یہ باتیں بھول جانے کی مگر کیونکر کوئی
بھول جائے صبح ہوتے ہی وہ سب شب کا سماں

بزم کو برہم ہوئے مدت نہیں گذری بہت
اٹھ رہا ہے گل سے شمع بزم کے اب تک دھواں

اکبر کا خیال ہے۔

نظم اکبر کو سمجھ لو یادگارِ انقلاب یہ اسے معلوم ہے ٹلتی نہیں آئی ہوئی

اور اقبال فرماتے ہیں:۔

"من صدائے شاعر فردا ستم" یا
"دیکھتا ہوں دوش کے آئینے میں فردا کو میں"

طالب علم:۔ اچھا، پروفیسر صاحب۔ یہ تو بتلائیے ان تینوں کے مخصوص پیغامات کیا ہیں۔

پروفیسر:۔ مختصر طور پر یوں سمجھ لیجئے کہ حالی کا پیغام تھا "چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی" اکبر قدیم چیزوں کی طرف لوٹنے کی تلقین کرتے تھے اور اقبال ماضی و حال کے امتزاج سے ایک نئی چیز اسلامی حقائق کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔ ہمارے علامہ نے تو اقبال کے علم الکلام پر ایک بسیط مضمون بھی لکھا ہے۔

علامہ:۔ جی ہاں مضمون تو میں نے لکھا ہے لیکن میں کوئی فلسفہ مرتب نہ کر سکا۔ ماہر تعلیم کو دیکھو، پہلے تعلیم کے متعلق ایک فلسفہ مرتب کیا اور پھر اس پر ایک نئی کتاب انگریزی میں لکھ ڈالی۔ تعریف یہ ہے کہ اپنے دلائل کے ثبوت میں خود اقبال کے اشعار پیش کرتے ہیں۔ فرمائیے حضرت دراصل آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟

ماہر تعلیم:۔ اس سے تو غالباً کسی کو انکار نہ ہوگا کہ اقبال کی شاعری کا نچوڑ ان کا فلسفۂ خودی ہے۔ ان کے اور چیزوں کے متعلق مختلف نظریے ہیں لیکن وہ سب اِسی محور کے گرد چکر لگاتے ہیں۔ وہ فرد کی صلاحیتوں کو ابھارنا چاہتے ہیں۔ وہ اسے جد و جہد اور حرکت کی تعلیم دیتے ہیں۔ وہ اسے زندگی سے نفرت نہیں بلکہ محبت کرنا سکھاتے ہیں۔ لفظ "خودی" ہمارے یہاں عموماً نخوت و غرور کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ خودی سے مراد خودداری نہیں بلکہ خود پسندی لی جاتی ہے۔ لیکن اقبال کے یہاں یہ لفظ ایک مخصوص معنی میں استعمال ہوا ہے۔ وہ اس سے مراد فرد کی پوشیدہ قوتوں کو ابھارنے کی لیتے ہیں۔ خودی کی تکمیل کے لئے تین چیزیں ضروری ہیں یعنی اطاعت، ضبطِ نفس اور نیابت الٰہیہ۔ فرد کی خودی جب جماعت کی خودی میں ضم ہوتی ہے تو اس کا دوسرا نام بے خودی ہو جاتا ہے۔ بے خودی بھی دراصل خودی کی ایک کیفیت ہے اور ایک حد تک مکمل۔ میں نے اس خودی کے تصور کو تعلیم کا ایک اہم جزو قرار دیا ہے اور مثال میں اقبال کے اشعار پیش کئے ہیں کیونکہ میرا خیال ہے

رائی زورِ خودی سے پربت پربت ضعفِ خودی سے رائی

اگر ملک کے بچے اس صحیح تعلیم سے جس کا ایک اہم جزو "خودی" بھی ہے آراستہ ہو کر نکلیں تو میں سمجھتا ہوں کہ اُس کے دن پھر جائیں گے۔ غرض میں نے اپنی کتاب اس نظریے کے ماتحت مرتب کی ہے۔

علامہ:۔ آپ ماہر تعلیم بھی ہیں اور ایک حد تک فلسفی بھی۔ لیکن ان پروفیسر صاحب کو دیکھئے کہ یہ ماہر تعلیم تو خیر ہو سکتے ہیں لیکن فلسفی ہرگز نہیں۔ پھر بھی انہوں نے اقبال اور ابلیس کا فلسفہ مرتب کر ڈالا۔ میں نے ابلیس کے اس نئے تصور کے متعلق اُن کا مضمون پہلی مرتبہ رسالہ "ہندوستان" میں دیکھا۔ واقعی انہوں نے کمال کر دیا۔ خواہ مخواہ بال کی کھال نکال کر ایک نیا فلسفہ مرتب کر لیا۔ کیا آپ اپنے فلسفے کی وضاحت کریں گے۔

پروفیسر:۔ کیا آپ کے نزدیک یہ فلسفے اقبال کے نہیں ہیں! ہم لوگوں نے محض مرعوب کرنے کے لئے گھڑ لئے ہیں! شاید آپ کو نہیں معلوم کہ اقبال کے یہاں شیطان کا ایک مخصوص تصور ملتا ہے۔ وہ اسے محض بدی کی قوت نہیں سمجھتے۔ وہ اس میں جوش و حرکت پاتے ہیں۔ اُن کے نزدیک شیطان ہمیشہ ترقی کی طرف گامزن رہتا ہے۔ لیکن اس کی خودی تعمیری نہیں بلکہ تخریبی ہے۔

وہ صراطِ مستقیم سے بھٹک گیا ہے۔ جمود و سکون شیطان کے لئے بے معنی لفظ ہیں۔ اکثر بڑے شاعروں کے یہاں شیطان کا ایک مخصوص تصور ملتا ہے، کیا آپ کو نہیں معلوم کہ ملٹن کی "فردوس گم شدہ" کا اصل ہیرو آدم نہیں بلکہ شیطان ہے۔ گوئٹے کے "فاوسٹ" میں بھی شیطان کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ غرض شعر و ادب کا شیطان مذہب کے شیطان سے بالکل مختلف ہے۔ اقبال کے یہاں پہلی مرتبہ شیطان کا تصور "پیامِ مشرق" کی ایک نظم میں ملتا ہے۔ اس کے بعد "جاوید نامہ" میں "نالہ ابلیس" کے نام سے فلک مشتری کے آخر میں جو نظم ہے، اُس کے مطالعہ سے یہ نظریہ اور واضح ہو جاتا ہے۔ "بالِ جبریل" میں ہمیں دو نظمیں ابلیس کے متعلق ملتی ہیں یعنی "ابلیس کی عرضداشت" اور "جبریل و ابلیس" آخر الذکر نظم کا شمار اقبال کی بہترین نظموں میں ہوتا ہے۔ "ضربِ کلیم" میں بھی ابلیس کے متعلق دو نظمیں ہیں یعنی "ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام" اور "تقدیر، ابلیس و یزدان"۔ لیکن ابلیس کے متعلق ان کی معرکہ کی نظم "ارمغانِ حجاز" میں ہے اس کا عنوان ہے "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ"۔ یہ نظم بہت رنگین و مرصّع ہے۔ اس میں ابلیس اپنے مختلف مشیروں سے گفتگو کرتا ہے۔ مشیر اپنے شیطانی نظام کے متعلق مختلف خطرے ظاہر کرتے ہیں آخر میں ابلیس اپنا خطرہ ظاہر کرتا ہے وہ کہتا ہے۔

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس اُمّت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو

اس سلسلے میں جمہوریت، الٰہیات، کارل مارکس اور دیگر سیاسی رجحانات کی طرف جو لطیف اشارے کئے گئے ہیں وہ بہت دلچسپ ہیں۔ غرضکہ ہمیں اقبال کے ابلیس میں اور دوسرے شعرا کے ابلیس میں فرق کرنا چاہئے۔

طالب علم: ابلیس کی بحث کو اب ختم کیا جائے تو بہتر ہے۔ میرا خیال ہے کہ اقبال نطشے اور برگسان سے زیادہ متاثر ہوا ہے۔

پروفیسر: رومی سے بھی ـــ رومی کا ایمان اور نطشے کا کفر اقبال کے لئے ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں اقبال رومی کو اپنا پیر و مرشد سمجھتا ہے اور نطشے کے متعلق اس کا خیال ہے کہ اس کا دماغ کافر ہے اور قلب مومن کا۔ نطشے کا فوق البشر اقبال کے یہاں خیر البشر ہو گیا ہے۔ نطشے اور اقبال دونوں خودی کی نشو و نما کے قائل ہیں اور عیسائیت سے بیزار ہیں۔ نطشے خدا کا منکر ہے اور اقبال اس کا قائل، وہ نطشے سے خطاب کرتا ہے۔

اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانہ میں
تو اقبال اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے۔

رومی اور اقبال دونوں اسلامی شاعر اور مفکّر ہیں۔ دونوں ارتقاء کے قائل ہیں۔ دونوں وحدت الوجود کے نظریے کے خلاف ہیں۔ دونوں کے یہاں سکون اور جمود موت کے مترادف ہے دونوں فرد کی خودی کو ابھارنا چاہتے ہیں۔ اقبال رومی سے بہت متاثر ہوا ہے اور ہر جگہ اس کا ذکر بڑے ادب سے کرتا ہے۔ برگسان کا زمان و مکان کا نظریہ بھی اقبال کے لئے اہمیّت رکھتا ہے۔ لیکن صحیح طور پر یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے کہاں تک متأثر ہوئے ہیں اقبال یورپ کے قیام میں برگسان سے فرانس میں ملا اور اس بڈھے فلسفی نے اقبال سے اپنی عقیدت مندی کا اظہار کیا۔ برگسان بذاتِ خود اقبال سے بہت متاثر ہوا ہے۔ اس کے علاوہ اقبال کے تخیّل کی بلند پروازی معلوم کرنے کے لئے ہمیں بعض دوسرے فلسفیوں پر بھی نظر ڈالنا پڑے گی۔

طالب علم: لیکن اُن کا اثر اقبال پر کچھ زیادہ نہیں ہوا۔

پروفیسر: اثر تو کچھ زیادہ نہیں ہوا۔ لیکن اقبال کی نظر ان فلسفیوں کے فلسفہ پر بھی ہے۔ وہ ان کے فلسفوں کی خوبیاں اور خامیاں اچھی طرح سمجھتا ہے۔ ہم اس سلسلے میں کانٹ، ہیگل، شوپنہار وغیرہ کا نام لے سکتے ہیں۔

علّامہ: آپ دونوں حضرات رومی کو چھوڑ کر بقیہ مشرقی مفکّرین کو بالکل نظر انداز کر رہے ہیں۔ کیا آپ کو نہیں معلوم کہ مجدد الف ثانی، محی الدین ابن عربی اور ابن خلدون کے فلسفے بھی اقبال کی نظر میں تھے۔ ہم مغربی فلسفہ کے جوش میں اُن کے نام بالکل بھول جاتے ہیں۔

پروفیسر: آپ نے درست فرمایا۔ "ضربِ کلیم" میں تقدیر پر جو نظم ہے۔ وہ محی الدین ابن عربی سے ماخوذ ہے۔ ان مفکّرین کے علاوہ کچھ شاعروں کا بھی اقبال پر اثر پڑا ہے۔

طالب علم: کن شاعروں کا اقبال پر اثر پڑا ہے؟

پروفیسر: یہ اثر دو طرح کا ہے۔ ایک اسلوبِ بیان پر اور دوسرا تخیّل پر۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ داغ اور غالب کا اثر ایک حد تک اقبال

کے اسلوب پر پڑا اور گوئٹے، رومی، غنی کاشمیری کا اُن کے تخیل پر۔ لیکن نظم میں اسلوب اور تخیل کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرنا مشکل ہے۔

طالب علم:۔ کیا اقبال حالی اور اکبر سے متأثر نہیں ہوئے ہیں۔

پروفیسر:۔ حالی و اکبر سے متأثر ضرور ہوئے ہیں لیکن یہ امر دائمی نہ تھا۔ ڈاکٹر عبداللطیف کا خیال ہے کہ اقبال نے "شکوہ" اور "جوابِ شکوہ" حالی کے مسدس سے متأثر ہو کر لکھے ہیں۔ "بانگِ درا" کے آخر میں جو ظریفانہ کلام ہے کیا وہ اکبر کے زعفران زار کی خوشہ چینی نہیں؟ لیکن یہ اثرات پیدا ہوئے اور ختم ہو گئے۔ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ داغ اور غالب کا اثر بھی "بانگ درا" کے بعد ختم ہو گیا غنی کاشمیری بھی کچھ زیادہ دور تک ساتھ نہ دے سکے۔ گوئٹے "پیامِ مشرق" ہی تک اقبال کے ہم سفر رہے۔ البتہ رومی وہ شاعر ہے جس نے اقبال کا کبھی ساتھ نہیں چھوڑا۔ رومی کے متعلق جو اشعار "جاویدنامہ" اور "بالِ جبریل" میں ہیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

علامہ:۔ رومی اور نطشے کا اثر اقبال پر نمایاں ہے۔ لیکن میرے خیال میں رومی کا اثر اقبال پر "اسرارِ خودی" کی اشاعت کے وقت سے شروع ہؤا ہے اور **نطشے کا اثر تو یقیناً** اُن کے قیامِ ولایت کی پیداوار ہے۔

پروفیسر:۔ مناسب ہوگا اگر ہم اقبال کے ذہنی ارتقا پر ایک اجمالی نظر ڈال کر اُن کی شاعری کے ادوار مقرر کر لیں۔ تمام مفکرین اور شعرا کے اثرات کا زمانہ خود بخود واضح ہو جائے گا۔ لیکن یہ مسئلہ ذرا پیچیدہ ہے۔ بہت ممکن ہے یہاں ہم میں سے ہر ایک اقبال کی شاعری کے مختلف دور قائم کرے۔ ان ماہرِ تعلیم نے اقبال کی شاعری کا عمیق مطالعہ کیا ہے میں ادوار کے متعلق ان کی رائے معلوم کرنا چاہتا ہوں۔

ماہرِ تعلیم:۔ جہاں تک میں نے اس مسئلے پر غور کیا ہے میرا خیال ہے کہ اقبال کی شاعری کو پانچ دوروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور ابتدا سے ۱۹۰۵ء تک جیسا کہ "بانگ درا" میں ہے۔ دوسرا دور ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک۔ یہ اُن کے قیامِ ولایت کا زمانہ ہے۔ تیسرا دور ۱۹۰۸ء سے ۱۹۲۳ء تک سمجھنا چاہئے۔ اُن کی مشہور نظمیں شکوہ، جوابِ شکوہ، شمع و شاعر، والدہ مرحومہ کی یاد میں، خضرِ راہ، طلوعِ اسلام اور فارسی مثنویاں اسرار و رموز اسی دور کی پیداوار ہیں۔ چوتھا دور ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۵ء تک ہے۔ اس دور کا بیشتر کلام فارسی میں ہے اور اردو کے مجموعۂ کلام یعنی "بالِ جبریل" میں بھی فارسی نظموں اور غزلوں کا چربہ اتارا گیا ہے۔ اقبال کا خیال دوسرے مفکرین کے متعلق اور مغربی سیاست کے متعلق اُن کی رائے ہمیں پہلی مرتبہ واضح طور پر اسی دور کی نظموں سے معلوم ہوتی ہے۔ پیامِ مشرق، زبورِ عجم، جاویدنامہ، مسافر اور بالِ جبریل اس دور کی اہم تصانیف ہیں۔ شیطان کا نظریہ بھی پہلی مرتبہ اِسی دور میں ملتا ہے۔ پانچواں دور ۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۸ء تک ہے۔ اس میں ہمیں اقبال کے تھکے ہوئے دماغ کے چند نقوش ملتے ہیں۔ وہ ایک بپھرے ہوئے شیر کی طرح جو ایک مرتبہ گولی کھا چکا ہو اپنے دشمن یعنی مغربی تہذیب و معاشرت پر حملہ کرتا ہے اور اس کی دھجیاں اُڑاتا ہے۔ ضربِ کلیم کی نظموں میں وہ ہمیں بنی اسرائیل کے کسی پیغمبر کی طرح دکھائی دیتا ہے جو اپنی گمراہ قوم کو نصیحت کر رہا ہے۔ اس دور کی تصانیف ضربِ کلیم، پس چہ باید کرد اور ارمغانِ حجاز ہیں۔

علامہ:۔ مجھے اس تقسیم سے اتفاق نہیں۔

پروفیسر:۔ میں نے اسی لئے کہا تھا کہ ہم میں سے ہر ایک اقبال کی شاعری کے مختلف دور قائم کرے گا۔ اچھا آپ کی رائے میں کتنے دور ہونا چاہئیں۔

علامہ:۔ کیا ضرورت ہے کہ "بانگ درا" کے تینوں دوروں کو برقرار رکھا جائے۔ ہم ابتدا سے ۱۹۰۸ء تک پہلا دور قائم کر سکتے ہیں۔ اس دور کی ممتاز خصوصیات وطنیت اور منظر نگاری ہیں۔ "نیا شوالہ" "تصویرِ درد" اور قیامِ ولایت کی تمام نظمیں اس کی ترجمانی کرتی ہیں۔ دوسرا دور ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۲ء تک قائم کیا جا سکتا ہے۔ اس دور کی مشہور نظمیں شکوہ، جوابِ شکوہ اور شمع و شاعر ہیں۔ اُن کے تصورِ خودی کا آغاز "شمع و شاعر" سے جو ۱۹۱۲ء کی تصنیف ہے ہو جاتا ہے۔ تیسرا دور میرے خیال میں ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۵ء تک قائم ہونا چاہئے۔ اس دور کی اہم خصوصیت اُن کا تصورِ خودی ہے۔ وہ محدود وطنیت کے بجائے ایک عالمگیر اسلامی تصور کے قائل ہو جاتے ہیں۔ ان کی مشہور مثنویاں اسرار و رموز اِس دور کی پیداوار ہیں۔ چوتھا دور ۱۹۱۵ء سے ۱۹۳۵ء تک

ہونا چاہئے۔ اس دور میں ہمیں اقبال کی بعض اہم تصانیف ملتی ہیں مثلاً خضرِ راہ، طلوعِ اسلام، پیامِ مشرق، زبورِ عجم، جاوید نامہ، مسافر اور بالِ جبریل۔ یہ اقبال کی شاعری کے شباب کا زمانہ ہے۔ اُن کے بعض اہم نظریے ہمیں اسی دور میں ملتے ہیں۔ ان کا شاہکار "جاوید نامہ" بھی اسی دور کی پیداوار ہے۔ اس دور میں گیارہ سال کے بعد اقبال کا دوسرا اردو مجموعۂ کلام بالِ جبریل منصّۂ شہود پر جلوہ گر ہوا۔ اردو داں حضرات کو پیامِ مشرق اور زبورِ عجم کا لطف بالِ جبریل کی نظموں میں آگیا۔ پانچواں دور ۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۶ء تک ہونا چاہئے۔ دراصل یہ ضربِ کلیم اور فارسی مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق کا دور ہے۔ مغربی تہذیب کے خلاف اعلانِ جنگ کیا گیا ہے۔ چنانچہ "ضربِ کلیم" کے سرورق پر یہ اشعار درج ہیں۔ ؎

نہیں مقام کی خوگر طبیعتِ آزاد ہوائے سیر مثالِ نسیم پیدا کر
ہزار چشمہ ترے سنگِ راہ سے پھوٹے خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر

"پس چہ باید کرد" میں بھی مغربی تہذیب کی خامیاں اُجاگر کی گئی ہیں۔ چھٹا اور آخری دور ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۸ء تک ہے۔ اس دور کو صرف "ارمغانِ حجاز" کے لئے قائم کرنا پڑا۔ یہ کتاب اقبال کی آخری یادگار ہے اور اپنے رنگ میں بھی اُن کی دوسری تصانیف سے مختلف ہے۔ وہ اسے ساتھ لے کر حج بیت اللہ کو جانا چاہتے تھے لیکن بیماری نے اس کی اجازت نہیں دی۔ کتاب کا بیشتر حصّہ فارسی میں ہے اور آخر میں سو صفحات کے قریب متفرق اردو نظمیں ہیں۔ فارسی میں رباعی کا پیرایۂ بیان اختیار کیا گیا ہے۔ اردو کے حصّے میں اُن کی بعض نظمیں اردو داں طبقہ کو ہمیشہ یاد رہیں گی مثلاً ابلیس کی مجلس شوریٰ، مسعود مرحوم، ملّازادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض، سر اکبر حیدری کے نام، حسین احمد وغیرہ وغیرہ۔

پروفیسر: میرے خیال میں آپ نے بہت زیادہ دور قائم کر دیئے۔ ہم اقبال کی شاعری کو صرف تین دوروں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ کیا مضائقہ ہے اگر ایک دور میں متعدد خصوصیّات موجود ہیں۔ ان کے ذہنی ارتقا اور اسلوبِ بیان کے لحاظ سے یہ دور مناسب معلوم ہوتے ہیں۔ میرے خیال میں پہلا دور ابتدا سے ۱۹۱۲ء تک ہونا چاہئے۔ اس دور کی خصوصیّات وطنیّت، منظر نگاری اور لفظ تراشی ہیں۔ وطنیّت پر ہمالہ، کنارِ راوی، نیا شوالہ، ترانۂ ہندی، ہندوستانی بچّوں کا قومی گیت اور تصویرِ درد ان کی بہترین نظمیں ہیں۔ منظر نگاری اور لفظ تراشی کے نمونے اس دور کی تقریباً ہر ایک نظم میں کچھ نہ کچھ مل جاتے ہیں۔ دوسرا دور ۱۹۱۲ء سے ۱۹۳۳ء تک ہے۔ اس دور کی ممتاز خصوصیّات اُن کا تصوّرِ خودی اور ان کا مستقل طور پر فارسی میں اشعار لکھنا ہے۔ ان کی تمام اہم فارسی تصانیف اس دور کی پیداوار ہیں۔ ۱۹۱۲ء سے انہوں نے مثنوی "اسرارِ خودی" لکھنا شروع کر دی تھی۔ ۱۹۱۵ء میں یہ مثنوی پہلی مرتبہ شائع ہوئی۔ "رموزِ بے خودی" ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئی۔ پیامِ مشرق ۱۹۲۳ء میں، زبورِ عجم ۱۹۲۶ء یا ۱۹۲۷ء میں، جاوید نامہ ۱۹۳۲ء میں اور مسافر ۱۹۳۳ء کی پیداوار ہے۔ تیسرا دور ۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۹ء تک سمجھنا چاہئے۔ اس دور میں اقبال نے "بانگِ درا" کی اشاعت کے گیارہ سال بعد پھر اردو کی طرف رُخ کیا۔ بالِ جبریل ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی۔ ضربِ کلیم ۱۹۳۶ء میں اردو داں طبقہ کے ہاتھوں میں پہنچی۔ لیکن فارسی کلام کا سلسلہ اب بھی منقطع نہیں ہوا تھا۔ مثنوی "پس چہ باید کرد" اور "ارمغانِ حجاز" اقبال کی آخری فارسی تصانیف ہیں۔ شاعر کہیں مغربی تہذیب کی دھجیاں اُڑاتا ہے۔ اور کہیں ابلیس کی مجلس شوریٰ منعقد کر کے مغربی سیاست پر رائے زنی کرتا ہے۔ بالِ جبریل کی غزلیات اس کی شاعری کا نچوڑ ہیں۔ ارمغانِ حجاز میں اگر ایک طرف وہ مسعود مرحوم کا مرثیہ لکھتا ہے تو دوسری طرف کشمیر اُس کے اشعار پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ غرض یہ دور اپنی گوناگوں رنگینیوں کی وجہ سے آپ اپنی نظیر ہے۔ میرے خیال میں اقبال کے ذہنی ارتقا کی یہ تینوں دور اچھی طرح ترجمانی کرتے ہیں۔

طالب علم: جہاں تک اقبال کے ذہنی ارتقا اور ان کے کلام کے ادوار کا تعلق تھا میرے خیال میں سیر حاصل بحث ہو چکی۔ اب اس سلسلے میں کچھ کہنے کی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن مجھے ابھی اقبال کے متعلق چند اور باتیں کرنا ہیں۔

ماہرِ تعلیم: فرمائیے، لیکن بحث طویل ہوتی جاتی ہے۔

علّامہ: اعتراضات بہت سے ہو سکتے ہیں۔ آپ صرف اہم اعتراضات

بیان کیجئے۔
پروفیسر:۔ جوابات نہایت مختصر دیئے جائیں گے۔
طالب علم:۔ اقبال ایک اسلامی فاشسٹ ہے۔
علامہ: یہ بالکل غلط ہے، وہ دنیا کے تمام امراض کا علاج اسلام میں پاتے ہیں۔ وہ اسلامی جمہوریت کے قائل ہیں۔
طالب علم:۔ وطنیت کے دشمن ہیں۔
ماہر تعلیم:۔ محدود وطنیت کبھی اچھے نتائج نہیں پیدا کرسکتی۔ اقبال جغرافیائی حدود، وطن، رنگ اور نسل کا قائل نہیں لیکن اُسے اپنے وطن سے محبت ضرور ہے۔ بانگِ درا کی نظموں سے قطع نظر، ضربِ کلیم میں "شعاعِ اُمید" کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے وہ وطن سے اُس کی محبت کو اچھی طرح ظاہر کرتی ہے۔
طالب علم:۔ ان کے بعض اشعار میں زبان کی غلطیاں ملتی ہیں۔ چند نئے الفاظ انہوں نے وضع کرلئے ہیں اکثر جگہہ محاورات کا خیال نہیں رکھا اور بعض جگہہ کلام میں رنگینی بالکل مفقود ہے۔ اُن کے کلام میں بعض جگہہ تضاد پایا جاتا ہے۔
پروفیسر:۔ ہر بڑے شاعر کے یہاں افکار زبان پر غالب آجاتے ہیں۔ وہ زبان کا محکوم نہیں ہوتا بلکہ زبان اس کی محکوم ہوتی ہے۔ نئے الفاظ وضع کرنے سے زبان کو وسعت ہوتی ہے۔ محاورہ اور بندش پر اعتراض کرنے کا زمانہ اب ختم ہوگیا۔ اقبال کے کلام میں رنگینی ملتی ہے۔ لیکن یہ رنگینی نگاہ پر اثر کرنے کے بجائے دل اور دماغ پر اثر کرتی ہے۔ اگر ان کے کلام کا عمیق مطالعہ کیا جائے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ محض سطحی طور پر دیکھنے والوں کو تضاد ملتا ہے ورنہ دراصل تضاد نہیں۔ بالِ جبریل میں وہ مسولینی کی شخصیت کی تعریف کرتے ہیں۔ لیکن ضربِ کلیم میں جبشہ کے فتح کرنے پر وہ اُسے اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ ایک جگہہ وہ مسولینی کو بحیثیت انسان کے پیش کرتے ہیں اور دوسری جگہہ بحیثیت فاتح کے۔ ہمیں ان دونوں باتوں میں امتیاز کرنا چاہئے۔
طالب علم:۔ میرے ابھی چند اعتراض اور باقی ہیں لیکن بہتر ہے کہ اقبال اب کچھ فرمائیں۔
اقبال:۔ میں نے آپ حضرات کی گفتگو غور سے سنی۔ مجھے حیرت ہے کہ آپ نے میرے کلام کا کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑا۔ واقعہ یہ ہے کہ اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے۔ لیکن اس میں کچھ شک نہیں جیسا کہ آپ حضرات نے فرمایا کہ میرا خاص نظریہ خودی کا تصور ہے۔ میں نے اپنے اس نظریے کی مختلف جگہہ پر وضاحت کی ہے آپ اُسے ملحوظ رکھئے۔ اسرارِ خودی کے پہلے ایڈیشن کا دیباچہ دیکھئے۔ پیامِ مشرق کا دیباچہ بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ خودی کا تصور مجھے اس درجہ عزیز تھا کہ میں نے بیشتر اپنے اشعار میں اُس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ اگر فرد اپنی خودی پہچان لے تو وہ کل کائنات کو تسخیر کرسکتا ہے۔ لیکن یکجہتی و اتفاق بھی اُس کے ساتھ اہم ہے۔ اور فرد قطرے کی طرح دریا کے باہر کچھ نہیں کرسکتا۔ اس کا قوم میں ضم ہوجانا نہایت ضروری ہے۔ اس طرح بے خودی بھی خودی کی ایک شکل ہوجاتی ہے مجھ پر بہت سے اعتراضات کئے گئے ہیں بعض کا جواب آپ حضرات نے دے دیا ہے۔ میں اس سلسلے میں صرف اس قدر کہوں گا کہ اگر لوگ میرے خطبات اور ان خطوط کو جو میں نے بعض اصحاب کو ان کے سوالات کے جواب میں وقتاً فوقتاً لکھے تھے اور جو اب مختلف رسالوں میں شائع ہوگئے ہیں، نظر میں رکھیں تو پھر یہ اعتراضات پیدا نہیں ہوتے۔ میں نے اس خوابیدہ قوم کو اپنے اشعار سے جگانے کی کوشش کی اور تھوڑا بہت کامیاب بھی ہوا۔ لیکن ابھی اُس نے اپنی خودی کو نہیں پہچانا ہے اور جدوجہد اور حرکت میں زندگی کے راز کا پوشیدہ ہونا نہیں سمجھا ہے۔ جس وقت اُس نے یہ سمجھ لیا میرا کام پورا ہوجائے گا۔ آپ حضرات نے جو تعلیم اور شیطان کے متعلق فلسفے وضع کئے ہیں گو میں نے صریحاً اس کا اظہار کہیں نہیں کیا تھا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان چیزوں کے متعلق میرا نظریہ تقریباً یہی تھا جو آپ پیش کرتے ہیں۔ آپ نے اچھا کیا کہ ان کو واضح طور پر بیان کردیا۔ دنیا ہر چیز کو دیکھتی ہے، سوچتی سمجھتی ہے، اور تنقید کے آئینے کے سامنے اس کے اصل خدوخال دیکھنے کے لئے مضطرب رہتی ہے۔ لیکن ایک کامیاب موجد یا شاعر اکثر اپنا کام کرجاتا ہے۔

(ریڈیو)

مبشر علی صدیقی

چار نظمیں

شگفتِ گل

دخترِ صبحِ بہار ہو کے خندے سے ہمکنار
قُربِ غنچہ سے اُٹھی کیا خبر کیا کہہ گئی ؟
غنچہ کچھ کہنے کو تھا
مُسکرایا، کھِل پڑا !

شُکر

جب کھینچ کے آہِ سرد، کہتا ہے کوئی بندہ
"جس حال میں بھی رکھے، سو شکر ہے اللہ کا !"
میں سوچنے لگتا ہوں
یہ شکر کیا اس نے یا طعنہ دیا اس نے
رزّاقِ دو عالم کو؟

تجربۂ ناگوار

مجبور کیا میں نے! اک بوسہ لیا میں نے!
ایسی مرے ہونٹوں کو محسوس ہوئی خنکی
گویا مری عذرا تھی
مورت کوئی پتھّر کی !!

واردات

کیا کہوں تم سے میں اپنی واردات !
بارہا ایسا ہوا،
میں نے کی ہنسنے کی کوشش اس قدر
چیخ کر میں رو پڑا !!

سعید احمد اعجاز

انتشار

بادِ بہاری ہو گئی رخصت　　اب ہے خزاں کا دورِ حکومت
موت کا ہر سُو ہے سناٹا　　اک بے لذت راگ ہے دنیا
آؤ میرے محبوب آؤ　　میرے دل کے مطلوب آؤ
ہم تم ویراں باغ میں چل کر
سوگ کریں گے اس کا دن بھر
آؤ میری رانی! آؤ　　عمر ہے تھوڑی جلدی آؤ
آؤ کہ ہم تم اپنے　　جامِ حیاتِ کیف آور کے
عشق و الفت کی صہبا سے
پُر کر لیں جتنا جی چاہے
آؤ کہ مل کر اب ہم اور تم　　راہِ طلب میں ہو جائیں گم
دن جا کر جب رات آتی ہے　　اور جب ظلمت چھا جاتی ہے
تب سطحِ بامِ گردوں پر　　آتا ہے مہتابِ منوّر
آؤ میرے دوست کہ باہم
آج کریں حل راز یہ تم — ہم
مہرِ عالمتاب کی کرنیں　　اور مہ کی رنگین شعاعیں
آپس میں کیوں ملتی نہیں ہیں　　وہ جو کہیں ہیں تو یہ کہیں ہیں
آؤ میرے دوست کہ باہم　　آج کریں حل راز یہ تم — ہم
لیکن اے محبوب تمہارے
عارض پر یہ آنسو کیسے؟

علی احمد بی اے

کھلونے

تاریکی

شام کے دھندلکے میں کسی نے کسی کے شانے کو چھوا تو کوئی تڑپ کر مڑا۔

"تم!"

"جی!۔۔۔۔ خاکسار!"

"تم یہاں کیوں آئے؟"

"آپ اس قدر پریشان کیوں ہوگئیں! چلئے۔ بنچ پر تشریف رکھئے باتیں اطمینان سے ہوسکتی ہیں"۔

"میرے سوال کا جواب دو"۔

"کیا میرے آنے سے آپ کے کسی پروگرام میں خلل پیدا ہونے کا اندیشہ ہے؟"

"میں پوچھ رہی ہوں تم یہاں کیوں آئے؟"

"کیا مجھے اب اتنا بھی حق حاصل نہیں رہا؟"

"کیسا حق؟"

شاید آپ بھول چکی ہیں اور گواہ چاہتی ہیں۔ تو لیجئے۔ ذرا ان خاموش درختوں ہی سے پوچھئے۔ جنہوں نے آپ کو بہ نفس نفیس میری معیت میں اکثر یہاں دیکھا ہے۔ اس گھانس ہی سے دریافت کیجئے جس کے اوپر آپ کے اور میرے پاؤں کئی بار گذر چکے ہیں، جب آپ اپنے حسین جسم کی رعنائیوں کو مجھ ناچیز کا سہارا دے کر چلا کرتی تھیں! یہ بھی نہیں تو اس آسمان سے ہی پوچھئے جس کے نیچے آپ نے صدہا بار اسی بنچ پہ بیٹھ کر اپنی گداز باہوں کو میری گردن میں ڈال کر میٹھی میٹھی سرگوشیاں کی ہیں اور یہ تاریکی جو لحظہ بہ لحظہ گہری ہوتی جا رہی ہے یہ بھی تو شاہد ہے! اور سب سے بڑھ کر یہی وقت جس کے سینکڑوں لمحات نے آپ کو اور مجھے ......"

"یہ سب فضول باتیں ہیں اور بالکل مہمل۔ کیونکہ ان کا اس ماضی سے تعلق ہے۔ جب میں نیک و بد میں تمیز کرنے کے قابل نہ تھی۔ میں تو صرف یہ پوچھتی ہوں کہ تم آج اس وقت یہاں کیوں آئے ہو جب کہ میں نے تمہیں کئی بار ۔۔۔۔ کئی بار ۔۔۔۔"

"کئی بار کیا، ہزار بار ہزار طریقوں سے ظاہر کیا ہے کہ آپ کو میری حقیر ہستی سے کوئی دلچسپی نہیں رہی! یہی کہنا چاہتی ہیں نا آپ؟ مگر ذرا سوچئے تو سہی۔ کیا شمع کی بھسم کر دینے والی آنچ سے ڈر کر پروانے شمع کے پاس جانا چھوڑ دیتے ہیں؟"

"پھر وہی بے معنی الفاظ!"

"بجا فرمایا آپ نے۔ شمع کے نزدیک پروانے کی تڑپ اور بے قراری بے معنی ہی ہوا کرتی ہے۔ اتنی بے معنی کہ وہ بے چارہ ہیں جلا کر راکھ کر دیا جاتا ہے۔"

"کیوں مجھے ناحق حیران کرتے ہو؟ آخر تم چاہتے کیا ہو؟"

"اُف کتنی بے خبری! مگر میں گلہ کیوں کروں۔ شکر نہ کروں کہ آخر آپ نے یہ پوچھنا گوارا کر ہی لیا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ آپ کے دہنِ شیریں سخن سے یہی الفاظ سننے کے لئے تو میں بے تاب تھا۔ مگر آپ نے اب بھی ایک چیز سے مجھے محروم ہی رکھا۔"

"کیا مطلب؟"

"کیا خاکسار کا نام آپ کے لبوں پر ایک بار بھی نہ آئے گا؟! ایک وہ زمانہ تھا جب آپ ہی کے قول کے مطابق یہ نام آپ کے ہر سانس کے ساتھ وابستہ تھا۔!"

خاموشی۔

"تو میں یہ سمجھ لوں کہ اس کی حسرت ہی رہے گی؟!"

خاموشی۔

"کم از کم مجھے اتنی تو اجازت مل جائے کہ میں آپ کا محبوب نام اپنے لبوں تک لے آؤں!"

"فضول باتوں میں وقت ضائع کرنے سے کیا حاصل! جو کچھ کہنا ہو کہہ ڈالو تاکہ قصّہ پاک ہو۔"

"کتنی بے رحم ہو زاہدہ! بالکل ویسے ہی جیسے پہلے تھیں ایک رتّی بھر بھی تو نہیں بدلیں۔ کیا اُس بے چارے پر بھی یوں ہی ستم ڈھایا کرتی ہو؟"

"کس پر" (غصّہ سے تڑپ کر)

"آپ جو میں مطلب کی بات کرنے لگا ہوں تو آپ بالکل انجان بن رہی ہیں آپ ہی بتائیں اس صورت میں کیا خاک عرض کروں!"

"میرے سر میں سخت درد ہو رہا ہے اور میں یہاں کھڑے ہو کر لغویات نہیں سن سکتی۔"

"درد سر تو صرف ناولوں کی ہیروئنز کو ہوا کرتا ہے۔ آپ کیوں خواہ مخواہ اپنے آپ کو غلط فہمی میں مبتلا کرتی ہیں؟ باقی رہیں میری لغویات، تو یہ ممکن ہے کہ میرا قیاس یا اندازہ غلط ہو اور آپ ستم ڈھانے کی بجائے اُس پر نظرِ کرم رکھتی ہوں مگر سچ پوچھیں تو مجھے یہ کھیل پسند نہیں۔ کیا آپ اپنا دل بہلانے کے لئے کوئی اور کھلونا تلاش نہ کر سکیں گی؟"

کھلو ——— نا!

"زاہدہ! کیسے بنتی ہو! میں ہوش میں ہوں۔ کوئی ایسی بات نہیں کہہ رہا جو تم نہ سمجھ سکو۔ غور سے سن لو۔ شاہد سے مجھے ایک خاص قسم کا لگاؤ ہے۔ وہ ابھی تک دنیوی آلائشوں سے پاک ہے اور اپنی خوبیوں سے بے بہرہ۔ اسی لئے گھمنڈ کا اس میں شائبہ بھی نہیں۔ میں جانتا ہوں۔ اور شاید تم بھی ——— کہ اس میں وہ تمام جوہر موجود ہیں جو اس کی آئندہ زندگی کو شاندار بنا سکتے ہیں، صرف ایک شرط ہے۔ وہ یہ کہ اس کی زندگی کا نازک پودا جو آہستہ آہستہ بڑھ رہا ہے ابھی سے نہ کچلا جائے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ تم اپنا جادو اس پر نہ ڈالو۔ جہاں تک میں اندازہ کر سکا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اُس کا بھی کچھ زیادہ بگڑا نہیں اگر تم اس کا خیال ترک کر دو تو۔ . . . ."

"بس۔ بس۔ تم حد سے بڑھتے جاتے ہو۔ بات کرنے کا موقع دیا تو اپنے آپ کو بھول گئے اور میرے ہی سامنے کھڑے ہو کر اتنی جرأت کہ میرے نام، بلکہ میرے خاندان کے نام پر بٹہ لگانے لگے۔ اتنی جرأت کہ مجھے ایک عام . . . !"

"توبہ۔ توبہ۔ یہ آپ کیا فرما رہی ہیں؟ قطع کلامی معاف۔ بھلا میں اور ایسی بے ادبی ہمسری! کیا مجال کہ آپ کی شان میں ایسے گستاخانہ خیال کو بھی اپنے دماغ میں جگہ دوں اور پھر آپ کے در دولت پر کھڑے ہو کر! دیکھئے میں اس کمپاؤنڈ سے آپ کے عالی شان بنگلے کے دروازوں اور کھڑکیوں کے بیش قیمت اور رنگین پردے بخوبی دیکھ سکتا ہوں۔ وہ کونے والا کمرہ جس کی کھڑکیوں پر انگاروں کی طرح چمکتے ہوئے سُرخ رنگ کے پردے پڑے ہوئے ہیں اور جن میں سے روشنی چھن چھن کر باہر آ رہی ہے، میں جانتا ہوں وہ آپ ہی کا کمرہ ہے، مطالعے کا کمرہ، جہاں کچھ عرصے سے میرے دوست شاہد ایک معلّم کے فرائض نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دے رہے ہیں ———"

"آپ کی معلومات واقعی وسیع ہیں۔ مگر آپ میرے حال پر کرم فرمائیے اور آپ تشریف لے جائیے۔"

"یعنی اپنا مدعا بیان کئے بغیر!"

"تو گویا آپ کی یہ تمام باتیں محض تمہیدی جملے تھے اور مدّعا ابھی باقی ہے!"

"آپ برہم نہ ہوں۔ لیجئے میں مختصراً کہے دیتا ہوں۔ آپ نے فلسفے کے مضمون میں رہبری کے لئے ایک معلّم کی خدمات حاصل کیں۔ یہاں تک تو ٹھیک ہے۔ مگر آپ کی نظرِ انتخاب شاہد پر کیوں پڑی، یہ مسئلہ ذرا غور طلب ہے!"

"تمہیں دوسروں کے ذاتی معاملات میں دخل اندازی کا کیا حق ہے؟"

"وہی جو آپ کو کسی ناتجربہ کار انسان کی پرسکون زندگی میں ایک عارضی جذبے کی تکمیل کے لئے ہلچل پیدا کرنے کا!"

"یہ سراسر جھوٹ ہے۔"

"زاہدہ! ذرا میری آنکھوں سے آنکھیں ملاؤ۔ میرا نام عاقل ہے۔ تم عاقل کی آنکھوں میں دھول نہیں ڈال سکتیں۔ تم فلسفے کا مطالعہ نہیں کرتیں۔ تم فلسفۂ عشق کا سبق دے رہی ہو!"

"یہ بہتان ہے! تم اس کے لئے پچھتاؤ گے۔ چلے جاؤ یہاں سے۔ چلے جاؤ پیشتر اس کے کہ ———"

"کہ آپ اپنے وفادار کتّوں کو بلا کر میری تواضع کریں یا کسی شہ زور ملازم کو دروازے تک میری رہنمائی کے لئے میرے ساتھ بھیجیں! مگر مجھے یقین ہے کہ آپ کی تہذیب آپ کو ایک مہمان کے ساتھ ایسا سلوک کرنے کی کبھی اجازت نہ دے گی اور پھر شاہد کی کہانی تو کتّوں کے بھونکنے یا دو انسانوں کے چند نازیبا حرکتیں کرنے سے کہیں زیادہ دلچسپ ہے۔"

"کہانی! ——— نہیں۔ میں کچھ نہیں سننا چاہتی۔ جاؤ۔ چلے جاؤ!"

دیکھا ہیں جانتا تھا کہ جوان عورتوں کو کہانیوں میں حصّہ لینے کے بعد کہانیاں سننے کا بہت شوق ہوتا ہے تو آپ کیوں اپنے آپ کو اس کہانی سے جبراً محروم رکھنا چاہتی ہیں؟ چلو۔ میرے کہنے سے ہی سُن لو زاہدہ! میں سچ کہتا ہوں شاہد کی تخلیق کا قصہ نہایت دلچسپ ہے"۔

"تخلیق؟"

"ہاں تخلیق! کیا تم یہ سمجھے بیٹھی ہو کہ وہ شاہد جسے آج کل اپنی قسمت پر ناز ہونا چاہئیے ہمیشہ ایسا ہی تھا جیسا تم اُسے اب پاتی ہو؟ زاہدہ! تمہیں جانتے ہوئے میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر تم اس کو ایک سال پہلے دیکھ پاتیں تو اُسے راستے میں پڑے ہوئے سنگ ریزے سے زیادہ قابلِ التفات نہ سمجھتیں۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ کسی وقت ایک سنگتراش ایسا مجسّمہ بنا ڈالتا ہے جس کی تمام تر خوبیاں اُس کی نکتہ بیں نگاہیں بھی نہیں دیکھ سکتیں!"

"اس میں سنگتراشی کا کیا دخل ہے؟ کیا تم مجھے اِدھر اُدھر کی باتیں بنا کر قصداً یہاں روکنا چاہتے ہو؟ میں اب ۔۔۔۔"

"کتنی بے صبر ہو تم۔ زاہدہ! جب کہانی میری توقعات سے بھی بڑھ کر دلچسپ ہونے لگی تو تم ایسے بے بنیاد وہم میں مبتلا ہو گئیں۔ ذرا سنو تو سہی! سنگ تراشی کا ذکر یہاں ناگزیر ہے۔ جب آج سے ایک سال قبل شاہد سے میری پہلی ملاقات ہوئی تو وہ دیکھنے میں بالکل ایک گنوار معلوم ہوتا تھا مگر مجھے جلد ہی محسوس ہونے لگا کہ اس سنگ ناتراشیدہ میں کئی جوہر چھپے ہوئے ہیں پس میں اس کی ذات میں دلچسپی لینے لگا۔ اس دلچسپی کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ اُس زمانے میں میں برنارڈ شا کا مطالعہ کر رہا تھا اور اُس کا ڈرامہ 'پگمیلین' پڑھ چکا تھا۔ شاید تم نے بھی پڑھا ہو۔ نہیں! خیر۔ کوئی مضائقہ نہیں تو اس ڈرامے میں ایک شخص، غالباً ایک پروفیسر ایک ایسی لڑکی کو جو جاہل مطلق تھی اور شہر کے گلی کوچوں میں مختلف قسم کی اشیاء فروخت کر کے گذر اوقات کرتی تھی مہذب بنانے کا تہیہ کرتا ہے۔ اس پروفیسر کا دعوےٰ تھا کہ وہ ایک قلیل عرصے کی محنت کے بعد اُس لڑکی کو اونچے سے اونچے طبقے کی سوسائٹی کا ایک درخشاں رکن بنا ڈالے گا۔ یہ دعوےٰ یہاں تک سچ ثابت ہوا کہ ایک وقت وہی جاہل لڑکی غلطی سے ایک نواب کی بیگم سمجھی گئی۔ میں اس ڈرامے سے کچھ ایسا متاثر ہوا کہ میں نے پوشیدہ طور پر خود ایک تجربہ کرنے کا ارادہ کر لیا۔ یہی وجہ تھی کہ میں شاہد میں غیر معمولی دلچسپی لینے لگا۔ میرا کام پروفیسر کی نسبت آسان تھا کیونکہ شاہد میں قابلیت تو پہلے ہی تھی۔ میں صرف یہ چاہتا تھا کہ وہ خارجی طور پر بھی مجھ جیسا ہی بن جائے۔ رفتہ رفتہ میری صحبت نے رنگ لانا شروع کیا۔ ایک ایک کر کے اُس میں تبدیلیاں ظاہر ہونے لگیں۔ اُسے لباس پہننے کا ڈھنگ آ گیا۔ اُس کی حرکات میں وہ پہلی جھجک جاتی رہی۔ تہذیب یافتہ سوسائٹی میں وہ نہ صرف گفتگو کرنے کے قابل ہو گیا بلکہ اُس کے طرزِ کلام میں ایک دلکش بے تکلفی اور بے باکی پیدا ہو گئی اور لطف یہ کہ اس کی جبیب پر کوئی ناخوشگوار اثر نہ پڑا۔ میں خود حیران رہ گیا۔ ایک بے ڈھب پتھر میں سے ایک خوبصورت مجسّمہ نکل آیا۔ میرا تجربہ کامیاب رہا۔ مگر مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ یہ کامیابی اتنی عظیم الشان ہے' اس کا ثبوت تم نے دے دیا!"

"میں نے؟ کس طرح؟"

"جان بوجھ کر بھولی نہ بنو زاہدہ! تم ہی نے تو آخر اس مجسّمے میں وہ خوبیاں پائیں جنہیں اُس کے بنانے والے کی آنکھیں نہ دیکھ سکیں۔ لیکن جن کی تم پرستار بن گئیں۔ مگر اُس میں ایک خامی باقی ہے جو تمہاری نگاہوں سے بچ گئی۔ اس خامی کا صرف سنگتراش ہی کو علم ہے!"

"وہ کیا؟"

"وہ یہ کہ اس مجسّمے سے آپ کے ہر اشارے کی تعمیل نہ ہو سکے گی۔ بلکہ ۔۔۔ معاف کیجئے ۔۔۔ آپ کے ایک ادنیٰ انداز کی بھی اُس طور سے داد نہ ملے گی جو ایک سیم و زر سے کھیلنے والی عورت کے دل کو مرغوب ہے۔ کیونکہ یہ مجسّمہ اندر سے کھوکھلا ہے۔ اس مسئلے پر غور کر لیجئے۔ اور یہ غضبناک نگاہیں مجھ پر نہ ڈالئے۔ میں اپنا فرض ادا کر چکا۔ یہ لیجئے میں جاتا ہوں۔ آداب عرض!"

زاہدہ غصّے سے بید مجنوں کی طرح کانپتی ہوئی ابھی وہیں کھڑی تھی کہ بڑے دروازے سے آواز آئی۔

"اور ہاں! ایک بات تو میں بھول ہی گیا۔ اگر آپ کبھی اس بچارے کے ساتھ بھلائی کرنے کے خیال سے یا ایک کھوکھلے مجسّمے کی بجائے کسی ٹھوس چیز پر نظرِ التفات ڈالنے کی غرض سے اُسے آزادی دینا چاہیں تو خاکسار کے حقوق کو نظر انداز نہ کیجئے گا۔"

. . . .

روشنی

کسی نے اُس کی پکار نہ سُنی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا گویا دن کے وقت رات ہو گئی ہے اور سب گھوڑے بیچ کر سوئے ہوئے ہیں۔ شاہد نے آخری

دفعہ دروازے کی چٹخنی کو پکڑ کر دروازہ اندر کی طرف کھینچنے کی کوشش کی، مگر بے سود دروازہ کھلنا تھا نہ کھلا۔ ستم ظریفی کسی کی!

شاہد نے تنگ آ کر اپنے آپ کو زور سے آرام کرسی کے سپرد کر دیا۔ اور غصے میں ٹائی کی گانٹھ بھی کھول ڈالی۔ جہنم میں جائے یہ سوٹ اور ٹائی جب دروازہ ہی ——

باہر سے ایک قہقہہ سنائی دیا۔ دوسرے لمحے دروازہ کھلا اور ساتھ ہی قہقہہ ہاتھوں میں ایک بنڈل تھامے اندر داخل ہوا۔

"بھئی۔ میں اس جبری قید کے لئے معافی چاہتا ہوں لیکن اگر یہ تجویز عمل میں نہ لاتا تو تم اس وقت خدا جانے کہاں پہنچ چکے ہوتے اور ایک نہایت ضروری کام رہ جاتا۔ اسی لئے میں اِدھر اُدھر ہدایات بھی دیتا گیا تھا کہ اگر کوئی قیدی شور مچائے یا دروازے پر تشدد کرے تو کان نہ دھرا!"

شاہد حیران ہو کر عاقل کے چہرے کا مطالعہ کر رہا تھا۔

"تو گویا یہ شائستہ حرکت جناب نے کی تھی۔ آخر وہ کونسا ایسا ضروری کام تھا جس نے آپ کے دماغ کو مجھے محبوس کرنے کی یہ انوکھی ترکیب بتائی؟ دیکھئے یہاں ہم نے ٹائی کی ناٹ کا بھی، جو بحیثیت آپ کا شاگرد ہونے کے نہایت خوبصورتی سے لگائی گئی تھی، قلع قمع کر ڈالا"

"پروا نہ کرو دوست! ٹائی کی ناٹ دوبارہ بھی ایسی ہی خوبصورتی سے لگائی جا سکتی ہے۔ آخر ہم کس لئے ہیں؟ مگر یہ کام کل تک ملتوی نہ کیا جا سکتا تھا!"

"اوہو! اتنا اہم!"

"بالکل۔ کیا جناب کو یاد ہے آج کیا تاریخ ہے!"

"کیوں، آج بارہ نومبر ہے"

"کمن جیکہ! بارہ نومبر تو مجھے بھی معلوم ہے۔ مگر —— آخر تمہارے دماغ کو ہوا کیا ہے جو ایسی معمولی بات بھی ——"

"ٹھہرو! ٹھہرو! یاد آ گیا۔ آج ہماری پیدائش کا دن یعنی برتھ ڈے ہے۔ یہی تھا نا تمہارا مطلب؟"

"اور کیا میں کوئی آسمانی مطلب تھوڑے ہی کہہ رہا ہوں۔ سنبھالو یہ اپنا بنڈل!"

"برتھ ڈے کا تحفہ! یہ قید تو بہت مفید رہی!"

"جی! کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم کسی کو اذیت پہنچانے کے لئے قید کریں گے! اب ذرا اکھولو تو اسے!"

"سمر سوٹ! رچ بلاک! یہ تمہیں کیا سوجھی!"

کیا آپ کو ساڑھی کی توقع تھی!"

"دو قمیضیں۔"

"ارے! یہ اس کے اندر کیا ڈال لائے ہو!"

"ایک موٹے لٹھے کا پاجامہ اور ایک کھُردرا سا لمبے کالر کُرتہ۔ سوٹ سمیت آپ کے کہنہ مشق درزی کے ہاتھوں سے سلے ہوئے!"

"اس مذاق کا مطلب!"

"مذاق! کیا آپ کو اپنے "زمانۂ سلف" سے کوئی دلچسپی نہیں رہی!"

"بہ الفاظ دیگر ان کو بھی برتھ ڈے کا تحفہ سمجھوں!"

"ٹھیک سمجھے آپ! مگر دونوں تحفوں میں سے انتخاب کرنا ہو گا!"

"انتخاب! ابھی خوب سوجھی اور ہم نے بھی انتخاب کر لیا!"

"تو سوٹ لو گے یا ——"

"بس! بس! ہمارے انتخاب میں "یا" کے لئے جگہ ہی نہیں۔ ہم دونوں لیں گے!"

"بہت سیانے ہو۔ اور کیا پہنو گے بھی دونوں! پاجامے کے اوپر پتلون اور ——"

"جی نہیں! پہنا جائے گا صرف سوٹ!"

"اور یہ بچارا کُرتہ اور پاجامہ!"

"انہیں نہایت احترام و احتیاط کے ساتھ طے کر کے ایک بکس کی گہرائیوں میں جو پہلے سے معطر کر لی گئی ہوں گی لٹا دیا جائے گا اور وقتاً فوقتاً یعنی جب کبھی ہمیں اپنے زمانۂ سلف کی یاد بہت ستائے گی تو دل کو ڈھارس دینے کے لئے ان کی زیارت کر لی جایا کرے گی۔ کیوں کیا خیال ہے!"

"خیال قابلِ داد ہے۔ بُتوں کا ذکر بھی اور خدا کی یاد بھی۔ دونوں باتیں ہو جائیں گی! مگر آج یہ نیا سوٹ ہی پہن کر نکلنا۔ خصوصاً جب شام کے وقت پڑھانے جاؤ!"

"یہ تخصیص کس لئے!"

"تمہارے بھلے کی بات کہتا ہوں"

"اجی جناب! میں ٹھہرا موٹی عقل کا آدمی اور آپ باتیں کرنے لگے معموں میں۔ ذرا سمجھائیے تو سہی کہ وہاں یہ سوٹ پہن کر جانے میں میری کیا بھلائی ہو گی اور کیونکر!"

"خدا کسی کو موٹی عقل نہ دے! لو! ہم چلتے ہیں اور آپ بھی جہاں جانا چاہتے تھے تشریف لے جائیں۔ مگر ایک بات یاد رکھنا کبھی کبھی معمے

حل کرنے میں بڑا لطف آتا ہے اور مزیدار نتائج برآمد ہوا کرتے ہیں!"

. . . .

پھر تاریکی

"کاش آج چاندنی رات ہوتی!"

"پھر کیا ہوتا؟"

"ہم دونوں اس سنسان کوٹھی سے بہت دور دریا کی رقص کرتی ہوئی نقرئی لہروں پر ایک چھوٹی سی ہلکی پھلکی کشتی میں بیٹھے کسی سمت بہے جا رہے ہوتے اور چاند کے سوا ہمیں کوئی اور دیکھنے والا نہ ہوتا!"

"دیکھنے والا تو یہاں بھی کوئی نہیں۔ سب پکچر دیکھنے گئے ہیں اور نوکروں کو میں نے باہر جانے کی اجازت دے دی تھی۔ البتہ چاند نہیں!"

"ہے تو، مگر صرف ایک! چاندنی رات ہوتی تو دو ہوتے اور میں اُس آسمانی چاند سے مخاطب ہو کر کہتا کہ دیکھ۔ ذرا زمین کے چاند کی طرف دیکھ! کیا اب بھی تجھے اپنی تابانی پر ناز ہے؟"

"پھر لگے شاعروں کی سی باتیں بنانے؟"

"یہ تو آپ ہی کا تصور ہے! آپ کیوں مجھ پر مہربان ہوئیں؟"

"تو لو میں الگ منہ موڑ کر بیٹھ جاتی ہوں!"

"نہیں! نہیں! یہ ظلم نہ کرو زاہدہ! خدا جانے کتنی صدیوں کے بعد مجھے یہ لمحات نصیب ہوئے ہیں! میرے قریب ہی رہو تاکہ مجھے پختہ یقین ہو جائے۔"

"یقین؟"

"ہاں یقین! مجھے اب تک شبہ ہے کہ میں عاقل نہیں اور نہ تم زاہدہ ہو۔ بلکہ ہم دونوں کوئی اور ہستیاں ہیں جنہیں میں کسی بھولے بسرے مگر شیریں زمانے کے زاہدہ اور عاقل سمجھ رہا ہوں!"

"یہ کیا فلسفہ ہے!"

"فلسفہ نہیں۔ زاہدہ! میری قلبی کیفیت کی ایک جھلک۔ میں اپنے آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ مجھے ایک کھوئی ہوئی عزیز چیز واقعی واپس مل گئی ہے۔ زاہدہ! ایک بار مجھے عاقل کہہ کر تو پکارو۔ تمہارے لبوں سے یہ لفظ سُن کر میرا شک رفع ہو جائے گا!"

خاموشی۔

"زاہدہ!"

"عاقل!"

تاریکی کا پردہ تاریک تر ہو گیا۔ مگر یہ دونوں وقت کی رفتار سے بے خبر بیچ پر پہلو بہ پہلو بیٹھے رہے۔ اس طرح کہ زاہدہ کا سر عاقل کے شانے کے ساتھ لگا ہوا تھا۔

"کیا یہ واقعی سچ ہے۔ زاہدہ؟"

"بالکل!"

"اور تم اب ــــ اُس کی طرف کبھی آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھو گی؟"

"پُرانی باتوں کا ذکر کیوں چھیڑتے ہو!"

"مگر کم از کم مجھے ایک بات تو بتا دو"

"کیا؟"

"تم شاہد سے یکایک کنارہ کش کیوں ہو گئیں؟"

"تم نے جو کہا تھا کہ وہ مجسمہ اندر سے کھوکھلا ہے!"

"تمہیں کیونکر معلوم ہوا!"

"مجھے اس کا ثبوت مل گیا۔"

"وہ کیسے؟"

"ایک شام وہ ایک بالکل نیا سوٹ پہن کر آیا۔ بہت خوبصورت معلوم ہوتا تھا۔"

"زاہدہ ــــ!"

"یعنی اُس وقت!"

"تم نے کیا کیا؟"

"میں نے سنگتراش کے شاہکار کا اندرونی حصہ دیکھنے کا ارادہ کر لیا۔"

"اور کامیابی ہوئی!"

"ہاں! میں نے کہا مجھے اسی وقت دس دس کے دو نوٹ درکار ہیں۔ کسی وجہ سے ابا سے نہیں مانگ سکتی۔ ایک ہفتے تک واپس کر دوں گی!"

"خوبصورت عیار!"

"محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے! پسینہ پونچھنے لگے اور کہا۔ کاش کہ میں آپ کے ارشاد کی تعمیل کر سکتا۔ مگر یہاں تو تن کے کپڑے بھی تحفہ پائے ہیں۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ مجسمہ واقعی کھوکھلا ہے۔ میں نے یہ بھی پوچھنے کی ضرورت نہ سمجھی کہ وہ تحفہ کس کی فیاضی کا ثبوت تھا!"

"اس کے بعد؟"

"چند ہی دنوں میں مجھے فلسفے کے مضمون سے کوئی دلچسپی نہ رہی اور اسی لئے مجبوراً معلم کو بھی زیادہ تکلیف دینا مناسب نہ سمجھا۔"

"بچارا۔ خوش قسمت شاہد!"

"یہ انوکھی ترکیب ذرا تشریح طلب ہے۔"

"بچارا اس لئے کہ اسے اب ایک معمے کی بجائے دو معمے حل کرنے ہوں گے! جس روز اسے وہ نیا سوٹ ملا ہیں اتفاقاً اس کے پاس پہنچا اور میں نے یوں ہی ایک پُراسرار انداز میں اسے کہا کہ جب وہ آپ کو پڑھانے جائے تو وہی سوٹ پہن کر جائے کیونکہ اس میں اس کی بھلائی ہے۔ میرا یہ کہنا اُس نے ایک معمہ سمجھا۔ دوسرا معمہ یہ ہے کہ ابھی تک اس کی عقلِ سلیم یہ ماننے کے لئے آمادہ نہیں ہوتی کہ کوئی خاتون جس کو فلسفے یا کسی اور مضمون سے گہری دلچسپی ہو یکایک اس مضمون سے قطعی متنفر ہو سکتی ہے۔"

"اور خوش قسمت کیوں؟"

"اس لئے کہ وہ اسیری جس سے اب اُس کو اپنی جدا دنیا بنانے کی کامل آزادی مل چکی ہے اُس کے موافقِ حال نہ تھی۔ ایسی اسیری کے لئے قدرت نے مجھ جیسے لوگ خاص طور پر وضع کئے ہیں!"

"یعنی میں جیلر ہوئی اور آپ میرے قیدی! دلچسپ کھیل ہے!"

"نہیں۔ یہ لفظ تو میں نے محض تشریح کے لئے استعمال کئے تھے۔ درحقیقت آپ اس دور کی ایک شمع ہیں اور خاکسار اس عہد کا ایک حقیر پروانہ!"

"پھر وہی بے تکی باتیں!"

"بے تکی نہ کہو زاہدہ۔ یہ تو میرے دل سے نکلے ہوئے الفاظ ہیں اور اتنے ہی سچے جتنی یہ حقیقت کہ تم اب نیک و بد میں تمیز کرنے کے قابل ہو۔"

"یہ آخری الفاظ تو شاید میں نے پہلے بھی کہیں سنے ہیں!"

"سنے ہوں گے! مگر ہم کیوں ان بے کار باتوں کے جنگل میں پھنس کر وقت گنوائیں۔ یہ لمحات تو بہت قیمتی ہیں!"

اور رات کی بے پناہ تاریکی میں دو چہرے ایک ہی چیز کی تلاش میں ایک دوسرے کی طرف جھکے . . .

. . . .

انور اعجاز قیصر

غزل

اب کے جنوں میں چاکِ گریباں نہ ہو سکا
کچھ اہتمامِ جشنِ بہاراں نہ ہو سکا

جینا طویل خوابِ پریشاں نہ ہو سکا
خوش ہوں کہ دل کے درد کا درماں نہ ہو سکا

راہِ درازِ عمر اسیری میں کٹ گئی
لیکن دماغ عادیِ زنداں نہ ہو سکا

حق بینیٔ نگاہ کے قربان جائیے
خاشاک پر گمانِ گلستاں نہ ہو سکا

شکرِ جفائے یار سے فرصت نہیں ملی
دل وقفِ شکوہ سنجیٔ دوراں نہ ہو سکا

سکندر علی وجد

ایک گیت کے دو بھاؤ

ایک ہلکی جھلک ہی نظر آئی تھی دُور سے جس کی من موہنی ہو گئی ہے،
رات چھائی ہوئی تھی اندھیری مگر چاند نکلا ہے اور چاندنی ہو گئی ہے؛
دل کے آکاش پر کالی، کاجل سی کالی گھٹا نے ہی قابو جمایا ہؤا تھا،
چھٹ گئی ہے گھٹا، ہٹ گئی ہے گھٹا، نور چھننے لگا، روشنی ہو گئی ہے۔
دل میں سویا تھا احساس جو روپ کا جاگ کر پریم کا راگ بننے لگا ہے،
آج تک آگ دل میں دبی تھی مرے، آج سے درد کی راگنی ہو گئی ہے۔

(۲)

کیسی دنیا ہے! سُکھ سیج سپنا بنی، سیج کانٹوں کی قسمت میں لکھی ہوئی تھی،
دل میں راحت کی اُمیّد کیسے پلے؛ زندگی بھی مجھے جانکنی ہو گئی ہے۔
ایک چاہے، نہ چاہے اُسے دوسرا، اس کا انجام نفرت میں ظاہر ہؤا ہے،
وہ محبت بھی اب تو بدل ہی گئی، کب محبت رہی؟ دشمنی ہو گئی ہے۔
زہرِ غم کو یہ ہر کوئی کہتا تھا رگ رگ میں نشتر کی مانند جا کر بسے گا،
روگ چاہت کا میٹھا ہے کیسا کہ تلخی بھی اب شہد کی چاشنی ہو گئی ہے۔
جی میں کہتے تھے تم سے ملیں گے کبھی، دل پہ گذری ہے جو وہ کہیں گے سبھی ہم
گفتنی تھی، مگر اب کہیں تم سے کیا، اپنی حالت ہی ناگفتنی ہو گئی ہے۔

میراجی

جھُوٹ

میں نے اظہر کو بلا کر کہا۔ "اظہر تمہارے اباشکایت کرتے ہیں کہ تم بہت جھوٹ بولنے ہو"۔ اظہر کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اس نے اپنی حیران سی ڈری ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ اور کہنے لگا "نن نہیں جی میں تو جھوٹ نہیں بولتا ——— پر ابا جی مارتے ہیں"۔ ان مختصر الفاظ میں اس چھوٹے سے لڑکے نے جھوٹ کا تمام فلسفہ بیان کر دیا یعنی مخصوص حالات میں جھوٹ ایک کارآمد چیز ہے جو زیادہ تر اپنے بچاؤ کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ جس طرح طفلی میں بچوں پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ ماں کی محبّت کو حاصل کرنے کے لئے رونا، روٹھنا، ضد کرنا اور بیمار پڑ جانا بہت مفید ہے۔ اسی طرح کسی روز اُن پر یہ انکشاف بھی ہو جاتا ہے کہ اباکی گھڑکیوں اور ماسٹر کی مار پیٹ سے بچنے کے لئے جھوٹ بولنا بہت ضروری ہے۔ یعنی جھوٹ ایک آرام دہ اور کارآمد ایجاد ہے جو عام لوگوں کے لئے بے حد ضروری ہے۔

حسین عورتوں اور بڑے سیاست دانوں نے جھوٹ کو آرٹ کے درجے تک پہنچا دیا ہے۔ غالباً اس لئے کہ انہیں جھوٹ بولتے ہوئے اس کا احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ عورتوں کے لئے گھر گرہستی کی زندگی میں جھوٹ ایک ایسی ہی آرام دہ چیز ہے جیسے خانہ داری کی اور چھوٹی موٹی چیزیں مثلاً چوکی، پچی، پیالہ یا دست پناہ وغیرہ اس کے علاوہ نمائشی جھوٹ بھی ہوتے ہیں جو اُن کے لئے ایک خوبصورت ساڑی یا کاجل اور پاؤڈر کا کام دیتے ہیں۔ وہ جھوٹ کی مدد سے صرف اپنا بچاؤ ہی نہیں کرتیں بلکہ دوسروں کو مغلوب کرنے کے لئے بھی کئی دلچسپ اور انوکھے جھوٹ ایجاد کرتی رہتی ہیں۔ میرا اپنا اندازہ ہے کہ جھوٹ سی دلچسپ اور رنگین ایجاد کے لئے ہم سب کسی عورت کے مرہون منّت ہیں۔

اتنا جھوٹ بولنے کے باوجود بھی مرد ابھی تک اپنی دروغ گوئی میں وہ لطافت نہیں پیدا کر سکے جو ایک چھوٹی سی لڑکی اپنے ایک سرسری جھوٹ میں پیدا کر لیتی ہے۔ شاید اس لئے کہ مرد بہت سوچ بچار کے بعد جھوٹ بولتا ہے حتیٰ کہ اُس کے جسم کا بند بند یہ جان لیتا ہے کہ ابھی ایک جھوٹ بولا جائے گا۔ اس طرح یہ راز اُس کے تمام جسم میں مشتہر ہو جاتا ہے اور عورت پر جھوٹ بولتے ہوئے ایک بے خودی کی سی کیفیت چھا جاتی ہے جیسے وہ کوئی شعر کہہ رہی ہو۔ اس لئے اُس کے جھوٹ کو سوچ بچار سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

شاید آپ نے بھی کبھی جھوٹ بولنے کی کوشش کی ہو اور یہ محسوس کیا ہو کہ بولتے ہوئے دل یوں دھڑکنا شروع کر دیتا ہے جیسے وہ کہہ رہا ہو "بھئی تم جانو تمہارا کام میں اس بات میں دخل نہیں دیتا"۔ آنکھیں یہ قطعی بھول جاتی ہیں کہ ان حالات میں انہیں کس قدر کھلا رہنا چاہئے اور کدھر دیکھنا چاہئے ہاتھ حیرانی میں شانوں سے نیچے یوں آوارہ لٹکتے ہیں گویا وہ کسی لامتناہی خلا میں آویزاں ہوں۔ اُس وقت آواز بھی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کا ساتھ نہیں دیتی۔ گویا کوئی درد بھرا گیت رُکتے ہوئے سروں میں گایا جا رہا ہو اور جسم کی نس نس ہم کو جھٹلانا شروع کر دیتی ہے۔ "جھوٹ! جھوٹ!" اس کے باوجود اگر کوئی ہمارے جھوٹ کو سچ مان لے تو یہ اُس کا حسنِ اعتقاد ہے۔

شاید آپ نے بھی یہ محسوس کیا ہو کہ ہم صرف زبان ہی سے جھوٹ بول سکتے ہیں اور وہ بھی صرف لفظوں کی مدد سے۔ ہمارے باقی اعضا اُس وقت ہمارے الفاظ کا ساتھ نہیں دیتے۔ اکثر تو وہ زبان کی اس دیدہ دلیری سے پریشان ہو جاتے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جو اپنی نیکی یا بزدلی سے زبان کو جھٹلانا شروع کر دیتے ہیں۔

میرا اپنا تجربہ یہ ہے کہ جھوٹ بولتے ہوئے مجھے اس قدر پریشانی اور پشیمانی ہوتی ہے کہ معاً میرے دل میں یہ آرزو پیدا ہو جاتی ہے کہ اگر اب کے اس خفّت سے بچ جاؤں تو اپنے گذشتہ گناہوں سے توبہ کروں اور باقی عمر اللہ کی یاد میں بسر کر دوں۔ شاید اسی ڈر کے مارے میں زیادہ تر جھوٹ بولنے کی کوشش ہی نہیں کرتا۔ یعنی راست گوئی میرے لئے ایک ناخوشگوار مجبوری ہے اور اس لئے زندگی ایک خشک اور پھیکی سی حقیقت۔

اس کے برعکس کسی کے جھوٹ پر ایمان لانے کے متعلق ——— آپ مجھ سے کتنا بڑے سے بڑا جھوٹ بھی بولیں۔ میں آپ کی بات پر سچے دل سے ایمان لے آؤں گا۔ بولتے ہوئے چاہے آپ کا دل اپنی دھکا دھک سے کچھ ہی کیوں نہ کہے۔ منہ پر ایک رنگ آئے اور ایک رنگ جائے،

آنکھیں بھینچی رہیں یا پھٹی ہوئی۔ میں آپ کی بات تسلیم کروں گا۔ چونکہ ایسی چھوٹی
چھوٹی باتوں پر غور کرنے کی مجھے عادت ہی نہیں ہے۔ پھر کبھی کسی وقت بیٹھے
بٹھائے میرے دل میں یکلخت یہ خیال آئے گا کہ اُس روز آپ نے میرے
روبرو جھوٹ بولا تھا۔ صریحاً جھوٹ تھا یعنی بالکل جھوٹ، سفید جھوٹ۔
اس وقت میرا جی چاہتا ہے کہ اُٹھ کر ٹوپی سر پر رکھوں، گھر سے نکلوں اور آپ
کو کان سے جا پکڑوں اور صاف صاف کہہ دوں۔ "اس روز آپ نے مجھ سے
سفید جھوٹ بولا تھا۔ شاید آپ کا خیال ہے کہ میں ابھی بچہ ہوں اور جھوٹ
سچ کو سمجھ نہیں سکتا"۔۔۔ پھر اُٹھنا ٹوپی سر پر رکھنا اور آپ کے در پر چل کر جانا یہ
تمام کام محض اپنی فہمِ رسا کے ثبوت اور آپ کو ہدایت دینے کے لئے!۔۔۔
اس خیال کے آتے ہی پھر بیٹھ جاتا ہوں اور بات آئی گئی ہو جاتی ہے۔

اگر جھوٹ بولنے اور جھوٹ پر ایمان لانے میں لوگ مجھی سے واقع
ہوئے ہوں۔ تو یہ ایک حقیقت ہے کہ ہم سب فطری طور پر راست گو ہیں۔
البتہ ہم جھوٹ پر ایمان لا سکتے ہیں۔ یعنی انسان فطرتاً کافر نہیں بلکہ
مومن واقع ہوا ہے اور ہماری منجملہ مشکلات کی وجہ ہماری دروغ گوئی نہیں
بلکہ خوش اعتقادی ہے۔ اس کے باوجود ہمیں ہمیشہ سے یہی تلقین کی گئی کہ
جھوٹ نہ بولو۔ یہ نہیں کہ جھوٹی باتوں پر ایمان نہ لاؤ۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو
کہ ہر مفکر جس نے انسان کو جھوٹ سے پرہیز کی تلقین کی بذاتِ خود
لوگوں کے حسنِ ایمان یا خوش اعتقادی کی ضرورت تھی یا شاید اس لئے کہ اُس کا
خیال تھا کہ اگر سب لوگ جھوٹ بولنا چھوڑ دیں تو جھوٹی بات کا وجود ہی نہ
رہے گا۔ اور جھوٹ پر اعتقاد کا سوال ہی پیدا نہ ہوگا بہرصورت انہیں یہ خیال
نہ آیا کہ یہ بات ایک "اگر" پر موقوف ہے اور ہر حرفِ شرط ایک نہ سلجھنے والا
تانا بانا ہے۔ اس کے علاوہ وہ یہ قطعی بھول گئے کہ جھوٹ نہ بولنے کی تلقین سے
بیشتر یہ اشد ضروری ہے کہ لوگوں میں سچی بات سننے اور برداشت کرنے
کی ہمت پیدا کر دی جائے۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ ہم سب بے حد خوش اعتقاد واقع ہوئے
ہیں تو ظاہر ہے کہ خوش اعتقادی ہمارے لئے مفید ہے۔ کیونکہ یہ بات قرینِ قیاس
نہیں کہ انسان سا عقلمند جانور کسی غیر مفید بات کو پلے باندھ لے۔ یعنی
ہم صرف اُن باتوں پر ایمان لے آتے ہیں جن سے ہمیں خوشی حاصل ہوتی ہے
حتیٰ کہ اعتقاد یا ایمان بنفسہٖ ہمیں قبول نہیں جب تک کہ وہ ہمیں خوشی نہ بخشے
یعنی ہم کسی کی بات پر اعتبار نہیں کرتے بلکہ خوش کن اعتباروں کو اکٹھا کرتے
رہتے ہیں۔ اسی طرح ہم صرف وہی جھوٹ بولتے ہیں جو ہمارے لئے
خوش کن ہوں۔ اس لئے عام طور پر اگر میں آپ سے کہوں کہ آپ میرے روبرو
جھوٹ بول رہے ہیں تو میرا مطلب یہ ہوگا کہ آپ کی بات مجھے اچھی نہیں
معلوم ہو رہی یعنی میرے اکٹھے کئے ہوئے اعتقادات کو جھٹلا رہی ہے
یا میرے مطلب کے مطابق نہیں۔

اگر آپ مجھ سے کچھ کہیں تو میرا اُسے تسلیم کر لینا یا نہ کرنا آپ کے بیان
کی سچائی یا جھوٹ پر مبنی نہیں۔ اگر آپ کوئی جھوٹ بول کر مجھے خوش کر دیں
تو میرے نزدیک آپ ایک راست گو ہوں گے یعنی جھوٹ اور سچ بذاتِ
خود ہمارے نزدیک دو غیر ضروری اور مہمل باتیں ہیں۔

مجھے اکثر اپنے بزرگوں کی کئی ایسی باتیں سننی پڑتی ہیں جو میرے اپنے
خیالات کے بالکل برعکس ہوتی ہیں اور میں اُن باتوں کے دوران میں "جی
ہاں ٹھیک ہے، بالکل درست" کہنے کا عادی ہو چکا ہوں۔ اُس وقت میں
وہ باتیں انہیں کے نقطۂ خیال سے سنتا ہوں۔ یعنی اگر بات سننے والا سنانے
والے کے نقطۂ خیال سے سُنے تو جھوٹ کا وجود ہی نہیں رہتا اور یہ دنیا اور
زندگی چند ساعت کے لئے جھوٹ اور سچ کی مصنوعی بندش سے بلند
ہو جاتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی اس وقت بیٹھے بٹھائے مجھے یہ خیال پیدا ہوتا
ہے کہ درحقیقت میں اُن بزرگوں کے نقطۂ خیال سے قطعی بیگانہ ہوں اور
وہ خوش کن جملے "ٹھیک ہے۔ بالکل سچ" صرف اس لئے میری زبان سے
نکل جاتے ہیں کہ ان کی مدد سے میں اپنے بزرگوں پر واضح کر سکوں کہ دیکھا
میں کیسا سمجھدار آدمی ہوں!

عام طور پر چار قسم کے جھوٹ بولے جاتے ہیں۔ ایک تو وہ جنہیں
بولتے ہوئے بولنے والے کو واضح طور پر اس کا احساس ہوتا ہے کہ وہ جھوٹ
بول رہا ہے۔ ایسے جھوٹ اکثر اپنے بچاؤ، مطلب براری، اپنی آن قائم رکھنے
کی غرض سے یا کسی ذاتی فائدے کے لئے بولے جاتے ہیں۔ اگر گہری نظر سے
دیکھا جائے تو یہ سب باتیں حقیقتاً اپنے بچاؤ ہی کے لئے ہوتی ہیں۔ یہ جھوٹ
مرد عام طور پر زیادہ بولتے ہیں۔ دوسرے وہ جھوٹ جو تفریحاً بولے جاتے
ہیں اور بولنے والے کو قطعی اس کا احساس نہیں ہوتا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے
یا اگر ہو بھی تو ایک دھندلا سا شک ہوتا ہے جو اُس کی نفسی کیفیت پر کوئی اثر
نہیں رکھتا۔ ایسے جھوٹ صرف عورت ہی بول سکتی ہے۔ اور صرف یہی
جھوٹ آرٹ کے درجے تک پہنچ سکتے ہیں۔ عورتوں کے علاوہ شاعر،
مصوّر اور دیگر آرٹسٹ بھی اس قسم کے جھوٹ بولنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔
اس کی وجہ یہ ہے کہ نفسیاتی نقطۂ نظر سے ان لوگوں میں عورت کا عنصر غالب

ہوتا ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ہر جسم میں عورت اور مرد خلط ملط ہو رہے ہیں۔ اور اکثر ایسے مرد دیکھنے میں آتے ہیں جن میں پگڑی اور مونچھوں کے باوجود ایک عورت چھپی رہی ہوتی ہے۔

تیسری قسم کے جھوٹ وہ جھوٹ ہیں جنہیں بولتے ہوئے ہمیں پختہ یقین ہوتا ہے کہ ہم حقیقت کو بے نقاب کر رہے ہیں اور ہمیں حیرانی ہوتی ہے کہ ایسی سیدھی بات سننے والے کی سمجھ میں کیوں نہیں آتی۔ اس قسم کے جھوٹ بولنے سے بیشتر یہ لازم ہے کہ وہی جھوٹ ہم اپنے آپ اتنی بار بول چکے ہوں کہ وہ ہمارے لئے جھوٹ ہی نہ رہیں۔ ایسے جھوٹ عام طور پر جاہل لوگ، سپاہی، سیاست دان اور فلسفی بولتے ہیں۔

چوتھی قسم کے وہ مہذب جھوٹ ہوتے ہیں جو ہم لوگوں کو خوش رکھنے کے لئے مروجہ تہذیب اور اخلاق کے مطابق بولتے ہیں۔ یہ جھوٹ اپنے متعلق پروپیگنڈا ہونے کے علاوہ اجتماعی زندگی میں بے حد ضروری ہیں۔

ان کے علاوہ ہم بسا اوقات تنہائی میں یا جب ہمیں کوئی کام نہ ہو بیٹھے ہوئے اپنے آپ سے جھوٹ بولتے رہتے ہیں۔ مجھے بھی اس کی عادت ہو چکی ہے۔ صبح دفتر کو جانے کے لئے جب میں اپنی بائیسکل پر پاؤں رکھتا ہوں تو معاً میں یہ سمجھتا ہوں کہ میں وہ مشہور ہوا باز ہوں جسے لندن سے سڈنی تک کا سفر چوبیس گھنٹے میں طے کر کے ریکارڈ قائم کرنا ہے۔ پھر میری سائیکل ہوائی جہاز بن جاتی ہے اور میں دیکھتا ہوں کہ نیچے دنیا بھر کے لوگ منہ اٹھا اٹھا کر میری طرف دیکھ رہے ہوتے ہیں اور شہر بھر میں اس ہندوستانی ہوا باز کی ریکارڈ توڑنے والی پرواز کی خوشی میں موٹریں لاریاں اور تانگے چلتے پھرتے ہیں۔ لوگ یوں خوش نظر آتے ہیں گویا وہ کسی بیاہ پر آئے ہوئے ہوں۔ تانگے والے بچ جانا بھائی۔ ہٹو ہٹو چیخ چیخ کر میرا راستہ صاف کرنے میں مصروف ہیں ...... اکثر تب میں جاگ پڑتا ہوں تو مجھے خیال آتا ہے کسی دن یہ ہوائی سواری مجھے کسی لاری کے نیچے نہ کچل دے لیکن آپ جانتے ہیں کہ لندن سے سڈنی تک پرواز کرنا آخر خطرے سے خالی تو ہے نہیں البتہ مجھے اس خیال سے بے حد دکھ ہوتا ہے کہ کسی روز اگر میں مر جاؤں تو لوگ سمجھیں گے کہ ایک سائیکل سوار اپنی حماقت کی وجہ سے لاری کے نیچے آ کر مر گیا۔ بے چاروں پر کوئی اس حقیقت کے ظاہر کرنے والا نہ ہو گا کہ وہ بظاہر سائیکل سوار درحقیقت وہ مشہور ہوا باز ہے جو چوبیس گھنٹے میں لندن سے سڈنی تک پرواز کرتے ہوئے اپنے جذبے کی نذر ہو گیا۔

یہ میں نہیں جانتا کہ اپنی اس ریکارڈ توڑنے والی ہوا بازی سے میرا مطلب کیا ہوتا ہے۔ شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ میری سائیکل اتنی پرانی ہے کہ چلتے ہوئے اس میں سے کئی ایک دلچسپ قسم کی آوازیں پیدا ہوتی ہیں اور وہ خود یوں جھولتی ہے کہ اس پر بیٹھ کر لوگوں کو اپنی طرف دیکھنے اور گھورنے سے باز رکھنا ممکن نہیں اور چونکہ مجھ میں ایسی نگاہوں کے برداشت کرنے کی ہمت نہیں اس لئے میں نے خیال ہی خیال میں اُسے ایک ہوائی جہاز بنا رکھا ہے۔ یا یوں کہئے کہ میں اُس سائیکل پر بیٹھنے سے بچنے کے لئے ہوا بازی کا عادی ہو چکا ہوں یعنی اپنے بچاؤ کے لئے میں اپنے آپ سے یہ معصوم اور خوش کن جھوٹ بولتا ہوں جب کبھی بیٹھے بٹھائے مجھے اس بات کا خیال آتا ہے۔ تو میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ دنیا میں سب جھوٹ بولنے والے لوگ کس قدر ترس کے قابل ہیں۔ گویا وہ سب لولے لنگڑے اپاہج ہیں جو اپنے ہونے، جینے یا چلنے پھرنے کے لئے سہارا ڈھونڈتے پھرتے ہیں، جو ان سہاروں کے بغیر چل بھی نہیں سکتے۔ اس وقت مجھے اُن لوگوں پر بے حد غصہ آتا ہے جنہوں نے ہمارے دل میں جھوٹ اور جھوٹوں کے لئے اس قدر نفرت پیدا کر دی ہے۔

میری اس اوپر کی مثال سے ثابت ہوا کہ اکثر ہمیں اپنے آپ سے بھی جھوٹ بولنے کی ضرورت پڑتی ہے کیونکہ جب ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا حقیقت میں ایک ایسی ٹیڑھی کھیر ہے جس کا نہ سر نہ پیر اور جس میں ہماری کوئی وقعت ہی نہیں تو ہمارا دل یوں بیٹھ جاتا ہے جیسے لامحدود گہرائیوں میں ڈوب رہا ہو۔ اُس وقت اپنے آپ کو بچانے کے لئے ہمیں چند ایسے خوش کن اعتباروں کی ضرورت پڑتی ہے جو ہمیں تسلی دے سکیں اور جن کے سہارے سے ہماری اپنی شخصیت کی اہمیت پیدا ہو۔ اُنہی خوش کن اعتقادوں سے جنہیں عام طور پر ذاتی لاگ لگا کہا جاتا ہے ہماری دنیا قائم ہے۔ اور انہیں کی مدد سے ہم میں احساسِ انفرادیت پیدا ہوتا ہے یعنی ان کو اکٹھا کر لیا جائے تو یہ ایک "میں" بن جاتے ہیں۔ اگر "میں" کا احساس نہ ہو تو دنیا بکھر کر ایک طوفان بدتمیزی ہو جائے۔ فطرت نے ہمیں یہ "میں" کا احساس دے کر زندگی کو زندگی بنا دیا ہے۔ یعنی اس "میں" کے پردے میں فطرت خود چھپی بیٹھی ہے اور ہماری فطری جھوٹ نوازی ہی کی وجہ سے ہمارے لئے اندھیرا اندھیرا سا اجالا اجالا ہے تو ظاہر ہوا کہ ہماری خوش اعتقادی ہماری مشکلات کی وجہ نہیں بلکہ ہمارے لئے زندگی ہے! "میں" ہے!

یہ اتنے عالی شان فلسفے کے خیالی ایوان جو انسان نے تعمیر

کئے ہیں۔ یہ مصوری کے شاہ کار یہ حسین مجسّمے یہ سب رنگین جھوٹ نہیں تو کیا ہیں! اور وہ دو رنگین ستون جن پر ہماری زندگی کا انحصار ہے یعنی عورت اور تخیّل وہ بھی تو محض رنگین جھوٹ ہیں اور اس لامتناہی کائنات کے دیوانہ کن پھیلاؤ میں خلا کا تخیّل جو اسے محدود کر کے اس کی ابتدا اور انتہا کو قائم کرتا ہے اور اس نفسا نفسی اور بے ترتیبی میں نظام پیدا کر کے ہمارے لئے ایک تسلّی کا باعث ہے وہ؟ ——!

ممتاز مفتی

بیٹے کی موت

چشمِ معصوم طلبگارِ مدد تھی ہم سے
ہائے ہر موئے بدن چیخ اُٹھا اس غم سے

پھینک دیتی ہمیں دوزخ میں قضا اس کے عوض
ہم کو مقبول تھا ہر دُرد و سزا اس کے عوض

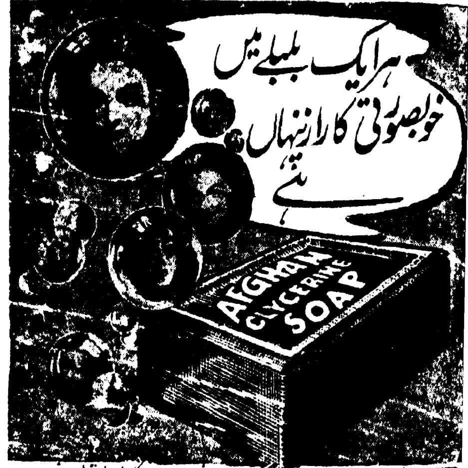
بے بسی ! حیف یہ انساں کا انساں ہونا
دی جو توفیق تو اتنی کہ پریشاں ہونا

درد ہی درد ہے اب درد کا یارا نہ رہا
ڈوبنے والے کو تنکے کا سہارا نہ رہا

غم یہ وہ غم ہے کہ جس غم کی کوئی تھاہ نہیں
اس کی گہرائی سے خود ڈوب کے آگاہ نہیں

دل کو ٹھہراتے ہیں مدہوش کہ ٹھہرے بارے
اضطراب اور بڑھا سعیِ سکوں کے مارے

سنت پرشاد مدہوش



نامعلوم سرزمین کا سفر

مسکراتے ہوئے تاروں کے شبستانوں سے
کس نے جھانکا ہے مجھے رات کی خاموشی میں
کروٹیں لیتی ہوئی دل میں تمنّائے حسیں
یاس کے خواب کی آغوش سے بیدار ہوئی
حسرتِ مُردہ میں جاں پڑنے لگی
روحِ پرنُور کی نیندوں کا سماں طاری ہے

سسکیاں بھرتے ہوئے جس کے شبستانوں سے
بارہا لذتِ دیدار سے ناکام پھرے
اور اُسے اپنی جوانی کے حسیں خوابوں میں
یہ بھی معلوم کبھی ہو نہ سکا
اس کے ایوان کے تاریک و جواں سائے میں
سسکیاں بھرتا ہوا شاعرِ غمگین و نزار
اپنی ناکام جوانی کو لُٹا بیٹھا ہے،
آج اُسی نے مجھے پیغامِ وفا بھیجا ہے۔

مسکراتے ہوئے تاروں کے شبستانوں سے
کس نے جھانکا یہ مجھے رات کی خاموشی میں
بربطِ کاہکشاں پر کس نے
غم میں ڈوبا ہوا اک نغمۂ اُلفت گایا
اور غمِ عشق کو بیدار کیا
ایک عرصہ ہوا دل جس کو بُھلا بیٹھا تھا
اور مرے وہم و گماں میں بھی نہ تھا
اُس کی جانب سے مجھے دعوتِ عشق آئے گی

مسکراتے ہوئے تاروں کے شبستانوں سے
اُس نے دزدیدہ نگاہوں سے مجھے دیکھا ہے۔
میں ہوں کہ جوشِ مستی میں سراپا کھو کر
دوش پرست ہواؤں کے اُڑا جاتا ہوں۔
کسی گمنام سی اقلیمِ مسرت کی طرف

تابش صدیقی

کالج سے گھر تک

میرا کالج تین بجے بند ہوتا ہے۔

دس بجے سے اِس وقت تک کلاسوں میں لیکچر سننا، اور خالی گھنٹوں میں بنچوں پر پہلو بدلنا، ہاتھوں سے چہرہ رگڑنا، ماتھا سہلانا، انگڑائیاں لے لے کر کوفت دور کرنے کی کوشش کرنا ہی کچھ کم تھکا دینے والا نہیں ہوتا، اور اوپر سے آخری گھنٹے میں اقتصادیات کی خشکی، اور لیکچرار صاحب کی بھدی، موٹی اور تھکی ماندی آواز اس احساس کو اور بھی تیز کر دیتی ہے۔ کلاس سے نکل کر قدم آہستہ آہستہ بے ترتیبی سے پڑتے ہیں، سر ایک طرف کو ڈھلکا ہوتا ہے، اور کتابیں نیچے ہاتھ میں لٹکی جھولتی رہتی ہیں۔ سڑک پر پہنچ کر اس خستگی میں کچھ کمی ہوتی ہے، اور پہلی دفعہ محسوس ہوتا ہے کہ اب کل دس بجے تک کے لئے آزادی ہے۔ یہاں میں ہلکا سا سانس لیتا ہوں، اور پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں۔ وہ سامنے اقتصادیات کا کمرہ نظر آ رہا ہے۔ میں فوراً گزرتے ہوئے یکوں اور سائیکلوں کی طرف متوجہ ہو جاتا ہوں۔

مجھے جانا تو ہوتا ہے ڈیڑھ میل، اور گرمی کا گرم سورج میرے ننگے سر کے ساتھ کچھ بہت زیادہ خوش سلوکی سے پیش نہیں آتا۔ مگر پھر بھی میں قدم بڑھانے کی کوشش نہیں کرتا —— نہیں کرنا چاہتا۔ آخر چوبیس گھنٹے میں یہی تو وقت ہوتا ہے جب سکون کے ساتھ کسی بات پر غور کیا جا سکے۔ صبح سے اُٹھ کر پڑھنا دڑھنا لگا ہی رہتا ہے۔ کالج جاتے ہوئے بے چینی ہوتی ہے کہ کہیں گھنٹہ نہ بج جائے — بس بھاگم بھاگ اور شام کو ٹہلنے میں ہلکی ہلکی ہوا کم بخت دماغ کو پتھر کا بنا دیتی ہے، نہ کچھ سوچ سکو اور نہ کچھ . . . . . بس جوتا پھٹ پھٹاتے جاؤ اور آ کر پڑ رہو۔ رات کا وقت تو خیر بنا ہی ناول پڑھنے کے لئے ہے پھر آپ ہی بتائیے کہ کالج سے آنے کے وقت کے علاوہ اور کون سا وقت فرصت کا رہ گیا۔ آخر گھر ہی پہنچنا ہے نا! پہنچ ہی جائیں گے۔ اپنے آہستہ آہستہ! پھر جلدی کاہے کی؟

ذرا آگے چل کر تراہا آ جاتا ہے۔ یہاں سے اس سڑک پر میرے سوا کالج کا کوئی لڑکا نہیں ہوتا، اور تانگوں وغیرہ کی آمد و رفت بھی معمولی ہی سی ہوتی ہے؛ اس لئے مجھے سوچنے کے لئے اور بھی اچھا موقع مل جاتا ہے۔

میرے ڈھیلے بد قطع کپڑوں اور چال ڈھال سے لڑکے مجھے نرا گاؤدی سمجھتے ہیں۔ میں جو خواہ مخواہ دخل در معقولات نہیں کرتا، اور اخباروں کے شذرات پڑھ پڑھ کر سیاسیات پر انٹ سنٹ بحث کرنے کو بے کار خیال کرتا ہوں، تو وہ لوگ سمجھ بیٹھے ہیں کہ میں کچھ جانتا ہی نہیں۔ جب وہ نئے قانونوں، اسمبلی کی تقریروں، بادشاہوں کی قدر و قیمت کے متعلق سرگرمی سے بحث کرتے ہوتے ہیں تو میری طرف پیٹھ کر لیتے ہیں جیسے یہ معاملات مجھ سے بالاتر ہیں۔ اچھا پھر سمجھتے ہیں تو سمجھا کریں، میرا ہی کون سا بڑا حرج ہوتا ہے۔ آخر اور بھی تو بہت سے بڑے بڑے آدمیوں کو اُن کے زمانے والے بے وقوف سمجھتے رہے ہیں۔ ہے تو یہ ٹھیک، مگر اُن لوگوں کے سامنے مجھے یہ محسوس ہونے لگتا ہے جیسے مجھ میں کوئی چیز کم ہے، اور میں بار بار اپنے آپ کو اوپر سے نیچے تک دیکھتا ہوں، لیکن یہاں سڑک پر . . . . . یہاں کون بیٹھا ہے جو مجھے کن انکھیوں سے دیکھ دیکھ کر مسکرا لے گا۔ یہاں تو میرا جس طرح جی چاہے چلوں، مُنہ بناؤں، ہاتھ ہلاؤں؛ بے چارے راہ گیروں کو کیا پڑی ہے کہ کسی پر ہنستے پھریں . . . . . اور آخر میں اُن سے کسی بات میں کم بھی تو نہیں ہوں۔ سیاست . . . . . بین الاقوامی معاملات . . . . . ادب . . . . . کیا نہیں آتا مجھے! بڑے آزاد خیال بن کر چلے ہیں وہاں سے —— مجھے دیکھیں: میں تو خدا کو بھی نہیں مانتا۔ وہ تھے نہ مولانا جواد علی، جو جمعیتہ العلما کی طرف سے تبلیغ کے لئے آئے تھے اور ہمارے ہی محلے میں ٹھیرے تھے۔ کیسے کیسے میرے پیچھے پڑے ہیں، مگر میں نے ہی نہ دی حضرت کو پڑھ کر نماز۔ کہیں یہ لوگ ہوتے تو دم سادھتے ہی بنتی۔ اور ہاں پھر میرے کمیونسٹ خیالات!

ایسے موقعوں پر اگر میں اپنی کھدر کی سفید شیروانی پہنے ہوئے ہوں۔ اور اُس کے دامن ہوا سے دونوں طرف اُڑ رہے ہوں تو میں محسوس کرنے لگتا ہوں گویا میں ایک سفید پروں والا فرشتہ ہوں، اور سڑک پر چلنے والے

آدمیوں سے اونچا ہو گیا ہوں۔ ہوا جب میرے بالوں اور کانوں کے بیچ سے گذرتی ہے تو میری کن پٹیوں کو آہستہ آہستہ سہلاتی ہوئی معلوم ہوتی ہے میں اپنا قد سپاہیوں کی طرح سیدھا کر لیتا ہوں، اور شیروانی کا دامن ایک ہاتھ سے پکڑ کر تھوڑی دیر تک ذرا تیز چلتا ہوں۔

لیکن مجھے یہ بھی تو چاہیئے کہ ان لوگوں پر اچھی طرح واضح کر دوں کہ میں اُن سے کچھ ہیٹا نہیں ہوں۔ اچھا تو آنے دو اب کی ڈیبیٹ۔ ۔ ۔ مگر..... نہیں مذاق اڑائیں گے شریر کہیں کے ..... پھر کالج کے میگزین ہی میں ایک مضمون لکھ ڈالوں لیکن اگر نہ لیا میرا مضمون تو..... ؟ کیا کرنا چاہیئے ..... کیا..... کرنا..... ٹھیک، ٹھیک! اب کے چھٹیوں میں جو گھر جانا ہو تو اپنے پرانے اسکول میں ایک تقریر کر ڈالوں۔ یہ لوگ تو واقعی میری تقریر نہ سن سکیں گے، مگر خیر مجھے تو تسلّی ہو ہی جائے گی کہ میں کوئی ایسا ویسا آدمی نہیں ہوں..... بس تو یہی طے ہے..... ہاں پھر، تقریر کا مضمون کیا رہے گا۔

میں ذرا دیر اپنا چہرہ کھجاتا ہوں، اور پھر تقریروں کے عنوان اور اُن کے متعلق فقرے ذہن میں چکّر لگانے لگتے ہیں..... موجودہ بین الاقوامی صورتِ حالات..... فش..... روس کی معاشرتی حالت..... ہوں، ہوں — لینن، ٹراٹسکی، اسٹالن — کوئی دوسرا..... ورڈس ورتھ کی شاعری ..... نہیں نہیں — "آج روس میں ہر ایک کسان.....!" مگر اس بات کا تعلق تو پہلے مضمون سے ہے..... اچھا پھر..... ادب اور زندگی ..... یہ ٹھیک رہا۔ آخر جاننا چاہیئے کچھ بے چارے ان اسکول کے لڑکوں کو بھی۔ انہیں پڑھایا ہی کیا جاتا ہے، بس وہی غالب..... شمارِ سبحہ مرغوب بُتِ مشکل..... بھلا یہ بھی کوئی شاعری ہوئی..... ہونہہ..... تو بس یہ مضمون ٹھیک رہا۔

اچھا اب اسے شروع کس طرح کیا جائے گا؟ ..... پہلے تو اپنی کم استعدادی کا اعتراف، اور پھر معافی کا مطالبہ وغیرہ..... معزز اساتذہ اور بھائیو"..... انگریزی میں کہتے ہیں لیڈیز اینڈ جنٹلمین۔ مگر عورتیں تو ہوں گی نہیں..... تو پھر یوں..... "غیر حاضر خواتین اور حاضر اصحاب"..... اس سے ایک ہنسی کی بات تو کہہ دی گئی نا..... "آپ سب مجھے جانتے ہیں..... میں اسی اسکول میں پڑھا ہوں..... میں کچھ زیادہ تو جانتا نہیں مگر آپ کی خدمت کے شوق میں حاضر ہو گیا ہوں..... میری غلطیاں معاف کریں گے" ..... اب کوئی لطیفہ یا شعر..... شعر ہی سہی..... یہ مصرع مناسب ہو گا۔

یہی زندگی حقیقت یہی زندگی فسانہ ..... پڑھ کر دیکھ لینا چاہیئے ..... میں چاروں طرف نظر دوڑاتا ہوں۔ لوگ آ جا رہے ہوتے ہیں۔ میں اپنا ہاتھ مُنہ پر اس انداز سے رکھ لیتا ہوں کہ ہونٹوں کے ہلنے کو کافی جگہ رہے، اور ہلکی آواز میں پڑھتا ہوں۔

یے ہی زن ..... دگی حقی قت ..... یہی زندگی ..... فس آنا۔

آپ لوگ غالب کا کلام پڑھتے ہیں، قصیدے پڑھتے ہیں، غزلیں پڑھتے ہیں۔ کیوں پڑھتے ہیں؟ لکھنے والا کیوں لکھتا ہے؟ کبھی آپ نے سوچا؟ بتائیے..... آپ اس لئے..... یہاں میری مُٹھی بندھ جاتی ہے، اور ہاتھ اوپر اُٹھنے لگتا ہے، مگر میں شرما کر اسے جلدی سے نیچے کھینچ لیتا ہوں۔ ..... "آپ اس لئے پڑھتے ہیں شعر کہ آپ زندگی..... ہاں ہاں اس ظالم زندگی..... کہ آپ زندگی کے متعلق جاننا چاہتے ہیں۔ اس کے گہرے رازوں کو سمجھنا چاہتے ہیں، ان سمندروں کی تھاہ لانا چاہتے ہیں۔ اور شاعر کا بھی.....!"

گھوڑے کے ٹاپوں کی زوردار آواز مجھے مڑ کر دیکھنے پر مجبور کر دیتی ہے ..... ہاں، وہی ہے۔ یہ لڑکیوں کا تانگہ مجھے اکثر ملتا ہے۔ ان میں سے ایک لڑکی مجھے بہت پسند ہے۔ وہ ہمیشہ ایک ہی انداز سے بڑی تمکنت کے ساتھ بیٹھتی ہے۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں ہمیشہ کھلی رہتی ہیں، اور وہ کبھی مجھ سے نگاہیں چرانے کوشش نہیں کرتی، بلکہ میری طرف دیکھتی رہتی ہے۔ اس کا چہرہ بیضوی، سفید اور بھرا ہوا ہے، اس کے ہونٹ خوب سُرخ ہیں۔ اور ہمیشہ بند رہتے ہیں۔ میں سوچا کرتا ہوں، کاش! مائیکل اینجلو اس کا مجسمہ بناتا..... لیکن مجسمہ پھر بھی بے جان ہی معلوم ہوتا ہے۔ آنکھیں تو خصوصاً مجسمہ میں پتھرائی ہوئی سی نظر آتی ہیں۔ مونا لیزا کا مصوّر ہی کچھ اس کی نقاشی کرے تو کرے۔ خاص طور سے اس کا سینہ تو مجھے بے حد پسند ہے۔ اس کی سفید جالی دار ساڑھی اور ہلکے جمپر میں سے اچھی طرح اندازہ کر سکتا ہوں..... سفید، ملائم، سڈول ..... کاش میں چھو سکتا! اگر کہیں وہ بھی میری تقریر سن سکے تو مزا ہی آ جائے..... ممکن تو ہے..... ابھی تو چھٹیوں میں بہت دن پڑے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس عرصے میں میری اُس سے ملاقات ہو جائے اور اتنی راہ و رسم بڑھ جائے کہ میں اُسے اپنے ساتھ لے جا سکوں۔ پھر تو مجھے دوسری طرح شروع کرنا پڑے گا۔ میں کہوں گا: "اکیلی خاتون اور بہت سے حضرات" سب ہنس پڑیں گے۔ میرے ساتھ ایک لڑکی کو دیکھ کر کیسا کیسا رشک ہو گا لوگوں کو اور میں خوشی سے دیوانہ ہو ہو جاؤں گا۔

اپنے پرانے انگریزی کے ماسٹر صاحب سے ضرور تعارف کراؤں گا اس کا،

.....تانگہ گذر بھی چکا ہے، اور میں اُسی کے خیال میں غرق، اپنے نچلے ہونٹ کو اوپر کے ہونٹ سے رگڑتا ہوا سر لٹکائے، بائیں ہاتھ سے کتابیں دل کے قریب جلائے ہوئے، اور داہنے ہاتھ کے انگوٹھے سے برابر والی انگلی کو ملتا ہوا، آہستہ آہستہ لڑھکتا رہتا ہوں۔

سورج کی گرمی سر کو جھلس کر رکھ دیتی ہے، بدن میں چنگاریاں سی چھوٹنے لگتی ہیں، اور چہرہ پسینے میں ڈوب جاتا ہے۔ بے قرار ہو کر میں یکایک تیز چلنا شروع کر دیتا ہوں۔ آگے درختوں کا سایہ آتا ہے جو کافی دور تک چلا گیا ہے۔ اسے دیکھ کر میں لپکتا ہوں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا سر کو چکرا دیتی ہے، اور میرا دماغ تیز لہروں کی دھار پر گھومتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس وقت ہر قسم کے خیالات میرے ذہن سے نکل جاتے ہیں، اور میری رفتار بہت دھیمی پڑ جاتی ہے۔

درختوں کے اختتام کے قریب سڑک کے کنارے ایک کمہار کا گھر ہے۔ درختوں کے سائے میں اس کی لڑکی اپنا چاک رکھے آبخورے بنایا کرتی ہے۔ وہ گھٹنوں سے اوپر تک کا پھٹا سا لہنگا اور آدھی بانہوں کا دھاری دار کرتا پہنے رہتی ہے اور اس کی اوڑھنی ڈھلک کر کندھے سے نیچے گر جاتی ہے اُسے اپنے تندرست اور نیم رس سینے کو ڈھکنے کی ضرورت کبھی محسوس نہیں ہوتی جس کا کافی حصہ گریبان میں بٹن نہ ہونے سے راہ گیروں کی نظروں سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اس کے سوکھے ہوئے سخت بالوں کے گچھے اور لٹیں بن گئی ہیں جن میں سے اکثر اس کے تانبا جیسے اور جا بجا مٹی سے سنے ہوئے چہرے پر لٹکتی رہتی ہیں۔ جب وہ اپنے ڈنڈے سے چاک کو گھماتی ہے تو اُس کے بازوؤں کی مچھلیاں گردش کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ اس کی ٹانگیں بے پروائی سے چاک کے دونوں طرف پھیلی رہتی ہیں، اور اُس کی برہنہ چکنی پنڈلیوں پر نیلی نیلی رگیں اُبھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس لڑکی کو دیکھ کر مجھے اپنی تقریر پھر یاد آ جاتی ہے اور میں سوچنا شروع کر دیتا ہوں، میری بھنویں چڑھ جاتی ہیں اور میں بمشکل اپنے لفظوں کو ہونٹوں تک آنے سے روکتا ہوں۔

"آپ نے اپنی شاعری میں قوس قزح کی رنگینی اُڑا لی، اُسے گل و یاسمن میں بسا دیا، موجِ نسیم کے گہوارے میں پالا، بادۂ ناب اور مئے انگوری کی کیفیتیں اس میں بھر دیں، اور طور کی تجلیوں سے اسے ضیا بخشی..... لیکن —— آپ نے زندگی سے کیا لیا —— زندگی..... میرا مقصد ہے زندگی..... کیا آپ نے کبھی خونِ گرمِ دہقاں کی جھلک دکھائی! کیا آپ نے مزدور کی کمر کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کی! کیا آپ نے..... اُن مضبوط لیکن فاقہ کش اور بدحال مزدوروں کی جفاکشی کے گن گائے!..... اگر نہیں تو آپ بے خبر سوتے رہے..... آپ نے آنے والے انقلاب کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں..... ہوشیار..... بیدار ہو جایئے..... اٹھئے اور اپنے ادب کا.....!"

موٹر کے ہارن کی متواتر آوازیں مجھے جگا دیتی ہیں، اور میں ایک طرف ہٹ جاتا ہوں۔ یہ موٹر میری کلاس کے ایک کالے اور بدشکل لڑکے کا ہے۔ وہ میرے سامنے ہی بیٹھتا ہے، اور مجھے ضرور پہچانتا ہوگا، مگر اپنی موٹر میں گزرتے ہوئے جب وہ مجھے دیکھتا ہے تو ناک سکیڑ کر دوسری طرف منہ کر لیتا ہے۔ کرتا ہے تو کر لے، مجھے کیا۔ ایسا کہاں کا لاٹ صاحب ہے بڑا۔ اور ہو بھی تو کیا ہے۔ انقلاب بھی تو نزدیک آ رہا ہے اور تھوڑے دن میں کیسا پھر کھل جائے گی حقیقت!..... اپنے منتقمانہ ارادوں کے پورا ہونے کی اتنی قریب اُمید پر ایک رمزیہ مسکراہٹ میرے ہونٹوں تک آ جاتی ہے۔ اور اس طرف سے مطمئن ہو کر میں اپنی تقریر سوچنے لگتا ہوں۔ اس وقت مجھے سلسلے کی کچھ زیادہ فکر نہیں ہوتی۔ کیونکہ ابھی تو خیالات کو جمع کرنا ہے، اُن کی مناسب ترتیب تو موقع پر ہوتی رہے گی۔

کسی مشہور انگریزی مصنف کا قول بھی آنا چاہیئے تقریر میں۔ آخر لوگوں کو یہ معلوم تو ہو کہ ہم نے بھی انگریزی ادب کا مطالعہ کیا ہے۔ اچھا تو پھر کون سا مصنف..... میتھیو آرنلڈ..... ادب تنقیدِ حیات ہے..... مگر نہیں، چھوڑو۔ بہت پامال ہے یہ..... شیلی کا وہ شـ ایسی ایسی شکلیں جو بقا کی پروردہ ہیں..... لیکن یہ تو میرے مقصد کے خلاف رہے گا! مجھے تو زندگی کے متعلق کہنا ہے..... پھر؟..... شاید لینن نے کہا تھا کہ یہ سر ہلانے کا وقت نہیں ہے بلکہ سر توڑنے کا..." لیکن کوئی ٹھوس چیز ہونی چاہیئے..... کس نے لکھا ہے وہ؟..... والٹر پیٹر..... بینٹ..... فرائی..... خیر، کوئی بھی سہی۔ یوں کہا جا سکتا ہے "کتنی اچھی بات کہی ہے ایک انگریز نقاد نے کہ ادب زندگی سے پیدا ہوتا ہے، زندگی سے نشوونما پاتا ہے، اور زندگی پر ہی اثر انداز ہوتا ہے"۔ اپنے میں یورپ کے مصنفین کے اقوال نقل کرنے کی صلاحیت پا کر مجھے اتنی خوشی ہوتی ہے کہ میں اپنی تقریر کو بھول کر کچھ دیر اسی خیال سے لطف اٹھاتا رہتا ہوں، اور بار بار مسکرا پڑتا ہوں۔ میں اُس دن کا تصور کرتا ہوں جب میں اپنی تقریر میں یہ اقوال دہرا رہا ہوں گا..... لڑکے میری قابلیت پر تعجب کریں گے۔ فارسی

کے ماسٹر صاحب گردن بڑھا بڑھا کر مجھے گھوریں گے۔ مرعوب تو وہ بھی ہو رہے ہوں گے، مگر اس پر جھنجلا رہے ہوں گے کہ میں نے ابھی تک فارسی کا ایک شعر بھی نہیں پڑھا۔ اور آخر میں کیوں پڑھوں صاحب۔ بھلا کہاں انگریزی کہاں فارسی!..... گھر جا کر بھی تو لڑکے ———

"ارے، ہٹتے بھی ہو آگے سے کہ نہیں" ایک پسینے میں شرابور اور سر سے پیر تک سیاہی سے پُتا ہوا مزدور کوئلے کی بوریوں سے لدے ہوئے چھکڑے کو کھینچتے ہوئے پیچھے سے پکار کر کہتا ہے، اور ساتھ ہی زیرِ لب ایک غیر شگفتہ اصطلاح کا اضافہ بھی کرتا ہے..... ان لوگوں کی ایسی باتوں سے میرے دل کو ایک دھکا سا لگتا ہے..... ہمارا تو یہ حال کہ ہم اُن کی حمایت میں تقریریں سوچیں، ان کی خاطر سرمایہ داری کے خلاف دانت پیسیں، اُن کی حالت پر افسوس کریں...... اور ان کا ایسا سلوک ہمارے ساتھ؟..... کیا حالت ہے دنیا کی بھی..... اپنے ہمدردوں کا بھی تو لحاظ نہیں کرتے یہ لوگ...... نہ جانیں، نہ پہچانیں،..... جانور کہیں کے۔ میں ارادہ کر لیتا ہوں کہ اب اپنی تقریر کا موضوع بدل دوں گا، اور اقبال کے فلسفۂ حیات پر بولوں گا..... مگر پھر مجھے خیال آتا ہے کہ کچھ ایسا تصور بھی تو نہیں ان بے چاروں کا..... جاہل ہی ہیں نا آخر..... چلو چھوڑو بھی، اپنی طرف دیکھو۔

ہاں تو..... وہ ادب جو زندگی سے رشتہ مضبوط رکھے، جو زندگی کی ترجمانی کرے..... جو..... زندگی..... زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب۔ اور ساتھ ہی ایک مزدور گھوڑے پر پڑنے والے کے چابکوں کی سزا سہتا ہے ——— ایک مرتبہ یونانیوں نے اپنے ایک شاعر کو اس لئے سزا دی تھی کہ وہ ان کی زندگی کے مصائب اپنے شعروں میں بیان کیا کرتا تھا..... زندگی مصائب سے پُر ہے..... مصائب..... ظلم...... بے انصافی..... اور یہ مزدور.....

میرا خالی ہاتھ کبھی اوپر آتا ہے، کبھی نیچے جاتا ہے، اور کبھی گھونسے کی شکل اختیار کر کے ہوا کو مارتا ہے۔ میرے ہونٹ بھی کچھ ہلتے ہوتے ہیں۔ مگر مجھے اس کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب دو اسکول کے لڑکے اپنی سائیکلوں پر میرے پاس سے گذرتے ہیں اور مجھے دیکھ کر قہقہہ مارتے ہیں۔ میرے خون کی گردش رُک سی جاتی ہے، اور کن پٹیاں بھاری اور گرم ہو جاتی ہیں لیکن میں آہستہ آہستہ اپنے بدن کو دوبارہ ڈھیلا کر لیتا ہوں۔ اور پھر..... "آپ لوگ اب بڑے ہونے والے ہیں۔ آپ کو اپنے فرض کا احساس ہونا چاہیے۔ ...... بچہ قوم کا باپ ہوتا ہے..... اب آپ لوگوں کے ہاتھ باگ ہے

آپ کو نیا ادب پیدا کرنا ہے..... زندگی سے باہر آپ کہاں جا سکتے ہیں۔ زندگی ایک چیتا ہے..... غور سے، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھیے زندگی کو..... ایک شاعر ہے آج کل انگریزی کا۔ وہ کہتا ہے کہ میں محبت کرتا ہوں چائے کی پیالیوں سے، کمبلوں سے، ریل کے....."

"چھوٹے نندیے نندی" ——— پگلا نذر دو چیخ چیخ کر گا رہا ہے، اور ساتھ ہی سڑک پر ناچتا بھی جاتا ہے۔ لڑکے اُسے چاروں طرف سے گھیرے رہتے ہیں، اور خود بھی چلاتے جاتے ہیں "کیا کہنے ہیں بجرو بیٹا کے"۔ پوسا پکوڑی والا دور بیٹھا لڑکوں کو شہہ دیتا رہتا ہے۔ یہ پوسا پنواڑی کی دکان کے قریب پیپل کے نیچے چبوترے پر بوری بچھائے بیٹھا کڑوے تیل میں پکوڑیاں پکایا کرتا ہے جس کی چرائند دور دور پھیلی رہتی ہے۔

اب گھر اتنا نزدیک آ جاتا ہے کہ تقریر کے متعلق کچھ اور سوچنا مشکل معلوم ہونے لگتا ہے۔ باقی حصے پر کل غور کرنے کا ارادہ کر کے میں چال کو تیز کر دیتا ہوں۔

بعض دفعہ یہ ہوتا ہے کہ مجھے بارش آ گھیرتی ہے۔ ایسے موقعوں پر اکثر بادل گھنٹہ ختم ہونے پر اٹھنا شروع ہوتے ہیں۔ لیکن میں ان کی دہشت ناک شکل کو ذرا خاطر میں نہیں لاتا۔ سورج کی جھلسن کا پتہ بھی نہیں ہوتا؛ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا بھی چل رہی ہوتی ہے۔ ایسے میں طبیعت کی روانی کا کیا پوچھنا ——— جیسے چلے جا رہے ہوں ہلکے ہلکے اڑتے ہوئے۔ اور پھر یہ کوئی لازمی تھوڑی ہے کہ بارش ہو، میں اپنی تقریر سوچتا ہوا چل دیتا ہوں ——— اور دونوں سے بھی آہستہ خطرے کے نزدیک ہونے کا احساس مجھے اس وقت ہوتا ہے جب یکے اور تانگے پوری رفتار سے گھڑ گھڑاتے ہوئے دوڑنے لگتے ہیں، سائیکلوں کی گھنٹیاں بے تابانہ زور زور سے بجتی ہیں، اور گھاس والیاں ایک ہاتھ سے اپنے لہنگے سنبھالتے ہوئے یہ کہہ کہہ کر بھاگنا شروع کر دیتی ہیں کہ "بھاگو بھئی پانی آ لیو"، میں بھی گھبرا کر جلد جلد قدم بڑھاتا ہوں ——— موٹی موٹی بوندیں پڑتی ہیں۔ اب میں بھاگنے کی تیاری کرتا ہوں مگر بارش ایک ساتھ آ جاتی ہے..... یوں ہونے کو تو میں ماجی غلام رسول ٹرنک ساز کی دکان میں پناہ لے سکتا ہوں اور ایک دفعہ میں نے کیا بھی یہی تھا۔ بارش جو آئی تو میں سیدھا حاجی جی کی دکان پر چڑھ گیا۔ حاجی جی لکڑی کی کرسی پر دونوں پیر اوپر رکھے بیٹھے تھے، اور حقہ پیتے ہوئے کسی سے باتوں میں مشغول تھے۔ میں بھی کھڑا ہو کر سننے لگا۔ اسکول کی لڑکیوں کا ذکر ہو رہا تھا۔ حاجی جی نے اپنے مخاطب کی طرف جھک کر میری طرف مشتبہ نظروں سے دیکھتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں کہا: "اور بھئی لو بیسیوں واقعے تو خود مجھے معلوم ہیں، جب بورڈنگ کی لڑکیوں کے بچے پیدا ہوئے ہیں آخر کچھ حد ہے بےحیائی

کی۔"

میں بھی بول اٹھا" لیکن جب آپ کی بھینس سچ مچ دیتی ہے تو اُسے بے حیا کیوں نہیں کہتے؟"

حاجی جی نے اس غیر متوقع جارحانہ حملے کو جس نے انہیں ہڑبڑا دیا تھا کچھ زیادہ پسند نہیں کیا۔ لیکن جلد ہی انہوں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا، اور داڑھی کو اس طرح اوپر اٹھاتے ہوئے بولے گویا وہ بھی ان کی دلیل کا ایک حصہ ہے۔" تو آدمی اور بھینس کی کیا مثال؟"

"بھینس آدمی نہیں ہوتی کیا؟" میں نے بغیر سوچے جواب دیا۔

"بھینس آدمی؟" حاجی جی کے حقے کی نے نیچے گر پڑی۔

"ہاں آدمی، یعنی یہ کہ . . . . جاندار تو ہوتی ہے۔"

میری اور حاجی جی کی خاصی جھڑپ ہوگئی جس کے دوران میں انہوں نے میری ذات کے متعلق کچھ بہت اچھے خیالات کا اظہار نہیں کیا حالانکہ انہیں میرے وہاں کھڑے رہنے پر فی الحال کوئی اعتراض نہیں تھا۔

مگر میں بارش کے باوجود وہاں سے چل دیا۔ جب سے میں کبھی ان کی دُکان میں نہیں جاتا، چاہے کتنے ہی زور کی بارش کیوں نہ آجائے اور پھر بارش ہمیشہ اُس وقت آتی ہے جب میرا ایک تہائی کے قریب راستہ رہ جاتا ہے۔ اس لئے میں سیدھا بھاگ ہی لیتا ہوں۔ بارش کا زور بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ بوچھاڑ آنکھوں کو بند کئے دیتی ہے کتاب کا رنگ چھوٹ چھوٹ کر کپڑوں پر ٹپکنے لگتا ہے۔ مگر میں بھاگے ہی چلا جاتا ہوں۔ بارش کے وقت پوسا پکوڑی والا اپنا سامان پنواڑی کے تخت کے نیچے سرکا دیتا ہے، اور چبوترے پر پیر نیچے لٹکا کر بیٹھ جاتا ہے۔ وہ کبھی ایک دھوتی کے سوا اور پہنتا ہی کیا ہے، اس وقت تو وہ دھوتی کو بھی اوپر چڑھا لیتا ہے اور ران پر ہاتھ مار مار کر زور سے گاتا جاتا ہے۔ "برسو رام جھڑا کے سے۔ بڑھیا مر گئی پھاکے سے"

جب میں بھاگ رہا ہوتا ہوں تو اُس کی آواز ایک عفریتانہ تمسخر کے ساتھ، تُند، کرخت، ایک دھمکی لئے ہوئے بارش کی دھار کو چیرتی پھاڑتی میرے تعاقب میں دوڑی چلی آتی ہے — برسو رام جھڑا کے سے —!

میں اپنے مکان کے سامنے کے میدان کو گھوڑوں کی لید اور کیچڑ میں پھنستے ہوئے اور پرنالوں کے پانی میں پچ پچ کرتے ہوئے طے کرکے سر سے پیر تک پانی میں ڈوبا ہوا زینے کے دروازے تک پہنچتا ہوں۔ جیب سے چابی نکالنا چاہتا ہوں تو جیب ایسی چپک جاتی ہے کہ چابی بڑی مشکل سے ہاتھ لگتی ہے۔ پھر تالا بھی کھلنے میں دقت پیدا کرتا ہے۔ جلد جلد اوپر پہنچ کر میں کتابوں کو چارپائی پر پھینک دیتا ہوں۔ شیروانی کو آہستہ آہستہ اُتارتا ہوں، اور اُسے اُلٹ پلٹ کر نہایت غور سے دیکھتا ہوں گویا میری نگاہ کی گرمی سے وہ خشک ہو جائیگی یا اُس کی رگڑ سے کتاب کا بہا ہوا رنگ چھٹ جائے گا۔ پھر میں اسے نہایت احتیاط سے کواڑ پر ٹانگ دیتا ہوں، اور بغیر کپڑے اتارے، بالوں کو تولئے سے سکھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ اتنے میں چھدن بکے والا اوپر چڑھ آتا ہے، اور کواڑ سے لگ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ تھوڑی دیر تو وہ تیز نظروں سے حالات کا جائزہ لیتا ہے۔ اور پھر چونکتے ہوئے مسکرا کر کہتا ہے۔

"کہو بابو جی، بھیگ گئے آج؟" اور ساتھ ہی اس کے دھکے سے شیروانی کواڑ پر سے نیچے کچی زمین پر گر پڑتی ہے، اور مٹی میں سن جاتی ہے۔

اور یہ وہی میری کھدر کی سفید شیروانی ہوتی ہے۔

. . . .

اگلے دن میں دنیا کے آئندہ نظام کے متعلق تقریر سوچتا ہوں۔

محمد حسن عسکری

غزل

جو کچھ چاہیں وہ فرمائیں، اُن کو تم فرمانے بھی دو
میرے دل کی حالت دیکھو، اُن کو قسمیں کھانے بھی دو

خشک ہوا ہے نخلِ تمنا، پھلنے کی امید نہیں ہے
باقی ہیں جو پھول کہیں پر اُن کو اب مرجھانے بھی دو

جینا کیا، جینے کی خوشی کیا، دل ہے جب بربادِ تمنا
جاؤ اب آنسو نہ بہاؤ، مجھ کو تم مر جانے بھی دو

ناز و ادا سے کام رکھو تم، جور و جفا کی مشق کرو تم
کوئی اگر مٹتا ہے جہاں میں اُس کو تم مٹ جانے بھی دو

رگ رگ میں اک آگ لگی ہے، دل ہے تیرِ غم کا نشانہ
رونے دو، رونے دو مجھ کو، آنسو کچھ بہہ جانے بھی دو

ختم نہ ہوگی غم کی کہانی، نیند تمہیں جھٹ آجائے گی
چھوڑو بھی اس افسانے کو، جانے بھی دو جانے بھی دو

عہدِ وفا کوکب! دھوکا ہے، کوئی کسی کا کب ہوتا ہے
غم نہ کرو اگلی باتوں کا، یاد آئیں یاد آنے بھی دو

کوکب شادانی

اچھی کتابیں زندگی کو اچھا بناتی ہیں

لیکن ہر شخص کو اچھی اور بُری کتابوں میں تمیز کا موقعہ حاصل نہیں۔ خصوصاً آج کل کے تیز رفتار زمانے میں جب کہ ہر بری چیز اپنا ظاہری دلکش لباس پہنے نگاہوں کو دھوکا دینے کے لئے ہر طرف موجود رہتی ہے۔ اس دھوکے سے بچنے کے لئے سکون اور وقت کی ضرورت ہے۔ ان وجوہات کے مدنظر کتبخانہ ادبی دنیا لاہور نے فیصلہ کیا ہے کہ ادبی دنیا کے پڑھنے والوں اور عام پبلک کے لئے وقتاً فوقتاً چنی ہوئی کتابوں کی مختلف فہرستیں شائع کی جائیں اس انتخاب کی ضمانت صلاح الدین احمد اور میراجی مدیران ادبی دنیا کا نام ہے انہوں نے نہایت محنت اور وقت صرف کرنے کے بعد یہ انتخاب کیا ہے اور جو بلند نظری اور معیار کی خوبی ادبی دنیا کے مضامین میں دکھائی دیتی ہے اُسی کا لحاظ ان فہرستوں میں بھی رکھا ہے۔ ناظرین کی آسانی کے لئے یہ تمام کتابیں کتب خانہ ادبی دنیا میں فراہم کر لی گئی ہیں تاکہ ایک ہی جگہ سے بغیر کسی دقت کے آپ کو یہ چنی ہوئی کتابیں مل سکیں ہمیں امید ہے کہ ہر ماہ ناظرین ان فہرستوں کا مطالعہ کر کے ان سے فائدہ اٹھائیں گے۔

افسانے

- فردوس خیال — منشی پریم چند — ۱ہر
- پریم بتیسی حصہ اول و دوم — 〃 — ۲ہر
- نظارے — کرشن چندر — عہ
- منٹو کے افسانے — سعادت حسن منٹو — ۱ہر
- سحر فرانس — طاہر قریشی — ۱ہر
- دانہ و دام — راجندر سنگھ بیدی — ۱ہر
- باسی پھول — سید علی عباس حسینی — ۱ہر
- شعلے — پروفیسر احمد علی ایم اے — عہ
- سوز ناتمام — عاشق حسین بٹالوی — ۱عہ
- چغتائی کے افسانے — مرزا عظیم بیگ چغتائی — تے
- صنوبر کے سائے — حجاب امتیاز علی — عہ
- میری ناتمام محبت — 〃 — ۱ہر
- طلسم خیال — کرشن چندر — ۱ہر
- اندھی دنیا — اختر انصاری — عہ
- ڈاچی — اپیندر ناتھ اشک — ۱ہر
- پس پردہ — چندر بھوشن سنگھ — ۱۲ر
- ساز فطرت — حسن عزیز جاوید — ۱ہر
- محبت اور نفرت — اختر حسین رائے پوری — ۱ہر
- ہیبت ناک افسانے — امتیاز علی تاج — ۱ہر

مزاحیہ

- پطرس کے مضامین — احمد شاہ بخاری — ۱ہر
- حاجی لق لق کے افسانے — حاجی لق لق — ۱۱ر
- سطائبات — سندباد جہازی — عہ
- جدید جغرافیہ پنجاب — 〃 — ر
- دنیائے تبسم — شوکت تھانوی — ۱عہ
- مضامین فلک پیما — فلک پیما — تے
- روح لطافت — مرزا عظیم بیگ چغتائی — ۱عہ
- روح ظرافت — 〃 — ۱ہر
- کونتار — 〃 — عا

ڈرامے

- انارکلی — امتیاز علی تاج — ۱ہر
- ریڈیو ڈرامے — فضل حق قریشی — عہ
- منتوش — حکیم احمد شجاع ۸ر — مینا — حکیم احمد شجاع — ۱۲ر
- ہملٹ — مترجمہ عنایت اللہ دہلوی — عہ
- فاوسٹ — گوئٹے — ۱ہر
- چند لوریاں — نورالٰہی محمد عمر — ۸ر
- چند ڈرامے — 〃 — ۸ر

منظومات

- بانگ درا — اقبال — ۲عہ
- نقش و نگار — جوش ملیح آبادی — ۲ہر
- فکر و نشاط — 〃 — ۱عہ
- بہارستان — مولانا ظفر علی خاں — للعہ
- سوز و ساز — حفیظ جالندھری — ۶
- نغمہ زار — 〃 — ۱ہر
- گیت مالا — 〃 — ۶ر
- چراغاں۔ احسان دانش ۲ر — آتش خاموش — احسان دانش — ۱ہر
- نغمہ حرم۔ اختر شیرانی ۱ہر — نقش دوام — عبدالحمید عدم — ۶

ملنے کا پتہ: کتب خانہ ادبی دنیا۔ دی مال۔ لاہور

ترقی پسند ادب اور مزدور

ادب اور زندگی کا کچھ ایسا چولی دامن کا ساتھ ہے کہ زندگی کے بغیر ادب کا تصور بھی ایک بے معنی سی چیز ہے۔ ادب عکاسی ہے زندگی اور اُس کے تجربات کی۔ درحقیقت زندہ ادب وہی ہے جس میں وہ گرم خون رواں دواں ہے جو زندگی کی روح ہے۔ ایک ادیب اپنے ماحول کی پیداوار ہوتا ہے وہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہم صدیاں گذر جانے پر بھی اُس کے ماحول اور زمانے کی ایک جھلک دیکھ سکتے ہیں۔ ایک ادیب بھی عام چلتے پھرتے انسانوں کا سا ایک انسان ہے اور یہ ناممکن ہے کہ اُس کے زمانے کے واقعات و حوادث اس پر اپنا اثر نہ چھوڑیں۔ ہاں وہ عام انسانوں سے اس بات میں ممتاز ہے کہ وہ ایک حساس اور سوز و گداز سے لبریز دل رکھتا ہے اور کوئی حقیر سے حقیر حادثہ یا واقعہ بھی اس پر ایک گہرا اور پائیدار نقش چھوڑ جاتا ہے۔ اُس کی دوربین نگاہیں ان واقعات و حادثات کی ظاہری صورت سے ہی ان کی اہمیت کا اندازہ نہیں کرتیں بلکہ ان کی نامعلوم گہرائیوں تک اُتر جاتی ہیں اور وہ پورے غور و خوض کے بعد ایک ایسی دنیا کا تخیل پیش کرتا ہے جس کی ضرورت کی دلیل یہ حادثات ہوتے ہیں۔

آج کل ہر طرف "ترقی پسند ادب" کا چرچا ہے اور یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ ادب کا ایک جگہ ساکن ہو جانا خودکشی کے مترادف ہے۔ زندگی اور تغیر دوش بدوش چلتے ہیں اور اگر ادب اپنے حقیقی اعلیٰ و ارفع مقام پر متمکن رہنا چاہتا ہے تو اُسے بھی لازمی طور پر زندگی کے ساتھ ساتھ بدلتے رہنا پڑے گا۔ ہر زمانے کا ادب اُس وقت کے مخصوص سیاسی، اقتصادی، مذہبی اور مجلسی حالات کی پیداوار ہوتا ہے۔ مثلاً جب مطلق العنان بادشاہت کا دور دورہ تھا تو اُس زمانے کا ادب بھی اُسی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ ایک مطلق العنان ذہنیت کا آئینہ دار تھا۔ اُس وقت کے ادب کا پس منظر بھی وہی شاہانہ شان و شوکت اور درباری طنطنہ تھا۔ اس ادب میں طبقہ وسطیٰ اور جمہور کا اول تو کوئی ذکر ہی نہیں اور اگر ہے بھی تو محض ثانوی حیثیت سے۔ قصیدہ بھی اسی زمانے کی خاص ایجاد ہے۔ اس کے بعد یعنی طبقہ وسطیٰ کی جمہوری حکومت کے زمانے کے ادب میں بھی عوام کی زندگی کی کوئی

ضروری نہیں ہے البتہ اتنا ضرور تھا کہ کہیں کہیں اس مظلوم طبقے کی حالتِ زار کا ذکر کر دیا جاتا تھا اور بس! آج جبکہ اشتراکیت کا سیلاب بڑھا آ رہا ہے اور حقیقی طاقت طبقہ وسطیٰ کے ہاتھوں سے چھین کر جمہور کے ہاتھوں میں جاتی دکھائی دے رہی ہے۔ ہمارے ادب میں بھی کروٹ بدلنے کے آثار دکھائی دینے لگے ہیں۔ اس ذہنی انقلاب نے ہمارے سامنے ادب کی ایک نئی صنف لا کھڑی کی ہے۔ میری مراد ترقی پسند ادب سے ہے۔ اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ترقی پسند ادب کی ترقی کو اب کوئی بڑی سے بڑی رجعت پسند طاقت بھی نہیں روک سکتی۔ کیونکہ یہ محض کوئی چیز نہیں ہے بلکہ نتیجہ ہے اس مخصوص ذہنی اقتصادی کا جو اس سیاسی اور اقتصادی تبدیلی کا پیدا کردہ ہے۔ لہٰذا جب تک اس سماجی تبدیلی کو نہ روکا جائے (جو قطعاً ناممکن ہے) اُس وقت تک ترقی پسند ادب کی مخالفت ایک طفلانہ حرکت سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔

یہ مقولہ بھی کس قدر مضحکہ خیز ہے کہ "ادب کو کسی ایک فلسفہ حیات کا فریق نہیں بننا چاہیئے۔ غیر جانبدار رہتے ہوئے تصویر کے دونوں رُخ نمایاں کر کے فیصلہ ناظرین پر چھوڑ دینا چاہیئے۔" آخر ادیب کوئی فرشتہ تو ہوتا نہیں کہ سیلِ حوادث اپنے تیز دھارے پر ہر نیک و بد کو اس کی آنکھوں کے سامنے بہائے لئے جائے اور وہ پتھر کی مورت کی طرح خاموش بیٹھا دیکھتا رہے وہ سماج کا ایک بے معنی فرد نہیں ہوتا۔ اس دنیا کو بہتر بنانے اور ایک شاندار نصب العین کی طرف لے جانے میں اُس کا بھی ایک بہت بڑا حصہ ہوتا ہے۔ بلکہ وہ دنیا کی رہبری کرنے کی اوروں سے زیادہ اہلیت رکھتا ہے کیونکہ اُس کی نظر غائر اور دل حساس ہوتا ہے۔ اگر وہ کسی سماجی نظام سے مطمئن نہیں تو یہ اس کا فرض ہے کہ وہ اس نظام کی برائیاں عوام کے سامنے اس طرح پیش کرے کہ وہ خطرات سے بے نیاز ہو کر اُس کو بدلنے پر تل جائیں اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو ایک خطرناک قسم کا مجرم ہے۔ ضمیر کش ہے۔ ایک ادیب جب غریب عوام کو سرمایہ داری کے ریشم و اطلس و کمخواب کے حسین مگر بھیانہ طلسم میں گرفتار دیکھتا ہے تو بے چین ہو جاتا ہے اور اس

ظلم کو روکنے اور دنیا کو اس شرمناک پستی سے نکال کر بلندی تک لے جانے کی کوشش کرتا ہے جہاں امیر و غریب کا کوئی امتیاز نہ رہے۔ یہ تمام معجزے وہ ادب ہی کے ذریعے سے سرانجام دیتا ہے اور عموماً کامیاب رہتا ہے کیونکہ وہ ایک ادیب ہے۔ لہٰذا مقصدی ادب ایک ایسی ضرورت ہے جس سے فرار و گریز ناممکن ہے۔ ہاں اس کو بے راہ روی سے روکنا ایک ناقد کا فرضِ اوّلین ہے۔

بعض ادبا و شعرا موجودہ تلخ حقائق سے بچنے کے لئے ان حقائق کی طرف سے ہی آنکھیں بند کر رہے ہیں لیکن اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ حقائق کو نظر انداز کر دینے سے حقائق بدل ہرگز نہیں سکتے۔ ہاں وقتی طور پر نظروں سے اوجھل ضرور ہو جاتے ہیں لیکن آنکھیں کھلتے ہی وہ تلخ تر بن کر سامنے آ جاتے ہیں۔ وہ غم دنیا سے بچنے کے لئے اس بات کی کوشش نہیں کرتے کہ موجودہ نظام کو جس کی وجہ سے یہ تلخیاں پیدا ہوئی ہیں، بدل دیں بلکہ وہ رومانیت کے حسین لیکن نازک پردے میں چھپ کر ان سے پناہ لینا چاہتے ہیں۔ وہ "تیرا غم ہے تو غمِ دہر کا جھگڑا کیا ہے" کا ورد کر کے خود کو فریب دینا چاہتے ہیں لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ بہت جلد ان کو "اور بھی غم ہیں جہاں میں غمِ فرقت کے سوا" کی ناقابلِ تردید حقیقت سے دوچار ہونا پڑے گا۔ لہٰذا ہمارے ادیب کو ان تلخ حقائق سے گریز نہیں بلکہ ان کے میدانِ وغا میں کود کر ان کا مردانہ وار مقابلہ کرنا چاہیئے۔

لیکن آج بہت سے ناتجربہ کار نوجوان ادیب اس ترقی پسندی کی رَو میں بہہ کر بے راہ ہوتے جا رہے ہیں۔ وہ ترقی پسند ادب کو ایک محدود سی چیز بنا کر اس کا اصل جوہر یعنی زندگی کی ترجمانی کا رتبہ اس سے چھین رہے ہیں۔ یہ نئے ترقی پسند ادیب یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ جوش کسانوں اور مزدوروں کے مصائب بیان کرنے سے ہی شاعرِ انقلاب بن گیا ہے۔ وہ احسان دانش کی مقبولیت کا راز صرف اس بات میں سمجھتے ہیں کہ اُس نے مزدوروں کی ناگفتہ بہ حالت پر قلم اٹھایا ہے مگر وہ ان شعرا کی فنی خوبیوں اور ان کی شاعری کی اصل روح یعنی انقلاب کے لئے دلی تڑپ کو یکسر نظر انداز کر جاتے ہیں (جو ان کے ہر ہر شعر سے نمایاں ہے)۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ انہوں نے جو کچھ لکھا وہ اُن کے ذاتی تجربات یا گہرے مشاہدے کے تاثرات ہیں۔ وہ ادیب پہلے ہیں اور ترقی پسند بعد میں۔ لیکن یہ نئے ادیب بالقاّل ان تمام باتوں کو نظر انداز کر کے اُن کے کلام کی صرف ظاہری شکل و صورت کی نقالی شروع کر دیتے ہیں اور اس طرح اس کار آمد فنِ لطیف کو رسوا کرتے ہیں۔

اِن نقالوں کے کلام کو ترقی پسند ادب کہنا ادب کی توہین کے مترادف ہے۔ ہم اِن کو ترقی پسند تو کہہ سکتے ہیں لیکن وہ ادیب ہرگز نہیں۔ کیونکہ ان کے کلام میں اُس لطیف شے کا فقدان ہوتا ہے جو ادب کو پروپیگنڈے سے ممیز کرتی ہے۔ ہماری مراد جمالیات سے ہے۔ ان کے کلام میں جان نہیں ہوتی۔ رس نہیں ہوتا کیونکہ یہ دلی تاثرات کسی خاص تعمیری جذبے کے حامل نہیں ہوتے۔ بلکہ محض نقالی کے طفیل معرضِ وجود میں آتے ہیں۔ یہ ادیب ادب کو زندگی کے دوش بدوش چلنے کے لئے سوچتے ہوئے دماغ اور دھڑکتے ہوئے دل نہیں دے سکتے۔ ان کے ادب اور کامریڈ یوسف مہر علی اور ایم این رائے جیسے اشتراکی لیڈروں کی تقریروں میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ بعض اوقات تو یہ حضرات ترقی پسندی کے شوق میں عجیب و غریب اور مضحکہ انگیز باتیں کہہ جاتے ہیں۔ مثلاً ایک صاحب کسان کی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "جب کسان اپنے عمر سے ہل کا ندھے پر رکھے بیلوں کی جوڑی کو ہانکتا ہوا کھیت کی طرف روانہ ہوتا ہے تو سورج ہل کے چمکتے ہوئے پھل پر اپنی شعاعوں کے نیزے مارتا ہے لیکن وہ اس سے ٹکرا کر اپنی طاقت کھو دیتے ہیں اور فضا میں گم ہو جاتے ہیں" اب اس بے چارے "ترقی پسند ادیب" کو کون سمجھائے کہ میاں غریب کسان تو اس وقت بیدار ہو کر اپنے کھیت کو روانہ ہو جاتا ہے جب آپ ابھی خوابِ راحت میں مدہوش ہوتے ہیں اور جب ستارے آسمان پر ابھی انگڑائیاں ہی لے رہے ہوتے ہیں۔

ترقی پسند ادب کے علمبردار تین گروہوں میں منقسم کئے جا سکتے ہیں پہلا گروہ اُن ادیبوں کا ہے جو ذاتی تجربات کی بنا پر اپنے دل میں اس مظلوم طبقۂ جمہور سے ایک بے پایاں ہمدردی رکھتا ہے۔ وہ اپنے ادب کے ذریعے سے لوگوں کی توجہ اِن کی مشکلات اور اِن کے مسائل کی طرف مبذول کرا رہے ہیں اور اس طرح ایک ذہنی انقلاب پیدا کر کے جس کا لازمی نتیجہ عملی انقلاب ہو گا، ایک نئی دنیا کی تخلیق میں کوشاں ہیں۔ دوسرا طبقہ اُن ادیبوں کا ہے جو ذاتی تجربات کی بنا پر تو نہیں البتہ اپنے گہرے مشاہدے اور وسیع مطالعے کے ذریعے سے سماجی نظام کی خرابیوں کو پا گئے ہیں اور اس کو بدلنے کی آرزو رکھتے ہیں۔ اِن کے دل موجودہ نظام کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہو چکے ہیں اور وہ اِس تمنائے انقلاب کا اظہار اپنے ادب کے ذریعے سے کرتے رہتے ہیں۔ تیسرا گروہ اُن نقالوں کا ہے جو نہ تو تجربات و مشاہدات کے ذریعے سے اس طبقے کی بنیادی ضروریات اور مشکلات سے آگاہ ہیں اور نہ اِن مسائل کا ابھی

طرح مطالعہ کر پاتے ہیں جو ہمدردانہ مشاہدے کے لئے مچل رہے ہیں۔ ان کے دل میں اس مظلوم طبقے کے لئے کوئی درد نہیں۔ ہاں کچھ بمقتضائے فیشن اور کچھ ترقی پسند کہلانے کی دُھن اور جھوٹی شہرت کے حصول کی خاطر ایک بے جان سا اشتہاری ادب پیدا کرنے کے مجرم بن رہے ہیں۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ یہ بیسرا گروہ بجائے نقالی کے ادب کی کوئی حقیقی خدمت کرے جس کا وہ اہل ہو۔ ترقی پسند ادب صرف کسانوں کے ہل اور مزدوروں کے بوجھ تک ہی محدود ہو کر نہیں رہ گیا ہے بلکہ اس کا احاطہ بہت وسیع ہے۔ اس کے دامن میں زندگی اپنی پوری وسعتوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ میں پروفیسر فیض احمد صاحب سے اس بات میں تو متفق ہوں کہ مزدور اور کسان کا مسئلہ ایک بنیادی مسئلہ ہے اور اسے حل کئے بغیر ہماری سماج آگے نہیں بڑھ سکتی۔ لیکن کیا پروفیسر صاحب یہ بات گوارا کریں گے کہ وہ ادیب بھی جو اس کام کے کسی طرح اہل نہیں اس مسئلے کی طرف عوام کی توجہ مبذول کرانے کی ناکام کوشش میں خود ادب ہی کی تخریب کا موجب بن جائے اور خدا گواہ ہے کہ ایسے ادیب تعداد میں قسم ثانی سے بہت زیادہ ہو رہے ہیں۔ اگر ادب کو چند خشک حقائق کا مجموعہ بنا کر ہی پیش کیا جائے اور جمالیات کی چاشنی جو کہ ادب کی جان ہے اس سے الگ کر لی جائے تو کیا ہم اس کو ادب کہہ سکتے ہیں اور کیا ایسا ادب کسی کام کا بھی ہے؟

یہ ضروری نہیں کہ جو نوخیز ادیب مزدور اور کسان کی زندگی اور اُن کی نفسیات سے آگاہ نہ ہو وہ ان پر ہی خامہ فرسائی کرے۔ وہ یہی بات ایک دوسرے طریقے سے حاصل کر سکتا ہے اگر وہ مزدور کی مظلومی اور بے بسی کی مُنہ بولتی تصویر نہیں کھینچ سکتا تو نہ سہی وہ سرمایہ پرست کے غرور و تکبر ہوس زر اور مظلوم کُش ذہنیت سے پردہ اتار کر اس کی مکروہ شکل تو دکھا سکتا ہے۔ اس کا نفسیاتی تجزیہ کر کے اُسے عریاں کر سکتا ہے اور اس طرح دنیا کو ایک خاص منزل کی طرف لے جانے میں مددگار ہو سکتا ہے اور یہی ترقی پسند ادب کا نصب العین ہے۔ اگر یہ بھی نہیں تو وہ زندگی کے دوسرے پہلوؤں کو تختۂ مشق بنا سکتا ہے اور اس طرح تعمیری کام کر سکتا ہے لیکن یہ جبھی ممکن ہے کہ وہ موجودہ نظام معاشرت سے غیر مطمئن ہو اور اس کو بدلنے کی ایک دلی آرزو رکھتا ہو نہ کہ محض کارل مارکس اور لینن کی نقالی کا خواہشمند ہو۔

پروفیسر صاحب موصوف جب یہ کہتے ہیں کہ ایک ترقی پسند ادیب کا کام ان مسائل کو حل کرنا نہیں بلکہ محض ان کی طرف توجہ دلانا ہے تو کیا وہ خود ہی ایسے ادیب پر وہ اعتراض نہیں کر دیتے جس سے وہ کمالِ ہوشیاری سے اس کو مبرا ثابت کرنے کی کوشش کر چکے ہیں۔ کیا وہ ادیب کو محض ایک کیمرے کی حیثیت نہیں دے دیتے جو بغیر کسی تنقیدی اور اصلاحی عمل کے صرف ایک موجود کی عکاسی کرتا ہے۔ ادیب کا کام ان مسائل کی طرف جو فیض صاحب کے الفاظ میں ہی بنیادی مسائل ہیں اور جن کو حل کئے بغیر ہماری سماج آگے نہیں بڑھ سکتی، صرف توجہ دلانا ہی نہیں ہے بلکہ ان کو حل کرنا بھی ہے اور ایک ایسا آدرش پیش کرنا ہے جو قابل عمل اور قابل حصول بھی ہو اور جہاں سماج کی موجودہ برائیوں کا کوئی نشان نہ ہو۔ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب ہمارے ادیب اگر عملی تجربے سے نہیں تو کم از کم ان مسائل کے وسیع مطالعے سے خود کو اس قابل بنائیں کہ ان پر خامہ فرسائی کر سکیں اور ان برائیوں کو دور کرنے کی کوئی عملی تجویز اور طریق کار پیش کر سکیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ کارل مارکس اور لینن خود مزدور نہیں تھے۔ لیکن ان کے دلوں میں مزدوروں کے لئے درد تھا۔ انہوں نے مزدوروں کے ساتھ میل جول پیدا کیا اور اس طرح ان کے بنیادی مسائل سے واقفیت پیدا کی بعد ازیں انہوں نے ان مسائل کی طرف صرف توجہ ہی مبذول نہیں کرائی بلکہ ایک مکمل نظام عمل پیش کیا۔ ترقی پسند ادب صرف تخریبی ہی نہیں بلکہ تعمیری بھی ہونا چاہیئے جبھی اس میں مزدوروں اور کسانوں کے لئے کوئی کشش پیدا ہو سکتی ہے۔ موجودہ خرابیوں کو دور کرنے کے لئے جہاں موجودہ نظام کی بنیادوں کو ڈھانا پڑے گا وہاں اس کی نئی تعمیر کی طرف بھی متوجہ ہونا ہوگا۔ جو ہماری اصلی منزل مقصود ہے۔ ہم کسی شخص کو اپنی بوسیدہ جھونپڑی گرا دینے پر اس وقت تک آمادہ نہیں کر سکتے جب تک اُسے یقین نہ دلایا جائے کہ اس کی بنیادوں پر ایک عمدہ عمارت بنائی جا سکتی ہے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس کو اس نئی عمارت کی ایک جھلک تو دکھا دیں خواہ وہ کسی نقشے وغیرہ میں ہی ہو۔ شاعرِ مشرق علامہ اقبال بھی اپنے پیشرووں اور ہمعصروں کی طرح مُلا کے غلط مذہب پر سخت تنقید کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ تعمیر کی طرف بھی متوجہ رہتے ہیں۔ وہ ایک مردِ مومن کی مکمل تصویر اور اُس کی صفات حسنہ بھی پیش کرتے ہیں تاکہ ہم ہندو صوفی و مُلا سے آزاد ہو کر اس آدرش کی طرف پہنچنے کی کوشش کریں اور یہی چیز ان کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے ترقی پسند ادیب کے لئے اقبال کی اس خصوصیت کی پیروی ضروری ہے لیکن یہ بھی نقالی سے نہیں بلکہ وسیع مشاہدے اور مطالعے سے۔

لہ گذشتہ سالنامہ ادبی دنیا میں پروفیسر فیض احمد صاحب کا مضمون "ترقی پسند ادب اور کثرت تعبیر" شائع ہوا تھا، زیرِ نظر مضمون کا یہ حصہ اسی سے تعلق رکھتا ہے: ادارہ-

ہم پرانے اردو ادیبوں کو صرف اس لئے مطعون کرتے ہیں کہ انہوں نے ادب کو گل و بلبل اور حسن و عشق کے فسانوں تک ہی محدود کر دیا تھا۔ وہ اس مہل کی تعریف میں رطب اللسان رہے جو ہندوستان میں ہوتا ہی بہت کم ہے اور انہوں نے استعارات اور تشبیہات بھی ایران کی استعمال کیں۔ یعنی مختصر الفاظ میں وہ اپنے ماحول کی ترجمانی اور عکاسی کرنے کی بجائے پرانی سنی سنائی باتوں اور چند فرسودہ راہوں کے ہی پابند رہے تو کیا یہی اعتراض اس ترقی پسند ادیب پر نہیں عائد ہوتا جو مزدوروں اور کسانوں کے مسائل اور ان کی معاشرت سے بالکل واقف نہیں لیکن ترقی پسندی کے زعم میں اپنی قابلیت اور رجحان طبیعت کا خیال کئے بغیر ان کو تختہ مشق بنائے ہوئے ہے۔ ایسے ادیب کو اردو زبان کے مایہ ناز افسانہ نویس منشی پریم چند سے سبق حاصل کرنا چاہئے جنہوں نے ایک کہانی "مزدور" کالز کا" لکھنے کے لئے خود ایک روئی کی مل میں کئی مہینے کام کیا اور بالآخر جب یہ کہانی بمبئی میں پردہ سیمیں پر نمودار ہوئی تو اس کی قبولیت عام اور اس کے اثر کے پیش نظر گورنمنٹ نے اس کو ممنوع قرار دے دیا اس کے خیال میں اس سے بغاوت پھیلنے کا خدشہ تھا۔

آخر میں میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ میرے دل میں ادب کے ذریعے مزدوروں اور کسانوں کے مسائل کو حل کرنے کی خواہش کا پورا پورا احترام ہے لیکن جس طرح آج ہر کس و ناکس اسے شہرت طلبی کا ذریعہ بنائے ہوئے ہے وہ بہت حد تک مذموم ہے۔ ان مسائل کو محض دل لگی نہیں سمجھنا چاہئے بلکہ ان سے پوری پوری واقفیت حاصل کرنے کے بعد ان پر قلم اٹھانا چاہیے۔ اگر کوئی ادیب ان مسائل میں اپنے لئے کوئی دلچسپی نہیں پاتا تو کیا ضرور ہے کہ وہ ان پر طبع آزمائی کرے۔ وہ ہماری تہذیب اور سماج کی اور سینکڑوں جزئیات پر جو بجائے خود نہایت اہم ہیں قلم اٹھا سکتا ہے۔ زندگی بے کراں ہے اور اسی لحاظ سے ہمارا ادب بھی بے کراں ہونا چاہیے۔

مسعود احمد (جالندھری)

دو شعر

چھڑ گئی اُن آنکھوں کی بات — دنیا میں اب دن ہے کہ رات؟
جینے والے جی لیں گے — اب نہ ملو گے؟ — اچھی بات!

فراق گورکھپوری

غزل

بھول سکتی نہیں وہ بزمِ شبینہ ساقی — ہم کو جب آیا ہے پینے کا قرینہ ساقی

سر جھکاتے ہی یہاں کھلتے ہیں اسرارِ وجود — درِ میخانہ ہے یا عرش کا زینہ ساقی

زندگی تلخ مصائب کا رواں دریا تھی — دلِ مرحوم تھا نازک سا سفینہ ساقی

تیرے رندوں نے بڑھایا جو سفینہ ہنس کر — پھٹ گیا وحشتِ گرداب کا سینہ ساقی

ہم نشینی پہ اضافہ ہے ترا لطفِ نظر — رند رکھ سکتا ہے کب رند سے کینہ ساقی

تیرے ساغر سے جو ٹکرا گیا ساغر میرا — ہنس پڑی گویا کوئی شوخ حسینہ ساقی

ذرہ ذرہ نگہِ شوق کی رہ میں حائل — توبہ توبہ ترے پردے کا قرینہ ساقی

شکوۂ کم نگہی تجھ سے؟ مگر کیا کیجے — تجھ کو آیا نہ محبت کا قرینہ ساقی

شوقِ نظارۂ فطرت سے ہے نہایت بے تاب
اشک خونیں ہیں نگاہوں کا پسینہ ساقی

عبدالعزیز فطرت

وقت کا راگ

مارچ میں جبکہ جواں کیف سحر ہو پیدا — اس سے پہلے کہ بہاراں ہو چمن سے رخصت

سادگی شوخ ہوائے گلِ تر سے رونق — نکہت و ناز ہو ریحان و سمن سے رخصت

مست بھونروں کے جلو میں ہو صبا محوِ خرام — اوس نے لی نہ ہو غنچوں کے دہن سے رخصت

پیشتر اس سے کہ ہو آگ بگولہ سورج — اور نادیدہ صباحت ہو کرن سے رخصت

پیشتر اس سے کہ سو جائے محبت میری — اور مایوس تمنا ہو وطن سے رخصت

مارچ میں ایسے ہی وقت، اے مرے دیرینہ ندیم

اے مرے دوست! مجھے رنج و محن سے رخصت

(۲)

جون میں جب شبِ تاریک کا آنچل لے کر — مسکراتے ہیں مہکتے ہوئے تارے شب بھر

گدگداتی ہیں سیہ فام فضا کو کرنیں — کروٹیں لیتے ہیں بیتاب نظارے شب بھر

بھیگ جاتی ہے سکوں ریز خموشی سے ہوا — جاگتے رہتے ہیں دریا کے کنارے شب بھر

جب گھنے کھیتوں سے اگتے ہیں خموشی کے درخت — اور ہوتے ہیں محبت کے اشارے شب بھر

یا شبِ مہ میں کہ پانی میں مزا دیتا ہے — عکس ٹوٹا ہوا موجوں کے سہارے شب بھر

جون میں ایسے ہی وقت، اے مرے دیرینہ ندیم

ہم جئیں عشق کی مستی کے سہارے شب بھر

(۳)

اور ستمبر میں کہ بدلا نہ ہو گرما کا لباس — لامکاں چاندنی راتوں کی ہو وسعت جس وقت

بھیگے بھیگے سے ترانے ہوں فضاؤں میں رقصاں — عشق کو ہو غمِ ماضی کی نہ فرصت جس وقت

بیخودی جھومتی پھرتی ہو چمن زاروں میں — اوس کے ساتھ ٹپکتی جاتی ہو راحت جس وقت

جب فرشتوں کے پروں سے ہو رواں موسیقی — ساغرِ نور میں ڈھلتی ہو محبت جس وقت

ایک سا حال ہو سب کا ہو جمادات کہ خلق — رونق آرائے دو عالم ہو مسرت جس وقت

ہاں ستمبر بھی میں آ۔ اے مرے دیرینہ ندیم

آ، تجھے کھینچ کے لائے مری الفت جس وقت

(۴)

پھر دسمبر میں کہ انگڑائیاں لیتا ہو شباب — آگ فرقت کے مصائب کو دکھائیں دونوں

اونگھتی ہوں شبِ تاریک کی لمبی گھڑیاں — دلِ خوابیدہ متکلم کو جگائیں دونوں

مسکراتے ہوں در و بامِ قمر کی صورت — فرطِ احساس سے جب اشک بہائیں دونوں

بیٹھ کر گرم لحافوں میں اٹھا کر ساغر — اپنی دنیا کو ہواؤں میں اڑائیں دونوں

پیار کی باتیں ہوں جب ساز دھڑکتا جائے — سرِ دہری کو زمانے سے مٹائیں دونوں

ہاں دسمبر میں بھی آ اے مرے دیرینہ ندیم

آج کے کام کو کل پر نہ اٹھائیں دونوں

یوسف ظفر

دنیائے ادب

تازہ ترین رسائل کے اہم مضامین

کا تذکرہ اور جائزہ

ساقی افسانہ نمبر۔ جولائی۔

ٹوٹے ہوئے تارے۔ اس حیرت انگیز مطالعے کو اگر کردار نگاری کا اعجاز کہا جائے تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔ کرشن چندر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے افسانوں میں فرد کی نفسیات کو سب سے اہم درجہ دیتے ہیں۔ اور اپنے بیان کی سب لطافتیں اور شوخیاں اسی عنصر کی تحلیل میں صرف کر دیتے ہیں۔ "کہانی پن" ان کے ہاں ایک ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ زندگی کے عام واقعات اور معاشرت کے معمولی حادثے جنہیں ہم ایک سرسری نگاہ سے دیکھنے کے عادی ہیں۔ اُن کے اظہارِ فن کے لئے بہت کافی ہوتے ہیں۔ وہ اپنی تخلیق میں کسی ڈرامائی تکمیل کے جویاں نہیں ہوتے بلکہ وہ اپنے فن کو کردار کے نقوش ابھارنے اور پڑھنے والے کو افسانے کے ماحول میں غرق کر دینے میں بروئے کار لاتے ہیں اس لئے اُن کے کارناموں کی ادبی حیثیت بسا اوقات بہت بلند ہو جاتی ہے۔

زیرِ نظر افسانے میں نازک ترین نفسیاتی کیفیتوں کے ایک لطیف اظہار کے علاوہ فن کار نے ایک علامتی اثر بھی پیدا کیا ہے۔ علامتیت SYMBOLISM، جدید افسانہ نگاری کا ایک دلچسپ پہلو ہے افسانہ نگار بعض اوقات غیر شعوری طور پر کسی منظر یا صورت سے متاثر ہوتا ہے اور وہ منظر اُس کے شعور پر چھاتے ہی چند خاص کیفیتیں یا تاثرات کے چند خاص سلسلے پیدا کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک خالص مادی اور خارجی صورت ایک مکمل نفسیاتی کیفیت کی کلید بن جاتی ہے۔ "ٹوٹے ہوئے تارے" کا پس منظر اسی قسم کی صورتوں اور ان کے نفسیاتی تاثرات سے معمور ہے۔ وادیٔ کشمیر کی سڑک جو دیو نژاد سیاہ پہاڑوں کے درمیان بل کھاتی ہوئی جاتی ہے۔ افسانہ نگار کے شعور پر وہی اثر پیدا کرتی ہے جو زبیدہ کے گھنے اور رنجے ہوئے سیاہ بالوں کے عین درمیان نکلی ہوئی سیدھی مانگ۔ یہ دونوں اس نقرئی تار کی مثیل ہیں جو ایک امیر کی جیب کا سلسلہ دوسرے امیر کی جیب سے ملاتا ہے اور جو پہاڑوں، ڈاک بنگلوں، زلفوں اور دلوں کی تاریکیوں میں یکساں طور پر چمکتا ہے۔

افسانہ نگار کی روح پر اس دنیا کے اندھیرے نے ایک ناقابلِ بیان بوجھ ڈال رکھا ہے، وہ اس کے تلے دبی جا رہی ہے اور اس عالم میں وہ اپنا بے کیف اضطراب، اپنا یاس انگیز درد و کرب اس پتلے میں منتقل کر دیتا ہے۔ جو آگے چل کر اُس کے افسانے کا کردار بنتا ہے اور جو پھر اپنے ماحول کو اپنی ہر جنبش سے پھوٹنے والی ظلمتوں سے تیرہ و تار کر دیتا ہے۔

افسانے کا افسانہ فقط یہ ہے کہ ایک رئیس زادہ جو اپنے طبقے کا مثالی نمائندہ ہے کشمیر کو جانے والی سڑک پر اپنی خالی، بے کیف اور اداس زندگی میں رنگینی پیدا کرنے کی ناکام کوشش میں مصروف ہے اور بالآخر وہ اپنے زہر کا تریاق زہر ہی میں ڈھونڈتا ہے اور سراب کو آبِ حیات سمجھ کر اس کے پیچھے دیوانہ وار دوڑتا ہے، اس کی سعیٔ لاحاصل خبر نہیں کب تک یونہی جاری رہے گی۔ افسانہ نگار نے اس عالمِ اضطراب کی تمام بے قراریوں کو اپنی نادرہ کاری سے یوں اسیر کیا ہے کہ افسانے کی ہر سطر ایک مچلتی ہوئی موج بن گئی ہے۔ دیکھئے:۔

> "جب وہ چومیل کے ڈاک بنگلے پر پہنچا تو ہر طرف شام کی اُداسی چھا رہی تھی سامنے کا سیاہ پہاڑ کسی دیوہیکل قلعے کی دیوار معلوم ہو رہا تھا، اور درختوں کی چوٹیاں پہرے داروں کی بندوقیں۔ اب وہ یکہ و تنہا تھا، اسے اپنے آپ سے قلعے کی دیواروں سے۔ پہرے داروں کی بندوقوں سے، فضائی تنہائی سے ڈر محسوس ہوا۔ اپنے آپ

سے ڈر۔ اُس تیرگی سے ڈر، جو اُس کی روح پر چھائی ہوئی تھی، رات کے گہرے سایوں کی طرح، جیسے وہ اس افسردگی کے دلدل میں اندر ہی اندر دھنسا جا رہا ہو۔ اُس نے ڈاک بنگلے کے بیرے کو آواز دے کر کہا "ایک وائٹ ہارس" ...... اور پھر اس نے دس روپے کا نوٹ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ جانِ عزیز کے مقابلے میں دس روپے کے نوٹ کی کیا اہمیت تھی۔ کاغذ کا حقیر ٹکڑا۔ بوتل کو اپنے سامنے دیکھ کر اس نے سوچا، اب میں بچ جاؤں گا۔ اب اس دلدل میں نہیں دھنسوں گا، اور اُس نے بوتل کو زور سے گردن سے پکڑ لیا، شاید کہیں وہ اس کا دامن چھڑا کر نہ بھاگ جائے ...... اس نے بیرے کو آواز دی۔

"جی سرکار"

"ایک مرغی بھون لو۔ دیکھو دُبلی پتلی نہ ہو"

"بہت اچھا سرکار"

"اور ہاں دیکھو" اُس نے بیرے کے ہاتھ میں پانچ کا نوٹ دے کر کہا۔
"ایک —— بے آؤ۔ دیکھو۔ دبلی پتلی نہ ہو ....."

اور وہ پیتا گیا، اور اس کے دل کی اُداسی بڑھتی گئی، ڈاک بنگلے میں اُس وقت کوئی نہ تھا اور اس نے سوچا کہ وہ اسی وقت گیرج میں جا کر اپنی موٹر سے لپٹ جائے، اور آنسو بہا بہا کر کہے "میں اکیلا ہوں، میری جان، میں اکیلا ہوں، مجھے تم سے محبت ہے ......" بوتل خالی ہو گئی اور وہ میز پر جھک جانے کو تھا کہ یکایک کسی نے اس کے شانے کو ہلایا۔ بیرا اُس کے پاس کھڑا تھا اور اُس کے پاس ایک عورت کھڑی تھی

"تم کون ہو؟" اُس نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

"میرا نام زبیدہ ہے" عورت نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

وہ کرسی کا سہارا لے کر اُٹھا۔ اور کمرے کے اندر جانے کے لئے مڑا۔ بیرے نے اُسے سہارا دینا چاہا، لیکن اُس نے اُسے جھٹک کر کہا "ہٹ جاؤ، میں کمرے میں خود چلا جاؤں گا" وہ اس وقت اس جری سیاح کی طرح محسوس کر رہا تھا، جو کسی دشوار گذار ریگستان میں سفر کر رہا ہو۔ ایک سیاہ کھائی سی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی، صرف کمرے کے ایک کونے پر ایک چھوٹا سا لیمپ جل رہا تھا، روشنی چاروں طرف تاریکی کا سمندر اور بیچ میں روشنی کا مینار ...... وہ اس روشنی کی طرف بڑھتا گیا۔ شاید وہ اب بھی بچ جائے گا۔

یکایک اُس نے پیچھے دروازہ بند ہونے کی آواز سنی۔ اور وہ رُک گیا۔ بیرے نے عورت کو اندر دھکیل کر دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا، عورت دروازے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

"آؤ ...... آؤ ......" اُس نے عورت کی طرف ہاتھ ہلا کر جھومتے ہوئے کہا "ادھر آؤ۔ روشنی ادھر ہے"

عورت ہولے ہولے قدموں سے قریب آ گئی تھی۔ اس کے بالوں میں عین درمیان سے ایک سیدھی مانگ نکلی ہوئی تھی۔ چاندی کے تار کی طرح ....."

آپ نے دیکھا! اضطراب، مایوسی اور روحانی تاریکی کی یہ کیفیت جب خارجی دنیا میں اپنے وجود کا اظہار کرتی ہے تو اُسے نمایاں کرنے کے لئے تمام شرابوں میں سے فقط "وہائٹ ہارس" کی بوتل، اندھیرے کمرے کے گوشے میں رکھا ہوا چھوٹا سا فانوس، اور زبیدہ کے گھنے بالوں میں کھچی ہوئی چاندی کے تار کی سی مانگ کس طرح فن کار کی مدد کو آ پہنچتی ہے۔ اور پھر دل کی خلا میں جب "وہ" کوئی زندہ صنم موجود نہیں پاتا تو انتہائے یاس میں اپنی موٹر کار ہی کو اپنی مردہ تمناؤں کا مرکز بنا لیتا ہے۔ اعجازِ تجزیۂ جذبات کی اس سے نازک تر مثال شاید ہی کہیں ملے۔ افسانے کا ہیرو دراصل ایک ٹائپ ہے، نمونہ ہے، اس ذہنی مفلسی کا، اس جذباتی خام کاری کا جو ہمارے متمول طبقے کے ایسے افراد میں عام طور پر پائی جاتی ہے، جن کی جنسی آرزوئیں پیدا ہونے سے پہلے پوری ہو جاتی ہیں۔ جن کی رومانی تمنائیں قبل اس کے کہ کسی مرکز کے گرد گھومنے پائیں، سیم و زر کے ذلت آمیز دباؤ سے ایسی منتشر ہوتی ہیں کہ پھر اُن کا سراغ تک نہیں ملتا۔ اور جن کے لئے ایک بھُنی ہوئی مرغی اور ایک محبوبِ شبانہ میں کوئی نمایاں فرق نہیں اور جن کے نزدیک مرغی کا دُبلا پتلا ہونا ویسا ہی گھاٹے کا سودا ہے جیسا کرائے کی عورت کا دُبلا پتلا ہونا۔ اس "ٹائپ" کی جنسی بھوک "جوع الکلب" بن کر رہ جاتی ہے، وہ طلب کی بلندیوں سے کبھی آشنا نہیں ہوتی، اس کے دل میں ہمیشہ ایک مبہم سا خلا پایا جاتا ہے جو کبھی مہر و محبت کا طالب، کبھی لطفِ رفاقت کا جویاں، کبھی سکونِ خاطر کا خواہاں رہتا ہے مگر اس سے ہمکنار نہیں ہو سکتا۔ آگے دیکھئے:-

"اُس نے عورت کے شانے پر جھک کر رازدارانہ لہجے میں کہا "کیوں؟ تم اُداس ہو ...... تمہارا نام کیا ہے؟"

"زبیدہ" اُس نے بے جان سے لہجے میں جواب دیا۔

"شبیدہ ...... شبیدہ ......" اس نے ہنس کر کہا "شبیدہ ......

ہوں ...... کیا خوب ......" اُس نے اُس کے چمکیلے بالوں پر

ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "یہ کیا ہے ..... شبیدہ ..... پیاری ش ..... ش ..... شبیدہ ..... "

"یہ ستھا ہے۔ یہ موم اور جنگل کے جنگن سے بنتا ہے اس سے بال خوبصورت ..... "

"خوت شورت؟ ..... خوب شورت شبید آ ..... آ ..... آ"

اُس نے ہنسی اور ہچکی کے بیچ کے لہجے میں کہا "تم بہت خوبصورت ہو شبیدہ ..... " اُس نے زبیدہ کے صاف اور گلابی رخساروں پہ انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ پھر وہ الگ ہٹ کر کھڑا ہو گیا اور انگلی سے اُس کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا "تم ..... تم ..... شبیدہ ہو ..... ؟ ..... نہیں تم میری ماں ہو! ہی ہی ہی"

اور وہ اس کے قریب گیا۔

عورت نے یکایک اُس کے بازوؤں کو جھٹک دیا، جیسے اُسے کسی سانپ نے ڈس لیا ہو "ہاں ..... ہاں ..... " وہ چلا کر بولا "شش۔ شش۔ شبیدہ ماں ہے۔ شبیدہ میری بہن ہے ..... شش شش شبیدہ میں گناہ گار ہوں۔ شبیدہ تم یہاں کیوں آئیں ..... آخر ..... ہیں؟

"میں غریب ہوں" زبیدہ نے آہستہ سے کہا۔

"غریب؟ ہی ہی ہی"

"میرا بچہ بیمار ہے؟ جما، میرا ننھا سا جما' ڈاگ دار (ڈاکٹر) نے کہا اُسے نمونیا ہو گیا ہے۔ وہ چار روپے فیس مانگتا ہے، تم نے مجھے صرف تین روپے دئیے ہیں، خدا کے لئے مجھے ایک روپیہ اور دے دو۔"

"نمونیا! ہی ہی ہی ..... اُسے غ ..... خ ..... خیراتی ہسپتال لے جاؤ نا ..... نمونیا ..... ننھا جما ..... "

"یہاں ایک ہی تو ہسپتال ہے" عورت نے اداس لہجے میں کہا "اور وہ بھی خیراتی ..... میرے اللہ ..... میں کیا کروں ... میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں ..... خدا کے لئے مجھے ایک روپیہ اور دے دینا ..... صرف ایک روپیہ"

"بش ..... بش ..... فکر نہ کرو ..... نہ ..... نہ ..... ننھی زبیدہ"۔ اس کی گردن سے لپٹ کر کہنے لگا "میں تم پہ مرتا ہوں خوبشورت شبیدہ ——— میں اکیلا ہوں ..... میں اکیلا ہوں ... مجھے تم سے محبت ہے۔ مجھے بچاؤ شبیدہ ..... اس نے اس کے شانے پہ سر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

وہ سویا پڑا تھا، عورت کے گلے میں اس کے بازو حائل تھے، جیسے فائنٹ ہارس کی بوتل پر اُس کی انگلیاں ......

جب وہ جاگا تو خمار اتر چکا تھا، روشنی بجھ گئی تھی، سائے غائب ہو چکے تھے ..... اور وہ ابھی تک اس کے آغوش میں مدہوش پڑی تھی، برہنہ، ..... اور سپید گردن کے اُن حصوں پہ سرخ سرخ نشان تھے جنہیں وہ بار بار چومتا رہا تھا۔ اُس نے نیم وا آنکھوں سے اُسے سر سے پاؤں تک دیکھا، سڈول، گداز سانچے میں ڈھلا ہوا جسم، وہ آہستہ آہستہ سے اس کے بدن سے پہ انگلیاں پھیرنے لگا۔ عورت کے سارے جسم میں ایک لرزش سی پیدا ہوئی جیسے سوئے ہوئے سمندر کی لہریں بیدار ہو جائیں ..... اس کے رخساروں پر گری ہوئی پلکیں کانپیں، اس کے لبوں سے اک آہ سی نکلی اور اُس نے آہستہ سے اُسی مدہوشی کے عالم میں کہا! جمے ..... پیارے ننھے جمے ..... " اور پھر اُس کے نیم وا لب اسی طرح آپس میں ملے جیسے ماں اپنے پیارے بیٹے کو چوم رہی ہو ..... ننھا جما؟ ..... یکایک وہ چونک پڑا، گذری ہوئی رات کے موہوم سے سائے اس کی آنکھوں کے آگے آتے گئے ..... ننھا جما ..... نمونیا ..... ڈاگ دار ..... وہ کانپنے لگا ..... تین روپے ..... چار روپے ..... صرف ایک روپیہ ..... اُس نے فوراً اپنے بازو اُس کی گردن سے ہٹا لئے۔ ننھا جما ..... اور اسے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ اپنی ماں سے ...

اور وہ یکلخت بستر سے اچھل کر زمین پر کھڑا ہو گیا اور پھٹی پھٹی نگاہوں سے اُس عورت کی طرف تکنے لگا جو اب جاگ گئی تھی اور برہنہ تھی اور ساری رات اس کی آغوش میں رہی تھی۔

وہ چیخ کر کہنے لگا "چھپا لو۔ چھپا لو اپنے آپ کو اس کمبل میں ... دفع ہو جاؤ میرے سامنے سے -- کیوں اس طرح پریشان نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی ہو ..... سُنتی نہیں ہو گیا؟ ..... میں کہتا ہوں اُٹھو، اُٹھو ..... میرے بستر سے ..... یہ لو ..... یہ لو ..... ایک روپیہ۔ دو روپے تین روپے۔ چار روپے۔ یہ سب لے لو، بھاگو یہاں سے بھاگو! بھاگو!! بھاگو!!!"

اور اس نے عورت کو کمبل اُڑھا کر اُس کے کپڑے اس کے ہاتھ
میں دے کر اسے کمرے سے باہر نکال دیا۔"

اس اقتباس میں سب سے زیادہ قابلِ توجہ چیز محبت کا وہ غیر جنسی یعنی مادی تصور ہے جسے خامکار جنسی شکاری اُس مرکزی جذبے کی جگہ دینا چاہتا ہے جو جنسی ہونے کے باوجود منتقل لطیف اور بلند ہو سکتا ہے۔ مگر اُسے اس جذبے سے کیا واسطہ۔ زرداری اُسے حصولِ حسن کا سیدھا راستہ دکھاتی ہے اور جب مادی حُسن اپنے جلوہ شبانہ سے اس کی روح کی تسکین نہیں کر سکتا، اور ظاہر ہے کہ حسین زبیدہ کی تمام روحانی رعنائیاں محض اس کے بچے کے لئے وقف تھیں، تو وہ ایک زبردست ردِ عمل میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اور وہ حُسن کی اس لاش سے یوں بھاگتا ہے جیسے اُس نے کوئی آسیب دیکھ لیا ہو۔ مگر آہ ستم بر فطرت! تو نے بے چارے انسان کے لئے کیسے کیسے دام بچھا رکھے ہیں۔ دیکھئے:۔

"بہت دیر تک وہ بستر پر سر پکڑے بیٹھا رہا۔ دل و دماغ پر ایک
مبہم سی اُلجھن ایک مکڑی کے جالے کی طرح تنی ہوئی تھی جو اُسے
بار بار پریشان کر رہی تھی اور وہ کچھ سوچ نہ سکتا تھا۔ وہ بار بار اپنے
اُلجھے ہوئے لمبے بالوں میں انگلیاں پھیر کر اس مکڑی کے جالے کو
دور کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ آخر جب بیرے نے آکر اس سے
کہا "صاحب غسلخانے میں گرم پانی دھرا ہے" تو وہ بے دلی سے اُٹھا
اور پوٹاشیم پرمینگنیٹ کی پچکاری اُٹھا کر غسل خانے میں گھس گیا۔
طبیعت بے مزہ سی ہو گئی تھی اور منہ کا کڑوا کسیلا ذائقہ ہوش آنے پر
بھی دور نہ ہوا تھا۔ شانے بوجھل سے تھے۔ نہا کر وہ برآمدے میں میز
پر کہنیاں ٹیک کر ناشتے کا انتظار کرتا رہا اور اپنے آپ کو کوستا رہا۔
ہوشیار بیرے نے ناشتے پر بیئر کی بوتل حاضر کر دی تھی۔ بیئر کے خوش
رنگ سیال نے آہستہ آہستہ اُس کے خیالات کی رَو کو بدل دیا....
وہ آہستہ آہستہ گنگنانے اور سیٹیاں بجانے لگا۔ بیتی ہوئی راتوں کے
لمحے خوشگوار اور دلکش بنتے چلے گئے۔ ستھرے سے چمکتے ہوئے بال....
سیاہ قمیص پر چھاتیوں کے اُبھرے ہوئے خم.... نہالو کا غیر فانی
حُسن، بلبل کا نغمہ، پپیہے کی پی پی، اور سیب کے پھول چاندنی میں
ہنستے ہوئے، یکایک کسی راستے میں چمکتے ہوئے چشمے کا ٹھنڈا اور میٹھا پانی
اُس کی آنکھوں کے سامنے خوشی سے اچھلنے اور اُبل اُبل کر قہقہے
لگانے لگا اور اسے اپنی کار یاد آئی جو گیرج میں پڑی اُس کی
راہ تک رہی تھی اور وہ کھڑا ہو گیا اور اُس نے بیرے کو انعام دے کر
پوچھا۔ گڑھی کا ڈاک بنگلہ یہاں سے کتنے میل دور ہو گا؟"

ہمارا ہیرو جب صبح کے ناشتے اور خوشرنگ بیئر کی مدد سے وہ دماغی اُلجھنیں دور کر لیتا ہے جو کبھی کبھی اُس کے معمولات میں بیزاری کے اثرات پیدا کر دیتی ہیں تو وہ سرشاری اور مدہوشی کے کم از کم ایک اور دن رات کے لئے نشاطِ حواس کا سامان بہم پہنچانے کی خاطر کمر ہمت باندھ کر اُٹھتا ہے اور گڑھی کا ڈاک بنگلہ اُس کے تخیل پر ایک پرستانی قلعے کی طرح چھا جاتا ہے، جہاں حسین نہالو، سیاہ قمیص پر چھاتیوں کے اُبھرے ہوئے خم والی محبوبہ جس کا میکہ ایک چشمہ اور سسرال دوسرا چشمہ تھا، یا ستھرے سے چمکتے ہوئے بالوں والی کوئی زبیدہ اس کا انتظار کر رہی ہو گی اور وہ ایک اور حسین شب اُس کے پہلو میں بسر کرے گا اور صبح پھر اس کے منہ کا ذائقہ کسیلا ہو گا اور اس کے شانے بوجھل سے محسوس ہوں گے ....

اور پھر

"ڈاک بنگلے کے قریب ایک موڑ کاٹتے ہوئے اسے ایک نیلے رنگ
کی کار مل گئی جو ڈاک بنگلے کی طرف آ رہی تھی۔ ایک بھاری جسم اور
دُہری ٹھوڑی والا آدمی جس نے سیاہ پھندنے والی رومی ٹوپی پہن
رکھی تھی، کار چلا رہا تھا، اُس کی بغل میں ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی۔
نیلی سوسی کی شلوار، سیاہ قمیص پر چھاتیوں کے اُبھرے ہوئے خم۔ اور
آنکھوں میں عادی مجرموں کی سی بے جان اُداسی، اور وہ دل ہی دل
میں مسکرایا، محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز....!"

مگر اس منظر کا پورا لطف اُٹھانے کے لئے آپ کو ایک شب پیچھے جانا پڑے گا۔ جب ہمارا ہیرو خوبصورت شبیدہ سے لذت یاب ہونے سے پہلے صبح صبح تریٹ کے ڈاک بنگلے سے روانہ ہوا ہے:۔

"اور اب تو وہ ڈاک بنگلہ بھی میلوں پیچھے رہ گیا تھا.... رات کی
تنہائیوں میں نہالو کا حُسن غیر فانی اور غیر زمینی معلوم ہوتا تھا..... اس
کے لب، اس کی آنکھوں کی نرمی، اس کے بال سیاہ گھنے اور ملائم جیسے
رات کی بھیگی ہوئی خاموشی اور پھر ان بالوں میں سیب کے چند چٹکنے
ہوئے غنچے جیسے رات کی بھیگی ہوئی خاموشی میں بلبل کے میٹھے نغمے، اور
وہ یہ معلوم نہ کر سکا کہ یہ خاموشی کہاں شروع ہوتی ہے اور یہ موسیقی
کہاں ختم ہوتی ہے..... اور اس کے تخیل میں نہالو کے لب اور
جنگل کی مہک اور بلبل کا نغمہ اور بیئر کا سنہرا رنگ چاندی کی تار کی

طرح چمکتی ہوئی سڑک پر اڑتے گئے۔ نیچے جہلم کا پانی وحشی راگ گانے لگا اور فضا میں سیب کے لاکھوں پھول آنکھیں کھول کر جھیلنے لگے اور اُس نے سوچا کہ کیوں نہ وہ اپنی موٹر کو اسی کھائی کی وسیع خلا پر ایک بے فکر پرندے کی طرح اڑا کر لے جائے۔ یہ خیال آتے ہی اُس نے اپنے جسم میں ایک سنسنی سی محسوس کی اور اس کی نیم وا آنکھیں کھُل گئیں

راستے میں ایک چشمے کے کنارے اُس نے اپنی کار ٹھہرا لی اور دیر تک ہاتھ پاؤں دھوتا رہا آنکھوں کو چھینٹے دیتا رہا۔

..... اُس نے اپنی اوک میں چشمے کا صاف و شفاف پانی پینے کے لئے بھرا اور رُک گیا، خاموش قدموں سے ایک عورت اس کے قریب آ گئی تھی، نوجوان سی اور کچھ کچھ فربہ اندام، اس نے نیلے پھولوں والی سوسی کی ایک بھاری شلوار پہن رکھی تھی اور اُسے سیاہ قمیص پر اس کی ابھری ہوئی چھاتیوں کے گول خم نظر آئے اور چشمے کا صاف و شفاف پانی اس کی اوک میں چھلکنے لگا.....

عورت چشمے میں سے اوک بھر بھر کر اپنی پیاس بجھاتی رہی اور اُس کی پیاس تیز ہوتی گئی .....عورت کے لب اور گال گیلے ہو گئے اور کانوں کے قریب بل کھاتی ہوئی زلف بھی، اور پھر یکایک دونوں کی نگاہیں ملیں۔ عورت نے مسکرا کر اپنی آنکھوں کو ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دینے شروع کئے۔

اُس نے پوچھا "تم کہاں جا رہی ہو؟"

عورت نے کہا "میں نگر میں اپنے میکے گئی تھی۔ اب بلند کوٹ اپنے خاوند کے پاس جا رہی ہوں۔"

"بلند کوٹ کدھر ہے"

عورت نے کہا "یہاں سے سات آٹھ کوس تک تو میں اسی سڑک پر چلوں گی....."

اُس نے بات کا رُخ بدل کر کہا "کیا تم نے کبھی موٹر کی سواری کی ہوا"۔

"ہاں ایک بار لاری میں بیٹھی تھی جب میری شادی ہوئی تھی۔"

"کتنا عرصہ ہوا"

"دو سال"

وہ اپنا رخت سفر باندھنے لگا۔ عورت کی ناک پر پانی کی دو بوندیں ابھی تک لگ رہی تھیں اور گیلی زلف داہنے گال سے چپک گئی تھی اُس نے کہا "تمہاری ناک پر پانی کی دو بوندیں ہیں"۔

اور پھر یکایک دونوں ہنسنے لگے۔ دو بوندیں، دو سال، دو گولائیاں

اور اس نے آہستہ سے کہا، "آؤ تم میری کار میں بیٹھ جاؤ کم از کم سات آٹھ کوس تک تو میں تمہیں ساتھ لے جا سکتا ہوں۔

پھر کیا یہ موٹر بھی دو آدمیوں کے سفر کے لئے نہ بنائی گئی تھی؟ ایک مرد اور غالباً ایک عورت، اور اس نے غیر شعوری طور پر اپنا ایک ہاتھ اس کی کمر پر رکھ دیا۔ عورت کے جسم میں ایک خفیف سی جھرجھری پیدا ہوئی جیسے سوئے ہوئے سمندر کی لہریں بیدار ہو جائیں موٹر بھاگتی گئی اور اس کا ہر نفس آتشیں ہوتا گیا۔ آگ اور سمندر جن میں بلند کوٹ کی رفعتیں غرق ہو جاتی ہیں اور وقت مٹ جاتا ہے....."

اب اس منظر کا سلسلہ پہلے منظر سے ملائیے اور آگے چلئے:۔

"ہاں تو وہ دل ہی دل میں مسکرایا، محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز..... غریب عورتوں نے اپنی خیالی عصمت کی خاطر پہاڑوں پر بلند کوٹ بنائے تھے، لیکن حقیقت یہ تھی کہ اُن کے میکے اور سسرال ایک میٹھے چشمے سے دوسرے میٹھے چشمے تک اور ایک ڈاک بنگلے سے دوسرے ڈاک بنگلے تک محدود تھے۔ اُس نے دل ہی دل میں خداوند لایزال کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا جس نے ان لوگوں کو غریب بنا کر اس کے لئے دلکش راہیں مہیا کی تھیں۔ زبیدہ، دائی لرس، اور بھٹکا ہوا مرغ ..... الٰہی کیسی کیسی نعمتیں تو نے بنائی ہیں ...... اس کے تخیل میں گڑھی کا ڈاک بنگلہ ایک پرستانی قلعہ نظر آنے لگا اور اس نے اپنی کار کی رفتار تیز کر دی ـــــ"

معلوم نہیں کہ ہمارے ہیرو کی کار آدمجوبہ نے جس کا نام موٹر کار تھا اسے کتنے اور پرستانی قلعے سر کرنے میں مدد دی۔ بہر حال آپ ذرا دیر کے لئے انہیں وہیں چھوڑیئے اور ذرا ہم سے مل کر فن کار کی اُن منظر نگاریوں کا لطف اٹھائیے جو کہانی کے دامن پر بہار کے پھولوں کی طرح بکھری ہوئی ہیں۔

اس کے بال سیاہ گھنے اور ملائم! جیسے رات کی بھیگی ہوئی خاموشیاں اور پھر اُن بالوں میں سیب کے چند چمکتے ہوئے غنچے، جیسے رات

....

افسوس ہے کہ اس بے مثال مقالے میں زبان اور کتابت کی چند غلطیاں بھی نظر آئیں جو اس بات کی شاہد ہیں کہ مصنف اور مدیر دونوں کو نظرِ ثانی کی فرصت نہیں ملی یا شاید افسانے کو نظرِ بد سے بچانے کے لئے انہیں درست نہیں کیا گیا۔ . . . .

صلاح الدین احمد

حصۂ نظم

انسان نے تخلیقِ انسانی سے لے کر اب تک اس قدر ترقی کی لیکن آج بھی وہ زمان و مکان کا ویسا ہی قیدی ہے جیسا روزِ اول کو تھا۔ مکان کی قید پر تو اُس نے کرۂ ارض کی حد تک کافی قابو پا لیا ہے لیکن زمان کا مسئلہ ابھی اس کے بس میں نہیں آیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وقت ایک اضافی تصور ہے۔ اگرچہ علم و تہذیب کے موجودہ دور میں وقت کے متعلق جدید ترین نظریے قائم ہوئے ہیں لیکن ذہنِ انسانی اب بھی ماضی حال اور مستقبل کے سلسلے میں ماضی ہی کا پابند ہے اور فنونِ لطیفہ کے لحاظ سے فن کاروں کے ذہن تو خصوصاً ماضی ہی کے شیدا ہیں۔ اور شعراء کے ذہن اس اعتبار سے اکثر رجعت پسند ہیں۔

سعیٔ خام

چاندنی کے ساز پر ہے مجسّم نغمہ گر
میرے دل کا اہتزاز بن گیا ہے روحِ ساز
راگنی کوے کے دُور جا رہی ہے موجِ نور
بھیجتا ہوں تیرے نام
موجِ سیمیں پر پیام
آہ لیکن سعیٔ خام
جس طرح بچہ کوئی ناؤ اپنی کاغذی
آبجو میں چھوڑ دے اور توقع یہ کرے
ناؤ اس کی جائے گی اور کھلونے لائے گی
مادرِ مرحوم سے شہرِ نامعلوم سے
پھر کنارِ جوئبار وہ سراپا انتظار
کشتیوں کو دور سے دور سے آتے ہوئے
دیکھتا ہو تا بہ شام

سید احمد عجاز

ندیم بہار نمبر ۱۹۴۰ء

سید احمد اعجاز کی نظم "سعیٔ خام" جہاں منظر نگاری اور تصورات کی مثال ہے وہاں اس سے اردو شاعری پر انگریزی شاعری کے اثر کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ اس نظم میں شاعر نے دو مناظر سے اپنی دلی کیفیت کو ظاہر کیا ہے۔ بظاہر اس نظم میں صرف چاندنی کا تأثر ہے۔ لیکن اس تأثر سے زیادہ دلچسپ وہ تسلسلِ خیال ہے جس کو چاندنی کے منظر سے تحریک ہوتی ہے۔ نظم کے دو حصّے ہیں، اور دوسرے حصّے میں پہلے حصّے کی تشبیہہ پیش کی گئی ہے لیکن تشبیہہ شاعر کے ذہن میں یونہی نہیں پیدا ہو گئی۔ وہ چاندنی سے لبریز فضا میں بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کی نظروں میں اونچا نیلا صاف ساگر پھیلا ہوا تھا، جس میں نور کی موجیں تھیں، چاند تھا ستارے تھے۔ اس من موہن منظر کو دیکھنے سے اُس کے سازِ دل کے محوِ شفقیہ تار سوئے ہوئے تھے وہ جاگ اُٹھے۔ اُسے تنہائی محسوس ہوئی، اُس کا جی چاہا کہ کوئی محبوب ہستی ان لمحوں میں اُس کی ہم جلیسی میں اس منظر کے حسن سے متاثر ہو اس کے اپنے کیف میں حصہ بٹائے لیکن وہ تنہا تھا، ہاں ماضی میں ایک محبوب ہستی اُس کے پاس ہوا کرتی تھی یا کم سے کم ایک محبوب ہستی ایسی ہے جس سے اس منظر کے کیف کی حصہ داری میں اُسے مسرت حاصل ہو سکتی ہے اُس کا خیال آتے ہی اس تک پہنچنے کی مجبوری کا احساس بھی ہوا اور اس لئے "موجِ سیمیں پر پیام" بھیجنے کی تحریک ہوئی۔ لیکن اس پیام کا پہنچنا بھی ویسا ہی ناممکن نظر آیا جیسی کہ یہ کوشش خیالی کہ وہ ہستی یہاں آن موجود ہو۔ اور پھر اس مجبوری کے متواتر احساس نے غیر شعوری طور پر شاعر کے ذہن کو گریز پر مائل کیا تاکہ یہ المناک احساس دور ہو سکے اور یوں وہ تشبیہہ کی طرف راغب ہوا۔ لیکن یہ رغبت بھی کچھ زیادہ کارآمد ثابت نہ ہوئی۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ وہ اپنے احساسِ مجبوری کو کسی اور کا احساس بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ یعنی مجبوری اور سعیٔ خام کی کیفیت کے متعلق اُسے یوں محسوس ہوا کہ یہ کیفیت تو اس بچے کی ہوا کرتی ہے جو "اپنی کاغذی ناؤ کو کھلونوں کی توقع میں آبجو کے سپرد کر دے" ——— یوں شاعر کا دل ہلکا ہو گیا۔ کیونکہ اُس کا بارِ الم ایک اور شخص کا بارِ الم بن گیا اور اُس کے اپنے دل میں اُس بچے کے لئے ہمدردی کا احساس پیدا ہو گیا۔

لیکن تشبیہہ کے لئے یہ بچہ اور اس کی ناؤ شاعر کے ذہن میں کیوں آئی؟ اُس کی اپنی مجبوری سے ملتی جلتی کیفیتیں تو کوئی اور بھی ہو سکتی تھیں — شاعر کی نظروں میں اونچا نیلا، صاف ساگر پھیلا ہوا تھا جس میں نور کی موجیں تھیں۔ چاند کی کشتی تھی ستاروں کے بجرے تھے۔ شاید کہکشاں کی آبجو کے کنارے پر اُسے چاند کی کاغذی کشتی کا دھیان آیا۔ آخری مصرعوں کے

تصور میں رہ پہ کنارِ جوئبار، وہ سراپا انتظار، کشتیوں کو دور سے، دور سے آتے ہوئے دیکھتا ہوتا بہ شام) شاعر نے اُس سکون کو اس دل کے ہلکا ہونے کو ظاہر کر دیا ہے جو اُسے اس تشبیہہ سے ملا۔

اور اس نظم میں جوشؔ بھی ماضی ہی کی طرف رجوع کر رہا ہے، اگرچہ اُس کے تخیّل کی بنیاد حال پر ہے۔

پرانا باغ

آم کا باغ جو ہے پیشِ نظر — یہ مرے باپ نے لگایا تھا
یاد ہے، خوب یاد ہے کہ یہاں — ایک روز اُن کے ساتھ آیا تھا
باغ کے پاسباں نے بہرِ سلام — ہاتھ اُٹھایا تھا، سر جھکایا تھا
کس قدر دلنواز شاخیں تھیں — کس قدر دلفریب سایا تھا
پتے پتے پہ نوجوانی تھی — ذرّے ذرّے پہ رنگ چھایا تھا
خستہ چڑیوں کے چہچہانے سے — شام کا وقت گنگنایا تھا
میرے اک بار مسکرانے سے — باغ سو بار مسکرایا تھا
دل پہ اب تک خراش باقی ہے — دو گھڑی کو وہ لطف آیا تھا

اور آیا ہوں میں جو آج یہاں — باغ ہنستا نہ مسکراتا ہے
کل تو گاتا تھا، گنگناتا تھا — اب نہ گاتا نہ گنگناتا ہے
ذرّہ ذرّہ مری طرف صد حیف — آنکھ بیگانہ وار اٹھاتا ہے
باغ کب کا بھلا چکا ہے جو دور — اس لئے مجھ کو یاد آتا ہے
یادِ ماضی ارے معاذ اللہ! — دل تڑپتا ہے، بیٹھ جاتا ہے
آہ! بیتے دلوں کی یاد کا درد — زندگی کو لہو رُلاتا ہے
صرف اِک بار مسکرا دینا — دل پہ سو بجلیاں گراتا ہے
کیا کہوں کس قدر مرے دل کو — نوعِ انساں پہ رحم آتا ہے

جانتا ہے، فریب ہے ہستی،
پھر بھی ناداں فریب کھاتا ہے

زمانہ جون ۱۹۷۰ء — جوشؔ ملیح آبادی

اس نظم کے عنوان ہی سے وہ فضا قاری کے ذہن میں قائم ہو سکتی ہے جہاں پہنچ کر شاعر اس نظم کی خود کلامی شروع کرتا ہے۔ اس لئے عنوان کے بعد نظم کی طرف جلد رجوع ہونے کی ضرورت نہیں بلکہ عنوان کے انجام اور نظم کے آغاز میں ایک وقفہ درکار ہے تاکہ جہاں شاعر کھڑا ہے وہیں ہم بھی جا کھڑے ہوں اور اُس کی بات کو پورے طور پر سمجھ سکیں۔ باقی نظم میں بیان اور بے ساختگی کی جو خوبیاں ہیں اُن کے اظہار کے لئے مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

ہماری سوسائٹی

حوصلے سرنگوں، اُمیدیں شل
آرزو بار یاس سے بوجھل

نشہ، بجھتا ہوا سا ایک شرار
کیف گرتی ہوئی سی اک دیوار

ہر لطیفے کی تہ میں رنج و محن
ہر ظرافت میں ایک پھیکا پن

شرم سے آب آب جولانی
ہر ہنسی شرمسار، کھسیانی

خال و خط پر دھواں بناوٹ کا
کرب بالقصد مسکراہٹ کا

ماہنامہ اضطراب لکھنؤ جولائی ۱۹۷۰ء — جوشؔ ملیح آبادی

جوشؔ کی دوسری نظم ماضی کی طرف نہیں لے جاتی بلکہ جس "حال" سے گریزاں رہنے کی کوشش میں ہم ہمیشہ مصروف رہتے ہیں، وہی اس کا موضوع ہے۔

اردو میں اگرچہ ہجو ایک قدیم صنفِ سخن ہے، لیکن جدید مفہوم کے لحاظ سے طنزیہ نظموں کی ابھی بہت کمی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ طنزیہ نظم کی تخلیق آسان کام نہیں کیونکہ طنز کے ساتھ ساتھ شعریت کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دینا ایک ایسی مہم ہے جو ہر شاعر کے بس کی بات نہیں۔ اس خیال کی روشنی میں یہ نظم خصوصاً قابلِ غور ہے۔ ایک اور نکتہ اس میں یہ ہے کہ شاعر نے طنز کرتے ہوئے سماج کی سطحی اور بیرونی باتوں کا ذکر نہیں کیا بلکہ سماجی روح اور کردار کی خامیوں اور پستی کی طرف توجہ دلائی ہے

میری رانی

پہلے پیکانِ محبت نے تھا دل پہلو میں،
خون کی گنگا بہا یا تو بنا رنگ محل
چپکے چپکے کوئی اس رنگ محل میں آیا
بجلیاں کانوں میں، سینے پہ وہ آڑی ہیکل

آتش حُسن سے گلنار ہبھبھو کا چہرا
عید ملتا ہُوا آنکھوں سے وہ کافر کاجل
بول اُٹھے چمن داغ میں خوش رنگ کنول رخ کے پرتو سے چھپے نور کا لے کر آنچل
غم نے بڑھ کر اسے پہنا دیا ان پھولوں کا ہار
نازنیں فرق پہ اک تاج زر افشاں رکھا
حسرتیں آ کے حضوری میں زمیں بوس ہوئیں
نازک ارمانوں نے داماں نہ گریباں رکھا
یاس نے آ کے سلامی دی بڑی شوکت سے
اُس نے اُس کے حضور آپ نمکداں رکھا
راج کرنے لگی اقلیم جنوں پر رانی —
میری بلقیس نے انداز سلیماں رکھا
کم نظر تو اسے کہتے ہیں فغاں کی بانی وہ ہے فی الاصل مرے رنگ محل کی رانی
(دست باقی و ماہتاب باقی)

سب رس حیدرآباد جولائی ۵۸ء ——— مختار صدیقی

اس نظم میں رانی کا پربت بنا ہے لیکن اس پربت کی چوٹی پر پہنچ کر شاعر نے دیکھا کہ ایک مندر ہے اور اس مندر میں کسی دیوی کی مورتی ہے۔ دنیا میں کئی مندر ہیں اور ان میں کئی مورتیاں لیکن جب تک کسی مورتی کا نام ہمیں معلوم نہ ہو ہماری نظروں میں اُس مورتی کے مندر کی کوئی اہمیت نہیں پیدا ہوتی۔ شاعر نے بھی پربت پر پہنچ کر جب مندر میں دیوی کی مورتی کو دیکھا تو اس کا ایک نام رکھ دیا اور اس نام رکھنے ہی سے اس نظم کے مندر کی اہمیت ہماری نظروں میں پیدا ہو گئی۔ اگر شاعر اُس مورتی کو پریم کی دیوی پکارتا تو یہ ایک عام سی بات ہوتی۔ شعرا اور خصوصاً نوجوان ہر مورتی کو پریم کی دیوی ہی سمجھنے لگتے ہیں اور یہی اُن کی غلطی ہے۔ لیکن یہ شاعر عوام کی طرح غلط نظری کا مرتکب نہیں ہوتا۔ یہ اس دیوی کو "فغاں کی بانی" کہتا ہے اور اپنے رنگ محل یعنی دل کی رانی سمجھتا ہے۔ دل کی رانی سے مراد یہاں محبوبہ نہیں ہے۔ بلکہ اس نظم کا بنیادی موضوع اصل میں غم کی پوجا ہے۔ رانی کا مفہوم اُس تلازمِ خیال کی وجہ سے آ گیا ہے جس کی وضاحت ابھی کی جائے گی۔ اگر وہ تلازمِ خیال پیدا نہ ہوتا تو شاعر اُس مورتی کو "فغاں کی بانی" کہہ کر ہی بات کو ختم کر دیتا۔

میں نے اکثر دیکھا ہے کہ ہمارے اردو شعرائے جدید عموماً نظم کے شروع ہی سے تلازمِ خیال کا اظہار نہیں کرتے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ آغاز میں شدتِ احساس اُن کے ذہن کو باقاعدہ جال سے نہیں چلنے دیتی۔ لیکن جب وہ دو چار شعر کہہ کر اظہارِ نفس کے ابتدائی اظہار کی حد تک تسکین کر لیتے ہیں تو ان کے ذہن میں آسودہ تصور جاگتے ہیں اور تلازمِ خیال بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ اس نظم کا بھی یہی حال ہے۔

شاعر کو چپ چاپ بیٹھے ہوئے اچانک خیال آتا ہے کہ اب تو دل کی حالت ہی بدل گئی۔ اب تو یہ دل ہی نہ رہا۔ محبت کا تیر لگنے سے پہلے یہ دل تھا۔ تیر لگا، خون نکلا، دل خون میں نہا گیا، خون کی گنگا بہا یا۔۔۔ گنگا کا تصور آتے ہی شاعر کی زبان بدل گئی۔ اور وہ "پیکانِ محبت" اور "پہلو" جیسے فارسی الفاظ سے ہٹ کر خالص ہندوستانی الفاظ کی طرف راغب ہو گیا۔ لیکن آگے چل کر پھر وہی فارسی الفاظ والی زبان جاری ہو گئی۔ کیونکہ وہ شاعر کی اصل زبان ہے۔ "خون کی گنگا" کے خالص ہندوستانی استعارے سے "رنگ محل" کی آمد ہوئی اور پھر اس میں "کوئی آیا"۔ یہاں شاعر نے آنے والے کی تخصیص نہیں کی۔ قاری آپ ہی سوچے کہ کون آیا۔ شاعر آخر میں حل کر بتائے گا۔ یوں ایک دلچسپی پیدا ہو گئی۔ قاری کا ذہن بیدار رہا اور اُس نے اپنے دل میں سوچا کہ شاعر کی محبوبہ رنگ محل میں آئی تھی۔ لیکن آخر میں جا کر جب قاری کو معلوم ہوا کہ وہ آنے والی شاعر کی محبوبہ نہ تھی بلکہ "فغاں" تھی تو اُسے یہ ایک غیر معمولی بات معلوم ہوئی کیونکہ یہ بات اس کی اپنی سوچ کے خلاف تھی۔

اس نظم کے دوسرے بند میں بہت سے شاہی سے تعلق رکھنے والے لوازم ہیں۔ تاج زر افشاں، حضوری، زمیں بوس، سلامی دی، شوکت سے، راج کرنے لگی، رانی، بلقیس، اور اندازِ سلیماں ۔۔۔۔ یہ سب چیزیں رنگ محل کے تصور کی پیداوار ہیں۔

بیان کی خوبی کے لحاظ سے دو مثالیں "عید ملتا ہُوا آنکھوں سے وہ کافر کاجل" اور "چمن داغ میں خوش رنگ کنول نور کا آنچل لے کر چھپے"۔

آخری ٹکڑا جو خطوطِ وحدانی میں ہے اُس کا مطلب میں نہیں سمجھ سکا آپ خود کوشش کیجئے۔

اس نظم میں بھی شاعر ماضی ہی کے دلکش زمانے کی طرف رجوع کر رہا ہے۔ اور ذیل کے منتخب اشعار میں اختر شیرانی بھی ماضی ہی کا نغمہ خواں ہے:۔

فراق

حیراں ہے آنکھ جلوۂ جاناں کو کیا ہُوا
ویراں ہیں خواب گیسوئے رقصاں کو کیا ہوا
قصرِ حسیں خموش ہے ایوان پُر سکوت آوازِ پائے سروِ خراماں کو کیا ہوا

پردوں سے روشنی کی کرن پھوٹتی نہیں — اُس شمعِ رنگ و بو کے شبستاں کو کیا ہوا
دنیا سیاہ خانۂ غم بن رہی ہے کیوں — اللہ میرے ماہِ خراماں کو کیا ہوا
طوفاں اٹھا رہی ہیں مرے دل کی دھڑکنیں — اس دستِ نرم و ساعدِ لرزاں کو کیا ہوا
نادان آنسوؤں کو ہے لذّت سے جستجو — آرام گاہِ گوشۂ داماں کو کیا ہوا
سیراب کار ہی لبِ گلگوں کدھر گئی — ہیں تشنہ کام ساغرِ جاناں کو کیا ہوا
کشتِ مرادہو چلی نذرِ سمومِ غم — یارب نمودِ ابرِ خراماں کو کیا ہوا

روتا ہے بات بات پہ یوں زار زار کیوں
اختر خبر نہیں دلِ ناداں کو کیا ہوا

میراجی

شعر

دل کو کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں — شام بھی تھی دھواں دھواں حُسن بھی تھا اُداس اُداس

فراق گورکھپوری

نقد و نظر

اندھی دنیا

(مختصر افسانوں کا مجموعہ از اختر انصاری بی اے آنرز)

حجم ایک سو ساٹھ صفحے لکھائی چھپائی اچھی۔ کاغذ خاصا قیمت ایک روپیہ

ملنے کا پتہ: مکتبہ جہاں نما، اردو بازار، جامع مسجد دہلی۔

تہذیب وتمدن کا مصنوعی ماحول انسان کی جنسی جبلت میں گمرہی اور تخریب کا باعث بنتا ہے اور ازبسکہ ادب زندگی کا آئینہ دار ہے اس لئے اس گمرہی یا تخریب کے نمایاں نقوش ہمیں ادب ہی میں ایک محفوظ صورت میں مل سکتے ہیں بعض اوقات تو ان نقوش کی نوعیت واضح ہوتی ہے۔ لیکن کہیں کہیں اور کبھی کبھی یہ نقوش عجیب پیچ در پیچ راستوں سے گذر کر اپنی ظاہری صورت سے اپنی اصلی نوعیت کو چھپا لیتے ہیں اور یہی وہ مقام ہے جہاں ہم تجزیۂ نفسی کی مدد سے ادب کا جائزہ لے کر اس کی تہ کو پہنچ سکتے ہیں۔ اردو زبان کے شعراء تو ابتدا ہی سے فارسی ادب کے اثرات کی وجہ سے اذیت پرست رہے ہیں اور دنیا میں انہیں رنج ومحن کے سوا اور کوئی بات کم ہی نظر آئی ہے لیکن نثر نگاروں میں بھی مسرت کا ادب ہمیں کم ہی ملتا ہے۔ نثر میں غم والم کے ادب کی پرانی نشوونما کی انتہائی بلندی راشد الخیری کی تصانیف ہیں لیکن گذشتہ پندرہ سال میں مغربی اثر سے جو نئی تحریکات ہمارے ادب میں آئیں اور جو نئے رجحانات پیدا ہوئے انہوں نے ہمارے فن کاروں کی تخلیقات میں بعض دلچسپ اور قابلِ تحقیق پہلو نمایاں کر دئیے ہیں خصوصاً ترقی پسند ادب کی تحریک نے ایک نئی قسم کا اذیت پرستانہ ادب پیدا کرنے میں ہمارے مصنفین کی بہت مدد کی۔ اور اس کے نتیجے کے طور پر شعراء عموماً اور افسانہ نگار خصوصاً زندگی کے مصائب ہی کا راگ الاپنے لگے ہیں۔ اور چونکہ پہلے زندگی کے مصائب سے لبریز پہلو پر بہت کم توجہ دی جاتی تھی اور صرف عشرت ومسرت کو ہی سراہا جاتا تھا اس لئے ردِّ عمل کے طور پر ان نئے رجحان والے مصنفین کو پہلے عشرت پرستانہ تصوّرات ہی سے نفرت ہو گئی اور وہ جہاں ادب میں ایک اصلاح اور وسعت کا موجب بنے وہیں ایک غلط نظری کے بھی مرتکب ہوئے۔ اختر انصاری کے افسانوں کے مجموعے کے شروع میں ایک صفحے پر جو فقرے لکھے ہوئے ہیں۔ وہ اوپر کے خیال کی دلیل ہیں۔ ان فقروں میں ظاہر کیا گیا ہے کہ ۔۔ "یہ افسانے ہجر و وصل اور بوس وکنار کی غلیظ داستانیں نہیں ہیں۔ ان میں انفرادی جذبات کی کیچڑ نہیں اچھالی گئی۔ یہ افسانے ہماری اجتماعی زندگی کے "ناسوروں" کو بے نقاب کرتے ہیں۔ اور سماج کے "ٹپکے ہوئے پھوڑے" اور تہذیب کے سڑے ہوئے اعضاء پر ایک بے درد نشتر کے کچوکے ہیں۔ موجودہ نظام کا "جنازہ" اپنے کاندھوں پر لئے ہوئے ہیں اور ایک مظلوم لیکن بیدار ہوتی ہوئی انسانیت کی حشر انگیز پکار ہیں"۔

یہ کلمے اُس مصنف (اور شاعر) کے افسانوں کے مجموعے سے پہلے تمہیدی طور پر لکھے ہوئے ہیں جو اپنی ابتدائی ادبی زندگی میں صرف محبت ہی کے لطیف جذبے کا نغمہ خواں تھا۔ لیکن اب عشق ومحبت کو کیچڑ بلکہ غلاظت سے تعبیر کرتا ہے۔ زندگی کے متعلق اُس کے اندازِ نظر میں یہ تبدیلی کیونکر ہوئی! ــــ اس سوال کا سراغ ان تمہیدی فقروں میں ہے جو میں شروع میں لکھ آیا ہوں۔ اختر انصاری اپنی شعری تخلیقات میں ایک داخلی فن کار تھا نہ صرف یہ بلکہ اس داخلی پہلو کو اُس کی انفرادیت نے ایک نمایاں اور ممتاز رنگ بخشا ہوا تھا۔

اور میرے خیال میں وہ اب بھی ایک داخلی فن کار ہی ہے۔ اگرچہ اُس کے یہ افسانے ایک عام قاری کے ذہن پر اپنا اجتماعی پہلو ہی واضح کر سکیں گے یا اقتصادی مسائل کی اُن اُلجھنوں کو ہی ظاہر کر سکیں گے جن سے دوچار ہو کر اس سرمایہ دارانہ دور میں ہر ہوشمند اور بے غرض انسان کے دل میں موجودہ نظام کے خلاف بغاوت کی آگ بھڑک اٹھتی ہے، لیکن ہمیں ان افسانوں کے نفسیاتی تجزیئے کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ افسانہ نگار ان افسانوں میں

آئینہ دیکھ رہا ہے وہ پہلے ہر افسانے کے خاص کردار کی شخصیت میں اپنے آپ کو کھو دیتا ہے اور پھر اُسی کی نظر سے سماج کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتا ہے۔ یہ شخصیت کا تبادلہ اُس کی گویا فطرتِ ثانی بن چکا ہے اور اسی لئے بعض افسانوں میں جب وہ خاص کردار کو واحد متکلم سے نجات بھی دے دیتا ہے تو اُس کی کہانی اپنی نہیں بلکہ اُسی کردار کی ہوتی ہے۔ لیکن یہ صورت کم ہی پیش آتی ہے کیونکہ اس مجموعے کے چوبیس افسانوں میں سے تین چار افسانے ہی ایسے ہیں جن میں وہ واحد متکلم کو افسانے کا خاص کردار نہیں بناتا۔ اور اجتماعی حالات کو اس طور پر انفرادی لحاظ سے دیکھنے میں ایک فائدہ ہوتا ہے کہ افسانہ ہمیں جگ بیتی نہیں بلکہ آپ بیتی معلوم ہوتا ہے اور ہمیں بھی اس بغاوت میں اپنا ہمنوا بنا تا ہے جو مصنف کے مغز، قلب و دماغ میں پیدا ہوئی ہے۔

ترقی پسند ادب میں ایک نقص عام ہے، اس سے مصنف کی محدود نظری کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن اختر انصاری کے افسانے اس سے مستثنیٰ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ سماجی مظلوموں میں سے نہ صرف ایک ہی طبقے یا ایک ہی قسم کے افراد کو اپنا موضوع نہیں بناتا۔ وہ بجائے اس کے کہ مظلوم افراد کو اپنے افسانوں کا کردار بنائے، سماج کے غلط اور نقائص سے لبریز پہلوؤں کو ان میں زیرِ بحث لاتا ہے۔ اور اس لئے نہ صرف محدود نظری کا مرتکب نہیں ہوتا بلکہ زندگی کی وسعت کا آئینہ دار رہتا ہے، اس کی تحریر حقیقت اور خلوص کا اظہار کرتی ہے اور وہ قاری کی نظروں میں ایک عصبی بیزاری کی بجائے (جو مظلوم کرداروں میں محض غیر شعوری جنسی تسکین کو ڈھونڈتے ہیں) ایک تندرست مصلح بن جاتا ہے۔ مثلاً تیں نے ایسا کیوں کیا — اس افسانے کا موضوع وہ مصیبت زدہ یتیم لڑکا نہیں ہے جس کا ظالم اور خود غرض چچا آسے ایک لاوارث ظاہر کر کے دوسروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہے بلکہ ہمارے ملکی اور سماجی نظام کا وہ افسوسناک پہلو ہے جس میں یتیموں اور غریبوں کی تعلیم کا بندوبست اُن کے زیادہ خوش قسمت ہم وطنوں کے دوش بدوش نہیں کیا جاتا۔

اسی طرح "خام مواد" اگرچہ بظاہر دو دوستوں کے تعلقات کا ایک دلچسپ نقشہ ہے لیکن حقیقتاً اس میں بھی بہت لطیف انداز میں ظاہر کیا گیا ہے کہ ملک میں اکثر بلکہ بیشتر ایسے نوجوان ہیں کہ اپنی عمر کے اس دور میں جب انہیں تعلیم حاصل کرنا چاہیئے اور ملک کے لئے اپنی ہستی کو مفید بنانا چاہیئے۔ حالات کی مجبوری کی وجہ سے فکرِ معاش کے سلسلے میں انہیں وہ کام کرنے پڑتے ہیں۔ جن کی مشقت ان کی روحِ حیات کو کچل دیتی ہے بلکہ اُن کے حواس تک کو معطل کرنے کا باعث بنتی ہے۔ اس افسانے کا نوجوان ایک پنکھا قلی ہے جسے گرمیوں کی راتوں میں اس لئے جاگنا پڑتا ہے کہ سونے میں ایک ایسے انسان کی مدد کرے جسے آرام سے سونے کا حق اس لئے زیادہ ہے کہ اُس کے پاس بہت پیسے ہیں۔ اس کہانی کو پڑھ کر ہمارے دل میں یہ خیال ضرور آتا ہے کہ ایسے نظام کو بدل دینا چاہیئے اور اقتصادی مساوات کو اصولِ حیات بنانا چاہیئے۔ لیکن ہمیں اس شخص پر غصہ نہیں آتا جو ساری رات پنکھے کی ہوا کے نیچے چین سے سویا رہتا ہے۔ اور یہ اختر انصاری کے افسانوں کی ایک اور خوبی ہے۔ اُس کا مقصد سرمایہ داروں کی سیاہ کاریاں اور اُن کے ظالم کرداروں کی رسوائی نہیں، اُسے اُن کی ذات سے دشمنی نہیں اُسے اُس نظام سے نفرت ہے جس کی وہ پیداوار ہیں۔

"اندھی دنیا" جس کے نام پر کتاب کا نام رکھا گیا ہے، اسی تعلیم اور غربت کے مسئلے کو باقاعدگی سے زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ اس میں افسانہ نگار نے اپنے اندازِ نظر کو خارجی رکھا ہے۔ حمید ایک چھوٹا سا لڑکا ہے جس کے دل میں اُمنگیں ایک شدت اختیار کر لیتی ہیں، جب وہ دیکھتا ہے کہ امتحان میں اول آنے پر اسے دو روپے ماہوار وظیفہ ملتا ہے تو اس وظیفے کو قائم رکھنے اور زیادہ انعامات پانے کی دُھن میں وہ انہماک سے پڑھتا ہے لیکن گھر میں صرف ایک مٹی کا دیا ہے۔ چاندنی راتوں میں کھیتوں کی منڈیر اس کا مسکن ہوتی ہے اور چاند کی دھندلی روشنی علم کا نورانی بادل۔ لیکن یہی بادل اُس کے لئے غم کی گھٹا ثابت ہوتا ہے جب اس طور کے مطالعے سے اُس کی پہلے ہی کمزور آنکھوں کی بینائی مستقل طور پر جاتی رہتی ہے اور اُس کی دنیا ہمیشہ کے لئے اندھی ہو جاتی ہے۔

ان افسانوں میں ایک اور خصوصیت بھی نمایاں ہے ان میں کوئی فالتو یا فضول بات نہیں بیان کی جاتی اور یوں وحدتِ تاثر قائم رہتی ہے۔ البتہ بعض دفعہ افسانہ نگار کی انفرادیت اُس کے افسانے کو کہانی سے ہٹا کر انشا پردازی کا ایک نمونہ بنا دیتی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے بڑھ کر قابلِ ذکر وہ مضمون ہے جسے "ڈپٹی صاحب" کا عنوان دیا گیا ہے ایک صاحب، ڈپٹی صاحب "قاضی عبدالغفار کے لیلےٰ کے خطوط" کے عاشق ہیں اسی کتاب کے خیالات کا پرچار وہ ہر وقت کرتے رہتے ہیں اور ہر جگہ یہی رونا روتے رہتے ہیں کہ ہماری سماج میں مرد عورت پر لگاتار بے انتہا مظالم کئے جا رہا ہے لیکن آخر کار جب ان کی بیوی مر جاتی ہے تو وہ بھی اپنی عمر کی زیادتی کے باوجود ایک نو عمر پہاڑی دوشیزہ سے نکاحِ ثانی کر لیتے ہیں۔ اس

انشا میں یہی آخری نکتہ ایسا ہے جس سے اس میں کہانی کا انداز پیدا ہو جاتا ہے اگر ان آخر کی چند سطروں میں افسانہ نگار پلٹا نہ لیتا تو یہ افسانہ (؟) محض تبلیغی خیالات کا ایک مرقع بن کر رہ جاتا لیکن مختصر افسانے کی ٹیکنیک کے لحاظ سے ایسی خام چیزیں اختر کے افسانوں میں شاذ ہی نظر آسکتی ہیں اور غالباً اُس کی افسانہ نگاری کے دور میں یا ابتدائی کوششیں ہیں جب ابھی اُس کے ذہن پر نئے خیالات کا اثر زیادہ تھا اور اُس نے ابھی افسانے کے فنی پہلو پر قابو نہ پایا تھا۔ بعد کی چیزوں میں اگر اُس کی کہانیوں کا فنی پہلو بھی اپنی بلندی کو اُسی زور کے ساتھ ظاہر کرتا ہے جس زور کے ساتھ وہ مصنف کے خیالات کو ہمارے نوٹس میں لاتا ہے۔

ہر افسانے کے متعلق علیحدہ علیحدہ کچھ کہنے کی ضرورت بھی نہیں اور اس سے وہ صحیح تاثر بھی نہیں پیدا ہو سکتا جو اختر انصاری کی خصوصیت ہے یہ افسانے نپے تلے لفظوں میں صرف اپنے تاثر کے متعلقہ الفاظ ہی سے تیار کئے گئے ہیں اور اس لئے اقتباس سے ان کی خوبیوں کا اُس قدر اندازہ نہیں ہو سکتا جس قدر انہیں پڑھنے کے بعد۔

اندازِ بیان کے متعلق بھی صرف اسی قدر کہنا کافی ہے کہ وہی اختر انصاری جو اپنی شاعری میں سادگی، خلوص، بے ساختگی اور اختصار کی مثال تھا یہاں بھی اپنی اُنہی خصوصیات کو لئے ہوئے ہے۔ آخر میں ایک بات کا جتانا میں ضروری سمجھتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ کتاب کے شروع میں جو تمہیدی فقرے درج کئے ہوئے ہیں وہ نہ صرف فالتو ہیں بلکہ افسانہ نگار کے اندازِ نظر کو متعصبانہ ظاہر کرتے ہیں۔ اُن کے بغیر بھی مقصدی ادب کا کام بخوبی چل سکتا ہے۔ اور ترقی پسند ادب کی راہ میں کسی قسم کی رکاوٹ در پیش نہیں آسکتی۔

میرا خیال ہے کہ مختصر افسانوں کے اس بیش قیمت مجموعے کے صحیح درجے کو جانچنے میں ملک کبھی غلطی نہ کھائے گا اور ہندوستان کی دوسری زبانوں کے اردو جاننے والے ادیب اس کے ترجمے کی طرف بھی رجوع ہوں گے۔

فضائی حملے سے بچاؤ

مؤلفہ خان صاحب چودھری بشیر احمد خاں اے۔ آر۔ پی۔ انسٹرکٹر۔ ناشر میسرز عطر چند کپور اینڈ سنز لاہور۔ قیمت آٹھ آنے سائز درمیانی صفحات ۱۱۸۔

یہ چھوٹی سی کتاب وقت کی ایک بڑی ضرورت کو پورا کرتی ہے اور اسی لئے اور کتابوں کا حق مار کر اس پر تبصرہ کیا جا رہا ہے۔ اگرچہ اس سے پیشتر آپ انہی صفحات میں گیس کے دفاع کے متعلق ایک کتاب کا ذکر پڑھ چکے ہیں۔ لیکن یہ کتاب اسی موضوع کو زیادہ وسعت کے ساتھ بیان کرتی ہے۔ اس میں نہ صرف گیسوں کے اثرات اور اُن کے فوری علاج کے متعلق ابتدائی معلومات تفصیل کے ساتھ دی گئی ہیں۔ بلکہ ہوائی جہازوں اور بموں کی پہچان اور فضائی حملے کی صورت میں عوام اور متعینہ افسروں کے فرائض سے بھی آگاہ کیا گیا ہے۔ فضائی حملے کی صورت میں جس خوف و ہراس اور بدنظمی کے پھیلنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اُس کو دور کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ اس کتاب کو نہایت غور کے ساتھ پڑھا جائے اور اس میں جو باتیں لکھی ہوئی ہیں انہیں یاد رکھا جائے تاکہ خدانخواستہ اگر بین الاقوامی صورتِ حالات کے مدِ نظر گر ہندوستان کو بھی براہِ راست جنگ سے دوچار ہونا پڑے تو پبلک کے جان و مال کا کم سے کم نقصان ہونے پائے۔ ضرورت ہے کہ اس لٹریچر کو زیادہ سے زیادہ اشاعت دی جائے۔

مؤلف کا اندازِ بیان سیدھا سادہ اور سلجھا ہوا ہے اور زبان بھی آسان ہے۔ اس لحاظ سے بھی یہ کتاب اپنے مقاصد کو مدِ نظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔ فنی لحاظ سے اس میں جو معلومات ہیں اُن کے معیار کے لئے یہی کہنا کافی ہوگا کہ مؤلف نے اے آر پی (ہوائی حملے کی مدافعت) کا باقاعدہ امتحان پاس کیا ہوا ہے۔

اس کے علاوہ کتاب میں جگہ جگہ نقشوں اور لنفو تصاویر کے ذریعے سے تمام مسائل کو آسان سے آسان بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ موجودہ وقت میں یہ کتاب ہر ہندوستانی گھر میں پہنچنی چاہئے۔

ڈاک کے ڈاکو ساہ ادبی دنیا ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ تک خریداروں کے پاس پہنچ جاتا ہے اگر اس تاریخ تک آپ کو پرچہ نہ ملے تو ایک شکایتی کارڈ اپنے حلقے کے سپرنٹنڈنٹ پوسٹ آفس کو لکھئے اور ایک کارڈ ہمیں تاکہ آپ کو دوبارہ بھیجا جائے اور محکمہ ڈاک دروازے پر آکے اور دستخط ہو چلے جائے۔

فہرست مضامین ادبی دنیا لاہور

بابت ماہ ستمبر سنہ ۱۹۴۷ء

جلد ۱۸ — تصویریں:- دکھ کا دارو، پریم کا ساتھ — نمبر ۹

چندہ سالانہ مع محصول ڈاک اور وی پی پانچ روپے ممالک غیر سے دس شلنگ

گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام صلاح الدین احمد پرنٹر و پبلشر چھپ کر دفتر ادبی دنیا لاہور سے شائع ہوا۔ تصاویر اور مثالیں ... میں چھپا

دنیائے کاروبار

پربھات نگر کی خبریں

آج کل بارشوں کے باوجود "پربھات نگر" میں خوب چہل پہل نظر آتی ہے۔ "پڑوس" کی شوٹنگ بڑے زوروں پر ہو رہی ہے چونکہ اس فلم کے تمام مناظر کی اچھی طرح ریہرسل ہو چکی ہے اس لئے مسٹر شانتا رام بڑی سرعت سے اپنا کام پورا کر رہے ہیں امید ہے کہ بہت جلد یہ فلم نمائش کے لئے تیار ہو جائے گی۔

پڑوس کے افسانے میں کیا ہے۔ یہ باہر کے لوگوں کو بالکل معلوم نہیں۔ ہم صرف اتنا بتا دینا چاہتے ہیں کہ اس کا تعلق کسی مسئلے سے نہیں ہے۔ یہ دو پڑوسیوں کی داستان ہے اور بس۔ لیکن ہم یہ بات وثوق سے ضرور کہہ سکتے ہیں کہ جب شانتا رام کوئی افسانہ منتخب کرتا ہے تو اس میں کوئی نئی چیز ضرور ہوتی ہے۔ "پڑوس" میں آپ کو ایک نہیں کئی نئی باتیں ملیں گی۔ شانتا رام نے اس فلم میں تکنیک کے کئی نئے زاویے پیش کئے ہیں جو ہندوستانی صنعتِ فلم میں خوشگوار انقلاب کا موجب ہوں گے۔

عمر خیام

پچھلے دنوں "پربھات نگر" میں ایک مشہور صحافی مسٹر شانتا رام کی ملاقات کے لئے تشریف لائے۔ گفتگو کے دوران میں شانتارام صاحب نے آپ سے کہا "آج کل میں اس موڈ میں ہوں کہ کوئی عالی شان موضوع لے کر اس کا فلم بناؤں"۔ اس گفتگو کے چند روز بعد ہم نے سنا کہ انہوں نے اپنے آئندہ فلم کے لئے عمر خیامؒ کے سوانح حیات فلمانے کا فیصلہ بھی کر لیا ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں یہ خبر دلچسپی سے سنی جائے گی کہ اس فلم کی ابتدائی تیاریاں شروع ہیں۔ سید فتح لال صاحب عمر خیام کے وطن نیشاپور کے نقشے وغیرہ تیار کر رہے ہیں۔ اس زمانے کے ملبوسات بھی تیار کئے جا رہے ہیں۔

رباعی کے اس خدا کا پارٹ کون ادا کرے گا۔ یہ ایک پہیلی ہے۔ کیا آپ اسے بوجھ سکتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ مسٹر شانتارام نے اپنے دل ہی دل میں اس کردار کے لئے ایک آدمی چن رکھا ہے۔ پٹیل اور خواجہ احمد عباس کو تو آپ جانتے ہی ہوں گے۔ بس وہی اس افسانے کے مصنف ہیں۔ قریباً ڈیڑھ سو کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ان لوگوں نے یہ فلمی کہانی لکھی ہے۔

مغل لائن لمیٹڈ

مسلمانوں کی قائم کردہ سب سے پرانی جہازران کمپنی ہے جو حاجیوں کو جدہ تک لے جانے اور واپس لانے میں امتیازی حیثیت حاصل کر چکی ہے۔ اس کے جہاز نہایت کشادہ اور حفظانِ صحت کے جدید ترین اصولوں کے مطابق تیار کئے گئے ہیں۔ ڈیک کے مسافروں کے لئے نماز باجماعت ادا کرنے کے لئے ایک وسیع میدان ہر جہاز میں چھوڑا گیا ہے۔ حاجیوں کو ہر طرح کا آرام پہنچانا ہر جہاز کے کارکنوں کا فرض ہے اور وہ اپنے اس فرض کو بدرجہ اتم ادا کرتے ہیں۔ جن حجاج کو مغل لائن کے ذریعے سے حج کرنے کا موقع ملا ہے وہ اس کے اعلیٰ انتظام کے متعلق رطب اللسان ہیں۔ گذشتہ موسم حج میں جبکہ جنگ کی وجہ سے کوئلہ کا نرخ غیر معمولی طور پر بڑھ جانے کے باعث جہاز رانی کے مصارف بہت زیادہ بڑھ گئے تھے مغل لائن نے نہ تو کرایہ میں کسی قسم کا اضافہ کیا اور نہ ہی حج سروس بند کی۔ یہ اس شاندار کمپنی کی روز افزوں ترقی کا نتیجہ ہے۔ ہم اپنے ناظرین سے پرزور اپیل کرتے ہیں کہ حج کے موقعے پر مغل لائن کے جہازوں سے ضرور فائدہ اٹھائیں تفصیلات کے لئے مندرجہ ذیل پتہ پر لکھئے

ٹرنر مارسین اینڈ کمپنی لمیٹڈ ۱۶ اینک سٹریٹ بمبئی۔

فضل الٰہی

مہتمم اشتہارات ادبی دنیا

بزم ادب

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آبِ بقائے دوام لے ساقی!

آغا شاعر، اور سید عبدالرؤف عشرت کا غم ابھی تازہ تھا کہ ٹپنے سے مولانا احسن مارہری کے افسوسناک انتقال کی خبر ملی۔ حضرت احسن جناب داغ کے ممتاز شاگردوں میں سے تھے۔ اور ان کا کلام اپنی نفاست، روانی، اور شباب انگیز تخیل کے لحاظ سے اردو نظم میں ایک خاص حیثیت رکھتا ہے۔ مرحوم ایک مدت تک مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں اُدبیات کے معلم رہے وہ درس و تدریس کے علاوہ اپنا وقتِ عزیز اردو کی خدمت میں صرف کرتے تھے۔ اُن کے بلند پایہ اشعار احسن الکلام کے عنوان سے ملک کے سربرآوردہ رسائل و جرائد میں اکثر شائع ہوتے رہے ہیں اور چند نہایت بیش قیمت ادبی مقالے بھی اُن سے یادگار ہیں۔ داغ مرحوم پر اُن کا ایک سلسلۂ مضامین خاص دلچسپی اور معلومات کی چیز تھی۔ مولانا احسنؒ ادبی دنیا پر ہمیشہ نظرِ عنایت رکھتے تھے، اور اُن کی وفات ہمارے لئے ذاتی طور پر ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔

حیدرآباد سے یہ روح افزا خبر آئی ہے کہ عثمانیہ یونیورسٹی کے استاد طبیعیات پروفیسر رضی الدین صدیقی کو امسال دنیا کا سب سے بڑا علمی انعام (نوبیل پرائز) ملا۔ یہ انعام انہیں غالباً اُن کی کسی عظیم الشان طبیعی تحقیقات پر ملا ہوگا جس کی تفصیل سے ہم آشنا نہیں اور غالباً ہو بھی نہیں سکتے لیکن ہم ادبی لوگوں کے لئے کیا اسی قدر کافی نہیں کہ ایک ہندوستانی کا علمی کارنامہ اس سال دنیا بھر کے علمی کارناموں سے بڑھ گیا۔ ع بریں مژدہ گر جاں فشانم رواست۔ ہم ڈاکٹر صدیقی کو، اگر یہ سطور اُن کی نظر سے گذریں، اپنی اور ناظرینِ ادبی دنیا کی جانب سے پرخلوص مبارکباد کا ہدیہ پیش کرتے ہیں وہ ہندوستان میں غالباً تیسرے شخص ہیں جنہیں یہ عظیم الشان اعزاز نصیب ہوا۔

اس شمارے کے مضامین میں مبشر علی صاحب صدیقی کا مقالہ اردو مزاحیہ نگاری کی مختصر تاریخ خاص طور پر قابلِ توجہ ہے۔ صاحبِ مضمون کی رائے سے بعض پڑھنے والوں کو کہیں کہیں ضرور اختلاف ہوگا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ انہوں نے اپنے جائزے میں غیر معمولی غیر جانبداری سے کام لیا ہے۔ افسوس ہے کہ ہماری مزاح نگاری نے ترقی کی دوڑ میں ادب کی دیگر اصناف کا ساتھ نہیں دیا لیکن اگر چند صاحبِ نظر نقاد اس طرف خاص توجہ دیں تو امید ہے کہ ہمارے ادیبوں کا یہ جوہر بھی کچھ نہ کچھ نکھر آئے گا۔

راجندر سنگھ صاحب بیدی ایک عرصے کے بعد ہماری بزم میں شامل ہوئے ہیں اُن کا ایک دلچسپ مطالعہ زین العابدین اس اشاعت کی زینت ہے، اور ہم اُسے بلا تامل "بوہیمین لائف" کا ایک کامیاب چربہ کہہ سکتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیدی صاحب ہماری معاشرت کا کوئی پہلو اچھوتا چھوڑنا نہیں چاہتے، ہمیں حیرت ہے کہ انہیں ایک مصروف زندگی کے باوجود انسانی مطالعے کے ایسے صبر آزما موقعے کیونکر میسّر آتے ہیں۔

آج تک ریڈیو سے نشر ہونے والے ادبی مضامین کے متعلق "ادبی دنیا" کی پالیسی یہی رہی ہے کہ رسائل کے ادب کو فضائی ادب سے علیحدہ رکھا جائے تاکہ امتیازی طور پر معلوم ہو سکے کہ زمین کے رہنے والے کیا کہتے ہیں اور زمین سے ذرا اوپر والے کون سی راگنی الاپتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے آج تک کوئی نشر شدہ چیز شائع نہیں کی۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ آغاز میں ریڈیو کے ادیب محض ریڈیو ہی کے ادیب تھے۔ ادبی رسائل میں اُن کی ہستی مردہ ہو چکی تھی۔ لیکن اب جہاں آل انڈیا ریڈیو کا کام تجربوں سے بڑھ کر مستقل حیثیت اختیار کر گیا ہے وہاں چند خوشگوار تبدیلیاں بھی ظاہر ہوئی ہیں بعض سٹیشنوں پر کبھی کبھار اچھے لکھنے والوں کو بھی بلا لیا جاتا ہے اور اس طرح بعض ایسی چیزیں بھی نشر ہوتی رہتی ہیں جنہیں اگر رسائل کے ذریعے سے دوام دے دیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔ ان حالات کے مدِ نظر آئندہ ادبی دنیا اپنی معین پالیسی میں مستثنیات کو بھی جگہ دے گا لیکن یہ استثنے بہت محدود ہوگا۔ چنانچہ اس دفعہ جب ہمارے خود فراموش کرمفرما جناب مظفر حسین شمیم نے اپنا اچھوتا مقالہ اردو ناٹک کی شاعری ہمیں اشاعت کی غرض سے بھیجا تو اُس کی خوبیوں کو دیکھتے ہوئے ہمیں مذکورہ بالا استثنے کا آغاز کرنا پڑا۔

صلاح الدین احمد

(۲)

جب سے اردو شاعری پر نظم کی حکومت ہوئی ہے ہمیں نت نئے انداز دکھائی دینے لگے ہیں۔ یہاں تک کہ تشبیہہ اور استعارے میں بھی جدید اسلوب پیدا ہو گئے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کی نظم اس کی ایک مثال ہے نظم کا بنیادی موضوع صرف اس قدر ہے کہ جس طرح دن کی روشنی کے بعد رات کا منظر اس دھرتی پر چھا جاتا ہے اسی طرح دل پر بھی ایک کیفیت طاری ہوتی ہے ــــــ اُس وقت جب عورتوں کی دلکشی بصارت میں سما کر کھو جاتی ہے اور بصیرت پر قبضہ جما لیتی ہے۔ گویا شاعر کا اصل موضوع وہ گھونگھٹ والیاں ہیں جنہیں اُس نے کبھی دیہات میں دیکھا تھا اور جن کے "لہنگے کی لہروں کے تلے کمکھن سے پاؤں رقص میں تھے"۔ اور

جن کے "سینے چھلکتے میکدے تھے" اور "ہونٹ ہیمانوں کے لب" ـــــ

یہ منظر پنگھٹ والیوں کا یہ منظر کہ جب وہ چل رہی تھیں تو پگ ڈنڈیوں کے اُس طرف گاگر کی چھاؤں "رقص میں" تھی، شاعر کے تحت الشعور میں تھا ـــــ اور پھر وہ اتفاقاً کسی شہر میں جا پہنچا، یہاں اس نے دیکھا کہ شام کے بعد "بجلی کا کھمبا تھام کر بانکا سپاہی سو گیا" اور "مشرق کے پربت سے پرے یک بیک گھٹائیں اُبھریں" اور "تارے نگلتی بدلیاں" ہر طرف چھا گئیں اور پھر آخر میں جب "ہر چیز نے آنکھیں ملیں، ہر چیز جم کر رہ گئی" اور "گنگناتی ظلمتوں کا جادو چھا گیا" تو "سنسان رات میں ستاروں کی درخشانی باقی رہ گئی، لیکن ان ستاروں کی فضائے بعید میں صاف آسمان کی ظلمت تھی" ـــــ شہر کے اس منظر کو دیکھ کر شاعر کے ذہن میں وہ منظر تحت الشعور سے اُبھر آیا جو اُس نے کبھی گاؤں میں دیکھا تھا۔ اور اُس نے محسوس کیا کہ جس طرح دیہات میں پنگھٹ والیوں کے چلے جانے کے بعد اُس کے دل کے "شہر" پر "سنسان راتوں کا سماں" طاری ہو جاتا تھا اسی طرح اس شہر میں دن کے بعد رات کا منظر چھا جاتا ہے۔

اوپر کی عبارت میں جو ٹکڑے واوین میں دئیے گئے ہیں وہ شاعر کے انداز بیان کی خوبیاں بھی پوری طرح ظاہر کر رہے ہیں۔

میرے خیال میں یہ نظم احمد ندیم قاسمی کی کامیاب نظموں میں سے ہے اور اُس کی انفرادی فن کاری کے ایک سے زیادہ پہلوؤں کو ظاہر کرتی ہے۔

جس شہر میں جا کر احمد ندیم قاسمی کو دیہات کی پنگھٹ والیاں یاد آئی تھیں، اختر ہوشیارپوری شاید اُسی شہر کا رہنے والا ہے۔ "برسات کی رات ہے" "گلی کوچوں میں خاموشی ہے"۔ "نشیلے بادل" ہیں "ملائم تیرگی" ہے اور چونکہ ایک شہر کی رات کا منظر ہے، دن کا نہیں، اس لئے جب "ہوائیں رقص کرتی ہیں"۔ "تو خموشی گنگناتی ہے" اور کیوں نہ گنگنائے کہ منظر ہی ایسا ہے "گھروں کے بند دروازے پھواروں سے کھنک رہے ہیں" اور اگرچہ شاعر کی "نگاہوں کے سفینے میں اب پانی ہی پانی ہے"۔ لیکن جس طرح بجلی کے چمکنے سے سب "گلی کوچے جھلکتے ہیں" اسی طرح شاعر کے دل پر بھی منظر کا اثر ہو رہا ہے اور اُسے ایسی ہی گذری ہوئی راتوں کی یاد آ جاتی ہے۔ وہ راتیں کیسی تھیں؟ کیا اُن راتوں میں اور آج کی رات میں کوئی فرق ہے؟ ـــــ اس کا جواب ہمیں ذیل کے شعر کا لطیف کنایہ دے رہا ہے کہ "بدلتی ہیں گھٹائیں یوں قبائیں آسمانوں پر" کہ جس سے "سنہری حاشئے چڑھتے ہیں دل کی داستانوں پر" ـــــ اور آخر میں تو راز پوری طرح طشت از بام ہو جاتا ہے اور ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ اس رات میں شاعر ایک محبوب ہستی کی کمی کو محسوس کر رہا ہے۔

اس نظم میں بعض جگہ اندرونی قوافی نے خوب موسیقی پیدا کی ہے۔ "بدلتی ہیں گھٹائیں یوں قبائیں آسمانوں پر" ـــــ اور "تنفس کی روانی میں محبت کی کہانی ہے"۔ نیز "نشیلے بادل" اور "ملائم تیرگی" کی ترکیبیں بھی بیانیہ لحاظ سے قابل غور ہیں۔ باقی اس کے بہتر ٹکڑے پہلی نظم کی طرح ہی اوپر کی عبارت کے واوین میں شامل ہیں۔

اختر ہوشیارپوری کی نظم میں داخلی احساس کو خارجی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ لیکن نسیم محمود مخمور کی نظم یکسر داخلی انداز لئے ہوئے ہے۔ دونوں نظموں میں محبت ہی کا جذبہ کارفرما ہے لیکن پہلی نظم کا شاعر اپنے جذبے کے متعلق ایک یقینی کیفیت کا مالک ہے اور دوسری نظم کا شاعر چند اُلجھنوں میں گرفتار ہے۔ پہلا شاعر اپنی محبوب کو دوبارہ دیکھنے کی ہوس رکھتا ہے، ایک اور آمنا سامنا چاہتا ہے، دوسرا شاعر ایک اور آمنے سامنے میں پہلے تعلق کا بے حقیقت پہلو ظاہر کر رہا ہے۔ اُس کا جذبہ اب ایک خوش آئند یاد بن کر رہ گیا ہے اب اُس کے احساس پہلے سے نہیں رہے اور محبت کی موت پر دہ خجل ہے، شرمندہ ہے!

"لگی کی لاگ" بظاہر ایک نظم ہے اور ہیئت کے لحاظ سے غزل، لیکن دُھن اور کیفیت کے لحاظ سے ایک گیت کا درجہ رکھتی ہے اور اس کا بہاؤ کسی پہاڑی ندی کے بہاؤ ایسا ہے جس میں ایک ترنم کا تواتر ہے اور سارنگی کے نغمے کا تسلسل۔

محمد ایوب محسن کا تغزل ایک اونچے پربت کی مانند ہے، پروقار۔ اس میں اگرچہ ردیف صرف تین لفظوں پر مشتمل ہے۔ لیکن موضوع پر یہ بہت سی پابندیاں عائد کر دیتی ہے۔ مقام مسرت ہے کہ اس غزل کا شاعر اُن پابندیوں سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہوا ہے۔

یہ سب شاعر دل کے مسائل میں اُلجھے ہوئے تھے لیکن روشن دین تنویر کو ذہن کا ایک مسئلہ اُلجھائے ہوئے ہے۔ "فتح" "آج کل خصوصاً ایک لائق توجہ نظم ہے۔ اس منظوم مکالمے میں نہ صرف باتوں کی سادگی شاعر کے بیان کو جِلا دے رہی ہے بلکہ موضوع کی سنجیدگی اور اہمیت ایک دعوت تفکر ہے، اس نظم کو دو اور نقاط نظر سے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک طنزیہ شاعری کے لحاظ سے اور دوسرے اردو شاعری میں مثنوی کی نئی صورتوں کے لحاظ سے۔ اس سے پہلے تنویر کی شاعری عموماً تخیل کی پروردہ تھی لیکن اس نظم میں عملی زندگی کا جو پہلو پیش کیا گیا ہے اس سے توقع ہوتی ہے کہ شاید آئندہ ہم اس شاعر کو ایک نئے رنگ میں دیکھیں گے۔

ـــ میراجی

آئینۂ عالم

ٹراٹسکی

ٹراٹسکی، صوبہ یوکرین کے ایک شہر نکولائف میں ۱۸۷۹ء میں پیدا ہوا۔ وہ ایک یہودی عطّار کا بیٹا تھا۔ ۱۹۰۵ء میں اس نے پیٹروگریڈ کے مزدوروں کے نمائندوں کی ایک جماعت تیار کی۔ یہ جماعت اپنے مقاصد میں ناکام رہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ٹراٹسکی جلا وطن کر دیا گیا۔ ۱۹۰۷ء میں یہ بلند پایہ شخص دی آنا میں پناہ گزین ہو گیا اور روس میں سوشلزم کے قائم کرنے کے امکانات کا گہرا جائزہ لیتا رہا۔

جنگ عظیم کے آغاز ہی میں یہ پیرس چلا آیا۔ یہاں اس نے روسی زبان میں ایک اخبار جاری کیا۔ جس میں اس نے شہنشاہیت کے خلاف مضامین لکھنے شروع کئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فرانسیسی حکومت نے اسے فرانس سے نکال دیا۔ اس نے پہلے سوئٹزرلینڈ میں اور پھر سپین میں قیام کرنے کا ارادہ کیا۔ مگر ان دونوں ملکوں نے بھی اسے داخلے کی اجازت نہ دی۔ بالآخر اسے ریاست ہائے امریکہ میں جانا پڑا۔

۱۹۱۷ء میں جب اسے خبر ملی کہ زاریت تباہ ہو گئی ہے تو اس نے روس کا رُخ کیا۔ مگر راستے ہی میں حکومتِ انگلستان نے اسے گرفتار کر لیا۔ روس میں اس وقت مزدوروں کی ایک بااثر جماعت قائم ہو چکی تھی۔ اس جماعت کے ایما پر حکومتِ روس نے انگریزوں سے مطالبہ کیا کہ ٹراٹسکی کو رہا کر دیا جائے چنانچہ ٹراٹسکی رہا ہو کر روس پہنچ گیا۔

روس پہنچ کر ٹراٹسکی نے لینن سے تعاون کیا اور یہ دونوں اشتراکی رہنما الیگزنڈر کیرنسکی کی طرزِ حکومت (جس کی بنیاد شہنشاہیت پر رکھی گئی تھی) کے استیصال کے فکر میں رہے۔ ٹراٹسکی اس دوران میں خارجی معاملات کا سیکرٹری بن گیا۔ اور شہنشاہیت کے زمانے کے اُن رازوں کو طشت از بام کرتا رہا۔ جن سے جمہور اب تک ناآشنا تھے۔ اس نے ساتھ ہی شہنشاہیت کے حامیوں کی طرف صلح کا ہاتھ بڑھایا مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ صلح کی گفت و شنید دیر تک جاری رہی۔ ٹراٹسکی اس گفت و شنید کو طوالت میں ڈالنا چاہتا تھا کیونکہ اسے امید تھی کہ وہ جرمنی میں اشتراکی تحریک جاری کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ ۱۰ فروری ۱۹۱۸ء کو گفت و شنید کا سلسلہ بند ہو گیا اور ٹراٹسکی نے مخالفین کو اپنے ساتھ ملا کر روس کی جنگ سے علیحدگی کا اعلان کر دیا۔

انہی دنوں جرمنی کی ایک جدید فوج نے لیوونیا اور استھونیا سے بالشویک لوگوں کو نکال باہر کیا۔ طرفین میں گفت و شنید شروع ہوئی اور ۸ مارچ کو سوویٹ نمایندوں نے صلح نامے پر دستخط کر دئیے اور ٹراٹسکی نے اپنے عہدے سے علیحدگی اختیار کر لی۔

کچھ عرصے کے بعد ٹراٹسکی جنگ کا سیکرٹری بنا دیا گیا۔ اس نے سرخ فوج کی تشکیل کی اور پولینڈ پر حملہ کیا۔ اس فوج کے چند دستے جرمنی کی سرحدوں پر چڑھ آئے۔ مگر انہیں شکست کھانا پڑی۔

بالشویک لینن کی پالیسی سے بیزار ہو چکے تھے۔ لینن نے شہنشاہیت پرست جماعت کو چند مراعات دے رکھی تھیں، اور بالشویک اس بات پر رضامند نہ تھے۔ انہوں نے ٹراٹسکی کو دعوت دی کہ آ کر معاملات کو اپنے ہاتھ میں لے۔ چنانچہ ٹراٹسکی بالشویکوں کا رہنما بن گیا۔ لینن کی وفات کے بعد ٹراٹسکی دیگر رہنماؤں کے ساتھ نئے نئے جھگڑوں میں معروف رہا۔ اور اپنے وقار کو کھو بیٹھا۔

ٹراٹسکی چاہتا تھا کہ بالشویکوں کی جماعت میں جتنے جھگڑے رونما ہوتے رہتے ہیں وہ سب مٹ جائیں۔ اور جماعت کے اراکین کو کسی نظریے کی پیروی کرنے پر مجبور نہ کیا جائے۔ اُس نے سٹالن، کامی نف، اور زنیوف کی

پالیسی پر سخت لے دے کی۔ اس سے لوگ سمجھنے لگے کہ یہ شہنشاہیت کا حامی ہے اور اپنے مقاصد کو تکمیل کے درجے تک پہنچانے کی خاطر بالشویکوں کے ساتھ ملا ہوا ہے۔

اس دوران میں ٹراٹسکی کی صحت خراب ہو گئی مگر اس کے باوجود اس نے ۱۹۲۴ء میں اپنی مشہور کتاب "اکتوبر کا سبق" شائع کرائی، جس میں اس نے اپنے دوستوں کی بے وفائی کے متعلق وضاحت سے بیان کیا کہ کس طرح سوشلزم کے ابتدائی ایام میں وہ اس کے راستے میں رکاوٹیں ڈالتے رہے۔ اس کتاب کی اشاعت کے ساتھ ہی اسے طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا گیا۔ اور جنوری ۱۹۲۵ء میں جنگ کے سیکرٹری کے عہدے سے برخاست کر دیا گیا۔ سٹالن اور اس کے رفقائے کار کو سرخ فوج پر پورا پورا قابو نہ تھا۔ اس لئے سیاسی مصلحت کی بنا پر ٹراٹسکی کو تین ماہ کے بعد پھر ایک متقدر عہدے پر متعین کر دیا گیا۔

یہاں زینوویف اور کامی نف جو ایک عرصے تک ٹراٹسکی کی شدید مخالفت پر تلے رہے تھے اب اس کے خیالات سے اتفاق کرتے ہوئے اس کے دست راست بن گئے۔ ٹراٹسکی کا خیال تھا کہ سٹالن بالشویکوں کو شہنشاہیت کے اصولوں کی طرف لئے جا رہا ہے۔ اور مزدور لوگ موجودہ نظام حکومت میں اسی طرح ظلم و ستم کا نشانہ بن رہے ہیں جس طرح وہ زار کے زمانے میں تھے۔ ٹراٹسکی اشتراکیت میں ایک انتہا پسند انسان کی طرح کام کرنا چاہتا تھا۔ اور اس کا منتہائے نظر یہ تھا ——— کہ دنیا بھر میں ایسا ہی نظام حکومت قائم ہو جائے۔

اسی سال ماہ اگست میں ٹراٹسکی کو دوبارہ معزول کر دیا گیا۔ اور اس کی کتاب "اشتراکی آمریت میں تبدیلی کی کوشش" ضبط کر لی گئی۔ اکتوبر میں اس نے سٹالن کے اصولوں پر بڑا زبردست حملہ کیا اور وہ اور اس کے دیگر رفیق اپنے اپنے عہدوں سے برخاست کر دیے گئے۔ ٹراٹسکی کی بیوی کو بھی ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا۔ ٹراٹسکی اور اس کی جماعت کے دیگر اراکین کا خیال تھا کہ سٹالن کی غلط پالیسی نے ملک کو مالی مشکلات میں مبتلا کر دیا ہے۔ اس کی بیرونی پالیسی بھی اتنی کامیاب نہیں۔ اس کی آمریت میں مزدور کو اپنے خیالات کے اظہار کی اجازت نہیں۔

اکتوبر ۱۹۲۷ء میں ٹراٹسکی کی جماعت نے دور و نزدیک کے اشتراکی بھائیوں کو خطوط لکھے کہ وہ آمریت کے موجودہ نظام کو تباہ کر دیں۔ سٹالن کے کانوں تک جب یہ دہشت انگیز خبریں پہنچیں تو اس نے ٹراٹسکی اور اس کی جماعت کے دیگر تیس اراکین کو ملک بدر کرنے کے احکام جاری کر دیے۔ ان کے خلاف الزامات یہ تھے کہ وہ روس میں رہنے والے غیر ملکی سیاسیین کی مدد سے آمریت کے موجودہ نظام کو الٹنا چاہتے ہیں۔ اس لئے ان کی سرگرمیاں سوویٹ نظام کے لئے مہلک ہیں۔

۱۶ جنوری کو ٹراٹسکی نے چینی ترکستان کی سرحد پر کے ایک گمنام سے گاؤں کا رخ کیا۔ ماسکو کو الوداع کہتے وقت ٹراٹسکی اور اس کے رفقاء نے سٹالن کی جماعت کو ایک عرضداشت پیش کی جس میں انہوں نے بتایا کہ ہم ایک بڑی قوت کے سامنے جھک رہے ہیں مگر ہمیں یقین ہے کہ آنے والی کشمکش میں ہم اسی طرح متقدر نظر آئیں گے جس طرح ہم آج تک رہے ہیں۔ اس لئے ہم درخواست کرتے ہیں کہ ہمیں دوبارہ اپنے عہدوں پر فائز کیا جائے۔

ورنی ایسی گمنام جگہ ہے، جو نزدیک ترین ریلوے سٹیشن سے ایک سو پچیس میل دور ہے، یہاں ٹراٹسکی اپنی بیوی، اور اپنے بڑے لڑکے کے ساتھ سادہ زندگی بسر کرتا رہا۔ سیاسیات میں اسے حصہ لینے کی اجازت نہ تھی۔ یہ بات اس کے لئے مفید ثابت ہوئی اور اس کی گرتی ہوئی صحت بحال ہونے لگی۔ وہ ہر وقت پولیس کی شدید نگہداشت میں رہتا تھا۔ مگر جب اس بے کیف زندگی سے گھبرا اٹھتا تو بندوق لے کر شکار کو چل دیتا۔ اشتراکی جماعت گذر اوقات کے لئے اسے پچیس پاؤنڈ ماہوار بھیج دیتی۔ اس رقم کے علاوہ گورنمنٹ پبلشنگ ٹرسٹ بھی رائلٹی کی رقوم اسے بھیجتا رہتا۔ ٹراٹسکی نہایت ہی سادگی سے زندگی گذارتا تھا۔ اور ان رقوم سے اس کا گذرا اچھی طرح ہو جاتا تھا۔

ٹراٹسکی اپنے وقت کا بیشتر حصہ لکھنے پڑھنے میں گذارتا۔ قیام کے دوران میں اس نے تین کتابیں ——— (۱) اشتراکیت اور فاشسٹیت (۲) چینی انقلاب سے سبق اور (۳) پائیدار انقلاب ——— لکھیں۔ ان کتابوں کے علاوہ اس نے اپنی زندگی کے سوانح لکھے۔ نیز وہ اپنے روسی دوستوں اور جلاوطن ہونے والے دیگر دوستوں بالخصوص راکوسکی، اور رادک کو بے شمار خطوط لکھتا رہا۔

انہی ایام میں ٹراٹسکی ملیریا بخار سے بیمار پڑ گیا اور علاج کی غرض سے اسے ماسکو آنے کی اجازت مل گئی۔ سٹالن نے اسے کہا کہ اگر تم میری مخالفت سے باز آ جاؤ تو تمہیں یہیں رہنے کی اجازت دے دوں گا۔ مگر ٹراٹسکی نے بڑے استقلال سے اس درخواست کو ٹھکرا دیا اور ورنی واپس چلا گیا۔

۱۹۲۹ء میں ٹراٹسکی کے حامیوں پر سٹالن کے وضع کردہ نظام

حکومت کے خلاف ایک بڑی سازش کھڑی کرنے کا الزام لگایا گیا۔ ان میں سے بہت سے گرفتار ہوئے اور ٹراٹسکی کو ان سے مکمل طور پر جدا کرنے کی غرض سے، روس سے باہر نکال دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ ٹراٹسکی اپنی بیوی اور لڑکیوں کو ساتھ لے کر ایک خفیہ نام ـــ سیپ راف ـ اختیار کر کے قسطنطنیہ پہنچا۔ یہاں بھی سوویٹ حکومت نے اس کی نگرانی شروع کر دی اور وہ ایک طرح کا قیدی بن کر رہنے لگا۔ اسے روسی افسروں کے علاوہ کسی دوسرے شخص سے خط و کتابت کی اجازت نہ تھی۔

بالآخر ٹراٹسکی بحیرۂ مارمورا کے کنارے ایک جزیرے ـ پرن پیکو ـ میں رہنے لگا۔ مارچ ۱۹۳۱ء کو اس کا چوبی مکان جلا دیا گیا۔ تمام فرنیچر اور لائبریری اور دیگر اشیا کا کافی حصہ جل کر راکھ ہو گیا۔ مگر لینن کے ساتھ اس کی خط و کتابت کے کاغذات اور روسی انقلاب کی تاریخ کے مسوّدات بچ گئے۔

نومبر ۱۹۳۲ء میں ٹراٹسکی نے ترکی کو خیرباد کہا۔ زیکوسلاویکیہ میں اسے داخلے کی اجازت نہ ملی۔ البتّہ ڈینمارک جانے کی اجازت مل گئی کہ وہاں طلباء کو لیکچر دیا کرے۔ کولمبیا براڈکاسٹنگ کمپنی نے تین سو پونڈ کے عوض میں اس کے لیکچروں کا ملخص خریدنے کی کوشش کی مگر ڈینش ڈائرکٹر نے براڈکاسٹ کی اجازت نہ دی اور یہ ملخص ٹیلیفون کے ذریعے سے لندن اور وہاں سے نیویارک پہنچایا گیا۔

ڈینمارک کو چھوڑ کر ٹراٹسکی نے فرانس میں رہائش اختیار کر لی۔ لیکن یہاں بھی کسی سوداگر کو اجازت نہ تھی کہ اس کے مکان میں اس سے ملاقات کر سکے۔ البتّہ رات کے اندھیرے میں وہ چند ملاقاتیوں سے مل لیا کرتا تھا۔

ٹراٹسکی کے دوستوں نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح سٹالن کے وہ احکام جن کے ماتحت ٹراٹسکی جلا وطن کیا گیا تھا، منسوخ ہو جائیں مگر سب اپنی اپنی کوشش میں ناکام رہے۔

کیرف، جو سٹالن کا دستِ راست تھا، دسمبر ۱۹۳۴ء میں قتل کر دیا گیا۔ جون ۱۹۳۵ء میں کیرف کے قتل ہونے کو ٹراٹسکی کی سازش پر محمول کیا گیا۔ زینودف، کیمی نف اور ٹراٹسکی کے دیگر چودہ رفقاء جو ماسکو جیل میں پڑے تھے، اس سازش کے بانی ٹھہرائے گئے اور گولی کا نشانہ بنا دئیے گئے۔

ٹراٹسکی ۱۹۳۵ء میں ناروے چلا گیا۔ اس نے اعلان کیا کہ سٹالن کی حکومت محض غلط فہمی کی بنا پر اس کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ ناروے کی حکومت نے سیاسیات سے باز رہنے کا ٹراٹسکی سے وعدہ لینا چاہا۔ مگر اس نے انکار کر دیا۔ حکومت ناروے نے اسے ایک قسم کا نظر بند قرار دیا۔ اُسے ٹیلیفون یا خط و کتابت کسی بات کی اجازت تھی۔ ملاقاتیوں کو بجز خاص حالات کے اس سے ملاقات کی اجازت نہ تھی۔ نیز اس کے سیکرٹری ناروے سے خارج کر دئیے گئے۔

۱۹۳۷ء سے ٹراٹسکی شہر میکسیکو میں قیام پذیر تھا۔ مئی ۱۹۴۰ء کے آغاز میں اس پر تیس اشخاص نے بندوقوں سے حملہ کیا۔ ٹراٹسکی اور اُس کی بیوی نے فرش پر لیٹ کر اپنی جانیں بچائیں۔ ۲۱ راگست کو دوبارہ اس پر حملہ ہوا۔ حملہ آور فرینک جانسن نے ہتھوڑے کے ساتھ ٹراٹسکی کا سر کچل دیا اور وہ ۲۳ راگست کو سات بج کر پچیس منٹ پر زندگی اور موت کی کشمکش سے رہا ہو کر عدم کو سدھارا۔

ٹراٹسکی کے قاتل جانسن کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ وہ یا تو یونین آف سوشلسٹ سوویٹ ریپبلک یا فاشسٹیت کا ممبر ہے۔ اس نے بیان دیا ہے کہ مجھ پر ٹراٹسکی کے نظریات نے مسحور کن اثر کیا۔ اور میں پیرس سے میکسیکو پہنچا۔ ٹراٹسکی کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد میں نے یوں محسوس کیا گویا میں فریب خوردہ ہوں اور اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں دنیا کو ٹراٹسکی کے وجود سے نجات دلاؤں گا۔

ٹراٹسکی کو جب ایمبولینس کار پر ہسپتال پہنچا رہے تھے تو اس نے کہا ـــ "مجھ پر حملہ کرنے والا یا تو سوویٹ ریپبلک کا کوئی نمائندہ ہے یا فاشسٹیت کا کوئی حامی ہے۔ میں ہر لمحہ موت کے قریب پہنچ رہا ہوں۔ میرے دوستوں سے کہہ دو۔ کام کئے جاؤ۔ مجھے یقین ہے کہ فتح تمہاری ہوگی۔"

طاہر قریشی

آج کل کا پیرس

امریکی اخبارات کے ایک نامہ نگار نے ایک مضمون لکھا ہے جس سے آج کل کے پیرس کی صورتِ حال کا پتہ چلتا ہے۔ اس مضمون میں یہ نامہ نگار لکھتا ہے۔

"جب میں پیرس سے روانہ ہونے لگا تو کیفے ڈی لاپیکس کے نوجوان ملازم نے میری طرف مخاطب ہو کر کہا "میں نے دس تک جرمنی زبان میں گننا سیکھ لیا ہے"۔ مجھے یہ سن کر مطلق حیرانی نہ ہوئی۔ آخر اس میں حیران ہونے کی بات ہی کون سی تھی۔ لیکن میں نے سوچا۔ اچھا ہی کیا اس نے کم از کم اسے یہ فائدہ تو ہوگا کہ وہ اپنے جرمن گاہکوں کو جو پیرس پر بادلوں کی طرح چھائے ہوئے ہیں، اشیا کی قیمت آسانی سے بتا سکے گا اگر یہ آج ایسا نہ کرتا تو ہفتہ دو ہفتہ یا زیادہ سے زیادہ ایک مہینے تک تو اُسے ضرور ایسا کرنا پڑتا۔ چلو اس کی ایک مشکل تو کسی حد تک آسان ہو گئی، اب وہ اپنے جرمن گاہکوں سے کہہ سکے گا کہ اتنے فرانک دیتے جاؤ وغیرہ وغیرہ۔

"آج کل پیرس پر جرمنوں کا مکمل قبضہ ہے۔ پیرس میں جس طرف بھی آنکھ اٹھا کر دیکھو جرمن ہلکی نیلی، گہری نیلی اور بھوری وردیوں میں ملبوس نظر آئیں گے۔ ان رنگدار وردیوں سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ فلاں جرمن فضائی محکمے سے تعلق رکھتا ہے۔ اور فلاں سمندری فوج کے دستوں سے۔

یہ لوگ اکثر دن کا بہت سا حصہ ہوٹلوں میں گذارتے ہیں۔ جہاں یہ چائے پیتے رہتے ہیں اور باتیں کرتے رہتے ہیں، ان میں بعض ہوٹلوں کی گیلریوں میں اپنے فوجی لباس میں کھڑے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔ ان کے بلند قہقہے بازاروں میں سے سر جھکا کر گذرنے والے اہلِ پیرس کو سنائی دیتے ہیں۔ اور اگر ان میں سے کوئی گردن اٹھا کر اوپر کی طرف دیکھتا ہے تو جرمنوں کے ہونٹوں کا تبسم جو اپنے میں نفرت کی تلخی لئے ہوتا ہے۔ ان کا استقبال کرتا ہے۔ اور وہ آنکھیں جھکا کر خاموشی سے گذر جاتے ہیں۔

سقوطِ فرانس جرمنوں کے لئے بہت مفید ثابت ہوا ہے اور ان کو ایک فائدہ یہ بھی پہنچا ہے کہ جرمن ریشتاغ کے نوٹ جن کی جرمنی میں کوئی قیمت نہیں رہی فرانس میں چل رہے ہیں۔ پیرس کی جرمن حکومت اُن دُکانداروں کے ساتھ نہایت سختی کا سلوک کرتی ہے جو ان کو قبول نہیں کرتے، جرمن ان نوٹوں سے ایسے ایسے تحفے خرید کر اپنے جرمن دوستوں کو بھیج رہے ہیں جنہیں وہ جرمنی میں نہ خرید سکتے تھے۔

"جرمن افواج جو پیرس میں مقیم ہیں، اکثر پیرس کی سڑکوں پر پریڈ کرتی نظر آتی ہیں۔ پریڈ کے اوقات کے علاوہ جو وقت ہوتا ہے وہ آرک ڈی ٹرمنیفی[1] میں جسے نپولین نے اپنی فتوحات کی یادگار کے طور پر بنوایا تھا۔ گذارتی ہیں۔

"میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ پیرس اور مفتوحہ علاقے کے تمام اخبارات پر جرمنوں کا پورا قبضہ ہے۔ اخبارات کے مالکوں کو حکم ہے کہ شائع کرنے سے پہلے مضامین اور خبریں جرمن سنسر آفیسر کو دکھا لیا کریں جو اخبار اس حکم کی متابعت نہیں کرتا اُس کی اشاعت کو روک دیا جاتا ہے۔

"پیرس میں جرمنوں کے داخلے سے قبل کئی لوگ پیرس سے بھاگ گئے تھے اور کئی قہوہ خانے، عالی شان ہوٹل اور گودام بند ہو گئے تھے۔ اب ان کے متعلق جرمن حکومت نے ایک حکم نافذ کیا ہے کہ کوئی شخص حکومت کی اجازت کے بغیر اپنی دکانوں، گوداموں، قہوہ خانوں اور ہوٹلوں کو نہ کھولے بعض لوگوں نے جو پیرس پر جرمن قبضے کے بعد اپنے گھروں کو واپس آئے ایسا کیا مگر اُن کی املاک ضبط کر لی گئیں۔ جو مالک اپنی دُکانوں وغیرہ کو کھولنے کے لئے اجازت حاصل کرتے ہیں ان کے سامنے ایسی سخت شرائط پیش کی جاتی ہیں کہ انہیں اپنا کاروبار شروع کرنے کی جرأت ہی نہیں پڑتی۔ یہی وجہ ہے کہ جرمن حملے کے وقت پیرس کی جو دُکانیں اور ہوٹل وغیرہ بند ہو گئے تھے۔ ان میں سے اکثر بدستور بند ہیں۔ ان کے علاوہ جرمن دن رات اخبارات اور ریڈیو کے ذریعے لوگوں کو ہدایت کرتے رہتے ہیں کہ وہ فی الفور اپنے اپنے گھروں کو واپس آ جائیں اور اپنا اپنا کاروبار شروع کر دیں۔ مگر زبان سے وہ جو کچھ کہتے ہیں عمل سے اس کی تردید کر دیتے ہیں۔

"پیرس والوں میں سے اکثریت کی حالت سخت ناگفتہ بہ ہے اُن کے پاس مکانوں کا کرایہ ادا کرنے کے لئے بھی رقم نہیں ہے، اور جرمن حکومت لوگوں کی مشکلات کو حل کرنے کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتی بلکہ وہاں اپنا فوجی قبضہ مضبوط کرنے پر تمام تر کوششیں صرف کر رہی ہے۔

"پیرس میں جرمن زبان پھیلانے کی کوشش بھی بڑے زوروں پر ہے کتب فروشوں کے پاس جرمن فرنچ ڈکشنریاں بکنے کے لئے پہنچ گئی ہیں جو

[1] لفظی معنی "فتح کی محراب"

جرمن حکومت نے فراہم کی ہیں اور جرمن زبان کا پروپیگنڈا اس قدر زیادہ کیا جا رہا ہے کہ ہوٹلوں کے کھانوں کی فہرستیں بھی جرمن زبان میں تیار کرا لی گئی ہیں۔ اور دکانداروں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ سائن بورڈ جرمن زبان میں لکھوائیں اور لوگوں کی رہنمائی کے لئے چوراہوں میں بورڈ بھی جرمن زبان میں لکھوائے گئے ہیں۔

غرضکہ پیرس کو بالکل جرمن رنگ میں رنگا جا رہا ہے۔ جرمنوں کے لئے وہاں زندگی نہایت سستی اور فرانسیسیوں کے لئے نہایت گراں ہے۔ جرمنوں کے لئے ہر شے سستی ہے اور ان کے نرخ پیرس کی جرمن حکومت نے خود مقرر کئے ہیں۔ علاوہ ازیں جرمن فوج نے ایوانِ نمائندگان، اور دیگر سرکاری عمارتوں کو بھی اپنے قبضے میں لے لیا ہے، مارشل فوش اور نپولین کے مقابر پر بھی جرمن جھنڈے لہرا رہے ہیں اور بازاروں پارکوں اور سرکاری عمارتوں پر بھی سواستیکا نظر آتا ہے جسے فرانسیسی مایوس نگاہوں سے دیکھتے ہیں، مگر اُن کو اُسے سلامی دینا پڑتی ہے۔

تابش صدّیقی

ایک نظم

اپنا اپنا راگ

اک کلی نے چٹک کے گل سے کہا
کس قدر پُر سرور ہے دُنیا
جھوم کر گل بھی یوں لگا کہنے
سیل اک رنگ و بو کا ہے گویا
سُن کے یہ ایک قطرۂ شبنم
اشک کی طرح خاک پر ٹپکا

مسعود شاہد

سسرال جانے پر

(سانیٹ)

میں اتنی دور سے ملنے کی خاطر چل کے آیا ہوں
چھُپی جاتی ہو کیوں کونے میں، شرماتی ہو کیوں مجھ سے؟
کہو کچھ تو مری پیاری کہ گھبراتی ہو کیوں مجھ سے؟
اِدھر دیکھو، تمہارے واسطے کیسا کچھ میں لایا ہوں!

خدارا اب مرے جذبات کی کچھ تو کرو پروا۔
جو پردہ درمیاں حائل ہے اب اُس کو اٹھا ڈالو،
جو دل میں ہیں شکوکِ ناروا اُن کو مٹا ڈالو،
تمہیں چھُپ چھپ کے رہنا مجھ سے یوں ہرگز نہیں زیبا۔

سمجھتا ہوں کہ تم مجبور ہو رسمِ زمانہ سے
مگر کچھ میرے حالِ زار پر بھی رحم فرماؤ
تڑپتا ہو جو پہلے ہی نہ اُس کو اور تڑپاؤ
دکھاؤ صورتِ زیبا کہ اب بے تاب ہیں سجدے

رہو گی مجھ سے چھُپ چھُپ کر، کہو جانِ وفا کب تک؟
کئے جاؤں گا میں آخر تغافل کا گلہ کب تک!

روشن نکودری

قانون قدرت

گلیوں کی شمعیں بُجھ گئیں اور شہر سُونا ہو گیا — بجلی کا کھمبا تھام کر بانکا سپاہی سو گیا
تاریکیوں کی دیویاں کرنے لگیں سرگوشیاں — اک دھیمی دھیمی تان میں گانے لگیں خاموشیاں
مشرق کے پربت سے پرے اُبھریں گھٹائیں یک بیک — انگڑائیاں لینے لگیں بے خود ہوائیں یک بیک
تارے نگلتی بدلیاں چاروں طرف چھانے لگیں — چھم چھم پھواروں کی جھڑی دھرتی پہ برسانے لگیں
کُتّے اچانک چونک کر بھونکے دبک کر سو گئے — بے رس نچوڑی ہڈیوں کی لذّتوں میں کھو گئے
مائیں لپکتی ہیں کہیں، بچّے بلکتے ہیں کہیں — اور چارپائی کے لئے بوڑھے اُچکتے ہیں کہیں
اک سرسراہٹ سی اُٹھی، لہرائی، تھم کر رہ گئی — ہر چیز نے آنکھیں ملیں، ہر چیز جسم کر رہ گئی
پھر گنگناتی ظلمتوں کا سحر ہر سو چھا گیا۔ — بادل کہیں گم ہو گئے، تاروں پہ جوبن آ گیا،

قدرت کے سب چھوٹے بڑے قانون ہیں یکساں مگر — پردے پڑے ہیں جا بجا، چھنتی نہیں جن سے نظر
انسان کا معصوم دل، تاریک، سُونا شہر ہے — جس کے تلے احساس کی چنگاریوں کی لہر ہے
جب دیکھتا ہے وہ کہیں بدمست پنگھٹ والیاں — گالوں کو جن کے چومتی ہیں پتلی پتلی بالیاں
زلفیں گھٹاؤں کی طرح، آنکھیں ستاروں کی طرح — چلنا ہواؤں کی طرح، رنگت شراروں کی طرح
لہنگے کی لہروں کے تلے مکھن سے پاؤں رقص میں — پگڈنڈیوں کے اُس طرف گاگر کی چھاؤں رقص میں
سینے چھلکتے میکدے اور ہونٹ پیمانوں کے لب — ٹخنوں پہ بجتی جھانجھنیں، ہنسنا ہنسانا بے سبب
یہ دیکھ کر انگڑائیاں لیتا ہے دل انسان کا — ہوتا ہے ہر دھڑکن پہ کیوں مجھ کو گماں طوفان کا؟

گلیوں میں جا کر چھپ گئیں یہ چلتی پھرتی بجلیاں
اور روح پر طاری ہوا سنسان راتوں کا سماں!

احمد ندیم قاسمی

تغزل

ذرّے ذرّے سے نمایاں وحشتِ یک سجدہ ہے
عالمِ ہستی خرابِ عشرتِ یک سجدہ ہے

دَیر سے اپنا تعلق ہے بقدرِ یک قیام!
ربط کعبے سے بحدِّ وسعتِ یک سجدہ ہے

رقص کرتا ہے نگاہوں میں جنونِ بےخودی
اور جبیں پر ارتعاشِ وحشتِ یک سجدہ ہے

اللہ اللہ زندگانی کے مصائب کا محاذ!
توبہ توبہ کس کو تابِ لذّتِ یک سجدہ ہے

یہ کمالِ عجز ہے احساسِ ہستی سے گزر!
بےنیازِ زیست ہونا قیمتِ یک سجدہ ہے

دعوتِ نظّارہ تو ہے حُسنِ بےپروا کی شان
کیا نیازِ عشق کو بھی جرأتِ یک سجدہ ہے!

میکدے میں پائے ساقی پر ہے محسنؔ سجدہ ریز
بےنیازی اُس کی نذرِ دولتِ یک سجدہ ہے!!

محمد ایوب محسنؔ

لگی کی لاگ

جس نے بنا دی بانسری، گیت اُسی کے گائے جا
سانس جہاں تک آئے جائے، ایک ہی دھن بجائے جا

ہاں مری ڈبڈباتی آنکھ، دیکھ بندھی رہے یہ دھاک
وہ بھی لگائے جائے آگ، تو بھی لگی بجھائے جا

دُکھ ہے یہ دل لگی نہیں، کھیل نہیں ہنسی نہیں
پہلے لگاؤ کان اِدھر، پھر یہ کہو سنائے جا

پھول میں باس پھل میں رس دیتا ہے جو وہ اور ہے
آس نہ توڑ جی نہ چھوڑ، جتنی پیوں پلائے جا

مٹّی جہاں کی ہے وہیں سونپ دوں اُس کو جیتے جی
مجھ کو تو سوجھتا نہیں، تو ہی جگہ بتائے جا

چھینا ہے جی کا چین بھی، اُس پہ پھری ہے آنکھ بھی
اُلٹے بنا ہوں لُٹ کے چور، بگڑی مری بنائے جا

ہونٹوں پہ آئے کیا ہنسی، جی ہے یہاں بجھا ہوا
پلکوں تک آنسو آ گئے، اب تو نہ گدگدائے جا

سچّی جو ہے لگی کی لاگ، اور بھڑک اُٹھے گی آگ
پاس ہوں جتنی بجلیاں، سوچ نہ کچھ گرائے جا

مان لی کس نے اپنی ہار، بڑھ کے تھکن بتائے گی
میں یونہی تڑپے جاؤں گا، تو یونہی مسکرائے جا

پل کو جو چپ ہوا تو مَیں تھم گیا دوڑتا لہو
بات تری بنی رہے باتیں یونہی بنائے جا

شریف ثمر جالندھری

زین العابدین

اونگھ جانے کے عرصہ بعد تک سگریٹ کا وہ ٹکڑا میری انگلیوں میں بے ارادہ تھما جلا گیا ..... جلا گیا ....

اونگھنے کے عمل میں جو سجات کا پہلو ہوتا ہے میں اس سے کُلّی طور پر محظوظ ہونا چاہتا تھا۔ بیداری کے تلخ حقائق کو کس طرح انسان خواب کے حسین لطلان میں کھوئے چلا جاتا ہے .... ایکدم سگرٹ کے بچھو نے مجھے دو انگلیوں کے درمیان کاٹا۔ میں اپنی جگہ سے اچھل پڑا، سگریٹ نے ایک لمبی جست لی اور چٹائی پر گر کر سلگنے لگا۔ اُسے پاؤں سے خاموش کرتے ہوئے میں نے میز پر پڑی ہوئی پیالی کو ہاتھ سے چھوا۔ چائے شربت ہو چکی تھی اور زیو جہانگیر ریسٹوران کا خوبرو، ایرانی نژاد چھوکرا اور دہکتے ہوئے کوئلے، پاس پاس پڑے، ایک دوسرے سے ہمدردی کرتے ہوئے، سوتے سوتے، سو ہی گئے تھے۔

سرد خون والے جانور، مثلاً ہماری سکھوں کے عہدِ حکومت کی بنی ہوئی کوٹھڑی کی بوسیدہ چھت کے نیچے بسنے والے اسفنجی کیڑے ہزار پا، چھپکلیاں اور انسان کے رینگنے والے بھائی منجمد ہو چکے تھے۔ خون کا دورہ ان کی رگوں میں سست پڑ گیا تھا۔ یہاں تک کہ انہوں نے خوراک کے لئے بھی جدوجہد چھوڑ دی تھی۔ وہ عیار چھپکلی جو ہر روز دبے پاؤں روشنی کے گرد طواف کرنے والے پروانوں کا شکار کرنے آیا کرتی تھی۔ اس روز نہ آئی اور جھینگروں نے بھی تو سرِ شام ہی شور مچایا تھا جبکہ سورج کی آخری شعاعوں کی جاں افزا گرمی کو برودت تسخیر کر رہی تھی۔ آغازِ زمستان میں میدان میں اتر آنے والی ابابیل جس نے ریسٹوران کے کلاک کے پیچھے اپنا گھونسلا بنا رکھا تھا۔ پر پھڑپھڑا کر اپنے بچوں کو اُن میں لپیٹتے ہوئے ان کی حرارت کو صرف ہونے سے بچا رہی تھی۔

بہت سے کپڑوں میں ملبوس، نرم و گرم، اُس وقت میری تلخ یادداشت پر فراموشی کا عمل تیز شروع تھا۔ جبکہ سگریٹ نے مجھے جگا دیا۔ آنکھیں کھلتے ہی میری نظر چھت پر ایک بے قاعدہ دائرہ بناتی ہوئی ایک چارپائی کے نیچے دو سمٹے ہوئے پیروں پر جا پڑی میں کچھ دیر گومگو کی حالت میں اُن پیروں کو گھورتا رہا۔ پھر یکایک کسی خیال کے آنے سے میں نے ان پیروں کو چھو دیا۔ چھوا ہی نہیں بلکہ زور سے کھینچا اور چلایا۔

"زینو کے بچے....."

زینو، ان پیروں کا مالک، ایک تیس سالہ ننگ پیری نوجوان، اسفنجی کیڑے کی طرح سکڑ گیا۔ لیکن یہ جانتے ہوئے کہ اب وہ چھپ نہ سکے گا۔ اپنی کہنیوں کی مدد سے پیچھے کو سرکا، اکڑوں بیٹھا، بالوں کو جھٹکے سے سیدھا کیا۔ اور ربے جباؤں کی طرح سیدھا کھڑا ہو گیا۔ مجھ سے نظریں چرانے کی بجائے اُس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ میں نے اُسے کان سے پکڑا اور کشاں کشاں لیمپ کے پاس لے گیا۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ عیار چھپکلی کسی بڑے سے پروانے کو پکڑ کر روشنی کی طرف بڑھتی تھی۔

زینو کی آنکھیں آج معمول سے زیادہ خونی ہو رہی تھیں۔ بال بھی پہلے سے زیادہ منتشر تھے اور نچلا ہونٹ لٹک کر اپان خوردہ دانتوں کی سیاہی کو نمایاں طور پر دکھا رہا تھا۔ اس کے زرد، دُبلے آمدنی کم خرچ زیادہ چہرے کی لکیریں گہری ہو رہی تھیں، اور اُس کے چوری کے روز افزوں تجربے کو عیاں کر رہی تھیں۔ شاید زینو چوری کے ذریعے اپنی آمدنی کو خرچ کے برابر کرنا چاہتا تھا۔ چوری کے روپے آمدنی کو خرچ کے مساوی ہی نہیں کرتے، بڑھا بھی دیتے ہیں۔ مگر وہ آمدنی کم خرچ زیادہ چہرے کے خدوخال کو نہیں بھرتے اور شاید اسی لئے چوری کا سائنیک اور پر منفعت پیشہ بُرا ہے۔

میں نے قدرے درشتی سے کالر کو کھینچا۔ اسی وقت مجھے یاد آیا۔ زینو کی پہنی ہوئی قمیص میری اپنی ہے وہی جو میں نے چند دنوں کے لئے اُسے پہننے

کو دی تھی، گرفت کو ڈھیلا کرتے ہوئے میں نے پوچھا۔

"کیوں بے سالے، بدمعاش، بولتا کیوں نہیں؟ کیا ہو رہا تھا یہاں؟"

"میں یونہی پڑا تھا، میں سوتے سوتے چارپائی پر سے گر پڑا تھا، میں چارپائی کے نیچے آپ کے لال لال کمبل کو ڈھونڈ رہا تھا ـــــ وہی پھٹا ہوا کمبل جو آپ نے بخس سمجھ کر پھینک دیا ہے، وہی، وہی جس میں جوئیں چل گئی تھیں، یاد نہیں آپ کو؟ ہاں ہاں وہی۔ــــــ اور اس قسم کی یاوہ گوئی کی بجائے اس نے اپنے سر کو جھنجوڑا اور ترکی بترکی دو ٹوک جواب دیا۔

"چوری!"

اس مختصر، جامع، نفسیات آزما جواب نے مجھے چند لمحوں کے لئے خاموش کر دیا۔ میں ایک ایسی دنیا میں پرواز کرنے لگا۔ جہاں ایمان، شرافت ایک اضافی بات ہو جاتی ہے اور تھوڑے سے تجربے سے دیانتداری اور چوری میں کانوں کو ہاتھ لگانے اور تفاوت رہ گیا تا بہ گیا والی بات نہیں رہ جاتی۔ اس پر بیجات خاموشی کے عالم میں میں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ کیا 'سالا' اپنی مذموم عادت سے باز نہ آئے گا؟ کئی مرتبہ اسے چوری کے الزام میں قرار واقعی سزا دی جا چکی ہے .... جس طرح نیلے رنگ کا شیشہ سفید روشنی کے باقی چھ رنگوں کو جذب کرتے ہوئے نیلے رنگ کو ہی گذرنے کی اجازت دیتا ہے۔ اسی طرح اس کی ذہنیت بھی پند و نصائح کی سب باتوں کو محسوس کرتے ہوئے چوری کی طرف آزادانہ رجوع کرتی ہے!

"تم نے خان کا سوٹ کیس کھولا ہے؟" میں نے اسے آستین سے پکڑتے ہوئے کہا۔

"ہاں"

"اگر خان دیکھ لے تو؟"

زینو کانپ رہا تھا، خوف سے نہیں، سردی سے، اور بولا "دیکھ لے تو پکڑ لے، اسی طرح آستین سے یا گریبان سے، جیسے آپ نے مجھے پکڑ رکھا ہے اور نہیں چھوڑتے، وہ بھی نہ چھوڑتا تو کیا بگاڑ لیتا میرا....؟"

میری بات کے جواب میں زینو یہ بھی کہہ سکتا تھا "آپ ہی کی قمیص پھٹ جاتی نا.... میرا کیا بگڑ جاتا"، اور یوں دریدہ دہنی کے علاوہ ایک لطیفہ ہو جاتا۔ لیکن اب جو کچھ ہو رہا تھا کیا وہ لطیفے سے کم تھا؟ میں نے نفسیاتی طور پر مرعوب ہوتے ہوئے اس کی آستین کو چھوڑ دیا۔ جسٹر کو اپنے گرد لپیٹا بٹن بند کئے۔ اس کے کندھے کو تھپکتے اور لبوں سے ایک بوسے کی آواز پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"شاباش! اللہ تمہارے نیک ارادوں میں برکت دے بیٹا!"

اور پھر پلٹتے ہوئے میں نے غصے سے کہا "جیل خانے کی ہوا اس آئے گی تمہیں، اُلّو کے پٹھے!"

اسی وقت بُیٹھے نے انگلیوں کی کنگھی بنائی۔ اپنے منتشر بال درست کئے اور اپنے گھٹنوں سے مٹی جھاڑی۔ میری بات کے جواب میں وہ قدرے دلیری سے بولا۔

"آپ کے خیال میں جیل کی زندگی اس زندگی سے بُری ہے؟ وہاں بھی اللہ روٹی دے گا، اللہ سب کا رازق ہے، واللہ خیر الرازقین..... یہاں ہماری جورو بیٹھی ہے نا جو...."

میں نے دل میں سوچا عجب ہے اللہ! اور پھر میں نے کہنا چاہا اللہ میرا بھی تو رازق ہے۔ واللہ خیر الرازقین مجھ پر بھی تو عاید ہوتا ہے اور بہتر طور پر اس خان پر جس کا سوٹ کیس تم نے ابھی ابھی ناپاک ارادے سے کھولا ہے۔ لیکن زینو کو سمجھانے سے فائدہ معلوم!

.... اور پھر زینو خود ہی چپ چاپ ڈھیٹ مار کی خالی پیٹی پر بیٹھ گیا۔ میں نے سمجھا، شاید وہ اندھیرے میں بیٹھ کر اپنی ندامت کو چھپانا چاہتا ہے۔ میں جسٹر اور جوتوں سمیت بستر میں جا گھسا اور ایک کونے سے اسے دیکھنے لگا۔ زینو نہایت بے پروائی سے بیٹھا اپنے دانتوں کی میل کرید رہا تھا۔ پھر اس نے احتیاط سے قمیص اتاری۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا اور سوچا۔ زینو کو کچھ بھی کہنا بے سود ہے۔ لاحاصل، لاحاصل۔ میں نے اسے سٹوو گرم کرنے کو کہا۔ اور خود اٹھ کر خان کا سوٹ کیس بند کرنے لگا۔ اس وقت خان نے چارپائی پر پہلو بدلا۔ چارپائی چیخی اور میں نے کانپ کر سوٹ کیس پر سے ہاتھ اٹھا لیا۔ خان اپنے پتلے سے لحاف میں سکڑ گیا۔ شاید خون کا دورہ اس کی رگوں میں بھی سست ہو چکا تھا۔

. . . .

زینو کا پورا نام زین العابدین تھا۔ عابدوں کی زینت۔ لیکن چوری عجب قسم کی عبادت ہے جس کی تلقین ہماری مذہبی کتابوں میں شاید غلطی سے رہ گئی ہے۔ اگر ہمارا معبود حق تلفی اور زبردستی کو دیکھ کر بھی جامد رہتا ہے، اپنی تعریف سے بھی ٹس سے مس نہیں ہوتا یا وہ کوئی بڑا چور ہے تو زینو اسم با مسمیٰ تھا۔

حقیقت میں زینو کا کوئی معین نام نہ تھا۔ اس لئے کہ سب اُس سے وافر محبت کرتے تھے۔ محبت جو نفرت کے بعد پیدا ہوتی ہے اور جس میں جذبات کو دخل ہوتا ہے ادراک کو نہیں۔ زینو کا نام وقت، جگہ اور مقامی حالات کے مطابق رکھ لیا جاتا تھا۔ اس مستقل نام کے نہ ہونے کا زینو کو گلہ تھا لیکن شدید نہیں۔ زینو میں شدت کسی چیز کی نہ تھی۔ نہ وہ کھلکھلا کر ہنستا تھا اور نہ گڑگڑا کر روتا۔ اس کے رونے اور ہنسنے میں تمیز مشکل سے ہوتی تھی۔ والدین شاید زینو کو ہلال عید اور اس قسم کے مشکل ناموں سے پکارتے ہوں گے بجائے اس کے کہ حرامی یا ایسے ہی کسی آسان نام سے پکارتے ۔

ہماری سکھوں کے عہد کی بنی ہوئی کوٹھڑی میں بسنے والے یاران طریقت سب کے سب زینو کے گرویدہ تھے۔ اسی لئے وہ اُسے ہر دفعہ اپنے من مانے نام سے پکارتے۔ خان اور وحید مستری اُسے بیٹا، کہہ کر بلاتے تھے۔ نجیب کاتب اُسے سالا کہا کرتا تھا۔ اور زینو جب سالے کے نام پر لبیک کہتا تو نجیب کو ایک خاص قسم کی خوشی ہوتی۔ وہ خوشی جو گدگدی یا میٹھی میٹھی خارش کے مشابہ ہوتی ہے اور عموماً تعلق والوں ہی کے حصے میں آتی ہے کوئی بزعم خود باپ تھا اور کوئی ـــــ اور اس طرح کسی عورت کے بغیر ہی وہاں ایک بڑا کنبہ بس رہا تھا ۔

ہماری کوٹھڑی میں ایک نو مسلم راجپوت رہتا تھا۔ خان اُسے تکلف سے ہادیٔ اسلام کے لقب سے یاد کرتا تھا۔ اس شخص کا پیشہ نقلی چیزوں پر پیٹنٹ کے لیبل چسپاں کرکے بیچنا تھا۔ ہادیٔ اسلام نو مسلم ہونے کی وجہ سے بہت پارسا اور نمازی تھا اور چونکہ خود تجرد پسند تھا، اس لئے زینو کو سالے کی بجائے ماموں کہہ دیا کرتا تھا ۔

زینو کی مجھ سے پہلی ملاقات ایک حادثے کی نوعیت رکھتی ہے۔ پُل پختہ کے تاریخی بلوے میں میں مجروح ہو کر شفایابی کے لئے ہسپتال میں داخل کیا گیا۔ وہاں نمبر ۹ کے ساتھ زینو کی چارپائی تھی۔ اسے غالباً چوری کے الزام میں پیٹا گیا تھا۔ وہ بالکل ادھ موا ہو رہا تھا۔ میں نے اُسے بیسیوں، چٹکلوں، مذہبی شعروں سے اور حسین عورتوں کی تصویریں دکھا کر زندگی میں اس کے مٹتے ہوئے یقین کو جلا دی۔ میری رفاقت میں وہ بہت جلد تندرست ہو گیا۔ میں نے اس سے بھی ایک قدم آگے اُٹھایا۔ زینو جو کہ بالکل بے یار و مددگار تھا۔ اس کی بے کسی کا احساس کرتے ہوئے یا دوسرے لفظوں میں اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر میں نے اُسے اپنے پاس بلا لیا..... جذبات بھی انسانی زندگی میں عجیب کھیل کھیلتے ہیں..... زینو نے آتے ہی مجھے گوناگوں مصیبتوں میں مبتلا کر دیا۔ بارہا میں سوچتا ہوں میں نے کیا بُرا کیا۔ جو ایک کُتے کی طرح ارزاں، ایک کیڑے کی طرح بے قیمت انسان کو قعر مذلت سے اٹھایا۔ اور اپنی کوٹھڑی میں بسنے والے شریف زادوں کا ہم نشین بنا دیا..... پھر میرا ذہن خود ہی جواب دیتا ہے۔ تمہارا ہی تو سب قصور ہے کہ تم نے ایک کیڑے کو آستین میں رکھا۔ کیڑے کو گندگی میں سے اٹھانے کی ضرورت نہیں تاوقتیکہ اُس کا ڈنک سہنے کی اہلیت اپنے آپ میں نہ پیدا کر لو۔ جانور اپنی عادت سے مجبور ہے تو انسان اپنی فطرت سے کیوں منحرف ہو جائے؟

پھر خیال پیدا ہوا اس نیک کام کے کرنے میں جذبات نے تمہیں کتنا حظ دیا ہو گا۔ اسے تم روحانی حظ کہتے ہو۔ اُس تھوڑے سے حظ کی تمہیں قیمت دینا ہو گی۔ جذبات! ـــ جذبات انسان کو ہمیشہ خمیازے بھگتنے پڑتے ہیں لیکن اگر کوئی میرے بہت قریب ہو کر پوچھے۔ کیا تم دیرپا حظ کو پسند کرو گے یا وقتی جذبات کو، تو میں بلا تامل کہوں گا، ـــ جذبات کو!

ہسپتال میں پہلی دفعہ جب میں نے زینو کو دیکھا تو اُس کا چہرہ خاک اور دھول سے اٹا پڑا تھا۔ اُن میں سے دو آنکھیں باہر گھور رہی تھیں منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ زینو کی جیب میں دو دانت تھے جو اُس نے نہایت احتیاط سے سنبھال رکھے تھے اور غالباً انہی دانتوں کے سلسلے میں اُس نے مجھے بلایا اور پوچھا۔

"آپ کیا کام کرتے ہیں؟"

"دار الترجمہ میں نوکر ہوں..... دبیر اوّل" میں نے کہا۔

"دبیر اوّل کیا ہوتا ہے؟"

"ہیڈ کلرک..... بڑا کلرک..... منشی، بڑا منشی، بڑا بابو" میں نے ذرا وضاحت سے کہا۔

زینو جو اس وقت بیٹھا ہوا تھا مایوس سا ہو کر چارپائی پر لیٹ گیا اس وقت دونوں دانت اُس کے ہاتھوں میں تھمے ہوئے تھے۔ جنہیں وہ مجھے دکھانا چاہتا تھا۔ وہ جماہی لیتے ہوئے بولا۔

"اوخ!..... ہا!..... میں سمجھا آپ ضلع کچہری میں چپڑاسی ہیں۔"

میں نے اپنی خجالت کو چھپاتے ہوئے کہا۔ "تم نے یہ اندازہ کیسے لگایا؟"

"تمہاری شکل سے" اس نے بلا تامل کہا۔

میں نے شرمندہ ہو کر سر گرا لیا۔ دانت برآمد کرتے ہوئے زینو ایک رازدارانہ لہجے میں بولا "اُن شہدوں نے میرے دو دانت توڑ دیئے ہیں۔ کیا آپ کا کوئی وکیل واقف ہے؟ جس کی ہائی کورٹ تک رسائی ہو.... میں نے احتیاطاً دونوں دانت سڑک پر سے اٹھا لئے تھے جبکہ پولیس کے سپاہیوں نے مجھے اٹھایا۔ آپ جانتے ہیں کسی کا دانت توڑنے پر پچاس روپے ہرجانہ وصول کر کے دانت کے مالک کو دیا جاتا ہے۔ آپ ان دانتوں کو رکھ لیں سو روپیہ آپ کو مقدمے کے ذریعے سے مل جائے گا۔ مجھے بیس روپے دے دیں، بڑی ضرورت ہے مجھے....."

میں نے جی ہی جی میں ہنستے ہوئے سوچا۔ بھلا اس سے نفع بخش سودا اور کیا ہو گا۔ اور پھر میں نے زینو سے بھی زیادہ گہرے، رازدارانہ لہجے میں اُسے کہا "سو؟.... شاید تمہیں ڈیڑھ سو مل جائیں، ان دانتوں کو نیلام کر دو۔"

. . . .

عادت!.... میں سگرٹ پیتے پیتے اونگھ جاتا ہوں اور جب انگلی جلتی ہے تو چونک اٹھتا ہوں۔ ایک دن کسی مترجم کی وفات پر دارالترجمہ میں چھٹی تھی اور میں دوپہر ہی کو اپنی کوٹھڑی کی چھت پر دھوپ میں پڑا اونگھ رہا تھا۔ اور میرے ہاتھ میں سگریٹ تھا۔ جب نیو جہانگیر ریسٹوران کے ایرانی نژاد چھوکرے نے پیک دان لا کر میرے پاؤں میں رکھا۔ میں اس وقت بھی نہ جاگا اور ابھی سگریٹ نے میرا ہاتھ بھی نہ جلایا تھا کہ سیڑھیوں پر دھما دھم کی آوازیں سنائی دیں۔ میں جاگ اُٹھا۔

خان، وحید، ہادی اسلام، ریسٹوران کا مینیجر سب کے سب میرے سامنے کھڑے تھے۔ اور چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے۔

"میری گھڑی لے گیا ہے، سالا" نجیب نے کہا۔

"میری مشہدی لنگی" خان آنکھیں دکھاتے ہوئے بولا۔

ریسٹوران کا مینیجر کہنے لگا "تین روپے سات آنے کا بل دو ماہ سے واجب الادا ہے"۔

سب سے آخر میں ہادی اسلام بولا۔

"میرے پانچ روپے نکال لئے ہیں ماں کے خاوند نے....."

ہادی نے وہ گالی ذرا وضاحت سے نہ دی تھی۔ میں نے سوچا۔ شاید ہادی نے ماموں بھانجے کا رشتہ بدل دیا ہے اور اُسے ماں کا خاوند بنا لیا ہے۔ یہ مجوزہ، نیا رشتہ عجیب ہے۔ آخر یہ پارسا اور غازی لوگ گالی دینے کے لطیف فن میں ماہر کیوں نہیں ہوتے۔ معمولی سی وضاحت، ایک ادنےٰ سے اسم فاعل ترکیبی کی ضرورت تھی اور ایک جامع گالی ہو جاتی۔ خیر! میں نے سب کو ایک نظر دیکھا۔ وہ لوگ اپنے تمام نقصان کی تلافی مجھ سے چاہتے تھے۔ ان تمام باتوں کے لئے میں ہی ذمہ دار تھا۔ کیونکہ میں نے ہی اُسے وہاں لا کر رکھا تھا۔ یہ کیا کم رعایت تھی کہ زینو سے کرایہ نہیں لیا جاتا تھا اور اُسے "دارالامان" (یہ ہماری کوٹھڑی کا نام تھا) میں پناہ دی جاتی تھی۔ شاید وہ "سب لوگ" مجھ سے بہت نامناسب سلوک کرتے اور لڑائی کی صورت میں تو شاید ایک ایک دو دو ہڈیاں بھی اُن کے حصے میں آ جاتیں۔ لیکن میں نے انہیں یقین دلایا کہ اگر زینو شام تک نہ لوٹا تو میں یکم کو سب نقصان چکا دوں گا۔ اُن سب کو یکم کی بندش پر اعتراض تھا۔ میں نے سوچا۔ بالفرض زینو شام تک نہ آئے تو بھی یکم میں جمعہ جمعہ آٹھ پورے آٹھ دن پڑے ہیں اور میرے رفیق مجھے اتنی رعایت تو دے سکتے ہیں کہ زینو کے یکم سے پہلے پہلے آ جانے پر مجھے چھوڑ دیں۔

اس کے بعد میں کیچڑ دیکھنے کے لئے سینما چلا گیا۔ جب رات کے دس بجے لوٹا تو میں نے دیکھا کہ خان کی لنگی کھونٹی پر ٹنگی تھی اور شبنم کی تپائی پر نجیب کی گھڑی رات کے سناٹے میں ٹک ٹک کر رہی تھی۔ کونے میں میرے سویڈ کے بوٹ رکھے تھے جو میں نے چند دن ہوئے بالکل نئے خریدے تھے۔ میں نے ابھی تک انہیں گھس جانے کے خوف سے نہیں پہنا تھا اور اپنے ٹوٹے ہوئے جوتوں کو ہی تین مہینے سے لگاتار استعمال کرتا آ رہا تھا اور اب وہ وہاں کیچڑ میں لت پت پڑے تھے۔ اور اژدہے کی طرح منہ پھاڑے ہوئے تھے۔ غالباً زینو انہیں بھی پہن گیا تھا۔ جس کا مجھے اس وقت تک علم نہ ہوا۔ اپنے بوٹوں کے یوں خراب ہو جانے پر میں بہت خشمگیں ہوا۔ میں نے وحید سے پوچھا زینو کہاں ہے! وحید نے ایک پرانی سی جنتری نیچے پٹختے ہوئے ایک کونے کی طرف اشارہ کیا۔

کونے میں زینو بیٹھا تھا۔ اس کے بال منتشر تھے۔ چہرہ مٹی سے اٹا پڑا تھا۔ اور اُس کا زیریں لب بُری طرح سے لٹک رہا تھا۔ میں نے اسی وقت بھانپ لیا کہ اُسے سب نے مل کر بری طرح سے پیٹا ہے۔ اور میں بھی پیٹنا چاہتا تھا۔ آخر اُس نے میرے سویڈ بوٹوں کا بھی تو ستیاناس کر دیا تھا۔ میں نے اُسے گردن سے پکڑا۔ اور حسبِ عادت لیمپ کے نزدیک لے آیا۔ اور جھنجوڑتے ہوئے بولا۔

"تو میرے بوٹ پہن گیا تھا بے؟ کس نے اجازت دی تھی تجھے؟"

یوں معلوم ہوتا ہے۔ زینو نے میری طبیعت کے کمزور پہلو کو پا لیا تھا۔ اور یوں بھی خطرے کے وقت جانور عقل حیوانی سے اپنے بل کو پالیتے ہیں۔ وہ اپنے ابر پتر حقیقت، سیدھے سادے لفظوں سے مجھ میں کسی ایسی غیبی طاقت کو بیدار کر دیتا تھا جو مجھ پر ایک خاص قسم کا جمود طاری کر دیتی۔ میرے دونوں ہاتھ مارتے مارتے رک جاتے۔ وہ بولا

"آپ سب کو بوٹ پہنتے ہوئے شرم نہیں آتی جب کہ آپ کا ایک بھائی اتنی سخت سردی میں ننگے پاؤں چلے؟ یہ انسانیت ہے؟ میں کہتا ہوں کیا یہ انسانیت ہے؟ دیکھو تو میرے پاؤں کیسے سوج رہے ہیں"۔

اس وقت میں نے سوچا۔ دنیا میں چوری، اور حق تلفی کے علاوہ انسانیت بھی ایک چیز ہے۔ اور یہ سوچتے سوچتے مجھ پر ایک جمود سا طاری ہو گیا۔ اس وقت زینو اپنے ننگے پاؤں دکھا رہا تھا جو برف کی طرح ٹھنڈے تھے۔ اور سوج رہے تھے۔ ایڑیوں اور تلووں پر آوارگی اور مصائب کے ایک لمبے چوڑے نقشے کی گولائیاں تھیں، ابھار اور پیچ و خم تھے جس میں زمانے کے ترقی پسند مصور نے احتیاط سے خون کے دریا بنائے تھے۔ میں نے زینو کی گردن چھوڑ دی اور بوٹوں کو پاؤں میں پہن کر دیکھا۔ میرے بوٹ، سویڈ کے بوٹ، نئے بوٹ قریب دو انگشت کے کھل چکے تھے۔

. . . .

بالکل ایک ہی کمرے میں کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ ایک انسان چیسٹر میں لپٹا رہے اور دوسرا اس کے سامنے سردی سے اکڑا رہے۔ ایک انسان کے پاؤں سردی سے پھٹ جائیں اور دوسرا نرم و گرم موزے زیب تن کرے ایک انسان گرم گرم چائے، کافی یا برانڈی پی کر دقت، فاصلہ اور اضافیت کے جدید نظریوں پر بحث کرے اور دوسرا ان باتوں سے بے بہرہ ایک کونے میں دبکا ہوا شدت کی تنہائی اور اجنبیت محسوس کرتا رہے۔ ایک شخص کے پاس ہوس رانی کے لئے وافر روپیہ پیسہ ہو اور دوسرے کو ان سے محروم رکھ کر اس میں جنسی عیوب پیدا کئے جائیں؟

ان دنوں میرے ہاتھوں نفسیات کی ایک کتاب آئی۔ اسے پڑھ کر میں نے زینو کی اس قبیح عادت کے ہر پہلو پر غور کیا۔ میں اسی نتیجے پر پہنچ سکا کہ زینو کی اس فطرت کا باعث محرومی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں بچپن ہی سے اسے ہر چیز ہر نعمت زندگی سے محروم رکھا گیا ہے علم، تہذیب، مذہب، شرافت اور قانون کی آڑ میں اس کے قدرتی حقوق غصب کئے گئے ہیں، اسی لئے وہ چوری کرتا ہے۔ دوسروں کے بوٹ لنگیاں، گھڑی اور سویڈ کے بوٹ پہن کر وہ رتوں کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اب چوری ایک دیرینہ بیماری کی طرح جڑیں پکڑ چکی ہے۔ اس کے انسداد کے لئے کسی اکسیر کی ضرورت ہوگی۔ کتنا کام زیر زمین کرنا پڑے گا۔ کتنا وقت درکار ہوگا اس ناسور کو جڑ سے اکھاڑنے کے لئے . . . .

میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ بوٹ میں زینو کو دے دوں گا دو انگشت تو وہ پہلے ہی کھل چکے ہیں۔ ان کا مجھے فائدہ ہی کیا۔ اس کے علاوہ میں نے سوا پانچ روپے میں کھردرا سا خاکی پٹی کا کوٹ زینو کے لئے خریدا تاکہ وہ سردی سے نہ کانپے بلکہ تن کر میری باتوں کا ترکی بہ ترکی جواب دے اور میں چپکے سے سہہ جاؤں ۔۔۔ جذبات ہی تو ہیں!

میں خراماں خراماں گھر لوٹ رہا تھا اور سوچتا تھا کہ آج زینو کتنا خوش ہوگا۔ وہ مجھے کیسا فرشتہ سیرت سمجھے گا۔ اس خوشی میں وہ کتنی چھلانگیں لگائے گا۔ مجھ سے لپٹے گا۔ کہے گا۔ اللہ تمہیں ایک خوبصورت بیوی دے۔ اللہ سب کا رازق ہے۔ واللہ خیر الرازقین . . . . .

میں نے دارالامان میں قدم رکھا۔ زینو اسی طرح ایک اسفنجی کیڑے کی مانند سکڑ کر ایک کونے میں پڑا تھا۔ میں نے سوچا۔ آج شاید پھر اس غریب الدیار کو کسی نے مارا ہے۔ میں ان جذبات سے کورے، عقلمند وحشیوں کو اس کی اچھی طرح سزا دوں گا۔ میں ان لوگوں کو اب بھی خرید سکتا ہوں۔ زینو کے ان سے تمام رشتے ناطے توڑ سکتا ہوں . . . . . لیکن نہیں . . . . . نہیں، زینو کو کسی نے نہیں پیٹا تھا۔

میں نے کونے میں پڑے ہوئے زینو کو کان سے پکڑ کر اٹھایا۔ یہ حرکت میں نے اس وجہ سے کی کہ زینو سمجھے گا کہ آج پھر مجھے کسی جرم کی پاداش میں سزا دی جا رہی ہے اور اس شک و بیم کے درمیان جب اسے پتہ چلے گا کہ اسے کوٹ اور بوٹ "بخشش" میں دیئے جا رہے ہیں۔ تو اس ڈر کے مقابلے میں خوشی کتنی ہولناک طور پر خوبصورت ہوگی۔

میں نے زینو کے کانوں کو اچھی طرح سے مروڑا۔ درد کے ایک احساس سے وہ آہستہ سے کراہ اٹھا لیکن اس نے مطلق نہ پوچھا کہ وہ سزا اسے کیوں دی جا رہی ہے۔ کچھ دیر کے بعد میں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ اب کانپ رہا تھا۔ سردی سے نہیں، خوف سے کیونکہ اس نے کوئی جرم نہ کیا تھا . . . . .

میں نے کہا "دیکھ بیٹا، تیرے لئے کوٹ لایا ہوں"۔

ایک لحہ میں زینو کا خوف دور ہو گیا۔ وہ میرے قریب سرک آیا اور کھوکھے کی ہٹی کے سہارے کھڑا ہو گیا۔ میں سنبھل کر بیٹھ گیا جیسے کوئی فرشتہ

بیٹھتے وقت اپنے بستر پر سنوارتا ہے۔ اپنی آنکھوں میں چمک پیدا کرتے ہوئے میں نے کہا۔

"وہ بوٹ بھی اب تمہارے ہیں۔"

زینو مسکرایا۔ بالکل خفیف۔ پھر اس نے چیسٹر مجھ سے لے لیا۔ اور اسی وقت اُسے کندھوں پر ڈال لیا اور بولا۔

"میں جانتا تھا! تم میرے لئے کوٹ لاؤ گے.... تم مجھے بوٹ دے دو گے، یہ بھی جانتا تھا۔"

اور اس کے بعد وہ کوٹ کے بٹن احتیاط سے بند کرتے ہوئے اپنی چٹائی پر جا لیٹا۔ مجھے اُس کی ناشکر گذاری پر سخت غصہ آیا۔ میں نے دل میں کہا۔ آئندہ میں زینو پر ایک پیسہ بھی ضائع نہیں کروں گا۔ اس کا فائدہ ہی کیا! اس نے میرا شکریہ تک ادا نہیں کیا۔ اس کے بعد جب میں خان کے ساتھ چارپائی پر لیٹا تو مجھے غصے کی وجہ سے نیند نہ آئی۔ پھر آہستہ آہستہ ایک خیال رینگتا ہوا میرے دماغ میں آیا۔ کیا اس کے بعد شکر گذاری کی ضرورت ہے! گویا کیڑے کو گندگی میں سے اٹھانے اور ڈنک سہنے کی ضرورت تھی۔ اس کے بعد مجھے ایک خاص قسم کا حظ محسوس ہوا۔ جیسے کوئی مجھے کوٹ اور بوٹ کی قیمت ادا کر رہا ہو!

. . . .

ایک دن میرا ایک مترجم دوست میرے پاس آیا۔ میں نے اس سے زینو کا تذکرہ کیا اور خاص طور پر زینو کو کوٹ اور بوٹ مہیا کرنے کا واقعہ سنایا۔ اُس نے میرے جذبات کو سراہا۔ مجھے ایک گونہ مسرت ہوئی۔ میری آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے اور میرا رواں رواں شدتِ احساس سے جاگ اُٹھا۔ میرے دوست نے بتایا۔ زینو کی چور ذہنیت کی وجہ یہ ہے کہ بچپن ہی سے اُس کے ہاتھ میں پیسہ نہیں دیا گیا جسے وہ آزادانہ خرچ کر سکے۔ وہ بولا تعجب ہی ہے جو زینو کو پیسے خرچ کرنے آتے بھی ہوں۔ ایک کوٹ یا چیسٹر کی بجائے اس کے ہاتھ میں کچھ نقدی دینا بہتر ہوگا۔ ایسی نقدی جسے وہ اپنی مرضی کے مطابق خرچ کرے۔

اس کے بعد وہ مترجم رخصت ہوا اور میں نصف شب تک اس بات پر غور کرتا رہا۔ اگلی صبح میں نے زینو کو پاس بلایا اور ایک روپیہ اُس کی مٹھی میں دیتے ہوئے کہا۔

"زینو، بیٹا..... لو یہ خرچ کر لینا۔ لیکن ذرا احتیاط سے.... جب ختم ہو جائے تو میں تمہیں اور دوں گا۔"

اُس دن میری طبیعت نہایت پرسکون رہی۔ شام کو آیا تو میں نے باتوں باتوں میں روپے کا ذکر چھیڑ دیا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ زینو روپیہ کتنی احتیاط سے خرچ کرتا ہے۔ لیکن شام سے پہلے پہلے زینو نے روپیہ ختم کر ڈالا تھا۔ اور دو روپے کی درخواست پیش کر دی تھی۔ جب میں نے جیب میں سے دوسرا روپیہ نکالنے کے لئے ہاتھ ڈالا تو میں ٹھٹھک گیا۔ اگر اس حساب سے روپے خرچ ہونے لگے۔ تو دیوالے کی درخواست دینی پڑے گی۔ میں کچھ دیر سوچتا رہا۔ گویا خرد یہ بانگِ دہل کہہ رہی تھی۔ "اب کہو؟"

لیکن میں نے خرد کو جذبات پر غالب نہ آنے دیا۔ میں نے جوشِ عمل کے جذبے سے ایک روپیہ نکالا۔ اور کہا۔

"زینو..... لو ایک روپیہ اور.... بس میں ایک ہی دے سکتا ہوں لیکن یوں گذارہ نہ ہوگا۔ احتیاط سے خرچ کرنا۔"

اس کے بعد جب میں شام کو دفتر سے لوٹا تو زینو پہلے سے موجود تھا میرے اندر داخل ہوتے ہی اس نے روپیہ میرے سامنے پھینک دیا۔

"مجھے اس کی ضرورت نہیں۔"

"کیوں زینو؟" میں نے پوچھا۔

"جب تک پیسہ میری جیب میں رہتا ہے" زینو بولا "مجھے سکون میسر نہیں ہوتا۔ گویا وہ میری جیب سے اُچھلا پڑتا ہے۔ جب تک اُسے خرچ نہ کر ڈالوں۔ مجھے بہت کوفت ہوتی ہے...."

میں نے سخت تذبذب میں روپے کو ہاتھ میں تھامے رکھا اور لیمپ کے گرد طواف کرنے والے ایک پروانے کو دیکھنے لگا۔ عجیب بات تھی زینو میں ایک روپے کو خرچ کرنے کی بھی اہلیت نہ تھی۔ ایک روپیہ جیب میں ڈال کر اُسے خیال پیدا ہوتا ہے کہ وہ لذیذ ترین مٹھائیاں، خوبصورت ساڑیوں میں ملبوس عورتیں اور کیا کچھ نہیں خرید سکتا۔ گویا وہ ایک چھوٹا برتن ہے جس میں زیادہ چیز نہیں سماتی۔ وہ ایک روپیہ بھی جیب میں نہیں رکھ سکتا اور جب اُس کی جیب خالی ہو گی تو وہ چوری کرے گا۔ اس پر ایک جمود طاری ہو چکا ہے..... لیکن کیا مجھ سے زیادہ جذباتی آدمی اور کوئی ہو گا جو اُسے ہر روز ایک روپیہ دے سکے.... جذبات..... جذبات جو کہ چوری سے بھی زیادہ جمود انگیز ہیں۔

چوری سے زینو کو روکنا بے سود سمجھ کر میں نے اس ضمن میں اُسے کچھ کہنا سننا ہی چھوڑ دیا۔

. . . .

اسی شہر کے محلہ قاضی عبدالغفار میں میری ہمشیرہ رہتی ہے۔ میرے بہنوئی محکمہ ڈاک میں ایک اچھی، گذارے کے لائق آسامی پر متعین ہیں۔ میری ہمشیرہ کے تین بچے اور دو مکان ہیں۔ شہر میں میرے بہنوئی کا کافی رسوخ ہے۔ کچھ دنوں سے میں شادی کی ضرورت کو شدت سے محسوس کرنے لگا تھا۔ اب تین میں برس کا ہو چکا تھا۔ ہندوستان کے سے گرم ملک کا باشندہ تھا۔ اور کثرت سے چاٹ کھانے کا عادی۔ شروع جوانی میں پھوپھی اور خالہ کے ہاں سے رشتے آتے تھے۔ مگر مجھے ان دونوں لڑکیوں سے کچھ چڑھ تھی۔ وہ دونوں لڑکیاں خوبصورت اور بے وقوف تھیں۔ اس کے بعد بھی ہمشیرہ کہتی تھی۔ وقت گذر چکا ہے اور اب تو میرے سر میں کہیں کہیں سفید بال دکھائی دینے لگے تھے۔ ہندوستان کی اوسط عمر سے زیادہ ہو چکا تھا۔ اور یہی کیا کم غنیمت تھا۔ لیکن میں ایک عورت کی شکل دیکھے بغیر ہی مر جاتا اور اس صورت میں کیا جنت کے دروازے مجھ پر کھلے رہتے؟ میں نے ارادہ کیا کہ کسی معتبر آدمی کے ذریعے شادی کے متعلق کہلوا بھیجوں اور جب ہمشیرہ تھوڑا سا بھی اصرار کرے تو مان جاؤں۔ آخر کھانا پکانے کے لئے بھی تو ایک عورت چاہئے۔ گویا میں سارا دن مردانے میں بیٹھا رہوں گا۔ اور یہی باورچی خانے میں!

اور دل کہہ رہا تھا۔ دارالامان کی جگہ دارالمنظر کی ضرورت ہے۔ زینب خالہ کی لڑکی خوبصورت ہے تو خوبصورت ہی سہی۔ بے وقوف ہے تو بے وقوف ہی سہی کھانا پکانا تو اچھی طرح جانتی ہے۔

اس کام کے لئے میں نے جس معتبر شخص کو ڈھونڈا وہ زینو کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ زینو کافی عرصے سے میری ہمشیرہ کے ہاں متعارف تھا۔ دیر سے حاجی بگوم باجی بگوم کا سلسلہ شروع تھا۔ میں نے زینو کو رضامند کیا کہ وہ وہاں پہنچ کر میرے لئے زمین تیار کر دے۔ میری شادی کا تذکرہ چھیڑے۔ ہمشیرہ جو مدت سے میرا گھر آباد دیکھنے کی خواہشمند ہے مجھ سے خود ہی اصرار کرے گی اور پھر میں زینب کا قصہ چھیڑ دوں گا۔

ایک نیک ساعت دیکھ کر میں اور زینو گھر پہنچے۔ ہمشیرہ قریب آ کر بیٹھی تو میں عمداً کسی بہانے سے وہاں سے چلا گیا۔ دراصل میں بغل کے دروازے کے پاس کھڑا سب کچھ سنتا رہا۔ زینو کہہ رہا تھا۔

"ان کی شادی کیوں نہیں کر دیتے آپا؟"

"مانے بھی؟" آپا بولیں۔

"اصرار بھی تو نہیں کیا آپ نے کبھی؟"

"اصرار کی خوب کہی تم نے۔" ہمشیرہ غالباً ہاتھ پھیلا کر بولی "اس ڈھیٹ آدمی نے پھوپھی اور خالہ کے سامنے منہ دکھانے کے قابل نہیں رکھا۔ اب تو میں سے کبھی نہیں کہنے کی۔"

میں تلملا کر رہ گیا۔ لیکن میرا ہونہار وکیل کہنے لگا۔

"بچپن تھا نا آپا! اس وقت تو . . . . ."

ہمشیرہ غالباً ایک چائے کی پیالی اس کے سامنے رکھتے ہوئے بولی

"میں تو کبھی نہ کہوں گی، تم منوا لو سے . . . . ."

میں موقع مناسب دیکھ کر کمرے میں داخل ہوا۔ اور ادھر ادھر تصویر پر نگاہیں ڈالتے ہوئے بیٹھ گیا۔ ہمشیرہ چائے کی پیالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"پی لو ایک پیالی" اور پھر بولی "شادی کے متعلق کیا خیال ہے تمہارا؟"

ضروری تھا کہ ہمشیرہ کے سامنے میں جھوٹا سچا انکار کرتا۔ میں نے کانوں کو چھوتے ہوئے کہا "شادی! توبہ! توبہ!! میں اس راہ میں بھٹکنا نہیں چاہتا میرا مطمح نظر شادی سے کہیں بلند ہے۔"

زینو نے ایک آنکھ مارتے ہوئے کہا "اور باورچی؟"

میں نے چلاتے ہوئے کہا "بکواس بند کرو۔ زینو کے بچے، جہانگیر ریسٹوران میں برا کھانا ملتا ہے کیا؟"

اب جو کچھ زینو نے کہا وہ بیان سے باہر ہے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ بیٹھا۔ اور مجھ سے مانگ کر پہنی ہوئی پتلون کے گیلس کو کھینچتے ہوئے بولا۔

"ایسے بے ڈھب انسان مجھے بالکل پسند نہیں۔ خود ہی نے مجھے تیار کیا کہ میں جا کر شادی کے لئے زمین تیار کروں اور اب مجھے ہی خجل کرنا چاہتے ہو۔ . . . . . ہاں! . . . . ."

زینو جتنا خجل ہو سکتا تھا وہ ہو چکا اب میری باری تھی۔ پسینے کے قطرے اتنی سردی کے باوجود میری پیشانی پر پیدا ہو گئے۔ میں ہمشیرہ کے سامنے برابر انکار کرتا رہا۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں نہ ڈال سکا۔ زیادہ سے زیادہ میں نے یہ کیا۔ ننھے بھانجے کو گودی میں اٹھا لیا اور بہنوئی کی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"یہ کس کے ابا ہیں؟ تمہارے! . . . . شیت . . . . . شیت، تھوکتے ہو؟ کتنے گندے ہو تم؟"

اور پھر ہمشیرہ کو مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"یہ بھی کہتا ہو گا، اچھا ماموں ہے میرا۔ بالکل خالی ہاتھ چلا آیا۔"

اور اپنے بھانجے کے گالوں کو چٹکی لیتے ہوئے میں نے کہا۔

"اب کی دفعہ میں تمہارے لئے چیزی لاؤں گا، چیزی' بڑے بڑے شاہ دانے اور ٹانی . . . . کیا تم نے کبھی ٹانی بھی کھائی ہے یا چیزی . . . . . ٹانی چیزی سے بھی زیادہ میٹھی ہوتی ہے"۔

لیکن عورتیں نفسیات میں مردوں سے برتر ہوتی ہیں۔ میری ہمشیرہ مسکراتی رہی۔ اس کے بعد ہم نے رخصت لی۔ راستے میں میری زینو سے خوب لے دے ہوئی۔ میں نے کہا "تمہیں "دارالامان" میں چل کر پیٹوں گا سالے! گویا پیٹنے کے لئے "دارالامان" سے زیادہ موزوں اور کونسی جگہ ہو سکتی ہے۔ میں پراگندہ دل کے ساتھ اپنی کوٹھڑی میں داخل ہوا اور اپنی بید کی چھڑی کو تلاش کرنے لگا۔ وہاں ہادی اسلام ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ اور وہ بید کی چھڑی اُس کے ہاتھ میں تھی۔ پتہ چلا کہ زینو نے ہادی کا پین چرا کر اُس کی نب صراف کے ہاتھ بیچ ڈالی ہے، یہی چار آٹھ آنے لے لئے ہوں گے۔ مقتول قلم کا جسم نالی میں سے ملا ہے چارے کے سر سے نیلا نیلا خون بہ رہا تھا۔ زینو کی قمیص کی جیب میں سیاہی کا ایک بڑا سا دھبہ چوری کا شاہد تھا۔

اس دن میں نے دونوں باتوں کے لئے زینو کو پیٹا اور کہا "نکل جاؤ سور کے بچے . . . . شہدے، حرامزادے، نکل جاؤ فوراً یہاں سے"

اُسی وقت میں نے زینو کو سیڑھیوں میں سے دھکا دیا۔ وہ دو چار سیڑھیوں پر سے لڑھکتا ہوا آخری سیڑھی پر جا رکا۔ اُس کے منہ سے خون بہنے لگا۔ یوں دکھائی دیتا تھا جیسے اُس کا کوئی دانت ٹوٹ گیا ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد زینو اُٹھا۔ اور پیچھے کی طرف دیکھنے لگا۔ گویا اُسے کسی بات پر یقین نہ آتا ہو جب وہ کچھ دور جا کر میری جانب دیکھنے کے لئے رُکا تو اس خوف سے کہ مبادا وہ اپنی عقل حیوانی سے مجھ پر فتحیاب نہ ہو جائے۔ میں نے دیوار کے قریب سے ایک اینٹ اٹھائی اور زینو کی ٹانگ پر دے ماری۔ زینو کی چیخ ریسٹوران تک سنائی دی اور وہ بلبلاتا ہوا بیٹھ گیا۔ میں نے ایک اور اینٹ پھینکی، زینو لنگڑاتا ہوا اٹھا اور اسی حالت میں رینگتا ہوا آہستہ آہستہ شام کے بے مہر منجمد اندھیرے میں کہیں غائب ہو گیا۔

. . . .

اس سخت سردی کی رات میں جبکہ جھینگر بھی سر شام ہی سے شور مچانا چھوڑ دیتے ہیں میں اپنے بستر میں لیٹا، اُس کی گرمی اور نرمی محسوس کرتا ہوں کہ میرے سینے میں دل حرکت کرتا ہے۔ میری قوت متخیلہ بڑی بلند ہے۔ جب وہ ریل کی لائنوں یا دریا کی گہرائیوں کو ناپتی ہے۔ تو یہ دل شدت سے دھڑکنے لگتا ہے۔ جب نجیب کاتب جغرافئے کے ایک کورس کی کتابت کرتا ہے تو مجھے وہ لفظ دکھائی دیتے ہیں "زمین اپنے محور کے گرد حرکت کرتی ہے" میں سوچتا ہوں۔ کیا عجب کہ وہ ساکن ہو جائے اور جب کتاب کے ساتھ نقشہ دکھائی دیتا ہے تو میں حیرت سے پوچھتا ہوں یہ کس زمین کے ابھار ہیں۔ یہ ہلکے ہلکے، نیلے نیلے دریا جو نیلے رنگ میں دکھائے گئے ہیں ان کا قدرتی رنگ تو سرخ ہے۔

یہ مترجم اور مصنّف کتنی سنجیدگی کے ساتھ وقت، فاصلہ اور اضافیت کے متعلق باتیں کرتے ہیں۔ حالانکہ جانتے ہیں کہ یہ لوگ سخت سردی میں منجمد ہو جائیں گے اور جب یہ دیکھتا ہوں کہ ہمارا ایک معبود ہے جو سب کچھ دیکھتا ہے لیکن خاموش رہتا ہے تو اسی وقت مجھ پر جنون کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ میں اس وقت "دارالامان" کے اندر بڑی تیزی سے اِدھر اُدھر گھومتا ہوں اور کہتا ہوں۔ میں کیوں ابھی تک فیصلہ نہیں کر سکا۔ کہ مجھے باورچن کی زیادہ ضرورت ہے یا زینو کی۔

خان کی مشہدی لنگی شب در روز کھونٹی سے لٹکی رہتی ہے اور نجیب کی گھڑی صبح و شام تپائی پر پڑی ٹک ٹک کرتی ہے۔ جہانگیر ریسٹوران کا بل ادا کیا جا چکا ہے۔ فونٹین پین کے پیسے بھی چکا دئے گئے ہیں۔ لیکن اب بھی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے مجھے کسی کا کچھ ادا کرنا ہے لیکن میرا قرض خواہ کوئی بڑا بے نیاز آدمی ہے۔ جسے اپنے پیسے کی رتی بھر بھی پروا نہیں۔

بھولے سے اپنا سوٹ کیس کھولتا ہوں تو مجھے فوراً ہی اُسے بند کر دینا ہوتا ہے۔ اس کے کونے میں دو دانت پڑے ہیں۔ اور ایک کونے میں سفیدے سے لکھا ہے۔ زین العابدین یعنی عابدوں کی زینت!

کل ہی میں نے فلیکس کا ایک نیا بوٹ خریدا ہے۔ جب میں اُسے پہنتا ہوں۔ تو وہ چیختا ہے چلاتا ہے۔ بھلا اُسے کس بات کا رونا ہے۔ وہ چلاتا ہے۔ ـــــــ نئے چمڑے کا ہے نا اور وہ کم بخت چسٹر بھی تو میرے لحیم و شحیم جسم پر پورا نہیں آتا۔

جب ہم شام کو سوٹ پہن کر دارالامان سے نکلتے ہیں تو ہم کتنے بہتر انسان دکھائی دیتے ہیں۔ ہم ہنستے ہیں لیکن تہذیب کے دامن کو ہاتھ سے نہیں دیتے۔ آخروالدین نے ہمیں تربیت دی ہے۔ ہم مفلر کو گلے میں اور موزوں کو پاؤں میں خوب کھینچتے ہیں تاکہ سردی لگ جانے کا خدشہ نہ رہے اور جب کوئی سڑک پر جاتی ہوئی لڑکی ہماری طرف دیکھتی ہے تو ہم فوراً اپنی ٹائی کی گرہ کو درست کرنے لگتے ہیں۔

کبھی کبھی باتوں باتوں میں نجیب وحید کو سالا کہہ دیتا ہے۔ وحید

پورے زور سے ایک چپت اس کے منہ پر جما دیتا ہے اور ایک ہفتہ تک وحید مستری کی ہتھوڑے پکڑنے والی انگلیوں کے نشان نجیب کے گالوں پر دکھائی دیتے ہیں۔ اور جب ہم اپنے ارد گرد غور سے دیکھتے ہیں تو محسوس کرتے ہیں، نہ کوئی کسی کا بھائی ہے نہ بہنوئی نہ سالا، نہ ماموں نہ بھانجا، نہ باپ نہ بیٹا..... سب رشتے ناطے ٹوٹ چکے ہیں۔

اللہ! تمام دنیا یکسر شریفوں کی دنیا میں بدل چکی ہے۔ گویا ہم ایک دار القرار بلکہ اس سے بھی اُوپر ایک خلد بریں میں رہتے ہیں!

راجندر سنگھ بیدی

زندگی اور موت

حیات:۔

ساغرِ ہستی شکستہ، جامِ مستی چُور چُور
عشق کی رنگین وادی تیرہ و تار و خموش
سرد جذباتِ جوانی، گم تمنّاؤں کا جوش
گرد تیرے نحس سے اصنامِ ہستی کا غرور
منتشر رومانِ فرحت، مضطرب ذوقِ سرور
محوِ قلبِ ملتہب سے مستیٔ احساس و ہوش
عہدِ ماضی کا ترانہ، سازِ ہستی کا خروش
عرصۂ عالم میں مہلک کس قدر تیرا ظہور!

موت:۔

حکمراں ہے مملکت پر تیری ہر سو اہرمن
دامنِ دوشیزگیٔ بزمِ جنوں میں تار تار
عشق یکسر مضطرب، روحِ جوانی شرمسار
سرد کرتا ہے تمنّاؤں کو تیرا بانکپن
اس جہاں میں جور و استبداد کی تجھ سے نمود
طنز ہے آسودگیٔ روح پر تیرا وجود
میرا دامن کش ہے حسن و عشق کا شوقِ وصال
ورنہ میں اور تیرے اس مہلِ شبستاں کا خیال!

شوکت واسطی

دو غزلیں

(۱)

دیوانگیٔ دل کی توقیر نہیں ہوتی
اب خاکِ محبّت بھی اکسیر نہیں ہوتی

باہر ہو قدم کیسے وحشت کدۂ غم سے
مانا مرے پاؤں میں زنجیر نہیں ہوتی

اے برقِ فنا تو ہی تقدیر مری بن جا
غارت گر ساماں سے تدبیر نہیں ہوتی

کیوں دیکھتے ہیں مجھ کو حیرت سے جنوں والے
کیا غم کی یہاں کوئی تصویر نہیں ہوتی

تعزیر کے لائق ہوں یہ سچ ہے مگر سوچو
قسمت کا بگڑ جانا تقصیر نہیں ہوتی

کرتی ہے خموشی ہی چپکے سے بیانِ غم
جب دردِ تمنا کی تفسیر نہیں ہوتی

آدابِ وفا سیکھو، اندازِ جفا چھوڑو
یوں قصرِ محبت کی تعمیر نہیں ہوتی

کیوں درد نہیں بڑھتا، کیوں موت نہیں آتی؟
اس خواب پریشاں کی تعبیر نہیں ہوتی

تاثیرِ محبت سے آہیں تو نکل آئیں
آہوں میں نظر پیدا تاثیر نہیں ہوتی

(۲)

سازِ ہستی میں ہیں سوزِ غم کی تفسیریں کہیں
آرزوئے شوق کے خوابوں کی تعبیریں کہیں

کس تجاہل سے بدل دی تم نے میری زندگی
یوں نگاہِ ناز سے بدلی تھیں تقدیریں کہیں؟

حلقہ در آغوش ہوں دیوانگانِ نو بہار
ہل رہی ہیں موجِ بوئے گُل کی زنجیریں کہیں

سینکڑوں خاکے ہوئے برباد رنگِ عشق سے
حُسن کے چھینٹوں سے جب چمکی ہیں تصویریں کہیں

حشر میں بھی مل رہی ہے توبہ کرنے کی سزا
میں کہیں برباد ہوں اور میری تقصیریں کہیں

جوشِ وحشت میں پریشاں حال ہیں بربادیاں
ڈھونڈتی ہیں مجھ کو شاید میری تدبیریں کہیں

پھونک ڈالا سردآہوں سے ہی اپنا آشیاں
آتشِ غم کی نظر چھپتی ہیں تاثیریں کہیں؟

قیوم نظر

شکوہ

شب تیرہ میں اک خُفتہ جوانی کو کچل ڈالا
شکاری! آہ، اے ظالم شکاری! تیری نادانی!

جھجک ہے، عشوۂ ہشیار ہے،
احساس ہے جس کا
گُلِ بوسیدہ کی زخمی جوانی کو!

اچانک تیر مارا، جذبۂ زہری سے آلودہ،
شگفتہ ہو گئے نکہت پھول کی بکھری فضاؤں میں۔ ایک بے چینی!
پریشاں ہو گی اب دنیا میں یہ سفّاک رسوائی،
ہر اک بوسیدہ پتّی کھو کے حسنِ نرم و نازک کو،
بنی ہے ہمسفر اک رنگِ نَو کے تُند جلوے کی!

بدل ڈالا ہے تُو نے رنگ فطرت کی اداؤں کا،
مچل کر جاگ اُٹھی ہے، درسِ وحشت دے گی دنیا کو،
بنی ہے ہمعناں اک رنگِ نَو کے تُند جلوے کی!

مگر تُو نے شکاری! آہ، اے ظالم شکاری! یہ بتا مجھ کو،
شب تیرہ میں کیوں خفتہ جوانی کو کچل ڈالا؟
کہ اب باقی نہیں پہلی سی وہ بے باک رعنائی؛
بجائے سادگی اب اک تکلّف ہے،

گُلِ بوسیدہ کی زخمی جوانی ہر شکاری کو
مچل کر درسِ وحشت دے گی، نادانی سکھلائے گی!
شکاری! آہ، اے ظالم شکاری! تیری نادانی!
شب تیرہ میں کیوں خفتہ جوانی کو کچل ڈالا!

میراجی

اُردو ناٹک کی شاعری

اس وقت تک اردو ڈرامے کی تاریخ کے متعلق جو تحقیق ہوئی ہے اُس سے یہی پایا جاتا ہے کہ اردو کا سب سے پہلا باقاعدہ ناٹک "اندر سبھا" ہے۔ فرخ سیر بادشاہ کے زمانے میں میاں نواز دہلوی نامی ایک صاحب نے سنسکرت کے شہرۂ آفاق ناٹک "شکنتلا" کے قصّے کو ملی جلی فارسی اور پراکرت میں لکھا تھا۔ مگر اب یہ ناٹک اگر اُسے واقعی ناٹک کہا جاسکتا ہے تو تقریباً ناپید ہوچکا ہے۔ البتّہ اس کے ایک سلیس اردو ترجمہ کا پتہ چلتا ہے جو فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے ایک مترجم مرزا کاظم علی جوان کے قلم کا رہین منت ہے۔ اس کے بعد اردو کے جس ڈرامے کا پتہ چلتا ہے اور جسے حقیقی معنوں میں ڈراما کہا جاسکتا ہے۔ وہ امانت کی "اندر سبھا" ہے۔ یہ اردو کا سب سے پہلا "اوپیرا" ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اب تک اس سے بہتر "اوپیرا" اردو میں نہیں لکھا گیا۔ آج بھی اگر کسی اسٹیج پر "اندر سبھا" دکھائی جاتی ہے تو دیکھنے والوں کے ذوق وشوق کا وہی عالم نظر آتا ہے، اندر سبھا امانت کی دیکھا دیکھی اُسی زمانے کے ایک شخص مداری لال نے بھی اندر سبھا لکھی۔ فنی اعتبار سے مداری لال کی اندر سبھا اور امانت کی اندر سبھا میں کوئی بڑا فرق نہیں پایا جاتا۔ لیکن امانت کی اندر سبھا میں زبان وبیان کی جو خوبیاں پائی جاتی ہیں اور جو روانی اور شاعرانہ نکتہ آفرینیاں موجود ہیں، وہ مداری کے ہاں بالکل مفقود ہیں، یہی وجہ ہے کہ امانت کے مقابلے میں مداری کی شعبدہ گری کامیاب نہ ہو سکی۔ "اندر سبھا" کی تقلید میں اردو میں اور بھی اوپیرا لکھے گئے مگر کسی کو "اندر سبھا امانت" سا قبولِ عام حاصل نہ ہوسکا۔ اندر سبھا اپنی ڈرامائی خوبیوں سے قطع نظر خالص شاعری کے نقطۂ نظر سے بھی ایک عمدہ تصنیف ہے اس کی شاعری میں شروع سے آخر تک ایک ہی سی روانی پائی جاتی ہے، فنی لحاظ سے بھی اس کی شاعری بڑی حد تک مکمل ہے، اور بڑی تلاش و جستجو کے بعد ہی مشکل سے چند سقم نکالے جا سکتے ہیں، اس میں کئی شعر ایسے ملیں گے جو بندش کی چستی۔ الفاظ کی نشست۔ تخیل کی بلند پردازی اور تشبیہوں اور استعاروں کی ندرت ورنگینی کے اعتبار سے بلند پایہ ہیں، میں اس وقت اس کی شاعری کے بعض نمونے پیش کرتا ہوں۔ پہلے ایکٹ کے پہلے سین میں درباری راجہ اندر کی آمد گاتے ہیں۔

سبھا میں دوستو اندر کی آمد آمد ہے — پری جمالوں کے افسر کی آمد آمد ہے
خوشی سے چہچے لازم ہیں صورتِ بلبل — اب اس چمن میں گل تر کی آمد آمد ہے

اندر سبھا میں ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ جس کے منہ سے جو کچھ کہلوایا گیا ہے وہ اُس کے مرتبے اور مقام کے عین مطابق ہے۔ اندر سارے پرستان کا بادشاہ ہے، چنانچہ دوسروں سے باتیں کرتے ہوئے یا اپنا تذکرہ کرتے ہوئے اُسے اپنی برتری کا پورا پورا احساس ہوتا ہے۔ اندر بادل کے جھالے سے اُتر کر تخت پر جلوس فرماتے ہوئے کہتا ہے۔

راجہ ہوں میں قوم کا اور اندر میرا نام — بن پریوں کی دید کے نہیں مجھے آرام

سبھا میں داخل ہوکر پکھراج پری کہتی ہے۔

گاتی ہوں میں اور ناچ سدا کام ہے میرا — آفاق میں پکھراج پری نام ہے میرا
میں لاکھ کی دو لاکھ کی پروا نہیں کرتی — قاروں کا خزانہ ابھی انعام ہے میرا

نیلم پری کہتی ہے۔

حوروں کے ہوش اڑتے ہیں اڑنے کی شان پہ ☆ نیلم پری ہے نام مرا آسمان پہ
نیلم کو چوم چاٹ کے آنکھوں پہ رکھتے ہیں ☆ شہرہ ہے میرا جوہریوں کی دکان پہ

لال پری سبھا میں داخل ہونے کے بعد کہتی ہے۔

انساں کا کام حسن پہ میرے تمام ہے — جوڑا ہے سرخ لال پری میرا نام ہے
یاقوت زر خرید ہے سرکار کا مری — ذکر عقیق لعلِ بدخشاں غلام ہے
پوشاک میری سرخ ہے مکھڑا ہے چاند سا — دیکھو شفق میں رات کو ماہِ تمام ہے

سبز پری کہتی ہے۔

آتی ہے نئے انداز سے اب سبز پری ہے — لب سرخ ہیں، پر سبز ہیں پوشاک ہری ہے
فیروزہ اُسے دیکھ کے کھا جاتا ہے میرا — چہرے میں زمرّد سے سوا جلوہ گری ہے

له ماگھ ناٹک ـــ (ادارہ)

اِن شعروں سے یہ بھی ظاہر ہوگا کہ امانت نے اندرسبھا کی شاعری میں اسی ماحول کی پوری پوری تصویر کھینچی ہے۔ جسے وہ بیان کرنا چاہتا ہے۔

جب لال دیو گلفام کو گرفتار کرکے اندر کے سامنے پیش کرتا ہے تو اندر غضب ناک ہوکر اس سے پوچھتا ہے۔

ارے کون ہے تو ترا کیا ہے نام — سبھا تو نے کی میری برہم تمام
تجھے لایا یاں کون اے بدصفات — بیاں مجھ سے کر جلد یہ واردات
کیا تو نے کیا تو نے پرستان کا — نہ خوف آیا اپنی تجھے جان کا

اسی طرح اندر سبز پری سے کہتا ہے

ارے او پری سبز او بے حیا — مرے سامنے جلد آ بیسوا
نگوڑی ہے تری ذات بنیاد پر — کہ عاشق ہوئی آدمی زاد پر

سبز پری ندامت سے سر جھکا کر دست بستہ عرض کرتی ہے۔

جفا و سزا کی سزاوار ہوں — حقیقت میں تیری گنہگار ہوں

غرض اندرسبھا اسی طرح کی رنگا رنگ رنگینیوں کا ایک رنگین مرقع ہے۔ اس کا ہر شعر اپنی اپنی جگہ پر ایک نگینہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ بقول مولانا حسرت موہانی" ظاہر میں یہ دیو پری کا ایک بے سرو پا قصہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت میں ایک مرادی افسانہ (ALLEGORY) ہے۔ جس کے ذریعے سے امانت نے پاسِ شرافت اور حُسن و عشق کے نہایت نازک اور اہم معاملات کا فوٹو کھینچ کر رکھ دیا ہے۔

امانت کے بعد بہت دنوں تک اردو ڈرامے کی قسمت سوئی رہی کیونکہ کسی بڑے شاعر نے ڈرامے کی طرف توجہ نہ کی جو لوگ اس فن کی طرف مائل ہوئے وہ یا تو بگڑے شاعر تھے یا بگڑے ادیب، جس طرح میر سودا کے زمانے میں یہ مشہور تھا کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو ہو جاتا ہے اُسی طرح امانت اور امانت کے بعد کے زمانے کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ بگڑا شاعر یا بگڑا ادیب تمثیل نگار بن جاتا تھا، چنانچہ خود امانت نے بھی اندرسبھا میں کئی جگہ اپنے آپ کو بجائے امانت "استاد" لکھا ہے بلکہ شرح اندرسبھا میں یہاں تک لکھ دیا کہ "یہ جلسہ کیا سب کو مرغوب تھا۔ مگر اپنے نزدیک معیوب تھا۔ اس لحاظ سے اپنا تخلص بدل کر اس میں استاد تخلص کیا۔ لیکن لوگوں نے غزلوں کے سبب بندہ کا کلام دریافت کر لیا" قسمت کی خوبی دیکھئے کہ جس "جلسہ" کو امانت ایک معمولی سی چیز سمجھتے تھے۔ وہی اُن کے لئے شہرتِ دوام کا باعث بنا اور انہیں اردو ڈرامے کی سبھا کا اندر بنا گیا اور جن غزلوں پر انہیں ناز تھا، انہیں گردشِ ایام کے جھونکے نہ معلوم کہاں سے کہاں اڑا لے گئے۔

اندرسبھا کی مقبولیت سے یہ بڑا فایدہ ہُوا کہ ملک بھر میں ڈراما دیکھنے کے شوق کو تقویت پہنچی اور جب ڈراما دیکھنے کا شوق بڑھا تو قدرتی طور پر کئی اہلِ قلم کو اس صنف کی طرف رغبت ہوئی چونکہ اُس زمانے میں ڈراما لکھنا اور ڈرامے میں پارٹ کرنا دونوں معیوب سمجھے جاتے تھے، اس لئے ایک طرف تو اچھے لکھنے والوں نے اس فن کی طرف توجہ نہ کی اور دوسری طرف اداکاری بھی عرصہ دراز تک ڈوم ڈھاڑیوں اور میراثیوں کا پیشہ بنی رہی، جن لوگوں نے اردو میں پہلے پہل ڈراما نویسی کی طرف توجہ کی۔ وہ سنسکرت سے بالکل ناآشنا تھے۔ اور سنسکرت کے سوا ہندوستان کی کسی زبان میں ڈرامے کا کوئی اعلیٰ نمونہ موجود نہ تھا جسے یہ لوگ اپنے لئے مشعلِ راہ بناتے۔ ناچار انہیں اپنی طبیعت اور عام مذاق کو اپنا رہبر بنانا پڑا۔ سب سے پہلی اور بڑی جس ناٹک کمپنی کا نام اب تک معلوم ہو سکا ہے وہ بمبئی کی اوریجنل پارسی تھیٹریکل کمپنی ہے۔ اس کے ڈراما نگار رونق بنارسی تھے۔ ان کے ڈراموں کا ایک مجموعہ کسی زمانے میں گجراتی رسم الخط میں شائع ہُوا تھا۔ انہیں اردو نظم و نثر دونوں میں بڑی اچھی مہارت حاصل تھی۔ اسٹیج سے تعلق رکھنے والے بعض پرانے لوگوں سے سنا ہے کہ رونق بڑے صاحبِ دل تھے، انہیں کسی ایکٹریس سے بہت لگاؤ تھا۔ ایک دن وہ بیٹھے سیب کاٹ رہے تھے خبر ملی کہ اس محبوبۂ جاں نواز نے ملکِ عدم کو کوچ کیا، اُس دن رونق کوئی غزل لکھ رہے تھے۔ اور اس مصرعے پر پہنچے تھے ؏

جہاں پہ اس کی لحد بنے گی وہیں پہ میرا مزار ہوگا!

یہ اندوہناک خبر سنتے ہی انہوں نے اپنے دل میں وہی چاقو گھونپ کر اپنا کام تمام کیا، نہ معلوم اس واقعہ میں کہاں تک صداقت ہے۔ اُن کے ایک ناٹک میں سے ایک شعر یاد ہے۔

کتا بستی کو پسند ہے اور نہ ویرانے کو دل
اب تو رونق چاہتا ہے اپنا مرجانے کو دل

رونق کے بعد حسینی میاں ظریف اسی کمپنی میں ڈراما نگار مقرر ہوئے، انہوں نے اردو میں کئی ڈرامے لکھے جو نظم و نثر دونوں پر مشتمل ہیں ظریف کے بعد اس صنف میں حافظ محمد عبداللہ کا نام لیا جا سکتا ہے۔ حافظ صاحب کے اکثر ڈرامے منظوم ہیں جو "لائٹ آف انڈیا تھیٹریکل کمپنی" اور "امپیریل تھیٹریکل کمپنی" وغیرہ نے بڑی کامیابی سے اسٹیج کئے۔ ان کے لکھے ہوئے ایک اوپیرا "زہرہ و بہرام" میں سے شاعری کے بعض نمونے ملاحظہ ہوں۔ بہرام کہتا ہے ؎

آئے وہ بیوفا یہاں اس کی بلا کو کیا غرض   جائے درِ قبول تک میری دعا کو کیا غرض
موت کو اے دلِ حزیں اور بہانے ہیں بہت   آئے جو اس کے ہاتھ میں میری قضا کو کیا غرض
اس کی گلی سے آئے کیوں نکہتِ زلف لائے کیوں   مجھ کو صبا سے ہے امید مجھ سے صبا کو کیا غرض

حافظ عبداللہ صاحب کے ایک دوسرے ناٹک "ہوائی مجلس عرف نیرنگ" سے چند شعر اور سنیئے۔ وزیر کہتا ہے ؎

شاہزادے کو میں لایا شہِ عالم سنیئے   ہے پری کا اسے سایہ شہِ عالم سنیئے
ہو وہیں اس شہر میں رمّال و نجومی جتنے   جائے ہر ایک بلایا شہِ عالم سنیئے

حافظ محمد عبداللہ کے شاگردِ رشید مرزا نظیر بیگ اکبرآبادی نے بھی کئی ڈرامے لکھے جو اسٹیج پر کامیابی سے کھیلے گئے اور مقبول ہوئے لیکن مرزا صاحب شاعری میں اپنے استاد سے بازی نہ لے جا سکے۔ یہ عجیب تماشا ہے کہ اُس زمانے کے ڈرامانگار، ڈرامانگاری کے اصول سے اس قدر بے خبر تھے کہ ڈراما اور ناول کے فرق کو بھی نہیں سمجھ سکتے تھے۔ چنانچہ مرزا نظیر بیگ اپنے ایک ڈراما "طلسماتی پتلا" کے دیباچے میں تحریر فرماتے ہیں۔

"یہ ناول ایک بہت پرانی مثل طلسماتی سحر ساحری سے لیا ہے اور اس میں موقع موقع پر چند سین پُرمذاق زیادہ ڈال کر گانے اور ڈرامے مقفّٰی عبارت کے بہت کوشش اور جانفشانی کے ساتھ بنا بنا کے شامل کئے۔"

مرزا نظیر بیگ کے بعد اردو ڈراما نویسی میں جو سب سے بڑا نام نظر آتا ہے وہ منشی ونایک پرشاد طالب بنارسی کا نام ہے۔ طالب نظم و نثر دونوں پر قدرت رکھتے تھے۔ انہوں نے اردو ڈرامے کی ترقی میں بہت نمایاں حصّہ لیا ہے اور کئی ڈرامے لکھے ہیں۔ ان کے ڈراموں میں سے شاعری کے بعض نمونے ملاحظہ ہوں ؎

دشمنی رکھتے ہیں آئینے سے صورت والے   خاک میں دل کو ملاتے ہیں کدورت والے
گورِ مقتولِ جفا سے یہ صدا آتی ہے   مارے جاتے ہیں یہاں مفت محبت والے
شیراز کی شراب ہے شیریں ہے لال ہے   زاہد کو بھی اگر یہ ملے تو حلال ہے

دل مرا لے کے کدورت سے دبا رکھا ہے   تم نے اکسیر کو مٹی میں ملا رکھا ہے
کیوں نشانہ مجھے تیروں کا بنا رکھا ہے   دل تو تم لے چکے اب سینے میں کیا رکھا ہے

طالب کے بعد جس شخص نے اردو اسٹیج کی ترقی میں بہت حصّہ لیا وہ منشی مہدی حسن احسن لکھنوی ہیں۔ احسن صاحب کو نظم و نثر دونوں پر بڑی قدرت حاصل ہے۔ انہوں نے اردو اسٹیج کی شاعری کا مرتبہ اونچا کرنے میں پوری پوری کوشش کی۔ ہم یہاں "خونِ ناحق" میں سے ان کی شاعری کی بعض مثالیں پیش کرتا ہوں۔

فرخ بیگم سے مخاطب ہو کر کہتا ہے ؎

نکل سکتی نہیں اس ظلم سے حسرت مرے دل کی
رہے گا بارِ خونِ بے گنہ گردن پہ قاتل کی

بیگم بادشاہ کی موت کے بعد رعایا کا حال پوچھتی ہے۔ ہمایوں کہتا ہے

ہائے کیا جلد یہ مٹی کا گھروندا بگڑا   موت کا کچھ نہ گیا کھیل ہمارا بگڑا

ہمایوں جہانگیر سے پوچھتا ہے۔

زرد رُخ ہے یاس ہے چہرے پہ کیوں چھائی ہوئی   ہے طبیعت کس لئے اس درجہ گھبرائی ہوئی

جہانگیر جواب دیتا ہے۔

مجھ کو یاد آئی بزرگوں کی قضا آئی ہوئی   جن کے مرنے سے مری دنیا میں رسوائی ہوئی
قبر میں بھی ساتھ لے جاؤں گا اپنا اضطراب   بعد مردن بھی پھرے گی روح گھبرائی ہوئی

جہانگیر مہربانو سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

بے وفائی سے عزیزوں کے کھلا یہ عقدہ   ہم ہیں دنیا میں کسی کے نہ ہمارا کوئی

ایک درباری فرخ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے ؎

جادۂ راہِ بقا غیر از فنا ملتا نہیں   ہے خودی جب تک کہ انساں میں خدا ملتا نہیں

احسن کے بعد اردو ڈرامے میں جو سب سے بڑا نام نظر آتا ہے۔ وہ پنڈت نارائن پرشاد بیتاب دہلوی کا ہے۔ "قتلِ نظیر" کو بیتاب کا سب سے اچھا اردو ڈراما سمجھا جاتا ہے۔ میں یہاں اس سے بیتاب کی شاعری کے بعض نمونے پیش کرتا ہوں۔ اس سے ظاہر ہوگا کہ بیتاب نے اردو اسٹیج پر شاعری کے کوئی اچھے نمونے پیش نہیں کئے۔ مہاجن کہتا ہے ؎

بنیا اپنا بھی گُر جو کھاتا ہے   ہر طرح اپنا مُنہ چھپاتا ہے
ایک یہ بے حیا ہے کم بد ذات   کھلے میداں مزے اُڑاتا ہے

دوست جواب دیتا ہے۔ ؎

تم کو جس گاؤں کو نہیں جانا   اس کے کوسوں سے کیا ہے مطلب؟
واسطہ جب نہیں رہا اُس سے   کچھ کرے وہ بلا سے اپنی اب

انجم کرم الٰہی سے کہتا ہے ؎

اور تو کچھ نہیں ہے ایک کھٹک سی دل میں   ہاں کوئی اس درد کا بتلائے مداوا کیا ہے
چُبھ گئی ہے وہ مژہ دل میں جیوں یا نہ جیوں   جان کا کانٹے کی انی پہ بھروسا کیا ہے

نظیر رنڈیوں کی چودھرائن فہمن سے کہتی ہے ؎

جو ہے سامان مرا کیا ہے وہ سب آپ کا ہے   ہاں یہ جان مرا کیا ہے وہ سب آپ کا ہے

نظیر کا سازندہ نگینہ کرم الٰہی سے مخاطب ہو کر کہتا ہے ؎

مال یا دولت نہ آئے ہاتھ اس کا غم نہیں نام ہی دنیا میں جو رہ جائے تو کچھ کم نہیں

بیتاب کے ہمعصر آغا حشر کاشمیری کی طبیعت میں شاعری کا بہت بڑا جوہر تھا۔ انہوں نے اپنی ڈرامائی شاعری میں مختلف قسم کے جذبات کی بہت اچھی ترجمانی کی ہے، حشر کی ڈرامائی شاعری میں جو جوش و خروش پایا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اردو اسٹیج کی شاعری میں اپنی نظیر آپ ہے۔ ایک جگہہ کہتے ہیں۔

انسان اور انسان کے دُکھ سکھ کی پہیلی۔ اک راز ہے اور حشر تلک راز رہے گی

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں

جگہہ جگہہ پہ بکھری ہوسولی قدم قدم پر بچھے ہیں پھندے ٭ دُکان کھولی ہو معصیت کی گناہ کے ہو رہے ہیں دھندے
نگاہ ناپاک سینے میلی زبان جھوٹی خیال گندے ٭ کچھ ایسا بدلا ہے اب زمانہ نہ وہ خدا ہے نہ وہ ہیں بندے
یہی ہو حالت تو دین و مذہب کو دور ہی سے سلام ہوگا ٭ نہ ہوں گے ہندو نہ ہوں گے مسلم رحیم ہوگا نہ رام ہوگا

"خواب ہستی" میں نواب عباس یہ کہتا ہے ؎

یہ وہیں تک ساتھ دیں گے جب تلک کچھ اس کے پاس ہے
جب ملک احمق ہے تو جس وقت تک زر پاس ہے

اسی ڈرامے میں ایک جگہہ حنا کہتی ہے ؎

محفلِ ہستی میں شمع انجمن آرا ہے یہ بیکسی کی رات میں امید کا تارا ہے یہ
آرزو کی آنکھ ہے یہ اور تمناؤں کی جان پیار بھی کرتا ہے جس کو پیار وہ پیارا ہے یہ

اسی ڈرامے میں ایک مقام پر فرماتے ہیں۔

پھر کہاں یہ دوست ہوں گے اور کہاں یہ بزم چنگ
آ گئی پیری تو رو دیں گے جوانی کے لئے

"سفید خون" میں ارسلان خاقان سے کہتا ہے۔

آب دریا میں سرورِ جامِ مُل ہوتا نہیں خار کا گُل نام رکھ لینے سے گُل ہوتا نہیں
آہنی فولاد کی تلوار ہو یا کاٹھ کی غیر تب مانے گا لوہا جب کہ اس نے کاٹ کی

اسی زمانے کے ایک ڈراما نگار کشن چند زیبا ہیں۔ زیبا نے اپنے ڈراموں میں شاعری کے عجیب و غریب شگوفے چھوڑے ہیں۔ مثلاً

کس قدر ہے شوک یہ آگھات کتنا گھور ہے
محل کیا ٹھہرے گا جب بنیاد ہی کمزور ہے

اگر اس شعر کی گنگا جمنی زبان سے قطع نظر بھی کی جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زیبا صاحب نے محض مصرعۂ اولیٰ سے مصرعۂ ثانی کا وزن ملانے کے لئے محل کو بالسکون باندھ دیا ہے۔ ایک اور جگہہ فرماتے ہیں۔

نرک ہے راج وہ جس میں پرجا مورکھ ہے ان پڑھ ہے
پرجا ہی راج کی رونق ہے پرجا ہی راج کی جڑ ہے

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شعر صنعت بے بحری میں کہا گیا ہے۔

منشی محمد ابراہیم محشر انبالوی بھی ایک خاصے کامیاب ڈراما نویس گذرے ہیں۔ اگرچہ یہ کوئی اچھے شاعر نہ تھے اور کبھی کبھی مہمل بھی لکھ جاتے تھے مگر ان کے ڈراموں میں کوئی کوئی صاف شعر بھی دکھائی دے جاتا ہے۔

تیرِ نظر سے ایسا جادو چلا دیا ہے ظالم نے میرے دل پہ سکہ بٹھا دیا ہے

منشی عباس علی بھی اردو اسٹیج کے ایک کامیاب ڈراما نویس ہوئے ہیں، شعر و شاعری کے لئے ان کی طبیعت موزوں نہ تھی لیکن چونکہ پارسی اسٹیج پر ڈراموں کو کامیابی کے لئے تھوڑی بہت شاعری ضروری سمجھی جاتی تھی اس لئے انہوں نے بھی اپنے ڈراموں میں جا بجا شاعری فرمائی ہے۔ میں یہاں "شیریں منجری" میں سے ان کی شاعری کا ایک نمونہ پیش کرتا ہوں جس سے ان کی شاعرانہ قابلیت کا اندازہ ہوگا۔

کبھی صحرا عرب کا اور کبھی الجیریا گو سنجا کبھی تو دھکتا پہاڑ اور کبھی تھا مینوا گونجا
صبا گو آج دھیمی ہے مگر وہ جوش رکھتی ہے اگر ہے محو بے ہوشی مگر کچھ ہوش رکھتی ہے

منشی عشرت حسین نیر نے بھی بعض ڈرامے لکھے ہیں جو مقبول ہوئے کبھی کبھی یہ کوئی اچھا شعر بھی نکال لیتے تھے۔ "نور کی پتلی" سے ان کے ایک دو شعر ملاحظہ ہوں۔

گھرے ہیں بدبختیوں کے بادل عذاب سر پر برس رہا ہے
زمیں کا ایک ایک ذرہ کمرِ عداوت پہ کس رہا ہے

نمایاں ہیں گُل خوش رنگ یوں صحرا کے دامن میں کہ گویا آگ دہکی آگ سی دریا کے دامن میں

منشی آرزو بدایونی "حشر اسکول" سے تعلق رکھتے ہیں، ان کے اردو اور ہندی دونوں ڈرامے اسٹیج پر کامیاب ہوئے "تصویرِ غم" سے ان کے ایک دو شعر نمونتہً ملاحظہ ہوں

اماں ملتی نہیں مجھ کو کسی صورت تباہی سے لکھی تھی میری قسمت پھوٹنے والی سیاہی سے

ہے جستجوئے رحم امیروں کے گھروں میں کرتے ہو تلاش آگ کو جگنوں کے پروں میں

ان حضرات کے علاوہ اور بھی متعدد اصحاب نے اردو میں ڈرامے لکھے اور وہ اسٹیج بھی کئے گئے مگر ان میں سے کوئی بھی اچھا شاعر نہ تھا۔

البتہ بمبئی والے شاد مرحوم، منشی محی الدین نازاں دہلوی مرحوم اور آرزو لکھنوی کے ڈراموں میں شاعری کے کچھ اچھے نمونے مل جاتے ہیں۔

مولوی ظفر علی خاں نے بھی "جنگ روس و جاپان" کے نام سے نظم و نثر پر مشتمل ایک ڈراما لکھا ہے۔ اس میں شاعری کے کہیں کہیں بہت اچھے نمونے نظر آتے ہیں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ اس ڈرامے کو اسٹیج نہیں کیا جا سکتا۔ احمد علی شوق قدوائی اور مرزا رسوا لکھنوی نے بھی منظوم ڈرامے لکھے ہیں۔ مگر انہیں ڈرامے کے بجائے مثنوی کہنا زیادہ موزوں ہوگا، یہ "ڈرامے" بالکل اسٹیج کے کام کے نہیں۔

یہ صحیح ہے کہ اردو ڈرامے میں جو شاعری کی گئی ہے اُس میں اعلیٰ شاعری کے بہت کم نمونے نظر آتے ہیں لیکن اتنا ضرور ہے کہ اردو اسٹیج کی شاعری میں بادشاہ سے لے کر فقیر تک سوسائٹی کے ہر طبقے کے افراد کے جذبات، احساسات اور خیالات کی جھلک پائی جاتی ہے نیز ہر موقع اور ہر محل کی نمائندگی نظر آتی ہے۔

(آل انڈیا ریڈیو بمبئی)

مظفر حسین شمیم

ایک نظم

کل جواں کا اُلجھ گیا دامن چلتے چلتے روش پہ کانٹوں سے
مسکرا کر وہ یوں مُڑے گویا اُن کے دامن کو میں نے تھاما تھا
دیکھا مجھ کو الگ تو حسرت سے
رہ گئے وہ یونہی کھڑے کے کھڑے

مسعود شاہد

برسات کی رات

گھٹا اُمڈی ہوئی ہے رات کی بھیگی جوانی ہے
دلِ محزوں کو راحت ہے نظر کو شادمانی ہے

گلی کوچوں میں خاموشی ہے اور پُر کیف خاموشی
ہے ذرّہ ذرّہ مخمورِ سکون و رہنِ مدہوشی

سحر کا اب تصوّر رات کے دل میں نہیں آتا
اُجالا بھول کر اس شب کے محمل میں نہیں آتا

نشیلے بادلوں کی اوٹ میں روپوش ہیں تارے
ملاحت کی نگہبانی میں ہیں خوش رنگ نظّارے

ملائم تیرگی قلبِ فضا میں تھرتھراتی ہے
ہوائیں رقص کرتی ہیں خموشی گنگناتی ہے

گھروں کے بند دروازے پھواروں سے کھنکتے ہیں
چمکتی ہے جو بجلی سب گلی کوچے جھلکتے ہیں

ستارے آنکھ جھپکاتے ہیں آغوشِ ملاحت میں
نظامِ برشگالی زور پر ہے بزمِ فطرت میں

گرجتا ہے جو بادل دل دہل جاتا ہے سینے میں
بس اب پانی ہی پانی ہے نگاہوں کے سفینے میں

ہوائیں گیت گاتی ہیں تو دل بے تاب ہوتا ہے
نگاہِ خواب میں ذوقِ طرب نایاب ہوتا ہے

لبِ فطرت پہ خوابیدہ جوانی کا فسانہ ہے
دلِ خرّم سے کوسوں دُور رودادِ زمانہ ہے

محبّت کی کہانی ہے تنفّس کی روانی میں
برستی ہے شرابِ ارغواں رِل مِل کے پانی میں

بدلتی ہیں گھٹائیں یوں قبائیں آسمانوں پر
سنہری حاشیے چڑھتے ہیں دل کی داستانوں پر

فلک پر نور کی قندیل یوں رُک رُک کے جلتی ہے
عروسِ نو کوئی جس طرح دھیمی چال چلتی ہے

گھٹا کے پیرہن پر برق جس دم تھرتھراتی ہے
مجھے گذری ہوئی راتوں کی میٹھی یاد آتی ہے

وہ میرے غم کدے میں آج اگر بھولے سے آجائے
تو ننھی بوندیوں سے میرے دل کا داغ دھل جائے

اختر ہوشیارپوری

واہمہ

کردار

۱۔ خداوند ۔۔۔ ۲۔ حُسن ۔۔۔ ۳۔ ہوس
۴۔ رحم ۔۔۔ ۵۔ محبت ۔۔۔ ۶۔ نفرت
۷۔ یاس ۔۔۔ ۸۔ استدلال ۔۔۔ ۹۔ اُمید
۱۰۔ خوف ۔۔۔ ۱۱۔ حرص ۔۔۔ ۱۲۔ اسرافیل (ایک فرشتہ)
۱۳۔ کروبی (دوسرا فرشتہ)

تاریکی کی طاقتیں

پہلی ۔۔ دوسری ۔۔ تیسری
چوتھی ۔۔ پانچویں ۔۔ چھٹی

۔ اِن کے علاوہ ۔

لاتعداد پرندے ۔ سانپ ، مچھلیاں ، چوپائے ، انسان ، پھول ، درخت ، ستارے ، سورج ۔

پہلا سین تخلیق

منظر ۔ (تاریکی اور لامحدود فضا ۔ وقت کی ابدیت ۔ خداوند ایک جامد و ساکن طاقت کی صورت میں جلوہ افگن ہے ۔ یکایک ایک حرکت سی پیدا ہوتی ہے :

ایک عظیم پیکر بادلوں میں نمودار ہوتا ہے ۔ اور فضا میں پھیل جاتا ہے پیکر کے اعضا نمودار ہوتے اور غائب ہو جاتے ہیں کبھی بازو نظر آتا ہے کبھی ٹانگ ۔ ابروؤں اور رخساروں کا ایک دھندلا سا نقشہ نمودار ہو کر غائب ہو جاتا ہے ۔ وقت کی ابدیت بھی یکایک ختم ہو جاتی ہے پھر ایک واہمہ ۔ روشنی مادی صورت اختیار کر لیتی ہے اور معبدوں کے مینا ۔ دوں کی شکل میں نمودار ہوتی ہے ۔ چمکتے ہوئے سورج اور شہاب ثاقب خداوند کے سر کے گرد گردش کرنے لگتے ہیں عجیب و غریب مخلوقات نمودار ہو رہی ہے ۔۔۔ جانور ، پرندے مچھلیاں سینگوں والی اور پردار مخلوق ۔ وہ خیالات کی طرح نمودار ہوتے اور غائب ہو جاتے ہیں ۔ خداوند آنکھیں بند کئے عرش معلی پر متمکن ہے ۔ وہ اپنے خیالی بازو پھیلا دیتا ہے اور پھر چہرے پر ہاتھ پھیرتا ہے ۔ چہرے کی حالت پر بار بار تغیرات ہوتے ہیں)

خداوند ۔ قہ ، قہ قہ ! قہ قہ قہ ! [پیچھے کی طرف جھک جاتا ہے سر کے تھوڑے حصے کے سوا باقی کچھ نظر نہیں آتا]

حسن (ایک تخیل) [خداوند کے دماغ سے ایک پیکر خیالی نکل کر مادی صورت اختیار کرتا ہے] خداوند تم نے مجھے پیدا کیا ۔ میں تمہارے تخیل کی تکمیل ہوں ۔ اور تمہارے خیالی پیکر کی خوش کن تصویر ۔۔۔ میری بھی پرستش ہو گی ۔۔۔ ہاں پرستش ! [گھومتے ہوئے اور تغیر پذیر کرنوں کے ساتھ حرکت کرتے ہوئے ایک نورانی تبسم اس کے لبوں پر نمایاں ہے اور وہ دونوں ہاتھ اٹھاتا ہے]

خداوند ۔ [اپنے آپ کو مادی صورت میں ظاہر کرتے ہوئے ۔ چہرے پر ایک پرہیبت مسکراہٹ ۔ اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتا ہے ۔ آنکھیں ظاہر ہوتی ہیں

اور حسن کو بغور دیکھتا ہے] کیا میں نے تمہیں پیدا کیا —— ؟ قہ قہ قہ!
[وہ اپنے بھڑکیلے بالوں پر ہاتھ پھیرتا ہے] میں تمہیں بھول نہیں سکتا!
میں تمہیں بھول نہیں سکتا۔ تم حسن ہو! [یکایک اس کی حالت تغیر
پذیر ہونے لگتی ہے۔ اس کے چہرے پر ایک خوفناک ہیبت ظاہر
ہوتی ہے جس پر کل ابدیت کا اثر ہے —— آہستہ آہستہ وہ
غائب ہونے لگتا ہے —— ہوس ظاہر ہوتی ہے۔ ایک منحوس خیال
لاٹھی ٹیکتے چلی آ رہی ہے۔ مکروہ جسم، آنکھوں سے خوف ٹپک رہا ہے]

ہوس۔ [لاٹھی زور زور سے فرش پر مارتے ہوئے] میری اطاعت ہو گی! میری
اطاعت ہو گی! خداوند تم نے مجھے اپنے غضب سے پیدا کیا۔
جنگ و جدل ہوں گے۔ جنگ —— جنگ!! [وہ اکڑ کر ادھر ادھر
گھومتی اور گھورتی ہے]

خداوند۔ [تغیر —— اطمینان چہرے پر ظاہر ہوتا ہے۔ اور وہ ہوس کو دیکھتا
ہے] کیا میں نے تمہیں پیدا کیا؟ —— اُف! میں تکان محسوس
کر رہا ہوں! تکان! .... [وہ بازو پھیلا دیتا ہے] لیکن ٹھہرو!
میں اکیلا ہوں۔ تم یہیں رہو —— [وہ اٹھ کر بیٹھ جاتا ہے۔ اور ارض و
سما کی گہرائیوں اور بلندیوں پر چھا جاتا ہے۔

حسن۔ [سورجوں کے ہار سے کھیلتے ہوئے] میری پرستش ہو گی! میری
پرستش ہو گی!!

[وہ خوشی سے گنگناتا ہے]

خداوند۔ [ایک تغیر —— آنکھیں گویا دیو کا غصہ ہیں ——] ابدیت!
ابدیت! قہ قہ قہ! ابدیت! یہ ایک خواب ہے ——۔ ایک واہمہ
[وہ ڈگمگانے لگتا ہے۔ بڑے بڑے سیارے بے پروائی سے گر پڑتے ہیں اُس
کو زمان اور مکان کا خیال آتا ہے اور وہ دونوں حاضر ہو جاتے ہیں۔
وہ مکان و زمان میں ڈگمگاتے ہوئے پھیل جاتا ہے۔ اس کے ابرؤوں
سے نفرت، یاس، رحم، امید اور خوف ٹپک پڑتے ہیں۔ امید اور
خوف کی بڑی بڑی گول آنکھیں ہیں اور دونوں کے منہ کھلے ہیں۔
یکایک فضا میں عجیب و غریب مخلوق کے بادل کے بادل نمودار
ہوتے ہیں۔ خداوند کے تخیل کی مادی صورتیں۔ سورج۔ جہان
—— بجلیاں۔ پرندے۔ سانپ۔ مچھلیاں۔ چوپائے۔ انسان ——
ان گنت مخلوق، انسانی ادراک سے بالاتر۔ فضا میں ایک شور و غوغا
بپا ہو جاتا ہے —— دھم دھم۔ چیخیں اور غل غپاڑہ —— انسان آگے
بڑھتا ہے اور اس کے پیچھے خود اس کا تخیل ایک دھند کی صورت
میں چلا آ رہا ہے۔ وہ خود صورت پیدا کرتا ہے۔ مگر خداوند کا تخیل
اس کی صورتوں کو مٹا دیتا ہے۔ خداوند اپنی اس مخلوق کو دیکھ کر ہنستا
ہے۔]

حسن۔ [ناچتے ہوئے] میری پرستش ہو گی! میری پرستش ہو گی!!

ہوس۔ [اس کے پیچھے بے چینی اور ڈراؤنی صورتوں کے بادل ہیں] خداوند
کی قوت کی مظہر میں ہوں اور اس کی طاقت کا تخیل۔ میں اس کے
غصے کی مادی تصویر۔ جدوجہد کی دیوی۔ قہ قہ قہ! [قہقہہ لگاتی ہے]
میری اطاعت کرو۔ میری ہی اطاعت —— میں تباہی کا بیج
بوؤں گی —— ہر طرف یاس پھیلا دوں گی۔ قتل و غارت ہوں
گے۔ تباہی —— آگ —— قہ قہ قہ! [قہقہہ]

خداوند۔ [وحشت سے —— اس کے چہرے پر غضب نمودار ہوتا ہے]
قہ قہ قہ! میں تمہارا خدا ہوں۔ مالک کل۔ رب اکبر۔ میں اپنے خواب
کی آپ ہی تعبیر ہوں۔ یہ سب میری مخلوق ہے [وہ فضا میں ہر
طرف دیکھتا ہے۔ سامنے عجیب و غریب مخلوق حاضر ہے] قہ قہ قہ!
میرا آرٹ! محبت! امید! موت! میرا خواب تمہارا خواب ہو گا! قسمت
تقدیر اور مصیبت! میں خدا ہوں، ازل سے آخر تک۔ ابد، عقل
کل! قہ قہ قہ۔ [ہنستا ہے۔ ہنسی میں غصہ ہے۔ غصہ خوشی سے بدل جاتا
ہے۔ ایک آہ —— اور پھر ایک نہ ختم ہونے والا قہقہہ ——]

رحم۔ [محبت سے] ہم خداوند کی مخلوق ہیں۔ ہم ایسا نہیں کر سکتے!

محبت۔ ہرگز نہیں۔ اُس کام کے سوا جسے وہ چاہے ہم کچھ نہیں کر سکتے۔

رحم۔ [امید سے] کیا تم بھی ایسا نہیں کر سکتے؟

امید۔ ہرگز نہیں اُس کام کے سوا جسے وہ چاہے، ہم کچھ نہیں کر سکتے۔

نفرت۔ [یاس کے ہاتھ پر تھپکی دیتے ہوئے] آؤ ہمیں ان سے واسطہ ہی کیا
ہے! ہم بھی خداوند کی مخلوق ہیں۔ بالکل ایسی ہی!

یاس۔ ہاں ہاں! ہم خداوند کے تخیل ہی کا نتیجہ ہیں۔ مگر یہ —— خداوند
کو ابدی نیند سو جانا چاہئے —— ابدی نیند ——

خداوند۔ [ڈگمگاتے ہوئے] قہ قہ قہ! قہ قہ قہ! میں خدا ہوں میں اپنا خواب
آپ ہوں! میں نے اپنے عجائبات آپ پیدا کئے۔ لامحدود خوشیاں
اور لامحدود خوف! قہ قہ قہ! [دیوانہ وار ڈگمگاتا ہے]

حسن۔ خداوند میرے لئے عشق کا مندر تعمیر کیجئے —— وہاں میری پوجا ہو

ہو جا!!

ہوس۔ خداوند تو نے بہت سے جہان پیدا کر دیے۔ ان میں افواج ہوں ــــ بہت سے جہان ــــ اور افواج کے ٹڈی دل۔ میری ان پر حکومت ہوگی ــــ حکومت! قتل! آگ!

محبت۔ رب اکبر میرے لئے پھول۔ سکون اور امن۔ چند پُربہار وادیاں جن میں روپہلی ندیاں بل کھاتی ہوئی رواں ہوں۔ چند نغمات ــــ خداوند ہوس کی دعا کو قبولیت نہ بخشیو۔ اس سے دنیا کا امن تباہ ہو جائے گا۔ جنگ! آہ جنگ!!

نفرت۔ [خداوند کے روبرو آ کھڑی ہوتی ہے] خداوند مجھے اپنے غضب کا ایک ذریعہ بنا دے۔ میں تیری مخلوق میں طرح طرح کے خوف پیدا کر سکوں۔ برائیاں مجھ سے نکلیں۔ مجھے بڑی بڑی بھاری زنجیریں عطا کر اور تاریک مقامات میرے قبضے میں ہوں۔ ناکامیوں اور مایوسیوں کا عذاب پیدا کر۔ عذاب! ــــ اذیت!

رحم۔ اے کریم و رحیم! خوف و نفرت کو اپنی مخلوق سے دور رکھ! مجھے طاقت دے کہ میں تیرے بندوں کے دلوں میں ایک جذبہ بن کر انہیں غضب سے باز رکھ سکوں۔ نفرت کو محبت سے بدل سکوں ہوس کو تباہ کاریوں سے روک سکوں۔ خداوند میں تیری صفت رحیمی کا مظہر ہوں ــــ تجھی سے ہوں!

خداوند۔ (تھکے ہوئے انداز میں) قہ قہ قہ! (ڈگمگاتا ہے)

خوف۔ خداوند مجھے اپنے سائے میں لے لے۔ رحم کی دعا قبول نہ کر۔ مجھے بھول نہ جا۔ میں خوف ہوں، خوف!!

یاس۔ خداوند تم اب آرام کیوں نہیں کرتے۔ سو کیوں نہیں جاتے۔ ہم آخر کس لئے ہیں۔ تیرا تخیل، تیرے تخیل کی تکمیل! نیند! نیند! نیند!

خداوند۔ (ڈگمگاتے ہوئے) کون و مکان۔ وقت، میں نے انہیں پیدا کیا سورج، ستارے میں نے بنائے، محبت، نفرت میری مخلوق۔ امید۔ خوف میرا تخیل۔ حسن! میں نے پیدا کیا ــــ میرا پیدا! قہ قہ قہ!

(وہ ڈگمگاتا ہے اور زور زور سے قہقہہ لگاتا ہے)

حسن۔ (دہشت زدہ ہو کر) میری پرستش ہوگی! میری پرستش ہوگی!!

دوسرا سین۔ زندگی

منظر۔ بادلوں کا ایک حلقہ تمام فضا پر پھیلا ہوا۔ افق پر رنگ برنگ کا نظارہ، ایسا کہ جس سے انسانی آنکھیں نا آشنا ہیں۔ سورج اور ستاروں سے روشنی کی کرنیں پھوٹ رہی ہیں۔ پس منظر میں ایک مسلسل تاریکی۔ ہر طرف ان گنت ستارے اور چاند بادلوں کے پیچھے ٹمٹماتے ہیں۔ فضا میں عرش معلیٰ اپنی پوری شان و شوکت سے استادہ ہے۔ اس پر خداوند جلوہ افروز ہے۔ اس کے ابروؤں سے فکر کے شعلے نکل رہے ہیں۔ وہ مادی شکل میں نمودار ہو رہا ہے۔ اس کے سامنے مختلف جذبات اور تخیلات ناچ رہے ہیں۔ یعنی حسن، محبت، رحم، امید اور شعور۔ رنگین سائے۔ آگے بڑھتے ہیں۔ ان کے پیچھے انسانوں۔ حیوانوں اور عجیب و غریب مخلوقات کا ایک جم غفیر ہے۔ عرش کے اوپر دو فرشتے ایک دائیں اور ایک بائیں۔ نور کی کرنیں پھینک رہے ہیں۔ پس منظر میں ہوس نمودار ہوتی ہے۔ اس کے گرد نفرت۔ خوف۔ لالچ اور یاس کھڑے ہیں۔ ان کے پیچھے تاریکیاں۔ بادل بجلیاں اور خداوند کی وہ مخلوق ہے۔ جن کے ذریعے وہ اپنے قہر کا اظہار کرتا ہے]

اسرافیل اور کروبی۔ [اپنے پروں کو ہلا ہلا کر پنکھا کر رہے ہیں] قابل ستائش ہے تو اے خالق اکبر اے مالک ارض و سما! تو اب تخیلی حالت سے بیدار ہو جا۔ تیری حقیقت قابل تعریف ہے اے ذوالجلال!

حسن۔ [ایک نورانی کرسی پر متمکن ہے۔ اور عرش معلیٰ سے بالکل قریب] خداوند کیا میں تیرا حسن نہیں! تیرا حسن اور تیرا پر تو۔ تیرا سب سے پہلا خیال۔ ازل سے ابد تک رہنے والا۔ تیرا ایک ادنیٰ سا اشارہ تیری مخلوق کو میری پرستش پر آمادہ کر دے گا۔ تیرا ارادہ انہیں حسن کو سب سے زیادہ عزیز رکھنے پر مجبور کرے گا۔

خداوند۔ [اسے دیکھتے ہوئے] میرا حسین خیال ــــ خوش کن تخیل۔

ہوس۔ [ایک بھاری زرہ بکتر پہنے ہوئے گویا ایک ہیبت ناک دیو معلوم ہوتا ہے۔ اپنے آپ سے] ہمیں انتظار کرنا ہوگا۔ انتظار! وہ اب ہماری طرف متوجہ نہیں۔ اس کے خیالات کا رخ دوسری طرف ہے۔ دوسری طرف حسن، امید اور امن ــــ کمزوریاں۔ خداوند تیری چند کمزوریاں ــــ یہ دو فرشتے محض پر پھڑپھڑانے والے۔ تیری بے جا تعریف کرنے والے۔ اس وقت حسن کا دور ہے۔

امید، شعور اور رحم اس کے قدموں میں پڑے ہیں۔ اس کی مخلوق
— بے وقوف مخلوق والہانہ حسن کی طرف بڑھ رہی ہے۔

خداوند۔ [شانِ کبریائی سے چاروں طرف نگاہ دوڑاتا ہے۔ اور حسن سے مخاطب ہوتا ہے] تو اب تو خوش ہوگا۔ میں نے تیرے لئے سب کچھ پیدا کیا۔ خواب! خواب! پرلطف اور پرسکون خواب — تخیل کی بلندیاں جنون افزا — حسن اور جنون — میں خود حسن ہوں اور خود ہی جنون —

حُسن۔ خدائے لایزال — میں تیرا ہی پرتوِ اولیں ہوں۔ خالقِ ارض و سما تُو ادراک سے بالاتر ہوتے ہوئے بھی حسین ہے تو جمیل ہے۔ تیرا جنون کتنا فرزانہ ہے اور میں — تیرا پرتو — جمیل — حسین، خداوند تیری نیند ارض و سما کو تباہ کر دے گی۔ تیری پرستش ہوتی ہے — میری بھی پرستش ہوگی!

خداوند۔ اے میرے کن کی تفسیر میرا جنون کتنا پرلطف ہے۔ تیرے لئے زمان مکاں کی قید نہیں تو میری کائنات کا ایک حسین خواب ہے۔ جس کی انتہا نہیں۔ مگر میرا جنون — کیا وہ ایک محدود رنج نہیں؟

حُسن۔ [بے پروائی سے] خداوند ایسا خیال نہ کر۔ تیرا جنون ایک خواب — حسین خواب۔

خداوند۔ [فلسفیانہ لہجے میں] میں کیا ہوں! تم کیا ہو! یہ کیا ہیں! [وہ اپنا دراز ہاتھ ہلاتا ہے] میری "کن" کا نتیجہ! میرا مسلسل خواب — اسے تم شیریں خواب کہتے ہو! نہ نہ نہ۔ شیریں خواب — میں نے تخلیق کی کنجی گم کر دی ہے۔ گم کر دی ہے! [وہ زور زور سے ہنستا ہے مگر اس کی ہنسی سے ایک افسوس نمایاں ہے]

ہوس۔ [پس منظر میں گنگناتی ہے] کنجی گم کر دی — کنجی گم کر دی —

حُسن۔ خداوند ایک حسین خواب! شیریں اور حسین — خداوند اب نہ سو! کائنات کا نظارہ کتنا دلفریب ہے۔ [مسکراتا ہے]

ہوس۔ [بے چینی سے] خداوند کا خواب بھی کیا ہے؟ ہم خواہ مخواہ غم سے نڈھال ہو رہے ہیں [وہ اپنا زرہ بکتر آہستہ آہستہ ہلاتی ہے]

رحم۔ خداوند تیری عنایات بے پایاں ہیں اور تیرا کرم بے حساب — اپنی مخلوق پر اپنی رحمت نازل فرما۔ تیرے قہر سے تیری رحمت زیادہ —

تاریکی کی قوتیں [یک زبان ہو کر] اے امید! — اے محبت! — اور اے رحم! تم سب دور ہو جاؤ۔

حسن۔ [کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور اپنے ابروؤں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے] خداوند میں تیری سب سے پہلی تخلیق ہوں۔ یہ سب میرے بعد پیدا ہوئے [امید، رحم اور شعور کی طرف اشارہ کرتا ہے] میں تیرے تخیل کا پہلا شاہکار ہوں۔ تیرے حسن کا پرتو — خداوند مجھے بھول نہ جانا۔ ہوس اور نفرت — تیری مخلوق کو تباہ کر دیں گے اور مجھے بھی — مجھے بھی، [مسکراتا ہے]

تاریکی کی قوتیں۔ [کڑک کر] حسن — حسن کی حقیقت ہی کیا ہے۔ خداوند تو ہر بات پر قادر ہے۔ ہر چیز فانی ہے،

خداوند۔ حسن، حسن! آخر ہر چیز کو فنا ہوگی۔ تیری آنکھیں — ان کی مستی — حسن اور جنون۔ سب فانی۔

ہوس۔ [غصے سے] خداوند اونگھتا ہے اور مجھے بھول گیا ہے۔ میں اس کی تقدیر۔ اس کی قوت اس کا قہر اور اس کی جبروت۔ حسن اس کا منظورِ نظر مگر میں — مجھے انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اس کا غضب ابھی خوابیدہ ہے — اس کا قہر کب بیدار ہوگا۔ خداوند میری طرف دیکھ — میں تیری طاقت کی مظہر ہوں، اے نفرت! اے غصے! یاس اور خوف! ادھر آؤ، ادھر آؤ اور میرے پاس بیٹھو

خوف۔ اے خداوند میں تیری مدد مانگتا ہوں۔

حسن۔ [ہوس سے غصے میں] وہ تیرا خیال کرے۔ جس کا نتیجہ! تباہی۔ بربادی۔ طوفان۔ قتل و غارت، کیا یہی ہے تیری طاقت کا انجام میں — حسن۔ نور اور نغمے میرے فرشتے۔ مگر تیرا صرف ایک تاریک سایہ، موت اور تباہی — خداوند! اسے اپنی مخلوق سے دور رکھ۔ یہ تیرے چمن زار کو جلا کر خاک کر دے گی تباہ کر دے گی، تاریکی — تاریکی کا سایہ . . . . .

ہوس۔ [غصے سے] خداوند کیا میں تیری طاقتوں کی مظہر نہیں ہوں؟ کیا قہر، جبروت، قوت، موت یہ سب تیری صفات نہیں؟ اور میں — اور میں ان کو حرکت میں لانے والی! —

حسن۔ مگر میں — محبت اور پیار کا مکمل پیکر۔ تیرا نور، راحت اور نغمات میری ہر سانس سے پھوٹے پڑتے ہیں —

نفرت۔ خوف۔ حرص۔ یاس [مل کر] خداوند! ہم سب بھی تجھ سے ہی ہیں۔

محبت۔ رحم۔ امید۔ شعور۔ [مل کر] اے رحیم و کریم ہم بھی تجھی سے ہیں۔

دو فرشتے - تو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا - سب تعریف تیرے لئے ہے۔

ہوس - [غصے سے] دور ہو جاؤ — خداوندا، —

خداوند - [حسن سے] ٹھہر تو میرا جمال ہے - ایک ابدی نور اور شیریں خواب — جہاں تو ہو گا وہاں میرا قہر نہیں جائے گا میری تخلیق کی روح! میں تجھے نہیں چھوڑ سکتا حسن! اے حسن! آ بڑھ

[اس کے رخساروں کو تھپکاتا ہے]

پہلا فرشتہ - حسن کی دنیا پر حکمرانی ہو گی!

دوسرا فرشتہ - اور دنیا نغمات سے بھر جائے گی۔

ہوس - [تاریکی میں ایک کانپتا ہوا سایہ] حسن! حسن! مجھے خداوند بھول گیا - ابدیت کا دور دورہ ہے - موت کی گویا ضرورت ہی نہیں رہی —

[سایہ آہستہ آہستہ غائب ہونے لگتا ہے - ہستی نیستی کا جامہ پہن لیتی ہے - فرشتے بازو ہلاتے ہوئے غائب ہو رہے ہیں]

تیسرا سین - موت

منظر - ایک بہت بڑا ایوان، جس کی وسعت انسانی تخیل سے بھی بالاتر ہے - غضب اور قہر کی فوجیں صف بستہ کھڑی ہیں - بڑے بڑے اژدہے لاکھوں کی تعداد میں فرش پر رینگتے نظر آتے ہیں - زخمی اور مجروح لوگ زمین پر تڑپ رہے ہیں خوفناک درندے منہ کھولے کھڑے ہیں - ایک نہایت ہیبت ناک نظارہ — فضا میں ایک آتشیں تخت لٹک رہا ہے جس پر خداوند جلوہ افروز ہے - تخت کے چاروں طرف عجیب و غریب پرہیبت مخلوق ہوا میں اڑ رہی ہے - تخت کے پایوں سے زہریلے ناگ چمٹے ہوئے ہیں - یاس اور حرص ادھر ادھر بھاگے بھاگے پھر رہے ہیں - حسن، شعور رحم - امید اور محبت ایک زرد سایہ بنے ایک کونے میں دبکے بیٹھے ہیں -

ہوس اپنی لاتعداد افواج کے ساتھ تخت کے سامنے کھڑی تباہی کا ناقوس بجا رہی ہے]

خداوند - او ہو ہو ہو! او ہو ہو ہو! موت! موت! اے موت! آگے بڑھ - میری تخلیق کی معراج! اپنا نذرانہ پیش کر - مُردوں کے انبار اور تڑپتے ہوئے لاشے - میرا غضب جوش میں آ جائے - لاؤ لاؤ بے شرمی کے نتائج - مایوسیوں کے انجام - تباہیوں کا اثر - عذاب کے نظارے - اور قتل کے ثمرات - جاؤ - نفرت - غصہ - یاس اور خوف کو ساتھ لیتے جاؤ - زمانے میں برائی کو پھیلا دو - خوب پھیلا دو - کوئی جگہ خالی نہ رہے [تڑپتے ہوئے لاشے دیکھ کر] ان کو اور عذاب دو تاکہ خوب تڑپیں - میرا عذاب عام کر دو —

[خداوند کے الفاظ کے ساتھ تاریکی کی چھ طاقتیں نمودار ہوتی ہیں - اور ان کے ساتھ تاریکیوں کا ایک بے پناہ لشکر ہے]

حسن - [تاسف کی دھیمی آواز سے] خداوند مجھے بھول گیا (کوئی جواب نہیں ملتا)

محبت - [کمزور آواز سے] اور مجھے بھی خداوند — (کوئی جواب نہیں ملتا)

امید - [نرم لہجے میں] خداوندا اور میں؟ — (کوئی جواب نہیں)

رحم - اور میں — (کوئی جواب نہیں)

ہوس - [تاریک بادل میں سے تاریکی کی چھ طاقتیں نمودار ہو رہی ہیں]۔ تم بھی ان کے ساتھ مل جاؤ - اور خداوند کے حکم کی تعمیل ہو۔

پہلی طاقت - (ہزار سر اور بے شمار بازو والی بجلی سے تیز تر) جو ارشاد ہو! قتل -

دوسری طاقت - [یہ طاقت بھی اسی طرح ہزار سر اور بے شمار بازو والی، بجلی سے تیز تر] ارشاد! عذاب —

تیسری طاقت - [یہ بھی ویسی ہی طاقت ہے) ارشاد! تباہی - بربادی - اور تاراجی!

چوتھی طاقت - (اور یہ بھی ویسی ہی ہے) ارشاد! جہاں امن ہو گا - میں وہاں رنج و غم لے کر پہنچوں گا۔

پانچویں طاقت (یہ بھی ویسی ہی ہے) ارشاد! خوشی کو مٹانا میرا کام ہو گا۔

چھٹی طاقت - (اور یہ بھی ویسی ہی) ارشاد کی تعمیل ہو گی! سکون اور محبت دنیا میں سے مفقود ہو جائیں گے

(تاریکی کی طاقتیں پھیل جاتی ہیں)

خداوند - پھیل جاؤ! تباہی بن کر! موت بن کر! میرے حضور پیش کر دو - بربادی آنسو - بڑے بڑے آنسو - بے کسوں کی آنکھوں سے نکلے ہوئے یتیموں کے آنسو - جن میں جگر کے ٹکڑے ملے ہوں - خواب کو مٹا دو تخیل کی دنیا برباد کر دو — تباہی! تباہی! ہر طرف غضب، موت رنج اور درد ہو - زندگی کو ایک مصیبت بنا دو — میرا قہر ہی قہر دنیا پر چھا جائے - جاؤ — جاؤ — (غضب ناک ہو جاتا ہے)

ہوس ۔(تاریکیوں کے بادلوں سے) خدا کے احکامات کی تعمیل ہو! رحم اور
امن کا زمانہ ہو چکا۔ اب بربادی ہوگی۔ سورج کو جلا کر راکھ کر دو۔ خون
اور گوشت میں فساد پیدا کر دو۔ ہستی کو نیستی بنا دو۔ بربادی! بربادی!
بڑھو۔ بڑھو!

تاریکی کی افواج ۔(جھکتے ہوئے) جو ارشاد ہو!

خداوند ۔(بے قرار ہو کر) میرے دائیں والو! میرے بائیں والو! اوپر والو!
اور نیچے والو! پھیل جاؤ! پھیل جاؤ ہر طرف، تباہ کر دو۔ وقت کا
احساس ہی نہ رہے۔ کون و مکاں کا نشان مٹ جائے۔ ہر چیز
کو مٹا دو ـــ مٹا دو!

ایک فرشتہ (زرد کرنوں میں تحلیل ہوتے ہوئے) اے خالق اکبر! اے
مالک ارض و سما! کیا ہمیں تو نے پیدا نہیں کیا ـــ؟ ہم مر رہے
ہیں ـــ اور تو ـــ (غائب ہو جاتا ہے)

حُسن ۔ (کھڑا ہو کر خوابیدہ نگاہوں سے دیکھتا ہے) خداوند تیرا رحم کیا ہوا!
تیرا نور کیوں مدھم ہو گیا! تیرے چمکتے ہوئے سورج اور ٹمٹماتے ہوئے
ستارے، تیرے لہراتے ہوئے کھیت اور مہکتے ہوئے گلستان
وہ سب کیا ہوئے! موت۔ ہر طرف موت! میرے لئے بھی موت!
میں خداوند کا پرتو ـــ اس کے تخیل کا شاہکار ـــ (نا امیدی
کے لہجے میں) اچھا رخصت! (ہوس سے) کیا تم سمجھتی ہو کہ ہماری
موت کے بعد تم زندہ رہوگی۔ ہرگز نہیں۔ میری موت تمہیں خود
بخود مٹا دے گی۔ تم یقیناً مٹ جاؤ گی۔ خداوند ہی کو بقا ہے۔
تاریکی کے بعد ایک بار پھر اُجالا ہوگا۔ موت پیش خیمہ ہے۔ آنے
والی ابدی زندگی کا ـــ سوچو! سوچو! برائی کو قرار نہیں ـــ
وہی نعمات ہوں گے اور زندگی ـــ بلکہ اس سے بڑھ کر ـــ

ہوس ۔(گستاخ لہجے میں) ہوگا! ایسا ہی ہوگا! تیرا سحر ٹوٹ چکا! او طلسم باطل
ہو گیا۔ اب قتل و غارت۔ موت و عذاب کا دور دورہ ہے۔ اب میں
ـــ جو چاہوں وہی ہوگا ـــ میں خداوند کے قہر کی مظہر۔

رحم ۔(حسن کے قریب جا کر) خداوند کو کیا ہو گیا! میں بھی گھل گھل کر مر رہا
ہوں۔ اب کیا ہوگا! امن کہاں گیا؟ دل پتھر ہو گئے ہیں۔ اب
پسیجتے ہی نہیں۔

ہوس ۔ دور ہو! اب تمہیں کوئی نہیں پوچھتا! (رحم سایہ بن کر غائب ہو رہا ہے)

محبت ۔ (ایک زرد سایہ) وہ تمام خیالات جو خوشی کا باعث بنتے
تھے، وہ اب کہاں گئے؟

ہوس ۔ کم بخت دور ہو جاؤ! اب تمہاری ضرورت نہیں (ایک نقطہ
بن کر رہ جاتا ہے)

شعور ۔ اور میں، عقل کل کا ایک ادنیٰ کرشمہ!؟

ہوس ۔ جاؤ! جاؤ۔

امید ۔ مگر میں تو مصیبت زدوں کو چھوڑ نہیں سکتی۔

ہوس ۔ دفع ہو جاؤ۔ خداوند کے قہر کو روکنے والی تو کون! (امید ایک زرد
سا شعلہ بن کر رہ جاتی ہے)

حسن ۔(غرور سے) میں خداوند کا پہلا پرتو ہوں۔ اے ہوس! تیرا یہ غصہ عارضی
ہے۔ تیری بُرائی آخر مٹ جائے گی۔ تجھے بھی آخر فنا ہوگی۔ مگر میں ـــ
میں ہمیشہ سے ہوں اور ہمیشہ رہوں گا۔ حُسن، خدا کا جمال، اُس کا
شاہکار! میں اس میں سے ہوں اور وہ مجھ میں ہے۔ آخر میری ہی پرستش
ہوگی۔ پرستش!

خداوند ۔ زندگی کو ختم کر دو۔ فکر کو مٹا دو۔ حسن۔ امید اور نظام کو درہم برہم
کر دو ـــ زندگی کا انجام یہی ہوگا ـــ بیماری ـــ موت،
موت! آگ، بربادی۔ عذاب ـــ زندگی کا انجام۔

شعور ۔ خداوند کیا ہمارا انجام یہی ہوگا۔ میں جو تیرا نظام تھا، درہم برہم کر دیا جاؤں
گا! میں تیری قوت تھا۔ اب کمزوری کا جامہ پہن لوں گا! اب مجھے نیستی
کی نیند سونا ہوگا! (وہ خداوند کے ابروؤں میں جا کر غائب ہو جاتا ہے)

محبت ۔ میں اس کی خوشی کے فکر کا نتیجہ تھی۔ مجھے بھی فنا کے گھاٹ اترنا ہوگا۔
(خداوند کے ابروؤں میں جا کر غائب ہو جاتی ہے)

امید ۔ خداوند میری صفت محبت اور امن کا محافظ ـــ (غائب ہو جاتی ہے)

حُسن ۔ (زرد رو) میرا مٹنا عارضی ہوگا۔ عارضی ـــ میری پرستش ہو کر
رہے گی (خداوند کے ابروؤں میں بغیر تحلیل ہوئے داخل ہو جاتا ہے)

تاریکی کی پہلی طاقت ۔(داخل ہوتی ہے) خداوند میرا کام مکمل ہو چکا ہے۔ جو کچھ
تیرے دائیں ہاتھ کی طرف تھا، سب مٹا دیا گیا۔

خداوند خوب!

دوسری طاقت ۔(داخل ہو کر) خداوند تیرے بائیں ہاتھ کی طرف جو کچھ تھا تباہ
کر دیا گیا۔

خداوند ۔ خوب!

تیسری طاقت (داخل ہوتی ہے) خداوند جو کچھ تیرے آگے تھا وہ مٹ چکا ہے۔

خداوند۔ خوب۔

چوتھی طاقت۔ (داخل ہوتی ہے) خداوند جو کچھ تیرے پیچھے تھا۔ اُسے
گہری نیند سلا دیا گیا۔

خداوند۔ خوب!

پانچویں طاقت۔ (داخل ہوکر) خداوند! جو کچھ تیرے اوپر تھا۔ اسے برباد
کر دیا گیا۔

خداوند۔ خوب۔

چھٹی طاقت۔ (داخل ہوکر) خداوند۔ جو کچھ تیرے نیچے تھا وہ ختم ہو چکا ہے۔

خداوند۔ خوب!

ہوس۔ خداوند! قہر و جبروت کے مالک تیرے حکم کی تعمیل ہو چکی ہے!

خداوند۔ اوہو ہو ہو! اوہو ہو ہو! میرا خواب! میرے قہر کا کمال! انجام!
اب پھر ابتدا ہو گی! ابتدا! امن!!
(یکایک حالت متغیر ہونے لگتی ہے۔ گویا وہ ماندگی محسوس کر
رہا ہے۔ تخت پر اس کا کچھ حصہ نظر آتا ہے)

پہلی طاقت۔ (خداوند کے دماغ میں غائب ہوتے ہوئے) اب میرا بھی
خیال نہیں رہا خداوند آپ کو! (غائب ہو جاتی ہے)

ہوس۔ (افسوسناک لہجے میں) اب انجام آن پہنچا!

دوسری طاقت۔ (خداوند کے دماغ میں غائب ہوتے ہوئے) خداوند!
اور میں ——— (غائب ہو جاتی ہے)

ہوس۔ (افسوسناک لہجے میں) انجام! حسرت ناک!

تیسری طاقت۔ (خداوند کے دماغ میں غائب ہوتے ہوئے) خداوند!
(غائب ہو جاتی ہے)

ہوس۔ انجام!

چوتھی طاقت۔ (غائب ہوتے ہوئے) خداوند! (چلاتی ہوئی غائب
ہو جاتی ہے)

پانچویں طاقت۔ یہ کیوں خداوند! (غائب ہو جاتا ہے)

ہوس۔ افسوس!

چھٹی طاقت۔ مجھے بھی بھول گئے خداوند! (غائب ہو جاتی ہے)

ہوس۔ آہ! افسوس!

خداوند۔ (آہستہ آہستہ حسن کے خد و خال ظاہر ہوتے ہیں۔ چہرہ اور ابرو
نمایاں ہیں) امن! امن! میرا قہر ختم ہوا۔ ختم! میرا شیریں خواب!

اوہو ہو ہو! (ایک آہ بھرتا ہے۔ درندے۔ اژدہے اور عجیب
مخلوق سب غائب ہو رہی ہے۔ ہوس پر زردی اور مایوسی چھا
گئی ہے۔ وہ مجسمۂ حیرت بنی خداوند کے روبرو کھڑی ہے)

ہوس۔ خداوند! یہ کیا! مجھے بھی تو نے بھلا دیا! ——— مجھے بھی! (غائب
ہو جاتی ہے)

حُسن۔ (ایک ننھا سا ستارہ خداوند کے ابرو میں ٹمٹماتا ہوا) خداوند مجھے
بھی بھول گیا ہے تو! میں تیری پہلی تخلیق ہوں۔ تیرا ابرو! میں تجھی سے
ہوں!

خداوند۔ امن! امن! تو مجھ سے ہے۔ اس لئے مجھ میں ہی رہ (وہ آہ بھرتا
ہے اور آہستہ آہستہ غائب ہونے لگتا ہے)

حُسن۔ (خداوند کی نیند میں غائب ہوتے ہوئے) میری پرستش ہو گی۔
میری پرستش ہو گی۔ (مسکراتا ہے)
(خیالی فضا کی جگہ حقیقت لے لیتی ہے۔ سورج اور ستارے
غروب ہو جاتے ہیں۔ زمان و مکان کی تمیز مٹ جاتی ہے)

(تھیوڈور ڈریزر)

شیر محمد اختر





مجھے اکثر بدہضمی کی شکایت رہتی تھی اور گھر میں اداس پڑی رہتی تھی۔ یہاں تک کہ بچوں کی بھی دیکھ بھال اچھی طرح نہ کر سکتی تھی۔ میں اس قدر کمزور ہو گئی تھی کہ اس کا علاج میری سمجھ میں نہ آتا تھا۔



جب سے میں نے کروشن سالٹ کا استعمال شروع کیا ہے میری تمام شکایتیں دور ہو گئی ہیں۔ میری پرانی بدہضمی کی شکایت اب مجھے پریشان نہیں کرتی ۔ اور اب میں پوری ہمت کے ساتھ گھر کا تمام کام کاج کرتی ہوں اور بچوں سے کھیلتی ہوں۔ زندگی اب بھلی معلوم ہوتی ہے یہ سب کروشن سالٹ کی بدولت ہے۔ کروشن سالٹ صحت کو برقرار رکھنے کے لئے قدرتی جوہر ہے۔ اس میں چھ قسم کے ضروری نمک شامل ہیں جو پھیپھڑوں اور گردوں کو باقاعدہ طور پر عمل کرنے میں مدد کرتے ہیں۔ کروشن سالٹ جسم کے اندرونی اعضا سے تمام قسم کی غلاظت کو دور کرتا ہے۔ اور تمام نظام جسمانی میں انقلاب پیدا کرتا ہے۔ اس کی ایک خوراک کا استعمال اپنا روزانہ کا معمول بنا لیجئے

کروشن سالٹ تمام دوا فروشوں سے ہر جگہ مل سکتا ہے۔

کروشن سالٹ کا شکریہ





فتح

مسافر

نعرے لگا رہے ہو کیوں؟ رقص میں آ رہے ہو کیوں؟
گھی کے چراغ بے شمار آج جلا رہے ہو کیوں؟

سپاہی

ہم پہ خدا کا ہے کرم،
دشمنوں کی فوج کا کوئی جواں نہیں رہا
دشمنوں کے اوج کا نام و نشاں نہیں رہا
جتنے تھے سر اُڑا دیئے جتنے تھے گھر جلا دئے
جشن منا رہے ہیں ہم!

مسافر

تم نے جنہیں مٹا دیا، تم انہیں جانتے تھے کیا؟
کون تھے اُن کے باپ ماں؟ کون تھا اُن کا خانداں؟

سپاہی

یہ تو ہمیں پتہ نہیں، پہلے نہ تھے ملے کہیں،
ہم سے نہ رسم و راہ تھی دیکھی نہیں تھی شکل بھی

مسافر

کاٹ دیں جن کی گردنیں اُن سے تھا بیر کیا تمہیں؟
تم کو بُرا کہا تھا کچھ؟ رنج تمہیں دیا تھا کچھ؟

سپاہی

ایسی نہ بات تھی کوئی ایسا نہیں ہُوا کبھی۔

مسافر

دشمنی نہ رنج تھا پھر انہیں کیوں مٹا دیا؟

سپاہی

پھر انہیں کیوں مٹا دیا؟ اس کا نہیں ہمیں پتا۔
ہم نے کیا جو حکم تھا!

مسافر

اب وہ جواں نہیں رہے اب وہ جہاں نہیں رہا
شہر و دیار مٹ گئے نام و نشاں نہیں رہا
جشن منا رہے ہیں ہم!
آہ! یہ زندگی ہے کیا؟ آہ! یہ آدمی ہے کیا!!

روشن دین تنویر

سیّد صاحب

پچھلے منگل کا ذکر ہے کہ ادھر اسکول کا گھنٹہ بجا اور کام شروع ہوا، اور اُدھر ایک لڑکے کے یکایک مر جانے کی خبر موصول ہوئی۔ اظہارِ غم کے طور پر اسکول فوراً بند کر دیا گیا۔ استاد اور لڑکے شاداں و فرحاں کلاسوں سے نکل پڑے۔ چھٹی تو سبھی کو بھاتی ہے نا۔ اور پھر مرنا جینا تو ہوتا ہی رہتا ہے لیکن غیر متوقع تعطیل کا لطف روز روز میسّر نہیں آتا۔ آن کی آن میں بھرا اسکول خالی ہو گیا۔ دو چار استادوں کے سوا کوئی بھی نہ رہا۔

میں نے سوچا کہ گھر جانے سے پہلے کچھ نہیں تو تازہ اخبارات پر ہی ایک نظر ڈال لوں۔ چنانچہ دو تین روزنامے اکٹھے کئے اور اس خیال سے کہ ان سب کو گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میں دیکھ لوں گا، اسٹاف روم کی طرف چلا۔

وہاں اسکول کے سیکنڈ ہیڈ ماسٹر، سیّد افتخار الدین صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ جس طرح ایک فارغ البال گھرانے کی سگھڑ بی بی اپنا صاف ستھرا پاندان ایک پُر تکلف انداز سے اپنے سامنے رکھے بیٹھی رہتی ہے، اُسی طرح ہمارے سیّد صاحب بھی فرصت کے اوقات میں اپنے پانوں کی ڈبیا لئے بیٹھے رہتے ہیں۔ ہر پانچ منٹ کے بعد ایک پان کھاتے ہیں، اور اس درمیانی وقفے میں ڈبیا ان کے سامنے کھلی رکھی رہتی ہے، جس میں سے کبھی چھالیا کے دانے نکال کر منہ میں ڈال لیتے ہیں، کبھی الائچی، کبھی لونگ اور کبھی انگلی کو چونے میں بھر کر زبان پر پھیر لیتے ہیں۔ اس وقت بھی پان کی ڈبیا اُن کے سامنے موجود تھی۔

"پان حاضر ہے ماسٹر صاحب!" انہوں نے یہ جانتے ہوئے کہ میں پان نہیں کھاتا مجھ سے کہا۔

میں نے رسمی بات کا جواب رسمی انداز میں دیا ——— "شکریہ!"

مگر سیّد صاحب کی طبیعت میں ایک شگفتگی تھی۔ غالباً غیر متوقع تعطیل کا اثر تھا۔

"اجی میاں! پان کھاؤ اور کوئی کام کی بات کرو۔ یہ کیا تم ہر وقت اخبار کے پیچھے پڑے رہتے ہو۔" انھوں نے چھت کی طرف منہ اُٹھا کر کہا۔ ان کا منہ چھلکتے ہوئے ارغوانی ساغر کی طرح پیک سے لبریز تھا۔

ابھی میں کچھ جواب نہ دے پایا تھا کہ وہ کرسی سے اُٹھ کر کمرے سے باہر گئے۔ پیک تھوکنے کے لئے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ سیّد صاحب اخبار نہیں پڑھنے دیں گے اور میں نے پرچوں کو تہہ کر کے رکھ دیا۔

سیّد صاحب نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے اور ڈبیا سے ایک نیا پان نکالتے ہوئے کہا، "آپ اخبار اس کثرت سے کیوں پڑھتے ہیں؟"

"کثرت سے تو نہیں پڑھتا، البتہ ...."

"اماں کوئی اعلیٰ قسم کا لٹریچر پڑھا کرو۔ اس خرافات میں کیا رکھا ہے!"

"ہاں اعلیٰ لٹریچر سے بھی ....."

"ایک وہ مولوی وحید الدین ہیں۔ جب دیکھو اخبار پڑھ رہے ہیں۔ جب دیکھو اخبار پڑھ رہے ہیں۔ انقلاب اور زمیندار کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے۔"

"یہ تو واقعی غلط ہے کہ انسان ....."

"اَرے بابا یہ تو سوچو کہ اخباروں میں ہوتا ہی کیا ہے ...."

اب مجھے یقین ہو گیا کہ سیّد صاحب میری نہیں سنیں گے، اپنی ہی کہے جائیں گے۔ میں بالکل خاموش ہو گیا تاکہ یہ جی بھر کے بول لیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنی گوہر افشانی کا سلسلہ جاری رکھا۔

"یہاں چوری ہو گئی، وہاں ڈاکہ پڑ گیا۔ اس کی عورت بھاگ گئی، اُس کے گھر میں آگ لگ گئی۔ ہندو مسلم فساد ہو گیا۔ بھنگیوں نے ہڑتال کر دی۔ آخر کیا غرض مجھے اور آپ کو ان لغویات سے؟ میاں اس دنیا میں ہزاروں باتیں ہوتی ہیں۔ اب یہ کیا ضروری ہے کہ ہم ان سب باتوں سے واقف رہیں ...."

میں اب خاموش نہیں رہ سکتا تھا۔ سیّد صاحب کے تشدّد کو دیکھتے ہوئے مجھے اپنا عدمِ تشدّد ختم کرنا ہی پڑا۔ میں نے کہا،

"جناب سیّد صاحب! میں صبح کے اخبار کو اتنا ہی ضروری سمجھتا ہوں جتنا صبح کے ناشتے کو۔ جو شخص اخبار نہیں پڑھتا میرے نزدیک وہ اس دنیا میں نہیں رہتا بلکہ ...."

سیّد صاحب نے پھر میری بات کاٹ دی "ارے میاں ماسٹر صاحب! رہنے دو اس فلسفے کو۔ اب کیا میں اس دنیا میں نہیں رہتا؟ آسمان پر رہتا ہوں! لیکن جناب میں نے اپنی زندگی میں کبھی اخبار نہیں پڑھا"۔

سیّد صاحب چھت کی طرف منہ اٹھا کر زور سے ہنسے۔ پھر ذرا سنجیدہ ہو کر بولے "آپ مذاق نہ سمجھئے گا ماسٹر صاحب! میں واقعی بالکل اخبار نہیں پڑھتا"۔

میں سیّد صاحب کی اس محرومی پر ہمدردی کا اظہار کرنے والا تھا کہ مجھے چند سال پیشتر کی ایک بات یاد آ گئی۔

مجھے اس اسکول میں ٹیچر کی حیثیت سے آئے ہوئے تقریباً چھ مہینے ہوئے ہیں لیکن میرا تعلق اس جگہ سے بہت پرانا ہے کیونکہ میں طالب علم کی حیثیت سے بھی کچھ وقت یہاں گزار چکا ہوں۔ تقریباً آٹھ سال پہلے میں اس اسکول کی آٹھویں جماعت میں داخل ہوا تھا۔ سال بھر یہاں رہا۔ پھر میرے والد علی گڑھ منتقل ہو گئے، اور میری بقیہ تعلیم وہیں ہوئی۔ اب خوش قسمتی سے اسی اسکول میں ٹیچر ہو کر آیا ہوں۔ آٹھ سال کے اندر اسکول کچھ سے کچھ ہو گیا۔ نئی عمارت بن گئی، بورڈنگ ہاؤس قائم ہو گیا، لڑکوں کی تعداد کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب بھی نئے آ گئے، اور بیسیوں چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں ہو گئیں۔ لیکن ایک چیز بدستور قائم ہے۔ استاد اگرچہ نئے بھی آئے ہیں مگر جو اُس وقت تھے وہ سب کے سب موجود ہیں اور جیسے پہلے تھے بالکل ویسے ہی اب بھی ہیں۔ یہ میری زندگی کا ایک نہایت بصیرت افروز تجربہ ہے کہ وہ لوگ جو کبھی میرے استاد تھے اب میرے ہم چشم اور ہم مشرب ہیں۔ جن لوگوں کو میں کبھی دور سے دیکھتا تھا اور اُن کی عزت کرتا تھا اب ان کو قریب سے دیکھتا ہوں اور نفرت کرتا ہوں۔ پہلے یہ لوگ میری نظروں میں علم و فضل اور بصیرت اور فطانت کے مجسّمے تھے، اب جہالت، تعصّب اور کم نظری کے بدترین نمونے ہیں۔ سیّد صاحب ہی کو لیجئے۔ یہ اس وقت بھی سیکنڈ ہیڈ ماسٹر تھے، اور سیّد صاحب کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ ان کا پورا نام میں کیا اکثر لڑکے نہیں جانتے تھے۔ ہم ان کو ایک بڑا آدمی سمجھتے تھے۔ ہمارے نوخیز طفلانہ ذہنوں پر یہ ایک باعظمت انسان کی طرح چھائے ہوئے تھے۔ کچھ تو اس لئے کہ ان کی قابلیت کی بڑی دھوم تھی، اور کچھ اس لئے کہ یہ ہمیں نہیں پڑھاتے تھے، بلکہ ان کا فیض صرف اونچی جماعتوں تک محدود تھا۔ میں اپنے بچّی تانگے میں بیٹھ کر اسکول آیا کرتا تھا، کیونکہ گھر اسکول سے بہت دور تھا۔ میرے والد ایک سخت گیر اور ضابطہ پسند طبیعت کے آدمی تھے۔ تانگے والا اُن کے مزاج سے خوب واقف تھا۔ چنانچہ وہ مجھے ہمیشہ وقت سے کچھ پہلے ہی اسکول پہنچا دیتا تھا۔ بلکہ بعض اوقات میں اسکول شروع ہونے سے آدھ آدھ گھنٹہ پیشتر پہنچ جاتا تھا۔ مگر میں پندرہ منٹ پیشتر پہنچوں یا آدھ گھنٹہ پیشتر، سیّد صاحب کو ہمیشہ اسکول میں موجود پاتا تھا۔ اور دفتر کے سامنے چبوترے پر ایک کرسی ڈالے بیٹھے ہوتے۔ ایک جہازی سائز کا کھلا ہوا اخبار اُن کے ہاتھوں میں ہوتا اور وہ اُس کے مطالعے میں منہمک نظر آتے۔ صدر دروازے میں داخل ہونے کے بعد جس طرح دو نیم کے درخت ایک لالٹین کا کھمبا، ایک کنواں اور اسی قسم کی چند چیزیں لازمی طور پر نظر آتی تھیں، اُسی طرح سیّد صاحب بھی اپنے اخبار کے لازمی طور پر بیٹھے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ اُن کو روزانہ اس طرح مصروف مطالعہ دیکھتے دیکھتے میرے ذہن میں یہ خیال راسخ ہو گیا تھا کہ سیّد صاحب ایک بے حد قابل آدمی ہیں۔ اُن کی عظمت اور فضیلت میرے دل پر نقش ہو گئی تھی۔

چنانچہ اب جو انہوں نے یہ کہا کہ میں کبھی اخبار نہیں پڑھتا تو فوراً مجھے وہ آٹھ سال پہلے کی بات یاد آ گئی اور میں نے اُن سے کہا "سیّد صاحب آپ شاید بھول رہے ہیں۔ ایک زمانے میں آپ بہت شدّت کے ساتھ اخبار پڑھا کرتے تھے"۔

"کبھی نہیں — ہرگز نہیں"۔ سیّد صاحب نے نہایت قطعیّت کے ساتھ جواب دیا۔

"آج سے تقریباً آٹھ سال پہلے جب میں یہاں آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا، میں آپ کو روزانہ صبح کے وقت اخبار پڑھتے ہوئے دیکھتا تھا"۔

سیّد صاحب پیشانی پر بل ڈال کر سوچنے لگے۔ "میں بہت سویرے اسکول پہنچ جاتا تھا اور اب جس جگہ حوض ہے وہاں ایک چبوترہ سا تھا۔ آپ کو یاد ہو گا آپ اُس چبوترے پر بیٹھے اخبار پڑھا کرتے تھے — روزانہ اسکول شروع ہونے سے پہلے — تعجب ہے آپ کو یاد نہیں — میں آپ کو تقریباً روزانہ دیکھتا تھا —"

"اوہو — اچھا — ہاں ہاں — میں سمجھا — ارے میاں مجھے اس زمانے میں کرکٹ سے دلچسپی تھی۔ اور میں اسپورٹس کے کالم دیکھا کرتا تھا — لاحول ولاقوۃ — آپ نے بھی کس بات کا ذکر کیا —"

میں نے بھی دل ہی دل میں لاحول پڑھی۔ اس کے سوا اور میں کر بھی کیا سکتا تھا۔

اختر انصاری

حسین ارادے

وہ دیکھو آسماں پر اک ستارہ جھلملاتا ہے — مجھے اس کو جبینِ ناز کی افشاں بنانا ہے

خدا سیرِ فلک کو کہکشاں کی راہ آتا ہے — مجھے پھولوں بھرے رستے سے تم کو گھر بلانا ہے

چھپا کر چاند کو دامن میں بادل مسکراتا ہے — مجھے بھی اس حسیں پہلو میں اک دن مسکرانا ہے

افق پر آتشیں پوشاک میں خورشید آتا ہے — مجھے بھی چھیڑ کر اک دن تمہیں غصے میں لانا ہے

کوئی قوسِ قزح کو آسماں پر جگمگاتا ہے — مجھے کیوپڈ کی اس رنگیں کماں کو آزمانا ہے

زمیں تک ابر بوندوں کے حسیں زینے لگاتا ہے — مجھے اس پر تمہیں لے کر فضا سے دور جانا ہے

تصور آسماں کے اس طرف اک گیت گاتا ہے — مجھے تم کو اسی دھن میں کوئی نغمہ سنانا ہے

وہ دریا تار ہائے موج پہ کچھ گنگناتا ہے — مجھے ان انگلیوں کے ساز پر اک گیت گانا ہے

پہاڑی کے کنارے آبشار اک گیت گاتا ہے — مجھے بھی اک فسانہ نظم میں تم کو سنانا ہے

قسم ہے منظرِ فطرت یہی پیغام لاتا ہے — قسم ہے منظرِ فطرت پہ اک دن تم کو چھانا ہے

ذرا ان منظروں کو اور بھی رنگیں تو ہونے دو!

ذرا میرے تخیل کو طرب آگیں تو ہونے دو!

سلام مچھلی شہری

دو دن کا پیار

یہ دلِ وحشی مرا
طائرِ آوارہ تھا اس کو قفس کی کیا خبر
ایک بے رہرو مسافر منزلوں سے بے نیاز
ایک بچہ — توڑ کر اپنے کھلونے پھینک دے
ایک تتلی، باغ میں ہر پھول کا رس چوس لے-

سادگی کا، تیری معصومی کا، عفّت کا گناہ،
تیرے نازک دل کا، دوشیزہ محبّت کا گناہ
ان رسیلی، مدھ بھری، مدہوش آنکھوں کی مست لقا کا گناہ
تیری دیوانہ بنانے والی صورت کا گناہ

آہ دو دن کے لئے جانے میں کیسا کھو گیا
اک نئی دل میں لگن تھی، مضطرب سا ہو گیا،
ایک ہی معبود کے سجدوں میں لطف آنے لگا
جذبۂ رنگینِ آذر کیا خبر کیوں سو گیا

آہ یہ دو دن کا پیار!
مجھ سے اب مت پوچھ تو جب میں نے کیا سمجھا تجھے

اپنی ہر اک آرزو کا منتہا سمجھا تجھے
ایک اندھی سی محبت، بے خودی، دیوانگی،
میں نے (اُف میرے خدا) اپنا خدا سمجھا تجھے
اب مگر دو دن کے بعد!

توڑ ڈالا ہائے کس کمبخت نے سارا فسوں
اب کہاں ہے میری مدہوشی، کہاں میرا جنوں؟
کس نے مجھ سے چھین لی میری متاعِ بے بہا؟
اس تلاطم میں بھرا ہے موت کا کس نے سکوں!

پھر وہی بے کیف دل ہے، پھر وہی سُونی حیات،
پھر وہ بے معنی سی دنیا، پھر وہی ہیں شش جہات،
وہ جو تھا اک نور ہر ذرّے میں اب ناپید ہے
پھر ہے میرے سامنے اک اجنبی سی کائنات

اب خجل، شرمندہ، تیرے سامنے آیا ہوں میں
زندگی کا ایک موتی نذر کو لایا ہوں میں،
یاد میں اُس شبنمی اُلفت کی ہے تجھ پر نثار
یہ مرا دو دن کا پیار!

نسیم محمود مخمور

دنیائے ادب

تازہ ترین رسائل کے اہم مضامین

کا تذکرہ اور جائزہ

ہمایوں (اگست)

اُس کی خوشی

اردو کے افسانوی ادب میں ان دنوں جو نمایاں ترقیاں اور تبدیلیاں ہوئی ہیں اُن میں غالباً سب سے اہم ترقی افسانے کی اُس صنف میں ہوئی ہے جس کا صحیح نام ہم اب تک تجویز نہیں کر سکے اور جسے اسکیچ کے نام سے پکارنا کچھ موزوں معلوم نہیں ہوتا۔ اسکیچ کا مغربی تصور ایک محدود تصور ہے۔ اور وہ ہماری اس نئی فنی تخلیق سے پورا انصاف نہیں کر سکتا جو مختصر افسانے کی حرکت اور اُبھار اور اسکیچ کی ہمواری اور سکون کا امتزاج پیش کرتی ہے لفظی خاکہ کشی اپنے عروج پر مصوری بن جاتی ہے اور جب نقوش کی زیادہ وضاحت کی جائے اور آرٹسٹ حقیقت پرستی کی طرف مائل ہو تو ہم اس کی تخلیق کو ایک اچھے فوٹوگراف سے تشبیہ دے سکتے ہیں لیکن فوٹوگراف ساکن اور ہموار ہے۔ اُس میں زندگی کی وہ روانی اور نشیب و فراز نہیں پایا جاتا۔ جو ایک اچھے مختصر افسانے کی لازمی خصوصیات ہیں۔ اس کے برخلاف اہل فن کے نزدیک مختصر افسانے کے لئے ایک نقطہ عروج اور مرکزی خیال کا ہونا نہایت لازمی بات ہے اور اسکیچ محض ایک نظارہ ہے۔ ہموار اور خاموش اردو افسانوی ادب میں جو نئی چیز جنم لے رہی ہے وہ اسکیچ اور افسانے دونوں کی دلکشیوں کا مجموعہ ہے، اور اس لحاظ سے نہ صرف ادبیاتِ اردو بلکہ بین الاقوامی افسانوی ادب میں ایک صحت مند اور دلچسپ اضافے کا درجہ رکھتی ہے۔

زیرِ نظر افسانہ (کسی بہتر لفظ کی عدم موجودگی میں اسے افسانہ ہی کہنا پڑے گا) اسی جدید انداز کا ایک شاہ کار ہے۔ لکھنے والے کوئی صاحب نشیام سکندر ہیں۔ اب سے پہلے اُن کی کوئی تحریر ہماری نظر سے نہیں گذری اس لئے جب ہم نے ان کے موجودہ کارنامے کا جائزہ لینا شروع کیا تو مصنف کا کوئی اثر ہمارے ذہن پر موجود نہیں تھا لیکن جوں جوں ہم آگے بڑھتے گئے۔ مطالب کی گہرائی اور بیان کی قوت ایک اُٹھتی ہوئی آندھی کی طرح ہم پر چھاتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ ہم افسانے کی تیرہ و تار فضا میں کھوئے گئے اور جب انجام کو پہنچے تو معلوم ہوا کہ فن کار نے ایک چلتا ہوا خاکہ لکھ کر پڑھنے والے کے دل و دماغ کو ایک کامیاب فریب میں مبتلا کیا ہے۔

امجد اور خلو، دو سیاسی قیدی ہسپتال کے اُس حصے میں صاحبِ فراش ہیں جسے سل وارڈ کہا جاتا ہے۔ دونوں کی زندگیاں آہستہ آہستہ ختم ہو رہی ہیں، یاس کے بے رحم عفریت نے انہیں اپنے پنجوں میں بُری طرح جکڑ رکھا ہے دنیا کی عملی قدریں اپنی پوری عریانی کے ساتھ اُن کی جوان مگر ذہنی طور پر بوڑھی نگاہوں کے سامنے آ چکی ہیں اور درد اپنی آخری حدود سے گذر کر دوا بن جانے والا ہے۔ ایسی حالت میں دماغ کا ذرا سی تحریک پر شعلہ زار بن جانا کوئی غیر معمولی بات نہ ہوتی، مگر سل کے تیسرے درجے میں گھلنے والے مریضوں کا ذہن بھی ایک تودۂ خاکستر کی سی زندگی رکھتا ہے۔ جس کی چند چنگاریوں کی روشنی میں وہ اپنے بیتے ہوئے دنوں کی یادیں تازہ کرتے ہیں:۔

"کیا سوچ رہے ہو امجد"

"یہی کچھ اپنی ختم ہوتی ہوئی زندگی کے متعلق"

"یعنی اپنی موت کے متعلق"

"نہیں، اپنی ختم ہوتی ہوئی زندگی کے متعلق" امجد نے اصرار کیا، موت تو زندگی میں آتی ہے، اور جب زندگی ختم ہوتے ہوتے ختم ہو جائے تو موت کہاں"

"میں کہتا ہوں امجد، آخر ہم پیدا ہی کیوں ہوئے میرا مطلب یہ ہے کہ میری زندگی اتنی فضول، نکمی اور بے مطلب رہی ہے کہ کبھی کبھی تو مجھے اپنے بنانے والے پر ہنسی آتی ہے..... کیا تمہیں بھی آتی ہے امجد..... کبھی..... کبھی"

جگو ایک طویل عرصے تک انتظار کرتا رہا، آج اُسے تیز بخار تھا اس کا ماتھا پھنکا جا رہا تھا، اسے اپنے رخساروں کے سیاہ گڑھوں میں انگارے سے بھرے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ یکایک وہ کھانسنے لگا اور ایک دو منٹ تک لگاتار کھانستا رہا، اس کھانسی نے اُس کے دونوں پھیپھڑوں کو چھلنی بنا دیا تھا۔ جب اُس کی کھانسی بند ہوئی تو امجد نے اس کے سوال کا جواب دیا "نہیں کبھی نہیں، مجھے تمہارے بنانے والے پر اعتماد نہیں..... ہنسی کیسے آئے اور....."

وہ خاموش ہو گیا۔

ایک لمبے وقفے کے بعد جگو نے پوچھا "کیا سوچ رہے ہو۔ امجد؟" امجد نے کہا "میری زندگی کے تار تو مدت سے ٹوٹ چکے ہیں لیکن آج کئی بھولی بسری باتیں پھر ستا رہی ہیں۔ آج نجانے ان ٹوٹے ہوئے تاگوں کو کیوں پھر اکٹھا کر رہا ہوں، کیا حاصل ہو گا؟"

ایک لمبے وقفے کے بعد امجد نے کہا "تمہیں آج کی تاریخ یاد ہو گی؟"

جگو نے کہا "ہاں ۱۳ر نومبر"

امجد نے دھیمی آواز میں کہا "آج کے دن میری شادی ہوئی تھی۔ اس بات کو دس سال گذر چکے ہیں۔"

جگو اور امجد دیر تک باہر پھیلی ہوئی چاندنی کو دیکھتے رہے وارڈ کے باہر سبز گھاس کے قطعے تھے اور پھولوں کی کیاریاں اور ان کے پرے ہسپتال کی بڑی دیوار کے ساتھ لگے ہوئے پیپل کی ایک ٹہنی پر چاند اپنی ٹھوڑی رکھے کچھ سوچ رہا تھا۔ جگو کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے جگو نے بے کسی کے لہجہ میں کہا "مجھے آج تک کسی عورت نے پیار نہیں کیا۔"

اس پارے کی سب سے نمایاں خصوصیت کردار اور ماحول کی مکمل ہم آہنگی ہے سِل کے وہ مریض جو اپنی تلخ زندگی کے آخری دن قید خانے میں گذار رہے ہیں۔ اُس قید خانے میں، جو کبھی انہیں آزادی کی دیوی کا مندر نظر آتا تھا، اور جہاں سے اب ان کے جنازے نکلنے والے تھے۔ اُن کی آنکھوں کے سامنے سے زندگی کے بہت سے پردے ہٹ چکے تھے اور اب وہ سوچ رہے ہیں۔ بس سوچ رہے ہیں اور سوچنے کے سوا وہ اور کر ہی کیا سکتے ہیں۔ اُن کی سوچ مایوسی کی تلخی اور بے بسی سے رچی ہوئی ہے

آہ وہ کن کن جاں افروز امیدوں کو لے کر قربانی کے میدان میں کود پڑے تھے۔ اور قید و بند کی سختیوں کو انہوں نے کیسی خندہ پیشانی سے خوش آمدید کہا تھا، لیکن وقت گذرتا گیا، اُن کے متموّل ساتھی اور غیر مخلص رہنما قید خانوں میں دادِ عشرت دینے کے بعد ایک ایک کر کے رہا ہو گئے غریبوں کی قربانیاں رنگ لائیں، اور وہ لوگ بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز ہو گئے جنہوں نے کبھی جیل کی صورت بھی نہیں دیکھی تھی لیکن جس طرح سپاہی کا کام میدان میں کام آنا ہے "تاکہ اُس کا جرنیل فتحمندی کا پرچم اڑاتا ہوا غنیم کے شہر میں داخل ہو، اسی طرح سیاسی کارکن اپنی صحت اور اپنی زندگی کی قربانی دیتا ہے "تاکہ لیڈر شہرتِ عام اور بقائے دوام پائے۔ اُس کی امیدیں ناکام، اُس کی آرزوئیں شکستہ اور اس کی ادنیٰ مزدوریں بھی تشنۂ تکمیل رہتی ہیں۔ لیکن از بسکہ اس دنیا میں جینا ایک ہی بار ہے۔ اس لئے جب زندگی کا جام لبریز ہو رہا ہو تو تمام بنیادی جذبات اور ابتدائی احساسات جنہیں پہلے ایک بلند نصب العین نے وقتی طور پر دبا دیا تھا۔ اپنی تاریک خلوتوں سے پھر اُبھرنے لگتے ہیں اور ایک شدید ردِ عمل سے رخصت ہونے والی روح پر چھا جاتے ہیں اور پھر وہ قربانیاں زندگی کی خوفناک غلطیوں کا جامہ پہن لیتی ہیں اور ناکام مرنے والے کو اس نظام، اس کائنات اور حتیٰ کہ خدا کی طرف سے بھی یکسر مایوس کر دیتی ہیں اور اُسے

پہلے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

اسی لئے افسانے کا امجد، جگو کے بنانے والے پر نہیں ہنستا وہ دنیا کی ہر چیز پر سے اعتماد اٹھا چکا ہے۔ رضیہ اُس کی منکوحہ ایک وفادار سردار کی لڑکی ہونے کے باوجود تین سال تک جیل کے دروازے پر اُسے دیکھنے کے لئے آتی رہی اور

"اُس کے رسیلے ہونٹ خشک ہوتے گئے۔ کیونکہ خوبصورتی روٹی سے پیدا ہوتی ہے، اور جب روٹی نہ ملے تو خوبصورتی مر جاتی ہے"

اور خواجہ کریم الدین جو ایک بڑے زمیندار تھے جب تین سال کے بعد رہا ہوئے تو امجد نے اپنی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے انہیں رضیہ کی مدد کرنے کو کہا..... انہوں نے رضیہ کی "بہت مدد کی"..... اور رضیہ اب بھی خوبصورت ہے"۔ پھر جب رضیہ بھی اُس کی نہ رہی تو خدا پر کیونکر اعتماد کیا جا سکتا تھا۔ آخر ہر سبب اپنے نتیجے سے پہچانا جاتا ہے اور جب نتائج کا یہ حال ہو تو مایوس انسان سبب پر کب تک بھروسہ رکھے۔

..... ہاں، جگو کا مسئلہ جداگانہ تھا، وہ لڑکپن کے جوش میں جب اس کے کھیلنے کھانے کے دن تھے، ماسٹر اُدھم سنگھ جی مالک قومی بنک کے لکچروں سے متاثر ہو کر جیل یاترا کو آ گیا تھا اور پھر یہیں کا ہو لیا تھا کیونکہ کرنل اروڑا صاحب

کی معلومات کے مطابق اس کے لئے کسی سنٹیوریم میں کوئی بیڈ خالی نہ تھا۔ اور قید کی ادلیں مدت گذارنے سے پہلے، اس کے ماں باپ وبائے طاعون کی نذر ہو چکے تھے اور وہ خود شدت مشقت کی تاب نہ لاکر تپ دق کی —— ان واقعات کو بھی کئی سال گذر چکے تھے اور اب امجد اور جگو مل کر طوفانِ حیات کو عبور کر رہے تھے، کشتی ساحل کے قریب تھی، پچھلا ساحل دھندلا ہو کر نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا، اور یہ ۱۲ ر نومبر کی رات تھی، امجد کی شادی کی رات، سردیوں کی چاندنی، دلوں میں سوز، اور فضا میں سوز، اور

"پیپل کی ایک ٹہنی پر چاند اپنی ٹھوڑی رکھے کچھ سوچ رہا تھا۔ جگو کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے بے کسی کے لہجے میں کہا "مجھے آج تک کسی عورت نے پیار نہیں کیا"

جگو، وہ سولہ سال کا کھیلنے کھانے والا لڑکا جس کی سب سے بڑی خواہش اور اس کی تکمیل کی تصویر صاحبِ افسانہ یوں کھینچتے ہیں:۔

"ایک دفعہ جیل میں میرا جی گنا چوسنے کو چاہا اور میری آنکھوں میں اپنے کھیتوں کی تصویر پھر گئی۔ میں نے دیکھا کہ ایکھ کے کھیت تیار ہیں ..... کاٹ کاٹ کر گٹھے بنائے جا رہے ہیں۔ میرا باپ بیل گاڑی میں بیل جوت رہا ہے ..... اور میری ماں (سسکیاں لیتا ہے) ..... ایکھ کے گٹھے اٹھا اٹھا کر بیل گاڑی میں رکھ رہی ہے ..... پھر میں نے دیکھا کہ کولھو میں گنوں کا رس نکالا جا رہا ہے اور ایک طرف چمکتے ہوئے الاؤ پر کڑھائی میں تازہ اور سونے جیسا پیلا گڑ تیار ہو رہا ہے اور میں بے قرار ہو گیا اور میں نے وارڈر کے سامنے ہاتھ جوڑے اور اس سے کہا کہ مجھے کہیں سے تھوڑا سا گڑ لا دو۔ اور اس نے میری پیٹھ پر ایک لات جمائی .....:"

اور جب جگو جوان ہوتا ہے، تو فطرت اُس کی بسل زندگی کی بھی پروا نہیں کرتی، اس کی حُبِ وطن بھی جذبۂ جنسی سے دب جاتی ہے اور وہ اپنی زندگی کے آخری دور میں جس نامرادی کا سب سے زیادہ شکار ہے وہ عورت سے محرومی ہے۔ اور یہاں فن کار نے اخلاص اور جرأت کے کمال کا مظاہرہ کیا ہے۔ دیکھئے:۔

"ایک لمبے وقفے کے بعد امجد نے کہا "تم کسان کے بیٹے تھے تم اپنے وطن کے لئے مر مٹے۔ اس میں رونے کی کیا بات ہے آج تمہاری قربانی کے بل بوتے پر اپنے بھائی یہاں حکومت کر رہے ہیں، تمہیں اس پر فخر ہونا چاہئے"..... جگو بولا "امجد تم مجھے چڑایا نہ کرو۔ کیا ہوا اگر میں ایک کسان کا بیٹا ہوں میں تمہاری طرح شاعر نہیں تو نہ سہی لیکن آخر میں نے بھی گاؤں گاؤں کی خاک چھانی ہے۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے منو بھاتی لیڈروں سے لے کر بڑے بڑے ہندوستانی لیڈروں کی تقریریں سنی ہیں، تین بار جیل گیا ہوں میں کوئی بچہ تو نہیں، میں نے آج تک کوئی آدمی ایسا نہیں دیکھا جسے اپنی زندگی سے محبت نہ ہو، جسے اس دنیا کے نیلے آسمان، زمین کی سوندھی خوشبو اور عورت کی اٹھلاتی ہوئی جوانی سے عشق نہ ہو..... کوئی بھی اس زندگی کو ختم کرنا نہیں چاہتا، میں خود جس کے پاس ایک مٹھی بھر ہڈیوں کے سوا اور کچھ نہیں۔ ایک جونک کی طرح اس زندگی سے چپکا ہوا ہوں اور تم ہو کہ مرنا چاہتے ہو..... یکایک وہ خاموش ہو گیا۔ دھیمے دھیمے قدموں سے نرس لوسی اس کے بستر کی طرف آ رہی تھی۔ جوان اور خوبصورت لوسی، وہ اُس کے سرخ ہونٹوں کو دیکھ کر پاگل ہو جاتا تھا۔ وہ جس کی ساری عمر جیلوں میں چکیاں پیستے، اور جیلوں سے باہر جیلوں سے بدتر دیہات میں لیکچر دیتے، جلسوں میں والنٹیروں کا کام کرتے اور قوم کے نام پر بھیک مانگتے گذری تھی..... اس چاندنی رات میں وہ اور بھی حسین معلوم ہو رہی تھی، اسے جیل جانے اور اپنے ملک کے لئے فاقے کر کر گذرنے پر افسوس نہ تھا۔ لیکن کاش اُسے تپ دق تو نہ ہوتا۔ کاش وہ تندرست رہتا اور حسین لوسی کے ہونٹ چوم سکتا وہ سر سے پاؤں تک کانپنے لگا۔ اس کے بیمار خون میں ایک وحشی راگ کا طوفان لہریں مارنے لگا، اُس کے کانوں میں بجلیاں کڑکنے لگیں، اس کے رخساروں کے سیاہ گڑھوں میں شعلے لپکنے لگے، کاش کوئی اُسے آج کی رات، صرف ایک رات کے لئے سچی تندرستی کی آگ اور پاک اور مقدس شباب کی حرارت عطا کر دیتا، صرف ایک رات کے لئے.....

نرس نے اپنا ہاتھ اس کے تپتے ہوئے ماتھے پر رکھا اور نیند سے مغلوب آواز میں کہا "کیا تمہیں نیند نہیں آتی۔ جگو، سو جاؤ، باتیں مت کرو۔ سو جاؤ پیارے جگو" جگو نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ سے نرس کی کلائی پکڑ لی چند لمحوں تک اُس کا پتلا، سوکھا ہوا ہاتھ نرس کی کلائی پر رہا پھر آہستہ سے تکیے پر گر گیا"

آپ نے دیکھا، تپ دق کا مریض اور لب چومنے کی خواہش، کیسی فطری اور جاں گسل تمنا ہے۔ اور کانپتے ہوئے بخار زدہ ہاتھوں کا نرس کی کلائی پکڑ لینا جنسی یاس کا کیسا دردناک اظہار! اس پارے میں الفاظ کا حیرت ناک خلوص اور رمز معانی کے پردے تار تار کر رہا ہے۔ راقم حروف کی نگاہ سے ایسے بہت کم پارے گذرے

ہیں جو اپنی شدتِ تأثر اور قوتِ اظہار کے اعتبار سے الفاظ کے اس چھوٹے سے مجموعے کی نظیر بن سکتے ہوں۔ اور اب ایک آخری منظر دیکھئے اور امجد جسے اب کارگاہِ حیات کے سب سے بڑے فن کار کے شعبدوں پر بھی ہنسی نہیں آتی اور جو اب مایوسیوں اور تلخیوں کی حدود سے بہت آگے نکل چکا ہے۔ جب ایک نگاہِ دلچسپ اپنے ناکام ماضی پر ڈالتا ہے تو یوں محسوس کرتا ہے کہ

"اب تو مجھے کسی سے کوئی عداوت نہیں، شکوہ نہیں، ہرگز نہیں
نہ تمہارے بنانے والے سے، نہ خواجہ کریم الدین سے ..... رضیہ
سے بھی نہیں ..... اچھا ہے کہ اب کسی کے دل میں ہماری یاد نہیں
چاہ نہیں عزّت نہیں ....."

لیکن یکایک اس تودۂ خاکستر میں ایک بجھی ہوئی چنگاری دمک اٹھتی ہے، آج نیرہ نومبر کی رات تھی ..... اس لئے

"تھوڑی دیر کے بعد ہی اُس کے صبر کے بند ٹوٹ گئے اور وہ نہایت دھیمی گلوگیر آواز میں بولا ..... "لیکن میرے خدا ..... میں آج کی رات کو نہیں بھول سکتا ..... آج کی رات ہی تو میرے ارمانوں کی دنیا آباد ہوئی تھی ..... آج کی رات ہی تو میں نے خوشیوں کا چہرہ دیکھا تھا ..... یہی چاندنی رات تھی ..... یہی رات کا سناٹا ...... چیڑ کا درخت ..... پھر رات کا سناٹا بڑھتا گیا، چاندنی پھیلتی گئی ..... ان سنہ رنگ کی خاموشیاں غنودگی کی گہرائیوں میں اترتی گئیں ..... وقت کا شور تھم گیا ..... اور زندگی کی ہر دھڑکن حسن کے سیلِ نور میں آپ ہی آپ بہتی ہوئی کہیں چلی گئی ..... خدا جانے ..... کہاں ..... کدھر .....؟"

اے حُسن! اے انسان!! اے خدا!!!

صلاح الدین احمد

حصۂ نظم

اس مہینے حصۂ نظم کے جائزے کا مسافر میرا جی اپنے سفر کو بہت دلچسپ سمجھتا ہے۔ بظاہر یہ سفر پورا مہینہ جاری رہا لیکن واپس آ کر جب تمام واقعات پر نظر ڈالی تو یوں محسوس ہوا کہ صبح سے بات چلتی ہے اور رات پر ختم ہوتی ہے، لیکن رات کے بعد پھر صبح کا سماں چھا جاتا ہے اور سفر سے جو چیزیں سوغات کے طور پر ساتھ آئی تھیں انہیں دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے گویا یہ سفر صرف شاعری کا نہ تھا، یہ سفر زندگی کا بھی تھا۔ پہلے پہل جب زندگی — انسانی زندگی — کرۂ ارضی پر نمودار ہوئی تو اس کے لئے صبح شام، دن رات کا ظاہری رنگ روپ ہی سب سے بڑھ کر دلچسپی کا باعث تھا، رفتہ رفتہ ان باتوں کا تصور اندھیرے اور اجالے کے لفظوں میں قید ہو گیا اور یہیں سے انسان نے اپنے ماحول سے آزادی حاصل کی اور اُس کے ذہن میں — کب، کیوں، کیا، کیسے — استفسارات کا ایک انبار جمع ہو گیا — اس ماہ شاعری کے سفر کی بھی یہی کیفیت رہی۔

میرا جی ہندوستانی ہے اور پنگھٹ ہندوستانیوں کے لئے کرشن کنھیا کے دور دراز زمانے سے جاذبِ نظر۔ سفر کی صبح اور پنگھٹ، دونوں مل کر پنگھٹ کی صبح بن گئے۔ تاہر القادری اگست کے "نگار" میں اس منظر کے تأثر کو لفظوں کے جال سے گرفتار کرتا ہے۔

پنگھٹ کی صبح

ٹھنڈی ہوا، خموش فضا، بھاپ کا دھواں — جاڑے کی رت، بہار کے دن، صبح کا سماں
لہروں پہ تیرتی ہے حبابوں کی کہکشاں — موجوں سے کھیلتی ہیں درختوں کی ڈالیاں

آئی ہوا تو اوس کے موتی ڈھلک گئے
سرسبز پتیوں کے پیالے چھلک گئے

آئی کرن نگاہ کے پر تولتی ہوئی — کہرے کی ہر لطیف گرہ کھولتی ہوئی
شبنم کے تابناک گہر رولتی ہوئی — پانی میں روشنی کی شکر گھولتی ہوئی

موجوں کی بے قرار جبینیں چمک گئیں
وہ جوشِ کیف ہے کہ ہوائیں بہک گئیں

اشنان کرنے آئی ہے لڑکی کسان کی — کاندھے پہ ایک گیلی دھوتی پڑی ہوئی
ندی کے پاس جا کے جو انگڑائی اُس نے لی — ملاح کے بھی ہاتھ سے پتوار چھٹ گئی

موجوں نے بڑھ کے اُس کو گلے سے لگا لیا
شاعر نے بھی نگاہ کو اپنی جھکا لیا۔

اس نظم میں اختصار کی خوبی بھی ہے ۔ پہلے بند کا پہلا ہی شعر دیکھئے ۔ بیان کے منظر کو آنکھوں کے عین سامنے لاتی ہوئی جدّت بھی ہے ۔ دوسرے بند کے پہلے شعر پر غور کیجئے ۔ منظر نگاری کا لطف بھی ہے (موجوں سے کھیلتی ہیں درختوں کی ڈالیاں) حقیقت پرستی کی باریک بینی بھی موجود ہے (کسان کی لڑکی کے کاندھے پر جو دھوتی ہے وہ "ملگجی" ہے) اُس لڑکی کی دلکشی کا ثبوت بھی ہے (ملّاح کے ہاتھ سے پتوار چھوٹ گئی) اس منظر سے تحریک پانے والی دبی ہوئی خواہش کا جھجکتا ہوا تذکرہ بھی ہے ۔ پتوار سطح آب پہ گری نہیں ، یہ ایک سیدھی سی بات ہے ، بلکہ موجوں نے اُسے بڑھ کر گلے سے لگا لیا" ــــ یہ التزام ایک ایسا پیچ ہے جو دبی ہوئی آرزو کو ظاہر کرتا ہے ۔ یہ آرزو شاعر کے دل میں نہیں تھی ، وہ تو صرف مشاہدہ کر رہا ہے ۔ لڑکی کی آمد سے ملاح پہ ایک بے خودی چھائی تھی ۔ آرزو اُس کے دل میں تھی ، شرمیلی آرزو ۔ اور شاعر بھی اُس شرمیلی آرزو کی لاج کا لحاظ کرتا ہے ۔ اس نے بھی "نگاہ کو اپنی جھکا لیا" شاید شاعر نے کسی اور وجہ سے اپنی نگاہیں جھکائی ہوں ، کیا پتہ ! ــ بہر حال اُسے "حبابوں کی کہکشاں" پر غور کرنے دیجئے ، جو لہروں پر تیرتی ہے ۔ ہم اپنے سفر پر چلتے ہیں ۔ لیکن پنگھٹ سے گوپیاں یاد آ گئیں ، رادھا کی سکھیاں ، سکھیوں سے جھولا اور جھولے سے ساون ــ اِس ذہنی قلابازی نے صبح سے رات کر دی ، ساون کی رات ۔ اگست کے ہمایوں میں یوسف ظفر ساون کی راتوں کا نغمہ ایک اچھوتی دھن میں الاپ رہا ہے ۔

پھر بھیگیں کالی راتیں

یہ مینہ برساتی راتیں ہر بوند میں ایک ترنم
یہ ہنستی گاتی راتیں ہر نے میں "تُم تُم ـ تُم تُم"
بے تم ہوں کیسے باتیں
پھر بھیگیں کالی راتیں

(۲)

چھاتوں پہ "رک ٹک رک ٹک" کپڑوں پر "رس بس رس بس"
پتّوں پہ "ٹک ٹک ٹک" اور در پہ "بے کس بے کس"
ہیں بے کس اور برساتیں
پھر بھیگیں کالی راتیں

(۳)

موٹر پر "آؤں ـــــ آؤں" تانگے پر "ٹنک ٹنک شاں شاں"
میں کیسے بات بتاؤں سب الفت کے ہیں عنواں
سب الفت کی ہیں گھاتیں
پھر بھیگیں کالی راتیں

(۴)

کوٹھے پر "تم تم تم تم" شیشوں پر "شن شن شن شن"
گرتے ہیں "چھم چھم چھم چھم" ہے دل میں "بجھ بن بجھ بن"
اور بجھ بن ہیں برساتیں
پھر بھیگیں کالی راتیں

(۵)

کوچوں میں "سر سر سر سر" چھجوں پر "چھن چھن چھو چھو"
نالوں میں "بھر بھر بھر بھر" اور فرش پہ "میں میں تو تو"
یہ میں اور تُو کی باتیں
پھر بھیگیں کالی راتیں

(۶)

"ٹپ ٹپ ٹپ ٹپ چھت" کیچڑ پہ "ترتر، دل دل"
بوندوں میں "خوش ہو خوش کر" ہیں بے کس اور تو بے کل"
ساون پر سو صلواتیں
پھر بھیگیں کالی راتیں
پھر بھیگیں

یوسف ظفر

اس نظم میں اسمائے صوت سے جو کام لیا گیا ہے وہ اردو میں ایک نئی چیز معلوم ہوتا ہے ۔ بظاہر یہ تلازم محض حسن تعلیل معلوم ہوتا ہے ۔ لیکن کیسا آنود اجیسا ماہر عشقیات کہہ گیا ہے کہ محبت میں ہر چیز محبوب کی یاد دلاتی ہے ۔

یہ نظم محض جذباتی چیز ہی نہیں حقیقت کی جھلک بھی اس میں جا بجا موجود ہے ۔ موٹر ، تانگہ ، کوٹھا ، کھڑکی یا دروازے کے شیشے ، چھتریاں ، گلی کوچے ، چھجّے ، نالے ، فرش ، چھت بلکہ کیچڑ تک موجود ہے ۔ کیچڑ سے بڑھ کر اور کیا حقیقت ہو گی جس میں سے زندگی کی نمود ہوئی ! یہ حقیقت کی جھلکیاں اس نظم کی منظر نگاری کو مکمل کرتے ہوئے اس کے درجے کو بڑھا دیتی ہیں ۔

لیکن یہ تو ساون کی رات ہے ، اس سفر میں کوئی ایسی رات مہیا ہو جو ہر رات سمجھی جا سکے اور جس سے لطف اندوز ہونے کے لئے موٹر تانگے سے ذرا دوری ہی رہے ـــــ لیجئے ایسی رات بھی آن پہنچی ۔ ہمیں اس

سے مطلب نہیں کہ چاند نکلا ہے یا رات کی تاریکی کو صرف ستاروں کا مدھم اُجالا ہی درخشاں بنا رہا ہے۔ ہمیں اتنا ہی کافی ہے کہ رات ہے۔ ایک بڑا شہر، کہیں سینما، کہیں تھیٹر اور کہیں کلب یا رقص گھروں کی رونق ہے۔ ہم رقص گھر کو چلتے ہیں۔ وہاں ہمیں اگست کے "ایشیا" میں ن۔م راشد تہذیب و تمدن کی اُلجھنوں میں خالص شہری شاعری کا جلوہ دکھائے گا۔

رقص

اے مری ہم رقص! مجھ کو تھام لے۔
زندگی سے بھاگ کر آیا ہوں میں۔
ڈر سے لرزاں ہوں، کہیں ایسا نہ ہو۔
رقص گھر کے چور دروازے سے آ کر زندگی۔
ڈھونڈھ لے مجھ کو، نشاں پا لے مرا،
اور جرمِ عیش کرتے دیکھ لے!
اے مری ہم رقص! مجھ کو تھام لے۔

رقص کی یہ گردشیں۔
ایک مبہم آسیا کے دور ہیں۔
کیسی سرگرمی سے غم کو روندتا جاتا ہوں میں۔
جی میں کہتا ہوں کہ ہاں
رقص گھر میں زندگی کے جھانکنے سے پیشتر۔
کلفتوں کا سنگریزہ ایک بھی رہنے نہ پائے۔
اے مری ہم رقص! مجھ کو تھام لے

زندگی میرے لئے۔
ایک خونی بھیڑیے سے کم نہیں۔
اے حسین و اجنبی عورت! اُسی کے ڈر سے میں
ہو رہا ہوں لمحہ لمحہ اور بھی تیرے قریب!
جانتا ہوں تُو مری جاں بھی نہیں
تجھ سے ملنے کا پھر امکاں بھی نہیں
تو مری اُن آرزوؤں کی مگر تمثیل ہے۔
جو رہیں مجھ سے گریزاں آج تک!
عہدِ پارینہ کا میں انساں نہیں
بندگی سے اس در و دیوار کی
ہو چکی ہیں خواہشیں بے سوز و رنگ و ناتواں۔
جسم سے تیرے لپٹ سکتا تو ہوں
زندگی پر میں جھپٹ سکتا نہیں،
اس لئے اب تھام لے۔
اے حسین و اجنبی عورت! مجھے اب تھام لے۔"

ن۔م راشد ایم اے

راشد کے متعلق میں ایک اور جگہ بھی کہہ چکا ہوں کہ اُس کا سوچنے کا انداز مغربی ہے اور شاید اسی لئے اُس کی نظموں کا ماحول بھی عموماً مغربی ہو جاتا ہے۔ اس نظم میں رقص گھر ہی کو لیجئے۔ خالصتہً مغرب کی چیز ہے۔ اگرچہ بمبئی اور کلکتے ایسے شہروں میں اب اسے ہندوستانی بھی نواز رہے ہیں۔ اور اس لئے پڑھے لکھے یا سینما کے شائق انسانوں کے لئے اس نظم میں کچھ زیادہ اجنبیت نہیں ہونی چاہئے۔ راشد کی نظموں میں یہ بات اکثر موجود ہے کہ وہ ایک جھجکتے ہوئے، تھکے ماندے انسان کا تصور پیش کرتا ہے، ایک ایسے انسان کا تصور جس کے ذہن پر تہذیب و تمدن کی اُلجھنوں کا اثر ذرا حد سے زیادہ ہوا ہو جو کسی بات سے جی بھر کر پورے طور پر لطف اندوز نہ ہو سکتا ہو، ایک نقطے سے ہٹ کر دوسرے نقطے تک جاتا ہو، اور پھر دوسرے سے تیسرے تک۔ اس نظم میں بھی اُس کی عصبیت اسے زندگی کی وسعت اور ہماہمی سے تنگ آ کر رقص گھر کے اندر لے گئی ہے اور اگرچہ وہ کہتا ہے کہ رقص کی گردشیں ایک خیالی چکّی میں اُس کے غم کو پیس رہی ہیں، نہیں، رقص کی گردشوں میں اُس کے پاؤں غم کو روند رہے ہیں، لیکن اُسے اب بھی خدشہ ہے کہ کہیں زندگی، وہ زندگی جس سے وہ گریزاں ہو کر رقص گھر کی پناہ میں آیا ہے، اُس کا کھویا ہوا سراغ نہ پا لے۔ "اے مری ہم رقص! مجھ کو تھام لے"۔ اس مصرعے کا تواتر ہی ظاہر کر رہا ہے کہ اُسے زندگی کے قریب آ جانے کا اندیشہ کس قدر ستا رہا ہے اور گویا وہ اپنی ہم رقص سے چمٹا جا رہا ہے۔ اُس میں اپنے کو کھو دینا چاہتا ہے، اس کے لئے رقص گھر کی پناہ کافی نہیں۔ شاید ابھی وہ اس حقیقت سے بے خبر ہے کہ ایسی حرکت بعض دفعہ "زندگی" کی تخلیق کا باعث بھی بن جایا کرتی ہے۔ لیکن ہمیں اپنے دل میں یہ خیال نہیں لانا چاہئے کیونکہ اُس کی ہم رقص اس کے لئے اجنبی ہے اس

کہ اُسے دوبارہ ملنے کی بھی کوئی صورت نہیں۔ اُس کی یہ دل بستگی ہنگامی ہے، ایک علاج کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور کہیں اُس کی ہم رقص، وہ حسین اور اجنبی عورت، رقص میں اُس کے غیر معمولی جوش سے کسی طرح کا شک نہ کرنے لگے، اس لئے وہ اُسے صاف طور پر کہہ رہا ہے کہ اُس میں اُسے صرف ایک مماثلت نظر آتی ہے۔ اُس کا یہ جوش کسی قدیم مرد کی وحشت نہیں ہے، اُس کی خواہشیں تو تہذیب کی چار دیواری کے آگے متواتر سر جھکائے رہنے سے اپنی قدیم شدت کھو چکی ہیں، اُس سے کسی طرح کا خطرہ غلط نظری ہے، وہ تو رقص میں صرف جسم سے لپٹ سکتا ہے اور بس۔ زندگی پر وہ نہیں جھپٹ سکتا۔ یہاں زندگی کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ زندگی جو رقص گھر کے باہر ہے جسے چھوڑ کر، جس سے تنگ آ کر شاعر اس چار دیواری میں آیا ہے اور دوسرے وہ زندگی جو اُسے اپنے پہلو میں دکھائی دے رہی ہے۔

راشد کے اس ٹکڑے سے آزاد نظم کے فنی فوائد کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ اس کی بحر سے رقص کا بہاؤ ظاہر ہے۔ بنیادی رکن فاعلاتن ہے۔ جھٹکے دیتا ہوا اور ہر گردش کو پورا کرتا ہوا رکن۔ فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن۔ "فاعلا" میں بہاؤ ہے اور "تن" کا ٹکڑا اس بہاؤ کو روک کر گردش کے دوسرے آدھے دائرے میں لے جاتا ہے، متواتر جب یہ پورا رکن دو یا تین یا چار بار چلتا ہے تو اس کے بہاؤ کا زور بڑھ جاتا ہے اور آخر میں فاعلن یا فاعلات کا چھوٹا رکن روک کا کام دیتا ہے۔

نظم کے شروع سے آدھے حصے تک شاعر ابھی رقص میں پوری طرح گم نہیں ہوا۔ اس لئے لمبے مصرعوں کے درمیان میں کہیں کہیں چھوٹے مصرعے بھی آ جاتے ہیں جو رقص کے بہاؤ کو کسی حد تک کم کر دیتے ہیں۔ جیسے دوڑنے میں کوئی شخص کبھی کبھی ٹھہر کر سانس لے۔ لیکن آدھی نظم کے بعد سے بہت دور تک مصرعوں کی لمبان باقاعدہ چلی جاتی ہے۔ اب شاعر رقص کے بہاؤ میں اس کی گردشوں میں، گردشوں کے آخر میں جھٹکے دیتی ہوئی پہلو بدلنے والی حرکتوں میں کھو چکا ہے۔ صرف آخر میں پہنچ کر جب اُسے شاید اس کا احساس ہوتا ہے کہ وہ اظہار نفسی کر چکا، ایک دو چھوٹے مصرعوں کی آمد ہوتی ہے۔

رقص کے جس بہاؤ کی اس نظم کے "ہیرو" کی ذہنی کیفیت کے لحاظ سے ضرورت تھی، فن کار نے بنیادی رکن "فاعلاتن" اس کے عین مطابق منتخب کیا ہے۔ مفاعیلن، فعولن، فعلن، مفتعلن، فاعلن ——— کسی اور رکن میں ایسا بہاؤ، ایسی گردش اور ایسے جھٹکے نہیں ہو سکتے تھے نظم میں ایک جگہ شاعر اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ اس رقص سے وہ یوں محسوس کر رہا ہے گویا ایک مبہم سی چکی چل رہی ہے اور وہ اپنے غموں کو پاؤں تلے روندتا جا رہا ہے۔ اس بنیادی رکن کی گردش اور جھٹکے میں کسی چکی کی گولائی ایسی کیفیت موجود ہے۔

رقص گھر کی اس رات کے سفر نے تو کسی قدر تھکا دیا۔ شاعر کی فطرت تو پہلے ہی ایک مچلتی ہوئی ندی تھی، تہذیب کی اُلجھنوں نے تو اُسے یکسر سیماب بنا دیا ہے ——— شاعر ——— سیماب ——— اگست کے "شاعر" میں مفکر سیماب (اکبر آبادی) دنیا اور زندگی کے موجودہ حالات کا جائزہ لے رہا ہے۔

قطعات

کیا زندگی و موت کی آویزش ہے
تا حدِ نظر سلسلۂ کاوش ہے
وہ عہدِ شباب و شعر و شاعر گذرا
اب دورِ شراب و شاہد و شورش ہے

جی کھول کے کوشش تباہی کر لے
بیدادگری و کج کلاہی کر لے
بے کس سے کہو، مآلِ شاہی دیکھے!
ظالم سے کہو کہ بادشاہی کر لے!

ارزاں نہ خدائی میں ہلاکت ہوتی
انسان پر ایسی نہ مصیبت ہوتی
تخریب میں صرف ہو رہی ہے جو متاع
اے کاش! یہ تعمیر کی قسمت ہوتی

سیماب اکبر آبادی

شعراء انسانیت کے تعمیری نمائندے ہیں۔ اس لئے موت سے گریزاں اور زندگی کی طرف راغب ہیں۔ کیونکہ زندگی ہی قدرت کا بھی شاہکار ہے۔ اگست کے "شاہکار" میں مجید امجد بی اے بھی کچھ اسی قسم کی باتیں کہہ رہا ہے اور چاہتا ہے کہ حال کی خوشگوار کیفیتوں ہی میں کھو یا رہے۔ جب تک سانس ہے تبھی تک لطف ہیں اور لطف ہی زندگی کا ماحصل۔

کہاں

موت کی گفتگو نہ کر اے دوست! آہ، یہ آرزو نہ کر اے دوست!
جب تلک سانس کی روانی ہے تیرے جیون کی رُت سہانی ہے
جب تلک دل کے داغ روشن ہیں شش جہت میں چراغ روشن ہیں
دوست جب تک ترا حریمِ نگاہ دے رہا ہے تجلیوں کو پناہ
زندگی نام ہے محبت کا زندگی جام ہے محبت کا
دل سے دل کی طرب نوازی ہے روح سے روح محوِ بازی ہے
آنکھوں آنکھوں میں مے انڈیلتی ہیں انگلیاں گیسوؤں سے کھیلتی ہیں
ہیں لبوں پر لبوں کے پیمانے ہیں نظر سے نظر کے افسانے
شانے سے شانہ بھڑ رہا ہے یہاں نغمے سے نغمہ چھڑ رہا ہے یہاں
جو بھی ارماں دلِ حیات میں ہے آج تو دامِ ممکنات میں ہے!
کل نہ معلوم کیا سے کیا ہو جائے کل کا مفہوم کیا سے کیا ہو جائے
اٹکے اُلجھے اجل کے دھارے سے جا کے ٹکرائیں اُس کنارے سے
کس نشیمن میں، کس ٹھکانے کہاں
اپنی منزل ہو پھر سجانے کہاں؟

مجید امجد بی اے

اس "کہاں" کے متعلق اگست کے "سب رس" میں مخدوم محی الدین کا تبصرہ ہے۔ وہ اپنے بیان کو ایک عجیب پیچ دیتا ہُوا سرمایہ داری کے در پر ایک ہتھوڑا بولتا ہے۔ اُس کا تخیّل اُسے موجودہ وقت کے تلخ حالات کے بارے میں عجیب تصوّرات سے دوچار کرتا ہے۔ موت کو دنیا سب سے بڑھ کر غارت گر تصور کرتی ہے لیکن اس نظم کا شاعر ہمیں بتاتا ہے کہ شاہی اور سرمایہ داری نے موت سے بڑھ کر مصائب لائے ہیں۔

روحِ فغفور

دخترِ خواجگی روحِ غارت گری موت کی ہم سفر مرگھٹوں کی پری
جہل و افلاس کے تخت پر جلوہ گر کچھ پچاری اِدھر کچھ پجاری اُدھر
وہ شب اندام وہ قبر کی تیرگی میرے گھر میں وہ کل یکبیک گھس گئی
ناچتی کودتی شور کرتی ہوئی میری خوشیوں سے جیبوں کو بھرتی ہوئی
پرچمِ غم ہوا میں ہلاتی ہوئی مسکراتی ہوئی کھلکھلاتی ہوئی
ایڑیوں سے دلوں کو کچلتی ہوئی خون پی پی کے گرتی سنبھلتی ہوئی
موت سے کہہ رہی تھی وہ یوں دمبدم میری ہم نفس اے مری ہم قدم!
تیرے ترکش میں کیا ہے جو مجھ میں نہیں؟ کونسی وہ ادا ہے جو مجھ میں نہیں؟
کیا مری کاکلوں میں بلائیں نہیں؟ کیا نفس میں میرے وبائیں نہیں؟
کیا مجھے جوعِ ارضی نے پالا نہیں؟ کیا یہ انسان میرا نوالا نہیں؟
پشتِ گیتی پہ میں بھی تو ناسور ہوں
دیکھ تو کون ہوں، روحِ فغفور ہوں!

مخدوم محی الدین ایم اے

یہ نظم اپنے کنائی انداز، اپنے استعاروں اور اپنی تخیّل پرستی کی وجہ سے میری نظروں میں ایک اونچا درجہ رکھتی ہے۔ لیکن مجھے بھی اسے پڑھ کر وہی سوچ آئی ہے جو اس کے خالق کو آئی ہے۔ کیا غیر معمولی زرد دولت کی اُمنگ انسان کو تباہی کے قریب نہیں لے جا رہی؟ —— لیکن میں ان مسائل کو سوچنے والا کون ہوں؟ —— میں تو ایک فقیر ہوں، سیلانی، ایک مسافر جو اپنے شاعری کے سفر سے لوٹا ہے اور جو بار بار وہی پرانا کلمہ دہراتا ہے کہ اللہ بس باقی ہوس!

میراجی

اچھی کتابیں زندگی کو اچھا بناتی ہیں

لیکن ہر شخص کو اچھی اور بری کتابوں میں تمیز کا موقعہ حاصل نہیں خصوصاً آج کل کے تیز رفتار زمانے میں جب کہ ہر بُری چیز اپنا ظاہری دلکش لباس پہنے نگاہوں کو دھوکا دینے کے لئے ہر طرف موجود رہتی ہے۔ اس دھوکے سے بچنے کے لئے سکون اور وقت کی ضرورت ہے۔ ان وجوہات کے مدِ نظر کتبخانہ ادبی دنیا لاہور نے فیصلہ کیا ہے کہ ادبی دنیا کے پڑھنے والوں اور عام پبلک کے لئے وقتاً فوقتاً چنی ہوئی کتابوں کی مختلف فہرستیں شائع کی جائیں۔ اس انتخاب کی ضمانت صلاح الدین احمد اور میرا جی مدیران ادبی دنیا کا نام ہے۔ انہوں نے نہایت محنت اور وقت صرف کرنے کے بعد یہ انتخاب کیا ہے اور جو بلند نظری اور معیار کی خوبی ادبی دنیا کے مضامین میں دکھائی دیتی ہے اُسی کا لحاظ ان فہرستوں میں بھی رکھا گیا ہے ناظرین کی آسانی کے لئے یہ تمام کتابیں کتب خانہ ادبی دنیا میں فراہم کر لی گئی ہیں تاکہ ایک ہی جگہہ سے بغیر کسی دقت کے آپ کو یہ چنی ہوئی کتابیں مل سکیں۔ ہمیں امید ہے کہ ہر ماہ ناظرین ان فہرستوں کا مطالعہ کر کے اِن سے فائدہ اٹھائیں گے۔

نام کتاب	مصنف	قیمت
افسانے		
فردوسِ خیال	منشی پریم چند	عہ
پریم بتیسی اول و دوم	؍؍	سے
نظارے	کرشن چندر	عہ
منٹو کے افسانے	سعادت حسن منٹو	عہ
سحر فرانس	طاہر قریشی	عہ
دانہ و دام	راجندر سنگھ بیدی	عہ
باسی پھول	سید علی عباس حسینی	عہ
شعلے	پروفیسر احمد علی ایم اے	عہ
سوز ناتمام	عاشق حسین بٹالوی	عہ
چغتائی کے افسانے	مرزا عظیم بیگ چغتائی	سے
صنوبر کے سائے	حجاب امتیاز علی	عہ
میری ناتمام محبت	؍؍	عہ
طلسم خیال	کرشن چندر	عہ
اندھی دنیا	اختر انصاری	عہ
ڈاچی	اپندر ناتھ اشک	عہ

نام کتاب	مصنف	قیمت
پس پردہ	چندر بھوشن چند رسنگھ	۱۲؍
سازِ فطرت	حسن عزیز جاوید	عہ
محبت اور نفرت	اختر حسین رائے پوری	سہ
ہیبتناک افسانے	امتیاز علی تاج	عہ
مزاحیہ		
پطرس کے مضامین	احمد شاہ بخاری	۸؍
حاجی لق لق کے افسانے	حاجی لق لق	۱۱؍
سطائبات	سندباد جہازی	عسہ
جدید جغرافیہ پنجاب	؍؍	سہ
دنیائے تبسم	شوکت تھانوی	عہ
مضامین فلک پیما	فلک پیما	۶؍
روح لطافت	مرزا عظیم بیگ چغتائی	عہ
روح ظرافت	؍؍	عہ
کولتار	؍؍	۶؍
ڈرامے		
انارکلی	امتیاز علی تاج	۱۲؍

نام کتاب	مصنف	قیمت
ریڈیو ڈرامے	فضل حق قریشی	سہ
منتوش ۸؍ ۔ مینا ۱۲؍	حکیم احمد شجاع	۱۲؍
ہیملٹ	مترجمہ عنایت اللہ دہلوی	عہ
فاؤسٹ	گوئٹے	عہ
تین ٹوپیاں	نور الٰہی محمد عمر	۸؍
چند ڈرامے	؍؍	۸؍
منظومات		
بانگِ درا۔ اقبال عہ	نغمۂ حرم اختر شیرانی	عہ
نقش و نگار	جوش ملیح آبادی	عہ
فکر و نشاط	؍؍	عہ
بہارستان	مولانا ظفر علی خاں	للعہ
سوز و ساز	حفیظ جالندھری	۶؍
نغمہ زار	؍؍	عہ
گیت مالا ۲؍ ۔ آتش خاموش	احسان دانش	عہ
چراغاں	احسان دانش	۶؍
نقش دوام	عبد الحمید عدم	۶؍

ملنے کا پتہ: کتب خانہ ادبی دنیا۔ دی مال۔ لاہور

ایک اور اشارہ

کتب خانہ ادبی دنیا نے وعدہ کیا تھا کہ وقتاً فوقتاً اچھی کتابوں کی طرف اشارہ کرنے کے لئے چھپی ہوئی کتابوں کی تازہ بتازہ فہرستیں ادبی دنیا میں شائع کی جائیں گی۔ تاکہ ناظرین ادبی دنیا کو اپنے مقبول رسالے ہی کے ذریعے سے ہر قسم کی اچھی کتابیں بہ آسانی مہیا ہو سکیں۔ چنانچہ اس سلسلے کی پہلی فہرست شائع ہو کر مقبول خاطر ہو چکی ہے۔ اس دفعہ کتب خانہ ان فہرستوں کی دوسری قسط آپ کے پیش نظر کر رہا ہے۔ موجودہ فہرست میں التزاماً وہی کتابیں درج کی گئی ہیں جو خواتین اور بچوں کے لئے دلچسپ اور مفید ہو سکتی ہیں جسب معمول اس انتخاب کی ضمانت بھی ادارہ ادبی دنیا کا نام ہے۔

مینیجر کتب خانہ ادبی دنیا لاہور

نام کتاب و مصنف	قیمت
خواتین کے لئے	
ناول اور افسانے	
عورتوں کے افسانے۔ کوثر چاند پوری	عہ۸
تحفے اور دیگر افسانے۔ حجاب امتیاز علی	۸ر
خانم . . مرزا عظیم بیگ چغتائی	للعہ
شریر بیوی . . ״ ״	عہ۸
شام زندگی راشد الخیری	عہر
شب زندگی دو حصے ״	عہ
ماہ عجم . . ״	عہ۸
شاہین و دراج ״	۸ر
لاشوں کا شہر۔ مسز عبدالقادر	سہ
نرملا . . منشی پریم چند	عہ۸
یوسف نجمہ عبدالحلیم شرر	عہ۸
بنات النعش۔ مولوی نذیر احمد مرحوم	سہ
یاسمین . . مرزا محمد سعید	عہ۸
نظم۔	
آئینہ حرم۔ محترمہ زخ ش کی نظمیں	۶ر

نام کتاب و مصنف	قیمت
شمع خاموش نظمیں	۶ر
آئینہ جمال ״	۱۲ر
صنعت اور خانہ داری	
گلدستہ کروشیا۔ فاطمہ بیگم انور علی	۶
عصمتی کروشیا	عہ۸
بیوی کی تعلیم۔ خواجہ حسن نظامی	عہ۴
اولاد کی شادی ״	عہ
مشرقی اور مغربی کھانے	۶ر
مذاقیہ کھانے	۶ر
متفرق	
محبت نامے۔ مترجمہ پروفیسر رام سروپ کوشل	۷ر
ادب زریں۔ حجاب امتیاز علی	۸ر
نغمات موت ״ ״	۶ر
بچوں کے لئے	
قصے کہانیاں	
ولائتی نخفی۔ راشد الخیری	۲ر
دادا لال بجھکڑ ״	۸ر

نام کتاب و مصنف	قیمت
بچوں کا انصاف (ڈرامہ)	۳ر
مرغی امبیر چلی۔ محترمہ رقیہ ریحانہ	۲ر
نبیوں کے قصے	۵ر
تاریخ ہند کی کہانیاں	
پہلا حصہ	۳ر
دوسرا حصہ	۵ر
تفریح اور معلومات	
تعلیمی کھیل	۳ر
سمندر کا عجائب خانہ	۸ر
ایورسٹ کی کہانی	۳ر
نظمیں	
بچوں کی نظمیں	۴ر
بچوں کے اسمٰعیل — مرتبہ سعید انصاری، پرنسپل مدرسہ جامعہ	۱۵ر
بچوں کی رباعیاں	۱ر
بچوں کا علاج (طب کی کتاب)	مجلد

ملنے کا پتہ:۔ کتب خانہ ادبی دنیا۔ دی مال۔ لاہور

فہرست مضامین ادبی دنیا لاہور

بابت ماہ اکتوبر ۱۹۴۰ء

جلد ۱۸ — تصویر: چند اماموں کے لڑکے — نمبر ۱۰

چندہ سالانہ مع محصول ڈاک و وی پی پانچ روپے ممالک غیر سے دس شلنگ

گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام صلاح الدین احمد پرنٹر و پبلشر چھپ کر دفتر ادبی دنیا ... لاہور سے شائع ہوا ... میں چھپے۔

دنیائے کاروبار

پاٹن والا لمیٹڈ عبد الرحمٰن سٹریٹ بمبئی

اس عظیم الشان کمپنی کی تیار کردہ "افغان سنو" اور "افغان کریم" ایک زمانے سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ اور دنیائے فلم کی تمام حسین ترین ستارہ اس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ یہ خالص ہندوستانی کمپنی ہے جس کی تیار کردہ اشیاء یورپ کے مقابلے میں اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ حال ہی میں اس کمپنی نے گلیسرین سوپ تیار کیا ہے جو جلد کو ملائم اور ستھرا رکھتا ہے اس کے استعمال سے جلد ہمیشہ پر شباب اور مخمل کی طرح ملائم رہتی ہے۔ ہندوستانی صنعت کے فروغ دینے والوں سے ہماری پرزور درخواست ہے کہ وہ ضرور گلیسرین سوپ کا استعمال کر کے اس کی خوبیوں سے مستفید ہوں اور اپنے عزیزوں کو اس کے استعمال کی سفارش کریں۔ ہمیں پوری توقع ہے کہ استعمال کے بعد انہیں بھی ہماری رائے سے اتفاق ہوگا۔ اپنے شہر کے ہر بڑے سٹور سے طلب کیجئے۔

ڈونگرے کا بال امرت

دراصل یہ سوکھا اصلی اور خالص دودھ ہے جس میں سے سائنس کے ذریعے سے پانی خشک کر لیا گیا ہے۔ ننھے بچوں کے لئے بہترین طاقتور خوراک ہے جو نہایت آسانی سے ہضم ہو جاتی ہے۔ زچگی کے ایام میں زچہ کو بھی طاقت دیتی ہے۔ ڈونگرے کا بال امرت ہر شہر میں ہر اچھے سٹور یا کیمسٹ سے مل سکتا ہے۔

کتب خانہ ادبی دنیا

گذشتہ چند ماہ سے کتب خانہ ادبی دنیا نے اچھی کتابوں سے ناظرین کو متعارف کرانا شروع کیا ہے۔ ایک مختصر فہرست ادبی دنیا کے ہر پرچے میں شائع کی جاتی ہے۔ ہمیں دیکھ کر نہایت مسرت ہوتی ہے کہ شائقین کتب اس میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ کتب خانہ ادبی دنیا یہ کوشش کر رہا ہے کہ اس فہرست میں اضافہ ہوتا رہے اور ناظرین کی خدمت میں چھپی ہوئی کتابیں پیش کر سکے۔ شائقین کتب سے ہم درخواست کرتے ہیں کہ ہر ماہ فہرست کتب کا مطالعہ کر کے ان سے فائدہ اٹھائیں۔ یہ تمام کتابیں کتب خانہ ادبی دنیا سے مل سکتی ہیں۔

چائے کی صد سالہ سالگرہ

دس جنوری ۱۹۳۹ء کو لندن میں امپائر ٹی انڈسٹری کی صد سالہ سالگرہ منائی گئی چونکہ ٹھیک اسی دن ایک سو سال قبل ۱۸۳۹ء میں آسام کے نئے باغات کے چائے کا پہلا نیلام ہوا تھا۔

اسی وقت ہندوستان میں چائے کی زراعت کی ترقی میں بڑی کوشش کی گئی اور سو سال کے اندر سلطنت برطانیہ دنیا کی چائے اور باغات اور بازار مانا گیا۔ دنیا کی مال تجارت میں چائے کی قیمت ایک فی صدی ہے اور ستر فی صدی سے زیادہ چائے کی پیداوار اور تقریباً ستر فی صدی اس کی کھپت سلطنت برطانیہ ہی میں ہوتی ہے۔

صد سالہ سالگرہ کے موقع پر دعوت ہوئی تھی اس میں سر والٹر اسماعیل ایم بی نے کمیٹی کے صدر نے فرمایا کہ اس کمپنی کے قائم ہونے کے پچاس سال کے اندر اس کمپنی نے چین کی نسبت زیادہ چائے منگوائی ہے اور آج تمام دنیا کی چائے کے بازار پر لدی ہے۔ عموماً ہم دو شخص کے لئے چائے طلب کرتے ہیں مگر ہندوستان اور سیلون دو کروڑ لوگوں کے لئے چائے پیدا کرتے ہیں۔ کیونکہ وہاں کی پیداوار آٹھ سو ملین پونڈ سالانہ ہے جس کے ہر پونڈ میں دو سو سے زیادہ چائے کی پیالی تیار ہوتی ہے۔

تمام ہندوستانی اور غیر ممالک کے باشندے اس ہر دلعزیز چائے کو اپنے گھروں میں بکار رہے ہیں۔

فضل الٰہی اے ڈورٹائزنگ منیجر
ادبی دنیا لاہور

بزمِ ادب

مقامِ مسرت ہے کہ جنگ کے باوجود ادبی دنیا کا سالنامہ انشاءاللہ حسبِ معمول نہایت آب و تاب سے دسمبر کے وسط میں شائع ہو جائے گا۔ یہاں اس امر کی توضیح ناموزوں معلوم ہوتی ہے کہ ایسے نامساعد حالات میں سالنامہ شائع کرنا کس قدر قربانی کا طالب ہے۔ اس لئے صرف یہی کہنا کافی ہے کہ ہم سے جو توقعات آپ کو ہیں انہیں ہم پورا کرنے کی کوشش کریں گے اور اس کے ساتھ ہی ادبی دنیا کے معاونین اور ناظرین سے جو توقعات ہمیں ہو سکتی ہیں اُن کے پورا ہونے کی اُمید کریں گے۔

اس تیمارے کے افسانہ نگاروں میں چودھری محمد علی صاحب ادبی دنیا کی محفل میں پہلی بار شریک ہو رہے ہیں، اگرچہ اس سے پہلے موصوف کی دو کہانیاں ہماری "دنیائے ادب" کی رونق بن چکی ہیں۔

چودھری صاحب اردو کے پرانے لکھنے والوں میں سے ہیں۔ مگر اُن کے انداز میں اس قدر جدت ہے کہ وہ مستقبل کے ادیب معلوم ہوتے ہیں۔ موجودہ افسانے کا موضوع نہایت نازک اور اچھوتا ہے۔ ایسے موضوع پر قلم اٹھانا اور اُسے حُسن و خوبی سے نبھانا کسی معمولی مصنف کا کام نہ تھا۔ اس کے لئے نہ صرف غیر معمولی سلیقے اور مہارتِ فن کی ضرورت تھی، بلکہ افسانہ نگار کا خلوص اور جرأت کی دولت سے مالا مال ہونا بھی ازبس لازم تھا۔ ہمیں مسرت ہے کہ چودھری صاحب نے موجودہ افسانے میں ان خصوصیات کے اجتماع کا ایک نہایت دلنشیں ثبوت پیش کیا ہے۔ افسوس ہے کہ "بزمِ ادب" کی تنگ دامانی ہمیں وہ گلہائے معانی چننے کی اجازت نہیں دیتی جن کے رنگ و بُو سے افسانے کی فضا معمور ہے۔ اس لئے فقط اسی قدر کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ زندگی کی بدلتی ہوئی قدروں کی ایسی جانچ اور انسانی فطرت کی نیرنگیوں کا ایسا مشاہدہ اور اظہار بہت کم افسانہ نگاروں کے حصے میں آیا ہے۔

زیرِ نظر افسانہ اپنی معنوی خوبیوں کے علاوہ زبان و بیان کی لطافتوں سے بھی سرتاسر معمور ہے اور اودھ کے روزمرہ کا نہایت اچھا نمونہ پیش کرتا ہے۔

اردو کے ایک اور کہنہ مشق اور نکتہ رس ادیب نے "ثبات" کے رُوح افروز نام سے ایک اعلیٰ درجے کا سوشل افسانہ لکھا ہے، "سونے میں سیلی" ہماری شہری معاشرت جس انقلابی دور سے گذر رہی ہے۔ اس کا قدرتی تقاضا ہے کہ ہمارے جنسی رجحانات اس سے شدید طور پر متاثر ہوں۔ اِدھر اقتصادی مجبوریوں نے اور پیچیدگیاں پیدا کر رکھی ہیں۔ اور نتیجہ یہ ہے کہ بہت سے نوجوانوں کی زندگیاں ایک خوابِ پریشان بن کر رہ جاتی ہیں، زیرِ نظر مطالعہ اسی قسم کے ایک خواب کی تفصیل ہے۔ اور واقعہ ہے کہ صاحبِ افسانہ نے اسے ایسے دلکش انداز میں پیش کیا ہے کہ تاثراتِ الم میں بھی ایک حلاوت پیدا ہو گئی ہے۔ اس پر زبان کی سلاست اور روانی گویا سونے پر سہاگہ ہے۔

اختر انصاری صاحب کے اتنے اچھے مطالعے ناظرینِ ادبی دنیا کی نگاہوں سے گذر چکے ہیں کہ اب ان کے اندازِ نگارش کی نسبت کچھ لکھنا ضروری معلوم نہیں ہوتا۔ موجودہ مطالعہ "غم نصیب" اُن کے بہترین افسانوں میں سے ہے اور ان کی تحریر کی خوبیوں کی پوری عکاسی کرتا ہے۔

محترمہ ہاجرہ بیگم نے ایک نہایت دلچسپ مضمون "ہمارے گھریلو گیت" کے عنوان سے لکھا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہاجرہ بیگم کو خود ان گیتوں کی فضا میں سانس لینے کا موقعہ ملا ہے اور اسی لئے ان کی اس تحریر میں اُس خلوص اور ہم آہنگی کی بہت سی علامتیں موجود ہیں جو زندگی سے بہت قریب رہنے والے فن کاروں کی تخلیق میں پائی جاتی ہیں ہمیں امید ہے کہ محترمہ ادبی دنیا کے لئے آئندہ بھی لکھتی رہیں گی۔

یادش بخیر، جناب تسکین عابدی بہت دیر کے بعد ہماری محفل میں آئے ہیں مگر شاید کسی دور کے راستے سے آئے ہیں جبھی تو ایک بڑے مزے کی چیز ہمارے لئے لائے ہیں۔ "ریختی" نے ہمارے ادب میں کبھی کوئی سنجیدہ حیثیت حاصل نہیں کی۔ ایک عرصہ ہوا کہ اس کا رواج اُٹھ گیا مگر یہ کہنا شاید بیجا نہ ہوگا کہ ہم نے اس صنفِ شاعری سے کبھی انصاف نہیں کیا اور اسے ہمیشہ تعصب کی عینک لگا کر دیکھا گئے۔ کچھ مدت گذری جناب تمکین کاظمی

نے اردو کے ایک مرحوم رسالے قوس قزح میں ریختی پر ایک سیر حاصل مضمون لکھا تھا، اور ریختی لکھنے والوں کا ایک مختصر تذکرہ بھی ان کے قلم کا رہین ہے، مگر ادبی حلقوں نے بحیثیت مجموعی کبھی اس پر کوئی توجہ نہیں کی۔ موجودہ مضمون میں تسکین صاحب نے اردو کے ایک مشہور ریختی گو جناب عابد مرزا مرحوم المتخلص بہ بیگم کے کلام کا اپنے مخصوص انداز میں جائزہ لیا ہے اور حق یہ ہے کہ بہت خوب لیا ہے۔ امید ہے کہ ناظرین اسے خاص دلچسپی سے پڑھیں گے۔ اور ریختی کی نسبت اپنے نظریئے میں قدرے ترمیم کو راہ دیں گے۔

آخر میں موجودہ شمارے سے آپ کی توجہ کو ہٹا کر پھر سالنامے کی طرف لانا چاہتا ہوں۔ تاکہ جس طرح سالنامہ ابھی سے ادارے کے ذہن پر چھا چکا ہے آپ کے ذہن پر بھی چھا جائے۔

صلاح الدین احمد

(۲)

اس دفعہ حصۂ نظم معذرت سے شروع ہوتا ہے۔ گذشتہ شمارے میں دو فرو گذاشتیں ایسی ہو گئی ہیں جن کے لئے مجھے ادبی دنیا کے پڑھنے والوں سے ندامت ہے۔ پہلی معذرت اُس نظم سے متعلق ہے جس کا عنوان "لگی کی لاگ" ہے یہ چیز اصلاً حضرت آرزو لکھنوی کی ہے جن کے خالص اردو کے تغزل نے تمام اردو دان صاحبوں کے دلوں کو اپنی میٹھی دھن سے موہ لیا ہے میں بھی حضرت آرزو کے متوالوں میں سے ہوں لیکن بدقسمتی سے ان کا مطبوعہ دیوان "بانسری" مجھ تک نہیں پہنچ سکا تھا اس لئے میں اس دلکش نظم سے ابھی روشناس نہیں ہوا تھا۔ اب جو یہ چیز ایک اور نام سے شائع ہوئی تو مکرمی فراق گورکھپوری اور ایک غائبانہ کرمفرما نے اس چوری کی طرف توجہ دلائی، اس چوری کے کرنے والے کا نام شریف ثمر جالندھری ہے۔ ان کی چور طبیعت کا اظہار مجھ پر ستمبر کے شمارے کی اشاعت کے عین بعد ہو گیا تھا۔ وہ یوں کہ ان صاحب نے تین غزلیں اشاعت کے لئے بھیجیں لیکن پہلی ہی غزل حضرت اصغر گونڈوی کی تھی۔ اتفاقاً یہ غزل مجھے یاد تھی۔ چنانچہ میں نے تینوں غزلیں لوٹا دیں اور بھیجنے والے کا نام ادبی دنیا کی سیاہ فہرست میں درج کر لیا۔ یہاں معذرت کے علاوہ میں دوسرے رسائل کے مدیروں کے فائدے کے لئے اس "ادب چور" کا اتہ پتہ بھی درج کئے دیتا ہوں تاکہ سب لوگ ان سے محتاط رہیں۔ شریف ثمر جالندھری رتہ امرال راولپنڈی۔

دوسری معذرت روشن دین تنویر کی نظم "فتح" سے متعلق ہے اس میں تین مصرعے غلط شائع ہو گئے ہیں۔ دوسرے بند کے پہلے دو شعر یوں لکھے گئے ہیں:-

دشمنوں کی فوج کا ، کوئی جواں نہیں رہا
دشمنوں کے اوج کا ، نام و نشاں نہیں رہا

اصل یوں ہے:-

دشمن اور اس کی فوج کا، کوئی جواں نہیں رہا
دشمن اور اس کے اوج کا، نام و نشاں نہیں رہا۔

تیسرا مصرعہ۔ "دشمنی نہ رنج تھا"
کی بجائے "دشمنی تھی نہ رنج تھا" ہے

اس غلطی کی طرف توجہ دلانے کے لئے میں جناب حرماں خیرآبادی کا ممنون ہوں۔

دنیا کی بہت سی اور باتوں کی طرح شعریت کا تصور بھی ایک اضافی تصور ہے اگر ایک شخص کو غالب پسند ہے اور دوسرے کو میر تو اس سے غالب یا میر کے اشعار کا درجہ کسی طرح کم نہیں ہوتا۔ جب اردو شاعری میں نظم آئی تو غزل کے متوالے اسے کچھ مستحسن نگاہوں سے نہیں دیکھتے تھے، اور نظم میں بھی جب پہلے پہل آزاد نظم نے اپنا جلوہ دکھایا تو لوگوں نے یہی کہا کہ یہ کیا چیز ہے۔ لیکن اب رفتہ رفتہ آزاد نظم بھی مقبول ہوتی جا رہی ہے۔ ان باتوں سے میرا مقصد شاعری اور شعریت کے تصور کو ایک اضافی تصور ثابت کرنا ہے، غزل اگرچہ ہماری شاعری کی بنیادی صنف ہے لیکن اس صنف نے گذشتہ پچاس سال میں ہی مختلف پلٹے کھائے ہیں یعنی غالب اور اُس کے بعد سے۔ پہلے اکثر شعراء کا انداز یکساں ہی ہوتا تھا خواہ تھوڑی بہت انفرادیت بھی ہر ایک میں ہو، پہلے شاعروں میں میر تقی ایک ایسا شاعر دکھائی دیتا ہے جس کا رنگِ تغزل اکثریت سے نمایاں طور پر مختلف تھا، یا پھر اُس سے ملتا جلتا شاعر میر درد ہے۔ موجودہ زمانے نے ہمیں اس لحاظ سے بہت سے مختلف رنگ کے غزل گو دیئے ہیں۔ جوش کی مسلسل غزل کو دیکھئے جو رفتہ رفتہ نظم ہی بن گئی، اسی طرح میرے خیال میں فراق گورکھپوری کا حال ہے۔ دیر کی بات ہے کہ فراق کی چند غزلوں میں میر تقی کا انداز دکھائی دیا تھا لیکن وہ کیفیت جلد ہی بدل گئی اور پھر آہستہ آہستہ اُس نے اپنا ایک ایسا مستقل رنگ قائم کر لیا جس نے اُسے بظاہر صرف شاعروں یا نقادوں کا شاعر بنا دیا ہے۔ موجودہ شمارے میں اس کی جو غزل پیش نظر ہے، اس میں نہ صرف گرتے ہوئے حرفوں اور مناسب الفاظ کے انتخاب کی وجہ سے موسیقی کا عنصر نمایاں ہے بلکہ

مضمون آفرینی بھی کسی طرح کم نہیں۔ موضوع وہی فراق کا ازلی اور ابدی" موضوع ہے یعنی حسن و عشق اور اس کی مختلف کیفیتوں کا بیان ! لیکن اس وحدت میں بھی جو کثرت موجود ہے اُس کا صحیح اور پورا پورا جائزہ لینے کے لئے خاص نگاہوں کی ضرورت ہے۔ یہ میری طرف سے ایک اشارہ ہے جو شاید صرف عقلمندوں ہی کو کافی ہوگا۔ !

سعید احمد اعجاز اپنی نظم کو بے حرکت ذہن کی تیرگی سے شروع کرتا ہے۔ اور اس بھیدوں سے بھرپور تاریکی کو رات اپنی گود میں لئے ہوئے ہے یہ تاریکی رات پر نہیں چھائی ہوئی بلکہ رات کی آغوش میں ہے کیونکہ یہ رات کے منظر کی تاریکی نہیں، یہ بے حرکت ذہن کی تیرگی ہے اور پھر اس اندھیرے میں حرکت پیدا ہوتی ہے۔ ایک شعلہ کانپتا ہے، یہ شعلہ واضح نہیں، شاعر اسے نورانی "سا" کہتا ہے۔ یونہی جب فن کار کا ذہن کسی وجہ سے تخلیق کی تحریک لیتا ہے تو اگرچہ بعض دفعہ پیدا ہونے والی چیز اچانک نظر کے سامنے پوری طرح جلوہ گر ہو جاتی ہے لیکن اکثر سب سے پہلے اُس کا مبہم سا احساس ہوتا ہے۔ تخلیقِ شعری کا شعلہ نظروں کے سامنے یوں کانپتا ہے گویا جھیل کے تاریک پانی میں کوئی تنہا کنول" ہو۔ رات کی آغوش کے پراسرار اندھیرے کا اثر ابھی دُور نہیں ہوا، ثبوت یہ کہ جھیل کا پانی تاریک ہے۔ اگلے مصرعے میں "ایک زریں ساحرانہ روشنی کا دائرہ نمودار ہوتا ہے۔ دائرہ کیوں ؟ — شاید اس لئے کہ شعلے کے گرد بھی نور کا ایک دائرہ سا بن جاتا ہے کیونکہ روشنی جب پھیلتی ہے تو یکساں رفتار سے ہر سُو رواں ہوتی ہے۔ کوئی سمت اُس کے نفوذ سے بچ نہیں سکتی۔ یا شاید یہ اس لئے کہ جھیل کے تاریک پانی پر تنہا کنول کسی سفید پتھر کی طرح گرا تھا۔ اور اُس سے جو رفتہ رفتہ بڑھتے ہوئے حلقے پیدا ہوئے تھے اُنہی میں سے ایک زریں ساحرانہ روشنی کا دائرہ بن گیا۔ روشنی ساحرانہ اس لئے کہ پہلے جو اندھیرا تھا۔ وہ بھی پراسرار تھا لیکن نور جب یوں پھیلنا شروع ہوا تو پھیلتا ہی نہیں چلا گیا۔ ذہن تحریکِ شعری سے ابھی پوری طرح حرکت میں نہیں آیا، اس لئے اس روشنی کے دائرے کے گرد دُھندلے دھندلے نیلگوں ہالے سے ہیں" ان ہالوں میں، اُس ساحرانہ روشنی کے دائرے میں، اُس تنہا کنول میں، اُس نورانی شعلے میں ہی شعر و موسیقی کی پریاں رقص کرتی ہیں" — لیکن اُن کا یہ رقص بہت ہی کم عرصے کے لئے ہوتا ہے۔ اس قدر کم عرصے کے لئے کہ آنکھ اس پر جمتی ہی نہیں کہ منظر نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے، بے کراں ظلمت میں، اُسی پہلے بے حرکت ذہن کی تیرگی میں اور تخلیقِ فن سے یہ محرومی شاعر کے دل پر چوٹ لگاتی ہے۔

فن کار کے ہاتھوں سے ساز چھوٹ جاتا ہے۔ یہ ساز کہاں سے آگیا ؟ اُس نورانی دائرے میں شعر و موسیقی کی پریاں رقص کر رہی تھیں، شعر و موسیقی کا گہرا تعلق اس امتزاج سے ظاہر ہے اور شعر کو لکھنے کی کوشش بھی ایک طرح سے ایسی ہی تھی جیسی کسی مغنی کی ساز پر مضراب لگانے کی کوشش۔

ایک بات اور۔ دیر ہوئی مشہور غزل گو حامد علی خاں کی ایک نظم "معبد کا دروازہ" پڑھی تھی۔ اس نظم کا پہلا مصرعہ تھا "وقت کبھی گذرا ہی نہیں ہاں ہم گذریں تو گذریں ——— اور اس کے بعد کچھ اس قسم کا مفہوم تھا کہ آج تک مجھے وہ لمحہ یاد ہے جب میں اور تو دعا سے فارغ ہو کر معبد کے دروازے سے نکلے تھے۔ گویا شاعر کے لئے وہ لمحہ گذرا نہیں تھا، اُس لمحے کا اثر اُس کے ذہن پر اس قدر گہرا ہوا کہ اُس کے ذہن نے مستقبل کی طرف حرکت کرنا ہی چھوڑ دیا۔ ماضی ہی کا ایک پل اُس کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ بلکہ یوں کہئے کہ وہ لمحہ ماضی کا نہ رہا ہمیشہ کے لئے حال کا لمحہ بن گیا۔ حامد علی خاں کی اس نظم میں وقت کا جو تصور پیش کیا گیا تھا وہ حکیم آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت کے عین مطابق تھا۔ اردو شاعری پر بیسویں صدی کے علوم کے اثرات کی مثال کے لحاظ سے یہ نظم ایک بہت اونچا درجہ رکھتی تھی۔

اعجاز کی موجودہ نظم میں بھی ایک ایسا ہی پہلو نمایاں ہوگیا ہے۔ مصرعہ ہے "نور کے اک ذرّے سے بھی مختصر موہوم لمحے کے لئے" پہلے سائنس دانوں کا خیال تھا کہ روشنی کی ہستی چند لہریں ہیں، پھر بعض نے کہا کہ لہریں نہیں بلکہ یہ ذرّے ہیں، لیکن اب پھر سرجیمس جینز نے اپنا نظریہ پیش کیا ہے کہ روشنی لہریں بھی ہے اور ذرّے بھی۔ اس مصرعے میں "لمحے" کے وقفے کو نور کے ذرّے سے بھی مختصر کہا گیا ہے۔ ذرّہ جسامت رکھتا ہے، جسامت فاصلہ ہے وقت اور فاصلے کے متعلق یہ نکتہ بھی نظم کی ایک قابلِ توجہ خوبی ہے نظم کے شروع میں دائرے کی پھیلتی ہوئی لہروں کا تذکرہ ہے اس مقام پر شاعر نے تحریکِ شعری کے وقفے کو لہروں کے تصور سے ظاہر کیا ہے اور اب آگے چل کر واضح طور پر "نور کے ذرّے" سے بھی مختصر کہا ہے کیونکہ شعر ناتمام رہ گیا — لیکن یہ نظم مکمل ہوگئی۔ اور نظم بھی کیسی !

سکندر علی وجد کی نظم "شملہ" ایک کامیاب طنز ہے۔ اور اس شعر میں حقیقت کی تلخی کو دیکھئے گا "ہر چڑھائی جان گُسل کر ڈال سپاہی کے لئے، کون بدبخت آئے گا یاں داد خواہی کے لئے" اور اس حقیقت کی تلخی سے شاعر کے حساس ذہن میں جو ردِ عمل ہوتا ہے اُس کی نفرت انگیز اور شعلہ سامان

کیفیت کو آخری شعر میں دیکھئے "یہ طلسمِ سامری بے اصل و بے بنیاد ہے
یہ بھی اک جنت ہے، لیکن جنتِ شدّاد ہے!"

"سُہاگ گیت" قدرت اللہ شہاب کا تازہ ترین ترجمہ ہے جو ایک طبعزاد نظم کی دلکشی لئے ہوئے ہے۔ اس سے پیشتر گذشتہ سال آپ اسی شاعر کے قلم سے شیلے ہی کا ایک ترجمہ "اے بادِ غرب" دیکھ چکے ہیں شہاب کے یہ ترجمے اگر زیادہ دیر تک جاری رہے تو شیلے کو بھی اردو ہی کا شاعر بنا دیں گے۔

میراجی کی نظم "دو نقشے" میں مرد اور عورت کے اثر دینے اور اثر لینے والے پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا ہے اور گیت میں اِن دونوں طاقتوں کے اُس ملاپ کا ذکر ہے جس کے ناپائیدار ہونے کا شاعر کو یقین ہے کیونکہ وہ ہر چیز کی طرح "وفا" کو بھی فانی سمجھتا ہے۔

میراجی

ایک قطعہ

بن گیا مغرب سنہری بدلیوں کا گلستاں
جیسے کسی کے عارضِ گلگوں میں اک رنگِ انفعال
یوں سمٹتا جا رہا ہے شام کی آمد سے نور
کھینچتا ہو جس طرح پانی سے ماہی گیر جال

ادیب مالیگانوی

غزل

اوج کا پستی میں پنہاں راز ہے — آسماں تک خاک کی پرواز ہے
ہیں فضائیں پردہ تیرے ساز کا — یہ خموشی بھی تری آواز ہے
ہو چکے رمز آشنائے مرگ ہم — زندگی کا راز اب تک راز ہے
ہر نفس سے ہے مایہ دارِ زندگی — میرا ہر نغمہ شکستِ ساز ہے
ہوشیاری ابتدا کی بات تھی — میری مستی انتہا کا راز ہے
خاک کی تقدیس کا باعث ہوں میں — میرے سجدوں پر حرم کو ناز ہے
اس کو کنجِ آشیاں سے کیا غرض — جو ہلاکِ لذّتِ پرواز ہے
ہے نوائے راز خاموشی مری — عاشقی کا ساز بے آواز ہے
دیکھنے والوں کا رتبہ دیکھنا — خود مجھے اپنی نظر پر ناز ہے
کس نے دیکھا ہے مآلِ عاشقی — ختم ہو جانا یہاں آغاز ہے

کم کہاں ہوتی ہے تاباںؔ دل کی آگ
عشق کا انجام بھی آغاز ہے

ظفر تاباں

آئینۂ عالم

آزاد فرانس کا آخری سانس ـــــ!

۲۱ جون کو تین بج کر ۱۵ منٹ پر کمپین کے جنگل میں ایک گاڑی آکر رکی جس میں سے ہر ہٹلر، مارشل گورنگ، ہر وان ربن ٹراپ، ہر ہس، جرنیل ولیم کیٹل، جرنیل بروشیش اور مارشل امیڈر اترے۔ یہ ساتوں فوجی لباس پہنے ہوئے تھے۔ ہٹلر کے کوٹ کے دائیں جیب کے ساتھ ایک سنہری سا آئرن کراس لٹک رہا تھا۔ یہ لوگ وہاں فرانس کی آزادی کو موت کی آغوش میں سلانے آئے تھے۔ اس جنگل میں جہاں آج سے ۲۲ سال پیشتر تاریخ عالم کا وہ مشہور واقعہ پیش آیا جو موجودہ جنگ کا پیش خیمہ ثابت ہوا ہے۔ اسی جنگل میں کئی تاریخی واقعات پیش آ چکے ہیں۔ اسی جنگل میں لوئی شانزدہم اور میری انٹونی کی ملاقات ہوئی تھی۔ یہیں نپولین اور میری لوئی کی ملاقات ہوئی تھی۔ اور اسی جنگل میں آج سے ۵۱۰ برس پیشتر ڈیوک آف برگنڈی نے فرانس کی مشہور محب وطن جون آف آرک کو شکست دی تھی اور آج یہاں وہ واقعہ پیش آنے والا تھا جو شاید آئندہ جنگ عظیم کا محرک ہو۔

جہاں ہٹلر کی گاڑی رکی اس کے بالکل سامنے سورین کے بہادروں کی یادگار میں بنایا ہوا عظیم الشان مجسمہ تھا جس میں فرانس کو ایک تلوار ظاہر کیا گیا تھا اور وہ تلوار جرمنی کے شاہ باز کے سینے میں گھونپی ہوئی تھی۔ مگر آج جرمنوں نے اس مجسمے پر جرمن جھنڈے لپیٹ رکھے تھے تلوار کو سواستکا نے ڈھانپ رکھا تھا اور نیچے کندہ کئے ہوئے وہ الفاظ بھی جو سورین کے بہادروں کی یاد تازہ رکھتے تھے۔ جرمن جھنڈوں کے نیچے چھپے ہوئے تھے۔

ہٹلر اور اس کے ساتھیوں نے اترتے ہی اس یادگار پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور آگے نکل گئے۔ کوئی دو سو قدم کے فاصلے پر ایک پتھر زمین سے ابھرا ہوا نظر آ رہا تھا۔ یہ لوگ اس کے پاس پہنچ گئے اور اس پر کندہ الفاظ کو پڑھا۔ یہ پتھر گذشتہ جنگ عظیم میں فتح پانے کے بعد اتحادیوں نے نصب کیا تھا اور اس پر یہ الفاظ کندہ تھے:۔

"اس مقام پر گیارہ نومبر ۱۹۱۸ء کو ان آزاد اقوام کے ہاتھوں جنہیں جرمن اپنی غلامی کی زنجیروں میں پہنانا چاہتے تھے جرمنوں کے مجرمانہ غرور کو شکست ہوئی تھی۔"

۲۲ جون کو یہ پتھر اکھاڑ دیا گیا۔

اس مقام سے وہ سب ریلوے لائن کی طرف گئے اور ایک اور پتھر دیکھا جو بالکل اس مقام پر نصب تھا جہاں گذشتہ جنگ عظیم میں جرمن نمائندے مارشل فوش سے عارضی صلح کی درخواست کرنے آئے تھے۔ ہٹلر اور اس کے ساتھیوں نے اسے دیکھا اور مارشل فوش کی ڈائننگ کار میں جو عجائب گھر سے یہاں پہنچائی گئی تھی، چلے گئے۔ اندر آ کر ہٹلر مارشل فوش کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے سامنے مارشل فوش کا مجسمہ تھا۔ ہٹلر کے دائیں طرف مارشل گورنگ اور کیٹل تھے۔ میز کے ایک طرف بروشیش اور ہر ہس تھے اور میز کے دوسرے کنارے پر ربن ٹراپ اور کرنیل امیڈر تھے۔ میز کا ایک کونہ ابھی خالی تھا جہاں چار کرسیاں تھیں۔

۳ بج کر تیس منٹ پر ایک اور کار لورین کے بہادروں کے مجسمے سے کسی قدر فاصلے پر آ کر رکی جس میں سے جنرل چارلس ہنٹزگر، محکمہ فضائی کا جرنل جین میری جوزف بارگرٹ، امیر البحر موریس آکفینی لی لک اور پولینڈ کا فرانسیسی سفیر لی ان نیول برآمد ہوئے۔ یہ لوگ آج انہی جرمنوں سے عارضی صلح کی درخواست کرنے آئے تھے جنہیں انہوں نے گذشتہ جنگ میں شکست دی تھی۔ انہوں نے گاڑی سے اتر کر سامنے مجسمے پر ایک نگاہ ڈالی اور آگے چلے گئے۔ اتنے میں تین جرمن فوجی افسران کی

رہنمائی کے لئے آگئے۔ انہیں جرمن گارڈ آف آنر نے سلامی دی اور وہ مارشل فوش کی ڈائننگ کار کے دروازے پر جاکر تھوڑی دیر کے لئے رکے اور سر جھکائے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ ان کے داخل ہوتے ہی ہٹلر اور اس کے ساتھی ان کے استقبال کے لئے کھڑے ہوگئے۔ ہٹلر نے باری باری ہاتھ اٹھا کر نازی طریقے سے ہر ایک کے سلام کا جواب دیا۔ مارشل گورنگ اور مارشل امیڈر نے بھی اپنے ہاتھوں کو تھوڑا سا فضا میں بلند کیا۔ برڈشتیش اور کیٹل نے فوجی طریقے سے اور ہس اور ربن ٹراپ نے نازی طریقے سے سلام کیا۔ اس مختصر سے ڈرامے کے بعد ہٹلر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا، اور اس نے جنرل کیٹل کو اشارہ کیا، اس نے جیب سے ایک کاغذ نکالا اور پڑھنے لگا۔

" گیارہ نومبر ۱۹۱۸ء کو اسی ڈائننگ کار سے جرمنی کے مصائب کا آغاز ہوا۔ پھر ۳ ستمبر کو (۳۹) فرانس اور انگلستان نے کسی وجہ کے بغیر جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ اب چونکہ جرمنی نے فرانس کو شکست دے دی ہے۔ اس لئے فرانس عارضی صلح کی درخواست لے کر آیا ہے اور اگر اسی جنگل میں اس کا فیصلہ ہوتا ہے تو اُس بے انصافی کی تلافی ہونی چاہئے جو جرمنوں سے گیارہ نومبر کو کی گئی تھی اور جو جرمنوں، فرانسیسیوں دونوں کے لئے شرمناک تھی۔ اگرچہ فرانس کو پایانِ کار شکست ہوئی ہے مگر اُس نے نہایت پامردی سے مقابلہ کیا ہے۔ اس لئے عارضی صلح کے عہد نامے میں اس بات کو خاص طور پر پیش نظر رکھا جائے گا کہ فرانس سے ایسا سلوک کیا جائے جو ایک بہادر قوم ایک بہادر دشمن سے کر سکتی ہے۔"

۴ بج کر ۲۶ منٹ پر جب آفتاب کافی ڈھل چکا تھا فرانسیسی نمائندے مارشل فوش کی ڈائننگ کار سے نکلے اور انہیں ایک خیمے میں لے جایا گیا جہاں چار کرسیاں ایک میز اور ایک سٹول تھا جس پر ہاتھ دھونے کا سامان رکھا تھا۔ یہاں آکر انہوں نے ٹیلیفون پر اپنی حکومت کو صلح کی شرائط سے آگاہ کیا جو فل سکیپ کے تیس صفحوں پر پھیلی ہوئی تھیں۔

اس دوران میں بورڈو گورنمنٹ صلح کی شرائط کا نہایت بے تابی سے انتظار کر رہی تھی۔ اور مارشل پیتاں نے اہل فرانس کے نام ایک پیغام نشر کیا تھا جس میں اُس نے وعدہ کیا تھا کہ اہانت آمیز شرائط ہرگز تسلیم نہیں کی جائیں گی۔ لوگ نہایت بے تابی کے ساتھ فیصلے کا انتظار کر رہے تھے اور ابھی تک جنگ بدستور جاری تھی،

اُس رات فرانسیسی نمائندوں کو پیرس سے ۵۲ میل دور ایک اور مقام پر رات بسر کرنا پڑی۔ جہاں سے دوسرے دن انہیں پھر اسی جنگل میں پہنچا دیا گیا۔ وہاں آکر وہ پھر جنرل کیٹل سے ملے۔ اس دفعہ جنرل کیٹل کے ساتھ اس کے پانچ سکرٹری تھے۔ انہوں نے صلح نامہ کی ایک ایک شرط پر بحث کی جس کے دوران میں فرانسیسی نمائندے کوشش کرتے رہے کہ جرمن کسی قدر نرمی کا سلوک کریں۔ مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔

"دلِ شاہین نہ سوزد بہر آں مرغے کہ در چنگ است"

اسی دن جنرل کیٹل نے فرانسیسی نمائندوں کو بتایا کہ وہ سوچ بچار کے لئے اب مزید وقت نہیں دے سکتے اس لئے وہ انہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیں جس پر فرانسیسی نمائندوں نے کہہ دیا کہ وہ حرف بحرف صلح نامہ سے متفق ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے جب جنرل کیٹل اور فرانسیسی نمائندے مارشل فوش کی ڈائننگ کار میں رخصت ہونے سے پیشتر ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے تو فرانسیسی نمائندوں کے سرکردہ نے کہا۔

"ہم حکومت کے فیصلے پر عمل پیرا ہونے سے پیشتر آپ کی خدمت میں درخواست کرتے ہیں کہ جب مستقل صلح نامے کی شرائط ہوں تو اس وقت ہماری حالت کو پیش نظر رکھا جائے اور شرائط ایسی ہوں کہ دونوں ہمسائے باعزت زندگی بسر کر سکیں"۔

اس کے جواب میں مارشل کیٹل نے کہا۔

"شکست خوردہ دشمن کے ساتھ شرافت کا سلوک کرنا فاتح کے لئے عزت کا باعث ہوتا ہے"۔

جب مارشل کیٹل نے یہ الفاظ کہے تو فرانسیسی نمائندوں کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ بار بار رومالوں سے آنکھیں صاف کر رہے تھے، اُس وقت مارشل کیٹل نے ان کی طرف ایسی نگاہوں سے دیکھا جو کہہ رہی تھیں کہ اب دستخط کرنے میں دیر نہ ہونی چاہیئے۔ چھ بج کر ۵۰ منٹ پر (جرمن وقت) انہوں نے دستخط کر دیئے۔

فرانسیسی حکومت نے سرکاری طور پر صلح کی شرائط کے متعلق کوئی اعلان شائع نہ کیا لیکن لندن سے ان شرائط کا خلاصہ شائع ہوا جو حسب ذیل ہے۔

۱۔ لُوار کا شمالی مغربی علاقہ مع فرانس کی مغربی بندرگاہوں کے جرمن قبضے میں آجائے گا۔

۲۔ ملک کا انتظام جرمن افواج کریں گی جن کا خرچ فرانس برداشت کرے گا۔

(۳)۔ فرانس کی حکومت غیر مفتوحہ علاقے میں اپنے لئے دارالحکومت چن سکتی ہے۔

(۴)۔ فرانس کی برّی، بحری، اور فضائی فوجیں بالکل غیر مسلح کر دی جائیں فرانس ملک کے انتظام کے لئے ضروری فوج رکھ سکتا ہے۔

(۵)۔ فرانس کے بحری بیڑے کو اکٹھا کر دیا جائے۔ اُسے جرمن حکومت اپنے مقاصد کے لئے استعمال نہیں کرے گی۔ بلکہ اس سے فقط ساحلی علاقوں کی حفاظت اور سرنگیں صاف کرنے کا کام لیا جائیگا

(۶)۔ فرانس تمام جرمن قیدیوں کو رہا کر دے گا۔ جرمن حکومت فرانسیسی قیدیوں کو صلح نامہ ہونے پر رہا کرے گی۔

(۷)۔ قلعہ بندیوں کے اسلحہ جرمنوں کے حوالے کر دیئے جائیں گے۔ اس کے علاوہ برّی اور بحری حفاظت کے اسلحہ بھی جرمن حکومت کے حوالے کر دیئے جائیں گے۔

(۸)۔ غیر مفتوحہ علاقے میں اسلحہ سازی کار خانے بند کر دیئے جائیں گے

(۹)۔ فرانس کے تجارتی جہاز بندرگاہوں سے باہر نہیں جاسکیں گے اور جو جہاز اس وقت فرانس کی حدود سے باہر ہیں وہ فوراً غیر جانب دار ممالک کی بندرگاہوں میں چلے جائیں گے۔

(۱۰)۔ فرانسیسی طیارے پرواز نہیں کر سکیں گے، انہیں جرمنی اور اطالیہ کے قبضے میں دے دیا جائے گا۔

(۱۱)۔ فرانس کے تمام ریڈیو سٹیشن جرمن حکومت کے حوالے کر دیئے جائیں گے۔

(۱۲) مقبوضہ علاقے میں سے کوئی فرانسیسی اپنا قیمتی سامان لے کر باہر نہیں جاسکے گا۔

(۱۳)۔ فرانسیسی حکومت جرمنی اور غیر مقبوضہ علاقے کے درمیان آمدورفت کی آسانیاں بہم پہنچائے گی۔

(۱۴)۔ یہ عہدنامہ اُس وقت تک قائم رہے گا جب تک صلح نامہ مکمل نہیں ہوتا۔ اگر جرمن حکومت کو پتہ لگا کہ فرانس نے اس عہدنامے کی کسی ایک شرط کی بھی خلاف ورزی کی ہے تو وہ اسے منسوخ کر سکتی ہے۔

فرانسیسی نمائندے جرمنوں سے عارضی صلح کرنے کے بعد میونخ گئے۔ جہاں ہٹلر اور مسولینی سے ان کی ملاقات ہوئی وہاں سے وہ اطالیہ کے ساتھ صلح کرنے کے لئے روما گئے اور ۴۸ گھنٹے کے بعد واپس آ گئے۔ اس کے بعد ۲۵ رجون کو ایک بج کر ۲۵ منٹ پر جنگ ملتوی ہوگئی۔ ہٹلر نے دس دن تک جرمنوں کو جشنِ فتح منانے کا حکم دیا، اور فرانسیسی حکومت نے اتنے ہی دن تک ماتم کیا ——— !

تابش صدیقی

غزل

مری نگاہ کا مرکز ہے دو جہاں سے پرے
درِ زماں سے بروں حلقۂ مکاں سے پرے

حریمِ ناز میں داخل ہو کس طرح کوئی
کہ برقِ جلوۂ جاناں ہے آستاں سے پرے

قدم قدم پہ مٹا جا رہا ہوں منزلِ دوست !
میں جانتا ہوں کہ تو ہے مقامِ جاں سے پرے

فضائیں اور بھی ہیں دلکشا وہ کیا جانیں
اُڑے نہ ہوں جو کبھی کنجِ آشیاں سے پرے

خموش ہوں کہ خموشی ہے کائنات کا نطق
زباں یہ بولتے ہیں سرحدِ زباں سے پرے

مجھے ازل سے بنایا گیا ہے برقِ خیال
مری تلاش کرے کوئی کہکشاں سے پرے

سوادِ عرشِ بریں ہے مقامِ عشق امیں
زمیں سے دور بہت دور آسماں سے پرے

امین حزیں

غزل

دنیا دنیا عالم عالم تھے اک روز یہی ویرانے
وادی وادی جنگل جنگل چھان گئے تیرے دیوانے

دُبدھا پیدا کر دے دلوں میں ایمانوں کو دے ٹکرانے
بات وہ کہہ اے عشق کہ سُن کر سب قائل ہوں کوئی نہ مانے

امن و اماں کی دنیا میں بھی ایسوں کو کب ملتے ہیں ٹھکانے
کئی بار تو عشق گیا ہے موت کے مُنہ میں جان بچانے

آنکھیں مل کر بھی نہیں ملتیں اپنے بھی ہیں یہاں بیگانے
کوئی تیری بزمِ ناز میں کس کو پوچھے کس کو جانے

کانٹا کانٹے سے نکلے گا ایسے میں پھول کا کام نہیں
چبھنے والی بات تو کہنے چاہیے کوئی بُرا ہی مانے

اُسی درد سے دنیا غافل اُسی درد کا گھر گھر چرچا
ایک شبِ غم کی سو راتیں، ایک محبت سو افسانے

اوروں سے بھی ہنس کر رو کر جھوٹا سچا پیار کیا تھا
وہ بھی تھے نرے عشق کے حیلے وہ بھی تھے نرے غم کے بہانے

حُسن کو حسن سمجھ لینا بھی اے اہلِ دل کارے دارد
تم بھی چلے ہو کس کے آگے ہنسنے ہنسانے رونے رُلانے

اُوپر سے خوش ہو لے ناداں کام دہن کی ہے خیر اسی میں
پریم کے سکھ لوہے کے چنے ہیں موت ہو گر پڑ جائیں چبانے

تو نے ہوا کی بزم روی کو اپنے گنو پہ لگا ناچاہا
صید گہہِ ہستی میں ناداں یونہی خطا ہوتے ہیں نشانے

غفلت ہو تو کوئی چونکائے جاگے ہوؤں کو کون جگائے؟
ہائے وہ کارِ جہاں جس سے خود نکلیں بے عملی کے بہانے

عشق کی باتیں عشق کے چرچے گھر گھر میں ہیں عشق پہ لیکن
آنکھیں پڑیں اگر دنیا کی دنیا مشکل سے پہچانے

حُسن کے پاس اِس کا نہیں چارا عشق کا اس میں کیا ہے اجارا
یوں بھی پھر جاتی ہیں نگاہیں یوں بھی بدل جاتے ہیں زمانے

اپنی اپنی سب کو پڑی ہے کاش سمجھ میں یہ عشق کے آئے
حُسن سے بھی اُمید نہ رکھے اک دنیا سے بیر جو ٹھانے

دنیا سے کیا پوچھ رہا ہے سو انجان نہ ایک سجان
دنیا کو پوچھ اس کی نظر سے دنیا کو دنیا کیا جانے؟

اس کی نظر پر حیراں حیراں مجبوری بھی آزادی بھی
وہی کہے جو سب کے دل میں سب کی سنے اور اپنی مانے

دنیا اپنے رنگ محل میں خواب خوشی کے دیکھ رہی تھی
جس میں خوشی نے آنکھیں کھولیں تھے وہ محبت کے غم خانے

حسن و عشق بے سادہ دلی کے آپ اپنی توہین ہیں گویا
تھوڑی دیر کو بھولے بن لیں ہم بھی سیانے تم بھی سیانے

عشق ہے بے بس یہ تو ہے ظاہر دنیا بھر میں غیب سے لیکن
کون لگا ہے آگ لگانے قہر اٹھانے آفت ڈھانے؟

ذرّہ ذرّہ کُھل جائے گا اس دنیا کا وقت کی رَو میں
تو نے سنا ہے لُون کی پُتلی چلی سندھ کی تھاہ لگانے

یہ آئینِ وفا بھی برحق یہ تسلیم و رضا بھی درست
لطف و ستم کیا! حُسن بھی لیکن پیڑ پرائی کچھ تو جانے

ترکِ محبت بھی کرتا جا، دردِ محبت بھی سہتا جا
ایک ہی مت رکھتے ہیں ناداں دنیا بھر کے چتر سیانے

سامنے کی چیزیں بھی اچانک انساں کو چونکا دیتی ہیں
بزمِ طرب میں خواب یہ دیکھا ہمیں چراغ ہمیں پروانے

حُسن کی اوٹ میں جانے کب سے سوتی ہیں دنیا کی تقدیریں
نرگسِ رعنا دیکھ کے ہم بھی بیٹھے ہیں کس جادو جگانے

شعلۂ گل پر چادرِ شبنم سرتاسر تصویرِ حیات
رو لینا ہے ہنستے ہنساتے ہنس لینا ہے غم کے بہانے

صبر و سکوں بھی کیفِ نہاں بھی سازِ طرب بھی اُس کا کرم بھی
پھر بھی رنگ اُڑا جاتا ہے عشق کی باتیں عشق ہی جانے

یاد کسی کی کرتا بھی جا دل سے کسی کو بھلاتا بھی جا
پیتا بھی جا بھرتا بھی جا ہوش اور غفلت کے پیمانے

ذرّہ ذرّہ تارا تارا قطرہ قطرہ دریا دریا
ہوش و خرد ہیں حیراں، ان کو کیا کوئی جانے کیا کوئی مانے!

بھولے بھٹکوں میں کیوں اکثر منزل سے آتی ہیں صدائیں
گڑ جائے پاتال میں لیکن گلی گلی کی خاک نہ چھانے

ایک تغافل لاکھ توجّہ ایک تجاہل لاکھ پتے
اہلِ محبت تجھ سے چلے ہیں حال چھپانے بات بنانے

سوتی دنیا جاگ اٹھی ہے ذرّہ ذرّہ کانپ اُٹھا ہے
بیٹھے بٹھائے کیا سوجھی جو عشق لگا ہے قیامت ڈھانے؟

مجبوری آزادی نکلی، رنج پرستی شادی نکلی
دنیا کی تقدیریں پلٹیں عشق کی محنت لگی ٹھکانے

غفلت کیسی، کیا ہشیاری! بیداری کیا، خواب بھی کیسا!
دونوں کا ہے ایک ہی عالم کیا دیوانے کیا فرزانے!

بے پئے بغیر یہ جوش ہے ساقی، پینے کا کب ہوش ہے ساقی
دورِ شراب کہاں کہ ابھی تو ٹوٹتے جاتے ہیں پیمانے

مٹ مٹ کر یہ اُبھرنا گویا تیرے بائیں ہاتھ کا کھیل
تیری بڑی بات اے دنیا تیری مہما کون بکھانے؟

پر سکھوں کے نر بہتیرے، لیکن بات کے آ جانے پر
ضد تو وہی ہے جس کو زمانہ سو سمجھائے ایک نہ مانے

حُسن بھی تھا اپنی پرچھائیں، شامِ غریباں دیکھ فراقؔ!
عشق وہی ہے اب بھی لیکن چھوٹ گئے اپنے بیگانے

فراقؔ گورکھپوری

بیگم کی ریختی

لفظ ریختی سے نہ صرف زمانہ ماضی بلکہ حال کے ان بزرگوں کو بھی جن کا ظاہر اور باطن ایک ہوتا ہے کچھ ایسی کراہت ہونے لگتی ہے کہ جس کا اظہار میرے لئے دشوار ہی نہیں بلکہ محال ہے۔ چونکہ اس وقت میرا موضوع صرف عابد مرزا بیگم مرحوم کی ریختی گوئی ہے اس لئے میں ریختی کی ابتدا اور انتہا میں الجھنا نہیں چاہتا۔ کیونکہ اگر میں ریختی کے موجد کے کھوج میں قدم اٹھاؤں اور اس کو کسی طرح ڈھونڈھ کر یہ بتاؤں کہ ریختی کا موجد کون تھا اور اس کو ریختی کہنے کا خیال کیوں ہوا اور اس کے معاصر کون تھے اور میری تحقیق سے اور تذکرہ نویسوں کو اتفاق ہے بھی یا نہیں تو اس دلچسپ مجذوب کی بڑ سے کہیں ایسا نہ ہو کہ ان حضرات کو تکلیف ہونے لگے جو اس لطیف صنفِ شاعری کو ظاہرا برا سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اس وقت مجھے تحقیق کرنے کی ضرورت بھی نہیں اور وہ اس لئے کہ آج سے بہت پہلے قابل محققین نے اس کی انتہا کو پہنچ کر ایک موجد کو ڈھونڈ نکالا ہے۔ اس وجہ سے میں اس انتہا اور ابتدا کو یہیں ختم کرتا ہوں۔ البتہ اس کی پیدائش کیسے ہوئی اور اس کے اسباب کیا تھے۔ یہ باتیں آپ کو جناب تمکین کاظمی کی زبان سے سناتا ہوں جو انہوں نے آج سے دس سال پہلے اپنے "تذکرہ ریختی" کے مقدمے میں لکھیں۔ ان کا یہ کہا از حد دلچسپ بھی ہے اور قرینِ قیاس بھی ـــــ وہ فرماتے ہیں کہ

"وہ مرد جن پر عورتوں کے خیالات کا زیادہ اثر پڑا یا کسی قدرتی کمی سے ان میں نسائیت پیدا گئی تو وہ اپنے آپ کو عورت سمجھنے لگے حالانکہ قدرت نے انہیں مرد پیدا کیا تھا، مگر وہ منشائے قدرت کے خلاف نہ تو عورت بن سکے اور نہ مرد ہی رہے بلکہ ایک جداگانہ ہستی قائم ہو گئی۔ اسی طرح بعض عورتیں بھی اپنے اندر مردانہ جذبات اور مردانہ خصوصیات کو محسوس کرکے مرد بننے کی کوشش کرنے لگیں مگر وہ نہ تو مرد ہی بن سکیں، اور نہ عورت ہی رہیں بلکہ ایک جداگانہ حیثیت قائم کرکے درمیانی قرار پائیں، اسی طرح آپ کو درمیانہ مرد اور درمیانہ عورتیں اکثر ملیں گی۔ مردوں کے اس درمیانہ طبقے کے متعدد نام رکھے گئے اور مختلف ملکوں میں مختلف اسماء سے مشہور رہیں مگر عورتوں کی اس درمیانی صنف کا کوئی نام ہی نہیں تجویز کیا گیا۔ اور نہ کسی ملک میں کسی خاص نام سے شہرت ہوئی، چونکہ بہ نسبت مردوں کے ان کی تعداد کم تھی اس لئے الشاذ کالمعدوم کے تحت انہیں بمنزلہ صفر ہی سمجھا گیا۔

مردوں میں نہ صرف بعض اس درمیانہ روش پر گامزن نظر آتے ہیں بلکہ بعض ایسے بھی ہیں کہ ان میں سوائے لطافتِ خیال کے اور کوئی بات عورتوں کی سی نہیں ملے گی اور اسی طرح بعض عورتیں بھی نسائیت کا مکمل نمونہ ہوں گی مگر ان کے خیالات مردوں کے سے ہوں گے بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ اس قسم کے مرد اپنے آپ میں نسوانی خیالات کی موجودگی اور ان کے جذبات کی لطافت کو محسوس کرتے ہیں اور عورتیں اپنے تئیں مردانہ خیالات کی حامل سمجھتی ہیں۔ انہیں عورتوں کے متعلق بیگم صاحب نے کہا ہے

! تمہیں جن کے قلم ہے بات بن جن کی فہم تو اے بلا وہ عورتیں بھی مردوں سے کم نہیں یہی نسوانی خیالات کی رو تھی جو مردوں میں پیدا ہوکر ریختی گوئی کی باعث ہوئی۔ نہ تو کوئی فحش خیال اس کا محرک ہوا اور نہ میلوں، تماشوں کی سیر ہی۔۔۔۔"

ریختی شاعری کی ایک مستقل صنف ہے جس طرح کہ ریختہ میں مسدس، مخمس، قصیدہ، رباعی، سلام، مثلث، واسوخت، مثنوی وغیرہ موجود ہیں۔ اسی طرح ریختی میں بھی یہ تمام چیزیں موجود ہیں اور ان میں شعر کہے جاتے ہیں ریختہ میں یہ ہوتا ہے کہ مرد ہی عاشق ہوتا ہے اور مرد ہی معشوق۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ریختہ کے شاعر کا معشوق عورت ہوتا ہے اور وہ مخاطب بھی عورت ہی سے ہوتا ہے۔ چونکہ ہندوستان میں شاعری ایران سے آئی

اور فارسی شاعری میں عورت سے تشبیب کرنا معیوب سمجھتے تھے اس لئے انہوں نے مرد کو اپنا مخاطب بنایا اور اسی کا تتبع ریختہ میں بھی کرنے لگے۔ مگر میں نہیں سمجھتا کہ شعرائے ایران "بیٹی تجھے کہتی ہوں بہو تو سُن" جیسی دکنی کہاوت پر عمل کر کے مرد کے پردے میں عورت سے عشق کرتے ہوں۔ خیر کچھ ہی ہو مگر ریختی میں عورت عاشق ہوتی ہے اور مرد معشوق۔ چونکہ عورت شرم و حیا کی دیوی سمجھی جاتی ہے اس لئے یہ گوارا نہیں ہوتا کہ وہ اپنی زبان سے اپنے معشوق یعنی مرد کو اپنے جذبات ہجر و فراق، بوس و کنار، درد و غم سے آگاہ کرے۔

ریختہ اور ریختی کا فرق آپ نے محسوس کر لیا یعنی مرد اپنی مردانی زبان میں جو جذبات ظاہر کرتا ہے وہ ریختہ ہے اور عورت اپنی نسوانی زبان میں جو جذبات ادا کرتی ہے وہ ریختی ہے۔

عام طور پر ریختی کو فحش اور گندہ سمجھ کر ظاہراً اس سے احتراز کیا جاتا ہے کیونکہ اس صنفِ شاعری میں فحش استعارات اور گندی تشبیہات بہت ہوتی ہیں۔ مگر یہ گندگی ریختہ میں بھی موجود ہے۔ آتش، ناسخ، ذوق، وغیرہ کون ہے جو اس گندگی میں مبتلا نہیں، بعضوں نے گندے اور فحش الفاظ استعمال کئے ہیں اور بعضوں نے گندہ تخیل پیش کیا ہے۔ غرض دو لوں ایک حمام میں ننگے ہیں۔ آتش کا تخیل ناف میں اٹک کر رہ جاتا ہے تو بے ساختہ چیخ اٹھتے ہیں کہ

یہ جانتے تو تمہیں ہم نہ باندھنے دیتے ۔ کمر کے ساتھ لپیٹے گا ناف کو پٹکا

ادھر ناسخ کے دل میں گدگدی پیدا ہوتی ہے اور وہ شکم صاف کے مخمل پر پھسل پڑتے ہیں

شکم صاف سے قریں ہے کمر ۔ یا ہے مخمل پہ خواب مخمل کا

استاد ذوق بھی "مرا عشق کم خرچ بالانشیں" ہے کہہ کر اپنے چاوڑی بازار کے چکروں اور چکلہ گردی کی یاد تازہ کر دیتے ہیں اور لوگ ان شعراء کے تمام اشعار کو غور سے نہیں دیکھتے۔ اس قسم کے اشعار چھوڑ کر صرف چند اچھے شعر چُن لیتے ہیں، گویا ع سمیٹ لیتے ہیں پھولوں کو چھوڑ کر کانٹے
مگر افسوس ہے کہ ریختی کے مطالعے کے وقت ایسا نہیں کیا جاتا، فحش اور گندے خیالات کو چھوڑ کر عمدہ اور اچھے خیالات نہیں لے لیتے!

صنفِ ریختی میں نہ صرف غزل، قصیدہ، مخمس، مسدس، ہی کہے گئے ہیں بلکہ حمد، نعت، منقبت، مدح اور ہجو وغیرہ بھی اس میں موجود ہے۔

ریختی میں جذبات نگاری اور نفسیاتی کیفیت کا بیان نہایت عمدگی کے ساتھ اس زمانے سے ہو رہا ہے جبکہ ریختہ میں یہ بات بالکل مفقود تھی۔ رنگین، انشا، قلیں اور جان صاحب نے تو جذبات نگاری میں کمال کر دیا۔ معمولی سے معمولی واقعہ کو اس عمدگی سے نظم کیا کہ تعریف نہیں کی جا سکتی،

ریختی کے ایک اُستاد عابد مرزا مرحوم بھی تھے جو لکھنؤ کے باشندے تھے۔ مگر جوانی میں حیدرآباد آ رہے۔ عابد مرزا نام تھا، ریختہ میں سقیم اور ریختی میں بیگم تخلص کرتے تھے۔ ان کے اجداد شیراز سے آئے تھے اور کتاب خوانی کرتے تھے۔ بیگم کے والد حسین مرزا نواب خاص محل عالم اور نواب فخر محل محلات عالیات واجد علی شاہ اختر کی سرکار میں کتاب خوانی پر مامور تھے۔ ۱۸۵۷ء میں بیگم لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور مٹیا برج کلکتہ میں جان عالم کے زیرِ سایہ پرورش پائی۔

بیگم کو بچپن ہی سے شعر و شاعری کا شوق تھا۔ تیرہ سال کی عمر سے ریختہ میں شعر کہہ کر آغا حجو شرف سے اصلاح لینے لگے۔ الف الدولہ کے پاس خانم جان کو ریختی پڑھتے سنا تو آپ کو بھی ریختی کہنے کا شوق ہوا اور کچھ دنوں تک ریختی کا مطالعہ کر کے خود بھی ریختی کہہ کر مرزا علی بہادر گلشن الدولہ کو دکھانے لگے۔ اور تھوڑے ہی عرصے میں خاصی مشق پیدا کر لی، نواب لطف علی خاں ابنِ ابراہیم خاں نے ۱۳۱۵ھ میں ایک بہت ہی دھوم دھام کا مشاعرہ کیا اور بیگم کو بھی دعوت دی گئی تو یہ بھی شرکت کے لئے پٹنہ گئے۔ یہ مشاعرہ تین دن تک رات دن ہوتا رہا، بیگم نے وہاں کئی ایک رباعیاں پڑھ کر مشاعرہ میں خاصی دھوم مچا دی، منجملہ اور رباعیوں کے ایک یہ بھی تھی۔ اس رباعی میں شعرائے عصر پر چوٹ کی گئی تھی۔

جو شاد تھا اس کے دل کو ناشاد کیا ۔ محفل کو مشاعرے کی برباد کیا
کہہ کے جو دوسرے سے لایا تھا غزل ۔ آ کے مجھ سے موئے نہ کیوں یاد کیا

اس کو سن کر شاد عظیم آبادی مرحوم اور ان کے ساتھی برافروختہ ہو گئے اور جنگ و جدل تک نوبت پہنچ گئی اور بڑی معرکہ آرائی رہی مگر آخر میں نواب لطف علی خاں نے مصالحت کرا دی، اس طرح پٹنہ میں بیگم کی ریختی گوئی کی دھاک بیٹھ گئی۔

جب اختر پیا جنت کو سدھارے اور مٹیا برج اجڑ گیا تو بیگم کلکتہ کو خیرباد کہہ کر عظیم آباد چلے گئے اور چند دن وہاں رہ کر پھر بھوپال ہوتے ہوئے حیدرآباد آ رہے۔ حیدرآباد آ کر نواب محبوب یار جنگ بہادر مرحوم کے توسط سے حضرت غفران مکان نواب میر محبوب علی خاں بہادر آصف کے دربار میں باریاب ہوئے حضور نے بیگم کی ریختی سماعت فرما کر مسرت کا اظہار فرمایا۔

اور دو ہزار کا ملوان دو پٹہ مرحمت فرما کر سربلند فرمایا۔ اس زمانے میں استاد داؔغ کا طوطی بول رہا تھا بھلا نہیں کس طرح گوارا ہوتا کہ بیگم جو لکھنؤ کی تھیں اپنی میناکوان کے برابر لا بٹھاتے اس وجہ سے انہوں نے بیگم کو آگے بڑھنے نہیں دیا۔ مگر بیگم بھی ترپاہٹ پر آمادہ ہو گئیں اور دامن گرداں دوپٹہ کمر سے لپیٹ کر لیٹ ہی پڑیں اور حیدرآباد میں ایسے پنجے گاڑ کر رہیں کہ یہیں کی مٹی میں ۲۶ رجنوری ۱۹۴۰ء کو مل گئیں۔

بیگم دُبلے پتلے میانہ قد، سُرخ و سفید تھے، مزاج میں ظرافت تھی آخر وقت میں قویٰ بہت کمزور ہو گئے تھے، کان جواب دے چکے تھے، بصارت ساتھ چھوڑ رہی تھی بعض بعض وقت ہوش و حواس بھی انجان ہو جاتے تھے مگر باوجود ان تمام باتوں کے طبیعت ایک برق تھی کہ ہر وقت جولانیوں پر آمادہ نظر آتی تھی، ہمیشہ شعر سنانے پر تیار۔ ہر مشاعرے میں غزل کہنے پر آمادہ —— بیگم راقم کے کرم فرما تھے۔ جب کبھی ملتے کچھ نہ کچھ سناتے تھے آخر وقت میں اپنا کلام ترتیب دے رہے تھے مگر افسوس ہے کہ موت نے بیگم کی یہ آرزو پوری نہ ہونے دی، آپ مذہبًا اثنا عشری تھے اور کئی بار مقامات مقدسہ کی زیارت سے مشرف ہو چکے تھے۔

حیدرآباد آنے کے بعد مہاراجہ چندو لال کی بارہ دری میں ایک عظیم الشان مشاعرہ ہوا تھا بہت سے مشاہیر مثلاً شمس العلما مولانا حالؔی صاحب، عالم مرزا خورشید عالم بہادر گورگانی، اختر مینائی، اور علی برتر، حبیب الرحمٰن بیدلؔ، استاد جلیلؔ، شاد صوفی، نظم طباطبائی، شیفتہ کنتوری، نواب آصف یاور الملک وزیر، منشی لچھمی نرائن عارف جود ھپوری وغیرہ شریک تھے۔ اس مشاعرے میں آپس میں چوٹیں ہوئیں اور بیگم نے لکھنؤ کی طرفداری میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے۔ ایک طویل قصیدہ کہہ کر وہ دھوم دھام سے سنائی کہ دلی والوں کے چھکے چھوٹ گئے حقیقت میں یہ قصیدہ نہ صرف لکھنؤ کی بہترین زبان کا نمونہ ہے بلکہ اس میں اردو کی مختصر تاریخ بھی بیان کی گئی ہے اور اپنی داستان الم بھی سنائی ہے ——

ملاحظہ ہو:۔

سناتے ہو مجھے باتیں ہزاروں
کہوں میں بھی جو کچھ اپنی زباں سے

تو اس دم کر کری ہو جائے گی بس
سبھوں کے سامنے میرے بیاں سے

جسے کہتے ہیں اردو ہے وہ لشکر
سنی باتیں جو لشکر کی زباں سے

اسی کا نام اردو ہو گیا ہے
کوئی منکر نہیں میرے بیاں سے

ہوئی جب چھاؤنی دہلی میں آ کے پی!
وہاں لوگ آ گئے سارے جہاں سے

ہوا ہر قوم کے لوگوں کا مجمع
کوئی کابل کوئی مازندراں سے

عرب تھا کوئی اور کوئی عجم تھا۔
کوئی شیراز کوئی شیرواں سے

جو کیں آپس میں ان لوگوں نے باتیں
تو اردو کی زباں نکلی یہاں سے

زباں یا ست نجا بھونا ہوا تھا
کہ گرما گرم آیا ہو دکاں سے

نمک مرچیں ملی ہیں لکھنؤ میں
کہ اب تک رال بہتی ہے زباں سے

وہ اردو تھی کہ اک لکڑی کا چھیلا
نہ نکلے جس کے کانٹے باغباں سے

بنایا لکھنؤ والوں نے اس کو
تمہیں کیوں فخر تم لائیں کہاں سے

مری جاں لکھنؤ والوں کے آگے
بہت مشکل ہے کچھ کہنا زباں سے

نہ کہنا اب کبھی میں ہوں زباں داں
ذرا اللہ کو رد کو اس بیاں سے

میں اپنے وقت کی زیب النسا ہوں
جواب اپنا کوئی لائے کہاں سے

یہ کہنا ہے بہت سب سے جادو گانہ!
کہ "اچھی ہوں میں ہی سارے جہاں سے

نہیں کرتا زمانے کا ہے دستور
ثنا اپنی کوئی اپنی زباں سے

ہے فضلنا بڑی روٹی میں آیا
ذرا پوچھو میاں! حافظ میاں سے

کیا خالق نے پیدا ایک پر ایک
سنا میں نے یہ آنو کی زباں سے

زباں کے خلد کی ہے حور عورت
اگر ہو لکھنؤ کے بوستاں سے

زباں کے ملک کا سکہ ہے عورت
انوکھا ہے چلن سارے جہاں سے

زباں کا فیصلہ ہے عورتوں پر
یہ باتیں مردوے لائیں کہاں سے

زباں دانی ہے حصہ بیگموں کا
لڑائے کیا زباں کوئی زباں سے

نگوڑی سوت جل گکڑی کے ہاتھوں
بتنگ آئی بہت اب میں یہاں سے

یہ بیکاری بنی ہے سوت میری
نکلتی ہی نہیں میرے مکاں سے

وطن چھوڑا اسی شغل کے چلتے
دکن میں آئی میں ہندوستاں سے

چھڑایا مجھ کو پیاروں سے اسی نے
چھپا کے منہ چلی آئی وہاں سے

موئی کو لاگ مجھ سے ہو گئی ہے
یہاں بھی آن لپٹی میری جاں سے

سنا اس نے مجھے دی مفلسی کی
نتیجہ خوب نکلا امتحاں سے

غرض ہونا ہے جو ہو جائے مجھ پر
میں کچھ کہتی نہیں اپنی زباں سے

مری اب پرورش فرمائیں آصف
کنیزی میں ہوں میں دل سے جاں سے

تو میری مفلسی اس طرح بھاگے
کہ جیسے تیر چھٹتا ہے کماں سے

جو مجھ کو عرض کرنا تھا کیا بس
دعا بیگم یہ ہے دل سے زباں سے

بجے چاروں طرف آصف کا ڈنکہ
خراج اس کو ملے سارے جہاں سے

آپ اس قصیدہ کو دیکھ چکے اب فرمائیے کہ اس میں کیا کچھ نہیں ہے! اس قصیدہ میں بیک وقت لطافت زبان، تاریخ اردو اور آپ بیتی کا

اتنا عجیب وغریب امتزاج ہے کہ دنیائے شاعری میں اس کی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔

بیگم کی اس قصیدی سے دلی اور لکھنؤ والوں میں ایک آگ بھڑک گئی طرفین آمادہ ستیز و فساد ہو گئے۔ جب یہ کیفیت کسی طرح حضرت غفران مکان تک پہنچی تو حضرت نے ایک فرمان کے ذریعے رفع شر فرمادیا۔

شاعر وہی اچھا سمجھا جاتا ہے جس کے اشعار میں نفیس استعارات، خوبصورت تشبیہات، بہترین محاورات ہوں، روزمرہ صاف، نشست الفاظ اچھی، تخیل میں بلندی ہو۔ اگر اس کے ساتھ ہی ساتھ طنز کا استعمال بھی وہ لطیف پیرائے میں کرے تو شاعری کو چار چاند لگ جاتے ہیں — اب آپ یہ تمام چیزیں بیگم کی ریختی میں ملاحظہ فرمایئے۔

یوں تو ریختی شاعری میں ہر موضوع پر کچھ نہ کچھ ضرور ملے گا لیکن اتنا بھی نہیں جس کے لئے مکمل کا لفظ استعمال کرنا پڑے بلکہ ایک حد تک — اخلاق اور فلسفہ کے بعض نکات جنہیں ریختہ کے شعرا نے بھی بیان نہیں کیا آپ کو ریختی میں ملیں گے، جانصاحب کا ایک شعر ہے۔

کھلتی ہے جبھی ٹھوکریں کھانے کی حقیقت ؎ سر پر جو کوئی چاہنے والا نہیں ہوتا

غور کیجئے یہ شعر حقیقت اور مجاز دونوں طرف پہنچتا ہے۔ کسی پیرومرشد کو سنا دیجئے تو پھڑک اٹھے گا کہ بھئی کیا کہنے واقعہ یہی ہے "بے پیرا بے دھڑنا" ہوتا ہے یا ایک ہادی اور مرشد کی ضرورت ہے ہی — اور یہی شعر کسی دنیا دار کو سنا دیجئے تو بے تحاشا کہے گا کہ واہ حضرت! کیا بات ہے سچ کہا ہے "مربی بیار و مربہ بخور" مگر واقعہ یہ ہے کہ جانصاحب نے سرسری طور پر اپنی مخاطب بیگم کو "کسی ایک سے دل لگانے" کا سبق دیا ہے۔ لیکن بیگم اس سے بھی آگے جاتے ہیں۔ وہ بعض دفعہ ان رموز و غوامض کو اپنی ریختی میں بیان کر دیتے ہیں جو اہل حکمت و فلسفہ کے درس کا موضوع ہوسکتے ہیں، یہ شعر سنئے۔

قطرے میں تھا انسان، بڑا پیٹ میں جس دم
روتا ہوا جب گود میں آیا تو بشر تھا

اب آپ اس کو قرآنی آیت سے منطبق کیجئے یا علم التشریح سے ثابت کیجئے یا روزمرہ کے واقعات میں شمار کر لیجئے۔ مگر بیگم نے ایک بڑی پتے کی بات کہی ہے۔ مصرع ثانی کی بے ساختگی دیکھئے

ع روتا ہوا جب گود میں آیا تو بشر تھا

نعرہ کہہ کر اشارہ کر دیا وضاحت نہیں کی ورنہ لوگ ناک بھوں چڑھاتے حالانکہ اس شعر کو طالب علم، مولوی اور مشائخ سبھی پڑھتے ہیں۔

اے قطرۂ منی سر بیچارگی بنہ ؎ کابلیس را غرور منی خاکسار کرد

مگر اسی مادہ منویہ کو کہیں ریختہ یا ریختی میں بیان کیا جائے تو لوگ بدک جاتے ہیں، اسی خطرے کو محسوس کر کے بیگم نے قطرے کو محدود کر دیا ہے۔ نو مہینے کی ڈائری صرف دو مصرعوں میں بیگم نے بیان کر دی اور قطرے کا بیان کر کے ایک جیتے جاگتے بشر کو سامنے کھڑا کر دیا ہے۔

بیگم کے کلام میں محاسن شعری تقریباً کل موجود ہیں لیکن میں صرف چند شعر نقل کرتا ہوں، طنز، شعر کی جان ہے۔ اس کو بیگم بڑی عمدگی سے ادا کرتے ہیں، اللہ میاں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔

مجھے غم سوت کو شادی ہے تیری شان کے صدقے ؎ میں روتی ہوں وہ خوش ہوتی ہے سُن کر داستاں میری

"تیری شان کے صدقے" اللہ میاں سے تخاطب ہے اور پھر اس میں عجز و انکسار نہیں بلکہ گہرا طنز ہے۔

فراق کے مضامین ریختی میں بہت باندھے جاتے ہیں اور بیگم نے بھی ان مضامین کو خوب جی کھول کر باندھا ہے۔ یہ شعر بھی انہیں میں سے ایک ہے

وہ ہیں پردیس میں اور غیر ہے حالت یہاں میری ؎ یہ ساون کا مہینہ اور یہ انگڑائیاں میری

ہندی میں ہزاروں گیت ساون کے متعلق ملیں گے جن میں فراقیہ مضامین ہوتے ہیں مگر بیگم نے اس ایک شعر میں ایک پورا گیت بھر دیا ہے ساون کے مہینے میں انگڑائیاں لے کر رہ جانا انتہائی فراق زدگی ظاہر کر رہا ہے۔ ساون میں جھولا جھولتے ہیں، پکوان اور تلن ہوتے ہیں، ہمجولیوں کے ساتھ چہلیں ہوتی ہیں۔ یہ سب چھوڑ کر انگڑائیاں لیتے ہوئے بیٹھے رہنا انتہائی حزن و ملال ظاہر کرتا ہے۔

بیگمات کا قاعدہ ہے کہ ماما چھوکری، انا، دایا کو ڈانٹ ڈپٹ کرتی ہی رہتی ہیں۔ ان مضامین کو بھی بیگم نے افراط سے باندھا ہے۔

کرتی تھی ادھر کام ادھر دیکھ رہی تھی ؎ اے چھوکری اس وقت ترا دھیان کدھر تھا

نہ ٹلے گی اری تھوڑا سا پانی چھوکری تب تک ؎ مسالہ ہو گیا ہے خشک کیسے کر سل سے نکلے گا

ذرا چولھے کا سوا لے بی دیا دیکھتی کیا ہو ؎ لیا ہے پھیر بچے نے بڑی مشکل سے نکلے گا

اس شعر میں بیگم نے زچگی کا پورا کورس بیان کر دیا ہے اور ایک محاورہ محلات کا بھی لکھ گئے ہیں،

بچہ ولادت کے وقت ٹیڑھا ہو جاتا ہے تو اسے پھیر لینا کہتے ہیں اس وقت بڑی مشکل ہوتی ہے۔ ہماری لیڈی ڈاکٹرز تو اس آڑے بچے کو عموماً کاٹ کر نکالتی ہیں مگر پرانی دایہ اسے راہ راست پر اس طرح لاتی ہے

زچہ کے پیٹ کو مل کر بچے کو سیدھا کر لیتی ہے۔ اس عمل کو "چول اُکاسنا یا چولین اُکاسنا کہتے ہیں"، اس قسم کی اصطلاحات سے بیگم کا کلام بھرا ہوا ہے۔

اک ذرا سے گندے پانی کے لئے، توبہ! توبہ توڑ ڈالی جائے گی؟

شراب کو عورتوں کی اصطلاح میں گندا پانی کہتے ہیں وہ اس ذرا سے گندے پانی کے لئے توبہ جیسی چیز توڑنے کے لئے تیار نہیں — کتنی حیرت سے کہتے ہیں "توبہ! توبہ توڑ ڈالی جائے گی"

عورت کی فطرت کو بیگم نے بڑی عمدگی سے نمایاں کیا ہے اس قسم کی جھلک بیگم کے سیکڑوں اشعار میں پائی جاتی ہے اور عورتوں کی نفسیات کو بڑی سلیقگی سے ظاہر کیا ہے۔

جونک سک سے ہوا اچھا اس کو دل سے پیار کرتی ہوں
میں بڑھیا ہو گئی ہوں پر طبیعت ہے جواں میری

کیا اثر بخشا ہے اللہ کی قدرت کے نثار
نام سے مردوے کے آتی ہے فرحت دل میں

ریختی میں یوں تو جذبات نگاری بہت کی جاتی ہے مگر فطرتِ نسوانی کی بعض مثالیں بہت کم دی جاتی ہیں، مثلاً ماں کی محبت۔ جان صاحب وغیرہ نے اس پر بہت کم توجہ کی ہے مگر بیگم ان چیزوں کو وضاحت سے بیان کرتے ہیں۔

آگ جس طرح سے پتھر میں چھپی رہتی ہے
ماں یوں ہی رکھتی ہے اولاد کی الفت دل میں

دیکھئے محبتِ مادری کی کتنی عمدہ مثال دی ہے۔

بیگم تھے تو عہدِ واجد علی شاہ کی پیداوار مگر نئی روشنی سے اُن کی آنکھیں بھی کھل گئی تھیں نئے نئے مضامین بڑی عمدگی سے باندھتے تھے اور فخر سے سناتے بھی تھے،

الٰہی خیر ان کی جان کی ہو ایک مدت سے
نہ وہ آئے نہ خط آیا نہ کوئی ان کا تار آیا

صرف یہی نہیں کہ تار اور ڈاک کی حد تک بیگم نے مضامین باندھے ہوں بلکہ وہ سیاسیات میں بھی عورتوں کو دخیل کرانا چاہتے ہیں اور کونسل تک پہنچانے کے آرزومند تھے۔

پھر نوئی عورتوں پر جو ہو تھوڑا ہے ظلم
کونسلوں میں جب کوئی خانم نہیں بیگم نہیں

یہ شعر بیگم نے کوئی بیس سال پہلے کہا تھا اللہ کی شان کہ آخر کونسلوں میں بیگمیں اور خانمیں آ ہی گئیں — اسی طرح بیگم نے عورتوں کو منظم ہونے کی تلقین بھی کی ہے۔

بیویاں بہتیری لیکن ان کی مجلس بھی تو ہو
چند تصویریں ہیں حیران اور کوئی انجمن نہیں

بیگم اس مرد کے قائل نہیں جو صرف تیوری پر بل ڈالے اینٹھتا پھرے وہ تلوار کے کس بل کے قائل ہیں۔

مردوے تلوار کا کس بل نہیں دم خم نہیں
بل ہے تیوری پر تو ہو، بندی کو اس کا غم نہیں

ان مردوں سے زیادہ اُن عورتوں کے قائل ہیں جن کی بات میں اثر اور ہاتھ میں قلم ہو۔

ہاتھ میں جن کے قلم ہو بات میں جن کی اثر
اے بوا! وہ عورتیں بھی مردوں سے کم نہیں

بیگم کی سب سے بڑی خصوصیت ان کا روزمرّہ تھا اس زمانے میں یوں تو کئی ایک ریختی گو ہیں مگر تین ریختی گو زیادہ مشہور رہیں، بیگم، شیدا، عنقا، بیگم چونکہ لکھنوی الاصل تھے محلاتِ واجد علی شاہ میں پرورش پائی تھی اور صحبتیں بھی استادوں کی رہیں۔ اس لئے ان کی زبان منجھ گئی۔ شیدا صاحب دریاباد کے ہیں ان کو بیگم پر صرف ایک فضیلت حاصل ہے کہ انہوں نے دیوان مرتب کر کے چھپوا لیا ہے۔ یوں ریختی خوب کہتے ہیں مگر بیگم کی سی بات ان میں کہاں — تیسرے عنقا بیگم ہیں جو ریاست بہاولپور کے رہنے والے ہیں۔ جان صاحب وغیرہ کے کلام کو سامنے رکھ کر انہوں نے ریختیاں کہی ہیں مگر کوئی بات پیدا نہ کر سکے، شیدا پھر بھی ان سے کروڑ درجے غنیمت ہیں۔ البتہ انہوں نے اپنا کلام شیدا سے پہلے چھپوا ڈالا۔ انشاء اللہ آئندہ کسی فرصت میں شیدا اور عنقا کے کلام پر روشنی ڈالی جائے گی۔

بیگم کے روزمرہ کے شعر بھی سن لیجئے۔

دل کسی کو کیوں دیا، بی ہاتھ ملتی ہو جواب
چیز اپنی جب تلک اپنے پاس ہے، جوکھم نہیں

لے گئی جب سے مری سونے کی جوشن کندن
ادہی کیا ننگے سے لگتے ہیں بازو میرے

اٹھا پردہ تو بی لیلیٰ کی عصمت کا یقین آیا
بوا، مجھ کو گماں تھا مردوا محمل سے نکلے گا

پکڑتا ہے کوئی یوں بھی کسی کا ہاتھ چھوڑ دو بھی
ہوئی جاتی ہیں ٹھنڈی دیکھو مرزا چوڑیاں میری

جان اگر ہے جانے والی جائے گی
بات تو اُن کی نہ ٹالی جائے گی

بھاگ جائے گی یہ جب ہو گی جواں
چھوکری مجھ سے نہ پالی جائے گی

تشبیہات میں بھی بیگم کو کمال تھا بعض تشبیہیں بڑی عمدہ ہیں، غیر منظم اور منتشر بیویوں کو "حیران تصویریں" کہنا کس قدر بلیغ تشبیہہ ہے۔ یہ ان کی جدید تشبیہہ ہے مگر پرانی تشبیہیں بھی انہوں نے بہت استعمال کی

ہیں۔ مثلاً چاندنی خانم کے گورے منہ پر کالے تل دیکھ کر اسپند رسانی کے دانے یاد آ گئے۔

ف نظر تو سارے دانے ہیں یہ اسپند کے گورے منہ پر چاندنی خانم کے کالے تل نہیں

ہو بیاں بہتیری لیکن ان کی مجلس بھی تو ہو چند تصویریں ہیں حیراں اور کوئی البم نہیں

محاوروں کے استعمال میں بھی بیگم کو بڑی مہارت تھی چند شعر نقل کئے جاتے ہیں جن میں بیگم نے محاورے باندھے ہیں بعض اشعار میں ایک ساتھ دو تین محاورے باندھ جاتے تھے چنانچہ اس شعر میں "پوٹا تر ہونا" "ٹیں ٹیں کرنا"۔ میاں مٹھو تین محاورے باندھ دیئے اگر ریختی کا محاورہ "رہنا" بھی اس میں شمار کیجئے تو چار ہوتے ہیں۔

ساتھ سبزہ کے رہے اب تو ہوا پوٹا تر! مجھ سے ٹیں ٹیں نہ کرو لے میاں مٹھو میرے
سوت تو جل گئی جل جل کے میں اب مرتی ہوں کیا کہا جو بھی نہیں گے یہ ددا جو میرے

نہ کوئی دوست دم آیا نہ کوئی جاں نثار آیا اگر آیا بھی کوئی یار تو مطلب کا یار آیا
ابھی آیا ابھی اٹھ کر چلا اے مردوے دم لے کبھی بھوے سے آیا بھی تو گھوڑے پر سوار آیا

گرے بجلی الٰہی! ایسے سانٹے کا رپاے جی کھٹائی میں موے نے ڈال رکھیں بالیاں میری

بیگم کے پاس مذہبی خیالات کی بھی بہتات ہے نعت خصوصاً اچھی کہتے تھے۔

پہنچے نہ جہاں وہم وہاں تیرا گذر تھا داری گئی تجھ پر تو ملک تھا کہ بشر تھا

اسی زمین میں معراج کا بیان کرتے ہیں۔

معراج کی شب سنتی ہوں احمد میں احد میں تھا میم کا پردہ یہ ادھر تھے وہ اُدھر تھا

اہل حال اس میم کے پردے پر سر دھنتے ہیں، احد اور احمد کو میم کا پردہ بیچ میں ڈال کر جدا جدا کر دینا بیگم کی انتہائی مذہب پسندی اور توحید دانی ہے ورنہ عام نعت گو شعرا تو میم کا پردہ اٹھا کر احمد کو احد ہی بنا دیتے ہیں، اس سے بیگم کی احتیاط اور مذہبی دانشمندی کا پتہ چلتا ہے۔

یہاں تک تو میں نے صرف وہی شعر پیش کئے ہیں جو مجھے پسند بھی تھے اور جن کے متعلق کچھ کہنا بھی تھا۔ اب آپ ذیل کے کلام سے اپنی پسند کے شعر انتخاب کر لیجئے۔

نوج ہو اس موسے بے دید کی چاہت دل میں چھٹ مری سوت سے رکھے جو محبت دل میں
آنکھ کیا اوس سے لڑی کر دیا جادو مجھ پر کھنچ گئی پل میں اجی یار کی صورت دل میں

ایک پہیلی ہے سنو کہتی ہوں کچھ مشکل نہیں ساری دنیا ہے مری آنکھوں میں باجی تل نہیں
بہت کا پیغام آیا سوت کو یہ سل نہیں کیوں دوا کرتی ہو دق ہوتی ہو کچھ حاصل نہیں
ظلم کر تا ہے مرے اوپر خدا حق ہے وہ دھڑک او موئے! سمجھا ہے تو شاید خدا عادل نہیں
آنکھوں آنکھوں میں کوئی دل کو اڑا کر لے گیا ڈھونڈھتی ہوں ہائے پہلو میں نگوڑا دل نہیں
سخت باتوں کی نہیں سننے کی مجھ کو تاب بے سنگدل تم ہو مگر پتھر کا میرا دل نہیں

محبت مجھ نگوڑی نے جہاں کی تو اس نے خاک چھنوائی جہاں کی
میں دیوانی ہوئی ہوں اس جواں کی نہیں پروا مجھے دونوں جہاں کی
بہن بے پوچھے میکے جاؤں کیونکر اطاعت فرض ہے مجھ پر میاں کی
مزے میں نے اڑائے زندگی کے نگوڑی سوت ہی نے خاک پھانکی
نبھے گی کس طرح مرزا سے لوگو! زمیں کی میں کہوں وہ آسماں کی
یونہیں دیکھا کیا حسرت سے مجنوں مگر لیلیٰ نہیں محمل سے جھانکی
نہ ہاری مانتا ہے تو نہ جیتی!! موئے تجھ میں ہے ہٹ دھرمی کہاں کی
بری ہوتی ہے اچھی شکل اے بی یہ عزرائیل ہے سارے جہاں کی
شگوفے باغ میں لاکھوں کھلائے جو نرگس چڑھ کے مہتابی پہ جھانکی
کیا جو چاہا تم نے ظلم مجھ پر زباں سے میں نے کچھ ہوں کی نہ ہاں کی
مقدر ہی برا ہے اپنا بیگم شکایت کیوں کروں میں آسماں کی

جاں اگر ہے جانے والی جائے گی بات تو اُن کی نہ ٹالی جائے گی
آہ میری یوں نہ خالی جائے گی سوت سر مونڈی نکالی جائے گی
خوب مہندی جب رچائی جائے گی پھر نہ ان ہاتھوں کی لالی جائے گی
جب کہوں گی ان سے کچھ مطلب کی میں بات میں بات اک نکالی جائے گی
یار کی تصویر کھینچی تو بوا حشر کے دن جان ڈالی جائے گی؟
اب جواں ہونے کو آئی چھوکری کب تری یہ لاابالی جائے گی
دیکھو دولھا کیا اسے دیتا ہے نیگ مانجھے لے کر چھوٹی سالی جائے گی
پان کیوں تو نے سحر کو کھا لیا اب بھلا ہونٹوں کی لالی جائے گی۔
سب مزے ہیں چار دن کے اے میاں ساتھ گوری اور نہ کالی جائے گی
عشق میں عزت بھلا کیا چیز ہے اونے پونے بیچ ڈالی جائے گی

مردوئے تلوار کا کس بل نہیں دم خم نہیں بل ہے تیوری پر تو مہندی کو ہاتھ کا غم نہیں
زال تو بیشک ہے تو بیٹا اگر رستم نہیں بار دھو دھو جوروں کا اور کمر میں خم نہیں

جنگ سے ہے صلح بدتر نوج ہو ایسا ملاپ   کونسا دن ہے یہاں ہل مل نہیں او دھم نہیں
تیری باتوں کے مرے دل میں ہزاروں گھاؤ ہیں   اور پھر بخیہ نہیں ٹانکے نہیں مرہم نہیں
یار ہے گی سوت گھر میں یار میں کیسے مزاج ہم   اب تو دل میں ٹھان لی ہے وہ نہیں یا ہم نہیں

جن کو معلوم یہ کرتب ہیں یہ جادو میرے   جن کے ہمزاد وہی لوگ ہیں لاگو میرے
مرد وے ڈولی کے ساتھ آئے نقیر ونکی طرح   یہ تو مجنوں سے سوا ہو گئے لاگو میرے
دیکھو اب بارہ اماموں کی قسم کھاتی ہوں   لوں گی ہیکل نہ کبھی دو دو ہی جگنو میرے
لے گئی جب سے میری سونے کی جوشن کندن   اوہی کیا ننگے برے لگتے ہیں بازو میرے
جو خبر لیتے ہیں ہر حال میں اس بیگم کی   یا الٰہی رہیں زندہ وہ کماؤ میرے

سونا میرا آباد سدا سوت کا گھر تھا   میں نے جو تمہیں دل دیا یہ اس کا ثمر تھا
صدقے گئی اللہ نے پروان چڑھایا   سچ پوچھو تو یہ میری دعاؤں کا اثر تھا
برسات میں سمدھن بڑی تکلیف اٹھائی   تم کیوں نہیں آئیں اجی خالی میرا گھر تھا
میں جاتی ہوں میکے نہ رہی ہوں نہ رہوں گی   اب تک جو دیا ساتھ یہ میرا ہی جگر تھا
جھک مار کے پھر کیوں مجھے تم بیاہ کے لائے   رہنا ہی نہیں گھر میں نہ منظور اگر تھا
ملنے کے لئے کل مرے گھر آئیں جو بیگم   کچھ نفع تمہارا تھا نہ کچھ میرا ضرر تھا

کھٹکتا ہے جو کانٹا سوت کا مشکل سے نکلے گا   نہ میرے دل سے نکلے گا نہ اس کے دل سے نکلے گا
پڑا رہتا ہے گھر میں دن چڑھے تک سوتے رہتا ہے   کسی کا کام کیونکر اس موئے کاہل سے نکلے گا
پلاؤں گی اسے شربت کے بدلے زہر کا پیالہ   بڑی ہی سخت جاں ہے سوت دم مشکل سے نکلے گا
اٹھا پردہ تو نبی لیلیٰ کی عصمت کا یقیں آیا   ہوا مجھ کو گماں تھا مرد وا محمل سے نکلے گا
پڑھے گی ریختی بیگم تو اک تعریف کا نعرہ   کسی کے منہ سے نکلے گا کسی کے دل سے نکلے گا

محبت کا یہی پیمانہ ہے کیونکر قرار آیا   روانہ ہو گئی جب روح قالب سے تو یار آیا
مری باندی نے باہر ہی سے باہر اس کو للکارا   نگوڑی سوت کے گھر سے جو کوئی چوبدار آیا
کہاں تھی رات کو چند تو اس گھر میں اس گھر میں   ترا عاشق تجھے دونوں جگہ جا کر پکار آیا
اجی بیگم مری پاپوش جائے سوت کے گھر میں   سواری میرے دروازے پہ کیوں لے کے کہار آیا

چمن سے دور ہوں ہے بس یہی سن کیا میں کیا زباں میری   کلیجہ تھام لو بی ابھی سنو تم داستاں میری
کیا ہے یاد کس نے کون ہے وہ چاہنے والا   ہیں رکے سے نہیں رکتی الٰہی ہچکیاں میری

۱۹۰۷ء میں بتقریب نوروز نواب مرزا شجاعت علی سفیر ایران نے کلکتہ میں ایک مشاعرہ کیا تھا جس میں طرح دی گئی تھی "ہیں شاد ہیں گلشن میں بے سامان بہار"۔ ان دنوں بیگم بھی کلکتہ میں تھے چنانچہ اس مشاعرے میں شریک ہو کر انہوں نے طرح میں دو غزلہ پڑھا۔ چونکہ عورتوں کی زبان میں واو عطف یا اضافت ترکیبی نہیں ہوتی۔ اس لئے بیگم نے بلا اضافت شعر کہے ہیں۔ چنانچہ اس دو غزلے میں سے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں۔

مجھ سے کیا پوچھتی ہے اے مری نادان بہار   گل کی لالہ کی نہیں کیا تجھے پہچان بہار
خود ہی پھولوں کو دیا رنگ خود ہی بھول گئی   ایسی ننھی مری ایسی مری نادان بہار
پانی پیتے ہیں گلستاں کی ہوا کھاتے ہیں   نازک اندام ترے گھر کے ہیں مہمان بہار

کنگھی چوٹی سے حسینوں کو جو رکھتا ہے درست   بال سنبل کے لگی آنے ہی سلجھانے بہار
آنکھ پتھرا گئی نرگس کی جو دیکھی آنکھیں   تیرے گالوں کو جو دیکھا لگی شرمانے بہار
ایک تو سوت موئی کا تھا جلایا مجھ کو   دوسری آئی ہے تو دل مرا تڑپانے بہار
سن کے بلبل کے ترانوں کو کہا بیگم نے   تیری تعریف کے گاتی ہیں یہ سب گانے بہار

قبل ازیں میں نے لکھ دیا ہے کہ بیگم نے تمام اصناف سخن میں فکر کی ہے لیکن خمسہ کے نمونے نہیں پیش کئے گئے تھے چنانچہ اب دو مخمسوں میں سے ایک ایک بند نقل کیا جاتا ہے

صاف کھلتا نہیں کیا شے ہے بھری شیشے میں   اے میں صدقے گئی دیکھو تو ذری شیشے میں
سن کے لاکن نے کہا مجھ سے اری شیشے میں   مے گلرنگ کی ہے جلوہ گری شیشے میں
بند کی ہے مرے ساقی نے پری شیشے میں

خاک ہے شاعروں کے پاؤں کی بیگم بہتر   پیسے جاؤ موئے جی بھر کے مجھے سن لیے مگر
جا کروں گی میں تیری آنکھوں میں سرمہ بن کر   خاکساران جہاں را بحقارت منگر
تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

۱۳۲۳ھ میں حضور نواب میر محبوب علی خاں بہادر غفران کی جوبلی کی تقریب میں بیگم نے ایک طویل قصیدہ کہی تھی جو انہیں دنوں گلدستہ "نغمۂ عندلیب" میں شائع ہوئی۔ اتفاقاً اس مضمون کے اختتام پر مجھے وہ قصیدہ ملی مگر افسوس ہے کہ اس کے زیادہ شعر نقل نہیں کر سکتا کیونکہ مضمون کے زیادہ طویل ہو جانے کا خوف ہے۔ یہ قصیدہ بہت طویل اور شرائط قصیدہ گوئی کی پوری پوری حامل ہے صرف مطلع نقل کیا جاتا ہے۔

بہار نے چمنستاں میں کی ہے گلکاری بنی ہوئی ہے دلہن باغ میں ہر اک کیاری

بیگم نے تقریباً پچاس سال تک شاعری کی ہے اور ان کا ذخیرہ شعر سارے کا سارا ریختی تھا — ریختہ میں بھی وہ بیگم (بے غم) تخلص کرتے اور ریختہ کے شاعر ہونے کا ادعا رکھتے تھے۔ مگر ریختہ میں ان کے شعر نہ تو پھلتے پھولتے تھے اور نہ ان کی طبیعت ریختہ سے مناسبت رکھتی تھی، اس طویل مدت ریختی گوئی میں انہوں نے ہزاروں غزلیں کہیں جن میں سے بعض گلدستوں رسالوں وغیرہ میں طبع ہوئیں اور بقیہ انہیں کے پاس رہیں۔ مرنے سے چند مہینے پہلے انہیں دیوان مرتب کرنے کا خیال پیدا ہوا تھا چنانچہ ترتیب شروع ہی کی تھی کہ قضا نے ان کے "دیوانِ حیات" کے شیرازے کو بکھیر دیا، اب ان کے کلام کی اشاعت کی کوئی امید ہے اور نہ حفاظت کی توقع، اس لئے میرے پاس جس قدر کلام ان کا رکھا ہوا تھا۔ اس میں سے ایک معتدبہ حصہ اس مضمون میں نقل کیا گیا ہے تاکہ کم از کم یہی حصہ محفوظ ہو جائے اور اس صنف سے دلچسپی رکھنے والوں کے کام آسکے۔

آخر میں ایک مرتبہ اور یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ ریختی اردو شاعری کی ایک بڑی اچھی صنف ہے اس سے نہ صرف ہماری گھریلو زبان اور ہماری عورتوں کے محاورے، اصطلاحات تشبیہات، وغیرہ محفوظ ہو جاتے ہیں بلکہ اردو زبان کا وہ تفوق بھی ظاہر ہو جاتا ہے جو دوسری تمام دنیا کی زبانوں پر اردو کو حاصل ہے۔ یعنی یہ کہ اردو ہی ایک ایسی زبان ہے جو مردوں کی الگ اور عورتوں کی جدا ہے۔ اس نسوانی، مردانی زبان کے اختلاف کو کوئی اور زبان نہیں پہنچ سکتی۔ سنسکرت، عربی، فارسی، انگریزی زبانوں میں سوائے ضمیر دل کے اختلاف کے اور کوئی اختلاف نسوانی اور مردانی زبان کے متعلق نظر نہیں آتا۔ یہ فخر اردو ہی کو حاصل ہے کہ اس میں مردانہ زبان، محاورے، اصطلاحات، تشبیہات الگ ہیں اور زنانہ الگ، ایسی حالت میں اس یادگار لسانی نمونے کو مٹانا اپنی زبان کی جڑیں کھوکھلی کرنا ہے۔ رہا شرم و حیا اور بے حیائی کا سوال سو اس کی آسان ترکیب یہ ہے کہ گندہ اور فحش محاورے اور تشبیہیں ریختی سے نکال دی جائیں اور بقیہ حصہ محفوظ کر لیا جائے — کیا میں توقع کر سکتا ہوں کہ وہ لوگ جو اپنے آپ کو اردو کے خدمت گذار اور بڑے ادیب تصور کرتے ہیں۔ اردو ہندی کے سرسری اور شہرت بخش جھگڑے سے تھوڑی دیر کے لئے علیٰحدہ ہو کر میری اس تجویز پر غور فرمائیں گے۔

تسکین عابدی

تین رباعیاں

تاریک دھواں ہے ابتدائے ہستی
کچھ گرد و غبار انتہائے ہستی
کیونکر ہو منکشف حقیقت محشرؔ
دونوں سے مکدّر ہے فضائے ہستی

(۲)

یہ ابرِ سیاہ، یہ ترشّح، یہ بہار
کوئل کی یہ کوک اور یہ سبزے کا نکھار
بارش میں نہائی ہوئی یہ سرد ہوا
اب بھی نہ شراب پی تو جینا بیکار

(۳)

ہاں آج شرابِ زعفرانی برسے
میخانے میں روحِ شادمانی برسے
کافر ہے جو پینے میں پس و پیش کرے
جب ابر گھرا ہو اور پانی برسے

عباس بیگ محشر

شعرِ ناتمام

ایک پُر اسرار اور گہرا اندھیرا ہر طرف
رات کی آغوشِ لامحدود میں پھیلا ہُوا!
اور اُس گہرے اندھیرے میں نظر کے سامنے
ایک نورانی سا شعلہ کانپتا ہے۔ جس طرح
جھیل کے تاریک پانی میں کوئی تنہا کنول!
ایک زرّیں ساحرانہ روشنی کا دائرہ،
مرتعش، تاباں، حسیں،
جس کے گرد
دُھندلے دُھندلے نیلگوں ہالے سے ہیں،
شعر و موسیقی کی پریاں رقص کرتی ہیں جہاں
نور کے اک ذرّے سے بھی مختصر موہوم لمحے کے لئے!

عکس بھی اِس سحر آگیں رقص کا،
رُوح کے باریک پردے پر ابھی رُکتا نہیں،
چھو نہیں سکتا تخیّل نور میں بہتی ہوئی رعنائیاں،
اور اس سے پیشتر ہی دلفریب انداز میں
شعر و موسیقی کی پریاں تیز تر اک رقص کے
تھرتھراتے ریشمیں سایوں میں لہراتی ہوئی
بے کراں ظلمت میں ہو جاتی ہیں گُم ـــــ

ایک زرّیں چوٹ کے احساس سے
چھُوٹ جاتا ہے مرے ہاتھوں سے ساز،
شعر رہ جاتا ہے میرا ناتمام!

آنکھ اس سیّال جلوے پر ابھی جمتی نہیں

سعید احمد اعجاز

سونے میں پیلی!

"اچھا ہوا، ممتاز تم آگئیں۔ تمہارے وہ تو بالکل بدل گئے ہیں"۔

"سچ؟" (اس نے خیال کیا کہ وہ اس کی غیر موجودگی میں اداس اداس رہا ہوگا)

"ہاں، وہ تو اک دوسری کے گھر جا پڑے ہیں"۔

"جھوٹ"

"یقین نہ آئے تو تحقیق کرلو"۔

"کون ہے آخر وہ"؟

"بتادوں کہ تم اس سے لڑائی مول لو!"

"قسم لے لو جو میں اس سے بات بھی کروں"۔

"تو بن بات کئے تو بن بھی نہ آئے گی"۔

"خیر پھر دیکھا جائے گا۔ ہاں تو کیا نام ہے اس کا"؟

"کس کا نام"؟

"اُسی کا جس کے گھر وہ جا پڑے ہیں"۔

"ابھی کہاں، اب جا پڑیں گے (مستقبل کا تصور اس کی آنکھوں میں چمکا)

"ہٹو بھی تم مذاق کرنے لگے۔ تم ہی سفارش کر دو"۔

"کس بات کی"؟

"یہی کہ یہ اُس کا نام بتادیں"

"کہہ دو کہ تمہارے وہ اک بیاہتا کے گھر جا پڑے ہیں"۔ (وہ اک نامعلوم خوف سے لرزی)

"وہ اک بیاہتا کے گھر جا پڑے ہیں"۔

"تم نام نہیں بتاتے نہ بتاؤ۔ میں کیا ایسی بے وقوف ہوں کہ نہ سمجھوں گی"؟

"ذرا ہم بھی سنیں کہ تمہارے دماغ میں کیا نام آیا"؟

"تمہارے ہی گھر آپڑے ہوں گے۔ ہمیشہ سے یہیں بہت آتے ہیں"۔

"ممتاز، بس مجھے تو معاف کرو۔ میں ایسے لوگوں کو منہ ہی نہیں لگاتی ہوں"۔

"تمہیں غلط فہمی میں کیوں رکھوں، بتا ہی دوں، حمیدہ نے اُن کو اپنا لیا ہے"۔

"کیا کہا حمیدہ نے"؟

"ہاں ہاں حمیدہ نے"۔

"حمیدہ نے، خوب"!

(۲)

دو دن ہوئے ممتاز لکھنؤ سے واپس آئی تھی، گیارہ مہینے کے قیام کے بعد۔ اس عرصے میں اس کا منگیتر کئی بار وہاں گیا تھا۔ وہ اک بار اپنے محکمے کا کام انجام دیتے اور کئی مرتبہ اس سے ملنے اور اسے دیکھنے کی خاطر، یوں کہ اُس کی بڑی آپا نے جس کے یہاں وہ ٹھہری تھی اسے آزاد چھوڑ دیا تھا، پہلے ہی دفعہ جب اس کا "وہ" اپنی سالی کے یہاں ٹھہرا تو اُس کا پردہ توڑ دیا گیا تھا۔ زمانے کے تقاضات کو سمجھنے والی ماں نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ اس کے ساتھ اُس نے سینما بھی دیکھا تھا اور جب وہ سب کے ساتھ نمائش گئی تھی تو اُس نے اُس کی بڑی آپا کے لئے اک بندوں کا سیٹ بھی خریدا تھا۔ تب ہی سے ملاقات اور گفتگو کی راہیں کھل گئی تھیں یہاں تک کہ اس مرتبہ اس نے عید بھی لکھنؤ ہی کی تھی۔ اس کے ہر دورے میں اس نے اس بات کی کوشش کی تھی کہ اس کے دل میں اپنے خیال کو اس طرح بھر دے کہ کسی اور ناگن کا تصور اس میں سوئی کے برابر جگہ نہ پا سکے۔ کیا اپنی اس خواہش کی تکمیل میں وہ ناکام رہی تھی؟ غالباً ایسا نہ تھا —— اب جب وہ اپنی سہیلی سے ملنے آئی تو اس کے شوہر نے جو کچھ کہا وہ کیا محض ایک مذاق تھا۔ کیا اسے صرف چھیڑنا مقصود تھا یا وہ اک حقیقت تھی جس سے اُسے دوچار ہونا تھا۔ کیا اسے حمیدہ سے اس کے متعلق گفتگو کرنا چاہیئے؟ وہ سوچ

میں پڑ گئی۔

اسے معلوم نہ تھا۔ اور مستقبل کا حال کون جانے کہ اس کی دلہن کو ایسی کے دو دن بھی نہ گذرنے پائیں گے کہ یوں اک نیا گل کھلے گا جس کے کانٹے اس کے مخملیں سینے میں نامعلوم طریقے پر چبھ کر اسے اک خلش میں مبتلا کر دیں گے۔ اسے گمان بھی نہ تھا کہ حمیدہ اُسی کی آستین کا سانپ بن جائے گی جس کی موجودہ زندگی اسی کا ایک عطیہ تھی۔ کیا اس کا یوں بدلہ دیا جائے گا؟ جس کی زلفِ حیات کو سنوارنے میں اس نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا کیا وہی اس کی تر و تازہ پھول کی سی زندگی کو اس طرح پامال کرے گی؟ یا اپنی ایڑی سے اس طرح مسل ڈالے گی جیسے کوئی اک پتی کو شاخ سے جدا کر کے مرجھا دے؟ —— کیسی ہوسناک ہے یہ زندگی کہ چاہے جانے کے باوجود دوسرے اس لئے اپنی اداؤں کا جال پھیلائیں کہ "چند اٹھنے نہ پائے" والے گرفتار ہو جائیں — اور یہ چاہت بھی اس طرح حاصل کی جائے کہ فریقِ مخالف کو اس حملے کا علم بھی نہ ہو، خالی میدان پا کر تو سب ہی صیاد اپنا اپنا نشانہ سنبھالتے ہیں اس طرح کہ بعض ابھی پر تولنے بھی نہیں پاتے کہ ان کا سینہ داغدار ہو جاتا ہے۔ ممتاز کا تصوّر اک زخمی قمری کی طرح پرواز کرنے لگا۔

"وہ پرائے گھر جا پڑے ہیں" اس کی وہ طرح طرح کی تاویلیں کرنے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ حمیدہ اس سے زیادہ خوبصورت نہیں، سلونی رنگت، درمیانی جسم، موٹے بھدّے بازو، کیا اس کو صباحت چاہنے لگا اس علم کے باوجود کہ وہ جس سے ملتی ہے اسے دوسروں کے سامنے بے وقوف اُلّو ظاہر کرتی ہے وہ باور نہ کر سکتی تھی کہ صباحت کی غیرت اس بات کو گوارا کرے گی۔ اس نے گھر پہنچتے ہی آئینہ دیکھا اور اس بات کا اچھی طرح یقین کر لیا کہ وہ حمیدہ پر ہر لحاظ سے فوقیت رکھتی ہے اس نے سوچا کہ شاید جمال کے بجائے صباحت کا نام لے دیا گیا۔ وہ ہرجائی اگر ایسا کرے تو کوئی تعجب کی بات نہیں، وہ بھی اس کا رشتے کا بھائی ہے اور اس کو خاموشی کے ساتھ چاہتا رہا ہے شاید اس نے اپنا دل بہلاؤ تلاش کیا ہو —— وہی نا جس نے اس کے حنائی تلووں کو چوما تھا، وہ انجان بنی مسہری پہ لیٹی رہی تھی، جس کے ساتھ وہ بچپن میں کھیلا کرتی تھی اور شاید اب بھی کھیلتی اگر زمانہ بدل نہ گیا ہوتا اور وہ اپنی تعلیم جاری رکھنے کی وجہ سے اس سے دور، اس کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہو گیا ہوتا —— نظر سے دور، دل سے دور۔ لیکن ابھی وہ اپنے اس خیال کو پختہ نہ کر سکی تھی اور یہ سمجھنا چاہتی تھی کہ جمال اس تک کس طرح پہنچ پایا اور کیونکر اس کو رسم و راہ کے بڑھانے کا حوصلہ دیا گیا۔ اور خیال کے اس جال میں وہ اک مکڑی کی طرح پھنسی ہوئی تھی کہ بادرچیخانہ سے اُس کی ماں کی آواز نے اُسے چونکا دیا "ممتاز تو تمہاری چچی بلا رہی ہیں، حمیدہ شاید رک گئی ہوگی۔"

جب وہ واپس ہوئی تھی تو اُس کی بیوہ ماں نے جسے صرف اس کو بیاہنا رہ گیا تھا۔ اسے بتایا تھا کہ حمیدہ سہ پہر کو اس سے ملنے آئی تھی اور شام کو ہی اپنے بنگلہ واپس جانے کو کہتی تھی اب جو اس کو چچی نے بلایا تو اس نے خیال کیا کہ حمیدہ میری وجہ سے ٹھہر گئی۔ اسے بن ملے جانا بھی نہ چاہئے تھا۔ اچھا ہوا ایک نازک معاملے کی صفائی کا موقعہ اتنی جلد مل گیا۔ وہ خوش خوش اٹھی، سنگار میز کے آئینے میں اس نے بال دیکھ کر ان کو ہتھیلیوں سے جمایا اور پان کھا کر ملازمہ کے ساتھ باہر نکلی اور اک سنسان گلی میں چند قدم چلنے کے بعد حمیدہ کے مکان میں داخل ہوئی اور چچی کو سلام کرتی ہوئی سیدھی اس کے کمرے میں جا پہنچی۔ حمیدہ نے اسے دیکھتے ہی کہا "یہ بھی کیا لکھنؤ ہے جہاں سے اتنے بلاؤں کے بعد آئی ہو" اس کے شوہر نے اس کو سیدھے ہاتھ کی آغوش میں لے کر اس کے صندلیں ماتھے کو چوما۔

"مجھے کیا خبر تھی کہ تم بیٹھی ہوگی!"

"میں تو تم سے بغیر ملے چلی جاتی نا اور یہ دو دن سے جو تمام میں گھوم رہی ہو میرے یہاں آنے میں کیا ہل بیل لگتے تھے؟"

"ہل بیل نہیں، اک گھوڑا تو تانگے میں ضرور لگتا۔ تم اتنی دور تو رہتی ہو قریب کے گھروں میں ہی جانا نہیں ہوا، خالہ ہی کا گھر رہ گیا ہے۔"

"خیر خالہ کا گھر تو پھر دیکھا جائے گا —— جلدی سے اپنے کپڑے لے آؤ اور چلو میرے ساتھ"

"میں پرسوں کو آؤں گی۔"

"پرسوں ورسوں میں نہیں جانتی، نہیں چلو گی تو صباحت ہی کو رات بھر نیند نہ آئے گی۔"

"تو کیا وہ بھی تمہارے یہاں ہوں گے؟"

"اور کیا —— دفتر اور کلب کے علاوہ اس کا باقی وقت ہمارے ہی یہاں گذرتا ہے۔"

"خوب اپنی چیز کے ہوتے تمہیں پرائی سے کیا مطلب؟"

"اللہ رے پرائی —— گویا آپ بھی تو کوئی غیر ہیں —— یہ تو اب نہ جانے سے رہی، ذرا آپ چچی سے کہہ آئیے کہ ان کو ہم چار دن کے لئے مہمان لئے جا رہے ہیں"۔ اس کا شوہر تعمیل حکم میں اٹھ کر باہر چلا گیا تو ممتاز نے

پوچھا "تم نے ان پر کیا جادو کر دیا ہے"۔ وہ یہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ اس نے اپنے شوہر کو کس طرح اتنا اطاعت شعار بنا لیا ہے۔ لیکن حمیدہ نے اُن کا اشارہ اُس کے منگیتر کی طرف سمجھا "میں تو جادوگرنی ہوں نا، پگلی کہیں کی، یہ سب تیری ہی خاطر کیا ہے۔ آخر وہ جاتا بھی کہاں، اس کی ماں آگرہ میں، بہن اپنی نند کے یہاں، اکیلا گھر میں کیا تمہارے تصور سے ہی دل بہلاتا اور ہمارے یہاں کوئی ایسا نیا جانا تو ہے نہیں کہ تم کچھ اور سمجھو، آخر کانپور ریں بھی تو وہ ان کے پاس کئی سال رہا۔ اب چند دن کو یہاں بھی رہ گیا تو کیا بگڑ گیا"۔

"اچھا وعدہ کرو کہ آج سے چوتھے دن ان کی مہمانداری ختم"۔

"اچھی بات ہے تو اب چل رہی ہو؟"

"ہاں ہاں امی جان منع نہ کریں"۔

اس کا شوہر اجازت لے کر آ گیا، نوکر تانگہ بھی لے آیا تھا، وہ حمیدہ کے ساتھ چلی گئی۔

(۳)

جمال ساڑھے چار بجے دفتر سے واپس آیا تو اُس نے خالہ کو موجود پایا جو اپنی بڑی آپا کے سلام اور اپنی بھانجیوں کو دیکھنے آئی تھیں۔ انہوں نے حسبِ معمول اس کو گلے لگایا اور اس کے جواب میں اس کی کمر پر بزرگی کا ہاتھ پھیرا۔ ناشتہ دیتے وقت اس کی ماں نے اپنی بہن کے برتاؤ کو دیکھ کر اس سے کہا "خالہ ناراض تو نہیں معلوم ہوتی" جب اس نے جواب میں کہا کہ "ناراض ہونے کی بات بھی کیا تھی" تو اس کی بڑی بہن نے جو پاس ہی بیٹھی تھی۔ اس کو تسلی دی "اور کیا! ایسے بات بنانے والے کچھ بنا لیں تو کیا"۔ اس نے جلدی سے ناشتہ ختم کیا اور ہوا خوری کے لئے باہر نکل گیا۔

راستے میں وہ یہ سوچتا رہا کہ آخر اس خط، اک نامۂ محبت لکھنے کا اسے یہ صلہ کیوں دیا گیا کہ ممتاز کو بھی اس کی زندگی سے چھین لیا گیا۔ اس کی زندگی کی ناکامیوں کی تاریکی میں اک روشنی تھی جس سے اس کو محروم کر دیا گیا، اس کو اس طرح بے سہارا چھوڑ دیا گیا جیسے ایک اندھے سے اس کی لاٹھی چھین کر اسے بھٹکنے دیا جائے۔ اس کے دل میں آرزو کی چنگاری دبی ہوئی تھی جسے فراق کی تیز و تند آندھیوں نے بھڑکا دیا اور اس طرح سب نے اس کو جلتا دیکھ لیا۔ یوں تو اس خط میں کچھ بھی نہ تھا البتہ اس میں مرہم لگانے کی کوشش کی گئی تھی ان بھڑیوں پر جو ممتاز کی پنڈلیوں میں ابھر آئی تھیں لیکن اپنی قسم کا وہ پہلا خط تھا، جو اس کو پہنچا اور جس کا وہ کوئی جواب نہ دے سکی سوائے اس کے کہ اُس نے اپنے حجلۂ ناز پر کم خواب کے دبیز پردے کھینچ دئیے یا وہ دور رہنے اور اس کے سامنے نہ آنے کے لئے مجبور کی گئی۔ گو یا وہ کوئی آئینہ تھا۔ جس میں وہ اپنے شباب کا عکس دیکھ لیتی اور یہ چاہتی کہ دن میں کئی مرتبہ نہیں تو کم از کم اک بار ضرور اپنی جوانی کی اس جھلک کو عریاں پا لیتی جسے ابھی ایک آدھ سال زریں ملبوسات سے آراستہ رہنا چاہئے تھا۔

اس نے اس کی آمد سے قبل خواب دیکھے تھے کہ ملاقات کا کمرہ جو کھلا ہوا تھا اس کے لئے بند کر دیا گیا ہے۔ گویا مندر کے دوار میں قفل ڈال دیئے گئے ہیں اور مورتی — وہ اک دیوی تھی جس نے ابھی تک اپنے پجاریوں سے اعتنا نہ کی تھی — کئی ایوانوں سے محصور اک کمرے میں بند کر دی گئی ہے اور پجاری باہر کھڑا رہ گیا ہے۔ شاید اسی لئے وہ خالہ کے ہمراہ نہ آئی ہوگی۔ وہ تلافیٔ مافات کے لئے اک راہ تلاش کر رہا تھا۔ کسی طرح پہنچ کر وہ اپنے گذشتہ برتاؤ کی صفائی پیش کر دے لیکن یہیں اسے خیال آیا کہ ابھی ایک ہفتہ ہوا جب اس کے آنے کی خبر گرم تھی اس کے تصور نے استقبال کا ایک نقشہ اس کے سامنے لا کھڑا کیا تھا کہ وہ اس کے یہاں گیا ہے وہ اپنے کمرے کی چھت پر اپنے بال سکھا رہی ہے یا سورج سے اپنے تمتماتے ہوئے چہرے کا مقابلہ کر رہی ہے وہ اس سوچ میں ہے کہ کون بہتر ہے وہ یا سورج اور اپنا پلہ اس لئے بھاری سمجھ رہی ہے کہ اس نے اک خرمنِ ہستی کو جلا دیا ہے عشق و ارفتہ کی آگ میں اور وہیں سے اس نے اپنی نگاہوں سے یہ ظاہر کیا ہے کہ تم نے مجھے رسوا کیا۔ جاؤ اب میں کبھی تم سے بات نہ کروں گی۔ اپنے تخیل کی اس سرد مہری کے باوجود اس کا ارادہ تھا کہ وہ اس تک جائے گا اور اگر حقیقت میں وہ روٹھ گئی ہے تو وہ اس کو منائے گا۔ اسے روٹھوں کو منانے کا ایک بہت لطیف طرز آتا ہے۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اک بار اس نے اسے ناراض سمجھ لیا تھا اور جب وہ اُسے رخصت کرنے دروازے تک آئی تھی تو اُس نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر اس سے پوچھا تھا۔

"آپ ناراض تو نہیں ہیں"؟

"میں اور تم سے ناراض — کیوں آخر"؟

"یوں ہی میرا خیال تھا"

"اچھا خیال تھا۔ میں تو ناراض نہیں ہوں" اتنا کہہ کر وہ جلدی سے اندر بھاگ گئی تھی، شاید اس کی آنکھوں میں کوئی چور تھا لیکن اگر اب وہ اسے رخصت کرنے نہ آئی یا اگر اس نے یہ کہہ دیا کہ ہاں میں تم سے بہت ناراض ہوں تو شاید وہ اس کے پیروں پر گر جائے گا۔ اور اپنی آنکھوں کے موتی اس کے حسین قدموں میں ڈال دے گا۔ اس لئے کہ وہ جانتا تھا کہ اس کی ناراضگی

اس کے جیون کو انتہائی کٹھن بنا دے گی۔ آخر اس سے دلچسپی رکھنے کی خاطر تو اس کی ماں نے اسے اپنا بیٹا سمجھنے سے انکار کر دیا تھا شاید وہ اسے پتھر کے ایک مجسمے کی طرح ایک بے حس بت دیکھنا چاہتی تھی۔ ممتاز کو اپنانے کی معین فردوس تخیل سے اس کو حقیقت ـــــ (جو ہمیشہ تلخ ہوتی ہے ـــــ) کے زندان تاریک میں پھینک دیا گیا تھا تو اب اس کو اس دوزخ میں رہنا کیوں ناگوار ہوتا جو ماں کے پیروں تلے نہیں ہوتی؟

وہ ٹہلتے ٹہلتے کافی دور نکل آیا تھا۔ اس وقت ٹھنڈی سڑک پر جا رہا تھا یہیں وہ کلب واقع تھا جہاں امیر زادے تفریح کی غرض سے آیا کرتے تھے، اور جہاں پر جوا بھی ہوتا تھا لیکن اسے خلاف قانون تصور نہ کیا جاتا تھا۔ اس لئے کہ سرمایہ داری تمام عیوب پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ اس کے پاس سے گذرتے ہوئے اسے اس بات کا تلخ احساس ہوا کہ وہ غریب ہے، وہ اگر اس سے ملنے جائے تو کم از کم ظاہرات تو اس بات کا اظہار کرسکیں کہ وہ اس کے نہ ملنے سے کچھ ایسا متاثر نہیں، قمیص پر ایک پلوور ہونا چاہیئے پیروں میں مخمل کی سیک جوتیاں۔ اس لئے کہ فیستہ والے جوتے تو شیروانی کے ساتھ ہی پہنے جاتے ہیں اور اپنے عزیزوں کے گھروں میں، جو بہت ہی قریب ہوں، اسے پہن کر جانا اچھا نہیں معلوم ہوتا لیکن اگر کسی دوپہر کو یوں ہی ایک قمیص پہن کر جایا جائے تو شاید وہ اس سے یوں کہے گی "ابھی آپنے پل او ور نہیں خریدا" اور اس کے جواب میں اسے یہ کہنے کا موقع مل جائے گا "میں خریدنا نہیں چاہتا بُنوانا چاہتا ہوں" اس پر اگر اس نے ہمدردی کے لہجے میں یہ کہہ دیا "تو اون لا دیجئے" تو وہ اون کہاں سے لائے گا۔ وہ اس کی نظروں میں حقیر ہونا نہیں چاہتا۔ اس کا معیار زندگی اتنا اونچا تو ہونا چاہیئے جتنا اس کے "ان" کا۔ لیکن اگر وہ اس قابل ہوتا تو اسی کو اپنا لیتا، آہ، دولت سے سب کچھ خریدا جا سکتا ہے بھرپور جوانیاں، ان کا حسن و شباب، رفیقان عشرت، غرض خدا کی خدائی اور شاید خدا بھی۔ اسے اس غیر مساوی تقسیم دولت پر غصہ آیا جو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کو منتقل ہوتی ہے لیکن غریب کو نہیں پہنچ پاتی، اس کی غربت میں آنکھ کھلتی ہے مفلسی میں بسر ہوتی ہے اور بے کفن ختم ہو جاتی ہے۔ اس پر خدا کی رحمتیں اولاد کی بے شمار تعداد میں یوں نازل ہوتی ہیں جیسے بارش کے قطرات ـــــ جو ذرا سی دیر کو خشک زمین کو تر کرتے ہیں۔ لیکن ایک کھیت کے لئے پانی کے علاوہ گرمی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اسی سے غریب ہمیشہ محروم رہ جاتے ہیں۔

جاڑے کی شام تھی مغرب کا وقت قریب تھا۔ اس نے دیکھا کہ سیکریٹریٹ کے آٹھ آٹھ روپیہ ماہانہ کے ملازم سوں سوں کرتے اپنے جھونپڑوں کو واپس جا رہے ہیں، قابل رحم ہیں یہ انسان جو صبح سات بجے اپنی ملازمت پر آتے ہیں، صاحب کے کمروں کی صفائی کرتے ہیں۔ مالی کے لائے ہوئے تر و تازہ پھولوں سے ان کی میزوں کو آراستہ کرتے ہیں، چونکہ ان کا دفتر لنچ کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اسی لئے دن کے ختم ہونے پر کام بند ہوتا ہے، اچھا ہوا اس کے پاس بڑا کوٹ نہ تھا۔ ورنہ اس وقت وہ اس کے جسم پر ناقابل برداشت بوجھ بن جاتا۔

وہ بڑھتے بڑھتے اسٹیشن کے قریب پہنچ گیا تھا اور جب واپس ہونے لگا تو چودھویں کا زرد چاند نکل آیا تھا۔ اس کے جذبات نے ایک جوان کروٹ بدلی۔ اس پر یہ خواہش غلبہ پانے لگی کہ کاش وہ ایسے میں تنہا نہ ہوتا۔ کوئی چمکتا ہوا تارا اس کے پہلو میں ہوتا۔ محل باغ کے کسی کنج میں وہ آرام کے بہانے بیٹھ جاتا۔ اک خوبرو لڑکی اس کے سودائی سر کو اپنے زانو پر رکھ لیتی اور وہ اس کے التفات بے پایاں سے سرشار ہو کر آنکھیں بند کر لیتا تو اس کا چہرہ آہستہ آہستہ اس کے چہرے پر جھکتا اور اس کے ہونٹ اس کے ہونٹوں سے مل جاتے اور وہ محبت کی ان بنیادوں پر اک فردوس کو تعمیر کر لیتا۔ زندگی یکسر شباب و نغمہ بن جاتی!

یوں نہ ہوتا تو یوں ہوتا کہ جب وہ سر دبوانا چاہتا تو چند نازک انگلیاں اس کے بالوں میں کنگھی کرنے لگ جاتیں۔ اسے اپنی بھابی سے تو درخواست نہ کرنا پڑتی۔ آج صبح ہی انہوں نے جب اس کے سر میں تیل ملنے میں پس و پیش کیا تھا تو اس نے ایک بیوی کی ضرورت کا اندازہ کیا تھا۔ اسے دفتر جاتے وقت شیروانی کے بٹن بھی خود ہی ٹھیک کرنا پڑے تھے۔ اگر ممتاز موجود ہوتی تو وہ محبت سے اس سے کہتی "لائیے بٹن میں لگا دوں نا" اسے یاد تھا کہ اک بار جب وہ کالج جا رہا تھا تو اس کی قمیصوں کی آستینوں میں اس نے بٹن ٹانکے تھے اور اسے جب بورڈنگ میں اس کی یاد آئی تھی تو اس نے ان بٹنوں کو ہی چوم لیا تھا اور یہ خیال کر لیا تھا کہ اس طرح اس نے اس کے نفیس و ملائم ہاتھ پر اپنا بوسہ ثبت کر دیا ـــــ آج اسے نہ معلوم کیوں اپنی زندگی میں ایک غیر معمولی خلا محسوس ہو رہا تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے سینے میں بائیں طرف ایک ایسا کاری زخم لگا ہے۔ جو اب کبھی نہ بھر سکے گا۔ اس کا دل و دماغ مجروح ہو رہا تھا۔

اگر وہ اس سے شادی کر لیتا ـــــ اسے حاصل کرنے میں کوئی خاص

دشواری تو نہ تھی ـــ تو نئے زمانے کے میلانات کی تسکین کا کیا سامان ہوتا۔ اتنی قلیل تنخواہ میں اس کے لئے ساڑیاں اور زیورات کس طرح خرید پاتا۔ مانا کہ محبت اس کی سادگی میں چار چاند لگا دیتی لیکن وہ اپنے ہمجولیوں میں بیٹھ کر اس کا کون سا ظاہری ثبوت پیش کرتی۔ وہ کیوں کر اس کی زندگی کو دلکش و جاذب توجہ بنا سکتا اور آج کل کی لڑکیاں اسے علم تھا کہ ایک خواہش، محبت کئے جانے کے علاوہ اور بہت سی خواہشات رکھتی ہیں جن کی تکمیل نہ ہو تو زندگی غیر دلچسپ ہو جاتی ہے!

غرض اس چاندنی رات میں، ان تصورات کی چاندی سے اپنے آپ کو تسلی دیتا جب وہ گھر پہنچا تو اس نے اس قید کا احساس کیا جس میں غیر شعوری طور پر وہ مقید تھا۔ ان کبوتروں میں سے ایک کی طرح جو صبح کو اپنے آشیانے سے اڑا دئیے جاتے ہیں اور شام ہوتے خود بخود واپس آ جاتے ہیں۔ لیکن کبوتر تو زمانہ جنگ میں بھی پیامبری کرتے ہیں۔ کاش ان تخیلات کے حصار سے نکل کر وہ بھی اپنا کوئی پیام اپنی چہیتی تک پہنچا آیا ہوتا لیکن اس کے تو پر کتر دئیے گئے تھے کیا اس کی ماں نے اسے منع نہ کر دیا تھا "جب تک میں پوچھ نہ لوں وہاں نہ جانا" اسے اذنِ پرواز ہی کب تھا!

کہا جاتا ہے کہ عورتیں محبت کے راز ـــ اس راز کی باتیں بڑی جلد سمجھ لیتی ہیں، شاید یاسی کا نتیجہ تھا کہ جب جمال کی بہن نے اس کو بے دلی سے کھانا کھاتے دیکھا۔ شاید وہ اپنے سامنے کی کرسی پر اک جانی پہچانی لڑکی کو بیٹھا دیکھنا چاہتا تھا جس کی طرف وہ کھانے کی پلیٹیں بڑھا دیا کرے ـــ تو اس نے ممتاز کا ذکر چھیڑ دیا۔ اس طرح اسے یہ معلوم ہوا کہ خالہ کے ساتھ اس کے نہ آنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ لکھنؤ سے آنے کے فوراً بعد ہی حمیدہ کے ساتھ چلی گئی تھی۔

کھانے کے بعد وہ جلد سونا چاہتا تھا لیکن اس ذکر یک لمحے نے تو اس کے خیال کی چاندی کو اور نکھار دیا ـــ جو سونا چاہے اسے ملے چاندی تو نیند اچاٹ نہ ہو جائے گی، غرض رات کے گیارہ بجے، کتنی سرد رات خیالات کو یکسو کرنے میں گذر گئی، اس کی آنکھ لگی ـــ وہ ممتاز سے ملنے کی آشائیں لئے سویا تھا، شاید اپنے ہی احساسات کا عکس تھا جو اس شام اس کے دماغ پر چھائے رہے تھے کہ اس نے بیداری کا ایک خواب دیکھا۔

رات کے نو بج چکے ہیں، ممتاز اک گھنٹے سے حمیدہ کے پاس انگیٹھی کے قریب دالان میں بیٹھی لکھنؤ کے حالات سنا رہی ہے اور وطن کے واقعات، جو اس کی غیر موجودگی میں پیش آئے سن رہی تھی کہ سائیکل کے چلنے کی آواز کانوں میں آئی، آواز ویسی ہی تھی جیسے اس نے دو ڈھائی کی شام سے اس وقت سنی تھی جب ان کو اس میں تبدیل دیئے زمانہ ہو گیا تھا۔ اس کے سنتے ہی اس نے صباحت کو اپنی طرف آتے دیکھا، وہ اتنی جلد وہاں پہنچ گیا کہ وہ اٹھ کر بھاگ بھی نہ سکی۔ بس وہ اتنا کر سکی کہ اپنا چہرہ ایک طرف کو پھیر کر بیٹھ گئی۔

صباحت نے کہا "آپ کے یہاں بغیر اطلاع کے بھی مہمان آ جاتے ہیں"۔

"لو اور سنو، کہیں بیٹیاں بھی میکے میں مہمان ہوتی ہیں"۔

"تب تو بیٹے بھی مہمان نہ ہوتے ہوں گے"۔

"ایسا ہوتا تو تم اتنے دن تک یہاں کیوں رہتے"۔

ممتاز کو یقین ہو گیا کہ وہ یہیں ٹھہر رہے گا "توبہ بڑوں کا بھی لحاظ نہیں"۔ اپنے دل میں کہتی ہوئی وہ نظر بچا کر بھاگی اور شرمائی لجائی حمیدہ کے کمرے میں اس کے پلنگ پر جا پڑی اس نے اس گھبراہٹ کا سبب پوچھا ہی تھا "کیوں کیا کوئی ہوا آ گیا" کہ صباحت آ موجود ہوا۔ وہ یونہی بے حس و حرکت پڑی رہی۔ البتہ اس کی مزاج پرسی کے جواب میں اس نے صرف اتنا کہا "آپ نے خالہ کا بھی خیال نہ کیا"۔

"خالہ کو معلوم ہے کہ تم میری بیوی ہو"۔

"خوب، یہ کس شیطان نے کہہ دیا آپ سے، میں تو آپ کی بیوی نہیں ہوں"۔

"اب نہیں ہو تو کیا چند ماہ بعد ہو جاؤ گی"۔

"یہ قبل از وقت کی راگنی کیوں"۔

"وقت قریب آ رہا ہے"۔

"جیسے آپ اس وقت قریب آ گئے ہیں! یہ تو بتائیے آپ اپنا گھر چھوڑ کے یہاں کیوں آ پڑے ہیں"۔

"یہاں ـــ تم سے ملنے کی آزادیاں حاصل ہیں"۔

"میں یہاں روز روز تو نہیں آتی"۔

"تو ہوا سی دن کے لئے تو یہاں آ گیا ہوں، تمہارے ساتھ ساتھ نقل مکانی ہوتا تو سب کو بات کرنے کا موقعہ ملتا"۔

"بہت دور اندیش ہیں آپ"۔

"اور تم بہت نکتہ شناس"۔

اب باتیں ختم جناب، پہلے ہمارا شکریہ ادا کیجئے۔"

"تمہاری محبت کا شکریہ" ممتاز محبت کا لفظ درمیان میں آتے ہی اُٹھ بیٹھی اور اس نے کہا "میں کسی کا شکریہ نہیں ادا کروں گی بلکہ حمیدہ کو میرا شکرگذار ہونا چاہئے کہ میں نے اس کی بات مان لی"۔

"مجھے کیا پڑی ہے شکریہ ادا کرنے کی، یہ جانیں اور تم"۔

"میں آپ کی عنایت کا شکریہ ادا کرتا ہوں" عنایت کا لفظ سن کر وہ جل ہی تو گئی۔ غیر کی محبت اپنوں کی عنایت، "بہت اچھا آپ کے اس نظریئے کو بھی تبدیل کرنا ہے" اس نے اپنے دل میں طے کر لیا۔

اتنے ہی میں حمیدہ کا شوہر آ گیا اور یہ سب کھانے کے کمرے میں چلے گئے۔ میز پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ چاندنی رات کا لطف اٹھانے سنسان سڑکوں پر جایا جائے۔ تجویز حمیدہ کی تھی اور تائید صباحت کی۔ ممتاز نے اس کی اس لئے مخالفت کی تھی کہ اس کے پاس جاڑے کی اس سرد رات میں پہننے کے لئے بڑا کوٹ نہ تھا۔ لیکن حمیدہ کے شوہر نے یہ کہہ کر کہ تم میرا اوورکوٹ پہن لینا اس تجویز کو پاس کر دیا تھا۔ تھی بھی آخر وہ اس کی دلشاد دلہن کی اٹھائی ہوئی ---

چنانچہ کھانا ختم کرنے کے بعد یہ لوگ باہر نکل گئے۔ ابھی تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ رات کی رانی کی انتہائی مست خوشبو نے ان کے دل و دماغ کو معطر کر دیا۔ صباحت حمیدہ اور ممتاز کے درمیان آ گیا اب اس کے بائیں جانب حمیدہ تھی سیدھی طرف ممتاز۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں چاندی تھی۔ یہ چاروں اس سہانی رات کو قہقہوں میں گذار دینا چاہتے تھے۔ خموشی میں جب ان کی گونج پیدا ہوتی تو ممتاز کو ایسا معلوم ہوتا جیسے آس پاس کے بنگلوں کے دالانوں میں کھڑے ہوئے جوڑے، بیلوں اور درختوں کی آڑ میں سے انہیں دیکھ کر مذاق اڑا رہے ہیں۔ صباحت ذرا خاموش چل رہا تھا ممتاز نے خیال کیا کہ شاید میں جو ان سے مخاطب نہیں تو ان کو یہی ناگوار گذر رہا ہے۔ اس کی طرف دیکھ کر اس نے کہا "کیا سوچ رہے ہیں آپ، کیا چپ کی نیند آ گئی؟"

"ہاں اک خمار سا چھا رہا ہے لیکن اصل بات یہ ہے کہ سردی زیادہ معلوم ہوتی ہے۔"

"انگیٹھی پہلو میں تو ہے" حمیدہ بولی "کیا گلے کا ہار بنانا چاہتے ہو۔ سنا ہے کشمیر میں لوگ ایسا ہی کرتے ہیں"۔

"حمیدہ، تمہارے ان کا پہلو بھی تو خالی ہے اِدھر آ جاؤ نا" ممتاز کو ناگوار تھا کہ اس کے شوہر کا بایاں پہلو وہ گرم کرے۔

"ابھی وقت نہیں آیا"۔

"کس بات کا"۔

"پہلو گرمانے کا۔ فی الحال تو ہوٹل چل کر چائے پئیں گے"۔

ٹرنک روڈ پر ہوتے، ریل کی پٹری کے ساتھ ساتھ، یہ دو جوڑے اسٹیشن کی سڑک پر جا رہے ہیں لیکن اب اُن کے چلنے کا انداز یوں ہے کہ حمیدہ اور صباحت آگے ہیں اور اس کا شوہر اور ممتاز دس قدم پیچھے چل رہے ہیں۔ اس نے شادی کا ذکر چھیڑ دیا ہے اسے افسوس ہے کہ منگنی کو چار سال ہو گئے لیکن ابھی رخصتی نہیں ہوئی اور وہ اس کو بتا رہی ہے کہ ابھی تو انتظامات میں دو تین ماہ اور لگ جائیں گے۔ "میں تو چاہتی ہوں کہ یہ جھگڑا جلد ختم ہو۔ اور کچھ نہیں تو ان کا یہ آوارہ پھرنا تو جائے میں نے سنا ہے یہ آپ سے ٹہلنے کا بہانہ کر کے ہوٹل میں جا کر شوق کرتے ہیں"۔

"اس میں حرج بھی کیا ہے"۔

"خوب شراب تو بہت نقصان پہنچاتی ہے"!

"کہتے ہیں کہ عورت اور شراب دونوں نشیلی چیزیں ہیں۔ جب وہ نہ ملے تو اس کو منہ لگانا ہی پڑتا ہے"!

"اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ بچے ہوئے ہیں"۔

"اس میں شک بھی کیا"۔

"اس وقت تو آپ ان کو نہ پینے دیں گے"۔

"میں کون ہوتا ہوں تمہارے ہوتے"۔

اس کے بعد گفتگو کا موضوع پلٹ گیا اور جب دونوں ہوٹل پہنچے تو دیکھا کہ درمیانی گیلری سے حمیدہ اور صباحت مسکراتے سیڑھیوں کی طرف آ رہے ہیں۔

ممتاز نے کہا "تم تو ہوا پر سوار ہو گئیں"۔

"بلکہ میرے کندھوں پر"۔

"آپ بھی بس ان ہی کا ساتھ دینا جانتے ہیں"۔

"تمہارا خیر مقدم تو کرنا تھا یہاں" اور یہ کہہ کر وہ تینوں کو ساتھ لئے اسی گیلری میں واپس ہوا۔ اس سے نکلا تو ہوٹل کے مینیجر سے "سامان بھجوایئے" کہتا ہوا ان کو ایک کمرے میں لے گیا۔ اس میں یوں تو سب سامان تھا لیکن مسہری ایک ہی تھی۔ ممتاز کمرے کا جائزہ لے رہی تھی کہ چائے اور پینے پلانے کا سامان آ گیا۔ حمیدہ چائے بنانے لگی تو صباحت نے ممتاز کے سامنے بوتل بڑھا کر کہا "تم اس کا کاگ اڑاؤ جام بھرو"۔

"افسوس ہے کہ میں ساقی نہیں ہوں"۔

"تو کیا آپ کوئی پیمانہ ہیں"

"اگر ایسا سمجھیں"

"گردن تو واقعی صراحی دار ہے ۔۔۔ لو، صباحت چائے پیو، جب ممتاز کو منظور نہیں تو اسے اٹھا رکھو"۔

"اس شرط پر کہ انہیں اپنے ہونٹوں سے پلانا پڑے گی"۔

ممتاز سوچنے لگی کہ بن پئے تو ان کا یہ حال ہے اگر کہیں چڑھالی تو پھر تو شاید یہیں لیٹ رہیں گے۔ اسے چائے کڑوی معلوم ہوئی اس نے حمیدہ سے کہا "مجھے نو ذرا معلوم ہو رہا ہے جلدی سے چائے ختم کرو واپس چلیں"۔

"لیکن ابھی تقریباً دس منٹ تو ٹھہرنا پڑے گا"۔

"وہ کیوں ۔۔۔ کیا دس پیالیاں چڑھاؤ گی"!

"ذرا ان کے ساتھ یہاں کا ڈرائنگ روم، ڈرائنگ روم دیکھوں گی۔ مجھے کوئی رت جگا تو نہیں کرنا کہ اتنی پی لوں"۔

اس نے اپنے شوہر کی طرف اشارہ کیا اور وہ یہ کہتا "ہم ابھی آتے ہیں" باہر نکل گیا۔ ممتاز نے اک لمحہ کی دیر کر دی ورنہ وہ بھی ان کے ساتھ ہو لیتی لیکن ان کو تنہا چھوڑنا بھی تو مناسب نہ تھا ۔۔۔ اب وہ تنہا اس نئے ہوٹل میں کیونکر اتنی رات گئے جرأت خرام کرے۔ وہ ذرا سنبھل کر بیٹھی تھی کہ کسی نے باہر سے دروازہ بند کر دیا۔ صباحت اس کی طرف لپکا لیکن اس کے جھٹکا دینے سے قبل وہ بند ہو چکا تھا۔ ممتاز نے کہا "حمیدہ کی شرارت معلوم ہوتی ہے"

"اور کیا اب ہم ان کی واپسی تک اٹھ بھی نہیں سکتے صبر کریں اور کچھ" اس نے انڈیل لی۔ لیکن ابھی جام لبوں سے لگانے نہ پایا تھا کہ ممتاز کا ہاتھ بڑھ گیا اور اس نے اس کی کلائی پکڑ لی "کیا مذاق ہے، چھوڑیئے میرا ہاتھ، چوڑیاں ٹوٹ جائیں گی"!

"ابھی چھوڑتا ہوں لیکن اک پیار" ممتاز محجوب ہو گئی اس نے آنکھیں نیچی کر لیں۔ صباحت نے اپنا چہرہ آگے بڑھا کر اس کے لبوں کا ایک بوسہ چرا لیا۔ کتنا شیریں تھا وہ۔ ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے گلاب کی پتیاں اس کے ہونٹوں سے چھوا دیں ۔۔۔ اور پھر تاش کی بازی شروع ہوئی۔

ممتاز نے اپنے ہونے والے شوہر کے جذبے کی دل ہی دل میں تعریف کی لیوں ہی کو چومنا چاہئے تھا لیکن جمال نے تو صرف اس کے ہاتھ کو بوسہ دیا تھا۔ شاید وہ پر عظمت تھا اور یہ لطیف ۔۔۔ تاش کھیلنے میں وقت گذرتا معلوم نہیں ہوا۔ یک دم وہ کسی خیال سے چونکی اور غسل خانے میں جا کر اس نے منہ دھویا۔ کہیں وہ بوسۂ اولیں چپکا تو نہیں رہ گیا۔ حمیدہ نے اگر اس کا نشان دیکھ لیا تو بہت بنائے گی۔ اور جب وہ وہاں سے نکلی تو میز پر رکھی ہوئی گھڑی ایک بجا رہی تھی۔ اسے یقین ہو گیا کہ حمیدہ اب واپس نہیں آئے گا۔ اسے شک گذرا کہ اب اس کو کہیں کوئی اور قیمتی چیز نہ کھونا پڑے الفت کی قماربازی میں وہ، بہت مدت ہوئی جمال کو ہار چکی۔ ابھی چند گھنٹے گذرے وہ اپنے ہونٹوں کی عفت کھو چکی، تاش میں وہ برابر ہار رہی تھی کیا اس کے بعد بھی کوئی ہار اس کے نصیب میں لکھی گئی ہے ۔۔۔ بہرکیف کسی نہ کسی صورت آج وہ اپنے ہونے والے شوہر کے دل سے اس سوئی کو نکال پھینکے گی جو کسی دوسری نے پرونا شروع کی ہے۔ اس نے واپس چلنے کی خواہش کی لیکن سب دروازے بند تھے۔ صباحت نے مجبوری ظاہر کی۔ اور کہنے لگا "یہ بستر موجود ہے اس پہ آرام کرو"۔

اس نے پوچھا "اور آپ"

"میں اس آرام کرسی پر لیٹ رہوں گا"

"تکلیف تو نہ ہوگی"۔

"اگر تمہیں راحت پہنچانے کا خیال آئے"۔

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی"۔

"اک جام پلا دو"

"باقی کا کیا ہوگا"

"تم شریک ہو جاؤ"۔ اس میں اب مخالفت کی سکت نہ تھی۔ اس نے دوسرا جام بھرا اور ایک پی کر مسہری پر جا لیٹی۔ تھوڑی دیر بعد میز پہ رکھا ہوا لمپ روشن ہوا اور پھر چند منٹ بعد اس نے اپنے جسم میں گرمی سی محسوس کی۔ کروٹ بدلی تو صباحت کرسی پر موجود نہ تھا اور شراب کی بوتل خالی ہو چکی تھی۔

(۵)

صبح کے روشن اجالوں میں جمال کی آنکھ کھلی اور اس نے آسمان پر اک ستارہ جھلملاتا دیکھا۔ دوپہر کو جب وہ کھانا کھانے مکان آیا تو ممتاز اسی کے یہاں موجود تھی۔ وہ بجائے رنگے ہوئے پاجامے کے سفید شلوار پہنے تھی اس کے پیروں میں سنڈلوں کی جگہ سچی کامدار جوتیاں تھیں۔ سرخ مخمل کی اور بالوں میں آڑی مانگ نکلی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ یا شاید بسنت رت کی وجہ سے جمال کو ایسا دکھائی دیا۔ اس نے جمال کو سلام کیا اور فوراً ہی اپنی جگہ بدل دی۔ کمرے میں جاتے ہوئے اس نے دیکھا کہ درخت میں جو کلیاں تھیں ان میں انار آ گئے ہیں۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ ممتاز سونے میں سیلی ہو چکی لیکن موتیوں میں سفید نہ ہوئی، جمال کے اشکوں کی لڑیاں وہ اپنے پیروں میں کیوں ڈالتی۔ شاید وہ اپنا ہی موتی کھو چکی تھی، دوسروں کے موتیوں سے کیوں بوجھل ہوتی!!

"حیات"

سہاگ گیت

لڑکے:- رات! جلا دے جلدی جلدی دیپک مالا تاروں کی تُو،
بھر بھر تھال لٹا دے موتی جھولی میں گلزاروں کی تُو،
چاند کی کرنوں کو بُن بُن کے سندر صورت سیج بچھا دے!
دُکھ داتا ہے دن کی اگنی، سورج دیو کی جوت بجھا دے!
آجا، سندر سپنوں والی! جھوٹے حیلے اور بہانے!
رات کے گھونگھٹ میں کیا ہوگا — ہائے، کوئی یہ کیا جانے!

لڑکیاں:- جا ری سکھی! آکاش کے تارے آج ترے رکھوالے ہوں گے!
سکھ سنگت کی ریت منانے، جھوم جھوم متوالے ہوں گے!
پریم کی اونچ اور نیچ سے تھک کر، پیاری سکھی جب تو سو جائے،
سندر سندر، کومل کومل، ٹھنڈے سپنوں میں کھو جائے!
رہ رہ کر یوں ڈرتا ہے من، تو اپنی ہے وہ بیگانے!
رات کے گھونگھٹ میں کیا ہوگا — ہائے، کوئی یہ کیا جانے!

لڑکے:- رات کا پل پل بڑھتا جائے، دن کی گھڑیاں سوتی جائیں!
اونچے نیچے پربت میں سورج کی کرنیں کھوتی جائیں —!
کوند کوند کے بجلی جیسے کالی بدلی میں کھو جائے!
جیسے کالے بالوں والی ناری بیٹھی بال سکھائے!

لڑکیاں:- جا ری سکھی، پر تیرا جانا — دل ہی نہ مانے دل ہی نہ مانے!
رات کے گھونگھٹ میں کیا ہوگا — ہائے کوئی یہ کیا جانے!

سب مل کر:- نیند کے ماتے نیند بھلا دیں، پریم کا ساگر جب لہرائے
من کا راگی من مندر میں میٹھی میٹھی تان اُڑائے!
جیسے من کی پینگ بڑھا کر چنچل آشا جھولا جھولے!
یا جیسے رُت آئے بسنتی، کھیت کھیت میں سرسوں پھولے!
رُوٹھ رُوٹھ کے بیٹھے کوئی — کوئی ڈھونڈے جو بہانے!
رات کے گھونگھٹ میں کیا ہوگا — ہائے، کوئی یہ کیا جانے!

(شیلی)

قدرت اللہ شہاب

دو غزلیں

(۱)

جلوے ہیں تیرے خشک و ترِ کوہ و کاہ میں
جز تیرے کوئی بچ نہیں سکتا نگاہ میں

سو بار گُل کی اوٹ سے دیکھا کئے تجھے
سو بار سبزہ بن کے بچھے تیری راہ میں

چشمِ زمانہ روز بدلتی ہے ایک رنگ
مضمون ہے وہی کہ ہے تیری نگاہ میں

جاری ہے تیرا سکہ سپید و سیاہ پر
ساری ہے تیرا حُسن سپید و سیاہ میں

کس کس سے التفات ہے کس کس سے اجتناب
ساقی کی ہر نگاہ ہے میری نگاہ میں

امید و یاس۔ وصل و فراق۔ اور غم و نشاط
ہیں جمع کیسے کیسے عناصر اک آہ میں

حالِ تباہ میں ہے اُسی پر مری نظر
جس نے تباہ کر دیا پہلی نگاہ میں

آخر کو بس میں کر ہی لیا اُس نے میرا دل
آخر کو بس گیا ہے وہ کافر نگاہ میں

بھاگے ہیں بتکدے سے برہمن حرم سے شیخ
"واللہ کس بلا کی کشش ہے نگاہ میں"

• وہ حُسنِ فتنہ کار۔ وہ عشقِ جنوں سرشت
فطرت کا ہر کمال ہے میری نگاہ میں

(۲)

نہ روا ہے مذاقِ فغاں بار بار
سماعت میسّر کہاں بار بار

نہ شعلے ہی بھڑکے نہ خرمن جلا
اُٹھا داغِ دل سے دھواں بار بار

خوشی سازگارِ محبّت نہیں
بدلتا ہے رُخ آسماں بار بار

وہ پہلی نظر کی حسیں سادگی!
وہ منظر میسّر کہاں بار بار

تلوّن جوانی کو مرغوب تھا
محبّت ہوئی بدگماں بار بار

نہیں یہ خیالات شایانِ عشق
نہ کر فکرِ سود و زیاں بار بار

مرے شوق کے کارواں نے کیا
نفس پر جرس کا گماں بار بار

جفا پر وفاؤں کو پیار آگیا
محبّت ہوئی بے زباں بار بار

غمِ آزارِ جاں تھا مگر شوق میں
ہُوا ضبطِ غم کامراں بار بار

تخیّل کی فطرت فریبی ہے خوب
حقیقت ہے وہم و گماں بار بار

عبدالعزیز فطرت

تجارت کے قدیم راستے

انسانی تمدن کے ابتدائی دور میں تجارت اصول مقائیضہ (تبادلۂ اشیاء بہ اشیاء) پر قائم تھی، ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں جس سے ہم ایسی تجارت کی ابتدا کے متعلق کوئی معلومات آپ کے سامنے پیش کرسکیں، اور نہ ہمارے لئے یہ ممکن ہے کہ ان اشیاء کی فہرست آپ کے سامنے رکھیں جن کا باہمی تبادلہ ان دنوں ہوا کرتا تھا۔ البتہ قیاس کیا جاتا ہے کہ ابتداء میں تجارت کا دارومدار شکاری یا پالتو جانوروں کے تبادلہ پر تھا۔ کیونکہ انسان نے غلّہ خوری گوشت خوری کے بعد شروع کی ہو یا یوں سمجھئے کہ جب انسان نے گیہوں، چاول، جو اور جوار زمین سے حاصل نہ کئے تھے۔ تو اس کی زندگی کا انحصار صرف گوشت پر تھا۔

اس مضمون میں انسانی تمدن کی ابتدائی حالت، اور اس وقت کی اشیائے تجارت پر تفصیلی بحث کرنا مقصود نہیں ہے۔ صرف قدیم تجارتی راستوں کا کسی قدر ذکر منظور ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ قدیم بحری و بری راستوں کے متعلق کسی قدر معلومات آپ کے سامنے پیش کریں۔ جن کے ذریعہ اس زمانے کی اشیائے تجارت ایک شہر سے دوسرے شہر اور ایک ملک سے دوسرے ملک تک پہنچائی جاتی تھیں۔

تجارت کا فروغ چند ضروری اسباب و عوامل کا محتاج ہوتا ہے اگر یہ مہیا نہ ہوں تو کسی جگہ تجارت کو فروغ بلکہ بعض حالتوں میں تجارت کا وجود ممکن نہیں۔ ان عوامل و اسباب میں ذرائع حمل و نقل راستوں کی تعیین اور امن عامہ کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اس کے بعد ضرورت و احتیاج، اور قیمت کے ذرائع، اور درآمد و برآمد کے محصول وہ عوامل ہیں جو تجارت پر براہِ راست اثر انداز ہوتے ہیں۔

قدیم زمانے میں دشوار گذار طویل راستے تجارت کی سب سے بڑی مشکل تھے اس وقت اونٹوں، گھوڑوں اور بیلوں کے علاوہ مشینی طاقتیں اور بھاپ و بجلی انسانی اقتدار میں کہاں تھی جو اس مشکل پر غالب آنے کے لئے بعد کے زمانوں میں کام آئی۔

قدیم تجارتی راستے عموماً غیر آباد صحراؤں کے وسط یا کم از کم ان کے کناروں سے گذرتے تھے۔ آباد اور گنجان علاقوں کی بہ نسبت صحرائی علاقوں میں تجارتی قافلوں کی حفاظت سہل سمجھی جاتی تھی۔ چوروں اور رہزنوں کی جمعیتیں ان صحراؤں میں بھی مل جاتی تھیں، اور بڑی آفت و مصیبت ثابت ہوتی تھیں مگر یہاں ان کی اتنی بڑی تعداد نہ ہوتی تھی جتنی آبادی کے قریب ہوتی۔ تجارتی قافلے ایسے پیش آنے والے حوادث کا مقابلہ کرنے کے لئے کافی تیاریاں کرکے سفر شروع کرتے تھے۔ راستوں کا انتظام اس طرح کیا جاتا تھا کہ جابجا منزلیں ہوتیں، جہاں پانی کھانے کے علاوہ تجارتی سامان کی حفاظت کے لئے گودام بھی ہوتے تھے۔ ابتدا میں یہ تمام سامان خود تاجر مہیا کرتے تھے، حکومت کو ان معاملات سے سروکار نہ تھا۔

دریائے دجلہ و فرات کے کناروں پر اور وادی نیل میں بسنے والی قدیم اقوام نے اسی طریقے پر تجارت شروع کی۔ ان اقوام کی تجارت بہت کامیاب اور ان کی سوداگری بڑی نفع بخش تھی۔ اس زمانے میں دوسرے ملکوں، بلکہ دوسرے شہروں سے برآمد ہونے والی اشیاء، بہت گراں پڑتی تھیں لیکن اس کی وجہ درآمد و برآمد کے محصولوں میں بے انصافیاں۔ اور ملکوں کی تجارتی مسابقت نہ تھی، بلکہ یہ تھی کہ دور دراز مقامات سے گھنٹوں اور ہفتوں نہیں بلکہ مہینوں کی آبلہ پائی تجارتی سامان کو ایک شہر سے دوسرے شہر تک پہنچانے میں کامیاب ہوتی تھی اور ان پر کثیر اخراجات حمل و نقل کا بار پڑتا تھا۔

ان اقوام میں جن اشیاء کی تجارت عام تھی وہ عموماً مسالے، خوشبو، دوائیں، رنگ، نفیس ریشمی ملبوسات تھے۔ کسی قدر معدنی اشیاء زینت بھی ایک ملک سے دوسرے ملک کو بھیجی جاتی تھیں۔ معمولی ماکولات و ملبوسات اسی گرانی کی وجہ سے دوسرے ملکوں کو نہ جا سکتے تھے۔

ایک مدت تک تجارتی قافلے تجارتی حمل و نقل کا واحد ذریعہ رہے۔ لیکن بحری راستوں کے کھل جانے اور جہاز رانی کی ابتدا سے ان کی اہمیت

کم ہوتی گئی۔

جہاز رانی کی ابتدا

تجارتی ضرورتوں کے لئے بحری راستے غالباً سب سے پہلے اہلِ فینیقیہ نے اختیار کئے۔ یہ لوگ شامی سواحل سے قبرص، روڈس، اور بحرابیض کے دوسرے جزائر و سواحل تک مال پہنچاتے تھے۔ اس کے بعد کے زمانے میں یہ لوگ مغرب کی طرف بڑھنے لگے اور جبل الطارق سے آگے بڑھ کر بحیرہ ظلمات تک اُن کی آمد و رفت ہونے لگی۔

قدیم زمانے میں "صور" و "صیدا" جو اب شام کے چھوٹے شہر ہیں، دنیا کی بڑی تجارتی منڈیاں تھیں۔ ان کے باشندوں نے بحرابیض کے دوسرے سواحل پر اپنی تجارتی نوآبادیاں قائم کر لی تھیں۔ شمالی افریقہ کا شہر "قرطاجنہ" اسی قسم کی ایک نوآبادی تھا۔ قدیم زمانے میں قرطاجنہ معدنی برتنوں اور شیشے کے سامان کے علاوہ مختلف قسم کے پارچہ جات کی مشہور منڈی رہا ہے۔

اہلِ فینیقیہ نے جہاز رانی کی ابتدا کر کے یہ ثابت کر دیا کہ بحری راستوں کے خطرات اور ان کا طول ہولناک ضرور ہے۔ مگر برّی راستوں سے زیادہ نفع بخش اور کہیں زیادہ سہل ہے۔

فینیقیوں کے متعلق مشہور ہے کہ اُن کی تجارت اصول مقاصنہ (تبادلۂ اشیاء بہ اشیاء) پر قائم تھی یہ لوگ سکوں کا استعمال خرید و فروخت میں نہیں کرتے تھے۔

سکوں کا استعمال عام طور پر فینیقیوں کے جانشین یونانیوں کے دورِ تمدن میں ہوا۔

یونانی تجارت

یونانیوں نے اپنے زمانۂ عروج میں جہاں اور بہت سی نئی چیزیں پیدا کیں، جہاز رانی کو بھی انہوں نے بہت ترقی دی۔ یونانی کشتیاں بحرِ یونان، بحرِ اسود، اور بحرِ روم میں چلا کرتی تھیں۔ اس زمانے میں شہر "پیریہ" دنیا کی سب سے بڑی تجارتی منڈی تھی۔ شام اور ایشیائے کوچک کے وہ تاجر جو یورپ اور خصوصاً یونان سے اپنا کاروبار رکھتے تھے۔ اس منڈی میں اپنا مال پہنچایا کرتے تھے۔

یونانیوں کی تجارت، انجیر، زیتون، روغن زیتون، شہد، ظروف گِلی، اور معدنی اشیاء و آلات کی تجارت تھی۔

یونانی شہنشاہیت کو ایک مرتبہ ایرانیوں نے اور دو بار مصریوں نے نقصان پہنچایا۔ لیکن بحری راستوں پر اُن کی سیادت کسی قدر کمی بیشی کے ساتھ پھر بھی قائم رہی۔

جب سکندرِ اعظم نے مشرق میں فتوحات حاصل کیں تو یونانیوں کے لئے ایشیا میں بحری و برّی راستوں سے تجارتی مال پہنچانے کی آسان صورتیں پیدا ہو گئیں۔ اس وقت دنیا میں دو تجارتی راستے بہت طویل، بہت منافع بخش اور بہت اہم سمجھے جاتے تھے۔

اول: ایتھنز سے براہِ بحر سمرنا، وہاں سے براہِ خشکی، کونیا، غزہ، موصل اور یہاں سے دو شاخیں تھیں، ایک عراق عجم، ایران و افغانستان ہوتی ہوئی ہندوستان تک، دوسری عراق عرب، شام و فلسطین ہوتی ہوئی مصر تک۔

دوم: ایتھنز سے براہِ بحر صقلیہ ہوتے ہوئے تُونس تک اور وہاں سے براہِ خشکی ایک طرف الجزائر، مراکش و ہسپانیہ تک اور دوسری طرف طرابلس، سوڈان و حبشہ تک۔

ان راستوں کے علاوہ چھوٹے چھوٹے اور بحری و برّی راستے بھی تھے۔ جو عموماً انہی بڑے راستوں سے مل جاتے تھے۔ مثلاً چین سے آنے والا راستہ چینی ترکستان سے گذر کر مشہد کے قریب بڑے راستے سے مل جاتا تھا۔ بحرِ کیسپین میں جہاز رانی کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ اسی طرح یمن سے آنے والا راستہ، حجاز سے ہو کر فلسطین و شام میں مل جاتا تھا۔

یونانی دورِ تمدن کی بڑی یادگار اُس کے نقرئی سکے ہیں، ان سے پہلے تک تجارت اصول مقاصنہ پر قائم تھی مگر یونانیوں نے اپنے ابتدائی دورِ تمدن میں چاندی کے سکے بنا لئے، یہ سکے بہت مقبول ہوئے، خالص چاندی کے سکے ڈھالے جاتے تھے۔ اور قیمت فلزی METAL VALUE سے قیمت مہر FACE VALUE مختلف نہیں ہوتی تھی، اس لئے یہ تمام دنیا کی تجارتی منڈیوں میں مقبول تھے۔ حکومت کی طرف سے یہ ضمانت تھی کہ ان کی مقررہ قیمت کو گرنے نہیں دیا جائے گا۔

اسکندر بن فیلقوس شہنشاہِ یونان نے جب دارا شہنشاہِ ایران کو شکست دی تو اس فتح کی یادگار میں اس نے حلب و شام سے ۶۲ میل اور انطاکیہ سے ۲۳ میل کے فاصلے پر خلیج کے کنارے ایک بندرگاہ بنوائی اور ایک قصبہ آباد کیا۔ جسے قدیم یونانی جغرافیہ نویس "اسکندریہ اسوم" اور عرب جغرافیہ نویس اسکندرونہ کہتے ہیں، اس قصبے کو تجارتی اہمیت دینے کے لئے عراق و شام کا سامان تجارت یہیں سے کشتیوں میں بار کیا جانے لگا، لیکن اسکندرونہ کو کوئی قابلِ ذکر تجارتی اہمیت اس دور میں حاصل نہ ہو سکی، اس کی تجارتی اہمیت مسلمانوں کے دورِ حکومت میں پیدا ہوئی ہے، اس لئے اس مضمون کے موضوع سے خارج ہے۔

تجارت رومن دورِ حکومت میں

رومادالوں نے اپنے ابتدائی دور میں تجارت کی طرف توجہ نہ کی، رومن قبائل عموماً زراعت پیشہ تھے۔ ملک میں کوئی صنعت موجود نہ تھی جس کی وجہ سے نکاسی کا انتظام ضروری ہوتا۔ لیکن جب سنہ ۱۴۶ ق م میں شہر قرطاجہ ان کے ہاتھ آگیا تو تجارت انہیں گویا یونانیوں سے وراثت میں مل گئی۔ اس وقت انہیں معلوم ہوا کہ تجارت ملک کے لئے نفع بخش اور خوشحالی لانے کا ذریعہ ہے۔

اغسطس قیصر روما جب تخت نشین ہوا تو اس نے اولاً اپنی تمام تر توجہ داخلی فتنوں کو دبانے اور بدامنیوں کو رفع کرنے میں صرف کی۔ لیکن جیسے ہی اُسے اس کام سے فرصت ملی، اُس نے ملک کی خوشحالی کے وسائل پر غور کرنا شروع کیا۔ اس سے پہلے یونانیوں نے دنیا کے مختلف حصّوں تک اپنے تجارتی راستے بنا رکھے تھے اس لئے اغسطس کو کچھ زیادہ غور کرنا نہیں پڑا۔ اس نے ان ہی راستوں پر کسی قدر زیادہ آسانیوں کا انتظام کر دیا۔

اس زمانے میں انطاکیہ دنیا کی سب سے بڑی تجارتی منڈی ہو گیا۔ یہاں سے دنیا کے مختلف حصّوں میں تجارتی قافلے جاتے اور دنیا کے تمام اہم حصّوں سے یہاں تجارتی مال آیا کرتے تھے۔

یہ عجیب بات ہے کہ انطاکیہ سے صرف ۲۳ میل کے فاصلے پر بندرگاہ اسکندرونہ واقع ہے، یہاں بری و بحری دونوں راستے آکر مل جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود اس دور میں اسکندرونہ کو وہ اہمیت حاصل نہیں ہوئی جس کا وہ اپنی جغرافیائی حیثیت سے مستحق تھا۔ کسی قدر مال یہاں سے بھی روانہ ہوتا تھا۔ لیکن زیادہ حصہ خشکی کے راستے سے مصر بھیج دیا جاتا تھا۔ جہاں سے وہ بحری راستے سے روانہ کر دیا جاتا تھا۔

اس زمانے میں اسکندریہ (مصر) کو یہ اہمیت حاصل تھی کہ یہاں عرب و ہند سے تجارتی جہاز آتے تھے یہ سامان عموماً مسالے، خوشبو، دوائیں، ریشمی اور سوتی کپڑے اور اشیاء زینت ہوا کرتی تھیں یہاں کشتیوں سے اتارے جاتے اور مختلف مقامات کو قافلوں کے ذریعے روانہ کئے جاتے تھے۔ اور بحری راستے سے اطالیہ بھیجے جاتے تھے۔ اسی طرح شام و فلسطین کا مال یورپ جانے کے لئے یہیں سے جہازوں پر بار کیا جاتا تھا۔

شہر روما اور اس کے نواح میں گیہوں کی پیداوار کم تھی۔ اس لئے اسکندریہ سے گیہوں کی بڑی مقدار روما کو بھیجی جاتی تھی بعض تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شہنشاہ روما کی وسیع زرعی زمین مصر میں واقع تھی جس کی پیداوار لاکھوں من گیہوں ہر سال بذریعہ جہاز روما جاتی تھی۔ اغسطس نے اپنے فرمان کے ذریعے ایسے جہازوں کو روکنے یا کسی قسم کی تاخیر پیدا کرنے کی شدید سزائیں مقرر کی تھیں۔ یہ جہاز اسکندریہ سے روانہ ہو کر بندرگاہ "اوستیا" پر خالی کئے جاتے تھے جہاں سے سامان بذریعۂ قافلہ روما پہنچایا جاتا تھا۔

بندرگاہ "اوستیا" شہنشاہ کلوڈیس نے بنوائی تھی، اور شہنشاہ ٹراگولس نے یہاں بڑے گودام اور تاجروں کے لئے سرائیں تعمیر کرائیں۔

چونکہ رومن شہنشاہیت تجارت کی اہمیت کو اچھی طرح جانتی تھی اس لئے حکومت کی طرف سے اس کی کافی نگرانی کی جاتی تھی اور تقریباً اتنی ہی توجہ تجارت کی طرف رکھی جاتی تھی جتنی آج کل حکومتیں رکھتی ہیں۔

قیصر اغسطس نے عرب اور حبشی بحری ڈاکوؤں سے راستوں کو محفوظ رکھنے کے لئے بھی ایک کامیاب مہم جاری کر رکھی تھی۔ اسی طرح اُس نے ان دریاؤں اور نہروں کی طرف بھی توجہ کی جن کے ذریعے سامان تجارت کی منتقلی ہو سکتی تھی۔ اس لئے اندرون ملک تجارتی ضروریات کے لئے دریاؤں اور نہروں سے کام لیا جانے لگا۔

جنوبی ہند کے بعض مقامات پر کھدائی کے سلسلے میں قدیم رومن سکے برآمد ہوئے ہیں جو اس امر کی قطعی دلیل ہیں کہ ہندوستان سے رومن شہنشاہیت کے تجارتی تعلقات تھے۔ اور مورخ "پلینوس" کا قول تو یہ ہے کہ رومن اس قدر تعیش پسند ہو گئے تھے کہ عرب اور ہندوستان سے درآمد ہونے والے سامان تعیش خصوصاً خوشبو اور باریک مہین ریشمی کپڑوں کی خریداری پر بُری طرح گرتے تھے۔ ان اشیا کے تبادلے میں رومن سکّہ کی بڑی مقدار باہر چلی جاتی تھی، ایک بار تو روما میں سکّے کی بُری طرح کمی محسوس کی گئی۔ اور حکومت کو اس کا نظم کرنا پڑا۔

روما اپنے انتہائی عروج میں بھی کوئی صنعتی ملک نہ تھا۔ اس لئے جن ملکوں سے یہاں مال آتا تھا اُن کے تبادلے میں روما کے پاس دینے کے لئے کچھ چیزیں موجود نہ تھیں بلکہ اُن کی قیمتیں زر کی شکل میں ادا کی جاتی تھیں۔

رومن شہنشاہیت کے مختلف حصّوں سے جو تجارت ہوتی تھی۔ اس پر حکومت کی طرف سے کافی نگرانی رکھی جاتی تھی۔ اگرچہ بحری ڈاکوؤں سے سمندر بالکل پاک تو نہ تھا مگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت سمندر بڑی حد تک حکومتی اقتدار میں تھا، باہر نہ تھا۔

اس وقت، موافق موسمی حالت میں اسکندریہ سے اوستیا نو دس دن میں اور خلیج فارس سے اوستیا سولہ سترہ دن میں جہاز پہنچ جاتا تھا۔ موسمی حالت کی خرابی یا بحری ڈاکوؤں کی وجہ سے جو خطرہ بحری قافلوں

کو تھا۔ وہ ان خطرات کے مقابلے میں بہت کم تھا جو خشکی کے راستے تجارتی مال کو پہنچانے میں قافلوں کو پیش آتے تھے۔ رومن بادشاہوں کی توجہ سے بحر ابیض بحر احمر اور بحر روم میں جہاز رانی کو بڑی ترقی ہوئی اس زمانے کے تاجر خشکی کے راستوں کی بہ نسبت جہازوں کے ذریعے مال بھیجنا زیادہ پسند کرتے تھے۔

تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تجارت یہودیوں، یونانیوں اور شامیوں کے قبضے میں تھی خود روما کے فاتح اور حکمران باشندے اس معاملے میں کوئی حیثیت نہ رکھتے تھے۔ کہیں سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ تجارت کا کوئی حصہ ان کے قبضے میں رہا ہو۔

تجارت بازنطینی دورِ حکومت میں

جب فاتح سور ماؤں نے رومن شہنشاہیت پر قبضہ کر لیا اور دنیا کا یہ عظیم الشان تخت الٹ دیا گیا تو تجارت کو بھی بڑا نقصان پہنچا اور یہ کیسے ممکن تھا کہ تجارت اتنے بڑے انقلاب میں مامون رہ جاتی۔ تجارت کی بقا اور ترقی کا انحصار جیسا کہ ہم پہلے لکھ آئے ہیں سمندروں کے امن پر تھا، رومن شہنشاہیت کے پارہ پارہ ہوتے ہی یہ امن رخصت ہو گیا۔ سواحل پر بسنے والی آبادی نے سمندروں میں دست درازیاں شروع کیں اور کوئی مضبوط ہاتھ ان بدامنیوں کی روک تھام کرنے والا باقی نہ رہا اس لئے اب بحرِ روم و بحرِ احمر میں جہاز رانی تقریباً بند ہو گئی۔ بحر ابیض کا مشرقی حصہ البتہ اب تک مامون تھا۔ اس علاقے میں تجارتی جہاز اب بھی چلا کرتے تھے۔ اور انطاکیہ اب بھی اچھی خاصی تجارتی اہمیت رکھتا تھا، مگر سنہ ۵۴۰ء میں ایرانیوں نے سکندر بن فیلقوس کا انتقام اردشیر بابک کی قیادت میں لیا اور اس قدر سخت خونیں انداز میں لیا کہ خدا کی پناہ شہر انطاکیہ جو بھرا بھرا یا شہر اور آباد منڈی تھی، اُن کے ہاتھوں جل کر خاک سیاہ ہو گیا بازنطینی حکومت نے اگرچہ انطاکیہ کو دوبارہ بسایا مگر اس کو تجارتی اہمیت حاصل نہ ہو سکی، سنہ ۶۳۸ء میں یہاں مسلمانوں کا قدم آیا اور انطاکیہ مقبوضات خلافت کا جزو ہو گیا۔ اس کے بعد حضرت معاویہ بن ابی سفیان کے عہد سے مسلمانوں نے سمندروں پر اپنی نگرانی شروع کی بحرِ ابیض، بحرِ روم بڑی حد تک مامون ہو گیا۔

بازنطینی دورِ حکومت میں قسطنطنیہ کو عظیم الشان تجارتی اہمیت حاصل تھی، قسطنطنیہ مشرق و مغرب کے نقطۂ اتصال پر واقع ہے، اور ایک بڑی سلطنت کا صدر مقام بھی تھا، اس لئے اس کا تجارتی مرکز بن جانا تعجب خیز نہیں یہاں سے اس زمانے میں یورپ و ایشیا کو بحری و بری قافلے روانہ ہوتے تھے قسطنطنیہ کی یہ مرکزیت کسی قدر کمی بیشی کے ساتھ حروب صلیبیہ تک قائم رہی۔

قسطنطنیہ اس زمانے میں نہ صرف ایک بڑی تجارتی منڈی تھا، بلکہ وہ ایک بہت عمدہ صنعتی شہر بھی تھا۔ اعلیٰ درجہ کے سوتی و ریشمی ملبوسات، معدنی اشیا سے تیار شدہ ظروف و سامان آرائش مٹی کے برتن، ہاتھی دانت کی اشیا اور بہت سے دیگر مفید مصنوعات یہاں تیار ہوتے تھے۔

قسطنطنیہ سے جو تجارت ہوتی تھی وہ اصول تبادلہ پر قائم تھی۔ وہاں سے دوسرے ممالک کو مصنوعات بھیجے جاتے تھے، اور دوسرے ملکوں سے خام اشیا درآمد ہوتی تھیں۔ اس وقت بازنطینی طلائی سکہ جو "بیزانت" کہلاتا تھا۔ دنیا میں معیاری سکہ سمجھا جاتا تھا۔ اور دنیا کی تمام تجارتی منڈیوں میں طلائی اشرفیوں کی طرح مقبول تھا۔

اس وقت تاجروں میں "بنک" کا رواج موجود تھا۔ ہنڈیاں، چک، حوالہ نامے اور تجارتی قرضوں کے لئے ادارے موجود تھے۔ اگرچہ مشترکہ سرمایہ سے کسی ایسے ادارے کا ثبوت نہیں ملتا۔ لیکن اشخاص کی طرف سے یہ کام ہوتے تھے، اور عام رواج موجود تھا۔

کسی ماخذ سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کرنسی نوٹ کا رواج کہیں موجود تھا۔ کہیں کہیں وقتی ضرورت کے لئے کاغذی دستاویزیں حکومت کی طرف سے زر تبادلہ کی جگہ پر اگر دی گئیں تو انہیں کرنسی نوٹ کہنا صحیح نہ ہوگا جس طرح آج مختلف قیمتوں کے چھوٹے بڑے کرنسی نوٹ رائج ہیں۔ اس طرح پر ان کا رواج چودھویں صدی عیسوی کے اوائل میں شروع ہوا ہے۔ تبریز میں نوٹ کی ابتدا سنہ ۶۹۲ھ میں صدرالدین صاحب دیوان الممالک کے حکم سے ہوئی،

"وفیہا وضع صدر الدین صاحب دیوان الممالک
بتبریز "الچاو" وھو کاغذ علیہ تمغۃ السلطان
عوض السکۃ علی الدنانیر والدراھم وامر الناس
ان یتعاملوا بہ وکان من عشرۃ دنانیر الی دون
ذلک حتی ینتھی الی درھم ونصف وربع فتعامل
بہ اھل تبریز اضطرارا لا اختیارا بالقسر والقھر"

(الحوادث الجامعۃ والتجارب النافعۃ لعبد الرزاق ابن الفوطی
المتوفی سنہ ۷۲۳ھ ذکر حوادث سنہ ۶۹۳ھ)

اور اسی سال صدرالدین وزیر مالیات نے تبریز میں "الچاو" جاری کیا،
یہ ایک کاغذ ہوتا ہے جس پر دیناروں اور درہموں کی طرح سلطان کا
شاہی نشان ہوا کرتا ہے۔ وزیر نے لوگوں کو حکم دیا کہ معاملات میں

اسے استعمال کریں یہ دس دینار اور اس سے کم کے تھے، یہاں تک کہ ایک درہم اور نصف درہم ربع درہم تک کے ہوتے تھے۔ اہل تبریز نے مجبوراً دباؤ کی وجہ سے اسے معاملات میں استعمال کرنا شروع کیا۔

بہرحال کرنسی نوٹ جب کبھی بھی جاری ہوئے ہوں، پرامیسری نوٹ اور بنکوں کے چیک وغیرہ بازنطینی دور میں جاری ہو چکے تھے اور نہ صرف بنک کا رواج ہو چکا تھا بلکہ اس زمانے میں جہازوں کا بیمہ بھی رائج تھا۔ اور بالکل موجودہ زمانے کی طرح جہازوں کا روانگی سے پہلے اور پوری مدت کارکردگی کے لئے بیمہ ہوا کرتا تھا۔ بازنطینی دور میں جو تجارتی ترقی ہوئی اس میں بیمہ کے رواج نے بھی ایک موثر عامل کا کام کیا۔

آزاد تجارت کے خلاف بندشیں

بازنطینی دور سے پہلے تجارت بالکل آزاد تھی، نہ کسی ملک کی طرف سے درآمد برآمد پر کوئی پابندی عاید کی جاتی تھی اور نہ کوئی ٹیکس لیا جاتا تھا۔ حفاظت قوافل کے لئے ایک بہت معمولی رقم کہیں حکومت اور کہیں خود تاجروں کی جماعتیں وصول کرتی تھیں۔

شہنشاہ یوسٹیانوس (۵۲۸ ـــ ۵۶۵ء) کے زمانے میں درآمد برآمد پر محصول لگایا گیا اور اسی شہنشاہ کے زمانے میں دنیا سب سے پہلی بار احتکار (تجارتی منافع کے لئے مال کو روک دینا) سے واقف ہوئی، اس سے پہلے کبھی یہ ظلم غالباً نہیں ہوا تھا۔

احتکار کی صورت یہ ہوئی کہ اس زمانے میں اعلیٰ ریشمی ملبوسات کی تجارت تمامتر ایرانیوں کے ہاتھ میں تھی، دنیا کے بازار ان کے مال سے پٹے پڑے تھے۔ قیصر یوسٹیانوس نے ایرانیوں کو نقصان پہنچانے کے لئے اپنی مملکت سے ریشمی کپڑوں کی درآمد و برآمد دونوں ممنوع قرار دی۔

اسی قیصر کے زمانے میں قسطنطنیہ اور سالونیکا میں سالانہ تجارتی نمائش کا انتظام کیا گیا۔ یہاں تمام دنیا کے تاجروں کو دعوت دے کر بلایا جاتا تھا۔ مگر جنوی۔ اور بندقیہ کے تاجروں کو محصول درآمد سے مستثنےٰ قرار دیا گیا تھا۔ اسی طرح ان دو شہروں کے تاجروں کو بعض ایسی رعائتیں دی گئی تھیں جو دوسروں کو میسّر نہ تھیں۔ تجارت میں امتیاز قائم کرنے کا غالباً دنیا میں یہ پہلا واقعہ تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہر جنوی و بندقیہ تو آہستہ آہستہ تجارت کے مراکز بن گئے اور دوسری منڈیاں ویران ہونے لگیں۔ جس وقت ۱۴۵۳ء میں سلطان محمد فاتح رحمۃ اللہ علیہ نے قسطنطنیہ فتح کیا ہے تو اس وقت عالمی تجارت کا مرکز بندقیہ و جنوی تھے۔ قسطنطنیہ نہ تھا۔

جنوی و بندقیہ

فتح قسطنطنیہ کے وقت اطالیہ کو تجارت میں مرکزیت حاصل تھی، اور خصوصاً اس کے شہر جنوی اور بندقیہ کو۔ بندقیہ تو اپنی جغرافی حیثیت سے بھی مرکز کا درجہ رکھتا ہے۔ ر اس اڈریاٹیک پر واقع ہے۔ اس زمانے میں دنیا کے مختلف حصّوں سے جہاز یہاں آتے تھے۔ یورپ کے تجار، ہالینڈ اور جرمنی کا مال لے پہنچتے تھے اور مشرقی کا مال یہاں جبل الطارق کے راستے سے آجاتا تھا۔

فتح قسطنطنیہ سے پہلے ہی بندقیہ والوں نے بحری راستوں پر قبضہ واقتدار حاصل کرنے کی منظم کوششیں شروع کر دی تھیں۔ حروب صلیبیہ میں ان کی طرف سے جو مالی امداد صلیبی حملہ آوروں کو دی جاتی تھیں، ان میں کوئی مذہبی جذبہ موجود نہ تھا بلکہ وہ محض تجارتی منافع اور اس امید و شرط پر دی جاتی تھیں کہ فتح صلیبی بندرگاہوں کو تجار بندقیہ کے قبضے میں دے دیں گے۔ چنانچہ تیسری صلیبی جنگ میں اڈریاٹک کی بندرگاہ زارا انہیں سپرد بھی کر دی گئی تھی۔ اس کے علاوہ تمام بندرگاہوں پر انہیں امتیاز حاصل تھا۔ جلب منفعت کے لئے ان کے اور نہ جانے کیا ارادے تھے۔ مگر سارا نقشہ خراب ہو گیا، چوتھی صلیبی جنگ کا نتیجہ قسطنطنیہ کا سقوط نکلا۔

فتح قسطنطنیہ اور اس کے پہلے چند سال کے مسلسل حوادث و واقعات سے بندقیہ والوں نے تجارتی فائدے اٹھانے میں کوتاہی نہ کی، جس قدر ممکن ہو سکا اٹھایا۔ صلیبیوں کو امداد دی اور آل عثمان کی خوشامد کر کے ان کو اپنی اطاعت و وفاداری کا یقین دلایا۔ اس طرح انہوں نے دونوں طرف سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ اور کہا جا سکتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ اس وقت ان کے تجارتی قافلے مشرق میں شرقی بحر ابیض تک اور مغرب میں جزائر برطانیہ تک جاتے تھے۔ اس طرح بندقیہ مشرق و مغرب کا نقطۂ اتصال بنا ہوا تھا۔

اہل بندقیہ کی اشیا تجارت میں، مسالے، خوشبو، مفرد ادویۂ نفیس کپڑے اور ریشم و مصر کی خام پیداوار داخل تھی۔

عبدالقدوس ہاشمی

دو نقشے اور ایک گیت

دو نقشے

جنگل سُونا اور سنسان
ہیبت والا، جرأت والا، شوکت والا اک حیوان!
ہاتھوں میں آیا ہے شکار،
ہر حرکت ہے گویا طاقت کی تلوار،
خونی آنکھیں
وحشی نظریں،
کرتی ہیں اس کا اظہار
کوئی نہیں جگ میں بلوان!

منڈل سُونا اور سنسان
خلوت والا، رغبت والا، چاہت والا اک انسان!
پتلی ڈالی ہے بے خار!
ہر حرکت ہے گویا اُلفت کی جھنکار!
ٹھنڈی آہیں
نرم نگاہیں،
کرتی ہیں اس کا اظہار،
آؤ آؤ لے لو دان!

گیت

اک بستی جانی پہچانی، یہ دُھن تو ہے بہت پُرانی
دل میں ہے دھیان ہمارے
نیلے منڈل کے تارے
اور چندر جوت کے دھارے
سب گائیں میٹھی بانی۔
اک بستی جانی پہچانی یہ روپ کی اٹل کہانی۔

دل کو ہے رس کا بندھن
اس اُجلی رات کا جوبن،
آکاش کا اُونچا آنگن
ظاہر میں ہے لافانی
اک بستی جانی پہچانی۔ یہ دُھن تو ہے بہت پرانی

تُو آئی، میں بھی آیا،
دونوں نے قول نبھایا،
لیکن ہر بات ہے مایا،
جگ کی ہر بات ہے فانی۔
سب فانی — فانی — فانی، یہ دُھن بھی ہے بہت پرانی

میراجی

دوا

ہمارحمانی کے یہاں زمینداری تو کبھی نہ تھی مگر گاؤں میں آبرودار گھر سمجھا جاتا تھا۔ دو بیل کی سیر ہوتی تھی اور عورتیں پردے دار تھیں۔ بھرا پُرا گھر تھا۔ ان کے شوہر ہمت خاں کی توقیر گاؤں میں کسی سے کم نہ تھی۔ گاؤں پٹی داری کا تھا جس میں حصہ دار تھوڑے دار یا تحتی والے سبھی رہتے تھے۔ اسی وجہ سے لوگ برابری کی زندگی بسر کر سکتے تھے۔ اگر ان کا گاؤں کسی بڑے علاقے میں شامل ہوتا تو رعایا رعایا سب بابا اور تعلقدار نائب صاحب اور ضلعدار سب کی حکومت اٹھاتے اٹھاتے لوگ محکومی کے زیادہ عادی ہو جاتے۔ ان کا گاؤں ایسا نہیں تھا۔ چھوٹے زراعت پیشہ کو بنتے بگڑتے کچھ دیر نہیں لگتی دو فصلیں اچھی ہو گئیں۔ اناج سے گھر بھر گیا، لگان بھی نکل گیا۔ پرانے بیلوں کی جگہ نئی گوئی بھی آ گئی اور اپنے ہم چشم عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ ایک فصل خراب ہو گئی۔ لیجئے صاحب لیکھا ڈیوڑھا برابر ہو گیا۔ اگر کہیں دو فصلیں تابڑ توڑ بگڑ گئیں تو کسان ٹوٹ گیا۔ اس کے بعد اگر کہیں خدانخواستہ کوئی بیماری جیلانی پڑ گئی یا کوئی مقدمہ اُٹھ کھڑا ہوا تو فاقے کی نوبت آ گئی اور گھر بار چھوڑ کر دیس پردیس نکل گئے۔ نہیں تو دو تین برسوں میں پھر حالت سنبھل گئی اور کام چلنے لگا۔

ہمت خاں کے دو لڑکے تھے اور ایک لڑکی۔ بڑا لڑکا سولہ سترہ برس کا تھا۔ لڑکی کا سن دس گیارہ برس کا تھا۔ چھوٹا بچہ سات سال کا رہا ہوگا۔ رحمانی کے یہاں بچے تو آٹھ ہوئے مگر جیے تین ہی باقی کوئی چیچک میں کوئی سوکھے میں یا اسی طرح کی دوسری بیماریوں میں جن میں حفاظت ہو سکتی تھی مگر نہیں ہوئی مرتے گئے۔ گاؤں میں ایسی عورتیں بھی تھیں کہ جن کے بچے تو بہت سے ہوئے مگر جیا ایک بھی نہیں۔ ان کے دیکھتے رحمانی اسی کو اپنی خوش قسمتی سمجھتی تھیں اور اللہ کا شکر بھیجتی تھیں۔ زمانہ ایک طرح پر کبھی نہیں رہتا۔ اسی کو اہل جہاں انقلاب سمجھتے ہیں۔

ایک سال گاؤں میں ہیضے کی بیماری آئی جس میں ہمت خاں کا انتقال ہو گیا۔ رحمانی نے بڑے بیٹے کی مدد سے کھیتی باڑی سنبھالنے کی کوشش کی مگر بڑے کی وجہ سے کام بگڑ ناہی گیا باہر جا کر پردہ چھوڑ دینا ممکن تھا مگر اپنے گاؤں میں رہ کر یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ بڑا لڑکا بھی کچھ بیمار رہنے لگا۔ کھٹ کھٹ کھانسی تو گذشتہ جاڑوں ہی سے آتی تھی اب تو تیسرے پہر کو حرارت بھی رہنے لگی رفتہ رفتہ یہ حال ہوا کہ کھیت بے جوتے بوئے پڑے رہنے لگے۔ کچھ شکمی اٹھا دیئے کچھ چھوٹ موٹ بوئے بھی گئے تو بسارہ بھی مشکل سے نکلا۔ فاقوں نے بڑے لڑکے کی بیماری اور بڑھا دی۔ گاؤں سے دس کوس پر ایک بڑا قصبہ تھا جہاں حکیم ڈاکٹر اور سرکاری شفا خانہ سب ہی کچھ تھا۔ وہیں رحمانی کی خالہ زاد بہن رہتی تھی جو کسی رئیس کے یہاں نوکر تھی۔ رحمانی نے علاج کے بہانے وہیں چلے جانے کا ارادہ کیا۔ اڑوسیوں پڑوسیوں سے روز روز قرض مانگتے مانگتے تھک گئی تھی۔ کہاں تک مانگتی کسی سے آٹا کسی سے دال کہاں تک اُدھار رہے۔ اگر گاؤں چھوڑ کر چلی گئی تو زمیندار کا پیادہ لگان بھی مانگنے روز سر پہ نہ کھڑا رہے گا۔ لڑکے کا بھی علاج ہو جائے گا۔ گاؤں میں سوا نیم کے سینکوں کے اور دوسری دوا نہیں تھی۔ ایک دن اللہ کا نام لے کر چل کھڑی ہوئی۔

قصبے میں آ کر پتہ چلا کہ لڑکے کو بڑی بیماری ہے پہلے حکیم صاحب کا نسخہ پلایا۔ پھر خیراتی ہسپتال سے دوا آنے لگی مگر "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی" اور تھوڑے دنوں میں چارپائی سے لگ گیا۔ ایسے بیمار کو کون گھر میں رکھتا مگر رحمانی کی بہن نے نکالا نہیں البتہ بیمار کے برتن الگ کر دیئے۔ رحمانی کی خالہ زاد بہن ایسی خدا ترس کہاں تھیں کہ بال بچوں والا گھر رکھا کر ایسے بیمار سے گھبراتیں نہ مگر وجہ یہ تھی کہ رحمانی کی لڑکی کو اپنے لڑکے کے ساتھ کرنا چاہتی تھیں اسی کی خوشامد تھی۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ کسی رئیس کے یہاں نوکری کرنے کے بعد رحمانی کی لڑکی کا پیغام دینے کی جرأت بھی نہ پڑتی۔ آج یہ دن تھا کہ وہی رحمانی خود اُن کی نگاہ دیکھتی تھیں۔ اللہ جس کو چاہے عزت دے جس کو چاہے ذلت دے۔ لڑکی کا سن بارہ تیرہ برس کا تھا۔ پڑھے لکھے خوش حال لوگوں کے یہاں یہ سن کھیلنے کا ہے۔ غریب اگر اپنی لڑکی کا بیاہ کر کے ذمہ داری دوسرے پر نہ

ڈالنے کی کوشش کرے توکیا کرے۔ رحمانی کا لڑکا گرمیوں میں صاحب فراش ہوچکا تھا۔ ساون کے مہینے میں ختم ہوگیا۔ اتنی لمبی بیماری اور بیمار کی تکلیف دیکھ دیکھ کر ہر شخص کے دل میں آتا تھا کہ اللہ اُس کی مشکل آسان کرے۔ اس دعا میں ماں بھی شریک تھی۔ مگر ایسی بات کون ہندوستانی ماں منہ سے نکال سکتی تھی۔ انتقال کے بعد رحمانی نے بین ایسے کئے کہ ہر شخص کے دل پر چوٹ لگی۔ تجہیز و تکفین کے بعد ہمدردوں نے اصرار کرکے غریب کو کھانا کھلایا۔ لڑکے کے انتقال کے پہلے نہ معلوم کے وقت فاقہ کیا تھا۔ اس وقت بھی کھانا کیا اچھی طرح کھایا جاتا مگر جب تک دنیا میں آدمی ہے بغیر کھائے چارہ نہیں لیکن اس وقت بیٹا ہی بین ایسے کئے کہ سننے والے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ اس باضابطہ رونے میں کتنا رونا رواج کا تھا کس قدر دل کے تقاضے کا اور کس قدر دماغ کے اشارے کا۔ اس کو اللہ ہی جانتا ہے۔

رحمانی مصیبت میں گھر سے نکلی تھی اُس کے پاس تھا ہی کیا؟ جو نثار چھلا رہا بھی ہوگا۔ وہ لڑکے کی بیماری میں اڑ گیا۔ اب خانۂ رسول اللہ تھا۔ جس چیز کا خیال کبھی خواب میں بھی نہ آیا تھا۔ اور جس کو یہاں آکر منہ سے نکالنے کی جرأت نہیں ہوئی تھی وہ سامنے آئی یعنی رحمانی ماماگیری کرنے پر تیار ہوگئیں اور لڑکے کے سیوم کے بعد منہ پھوڑ کر بہن سے کہہ بھی گذریں۔ بہن نے کہا اس کی فکر ہو جائے گی۔ مگر جوان لڑکی کو کیونکر ساتھ لے جاؤ گی جوان کے دل میں تھا وہی اُن کی خالہ زاد بہن کے دل میں تھا۔ قصہ مختصر لڑکے لڑکی کی نسبت ہو گئی اور دو بول شرع کے بھی ہو گئے۔ گھر میں اتنی بڑی موت ہوچکی تھی اگر پیسہ ہوتا بھی تو ڈھول کیونکر رکھی جاتی لیکن اُن کی سمدھن نے بھی اتنا لحاظ کیا کہ گانا وانا نہیں ہوا۔ لڑکی کے فرض سے سبکدوش ہوکر رحمانی نوکری کرنے نکلیں اور رحمانی سے بوا رحمانی ہوگئیں۔ یہ تو ماماگیری کرنے پر تیار تھیں مگر تقدیر کی اچھی تھیں۔ ایک بڑے گھر میں کھانا پکانے پر نوکر ہوگئیں۔ بہت بڑی سرکار تھی۔ باہر کا باورچی خانہ جدا تھا اندر کا کارخانہ جدا۔ نوکروں چاکروں کی کثرت تھی اندر باہر ملاکر خدا جھوٹ نہ بلاوے پچاس ساٹھ آدمیوں کی روٹی رہی ہوگی۔ نوکر تو پھر نوکر لیکن اتنا غنیمت تھا کہ ماماگیری کی ذلت سے بچ گئی تھیں۔ زمانہ گذرتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ قصے کہانی میں تو کچھ بھی دیر نہیں لگتی۔ دس برس ایک سطر سے دوسری سطر پر نگاہ دوڑاتے گذر جاتے ہیں۔ اتنے زمانے میں بوا رحمانی کی دنیا ہی بدل گئی تھی۔ دیہات کا گھر کھیتی باڑی وہاں کا رہنا سہنا پچھلے جنم کی باتیں ہوگئی تھیں۔ اُس کے بجائے صاف ستھرا چھوٹا سا گھر رئیس صاحب کی مدد سے اور انہیں کی زمین پر بن گیا تھا۔ عدت گزرتی بھی حیثیت کے موافق ہوگئی تھی۔ بوا رحمانی ادھیڑ عمر میں تو آئی ہی تھیں اب اچھی خاصی بوڑھی ہوگئی تھیں پہلے دُبلی تھیں اب بلغم نے بھاری بھرکم بنا دیا تھا۔ ناک میں کیل تو پہن نہیں سکتی تھیں۔ مگر ہاتھوں میں موٹے موٹے کڑے اور بتانے گلے میں حالدار طوق اطمینان کا پتہ دیتے تھے۔ سونے کی بجلیاں بھی بنوائی تھیں مگر وہ بہو کے لئے رکھی تھیں۔ ساتھ کی ماما اصیلوں نے کہا بھی کہ بوا کان میں ڈال لو اپنے جیتے جی بہو کو کیوں دو گی۔ تمہارے بعد تو اُس کا ہے ہی۔ اس سے ذرا بہو پر رعب رہے گا اور تابعدار رہے گی۔ مگر رحمانی نے نہ پہنا۔ اللہ وہ دن بھی لایا کہ بوا رحمانی بہو بیاہ کر لائیں مگر اپنے قدیم دیہاتی اعزا کو نوید نہیں بھیجی اور نوید بھیجتیں بھی تو شاید وہ نہ آتے۔ وجہ یہ تھی کہ جس لڑکی سے انہوں نے لڑکے کی نسبت کی تھی۔ اُس کی پرورش ایک دوسرے رئیس کے گھر میں ہوئی تھی۔ اُس کی ماں کسی زمانے میں اسی طرح رانڈ دکھیا دیہات سے آکر دودھ پلانے پر نوکر ہوئی تھی۔ پہلا ہی لڑکا گود میں تھا۔ نوکری کے بعد اُس کو کافی دودھ نہ مل سکا اور وہ دُبلا ہوکر مر گیا۔ قاعدہ کے موافق انا کا لڑکا اوپر کا دودھ پاتا تھا چورا چھپا کر کسی وقت انا بھی پلا دیتی تھی اگر کسی نے نہ دیکھا تو خیر۔ اگر دیکھ لیا تو آفت آئی تھی۔ جس لڑکے کو انہوں نے دودھ پلایا تھا۔ اس کی دودھ بڑھائی کے بعد یہ کچھ معطل سی ہوگئیں۔ گو گھر میں عزت توقیر وہی رہی جو ہونا چاہیئے تھی۔ مگر دھندا کم ہو جانے سے خیالات کچھ اچاٹ رہنے لگے جو وقت بچے کی خدمت میں صرف ہوتا تھا وہ بناؤ سنگار میں گذرنے لگا۔ دودھ بڑھ جانے کی وجہ سے پرہیز کی بھی تقید اٹھ گئی تھی۔ مرچیں کھانے کو زبان ترس گئی تھی کھٹاس کا مزا خواب ہوگیا تھا وہ پھر لوٹ آیا۔ کچالو چٹ پٹے اور چنے جور گرم کا چٹخارہ بھرا جانے لگا۔ کپڑے اور زیور تو اناؤں کے پاس اچھے ہوتے ہی ہیں ان کے پاس بہر دل جوانی کا بھی خزانہ تھا۔ جوانی میں دانت نکال کر طاق پر رکھ دو تب بھی نکلے ہی رہیں گے یہی حال انا کا تھا کسی مرد سے آنکھیں چار ہوئی نہیں کہ ہونٹوں کی کلی کھل گئی ———

اسی زمانے میں بیگم صاحبہ نے ایک آدھ مرتبہ رئیس صاحب کو بھی آنکھیں ملاتے اور انا کو مسکراتے دیکھ لیا۔ آدمی بڑی سمجھ دار تھیں۔ بجائے اس کے کہ سوئی کا بھالا بنائیں۔ بات کا بتنگڑ کرتیں رہنا مت ڈالتیں۔ گھر کا پالا ہوا ایک لڑکا تھا انہوں نے اُسی کے سر انا کو تھوپ دیا۔ لیجئے صاحب اُس کا بھی گھر آباد ہوگیا اور قاضی صاحب نے اپنی عنایت سے آئندہ اور گذشتہ تہمتوں کا دروازہ بھی مسدود کر دیا۔ مجال ہے کہ شوہردار عورت پر کوئی دو کہہ رکھ سکے یا باندھنو باندھے۔ مگر سال کے اندر ہی لڑکی پیدا ہوئی۔ حساب لگانے سے بیاہ کے آٹھ ہی مہینے ہوتے تھے۔ اب کیا تھا عورتوں اور عورت مزاج

مردوں کے ہاتھ ایک مشغلہ آگیا جہاں سننے اسی کی باتیں ہوتی ہیں۔ کہیں غصہ ہے کہیں ہنسی ہے کہیں تعجب ہے کہیں کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا جا رہا ہے، توبہ توبہ! کہیں ماتھا کوٹ کر کہا جاتا ہے، اللہ ہر آفت سے بچائے کہیں ہونٹوں پر انگلی رکھ کر "ادی بہن یہ کیا ہوا" کی آواز آتی ہے۔ کوئی چار دن کے بچے میں رئیس صاحب کی مشابہت دیکھ لیتی ہے کوئی پہلے ہی سے سر پر پورے بالوں کا ذکر کر کے کہتی ہے اٹھواسی تو ہو نہیں سکتی۔ ایک متشرع بزرگ شوہر کو بہ رگانہ صلاح دے رہے ہیں کہ بیٹا پھر سے نکاح پڑھوا لو۔ قصہ مختصر جتنے منہ اتنی زبانیں۔ جتنی زبانیں اتنی باتیں۔ ہر شخص اپنی چھوڑ پرائی بات طے کرنے پر تیار تھا۔ اگر یہ دیہات میں پیدا ہوئی ہوتی تو اس کا نام کوئی رسولن۔ امامن وغیرہ ہوتا یہاں اس کا نام جوہی خانم رکھا گیا۔ یہی لڑکی تھی جس کے ساتھ بوا رحمانی کے لڑکے کی شادی ہوئی تھی۔ بوا رحمانی نے بہو نہایت سلیقہ کی پائی۔ سینا پرونا۔ کھانا پکانا۔ ہر چیز میں بے مثال تھی گھر کے انتظام میں صفائی، کفایت شعاری میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔ آنے جانے والوں سے برتاؤ، ساس کی خاطر مدارات میں اپنی حیثیت سے کہیں بڑھ کر کام کرتی تھی اور گو بڑے لاڈ پیار کی پالی ہوئی تھی اور جس گھر سے آئی تھی گو وہاں نوکر چاکر اس کی قدر و منزلت نہ معلوم کس وجہ سے نوکروں کی دوسری لڑکیوں سے زیادہ کرتے تھے پھر بھی یہ سسرال میں ہر طرح کی کڑی جھیلنے کو تیار رہتی تھی۔ بوا رحمانی جہاں نوکر تھیں وہاں کے نوکر چاکر مختلف موقعوں پر ان کے گھر آنکلتے تھے اور ہر شخص کے ساتھ ایسا برتاؤ ہوتا تھا کہ بوا رحمانی کی بہو کی ہر طرف واہ واہ تھی۔

اب دو باتیں بوا رحمانی کے لڑکے کی بابت سن لیجئے۔ ان کا نام دائم خاں تھا۔ بوا رحمانی کی سرکار میں یہ بھی رہتے تھے۔ پہلے چلم وغیرہ بھرتے تھے۔ جب ذرا ہوش سنبھالا تو پھر خدمت گاری کرنے لگے۔ مگر اوروں کی طرح تنخواہ ان کی نہ مقرر ہوئی گو مہینے میں تنخواہ سے زیادہ پا جاتے تھے غیر ذمہ داری کا کام رفتہ رفتہ سیر گشت زیادہ اور کام کم کرنے لگے۔ عمر بھر یہی رہا کہ گھر کا خرچ اسی سرکار سے چلا کیا۔ وقتاً فوقتاً کام بھی کیا گئے مگر مقررہ تنخواہ کبھی نہیں پائی ایسے لوگوں کو لواحق کہتے ہیں۔ آدمی نیک تھا مگر بے وقوف نوکروں میں ایک کہاوت ہے "جس کی بڑھیا محل کے اندر اس کا ملل لعل بڑا اسکندر"۔ بچپن سے پکے پکائے عمدہ کھانے کے عادی رہے۔ مزے سے مزے کی چیز جو گھر میں پکی اس میں ان کا حصہ ضرور لگا اوپر کا نہ سہی پیندی کا سہی تو ان کا کہیں گیا نہ تھا بغیر محنت کئے کھانے کی سزا چھوٹے بڑے ہر شخص کو ملتی ہے ان میں کیا سرخاب کے پر لگے تھے جو یہ بچ جاتے اسی وجہ سے کاہل بھی ہو گئے تھے۔ غریبوں کے لڑکے لڑکوں کا دستور ہے کہ دس ہی بارہ برس کی عمر میں یا اپنے آبائی یا کسی نہ کسی دوسرے کام پر لگا دیئے جاتے ہیں بعض اسی وقت سے کرنے لگتے ہیں بعض جب مصیبت پڑتی ہے تب کرتے ہیں لیکن ماں باپ کوشش یہی کرتے ہیں کہ کام کرنے کی عادت شروع ہی سے پڑ جائے۔ میاں دائم خاں کو ان کی ماں نے اس ڈھرے پر نہ لگایا۔ اسی طبقے کے دوسرے لڑکے جب دوپہر کو کام پر سے لوٹتے تھے تو موٹا جھوٹا جو کچھ ملا بے تابی میں کھا گئے بھوک کی شدت نے شکوے شکایت کا موقعہ نہیں دیا۔ میاں دائم خاں کی یہ عادت پڑی تھی کہ گھومنے پھرنے کے بعد جب دوپہر کو لوٹے تو جو ڈالی ماں سرکار سے لے کر آئی ہیں سامنے رکھ کر کھانے لگے۔ اگر کسی دن سالن کم بچا تو جائزہ لیتے ہی وہیں سے شکوے کے انداز میں پکارتے "اور اماں اس میں تو بڈی ہی بڈی دکھائی دیتی ہے۔ بوٹی تو ہے ہی نہیں" ماں نے کہا کھا لو نہیں بچی تو میں کیا کرتی وہ دیکھو طاق پر کاغذ میں لپٹی ایک برفی کی ڈلی رکھی ہے وہ کھا لینا۔ اس کے بعد دائم چپ چاپ کھا کر باہر چلے جاتے تھے۔ حق بات کہنا چاہتے۔ کھانا چاہے اچھا ہو چاہے برا میاں دائم خاں اس معاملے میں مذکورہ بالا شکایت سے زیادہ کبھی نہیں کرتے تھے۔

شادی کے بعد ایک نئی آفت نازل ہوئی یعنی نہ فاتح کے اوپر فتح مندی کے آثار دکھائی دیئے نہ مفتوح پر فتح ہو جانے کا وہ اطمینان چمکا جو تسلط کے بعد ہوتا ہے۔ آٹھ دس دن تو بات چھپی رہی مگر رفتہ رفتہ یہ راز دائم خاں کی سسرال سے کھلنا شروع ہوا۔ بوا رحمانی بہت گھبرائیں بیٹے کو حکیم صاحب کے پاس لے جانے کو تیار ہوئیں۔ لڑکا پہلے تو جانے ہی سے انکار کرتا رہا۔ اس کے بعد مجبوراً گیا۔ حکیم صاحب نے وہی سوالات کئے جو دواؤں کے اشتہاروں میں دیکھے جاتے ہیں اور یہی سبب مرض کا ٹھہرایا۔ جھنگی کا نسخہ لکھ دیا کہ صبح کو گائے کے دودھ کے ساتھ پیو۔ کئی روپے کا حلوا بنا دیا۔ جب اس سے بھی کچھ فائدہ نہ ہوا تو کہا ذرا سردی اور پڑنے لگے تو علاج شروع ہوگا۔ اب یہ راز پوری طور سے افشا ہو چکا تھا ساتھ کے نوکروں چاکروں نے دائم خاں سے صاف صاف پوچھنا شروع کیا۔ دائم خاں کبھی جز بز ہوئے کبھی شرمائے کبھی ہمدردی کا اظہار پا کر کہنے لگے "یار کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے ایسے تو ہم اچھے ہیں مگر وہاں پہنچ کر نہ معلوم کیا ہو جاتا ہے۔ حکیم صاحب نے کہا ہے کہ جب ناقص مواد نکل جائے گا تو اچھے ہو جائیں گے۔ دیکھو بھائی کیا ہوتا ہے"!

بوا رحمانی اپنی پریشانی میں دائم کو لے کر لکھنؤ بھاگیں۔ ایک بڑے ڈاکٹر کو دکھایا۔ اس نے حال سن کر کہا یہ روحانی شکایت ہے جس کو غلطیوں

سے کوئی واسطہ نہیں ممکن ہے غلطیوں سے کچھ بیماری زیادہ ہوگئی ہو مگر اصل وجہ روحانی ہے۔ اس علاج میں دیر لگے گی اور یہاں رہنا پڑے گا۔ بوا رحمانی کے پاس نہ اتنا وقت تھا نہ روپیہ ما چار نسخہ لکھوا کر واپس آئیں۔ اس کے بعد پھر حکیم صاحب کا علاج شروع ہوا پھر میاں دائم خاں عطائیوں کے ہتھے چڑھ گئے۔ نہ معلوم کتنے زخم ڈالے گئے کتنا خون مواد ہو کر بہہ گیا۔ مگر "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی"۔ تقریباً دو سال یہی ہوا کیا اُس کے بعد مایوس ہو کر بیٹھ رہے۔ سسرال والے پہلے ہی سے طلاق مانگ رہے تھے اب بڑے زور شور سے اس کا مطالبہ کیا گیا۔ اسی زمانے میں بوا رحمانی کا بھی انتقال ہو گیا۔ لڑکی کے ماں باپ مقدمہ چلانے پر تیار ہوئے مگر جو ہی خانم نے صاف صاف کہہ دیا کہ میری تقدیر میں جو کچھ ہونا تھا ہوا اور جو ہونا ہوگا ہو کے رہے گا۔ پہلے تو بے سوچے سمجھے جھونک دیا اب فارغ خطی لکھواتے ہیں۔ میں طلاق ولاق نہ لوں گی اور خدا نے چاہا تو عمر بھر یوں ہی پار کر دوں گی بہت سی کم سنی میں رانڈ ہوتی ہیں آخر وہ نہیں پہاڑ ایسی جوانی کاٹ دیتی ہیں۔ دائم خاں میاں بی بی کا سلوک جوں جوں اغیار دراندازیاں کرتے گئے اور اچھا ہی ہوتا گیا۔ لوگ کہتے ہیں اور دیکھنے میں بھی یہی آیا ہے کہ بغیر زناشوئی رشتے کے محبت قائم نہیں ہوتی۔ یہی فرق بہن بھائی اور میاں بیوی کی محبت میں بتایا جاتا ہے مگر دائم خاں میاں بیوی کی یگانگی وہ استثنا سمجھئے جس سے ہر قاعدہ مضبوط ہوتا ہے۔ اسی طرح دس پانچ برس گذرتے گئے اور بات پرانی دھرانی ہوتی گئی۔ دوسروں پر اعتراض جانے کو نت نئے معاملات نکلا کرتے ہیں۔ معاشرتی۔ مالی جنسی گڑبڑیں ہوا ہی کرتی ہیں۔ اس قدیم فضیحتے کو لوگ کب تک لئے بیٹھے رہتے آخر بھول گئے۔ اگر کچھ لوگ نہیں بھولے تھے تو محلے کے دو چار دل پھینک لونڈے تھے۔ اور خود دائم خاں کی سرکار کے دو ایک نوجوان نوکر جو وقتاً فوقتاً کسی نہ کسی عذر سے دائم خاں کے گھر پہنچ ہی جاتے تھے لیکن یہاں عجیب رنگ تھا۔ لوگ نہ معلوم کیا کیا ارادے اور کون کون منصوبے گانٹھ کر آتے تھے مگر وہاں نگاہیں کچھ ایسا برف۔ کافور۔ کتیرہ۔ کیلے کا پانی۔ بردمائیڈ گھلا ہوا تھا کہ لونڈے کیا بڑے بڑے تماشبین سٹ پٹا جاتے۔ مسز سڈنس انگلستان کی بڑی مشہور ایکٹرس کی پرستش کرنے والوں کی کمی نہیں تھی شاہزادوں سے لے کر متوسط درجے تک پجاریوں کا شمار سیکڑوں میں تھا۔ شریڈن بھی انہیں میں تھے۔ کسی نے کہا تعجب ہے کہ تم نے باوجود اس گرم جوشی کے مسز سڈنس سے کبھی اظہارِ عشق نہیں کیا۔ شریڈن نے کہا، ارے اُس کے رعبِ حسن میں وہ دبدبہ ہے کہ جو شخص اس سے اظہارِ عشق کرلے وہ آرچ بشپ آف کینٹربری سے بھی اظہارِ عشق کرلے گا یہی حال جو ہی خانم کا تھا۔ ایک آدھ بے تکے بے ہودہ آنے جانے والے نے مذاق میں یا کسی اور بھدے طریقے سے مُنہ پھوڑ کر اظہارِ مطلب بھی کیا مگر ایک ہی نگاہ میں کھسیانے ہو کر بھاگ آنا پڑا۔ زمانہ گذرتا گیا۔ لوگوں کی کوششیں جاری رہیں۔ میاں بیوی کی بے واسطہ محبت مضبوط ہوتی گئی۔ ہر رنج مرض میں یہ حال ہوتا تھا کہ اگر ایک کی انگلی دکھی تو دوسرا بے چین ہوگیا۔ عورت کو مرد کا جھوٹ موٹھ کا سہارا بھی بہت ہوتا ہے لیکن مرد کو بھی ہمدردی کی کم ضرورت نہیں ہوتی۔ ظاہراً یہی وجہ معلوم ہوتی تھی کہ یہ لوگ ایک جان دو قالب تھے۔ ورنہ معاملات ایسے تھے کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو کون تعجب کی بات تھی۔ بعض عورتیں جو ہمدرد تھیں اور جن سے یہ بھی اپنے دل کا حال کہہ دیتی تھی۔ ان سے اکثر باتیں ہوئیں۔ اُس نے صرف یہی کہا کہ مجھکو کوئی تکلیف نہیں ہے یہ بھی کہا کہ جب کوئی مرد اس طرح کا کوئی کنایہ کرتا ہے تو نہ صرف سر سے پاؤں تک آگ لگ جاتی ہے بلکہ یہ بھی جی چاہتا ہے کہ کنویں تالاب میں پھاند پڑوں۔ کہتی تھی کہ آبرو پر سے سو جانیں قربان ہیں۔ مختلف مردوں کے ڈورے ڈالنے کی مصیبت اس غریب پر اس وجہ سے اور زیادہ تھی کیونکہ میاں دائم خاں رشک کے مادہ سے بالکل بے واسطہ رہے۔ اگر کوئی مرد کسی بہانے سے گھر میں آیا تو انہوں نے کوئی مزاحمت نہ کی اور اگر نہ آیا تو کوئی پوچھ گچھ نہ کی گویا ان کے دماغ میں مادہ کا خانہ ہی خالی تھا۔ میاں دائم خاں کو کبھی زکام ہوگیا کبھی یوں ہی طبیعت سست ہوگئی۔ مگر ان کی بیوی ہمیشہ عورتوں کی بیماری میں گرفتار رہتی تھی۔ کمر میں درد سر میں درد۔ آنکھوں میں تکلیف غرضکہ آئے دن روز کی بیمار تھی۔ ایسے وقتوں میں میاں دائم خاں کی بے چینی قابلِ دید ہوتی تھی۔ کہیں سر دبا رہے ہیں کہیں حکیم صاحب کے یہاں دوڑے جاتے ہیں کہیں قابلہ کی خوشامدیں کر رہے ہیں۔ غرضکہ یہی مشغلہ رہ گیا تھا۔

دائم خاں کی شادی کو تقریباً دس بارہ برس ہو چکے ہیں۔ جو ہی خانم جوانی کے بے آب ریگستان کو پار ہی کیا چاہتی ہیں۔ مگر مثل ہے "عورت کو تین دن قبر میں بھی بھاری ہیں"۔ عاشق تن لوگ اُس کی طرف سے کم وبیش مایوس ہو چکے ہیں۔ ٹوہ لگانے والی عورتیں طوطیا طوفان اٹھانے والیاں بھی بے پرواسی ہوگئی ہیں کہ ایک نیا گل کھلا۔ پڑوس میں ایک آدمی کوئی پینتیس چھتیس برس کے سن کا آ کر رہا۔ ڈھونڈے نام نہ صورت نہ شکل نہ ایسی کمائی نہ

اُٹھتی جوانی۔

رمضان شریف کے دن ہیں رات کے دس بجے ہیں۔ میاں دائم خاں شبینہ پڑھنے بڑی مسجد گئے ہیں کہ جعفر نامی ایک مشٹنڈا کچھ کچھ کبھی کبھی افطاری بیگم صاحبہ کے حکم سے لے کر آیا۔ صدر دروازے کی طرف تو گیا نہیں۔ کھڑکی قریب تھی اسی طرف آیا کھڑکی بند تھی مگر کچھ آہٹ پاکر اس نے نہ آواز دی نہ زنجیر کھٹکھٹائی بلکہ دروازے میں کان لگاکر سننے لگا کیا سنتا ہے کہ دائم خاں کی بی بی آہستہ آہستہ کہہ رہی ہیں "عورت کی دوا مرد۔ میں ہمیشہ کی بیمار۔ برسوں ہوگئے ٹھیک وقت پر نہ سر دھویا نہ بغیر تکلیف کے ایک مہینہ گذرا۔ اور دو ہی ماہ ہوں کہ کوئی بیماری نہیں۔ دن بھر سرجھکا کر سیا کرو نہ آنکھوں کے ڈھیلے دکھیں نہ سر میں دھمک پیدا ہو کمر کا درد تو جیسے تھا ہی نہیں"۔ میاں جعفر بھی اُن کھسیانی بلیوں میں تھے جو کسی زمانے میں کھمبا نوچ چکے تھے اب کیا تھا پیٹ پکڑے دوڑے اور دوسروں کو خبر سنائی۔ آبرو بڑی قیمتی چیز ہے مگر دوسرے کی آبرو کوڑیوں کے مول بیچنے میں سب کو لطف آتا ہے۔ بس کیا تھا لوگ چڑھ دوڑے۔ ان میں وہ بھی تھے جو خود ناکامیاب رہے تھے اور وہ بھی تھے جو مفت کی سیر دیکھنا چاہتے تھے اور چور چور کا ہلڑ کر دیا دو چار آدمیوں نے چور کی ہانک لگائی۔ چالیس پچاس آدمیوں نے ڈنڈے لاٹھی لے کر گھر گھیر لیا۔ کچھ لوگ چاروں طرف اپنے اپنے کوٹھوں پر چڑھ گئے کہ چور نکل کر نہ جانے پائیں۔ وہاں چور ہو تب تو نکلے میاں ڈھونڈے شرمائے لجائے پریشان حال نکلے اور کہنے لگے میں تو آگ لینے آیا تھا۔ لوگوں نے ایک نہ سنی بعض منچلوں نے دو چار گھونسے بھی رسید کئے اور پکڑ کر رئیس صاحب کے پاس لے آئے دائم خاں کی بیوی بھی طلب ہوئیں۔ نہایت سراسیمہ سر سے پاؤں تک کانپتی ہوئی منہ چادر سے چھپائے آئی اور رئیس صاحب کے قدموں پر گر پڑی۔ رئیس صاحب کو ترس آیا اُس کو اندر بھیج دیا اور مجمع کو منتشر ہونے کا حکم دے دیا۔ اتنے میں پولیس کا آدمی بھی آ گیا مگر صورتِ حال دیکھ کر دست اندازی کی کوئی وجہ نہ پائی۔ اگر وہ عورت غریب آشنائی میں پختہ کار ہوتی تو نہ معلوم کتنے بہانے ڈھونڈھ لیتی اور دوسروں کے پہلے شاید خود ہی چور چور پکار اٹھتی مگر وہ ایسی تو تھی نہیں۔ رئیس صاحب سے تنہائی میں اُس نے صاف صاف کہہ دیا کہ آج اتنے دن مجھ کو اُن کے گھر میں آئے ہوئے جو حال ہے آپ سے چھپا نہیں ہے۔ میں ہمیشہ آبرو پر سے جان قربان کرتی رہی البتہ اس معاملے میں مجھ کو جو دُسیاہی بدی تھی وہ ہوئی اور میں تو کہوں گی کہ اس میں بھی میرا قصور نہیں کیونکہ اٹھتی جوانی کا جو زمانہ تھا اُس میں نہ معلوم کتنوں نے میری آبرو لینی چاہی مگر میرا پاؤں نہ ڈگا۔ اب آدھی عمر گذر چکی تب لکھا پورا ہوا اس کی صورت یہ ہوئی کہ جب جب میں نے اس مرد کو دیکھا تو میری حالت ہی بدل جانے لگی۔ اِدھر اس کا سامنا ہوا اور اُدھر میرا دل دھڑکنے لگا اور سر سے پاؤں تک تھرتھری سی پڑ گئی، ہاتھ پاؤں کی طاقت سلب ہوگئی زبان سے نہیں نکلنا مشکل ہوگیا۔ دل میرا آبرو جانے پر رو دیا کیا مگر ہونٹھ بلا اختیاری میں مسکراتے رہ گئے۔ میں اُس کو نہ تب چاہتی تھی نہ اب چاہتی ہوں۔ اب چاہے سر منڈوا کر اور منہ میں کالک لگا کر گدھے پر سوار کیجئے چاہے اجازت دیجئے کہ کچھ کھا کر سو رہوں اسی کے ساتھ یہ بھی خیال ہے کہ اگر میں مر گئی تو پھر اُن کی (دائم خاں کی) کون خبر لے گا۔

جو ہی خانم کا ڈھونڈھے کی محبت سے انکار۔ ممکن ہے اس وجہ سے رہا ہو کہ محبت سے انکار عورت اپنا فطرتی حربہ سمجھتی ہے۔ ممکن ہے اس وجہ سے رہا ہو کہ دائم خاں سے شادی کے بعد وہ سمجھنے لگی ہو کہ عورت کا جنسی حق اور مرد پر جان دے دینے کی صفت قسامِ ازل کے یہاں سے اُس کو ملی ہی نہیں ہے۔ رہی دائم خاں سے محبت وہ کوئی بلند چیز رہی ہو یا ہندوستانی رسُوم کی گنگا میں پھسل پڑنے کے بعد صرف ہر گنگا رہی ہو اس میں کلام نہیں کہ اِن میاں بیوی کا تعلق وہ تعلق نہ تھا۔ جو عورت اور مرد کی محبت کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

رئیس صاحب پڑھے لکھے نیک دل آدمی تھے یہ بیان اس صفائی سے سُن کر دنگ رہ گئے اور بجائے نفرت کے عبرت سی ہوئی۔ میاں دائم خاں مسجد سے واپس ہوئے انہوں نے ہاں ناں کچھ نہ کہا۔ اور بیوی کو ساتھ لئے گھر چلے آئے وہاں پہنچ کر کہنے لگے سب کے سب سالے ہماری آبرو لینے پر تلے ہیں مگر تم کچھ پروا نہ کرو لو مسجد سے یہ مٹھائی تمہارے لئے لائے ہیں کھا لو تمہارا سحر گہی کا دودھ لاکر طاق پر رکھ دیا تھا تب مسجد گئے تھے دیکھنا بلی تو نہیں پی گئی۔

لیجئے صاحب قصہ ختم ہوگیا۔ میاں دائم خاں کے رقیب صاحب دوسرے دن غائب ہوگئے۔ دائم خاں کی بیوی کا کچھ نشہ سا ٹل گیا اور تب ہی سے کچھ بہکی بہکی سی باتیں کرنے لگیں مگر اس حالت میں بھی میاں بیوی ایک دوسرے پر فدا ہی رہے بلکہ کچھ ایک دوسرے کا سہارا اور زیادہ ڈھونڈھنے لگے۔

(چودھری) محمد علی

چشمِ منتظر

دن بیت چکا ہے، مہرِ حسیں پنہاں ہے شفق کے پردے میں ہر شے گم ہوتی جاتی ہے سایوں کے عمیق دھندلکے میں

یہ وقت ہے دریا کی جانب تنِ تنہا گھر سے نکل جاؤں اور اپنی رنگیں بانی سے وہ سوز کے شعلے برساؤں

جو چرخ کی نیلی نیلی سی بے پایاں گہری وسعت میں

تھرانے لگیں جگمگ جگمگ کرتے انجم کی صورت میں

مخمور ہے شام کی نرم ہوا کوئل کی نوائے شیریں سے صد چاک ہے سینہ خاموشی پانی کے ترانۂ غمگیں سے

آوارہ ہیں بھینی بھینی سی خوشبوئیں سُر فضاؤں میں پنچھی چپ بیٹھے ہیں اُلجھی شاخوں کی گھنیری چھاؤں میں

اس کوچۂ تنگ و تنہا کی تاریکی بڑھتی جاتی ہے

اور لمحہ بہ لمحہ نسیمِ شبی کچھ زور پکڑتی جاتی ہے

معلوم نہیں واپس گھر کو میں جا کر آؤں گا کہ نہیں ڈر ہے کہ اچانک رستے میں مجھ کو نہ کوئی مل جائے کہیں

ممکن ہے مجھے کچھ ان جانی ان دیکھی روحیں تاروں سے رہ رہ کے بلانے لگیں اپنی جانب انجان اشاروں سے

سونی پگڈنڈی کے موڑ پہ اوٹ میں جھاڑی کے وہ کھڑی ہو گی

اپنی گھبرائی نگاہوں سے میرا رستہ دیکھ رہی ہو گی۔

تخت سنگھ

اچھی کتابیں زندگی کو اچھا بناتی ہیں

لیکن ہر شخص کو اچھی اور بری کتابوں میں تمیز کا موقعہ حاصل نہیں خصوصاً آج کل کے تیز رفتار زمانے میں جب کہ ہر بری چیز اپنا ظاہری دلکش لباس پہنے نگاہوں کو دھوکا دینے کے لئے ہر طرف موجود رہتی ہے۔ اس دھوکے سے بچنے کے لئے سکون اور وقت کی ضرورت ہے ان وجوہات کے مدنظر کتب خانہ ادبی دنیا لاہور نے فیصلہ کیا ہے کہ ادبی دنیا کے پڑھنے والوں اور عام پبلک کے لئے وقتاً فوقتاً چنی ہوئی کتابوں کی مختلف فہرستیں شائع کی جائیں۔ اس انتخاب کی ضمانت صلاح الدین احمد اور میراجی مدیران ادبی دنیا کا نام ہے۔ انہوں نے نہایت محنت اور وقت صرف کرنے کے بعد یہ انتخاب کیا ہے اور جو بلند نظری اور معیار کی خوبی ادبی دنیا کے مضامین میں دکھائی دیتی ہے اسی کا لحاظ ان فہرستوں میں بھی رکھا ہے۔ ناظرین کی آسانی کے لئے یہ تمام کتابیں کتب خانہ ادبی دنیا میں فراہم کر لی گئی ہیں تاکہ ایک ہی جگہ سے بغیر کسی وقت کے آپ کو یہ چنی ہوئی کتابیں مل سکیں۔ ہمیں امید ہے کہ ہر ماہ ناظرین ان فہرستوں کا مطالعہ کر کے ان سے فائدہ اٹھائیں گے۔

نام کتاب و مصنف	قیمت
افسانے	
فردوسِ خیال　منشی پریم چند	۴عہ ر
پریم بتیسی اول دوم　،،	ہے ۴ر
نظارے　کرشن چندر	عہ ر
منٹو کے افسانے　سعادت حسن منٹو	۸عہ ر
سحرِ فرانس　طاہر قریشی	۴عہ ر
دانہ و دام　راجندر سنگھ بیدی	۸عہ ر
باسی پھول　سید علی عباس حسینی	۴عہ ر
شعلے　پروفیسر احمد علی ایم اے	مہ
سوزِ ناتمام　عاشق حسین بٹالوی	۴عہ ر
چغتائی کے افسانے　مرزا عظیم بیگ چغتائی	ہے
صنوبر کے سائے　حجاب امتیاز علی	عمد
میری ناتمام محبت　،،	۸عہ ر
طلسمِ خیال　کرشن چندر	۴عہ ر
اندھی دنیا　اختر انصاری	مہ
ڈاچی　اپندر ناتھ اشک	۸عہ ر
پسِ پردہ　چندر بھوشن سنگھ	۱۲ر

نام کتاب و مصنف	قیمت
سازِ فطرت　حسن عزیز جاوید	۴عہ ر
محبت اور نفرت　اختر حسین رائے پوری	۴عہ ر
ہیبت ناک افسانے　امتیاز علی تاج	۸عہ ر
مذاحیہ	
پطرس کے مضامین　احمد شاہ بخاری	۸عہ ر
حاجی لق لق کے افسانے　حاجی لق لق	۱۱ر
مطائبات　سند باد جہازی	عہ ر
جدید جغرافیہ پنجاب　،،	عہ ر
دنیائے تبسم　شوکت تھانوی	۴عہ ر
مضامینِ فلک پیما　فلک پیما	۶ع
روحِ لطافت　مرزا عظیم بیگ چغتائی	۴عہ ر
روحِ ظرافت　،،	۸عہ ر
کولتار　،،	۶ع
ڈرامے	
انارکلی　امتیاز علی تاج	۴عہ ۱۲ر
ریڈیو ڈرامے　فضل حق قریشی	عمر
منقوش　حکیم احمد شجاع	مہ

نام کتاب و مصنف	قیمت
ہبسنا　حکیم احمد شجاع	۱۲ر
ہملٹ　مترجمہ عنایت اللہ دہلوی	عمر
فاوسٹ　گوئٹے	۸عہ ۴ر
چند ٹوپیاں　نور الٰہی محمد عمر	۸ر
چند ڈرامے　،،	۸ر
منظومات	
بانگِ درا　اقبال	۶ ۸ر
نغمۂ حرم　اختر شیرانی	۴عہ ر
نقش و نگار　جوش ملیح آبادی	۶ ۴ر
فکر و نشاط　،،	عمر
بہارستان　مولانا ظفر علی خاں	للعمر
سوز و ساز　حفیظ جالندھری	۶ع
نغمہ زار　،،	۴عہ ر
گیت مالا	۶ر
آتشِ خاموش　احسان دانش	۸عہ ر
چراغاں　،،	۶عار
نقشِ دوام　عبدالحمید عدم	۶ع

مینیجر کتب خانہ ادبی دنیا۔ دی مال۔ لاہور

ہمارے گھریلو گیت

دنیا کی ہر قوم کے پاس ایک خزانہ ایسے ادب کا ملتا ہے جو نسلاً بعد نسل سینہ بہ سینہ محفوظ رہتا چلا آیا ہے۔ اس ادب کی یعنی Folk-lore کی دوسرے ملکوں کے رہنے والوں نے تو خوب قدر کی لیکن ہمارے یہاں یہ ذخیرہ یوں ہی خاک میں مل رہا ہے۔ یوں تو پرانے ادب میں قصے۔ کہانیاں۔ کہاوتیں۔ گیت۔ پہیلیاں۔ ٹونے ٹوٹکے سبھی کچھ آجاتے ہیں لیکن ایک خاص چیز ہے۔ لوریاں اور بچوں کے بول۔ جن کو انگریزی میں Nursery Rhymes کہا جاتا ہے۔ یہ وہ میٹھے میٹھے بول ہوتے ہیں کہ جن کو ماں بچے کو بہلاتے اور سلاتے وقت سناتی ہے اور زبان کھلنے پر جن کو بچہ اپنی ٹوٹی پھوٹی طرز میں ادا کرنا سیکھتا ہے۔

ہمارے یہاں بدیشی تمدن نے آن کر مردوں کو تو نقلی صاحب بنا دیا۔ لیکن عورتوں کو کہیں کا بھی نہ رکھا۔ چنانچہ آج اگر آپ کسی کم سن ماں سے پوچھیں کہ بچوں سے کھیلتے وقت وہ انہیں کیا سکھاتی ہے تو یا تو وہ حیرت سے آپ کا منہ دیکھ کر کہہ دیں گی "کچھ بھی نہیں" یا شرما کر بتائیں گی کہ سُلاتے وقت "آ جا ری نندیا" گا دیتی ہیں۔ بچوں سے معلوم کیجئے تو وہ بہت باتمیز ہوئے تو انگریزی کے "جیک اینڈ جل" وغیرہ آپ کو سنا دیں گے لیکن اس کے معنی مطلب سے ان کو واسطہ نہ ہو گا۔ یا اگر مذہبی گھرانے کے نونہال ہوئے تو اقبال کا ترانہ یا حفیظ کے کچھ اشعار ان کو یاد ہوں گے۔ ورنہ بہت شوقین ہوئے تو نیو تھیٹرز کی "بن کی چڑیا"[1] ان کو آتا ہو گا!

لیکن ہمارے پرانے تمدن کی نشانی ابھی مٹی نہیں ہے۔ کالج کی پڑھی ماؤں کو چھوڑیئے اور دادی اماں اور نانی جان کے پاس جائیے۔ کیسے میٹھے میٹھے بول اور اچھوتے فقرے آپ کو وہ سنائیں گی کہ بچپن کی سہانی تصویر آنکھوں میں پھر جائے گی۔ یہ بول دو دو چار چار بندوں کے ہوں گے۔ زبان بھی ان کی سہل ہو گی اور گو وزن اور قافیہ کچھ انوکھا ہو لیکن اس راگ کا ترنم ان میں ضرور ہو گا جس کی دُھن پر بچے کی زندگی بیتتی ہے۔

بچوں کو تو جانے دیجئے۔ بزرگوں کے لئے بھی ان فقروں میں بہت دلچسپی کا سامان بھرا ہوا ہے۔ یہ بول ہمیں اپنے بڑے بوڑھوں کی زندگی۔ بول چال۔ رسم و رواج آپس میں برتاؤ اور سماج کے مختلف پہلوؤں کے سمجھنے میں بڑی مدد دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر لیجے:۔

"میاں آویں دُوروں سے
گھوڑا باندھوں کھجوروں سے
میاں آویں علی علی
پھول بکھیروں گلی گلی۔
میاں آویں دور سے
پاؤں جھاڑوں منقول سے"

ماں کی ممتا کی کیسی سادی اور سچی تصویر ہے۔ بیٹا بڑا ہو گا پردیس جائے گا اور ماں کی آنکھیں اس کے انتظار میں دروازے پر لگی ہوں گی اس کی دعا ہو گی کہ بچہ خیر و عافیت سے پلٹے اور اس کو ارمان ہو گا کہ بیٹے کے آنے پر "پھول بکھیرے گلی گلی"۔

یا دوسرا بول دیکھئے۔ سادے اور گھریلو الفاظ ہیں لیکن ایک ایک لفظ نے محبت کرنے والی ماں کے دل کی کیفیت ظاہر کی ہے۔

چوموں تیرا ماتھا۔ دکھ اور درد سب جاتا
بنے پھر بھی چوموں گی
چوموں تیری آنکھیں تیری اماں ٹوپی ٹانکیں
بنے پھر بھی چوموں گی

[1] بن کی چڑیا دلاگا نامبیئی ٹاکیز کے ایک فلم میں تھا۔ البتہ نیو تھیٹرز کے ایک فلم "پریزیڈنٹ" میں بھی بچوں کی دلچسپی کا ایک گیت تھا جس کے پہلے بول ہیں "اک بنگلہ بنے نیارا" (ادارہ)

چوموں تیرے ہاتھ۔ تیرے اباہوں دلشاد

بنتے پھر بھی چوموں گی

چوموں تیری ایڑی۔ تو کھیل سونے کی گیڑی

بنتے پھر بھی چوموں گی

اتنا ہی نہیں کہ ان بولوں سے ماں کی ممتا کی جھلک نظر آئے بلکہ یہ بول پرانے رسم ورواج کا اتا پتا دینے میں بھی ہماری مدد کرتے ہیں جیسے کہ اوپر والے بول ہیں "تو کھیل سونے کی گیڑی"۔ یہ سن کر بچہ خواہ مخواہ پوچھے گا کہ گیڑی کیا چیز ہوتی اور اس طرح اس کو معلوم ہو سکے گا کہ تاکی سیکھنے سے پہلے بچے لکڑی کی گیڑیوں سے کھیلتے تھے۔ یا دوسری مثال لیجیے۔

"کودوں دل بھابی کو دوں دل

کودوں کا بھات پیجے گا۔

میری بھابی کا لشکن بھیجے گا۔

تو بول بھابی مجھ سے

ستھورا مانگوں تجھ سے

ستھورے میں کی رائی

جیویں تیرے باپ اور بھائی"

کودوں ایسا اناج ہے جس کا نام شہری بچے بھول گئے ہیں لیکن دیہات میں اب بھی اس کا بھات کھایا جاتا ہے۔ بھابی اب چاہے لشکن نہ پہنتی ہوں۔ لیکن پرانی تصویروں میں جہاں اور زیور ہوں گے وہاں یہ بھی چمک رہا ہوگا۔ اسی طرح رائی پڑا ستھورا بھی معلوم ہو گیا کہ بچے اس زمانے میں شوق سے مانگ مانگ کر کھایا کرتے تھے جبکہ (TOFFEE) ٹافی اور چاکلیٹ کا مزہ نہیں معلوم تھا۔ اور دیکھئے۔

گھومر گھومر دودھ بلوئے

جاٹنی کا چھورا روئے۔

روتا ہے تو رونے دو

موکو دودھ بلونے دو

شاید آج بھی پنجاب کے گاؤں میں اس نظم کی زندہ مثال نظر آجائے گی گو شہروں میں نہ ملے۔

ایک اور بڑا فائدہ جو ان بولوں سے ہوتا ہے وہ یہ کہ بچوں کو مختلف نام سیکھنے میں مدد ملتی ہے بچپن میں نام ہوتا ہی ہے انوکھی چیز گھر کی چیزوں کے نام سیکھ کر بچہ جانوروں کے اور پرندوں کے نام پوچھتا ہے۔ پھر ذرا بڑا ہو کر وہ نئی نئی جگہوں کے نام سن کر گھنٹوں ان پر غور کرتا ہے کس کو یاد نہیں کہ بچپن میں مصر اور سمرقند۔ بند صبا میں اور نسرور کے ناموں میں کیسا طلسم بھرا تھا جس کو اسکول کے بھونڈے نقشے بھی بعد کو مٹانے میں کامیاب نہ ہوئے۔ دادی اماں ننھے کو وہ طلسمی دنیا یوں دکھاتی ہیں۔

آگرہ ملتان صدقے

سارا ہندوستان صدقے

کابل اور قندھار صدقے

لونڈی کا گھربار صدقے

میں جاؤں صدقے تیرے

تیری ساس صدقے میرے

ساتھ ہی سمجھنے والے یہ بھی سمجھ گئے کہ اس گیت کا واسطہ اس زمانے سے ہے جب کہ اکبر کی حکومت تھی اور سارا ہندوستان اور کابل اور قندھار تک ایک سلسلے میں بندھا تھا یا دوسرا گیت ہے۔

ہم ننھی ننھی بیٹیاں

تال کھودے گٹھیاں

تال نے ماری لات

میں جا پڑی گجرات

گجرات کی ہوی موٹی

وہ کھائے چنے کی روٹی

یا ایک اور لمبی نظم کا حصہ ہے۔

بڑے گرو کی چھپی چھری

بل بل کا سپے مین پوری

مین پوری کے آئے امیر

کھائے گروندا مارے تیر

ماروں گا بے ماروں گا

جا دلی پکاروں گا

دلی ہے دو کالے کوس

وہاں پڑی ڈھلم کی جوٹ

ڈھلم ڈھیل مجیرا باجے

ہاتھی چھوڑ ملک کو بھاگے

ظاہر ہے کہ یہ بین پورآسی کے کسی امیر کا قصہ ہے جو کہ دلّی کے بادشاہ کے پاس فریاد کرنے گئے تھے۔ لیکن جب وہاں پر اُلٹی اُن کی آفت آئی تو اپنی فوج اور ہاتھی گھوڑے چھوڑ کر ملک کو بھاگ گئے۔

آپ نے دیکھا کہ ظاہر میں اٹل بے جوڑ چیز بھی غور کرنے پر با معنی معلوم ہونے لگتی ہے۔ ہمارے یہاں تو بھلا کا ہے کو اتنی توفیق ہوتی لیکن دوسرے ملکوں میں تو ماہروں نے یہی بچوں کی NURSERY RHYMES کو لے کر ان کی تحقیق کی ہے اور یہ معلوم کیا ہے کہ ہر گیت کب بنا۔ کیوں بنا اور کہاں کہاں پھیلا اور اس کو پھیلانے والے کون لوگ تھے اور اس طرح قوموں کی اور زبانوں کی تاریخ کی چھان بین میں مدد لی ہے۔

اتنا تو ہمارے یہاں بھی ہوا ہے کہ امیر خسرو کی کہہ مکرنیاں اور پہیلیاں اردو زبان کی بنیادی حالت کی تصدیق کرنے کے لئے استعمال کی گئی ہیں۔ لیکن اگر ہم ان بچوں کے بولوں کو گہری نظر سے دیکھیں تو ہم زبان کے مسئلہ اور اردو زبان کی اولیں حالت پر بہت کچھ معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ مثلاً

ننھی ننھی کلہیوں میں جھنک دھنگار دوں۔
لونگوں کا دے دوں دھونگار
راجہ کے جائے رانی کہلائے۔

چیری کا جایا غلام۔
گھوڑی کا جایا الل بچھیرا۔
جگ بیں کھیلے چوگان

اُس میں کلہیوں یعنی چھوٹے چھوٹے گول برتن اور دھونگار دل یعنی دھوئیں سے بسا دں کے الفاظ یوپی میں اب بھی بولے جاتے ہیں کسی زمانے میں عام استعمال ہوں گے۔ چیری یعنی باندی کا جایا یعنی بیٹا شاید ہر ایک نہ سمجھے۔ اور چوگان یعنی پولو کا لفظ تو اب سمجھنے والے بہت ہی کم ہوں گے۔ لیکن آپ نے دیکھا حالانکہ چوگان خالص فارسی لفظ ہے لیکن اس کے ساتھ جگ اور بچھیرا ہندی کے لفظ بھی اس زمانے میں ملنے لگے تھے جب یہاں کے رئیس چوگان کھیلتے تھے۔

بادا تیرا ہفت ہزاری
دادا صوبہ دار
اماں تیری سدا سہاگن
بچے برخوردار[۱]

ظاہر ہے کہ یہ بول اس وقت بنا ہو گا جب ہفت ہزاری۔ پنج ہزاری وغیرہ عہدے یہاں رائج ہوں گے یعنی مغلوں کے زمانے میں لیکن چونکہ مغل ہندو بیویاں بیاہ کر لاتے تھے اس لئے ماں کے منہ سے اپنے لئے سہاگن کا ہی لفظ نکلا۔

ان پرانی چیزوں میں آپ ہندو اور مسلم فرق کہاں پائیں گے کیونکہ وہ تو اس زمانے کی یاد ہیں جب کہ یہ سوال ہی مٹ چلا تھا۔ کنہیا کرشن کا نام ہے۔ لیکن سب بچے جس وقت کاندھے پر ڈنڈا رکھ کر ڈولی ڈولی کھیلتے تھے تو کہتے تھے۔

ہاتھی گھوڑا پالکی
جے کنہیا لال کی

یا جس وقت بارش نہ ہوتی تھی اور ابر آتا تھا تو کودو کودو کر چلاتے تھے۔

برسو رام دھڑا کے سے
بڑھیا مر گئی فاقے سے

آخر میں ایک التماس ان لوگوں سے ہے جو اس فکر میں رہتے ہیں کہ عام فہم زبان کیا ہے۔ ہندوستانی کسے کہتے ہیں اور جنتا کس زبان کو سمجھتی ہے۔ وہ یہ کہ آپ بچوں کی ان چیزوں کو دیکھئے۔ یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں صدیوں سے اسی لئے محفوظ رہیں کہ عام فہم تھیں۔ وہ دور پھیلیں کہ جنتا کی زبان میں تھیں۔ ہر دل عزیز ہوئیں کیونکہ اس ملک کی چیز تھیں اور اس ملک کے رہنے بسنے والوں کی روزمرہ کا صحیح آئینہ تھیں۔ کیا آدھے ہندوستان کو پیارے یہ بول سچے طور پر "ہندوستانی" نہیں ہیں کہ۔

چندا ماموں دُور کے — بڑے پکائیں بُور کے
آپ کھائیں تھالی میں — ہمیں دیں پیالی میں
پیالی گئی ٹوٹ — چندا ماموں گئے روٹھ
پیالی اور لائے — چندا ماموں دوڑ آئے

یا نینی کی وہ میٹھی آواز جس نے ہندوستان کے کونے کونے میں لاکھوں بچوں کو سلایا ہے۔ ہمارے لکھنے والوں کے لئے ایک نمونہ ہیں؟۔

آ جا ری نندیا تو آ کیوں نہ جا — میرے بالے کی انکھوں میں گھل مل جا
آتی ہوں بیبی میں آتی ہوں — دو چار بالے سلاتی ہوں

ہاجرہ بیگم

[۱] اس سے انگریزی کی ایک نرسری رائم یاد آ گئی ہے

O! hush Thee MY BABY THY FATHER WAS A KNIGHT
TH: MOTHER'S A LADY BOTH LOVELY And BRIGHT (ہ/ا/ا)

ایک غزل اور ایک نظم

شملہ

چوٹیوں پر کوہ کی فرشِ حریرِ دِ پرنیاں
جامۂ اہلِ وطن کی اُڑ رہی ہیں دھجیاں !
برق کی رو سے یہاں ہر ذرّہ ہے کیواں دماغ
گاؤں میں بے تیل ہیں مُدّت سے مٹی کے چراغ
ہر چڑھائی جاں گُسل کڑیل سپاہی کے لئے
کون بدبخت آئے گا یاں داد خواہی کے لئے!
روحِ ہمدردی یہاں پھرتی ہے گھبرائی ہوئی
ہر مکاں پر ہے سراپا بے حسی چھائی ہوئی
زندگی کی موج اُٹھے کس طرح دل سرد ہیں
اس زمیں پر اہلِ ہمت ہیں نہ اہلِ درد ہیں
یاں سکوتِ قبر ہے کوئی جئے کوئی مرے
جس طرف دیکھو کھڑے ہیں مقبرے ہی مقبرے!
یہ طلسمِ سامری بے اصل دبے بنیاد ہے۔
یہ بھی اک جنت ہے، لیکن جنتِ شدّاد ہے۔

سکندر علی وجد

غزل

یارب کبھی تسکینِ دلِ زار بھی ہوگی،
تدبیر گراں جانئ بیمار بھی ہوگی؟
ہونے کو ترے جلوۂ انوار میں مدغم
اصرار بھی ہوگا کشش دار بھی ہوگی!
اقرار ہو جب تجھ کو مرے جوشِ جنوں کا
اُس وقت تجھے صورتِ انکار بھی ہوگی!
ساقی نے کیا سحر عجب جلوہ گری سے
محفل میں کوئی آنکھ تو ہشیار بھی ہوگی!
کیوں کس لئے بیتے ہوئے دن یاد دلائے؟
اس یاد سے تسکینِ دلِ افگار بھی ہوگی؟
معلوم نہ تھی شادئ خاطر کی حقیقت
یہ دشمنِ جاں دشمن افکار بھی ہوگی.

نذیر مرغوب

غم نصیب

عمر کے لحاظ سے تیتیس سال کا نوجوان لیکن افکار و ترددات کے اعتبار سے ساٹھ سال کا بوڑھا! بظاہر خوش حال اور فارغ البال لیکن دراصل نہایت غمزدہ اور دردمند!

وہ اپنی المناک زندگی کو بہلانے کے لئے کبھی کبھی سینما چلا جاتا ہے!

"کیا سینما گئے تھے؟ کیسا کھیل تھا؟"

سینما سے واپسی پر اپنی ماں سے کھیل کے متعلق باتیں کرنا اور اُس کے دیکھنے یا نہ دیکھنے کی بابت مشورہ دینا اُس کا دستور ہے لیکن اس دن وہ سینما سے واپس آیا تو بالکل خاموش تھا ـــــ اپنے بے پایاں غم کی سوگوار فضا میں کھویا ہوا! مجبور ہو کر خود ماں نے باتوں کا سلسلہ شروع کیا۔

"کیا سینما گئے تھے؟ کیسا کھیل تھا؟"

"کچھ نہیں امّاں! ـــــ بالکل فضول اور مہمل!"

"کس کمپنی کا تھا؟" ماں نے سوال کیا۔

"یہ فلم بنانے والے بھی بالکل گدھے ہوتے ہیں۔ ذرا بھی تو شعور نہیں ہوتا ان کو! ایسی بے تکی باتیں اسکرین پر دکھلاتے ہیں کہ گالیاں دینے کو جی چاہتا ہے۔ یعنی اب جو بھی اندھا اپریشن کریں گے اُس کو بعد میں آنکھیں ضرور مل جائیں گی۔ یہ ان کے نزدیک زندگی کی ترجمانی ہے۔ . . ."

ماں نے اپنے مطالعے کی بنا پر بات کاٹ کر کہا، "ویسی ہی کہانی ہوگی۔ جیسی اُس کتاب میں پڑھی تھی۔ کیا نام تھا اُس کا . . . ."

"اُس میں ایک اندھی عورت ہے اور ایک اندھا مرد۔ دونوں کی آنکھوں کا اپریشن ہوتا ہے اور بینائی واپس آجاتی ہے۔ لاحول ولا قوۃ! کیسی مہمل بات ہے! ہم نے تو دیکھا نہیں کسی اندھے کو دوبارہ آنکھیں مل گئی ہوں۔"

"ہاں، نظر کمزور ہو جاتی ہے تو آنکھیں بنوائی جاتی ہیں اور فائدہ بھی ہوتا ہے لیکن کوئی بالکل ہی اندھا ہو تو بھلا اُس کا کیا اپریشن ہوگا!"

"اگر ایسا ہی ہوا کرتا جیسا یہ لوگ فلموں میں دکھاتے ہیں ـــــ آپریشن کے ذریعے بینائی مل جایا کرتی ـــــ تو ہم بھی انیس کی آنکھوں کا اپریشن کرا لیتے ـــ"

"پھر وہی! انیس کی آنکھیں! انیس کی آنکھیں! آخر کب تک انیس کی آنکھوں کا غم کرو گے؟ تم نے تو اپنی زندگی اجیرن کر لی۔ سینما کا ذکر ہو رہا ہے، اُس میں بھی انیس کی آنکھوں کو لے بیٹھے۔ اس کی آنکھیں جاتی رہیں، خدا کو ایسا ہی منظور تھا۔ اب عمر بھر اُس کا سوگ منانا تو کوئی عقلمندی کی بات نہیں ہے!"

اُس نے جواب میں خاموشی اختیار کر لی ـــــ خاموشی جو دراصل ایک طویل آہ تھی۔

اُس وقت اُس کے ذہن میں یہ الفاظ گونج رہے تھے:۔

"تم کیا جانو امّاں! تم ایک حساس اور بدنصیب باپ کے دُکھ کو نہیں جان سکتیں۔ تم ایک عورت ہو، اور عورتیں فطرتاً صابر و شاکر ہوتی ہیں۔ ہندوستان کی غم پرست عورتیں! وہ غم کو اپنی ہستی کا جزو بنا لیتی ہیں اور اس کو زندگی سمجھ کر ہنسی خوشی برداشت کرتی ہیں۔ وہ غم کو غم ہی نہیں سمجھتیں۔ لیکن ایک باپ جو محبت بھرے دل کے ساتھ ایک فلسفیانہ دماغ بھی رکھتا ہو، تقدیر پرستی کا جذبہ کہاں سے لائے! وہ اپنی بیٹی کے دکھ کو کس طرح نظر انداز کرے! اُس کے لئے اِس دنیا میں سکون کہاں ہے امّاں! . . ."

وہ بے شک ایک فلسفی ہے، اس معنی میں کہ سوچنے سمجھنے اور زندگی کی حقیقتوں پر غور کرنے کا ایک فطری ذوق اُس کی طبیعت میں ہمیشہ سے پایا جاتا ہے۔ وہ ایک قنوطی واقع ہوا ہے، اور اس کا یہ میلان بھی بالکل پیدائشی ہے چنانچہ اُس کا بچپن بھی دوسروں کے بچپن کی طرح بے فکری اور بے پروائی کا زمانہ تھا۔ جس عمر میں کہ بچے عام طور پر کھیل کود اور بے معنی ہاؤ ہو کے سوا کوئی دوسرا شغل نہیں رکھتے

وہ ایک بوڑھے مفکر کی طرح دنیا کو ایک غم کدہ اور زندگی کو ایک مصیبت ناک حادثہ خیال کرتا تھا، اور گھنٹوں دکھی انسانیت کے آلام پر غور کیا کرتا تھا۔ بیماری، پیرانہ سالی اور موت کے روح فرسا مناظر جس طرح راج کمار سدھارتھ کے لئے بیزار کن ثابت ہوئے، اسی طرح اس کے لئے بے اندازہ غم واندوہ کا موجب تھے۔ تاریخ ہند کا وہ صفحہ جس پر گوتم بدھ کے حالات زندگی درج تھے۔ وہ بار بار پڑھتا تھا اور کبھی سیر نہ ہوتا تھا۔ اُن چند سطروں میں گویا اُس کے اپنے غم کی داستان مرقوم تھی۔

پھر وہ جوان ہوا۔ اس کی جوانی کاؤنٹ ٹالسٹائے کی جوانی کی طرح بے چین اور غیر مطمئن تھی۔ اُسے کہیں سکون نہ ملتا تھا اور وہ روسی مفکر کی طرح خودکشی کے مسئلے پر سنجیدگی کے ساتھ غور کیا کرتا تھا۔

جب وہ چودہ سال کی عمر میں انٹرنس کا امتحان پاس کر کے کالج میں داخل ہونے کے لئے گیا تو پرنسپل نے اُس کے داخلے کے فارم پر کھیل کے خانے کو خالی دیکھ کر سوال کیا "تم کوئی کھیل نہیں کھیلتے؟"

"جی نہیں" اُس نے جواب دیا۔

"کیوں؟"

"اس لئے کہ کھیل کود بے مغز انسانوں کا کام ہے۔ ذہین اور سنجیدہ آدمیوں کا کام نہیں۔"

بوڑھا پروفیسر چونک پڑا۔ اُس نے پھٹی ہوئی نظروں سے اِس ذہین اور سنجیدہ چھوکرے کو دیکھا۔ وہ خود بھی فلسفے کا عالم تھا اور کھیل کی نفسیات پر بڑے بڑے ماہرین علم النفس کی تصانیف کا مطالعہ کر چکا تھا۔ اس کے نزدیک کھیل کے متعلق اس لڑکے کا خیال جرأت آمیز ہونے کے ساتھ ساتھ غلط اور مہمل بھی تھا۔ مگر آہ! وہ بوڑھا عالم جس کی فلسفیانہ علمیت کتابوں کی مرہونِ منت تھی، اُس لڑکے کے احساس کو کیا جان سکتا تھا، جس کے قلب و جگر میں سارے جہان کا درد سمایا ہوا تھا اور جو زندگی کو انسانیت کی ایک دلدوز کراہ خیال کرتا تھا۔

اٹھارہ سال کی عمر میں اس کی شادی ہو گئی، اور انیس سال کی عمر میں وہ ایک بچی کا باپ بن گیا۔ لیکن ایک خوبصورت بیوی اور ایک پھول سی لڑکی کی محبت بھی اُس کو دردِ دل اور دردِ زندگی سے غافل نہ کر سکی، اور اُس کے دماغ کو سکون کی نیند نہ سلا سکی۔ وہ بدستور بے چین اور دردزدہ رہا۔ اور پھر جب اُس کی بچی دو سال کی عمر میں اندھی ہو گئی اور بیوی عین اٹھتی جوانی میں دائمی مفارقت کا داغ دے گئی تو وہ جیتے جی موت کے منہ میں چلا گیا۔ اُس کی اُمید کی کشتی جو شکستہ بھی تھی اور نازک بھی، اس طوفان کے تھپیڑے برداشت نہ کر سکی اور پاش پاش ہو کر غرق ہو گئی۔

وہ یاس اور نامرادی کی آخری سرحد پہ پہنچ گیا۔ اور اس عالم میں ایک دکھ بھری آواز اُس کے دل سے نکلی:۔

"میرے معبود! کیا سینے کے اندر ایک حساس اور دردمند دل رکھنا کوئی جرم ہے جس کی سزا ہولناک مصائب کی شکل میں دی جاتی ہے؟ یا دل کا ذکی الحس ہونا بذاتِ خود کوئی ایسی چیز ہے جو آفات و آلام کی دعوت دیتی ہے؟ بار الٰہا! میری زندگی یوں ہی کیا کم متالم اور مصیبت ناک تھی کہ اُس میں ان بھیانک غموں کا اضافہ ضروری خیال کیا گیا؟ تیری حکمت کس قدر ناقابلِ فہم ہے میرے معبود!"

اس زمانے میں اگر کوئی چیز اُس کو خودکشی کے اقدام سے باز رکھ سکی تو وہ دو سال کی معصوم بچی تھی جو گویا اس دنیا میں آنکھیں کھولتے ہی آنکھوں سے محروم ہو گئی تھی، جو اپنے سفر کی پہلی ہی منزل میں اپنا زادِ راہ کھو بیٹھی تھی۔ وہ (وہ اپنے اردگرد کی تاریکی میں ملفوف، خاموش اور حیران بیٹھی رہا کرتی اور نظر کی بجائے (کہ وہ اُس کے پاس نہ تھی) اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اس تاریکی کو چیرنے کی کوشش کیا کرتی۔ اُس کا بدنصیب باپ جب اُسے اس حالت میں دیکھتا تو اُس کا جی چاہتا کہ خود بھی اپنی آنکھیں پھوڑ لے۔ "میرے اللہ!" وہ خدا سے فریاد کرتا، "یہ تو دوہری سزا ہے اور دوہرا عذاب ہے۔ اگر تیرے کرم سے یہ بہت ہے میں بھی اندھا ہو جاتا تو کم از کم ان آنکھوں سے اس بچی کی تکلیف کو تو نہ دیکھ سکتا!" پھر وہ محبت کے ایک بے اختیار جذبے سے مغلوب ہو کر لڑکی کو گود میں اٹھا لیتا، بھینچ بھینچ کر اُس کو پیار کرتا اور بالکل بے ضرورت اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگتا جیسی کہ عام طور پر بچوں کے ساتھ کی جاتی ہیں۔

اس طرح اُس کی محبت بچی کے ساتھ شدید سے شدید تر ہوتی چلی گئی اور بہت جلد دیوانگی کی حد کو پہنچ گئی۔ اس کا جذبۂ دل سوزی و ہمدردی جو کل انسانیت کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے تھا، اب صرف ایک بچی کے لئے وقف ہو کر رہ گیا۔ عالم انسانی سمٹ کر ایک ننھا سا وجود بن گیا، اور اس ننھے سے وجود نے اُس کی بے کراں محبت پر قبضہ کر لیا۔ اب وہ اکثر اپنے دل میں سوچتا: "یوں تو دنیا میں شاید ہی کوئی بدبخت باپ ہو جو اپنی اولاد کے ساتھ محبت نہ رکھتا ہو، لیکن کیا کوئی ایسا باپ بھی ہوگا جو اپنی بیٹی سے اِس حد تک محبت کرتا ہو جس حد تک کہ میں کرتا ہوں؟ یہ بے اندازہ اور بے پایاں محبت جو میرے دل میں انیس کے لئے ہے، قدرت کا ایک عطیہ ہے، اور قدرت کا یہ عطیہ

یقیناً ایسے والدین کو بہت کم ارزانی ہوتا ہے جن کی بیٹیاں میری بیٹی کی طرح بے بصر نہیں ہوتیں۔ لاریب قدرت نے میرے حالِ زار پر ترس کھایا اور میرے ناقابلِ تلافی نقصان کی تلافی کر دی۔"

تھوڑی سی مدت میں اُس کا اندازِ نظر کچھ سے کچھ ہو گیا۔ اُس کے ذہنی افق پر ایک نئی روشنی نمودار ہوئی۔ یاس کی گہرائیوں سے سکون و اطمینان کا سوتا پھوٹا، قنوطیت کے بطن سے رجائیت نے جنم لیا، اور نامرادی کی انتہا سے مراد مندی کا آغاز ہوا۔ وہ دنیا کے سارے غموں کو بھلا کر بیٹی کی محبت میں سرشار ہو گیا، اور اس محبت کی بنیادوں پر تصورات کے محل اور ارمانوں کی جنتیں تعمیر کرنے لگا۔ اُس نے اپنے دل میں کہا "یہ بچی گو بے بصر ہے، پھر بھی میری روح کا اجالا ہے۔ یہ میری زندگی کی تاریکیوں میں ماہتاب کی ضیا بن کر آئی ہے۔ میں اس کو اپنے سینے سے لگا کر رکھوں گا! میں اس کی قدر کروں گا! میری دولت جو اب تک بے مصرف رہی ہے۔ اس کے لئے راحت اور آرام مہیا کرے گی۔ یہ اچھے سے اچھا کھائے گی عمدہ سے عمدہ پہنے گی۔ خادمائیں ہر وقت اس کے حکم کی منتظر رہا کریں گی اور اس طرح خدمت بجا لائیں گی کہ اس کو اپنی بے بصری کا ذرا بھی احساس نہ ہو گا۔ اس کی دنیا بے شک تاریک ہے، لیکن میں اس تاریکی کو اپنی تابناک محبت کے ذریعے روشنی اور نور میں تبدیل کر دوں گا!"

اور دراصل اُس نے ایسا ہی کیا۔ لڑکی کی محبت اور خدمت کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا۔ اُس کی زندگی جو مقصد سے خالی ہونے کے باعث بے لطف اور بے کیف تھی، لطفِ مقصد اور کیفِ مدعا سے لبریز ہو گئی۔ اُس کے ارمانوں کی دنیا جو ایک بے آب و گیاہ میدان کی طرح ویران، اُجاڑ اور سنسان تھی، ایک ہرے بھرے باغ کی مانند جگمگا اُٹھی۔ اُس کے دل میں جو خلا تھا وہ پُر ہو گیا! وہ دنیا کے غموں کو بھول گیا اور انسانیت کے آلام سے غافل ہو گیا۔

اِس طرح اُس کی زندگی کے بارہ سال گذر گئے۔

اور اب کہ وہ تینتیس سال کی عمر کو پہنچ چکا ہے، اُس کی زندگی پھر کروٹ بدل رہی ہے۔ اس کی حیاتِ معنوی میں ایک نئے انقلاب کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔ انیس جوانی کی حدود میں داخل ہو چکی ہے۔ اب وہ دس بارہ سال پہلے کی ننھی بچی نہیں ہے جو اپنے ہاتھوں سے راستہ ٹٹولتی ہوئی آتی تھی۔ اور "ابا ابا" کہتی ہوئی باپ کی گود میں چڑھ جاتی تھی۔ جوان ہونے کے ساتھ ساتھ اُس میں ایک حجاب اور نسوانی حیا کا ایک احساس پیدا ہو گیا ہے۔ اب وہ باپ سے بات کرتے ہوئے بھی شرماتی ہے بلکہ اُس کے سامنے بھی نہیں آتی اور ہمیشہ دور دور رہتی ہے۔

اور باپ یہ سمجھتا ہے کہ اُس کی دنیا پھر اُجڑ رہی ہے، اور اُس کی تعمیر کی ہوئی جنت جہنم بداماں ہوتی جا رہی ہے۔ وہ حسرت کے ساتھ اُن دنوں کو یاد کرتا ہے۔ جب اُس کی پیاری بیٹی اُس کی گردن میں باہیں ڈال کر گھنٹوں میٹھی میٹھی باتیں کیا کرتی تھی۔

"ابا جی!" وہ کہا کرتی۔

"ہاں بیٹی!" وہ جواب دیتا۔

"ابا!"

"ہاں بیٹی، کہو کیا بات ہے؟ انیس!" اور وہ محبت سے اُس کے گالوں پر ہاتھ پھیرتا۔

اور وہ کچھ کہے بغیر اپنا سر اُس کے کندھے پر رکھ دیتی اور اس کے سینے سے چمٹ جاتی۔

وہ اُس کو اپنی آغوش میں بھینچ لیتا اور خوب پیار کرتا۔

پھر جب وہ ذرا اور بڑی ہو گئی تو خوب کھُل کر باتیں کرنے لگی۔ وہ اُسے اپنی گود میں اٹھا لیتا اور کہتا "آہا! آج تو انیس نے نئے کپڑے پہنے ہیں۔ کیسی اچھی معلوم ہو رہی ہے ہماری بیٹی!"

اور انیس اپنا ہاتھ اپنے ریشمیں کپڑوں پر پھیرنے لگتی، اور ایک مسرت بھری مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں سے پھوٹ کر سارے چہرے پر پھیل جاتی۔

پھر وہ اُس کی ٹھوڑی پکڑ کر کہتا "ہماری بیٹی کتنی خوبصورت ہے! اور بیٹی کے ماتھے پہ ایک تل ہے"۔

"ابا! کس جگہ ہے میرا تل؟" وہ سوال کرتی۔

وہ اپنی انگلی اُس کے تل پر رکھتا۔ ٹھیک اُس جگہ جہاں ہندو سہاگنیں صندل کا قشقہ لگاتی ہیں، اور کہتا "اس جگہ ہے۔ یہ ہے تمہارا تل"۔

اور پھر وہ بھی اپنی انگلی اُسی جگہ رکھتی اور لمس کے ذریعے تل کو دیکھنے کی کوشش کرتی۔

"اچھا بتاؤ، ہمارے چہرے پر تل کس جگہ ہے؟" وہ اس سے کہتا۔

"میں نے تو آپ کا چہرہ دیکھا ہی نہیں ابا جی"۔ وہ جواب دیتی۔

"نہیں بیٹی، تم نے میرا چہرہ دیکھا ہے۔ تم بھول گئی ہو۔ جب تم چھوٹی

سی تھیں، ننھی منی سی، تو تم نے مجھے دیکھا تھا —— ہاں —— تم مجھے دور سے پہچان لیتی تھیں۔ اور جب میں بازار سے آتا تھا، تو تم فوراً ابا ابا کہتی ہوئی میری طرف دوڑتی تھیں ——"

وہ یہ سن کر خاموش ہو جاتی، اور ایک معصوم سنجیدگی کے ساتھ کچھ سوچنے لگتی گویا اُس بے خبری کے زمانے کو یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ گویا ایک خواب دیکھ رہی ہے۔ باپ اُس کی پیشانی چوم لیتا اور اس کا خواب ختم ہو جاتا۔

مگر یہ سب باتیں اب قصّہ ماضی بن چکی ہیں اور صرف اُن کی ایک تکلیف دہ یاد اُس کے دل میں باقی رہ گئی ہے۔

صرف یہی نہیں کہ اب لڑکی اُس سے دُور دُور رہنے لگی ہے، بلکہ اس دوری اور علیحدگی میں وہ اُداس بھی رہتی ہے اور یہ چیز اُس کے باپ کے لئے سب سے زیادہ اذیّت کا باعث ہے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ وہ کسی گوشے میں خاموش بیٹھی ہوئی ہے۔ اس طرح کہ اُس کا چہرہ اُداس ہے اور پیشانی پر غمناک تصوّرات کے نقوش ہیں، تو اُس کا کلیجہ پھٹنے لگتا ہے۔ اور دل پر چھریاں سی چلنے لگتی ہیں۔

"یہ کیا سوچ رہی ہے؟" وہ اپنے دل میں کہتا ہے، "میری بدقسمت بچّی! یہ کن خیالات میں ڈوبی ہوئی ہے میرے معبود؟ شاید اب اس کو باپ کی محبّت کی ضرورت نہیں، شوہر کی محبّت کی ضرورت ہے میرے اللہ!....."

وہ محسوس کرتا ہے کہ اب اس سے زیادہ اپنے آپ کو فریب دینا ناممکن ہے۔ یہ دنیا ایک غم کدہ ہے، اور زندگی ایک مصیبت ناک حادثے کے سوا اور کچھ نہیں، اُس کی قنوطیّت پھر اس پر اپنا تسلّط جما رہی ہے۔

وہ رات کو سینما دیکھ کر آتا ہے تو حسرت کے ساتھ سوچتا ہے کہ کاش اس دنیا میں کوئی سبیل ہوتی جس سے کھوئی ہوئی آنکھیں واپس آجایا کرتیں!

اور کبھی کبھی وہ خودکشی کے مسئلے پر بھی غور کیا کرتا ہے۔

بدقسمت باپ اور ناکام فلسفی!

اختر انصاری

تغزّل

ضبط کرتے نہ بنے اشک بہائے نہ بنے
پیشِ محبوب کوئی بات بنائے نہ بنے

اب یہ ہے عالمِ حیرت کہ کسی عنواں سے
پردۂ حسرتِ دیدار اٹھائے نہ بنے

گرچہ ہر ذرّۂ جاں صورتِ خاکستر ہو،
شررِ عشق کسی طرح چھپائے نہ بنے

پا بہ زنجیرِ وفا آتشِ دل ہے ورنہ
آپ دامن کو بچائیں تو بچائے نہ بنے

دہر میں نقشِ محبّت کو مٹا کر اک بار
کوئی سو بار بنائے تو بنائے نہ بنے

کر دیا عشق کو درماں طلبی نے رسوا
غمِ دل بار نہیں ہے کہ اٹھائے نہ بنے

ہائے وہ جنبشِ داماں کہ رمیدہ ہی رہے
آہ! وہ خوابِ گریزاں کہ بھلائے نہ بنے

رفتۂ خوابِ مسلسل ہی سہی عشق، مگر،
ہے وہ عالم کہ کسی طرح جگائے نہ بنے

لا مجھے ساغرِ زہرآبِ خموشی اے ضبط!
دل کا وہ حال ہوا ہے کہ سنائے نہ بنے

اٹھ ہی جائے جو نقابِ رخِ مدہوشیٔ عشق
عالمِ ہوش کو بھی ہوش میں آئے نہ بنے!

وہ ترے رازِ محبت کا سزاوار کہاں،
جس سے اک لفظِ محبت بھی چھپائے نہ بنے۔

یہ نہ ہو کاش! کہ اس جانِ نزاکت سے روشؔ
بارِ احساسِ تغافل بھی اٹھائے نہ بنے

روشؔ صدّیقی

خواب بیداری

(۱)

دوست! یہ رنگیں فضائیں اور گھٹا چھائی ہوئی
نکہتیں دوشِ صبا پر ہر طرف اُڑتی ہوئی
آسماں پر اُودی اُودی بدلیاں بکھری ہوئی
آرہی ہے دور سے معصوم گیتوں کی صدا
مجھ کو یوں محسوس ہوتا ہے ابھی سو جاؤں گا
تو سنائے جا مگر رومان پرور داستاں

ابر کے رنگین سایوں میں بڑھے جاتا ہے تو!
ریشمی آنچل ترا تھامے ہوئے میں ساتھ ہوں،
کیوں پلٹ کر دیکھتے ہی مسکرا دیتا ہے تو؟
میری آنکھوں کی چمک میں خواب تو پنہاں نہیں!
راستہ قوسِ قزح کا کس قدر رنگین ہے!
روح کی گہرائیوں میں گونجتے ہیں تیرے گیت
مسکرا کر دیکھتا جا اور یوں ہی گائے جا

(۲)

رہنمائی میں تری بڑھتا چلا جاتا ہوں میں
جا رہی ہے دور تک سر سبز پیڑوں کی قطار
گونجتی ہے وادیوں میں آبشاروں کی صدا
چومتی پھرتی ہے ہر سو لالۂ خود رو صبا
یہ فرازِ کوہ کی راہیں لکیروں کی طرح
ایک نامعلوم دنیا کی طرف جاتی ہوئی
مل گئی ہیں جا کے سب قوسِ قزح کی راہ سے

ایک نامعلوم دنیا میں پہنچنا ہے ہمیں
اور اُسی دنیا کو جاتا ہے یہ رنگیں راستہ
ہاں! وہ نامعلوم دنیا چاند اور تاروں میں ہے"

(۳)

کیا کہا اے دوست! کیوں ہوں سوچ میں ڈوبا ہوا؟
کیا کبھی دیکھے نہیں ہیں تو نے بیداری کے خواب؟
سن رہا ہوں میں تری رومان پرور داستاں!

نذیر میرزا برلاس

اسی طرح پروفیسر براؤن نے بھی دنیا کو فارسی کے مرتبے سے آشنا کرنے میں
اپنی زندگی صرف کردی اور آج یورپ بلکہ خود ایشیا میں فارسی کا جو چرچا ہے
اس میں براؤن کی کوششوں کا بہت بڑا حصہ ہے ۔

" خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را "

صلاح الدین احمد

حصۂ نظم

غزل اور نظم میں جو کشمکش اردو شعری ادب میں جاری رہی ہے اور اب
بھی جاری ہے، اُس کے بعض پہلوؤں کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ۔
غزل کے شعر میں جو اختصار ہم دیکھتے ہیں وہ موضوع کے ہر اُس نکتے پر حاوی
ہوتا ہے جس کا تعلق اصل بات سے ہو۔ اب یہ کام قاری کا ہے کہ وہ اپنے
تخیل سے، اپنے ذہن ہی کی اندرونی طاقتوں سے ہر بات کو گرفت میں لے
گویا غزل کے شعر کو سمجھنے کے لئے ایک طرح سے ہم تخلیق کا داخلی عمل کرتے
ہیں ۔ اس کے برعکس نظم کا پھیلاؤ موضوع کے لوازم کو بنفسہٖ ہماری نظروں کے
سامنے لے آتا ہے۔ اس طرح ہمارے ذہن پر نظم کا مفہوم خارجی انداز
ہی میں اثر انداز ہوتا ہے۔ ساون کے متعلق گنّا بیگم کا ایک مشہور شعر ہے ۔

ابر چھایا ہے، مینہہ برستا ہے
جلد آ جا کہ جی ترستا ہے

اس شعر میں ماحول کا ذکر صرف "ابر کے چھانے اور مینہہ کے برسنے"
سے کیا گیا ہے لیکن ظاہر ہے کہ ساون کا مفہوم صرف ابر اور برسات ہی نہیں
ہے۔ ساون کا ماحول ایسے کثیر لوازم کا حامل ہے جن سے جذبات بھڑک
اُٹھتے ہیں، لیکن نظم میں اُن کا تذکرہ امکانی ہے اور آسانی سے ہو بھی سکتا
ہے۔ غزل میں صرف اُس ماحول کی طرف اشارہ ہی کیا جا سکتا ہے۔ باقی
تعمیر ہمارا ذہن تخلیق کے داخلی عمل سے کرے گا۔ اس بات کو نظم کے لحاظ
سے واضح کرنے کے لئے شاد عارفی کی "ساون" پیش نظر ہے۔

ساون

۱۔ جب پورب پچھم سے اُٹھ کر گھنگھور گھٹائیں چھاتی ہیں۔
کچھ لچتی ہیں کچھ دبتی ہیں کچھ آتی ہیں کچھ جاتی ہیں۔
کچھ ملتی ہیں کچھ کٹتی ہیں کچھ رُک کر مینہہ برساتی ہیں

۲۔ جب جھلسی دُوب پہ جل داتا کچھ "امرت رس" برساتے ہیں
جب مکا کے چھوٹے پودوں پر سبزے سے ٹک جاتے ہیں
جب چٹیل میدانوں کے سبزے مخمل کو شرماتے ہیں

۳۔ جب کھیتوں سے بہہ بہہ کر پانی جھیلوں میں مل جاتا ہے
جب مدھم پُروا کے جھونکوں سے کنول کنول کھل جاتا ہے
فطرت کی پوجا کرنے والوں کا "ہردے" چھل جاتا ہے

۴۔ جب سرپادل پر "بیر بہوٹی" اپنا رنگ جماتی ہے
جب گیت پپیہا گاتا ہے جب کوئل کوکے جاتی ہے
جب گھنے رتالو کے پتوں میں آنکھ شانتی پاتی ہے

۵۔ جب ہلکے ہلکے بادل سے سورج کی کرنیں پڑتی ہیں
آکاش پہ جب اُدھر پیچھے دو سندر دھنکیں پڑتی ہیں
جو آنکھوں میں بس جاتی ہیں جو دل کے اندر گڑتی ہیں۔

۶ جب جھولے ڈالے جاتے ہیں آموں کی آڑی ڈالوں میں
جب پینگ بڑھائے جاتے ہیں ساون کے دھیمے جھالوں میں
جب مدھر ملاروں کے چرچے ہوتے ہیں فرقت والوں میں

۷ جب پچھلی رات کو آدھی چادر تان کے تارے سوتے ہیں
جب کل سنسار میں بسنے والے نیند کے ماتے ہوتے ہیں
کچھ بپتا جن پر آپڑتی ہے چپکے چپکے روتے ہیں

اس نظم میں پہلے بند سے تیسرے بند تک ایک فقرہ ہے، یعنی
"جب پورب پچھم سے اُٹھ کر گھنگھور گھٹائیں چھاتی ہیں" اور بہت سی اور ایسی
باتیں ہوتی ہیں جن کا ساون سے تعلق ہے تو "فطرت کی پوجا کرنے والوں کا
ہردے چھل جاتا ہے"۔۔۔۔ اس کے بعد چوتھے بند سے لے کر ساتویں
آخری بند تک دوسرا فقرہ ہے یعنی سرپادل پر بیر بہوٹی کا رنگ، پپیہے کا گیت
کوئل کی کوک، گھنے رتالو کے پتے، ہلکے ہلکے بادل سے سورج کی کرنوں کا
لڑنا، دھنک، آموں کی ڈالوں پر جھولے، مدھر ملاریں، پچھلی رات ۔۔۔۔
اس ماحول میں، ان چیزوں کے اس ماحول میں "کچھ بپتا جن پر آپڑتی ہے چپکے
چپکے روتے ہیں"

ان کے دل کی حالت کو ظاہر کرنے کے لئے جن پر کچھ بپتا آپڑتی ہے
اور جو چپکے چپکے روتے ہیں اور فطرت کی پوجا کرنے والوں کے دل پر ساون
کے تاثرات کے اظہار کو ہم پر منکشف کرنے کے لئے فن کار نے ان دونوں
فقروں کا درمیانی ماحول کھڑا کیا ہے ۔

یہ تو ہوئی غزل اور نظم کی فنی حیثیت کے متعلق ایک بات۔ اب کچھ

اس نظم کے متعلق۔

اس ٹکڑے میں شاد عارفی نے الفاظ کا انتخاب بہت خوب کیا ہے۔ لچنا، دبنا، ہٹنا، کٹنا، جھلسی دوب، ہیرے سے ٹک جاتے ہیں، ہریاول، بیر بہوٹی، گھنے رتالو، آڑی ڈالیں دھیمے جھلے، مدھر ملاریں، آبی چادر ـــــ ان الفاظ کی اصوات ہی ایک ایسا نرم ونازک اثر پیدا کرتی ہیں کہ ہمارا ذہن خود بخود اُس گداز کیفیت میں ڈوب جاتا ہے جو نظم کے موضوع کے متعلق ہمارے اندازِ نظر کو ہمدردانہ بنا دیتی ہے۔

"جب ہریاول پہ بیر بہوٹی اپنا رنگ جماتی ہے" اور "جب گھنے رتالو کے پتّوں میں آنکھ شانتی پاتی ہے" ان مصرعوں میں تصوّرات کی دلکشی ملاحظہ ہو۔

"جب مکّا کے چھوٹے پودوں پہ ہیرے سے ٹک جاتے ہیں" اور "جب کھیتوں سے بہہ بہہ کر پانی جھیلوں میں مل جاتا ہے"۔ ان مصرعوں میں شاعر کا مشاہدہ قابلِ تعریف ہے۔

اور بیان کی خوبی پہلے بند کے علاوہ اس مصرعے میں بھی دیکھئے۔

"جب پچھلی رات کو آبی چادر تان کے تارے سوتے ہیں"

نظموں سے لطف اٹھانے اور ان کو صحیح طور پر سراہنے کے لئے میں نے آج تک یہی طریقہ اختیار کیا ہے کہ ایک بار پڑھ لینے کے بعد میں اُس جگہ جا کھڑا ہوتا ہوں جہاں استادہ ہو کر شاعر نے اپنا کلام ظاہر کیا اور پھر آغاز سے لے کر نظم کو دوبارہ پڑھنا شروع کرتا ہوں۔ یوں میرا ذہن شاعر کے ذہن کی اُس کیفیت سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے جس میں اُس نے شعر کہا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں اُس شاعر کی انفرادی خصوصیات کو بھی مدنظر رکھتا ہوں تاکہ بعض باتیں جو میرے لئے غیر مانوس ہوں، نظم میں اُن کی آمد سے میرا ذہن لغزش نہ کھا جائے اور کہیں میں شاعر کی کیفیتِ ذہنی کو سمجھنے میں چوک نہ جاؤں۔ مثال کے طور پر ماہنامہ "اضطراب" لکھنؤ کے شمارہ ستمبر ۱۹۴۰ء سے جوش ملیح آبادی کی نظم لیتا ہوں:۔

دیدنی ہے آج

پہلو میں تابِ حسنِ جواں دیدنی ہے آج
نورِ چراغِ خلوتیاں دیدنی ہے آج
کشتی رواں ہے نغمۂ ساقی کی لے کے ساتھ
موجِ خرامِ آبِ رواں دیدنی ہے آج
دم سازِ ابر و باد ہے رندانہ بانکپن
طرفِ کلاہِ پیرِ مغاں دیدنی ہے آج
آرائشوں کی فکر نہ زیبائشوں کا ہوش
وارفتگیٔ لالہ رُخاں دیدنی ہے آج
حسنِ جواں، شرابِ کہن، سازِ برشگال
عشرت سرائے بادہ کشاں دیدنی ہے آج

"اضطراب" ـــــــــ جوش ملیح آبادی

اس نظم سے لطف اندوز ہونے کو میں سب سے پہلے ذہنی طور پر کسی دریا کے کنارے پر جا پہنچتا ہوں۔ کنارے پہ پیڑ ہیں، سبزہ ہے، آبادی کا دور دور تک نام ونشان نہیں، پیڑوں سے پرے دھرتی پھیلی ہوئی ہے اور اُس دھرتی پر کھیتوں کا جال بچھا ہے۔ لیکن وہ میری ذہنی گرفت کے افق کی چیزیں ہیں۔ میں دریا کے کنارے پر کھڑا ہوں، سامنے دریا لہروں کی سلوٹوں میں بس گھول رہا ہے۔ ہر طرف ایک چپ چاپ سی پھیلی ہوئی ہے، خاموشی اور سکون مکمل نہیں ہیں، کبھی کبھی کسی طائر کی آواز کان تک آ پہنچتی ہے۔ اوپر نگاہ کرتا ہوں تو آسمان پھیلا ہوا دکھائی دیتا ہے لیکن موسم ساون کا ہے، وہی ساون جس کے رنگا رنگ پہلوؤں کا تذکرہ ابھی شاد عارفی نے کیا تھا، پھیلے ہوئے آسمان پر بادلوں کے جھرمٹ چھائے ہوئے ہیں اور اُن کی کاجل ایسی سیاہی آنے والی بوندوں کا پیغام دے رہی ہے۔ اب بہت سی باتیں یک بارگی ہو جاتی ہیں۔ بوندا باندی شروع ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ ایک پھوار کی صورت اختیار کر لیتی ہے نہ جانے کہاں سے سطحِ آب پر ایک بڑی سی کشتی نمودار ہو جاتی ہے۔ اس کشتی پر بہت سے لوگ ہیں۔ مرد بھی اور عورتیں بھی اور پھر میرے ذہن کی قلابازی مجھے بھی اُن کا ہم جلیس بنا دیتی ہے۔ اب مجھے صرف اس کشتی اور اُس کے مسافروں کے ساتھ کا ہی احساس رہ جاتا ہے، دریا کا کنارہ دور ہے، قریب صرف دریا کی لہریں ہیں، "موجِ خرامِ آبِ رواں ہے" جس کے ساتھ ہی ساتھ ساقی کے نغمے کی لَے بھی جاری ہے، بھیگی ہوا چل رہی ہے اور پل بھر کو اوپر نظر اٹھاتا ہوں تو آسمان پر ابر پارے لڑکھڑاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، اُن کی لغزش میں ایک "رندانہ بانکپن" محسوس ہوتا ہے اور پھر نظر کشتی میں آ رکتی ہے وہاں بھی رندوں کا جھرمٹ ہے جن کی بادہ نوشی موسم کو خراجِ تحسین دے رہی ہے۔ سامنے شاعر کا ہما جان ہے جس کے پہلو میں "تابِ حسنِ جواں دیدنی ہے" ایک طرف کو جناب پیرِ مغاں ہیں اور اُن کی کج کلاہی! ہر شخص اپنی ہی دُھن میں کھویا ہوا ہے، نازنینوں کو بھی نہ اپنے پیراہن کی پریشانی کا فکر ہے، نہ اس کا

خیال کہ اُن کی بکھری ہوئی لٹیں ہوا سے اٹھکیلیاں کر رہی ہیں۔ وہ بھی سرمستی میں کھوئی ہوئی ہیں۔ ان کے گالوں کی سُرخی "شرابِ کہن" اور "عشرتِ بادہ کشاں" کے اثر سے دمک اُٹھی ہے۔ میں تو اس منظر میں صرف مشاہدے کی بیرونی طاقت ہوں۔ اس بزمِ عشرت کا ہیرو شاعر ہے جس کے دل پر حسنِ جواں کی مستی، شرابِ کہن کا نشہ اور سازِ برشگال کا کیف طاری ہے۔

جوش کا ذہن اردو شعراء کی اکثریت کی طرح فارسی ادب سے متاثر ہے لیکن اس کا دل خاکِ پاکِ ہند ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا اظہار بھی اس نظم سے ہو رہا ہے۔ ساقی اپنے نغمے کے ساتھ اور پیرِ مغاں اپنی کج کلاہی کو لئے ہوئے ایران سے آتے ہیں، لیکن جس دریا پر یہ عشرت سرائے بادہ کشاں، یہ کشتی رواں ہے وہ ہندوستانی ہے اور سازِ برشگال کی دلکشی تو اور کسی ملک میں یہ درجہ رکھتی ہی نہیں۔

پہلے جوش غزل کا شاعر تھا، اس نظم میں ہیئت کے علاوہ بھی بعض باتیں اس کا پتہ دیتی ہیں۔ غزل ہی کی طرح وہ اس منظوم پارے میں کنایوں سے کام لیتا ہے اور اُس کا یہ کنائتی انداز اُس کی فن کارانہ قدرتِ اظہار کو نمایاں کرتا ہے۔ پہلے دو شعروں میں اپنے پہلو، حسنِ جواں، خلوتیاں، کشتی، نغمۂ ساقی، اور موجِ خرامِ آبِ رواں کا ذکر کرتا ہے، تفصیل میں نہیں جاتا لیکن منظر کے متعلق ہمیں تمام سراغ دے جاتا ہے۔ پیرِ مغاں کی دلچسپ کیفیت کو اُس کے طرفِ کلاہ ہی سے ظاہر کر دیتا ہے۔ لالۂ جو کے بارے میں صرف ایک آدھ بات کہتا ہے لیکن ہم پوری طرح جان لیتے ہیں کہ کیسے کیسے جنتِ نظر پہلو موجود ہوں گے۔ اور پھر آخری شعر میں سارے ماحول اور اُس کی کیفیت کا تتمّہ بناتا ہے۔ تفصیلات کی عدم موجودگی کے باوجود یہ نظم کسی اچھے سے اچھے مختصر افسانے پر بھاری ہے اور اپنے تصوّرات کے لحاظ سے کسی مصوّر کا غیر فانی شاہکار معلوم ہوتی ہے۔

محاکات

کون؟
ہاں، پار نہ کیجے میری دیواروں کو۔
آپ تو چڑھتے ہی آتے ہیں، اُدھر ہی رہیئے
کیا سزا آپ کو دی جائے یہ خود ہی کہیئے
دیکھئے یوں نہ مرے حسن کے نظاروں کو
ہے نگہباں کی نظر۔
آپ کی اس جرأت پر
میں، قسم ہے اسے برداشت نہیں کر سکتی!

کون؟
پھلواری میں کیوں آپ چلے آتے ہیں!
آپ تو بڑھتے ہی آتے ہیں ذرا رُک جائیں
خود ہی تجویز خطاؤں کی سزا فرمائیں
کیوں مری جوہی، چنبیلی کی طرف جاتے ہیں!
باغباں بھی ہے کھڑا
دیکھ کے وہ سوچے گا کیا!
میں، قسم ہے اسے برداشت نہیں کر سکتی!

کون؟
اندر نہ قدم رکھئے، عنایت ہوگی!
آپ رُکتے ہی نہیں، ہوش میں بھی ہیں کہ نہیں؟
مجھ کو ڈر ہے کہ نہ غصہ مجھے آ جائے کہیں!
کیا مرے پردے کو بھی چھونے کی جرأت ہوگی!
کمرے کے پیچھے وہاں
جیسے ملازم ہیں عیاں!
میں قسم ہے اسے برداشت نہیں کر سکتی!

کون؟
کمرے میں نہ آ جانے کی جرأت کیجے
آپ رُکتے ہی نہیں کیسا کوئی سودائی ہیں؟
آپ اب میرے لئے باعثِ رسوائی ہیں؟
میرے گلدستے کو چھونے کی نہ رغبت کیجے!
خادمہ آ جو گئی؟
آپ کو وہ پا جو گئی!
میں قسم ہے اسے برداشت نہیں کر سکتی!

کون!

اب وقت نہ یوں کیجئے بیکار مرا
مانتے ہی نہیں، بڑھتے ہی چلے آتے ہیں،
آپ اُلٹے ہی یہ غمزے کسے دکھلاتے ہیں۔
ہاں، یہ کیوں چھپتے ہیں جُو ہی کا حسیں ہار مرا!
مسکراتی ہے کھڑی
ایک سہیلی وہ مری
میں قسم سے ہے اسے برداشت نہیں کرسکتی!

کون!

کیوں کرتے ہیں اس طرح پریشان مجھے!
آپ کیا ٹھان کے آئے ہیں، ارادہ کیا ہے؟
کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ منشا کیا ہے!!
دیکھئے اب تو نہ یوں کیجئے حیران مجھے!
کیا کہے گا یہ جہاں
اور میں جاؤں گی کہاں!
میں، قسم سے ہے اسے برداشت نہیں کرسکتی!

اضطراب اکتوبر ۱۹۴۰ء سلام مچھلی شہری

سلام مچھلی شہری کی یہ نظم نہ صرف اپنی سادگی و پرکاری کے لحاظ سے قابلِ توجہ ہے بلکہ اس سے اردو شاعری کے نت بدلتے رجحانات کا پتہ بھی چلتا ہے نیز یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارا شعری ادب حقیقت سے کس قدر قریب ہوتا جارہا ہے۔ اس نظم میں واقعہ تو دلکش ہئی لیکن واقعے کی مختلف کڑیاں جس باقاعدہ تسلسل سے اپنے متناسب زیروبم کے ساتھ ایک دوسرے میں گھلتی ہوئی پڑھنے والے کے ذہن کو نقطۂ عروج کی طرف لے جاتی ہیں وہ بھی لائق ستائش ہے۔ اس نظم کا ہیرو شاید انشا کے اس شعر کا ہیرو ہے۔

کودا کوئی دیوار تری دھم سے نہ ہوگا
جو کام ہوا ہم سے وہ رستم سے نہ ہوگا

رستم سے یہ کام واقعی نہ ہوسکتا تھا، محض اس لئے کہ وہ مرچکا ہے، البتہ ہماری جدید سماج میں جو نوجوان رستم اپنے عشقی کارناموں سے نمایاں نظر آتے ہیں اُن کے لئے یہ "کام" بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اس نظم کی مہم میں ہیرو کو واقعے کی بڑھتی ہوئی تان کے ساتھ ساتھ جن مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے وہ یہ ہیں، چوکیدار، مالی، ملازم، خادمہ، ہیروئن کی سہیلی اور پھر خود ہیروئن۔

یہ تو ہوئے کردار، لیکن قصہ بھی غور کے لائق ہے۔ اسے یوں سمجھئے:۔

شہر سے باہر کھلے علاقے میں ایک صاف ستھری سڑک ہے جس کے دونوں طرف عمدہ کوٹھیاں اس کی شان کو بڑھا رہی ہیں۔ لیکن ہمیں اس وقت ایک کوٹھی سے غرض ہے۔ سامنے بڑے دروازے سے داخل ہوکر ایک اچھا خاصا باغ دکھائی دیتا ہے۔ اس باغ میں سے جاتی ہوئی سڑک آگے جاکر اصل عمارت تک پہنچتی ہے۔ شام کا وقت ہے اور ہیروئن گھر میں اکیلی ہے۔ ابا کلب گھر اور اماں خالہ سے ملنے گئی ہیں۔ بھائی ٹینس کھیلنے کے لئے کالج کو گیا ہوا ہے۔ لیکن ہیروئن سے ملنے کے لئے اُس کی ایک گہری سہیلی بھی آئی ہوئی ہے۔ وہ دونوں کمرے سے نکل کر باہر باغ میں ٹہلنے لگتی ہیں۔ اچانک ساتھ کی دیوار سے ایک نوجوان نمودار ہوتا ہے۔ یہاں سے نظم شروع ہوتی ہے لیکن ہم اس بات کا تعین نہیں کرسکتے کہ یہ دیوار کوئی سچ مچ کی مادی دیوار ہے یا ایک نوجوان لڑکی کی ذہنی دیوار جسے پھاندنا ہر کسی کا کام نہیں، جسے صرف اُس کا محبوب مرد ہی پار کرسکتا ہے یا پھر وہ خیالی عاشق اس دیوار کی روک سے پنپ سکتا ہے جس کی ہستی محض ایک عورت کی نفسی حرکت سے بنتی ہے۔

اگر ہم اس نظم کو حقیقت کا رنگ دے کر اس کی شرح روزمرّہ زندگی کے مطابق کریں تو ہمیں اس نظم کے پلاٹ کے تعین کے علاوہ اس کے کرداروں کے باہمی تعلق کے بارے میں بھی فیصلہ کرنا ہوگا سہیلی کا تعلق ہیروئن سے کیا ہے، اور اُس نوجوان کا تعلق کیا ہے جو دیوار پھاند کر آیا ہے۔ تمام نظم میں ہیروئن کے لہجے سے اتنی بات تو عیاں ہے کہ وہ محض رسوائی کے ڈر سے اُس نوجوان کو روک رہی ہے، ورنہ اگر یہ ڈر نہ ہوتا تو وہ اُسے کچھ نہ کہتی اور شاید اپنی من مانی بھی کرنے دیتی۔

اس کے برعکس اگر ہم اس نظم کے پلاٹ کو ایک نوجوان لڑکی کے ذہن کی اختراع سمجھیں، ایک نفسی حرکت، بیداری کا ایک خواب تو اس صورت میں ہمیں کسی خاص ترتیب یا تعلق خاطر کے تعین کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ذہن کے کرشمے نرالے ہیں۔ انسانی کھوپڑی میں ہر بات کا وقوع ممکن ہے اور میرا خیال ہے کہ یہ نظم ایک ذہنی حرکت ہی کو بیان کرتی ہے؛ ایک نفسیاتی مطالعہ ہے۔ عنوان "کون؟" ہی سے ظاہر ہے کہ دیکھ کر بھی لڑکی کو یہ معلوم نہیں کہ نوجوان کون ہے؟ البتہ اس نوجوان کی ہستی اُس کے لئے پسندیدہ ضرور ہے گویا اس کی صورت اور مورت مبہم ضرور ہے لیکن ہے محبوب۔ اس کے علاوہ ہر بند سے پہلے کون کا لفظ موجود ہے، گویا یوں سمجھئے کہ ایک نوجوان لڑکی کہیں تنہا بیٹھی ہوئی ہے اُسے ابھی عشقی معاملات سے واسطہ نہیں پڑا لیکن اُس کے جسم کے غدودوں میں ایک تبدیلی رونما ہوچکی ہے اور اب وہ اس تبدیلی کی کیفیت کی تسکین کے لئے ایک فانوسِ خیالی کو روشن

نقد و نظر

دانہ و دام (مختصر افسانوں کا مجموعہ) از راجندر سنگھ بیدی
حجم تین سو تین صفحے کتابت اور طباعت اچھی کاغذ اچھا۔ شائع کرنے والے مکتبہ اردو لاہور۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ (عہ)

راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں کا مجموعہ اردو ادب کے بڑھتے ہوئے ذخیرے میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔ بلا مبالغہ "دانہ و دام" ان چند کتابوں میں سے ہے جو اردو کو دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے بہترین افسانوی ادب کی صف میں کھڑا ہونے کے قابل بناتی ہیں۔

بیدی فن اور اپنے نقطۂ نظر کے اعتبار سے ایک مکمل ادیب ہے نقطۂ نظر کی سنجیدگی اور توازن تو اس کی عمر کے لحاظ سے تعجب انگیز ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اس نے ذہنی اور اقتصادی دونوں دنیاؤں میں احتیاج اور آرزو کی شدت کو محسوس کیا ہے۔ اور اسی احساس کا نعم البدل بھی محبت اور ہمدردی کی صورت میں تلاش کر لیا ہے۔ اگرچہ درد کا احساس اس کے ہاں زیادہ تیز ہے لیکن محبت سے جو راحت ہوتی ہے وہ بھی اس کی دنیا میں کوئی غیر نمایاں جذبہ نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ زیر نظر مجموعہ میں اس کا افسانہ "ہمدوش" ہمیں اس کے نقطۂ نظر کے متعلق بہت صحیح واقفیت مہیا کرتا ہے اسے پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ افسانے کا راوی مصنف خود ہے۔ اس نے ذہن کے مرکزی شفاخانے میں سے "تندرست انسانوں کی دلچسپ حماقتوں کا تماشہ" کیا ہے۔ "وہی ہنگامے، وہی بے صبری ..... بے شک! زندگی کی بہت سی خوشیاں موت کے پس منظر کی رہین منت ہیں" وہ سوچتا ہے کہ باہر سے تیمارداری کے لئے آئے ہوئے لوگ کیا جانیں کہ شفاخانے کے احاطے کی چار دیواری سے باہر سب کچھ ہے مگر یہاں کوئی ہندو ہے نہ مسلمان، سکھ نہ عیسائی، گورا، برہمن اور نہ اچھوت"۔

لیکن آخر وہ تندرست ہو جاتا ہے اور مریضوں کے دکھ درد کو پوری طرح محسوس کرنے لگتا ہے۔

"ایک دفعہ میں شفاخانے کے پاس سے گذرا تو میری روح تک لرز گئی اس وقت میرے ساتھی اور بعد میں آئے ہوئے مریض حسرت بھری نگاہوں سے ہماری دلچسپ حماقتوں کو دیکھنے میں محو تھے...... اس وقت میرے سوا ان مریضوں کی تکلیف کو کون جان سکتا تھا۔ میں نے ان لوگوں کی مصیبت پر چند ایک آنسو بہائے"۔

یہ سچ ہے کہ ابھی تک بیدی کو خود اپنی تکلیف کا خاصا تیز احساس ہے اور اس لئے اس کی ہمدردی بالکل مکمل نہیں وہ کبھی کبھی جھلا اٹھتا ہے۔ بالخصوص جب وہ دنیا کی ریا اور نمائش کو دیکھتا ہے۔ زندگی سے وہ ابھی تک پوری طرح مطمئن نہیں ہوا۔ اسی لئے اس کے ہاں کہیں کہیں تلقین کی غیر ضروری کوشش ہوتی ہے (جس شخص کی نظر زندگی کے ہر منظر پر حاوی ہو چکی ہو وہ اکثر تلقین کی کوشش نہیں کیا کرتا)

موجودہ تہذیب کی ظاہرپرستی سے وہ بیزار نظر آتا ہے۔

"جب وہ بڑا ہوا تو اس کی تمام عادتیں بالو کی سی تھیں۔ ماں کو حقارت سے "اے بُو!" اور باپ کو "چل بے!" کہنا اس نے نہ جانے کہاں سے سیکھ لیا تھا" (زنادان صفحہ ۱۹۱)

محاکات کے لحاظ سے یہ شاید درست ہو لیکن ہمدردی کے لحاظ سے خفیف ہے۔ اور دیکھئے:-

"وہ راٹا کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ گیا ہے کیونکہ وہ اس سے محبت کرتی ہے اور جس شخص میں محبت کی سی کمزوری ہو وہ پلے استحقار سے ٹھکرا دیا جاتا ہے" (دس منٹ بارش میں صفحہ ۲۰۱)

یہ بھی اگر کسی کردار کے جذبات ہوتے تو درست تھے لیکن مصنف کے لئے زندگی سے اس کی بے اطمینانی کا اظہار کرتے ہیں۔ امید ہے کہ تجربہ اور زمانہ بیدی کے دل کو اور بھی گداز بنا دے گا۔

جہاں تک فن کا تعلق ہے راجندر سنگھ میں افسانہ نگار کی قریب قریب تمام صفات موجود ہیں اس کے ہر افسانے میں کوئی نہ کوئی نفسیاتی یا کیفیاتی "حقیقت" کہانی کا مرکز ہوتی ہے۔ ہر جزئی تفصیل اور ذیلی قصہ اسی

حقیقت کو نمایاں کرنے کے لئے لایا جاتا ہے نہ کہ محض آرائش کی خاطر محاکات کا بیدی میں ہر جگہ التزام ہے۔ لیکن محاکات اس کے فن کی روح نہیں محض جسم ہیں اس کا اصلی مقصد ہمیشہ کسی باطنی حقیقت کا مطالعہ ہوتا ہے اور یہی فرق اُسے بہت سے اردو افسانہ نگاروں سے ممتاز کرتا ہے

وہ اپنے افسانے کا ماحول بڑی چابک دستی سے تیار کرتا ہے شروع ہی میں وہ چند ایسی چیزوں کو بیان کر دیتا ہے جنہیں بظاہر ماحول سے کچھ تعلق نہیں معلوم ہوتا ہے لیکن جو ایک زبردست ذہنی اثر رکھتی ہیں۔ مثلاً کرداروں کے نام، اعتقادات، خواہشات وغیرہ

بیدی کی دنیا بہت سنجیدہ ہے اور یہ سنجیدگی بعض دفعہ ذہن میں ہیبت کی ایک لرزش طاری کر دیتی ہے۔ اس میں مزاح کو بہت دخل نہیں لیکن تیکھی طنز اور استعجاب اس کا ایک لازمی جزو ہیں۔ آپ اس کا معمولی سے معمولی افسانہ پڑھ کر بھی زندگی کے اہم اور عالمگیر حقائق سے ذہنی طور پر دو چار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ میں اُس کے افسانوں کی اس خوبی کو سب سے زیادہ درجہ دیتا ہوں۔

بیدی کے فن میں اُس کے اندازِ تحریر کا معتدبہ حصہ ہے۔ کئی چھوٹے چھوٹے لیکن معنی خیز کنائے جو وہ جابجا بکھیرتا چلا جاتا ہے پڑھنے والے کے دماغ کو اونگھنے نہیں دیتے۔ اس لحاظ سے وہ ایک بہت کامیاب مصنف ہے کیونکہ ادب (اور خصوصاً افسانے) کی پہلی خوبی یہ ہے کہ اس کو پڑھا جاسکے یعنی پڑھنے والا غیر متوجہ نہ ہونے پائے۔ کہیں کہیں زبان ضرور ایسی استعمال ہوگئی ہے کہ اجنبیت کا احساس ہوتا ہے مثلاً کبھی کبھی انگریزی الفاظ کا غیر مناسب استعمال لیکن یہ کمزوری ایسی نہیں کہ جس سے افسانے کے فنی پہلو پر کوئی خاص بُرا اثر پڑسکے۔ البتہ اردو زبان کی وسعت اور ہمہ گیری کے مدِنظر اس کو افسانہ نگار کی خامی ہی کہنا پڑے گا۔

(پروفیسر) ظہیر الدین ایم اے

ایک اور اشارہ

کتب خانہ ادبی دنیا نے وعدہ کیا تھا کہ وقتاً فوقتاً اچھی کتابوں کی طرف اشارہ کرنے کے لیے چنی ہوئی کتابوں کی تازہ بتازہ فہرستیں ادبی دنیا میں شائع کی جائیں گی تاکہ ناظرین ادبی دنیا کو اپنے مقبول رسالے ہی کے ذریعے سے ہر قسم کی اچھی کتابیں بہ آسانی مہیا ہو سکیں۔ چنانچہ اس سلسلے کی پہلی فہرست شائع ہو کر مقبول خاطر ہو چکی ہے۔ اس دفعہ کتب خانہ ان فہرستوں کی دوسری قسط آپ کے پیش نظر کر رہا ہے۔ موجودہ فہرست میں التزاماً وہی کتابیں درج کی گئی ہیں جو خواتین اور بچوں کے لئے دلچسپ اور مفید ہو سکتی ہیں۔ حسب معمول اس انتخاب کی ضمانت بھی ادارہ ادبی دنیا کا نام ہے۔ مینیجر کتب خانہ ادبی دنیا

نام کتاب و مصنف	قیمت
خواتین کے لئے	
ناول اور افسانے	
عورتوں کے افسانے۔ کوثر چاندپوری	۸ر
تحفے اور دیگر افسانے۔ حجاب امتیاز علی	۸ر
خانم ۔ ۔ ۔ ۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی	للعہ
شریر بیوی " "	عمر
شام زندگی راشد الخیری	عہ
شب زندگی دو حصے "	عہ
ماہ عجم "	۸ر
شاہین و دراج "	۸ر
لاشوں کا شہر۔ مسز عبد القادر	۱۲ر
نرملا ۔ ۔ ۔ منشی پریم چند	۱۲ر
یوسف نجمہ۔ عبد الحلیم شرر	عمر
بنات النعش۔ مولوی نذیر احمد مرحوم	۱۲ہ
یاسمین۔ مرزا احمد سعید	۸ر
نظم:	
آئینہ حرم۔ محترمہ ز۔خ۔ش کی نظمیں	۲ر
شمع خاموش نظمیں	۲ر
آئینہ جمال "	۱۴ر
صنعت و خانہ داری	
گلدستہ کروشیا۔ فاطمہ بیگم انور علی	۶ر
عصمتی کروشیا	۸ر
بیوی کی تعلیم۔ خواجہ حسن نظامی	۱۲ر
اولاد کی شادی "	عہ
مشرقی اور مغربی کھانے	۶ر
مذاقیہ کھانے	۲ر
متفرق	
مجنت نلمے۔ مترجمہ پروفیسر رام سروپ کوشل	۷ر
ادب زریں۔ حجاب امتیاز علی	۸ر
نغمات موت "	۶ر
بچوں کے لئے	
قصے کہانیاں	
دلائی نتھی۔ راشد الخیری	۲ر
دادا لال بجھکڑ "	۸ر
بچوں کا الفاف (ڈراما)	۳ر
مرغی اور بچے۔ محترمہ رقیہ ریحانہ	۴ر
نبیوں کے قصے	۵ر
تاریخ ہند کی کہانیاں	
پہلا حصہ	۳ر
دوسرا حصہ	۵ر
تفریح اور معلومات	
تعلیمی کھیل	۳ر
سمندر کا عجائب خانہ	۸ر
ایورسٹ کی کہانی	۳ر
نظمیں	
بچوں کی نظمیں	۴ر
بچوں کے اسمٰعیل — مرتبہ سعید انصاری، پرنسپل مدرسہ جامعہ	۱۵ر
بچوں کی رباعیاں	۱ر
طب کی کتابیں	
بچوں کی بیماری کے لئے بہترین کتاب	
بچوں کا علاج	مجلد ۶ر
حکمت کے موتی حجم ۱۲۰ صفحات	۱۲ر
اکسیر بو علی سینا	۳ر

فہرستِ مضامینِ ادبی دنیا، لاہور

بابت ماہِ نومبر ۱۹۴۰ء

جلد ۱۸ — تصاویر:- ۱۔ انگلستان کا پیامی شاعر ۲۔ سہارے کی جستجو — **نمبر ۱۱**

سالانہ چندہ مع محصول ڈاک اور وی پی پانچ روپے (صہ) ممالکِ غیر سے دس شلنگ

دنیائے کاروبار

امسال کی حج ٹریفک اور سندھیا کمپنی کا بیان

ادارۂ ادبی دنیا اس بیان کی صحت کا ذمہ وار نہیں

سندھیا اسٹیم نیوی گیشن کمپنی لمیٹڈ کے مینجنگ ایجنٹ نے حج ٹریفک میں امسال سندھیا کمپنی کے شرکت کے بارے میں بیان دیتے ہوئے کہا کہ یہ سنکر مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ حکومت ہند موجودہ نازک حالات میں بھی ہمارے مسلم ہم وطنوں کو فریضۂ حج کی ادائیگی کے لئے سہولتیں بہم پہونچانے کے لئے تیار ہے۔

بیان دیتے ہوئے مزید فرمایا کہ گورنمنٹ نے اس سلسلہ میں ہم سے خط وکتابت کی تھی۔ جس کے جواب میں ہم نے گورنمنٹ کو یہ بتایا تھا کہ ہماری کمپنی حاجیوں کو امسال لانے اور لے جانے کے کام کرنے کے لئے بخوشی تیار ہوگی۔ اور شرح کرایہ کے متعلق واضح طور پر کہہ دیا۔ کہ جہاں تک جہاز کے کرایہ کا سوال ہے ہم گورنمنٹ کے مقرر کردہ کرایہ پر حاجیوں کو لے جانے کے لئے تیار ہوں گے۔ اس چیز کو ہم نے خصوصیت کے ساتھ واضح کر دیا تاکہ وہ ناخوشگوار غلط فہمی جو گذشتہ سال چند متعلقہ اصحاب نے پیدا کی تھی، وہ دور ہو جائے۔

ساتھ ہی ہم نے یہ بھی بتایا تھا کہ جیسا کہ گذشتہ سال ہم نے کہا تھا ہماری کمپنی اب بھی حج ٹریفک کی مساویانہ تقسیم کے مطالبہ پر قائم ہے۔ یہ ٹریفک ہندوستان سے چلتی ہے، ہندوستان ہی میں ختم ہوتی ہے اور ہمارے ہندوستانی مسلمان بھائیوں کو لانے اور لیجانے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس لئے یہ ظاہر ہے کہ ایک ہندوستانی جہاز راں کمپنی کو اگر زائد نہیں تو کم از کم مساوی حصہ تو ضرور ملنا چاہیئے۔ لیکن ہمیں افسوس ہے کہ حکومت ہند کی پالیسی کا رویہ جیسا کہ ان کے خط سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس سے بالکل برخلاف ہے وہ دونوں کمپنیوں میں مساوی تقسیم تجارت کے سوال پر غور کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ بلکہ وہ خود حجاج کے لے جانے کے جہازوں پر اور یہ کہ کونسی کمپنی کا جہاز کب جائے اس کا اپنا اختیار اور پورا ضابطہ رکھنا چاہتی ہے۔ حکومت کے اس غیر منصفانہ فیصلہ کا احساس رکھتے ہوئے کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ کمپنی کا ہردلعزیز اور بہترین جہاز جو حج لائن میں اب تک چلا کرتا تھا۔ آج کل حکومت کے تصرف میں ہے۔ سندھیا کمپنی کو مجبوراً یہ کہنا پڑتا ہے کہ وہ اس موسم حج میں اپنا کوئی بھی جہاز حجاج کو لے جانے اور لانے کے کام میں لگانا ناممکن سمجھتی ہے۔ ہمارے مسلمان بھائیوں کو ہم یقین دلانا چاہتے ہیں کہ اس فیصلہ کا افسوس سب سے زیادہ خود ہمیں ہے۔ مگر ہم مجبور ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ مسلم پبلک، مسلمان اراکین مجالس قانون ساز اور پورٹ حج کمیٹیاں اس امر کا احساس کریں گی۔ کہ ہمارا حج لائن سے امسال پھر ہٹ جانے کا فیصلہ حکومت نے جبراً کروایا ہے۔ حکومت کی موجودہ پالیسی ایک قومی جہاز راں کمپنی کو اس ہندوستانی تجارت میں جو خود اس کی ہے۔ اس کے پورے حقوق یا کم از کم مساوی حقوق دینے سے پس وپیش کرنا ہر طریقہ سے ناروا ہے اور اس کمپنی کے لئے سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار معلوم نہیں ہوتا کہ اپنی خودداری کو قائم رکھتے ہوئے اس لائن سے احتجاجاً امسال کیلئے بصورت یہ دار ہو جائے۔

ہومیوپیتھک ادویات کے خواہشمندوں

کے لئے یہ خبر مسرت کا باعث ہوگی۔ کہ لاہور کے مشہور ومعروف ہومیوپیتھک ڈاکٹر نظام الدین صاحب کی سرپرستی میں دی ایشیاٹک ہومیوپیتھک ڈرگ کمپنی ۱۵ بی بلاک ماڈل ٹاؤن ضلع لاہور میں قائم ہوئی ہے جس میں ادویات گورنمنٹ کی نگرانی میں تیار ہوتی ہیں۔ کمپنی مذکور کو حضور فنانشل کمشنر صاحب بہادر کی طرف سے اجازت نامہ بھی عطا ہو چکا ہے۔ ہر ضلع تحصیل اور قصبہ جات میں سٹاک رکھنے والے ایجنٹوں کی ضرورت ہے۔ یہ ادویات بورک اینڈ ٹفیل کی پہلی طاقتوں سے تیار ہوتی ہیں۔

ایک ضروری تصحیح:-

ادبی دنیا کے شمارہ اکتوبر ۱۹۴۷ء صفحہ نمبر ۲ پر ڈینس انشورنس کمپنی لمیٹڈ کے اشتہار میں چند اغلاط رہ گئی ہیں۔ قارئین اکرام اس کی درستی فرمائیں۔

ITEM نمبر ا میں لفظ امانت کو ضمانت پڑھا جائے۔

ITEM نمبر ۲ یوں پڑھی جائے۔ کمپنی اپنے پالیسی ہولڈروں کو ۱۵ اور ۱۷ روپیہ فی ہزار کے حساب سے بونس دے رہی ہے۔

بزمِ ادب

سالنامہ کے لئے مضامین اور افسانے جس رفتار سے موصول ہو رہے ہیں، وہ چنداں حوصلہ افزا نہیں۔ اگر سب لکھنے والے یہی عہد کریں کہ وہ اپنے عطیات آخری گھڑیوں ہی میں ارسال کریں گے۔ تو ایڈیٹر کے پاس کوئی جادو کی چھڑی تو ہے نہیں کہ وہ اُسے گھمائے گا اور مسودے فر فر کرتے ہوئے سالنامے کی شکل میں نمودار ہو جائیں گے۔ ہمارے معزز معاونین کو کچھ ہماری مشکلات کا بھی لحاظ رکھنا چاہئے۔ از بسکہ اس دفعہ سالنامے سے پہلے ایک عام پرچہ بھی چھپ رہا ہے یعنی دسمبر میں دو نمبر شائع ہو رہے ہیں۔ اس لئے ادارے کی مشکلات اور ذمہ داریاں بھی غیر معمولی طور پر زیادہ ہو گئی ہیں اور ہم ان سے اسی صورت میں عہدہ برا ہو سکتے ہیں کہ ہمارے قلمی معاونین اپنی امداد میں التوا اور تساہل کو مطلق دخل نہ دیں۔

اس وقت تک جن اصحاب کے مضامین سالنامے کے لئے منتخب ہو چکے ہیں اُن میں شاہد احمد صاحب مدیر ساقی۔ دھرم پرکاش صاحب آنند، اُپندر ناتھ صاحب اشک، پروفیسر احتشام حسین رضوی، جناب ممتاز مفتی۔ شیر محمد صاحب اختر۔ محمد حسن صاحب عسکری اور ابو مسلم صاحب صدیقی کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ میراجی نے ایک خاص مضمون چنڈی داس اور اس کی شاعری پر لکھا ہے جو اس سلسلے کے تمام مضامین میں غالباً سب سے زیادہ دلچسپ اور خیال افروز ہوگا۔

حضراتِ شعرا میں مندرجہ ذیل اصحاب کا تازہ اور بلند پایہ کلام سالنامے کے اوراق کو رونق دے رہا ہے:۔

جنابِ علی منظور، حضرتِ فانی، احمد ندیم صاحب قاسمی، عبدالحمید صاحب عدم۔ سعید احمد صاحب اعجاز، مراتب علی صاحب تائب جنابِ قیوم نظر، جناب علی احمد، جنابِ یوسف ظفر، جناب تابش صدیقی۔ جنابِ حسرتؔ ہوشیارپوری عبدالعزیز صاحب فطرت، جناب ظفر تاباں، جناب ضیا فتح آبادی، پیارے لال صاحب شاکر۔ جناب سلام مچھلی شہری۔ حضرت آزاد انصاری۔ جناب مسعود شاہد۔ حضرتِ اسد ملتانی، اندرجیت صاحب شرما۔ جنا[ب] کوکب شادانی۔ حضرتِ اثر لکھنوی اور جناب

ان کے علاوہ جو اصحاب اپنے قول [کے ایفا میں] اپنی بہترین کاوشیں ہمیں عنایت فرمانے کا کے ایفا میں "شب و روز" کوشاں ہیں۔ اُن [کے نام] یہ ہیں:۔

جنابِ عاشق حسین بٹالوی، جنابِ
جنابِ پیارے لال شاکر (حصہ نثر) جناب
جنابِ عابد لاہوری، جناب کشفی ملتانی۔ جنا[ب]
بادشاہ حسن حیدرآبادی، جناب حرماں خ[یرآبادی]
جنابِ انور اعجاز قیصر۔ جناب فاروق علا

خدا کرے کہ ان اصحاب کے
مندرجہ بالا حضرات کے علاوہ ہماری آ
جن کی چمک اپنے وقت پر ظاہر ہوگی

موجودہ نمبر کے افسانوں
اور اشرف صبوحی صاحب کی بیچی کو
ہیں۔ چودھری صاحب نے موجود
انداز اختیار کیا ہے، وہ اردو ز
ساتھ بے حد دلچسپ بھی۔

ناظرین کو یاد ہوگا کہ گذ
نے ایک دلکش اسکیچ لکھا تھا"
اور اس گفتگو کے دوران ہم
اسی قسم کی ایک چیز ہماری اب
"ایک طرف کی باتیں" بھی نا
صاحب نے کردار کی نفسیاتی

ملکوں کی سلطنتیں ایک ایک
یمن، لبنان، آذربائیجان سعودی
یار۔ عدن۔ سمالی لینڈ۔ زنجبار
افغانستان اور ایران خالص اسلامی
ان اور چین میں بھی مسلمانوں کی کئی
سلمان اتحادِ اسلامی اور عربوں کے
ور اس سلسلے میں ان کے لئے ہر قسم کی
ہیں کہ عربوں کو اپنی اس سکیم کو پورا
نا کرنا پڑے گا۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے
ٹھایا جا چکا ہے۔ اور یہ قدم ۱۹۲۷ء میں
یا گیا تھا جس کا ادنیٰ سا ثبوت اس امر سے
ئی تکمیل کے لئے پہلے نجد و حجاز کی حالت
یہاں اصلاحات نافذ کیں۔ یہ سب انہی کی
ب ترقی کے راستے پر گامزن ہیں۔
طرح یمن کے امام یحییٰ کے ماتحت یمن نے
حکمران نہایت بیدار مغز اور اعلیٰ پائے کے
ونکہ بوڑھے ہو چکے ہیں اور ان کی عمر ستر سال
ے ان سے زیادہ امیدیں وابستہ نہ رکھنی چاہئیں
ترقی کے لئے کرنا تھا کر چکے ہیں اب عرب کا مستقبل
بیٹوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ چونکہ ہر دو کی
لئے خطرہ ہے کہ کہیں ان کی وفات پر بھائیوں
جھگڑے نہ کھڑے ہو جائیں۔ اگر ایسا ہوگیا تو عرب

مکالمے کی شکل دے دی ہے جو ایک ہی شخصیت کے دو پہلوؤں میں جاری رہتا ہے اظہار کی اس نفیس کیفیت کے علاوہ افسانہ زندگی کی ایک زبردست جنسی حقیقت کو بڑی خوبی سے ظاہر کرتا ہے۔ جوانی اور بڑھاپے کے غیر فطری جوڑ پر ہمارے ہاں بیسیوں لکھنے والوں نے قلم اٹھایا ہے۔ مگر جو بات محمد علی صاحب نے پیدا کی ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔ ہماری ناچیز رائے میں جو اصلاح ہماری سوسائٹی میں شاردا ایکٹ جیسے قوانین سے نہ ہو سکی وہ اس قسم کے اصلاحی اور اخلاقی افسانوں کی عالمگیر اشاعت سے ضرور ممکن ہے۔

جنابِ اشرف صبوحی نے بظاہر تو ایک سیدھی سادھی کہانی لکھی ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ ہماری سوسائٹی کے ایک اہم طبقے کی معاشرت کو انہوں نے ایسی دل آویزی سے بیان کیا ہے کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ اس پر ان کی نکھری ہوئی زبان گویا سونے پہ سہاگہ۔ اگر ہم یہ کہیں کہ صبوحی صاحب کا شستہ روزمرہ ہمیں نذیر احمد اور راشد الخیری کی یاد دلاتا ہے تو یقیناً مبالغہ نہ ہوگا۔

میراجی نے اس دفعہ انگلستان کے جواں مرگ شاعر ڈی۔ ایچ لارنس کے سوانح اور کلام کو اپنے مخصوص فاضلانہ رنگ میں پیش کیا ہے۔ لارنس کی بعض نظموں کے تراجم انہوں نے بے حد اچھے کئے ہیں۔ اگرچہ ایک رفیقِ کار کی تخلیقات پر میرا کچھ لکھنا شاید موزوں نہ معلوم ہو لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ مجھے ان کے اس مضمون میں تحقیقِ علمی اور کاوشِ ادبی دونوں اپنی پوری بلندی پر نظر آئی ہیں۔

صلاح الدین احمد

(۲)

گذشتہ شمارے میں فراق گورکھپوری کی ایک غزل شائع ہوئی تھی۔ جیسا کہ میرا خیال تھا یہ غزل بہت سی طبائع کے لئے تحریک کا باعث بنی۔ بعض کی تحریک نے نثر کی صورت اختیار کی اور بعض کی تحریک نظم کی صورت میں ادبی دنیا تک پہنچی۔ یہاں نثر سے گریز کرتے ہوئے کہ وہ صرف اعتراض ہیں لہٰذا تخریبی، نظم کی طرف آپ کو رجوع کراتا ہوں کہ وہ تعمیری چیز ہیں۔ اور اس بات کی دلیل کے طور پر کہ فراق کی گذشتہ غزل نہ صرف بنفسہٖ شعریت کا اچھا نمونہ تھی بلکہ اوروں کو بھی شعر کہنے پر برانگیختہ کر سکتی تھی۔ اختر شیرانی اور "م" کی غزلیں ملاحظہ ہوں۔

موجودہ شمارے میں احمد ندیم قاسمی کے قطعات غور کے قابل ہیں۔ اس کے قطعات کے بارے میں مفصل خیال آرائی تو اس بار کی دنیائے ادب کے حصۂ نظم میں بھی کی گئی ہے اس لئے یہاں اس قدر کہنا کافی ہوگا۔ کہ نزاکتِ خیال، بیان کی سادگی اور حقیقت کی گہری جھلک ہر قطعے میں موجود ہے۔

سعید احمد اعجاز اس دفعہ اپنی ننھی نازک نظموں کا اظہار چاہتا ہے۔ "مہرِ سکوت" ایک عاشق کی خاموشی کے سلسلے میں ایک حسنِ تعلیل ہے۔ "تجدید" احساسِ جنسی میں حیاتِ تازہ کا ایک دلچسپ کنایہ ہے۔ اور "حیرانی" اپنے ابہام اور اپنی خیال افروز کیفیت کی وجہ سے ان چاروں نظموں میں ایک خاص درجہ رکھتی ہے۔

اختر مینوی کی نظم "بارش سے چند لمحے پہلے" نہ صرف اپنے ترنم کے لحاظ سے اچھی ہے بلکہ اس میں جس انداز سے ایک اچھوتی فضا کو بیان کیا گیا ہے وہ بھی خوبیوں سے بھرا ہوا ہے۔ شروع سے آخر تک نظم محض بیانیہ معلوم ہوتی ہے، وہی مناظرِ قدرت والا معاملہ۔ لیکن جس ماحول کو شاعر نے قائم کیا ہے وہ نہ صرف جذبات پرور ہے بلکہ ایک خاص رنگ کا ایسا "جاندار مجسمہ" معلوم ہوتا ہے جو ہماری ہی طرح احساس رکھتا ہو۔ اور آخر میں "بڑھنے لگی ہے الجھن دل کی، کیا وہ لڑکی گھر جا پہنچی؟" سے جو دور تک لرزتی جاتی ہوئی کیفیت پیدا کی ہے وہ ایک ساکن منظر کو حرکت دے دیتی ہے۔ ہمارا ذہن منظر کے پہلے تاثرات سے رک سا جاتا ہے۔ لیکن یہاں پہنچ کر اُسے ایک خیال انگیز تصور حاصل ہو جاتا ہے۔

میراجی

شعر

پھر نہ دیکھا کچھ بجز یک شعلۂ پُر پیچ و تاب
شمع تک تو ہم نے بھی دیکھا کہ پروانہ گیا

میر تقی

آئینۂ عالم

عربوں کا عظیم الشان مستقبل ——!

ایک امریکن اخبار نویس نے مشہور امریکن رسالہ ایشیا میں عربوں کے مستقبل کے متعلق ایک مضمون لکھا ہے جس میں وہ رقمطراز ہے کہ آج سے تین سال قبل کی بات ہے میں عمان میں امیر عبداللہ کے ہاں فروکش تھا۔ ایک دن ہم تاریخ کے مختلف ادوار اور قوموں کے عروج و زوال کے متعلق گفتگو کر رہے تھے کہ عربوں کے مستقبل کا سوال بھی سامنے آگیا۔ جس کا جواب دیتے ہوئے امیر عبداللہ نے کہا "وہ زمانہ ایک بار پھر آنے والا ہے جب عرب دنیا پر پہلے کی طرح چھا جائیں گے اور یہ سب کچھ پچاس سال میں ہو جائے گا" مجھے امیر کے لہجے میں اعتماد اور یقین کی جھلک نظر آئی۔ اس واقعے کے بعد مجھے چند اور مقامات پر بھی اسی قسم کے خیالات سننے کا موقع ملا۔ بغداد کے ایک مغربی تعلیم یافتہ وکیل نے بھی ایک دفعہ یہی کہا۔ سلطان ابن سعود کی زبان سے بھی ایسے ہی الفاظ نکلے۔ سکندریہ کے ایک اخبار نویس اور جدہ کے ایک فوجی افسر نے بھی یہی کہا کہ عرب ایک بار پھر ساری دنیا پر چھا جائیں گے۔

لیکن کیا موجودہ حالات میں جب کہ یورپی ملوکیت تمام دنیا کو اپنی آغوش میں لے چکی ہے۔ جب مسولینی عرب کے دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ اور روس اور جرمنی اپنی حکومت کی توسیع میں معروف ہیں عربوں کا یہ خواب پورا ہو سکتا ہے۔

اس کا جواب مشکل نہیں ہے مگر اس سے قبل یہ سمجھنا ضروری ہے کہ عرب کی مملکت ایک بے برگ و گیاہ صحرا اور چند بدوی قبیلوں کا ہی نام نہیں ہے بلکہ یہ ایک جذبہ ہے۔ جو لجان سے ہندوکش زنجبار، مصر اور تانجیر تک پھیلا ہوا ہے۔ ان علاقوں کے مسلمان ایک زبان، ایک مذہب ایک تہذیب، اور ایک سے تصورات کے مالک ہیں۔ اور اخوت کے ایک ناقابل شکست رشتے میں منسلک ہیں۔ آج بھی جب اتحادِ اسلامی پارہ پارہ ہو چکا ہے، اور مسلمانوں کی سلطنتیں ایک ایک کر کے ان سے چھن گئی ہیں۔ شام، فلسطین، بنان، آذربائیجان، سعودی عرب، یمن، کویت، نجران، حضر موت، کوتار، عدن، سمالی لینڈ، زنجبار، سوڈان، مصر، لیبیا، تونس، الجیریا، مراکو، افغانستان اور ایران خالص اسلامی سلطنتیں ہیں۔ جن کے علاوہ ہندوستان اور چین میں بھی مسلمانوں کی کئی کروڑ آبادی ہے۔ ان تمام علاقوں کے مسلمان اتحادِ اسلامی اور عربوں کے عظیم الشان مستقبل کے آرزو مند ہیں۔ اور اس سلسلے میں ان کے لئے ہر قسم کی قربانی سے بھی گریز نہ کریں گے۔

اگرچہ اس بات میں شک نہیں کہ عربوں کو اپنی اس سکیم کو پورا کرنے کے لئے کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ اس کی تکمیل کی طرف پہلا قدم اٹھایا جا چکا ہے۔ اور یہ قدم ۱۹۲۷ء میں ابن سعود کے شاہِ حجاز بننے پر اٹھایا گیا تھا جس کا ادنیٰ سا ثبوت اس امر سے مل سکتا ہے کہ انہوں نے اس سکیم کی تکمیل کے لئے پہلے نجد و حجاز کی حالت کو سدھارنا ضروری خیال کیا اور یہاں اصلاحات نافذ کیں۔ یہ سب انہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ عرب ترقی کے راستے پر گامزن ہیں۔

سلطان ابنِ سعود کی طرح یمن کے امام یحییٰ کے ماتحت یمن نے بھی کافی ترقی کر لی ہے۔ یہ ہر دو حکمران نہایت بیدار مغز اور اعلیٰ پائے کے سیاست دان ہیں مگر اب چونکہ بوڑھے ہو چکے ہیں اور ان کی عمر ستر سال سے تجاوز کر چکی ہے اس لئے ان سے زیادہ امیدیں وابستہ نہ رکھنی چاہئیں اُن کو جو کچھ ملکی اور ملی ترقی کے لئے کرنا تھا کر چکے ہیں۔ اب عرب کا مستقبل ابن سعود اور امام یحییٰ کے بیٹوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ چونکہ ہر دو کی اولاد بہت زیادہ ہے۔ اس لئے خطرہ ہے کہ کہیں ان کی وفات پر بعد میں تخت نشینی کے لئے جھگڑے نہ کھڑے ہو جائیں۔ اگر ایسا ہو گیا تو عرب

کا یہ پروگرام بہت پیچھے جا پڑے گا۔

ابن سعود اور امام یحییٰ کی وفات پر جو جھگڑے پیدا ہوں گے ان کی صورت حسبِ ذیل ہے۔

ابن سعود نے اس بات کو پہلے ہی سے محسوس کر لیا تھا اس لئے اپنے بیٹوں میں سے دو کو خاص طور پر حکومت کے لئے تربیت دلائی۔ ان میں سے ایک حجاز کا گورنر ہے تو دوسرا نجد کا۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے خیر اندیش اور خیر خواہ ہیں۔ کچھ عرصہ ہُوا ایک امریکن اخبار نویس نے ان سے ملاقات کی تھی جس میں دونوں نے کہا تھا کہ ان میں سے جو بھی بادشاہ بن جائے گا دوسرا اس کی مخالفت نہیں کرے گا اس لئے خیال کیا جاتا ہے کہ امیر سعود ابن سعود کا بڑا لڑکا اگر بادشاہ بن گیا تو چھوٹے کی طرف سے اُس کی مخالفت نہیں ہوگی۔ مگر ان کا بھائی امیر محمد ضرور ان کی مخالفت کرے گا امیر محمد چونکہ پرانے خیالات کا انسان ہے ہر جدید چیز سے نفرت کرتا ہے حتیٰ کہ موٹر پر بھی سوار نہیں ہوتا اور ٹیلی فون پر بات کرنا بھی حرام سمجھتا ہے اس لئے وہ کٹر وہابیوں میں ہر دلعزیز ہے۔ اور یہ لوگ جنگ میں اس کی مدد کریں گے مگر تخت نشینی کی جنگ میں اسے اکیلے تو ناکامی ہوگی۔ اگر مسولینی نے اس کی مدد کو ہاتھ بڑھایا تو ضرور کامیاب ہو جائے گا مگر اس صورت میں برطانیہ اور اس کے حلیف بھی کب خاموش بیٹھ سکتے ہیں۔ وہ بڑے بھائیوں کی مدد کریں گے۔ اس لئے خیال کیا جاتا ہے کہ اس صورت میں امیر محمد کو اپنے ارادوں میں ناکامی ہوگی۔

اسی طرح امام یحییٰ کی وفات پر بھی تخت نشینی کے جھگڑے کا خدشہ ہے اس کے تیرہ بیٹے ہیں۔ جن میں صرف سیف الاسلام حسین اور سیف الاسلام قاسم ہی بیدار مغز اور قابل ہیں۔ باقی گیارہ میں سے بعض نیک، صوفی اور بعض آوارہ اور بدچلین ہیں اور عیش و عشرت کے سوا ان کو کوئی کام ہی نہیں ہے۔

حسین نہایت قابل اور اعلیٰ دماغ کا مالک ہے اور بین الاقوامی سیاست کو خوب سمجھتا ہے۔ وہ لندن، پیرس، روم اور ٹوکیو کی کانفرنسوں میں بھی اپنے ملک کی نمائندگی کر چکا ہے۔

امام یحییٰ کا دوسرا بیٹا قاسم اُس کا مخالف ہے وہ بہادر اور تیغ زن ہے اور آج کل یمن کی افواج کا سپہ سالار ہے۔ ادھر اسے مسولینی کی مدد بھی حاصل ہوگی۔ کیونکہ اس نے یمن پر قبضہ کرنے کے لئے اسے تخت نشینی کی جنگ میں امداد دینے کا وعدہ کر رکھا ہے۔ اس لئے اگر قاسم کو اس لڑائی میں فتح ہوئی تو مسولینی کو یمن میں فروغ حاصل ہوگا۔ اس صورت میں عربوں کا مستقبل بالکل تاریک ہو جائے گا۔

ان حالات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر حجاز اور نجد میں امیر سعود اور یمن میں سیف الاسلام حسین کو کامیابی ہوئی تو عربوں کا خواب پورا ہو سکے گا ورنہ جزیرہ نما عرب پر مسولینی کو بہت دخل حاصل ہوگا اور وہ عرب کو اپنا غلام بنانے کی کوشش کرے گا۔

اگر مسولینی وہاں اقتدار حاصل نہ کر سکا اور حجاز و نجد اور یمن امیر سعود اور سیف الاسلام حسین کے قبضے میں آئے تو اس صورت میں عربوں کو ایک اور مشکل کا سامنا کرنا پڑے گا جو یہ ہوگی کہ شاید یورپ اس موقعے پر عربوں کے آئندہ پروگرام میں روڑا اٹکائے۔ لیکن اگر ایک بار عربوں کے قدم میدان میں جم گئے تو پھر آسانی سے نہیں اکھڑ سکیں گے۔

ممکن ہے عرب کے حالات شام اور عراق اور فلسطین پر بھی اثر انداز ہوں۔ شام پر ان کا اثر زیادہ ہوگا کیونکہ شام کے لوگ فرانس پر ہٹلر کے قبضے کو سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور بیتیان کی حکومت کا جُوا پھینک دینا چاہتے ہیں۔ اگر انہوں نے ایسا کیا تو یہ اس پروگرام کی تکمیل کی طرف دوسرا قدم ہوگا۔ باقی رہا فلسطین عراق وغیرہ کی آزادی کا مسئلہ تو یہ ظاہر ہے اگر شام آزاد ہو گیا تو وہ بھی آزادی کے لئے ہاتھ پاؤں ماریں گے۔ اور اس راستے میں ہر قسم کی قربانی کریں گے۔ انہیں اس سلسلے میں عربوں کی امداد بھی حاصل ہوگی۔ ان کی آزادی کے بعد تقریباً سارے عرب علاقے آزاد ہو جائیں گے باقی ان ممالک کو اسلامی حکومت میں لانے کا سوال رہ جائے گا جو پہلے عربوں کے ماتحت تھے۔ ان کا معاملہ ذرا مشکل اور ٹیڑھا ہے۔ کیونکہ ان میں سپین اور سپین کے مقبوضات بھی شامل ہیں اور سپین کی کی طاقت عرب ممالک سے بہرحال زیادہ ہوگی لیکن جیسا کہ امیر عبداللہ نے کہا ہے وہ اس مقصد کو حاصل کر کے رہیں گے اس کے لئے خواہ ان کو پچاس سال ہی کیوں نہ لگ جائیں۔ پچاس سال کا عرصہ شاید اسی لئے رکھا گیا ہے کہ اگر عرب ممالک کی طاقتوں میں کوئی کمی ہو تو اُسے اتنی مدت میں پورا کر لیا جائے ——!

تابش صدیقی

تأثرات

(۱)

گائیں ڈکراتی ہوئی پگ ڈنڈیوں پر آ گئیں
مُرلیاں ہاتھوں میں لے کر مست چرواہے بڑھے

بیریوں کے دھندلے سایوں میں کھڑا ہوں منتظر
ایک لڑکی کو گزرنا ہے یہاں سے دن چڑھے

(۲)

آندھیوں کے تند رو جھونکوں سے گھبرائی ہوئی
دیر تک گلیوں کی شمعوں نے جب اپنا سر دُھنا

خلوتِ دل میں اٹھی بے بس صبوحی کی صدا
"کس نے مجھ دُکھیا کا اس سنسار میں دکھڑا سنا!"

(۳)

ہائے کیوں فطرت کو معصوموں پہ رحم آتا نہیں
مختصر ہے کس قدر یہ زندگی کا کھیل بھی!

سو رہی ہے ایک سادہ سی لحد میں بے خبر
وہ حسیں لڑکی جو کل کھیتوں میں محوِ رقص تھی!

(۴)

کھڑکھڑاتی ڈول وہ اندھے کوئیں میں گر گئی
دم بخود پنہاریاں کنگن گھماتی رہ گئیں

وہ لپک کر ایک چرواہا کنوئیں میں گھس گیا
وہ صبوحی کی نگاہیں مُسکراتی رہ گئیں

(۵)

پربتوں پر ہر طرف شہری شکاری آئے ہیں
شہریوں کے دم سے ہر گاؤں پہ رونق چھائی ہے

ایک لڑکی جس کو تاروں سے بھی آتا تھا حجاب
نصف شب کو کس کے چنگل سے نکل کر آئی ہے

(۶)

لڑکیاں چُنتی ہیں گیہوں کی سنہری بالیاں
کاٹتے ہیں گھاس بینڈھوں پر سے بانکے نوجواں

ایک لڑکی پست قد بیری کی چھدری چھاؤں میں
دیکھتی ہے گھاس پر لیٹی ہوئی، جانے کہاں

(۷)

ملگجے پردوں میں چھپ کر چاند کیا سوچا کیا!
تارے کس کی فکر میں آنکھوں کو جھپکاتے رہے؟

اک مرے دل ہی میں تھا تیرا تصور میرے دوست!
یا زمانے بھر کو تیرے ہی خیال آتے رہے؟

احمد ندیم قاسمی

غزل

سوزِ نوا سے آگ لگانے لگا ہوں میں
گلشن کے خار و خس کو جلانے لگا ہوں میں

اپنا شکستہ ساز بجانے لگا ہوں میں
مدت کے غافلوں کو جگانے لگا ہوں میں

نغمے ترے وصال کے گانے لگا ہوں میں
ارض و سما کو وجد میں لانے لگا ہوں میں

پھر ایک بار دیکھ مجھے چشمِ مست سے
یہ جام پی کے ہوش میں آنے لگا ہوں میں

گلشن میں تذکرہ ترے گیسو کا چھیڑ کر
خوشبو میں ہر کلی کو بسانے لگا ہوں میں

دکھلا کے تیری چشمِ فسوں گر کی گردشیں
جی بھر کے آسماں کو ستانے لگا ہوں میں

کھولا ہے شیشۂ مئے شیریں کنارِ جُو
غم ہائے دو جہاں کو مٹانے لگا ہوں میں

سجدے میں سر نہیں ہے ترے در کے سامنے
گردوں تک اس زمیں کو اٹھانے لگا ہوں میں

پالی ہے تیرے سایۂ دیوار میں جگہ
کیا گردشِ فلک سے ٹھکانے لگا ہوں میں!

پیمانۂ سحر سے اُبلنے لگا ہے نُور
توحید کے رباب پہ گانے لگا ہوں میں

اے عرصۂ حیات کے شیرِ شکستہ پا
اب جاگ ورنہ حشر اٹھانے لگا ہوں میں

آنے لگی ہے دور سے تکبیر کی صدا
افلاک کی فضاؤں پہ چھانے لگا ہوں میں

دل کے نہاں کدے سے اُٹھا کر صدائے حق
باطل کے لشکروں کو ڈرانے لگا ہوں میں

روحِ نشاط ڈال کے رگ ہائے شعر میں
سرمایۂ حیات لٹانے لگا ہوں میں

اصغر حسین خاں نظیر

انگلستان کا پیامی شاعر

ڈیوڈ ہربرٹ لارنس

"تم کہتے ہو کہ میں غلطی پر ہوں،
تم ہوتے کون ہو مجھے یوں کہنے والے، کوئی بھی مجھے کیوں کہے کہ میں غلطی پر ہوں؟
"میں غلطی پر نہیں ہوں!

ڈی۔ ایچ لارنس

اگر روایت کو حقیقت سمجھا جائے تو حوّا ہی نے آدم کو سُجھایا کہ دنیوی زندگی کی کشمکش میں ڈوب کر ہی انسان اپنی فطرت کی بلندی یا پستی کو معلوم کرسکتا ہے۔ اور یہ سچ بھی ہے کہ ازل سے عورت ہی انسان کو نئے راستے دکھاتی آ رہی ہے۔ عورت ہی انسان کو پیدا کرتی ہے اور عورت ہی انسان کے جوہر کو چمکاتی ہے۔ لارنس کی زندگی میں بھی، اور بڑے آدمیوں کی طرح، دو عورتوں کو دخل ہے۔ ایک اُس کی ماں جس نے اُس کی ہستی کو جنم دیا اور دوسری اس کی محبوبہ جس نے اُس کی شخصیت کو جنم دیا اور اُس کے کردار اور اُس کی ذہانت کی چھپی ہوئی طاقتوں کو بیدار کر کے اُسے ایک پیغامبر بنا دیا۔

اپنے وقت سے بعد سراہے جانے والے مصنف اور شاعر ایک پیغمبرانہ خصوصیت رکھتے ہیں۔ نظیر اکبر آبادی اپنے شاعرانہ عمل اور اپنی شعری تخلیقات سے جمہور کی اہمیت کو واضح کرنے کے لئے پیدا ہوا۔ اپنے زمانے سے لے کر اُسے کئی سال تک کوئی معترف نہ ملا۔ اور آج جبکہ جمہور کی اہمیت کو واضح کرنے والے روس سے لے کر ہر مہذب ملک تک میں موجود ہیں اردو ادب میں نظیر کا نام بھی تعریفی الفاظ میں لیا جا رہا ہے۔ غالب ادبی جمود کو دور کر کے نیا راستہ دکھانے آیا، اُس کی قدر بھی اُس کے بعد ہوئی۔ اور اگر کوئی صاحب اقبال کی مثال میرے نظریے کی مخالفت میں پیش کریں تو میں پوچھوں گا کیا آپ نے اقبال کے پیغام اور فلسفے کو پورے طور پر سمجھ لیا ہے؟

لارنس بھی اپنے وقت کے بعد سراہا گیا، کیونکہ وہ ایک نیا راستہ لوگوں کو دکھانا چاہتا تھا، ایک نئی دنیا میں انہیں لے جانا چاہتا تھا۔ وہ خود ایک جگہ لکھتا ہے کہ کسی نئی آواز کو سُننا مشکل ہے، اتنا ہی مشکل جتنا کہ کسی انجانی بولی کو سُننا۔ اور اس کی وجہ وہ یہ بتاتا ہے کہ دنیا ڈر کے مارے نئی آواز کو نہیں سُنتی۔ کیونکہ دنیا اگر کسی بات سے ڈرتی ہے تو وہ ہے نیا تجربہ۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک نیا تجربہ بہت سے پرانے تجربات کو درہم برہم کر دیتا ہے۔

لارنس اس صدی کے اہم ترین مصنفوں میں سے ایک ہے۔ اُس نے ایک آدرش کے لئے جنگ کی اور اپنے ذاتی تجربات کو زندہ ادب کی صورت میں ڈھالا، لیکن اس کے باوجود کہ اُس کے تجربات نفسیاتی لحاظ سے جنسی نوعیت رکھتے تھے۔ اُس نے کبھی بھی اس موضوع سے اپنی دلچسپی کو غیر متوازن اور ناخوشگوار نہ بننے دیا۔ البتہ اس تنگ نظر دنیا اور خصوصاً انگلستان کے رسوم پرست ملک نے اُس کی زندگی کو ناخوشگوار بنانے میں اپنی روایتی ظاہر پرستی اور قدامت پرستی کے باعث غیر مستحسن کارفرمائیاں ضرور کیں۔

اُس کی تصنیفات کو پڑھنے والوں میں سے اکثر اُس کے متعلق صرف اسی قدر جانتے ہیں کہ وہ جو کچھ بھی لکھتا ہے اس میں جنسی باتوں کو دخل ضرور ہوتا ہے۔ لیکن لارنس تمام عمر اپنے ایک فلسفے کو نمایاں کرنے کی کوشش کرتا رہا اور اس فلسفے سے اس نے وفاداری کی لیکن وہ فلسفہ، وہ نظریے اس سے دفادار رہے، اُنہوں نے اُس کا ساتھ نہ دیا، انہوں نے اس لئے تعلق کہاں کے نظریوں میں کوئی تنظیم نہ تھی۔ ہر بات، ہر چیز اُس کے لئے ایک تجربہ، ایک اچھوتا احساس،

ایک نئی دریافت کا درجہ رکھتی تھی اور اس لئے زندگی کا ہر لمحہ اس کے سامنے ایک نئے اندازِ نظر کو لے آتا تھا۔ نظم ہوتی بھی تو کیسے؟

لارنس کا زمانہ انگلستان میں ایک بدلتا ہوا زمانہ تھا۔ فرانس والوں سے ادب اور آرٹ میں آزادی کا سبق مل رہا تھا۔ جنسیات اور اخلاقیات میں ہیولاک ایلس اور فرائیڈ کے خیالات ایک انقلاب لا رہے تھے۔ اور اس کے ساتھ ہی انفرادیت کا دَور دورہ بھی تاریخ عالم میں پہلی بار اس قدر شدت اختیار کر رہا تھا کہ ہر پرانے نظام کو تہ و بالا کرنے پر تُلا کھڑا تھا۔ اس زمانے میں لارنس نے اپنے اُن ناولوں کے ذریعے سے جنہیں ایک نقاد نے سوانحانی استعارے کہا ہے وقت کی ضرورت کو پورا کرتے ہوئے ایک نیا پیغام دیا۔

لارنس نے اپنی ذات کو ادبی تخلیقات کی بنیاد بنایا، اور اس لئے اُس کی کارگزاریوں کی طرف توجہ کرنے سے پہلے اُس کی شخصیت اور اُس کے اہم واقعاتِ زندگی کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔

لارنس کے لئے یہ دنیا روپ اور بھیدوں کا ایک اتھاہ ساگر تھی! ہر لمحہ اس کے لئے دلچسپ تھا اور ہر قدم پر اُس کے لئے دلکشی کا نئے سے نیا خزانہ مُنہ کھولے کھڑا تھا۔ آلڈس ہکسلے لکھتا ہے کہ لارنس کی اسی خصوصیت کی وجہ سے اُس کا ساتھ ایک مہم، ایک دریافت کے سفر کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ ایک ایسا سفر جس میں انسان پر نئی باتوں کا انکشاف ہوتا، اور پرانی چیزوں میں بھی ایک اچھوتا پن محسوس ہونے لگتا۔ اس کا باعث یہ تھا کہ لارنس کی ذات ہم سے علیحدہ ایک اور نظام سے تعلق رکھتی تھی اور اس لئے وہ عام انسانوں سے کسی مختلف کائنات کا رہنے والا معلوم ہوتا تھا۔ اس کی دنیا میں اس ہماری دنیا کی بہ نسبت زیادہ تابانی تھی، زیادہ شدتِ احساس تھی اور جب کبھی بھی وہ اپنی دنیا کے بارے میں کسی سے گفتگو کرتا تو سُننے والوں کو موجودہ ماحول کے بندھن سے آزادی کا ایک گہرا احساس دلاتا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اُسے گویا ذاتی تجربے کی بنا پر معلوم ہے کہ ایک درخت ہونا یا ایک پھول یا ایک موجِ سمندر یا آسمان کا چاند ہونا کیسا معنی رکھتا ہے۔ وہ عالمِ حیوانات، نباتات اور جمادات کی ہر شے میں اپنے کو مدغم کر سکتا تھا اور یہی اہلیت اُسے ہر چیز اور ہر لمحے کو اچھوتا بنا دینے میں مدد دیتی تھی۔ وہ گویا ایک طرح سے کسی جانور کی کھال بلکہ روح میں جذب ہو کر ہمیں بتا سکتا تھا کہ اُس حیوانِ مطلق کے احساس کیا ہیں اور وہ کیا کچھ سوچ رہا ہے۔

اور لارنس کی یہ ہمہ گیر فطرت محض ذہنی باتوں ہی تک محدود نہ تھی عملی زندگی میں بھی اُس کی طبیعت اور رجحان کی وسعت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ کھانا پکانا وہ جانتا تھا، سینا وہ جانتا تھا، جتنا میں وہ بُن سکتا تھا، گلّے کو وہ اپنے ہاتھوں سے دوہ سکتا تھا، لکڑی کاٹنے میں اُسے ایک زبردست مہارت حاصل تھی، کاڑھنے کے کام میں بھی اُس کی مشق کچھ کم نہ تھی، باقاعدگی کے ساتھ آگ جلانا جو بعض عورتوں کو بھی نہیں آتا اُس کے بائیں (یا دائیں!) ہاتھ کا کام تھا، اور فرش یا گھر بار کی صفائی میں بھی اگر مقابلہ ہو جائے تو وہ کسی سے کم نہ تھا۔ اتنے مختلف کام! لیکن آندرے موروا کے قول کے مطابق ان کاموں کے علاوہ وہ ایک اور کام بھی کر سکتا تھا، ایک ایسا کام جو ایک تیز فہم اور ذہین انسان کے لئے "ناممکن" ہوتا ہے یعنی وہ بیکار بھی بیٹھ سکتا تھا، بغیر کچھ کئے، بغیر کوئی بات بھی کئے بلکہ بغیر کچھ سوچتے ہوئے! یوں ہی بیکار بیٹھے ہوئے بھی وہ مطمئن دکھائی دے سکتا تھا، اور اُس کا یہ اطمینان متعدی تھا۔ اگر آپ ایسے وقت میں اُس کے ساتھ بیٹھے ہوں تو آپ بھی کافی عرصے تک اُس کی طرح یونہی بیکار، بے مصرف بیٹھے رہ سکتے تھے (یہ تو ہوا شعر کا پہلا مصرعہ دے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں! لیکن دوسرے مصرعے کے ساتھ بھی وہ پورا پورا انصاف کر سکتا تھا ورنہ کیسے بات کر نہیں آتی) ــــ اور اُس کی تخلیقات میں اُس کی گفتگو کا غیر معمولی جوش و خروش، اُس کے غصّے کی شدت اور اپنی ہی فطرت سے اُس کا تیز ردِ عمل ایک فن کارانہ طاقت کی صورت میں موجود ہے لیکن باتیں کرنے، چپ رہنے اور اس قدر مختلف کاموں میں ماہر ہونے کے باوجود زندگی کے ایک پہلو سے لارنس کو قطعاً کوئی رغبت نہ تھی یعنی اُسے کسی قسم کے کھیل سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ اپنی زندگی کو پوری شدت سے بسر کرتا تھا، اس کا ذہن ہر لمحہ مصروف رہتا تھا اور اُس کے احساسات ایک تیزی کے ساتھ مشغول! اس لئے اُسے اس کی ضرورت ہی کیوں ہوتی کہ وہ کسی قسم کے کھیلوں میں حصہ لے، پرندوں یا درندوں کو خواہ مخواہ مارتا پھرے اور اس تضیعِ تخلیق کا نام شکار رکھ لے، گھوڑوں کو دوڑا دوڑا کر ہلکان کرے، یونہی ہوا میں بلّا گھماتا پھرے یا گیند اُچھالتا پھرے ــــ ان بیرونی کھیلوں کے علاوہ اُسے گھر کے کھیلوں سے بھی کوئی رغبت نہ تھی یہاں تک کہ وہ تاش کی بازی میں بھی کبھی حصہ نہ لیتا تھا۔ اس سلسلے میں اُس کا اندازِ نظر یہ تھا کہ زندگی ابد تک نہیں رہے گی، زندگی مختصر ہے، ذہن ہر دم تازہ دم ہے، حرکت پہ مائل، دنیا میں دیکھنے کی باتیں بے شمار ہیں کرنے والے کام بھی کم نہیں، احساس اور علم کے ہزاروں ذریعے موجود ہیں تو پھر اِس مختصر زندگی کو فہم و ادراک کی بے انتہا

قوتوں کو چند بے معنی کھیلوں میں مصروف رہ کر ضائع کیوں کیا جائے!

رچرڈ آر لنگٹن لکھتا ہے کہ کردار کا ایک ممتاز جبلی مشاہدہ، پیچیدہ انسانی تعلقات کی ایک نازک تفہیم، ایک نفیس احساسِ حسن، اشیائے کے اسرار کا احساس، مختلف ممالک، مناظر اور حیوانات کے ذریعے سے انسانی ذہن، اُس کی کیفیات اور اس کے المناک پہلوؤں کی تشریح کا ملکہ، ایک زبردست بیانیہ قوت اور سب سے آخر میں دلچسپی ـــــ ایک بے پناہ جذب کی طاقت ـــــ یہ سب باتیں لارنس کی تخلیقاتِ ادبی میں پائی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ ایک کردار ایسا ہے جس کا نقشہ وہ ہمیشہ غیر معمولی عمدگی سے کھینچتا ہے ـــــ اور یہ کردار اُس کی اپنی شخصیت ہے۔

اپنی ہستی، اپنی ذات کے علاوہ عورتوں کی فطرت کا بھی اُس نے گہرا مطالعہ کیا تھا اور اگرچہ اپنی محبوبہ سے وہ اپنے تعلقات کو سلجھا نہ سکا۔ اس کے باوجود عورت کے ذہن تک رسائی گویا اُس کی جبلت میں داخل تھی، اور اُن کے احساسات اور جذبات کو سمجھنے کی غیر معمولی اہلیت اُس میں موجود۔ اس کے ساتھ ہی وہ جنسی خواہش کی گہری، گرم، تند اور شرابی خصوصیت کی تشریح بھی حیرت ناک طریق پر کر سکتا تھا۔ اس سلسلے میں اُس کا اندازِ بیان ہمیشہ ایک کیفیت اور لذت کا اظہار کرتا ہے لیکن جب کبھی وہ زندگی کے اس پہلو پر اپنے تیکھے تیروں کی بارش کرتا ہے تو اُس وقت اپنی ستم ظریفی میں کسی طرح شیطان سے کم نہیں دکھائی دیتا۔

عموماً لارنس کی اس جنس پرستی کو رسوا کیا جاتا ہے اور نفرت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے، اور اسی لئے سماج کے اصولوں نے وکیلوں کے ذریعے سے اُس کی کتابوں کو نہایت بے دردی سے کند چھری کے ساتھ مجروح کیا ہے لیکن یہ تنگ خیالی اور ریاکاری کا مظاہرہ ہے۔ اس کی جنس پرستی لائقِ صد ستائش ہے کیونکہ اس میں کبھی بھی عامیانہ پن یا درفحاشی کے اثرات نمودار نہیں ہوتے۔ درحقیقت اس دنیا میں جن لوگوں کو ہم شرفا اور نیک اور پاکباز انسان سمجھتے ہیں وہی گندہ ذہنیت کے مالک ہوتے ہیں۔ رچرڈ آر لنگٹن اسی بات پر رائے زنی کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ لارنس کو چاہئے تھا کہ وہ اپنی کتابوں کا ایک خاص ایڈیشن شائع کرتا اور اس پر یہ عنوان دیتا۔ "ڈی ایچ لارنس کے سنسر شدہ کلیات، جن میں سے تمام جنسیت اور حسن کو دور کر دیا گیا ہے، ہر کسی کو پڑھنے کے لئے دیئے جا سکتے ہیں، خواہ عورتیں ہوں خواہ وکیل اور خواہ اخلاقیات کے علمبردار۔"

رچرڈ آر لنگٹن نے تو مندرجہ بالا انداز میں اُس رویئے پر طنز کر دی لیکن ہمیں اُس مصنف کے ذہن کی کارفرمائیوں پر غور کرنا ہے جس نے اپنی ذات کے ملک میں ایک تحقیقاتی سفر کیا اور اُس کے نتائج کو ادبی تخلیق کے درجے تک پہنچا دیا اور اس تخلیق کے ذریعے سے اپنی نفسیاتی اُلجھنوں کو معلوم کیا اور اگرچہ اُس کی تخلیقات میں ایک مدقوق انسان کی ہر دم برانگیختہ ہونے والی خصوصیت موجود ہے اس کے باوجود اُن نظریوں کے صائب ہونے میں کسی طرح کے شک و شبہے کی گنجائش نہیں ہے جنہیں اُس نے اپنے ناولوں اور نظموں کے ذریعے سے پیش کیا۔

لیکن کیوں نہ ہم ساتھ ہی ساتھ اُس کے سوانح پر بھی غور کرتے جائیں؟

نوٹنگھم شائر کے ایک ایسے علاقے میں جہاں کانوں کا کام ہوتا تھا ۱۸۸۵ء میں ڈیوڈ ہربرٹ لارنس پیدا ہوا۔ اس کا باپ کسی کان میں ایک مزدور تھا لیکن اُس کی ماں سماجی لحاظ سے اپنے خاوند کی بہ نسبت اونچے طبقے سے تعلق رکھتی تھی۔ چنانچہ اس بلند تر معاشری مرتبے کی وجہ ہی سے وہ اپنے خاوند کی طرح مقامی بولی نہیں بولتی تھی بلکہ اُس کی زبان صحیح انگریزی تھی جسے عام اصطلاح میں "بادشاہ کی زبان" کہا جاتا ہے یعنی ٹکسالی زبان لیکن "ہونی" کے جادو نے اس عورت کو ایک معمولی مزدور کی بیوی بنا دیا۔ حالانکہ اُس کا مطالعہ بھی اچھا خاصا تھا اور وہ اپنے لکھے ہوئے خطوط کی دلچسپی کی وجہ سے بھی جان پہچان والوں میں مشہور تھی۔

لارنس اپنے بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ وہ ایک حساس لڑکا تھا۔ اُس کی آنکھیں اپنی ماں کی طرح نیلی تھیں اور اپنی ماں ہی کی ذہانت اُس میں بھی نمایاں تھی۔ لارنس کی ماں ایک طبیعت دار عورت تھی اور اسی وجہ سے اُس کے میل جول والے اُسے عزت کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ اُسے خیال انگیز باتوں میں لطف آتا تھا خصوصاً فلسفیانہ یا مذہبی مباحث میں وہ بہت دلچسپی لیتی تھی۔ خاوند یعنی لارنس کا باپ رفتہ رفتہ عادی شرابی ہو گیا اور اکثر بیوی سے ظالمانہ سلوک بھی کرنے لگا اور یوں لارنس کی ماں نے بہت جلد خاوند سے بیزار ہو کر اپنے بچوں ہی میں اپنی تمام دلچسپی کو مرکوز کر دیا۔ خصوصاً اُسے لارنس سے ایک خاص لگاؤ پیدا ہو گیا۔ گھر کے ان حالات کو دیکھتے ہوئے رفتہ رفتہ لارنس بھی اپنے باپ سے دل برداشتہ ہو گیا۔ لیکن اُس کی فطرت میں بہت سی باتیں

باپ سے بھی ورثے آئی تھیں۔ اپنے جبلی رجحانات کی شدت، ناراضگی کے لمحوں میں اپنے غصے کی تندی اور اپنی تمام عامیانہ یا سادگی سے لبریز خصوصیات اُسے باپ ہی سے ملی تھیں۔

گھر میں چونکہ وہ شانتی اور ہم آہنگی موجود نہ تھی جس کی وجہ سے بچوں کے اعصاب کی پرورش ایک سکون کے ساتھ ہو سکتی ہے اور انہیں انتہا پسند ہونے سے بچایا جا سکتا ہے اس لئے لارنس کے دل میں ماں کی محبت بھی ایک انتہائی صورت اختیار کر گئی۔ اور بیٹے نے ماں کے ساتھ مل کر گویا بدقماش خاوند اور باپ کے خلاف ایک ملی بھگت قائم کر لی۔ یوں ماں کی نظروں میں بھی بیٹا خاوند کا نعم البدل ثابت ہو گیا۔ چارلس باڈیلیر ہی کی طرح لارنس کا یہ جذبہ بھی عام محبت سے بڑھ کر عشق کا رنگ اختیار کر گیا۔ ایک جگہ وہ گویا اپنی ماں ہی کو مخاطب ہو کر لکھتا ہے "تم نے ایک ایسے فعل کا ارتکاب کیا ہے جو کسی بھی ماں کے لئے مستحسن نہیں ہو سکتا۔ تم نے اپنے اور اپنے بچے کے درمیان ایک ایسی محبت کا بندھن پیدا کر دیا ہے جو (انسان کو) بلوغ کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ محبت کے اس احساس سے مرد مرد کو چاہتا ہے، عورت عورت کو چاہتی ہے اور مرد عورت کو چاہتا ہے۔ تمہاری تمام نرم دلی اور دل سوزی بھی تمہیں اس جرم سے عہدہ برآ نہیں کرا سکتی۔ بلکہ (اس دلسوزی کی وجہ سے) تمہارا جرم اور بھی گہرائی حاصل کر لیتا ہے۔ تم نے اپنے اور اپنے بچے کے درمیان ایک متواتر ہم آہنگی کا بندھن قائم کر لیا ہے۔ میں جنس کی بات نہیں کرتا۔ میں خالص ہم آہنگی (ہمدردی)، مقدس محبت کی بات کرتا ہوں۔۔۔ وہ ہمدردی جس کا تعلق ایک پختہ روح سے ہوتا ہے۔۔۔۔ خواہ ہم فرشتوں کی طرح پاک ہوں۔ اس کے باوجود، چونکہ ہم انسان ہیں، یہ بات لازماً ہو کے رہے گی۔۔۔۔ کیونکہ ہمارے ارادوں کے باوجود، ہمارے مسلک کے باوجود، ہماری پاکیزگی کے باوجود، ہماری خواہشات اور ہماری قوتِ ارادی کے باوجود، اگر ہم ایک بار محبت کے اوپر والے بلند تر حصے میں مقناطیسی تعلق کو برانگیختہ کر دیں، تو لازماً جسمانی محبت کے نیچے والے عمیق تر حصے میں بھی ایک مقناطیسی احساس و شعور کو جگا دیں گے"

ماں بیٹے کے تعلق کی اس اُلجھن ہی کے باعث لارنس اپنی محبوبہ مریم سے بھی اپنے تعلقات کو سلجھا کر استوار نہ کر سکا (جس کا بیان آگے آئے گا) اور اسی کشمکش کو اُس نے اپنے شاہکار ناول "بیٹے اور عاشق" میں ظاہر کیا ہے۔ اس ناول کی ہیروئن کا نام مریم ہے اور یہی مریم لارنس کی حقیقی مریم (ای۔ ٹی) کی نقل ہے۔

لارنس کی محبوبہ یعنی اصلی مریم کسانوں کے ایک خاندان سے تھی اور تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد کسی سکول میں معلمہ کا کام کرتی تھی۔ لیکن لارنس سے اُس کا تعلق زمانۂ طالب علمی سے تھا۔ اُس زمانے میں لارنس کو جب کبھی موقعہ ملتا وہ مریم کے ہاں سائیکل پر سوار ہو کر جا پہنچتا۔ ان ملاقاتوں کا مفصل حال مریم نے لارنس کی موت کے بعد ای ٹی کے نام سے ایک کتاب میں لکھا ہے۔ لارنس اس لڑکی سے جنسی تعلق کے سلسلے میں ہمیشہ خوفزدہ رہتا تھا اور اپنی اس جھجک اور کمزوری پر انتقامی طور پر یہ کہہ کر پردہ ڈالنے کی ناکام کوشش کرتا رہتا کہ مریم میں کوئی جسمانی دلکشی ہی نہیں ہے۔

پہلے پہل لارنس کو مریم نے گرجا گھر کے سکول میں دیکھا جبکہ دینیات کے سبق میں لارنس ایک نظم سنانے سے پہلے اس کے آغاز کے الفاظ بھول گیا اور اُس کی گھبراہٹ پر طلباء اور طالبات ہنستے رہے۔

اگر مریم کی ماں اور لارنس کی ماں ایک دوسری سے نہ ملتیں تو ممکن تھا کہ مریم اور لارنس بھی ایک دوسرے کو کبھی نہ جان سکتے۔ کیونکہ ان دونوں ہی کی اتفاقی ملاقات سے دونوں گھرانوں میں راہ و رسم پیدا ہوئی پہلے پہل ایک آدھ بار لارنس اپنی ماں کے ساتھ مریم کے ہاں گیا۔ رفتہ رفتہ تعلقات بڑھتے گئے اور لارنس نے مریم کے گھر کے ہر رکن کے ساتھ خصوصاً اُس کے باپ اور ماں کے ساتھ اس قدر اُنس پیدا کر لیا کہ ہر ہفتے کے روز چار کے وقت اُس کا وہاں جانے کا معمول ہو گیا۔ مریم لکھتی ہے کہ لارنس کے گھر میں داخل ہوتے ہی فراغت اور خوش دلی چھا جاتی تھی اور یہ بات اس وجہ سے نہ تھی کہ ہم سب سے اُس کے تعلقات اچھے تھے بلکہ اُسے کچھ ایسا ڈھب آتا تھا کہ ہم سب آپس میں بھی خوش دلی سے برتاؤ کریں۔ لارنس غیر معمولی طور پر مہربان طبیعت کا مالک تھا اور کوئی بھی کام ہو اس میں جھٹ ہاتھ بٹانے کو تیار ہو جاتا۔ اُس کے لئے کوئی بھی کام بیزار کن نہ ہوتا۔ وہ ہر کام میں کچھ ایسی جان ڈال دیتا کہ معمولی سی بات بھی ایک تخلیقی اہمیت اختیار کر جاتی۔ اُس کے ساتھ کہیں باہر آنا جانا ایک یادگار تجربے کا حکم رکھتا۔ اس کی سنگت میں انسان کو ہر چیز کی نزدیکی کا احساس رہتا اس کی رفاقت کا ہر لمحہ زندگی کا ایک خاص حصہ معلوم ہوتا۔ اور اگر وہ کبھی کسی بات، کسی کام یا کسی چیز کا ذکر کرتا تو بیان کا بھی اُسے کچھ ایسا ڈھب آتا تھا کہ سامع یہی سمجھتا کہ یہ کام یہ بات یا یہ چیز دنیا کی چند اہم چیزوں میں سے ہے۔

"جب کبھی ہم دونوں تنہا ہوتے تو ہم اس دنیا سے کسی دُور کی دنیا میں جا پہنچتے جہاں احساسات اور خیالات میں ایک شدت ہوتی، اور ہمیں یوں محسوس ہوتا کہ ہم کسی ایسی حقیقت کو چھو رہے ہیں جو روزمرہ کی عام دنیا سے بہت بلند ہے"۔

لیکن جُوں جُوں یہ دونوں جوان ہوتے گئے حالات میں تبدیلی پیدا ہونی شروع ہوئی۔ بلوغ کے ساتھ ہی سماجی لحاظ سے ممانعت اور پابندیاں بھی آئیں۔ لارنس کی ماں کو کچھ زمانے کے لحاظ سے اور کچھ اپنے حسد کے لحاظ سے ان کا حد سے زیادہ میل جول ناپسند ہوا۔ اور لارنس بھی ماں سے اپنی والہانہ دلبستگی کی بنا پر یہ نہ سمجھ سکا کہ ایک خاص وقت تک ہی ماں سے انسان کا تعلق خاطر رہ سکتا ہے۔ خصوصاً جب انسان کسی ایسی عورت کو پا لے جس سے ہر طرح کی ہم آہنگی دلپسند ہو تو وہی نئی عورت زندگی میں انسان کی رہنما اور رفیق دوامی بن جاتی ہے۔ معلوم نہیں کہ لارنس اس فرقِ مراتب کو کیوں نہ سمجھ سکا حالانکہ خود اُس نے ایک بار مریم سے کہا تھا کہ ہر بڑا آدمی یعنی ہر وہ آدمی جو کوئی نمایاں کام سرانجام دیتا ہے، اس کی بنیاد کسی نہ کسی عورت کی ہستی میں ہوتی ہے"۔ اور ماں کے بعد اس کی محبوب عورت مریم کی ہستی ہی ایک ایسی ہستی تھی۔ لیکن شاید لارنس کی نظر اس مقام پر اُلجھ گئی اور اسی اُلجھن کی وجہ سے لارنس کی شخصیت مریم کی نظروں میں ایک دُہری شخصیت بن گئی اور وہ بھی اس دُہری شخصیت سے اپنے آپ کو ہم آہنگ نہ بنا سکی۔

شادی کے متعلق لارنس اکثر اپنے خیالات مریم پر ظاہر کیا کرتا تھا۔ "یہ بات نہیں کہ میں شادی نہیں کرنا چاہتا، اگر مجھے کوئی ایسی عورت مل جائے جس سے شادی کرنا میرے امکان میں ہو تو میں کل ہی شادی کر لوں، لیکن میری موجودہ حالت کچھ ایسی ہے کہ میں ایک عورت سے دوسری عورت تک اپنے سفر کو جاری رکھوں گا یہاں تک کہ پورے طور پر میری تسکین ہو جائے"۔

اسی کشمکش تعلق کے متعلق ایک خط میں لارنس مریم کو لکھتا ہے "جو درد و اذیت تمہیں اس وقت اس بے رحمانہ طریق پر محسوس ہو رہا ہے، اُس کی وجہ مجھ سے تمہارا میل جول ہے۔ ایک بار تم میرے دائرے سے نکل جاؤ گی تو زندگی تمہیں اپنے لئے مسرت سے لبریز نظر آئے گی۔ مجھے اس کا یقین کامل ہے"۔ اس خط سے مریم کے دل میں جو خیالات پیدا ہوئے ان کے بارے میں وہ لکھتی ہے "اگرچہ میں اس خط کی بنیادی سچائی سے آگاہ تھی، اس کے باوجود ان کلمات نے مجھے ایک صدمہ سا پہنچایا۔ میں لامحالہ کی زندگی تو بسر کرنا چاہتی تھی مجھ سے میرا دل کہتا تھا کہ جہاں تک ہو سکے تجھے زندگی کو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہئے، زندگی سے گریزاں نہیں رہنا چاہئے۔ اور نہ میں لارنس کے اس خیال سے متفق تھی کہ محبت کو جسمانی اور روحانی دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ مجھے یہ بالکل غلط معلوم ہوتا تھا کیونکہ اس طرح کی تقسیم سے جسمانی محبت ایک توہین کا درجہ اختیار کر لیتی ہے اور روحانی محبت محض ایک نظریہ یا انداز نظر بن کر رہ جاتی ہے مجھے یوں محسوس ہوتا تھا گویا یہ دونوں حصے غیر حقیقی سے ہیں۔ لیکن لارنس نے اسی زمانے سے محبت کے ان دو علیحدہ اور ممتاز حصوں کے تصور کی نشو و نما شروع کر دی وہ مجھ سے اکثر کہنے لگا کہ وہ ہماری ایک واقف لڑکی سے محض جسمانی نقطۂ نظر سے بیاہ کر سکتا ہے (اسی لڑکی کا ذکر اُس نے اپنی مجموعی نظموں کی کتاب کے مختصر دیباچے میں "دوسری عورت" کے محاورے میں کیا ہے۔ آسانی کے لئے میں اس لڑکی کو ح کہوں گی) انسانی تعلقات کے وہ تمام تصورات جو میرے ذہن میں قائم تھے، اُن کے لحاظ سے اس قسم کے بیاہ کا خیال بھی میرے نزدیک الحاد سے کم گناہ نہ تھا۔ مگر مجھے کچھ مبہم طور پر محسوس ہوا کہ لارنس کی یہ انتہائی مادہ پرستی اُس کی روحانی پریشان نظری کے باعث ہے۔

لارنس نے یہ کوشش کی کہ وہ مجھ سے گفتگو کر کے اس مسئلے کے متعلق کوئی دلیل مہیا کرے۔

"مثال کے طور پر میں ح سے خالصتاً حیوانی لحاظ سے بیاہ کر سکتا ہوں"۔

میں "لیکن یہ تو ایک گھناؤنی بات ہو گی"۔

لارنس "گھناؤنی کیسے ہو سکتی ہے؟ بہت سے مرد ایسے ہیں جو محض حیوانی لحاظ سے ہی بیاہ کرتے ہیں۔ ہمیں اُن کے متعلق معلوم کرنے کے لئے محض اُن کے حالات پر غور کرنے کی ضرورت ہے"۔

میں نے کہا "یوں اپنی ہستی کے دو حصے بنا کر صرف ایک حصہ اس عورت کو دینے میں اُس کی توہین ہے"۔ وہ کہنے لگا "کوئی بھی توہین نہیں ہر اُس کے نیچے بھی تو ہوں گے، اس کے علاوہ اُسے اس بات کا پتہ ہی کب چلے گا؟"

میں نے پوچھا "کیا تم سمجھتے ہو کہ پتہ نہیں چلے گا؟" اس کے بعد اُس نے کہا کہ اُس کی ہستی کا دوسرا حصہ مجھ سے تعلق رکھتا ہے، میری ملکیت

ہے" اور وہ بولا "میں تمہیں اپنی ہستی کا بہترین جزو سونپتا ہوں۔ تمہیں حقیقتاً دوسرے حصّے کی تو ضرورت ہی نہ ہوگی"۔ —— یہ اُس نے التجا کے لہجے میں کہا۔ میں حیران رہ گئی۔ میں نے کہا "لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر تم م سے بیاہ کرنا چاہتے ہو تو مجھ سے کیوں تعلق قائم رکھتے ہو؟"

وہ بولا "اس لئے کہ میں تمہارے بغیر گذارہ ہی نہیں کرسکتا"——

یہ اُس نے ایک شدّتِ احساس کے ساتھ کہا "میری تحریریں، میری ہستی کا یہ پہلو تمہیں سے تعلق رکھتا ہے، تمہارے بغیر میں آگے نہیں بڑھ سکتا" اور اپنے متعلق اس غیر یقینی کیفیت کی وجہ ہی سے وہ بہت ذکی الحس ہو گیا تھا۔ مسز میبل ڈوج لکھتی ہے "وہ یہ برداشت ہی نہیں کرسکتا تھا کہ کوئی شخص اُس پر کسی قسم کا اعتراض کرے، اُس کی طاقت پر، اُس کی غلطی یا راستی پر، بلکہ یہاں تک کہ اُسے اپنے حلیے کے متعلق بھی کسی قسم کی رائے زنی یا کوئی اعتراض بُرا لگتا تھا۔ اور میرا خیال ہے کہ چونکہ اُسے اپنے آپ میں، اپنی ذات پر پورا پورا اعتماد حاصل نہ تھا، اُس کے دل میں احساسِ کمتری کا ایک مبہم سا شائبہ موجود تھا اسی لئے اُس کی افتادِ طبع زود رنجی سے آلودہ ہوگئی تھی:

نوٹنگھم یونیورسٹی میں دو سال گذارنے کے بعد لارنس نے ثانوی تعلیم کے ایک مدرسے میں پڑھانا شروع کیا۔ ابھی اُس کی عمر تیئس سال کو پہنچی تھی کہ مریم نے اُس کی بے خبری میں، لیکن اُس کی اجازت سے اُس کی چند نظمیں نقل کرکے مجلّہ انگلش ریویو کو اشاعت کے واسطے روانہ کردیں اس سے پہلے لارنس نے صرف ایک بار اپنی کوئی تصنیف کسی مشہور مصنّف کو رائے زنی کے لیے بھیجی تھی، لیکن وہ بغیر رائے زنی کے مصنف کی بیوی ایک رقعہ کے ساتھ لوٹا دی گئی کہ مصنّف موصوف کو افسوس ہے کہ اپنے کام کی زیادتی کی وجہ سے لارنس کی درخواست کو منظور نہیں کرسکتے۔ اس واقعے کا ذکر لارنس نے مریم سے کیا اور کہا کہ اب میں کبھی کوئی چیز شائع کرنے کی طرف قدم نہ اٹھاؤں گا۔ اس پر مریم نے اس سے اجازت لی کہ وہ بذاتِ خود اس کی نظمیں بھیجنا چاہتی ہے۔

مریم کے اسی اقدام کے نتیجے کے طور پر محولہ بالا مجلّے کے مدیر فورڈ میڈوکس ہیوفر نے لارنس کو ملاقات کے لئے بلایا اور یوں اس کی ادبی زندگی کی ابتدا ہوئی۔ فورڈ میڈوکس نے مریم کی طرح، اُس کی نظموں ہی سے جان لیا کہ اُس میں جوہر خداداد موجود ہے اور اس کے بعد لارنس کا پہلا ناول "سفید مور" بھی فورڈ میڈوکس ہی کے ذریعے سے ایک مشہور ناشر کے پاس پہنچا اور شائع ہوا۔

لارنس ستائیس سال کا تھا کہ اُس کی ماں کا انتقال ہوگیا۔ ظاہر ہے کہ اس حادثے نے اُس کی طبیعت پر ایک خاص اثر کیا جس کا اظہار اُس کی تصنیفات میں مختلف جگہوں پر موجود ہے۔

سنہ ۱۹۱۲ء میں لارنس کی ملاقات اُس عورت سے ہوئی جو آئندہ عمر بھر اُس کی رفیقۂ حیات رہی۔ یہ خاتون نسلاً جرمن تھی اور ایک اونچے فوجی گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ اور اس کے علاوہ کسی یونیورسٹی کے ایک انگریز پروفیسر کی بیوی بھی تھی۔ پہلی ملاقات ہی میں لارنس اور فریدہ ایک بے پناہ جذب باہمی سے ایک دوسرے کی طرف راغب ہوگئے۔

عورتوں پر لارنس ہمیشہ ایک سحر سا کر دیا کرتا تھا، لیکن اس جادو کا بھید کیا تھا؟ کیا وہ خوش کرنے کے فن میں ماہر تھا؟ یہ بات نہیں ہوسکتی کیونکہ اکثر وہ عورتوں سے بے رحمانہ اور ناخوشگوار برتاؤ بھی کرتا تھا۔ مریم کی مثال پیش کرنے کی ضرورت ہی نہیں، یہ ایک واضح مثال ہے۔ اُس نے اپنے باہمی تعلق کو اپنی ذہانت کے باوجود اپنی نفسی اُلجھنوں کی بھینٹ چڑھا دیا۔ اور فریدہ کے سلسلے میں بھی اُس نے اُسے ایک آرام و راحت سے لبریز، تن آسانی کی زندگی سے ہٹا کر محنت مشقّت کی زندگی اختیار کرنے پر مجبور کردیا فریدہ گھر کا تمام کام کاج خود کرتی تھی۔ کھانا پکانا، کپڑے دھونا اور دوسری مختلف باتیں جسمانی طور پر بھی لارنس میں کوئی خوبی یا دلکشی نہ تھی۔ آندرے موروا کا خیال ہے کہ لارنس کی ذات میں اِن عورتوں کو جو بے اختیار اُس کی طرف کھینچی جاتی تھیں، ایک قدیم، وحشیانہ، غیر مہذّب خصوصیّت دکھائی دیتی تھی اور اس خصوصیّت کو اُن کی اپنی فطرت سے بھی یک گونہ نسبت تھی۔ لیکن اس سے بڑھ کر ایک اور دلکشی بھی تھی۔ اُس کی فطرت میں کمزوری اور طاقت کا ایک ایسا اجتماع تھا جس میں عورت کے لئے ایک خاص دلکشی ہوتی ہے۔ طاقت انہیں اپنے آپ کو مرد کے قابو میں لاتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور کمزوری مرد کو اُن کے اپنے قابو میں لاتی محسوس ہوتی ہے۔ فریدہ سے لارنس اکثر لڑتا جھگڑتا بھی رہتا تھا اور ان جھگڑوں میں بعض اوقات ہاتھا پائی تک نوبت آجاتی اور وہ فریدہ کو پیٹنے لگتا لیکن ان دست درازیوں کا فریدہ بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا کرتی۔ لارنس اپنے اُن دوستوں سے جن کے گھروں میں ناچاقی رہتی اکثر کہا کرتا کہ ایسے موقعے پر جسمانی قوت کو کام میں لانا چاہیئے۔ گویا ناراضگی یا رنجش کے موقعے پر خاوند بیوی کے تعلقات کو استوار کرنے کے لئے مار پیٹ کی ضرورت ہے۔ ایک انگریز سے ایسے اندازِ نظر کی توقع نہیں ہوسکتی۔ ایک انگریز کی فطرت اپنی سماجی پابندیوں

کی بنا پر تکلفات کے ایک بے پایاں سمندر میں ڈوب جاتی ہے۔ لارنس کو اس سے سخت نفرت تھی اور وہ ہمیشہ انگریزوں کی حد سے بڑھی ہوئی احتیاط کو بُرا بھلا کہتا رہتا تھا۔

خاوند بیوی کے تعلقات کا مسئلہ لارنس کے تخیل کی ایک خاص آماجگاہ تھا اور اپنے اکثر افسانوں میں اُس نے زندگی کے اس پہلو پر بحث کی ہے۔ بلکہ اس کے دو مشہور ناولوں "ڈوصنکٹ" اور "متوالی عورتیں" کو تو ایک نقاد نے گھریلو زندگی کی تکمیل کے جواب مضمون" کہا ہے۔

لارنس اور فریدہ کی شادی کے ساتھ ہی جنگِ عظیم شروع ہو گئی لارنس کے لئے ایک اور اُلجھن پیدا ہوئی، کیونکہ اس کی بیوی جرمن تھی۔ اب کیا بنے گا؟ — ایک دوست نے کارنوال کے علاقے میں اپنا ایک مکان انہیں رہنے کے لئے عاریتاً دے دیا۔ یہ جگہ لندن کی شہری زندگی کے ماحول سے بالکل الگ تھلگ تھی بلکہ یہاں کی علیحدگی اور تنہائی ہی کی وجہ سے ایک دفعہ لارنس نے خیال کیا تھا کہ وہ اس مقام پر اپنے دوستوں اور مصنفوں کی ایک نوآبادی قائم کرے۔ اور یہ سب دوست اُس مادی اور میکانکی تہذیب سے بیزار ہوں جس کی بدولت ممالک میں جنگوں کے مصائب نازل ہوتے رہتے ہیں۔

لوگوں کے دماغ جنگ کی وجہ سے پریشان اور بھڑکے ہوئے تھے۔ اور جب مقامی باشندوں کو معلوم ہوا کہ فریدہ ایک جرمن عورت ہے تو انہوں نے اپنے غیر مدلل اجتماعی انداز میں لارنس اور اس کی بیوی کو جاسوس سمجھا، پولیس اُن کے ہاں آئی اور فریدہ کے بعض خطوط محض اس بنا پر اُٹھا کر لے گئی کہ وہ جرمنی زبان میں لکھے ہوئے تھے۔ آخر روز روز کے جھگڑوں اور انگشت نمائی سے تنگ آ کر انہیں کارنوال کو چھوڑ کر لندن لوٹنا پڑا۔ اس واقعے نے بھی لارنس کی طبیعت پر ایک گہرا اثر کیا اور اُس کے ذہن کی تلخی کو بڑھا دیا اور جنگ کے بعد جس قدر جلد ہو سکا وہ فریدہ کو لے کر اٹلی میں جا پہنچا۔

لارنس کے خیال میں ایک انسان جب مناکحت کی زندگی اختیار کرے اور اس میں کامیاب ثابت ہو تو اُسے چاہیئے کہ وہ کوئی تعمیری کام کرے اور اس کا طریقہ ایک نئی سوسائٹی کا قیام ہو سکتا ہے۔ اس قسم کے کام سے انسان اب عورت کی بجائے دوسرے مردوں سے رابطۂ اتحاد پیدا کر سکتا ہے۔ اور اسی لئے اس نے سوچا کہ کسی نئے ملک میں دوستوں کا ایک جھرمٹ اکٹھا کر کے زندگی گذاری جائے اور یہ جھرمٹ ایسے دوستوں کا ہو جنہیں لارنس کی تعلیم کے مطابق رہنا سہنا پسند ہو۔ لیکن اسی دوران میں اُسے امریکہ سے ایک ایسا خط آیا جس سے اُسے ایک نئے تجربے کا موقعہ ملا۔

مسز میبل، ڈوج، سٹرن، لوہان" پیدائش کے لحاظ سے ایک امریکی عورت تھی۔ یہ تین نام اُس کے تین مختلف شوہروں کے تھے۔ اس عورت نے ایک لال ہندی سے شادی کر کے نیو میکسیکو کے ایک مقام پر رہنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے لارنس کو ایک خط میں لکھا کہ وہ لارنس کی تصنیفات کا مطالعہ بہت شوق و ذوق سے کرتی رہی ہے، اور ان کتابوں ہی کے ذریعے سے اس نے اُن کے مصنف کا بھی گہرا مطالعہ کیا ہے اور وہ اس بات کا پورا یقین رکھتی ہے کہ لارنس ایسے انسان کے لئے جسے ابتدائی انسانی زندگی کے انداز معاشرت سے بہت رغبت ہے، میکسیکو کے لال ہندیوں میں زندگی گذارنے سے مسرت کا بہت زیادہ امکان ہے۔ اس لئے وہ لارنس کو وہاں آنے کی دعوت دیتی ہے۔

لارنس نے اُس کی اس درخواست کو منظور کر لیا، اور فریدہ کو ساتھ لے کر وہ لنکا اور آسٹریلیا سے ہوتا ہوا میکسیکو جا پہنچا۔

آلڈس ہکسلے کے خیال میں یہ سفر لارنس کے لئے بیک وقت ایک گریز اور ایک تلاش کا حکم رکھتا تھا۔ وہ ایک ایسے حلقے کی تلاش میں تھا۔ جہاں ابھی انسانی تخیل نے شعور و احساس کی بلندی کو حاصل کر کے زندگی کو تخریب آلود نہ کر دیا ہو۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ یورپی تہذیب کے مصائب اور اُس کی برائیوں سے گریزاں تھا۔

میکسیکو پہنچنے پر لارنس کی میزبان میبل ڈوج نے دیکھا کہ فریدہ ایک چٹان کی طرح مضبوط ہے اور لارنس ہر وقت ایک بچے کی طرح اُس کی موجودگی ہی سے طاقت کا اکتساب کرتا ہے اور اس توازن کے جھمیلے میں اکثر دونوں لڑتے جھگڑتے اور ایک دوسرے سے بیزار بھی ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اُس نے سوچا کہ آئندہ فریدہ کی بجائے وہ خود لارنس کی دیکھ بھال کرے گی۔ کیونکہ اُس کی نظر میں فریدہ اس لائق نہ تھی کہ لارنس کے جوہر کو اس کی انتہائی بلندی تک تحریک دے سکے۔ چنانچہ اُس نے آئندہ کے لئے لارنس کی کتابی "ماں" کا درجہ حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن فریدہ ہار ماننے والی ہستی نہ تھی۔ اس نفسیاتی جنگ میں اُس نے نہایت بہادری سے کام لیا اور آخر کار اپنے لارنس کو میکسیکو سے لے کر اٹلی کو لوٹی۔ یہاں میکسیکو میں لارنس نے دو کتابیں لکھیں۔

جب لارنس اٹلی پہنچا تو اُس وقت اُس پر دق کا حملہ ہو چکا تھا۔

اور وہ ایک مریض انسان تھا، ایک مرتا ہوا انسان جس کی موت مستقبل قریب میں یقینی تھی ـــــ لیکن اس کے ساتھ ہی اُس کے دل میں زندہ رہنے کی خواہش بے تحاشا بڑھ گئی تھی اور اس کی توجہ ایک بار پھر اسی موضوع پر مرکوز ہو گئی تھی جس نے ہمیشہ اُسے پریشان کئے رکھا یعنی نفس انسانی کی جنسی زندگی۔ اُس کی مشہورِ عالم کتاب "لیڈی چیٹرلے کا عاشق" میں جس حد سے بڑھی ہوئی جنسی جذبات پرستی کا اظہار ہے اُس کی یہی توجیہہ کی جا سکتی ہے۔ کہ موت کے قرب کا خیال اور زندگی کی شدید خواہش اس قصّے کی تعبیر کا باعث بنی۔ انگلستان میں اس ناول کو ممنوع قرار دیا گیا، اور اس کی پہلی اشاعت اٹلی سے ہوئی تھی۔ اس کے بعد لارنس کی بنائی ہوئی بعض تصاویر کی نمائش کو بھی لندن میں روک دیا گیا اور اس کے بعد چند مہینے وہ جنوبی فرانس میں اپنا آخری ناول "مردِ رفتہ" لکھتا رہا لیکن یہ ناول اُس کی موت کے بعد شائع ہوا۔

عمر کے آخری حصّے میں جب لارنس بہت زیادہ بیمار ہو گیا تو دوستوں کے مجبور کرنے پر ایک صحت گاہ میں داخل ہوا۔ تین مہینے تک اُس نے وہاں کی پابند زندگی کو برداشت کیا۔ اور اس کے بعد اُس نے وہاں سے نکل بھاگنے کا ارادہ کر لیا۔ صحت گاہ کی زندگی میں اصولوں کی پابندی اُس کی طبیعت پر بار نہ تھی بلکہ وہاں مشین کی طرح ہر کام کا ہونا اُس کی برداشت سے باہر تھا، ایسے میکانکی ماحول میں اُس کی ہمّت جواب دے سکتی تھی۔

اس کی حالت پہلے سے یقیناً بدتر تھی اس نے سوچا کہ اگر زندگی باقی ہے تو اس صحت گاہ میں نہیں رہنا اور اگر موت ہی لکھی ہے تو کم سے کم یہاں نہیں مرنا۔ چنانچہ وہ بغیر کسی کی مدد کے اپنا مختصر سا سامان سنبھال کر وہاں سے پیادہ پا چل پڑا اور پتھریلے پہاڑی راستے کو طے کر کے کچھ دور کے اس مکان میں جا پہنچا جہاں اُس کی بیوی فریدہ رہتی تھی۔ اور وہاں پہنچ کر بھی اُس نے صحت گاہ کی طرح کسی کام میں بھی کسی اور کی مدد لینے سے انکار کر دیا۔

کیتھرین کارسوئل اپنی کتاب "وحشی زیارت" میں لکھتی ہے کہ اِن ایّام میں لارنس جسمانی لحاظ سے اپنی پہلی ہستی کا محض ایک سایہ سا تھا، ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ، لیکن آخر دم تک اس نے موت کا مقابلہ نہایت مستقل مزاجی اور بہادری سے کیا اور جب اُس نے دیکھا کہ نگاہِ واپسیں کا لمحہ آن پہنچا ہے تو بھی اُس نے صورتِ حال کو ایک سادگی سے لبریز ہمّت کے ساتھ آمنا و صدقنا کہا۔ وصیّت کے طور پر اُس نے یہ خواہش ظاہر کی کہ اُس کے جنازے پر کم سے کم رقم صرف کی جائے لیکن ان باتوں کے باوجود اُسے ابھی امید تھی کہ وہ مرے گا نہیں اور اس کے وہ دوست بھی جو اُس سے دور تھے۔ آخر دم تک یہی یقین رکھتے رہے کہ وہ نہیں مرے گا، وہ مر ہی نہیں سکتا۔ سِل کا مرض اب آخری حد تک پہنچ رہا تھا اس کے باوجود اس کا ذہن آخر تک مطمئن اور روشن رہا۔ درد کو مٹانے یا کم کرنے کے لئے وہ آخر تک ٹیکا لگوانے سے انکار کرتا رہا۔ اُس کے جو دوست وہاں موجود تھے ان کے لئے اور خصوصاً آلڈس ہکسلے کے لئے یہ ایک ناقابلِ برداشت سانحہ تھا کہ ان بے باک اور درخشاں آنکھوں کا نور دھندلا جائے لیکن اُس کی بیوی فریدہ اپنے مرتے ہوئے خاوند کی ہمّت سے اکتسابِ فیض کرتے ہوئے نہایت دلیری سے انجام کا مقابلہ کرتی رہی۔

اور صحت گاہ سے چلے آنے کے دو روز بعد ۲ مارچ ۱۹۳۰ء کے روز اپنی عمر کے پینتالیس[۴۵] ویں سال میں انگلستان کا یہ بیباک پیغمبر، یہ شاندار مصنف اور یہ اچھوتا شاعر مر گیا لیکن اُس کی موت بیکار نہ گئی۔ اُس کی زندگی مصائب اور مخالفتوں کے باوجود فتح اور کامیابی کی زندگی رہی، وہ جو پیام دنیا کے سامنے لایا تھا اُس کے خلوص اور سچائی کا یقین لوگوں کو دلا کر گیا۔ اُس کی زندگی ہی میں اس کے پیام کا اثر شروع ہو گیا تھا اور اُس کے بہت سے حامی پیدا ہو چکے تھے لیکن اُس کی موت نے اس اثر کو بہت پھیلا دیا اور آج اس کی تقریباً تمام وہ کتابیں لگاتار شائع ہوتی رہتی ہیں جنہیں اُس کی حیات میں اِس تنگ دل دنیا نے قابلِ ضبطی قرار دیا تھا۔

اُس کی محبوبہ مریم اپنی کتاب کے آخر میں لکھتی ہے کہ لارنس اکثر مجھ سے کہا کرتا تھا کہ "تم ہی جو میرا کتبہ لکھو گی" لیکن اُن دنوں اُس کی اِس بات کو میں بالکل بے معنی سمجھتی تھی کیونکہ اس زمانے میں لارنس اور موت دو یکسر مختلف چیزیں تھیں، وہ ہمیشہ میری نظروں میں اُبلتی ہوئی زندگی کا ایک مجسمہ تھا۔ زندگی اس میں سے پھوٹ پھوٹ کر ظاہر ہوتی تھی اور وہ خود بھی خارجی زندگی میں ڈوب سکتا تھا، نہ صرف انسانی زندگی میں بلکہ عالمِ حیوانات میں بھی اور عالمِ نباتات میں بھی جنگلی چیزوں سے، پھولوں اور پرندوں سے، جال میں پھنسے ہوئے خرگوش سے، زمین کے کسی سوراخ میں پڑے ہوئے انڈوں سے اُسے ایک ازلی قسم کی ہمدردی اور ہم آہنگی میسّر تھی۔ اس میں اور تمام دوسری چیزوں میں ایک زندہ لرزش آر پار ہوتی دکھائی دیتی تھی اور یہی وجہ تھی کہ وہ مجھے لافانی نظر آتا تھا۔ اور وقت کے ساتھ جو سوجھ بوجھ انسان کو حاصل ہوتی ہے۔ اس کی روشنی میں ہم میں سے وہ لوگ جن کے ایّامِ شباب لارنس کو جاننے کی وجہ ہی سے معنی خیز ہوئے، اُس کی محبوب

اور مانوس شکل و صورت کو تصوروں میں دیکھتے ہیں اور ہمیں یاد آتا ہے کہ ہماری مسرتوں کا بہت زیادہ حصّہ لارنس ہی کی شادماں اور بے باک فطرت کا ممنونِ احسان ہے۔

یہ اُس کی محبوب عورت کا خیال ہے اور اُس کا گہرا دوست مڈلٹن مرے ایک اور بات پر غور کرنا چاہتا ہے۔ اس کشمکش کی داستان کو سُن کر ہمارے دل میں رحم کا احساس پیدا ہوتا ہے، ہم حیرانی میں سوال کرتے ہیں کیا جس طرح آئے دن اور تقدیری معاملات ہوتے رہتے ہیں۔ اسی طرح یہ کشمکش اور اس کا المناک انجام بھی محض ایک قسمت کا کھیل تھا؟ کیا اس قصّے میں باپ کے گناہوں کی سزا ماں کے ذریعے سے بچّے کو بھگتنا پڑی؟ کیا اُس مفت کی سزا سے گریز کا کوئی امکان نہ تھا؟ ان سوالوں کا جواب کیونکر دیا جائے؟ لیکن یہ سوال استفسار کا اصرار کرتے ہیں کیونکہ ہم سوچتے ہیں کہ لارنس آسانی سے اُس خوفناک بندھن کو توڑ سکتا تھا جو ماں کی محبت نے اُس کے ذہن پر طاری کر دیا تھا اور اگر وہ یوں نہ کر سکا تو کیا یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ اُس کی فطرت میں کسی قسم کی کمزوری تھی؟ ——— یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُسے اندیشہ تھا، ڈر تھا کہ اس بندھن کو توڑتے ہوئے وہ اپنی ماں کو دُکھ پہنچائے گا۔ لیکن ہمیں یہ بھی سوچنا چاہئے کہ اخلاق اور سماج کے قوانین کی حدبندی میں ایک نقطہ ایسا بھی آتا ہے جہاں پہنچ کر اچھی سے اچھی نیکی اور خوبی بھی بدی اور کمزوری یا عیب کا درجہ اختیار کر لیتی ہے اور اس نقطے کی پہچان کچھ ایسی مشکل نہیں، خصوصاً لارنس کی ذہانت کے انسان کے لئے۔ سیدھی سی بات ہے کہ جب ہم اپنی نیک روی کے بندھن سے بیزار آنے لگیں، اس سے تکلیف محسوس کرنے لگیں تو وہی نیک روی عیب بلکہ گمراہی بن جاتی ہے"۔

اب تک لارنس کی ذہنی کشمکش کے متعلق دوسروں ہی کا نقطۂ نظر ہمارے سامنے آیا لیکن آئیے ہم یہ بھی دیکھیں کہ وہ خود اس سلسلے میں کیا کہتا ہے۔ اپنی نظموں کے مجموعے سے پہلے دیباچے میں سوانحاتی نظموں کی وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے "شبابِ گمشدہ کا نوحہ ترتیب دینے کی بجائے آج کل جب ایک انسان میری طرح بیالیس سال کی پختہ عمر کو پہنچتا ہے تو سوچتا ہے کہ کیا کبھی وہ وقت بھی آئے گا کہ اُس کا ماضی دب کر آرام کے ساتھ گیا گذرا ہوگا۔ ان نظموں کو دیکھتے ہوئے مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میری عمر کے بیٹھے برس کا لارنس آج بھی اُسی طرح موجود ہے۔" اور آگے چل کر وہ کہتا ہے کہ آغازِ شباب میں میں جب نظمیں لکھا کرتا تھا تو وہ کوئی خصوصیت نہیں رکھتی تھیں، بہت سے لوگ ویسی چیزیں لکھ سکتے ہیں لیکن میں نوجوان شاعروں کی طرح انہیں شاہکار سمجھا کرتا تھا اور مریم بھی انہیں بہت پسند کرتی تھی۔ لیکن مجھے اس زمانے کے بعد کا دور بھی مبہم طور پر یاد ہے جب مجھے اندرونی طور پر کوئی دیو مجبور کرتا تھا کہ یہ بات کہہ اور میں نظم کی تخلیق کو ایک گناہ تصور کرتے ہوئے اس سے گریزاں رہنے کی کوشش کرتا۔ اس دور میں مجھے یوں محسوس ہوتا تھا گویا میرے سر پر کوئی بھوت سوار ہے۔ اُن نظموں سے میں شروع ہی سے بہت خوفزدہ رہتا کیونکہ وہ مجھے اپنی ہستی کے کسی ایسے حصّے سے نمودار ہوتی محسوس ہوتیں جسے میں ابھی نہیں جانتا تھا۔ اور نہ جاننا چاہتا تھا، اور کئی باتیں ان میں ایسی بھی ہوتی تھیں جنہیں میں کہنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن مجبور تھا، وہ کہی جاتی تھیں، خود بخود، بے اختیاری کے ساتھ۔ میں اُن نظموں کو دوبارہ کبھی نہ دیکھتا اور مریم کو دے دیا کرتا، اور وہ انہیں بہت پسند کرتی تھی یا کم سے کم ایسا دکھائی دیتا تھا"۔ ان نظموں کو لارنس نے جس بیاض میں نقل کر رکھا تھا اُس پر "بے ساختہ طبعی کیفیات" کا عنوان دیا ہوا تھا۔

آگے چل کر لارنس کہتا ہے کہ جن نظموں میں مجھے اس "بھوت" کی موجودگی کا احساس ہوتا اُن میں سے اکثر کو میں ضائع کر دیا کرتا۔ اور اگر مریم نہ ہوتی تو میں ایسی تمام نظموں کو ضائع کر دیتا۔ کیونکہ وہ میرے بھوت کو سراہتی اور اُس کی ہمت افزائی کرتی تھی۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ وہ محبت مجھ سے کرتی تھی۔ میرے اس "بھوت" سے نہیں۔ اور یوں اس کے لئے بھی یہ مسئلہ ایک مصیبت بن گیا۔ کوئی شخص آسانی سے میرے بھوت کا متوالا نہیں ہو سکتا، البتہ میری ہستی کے معمولی پہلو کا متوالا ہر کوئی ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ مریم کو پسپا ہونا پڑا۔ اس کے باوجود اُس نے میرے بھوت کو یہاں تک پسپا کیا کہ وہ چلّانے لگا۔ اور اب بھی چلّا رہا ہے۔ مریم کی نظمیں اُن نظموں میں مل جاتی ہیں جن کا تعلق میری والدہ سے ہے۔ اس کے بعد ہیلن کے متعلق نظمیں شروع ہوتی ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لندن میں پہنچ کر ایک نئی دنیا میری نگاہوں کے سامنے آ گئی تھی۔ اور پھر گھر سے جدائی شروع ہوتی ہے اور مریم سے جدائی اور کشمکش۔ اس کے بعد کافی عرصے تک میں بیمار رہا اور پھر میری والدہ کی وفات ہوئی۔ اور اس کے بعد کی بیماری میں مریم ہیلن اور ایک اور عورت کے افسانے کا انجام ہوا۔ اس کے بعد میرے لئے کوئی دلچسپی نہ رہی یہاں تک کہ ۱۹۱۲ء میں جب میں ابھی چھبیس سال ہی کا تھا

ایک نیا دور شروع ہوا"۔

یہ نیا دور فریدہ کی آمد کے ساتھ شروع ہوتا ہے اور فریدہ کے اور اپنے تعلقات کے متعلق ایک دوست کو لارنس خط میں لکھتا ہے" فریدہ اور میں برُے وقتوں میں ایک کشمکش کے بعد ایک شاندار، عریاں موانست کے دائرے میں داخل ہوگئے ہیں ایک ایسے دائرے میں جس میں گرمجوشی ہی گرمجوشی ہے اور آخر کار میں نے جان لیا ہے کہ یہی گرمجوشی محبت ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب تک میں نے اگر اپنے جذبۂ دل کو غلط عورت کے سامنے پیش کیا ہے تو اس کا الزام مجھے عورتوں پر نہیں بلکہ اپنی ذات پر رکھنا چاہیئے۔ ہر شخص کو اپنی تلاش جاری رکھنی چاہیئے یہاں تک کہ وہ اُس عورت کی ہستی تک پہنچ جائے جو اُس سے محبت کر سکے اور جس سے وہ خود بھی محبت کر سکے۔ لیکن یہ جذبہ دو طرفہ ہونا چاہیئے۔" (دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی)

اس دیباچے کی عبارت سے اور بعض دوسری باتوں سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہیلن کے ساتھ لارنس کے تعلق کا دور بہت مختصر تھا نیز یہ معاملہ مریم کی کشمکش کے عین بعد کا ہے۔ اسی دوران میں لارنس کی ماں کا بھی انتقال ہوا ہے اور مصائب یہیں پر ختم نہیں ہوئے، دوسری بار لارنس پر نمونیا کا شدید حملہ ہوا نیز اس کے بعد ہی لارنس نے مریم سے اپنے تعلقات کو از سرِ نو استوار کرنے کی ناکام کوشش کی۔ لارنس کا ناول "بیٹے اور عاشق" اسی زمانے کے بعد کی تخلیق ہے۔ اس ناول میں لارنس نے ایک تازہ دم زور اور قوت کے ساتھ ماضی کا شعوری احساس کرنے کی کوشش کی تاکہ ماضی کا بار اُس کے شانوں سے اُتر جائے اور اُس کے بعد ہی اُس کی ملاقات اُس عورت سے ہوئی جو آئندہ چل کر اُس کی رفیقِ حیات بنی چنانچہ اس وقت سے اُس کی ادبی تخلیقات میں اسی عورت کی ہستی چھائی ہوئی ہے۔ یہ بات جیسا کہ لارنس نے اوپر خود لکھا ہے ۱۹۱۲ء کی ہے۔

آندرے موروا کے خیال میں یہاں لارنس کی زندگی اور اُس کے ادبی کارناموں کا پہلا دور ختم ہوتا ہے اور دوسرے کا آغاز۔ انشار اور ملٹن کی طرح لارنس کی زندگی کے بھی ایسے چار نمایاں دور تھے۔ پہلے دور کا انجام اُس کی ماں کی موت پر ہوا۔ دوسرا دور فریدہ سے اُس کی ملاقات سے شروع ہوتا ہے اور گذشتہ جنگِ عظیم کے اختتام کے ساتھ انجام کو پہنچتا ہے۔ تیسرا دور اندازاً اُس وقت شروع ہوتا ہے جب وہ ۱۹۱۹ء میں انگلستان کو چھوڑ گیا اور یہ دور ۱۹۲۳ء میں ختم ہوا جب اُس نے کوشش کی کہ پھر سے انگلستان میں قیام کرے۔ اور اس کے بعد چوتھا اور آخری دور ۲ مارچ ۱۹۳۰ء کے روز اس کی موت کے ساتھ تکمیل کو پہنچا۔

لارنس نے بہت کچھ حاصل کیا اور بہت کچھ کھویا لیکن وہ جس قسم کے انسانوں میں سے تھا اُن کے لئے کھوئی ہوئی باتیں بھی کھوئی ہوئی نہیں رہتیں۔ اُس کی ہستی ایک خاص قسم کے انسان کا گویا ایک استعارہ تھی۔ ایسے افراد دنیا کو ایک مثال قائم کر کے بتاتے ہیں کہ انسان کو کیا کچھ ہونا چاہیئے اور وہ کیا کچھ ہو سکتا ہے، اگر کوشش کرے۔ وہ اُن نادر افراد کے گروہ کا ایک ممتاز رکن تھا۔ جو لوگوں کو اُن کی انوکھی تقدیر کا احساس دلاتے ہیں۔ لارنس کے ذریعے سے ہم اپنے آپ کو جاننا سیکھتے ہیں اور اس فہم و ادراک کی نوعیت بالکل نئی ہوتی ہے۔ اگر لارنس نے اپنی قربانی "ہونی" کے مندر پر چڑھائی تو یہ ہمارے ہی لئے تھی۔ اگر اُس کی نرم دلی اور حساس فطرت نفرت کی شدید صورت اختیار کر گئی، اگر وہ اپنے آخری ایام میں ایک ایسا اُدھا پیغمبر بن کر رہ گیا جو ناممکن خوابوں میں کھو کر اُن کی پرورش کر رہا ہو تو یہ صورتِ حال سہنے والے کے لئے تو المناک اور درد انگیز تھی لیکن ہم دور سے دیکھنے والوں کے لئے، خارجی تماشائیوں کے لئے اُس کا درد، اُس کی اذیت، اس کی تیرہ بختی ایک اجالا تھی، علم کا ایک نور۔ وہ اپنے تجربات کے بارگراں میں ہمارے لئے زندگی بسر کر گیا، اس کو سراہنا ہمارے ذمے ہے، ہمارا فرض ہے۔

اُس نے اپنی زندگی کے تجربات سے کیونکر ہمیں فائدہ پہنچایا اور ہمارے لئے خیال کی نئی راہیں کھولیں اس کا صحیح پتہ تو اس کی ادبی تخلیقات (نثر و نظم) کے مطالعے سے لگ سکتا ہے لیکن ان نظموں کو دیکھنے سے پہلے ہم ذرا اُس کے فلسفے اور پیام کے متعلق کچھ معلوم کر لیں۔

ایک مصنف لارنس کی بے باکی اور آزادروی کو اُس کی نسلی خصوصیت کہتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ لارنس نسلاً پیوریٹن لوگوں سے تعلق رکھتا تھا عیسائیت کا یہ فرقہ کٹر مذہبی خیالات رکھتا ہے اور نہایت متشرع گروہ ہے لیکن اس مصنف کے خیال میں اس کٹرپن کی بنیاد انفرادیت پر ہے یعنی اس اعتقاد پر کہ ہر مرد اور عورت کی ذمہ داریاں الگ الگ ہیں اور اس لئے انسان کو اجتماع میں مشین کی طرح کام نہیں کرنا چاہیئے، تہذیب و تمدن کی کل کا محض ایک پرزہ نہیں بن جانا چاہیئے۔ اور لوگوں کے بنے بنائے فیصلوں کو تسلیم نہیں کرنا چاہیئے۔ سیاسی لحاظ سے یہ فرقہ آزادی

کا زبردست حامی ہے۔ لیکن یہ آزادی اپنے حقوق ہی کے لئے نہیں ہے
بلکہ اُن فرائض کے متعلق بھی ہے جو ایک فرد پر سماج کی طرف سے عائد ہوتے
ہیں یعنی نہ صرف اپنے حقوق کی طلب بلکہ دوسروں کے حقوق کی
بجا آوری بھی۔ چنانچہ لارنس نے بھی تمام عمر اسی انداز میں اپنی انفرادیت
کا اظہار کیا۔ اپنے حقوق طلب کئے اور دوسروں کے حقوق کو خدمت کے
ذریعے سے پورا کیا۔ اُس کی ادبی تخلیقات کے ہر صفحے پر یہ بات ظاہر ہے۔
ایک جگہ لکھتا ہے۔

میں اپنا آپ ہوں،

"میں نوعِ انسان کو کبھی یوں نہ کرنے دوں گا کہ وہ مجھ پر کسی اور
چیز کو حاوی کر دے، لیکن اس کے ساتھ ہی میں ہمیشہ کوشش کروں
گا کہ اپنے آپ میں اور دوسرے مردوں اور عورتوں میں جو دیوتاؤں کی سی
خصوصیات ہیں، انہیں جانوں اور اُن کے سامنے سرِ تسلیم خم کروں"۔

خدا کی تلاش کے لئے ایک ذاتی جستجو کی ضرورت ہے۔ روایات
کے بندھنوں سے اُسے حاصل نہیں کیا جا سکتا، اور اس لئے مشیتِ
ایزدی کے اسرار کو سمجھنا ہی اس انفرادیت کے جواز کی دلیل ہے کیونکہ
انفرادیت ہی ایک ایسا واحد مسلک ہے جو اس سفر میں انسان کی رہنمائی
کر سکتا ہے۔ مشیتِ ایزدی سے اگر ذہنِ انسانی کی کشمکش جاری ہو جائے
تو اس سے دو ہی نتیجے نکل سکتے ہیں۔ انسان کی تباہی یا حصولِ احساسِ
روحانی کے بعد ہم آہنگی۔ ظاہر ہے کہ ایک غیر مدلل ہجوم یا رنگا رنگ کا
اجتماع ہم آہنگی کو حاصل نہیں کر سکتا اس کے عمل میں ایک پریشانی اور
بے ترتیبی مقصد کے حصول کے راستے میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ اسی
لئے اس کے واسطے یک رنگ فرد کی ضرورت ہے۔ اور انفرادیت
کی بنیاد اسی اصولِ مذہبی پر قائم ہے۔ اور یہی اصول ایک فرد کو اس کے
اعتقادات میں ایک ان تھک طاقت بخشتا ہے اور خواہ اُسے تنِ تنہا
ہر بات کا مقابلہ کرنا پڑے یہ اصول اُس کی مدد کرتا ہے۔ اور اُس کی انفرادیت
کو ایک آدرش بن کر ایک عامیانہ خود بینی اور خود دردی کی صورت اختیار
کرنے سے بچاتا ہے۔ انسان یوں محسوس کرتا ہے گویا کوئی اور طاقت
اس کی ہستی کے پردے میں کارفرما ہے۔ اسی بات کو لارنس نے کس حسنِ ادا
سے بیان کیا ہے:۔

"یہ میں تو نہیں، یہ میں تو نہیں، اک اور ہوا میری ہستی سے چلتی
ہے،
اک اور نفیس ہوا بہتی ہے، وقت کی طرف تو یہ مچلتی ہے،
اے کاش میں اس کے سہارے پر چلتا جاؤں، چلتا جاؤں،
لے جائے مجھے یہ دور کہیں، ہاں دور کہیں، ہاں دور کہیں!

اور اسی طرح اُس کے تمام ناول اور اُس کی اکثر نظمیں اسی
انفرادیت کی تیرتھ یاترا کا ایک روزنامچہ ہیں۔ اسی انفرادیت اور پابندیٔ
رسوم سے آزادی کی خواہش نے اسے ناول "لیڈی چیٹرلے کا عاشق"
میں اپنے سب سے بے باک اقدام پر مائل کر دیا۔ اُس نے دیکھا کہ لوگوں
نے خواہ مخواہ بعض الفاظ کو ایک زمانۂ دراز سے ناپاک اور ممنوع قرار
دے رکھا ہے۔ اور اُس نے ارادہ کر لیا کہ یہ پابندی اور یہ ممانعت بھی دور
کر دی جائے گی۔ اُس نے ارادہ کر لیا کہ وہ اپنے فن کی قوت سے اس آخری
بندھن کو بھی توڑ ڈالے گا لیکن اس مایا جال کی دنیا میں ہر بندھن کو توڑنا
ممکن نہیں ہے۔ اور وہ اپنے اس ارادے میں بہت بری طرح ناکام رہا
اور صدیوں کے تہذیب و تمدن نے انتقامی طور پر اُس کی روح کو یہاں
تک کچل دیا کہ وہ اس کے ماحول ہی سے گریزاں ہو گیا۔

لارنس کا فلسفہ یا پیغام کیا ہے۔ اسے دو اور دو چار قسم کے لفظوں
میں نہیں بتایا جا سکتا۔ لارنس گویا اقبال کے اس شعر کا قائل تھا کہ

سیاہی گر بدانی نورِ ذاتست — بہ تاریکی درون آبِ حیاتست

یا یوں سمجھئے کہ جوش کا یہ شعر اُس کے اعتقاد کی بنیاد تھا

ہر شبِ تار سوئے نورِ سحر آتی ہے
پردۂ شر میں مجھے خیر نظر آتی ہے

اور اس بظاہر اُلٹے اندازِ نظر کی وجہ یہ تھی کہ لارنس کو شروع ہی سے دو
دنیاؤں سے واسطہ پڑا۔ بچپن میں اُسے اپنے ماں اور باپ کا وجود
اندھیرے اور اجالے کی صورت میں دکھائی دیا۔ اور اس خیال کو اُس کی
آئندہ زندگی میں بھی قدم قدم پر وسعت ملی۔ یونیورسٹی کے زمانۂ تعلیم
میں اُس نے دیکھا کہ لوگ بعض باتوں کو برا اور بعض کو اچھا سمجھتے ہیں اور اسی
لئے سماجی اور اخلاقی بندھنوں میں گرفتار زندگی بسر کر رہے ہیں لیکن یہ
پابندیاں اُنہیں زندگی کو پُر مسرت بنانے میں کوئی مدد نہیں دے رہیں۔
ذیل کی نظم میں شاید وہ اسی ماحول سے متاثر ہو کر لکھتا ہے۔

آنکھوں میں ہیں گھلتی سی، بجھتی ہوئی شامیں
اور ایک تمنا مرے دل میں،
اِن سرخ بھڑکوں سے نکل جاؤں، پرے جا کے میں پہنچوں،

اور دیکھوں حدیں تیرہ و تاریک، گلابی!
جانے کی ہے، جانے کی تمنا مرے دل میں!

ان مرمریں جھروکوں سے پرے صاف فضا ہے،
اُس صاف فضا میں،
اُترے ہوئے ملبوس کی مانند جدا کر کے بدن سے
درد اور پشیمانی کے احساس سے چھوٹوں،
اور دیکھوں پلٹ کر،
مسلے ہوئے پیراہن بوسیدہ کا منظر،
اور نغمۂ مسرت کا الاپوں!

یہیں سے اس کے ذہن میں دو دنیاؤں کا تصور نشو و نما پانے لگا۔ دو دنیائیں، سیاہ و سفید، پست و بلند، اندھیرے اور اُجالے کی دنیائیں، جسم اور روح کی دنیائیں۔

مذہباً وہ عیسائیت کے جس فرقے سے تعلق رکھتا تھا وہ بھی پرانی ڈگر پر چلنے والا ہے یعنی کٹر خیالات کا حامی اور اپنے اعتقادات میں جوش و خروش کا حامل۔ اُس نے اس فرقے سے اعتقادات کے جوش و خروش کو تو اپنی فطرت میں رہنے دیا۔ لیکن چونکہ اُس کی اپنی روح ہر قسم کے بندھنوں کو توڑ دینا چاہتی تھی، اس لئے اُس نے خود پرانی ڈگر سے نجات حاصل کرنا چاہی، اور نفسِ امّارہ کے ہوّے سے ڈر کر اُسے اپنے آس پاس جو خوفزدہ، مصائب سے لبریز دنیا نظر آتی تھی اس سے ایک بالکل علیحدہ فطری دنیا اُس نے اپنی تصنیفات میں تخلیق کی۔ اُس نے دیکھا کہ افلاطون سے لے کر اب تک جسم و روح کی دنیا کو اندھیرے اور اُجالے کے استعارے سے بیان کیا جا رہا ہے لیکن اُس کا اپنا اندازِ نظر یہ کہتا ہے کہ جسم کی دنیا کو بُرا کیوں کہا جائے، اندھیرے کا استعارہ اسی کے لئے کیوں ہو؟ اور چونکہ رفتہ رفتہ اُس نے سمجھ لیا کہ جسم کی دنیا کو پست یا بُرا کہنے ہی سے بہت سی مصیبتیں لوگوں پر نازل ہیں اس لئے جہاں اُس کی نظروں میں جسم کی دنیا روح کی دنیا کے ہمدوش ہو گئی۔ وہیں اندھیرا بھی اجالے کا ہم معنی بن گیا یوں [illegible] اپنا نظریہ افلاطون کے نظریے کے اُلٹ قائم کر لیا۔ اور پھر یہ جنگل، [illegible] یہ اندھیرا، یہ تحت الشعور، یہ عالمِ حیوانی اور زمانۂ ماضی ہی اُس کی ذہنی حرکت اور جستجو کا مرکز بن گیا اور اس جستجو میں اُس کی زندگی ایک تیرہ

یاترا۔ اور اسی یاترا میں اُس نے اپنی جنّت کے تصور کو حاصل کیا، یہ جنّت برقی طاقت، سنیما، ریل گاڑی وغیرہ سے بہت دور کسی زرخیز و شاداب خطۂ گرم مرطوب میں تھی، جہاں سورج اور چاند یورپ کے تہذیب و تمدن سے کہیں زیادہ درخشانی سے چمکتے تھے، جہاں بڑے بڑے شہروں میں انسان کا دم نہ گھٹتا تھا، جہاں شہروں کی صفائی کا جنون ایک غیرفطری اور مصنوعی فضا نہ پیدا کر دیتا تھا، جہاں کے سانولے سلونے لوگ تکلّفات سے عاری تھے۔

اور اس کے مقابلے میں اُس کے تصور کا دوزخ وہ جگہ ہے جہاں تہذیب و تمدن نے اپنے جال پھیلائے ہوئے ہیں، جہاں لوگ سوٹ بوٹ اور دوسرے فضول پیراہنوں میں لپٹے لپٹائے اپنی ساختہ اور پُرتکلف زندگی گذار رہے ہیں، جہاں انسان کی فطری آرزوؤں کو پورا کرنے کے راستے میں بے معنی رکاوٹیں ہیں، ——— اور اس دوزخ کا مادی نقشہ لارنس کو انگلستان کی صورت میں نظر آتا تھا۔

لیکن لارنس کے ان نظریوں سے ہم اُس کی فطرت اور ذہانت کی تہ کو نہیں پا سکتے بلکہ ہمیں اُس کی افتادِ طبع اور نفسی کیفیات کے ذریعے سے اُس کے فلسفے اور اُس کے نظریوں تک پہنچنا چاہئے۔

یہ زمانہ جب لارنس ان مسائل سے دوچار ہو رہا تھا اس کی اپنی زندگی میں بھی ایک اہمیت رکھتا تھا، اُس کے اندر بھی ایک تبدیلی پیدا ہو رہی تھی، وہ بالغ ہو رہا تھا۔ ذیل کی نظم میں اس دور کے چند خاص لمحوں کی کیفیت کو اُس نے عجب زود رو انداز میں پیش کیا ہے۔

اچھوتی جوانی

کبھی کبھی ———
جو زندگی ہے دیکھتی مری نظر کی چلمنوں کے پار سے،
لرزتی ہے مری زباں کے نغمہ فشاں سے،
اور ایسے جیسے اور لوگ کر رہے ہیں اپنی عمر کو بسر،
یہ کر رہی ہے ختم اپنی اک حیاتِ مختصر!
کبھی کبھی ———
یہ زندگی پھسل کے، دور ہو کے میرے نرم اختیار سے،
فضا میں آشکار ہوتی ہے برزینتِ جواں!
اور آہ سرد کھینچ کر میں سوچتا ہوں ناگہاں!

اور ایسے میری اجنبی سی چھاتیاں۔
بھی جاگتی ہیں نیند سے!
اور ایسے پتلی پتلی موجھلتے سینہ کے تلے،
ہویدا ہوتا ہے شروع نغمہ رواں!
مرا خموش اور خوابگوں شکم
بھی جاگتا ہے کہ کرے فتنہ خیزیاں!
مرا یہ نرم، پُرسکوں شکم
لرز کے جاگ اٹھتا ہے بیک ارادہ واثر!
پھر اس کے بعد خواہ مخواہ میری ایک اور ہستیٔ نہاں۔
ستادہ ہو کے مجھ سے کرتی ہے کلام سرخوشی؛
وہ کوئی دیو، خفتہ ہے جو بے حسی میں، جاگ کر،
مچل کے، کشمکش میں بہہ کے، دیتا ہے سزا مجھے!
ستادہ ہے وہ اور میں کانپتا ہوں اُس کے سامنے،
—"تو پھر بتا تو کون ہے؟" —
وہ بے زباں ہے مگر ہے گرم جوش اور وسیع! — میں تو اس کو پوچھ سکتا ہی نہیں،
—"تو کون ہے! تجھے ہے مجھ سے کام کیا؟"
تو اے کہ دیو ہیبت شکن! منور اور نور زن!" —
وہ کس قدر حسین ہے!
کوئی صدا نہیں، نہ چشم و دست اُس کے ہیں کوئی!
مگر زمین زندہ کا وہ شعلہ ہے کھڑا ہوا — بھڑک رہا —
ہے ایک آتشیں چٹان رات میں!
اور آہ! وہ اتھاہ بھید جانتا ہے، صرف وہ ہے جو سمجھتا ہے ہر ایک بات کو!

وہ ایک، وہ اکیلا ایک جانتا، سمجھتا ہے،
وہ نور اعتماد سے بھرا ہوا،
ستادہ ہو گیا کہیں سے، بے نشاں زمین سے؛
میں کانپتا ہوں اُس کے سامنے میں اگر
وہ شعلہ زن ہے اور رواں
کہ تیرہ منزلوں کو جلد جا ملے!
وہ ایسے ہے کہ جیسے روشنی کا اک ستون جس کے ارد گرد رات ہو لپٹ رہی
کہ جیسے جسم سیگوں سے پیرہن کھنچا ہوا!
اور اُس کی تیرہ روشنی فضا میں پھیلتی ہوئی ہے موج بحر کی طرح!
اور ایسے جیسے گردشوں سے لوٹ کر ستون ہی میں آکے پھر ٹھہر گئی!

مجھے بلا رہا ہے کیا؟
وہ ایک اور اکیلا اب مجھے بلا رہا ہے کیا؟
ہیں اُس کی پُروقار سولہوں خموشیاں صدا وس سے بھری ہوئی،
وہ کیا مری نظر کے پار چل رہا ہے ہو کے آنکھ سے نہاں؟
نسائیت کی ہے لپک کہ بید کی خمیدگی۔
جو اُس میں ہے رواں دواں؟

مسافر! آہ! آتشیں چٹان! کچھ نہیں ہے اس سے منفعت!
یہ تیری تابناک آرزو بنی ہے ایک موج درد کی!

ستون تیرہ، سرخ! میری ہمدمی کو بھول جا!
مرے سلوک سے تو اپنے دل میں کوئی غم نہ لا،
کہ میں کنوارے پن کے بندھنوں کی بے بسی میں قید ہوں!
یہ تیری اجنبی صدا مرے لئے خموش ہے!
جدا جدا —
ہم آہ و نالہ کر رہے ہیں ایک ریگ زار میں!
مجھے معاف کر کہ میں
رہا جو ہوتا حد قید و بند سے،
تو پھر خوشی سے لپٹ جاتا اُس نسائی گلستان میں،
کہ جس میں تیرا ادھر ادھر رقص بے قرار ہے نمود کے لئے؛
اے تیرہ آور گھمنڈی اور خمیدہ حسن! میں تجھے
یہاں تک آہ! پوجتا رہوں کہ اینٹھ جائیں یہ سرین لیکن اک ہجوم دہر
مجھ کو روکتا ہے اس طرح کی بات سے!
اُسی ہجوم دہر نے در بہشت بند کر کے راستے میں خاردار جھاڑیاں اُگائی ہیں!

میں تیری عظمت اور بلندیوں کو جانتا ہوں، آہ پر
ترا ستون آہنیں خلاؤں پر محیط ہے!

ستونِ نیرہ، آتشیں! مجھے معاف کر کہ میں ہوں، اور ہے جہاں کی
تلخ دشمنی!

جذبات کا یہ جسمانی احساس بھی لارنس کے لئے ایک تجربہ، ایک کشمکش ثابت ہوا سماج کے بندھن اور بلوغ کی آمد ——— اِن دونوں کی اُلجھن میں وہ مریم سے اپنے تعلقات کو پیچیدہ بنا بیٹھا۔ اور شاید اس ابتدائی اُلجھن ہی نے اُسے نئے راستے دکھائے۔

مشہور مغربی مصنفہ اتھیل میئن ایک جگہ لکھتی ہے کہ لارنس کے دل میں تہذیب و تمدن سے (مندرجہ بالا حالات کی بنا پر) نفرت پیدا ہوئی اور اُس نے اس سے منہ موڑ کر میکسیکو کے ویرانے میں غیر آلودہ زندگی کی تلاش کی کوشش کی۔ اُس کی موت کے بعد سر کومہ نے اُس کے متعلق خامہ فرسائی کی ہے اور اُس کی محدود طاقتوں کا ذکر کیا ہے لیکن اُنہوں نے اس بات کو نظر انداز کر دیا ہے کہ لارنس اپنی محدود طاقتوں کے باوجود ان نکتہ چینوں کی کامیابیوں سے کہیں زیادہ عظمت رکھتا تھا۔ جنس کے مسئلے میں اس کا انہماک حقیقتاً زندگی کے مسئلے میں انہماک تھا۔ اس بات پر بھی لوگوں نے بہت لے دے کی ہے کہ وہ اپنی مختصر زندگی کا زیادہ عرصہ ایک مریض انسان تھا اور مرض نے اس کے زاویہ نظر کو زہر ملا بنا دیا تھا۔ لوگوں کو یہ بات اس شخص کے متعلق کہنے کی جرأت ہوتی ہے جو اپنی آخری تحریروں میں پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ اگر ہمیں جینے کی تربیت دی جائے بجائے اس کے کہ ہمیں کمانے اور صرف کرنے کے ڈھنگ سکھائے جائیں تو ہم سب کا گذارہ پچیس شلنگ ہفتہ وار میں بہت عیش و مسرت کے ساتھ ہو سکتا ہے۔" اگر لوگوں کو کھانے پہننے کو مل جائے تو انہیں روپے کا کبھی خیال ہی نہ آئے۔ اگر وہ جس طرح اُن کا جی چاہے ناچیں کودیں اُچھلیں گائیں تو انہیں نقد کی ضرورت کا احساس ہی نہ ہو۔ وہ عورتوں کا دل بہلائیں، عورتیں اُن کا دل بہلائیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ لوگوں کو سادگی اور عریانی کی تعلیم دی جائے۔ اگر وہ پرانے رواج کے مطابق مل کر گانا اور ناچنا سیکھ لیں اور اپنے بیٹھنے کے لئے پہلے لوگوں کی طرح خود ہی کوئی چیز گھڑ کر تیار کر لیں اور اپنے اپنے نشان خود ہی کاڑھ لیں تو روپے کی انہیں کوئی ضرورت نہیں رہتی۔ اور صنعتی مسئلے کا واحد حل یہی ہے لوگوں کو سکھاؤ کہ وہ ہنسی خوشی زندگی بسر کر سکیں اس طرح کہ انہیں روپے پیسے کی ضرورت ہی نہ محسوس ہو لیکن یہ بات بہت مشکل ہے۔ ساری دنیا آج کل ایک ہی رستے پر چلنے والے دماغوں کی مالک ہے۔

لارنس ہمیشہ ایک نئی دنیا کے خواب دیکھتا رہا۔ اور اس دنیا کو آباد کرنے کے لئے اس کا خیال ہمیشہ پہلی پرانی قدیم ترین اشیاء کی طرف منتقل ہوتا رہا۔ کیونکہ اُس کے خیال میں مہذب انسان تکلفاتِ تمدن کی وجہ سے کائنات سے ہم آہنگ نہیں رہا۔ اس کے برعکس ایک فطری انسان کو کائنات سے ایک پُر اسرار تعلق اتحاد ہوتا ہے۔ اگر دنیا اس اعتقاد کی مخالف ہے تو کیا پروا! ہر ایک بڑا آدمی، ہر ایک حقیقی طور پر مذہبی ہستی اپنے دل کی گہرائی میں ایک شعلے کا نور دیکھتی ہے، لارنس بھی اپنے اس خیال کے شعلے کا نور دیکھ رہا تھا! اور آس پاس کی دنیا میں اُسے دکھائی دیتا تھا کہ ہر انسان تعلقات کے چکر میں گرفتار ہے۔ گویا ایک عام سماجی انسان کی طبعی تحریکات پر روپے پیسے کا بارِ گراں ہے۔ اور اس کے علاوہ ایک اور بندھن بھی اُسے جکڑے ہوئے ہے۔ یہ بندھن سماجی رائے کا ہے، دنیا کیا کہے گی! اور دنیا کے کہنے کی پروا نے لوگوں کو گویا اپنے آپ میں نہیں رہنے دیا۔ لیکن اس کے مقابل میں لارنس کی دنیا کا فطری انسان کیسا ہوگا؟ لارنس کا فطری انسان اپنے جسم کے بل پر اور اپنے جسم کے لئے زندہ رہے گا۔ لیکن صرف جسم ہی کا سہارا کافی نہیں ہے جسم اور دماغ کی طاقتوں کا جو گہرا تعلق ہے وہ بھی لارنس کے پیشِ نظر تھا۔

اندھیرے اور اجالے کا مسئلہ لارنس کا خاص موضوع تھا اور وہ نور کی طاقت کے مقابلے میں تاریکی کی طاقتوں کا حامی تھا۔ رات جو تاریکی کو گود میں لئے ہوتی ہے۔ اُس کی نظروں میں وقت کا بہتر حصہ تھی کیونکہ یہ عشق و محبت کا وقت ہے بلکہ آندرے موروا کے لفظوں میں رات ہی کے زرخیز سایوں میں طبعی تحریکات چھاؤنی چھائے بیٹھی ہیں، اُس کے خیال میں رات کو دیر سے بستر کی طرف رجوع کرنا ایسی ہی غلطی ہے جیسی کہ دن کو دیر تک سوئے رہنا۔ بلکہ ہر مرد اور عورت کو دن چڑھتے ہی بیدار ہونے پر مجبور کر دینا چاہئے خصوصاً حساس اور ذہین افراد کو۔ اور صبح ہوتے ہی سب کو کام کاج میں مشغول ہو جانا چاہئے۔ اگر ہر شخص اس اصول پر کاربند ہو جائے تو موجودہ تہذیب و تمدن میں سے عصبی امراض یک قلم کافور ہو جائیں۔

لیکن اعتقاد کے اُس شعلے کو از سرِ نو کس طرح اپنے قریب کیا جائے، تہذیب زندگی نے ہمیں اُس سے بہت دور لا پھینکا ہے، اب کونسا ذریعہ اختیار کریں کہ وہی "نورِ سیاہ" پھر ہمارے دلوں میں چمک اُٹھے؟ لارنس اس کے جواب میں کہتا ہے کہ اپنے آپ کو آزاد چھوڑ دو، زندگی کی ہر بات کو قوتِ ارادی کے ضبط میں لانے سے ہاتھ اٹھا لو، اپنی شعوری زندگی پر قابو پانے کی کشمکش سے کنارہ کشی کر لو، اپنے آپ کو بہتا جانے دو اور رات کو خیرباد کہو

بھیدوں والی اچھوتی رات کو، اور انجانے پن میں ڈوب جاؤ۔ کیونکہ انجانے پن میں ڈوب جانے ہی سے تم بہت کچھ جان کر اُبھرو گے۔ گویا دوسرے لفظوں میں لارنس چاہتا تھا کہ لوگ موجودہ سائنس کی دنیا سے جس میں تحقیقات اور تجربے کو حد سے زیادہ دخل ہے گریزاں ہو جائیں۔ کیونکہ اس کا اعتقاد تھا کہ پرانی دنیا کے لوگوں کی بھی ایک ایسی ہی مکمل سائنس جیسی آجکل کے لوگوں کی ہے اور وہ سائنس وہ علم ضروریات زندگی کے لئے بالکل کافی تھا۔ اس علم کو استعاروں میں سکھایا جاتا تھا یہی علم دیومالا کے استعاروں میں لوگوں کے حافظے محفوظ رکھتے تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ تقریباً تمام قدیم عظیم ممالک کی دیومالا کے قصے ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ گویا لارنس پرانی مذہبی رسوم پرانے ناچوں اور پرانے اجتماعی گیتوں کا معتقد تھا۔ لیکن یہ باتیں آج کل کی دنیا میں ہر کسی کو میسر نہیں آسکتیں اور اسی لئے لارنس لوگوں کو ذہنی زندگی سے ہٹ کر جسمانی زندگی کی طرف متوجہ ہونے کی تبلیغ کرتا ہے۔ تاکہ تہذیب کے مختلف بندھنوں نے طبعی تحریکات کی تکمیل کے راستے میں جو رکاوٹیں ڈال رکھی ہیں وہ دور ہو جائیں لیکن اس بات کا خیال رہے کہ جس طرح وہ رکاوٹ کو برا کہتا تھا۔ اسی طرح وہ نفس کی حد سے بڑھتی ہوئی ریشہ دوانیوں کے بھی خلاف تھا جسمانی خواہشات کو پورا کرنا بھی اس کے لئے ایک مذہبی نوعیت رکھتا تھا اور محبت اس کے نزدیک دو افراد کے مستقل اور متواتر باہمی سمجھوتے کا نام تھا، ایک ایسا سمجھوتہ جس کے ذریعے سے دو جسم اور دو روحیں ایک ہو کر ایک انعقاد، ایک اطمینان، ایک ہم آہنگی کو حاصل کر سکیں۔

اور اب اس کی چند نظمیں:۔

بیراگ

آہیں بھرو اب، آہیں بھرو سب، آہیں بھرو!
آنسو بہاؤ، روتے جاؤ، آہیں بھرو!
سورج موت کی نیند میں ہے اور سرشے ہے آکاش کی ایسے
جیسے دُھندھلا سے اُبلے!

چاند میں بھی اب جان نہیں ہے، چاند میں بھی اب جان نہیں۔
چاند جو دھرتی کو پیلی پیلی کرنوں کے جال اُڑھاتا تھا،
چاند میں بھی اب جان نہیں ہے، چاند میں بھی اب جان نہیں!
موت کی نیند میں، موت کی نیند میں سارے منارے سوتے ہیں،
رات کے اندھیارے نے ہلو توں میں اسمارے سوتے ہیں،
گنتی کے باہر جگراتوں سے بے چارے سوتے ہیں!
آہیں بھرو اب، آہیں، آہیں، آہیں بھرو!
آہیں بھرو اب، آہیں بھرو سب، آہیں بھرو!

دھرتی، کنواری دھرتی میں بھی جان نہیں،
ہم نے اُٹھا رکھی ہے ارتھی دھرتی کی،
وہ دیکھو، لپٹیں اٹھتی ہیں ختیا سے بھی،
آہیں بھرو اب، لمبی، سسکتی آہیں بھرو،!
آنسو بہاؤ گرم اور نمکین آنسو بہاؤ!
آنسو بہاؤ، روتے جاؤ، آہیں بھرو!
آہیں بھرو اب، آہیں بھرو سب، آہیں بھرو!
لیکن آہیں بھرنے پر بھی دل میں نہ اپنے رنج کرو!
دل میں نہ اپنے رنج کرو آہیں نہ بھرو آہیں نہ بھرو!
مایا ہے، سب جگ مایا ہے وجیون مایا، جائیں بھی!
جینا جب مایا ہے پیارے! موت بھی مایا ہی ہوگی!

بے چارہ، بے کس

مرے سامنے اور مرے آس پاس، لا انتہا ہے فضائے جہاں!
پلٹ کر جو دیکھوں تو ڈر جاؤں میں،
فضا کا ہے احساس ہر سو رواں،
ڈراتی ہے حیراں کر کے مجھے
کہ سطح سمندر پہ کشتی کوئی
ہو جیسے کسی آدمی کو لئے،
اور اس کو سمندر کی بے باک موجیں پریشان کرتی ہوں تنہائی میں،
سہارا نہ ظاہر ہو کوئی جہاں!

بساط جہاں پر اکیلا ہوں میں،
اسی فکر میں بس اُلجھتا ہوں میں
کہ اب کون سی چال چلتا ہوں میں!
مرے ہاتھ لرزاں ہیں جیسے خزاں میں ہوں دوش ہوا پر کئی پتیاں!

سنبھلا جو خود کو یہ احساس تھا۔
بہاتی ہے اک بادِ مرمر مجھے،
اُڑاتی ہوئی جا رہی ہے کدھر
نہیں مجھ کو معلوم، —— اور کس لئے!
نہیں مجھ کو معلوم —— کچھ بھی نہیں!

ہے غفلت، جسامت مرے آس پاس،
میں اس درجہ بے نام اور ہیچ ہوں۔
اگر فاصلہ دو قدم طے کروں،
تو گم گشتہ دو بارہ ہوتا ہوں میں!

میں کیسے پھر اس دل کو سمجھاؤں گا۔
کہ ممکن ہے یہ، میں کروں گلہ ہی!"
میں بس ایک ذرّہ ہوں تنکا ہوں ایک،
اِس آندھی میں ہر سمت ہے جو رواں!

سپنے کی اُلجھن

یہ کیا چاند ہے پاس روزن کے، آتشا بوا، لال، بہتے لہو سا؟
مرے پاس کوئی نہیں ہے؟
نہیں سیج کے پاس کوئی؟
مگر پھر یہ زینے پہ آہٹ ہے کیسی؟
کہ ہے کوئی طائر جو روزن کے باہر یونہی پھڑپھڑاتا چلا جا رہا ہے؟

ابھی ایک لمحہ ہی پہلے
مجھے اُس کے گرم اور نازک لبوں کا اک احساس کامل ہوا تھا،
یہ آکاش پر چاند گرم اور لہو سا چمکتا ہے ایسے کہ جیسے
وہ نہیں گرم و نازک لبوں کا۔
مجھے اک اشارہ سا کرتا ہے گویا!

اور اب لو، اُسے —— چاند کو بادلوں نے ہے گھیرا،
اور افسردہ دکھیا اندھیرا!
فضا پر ہے طاری!

یونہی دھم کو ماضی میں حاصل ہوئے تھے جو بوسے
ابھی بیٹھ جائیں گے تہ میں!

غلط میں نے سمجھا! غلط میں نے سمجھا!

محبت کا گیت

مجھے کچھ نہ کہنا اگر میں کہوں، بھول جاتا ہوں آوازِ تیری،
یہ نغمہ سحر کا!
اگر میں کہوں، بھول جاتا ہوں آنکھیں کہ جن سے ہویدا ہے جذبہ نظر کا!
مگر پھول جس وقت کھلتے ہیں باغوں میں، اُس دم ہی میں سمجھتا ہوں
جادو میں ہستا ہے اور جنوں میں'
نرا نرم، اُجلا سا چہرہ مرے جذبۂ دل سے پُرشوق سینے پہ لگ کر ہنسا ہے،
اور اُس وقت گم ہو کے بہجت کے نازک فسوں میں،
روش پر گلستاں کی استادہ رہتا ہوں، جیسے کسی نے کوئی بُت بنایا
ہوا ہے!

مگر اُس گلستانِ پُر درد کو چھوڑ کے میں
وہیں، اپنے تاریک خلوت کدے میں
اکیلے سے، درماندہ بستر پہ خاموش ہو کر۔
یونہی بیٹھ جاتا ہوں مضطر!
اور اُس وقت مہتاب کی نرم و نازک سی کرنیں جھلکتی ہوئی اور چھنتی ہوئی
روزنوں سے،
مرے دل کو افسردہ کرتی ہوئی، آتی رہتی ہیں بے رحم ظالم تواتر میں ہر دم!
بس دُکھتے ہوئے بازوؤں کو اُٹھاتا ہوں اُس دم،
میں پُرشوق و پُر درد سینے کو اپنے بڑھاتا ہوں اُس دم،
میں بھرتا ہوں آہیں اور آنسو بہاتا ہوں اُس دم،
اور اس طرح بے تاب و پژمردہ ہو کر
اُسی بسترِ غم کی بھیگی تہوں میں
یونہی لیٹ جاتا ہوں اُس دم!

یونہی، رات ساری میں بستر میں کروٹ بدلتا ہی رہتا ہوں ہردم،
اور اُس خواب کے سیلِ نازک میں بہتا ہوں ہردم،
کہ ہارا ہُوا، نیم وا اک دہن ہے،
ہے احساس انگیز، مجھ کو ملا ہے!
ہے پہلو میں میرے، جو سینہ جوانی کے پھولوں سے سنورا ہُوا ہے!

گہرے دوست

وہ بولی: "یہ کیا تمہیں میری محبت کی نہیں پروا؟"
اور اُس کے ہاتھ میں اک آئینہ دے کر کہا میں نے
"نوازش ہو کہ یہ باتیں اسے پوچھو،
نوازش ہو اگر یہ تم بڑی سرکار سے پوچھو!
تعلق دل کے جذبے یعنی کمزوری سے ہو جن کا
وہ باتیں تم بڑی سرکار سے پوچھو!"
یہ کہہ کر آئینہ میں نے دیا اُس کو۔

وہ آئینے کو میرے سر پہ ہی دے مارتی، لیکن۔
نظر آئینے میں جب عکس پر اپنے پڑی اُس کی
تو اک لمحے کو وہ حیراں ٹھٹھک کر رہ گئی اک دم،
اور اتنے میں وہاں سے میں سرک آیا!

ادھ ڈھلا پن

دھندلکے میں تاروں کی کرنوں کے ننھی سی ندی تھرکتی ہوئی، چھپاتی ہوئی،
اور آکاش کی زرد، حیران نگاہیں،
یہی ہے یہی، کیف و بہجت کی محکم بلندی!

ہر اک چیز خاموش، خوابوں میں سوئی،
ہر اک درد، چنتا، اذیت کے جھرمٹ ——
دھندلکے میں تاروں کی کرنوں کے کھوئے ہوئے ہیں!

فقط اب دھندلکا ہے تاروں کا، ندی کی نازک سی سرگوشیاں ہیں،
یہی نرم چیزیں یونہی جلوہ افشاں رہیں گی ہمیشہ!

اور آخر محبت جو تھی دل میں پنہاں، ہوئی آشکارا!
میں اِس دل کے جذبے کو گویا مجسم، نظر میں لئے ہوں،
ستاروں کی دھندلی شعاعوں کی مانند ظاہر ہوئی ہے محبت کی ہستی!
نہ پہچانا پہلے محبت کو میں نے
کہ درد اور اذیت کے جھرمٹ مزاحم ہوئے تھے
مرے فہم و احساس کے راستے میں!

بُلاوا ہو تم اور جواب اُس کا ہوں میں،
تمنا ہو تم اُس کی تکمیل ہوں میں،
تم اک رات ہو اور میں اُس کا ہوں دن!
کسی اور شے کی ضرورت نہیں ہے،
مکمل ہے ہر شے!
کسی شے کی حاجت نہیں ہے،
مہیا ہے سب کچھ!
یہ تکمیل ہے! تم ہو، میں ہوں، (بھلا اور کیا ہو!)
کسی اور شے کی ضرورت نہیں ہے!

مگر پھر بھی حیران ہوں میں کہ ہر چیز کے باوجود اک اذیت ہے ہم کو!
تمنائیں جتنی تھیں پوری ہوئی ہیں، مگر کوئی حسرت ہے ہم کو!

اندھیرے میں

اٹھے جیسے دھرتی کے سینے سے نغمہ،
کوئی [illegible] سا داغ، بے نام، دھندلا،
گلستانِ انجم کا مضطر شگوفہ،
بلندی پہ لٹکے ہوئے نیلگوں شامیانے میں تھرکا!

اندھیرے میں کوئی صدا پست و مغلوب ہو کر خموشی میں کھوئی،
کہ آنسو تھے افسردہ دل کے،
کہ جس طرح بے چارہ طائر جھپٹ کر اُڑے آشیاں سے
جو تکتے تھے شکاری!

"یہ کیا کر رہی ہو؟
"یہ کیا بات ہے؟ رات آدھی ہوئی، آؤ، یاں آؤ، سو جاؤ آکر؛
مجھے بھی جگایا،
"مگر یہ ہوا کیا کہ تم رو رہی ہو؟
اکیلا ہے بے چین بستر!"

"میں ڈرتی ہوں تم سے، میں ڈرتی ہوں، ڈرتی،
کوئی بات ہے تم میں جو مجھ کو تم سے گریزاں ہے کرتی"

"نہیں، تم نے سپنا ہے دیکھا! ابھی نیند اور ہوشمندی کے ہو درمیاں تم!
یہاں آؤ، آؤ یہاں تم!"

"نہیں، جاگ اٹھی ہوں میں تو،
"یہ تم ہو کہ انجان بنتے ہو، ظالم ہو، مجھ پر نہیں مہرباں تم!"

"مری جان! ——"

"یہ تم ہو تم ہو! تمہیں ظلم کرتے ہو مجھ پر!
تمہیں میرے سینے پہ بوجھل گھٹا بن کے چھائے ہو، سایہ فگن ہو،
"یہ سایہ مجھے مار ڈالے گا آخر!"

"چلو آؤ، مانو! ——"

"نہیں، میں تو ہوں شیفتہ زندگی کی!
"مجھے تم نہ دو گے کبھی چین اور سکھ سے جینے ——
"مجھے، جو تمہیں زندگی کا اجالا ہے دیتی!"

نہیں بات کوئی، مری جاں! فقط نیند آئی ہے مجھ کو،
"یہ رائی کا پربت بناؤ نہ ہرگز، مجھے پاس ہے اک تمہارا!"

"مصیبت ہے، بیزار کرتا ہے مجھ کو یہ برتاؤ ہر دم تمہارا،

"میں کب تک سہوں گی یہی سرد مہری!
مرے سامنے بھوت بن کر کھڑے ہو، مجسم اندھیرا!"

"مجھے کہہ رہی ہو! یہ باتیں مجھے کہہ رہی ہو!"

"یہ برتاؤ، مجھ سے محبت ہے میری!؟
"بنایا ہے بےچارگی کو مری تم نے پیرن سہیلی!"

"مری جان! بزم اور سہانی ہے رات، اور ہر ناکہ بھاتی ہے تم کو،
"ہر اک بات کا ایک موقعہ ہے، اتنا تو سوچو!"

"میں بیزار ہوں، آہ! اس رات کی تیرگی مار ڈالے گی مجھ کو!"

"مری جان! راحت کے رستے پہ چلتا ہو کوئی ۔
"تو پہلو میں تاریکیاں اس کے ہوتی ہیں غم کی!
"تو پھر کس لئے ہے یہ شکوہ شکایت، یہ تیزی، یہ تلخی؟"

"نہیں، میں مسرت میں رقصاں ہوں ہر دم،
مجھے اس جہاں میں نہیں ہے کوئی غم؛
نہیں، میں تو ہوں شیفتہ زندگی کی!"

"تو پھر بھی پلٹ کر جو دیکھو تو بنتی ہیں تاریکیاں ہی مقابل نظر کی!
"اصول جہاں ہے کہ سایہ ہمیشہ
رہے گا جہاں بھی ہو بہجت کا نغمہ!"

"ستمگر ہو، ظالم ہو، تم تو اجالے کو آلودہ کرتے ہو تاریکیوں سے!"

......

"مگر میں تمہارے اندھیرے میں ہر دم ملاتا ہوں اپنا اجالا،
تمہارے اور اپنے اجالے ملاتا ہوں ہر دم،
تمہاری فغاں میں ملاتا ہوں اپنا تبسم!
"شب تار کی خامشی میں ہر انسان ہستی کو کھو کر،

ہوا اُس کا، پیڑوں کا، بے چین دریا کا ہمراز ہو کر،
بُھلاتا ہے جینے کی کاوش کو دل سے،
مٹاتا ہے درماندگی کے سفینے کی کاہش کو دل سے!"

"مجھے اس سے کیا واسطہ! میں تو ہستی ہوں اپنی ہی یکسر!

"چلو آؤ سو جائیں، بھیدوں کے پھولوں سے اس دم ہے لبریز بستر!
مرے پاس آؤ، مرے جسم سے جسم اپنا لگاؤ!
تم میرے پہلو میں کرنوں کا گُچھا، مجھے تیرہ و تار سایہ بناؤ!
چلو آؤ اب ضد کو چھوڑو، شب تار نے کچھ ڈرایا ہے تم کو!
سنو، دیکھو، دریا کا مضطر فسانہ
سناتا ہے جو پیچ کھاتے ہوئے ہم کو روز و شبانہ!
یہ جنگل، یہ بہتے ہیں مجھ کو،
نگاہوں سے روپوش ہو کر نجانے کن اسرار سے یہ لدے ہیں!

"مجھے اپنی ہستی کو پانے دو، میں آہ! دریا نہیں اور نہ ہوں پیڑ یا
جنگل میں جو سب اُگے ہیں!"

"مجھے چوم لو! — کس قدر سرد ہو تم! تمہارے یہ ننھے شگوفے
یہ دو بلبلے برف کے ہیں!
مجھے چوم لو! — جانتی ہو کہ تم سے
مرا تشنگی دُور کرنا،
تمہیں اپنے جذبوں سے مخمور کرنا،
اندھیرے میں سب کچھ بھلانا،
ہے آرام و راحت کا مخزن!
ہے بہجت کا پُر شوق مسکن،
شب تار میں شعلۂ سینگوں کو بجھانا!
مگر بھول جاؤ مری جاں! نہیں کوئی پروا کہ نیند آ رہی ہے!
یہاں میں ہوں، تم ہو، یہ بستر ہے، ہر ایک شے بھولتی جا رہی
ہے!"

آج تک لارنس کی نظموں کے کل بارہ مجموعے شائع ہوئے ہیں
سب سے پہلا مجموعہ ۱۹۱۳ء میں "محبت کی نظمیں" کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس کے بعد ۱۹۱۶ء، ۱۹۱۷ء، ۱۹۱۸ء، ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۲ء میں پانچ مجموعے شائع ہوئے۔ ۱۹۲۳ء میں نظموں کا وہ مجموعہ شائع ہوا جس کا عنوان "پنچھی پشو اور پھول" ہے۔ اور پھر ۱۹۲۹ء اور ۱۹۳۲ء میں تمام نظمیں یک جا شائع ہوئیں اور ۱۹۳۳ء میں آخری نظمیں۔

ان تمام نظموں میں "پنچھی، پشو اور پھول" کو چھوڑ کر (اگرچہ یہ بھی لارنس کے تجربات ہی ہیں) لارنس کی تمام اچھی نظمیں کم و بیش اُس کی جنسی زندگی کی کشمکش کو ظاہر کرتی ہیں۔ "اچھوتی جوانی" کی سوانحاتی اہمیت کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ یہ نظم اگرچہ لارنس کے دوسرے مجموعے "عشقیات" میں بھی شامل ہے اور پھر ۱۹۳۲ء کی مجموعی نظموں میں بھی، لیکن ان دونوں نسخوں میں ایک نمایاں فرق ہے اور خود لارنس کے بیان کے مطابق وہ جو بات اس نظم میں کہنا چاہتا تھا اُسے پورے طور پر کہنے کے لئے اُسے بیس سال لگے ہیں۔

اُس نظم میں جس کا عنوان "اندھیرے میں" ہے اُس کے مریم سے نزدیک اور دور ہونے کی تگ و دو کا بیان ہے۔ اور "بے چارا بے کس" (نہ چاہے جانے والے کا گیت) بھی اُس کی آپ بیتی ہے۔ اس نظم میں اس کے ذہن پر صرف ایک خیال چھایا ہوا ہے: "اگر مریم نہ ملی تو کس قدر تنہائی ہوگی!"

"گہرے دوست" اُس کی آخری نظموں میں سے ہے۔ اس مجموعے کی نظمیں زیادہ تر تہذیب و تمدن کے خلاف احتجاج کا حکم رکھتی ہیں اور اس نظم میں بھی وہ حقیقتاً نسائی حسن کی اُس آلودگی کی طرف طنزیہ اشارہ کرتا ہے جو خالصتاً تہذیب کے تکلفات کی پیداوار ہے۔ "بیراگ" اُس کے آخری دنوں کی اُس ذہنی کشمکش کو ظاہر کرتی ہے جو اُسے موت کے قرب سے محسوس ہو رہی تھی۔

"پنچھی پشو اور پھول" کی کسی نظم کا ترجمہ میں نے نہیں کیا۔ کیونکہ اگرچہ فن اور شعریت کے لحاظ سے یہ بھی لارنس کے شہ پارے ہیں لیکن ان کا منظوم ترجمہ ایک ناممکن سی بات ہے۔

یہ تو ہوئی نظموں کی متعلقہ وضاحت۔ اب ذرا شاعری کے متعلق بھی لارنس کی ایک آدھ بات سُن لی جائے۔ اُس کے خیال میں شاعری یا تو دور کے آنے والے دور کی آواز ہوتی ہے، ایک نفیس اور شبیہوں آواز یا ماضی کی آواز ہوتی ہے، گہری اور شاندار لیکن ان کے علاوہ وہ ایک

اور قسم کی شاعری کا ذکر بھی کرتا ہے یہ ان باتوں کی شاعری ہے جو ہمیں آپنے سامنے دکھائی دیتی ہیں۔ ماضی ایک مکمل چیز ہے اور مستقبل محض ایک اندازہ لیکن حال ایک ایسا ہیولیٰ ہے جس کی نہ کوئی ہیئت ہے نہ اس میں کوئی تنظیم یا ترتیب اور اسی لئے حال کی شاعری میں، سامنے دکھائی دینے والی باتوں کی شاعری میں بھی یہی سب خصوصیت موجود ہوتی ہے۔ لارنس کہتا ہے کہ اُسے ماضی کے اتھاہ ساگر کی ضرورت نہیں، نہ اُسے مستقبل کے بے پایاں سمندر کی حاجت ہے اُسے صرف معین "حال" درکار ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اُس کی نظموں میں "ہوچکے" کے گئے گذرے یا آنے والے پہلو کی کوئی بات موجود نہیں ہے۔ اُس کی نظموں میں صرف "حال" کا احوال ہے۔

میراجی

عکسِ پیہم

آبِ رواں کے اندر، میں چاند دیکھتا ہوں

اور پھر ذرا ٹھہر کر، اک بار سوچتا ہوں

کیا ہے نظامِ عالم؟

خود چاند آئنہ ہے، سورج کی روشنی کا

اِک عکس بن گیا ہے، خورشید بھی کسی کا

عالم ہے عکسِ پیہم!!

شرف الدین احسن

راز و نیاز

عشق کہتا ہے کہ دِل بے خود و مستانہ بنے

حُسن کہتا ہے کہ ساغر بنے پیمانہ بنے

عشق کہتا ہے کہ دِل سوزِ محبت میں جلے

حُسن کہتا ہے رُخِ یار کا پروانہ بنے

عشق کہتا ہے کہ دِل عقل سے ہو مستغنی

حُسن کہتا ہے کہ مجنوں بنے دیوانہ بنے

عشق کہتا ہے کہ دل میں رہے تصویرِ صنم

حُسن کہتا ہے کہ کعبے میں ہی بتخانہ بنے

عشق کہتا ہے کہ دل مجھ سے ہو آباد مدام

حُسن کہتا ہے کہ یہ میرا ہی کاشانہ بنے

عشق اور حُسن کا کیا کہنا مگر اے نازش

یہ مناسب ہے کہ دل دونوں کا افسانہ بنے

نازش رضوی

چار نظمیں

مُہرِ سکوت!

ڈر تھا میں کہہ دوں کہیں الفت کا راز
ثبت کر دی ہے مرے محبُوب نے
مُہرِ اک بوسے کی ہونٹوں پر مرے

حیرانی

معصُومی کا پیارا سُپنا! عریاں سا دوشیزہ جلوہ!
دل کانپا لرزا تھرّایا!
کیوں حسرت پانی پانی ہے؟ اِک مبہم سی حیرانی ہے!

تجدید!

جاگ اُٹھی پھر دل کی بستی پھر بازار میں میں نے دیکھی
ایک معطّر رنگیں ساری!!

ایک منظر

سنہرے سپنوں کی وادیوں سے حسین سایوں کا لے کے پردہ
اُفق سے پوشیدہ ہو رہا ہے سپیدۂ شام رفتہ رفتہ
لطیف کہرے میں ہولے ہولے غروب یوں ہوگئی ہے دُنیا
کہ جس طرح سے کوئی مصوّر حسین تخیّل میں کھو گیا ہو!

اعجاز [illegible]

غزل

جیون جیوتی جاگ رہی ہے چھوڑ بہانے، چھوڑ بہانے | تن من دھن کی بھینٹ چڑھا دے کیوں سپنوں کے تانے بانے؟

آئے کون تجھے بہلانے، پہنچے کون تجھے سمجھانے؟ | بھرمایا ہے پریم سدھا نے، اُلجھایا ہے پریم کتھا نے۔

اک گھمسان کا رن ہے دنیا جاگ سپاہی، جاگ سپاہی | اُٹھ کر اک دو ہاتھ دکھا دے دشمن بھی جوہر پہچانے

آنکھیں کھول کے دیکھ جگت کو رنگ رنگ کی نیاری باتیں | ایک ہی چاند مگر آتا ہے تیری راتوں کو چمکانے

نا امیدی کے آکاش پہ چمکا ہے آشا کا ستارہ | مندر میں اک دیوداسی سج کر آئی ناچ دکھانے

موہ کا پنچھی دل میں بیکل ڈول رہا ہے جنگل جنگل | تو ہے اک نادان شکاری ٹھیک نہیں ہیں تیرے نشانے

ساغر اُلٹے مینا ٹوٹی میخواروں کی سنگت چھوٹی | ڈھونڈنا اب بیکار ہے تیرا خالی ہیں سارے میخانے

اُس کے دامن میں سو لہریں آئیں جھکولے جائیں جھکولے | ہاں کہہ کر پھر جائیں پل میں کوئی مانے کوئی نہ مانے

دیکھ کہ ندی اب گدلی ہے جاگ کہ دنیا ہی بدلی ہے | موج کی راہ سے ناؤ ہٹا لے آئے ہیں تیرے محل کو ڈھانے

پریم کا ساتھ ہے دُکھ کا دارو کیسا سکھ ہو پاس نہیں تو، | آنے لگی گیسو کی خوشبو پیتا ہوں رس کے پیمانے

مانا دُکھ میں کھویا ہوا ہوں، تم سمجھے ہو سویا ہوا ہوں

دھرتی کو آکاش بنا دوں آئے ہو تم کس کو جگانے؟

"م"

غزل

چھڑتے ہیں وحشت کے افسانے، ملتے ہیں جب دو دیوانے
کیسا جنوں اور عقل کہاں کی یہ بھی فسانے وہ بھی فسانے

تم بھی جھوٹے میں بھی جھوٹا جگ کی ساری ریتیں جھوٹی ہیں
مسجد، مندر، اور کلیسا دل بہلانے کے ہیں ٹھکانے

برکھا رت کی آئی جوانی بادل روئیں برسے پانی
کوئی نہیں ہے سنگی ساتھی ہم بیگانے تم بیگانے

دل اور آنکھ کی دنیا ساری آنکھ اور دل کے جادو سارے
بزمِ جہاں کے میخانے میں کچھ شیشے ہیں کچھ پیمانے

دو نظروں کے ملنے سے جو ہوتی ہے پیدا کیفیت
اُس کو میرا دل ہی سمجھے اُس کو میرا دل ہی جانے

جس کو دیکھو لوبھ کا بندہ، حسن شکاری، دولت پھندہ
ڈھونڈھ رہی ہیں جس کو نگاہیں اب وہ کہاں ہیں لوگ پرانے؟

چہرہ پھیکا، آنکھ میں آنسو، دل افسردہ بالِ پریشاں
آج نہ جانے بیٹھے ہیں کیا سوچ کے جی میں یہ دیوانے

روزِ ازل سے راز رہا ہے روزِ ابد تک راز رہے گا
رازِ محبت کیا کوئی سمجھے رازِ محبت کیا کوئی جانے

دنیا بھر کی تقدیروں کا ردّ اک چاکِ گریباں میں ہے
لاکھوں مسائل سلجھاتے ہیں ایک ہی لمحے میں دیوانے

فاش ہے اس پہ رازِ بہاراں جانتا ہے وہ بھیدِ خزاں کا
ایک سیانے نے یہ کہا ہے اک دیوانہ سو فرزانے

عشق کے مارے دیوانے اس حال کو اختر اب آ پہنچے
کہتے ہیں جو لفظ بھی منہ سے بنتے ہیں اس سے لاکھ فسانے

اختر ہوشیار پوری

دھوکا

ناجو۔ غریب کا بچہ تھی مگر پیدائش اچھی ہونے کی وجہ سے اپنی ساتھ والیوں سے بڑی معلوم ہوتی تھی۔ کیا کھایا کیا پیا۔ مگر ہاتھ پاؤں ایسے تھے کہ دیکھنے والا جانے کہ دودھ ہی ملیدے پر پلی ہے۔ صورت پر بھی وہ نشانی تھی شہزادیاں شرما جائیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ جوانی پر اگر تاج پہن لے گی تو بے جوڑ نہ لگے گا۔ کھیت میں ککڑی اور گھر میں لڑکی کی باڑھ مشہور ہے دیکھتے دیکھتے بڑی سی ہوگئی۔ سات ہی آٹھ برس کے سن میں یہ حال تھا کہ ماں کے پہلو میں بیٹھتی تھی تو آدھی بی بی معلوم ہوتی تھی۔ باپ ناظمہ کہتے تھے۔ ماں جب تک جئیں ناجو ہی پکارا کیں۔ گیارھواں برس رہا ہوگا کہ باڑھ پر آگئی۔ بارھویں برس بھرنا شروع ہوئی۔ تیرھویں برس ایسی ہوگئی کہ ماں باپ سے نگاہ بھر کے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ ماں کو بیاہ کی فکر پڑ گئی۔ اس زمانے میں بڑی بڑی امیرزادیوں کو نہیں جڑتا۔ غریب کس کھیت کی مولی ہے۔ یہ جوانی یہ خوبصورتی دیکھ کر ماں باپ کی چھاتی پہاڑ ہو جاتی۔ مگر یہاں نگاہ بھر کے دیکھنا مشکل تھا۔ باپ صرف اچٹتی نظر ڈال لیتے تھے۔ ماں کہتی تھی دیکھتے ہو اب کیا کسر ہے۔ کچھ نسبت کی بھی فکر کرو گے کہ یہ کالا پہاڑ یوں ہی چھاتی پر رکھا رہے گا۔

دیوانی عدالت کے منصرم صاحب کی دوسری بیوی کا بھی انتقال ہوگیا تھا۔ ہمدردوں نے جوڑ توڑ ملا کر بیاہ کروا ہی دیا۔ منصرم صاحب کا سن چالیس برس کے لگ بھگ رہا ہوگا۔ چالیس بیالیس برس کا مرد بڈھا نہیں کہا جاتا۔ اُن کی کاٹھی بھی اچھی تھی۔ مگر پندرہ اور بیالیس میں اچھا خاصہ فرق ہوتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ بیاہ کے بعد ناجو نے ہمجولیوں میں بیٹھ کر کبھی اپنے سن کی ایسی باتیں نہیں کیں ہمیشہ بیچاری بہر کم چپ کو لئے دے رہیں۔ سولہ برس کے سن میں بھی مزاج اور حوصلہ ۶۱ برس والے کا ایسا رہا۔

ایک بڑے بدصورت ادھیڑ میاں اور ایک خوبصورت کمسن بیوی راستے میں چلے جاتے تھے۔ بیوی نے ایک کتوں کی جوڑی دیکھی جو دونوں ایک ہی طرح کے تھے۔ میاں سے کہنے لگی ایسا جوڑ ملتے بھی کم دیکھا ہوگا۔ انہوں نے جواب دیا ساتھ رہتے رہتے پہلے خیالات اور پھر صورت ملنے جلنے لگتی ہے۔ بیوی کا جی دھک سے ہوگیا۔ کہنے لگی میری جان کیا ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔

منصرم صاحب شریف خوبصورت نیک نام آدمی تھے۔ گھر کے بھی خوش حال کہے جاتے تھے۔ شاید تیسری شادی نہ کرتے مگر اولاد کی تمنا اور بیماری حیرانی میں ہمدرد کی ضرورت نے مجبور کر دیا۔ لڑکی والوں کو فرض سے سبکدوشی حاصل کرنے کی مصلحت نے سن کے فرق کا زیادہ خیال بھی نہیں آنے دیا۔ حالانکہ ناجو کی ماں ہی نے نسبت پسند کی تھی۔ مگر اسی کے ساتھ تنہائی میں میاں سے دبی زبان میں سن کے فرق کا بھی ذکر کیا۔ انہوں نے یہ کہہ کر بات ٹال دی کہ سب کچھ تو کسی کو بھی نہیں ملتا۔ ناجو کو پھندناں سی دلہن بنی دیکھ کر ماں باپ کا کلیجہ ٹھنڈا ہوا۔ وہ سونے کا گہنا پہن کر سونے میں گوندھ گئیں۔ چاہنے والا میاں پایا ہر طرح کا چین آرام ہاتھ آیا۔ منصرم صاحب بھی خوش ہیں۔ خضاب جلد جلد لگنے لگے ناجو نے جانا دنیا میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ میاں بیوی کے راز پردے کے اندر کی بات کسی کو کیا معلوم مگر خدا کو دیکھا نہیں عقل سے پہچانا ہے۔ اگر سن کے تقاضے سے شوخی اچپلاہٹ کا جواب شائستگی سے ملتا رہا ہوگا تو یقیناً ناجو اُس کو بھی زندگی کے کھیل کے ضروری قاعدوں میں سمجھتی رہی ہوگی۔

پیٹ کا ملا کر ناجو کی شادی پندرھویں سال ہوئی تھی۔ زن جوان و مرد پیر۔ سبد بیار و بچہ بگیر۔ ڈیڑھ برس میں ماں بھی بن گئی۔ مگر کیا کچھ ہوا؟ چوہیا کا بچہ پیدا ہونے کے بعد بڑی دیر تک تو رویا نہیں۔ لیڈی ڈاکٹر نے بڑی بڑی ترکیبیں کیں تب کہیں چیں چیں آواز نکلی اور پھر ہمیشہ کے لئے بند ہوگئی۔ ناجو البتہ بہت دن بیمار رہی۔ اس کے بعد ہمیشہ کے لئے قابلہ کی روزی کا سامان ہوگیا۔ مگر ناجو کے بچہ نہ ہونا تھا نہ ہوا۔ ناجو تیس اکتیس سال کی تھی کہ رانڈ ہوگئی۔ منصرم صاحب پنشن

لے کر اپنے وطن چلے گئے تھے۔ تقریباً دو ہی برس آرام کیا تھا کہ دوامی آرام گاہ میں پہنچ گئے۔ ناظمی بیگم کے ماں باپ پہلے ہی چل بسے تھے اب منصرم صاحب بھی ختم ہو گئے۔ ناظمی بیگم تن تنہا رہ گئی۔ جائداد رکھ کر یک سوئی سے زندگی بسر کرنا کسی کے امکان میں نہیں۔

یہ جلئے پردہ دار رانڈ۔ منصرم صاحب ناظمہ بیگم کے لئے ہر طرح کی مضبوطی کر گئے تھے مگر پھر بھی بغیر ہمدرد کے کیسے کام چلتا۔ منصرم صاحب کے اعزا کو مرحوم کی جائداد سے کچھ ملا نہیں تو انہوں نے کوئی واسطہ بھی نہیں رکھا۔ محلے میں ایک لڑکا رہتا تھا بیس اکیس برس کا سن رہا ہوگا۔ مگر نہایت شریف لائق اور سلیقہ مند، محلے کے رشتے سے منصرم صاحب مرحوم کو چچا کہتا تھا اور جب سے وہ پنشن لے کر آئے تھے یہ پیش پیش رہتا تھا۔ میں اصلی نام تو اس کا بتا نہیں سکتا قصے کی ضرورت سے صغیر احمد کہہ لیجئے۔ یہی میاں صغیر اڑے وقت میں کام آئے اور خدا ترسی سے اب کام کر دیا کرتے تھے۔ دن بھر میں اگر چار مرتبہ ضرورت ہو تو یہ اپنے کام کا ہرج کر کے حاضر رہتے۔ جھوٹوں بلا بھیجو تو غریب ڈیوڑھی میں پردے کے پاس موجود ان کو اپنا ذاتی کام زیادہ تھا بھی نہیں۔ اکیلے تھے۔ ہاں باپ نے بُودگی اچھی خاصی چھوڑی تھی دو چار مکانات بھی تھے۔

اُسی میں سفید پوشی سے کٹتے تھے۔ شادی ہو چکی تھی مگر بیوی سے بنی نہیں چوتھی چالے کے بعد سے پھر ایک نے دوسرے کی صورت نہیں دیکھی تھی تین برس ہونے کو آئے تھے مگر ملاپ کی کوئی صورت نہ تھی۔ بگاڑ کا مرض عارضے کی طرح جڑ پکڑ گیا تھا۔ جب صغیر ناظمہ بیگم کے اتنے کام آتے تھے تو یہ کہاں کی گئی گذری تھیں کہ اُن کا حال پوچھ کر اظہار ہمدردی نہ کرتیں۔ مقدمات معاملات کی باتیں پردے کے پاس آہستہ آہستہ ہوتی تھیں اس لئے بعد کو یگانگی کی باتیں بھی اُسی مدھم آواز میں ہوا کرتی تھیں باتیں کون تھیں صرف یہی کہ "کیا کیا کرتے ہو؟ اپنی بیوی سے ملاپ کیوں نہیں کر لیتے؟ گھر آباد ہو جائے۔ پردیس میں ایک ہمدرد بڑھ جائے۔ صغیر اس کے جواب میں صرف یہی کہتے تھے کہ اب ملاپ قیامت میں ہوگا اور گوریاں لے کر چلے جاتے تھے۔ صغیر کے چلے جانے کے بعد ناظمی بیگم کے دل کے اندر کوئی ان سے باتیں کرنے لگتا تھا۔

سنئے صاحب۔ میں کہانی لکھتا نہیں ہوں کہانی کہتا ہوں اگر آپ کو اس میں دو بدو باتیں کرنے کا مزا نہیں آتا تو اس بکواس کو در مدفان کیجئے اگر اچھی معلوم ہوئی تو سنتے جائیے کہ ناظمہ بیگم صاحبہ کی سلیم عقل نے کیا کہا اور دل کی دبی ہوئی خواہش نے کیا کہا اور اُن کے حس باطن نے عقل اور خواہش سے کیا کچھ کہلایا۔

اندر والا۔ سنو بی ناجو تم اور صغیر پردے سے ملے گھڑیوں باتیں کیا کرتے ہو اور جو کوئی کچھ کہہ دے۔

ناجو۔ مجال پڑی ہے جو کوئی کچھ کہہ دے۔ کریں تو ڈر کس کا۔ پہلا مجھ سے آٹھ برس چھوٹا اور پھر وہ مجھ کو چچی کہتا ہے۔

اندر والا۔ یہ تو ٹھیک ہے مگر تم جب دیکھو اس کی بیوی کا ذکر کیوں کیا کرتی ہو۔

ناجو۔ تو اس میں کیا ہرج ہے اگر میرے خیال دوسرے ہوتے تو اُس کی بیوی نگوڑی کا ذکر کیوں آتا۔

اندر والا۔ تم ہنسنے زیادہ لگی ہو۔

ناجو۔ ہنسی آتی ہے تو کوئی کیا کرے۔

اندر والا۔ پہلے کیوں نہیں ہنستی تھی۔ ہنسی سو پہنسی پرانی مثل ہے۔

ناجو۔ ہوا کرے مثل میرے بلے سے ہزار جوان صدقے اتارتے ہیں۔ خیر اب اس کا ذکر ہی کیا ہے۔ جب جوانی میں اس طرح کے خیالات نہیں آئے تو اب بڑھاپے میں اس کا کیا ذکر ہے۔

اندر والا۔ بڑھی تو تم بالکل نہیں ہو۔ اِس کو تم بھی سمجھتی ہو۔

ناجو۔ میرے تو ایک لڑکا بھی ہوا ہے۔ اُس کی بیوی تو ویسی ہی پٹیا ہے۔

اندر والا۔ مگر وہ صورت میں تو تمہارے تلووں کے برابر نہیں ہے۔

ناجو۔ یہ تو ٹھیک ہے مگر اس سے ملاپ تھوڑی ہونے کو ہے۔

اندر والا۔ اور جو ہو جائے۔

ناجو۔ ہو جائے تو ہماری جوتی سے لتڑ سے پاپوش سے۔ مگر نہ ہوتا تو اچھا تھا۔

اندر والا۔ یہ دیکھو۔ کہلا نا۔ یہی تو میں کہتا تھا۔

ناجو۔ ہوگا بُوا پھر ہم کیا کریں۔ نیند نہیں آتی تو یہی سوچنے لگتے ہیں کوئی نہ کوئی خیال آئے گا تو ضرور۔

اندر والا۔ اور اسی کو سوچتے سوچتے سو بھی جاتی ہو۔

ناجو۔ ہاں سو جاتے ہیں۔ سو جاتے ہیں۔ تب نہیں تو تب سو جاتے ہیں۔ منصرم صاحب تو ہیں نہیں ہمیں ڈر کس کا پڑا ہے۔ کر ہی لیں تو ہمارا کوئی کیا کرے گا۔

اندر والا۔ ہاں اب ٹھیک راستے پر آگئیں۔ یہی تو میں کہتا تھا کہ جو کچھ کرو ہم سے صلاح مشورہ لے کر کرو ہم تمہارے ساتھ ہیں۔

واقعی اگر صغیر کے ساتھ ہو جائے تو بے جا نہیں گو اور سب
باتوں کا آرام رہا مگر ہم سن کے ساتھ کو بھی ترس گیا۔

دنیا اور باتوں میں نکمی ہو ہوشیار نہ ریاضی خوب جانتی ہے۔
یعنی ایک اور ایک جوڑ کر دو کا نتیجہ نکالنے میں کبھی غلطی نہیں کرتی۔ دو ہی چار
دنوں میں باندھنوں باندھنے والی دنیا نے ہوئی اور بن ہوئی باتوں کو اکٹھا
کر کے اچھا خاصہ پلاٹ تیار کر لیا۔ جس کی ہیروئن ناظمہ بیگم اور ہیرو میاں صغیر
ٹھہرے۔ شدہ شدہ یہ بات ناظمہ کے بھی کان تک پہنچی۔ بے چاری بہت
پریشان ہوئی مگر تو کر نہیں خدا کے غضب سے ڈر۔ تمام زندگی ایک سرے
سے دوسرے سرے تک نگاہ کے آگے پھر گئی۔ وہ موتی کی آب جو آج
تک ویسی کی ویسی ہی تھی مدھم پڑتی دکھائی دی۔ آپ لوگ ناظمہ کے دلی راز
سے ہزار واقف ہوں پھر بھی عورت کی بات سمجھنے کا کون دعوے کر سکتا ہے
آج منصرم صاحب کو یاد کر کے ناظمہ ایسا روئی کہ شاید کبھی نہ روئی ہوگی۔
آج ضروری کام کا ہرج بھی ہو گیا۔ مگر صغیر کو نہیں بلایا۔ دوسرے دن وہ خود
آئے۔ رفتہ رفتہ اندر والے نے صلاح بتائی۔ بی ناجو آبرو پر سے جان قربان
ہے۔ تم ہزار پاک صاف بنی رہو مگر دنیا بے دوکہ لگائے نہ چھوڑے گی اگر
اس کو ہرانے کی کوئی ترکیب ہے تو یہی کہ نکاح پڑھوالو۔

نازنین اپنے منہ سے کیا کہتیں مگر اس کا انتظام کچھ مشکل نہیں
تھا کہ چھیڑ اُدھر ہی سے شروع ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور دشمنوں کا
منہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔ اچھا ناظرین! اب ٹہلئے یہاں سے کھسکئے!
غریب ہندوستانی عورت۔ شرم کے مارے کٹے جا رہی ہے۔ دوسرا
نکاح بے چاری نے نہ معلوم کن اسباب کن مجبوریوں سے کیا۔ اور
آپ ہیں کہ پردے کی باتوں کی ٹوہ لگانے کو اڑے ہیں۔ میں ہرگز نہ بتاؤں
گا۔ میرا گلا بھی کٹ جائے تب بھی کوئی ایسی بات منہ سے نہ نکالوں گا کہ صبح کو آپ
خیر صلاح کے بہانے آئے اور مسکرا مسکرا کر اس کو دیکھئے اور ہماری ناجو جھینپ
جھینپ کر گردن جھکائے۔ شرم کے مارے اس کا چہرہ سُرخ ہو جائے۔
خیر اتنا بتائے دیتے ہیں کہ ناظمہ کی زندگی دوسری طرح کی ہو گئی۔ اس کا حال
آئندہ معلوم ہوگا۔ فی الحال اتنا سمجھ لیجئے کہ منصرم صاحب اور صغیر احمد کا ساتھ
دو بالکل مختلف طرح کے ساتھ تھے۔ جو ایک دوسرے سے ویسے ہی
مختلف تھے جیسے ناظمہ کے بچپن کا زمانہ مختصر رنڈاپے کے زمانے سے تب
اگر سولہ برس کے سن میں کسٹھ کی تھیں تو اب تئیس برس کی عمر میں تیئس ہی کی
ہو گئی تھیں۔ جو پھبن جوانی کے شروع میں نہ آئی تھی وہ بے فصل کے

آم کی طرح سواد کھو کر اب آئی۔ یہ "حسن باطن" کا کھیل کون سمجھے۔ صغیر نے ناظمہ
کی جھلک یوں کبھی دیکھ لی ہوگی۔ اب با مراد دیکھا وہ صورت شکل وہ رعب
حسن وہ متناسب اعضا۔ وہ مزاج کی شگفتگی اور یہ ٹھہرے بھوکے بنگالی
آنکھوں میں چربی چھائی ہوتی۔ ساون کے اندھے کو ہرا ہی ہرا سوجھتا ہے
ایسے میں سن کا فرق کس کو دکھائی دیتا۔ البتہ دو چار برس کے بعد کچھ کچھ
فرق معلوم ہونے لگے گا۔ صغیر بڑی پیاری چیز تقدیر سے ہاتھ آ گئی ہے۔
ہاتھ پاؤں کے گوشت میں وہ سختی نہیں تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ اور کسی
بات میں بڑھاپا پاس نہیں آیا ہے۔

اندر والا۔ بڑھاپا تو نہیں ہے۔ مگر وہ پنڈے کا کساؤ کہاں ہے۔

صغیر۔ اجی محبت اصل چیز ہے۔ پنڈا ونڈا کہاں رہتا ہے۔

اندر والا۔ محبت الگ چیز ہے۔ جوانی الگ ہے۔ ان دونوں کو ملاتے
کیوں ہو۔

صغیر۔ جوانی کے دن کی ہے۔ محبت تو ہمیشہ کی ہے۔

اندر والا۔ ہے تو ہمیشہ کی مگر جوانی میں بھی مقناطیس کا اثر ہے۔

صغیر۔ محبت کے بھاری پتھر کو مقناطیس بھی نہیں کھینچ سکتا۔

اندر والا۔ اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ محبت جیسے پلاؤ۔ جوانی
جیسے بیسنی روٹی۔ ہم مانتے ہیں پلاؤ پلاؤ ہی ہے۔ بیسنی بیسنی ہی
ہے۔ مگر کیا روز روز پلاؤ کھا کر کبھی کبھی بیسنی کو جی نہیں چاہتا۔ وہ
بیسنی والی سندر ہٹ تو تمہاری بیوی ہی میں ہے۔

صغیر۔ میں نے کہہ دیا ہے کہ اور جو باتیں جی چاہے کیا کرو ہماری بی بی
کا نام ہمارے سامنے نہ آوے۔

اندر والا۔ ارے میاں تمہاری بیوی سے ہم کو مطلب! ہم تو جوان عورت
کا خواب دیکھتے ہیں وہ تمہاری بیوی ہو یا کوئی اور ہو۔ تمہاری
بیوی کا نام تو اس وجہ سے آیا کہ وہاں تک پہنچ آسان ہے،
اور کوئی بات نہیں ہے۔

صغیر۔ یار یہ تو ہے مگر ناظمہ غریب کی چھاتی پھٹ جائے گی اور مجھ کو بھی
چین نصیب نہ ہوگا۔

اندر والا۔ خیر چھاتی واتی تو کیا پھٹے گی۔ مگر ہے بڑی سخت بات اور
غضب تو یہ ہے کہ بغیر اُس کے بھی پیاس بجھتی نہیں معلوم ہوتی۔

صغیر۔ یار تو پھر کیا کریں۔

اندر والا۔ کرو گے کیا عاپ کرو۔

صغیر۔ اور ناظمہ کو کیا کریں۔

اندر والا۔ کچھ نہیں یہ بھی رہیں گی وہ بھی۔ یہ یہاں ہیں۔ وہ وہیں ہوں گی۔ اِن کا مقابلہ کوئی تھوڑی کر سکتا ہے اور وہ آئے گی تو تمہارے گھر میں رہیں گی۔ یہ اس گھر میں رہیں گی ان کا سامنا بھی تو نہ ہوگا

صغیر۔ بھئی ناظمہ سے چار آنکھیں کیسے کریں گے۔

اندر والا۔ سب کچھ ہو جائے گا۔ سنو میاں ہم ہوں کہ تم ہو کہ ناظمہ ہوں سب ٹھہرے حکم کے بندے۔ حُسن باطن کے وہاں سے جو اشارہ ہوگا وہ کرنا ہی پڑے گا۔ آپ کون ایسے خوبصورت تھے۔ کون بڑے روپے والے تھے کہ ناظمہ آپ پر ریجھ گئیں۔ حسن باطن نے کہا ناظمہ منصرم صاحب مرحوم کی محبت میں تم اپنے ہم سن کو ترس گئیں۔ لہذا تم کو حکم دیا جاتا ہے کہ صغیر کے ساتھ کر لو۔ ناظمہ نے کر لیا۔ اب تم کو حکم دیا جاتا ہے کہ ناظمہ کو کبھی نہ چھوڑنا مگر اپنی کمسن بیوی سے ملاپ کر لو۔ بندگی بے چارگی تمہارا بس ہی کیا ہے۔

صغیر۔ تو غریب ناظمہ دونوں طرف سے گئی۔ منصرم صاحب کے وقت میں پلّا ایک طرف جھکا تھا۔ اس بار دوسری طرف جھک گیا۔ دونوں کا نتیجہ اس غریب کے لئے بُرا ہی ہوا۔

اندر والا۔ یہ تو ہے ہی۔ ناظمہ کے ماں باپ نے جو شروع میں غلطی کی تھی اس کا ہرجانہ غریب ناظمہ کو بھرنا پڑا۔ تم نے سنا نہیں۔ خدا تین خطائیں معاف کرتا ہے بندہ بھی کبھی کبھی ایک آدھ خطا معاف کر دیتا ہے۔ مگر فطرت کے یہاں بھول چوک کی سزا ہمیشہ بھرپور ہے۔

محمد علی ردولوی

قطعات

اغیار سے توڑ کر تعلق اپنے سے نباہ کیجئے گا
ظاہر میں اگر ہو کوئی تکلیف باطن کی پناہ لیجئے گا

جہاں کو ناز ہے ہستی پر اپنی میں اپنی پستی پہ مر رہا ہوں
ملا ہے جب سے لطفِ خاکساری تنزّل میں ترقی کر رہا ہوں

میں اس دریائے موج زن میں مانندِ حباب اُبھر رہا ہوں
ہر سانس میں پھانس کی کھٹک ہے پھر بھی جینے پہ مر رہا ہوں

اُبھرا تو ہوں میں حباب بن کر پر چشم زدن میں نیستی ہوں
جاہل میں ہوں، کا مدعی ہے عارف کہتا ہی میں نہیں ہوں

امجد حیدرآبادی

بارش سے چند لمحے پہلے

رُت برسات کی دن ساون کا | سماں سہانا منظر بن کا
مطلع ابر آلود ہے کل سے | مست گھٹا موجود ہے کل سے
گہہ پورب سے گہہ پچھم سے | خلد سے گاہے گاہ ارم سے
چلتی ہیں مدہوش ہوائیں | نکہت در آغوش ہوائیں
بادل گھر گھر کر آتے ہیں | مل مل کر چھائے جاتے ہیں
جھاڑیاں اور اشجار یہ سارے | پودے سب ندّی کے کنارے
مست ہوا میں لہراتے ہیں | سیدھے ہو کر جھک جاتے ہیں

خود رو پھول سفید اور پیلے | پتّے گھنیرے اور رنگیلے
کھیت، چراگاہوں کا سبزہ | اور جنگل کا گوشہ گوشہ
فطرت کی رنگیں تحریریں | القصّہ سب جھوم رہی ہیں
بادل خود رقصاں ہوتا ہے | بارش کا ساماں ہوتا ہے

جنگل کے اس گوشے میں سے | بنسری کی آواز آتی ہے
میٹھی میٹھی اور رسیلی | دھیمی دھیمی اور سُریلی
احساسات میں کھوئی کھوئی | کیفیات میں سوئی سوئی

ہنستے پھول سے بڑھ کر رنگیں | میٹھے شہد سے بڑھ کر شیریں
روح کو فرحت سی دیتی ہے | اور دل کو موہے لیتی ہے
کالے بادل مست گھٹائیں | چلتے چلتے ٹھہر گئی ہیں

سامنے اک دوشیزۂ صحرا | طے کرتی ہے راستہ گھر کا
کالی زلفیں، چاند سا مکھڑا | دیوی ہے برسات کی گویا
سر سے سرکا ہے تھوڑا سا | ہلکا نارنجی دوپٹا
کتراتی، بچ بچ کے چلتی | کانٹوں سے بھی پھولوں سے بھی
بارش کے ڈر سے جاتی ہے | جلدی جلدی پاؤں اٹھائے
آخر طے کرتی ہوئی جنگل | آنکھوں سے بھی ہو گئی اوجھل
سامنے کوئی پرندہ جیسے | اڑتا اڑتا گم ہو جائے
اے لو زور سے گرجا بادل | بجلی چمکی برسا بادل

بڑھنے لگی ہے اُلجھن دل کی
کیا وہ لڑکی گھر جا پہنچی

اختر مُنیر

سچی کہانی

دلّی میرا آبائی وطن ہے۔ وہیں میں پیدا ہوا۔ والدین کیا سارا کنبہ غریب تھا مگر بے داغ، اجلے پوش، اپنی راہ چلنے والے، ملازمت پیشہ۔ ابھی دودھ چھٹنے کی نوبت بھی نہیں آئی تھی کہ ماں کی گود سے خدا نے محروم کر دیا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ دودھ چھٹا اسی بجوگ میں کہ وہ بیمار ہو گئیں۔ والد پردیس میں ایک ریاست کے نوکر۔ نوکری کرتے یا مجھے پالتے۔ قریب کے رشتہ داروں میں ایک خالہ تھیں بے اولادی ان کے سپرد کر دیا۔ خدا نے میری پرورش کا سامان تو کر دیا لیکن پھوٹی ہوئی قسمت کا کیا علاج! بسم اللہ کے گنبد میں تھا کہ والد کا سایہ بھی اُٹھ گیا۔ چوتھے برس خبر آئی کہ دشمنوں نے انہیں زہر دے دیا۔

اس وقت مجھے اتنے ہوش کہاں تھے کہ اس مصیبت کو سمجھتا۔ خالہ، خالو کو البتہ بہت صدمہ تھا۔ اس لئے نہیں کہ ان کا ایک عزیز قریب مر گیا۔ بلکہ اس لئے کہ میرے والد جو دس روپلے ماہوار مجھ کو بھیجا کرتے تھے وہ بند ہو گئے۔ کیونکہ ہمارے سارے خاندان میں سب سے زیادہ عزت انہی کے ہاں تھی۔ بیچارے سخت پریشان کہ ایک بڑا سہارا گیا لیکن مشیت ایزدی میں کیا چارہ۔ خدا سے لڑا نہیں جاتا۔ صبر شکر کرکے بیٹھ رہے میرے پہلے سے چاؤ چونچلے اب کہاں سے ہوتے۔ تعلیم و تربیت میں بھی قدرتی طور پر کمی آگئی۔

اس زمانہ کی دیسی ریاستوں کا دستور تھا کہ اگر کوئی قدیم ملازم مر جاتا تو اس کی جگہ اس کے کسی وارث کو ملتی۔ تھوڑے دن کے بعد وہاں سے اطلاع آئی کہ مولوی صاحب کا کوئی لڑکا ہو تو ریاست اس کو باپ کی جگہ دینے کے لئے تیار ہے۔ مگر میں کس قابل تھا۔ رشتہ داروں میں کسی نے کالے کوسوں جانا پسند نہیں کیا۔ کسی کو اتنی بھی توفیق نہ ہوئی کہ خط و کتابت سے تعلق تو قائم رکھتا۔ جواب تک نہ دیا۔ کم از کم میری یتیمی اور اپنی ناداری کا ہی حال لکھتے بھیجتے تو شاید میرا کچھ گزارہ مقرر ہو جاتا۔ یہ بھی نہ ہوتا تو آئندہ کے لئے حقوق تو قائم رہتے۔ پرانے خیال کے لوگ تھے۔ اپنی کملی میں مست اللہ کے سوا کسی کے آگے ہاتھ نہ پسارنے والے غرضکہ کچھ نہ کیا اور والد کی خدمات کا کوئی صلہ نہ چاہا۔

خالو صاحب کا شہر کے اچھے حافظوں میں شمار تھا۔ بچے پڑھاتے تھے۔ میں ہوشیار ہو گیا تو مجھے بھی اپنے ساتھ مکتب لے جانے لگے اور بغدادی قاعدہ شروع کرا دیا۔ اُن دنوں انگریزی تعلیم عام نہ تھی۔ ہوتی بھی تو ہمارا خاندان ٹھیرا مُلّانے قسم کا۔ کب گوارا ہوتا کہ ان کے بچے کرسٹانوں کا علم پڑھیں۔ انہوں نے بہت سے بہت یہ کیا اور یہی ان کے نزدیک بڑا اعلیٰ کمال تھا۔ کہ مجھے حافظ بنا دیا۔ اب اسے میرا شوق سمجھو کہ اردو فارسی میں بھی کچھ شُدبُد پیدا کر لی۔ قصے کہانیوں کی کتابیں خاصی رعانی کے ساتھ پڑھنے لگا۔ لیکن زمانہ جس چال سے بدل رہا تھا۔ اس کا ساتھ میں کس طرح دے سکتا۔ مدتوں میری حالت کنوئیں کے مینڈک کی سی رہی۔ کسی سے کچھ واسطہ نہیں۔ گھر سے نکلا مسجد میں اور مسجد سے گھر میں۔ خالو سیدھے مسلمان جنتی آدمی۔ دنیا کی انہیں کیا خبر کہ کس رنگ پر جا رہی ہے اور آنے والی نسلوں کو عزت و آبرو کی زندگی بسر کرنے کے لئے کیسی تعلیم دینی چاہیئے۔ مسلمانوں کی سی وضع بنا لینا ہی ان کی رائے میں سب کچھ تھا۔

ایسے ماحول میں ضروری اور معاشی تعلیم کہاں سے ہوتی۔ خالو جان کو علوم جدیدہ سے نفرت، انگریزی کا جہاں کسی نے نام لیا اور انہوں نے کفر کا فتوےٰ دیا۔ لمبی ڈاڑھیوں اور گھٹے ہوئے سر والوں کے عاشق تھے خواہ وہ مردہ شو اور جمعرات کی روٹیاں کھانے والے ہی کیوں نہ ہوں۔ جس دن انہوں نے مجھے اپنا خلیفہ بنا کر دو چار لڑکے میرے سامنے بٹھائے ہیں ان کی خوشی کوئی دیکھتا۔ گویا مجھ کو اپنی سلطنت بخش دی تھی۔ غرضکہ بس کودن کا کودن رہا۔ لیکن ہوا کے ساتھ رُت بدلا کرتی ہے۔ اگلے طور طریق خود بخود مٹتے جا رہے تھے، نئی روشنی نئی فضا برابر چھائی چلی جاتی

تھی۔ محض قرآن خوانی کے کتب بے رونق ہونے لگے۔ نرے حافظوں کو روٹیوں کے لالے پڑ گئے۔ خالو جان کا تو ذکر نہیں۔ آخری دنوں میں کیا کسی بدعت کے مرتکب ہوتے۔ میں البتہ پاس پڑوس کے لڑکوں کو دیکھ کر للچاتا اور سوچا کرتا کہ کیا میری تقدیر میں مکتب پڑھانا لکھا ہے۔ ایسی کوئی صورت نہیں نکلے گی کہ اس غوغوں سے نجات ملے۔

پندرہ سولہ برس میرے یونہی گذر گئے۔ دماغ تو ٹھٹھرا ہی تھا۔ اگر والد کے شباب کی بیداوار نہ ہوتا تو ہاتھ پاؤں بھی ٹھٹھر کے رہ جاتے کیونکہ ہمارے خالو جان کے ہاں مذہب قید خانے کی ایک کوٹھڑی تھی جس کے چاروں طرف شرک۔ بدعت اور بے دینی کے جال بچھے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے خیال میں اسلام کی جو حدیں بنا رکھی تھیں کسی کا پاؤں اُن سے چھوا اور خسرۃ الدنیا والآخرہ ہوا۔ خیر۔ بہرحال نہایت نیک آدمی تھے مسیں بھیگتے بھیگتے میں بالکل بدایوں کا مُلّا بنا رہا۔ آٹے دال کا بھاؤ تو ایک طرف مجھے واقعی یہ بھی معلوم نہ تھا کہ عورت مرد میں ڈاڑھی اور چوٹی کے علاوہ اور کیا فرق ہے؟ برابر کے لڑکوں سے وہ ملنے نہ دیتے۔ کوئی ایسی ویسی کتاب ہاتھ میں دیکھتے تو چھین لیتے۔ لیکن جب بہار کے دن آتے ہیں تو بلبل آپ ہی آپ چہکنے لگتی ہے۔ جوانی کے ولولے نکلنے کا راستہ خود بنا لیتے ہیں۔

شباب آیا اور پورے جوش کے ساتھ۔ مسجد کی روٹیوں میں یہ تاثیر مخصوص ہے۔ ابتدا میں گلستان کا پانچواں باب پڑھا تھا۔ اس کے سمجھنے کی چیز کہاں تھی جو سمجھتا۔ اب سمجھا۔ دوبارہ سہ بارہ پڑھتا اور مزے لیتا۔ رفتہ رفتہ خیال مجسّم ہونے لگا۔ رات کو حسن و عشق کے خواب دیکھتا اور صبح سے شام تک تعبیر کی فکر میں محو رہتا۔ گھر میں کوئی سامان نہ تھا۔ گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہ تھی۔ ادھر جوانی دیوانی دیواریں کودنے پر آمادہ۔ ہر وقت فساد کے لئے تیار۔ خدا بھی بڑا کارساز ہے۔ حافظ ہونے کی شرم رکھ لی۔ باہر جھک مارنے سے بچا لیا۔ خالو صاحب کی دور دراز کی ایک بہن تھیں۔ تعویذ گنڈوں پر اعتقاد رکھنے والی۔ آئے دن جھاڑ پھونک کی ضرورت پڑتی رہتی۔ اتفاق سے ان کے میاں دوسرے خیال کے تھے۔ عام مُلّا سیانوں میں نذر نیاز کا خرچ۔ پھر کوئی ایسا رازدار بھی نہ تھا کہ بھید نہ کھلنے دیتا۔ اس لئے جب کوئی اونچی نیچی بات ہو جاتی۔ خالہ سے ملنے کا بہانہ کیا۔ ذرا دل میں سُوار ہوئیں اور ہمارے ہاں آ گئیں۔ خالو صاحب بھی ان کی خاطر سے کچھ دم کر دیا کرتے اور اللہ کے نام کی برکت سے ان کا کام بھی ہو جایا کرتا۔ اس مرتبہ جو آئیں تو منجھلی لڑکی بھی ساتھ تھی۔ لڑکی کیا گلاب کا پھول۔ چھپکلی کلی۔ سارے کنبہ کا روپ اسی میں آ گیا تھا۔ یکا یک کا ملنا جلنا۔ خالو جان تو خاندان کے بزرگ۔ ان سے کون چھپتا۔ رہا میں تو مجھ سے بھی کچھ زیادہ اوٹ نہ تھی۔ آنکھ مچولی کا سا پردہ ہو جاتا۔ چھوٹا گھر رہا بڑا تا بڑ کا معاملہ۔ یکا یک جو میں گھر میں آیا تو چاند نکلا ہوا دیکھا۔ بیٹھنے کو تو لڑکی میرے آتے ہی پیٹھ موڑ چھپا کے سے کوٹھڑی میں دبک گئی۔ لیکن نظر کام کر چکی تھی۔ دل ہاتھ سے جاتا رہا۔ ہر وقت اداس رہنے لگا۔ محبت میں جتنا مزہ ہے اتنی ہی بدمزگی بھی۔ آٹھ پہر اس کی شکل سامنے رہتی۔ کسی کام میں جی نہ لگتا۔ چلتے پھرتے۔ بیٹھتے اٹھتے۔ سوتے جاگتے اسی کا خیال رہتا۔ سورۂ یوسف کے سوا کوئی سورت یاد نہ رہی۔

اللہ میاں کو بھی اس آگ میں پھونس ڈال کر بھڑکانا منظور تھا۔ اب جو وہ آتیں تو لڑکی بھی ساتھ ہوتی۔ میں کہاں ٹلتا بلکہ کسی نہ کسی بہانے تاک جھانک کرنے کی کوشش کرتا۔ وہ جو کہتے ہیں کہ عشق و مشک چھپا نہیں رہتا۔ خالہ میری نگاہیں تاڑ گئیں۔ ان کی پہلے ہی سے لڑکی پر نظر تھی۔ ادھر تو مجھ سے کہا "بیٹا کوئی گھر میں آئے تو اس طرح نہیں جم جایا کرتے۔ خدا جانے کسی کو کیا بات کرنی ہے۔ باہر چلے جایا کرو۔" اور اُدھر باتوں باتوں میں نسبت کا سلسلہ چھیڑ دیا۔ میں بھی برابر سُن گن لیتا رہتا تھا۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ خالو جان نے باقاعدہ پیام بھی بھیج دیا تو میری خوشی کا کیا پوچھنا۔ باچھیں کھل گئیں۔ ایک ایک گھڑی جواب کے انتظار میں گن گن کر گزارنے لگا۔ لیکن "تدبیر کند بندہ تقدیر زند خندہ" سہرے کے پھولوں کی کیاریوں کو ابھی آنسوؤں سے سینچنا تھا۔ چٹ منگنی اور پٹ بیاہ کس طرح ہو جاتا۔ ہماری غربت اور میری مُلّانی وضع نے پھانس ماری۔ کورا جواب آ گیا۔ بھلا ایک کھاتے پیتے گھر کی بیٹی مجھ جیسے قُل اعوذ کو کون دینے پر راضی ہوتا۔ خالی شرافت کو لے کر چاٹتے ہیں جس کا باپ ڈیڑھ سو روپے کا نوکر ہو وہ اپنے داماد کو مسجد میں سارے دن بچوں کے ساتھ مغز مارتے دیکھے۔

خالو جان اور خالہ جان تو خیر اپنا سا منہ لے کر چپ ہو گئیں مگر میں کیا بتاؤں کہ میری کیا حالت ہوئی۔ جی چاہتا تھا کہ کپڑے پھاڑ کر کہیں نکل جاؤں یا کچھ کھا کر سو رہوں۔ آہ! یہ آگ نہ اپنے لگائے لگتی ہے نہ اپنے بجھائے بجھتی ہے۔ کلیجے میں شعلے سے بھڑکتے اور میں سوختہ ہوا چلا جاتا۔ میرے پاس زر تھا نہ زور۔ صرف ایک زاری تھی وہ بھی دوسروں کا دل پگھلانے کے لئے نہیں۔ کیونکہ میں روتا بھی تو چھپ کر کہ کوئی دیکھ نہ لے۔ ابھی اتنے جنوں سے بے شرم نہیں ہوئے تھے۔

جب کوئی تدبیر بن نہ پڑی اور دل کسی طرح سنبھلتا نہ معلوم ہوا تو
ایک دن بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ آؤ خالو جان کے تعویذ گنڈوں کی کتاب تو دیکھیں
شاید کوئی عمل ایسا نکل آئے کہ لڑکی والوں کی ناک ٹوٹ جائے۔ "راہ بتخانہ نہ
ملی تو خدا یاد آیا" ہارے ہوؤں کی آخری منزل یہی ہوتی ہے۔ اس کام میں کوئی
پیسے کی ضرورت تھی نہیں۔ صرف یکسوئی، استقلال اور محنت چاہئے تو
محبت میں ان چیزوں کی کیا کمی پھر جب محبت بھی حرامکاری کے لئے نہیں
نکاح کی غرض سے ہو۔ چنانچہ تسخیر و حُب کے جتنے عمل مجھ کو ملے۔ ایک ایک
کر کے سب ہی کو میں نے نہایت پابندی کے ساتھ پڑھ ڈالا۔ خدا کا وعدہ جھوٹا
نہیں۔ جو مانگتا ہے پاتا ہے۔ البتہ مانگنے کی طرح مانگے۔ یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ
عملوں نے تاثیر دکھائی یا اللہ میاں کو ویسے ہی میرے گڑگڑانے پر رحم آگیا۔
بہرحال میری دعا قبول ہوئی۔ کچھ سامان بنے اور بیٹی والے خود بخود ڈھلے اور
ایسے ڈھلے کہ گویا دھار کھا لیا تھا۔ بات پکی کرنے کو خالو جان نے جنم سے اب
تک کی ساری کہانی سنا دی۔ یہ بھی کہہ دیا کہ لڑکا خالی گول کا چوہا ہے مسجد
میں لونڈے پڑھانے کے سوا اسے کچھ نہیں آتا۔ تمہاری لڑکی کو کمائی بنا
پڑے گا۔ مگر وہ کچھ ایسے بھٹی ہوئے کہ آخر ہاں کرتے بنی۔ مولویوں نے عرش
پر نکاح پڑھوا دیا تھا۔ دلہن بغیر دولہا کے گھر آئے کب رہ سکتی تھی۔ آٹھ
دن کے اندر اندر برات بھی چڑھی اور دلہن بھی گھر میں آ گئی۔

میری زندگی سہارے کی زندگی تھی۔ کھانے پینے، پہننے اوڑھنے
سب میں دوسروں کا دست نگر۔ لشتم پشتم گزارہ کر رہا تھا۔ شادی کے بعد
مجھے اپنے فرائض کا احساس ہوا۔ ایک سے دو ہو گئے تھے۔ خالو جان کی اوقات
معلوم۔ غریب دلہن کے چاؤ چونچلے کہاں سے اٹھاتے؟ اب میری جان کو یہ
دوسری علجان لگی۔ اصل تو یہ ہے کہ محبت میں اوّل سے آخر تک آفتیں ہی
آفتیں ہیں۔ دنیا بھی عجب گورکھ دھندا ہے۔ کبھی سلجھتا ہی نہیں۔ ایک ارمان
نکلا کہ چار اور موجود۔ شادی تو ہو گئی تھی لیکن خانہ آبادی کا سامان نہ تھا۔ یہی
سال دو سال کھانے پینے کے ہوتے ہیں۔ اور کچھ نہ سہی تو دو پیسے کے پھول
چار پیسے کا عطر، تیل، مسی، کاجل تو ہو۔ آدمی ہے کبھی چٹخے مٹخے کو بھی جی چاہتا
ہے۔ غریبی سے یہ مراد نہیں ہوتی۔ کہ کورے بامن جنیو اوڑھنا اور جنیو بچھونا۔
خالی چاہت سے تو نہ تن ڈھنکتا ہے نہ پیٹ بھرتا ہے۔

سارے دن فکر کرتا اور فکر میں گھلا جاتا۔ کسی قسم کی لیاقت ہوتی کوئی ہنر
جانتا تو کسی سے کہتا سنتا بھی اچھا معلوم ہوتا۔ حافظوں کی اس زمانے میں جیسی
قدر ہے سب جانتے ہیں۔ اس پریشانی میں کئی مہینے گزر گئے۔ کوئی صورت نہ
نکلی کہ اپنی کمائی کی پان چھالیہ ہی گھر میں لاؤں آخر ارادہ ہوا کہ کہیں باہر چلو۔ دیس
چوری پردیس بھیک، سنا تھا کہ ؎

عزت اسے ملی جو وطن سے نکل گیا
وہ پھول سر چڑھا جو چمن سے نکل گیا

شاید خدا کوئی سامان کر دے۔ چھوٹی موٹی نوکری مل جائے۔ ہچکچاہٹ تھی
تو یہ کہ بیوی سے کیا کہوں؟ اور خالو جان کو کیا بتاؤں۔ بے سوچے، اونٹ کی
طرح منہ اٹھا کر نکل جانا کیا معنی رکھتا تھا؟ صدقہ اس مسبب الاسباب کا، یہاں
بھی اس نے میری سنی۔ والد مرحوم کے ایک دوست حاجی نعمت تھے۔ کتب
فروش۔ مکتب کے لڑکوں کے لئے سیپارے خریدنے جو گیا انہوں نے حال پوچھا
میں نے اپنی ساری داستان شادی اور باہر جانے کا ارادہ بھی ظاہر کیا۔ پرانی وضع
کے ملنے والے تھوڑی دیر تو کچھ سوچتے رہے پھر بولے "میاں! اگر دلی سے باہر
ہی جانا چاہتے ہو اور تمہارا رزق خدا نے پردیس ہی میں اتارا ہے تو آگرہ چلے جاؤ۔
شیخ انوار الحق کا نام پوچھ لینا۔ ان کا چھاپہ خانہ ہے۔ مشہور آدمی ہیں میں خط
لکھے دیتا ہوں۔ وہ تمہیں ضرور اپنے ہاں نوکر رکھ لیں گے۔"

آگرہ سب کا جانا بوجھا، زیادہ دور بھی نہیں۔ پھر شیخ جی کے چھاپہ
خانہ سے دنیا واقف اس پر طرہ حاجی نعمت صاحب کی سفارش۔ خالہ، خالو
دونوں نے کوئی وہم نہیں کیا۔ بیوی کو البتہ رنج تھا۔ مگر میری اور اپنی آئندہ
خوشی کے لئے اسے بھی کوئی عذر نہ ہوا۔ سامان کیسا؟ دو جوڑے ایک مختصر سا
بستر لے۔ گلے میں قرآن شریف لٹکا ریل پر سوار ہو آگرہ پہنچا۔ واقعی شیخ صاحب
سچ مچ کے مسلمان تھے۔ حاجی جی کا خط پڑھ کر بڑے متاثر ہوئے۔ اللہ اللہ کیا
دوستیاں تھیں۔ آج وہ لوگ کہاں؟ اسی دن سے میرا دس روپیہ مہینہ کر
دیا اور میں ان کے بچوں کو کلام مجید اور اردو فارسی پڑھانے لگا۔

نوکر تو ہو گیا اور عزت کے ساتھ لیکن گھر سے بے گھر ہو، بیوی سے جدا
تقدیر کی خوبی کہ شادی ہوئی تو دیس نکالا ملا۔ دس روپلی میں الگ مکان لے کر
بیوی کو تو بلانے سے رہا۔ اللہ شیخ صاحب کی قبر کو نور سے بھرے۔ مجھے
مکدر دیکھ کر مجھ سے پوچھا کہ "میاں میں تمہیں کچھ پریشان سا دیکھتا ہوں" میرا
دل بھر آیا۔ آنسو نکل پڑے۔ اور جو تکلیف تھی ان سے بیان کر دی۔ اس
کے بعد وہ مجھ کو اپنے ہاں جو کتابیں چھپتیں ان کے پروف صحت کے لئے
دینے لگے۔ میری آمدنی پانچ سات روپے اور بڑھ گئی۔ پھر انہوں نے

یہ کیا کہ جب کاروبار کے سلسلہ میں کسی کو دلی بھیجنا ہوتا، مجھ کو بھیجتے۔ اسی طرح ادھر تو میری ایمانداری جزرسی اور حسن خدمت ان کے دل میں گھر کرتی رہی اور ادھر تقریباً ہر مہینہ مجھے بیوی سے ملنے اور اس کی دلدہی کا موقع مل جاتا۔ غرضکہ میں اب خوش تھا۔ مختلف قسم کی کتابوں کے پروف دیکھتے دیکھتے میری قابلیت بھی بڑھتی جاتی تھی۔ شیخ صاحب بھی مجھے اپنے لئے بکارآمد سمجھنے لگے تھے۔ ماحول کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ اب مجھے شوق ہوا کہ کچھ انگریزی اور حساب بھی سیکھنا چاہیئے کیونکہ چھاپہ خانے میں انگریزی پڑھے لکھوں کی زیادہ قدر تھی اور شیخ صاحب بھی دو چار مرتبہ کہہ چکے تھے کہ "میاں سلیم اگر تم انگریزی لکھنا پڑھنا جانتے بہی کھاتے کو سمجھتے تو میں تمہیں اپنے ہاں مینجر کر دیتا۔"

میرے پاس وقت تھا اور محنت کے لئے مضبوط قوی۔ میں نے دفتر کے بابو سے انگریزی پڑھنی شروع کر دی اور ساتھ ہی ساتھ جب فرصت ملتی چھاپہ خانہ کے محاسب کے پاس جا بیٹھتا۔ خدمت سے عظمت ہے۔ سال ہی بھر میں اللہ نے ایسا کیا کہ میں معمولی چٹھی چپاٹی لکھنے پڑھنے لگا اور حساب کتاب میں بھی ایسی مہارت پیدا کر لی کہ منیم جی پاؤں پھیلائے سویا کرتے اور ان کا سارا کام میں کیا کرتا۔ اب میری تنخواہ بھی تیس روپے ہو گئی تھی اور یہ بھی سنا تھا کہ شیخ صاحب مجھے اپنا داہنا ہاتھ بنانے والے ہیں لیکن قسمت کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔ کرم کے سب ساتھی ہیں جنم کا کوئی نہیں۔ گھر میں بال بچہ پیدا ہونے کے دن آئے۔ میں نے خالو جان کو لکھ دیا کہ "نواں مہینہ لگتے ہی مجھے اطلاع دے دیجئے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کو کوئی تکلیف نہ دوں جاپے کا سارا انتظام خود کر لوں گا۔" اس مطلب کے لئے میں نے شیخ صاحب سے کچھ رقم پیشگی لینے کا سوال بھی ڈال دیا تھا۔ اور انہوں نے ہاں بھی کر لی تھی۔

آدمی اپنے لئے سب کچھ چاہتا ہے مگر ہوتا وہی ہے جو اللہ میاں چاہیں۔ میاں کی مرضی نہیں ہوتی تو ساری کاریگریاں دھری رہ جاتی ہیں۔ قدرت کو تو عین کریل میں غلہ پھینکنا منظور تھا۔ محبت کا پھول کیا کھلتا، شاخ ہی پہ بجلی گرنی تھی۔ ایک رات کو میں نے خواب دیکھا کہ "دلہن کے ہاں لڑکا پیدا ہوا ہے لیکن ساتھ ہی ایک ایسا زلزلہ آیا کہ زمین پھٹ گئی اور زچہ بچہ دونوں اس میں سما گئے۔" مذہبی خیالات والوں میں خواب بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ڈر کر جو آنکھ کھلی، پھر نہ لگی۔ طرح طرح کے وہم آتے رہے۔ صبح کی نماز پڑھتے ہی چھاپہ خانہ جا پہنچا کہ شاید کام میں جی بہل جائے۔ شیخ صاحب کی عادت تھی

کہ مسجد سے نکل کر سیدھے دفتر آ بیٹھتے یا صحن میں ٹہلا کرتے۔ مجھے جو خلاف معمول اتنے سویرے آتے دیکھا ساتھ پریشان بھی پایا تو پوچھا "کہو بھئی! خیریت؟ آج اتنی جلدی آ گئے؟ گھر سے بال بچہ ہونے کی کوئی خبر تو ابھی نہیں آئی؟" میں خواب کی باتوں کو ان سے کیا کہتا۔ ہاں ناں کر کے ٹال دیا اور اپنے کام کرنے کی جگہ جا بیٹھا۔ جی کیا لگتا۔ دماغ پر تو توہمات سوار تھے۔ کبھی یہ کاغذ اٹھاتا کبھی وہ کتاب ٹٹولتا۔ اتنے میں گھنٹے نے نو بجائے دلی کی طرف سے ڈاک ایسے ہی وقت آیا کرتی تھی۔ گھبرا کر اٹھا کہ ڈاکیہ آتا ہی ہوگا۔ انتظار کرتے کرتے دہشت میں دروازہ کے باہر جا کھڑا ہوا۔ کھڑا ہوا ہی تھا کہ تار والا آتا دکھائی دیا۔ تار والے ایک دو روز چھاپہ خانہ میں آیا کرتے "سلیم چھاپہ خانہ میں کون ہیں، ان کا تار ہے۔" میں نے کہنے کو تو کہہ دیا کہ "سلیم میرا نام ہے۔ اندر آؤ" لیکن ہاتھ پاؤں قابو میں نہ رہے بڑی مشکل سے اندر آیا۔ تار کی رسید دی اور کانپتی ہوئی۔ انگلیوں سے لفافہ کھولا۔ اب جو پڑھتا ہوں تو بیوی کے وضع حمل کے بعد مرنے کی خبر۔ زمین پاؤں کے نیچے سے نکل گئی۔ آنکھوں تلے اندھیرا آ گیا۔ بہت سنبھلا۔ نہ سنبھل سکا۔ دھڑ سے گر پڑا۔ کہتے ہیں کہ شیخ صاحب نے انسانیت اور ہمدردی کا حق ادا کر دیا۔ کئی کئی حکیم ڈاکٹر بلائے۔ جب تک مجھے ہوش نہ آ گیا برابر میرے سرہانے بیٹھے رہے۔ آخر جب میں نے آنکھ کھولی تو کیا دیکھتا ہوں شیخ صاحب کرسی پہ موجود ہیں اور میں ان کے بستر پہ۔ بابو کے ہاتھ میں تار۔ گویا اب تک انہیں یہ بھی خبر نہ تھی کہ حادثہ کیا ہوا۔ تار کا مضمون سن کر انہوں نے گردن ہلائی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ پڑھی اور بزرگانہ انداز سے میرے سر پہ ہاتھ پھیر کر کہنے لگے "عزیز من! اللہ کو یاد کرو، مشیت ایزدی میں انسان کا کیا دخل۔ ہم تو امانت دار ہیں۔ اس کی چیز تھی۔ اس نے لے لی۔ مسلمان ہو اور خدا کے فضل سے حافظ۔ صبر و شکر کا ثواب بہت بڑا ہے۔"

یہ کہتے کہتے ان کی آواز بھرا گئی۔ میرا دل بھرا چلا آتا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ کسی کے گلے سے لگ کر خوب روؤں۔ ہاتھ پھیلا دیئے۔ شیخ صاحب اولاد والے تھے۔ انہوں نے اپنے بچوں کی طرح مجھے اپنی چھاتی سے چمٹا لیا۔ آپ بھی روئے اور میرا جی بھی ہلکا ہونے دیا۔ دو چار منٹ کے بعد بولے "کہو اب کیا ارادہ ہے؟ گھر جانا چاہو تو انتظام کر دوں۔" میں نے کہا "قبلہ! گھر تو اجڑ گیا۔ کیا صورت لے کر جاؤں، اور کس کو دکھاؤں۔ دیکھنے والی ہی نہیں رہی۔ میرا ٹھکانہ آپ کے قدموں کے سوا کہاں ہے۔ ہاں ایک دفعہ دلی سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہونے جاؤں گا۔ اپنی مردہ حسرتوں کو خاک میں ملا ہوا بھی

دیکھ لوں "۔

شیخ صاحب نے میری خواہش معلوم کر کے اور کچھ کہنا فضول سمجھا فوراً میرا بستر بند ھوا یا۔ ایک آدمی میرے ساتھ کیا کہ بحفاظت مجھے گھر پہنچا دے۔ گاڑی میں سوار کرانے کو خود باہر تک آئے۔ چلتے وقت سو روپے دیئے اور کہا برخوردار! خرچ سے تنگ نہ ہونا۔ ضرورت ہو اور منگا لینا۔ یہ تمہارا گھر ہے۔ کوئی جلدی نہیں۔ دس دن میں پندرہ دن میں جب تمہاری طبیعت درست ہو جائے آجانا "

گھر آیا۔ دیوانوں کی سی حالت۔ ایک ایک کا منہ دیکھتا اور روتا۔ لوگ سمجھاتے مگر کچھ سمجھ میں نہ آتا۔ کچی چوٹ تھی۔ اندر ہی اندر ہوک اٹھتی اور تلملا اٹھتا۔ قبر پہ پہنچا۔ اس مٹی کے ڈھیر پر گر پڑا لپٹ گیا۔ نہ جانے کیا کیا بکواس کرتا رہا۔ آنسو کہاں تک بہتے۔ تڑپتے تڑپتے نڈھال ہو گیا تھا۔ آخر صبر سا آچلا۔ قبرستان پہ نظر ڈالی۔ ہزاروں مائی کے لال اسی طرح پڑے سوتے تھے۔ فاتحہ پڑھی۔ دل ذرا ٹھیرا۔ رات ہو چلی تھی گھر آگیا۔ کدھر جاتا۔ کیا کرتا؟ لیکن یہاں در و دیوار روتے ہوئے دکھائی دیئے۔ ان کی ہر چیز دیکھتا اور کپڑے پھاڑنے لگتا۔ تھوڑی دیر تک تو کلیجا پکڑے منہ اوندھائے پڑا رہا۔ جب زیادہ بیچین ہوا تو مسجد میں جا بیٹھا اور صبح تک قرآن شریف پڑھا کیا۔ نماز سے فارغ ہو کر پھر قبرستان کی راہ لی۔ اب میرا یہ معمول ہو گیا کہ علی الصباح ان کی قبر پہ جا بیٹھتا۔ مغرب کے وقت تک برابر قرآن شریف پڑھتا رہتا اور چراغ جلے واپس آتا۔

اللہ کے نام کی برکت اور میرا خلوص ان کی روح کو وہ آزادی نصیب ہوئی کہ چوتھے پانچویں دن ہی کے بعد سے وہ میرے خواب میں آنے لگیں۔ میرے اپنے اضطراب میں بھی بہت سکون ہو گیا تھا۔ جب رات کو ان کا خیال کر کے لیٹتا۔ آنکھ بند ہوتے ہی انہیں اپنے پاس دیکھتا۔ روز نئے نئے لباس میں آتیں۔ قسم قسم کی باتیں کرتیں۔ دنوں یہ سلسلہ جاری رہا اور میں سمجھنے لگا کہ اللہ میاں نے دنیا کی آنکھوں سے اوجھل اب ہماری روحوں کی شادی کر دی ہے اور مادی خوشیوں میں میرا حصہ نہیں رہا اس لئے دنیا سے بیزار ہو جانا قدرتی تھا۔ نوکری اور نوکری کا خیال تو ایک طرف جینے کی آرزو بھی نہیں رہی تھی۔ جینے کی تمنا ہوتی بھی تو کس کے لئے؟ عالم ارواح میں شادمانی اور کامرانی ان اسباب پر منحصر نہیں۔ وہاں تو صرف رب العزت کی مہربانی چاہیئے۔ جی تو ہر لحمہ یہ چاہتا تھا کہ کسی طرح عناصر کی زنجیریں کٹ جائیں، قید ہستی سے نجات ملے اور دن رات ہماری روحیں ایک دوسری سے ہم آغوش رہیں لیکن بے موت مرا نہیں جاتا۔ مرنے کے بظاہر آثار نہ تھے خودکشی اول تو حرام، حرام موت مر کر روحانی مسرت کی توقع عقل و مذہب کے بالکل خلاف، دوسرے اجل کیا میرے تابع تھی کہ میں بلاتا اور وہ آجاتی بہیتیل کو زہر کھا کر جیتے دیکھا ہے۔ الٹے اور عذاب میں مبتلا ہو گئے۔ وہاں تو اس امانت میں خیانت کی جو سزا ملے گی۔ ملے گی یہیں وہ گت بنتی ہے کہ توبہ توبہ!

اسی طرح "شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن" صبح سے شام اور شام سے صبح ہوتی چلی جاتی تھی۔ ایک دن خدا جانے کیوں؟ میرے دل میں آیا کہ ان سے کچھ وہاں کا حال تو پوچھنا چاہیئے۔ کہتے ہیں کہ آزاد روحوں کو اگلا پچھلا بہت سا حال معلوم ہو جاتا ہے۔ میں نے تین باتیں سوچیں اپنے مطلب کی۔ اول یہ کہ میں کب مروں گا؟ دوسرے عالم میں ہم ایک جا رہ سکتے ہیں یا نہیں؟ تیسرے، مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے؟ اور یہ بھول گیا کہ ایسے سوالات ممنوع ہیں۔ ان بھیدوں کو کس کی مجال ہے جو کھولے۔ دنیا کے کارخانہ میں گڑبڑ مچ جائے اتنا بھی نہ سوچا کہ وہ اللہ میاں کے کسی چاہتے کی تو روح ہے نہیں کہ اس کی زبان کوئی نہ پکڑ سکے۔ افشائے راز میں اگر دھر لی گئی تو قیامت تک چھٹکارا مشکل ہے۔

ہونے والی بات، یہ خیالی راحت بھی تقدیر میں نہ تھی۔ عقل پر پردے پڑ گئے۔ دو تین دن تو کچھ ہیا ڈنہ پڑا۔ وہ کچھ گھبرائی ہوئی سی نظر آئیں لیکن میرا پیٹ منہ کو آرہا تھا۔ چوتھی رات یہ ٹھان کر سویا کہ کچھ بھی ہو آج بے پوچھے نہیں رہوں گا۔ چنانچہ انہیں دیکھتے ہی میں نے پہلا سوال کرنا چاہا۔ اس مرتبہ وہ خلافِ معمول میرے پاس بیٹھی نہیں۔ الگ کھڑی رہیں۔

میں۔ کیوں، کھڑی کیوں ہو؟

وہ۔ (روکھے منہ سے) یونہی!

میں۔ دو تین روز سے میں تمہیں کچھ مکدر بھی دیکھ رہا ہوں۔

وہ۔ تمہاری بلا سے!

میں۔ یہ کیا کہا؟

وہ۔ کچھ نہیں۔ (ٹھنڈا سانس لے کر) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم زیادہ روز تک نہیں مل سکتے۔

میں۔ ایسا غضب نہ کرنا۔ پھر میں کیا کروں گا؟

وہ۔ مرضی الٰہی۔

میں ۔ کوئی تدبیر؟

وہ ۔ میں کیا بتاؤں؟

میں ۔ تم نے تو شادی کے بعد سے اب تک کبھی مجھ سے بے وفائی کی نہیں۔

وہ ۔ مگر تم تو مجھے بیوفا بنا رہے ہو۔

میں ۔ آج کی تمہاری باتیں تو کچھ عجیب ہیں؟

وہ ۔ ہوں گی؟ اچھا چلو دوسری باتیں کرو۔

اس کی روح لوح محفوظ کو پڑھ آئی تھی۔ اس نے اپنی صورت اپنے اشارات سے مجھے بہتیرا آگاہ کرنا چاہا ۔ لیکن میں مطلق نہ سمجھا بلکہ تسکین کی شکل اگر نظر آئی تو صرف اپنے سوالات کے جوابات میں ۔ کچھ دیر اُن کی طرف مایوسانہ دیکھنے کے بعد بولا ۔

میں ۔ برسوں اترسوں سے میں تو کئی سوال دل میں لئے بیٹھا تھا۔ تم نے تو سب پر پانی پھیر دیا۔

وہ ۔ (بے چین ہوکر) کیسے سوال؟

میں ۔ ہیں! پوچھوں؟ بتاؤ گی؟

وہ ۔ (کانپتے ہوئے) نہ پوچھو!

میں ۔ ڈر کیوں گئیں؟ چھوٹے چھوٹے تین سوال ہیں ۔ ہمارے اپنے متعلق۔

وہ ۔ (ایک گہرا سانس لیتے ہوئے) تم جانو۔

میں ۔ تم نے کہا ہے کہ اب ہم زیادہ نہیں مل سکیں گے ۔ جسمانی جدائی تو تھی ہی رات کی دیدار بازی سے کچھ سہارا ہوگیا تھا یہ بھی جاتا رہا تو زندگی اجیرن ہو جائے گی، خدا کے لئے اتنا بتادو کہ میں مروں گا کب؟

میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ ایسی ملتجی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھیں جیسے کوئی منت کر رہا ہو کہ ایسے سوالات نہ کرو۔

میں ۔ (اپنی دُھن میں) معلوم ہے تو بتا دو ۔ چپ کیوں ہوگئیں ۔

وہ ۔ ابھی سے مرنے کی کیا فکر ۔ ابھی تو ایک شادی اور کرنی ہے۔ بچوں کی بہاریں دیکھنی ہیں۔

میں ۔ کبھی نہیں ہوگا ۔ اگر میری عمر لمبی کھنچی تو میں خود مر جاؤں گا۔

وہ ۔ نہ جینا انسان کے اختیار میں ہے نہ مرنا ۔ ہوش میں آکر باتیں کرو۔

میں ۔ اچھا یہ کہو اس عالم سے گزر کر اس عالم میں ہم ایک دوسرے سے بے تکلف ہل مل کر رہ سکیں گے یا نہیں؟

وہ ۔ خدا نے چاہا تو ضرور ۔ بشرطیکہ یہاں تم اس کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہے ۔ اس کی مرضی پر چلے اور اپنے خیالات کو صحیح رکھا۔

میں ۔ اس کے کیا معنی؟

وہ ۔ (تیوری چڑھا کر) تم آج سے پہلے ایسے کٹ حجتی نہ تھے ۔ لو میں جاتی ہوں ۔

میں ۔ ذرا ٹھیرو ۔ ایک سوال اور رہ گیا ہے ۔ اس کا بھی جواب دیتی جاؤ۔

وہ ۔ (سہم کر) تمہاری محبت سے مجبور ہوں ۔ خیر پوچھو؟

میں ۔ یہ اور بتا دو کہ مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے؟

وہ ۔ (دانتوں میں انگلی دبا کر) خبردار! نہ میں کہہ سکتی ہوں نہ تم سن سکتے ہو ۔ میں جانتی تھی کہ تم اپنے پاؤں میں آپ کلہاڑی مار و گے ۔ بس اب میرا ایک منٹ بھی ٹھیرنا ممکن نہیں ۔ اللہ حافظ!

یہ کہہ کر وہ غائب ہوئیں تو وہ دن اور آج کا دن پھر خواب تو خواب تصور میں بھی ان کی صورت نظر نہ آئی ۔ مہینوں دعائیں مانگیں چلے پہ چلے کھینچے مگر درِ قبول نہ کھلا کہ کبھی جھلک تو دیکھ لیتا ۔

جسمانی جدائی کے بعد روحانی مفارقت کا یہ دوسرا صدمہ پڑا ۔ مجھے اپنی حماقت پر بڑا غصہ آیا ۔ بار بار اپنے اوپر ملامت کرتا اور سر دھنتا لیکن "تیر از کماں جستہ باز نمی آید" اپنی ڈاڑھی نوچتا ۔ بوٹیاں کاٹتا اور رہ جاتا ۔ کس کا کھانا کس کا پینا ۔ خالو جان پڑھ پڑھ کر دم کرتے ۔ کیا ہوتا تھا ۔

اتنے میں رمضان کا مہینہ آگیا ۔ کئی سال سے خالو جان حج بیت اللہ کا ارادہ کر رہے تھے ۔ اتنی رقم نہیں جُڑی تھی کہ اس فرض کو ادا کریں ۔ اتفاق سے امسال خدا نے مدد کی ۔ خالو اور خالہ حج کے لئے تیار ہوئے ۔ مجھے کس پر چھوڑتے دوستوں سے مشورہ کیا ۔ دلوانے پر کون ہاتھ رکھتا ۔ صلاح ہوئی کہ جس طرح ہو سکے مجھے بھی اپنے ساتھ لے جائیں ۔ مقدس سفر ہے ۔ سمندر کی آب و ہوا شاید دماغ پر اچھا اثر کرے ۔ پھر مسلمانوں کے عقیدے کے موافق وہاں دعائیں مقبول ہوتی ہیں ۔ کعبہ کا غلاف پکڑ کر ۔ سبز گنبد والے کے روضہ پر اللہ سے التجا کریں گے کہ اس یتیم کی لاج آپ کے ہاتھ ہے ۔ اس کی دین و دنیا دونوں ضرور سنور جائیں گی ۔ داتا کے در سے کوئی محروم نہیں آتا۔

خالوجان نے اپنا ارادہ مجھ پر ظاہر کیا۔ خدا کی قدرت کہ میرے دل کا دست اس وقت سید صاحب تھا۔ عقل کی باتیں کیں کہ اس سے بڑھ کر مبارک صلاح کیا ہوسکتی ہے مگر آپ میرا بار کیوں کر اٹھا سکتے ہیں۔ دیکھئے میں فکر کرتا ہوں۔ اگر بندوبست ہوگیا تو ضرور چلوں گا۔" خالوجان میری یہ باتیں واہی تباہی سمجھے۔ دیوانے آدمی کسی کسی وقت انسانیت کی جون میں بھی آجاتے ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ میرا کوئی کاروبار نہیں۔ اندوختہ نہیں۔ نوکری بھی چھوڑ چکا ہوں۔ حج کا خرچ کہاں سے لاؤں گا یہ بھی وحشت کی ایک اپج ہوگی جو کہہ دیا ہے۔ کہ "دیکھئے فکر کرتا ہوں" انہیں اندیشہ تھا کہ وقت پر کہیں مچل نہ جاؤں اور کوشش اکارت جائے تاہم انہوں نے چڑھاوے کے دو چار زیور بیچ کر سو پچاس کا انتظام کیا۔ ادھر مجھے کچھ ایسی لَو لگی کہ دوسرے سارے خیالات رفوچکر ہوگئے۔ بس وقت حج کی دُھن اور اخراجات سفر کے حاصل کرنے کی فکر۔ ملا کی دوڑ مسجد۔ لے دے کے مجھے شیخ صاحب یاد آتے تھے۔ پہلے تو ہمت نہ پڑی کہ دہلی آکر کبھی انہیں خط نہیں لکھا۔ اب کس منہ سے ان سے کچھ مانگوں۔ پھر خیال آیا کہ ثواب میں دوسروں کو شریک کرنا بھی ثواب ہے۔ خط تو بھیجو۔ آخر انہیں آگرہ سے آنے کے بعد سے ساری کیفیت لکھی اور جواب کا انتظار کرنے لگا۔ آٹھ دن نہیں گزرے تھے کہ وہاں سے خط اور ساتھ ہی سو روپے کا منی آرڈر آیا معلوم ہوا کہ شیخ صاحب کا انتقال ہوچکا ہے۔ اچھوں کے اچھے ہی ہوتے ہیں۔ ان کی بیگم صاحبہ کو جب میرا خط سنایا گیا تو انہوں نے یہ عنایت کی تھی۔ اللہ انہیں جزائے خیر دے۔

اُن دنوں حج پر جانے والوں پر نہ آج کل جیسی پابندیاں تھیں نہ اتنے اخراجات۔ سو دو سو میں آدمی خاصا حاجی بن کر گھر آجاتا تھا۔ جیسے آگرہ سے آئی ہوئی رقم خالو آبا کو دی وہ خوش بھی ہوئے اور حیران بھی۔ خوش اس لئے کہ خرچ میں مدد ملی۔ بہت مشکلیں آسان ہوگئیں اور حیران یوں کہ دیوانہ کے پاس یہ رقم کہاں سے آئی۔ زیادہ کرید نہ اس زمانہ کا دستور تھا نہ خالو جان کی یہ عادت۔ نہ خود بدمعاش، فریبی ہوتے نہ کسی پر ایسی بدگمانی کرتے۔ الغرض ہمارا مختصر سا قافلہ ریل میں بیٹھ کر بمبئی اور بمبئی سے جہاز میں سوار ہو کہ معظمہ پہنچ گیا۔ اللہ نے حج بھی کرا دیا اور اپنے حبیب کی زیارت سے بھی مشرف کیا۔ وحشت تو میری جہاز میں سوار ہوتے ہی جاتی رہی تھی۔ خانہ کعبہ میں نماز پڑھتے ہی لپے سپے توہمات بھی دور ہوگئے۔ روحانی اور جسمانی آلائشیں تقریباً ساری کی ساری دور ہوگئی تھیں

اور ہم واپسی کے لئے تیار تھے کہ یکایک خالوجان بیمار ہوئے۔ ضعیفی تھی عمر کا جہاز موت کے کنارے آ لگا تھا۔ ارض مقدس میں قدم رکھتے ہی وہ دعا مانگا کرتے کہ "الٰہی! مرنا تو برحق ہے، ایک نہ ایک دن موت آئی ہے۔ کیا اچھا ہو جو یہیں دم نکل جائے۔ تیری رحمت سے کچھ دور نہیں۔ یہ مراد بھی اپنے پیاروں کے صدقہ میں پوری کر دے۔" دل سے مانگو تو کیا نہیں ملتا۔ وہ بڑا ہی داتا ہے۔ خدا نے ان کی سن لی۔ انتقال ہوگیا۔ خالہ جان کا ساٹھ برس کا ساتھ چھوٹا۔ جزع فزع کرنا تو ان کی شان کے خلاف تھا۔ چپ ہو کر رہ گئیں۔ اللہ والی عورت، کوئی یار نہ مددگار۔ آس نہ اولاد۔ بڑھاپے کا صدمہ۔ صدمہ بھی کاری۔ چپکے چپکے دعائیں مانگتیں "اللہ میاں! میرا بھی پردہ ڈھانک لے۔ جیتے جی آج تک جس کے دامن میں چھپی رہی۔ آخری وقت اس سے دور نہ پھینک۔ ان کو اپنے در پر سلایا ہے تو مجھے بھی پڑ مرنے کی جگہ عنایت کر۔"

چوتھے دن رات کو اچھی بھلی سوئیں۔ صبح کی نماز خاصی طرح پڑھی تسبیح ہاتھ میں تھی۔ یکایک مسکرائیں اور جا نماز ہی پر لیٹ گئیں۔ میں دیکھ رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں پھیلا دیئے مجھے کچھ شک سا ہوا۔ پاس آیا۔ ڈرتے ڈرتے نبض دیکھی وہاں کیا دھرا تھا۔

مذہب میں جب کسی کو زیادہ انہماک ہوجاتا ہے تو موت کے واقعات کچھ زیادہ اثر انداز نہیں ہوتے۔ مجھے اپنی تنہائی کی فکر کے سوا کوئی اور صدمہ نہیں ہوا۔ تجہیز و تکفین کے بعد اب میں نے چلنے کی ٹھہرائی۔ متوکل لوگوں کا ساز و سامان ہی کیا۔ دو چار مختصر سی گٹھریاں تھیں۔ ان کے ٹٹولنے میں گھنٹوں کی دیر بھی کیسی؟ ٹٹول صرف یہ تھی کہ نقد کہاں رکھا ہے۔ کیونکہ میں تو کورا تھا۔ یہ خبر نہیں کہ روپیہ پیسہ وہ کس جگہ رکھتے تھے۔ خالوجان کی جیبوں اور خالہ اماں کے بٹوے میں دو چار روپلی کے سوا کچھ نکلا نہیں۔ گھبرا گھبرا کر ایک پوٹلی کو دیکھتا آخر ڈبیا میں سے کچھ اشرفیاں ملیں۔ لیکن مالیت میں صرف اتنی کہ میں اکیلا دلی پہنچ جاؤں۔ حیران ہوگیا۔ واقعی اللہ کے بھید اللہ ہی جانے اس کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں۔ ان کی ناداری و مفلسی کا کس شان سے پردہ رکھا ہے۔ اگر وہ دونوں مر نہ جاتے تو کیا حال ہوتا۔ جو ہاتھ خدا کے سوا کسی کے آگے کبھی نہ پھیلا تھا۔ خدا کے گھر میں پھیلانا پڑتا۔

اللہ کی قدرت کا تماشہ دیکھتا ہوا الغرض تین مہینے کے بعد دلی آیا۔ اور حاجی کہلانے لگا۔ حافظ تو تھا ہی حاجی بھی ہوگیا۔ خالوجان کے دوست آشنا عزیز و اقارب، شاگرد اور معتقد میرے سر کو ان کی مسجد سنبھالوں۔ لیکن میں

اب دوسری ہوا میں تھا۔ مرحومہ کی روح نے جو پیشین گوئی کی تھی وہ یاد آنے لگی۔ آگرہ کی ملازمت کے مزے عود کر آئے تھے۔ ہونے والی بات ارادوں میں استحکام پیدا کر دیتی ہے۔ اور اس کے مطابق اسباب بننے لگتے ہیں۔ آگرہ میں شیخ صاحب کے ہاں کسی اسلامی ریاست کے ایک کارندے آیا کرتے تھے۔ انہیں میرے ساتھ کچھ ایسا انس ہو گیا تھا کہ جب آتے چھاپہ خانہ کے علاوہ ایک دو بار مجھ سے ضرور ملتے۔ اکثر کہا کرتے "میاں شخصی ملازمت کا کیا اعتبار۔ آج ہے کل نہیں۔ انگریزی نوکری کے لئے خیر بہت سی شرطیں ہیں۔ ریاستوں میں روزگار تلاش کرو۔ ایک مرتبہ لگ جانا شرط ہے۔ یہ سمجھ لو کہ جاگیر ہو گئی۔" میرا جواب عموماً یہی ہوتا کہ جناب میں ایسی قسمت ہی لے کر نہیں آیا۔ آخری مرتبہ جب ان سے ملاقات ہوئی ہے تو انہوں نے کوشش کا وعدہ کیا تھا۔ ایک بات تھی ہو گئی۔ اپنی پریشانیوں میں مجھے ان کا خیال بھی نہ رہا۔

ایک دن ظہر کی نماز مسجد میں پڑھ کر میں اپنے گھر آرہا تھا۔ کہ ڈاکیہ نے ایک خط دیا۔ میری کسی سے خط و کتابت نہ تھی۔ متعجب ہو کر اپنا نام پتہ دیکھنے لگا۔ یہ تو نہ کھلا کہ بھیجنے والا کون ہے البتہ اتنا معلوم ہوا کہ آگرہ سے پتہ بدل کر یہاں آیا ہے۔ جلدی جلدی لفافہ کھولتا ہوا گھر میں آیا۔ تحریر غیر مانوس مگر مضمون دردمندی سے بھرا ہوا۔ لکھا تھا "عزیزی حافظ صاحب سلمہٗ تم تو شاید بھول گئے ہو۔ لیکن میں تمہیں نہیں بھولا۔ کئی مہینے کی جد و جہد کے بعد آج خدا نے مجھے تم سے سرخرو ہونے کا موقع دیا ہے۔ فی الحال پچاس روپے ماہوار کی اسامی تمہارے واسطے تیار ہے۔ فوراً سوار ہو جاؤ۔" بڑی دیر سوچنے کے بعد یاد آیا کہ "اچھا فلاں صاحب ہیں" اچھے دن آ گئے تھے۔ دل نے کوئی حجت بھی پیش نہ کی۔ سجدہ شکر ادا کیا کہ دیتا ہے تو یوں چھپڑ پھاڑ کر دیتا ہے اور دوسرے ہی روز خط میں لکھے ہوئے پتہ پر روانہ ہو گیا۔ ایک دفعہ نصیب جاگا سو جاگا۔ آدمی چلا اور چلا۔ تھوڑے عرصہ بعد میری جڑیں مضبوط ہو گئیں تو میں نے دوسری شادی کی۔ اللہ نے پے در پے بچے بھی دیئے۔ القصہ جو کچھ میری پہلی بیوی نے عالم خواب میں کہا تھا جیتے جاگتے پورا ہوا۔ اب سوچ ہے تو صرف یہ کہ دیکھئے مرنے کے بعد کیا گزرتی ہے۔

اشرف صبوحی

رباعیات

(۱)

جینا ہے تو بیکسی کے غم میں جینا ہوگا
اس راہ میں ہر خار سے لب سینا ہوگا
فرمانِ جنوں کی ہو گی لازم تعمیل
ہر غوطہ کشِ خرد سے دور رہنا ہوگا

(۲)

صہبا میں وہ رنگینی و مستی نہ رہی
میخانہ وہ، ہم رندوں کی سرمستی نہ رہی
ساقی نہیں میخوار نواز اب فطرت
میخواروں میں وہ ساقی پرستی نہ رہی

عبدالعزیز فطرت

غزل

اُٹھا پھر وہ شرر جس نے مری فطرت جلا ڈالی
نہ تھا آساں وہ غم جس کی محبت نے بنا ڈالی

محبت تُو نے اپنی ابتدا کو انتہا جانا
میں وہ ہوں میں نے تیری انتہا کی ابتدا ڈالی

رلا دے پھر دلوں کو حسن کے خاموش استغنا
مرے نعروں نے یہ سنسان بستی پھر جگا ڈالی

تماشا ہے کہ کلکِ عشق کی نیرنگ کاری نے
مرا خاکہ اُڑا ڈالا تری صورت بنا ڈالی

نگاہیں حسن کی کس شوخ کے ہیں موقلم یارب!
یہ جب اُٹھے انہوں نے نقش باطل میں جلا ڈالی

اتارے نقش کچھ بے رنگ الفت نے مرے دل پر
مرے آئینۂ دل پر تری صورت بنا ڈالی

نہ تھا آساں مری صنعت کا صنعت سے بدل دینا
مصوّر نے مری تصویر اپنی سی بنا ڈالی

اثر وائے زمانے بھر نے چربے تیری شوخی سے
مصوّر تیرے دستِ شوخ نے دنیا مٹا ڈالی

بجز میرے نکالا آج ہر تائب کو محفل سے
یہ اچھی رسم تُو نے ساقیٔ نا آشنا ڈالی

مراتب علی تائب

نوکر

"اچھا تو کل عید ہے۔ تب ہی تو جدھر دیکھو بہار سی نظر آرہی ہے۔ سب لڑکے اپنے اپنے والدین کے ہمراہ بازار کا رُخ کر رہے ہیں۔ یہ دیکھو یہ تین لڑکے کیسے خوش خوش اپنے باپ کے ساتھ چوک جا رہے ہیں۔ وہ لو، وہ بڑا والا کہہ رہا ہے "آبا! میں تو ہیٹ لوں گا۔" وہ دیکھو اس کی دیکھا دیکھی اس کے اور بھائی بھی کہنے لگے۔ کیا یہ سب ہیٹ پہننا چاہتے ہیں؟ ان کو شاید ہیٹ بہت پسند ہے۔ کیا ہیٹ واقعی بہت اچھا ہوتا ہے؟ کیا معلوم۔ مگر کیا اچھا ہوگا سر پہ بھاری سی ایک ناند اور پھر اس کے چاروں طرف موٹا کنارا۔ بالکل گلی میں گشت لگانے والے دیدوں جیسی ٹوپی۔ نہ جانے اسے لوگ کیوں پسند کرتے ہیں۔ مگر یہ اچھا ضرور ہوتا ہوگا۔ کیونکہ یہ لڑکے بڑے شوق سے خریدنے کو کہہ رہے تھے اور یہ دیکھو یہ بھی تو لگائے جا رہے ہے۔ ضرور اچھا ہوتا ہوگا کیونکہ ہمارے میاں، چوک میں گھومنے والے صاحب۔ اور موٹر سائیکل پر بیٹھنے والے انگریز سب ہی تو لگائے رہتے ہیں۔ اگر اچھا نہ ہوتا تو ان سب بڑے بڑے آدمیوں کا سر تھوڑے ہی پھرا تھا جو اس بھاری، ناند جیسی دیدوں والی ٹوپی کو لگاتے۔ یہ ضرور اچھا ہوتا ہوگا اور پھر اچھا کیوں نہ ہو ملتا بھی تو ہے بہت داموں میں۔ کتنے آنوں میں ملتا ہوگا؟ پچاس ساٹھ۔ نہیں سو آنوں میں تو ضرور ہی ملتا ہوگا۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ ہندوستانی بھی لگائے تو گورا معلوم ہو۔ اگر مجھ کو کہیں سے سو آنے مل جاتے تو میں بھی ایک خریدتا اور بس آج ہی رات کی گاڑی سے گھر پہنچتا۔ صبح سویرے گاڑی اسٹیشن پر پہنچتی۔ میرا گاؤں تو وہاں سے کچھ زیادہ دور بھی نہیں۔ یہی کوئی ڈیڑھ دو کوس ہوگا۔ بس نماز کے وقت تک گھر پہنچ جاتا۔ اماں۔ ابا۔ بہن۔ سکھیا۔ نور دا۔ نئے نئے کپڑے پہنے کھیلتے ہوں گے۔ ابا تو اس وقت دوگانہ کو عید گاہ گئے ہوں گے۔ بس میں ہیٹ لگائے پہنچتا تو ——!

"رجب او رجب! رجبا سنتا نہیں! کب سے بچہ اس زینے کے پاس کھڑا رو رہا ہے اور تیرے کان میں آواز ہی نہیں جاتی۔ ایسا کھڑا ہے جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ الّو کہیں کا ——!"

"یہ لڑکا بھی بڑا پاجی ہے اترنے کا نام ہی نہیں لیتا ہر دم گود میں چڑھا ہی رہتا ہے۔ لڈو ہو گیا ہے لڈو۔ اور دیکھو موٹا بھی تو خوب ہے۔ کون اس کی بھاری لاش کو لادے لادے پھرے۔ اچھا خاصا ڈیڑھ دو سال کا بچہ ہر دم لدا ہی رہتا ہے۔ نہ جانے کہاں کی عادت ہے کہ ہر دم گود ہی میں رہے۔ ان پہاڑ سے دنوں میں شاید ہی دو ایک مرتبہ اترتا ہو ورنہ ہر گھڑی سواری کئے رہتا ہے اور پھر وہ بھی تھوڑی دیر گود میں تو تھوڑی دیر کاندھے پر اور پھر پیٹھ پر۔ ناک میں دم آگیا ہے اس کے مارے۔ لڈو سالے کی چٹکی کاٹ لوں تب تو جان بچے گی! مگر نہیں اس میں تو سراسر میرا ہی گھاٹا ہے تب تو اور شہد کی مکھیوں کی طرح چمٹ جائے گا اور جان بچائے نہ بچے گی۔ یہ بچے بھی کیا چیز ہوتے ہیں ہر دم گود ہی میں لدے رہتے ہیں۔ کیا گود میں چڑھنا بہت اچھا معلوم ہوتا ہے! کیا گود میں بہت آرام ملتا ہے! کیا معلوم؟ مگر آرام ضرور ملتا ہوگا تب ہی تو ہر دم لدے رہتے ہیں اور اترتے بھی ہیں تو ہر وقت گود ہی گود چلایا کرتے ہیں۔ اگر تکلیف ہوتی تو کاہے کو گود میں رہتے۔ اگر گود میں تو تکلیف ہوا کرتی تو بڑے مزے رہتے۔ بس میں ہر وقت کی اس پریشانی سے نجات پا جاتا۔ لیکن گود میں تو تکلیف ہی ہوتی ہے۔ کیونکہ جب پارسال میں جامن کے ڈال پر سے گر پڑا تھا تو چچا مجھے گود ہی میں گھر لائے تھے۔ مجھے تو کوئی آرام نہیں ملا تھا۔ میرا تو یہی جی چاہتا تھا کہ میں لیٹا رہوں۔ اور ہاں! یہ بھی تو ہے کہ بچے لیٹتے ہی نہیں اور لیٹنے کیا بیٹھتے بھی نہیں۔ اُن کو شاید لیٹنے میں آرام نہیں ملتا۔ مگر مجھے تو بڑا ہی آرام ملتا ہے۔ اچھا تو اب معلوم ہوا کہ لڑکے کچھ انوکھے مزاج کے ہوا کرتے ہیں۔ جس چیز میں ہم کو آرام ملتا ہے ان کو تکلیف ہوتی ہے اور جس حالت میں ہم کو تکلیف ہوتی انہیں آرام ملتا ہے۔ اچھا اب تو یہ بڑا ہو ہی گیا ہے بس دو چار مہینہ میں اس کو چلنا آجائے گا۔ اور کچھ بڑا بھی ہو جائے گا تو کھیلتا پھرے گا۔ یا تھک جائے گا تو لیٹ جائے گا گود کا تو کبھی نام بھی نہ لے گا اور پھر میں ہر دم چین کاٹوں گا۔ مگر نہیں نہیں۔ چین کہاں!

میری قسمت میں بھی کہیں چین لکھا ہے۔ وہ پرسوں جو پیلی ساری پہنے بی بی آئی تھیں ان سے بڑی بی بی کہہ نہ رہی تھیں کہ بیگم صاحبہ کے دو چار دن میں ہونے والا ہے سافوہ! تب تو واقعی بڑی مصیبت ہوگی اس کو تو ہر دم لئے ہی رہنا پڑے گا۔ یہ تو کبھی کبھار اتر کر گھٹنوں کے بل بھی چلنے لگتا ہے مگر وہ تو ہر دم لدا ہی رہے گا۔ یہ تو بڑی زحمت ہوگی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اس میں فائدہ ہی کیا ہے۔ میاں، بیوی، بچے، سب پریشان گھومتے پھریں میاں ہر وقت لیٹنے کے خواہشمند اور رہ رہ آٹھویں دسویں روز بیمار۔ آج سر میں درد ہے تو کل بخار آ رہا ہے پرسوں سر چکرا رہا ہے۔ آدھے سے زیادہ سر کے بال سفید ہو گئے ہیں کمر جھک گئی ہے، گال پچک گئے ہیں۔ اس سے تو کوئی فائدہ نہیں دکھائی دیتا کہ یہ لوگ آرام چھوڑ تکلیف اٹھاتے پھریں، ہاں البتہ اس وقت ہو سکتا ہے جب یہ مانا جائے کہ یہ لوگ نوکر کو تکلیف دینا چاہتے ہیں۔ اور ان کی خواہش یہ ہے کہ وہ کبھی چین سے نہ بیٹھنے پائے اور صرف اس کی دشمنی میں سارے گھر والے تکلیف اور عسرت میں بسر ——!!

"رجب! رجب! رجبا! رجبا! رجبا!!"

"جی! جی بیگم صاحب، ابھی آیا!"

"مر گیا تھا موا نگوڑا! سنتا ہی نہیں۔ جب باہر جاتا ہے کان میں تیل ڈال کر بیٹھ رہتا ہے۔ کب سے چیخ رہی ہوں! تجھ سے کہا تھا کہ ننھے کو گود سے مت اتارا کر۔ ٹھنڈی ٹھنڈی زمین پر رہنے سے اس کو سردی ہو جائے گی۔ مگر تو ہے کہ سنتا ہی نہیں۔ خوب کان کھول کر سن لے۔ آئندہ ایسا نہ کرنا سمجھا! اچھا ذرا بازار چلا جا اور روپیہ کی ترکاری لیتا آ۔"

"اور بیگم صاحب میاں کو؟"

"کس کو۔ ننھے میاں کو! ارے چھوٹا سا بچہ ہے لیتا چلا جا۔ اور سبزی منڈی ہے ہی کتنی دور۔ مگر نہیں تو اناڑی ہے۔ نیا نیا شہر آیا ہے۔ کہیں کہ گاڑی، موٹر میں نہ دب جائے ان کو یہیں زمین پر اتار دے اور چلا جا۔ لپک کر جلدی سے لے آنا۔ دیر نہ کرنا۔ میں ان کو دیکھے رہوں گی۔"

"مگر بیگم صاحب! سردی۔!"

"سردی! ارے وہ اس وقت نہیں لگتی۔ اس وقت تو چار بجے ہیں۔ دن بھر دھوپ میں تپنے کی وجہ سے زمین کی سردی ختم ہو گئی ہے۔ اتار دے کوئی ہرج نہیں۔"

"بچے کو اتار کر" تو بیگم صاحب میں بھی اس وقت انہیں اتار ہی دوں؟"

"نہیں، نہیں کیوں؟"

"آپ ہی نے تو کہا کہ اس وقت دن بھر کی دھوپ کی وجہ سے سردی نہیں لگتی۔ زمین گرم ہو جاتی ہے۔"

"ارے تو میں دیکھے رہوں گی سردی کیسے لگنے پائے گی تو تو اتار دیتا ہے پھر خبر ہی نہیں لیتا۔ جا جا۔ تو بڑا بکی ہو گیا ہے۔"

آج عید ہے۔ تب ہی تو ہر طرف چہل پہل ہے۔ گلی میں بچے نئے نئے کپڑے پہنے گھوم رہے ہیں۔ کوئی ادھر جا رہا ہے تو کوئی ادھر جس کو دیکھو وہی نئے کپڑے بدلے ہوئے ہے اور وہ پڑوس والے میر صاحب کا نوکر بھی تو خوب ٹھاٹ سے ہے۔ نیا جوتا نیا پاجامہ، نئی قمیص، نئی واسکٹ! اس کی تنخواہ بھی تو مجھ سے کچھ بہت زیادہ نہیں مگر وہ تو اپنی تنخواہ خود لیتا ہے اور مزے اڑاتا ہے۔ جب دیکھو منہ سے سگرٹ لگا ہوا ہے کبھی کبھی مٹھائی بھی کھاتا رہتا ہے۔ میری تنخواہ مجھ کو ملتی ہوتی تو میں بھی ایسا ہی کرتا۔ نئے نئے کپڑے بنواتا، مٹھائیاں کھاتا، شان کرتا۔ مگر یہ میری قسمت میں کہاں۔ میری تنخواہ سے تو ابا، اماں موج کرتے ہیں اور میں یہاں مرتا ہوں۔ بڑی مصیبت ہے۔ ابھی تو چھٹی ملنے کی امید نہیں، ہاں شاید گیارہ بجے تک چھٹی ملے تو ملے اور تب ہی باہر جا کر میلہ دیکھنے کا موقع ملے گا۔ ابھی تو میاں کپڑے ہی بدل رہے ہیں۔ اس کے بعد کہیں باہر جائیں گے اور دوگانہ پڑھ کر واپس ہوں گے۔ تب کہیں کھانے کو نصیب ہوگا اور پھر گود میں من بھر کا بوجھ لاد کر باہر کی سیر ——!"

"رجب! طشتریاں دھوئیں کہ نہیں! کیا مر گیا جا کر؟"

سید مسیح الزماں جائسی

شعر

آہ! عورت! کہاں ہے گم عورت
ہم کو لاکھوں میں ایک بھی نہ ملی

جوش ملیح آبادی

ایک گیت

ایسا تو دیکھا نہ تھا جیسا دل بے چین ہے آج

گھاؤ نیند سے چونک اُٹھا ہے آنکھ جھپکتے درد بڑھا ہے
کالی گھٹا سے اُن آنکھوں کا رستا کاجل یاد آیا ہے
درد کی فوجیں جیت رہی ہیں
کیسی گھڑیاں بیت رہی ہیں
ایسا تو دیکھا نہ تھا جیسا دل بے چین ہے آج

(۲)

بستی تھی وہ روپ نگر کی خوشبو چھائی ہوئی تھی اگر کی،
اب سُونا سنسان سماں ہے برکھا لگی ہے چشمِ تر کی،
آنسو تھک کر چُور ہوئے ہیں
راجا رانی دُور ہوئے ہیں
بیری من یہ سوچ رہا ہے اب ہے کس کا راج!

(۳)

ہم تو جو بیتے وہ سہہ لیں دل کی باتیں دل ہی سے کہہ لیں
من سے جو دھارا پھوٹی ہے رتن کا بن کر اُس میں بہہ لیں
ایک ہی بات ہے جی کی بیرن،
یاد نہ آئے پریم کا بندھن،
کانوں میں یہ بول نہ گونجیں "تم ہو مرے سرتاج"!

(۴)

ہونی کے ہیں بان نرالے دیکھے رنگ ہر آن نرالے
جی کے روگ کی شان انوکھی پریم کے ہیں سامان نرالے
آس یہ جاگی ہے اب من میں
لوٹ آئیں گے وہ آنگن میں
اندیشے آئیں تو آئیں، وہم کا کیا ہے علاج!

میراجی

میرے گیت

میرے گیتوں میں بہت رس ہے — سناؤں تم کو؟
میں وہی گیت سناؤں گا جو تم چاہو گے —
میں نے لکھے ہیں بہاروں کے ترانے اے دوست!
مجھ پہ گزرے ہیں مصیبت کے زمانے اے دوست!
غم کی تابندہ حقیقت کے فسانے اے دوست!
میں نے جو دیکھا ہے اے دوست وہی لکھا ہے
میں وہی گیت سناؤں گا جو تم چاہو گے۔
میرے گیتوں میں بہت رس ہے — سناؤں تم کو؟

(۲)

یوں تو اشعار سنے ہوں گے بہت سے تم نے
میرے اشعار مگر میرے ہیں اشعار اے دوست!
داستاں اپنی سناتا ہوں انہیں شعروں میں
کائنات اپنی بساتا ہوں انہیں شعروں میں
زندگی اپنی دکھاتا ہوں انہیں شعروں میں
دکھ بھرے درد میں ڈوبے ہوئے غمگیں اشعار
یوں تو اشعار سنے ہوں گے بہت سے تم نے
میرے اشعار مگر میرے ہیں اشعار اے دوست!

(۳)

میرے اشعار! مگر کب ہیں یہ میرے اشعار؟
یہ مرے گیت، نہیں گیت زمانے کے لئے،
تم نے یہ داغ ابھارے ہیں، تمہیں کیا معلوم!
میری آہوں کے شرارے ہیں، تمہیں کیا معلوم!
گیت، یہ گیت تمہارے ہیں تمہیں کیا معلوم!
میں نے یہ شعر کہے ہیں تو تمہاری خاطر
یہ میرے گیت نہیں گیت زمانے کے لیئے
میرے اشعار! مگر کب ہیں یہ میرے اشعار؟

یوسف ظفر

دنیائے ادب

تازہ ترین رسائل کے اہم مضامین

کا تذکرہ اور جائزہ

ہمایوں (اکتوبر)

ہندی پر اُردو کا اثر

جناب گوری سرن لال سری واستو ایم اے ہمارے ملک کے اُن چند نوجوانوں میں سے ہیں جنہوں نے اردو اور ہندی دونوں زبانوں کی ادبیات کا غائر نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ اُردو کے تو وہ منتہی ہیں اور اگر ہمارا اندازہ غلطی نہیں کرتا تو ہندی لٹریچر پر بھی انہیں کافی عبور حاصل ہے۔ یہ مضمون اسی صاحبِ نظر ادیب کے غور و فکر کا نتیجہ ہے۔

اس مقالے میں سری واستو صاحب نے ہندی اردو مناقشے کے ایک روشن پہلو پر نگاہ ڈالی ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ جہاں اس پیچیدہ مسئلے نے ملک کی فضا پر ایک ناخوشگوار اثر کیا۔ وہاں یہ کیفیت بھی پیدا کر دی کہ دونوں زبانوں کی انفرادی خوبیاں ایک دوسرے پر سایہ ڈالنے لگیں اور دونوں اطراف کے بعض دور اندیش اُدباء نے مقابلے کی زبان کی ایسی خصوصیات کو اپنے ہاں فروغ دینے کی کوششیں کیں، جن سے اب تک اُن کی اپنی زبان تہی دامن تھی۔ یہاں انہوں نے ایک اور بات بھی صاف صاف بیان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں:۔

"یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اچھی ہندی اور اچھی اردو میں زبان کی حیثیت سے کوئی فرق نہیں محض رسم الخط کا فرق ہے اور یہ اپنی پسند کی چیز ہے۔ اگر ان باتوں پر غور کیا جائے تو اس وقت کی لسانی کشمکش بالکل مہمل معلوم ہوگی۔ ہندی اردو دونوں زبانیں تقریباً ڈیڑھ سو برس سے ایک دوسرے پر اثر ڈال رہی ہیں لیکن گذشتہ بیس برس کے اندر اُن کا ادب بہت کچھ ایک دوسرے سے مستفید ہوا ہے۔ حیرت تو یہ ہے کہ اس زمانہ میں جب ہندی اردو ایک دوسرے سے اس قدر قریب آگئی ہیں، خواہ مخواہ زبان کے مسئلے پر زور دیا جاتا ہے..... موضوع کی خاطر یہ مان لینا ضروری ہوگا کہ اردو ہندی دو مختلف زبانیں ہیں۔ دونوں دو مختلف تہذیب اور معاشرت کی حامل ہیں۔ اردو میں ایران و عرب کا ماحول نمایاں ہے ہندی میں ہندوستان کی فضا نظر آتی ہے اردو کی گرامر فارسی کے انداز پر لکھی گئی ہے اور ہندی کی قواعد سنسکرت کے نقشِ قدم پر۔ اردو نظم کی بحریں ایران کی شاعری سے مستعار لی گئی ہیں اور ہندی کا پنگل سراسر سنسکرت کا عطیہ ہے۔ خیر اس قدر فرق ہونے کے باوجود بھی چونکہ ہندو مسلمانوں کا کلچر ایک ہو گیا تھا اس لئے فورٹ ولیم کے زمانہ یعنی ۱۸۰۰ء تک ہندی اردو میں کوئی نمایاں فرق نظر نہیں آتا۔ سوائے اس کے کہ اردو میں چند ایرانی اصطلاحات کا کہیں کہیں استعمال ہے اور ہندی میں اس کا نقدان ہے۔ کمپنی نے جو ہندوستان کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی تو یہ بھی ضروری سمجھا کہ ہندو مسلمانوں کو ہر طرح سے ایک دوسرے کا حریف بنا دیا جائے چنانچہ زبان کے معاملہ میں بھی یہی ہوا۔ ہندی ہندوؤں کے سپرد کی گئی اور اردو مسلمانوں کے حوالے۔ نصف صدی بھی نہ گذرنے پائی تھی کہ ہندی اردو کا مسئلہ پیدا ہو جو اب سخت ہیبت ناک صورت اختیار کر چکا ہے.....!"

مندرجہ بالا اقتباس میں صاحبِ مضمون نے جہاں ہندی اردو مسئلے کے طوفان کو ایک کوزے میں بند کر دیا ہے اور کم از کم الفاظ میں اس مناقشے کی ساری تاریخ بیان کر دی ہے، وہاں نادانستہ طور پر وہ ایک ایسی باتیں بھی کہہ گئے ہیں جن سے غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان ہے۔ مثلاً اُن کا یہ قول کہ اردو میں ایران و عرب کا ماحول نمایاں ہے، بہت کچھ مبالغہ آمیز ہے۔ جب دونوں قوموں نے ایک کلچر کو قبول کر لیا اور اردو نے اُن کے باہمی اتصال سے جنم لیا تو اس میں ایران

عرب کا ماحول کیونکر باقی رہ سکتا تھا۔ مسلمانوں کو اس ملک میں آئے صدیاں گذر گئیں اور اب ایک عرصہ دراز سے بھارت ورش میں اس جنس کی درآمد قطعاً بند ہو چکی ہے۔ اردو اُن بدیشیوں کی زبان نہیں تھی جو ایران و توران کی خاک سے اُٹھے اور سودائے جہانگیری انہیں گنگ و جمن کی وادیوں میں لے آیا۔ وہ تو ترکی اور فارسی بولتے تھے۔ ملکی اور معاشرتی ضروریات کے تقاضے سے رفتہ رفتہ ایک نئی زبان اردو پیدا ہوئی جس کا ماحول سراسر ہندوستانی تھا۔ اردو نظم بلکہ اس کی صنف غزل کو چھوڑ کر ہمارا سارا لٹریچر ہندوستانی کلچر کا آئینہ دار ہے اور اس پر ملکی ماحول اسی طرح چھا رہا ہے جس طرح ہندی ادبیات پر بلکہ اب تو اردو غزل بھی چولا بدل چکی ہے اور موجودہ دَور کی اردو غزل میں اگرچہ ہندی کی طرح عاشق مؤنث نہیں بنا لیکن معشوق مؤنث ہو چکا ہے۔ افسانوی ادب جو ہمارے سرمایۂ زبان کا سب سے بڑا ضروری اور عوام پسند حصہ ہے۔ خالص ملکی اور ہندوستانی ماحول کی پیداوار ہے، اور یہی حال اردو نثر کی دیگر اصناف کا ہے۔ پھر یہ کہنا کچھ بہت ٹھیک نہیں معلوم ہوتا کہ اردو میں ایران و عرب کا ماحول نمایاں ہے۔

دوسری بات جو سری واستوا صاحب کو زیادہ وضاحت سے بیان کرنی چاہیئے تھی گرامر اور قواعد کے متعلق ہے جو کچھ انہوں نے فرمایا ہے اس سے یہ ٹپکتا ہے کہ اردو اور ہندی کے قواعد جدا جدا ہیں، حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ جب اردو اور ہندی بقول صاحب مضمون درحقیقت ایک ہی زبان ہے تو قواعد کیونکر مختلف ہو سکتے ہیں۔ ہندی کی طرح اردو افعال بلکہ مصادر تک تذکیر و تانیث کے تابع ہیں۔ البتہ یہ بات فارسی میں کہاں۔ ہاں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اردو قواعد کی اصطلاحات فارسی سے لی گئی ہیں اور ہندی قواعد کی سنسکرت سے، لیکن اگر دونوں زبانوں کے بنیادی اصول ایک ہیں تو اصطلاحات کا فرق دراصل کوئی فرق نہیں۔

آگے چل کر وہ اردو ہندی کی بعض خصوصیات کا اجمالی تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

> اردو نظم ہندی سے بہت آگے نکل گئی ہے اس لئے ہندی والے روز بروز، حالی، اقبال، جوش، اور جگر کو شوق سے پڑھتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ ہندی میں بھی ایسے ہی شعرا پیدا ہوں۔ اردو میں رزمیہ نظموں کی کمی ہے۔ اردو والے اگر یہ چیز ہندی سے لیں تو اپنی زبان کو بہت فائدہ پہنچائیں گے۔ اسی طرح ہندی نثر صفائی اور شستگی سے عاری ہے، یہ خوبی اردو میں بہت زیادہ ہے۔ ہندی میں اس کا رواج اسی وقت ہو سکتا ہے جب ہندی پڑھنے والے اردو پڑھیں"۔

ہمیں معلوم نہیں کہ رزمیہ نظموں سے صاحب مضمون کا مدعا کیا ہے ڈیڑھ سو برس ادھر سے ہم لوگ غلامی سے آشنا ہو چکے ہیں۔ رزم اور رزمیہ شاعری کہاں سے پیدا ہو۔ یہاں تو اب بزم ہی بزم ہے، وہ بھی ایک بساط پارینہ پرچمی سے، جسے فلک ناہنجار ہر آن لٹنے پر تیار رہتا ہے۔ ہندی شاعری میں رزمیہ نظموں کے فروغ کا حال پڑھ کر تعجب بھی ہوا اور خوشی بھی۔ اگر جدید ہندی شعرا رزمیہ نظمیں لکھتے ہیں تو ہمیں اُن کے موضوع اور انداز بیان سے آشنا ہونے کی بڑی تڑپ ہے۔ لیکن اگر صاحب مضمون کا اشارہ بھاشا کی اس پرانی رزمیہ شاعری کی طرف ہے جو راجپوت درباروں میں پروان چڑھی اور جسے پرتھی راج کے درباری شاعر چند بردائی کی رہنمائی کا شرف حاصل ہے، تو اس چیز کی مثال کو جدید اردو شاعری میں تلاش کرنا نہ صرف لاحاصل بلکہ ایک غیر منطقی بات ہوگی۔ سچی رزمیہ شاعری اُسی وقت معرض وجود میں آتی ہے جب سوسائٹی کی نبضیں خونِ گرم کی روانی سے تڑپ رہی ہوں۔ اور اُس کے سامنے تسخیر و مدافعت، آزادی و غلامی اور حیات و ممات کا سوال درپیش ہو اور اس کا حل تلوار کی دھار اور خنجر کی کاٹ میں تلاش کیا جائے۔ یہ باتیں اب افسانہ ہو چکیں، حیرت ہے کہ موجودہ ہندی ادب میں ان کا اثر کیوں کر ظاہر ہوا ہمارے ہاں تو انیس و دبیر کے مرثیوں کے سوا جو ملکی زوال کے زمانے میں لکھے گئے، رزمیہ شاعری واقعی مفقود ہے اور ان مراثی میں بھی سچے رزمیہ جذبات کی کمی ہے۔ ان دنوں میں وقار انبالوی نے آہنگ رزم اور حفیظ نے شاہنامۂ اسلام لکھ کر رزمیہ شاعری کو از سر نو تازہ کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن از بسکہ وقار کا سپاہی غیر ملکی حکومت کا غلام ہے، اس لئے وہ اس کے جذبات میں خلوص پیدا نہیں کر سکے۔ اور شاہنامۂ اسلام کی رزم پر روایت اور مذہبی تقدس کا ایسا گہرا رنگ چڑھ رہا ہے کہ ہم اُسے رزمیہ شاعری کہتے ہوئے ایک جھجک سی محسوس کرتے ہیں۔ تو یہ ہے ہماری رزمیہ شاعری کی کل کائنات۔ بعض لوگ جوش، ظفر علی خاں اور سالک کی ایک آدھ نظم کو بھی رزمیہ نظموں میں شامل کر لیں گے، لیکن ذرا غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ وہ خالص حُبِّ وطن کی نظمیں ہیں، اور رزم کے عناصر سے قدرتی طور پر محروم۔ قدرتی طور پر اس لئے کہ ایک محکوم ملک میں ایسی نظموں کے پھولنے پھلنے کا امکان ہی کہاں ہے۔ اس لئے سری واستوا صاحب جہاں ہمیں رزمیہ شاعری کو ترقی دینے کی تلقین کرتے ہیں، وہاں وہ اس ترقی کے دو ایک زینے بھی بتا دیتے یا جدید ہندی ادبیات میں سے چند مثالیں پیش

کر دیتے تو عین احسان ہوتا۔

صاحبِ مضمون نے ہندی پر اردو کا اثر واضح کرنے کے لئے پہلے ہندی نظم کو لیا ہے اور اجمالاً بتایا ہے کہ ہندی میں خمریات، شبابیات اور تصوف کا رنگ اور بعض کویتاؤں کی فارسی بحریں اردو نظم کے اثرات کا نتیجہ ہیں۔ چندر بردائی اور ودیاپتی جیسے قدیم شعرا کے ہاں بھی فارسی اور عربی کے الفاظ جا بجا ملتے ہیں اور کبیر صاحب سورداس اور تلسی داس کے بھجن اور دوہے تو ہندو مسلمان دونوں کی معاشرت اور بول چال کے آئینہ دار ہیں۔ مغل دورِ حکومت کے ان ہندو شعرا میں جن کا کلام اسلامی معاشرت کی جھلک کے باعث ممتاز ہے، سیناپتی بھوشن، متی رام گوپال اور عہدِ عالمگیر کے مشہور شاعر بہاری لال خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ غدر کے بعد ہندی شاعری میں کیا کچھ انقلاب آیا اُس کی کیفیت صاحبِ مضمون کی زبانی سنئیے:۔

"غدر کے بعد ہندوؤں میں قومیت کی لہر دوڑ گئی تو ہندی شاعری بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ برج بھاشا اور اَودھی زبانوں کی شاعری اب سنبھالے نہ رہی تھی اور اُن کی جگہ کھڑی بولی کی شاعری رائج ہوئی۔ گریرسن نے اس زبان کو معمولی ہندی کہا ہے اور بتایا ہے کہ یہ اُردو ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ عربی فارسی الفاظ کے بجائے اس میں سنسکرت کے الفاظ زیادہ ہوتے ہیں۔ زبان کا ڈھانچا تو اردو کا ہی رہا لیکن موضوع وہی برج بھاشا کا۔ لیکن جب اس کی کھپت کھڑی بولی میں نہ ہو سکی تو انگریزی خیالات اور قومیت کی جھلک نمودار ہوئی اور شاعری اسی کا نام ہو گیا۔ آخر اس سے لوگ اُکتا گئے اور ہندی میں از سرِ نو تغزل، تصوّف، مطالعۂ قدرت، حمد و نعت، خمریات حتّٰی کہ معاملہ بندی اور رزم آرائی کے مضامین کی کثرت ہونے لگی۔ ہندی میں عروض یعنی پنگل کا استعمال برائے نام تھا۔ لیکن اب اردو کی بعض بحریں خصوصاً رجز و رمل کا استعمال ہونے لگا۔ پروانہ کے عنوان سے ایک نظم مثالاً پیش کی جاتی ہے۔ چند الفاظ کے تغیّر سے اسے اُردو کی نظم کہنا نامناسب نہ ہوگا۔ ؎

دیپک پر پروانے آئے   اپنے پر پھڑکاتے آئے
کرنوں پر بل کھاتے آئے   بڑی بڑی اچھائیں لائے
بڑی بڑی آشائیں لائے
دیپک پر پروانے آئے   (سُمترانندن پنت)

البتہ ہندی میں جو عورت کا خطاب مرد کی طرف ہوتا ہے برابر قائم رہا اور یہ اچھا ہی ہوا ورنہ بہت ممکن تھا کہ ہندی شاعری اپنے پایہ سے گر جاتی۔ خمریات کے سلسلے میں یہاں ہم کوئی مثال نہیں دینا چاہتے۔ صرف اس قدر کہنے پر اکتفا کریں گے کہ خیام کی رباعیات کا منظوم ترجمہ ہندی میں ہو گیا ہے۔ اس کتاب کا نام ہے "خیام کی مدھوشالا" اور اس کے مؤلف بچّن جی کوی ہیں۔ اس کے علاوہ مدھوبالا اور دیگر کتابیں بھی ہندی میں بھی بہت مقبول ہوئی ہیں۔ خیّام کو جو مقبولیت یورپ میں حاصل ہوئی ہے اس سے کہیں زیادہ ہندوستان میں ہو سکتی ہے اگر ان کی رباعیات کا بنگالی مرہٹی گجراتی وغیرہ زبانوں میں بھی ترجمہ کیا جائے۔ جسے اُردو میں تغـزّل کہتے ہیں اس کی پیروی تو ہندی میں نہ ہو سکی لیکن اتنا ضرور ہوا کہ اس کے اثر سے عشقیہ شاعری کو فروغ حاصل ہوا۔ اس میں نفسانیت کا وہ عنصر نہیں ہے جو انشا اور سعادت یار خاں رنگیں کا طرۂ امتیاز ہے، موجودہ ہندی کا شاعر دو مصرعوں میں اپنی وارداتِ دل کہنے کے بعد فوراً حب الوطنی اور انقلاب کی طرف رجوع کرنے لگتا ہے۔ دو بند ملاحظہ ہوں۔

سنتا کا آلوک سر دت   ہے پھوٹ پڑا میرے من میں
جس سے نوجیون کا پربھات   ہوگا پھر جگ کے آنگن میں
میرا سور ہوگا جگ کا سور   میرے بچار جگ کے بچار
میرے مانس کا سورگ لوک   اترے گا بھو پر نئی بار

نعتیہ نظموں کی نسبت اس قدر واضح کر دینا ضروری ہے کہ اس کے کہنے والے عموماً اردو کے ہندو شاعر ہیں۔ سرور جہاں آبادی اور حضور لکھنوی وغیرہ نے بلند پایہ نعتیہ نظمیں لکھی ہیں، جو ہندی کے رسالوں میں بھی چھپ چکی ہیں اور مشہور ادیبوں سے خراجِ تحسین وصول کر چکی ہیں۔ اس کا براہِ راست اثر یہ ہوا کہ بعض اصطلاحی الفاظ مثلاً رسولِ مدنی، آمنہ کا لال، کملی پوش وغیرہ ہندی میں بھی آسانی سے رائج ہو گئے۔"

صاحبِ مضمون کے ان اشارات سے یہ پتہ تو ضرور چلتا ہے کہ ہندی نظم پر اردو کی بعض خصوصیات کا اثر ہوا لیکن افسوس ہے کہ انہوں نے کوئی اچھی مثالیں پیش نہیں کیں۔ بچّن صاحب کی مدھوشالا کے چند بند سننے کا راقم الحروف کو بھی ایک بار اتفاق ہوا تھا بہت خوب کہتے ہیں، مگر بے چارے خیّام کے

ا - لیکن میں پھر بھی یہی کہوں گا کہ تمہاری یہ تشریح بھی نظم سے کچھ کم اُلجھی ہوئی نہیں ہے۔

م - کہنے کو تم جو جی میں آئے کہو لیکن اتنی بات یاد رکھو کہ کسی نظم کے تاثر پر غور کرنا چاہیئے۔ اس نظم کا بھی مجموعی تاثر کامیاب ہے۔ اور اسی طرح یہ سمجھ لو کہ میرا اندازِ تشریح بھی اُس بات کو کافی حد تک ظاہر کر رہا ہے جو مجھے نظم کے مطالعے سے محسوس ہوئی، ہاں ایک بات اور۔ اس نظم کے الفاظ کی آواز دل میں ایک ایسی کیفیت ہے جو مغل عمارتوں کی ترشی ترشائی کیفیات سے ہم آہنگ ہے۔ اگر شاعر فارسی عربی کی بجائے ہندی الفاظ کو کثرت سے استعمال کرتا تو اُن لفظوں کی نرمی اور لوچ کی وجہ سے یہ کیفیت جاتی رہتی۔

ا - اس سے اتفاق ہے۔ لیکن اس وقت تو میرے اپنے ذہن میں جس قدر نرمی اور لوچ تھا وہ بھی جاتا رہا ہے — اچھا میں اب چلتا ہوں۔ پھر ملاقات ہو گی۔

میراجی

نقد و نظر

اردو مثنوی کا ارتقا

از جناب عبدالقادر سروری ایم اے ایل ایل بی تقطیع ۲۰×۲۶/۸ حجم ۲۴۳ صفحے کاغذ اچھا کتابت اور طباعت صاف ستھری قیمت درج نہیں ہے۔ ناشر:۔ سب رس کتاب گھر خیریت آباد۔ حیدرآباد دکن،

یہ کتاب بھی ادارہ ادبیات اردو کے سلسلہ مطبوعات میں سے ہے۔ اس بات کی بہت ضرورت ہے کہ اردو نظم کی تمام اصناف سخن غزل قصیدہ، رباعی، وغیرہ کے متعلق مختلف کتابیں لکھی جائیں۔ جن میں ہر صنف کے ارتقا اور دیگر خصوصیات کے متعلق تفصیلی بحث کی جائے۔ مثنوی کے متعلق یہ کتاب اس ضرورت کو کافی سے زیادہ حد تک پورا کرتی ہے کیونکہ جہاں تک راقم الحروف کے علم کا تعلق ہے اس سے پہلے اردو کی مشہور مثنویوں پر علیحدہ علیحدہ تو بہت کچھ لکھا گیا ہے اور اردو مثنوی کے متعلق بھی ایک آدھ مقالہ تو موجود ہے لیکن اس مسئلے پر کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے۔ اس کتاب میں جس تفصیل سے موضوع زیر بحث کا جائزہ لیا گیا ہے اس کے ظاہر کرنے کو سب سے پہلے اس کی فہرست سے عنوانات کا درج کرنا ضروری ہے۔ ۱۔ مثنوی کا درجہ اصناف شعر میں ۲۔ اردو مثنوی کے اولین نمونے، ۳۔ طویل تر مثنویاں، ۴۔ قدیم مثنوی کا سنہری زمانہ ۵۔ بیجا پور اور گولکنڈے کی مثنویاں ۶۔ مغلیہ عہد کی متصوفانہ اور مذہبی مثنویاں ۷۔ دور متوسط کی ابتدائی مثنویاں ۸۔ دور متوسط میں مثنوی کی ترقی اور ۹ مثنوی جدید دور میں۔

گویا اردو مثنوی کے تمام ادوار کو یہ جائزہ محیط ہے بعض جگہ زیر بحث مثنویوں سے چند مثالیں بھی دی گئی ہیں لیکن اگر مثالوں کا حصہ ہر دور میں کافی حد تک دیا جاتا تو کتاب کی قدر اور بڑھ جاتی۔

"مثنوی دور جدید میں" اس حصے میں جناب سروری نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اُن سے بعض مقامات پر ہمیں اختلاف ہے۔ مثنوی غزل اور دوسری اصناف سخن کی طرح ہمارے ادب کی قدیم اور بنیادی چیزوں میں سے ہے۔ اور جو خصوصیات پہلے اس صنف سے متعلق سمجھی جاتی تھیں وہی اب بھی اس کا طرۂ امتیاز سمجھی جانی چاہئیں۔ یہ مان لیا کہ ادب کے بدلتے ہوئے رجحانات کے ساتھ ساتھ ہر صنف ادب کی بنیادی خصوصیات میں کچھ نہ کچھ تبدیلی ہونا ضروری ہے لیکن جناب سروری نے جدید دور میں بعض جگہ شعراء کی جن نظموں کو مثنوی کہا ہے۔ وہ ہمارے خیال میں صحیح نہیں ہے۔ مثلاً آزاد کی "موسم زمستان" اور دوسری نظمیں۔ اسمٰعیل میرٹھی کی خدا کی تعریف اور دوسری نظمیں، اقبال کی خفتگانِ خواب سے استفسار، سید کی لوح تربت پر انسان اور بزم قدرت، رخصت اے بزم جہاں وغیرہ۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر مصنف نے بیانیہ نظم کی ایک نئی صنف کو اور کوئی نام موجود نہ ہونے کی وجہ سے مثنوی ہی کہہ دیا ہے۔

امید ہے کہ اپنے موضوع پر اس پہلی کتاب کا خیر مقدم نہایت خوبی سے کیا جائے گا۔

تاریخ ادب اردو

(درسی تقطیع حجم ۱۷۶ صفحات کاغذ معمولی کتابت طباعت صاف ستھری قیمت ایک روپیہ چار آنے۔ ناشر:۔ سب رس کتاب گھر رفعت منزل خیریت آباد حیدرآباد دکن)

ادارہ ادبیات اردو اپنے قیام سے لے کر اب تک اردو کی نمایاں خدمت انجام دے رہا ہے۔ زیر بحث کتاب اردو ادب کی ایک پھیلتی ہوئی تاریخ ہے اور ہر وقت کے حوالے کے کام آسکتی ہے۔ دیباچہ مشہور دکنی نقاد ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے لکھا ہے۔ اور اس میں ظاہر کیا ہے کہ ادارۂ ادبیات نے مختلف زبانوں کی مبسوط تاریخ ادب شائع کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ اور یہ ارادہ عمل کی صورت بھی اختیار کر رہا ہے لیکن اس دوران میں ضرورت اس بات کی تھی کہ اردو ادب

کی ایک مختصر سی تاریخ امتحان اردو عالم اور اردو فاضل کے طلبا کی سہولت کے لئے شائع کر دی جائے۔

چنانچہ زیرِ بحث کتاب اسی ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ پہلے حصے میں زبان اردو کی مختصر تاریخ درج ہے۔ نیز اردو ادب کے ابتدائی ارتقا کے مختلف ادوار کا ذکر کیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں دہلی میں اردو ادب کے پہلے سو سالوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس حصے کی دوسری فصل میں دکن میں اردو ادب کے احیاء کا بیان ہے اور دارالترجمہ کے علاوہ انفرادی کوششوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اسی طرح تیسری فصل میں لکھنؤ سکول اور چوتھی فصل میں دہلی کے ادارۂ خیال کی کارگزاریوں کا تذکرہ ہے۔

تیسرے حصے میں جدید دور کے کارنامے ہیں اور اس سلسلے میں اردو صحافت کو فراموش نہیں کیا گیا۔

کتاب کے آخر میں ایک اشاریہ (یعنی انڈکس) کی شمولیت اس کی خاص خوبی ہے جو حوالے میں آسانی پیدا کر سکتی ہے۔

عام طور پر کہا جا سکتا ہے کہ کتاب تفصیلی نہ ہونے کے باعث تشنہ محسوس ہوتی ہے۔ لیکن اس کا مقصد ہی صرف طلبا کو اردو کی تمام تحریکوں اور مختلف ترقیوں سے آگاہ کرنا ہے۔

دستور اصلاح

از سیماب اکبر آبادی۔ درسی تقطیع حجم ۱۴۴ صفحے طباعت کتابت خوب، قیمت ایک روپیہ چار آنے۔ ناشر:۔ مکتبۂ قصر الادب۔ دفتر "شاعر" آگرہ۔

اردو دنیا میں اپنے ادارۂ خیال کی وسعت اور اثر کے لحاظ سے موجودہ شعراء میں جناب سیماب کا نام سب سے پہلے لیا جا سکتا ہے۔ اس لئے اصلاح کلام کے موضوع پر قلم اٹھانے کے لئے آپ کی ذات از بس موزوں تھی۔ اس کتاب میں آپ نے جہاں اس موضوع کا عام جائزہ لیا ہے وہاں اپنے تجربے کے نتائج کو بھی کافی حد تک دوسروں کے فائدے کے لئے پیش نظر کیا ہے۔ سب سے پہلے اصلاح کلام کے مختلف پہلوؤں کا بیان اور جائزہ ہے۔ اس کے بعد ضرورتِ اصلاح سے بحث کی گئی ہے اور اس سلسلے میں باقاعدہ اصول و قواعد پیش کئے ہیں۔ اور اس بنیادی بحث کے بعد نمونے متقدمین و متوسطین، متاخرین اور موجودہ شاعروں کی اصلاح کے مختلف نمونے وضاحت کے طور پر درج کئے گئے ہیں۔

آخر میں محترم مصنف نے اپنے تلامذہ کی مختلف فہرستیں دے کر کتاب کو ذاتی رنگ دے دیا ہے لیکن ان فہرستوں سے پہلے جس قدر مفید مواد اس مختصر سی کتاب میں موجود ہے۔ اس کو دیکھتے ہوئے اس آخری نکتے کو نظر انداز کر دینا چاہئے۔ توقع ہے کہ ملک کے وہ بے شمار نوجوان جو بغیر سوچے سمجھے شاعری کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اس کتاب سے فایدہ اٹھائیں گے۔

کتاب کی قیمت ہمارے خیال میں ذرا زیادہ ہے۔

زبان دانی۔

مؤلفہ جناب فضل الٰہی عارف۔ درسی تقطیع حجم تین سو صفحے۔ کاغذ خاصا کتابت اور طباعت اچھی۔ قیمت ہے: ناشر سار دو اکیڈیمی پنجاب لاہور۔

اردو رسائل اور اخبارات کے ہر روز بڑھتے ہوئے طوفان نے ہر قسم کے لکھنے والوں کے لئے اپنی تخلیقات کی اشاعت کا موقع مہیا کر دیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی ہمارے تعلیمی اداروں میں زبان و ادب کے متعلق وہ دلچسپی نہیں لی جاتی جس کے یہ مستحق ہیں اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا ہے کہ بیشتر لکھنے والے (اور ان میں بعض مشہور اہل قلم بھی ہیں) زبان کے اچھے ماہر نہیں ہیں چنانچہ وہ محض اپنے خیالات اور فن کارانہ مواد کے بل بوتے پر جہاں اپنے لئے ایک قسم کی شہرت مہیا کر رہے ہیں وہاں پڑھنے والوں کو اپنی اغلاط سے لبریز زبان سے گمراہ بھی کر رہے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ عالم فاضل حضرات اس سلسلے میں اپنے علم اور قیمتی وقت کو ملک و قوم کے لئے وقف کریں۔ زیرِ بحث کتاب اس لحاظ سے ایک قابل تعریف اقدام ہے۔

پہلا باب اگرچہ زیادہ تر قواعد زبان کے متعلق ہے لیکن اس میں بھی مؤلف نے یہ التزام کیا ہے کہ عام گرامروں کی طرح خشک انداز میں محض اصولوں کا بیان ہی نہیں کیا بلکہ تحقیق و تصحیح کی طرف اپنی توجہ کو مبذول رکھا ہے۔ اور اس سلسلے میں اُنہی مثالوں کو یکجا کیا ہے جن کے استعمال میں عام طور پر لکھنے والے غلطی کرتے ہیں۔ دوسرے باب میں مختلف اشیا کے متعلقہ الفاظ کو اکٹھا کر کے قاری کی عام معلومات کو وسعت دینے کی کوشش کی ہے۔ یہ باب اپنے مفید مواد کے علاوہ دلچسپی کے لحاظ سے بھی ایک خاص درجہ رکھتا ہے اور تیسرے باب میں روزمرہ کے لحاظ سے "عام بول چال" اور "نسوانی بول چال" کے عنوانات کے تحت میں اچھی اردو کے نمونے پیش کئے ہیں۔ آخر میں ایک مختصر سی فہرست اُن جدید الفاظ کی بھی ہے جو ہماری زبان

میں مغرب کے اثرات اور سیاسیات کی وجہ سے اضافہ ہوئے ہیں۔

اُمید ہے کہ وہ تمام حضرات جو صحیح اردو لکھنا چاہتے ہیں۔ اس کتاب کی قدر کریں گے۔ نیز اس کے دوسرے ایڈیشن میں جناب مؤلف اپنے اس قیمتی اور قابلِ قدر کام کو زیادہ وسیع طور پر پبلک کے لئے تیار کر دیں گے۔

پھول کا سالگرہ نمبر

صفحات ۱۶۸ ایک سہ رنگی اور ۶ یک رنگی تصویریں اس کے علاوہ کارٹون اور مزاحیہ تصاویر ہیں

ادبی تخلیقات میں بچوں کے لئے بڑوں سے کہیں بڑھ کر احتیاط کی ضرورت ہے۔ اور اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو تمام اردو دنیا میں پھول ہی ایک ایسا رسالہ ہے جو متواتر اکتیس سال سے جہاں ہمارے بچّوں کی تفریحِ طبع کا سامان مہیا کر رہا ہے وہیں اُن کے ذوقِ علم و ادب کو بھی تحریک دیتا آ رہا ہے۔

ہر سال کی طرح امسال بھی پھول والوں نے اپنے اس ہر دل عزیز رسالے کا سالگرہ نمبر شائع کیا ہے اور اس کے مرتب کرنے والوں نے اس میں رنگا رنگ کی دلچسپیوں کو اکٹھا کرنے کی کوشش کی ہے جسے اگرچہ گذشتہ سالوں کی طرح تو کامیاب نہیں کہا جا سکتا پھر بھی لائقِ ستائش ہے۔

اس دلچسپ مجموعے میں بڑی عمر کے لوگوں کے رسائل کی طرح کہانی ڈراما، مضمون، نظم۔ ہر صنفِ ادب کی کوئی نہ کوئی شے موجود ہے۔ اور ہر چیز کافی سے زیادہ دلچسپی رکھتی ہے۔ بعض نظموں میں دلچسپی کے باوجود فنی اسقام بھی کہیں موجود ہیں چونکہ اس بات کو بچے نہیں سمجھ سکتے۔ اس لئے یہ معمولی بات ہے۔

پھول کی خوبیوں کا راز اس کے کارپردازوں کی خوش اسلوبیٔ ذوق میں ہے اور اس کامیاب شمارے کی اشاعت پر ہم اس کے مدیر سید امتیاز علی تاج کو مبارک باد کہتے ہیں۔

قیمت غالباً ۸ر آنے ہے جو درج نہیں ہے۔ ملنے کا پتہ دفتر اخبار پھول دار الاشاعت پنجاب لاہور۔

دس نظمیں

از فیض لدھیانوی۔ یہ اخلاقی اور اصلاحی اشعار کا دلچسپ مجموعہ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے دس نظموں پر مشتمل ہے۔ اگرچہ کچھ نظمیں "تہذیب جدید" اور "مژدۂ بہار" جیسے رنگین عنوانات اور کچھ "تجارت" اور "ہمدردی" جیسے بظاہر خشک موضوعات پر لکھی گئی ہیں۔ لیکن زبان کی پاکیزگی اور بیان کی سادگی نے اُن میں ایک ایسی کشش اور دلآویزی پیدا کر دی ہے۔ جو دس بارہ برس کی عمر کے بچوں کو عموماً مرغوب ہوتی ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ ان نظموں کا مقصد بھی نونہالانِ قوم کی اصلاح ہی ہے ہر نظم شروع سے آخیر تک یکساں طور پر "اخلاقیات" اور "قومیات" کی ایک خوبصورت مگر یک رنگی تصویر ہے۔

اس مجموعہ کی قیمت ۸ر آنے اور ملنے کا پتہ ریاض بکڈپو۔ محلہ دارا شکوہ۔ لاہور ہے۔

"دم"

ڈاک کے ڈاکوادبی دنیاہر ماہ کی ۱۵ تاریخ تک خریداروں کے پاس پہنچ جاتا ہے اگر اس تاریخ تک آپ کو پرچہ نہ ملے تو ایک شکایتی کارڈ اپنے حلقے کے سپرنٹنڈنٹ آفس کو لکھئے اور ایک کارڈ ہمیں تاکہ پرچہ آپ کو دوبارہ بھیجا جائے اور محکمۂ ڈاک کے دروازے پر ایک اور دستک دی جائے۔ مینجر

فہرستِ مضامینِ ادبی دُنیا لاہور

بابت ماہ دسمبر ۱۹۴۰ء

جلد ۱۸ — تصویر: لندن میں سرما — نمبر ۱۲

چندہ سالانہ مع محصول ڈاک اور وی پی پانچ روپے ممالک غیر سے دس شلنگ

گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام صلاح الدین احمد پرنٹر و پبلشر چھپ کر دفتر ادبی دنیا دیال سنگھ مینشن مال لاہور سے شائع ہوا۔

دنیائے کاروبار

نیشنل ایوننگ کالج ۔ ۶ ایبٹن روڈ لاہور یہ کالج میٹرک ایف اے، اور بی، اے کے طالب علموں کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے نہایت قابل اور محنتی پروفیسروں نے شروع کیا ہے ۔ کالج کے پرنسپل پرشوتم لال ضیا ایم اے ہیں جن کی تعلیمی سرگرمیوں سے اہل پنجاب اچھی طرح واقف ہیں ۔ جو طالب علم کسی بھی مضمون میں کمزور ہوں ۔ اس کالج میں داخل ہو کر اپنی کمزوری رفع کروا کر نمایاں اور یقینی کامیابی کی پوری امید رکھ سکتے ہیں ۔ .... لڑکیوں کے لئے خاص انتظامات ۔ شرح فیس بالکل واجب اس انسٹی ٹیوشن کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ ملک کے فاضلان علم و فن گاہے گاہے اپنی خداداد بیش قیمت تقریروں سے طلبا کو مستفیض فرماتے رہیں گے ۔

ہمیں یقین واثق ہے کہ کالج ہذا ضیا صاحب کی زیر سرپرستی پبلک کی خدمات نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دے گا ۔ ہم اس کی ترقی کے لئے دعا گو ہیں ۔ مزید تفصیلات کے لئے خود تشریف لائیں یا کالج کے سیکرٹری سے خط و کتابت کریں۔

مغل لائن سب سے پرانی اور بہترین جہاز راں کمپنی ہے جس کے ذریعہ سے ہر سال ہزارہا حجاج زیارت حرمین سے مشرف ہوتے رہتے ہیں اس کمپنی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ حاجیوں کو ہر طرح کا آرام پہنچانا اس کمپنی کے کارکنوں کا مطمع نظر ہوتا ہے ۔ جہاز نہایت کشادہ، صاف ستھرے اور حفظان صحت کے جدید ترین اصولوں کے مطابق تیار کئے گئے ہیں ۔ غذا صحت بخش اور خواہش کے مطابق دی جاتی ہے ۔

آج جب کہ جنگ کے مہیب بادلوں نے تمام یورپ کو گھیرا ہوا ہے اس کمپنی کی علو ہمتی میں کچھ فرق نہیں آیا ۔ اس عظیم الشان کمپنی نے حکومت کے مشورہ سے حجاج کو لے جانے کا فیصلہ کر لیا ہے ۔ جنگ سے پیدا شدہ صورت حالات کے پیش نظر جہازوں کی روانگی کی صحیح تاریخیں مقرر نہیں ہو سکیں اس لئے کمپنی مذکورہ نے اعلان کیا ہے کہ بمبئی سے جانے والے زائرین ۱۶ / دسمبر تک اور کراچی سے جانے والے تمام زائرین ۱۹ / دسمبر تک کراچی پہنچ جانے لازمی ہیں ۔ شرح کرایہ کے لئے اسی شمارہ میں مفصل اشتہار ملاحظہ فرمایئے گا ۔ ہمیں اپنے ناظرین سے توقع ہے کہ وہ حج کے موقع پر اس بین الاقوامی شہرت کی مالک حج لائن کی خدمات سے فائدہ اٹھائیں گے ۔

سن لائیٹ صابون سن لائیٹ صابون نے جو دنیا میں شہرت حاصل کی ہے وہ قابل تعریف ہے ۔ کپڑوں کے لئے بہترین ڈاکٹر ہے ۔ اکثر ہندوستانی اس سے سر اور بدن کو صاف کرتے ہیں ۔ مگر درحقیقت اس سے کپڑے سوتی اور اونی دھوئے جاتے ہیں ۔ اس کی تعریف اشتہار کی عبارت سے ہی واضح ہو جاتی ہے کہ کس قدر یہ صابن مفید ہے ۔ وہ صنف نازک کی زبان سے ملاحظہ فرمائیے:۔

> اب میں سن لائیٹ صابون ہی کو استعمال کرتی ہوں ۔ یہ صابون کپڑوں کو حقیقی معنوں میں صاف کر دیتا ہے ۔ میری پڑوسن کے کپڑے میرے کپڑوں کی نسبت بہت کچھ صاف ستھرے نظر آیا کرتے تھے ۔ اور میں اپنے دل میں سوچا کرتی کہ نہ جانے اس کے پاس کیا جادو ہے جو اس کے کپڑے ہمیشہ چمکتے دمکتے ہیں آخر مجھے پتہ چلا کہ یہ سن لائیٹ صابون کو استعمال کرتی ہے ۔ میں نے اس کی کیفیت پوچھی تو اس نے بتایا کہ سن لائیٹ سے کپڑوں کے دھونے میں بڑا فرق پیدا ہو جاتا ہے ۔ کیونکہ سن لائیٹ بلسبت دیگر صابونوں کے زیادہ جھاگ دیتا ہے اور جھاگ ہی سے کپڑوں کا میل نکلتا ہے ۔
>
> میں خود بھی سن لائیٹ کو آزما چکی ہوں ۔ اور میں نے بھی اب اس فرق کو جان لیا ہے ۔ سن لائٹ صابون ہی کے جوہر کی بدولت میرے سفید کپڑے اب حقیقی معنوں میں سفید رہتے ہیں۔

اچھی کتابیں زندگی کو اچھا بناتی ہیں

لیکن ہر شخص کو اچھی اور بری کتابوں میں تمیز کا موقعہ حاصل نہیں۔ خصوصاً آج کل کے تیز رفتار زمانے میں جب کہ ہر بری چیز اپنا ظاہری دلکش لباس پہنے نگاہوں کو دھوکا دینے کے لئے ہر طرف موجود رہتی ہے۔ اس دھوکے سے بچنے کے لئے سکون اور وقت کی ضرورت ہے ان وجوہات کے مدنظر کتبخانہ ادبی دنیا لاہور نے فیصلہ کیا ہے کہ ادبی دنیا کے پڑھنے والوں اور عام پبلک کے لئے وقتاً فوقتاً چنی ہوئی کتابوں کی مختلف فہرستیں شائع کی جائیں۔ اس انتخاب کی ضمانت صلاح الدین احمد اور میراجی مدیران ادبی دنیا کا نام ہے۔ انہوں نے نہایت محنت اور وقت صرف کرنے کے بعد یہ انتخاب کیا ہے۔ اور جو بلند نظری اور معیار کی خوبی ادبی دنیا کے مضامین میں دکھائی دیتی ہے۔ اُسی کا لحاظ ان فہرستوں میں بھی رکھا ہے۔ ناظرین کی آسانی کے لئے یہ تمام کتابیں کتب خانہ ادبی دنیا میں فراہم کرلی گئی ہیں تاکہ ایک ہی جگہ سے بغیر کسی دقت کے آپ کو یہ چنی ہوئی کتابیں مل سکیں۔ ہمیں امید ہے کہ ہر باذوق ناظرین ان فہرستوں کا مطالعہ کرکے ان سے فائدہ اٹھائیں گے۔

نام کتاب و مصنف	قیمت	نام کتاب و مصنف	قیمت	نام کتاب و مصنف	قیمت
افسانے		ساز فطرت — حسن عزیز جاوید	عہر	مینا — حکیم احمد شجاع	۱۲ر
فردوسِ خیال — منشی پریم چند	عہر	محبت اور نفرت — اختر حسین رائے پوری	عہر	ہملٹ — مترجمہ عنایت اللہ دہلوی	عہر
پریم پچیسی اول و دوم — ״	ے ہر	ہیبت ناک افسانے — امتیاز علی تاج	عہر	فاؤسٹ — گوئٹے	عہر
نظارے — کرشن چندر	عہر	**مزاحیہ**		چند ٹوپیاں — نور الٰہی محمد عمر	۸ر
منٹو کے افسانے — سعادت حسن منٹو	عہر	پطرس کے مضامین — احمد شاہ بخاری	عہر	چند ڈرامے — ״	۸ر
سحرِ فرانس — طاہر قریشی	عہر	حاجی لق لق کے افسانے — حاجی لق لق	۱۱ر	**منظومات**	
دانہ و دام — راجندر سنگھ بیدی	عہر	مطائبات — سندباد جہازی	عہر	بانگِ درا — اقبال	عہر
باسی پھول — سید علی عباس حسینی	عہر	جدید جغرافیۂ پنجاب — ״	عہر	نغمۂ حرم — اختر شیرانی	عہر
شعلے — پروفیسر احمد علی ایم اے	عہر	دنیائے تبسم — شوکت تھانوی	عہر	نقش و نگار — جوش ملیح آبادی	عہر
سوزِ ناتمام — عاشق حسین بٹالوی	عہر	مضامینِ فلک پیما — فلک پیما	عہر	فکر و نشاط — ״	عہر
چغتائی کے افسانے — مرزا عظیم بیگ چغتائی	ے ر	روحِ لطافت — مرزا عظیم بیگ چغتائی	عہر	بہارستان — مولانا ظفر علی خاں	للعہ ر
صنوبر کے سائے — حجاب امتیاز علی	عہر	روحِ ظرافت — ״	عہر	سوز و ساز — حفیظ جالندھری	عہر
میری ناتمام محبت — ״	عہر	کولتار — ״	عہر	نغمہ زار — ״	عہر
طلسمِ خیال — کرشن چندر	عہر	**ڈرامے**		گیت مالا	۶ر
اندھی دنیا — اختر انصاری	عہر	انارکلی — امتیاز علی تاج	عہر ۱۲ر	آتش خاموش — احسان دانش	عہر
ڈاچی — اپندر ناتھ اشک	عہر	ریڈیو ڈرامے — فضل حق قریشی	عہ	چراغاں — ״	عہر
پسِ پردہ — چندر بھوشن سنگھ	۱۲ر	منقوش — حکیم احمد شجاع	۸ر	نقشِ دوام — عبد الحمید عدم	عہر

مینجر کتب خانہ ادبی دنیا۔ دی مال۔ لاہور

بزمِ ادب

دسمبر کا ادبی دنیا معمول سے کچھ پہلے شائع ہو رہا ہے تاکہ سالنامہ جو درحقیقت جنوری کا شمارہ ہے، دسمبر ہی میں آپ کو مل جائے، ورنہ جنوری کے آغاز میں تو بہر حال پہنچ ہی جائے گا جو اصحاب مینجر کے نام رجسٹری کے ٹکٹ بھیج دیں گے وہ اپنا پرچہ ڈاک خانے والوں کی دستبرد سے محفوظ رکھنے میں کسی حد تک ضرور کامیاب رہیں گے۔

موجودہ شمارے میں "تاریخ ادب اردو کا الزام بابو سکسینہ پر" جناب مختارالدین احمد آرزو کا ایک نہایت بیش قیمت اور پر از معلومات تحقیقی مضمون شائع ہو رہا ہے، جسے صاحبِ مضمون نے نہایت وسیع مطالعہ کے بعد لکھا ہے جناب آرزو کا اندازِ تحقیق ایک مثالی چیز ہے، اور یہ واقعہ ہے کہ جب تک ہم نے یہ مضمون نہیں پڑھا تھا، ہم یہ قیاس کر ہی نہیں سکتے تھے کہ ہمارے اول درجے کے مصنف اور تذکرہ نگار بھی اپنی علمی کاوشوں میں اس حد تک بے پروائی یا غیر ذمہ داری سے کام لیتے رہے ہیں۔ اور بعض جگہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے، مثلاً آبِ حیات کے بعض ایسے لطائف کے سلسلے ہیں، جو اب ہماری ادبیات کے غیر فانی اجزا بن چکے ہیں، کہ مصنف نے اپنی کسی لطیف ایجاد کو روایت کا درجہ دے کر اس کے بقائے دوام کا تو سامان کر دیا۔ لیکن حقیقت اور واقعیت اب اُس کا گریبان قیامت سے پہلے نہیں پکڑ سکتیں۔

اس دفعہ کے سبھی افسانے چھوٹے چھوٹے لیکن بقیمت بہتر ہیں جناب رہبر نے ایک اچھوتی نفسیاتی کیفیت کو اپنا موضوع بنایا ہے، اور ہمارے نوجوان طبقے کی معاشرت کے ایک ایسے گوشے کو بے نقاب کیا ہے، جو ہمارے "ترقی پسند" مصنفین کی نگاہ سے اب تک اوجھل تھا۔ کاش کہ یہ لوگ ان راہوں پر بھی اپنے قدم ڈالیں اور بے چارے مزدور کو تھوڑی دیر کے لئے سانس لینے دیں۔

پروفیسر کنہیا لال صاحب کپور ہماری بزم میں پہلی بار شریک ہو رہے ہیں۔ پروفیسر کپور اُن چھپے رستموں میں سے ہیں جو عموماً اپنے پنجۂ فولاد پر تجاہلِ عارفانہ کا ریشم لپیٹے رکھتے ہیں۔ لیکن ایک بار کی پکڑ ہی میں اُن کے جوہر عیاں ہو جاتے ہیں۔ آپ نے ایک ہلکا پھلکا "مزاحیہ مبالغہ" ہمیں عنایت کیا ہے انگریزی ادب میں یہ صنف معروف ہے، اور اب ہمارے ہاں بھی رواج پکڑتی جا رہی ہے۔ کردار کی خصوصیات کو کھینچ تان کر یہاں تک نمایاں کرنا کہ وہ ایک تصویری کارٹون بن جائے، اس صنفِ ادب کا امتیاز ہے۔ کپور صاحب کا "آرٹسٹ" اسی قبیل سے تعلق رکھتا ہے، امید ہے کہ پروفیسر صاحب ادبی دنیا کو اپنے گہرے مطالعے اور وسعتِ نظر سے استفادہ کرنے کے مواقع آئندہ بھی بہم پہنچاتے رہیں گے۔

مردم آزاری لکھ کر جناب "حیات" نے ذہنِ انسانی کے بعض نہایت دلچسپ اسرار کی غمازی کی ہے۔ اس پر ان کے لطفِ بیان نے گویا سونے پر سہاگے کا کام دیا ہے۔ "حیات" واقعی اسم بامسمیٰ مصنف ہیں۔ ان کی "سونے میں پیلی" کی مخالفت اور موافقت میں ہمیں متعدد خطوط موصول ہوئے ہیں اور یہی ان کے افسانوں میں زندگی کی دھڑکن کا قطعی ثبوت ہے۔

محمد فاروقی صاحب کی ہارجیت اوسط درجے کے ہندوستانی گھرانوں کی روزانہ ہارجیت کا ایک نہایت دلکش اور صحیح مطالعہ ہے، جس کی تفاصیل اور جزئیات پڑھنے ہی سے تعلق رکھتی ہیں۔

اور اب آپ سالنامے کے متعلق کچھ تفاصیل معلوم کرنے کے منتظر ہوں گے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم سردست بجز اس گذارش کے کہ سالنامہ انشاءاللہ ہر لحاظ سے ادبی دنیا کی روایات کے مطابق ہوگا اور کچھ کہنے سے قاصر ہیں، خدا کرے کہ ہماری کوششیں اور آپ کی توقعات اس طرح پوری ہوں کہ ہمیں فلک کی کج روی کی اور آپ کو ادارے کی کم نگہی کی مطلقاً کوئی شکایت نہ رہے۔

صلاح الدین احمد

(۲)

اس ماہ اگرچہ سالنامے کی گہما گہمی ہے لیکن دسمبر کے شمارے میں بھی اچھی اور جاذبِ نظر چیزوں کی کسی طرح سے کمی نہیں رہی۔ "فریبِ تخیل" ہی کو لیجئے۔ اس نظم کا شاعر (اختر اورینوی) اگرچہ بظاہر ایک کمرے کے مختصر سے ماحول میں محبوس ہے اور اُس کی توجّہ اُس کمرے کی مختلف چیزوں پر مرکوز لیکن حقیقتاً اُس کا ذہن ماضی کے اس وسیع اور بے پایاں دور میں نفوذ کر گیا ہے جس کی دلکشی ہر لمحہ ایک بے پناہ طاقت کا اظہار کرتی رہتی ہے اور شاعر کو کبھی تھکنے نہیں دیتی۔ لیکن اس نظم کی پرداز ایک چھچھلتی ہوئی راگنی ہے، شاعر ایک نہایت مختصر لمحے کے لئے ماضی میں کھو جاتا ہے اور اُس کی یہ گم شُدگی محض ایک احساس ہے ——— وہ کمرے میں داخل ہوتا ہے اور کمرے میں پڑی ہوئی اشیاء اُسے ذرا کی ذرا حال سے لڑکھڑا کر ماضی کی طرف جھکا دیتی ہیں۔ نظم کا موضوع جذباتی ہے لیکن اندازِ بیان حقیقت سے ہم آہنگ۔ اور شاعر نے "لکس صابن" ——— "الماری" ——— "شیشے کا گلاس" ——— اور "سینٹ کی شیشی" ایسی مادی چیزوں سے تلازمِ خیال کے ذریعے سے جو شعریت پیدا کی ہے وہ غور کے لائق ہے اس نظم کا شاعر اپنے احساسات کے اظہار میں بے باک ہے۔

لیکن "رات" کا شاعر (سیف الدین سیفؔ) ایک جھجکتا ہُوا فن کار ہے۔ اُسے ایک منظر سے اپنے جذبۂ عشق کے باعث ملال انگیز کیفیت کا احساس ہوتا ہے مگر وہ اپنی فطری جھجک کی وجہ سے اس کیفیت کا واضح اظہار نہیں چاہتا اور اسی لئے وہ ایک غیر شعوری ذہنی عمل کے ماتحت بیانیہ انداز اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن اُس کا جذبۂ عشق شدید ہے اور اُس کا احساسِ ملال شدید تو اُس کے تمام بیان سے وہ غمِ دل آشکار ہے جسے وہ چُھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔ چوتھے بند کے آخری مصرعے میں صرف لفظ "بھی" ہے جو اس کی چغلی کھا رہا ہے۔

"ایک منظر" میں شاعر (مسعود شاہد) نے فضا کو خوب قائم کیا ہے۔ اِس نظم کا مطالعہ، جو بظاہر محض ایک مطالعۂ فطرت ہے، پڑھنے والے پر ایک خاموشی بلکہ غنودگی سی طاری کر دیتا ہے۔ تمام منظر ایک ساکن کیفیت لئے ہوئے ہے۔ لیکن اس سکون میں بھی حرکت موجود ہے "جگنو کا نور رقصاں ہے" ——— "وہ تارا ٹوٹا ہے اک آسماں سے" ——— "ہر اک شاخ نے لی انگڑائی" ——— "ٹپک کے اشک مرادے رہا ہے اس کا جواب" ——— اور یہ مختلف حرکتیں بھی منظر کے سکون کو بڑھا رہی ہیں۔

"تحریک" (از ظفر زبیری) ایک نفسیاتی چیز ہے۔ انسانی جبلّت کا ہر تشنہ پہلو نیا راستہ تلاش کر کے تکمیلِ آرزو کا باعث بنتا ہے۔ شاعر جب محبوب سے نہیں مل سکتا تو فرقت کا درد بھرا گیت گا کر اپنے جذبات کو فن کی صورت میں ڈھال دیتا ہے۔ گذشتہ اگست کے ادبی دنیا میں اسی قسم کی ایک نظم "بیماری کی خبر" (از احتشام حسین ایم اے) شائع ہوئی تھی لیکن اُس میں غور و تفکّر کو بہت دخل تھا۔ اُس میں شاعر ایک معمولی سی بات سے برانگیختہ ہو کر سماجی اور اقتصادی نظام پر غور کرنے لگتا ہے لیکن اِس نظم کا ہیرو تحریک پاتے ہی پلٹا کھاتا ہے، اُس کے دل کا درد گویا ایک کروٹ لیتا ہے اور اس کروٹ ہی سے قلبِ ماہیّت ہو جاتی ہے۔

والشاد کلانچوی کے "انتظار" سے ظاہر ہے کہ کسی نے وعدہ کیا ہے اور شاعر کو اعتماد ہے کہ یہ وعدہ وفا بھی کیا جائے گا۔ شروع میں وہ سوچتا ہے کہ شاید وہ نہ آئے، نہ آسکے اور اُس کے ذہن کو نہ آنے کے اسباب سوجھتے ہیں لیکن ان اسباب کا رد، اُن اندیشہ ناک خیالوں کو دور کرنے کے لئے، مٹانے کے لئے، مصرعوں کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے۔ نہ آنے کا باعث گھر کے لوگ یا راہ میں رات کا اندھیرا ہو سکتا ہے لیکن "نیند کے ماتے سو چکے ہوں گے، اب اُسے کون آنے سے روکے؟ ——— اور اگر "راہ پر پھیلی ہے تاریکی" تو اُس بھیانک سمے سے بے پروا" ہوا جا سکتا ہے کیونکہ "حُسن کی شعلہ باریاں" مشعلِ راہ بن سکتی ہیں ——— اس ردّ و کد کے بعد ایفائے وعدہ کا یقین پختہ ہو جاتا ہے اور یہی پختگی آخر میں اُس کے ذہن کو عشرت کے خیالات کی طرف لے جاتی ہے۔ اس نظم کا یہ پہلو خصوصاً لائقِ غور ہے۔ اردو کے شعراء یا عام اذیت پرست شعراء عموماً فراق یا انتظار کے لمحوں میں اپنی پست ہمّت کا اظہار کرتے اور تاریک پہلو کو مدِ نظر رکھتے ہیں، اس نظم میں یہ بات نہیں اور اسی لئے انتظار جو موت سے سخت ہوتا ہے یہاں ایک زندگی سے لبریز خوشگوار کیفیت سے ہم آہنگ ہے۔

میراجی

آئینۂ عالم

سٹالن کے دشمن

اگرچہ سٹالن کو روس کا نظامِ حکومت سنبھالے کافی مدت ہوچکی ہے اور خیال کیاجاتاہے کہ اب سٹالن کی طاقت کو کوئی بھی نہیں توڑ سکتا مگر آج کل بھی روس سے باہر سٹالن کے دشمنوں کی کافی تعداد موجود ہے جو ہر وقت اس کے زوال کے منتظر ہیں۔ ان میں سے بعض تو اشتراکیت کے ہی مخالف ہیں اور اشتراکیت کے اس بڑے بُت کو توڑنے کے لئے مضطرب ہیں اور بعض کو سٹالن سے ذاتی مخالفت اور پرخاش ہے۔ ان لوگوں میں ملوکیت پسند بھی ہیں اشتراکی بھی اور جمہوریت کے شیدائی بھی۔ اِن لوگوں کے آپس میں اصولی اختلافات بھی ہیں مگر وہ ایک بات پر ضرور متفق ہیں کہ سٹالن کو روسی آمریت سے ہٹایا جائے ان لوگوں کا سب سے بڑا رہنما لیون ٹراٹسکی تھا جو میکسیکو میں مقیم تھا اور دو ماہ ہوئے قتل کردیاگیا ہے۔ خیال کیاجاتا ہے کہ اس کے قتل میں سٹالن کی پارٹی کا ہاتھ ہے مرحوم نے بھی مرتے وقت کچھ اسی قسم کے خیال کا اظہار کیا تھا۔ اگرچہ اب ٹراٹسکی اس دُنیا میں نہیں رہا مگر خیال کیا جاتاہے کہ اس کی پارٹی نے کسی اور شخص کو اپنے میں سے راہنما ضرور بنایا ہوگا جو سٹالن کے زوال کا منتظر ہوگا۔

ٹراٹسکی کے بعد روس کی بادشاہت کا طالب شاہی خاندان کا ایک رکن ولیڈیمر رومانوف ہے جو گرینڈ ڈیوک سیرل کا بیٹا ہے۔ وہ نہایت تنومند، بلند قامت اور خوبصورت انسان ہے اور آج کل برٹنی کے ایک قصبہ سینٹ برگ کے ایک کارخانے میں ملازم ہے۔ اُس نے آجکل اپنا نام تبدیل کرلیاہے اور وہاں کے حلقوں میں سٹنسلس مخلوف کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی پارٹی کے لوگوں کا یقین ہے کہ جس نظام کو لینن نے تباہ کیا تھا وہ اسکے ہاتھوں پھر سے قائم ہوگا چونکہ لینن اور اس کے نام کا پہلا حرف ولیڈیمر ہے اس لئے وہ لوگ کہا کرتے ہیں کہ ایک ولیڈیمر نے ملوکیت کو تباہ کیا ہے تو دوسرا ولیڈیمر اسے پھر قائم کرے گا!

سٹالن کا تیسرا دشمن الیگزینڈر کیرن سکائی ہے۔ اس کی عمر اس وقت ۵۵ سال ہے اور وہ امریکہ میں مقیم ہے۔ یہ ۱۹۱۷ء کی جمہوریت کا جسے لینن نے تباہ کرکے اس کے بجائے اشتراکی حکومت قائم کی تھی وزیر اعظم تھا ۲۴ سال گزرنے پر بھی اس کے دل میں حکومت کی آگ بدستور بھڑک رہی ہے۔ اِسکے متعلق بیان کیاجاتاہے کہ وہ ایک آتش نوا خطیب اور زبردست ادیب ہے لیکن اس میں قوتِ عمل بالکل مفقود ہے۔ اس کی یہی خامی اس کے زوال اور لینن کے عروج کا باعث بنی۔ اور اُسے جان بچانے کے لئے امریکہ میں پناہ لینی پڑی۔

یہاں آکر اس نے برسبین کے ایک امیر تاجر کی لڑکی سے شادی کر لی۔ اب میاں بیوی دونو سٹالن کے زوال کے خواب دیکھا کرتے ہیں اور اس دن کی آرزو میں جی رہے ہیں جب وہ روس واپس جاکر پہلا سا اقتدار حاصل کرینگے۔ یہ دونوں اس وقت تک سٹالن اور اشتراکیت کے خلاف بہت سا لٹریچر شائع کرچکے ہیں۔ گئی جنگ کے شروع میں اُنہوں نے ایک انٹرویو کے دوران میں بیان کیا تھا۔ اگر جنگ کی وجہ سے روس کی صورت حال بگڑ گئی تو وہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کرینگے۔!

سٹالن کا چوتھا دشمن امیر البحر کڈرف ہے جو ۱۹۱۶ء میں زارِ روس کے بحری بیڑے کا امیر البحر تھا اور انقلاب آنے پر اسے بھی دیگر ملوکیت پسندوں کی طرح روس سے بھاگنا پڑا۔ یہ بھی آج کل غربت اور جلاوطنی کی زندگی بسر کررہا ہے۔

امیر البحر کڈرف کے بعد جنرل کوٹی پف کا نام لیاجاتاہے جنرل موصوف ۱۹۳۰ء تک روس میں ایک اعلٰے فوجی عہدے پر ممتاز تھا اور گمان بھی نہیں کیاجاتا تھا کہ یہ بھی سٹالن کے دشمنوں کی صف میں مِل جائے گا۔ مگر ۱۹۳۰ء میں وہ اپنے عہدے کو چھوڑ کر نہایت پُراسرار طریقے سے بھاگ نکلا۔

۱۹۱۷ء کی جمہوریت کا وزیر خارجہ پروفیسر پال۔ ملی کوف بھی سٹالن کے مخالف محاذ میں شامل ہے اور اسکے دشمنوں میں نمایاں حیثیت کا مالک ہے۔ اور اسکے

عہد میں بھی وہ لبرل پارٹی کا لیڈر تھا۔ ریکل ابراموودش اور نفسیوڈ رداں کی سرکردگی میں بھی منشویک سٹالن کا تختۂ حکومت اُلٹنے کی سازشیں کر رہے ہیں اور ان کے عزائم سے ہمدردی رکھنے والے دُنیا کے ہر حصّہ میں موجود ہیں ان کے علاوہ پال سکوردپالوسکی اور گریگوری برسٹودسکی بھی سٹالن کے پُرانے دُشمن ہیں۔ ان میں پہلا شخص یورپ میں سٹالن کے دُشمنوں کا لیڈر ہے۔ اس کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ یہ ہٹلر کا ایجنٹ ہے اور اس کے اشاروں پر ناچ رہا ہے۔ دوسرا شخص گریگوری برسٹودسکی پہلے تو سٹالن کا حامی تھا اور ایک روسی سفیر کا اتاچی تھا۔ مگر بعد میں اس کے مخالفین کے ساتھ مل گیا۔

لیکن کیا یہ لوگ اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے؟ اس سوال کا جواب وقت خود دے گا۔ مگر اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اگر کبھی سٹالن کے خلاف کوئی سازش ہوئی تو ان میں سے ہر ایک صورتِ حال سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے گا۔

تابش صدیقی

شعر

[illegible]

میر تقی

غزل

کہہ کہہ کے رقیب کے فسانے ‏ ‏ آئے ہیں مجھے وہ آزمانے

بے ربط سی راگنی ہیں ہے ہے! ‏ ‏ پھر یاد لگی ہے گنگنانے

خود آپ ہی آپ بُجھ رہا ہے ‏ ‏ کیا ہو گیا دل کو ہم نہ جانے

کچھ تو دورِ فلک نے لوٹا ‏ ‏ باقی جو رہا تیری ادا نے

دیتا ہوں فریب دل کو ورنہ ‏ ‏ ہم جانتے ہیں ترے بہانے

آتے ہیں وہ دیکھو ڈگمگاتے ‏ ‏ "آنکھوں میں بھرے شراب خانے"

ننھے ننھے سے جگمگاتے ‏ ‏ نازک سی پلک پہ سو فسانے

رُخ پر نہ لٹیں بکھر گئی ہوں! ‏ ‏ کیوں چاند کو لے لیا گھٹا نے؟

رنجور نہیں میں بھول سکتا!

وہ موسمِ گُل، وہ دن سہانے

رنجور عظیم آبادی

رات

چاندنی اور ملول تنہائی

اک حسیں لاش پیکرِ کہسار ـــ زندگی نوحہ، بے اثر، خاموش
وادیاں حلقۂ طلسمِ خیال ـــ کائنات اک فغاں مگر خاموش

نیم کا پیڑ، سرنگوں شاخیں ـــ ایک بے برگ و بار ٹہنی پر
سوچتا ہے، اُداس بیٹھا ہے ـــ کوئی طائر، شکستہ پر طائر

چاندنی، جھیل، ندّیاں، چشمے ـــ دشت، کہسار، کھیت ویرانے
حسن کی ناتمام تصویریں ـــ عشق کے ناتمام افسانے

عشق کی سوگوار راتوں میں ـــ تم نے محسوس کی ہے تنہائی؟
درد کے جاں گداز لمحوں میں ـــ کیا تمہیں بھی کسی کی یاد آئی؟

دور تک ماورائے حدِّ نظر ـــ یوں فسردہ نگاہ تکتی ہے
زندگی انتظار ہے جیسے ـــ آنے والے کی راہ تکتی ہے

چاندنی اور ملول تنہائی

سیف الدین سیف

لیل و نہار

نہ کر سکے گی کبھی میرے ذوقِ دید کو کم — سحر کے وقت گلوں پر پڑی ہوئی شبنم
چمن میں عام ہے کیوں دلنوازیٔ فطرت — جلائے آئینۂ دل ہے گریۂ پیہم

مری نگاہ میں تاریک ہے جہاں اے دل — اگر ہو سوزِ محبت سے بارشِ انوار
حقیر ذرّے چمک کر ہوں آسماں پیما — غبارِ منزلِ ہستی ہو آئینہ بردار

مآلِ گل سے اگر آشنا نہ ہو بلبل — چمن میں آشیاں بندی کا ذوق ہے بے سود
ستم طرازیٔ صیّاد کا گلہ کیسا؟ — حریفِ برق یہاں ہوگی داغِ دل کی نمود

مری حیات وہ عقدہ ہے پیچ ہا در پیچ — جسے نہ کھول سکا تیرا ناخنِ تدبیر
نہ دے خرابِ محبت کو فرصتِ نالہ — کماں سے نکلا تو واپس نہ آئے گا پھر تیر

دھڑک رہا تھا ابھی دل ابھی ہے کیوں خاموش — کہ میکدے سے اٹھی ہے صدائے نوشانوش
غلط ہے زاہدِ نافہم تیرا اندیشہ — خدا گواہ کہ انورؔ نہیں ضمیر فروش

لطیف انورؔ

بدلے گا کروٹ درد ترا اور درد وطن بن جائے گا،
اب تک تو یہ صرف رُلاتا تھا، اب خون مرا کھولائے گا،
اشکوں کی بجائے آنکھوں سے اب پھوٹ پڑیں گے انگارے،
میری آہیں بن جائیں گی لرزاں شعلوں کے گہوارے،
محکوموں کی آزادی کے لئے میں اپنی جان لڑا دوں گا،
اور استبداد کے ایوانوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا،
میری تحریر کے پردوں میں شعلے ناچیں گے، گائیں گے،
میری تقریر کے تیور بھی کوندے کی لپک دکھلائیں گے،
میں سنگینوں کے پہرے میں بھی گیت وطن کے گاؤں گا،
اور گاتا گاتا پھانسی کے تختے پر بھی چڑھ جاؤں گا۔

ظفر زبیری

دو رُباعیاں

(۱)

افلاک کی حد سے کالے کوسوں دُور
اس خاک کی حد سے کالے کوسوں دُور
دنیائے بے خودی عجب جنّت ہے
ادراک کی حد سے کالے کوسوں دور

(۲)

جذبات شر طراز توبہ توبہ
حالات جگر گداز توبہ توبہ
اس طور تو ایک پل بھی جینا معلوم
دن رات خطر نواز توبہ توبہ

عبدالرحمٰن وفا

ملتی جلتی کہانیاں

آج سناتا ہوں میں سن لو مجھ سے کہانی لہروں کی
پہلے تو تھی دل کو بھاتی میٹھی بانی لہروں کی
رات نے اپنا جال بچھایا، روٹھی رانی لہروں کی
چندرماں نے پل میں بدلی نرم روانی لہروں کی
بے چینی کے ساز پہ گیت سنایا زبانی لہروں کی
جوش میں آئی اندھی جوانی آنی جانی لہروں کی
پھر طوفان کا روپ تھی صورت چنچل، فانی لہروں کی
جھاگ ہی باقی رہ جاتی تھی ایک نشانی لہروں کی

مٹ کے چھپی اک پل میں شوبھا سب اجیالی لہروں کی
ساحل پر ہی بات بنے گی، خام خیالی لہروں کی!

میرے دل نے بھی دہرائی پریم کہانی لہروں کی،
دل کی امنگیں لہریں ہی تھیں میٹھی بانی لہروں کی،
اور پریتم تھی من کو بھاتی، موہن رانی لہروں کی،
چاند بنی پھر میرے دل میں نرم روانی لہروں کی،
پیتم کو اک گیت سنایا میں نے زبانی لہروں کی،
جب سنجوگ ہوا تو جوش میں آئی جوانی لہروں کی،
پھر طوفان میں بدلی صورت چنچل، فانی لہروں کی،
جھاگ ہی باقی دیکھی میں نے ایک نشانی لہروں کی،

مٹ کے چھپی اک پل میں شوبھا امرت والی لہروں کی،
منزل پر ہی بات بنے گی، خام خیالی لہروں کی!

میراجی

مردم آزاری

بیکار لوگ، جو عشاق کے زمرہ میں آتے ہیں، اختر شماری اور خوابِ شیریں کے مزے لیا کرتے ہیں اور ہم جیسے باکار انسان خدمتِ خلق کرتے ہیں فرق یہ ہے کہ وہ یادِ محبوب کے حصار میں مقید اور ہم اپنے افسرانِ اعلیٰ کے احکامات کے محکوم ہیں اور وہ جو خلل ہے دماغ کا، اس سے محفوظ رکھنے کے لئے باوجود ہماری ملازمتی مصروفیتوں کے وہ ہمیں مشغول رکھتے ہیں۔

مجھے اسکول میں ملازم ہوئے دوسرا سال تھا میری ملازمت غیر مستقل تھی اور اسی لئے میں انتہائی محنت و جانفشانی سے نئی پود تک وہ علم پہنچانے کی کوشش کرتا تھا جو میرے سر کے بال گرانے اور اس میں خشکی کے اضافہ کا باعث ہؤا تھا۔ اک روز انگریزی کا درس دے رہا تھا کہ ایک شریف چپڑاسی ایک فہرست لے کر داخل ہوئے اور مرا نام تصدیق کر کے اس کو میرے سامنے پیش کر دیا۔ حاکمِ ضلع نے دیگر تین استادوں کے ساتھ یاد فرمایا تھا چنانچہ ہم چار یار بن کر متترہ دن سیکرٹریٹ پہونچے جو شہر سے دو میل دور واقع ہے۔ برسات کی گرم دوپہر تھی اس لئے تانگہ کا کرایہ اپنے سر اوڑھ لیا۔

وہاں حاکم ضلع نے کمشنر کی حیثیت سے ہمیں یہ نوید دی کہ قانونِ مردم شماریٔ شہر کے ماتحت اس جلسہ کے حاضرین میں سے ہر اک کو اک اک حلقہ سپرد کیا گیا ہے جس میں وہ مردم شماری کے تمام لوازم کی تکمیل کے ذمہ وار ہوں گے۔ وہ اپنے ماتحت شمار کنندگان سے یہ کام کرائیں گے گویا بغیر ہماری کسی مانگ یا تگ و دو کے انہوں نے حکومت خود اختیاری عطا فرما دی تھی اور یہ جانتے ہوئے کہ ان اصحاب نے اگر کالج یا یونیورسٹی میں معاشیات کا مضمون نہ بھی لیا ہوگا تب بھی یہ اتنا سمجھ لیں گے کہ مردم شماری کی اہمیت کیا ہے ان کو بتایا کہ اس سے یہ اندازہ کیا جائے گا۔ کہ شرح اموات و پیدائش کیا ہے۔ رعایا کا ذریعۂ معاش اچھا ہے یا برا۔ تعلیم وہی ۹ فیصدی ہے یا ۱۹ فیصدی ہو گئی ہے، کتنے لوگ روزگار سے ہیں، افزائشِ نسل سے کس قوم کا پلہ بھاری ہے اور اک خاندان میں کتنی بالغ کنواریاں موجود ہیں کیا وبائیں عام ہیں اور آیا اس کی کوئی توقع ہے کہ تپ دق کی روک تھام کے لئے جو چندہ جاری ہے اسی قسم کا کوئی اور فنڈ آنے والی وائسرائن کھول سکیں گی یا نہیں (ممکن ہے اخیر کی دو باتیں انہوں نے نہ بتائی ہوں لیکن کارڈ کے سوالات سے ان کو معلوم کئے جانے کا امکان ہے)۔ ہم سے تقریباً سب نو گرفتارِ قفس تھے جو نہیں جانتے تھا کیا ہے اس لئے اس اسمبلی ہال سے جو قانون پاس ہؤا اس کی زد میں خاموشی سے اپنی ہستی کو پیش کر دیا البتہ اک آزمودہ کار نے اپنی علمیت اور وقتی فراست کا ثبوت دینے کے لئے یہ تجویز کیا کہ اک ہفتہ بعد ہی جلسہ اس لئے منعقد کیا جائے کہ اراکین اپنی مشکلات رفع کر لیں اور اس کے پاس کئے جانے پر ہم لوگ وہ بارِ گراں لئے اٹھے جواب تک اٹھائے نہ اٹھ سکا!

دوسرے جلسہ میں کوئی کام کی بات تو ہوئی نہیں البتہ بلدیہ کے افسر نے اس سے یہ فائدہ اٹھالیا کہ یہ دانۂ تقرری اور دیگر کاغذات وہیں تقسیم کر دیئے اور ان کو پاکر یہ محسوس ہؤا کہ قانون کا پھندا گلے میں ٹھیک بیٹھ گیا ہے اور ذرا بھی کوتاہی کی تو فوراً ٹیٹوا دب جائے گا۔ اور وہ جو خیال کا گلستان بنایا تھا جس میں ہر اک سپروائزر کو اک پھول تصوّر کیا تھا اور حاکم ضلع کو اک روشن خیال گلچیں، معلوم ہوا کہ اس میں صرف کانٹوں کا بستر ہے جس سے راتوں کی نیند بھی محال ہو جائے گی۔ سوچا تھا کہ ملازمت کے سلسلہ میں جو پہلی ملاقات ان سے ہوئی تھی جس میں انہوں نے کافی اثر قبول کیا تھا اور جس کا اعتراف والد سے ان الفاظ میں ہؤا تھا "معلوم تو عقلمند ہوتے ہیں" وہ ابھی تک زائل نہیں ہؤا لیکن نوجوان، عقلمند اور مستعدِ کار ہونے کی جو سزا ملی اس کا بھگتنا کچھ زیادہ مشکل نہ تھا اور میں نے اپنی تسکین کا یہ سامان

کرلیا تھا کہ ۱۰ مارچ کو اس مردم آزاری کے کام سے فرصت پا کر میں ایک ہفتہ میں اپنی زندگی کی سلور جوبلی منانے کا خاطر خواہ انتظام کر لوں گا۔ اور اس طرح ۱۲ مارچ کو حاکم ضلع کی دعوت کر کے اپنی سند پر گویا ان سے دستخط کرا لوں گا۔ حاکموں کے یہاں خدمات کم قبول ہوتی اور اضافے شاذ و نادر دیئے جاتے ہیں البتہ سفارشات ارزاں بکتی ہیں اور وہ بھی اس لئے کہ اس برادری کے اصحاب نے یہ طے کر لیا ہے کہ سفارش ضرور کرو لیکن اس پر عمل نہ کرو، بہرکیف سرکار کو کچھ دھاگے میں باندھنے کے لئے جو تدبیر ذہن میں تھی اس پر تو عمل کرنے کا ابھی وقت نہیں آیا اور یوں ہی تدبیروں سے بدل جاتی ہیں تقدیریں کہیں ؟ ہاں یہ سال ایک حادثہ کے لئے یادگار رہ گیا اور جس لگی کی لگن سے اپنی ہستی کو محفوظ رکھنے کے لئے پیہم مصروفیت کار کا خیر مقدم کیا جاتا رہا تھا۔ اس نے پھر باوجود مرجانے کے زندگی کی تمنا پیدا کر دی آخر راعی اور رعایا میں کچھ فرق تو ہونا چاہیے۔ اگر اس کو موت سلور جوبلی کے بعد بلاتی ہے تو اس کو قبل ہی آنا چاہیے۔ وہ حکومت کی تھی یہ عمر کی، ہر حال میں پہلے رعایا ہی کا خون ہونا ہے۔

(۲)

اپنے حلقہ میں نمبر اندازی کا کام نگراں کو اپنی موجودگی میں شروع کرانا چاہیے اور اس کے لئے وقت نکالنا آسان نہ تھا۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر نے لائبریری کی تنظیم و ترتیب مرے سپرد کی تھی اور گو اسکول کی حیات کو میری ملازمت کی طرح ایک ہی سال ہوا تھا - پھر بھی انہوں نے اس کو گوارا نہیں کیا کہ مجھے اس کار دیگر کے لئے الاؤنس دلا دیں۔ جہاں زبان کی میٹھی چھری سے دوسرے کی ترقی کو ذبح کیا جا سکے وہاں منظور شدہ بجٹ میں کوئی کمی دکھانا اپنے انتظام کو امتیاز دینا ہے۔ بہرکیف یہ کام محض کام کی خاطر انجام دے کر میں نے اپنے حلقہ میں نمبر اندازی شروع کرائی۔

ایک شمار کنندہ اور ایک گیروبردار مرے ساتھ تھے۔ محصول چنگی کی ایک چوکی پر نظر ڈال کر ہم خاکروبوں کے احاطۂ مکانات میں داخل ہوئے - اس میں ایک ایک کوٹھری میں ایک ایک خاندان کی رہائش تھی جو کبھی اک تنہا انسان پر کبھی میاں بیوی اور ان کے بچوں پر مشتمل تھا۔ شمار کنندہ رنگین مزاج آدمی تھے اور بھنگنوں سے اچھی طرح واقف۔ انہوں نے جیسے ہی اک سرو قد نازک اندام، شوخ آنکھوں والی لڑکی سے یہ سنا "یہ کاہے کو لکھت ہو رہی ہے،" کہنے لگے "جنگ میں ذرا نوجوانوں کی ضرورت ہے، ہر گھر سے

ایک ایک فالتو لیا جائے گا۔" اور اس کا منہ فق ہو گیا اور وہ پریشان ہو کر اس زرد چہرہ نوجوان کو تکنے لگی جو اس کے سامنے کھڑا تھا۔ جب ہم اس کی کوٹھڑی پر چوبیسے شماری کے لئے آئے تو وہ اپنے آپ کو بھی اس کے مکینوں میں لکھائے دیتی تھی۔ جانے کیوں لیکن شمار کنندہ کو اپنے رقیب رو سیاہ کی حیات کا یقین تھا انہوں نے پوچھا "مراد آباد نہ جائے گی؟" اور زرد چہرہ نے اپنی زبان ہلائی "جائے گی کیوں نا" اور شمار کنندہ نے "تجھے نہیں لکھتے" کا فیصلہ دے کر برابر والی کوٹھری کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے زرد رو نوجوان کی طرف ہمدردانہ دیکھ کر کہا "اس میں یہ رہتے ہیں۔"

"اور کون؟"

"بس اکیلے۔" اور اس کے لب خموشی سے ہلے۔ میں نے اس کو تسکین دی "کوئی فکر کی بات نہیں۔ مردم شماری ہوتی ہے نا۔ اس میں مکانات گنتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ کتنے مرد رہتے ہیں کتنی عورتیں۔" اس کے لب مسکرا اٹھے اور میں نے خیال کیا "اگر درمیانی دیوار حائل نہ ہوتی تو ان دونوں کے جسم مل نہ گئے ہوتے" جب ہم باہر نکلے تو میں نے شمار کنندہ سے کہا "یہ ضرور ہے کہ یہ سرکل جھونپڑیوں کی بوسیدگی اور گندگی سے معمور ہے لیکن حقیقت میں انسانوں کی یہی بستی ہے۔ ذرا تعجب کیجئے اس انصاف پر کہ خاکروب تمام شہر کی صفائی کریں لیکن جس گلی میں رہتے ہوں وہاں میونسپلٹی اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتی"

ہم آگے بڑھے اور کام جاری رہا۔ اس اثنا میں معلوم ہوا کہ ہم جس حلقہ میں نمبر اندازی کر کے فہرست مکان تیار کر رہے ہیں اس میں نیچ ذات ہی کے غریب لوگ رہتے ہیں۔ بھنگی گھوسی، کہار، چمار اور مالی اور رانیں، اور ان میں سے بہت سی عورتیں شادی شدہ ہیں۔ لیکن صرف بچے کی اماں بننا چاہتی ہیں اور اپنے اُن کے نام زبان پر لانا ان کے لئے پاپ ہے۔ شاید کنوارپن کی حیا کو باقی رکھ کر وہ اپنے کو "ابھی تو بچہ میں جان ہے" کا فریب دینا چاہتی ہیں۔ یا وہ ہر اک کو اُلّو سمجھتی ہیں اور اس سے اس کے سامنے نام نہیں ظاہر کرتیں کہ کہیں وہ ان کی زبان پر چڑھ جائے اور وہ ان کا سہاگ پھیکا پڑ جائے!!

اڑتیس مکانات سے نمٹ کر ہم نے اپنے اپنے دفتر کی راہ لی۔ شام کو شمار کنندہ تشریف نہیں لائے۔ دوسری صبح کو ایک انتہائی غیر دلچسپ آدمی کا ساتھ دینا پڑا۔ وہ وقت سے قبل بوڑھے ہو رہے تھے۔ اس

لئے ان سب کے ہلاک میں ایک دق کی ماری جوان عورت کو اک ایسے پلنگ پہ لیٹے دیکھا تھی کے بان تقریباً ٹوٹ چکے تھے اور جس پر صرف ایسے چھپر کا سایہ تھا جس میں پھونس اڑ گیا تھا صرف بانس رہ گئے تھے جس طرح اس میں خود ہڈیاں رہ گئی تھیں شفاخانہ اس کے مکان کے قریب تھا۔ لیکن اس خیال کے تحت کہ وہاں غریبوں کو جلد ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔ وہ یہیں پڑی زندگی کو گھسیٹنا چاہتی تھی۔

صبح کی یہ ٹمٹماتی ہوئی شمع حیات، میرے لئے سرِ شام اک دیا روشن کرنے کا پیش خیمہ ہوئی، اس کا مجھے اسی شام کو احساس ہوا۔ میں آپ کو بتا دیتا کہ اس ڈوبتے سورج کے مقابل میں نے اک نیا چاند کہاں طلوع ہوتے دیکھا لیکن جناب ہمارے اندراجات سوائے مردم شماری کے اور کسی کی ذاتی غرض کے لئے استعمال نہیں کئے جا سکتے اور اس کا نام میں اس لئے نہیں بتا سکتا کہ اس کا شوہر زندہ ہے اور ہم نے خاندان کے مکھیا کے خانہ میں اسی کا نام درج کیا ہے۔ جب اس نے یہ بتا دیا تو ہمیں اس کا نام معلوم کرنے کا اس وقت کوئی حق نہ تھا۔

جھٹپٹے کا وقت تھا جب ہم اس کے دروازہ پہ پہنچے جس کے پٹ کھلی ہوئی باہوں کی طرح وا تھے۔ اندر کا صاف صحن صاف دکھائی دے رہا تھا اور وہ ایک کوٹھڑی میں بیٹھی اک پڑوسن سے (یہ رشتہ اس نے بعد میں ظاہر کیا) باتیں کر رہی تھی۔ دروازہ کے پاس ہی کنواں تھا اور اس کے قریب نہانے کے لئے چوکوں کا فرش، اس لئے اندر جانے کی جرأت نہ پا کر اس کو وہیں سے کھٹکھٹایا گیا وہ بیٹھے سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور جب دور ہی سے سوال کا یہ تیر پھینکا گیا "اس میں کون رہتا ہے؟" تو اس کی ساتھن بولی: "ہمیں نہ معلوم" لیکن وہ صحن میں آ چکی تھی اور آگے بڑھانے پر وہ اک شعلہ کی طرح لپکتی، اور ہوا سے اسی کی مانند بل کھاتی ہوئی آئی ـــــ چوکھٹ پر ـــــ اس کی آنکھیں اک بے نام سا نشہ برسا رہی تھیں۔

"اس مکان میں ایک آدمی رہتا ہے یا دو؟"

"ایک ہی کا گھر ہے پر رہتے ہیں دو۔ اک اس کوٹھڑی میں اک اُس میں۔"

"اُس میں کون رہتا ہے؟"

"ہم"

"اور اُس میں؟"

"ایک کرایہ دار۔"

"الگ الگ کھاتے ہیں یا اک ساتھ؟"

"الگ الگ۔"

"ٹھیک ـــــ بس تو اس پر دو نمبر پڑیں گے۔"

"ہاں ـــــ جب وہ آ جائیں تب۔"

"دیکھو نا ـــــ یہ سامنے کے مکان پر پڑا ہے۔ یہ بکرے جہاں کھڑے ہیں ان کے یہاں ڈال کر آئے ہیں۔ اس میں کوئی نقصان تھوڑی ہے۔"

"اچھا ـــــ پہلے اس برابر والے مکان پر ڈالو"

"ابھی، تمہارے سامنے، اور اگر وہاں نہ ڈالیں تو تم بھی مٹا دینا۔"

وہ بڑی مشکل سے راضی ہوئی اور جب سابقہ تجربہ کی بنا پر بڑے میاں سے اس کے شوہر کا نام بتانے کے لئے کہا گیا تو اس نے خود ہی بتا دیا اور کیا بتایا یہ مجھے اس وقت یاد نہیں آتا۔ شمار کنندہ اندراج کر رہے تھے۔ میں اس کے برابر والے مکان کی طرف بڑھ آیا اور اس پہ نمبر پڑ جانے کے بعد میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ وہیں آ موجود ہوئی تھی۔ شاید اسے اعتبار نہ تھا اور اطمینان کرنا چاہتی تھی۔ میں نے کہا "بس اب تو خوش ہو؟"

"(میں نے اس پر تھوڑی کہا تھا اُس پر" اس نے انگلی سے برابر کے مکان کو بتایا)

"ابھی دو منٹ بعد اس پر بھی لو" اس سے اس کی کچھ تسکین ہوئی اور وہ اس مکان سے نکل کر باہر اک ٹوٹے ہوئے مکان کے چبوترے پہ آ کھڑی ہوئی اور جب اس کی خواہش کے مطابق اس مکان پر نمبر پڑ گئے تو میں نے اس سے کہا "اب ان بچوں میں مٹھائی بانٹو۔ اب تو تمہیں چین سے نیند آ جائے گی۔" اس لمحہ اس کی آنکھوں سے آنکھیں ملیں اور وہ کچھ کہنے کو تھیں پر کہتے کہتے رک گئیں اور اس کی زبان، جو اس مکان کے مکینوں کا حال بتا رہی تھی، لڑکھڑائی۔ یہ حال دیکھ کر میں نے پلٹا لیا اور قریب کی گلی میں چلا گیا۔ یہاں شمار کنندہ کو اندراج کرا رہا تھا کہ گلی کے موڑ پر اس کا چہرہ نظر آیا۔ وہ کھڑی بیٹھی بیٹھی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی شاید یہ تماشہ یا خود اک تماشہ بن گئی تھی۔ وہ چند منٹ وہیں سے کھڑی نظروں کے تیر برساتی رہی اور ہوائیں شاید یہ پیام بھیجتی رہیں۔ "جانے نہ دوں گی۔"

جب ہم اس گلی سے نکلے ہیں تو وہ غائب ہو چکی تھی اور میں نے

صبر کر لیا تھا کہ اب اس سے ملاقات نہ ہو گی لیکن بلاک کے آخری مکان کی تفصیل معلوم کی جا رہی تھی۔ میں وہیں میدان کے اک ٹیلہ پر دور کھڑا تھا کہ وہ سامنے سے آتی دوبارہ نظر آئی۔ راہ میں اسے ایک بڑھیا نے ٹوکا اور اسی بہلانے اس سے باتیں کرنے کھڑی ہو گئی اور جب وہ چلنے لگی تو خود بھی لپکی اور مڑتے مڑتے اک دزدیدہ نظر ڈالتی گئی۔

اف وہ قدم لغزیدہ لغزیدہ، ہائے وہ دزدیدہ نگاہ!!

چراغ روشن ہونے کو تھے اس لئے ہم واپس چلے آئے۔ رات کو اس کی ملاقات کی حقیقی کہانی سے دل ناداں کو بہلاتا رہا۔ وہ اس قسم کی عورت تھی جو نظر پڑتے ہی تصور پر چھا جاتی ہے اور جی چاہتا ہے کہ نگاہوں سے اوجھل نہ ہو اور کچھ نہیں تو باتیں ہی کرتے رہیں۔ غرض جب خیال نے یہ لوری دی کہ کل صبح پھر اسی کوچہ سے گذر ہو گا۔ اور اسی جگہ سے آغازِ کار جہاں شام کو نمبر اندازی ختم کی ہے تو اچاٹ سی نیند آئی اور معمول کے مطابق صبح ہی آنکھ کھل گئی۔ کہاروں کی اک سرائے سے نکل کر ہم ایک بغلی گلی سے واپس ہو رہے تھے کہ نگاہ برد وہ کھڑی تھی۔ اسے دیکھتے ہی میری زبان سے بے اختیارانہ نکلا "آداب، رات نیند آ گئی تھی؟" چند گز کا فاصلہ ہونے کی وجہ سے شاید اس نے سنا نہیں۔ جب میں اس کے سامنے پہنچا تو میں نے پوچھا "رات مٹھائی بانٹی تھی؟"

"نا" اس کا جواب تھا اس کی آنکھیں مخمور ہو رہی تھیں اور اس کے لب سرخ شاید وہ ابھی پان کھا کر نکلی تھی۔ چند لمحہ کھڑی وہ ہمارے حال پر ترس کھاتی رہی۔ شاید یہ سوچتے ہوئے "جانے ان کو رات کو نیند بھی آئی ہو گی۔ چھٹی کے وقت سو گئے تھے اور پوپھٹے کے وقت آ گئے"، اور پھر جب اس کے دل نے اس سے یوں کہا "مری بلا سے۔ یہ جانیں اور ان کا کام" تو وہ اور عورتوں کی اوٹ میں آ گئی۔ خورشید کے بادلوں میں چھپ جانے کی طرح۔

اور اس دن سے آج کا دن ہے کہ شب تیرہ و تاریک کی طرح بے آب و تاب، کوئی حاکم ضلع سے کیوں کر جا کر کہے کہ مردم شماری کا جو کام آپ نے دیا تھا وہ ختم ہو گیا، (اچھے طریقہ پر) لیکن اس نے ایک نوجوان کو اک آزار دے دیا! جس کی تلافی یوں ہی ہو سکتی ہے کہ بقیہ کام بھی فوراً شروع کر دیا جائے اور اسے سپروائزر کے بجائے اینومیریٹر بنا دیجئے کہ اس طرح پھر وہ اس تک پہنچ جائے اور کارڈ بھرتے ہوئے اس کا نام، عمر، ذات، مذہب معلوم کرے اور اس طرح ناظرین کے دلوں میں جو سوالات چھپے بیٹھے ہیں ان کا جواب ان کو مل جائے اور وہ اپنی تسکین کا سامان کر لیں حالانکہ افسانہ نگار اس سلسلہ میں یوں تسلی دے سکتا ہے کہ نمبر اندازی کے ایک ماہ بعد جب ہم اس کی رہائش گاہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ اک صبح جب وہ اک دولہا کے سہرے کے لئے تر و تازہ پھول چننے اناروں کی چھاؤں میں، باغ گئی تو ہوا نے اس کے سینہ میں گھر کر لیا اور وہ نمونیا کی نذر ہو گئی حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ ابھی تک زندہ ہے اور وہ ادیب جو یہ فریب دے سکتا تھا اس کے لئے مر چکا اور اس سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ اس سانحۂ حیات کو ۱۹۴۰ء نے دفنا دیا اور ملن کی نت نئی امیدوں کے ساتھ ۱۹۴۱ء کی صبح اولیں طلوع ہو رہی ہے۔ اس شامِ جدائی کے بعد صبحِ ملاقات کا آغاز ہوتا ہے اور ابتدا سے قبل انتہا کا انجام معلوم!

"حیات"

رباعی

[illegible]

عبدالرحمن وفا

فریبِ تخیّل

آج میں کمرے میں "ریحانہ" کے اے ہمدم گیا
یادِ ماضی سے دلِ غمگیں میں محشر تھا بپا

پیار کی باتیں وہاں ہوتی تھیں سرگوشی کے ساتھ
کتنی زرّیں ساعتیں گزری ہیں مدہوشی کے ساتھ

اُس کا پیمانِ وفا! اُس کی محبّت کی نظر!
التفاتِ حُسن پر نازاں دعائے با اثر!

کیف افزا روح میں رنگینئ عیش و نشاط
رقص فرما دل میں نورِ جلوہ ہائے انبساط

وائے محرومی کہ اب خاموش تھا عشرت کا ساز!
ایک افسانہ تھا اس کا ارتباطِ دلنواز!

حُجلۂ رنگیں تھا لیکن روحِ کاشانہ نہ تھی
سب تھے آرائش کے ساماں میری "ریحانہ" نہ تھی

گوشے گوشے سے تھا وابستہ مگر اس کا خیال
جیسے مسجد میں ہو چھایا سرمدیت کا جمال

منتشر سی تھی فضا میں اس کے گیسو کی شمیم
تھا گماں اس کے تنفس کا جو چلتی تھی نسیم

تھرتھری میں پردۂ در کی تھا اس کا انتظار
آئینے میں منعکس سی اس کے جلووں کی بہار

دل نشیں تصویرِ جاناں حُسن و رعنائی لئے
عشوۂ ارماں طلب شانِ زلیخائی لئے

تھا رکھا پہلو میں الماری کے شیشے کا گلاس
یاسمینی اُنگلیوں کی لوچ کا جوہر شناس

لکس صابن اس کے جسمِ مرمریں کا رازداں
سینٹ کی شیشی جواں راتوں کی تھی افسانہ خواں

اس کے بستر سے تھی لپٹی جسمِ نازک کی لچک
نرم تکیئے سے تھی ہم آغوش پھولوں کی مہک

نغمہ زن کمرے میں تھی اک آشنا آواز سی
میری نظروں میں کھلی اس کے تبسّم کی کلی

میں نے کی محسوس ریحانہ کے بازو کی لمس
مچلا میرے لب پہ اُس کے شہد آگیں لب کا رس

آہ لیکن تلخ کتنی تھی حقیقت اے ندیم!
خواب سے چونکا تو گم تھی میری جنّت اے ندیم!

تھی بسی دل میں مگر وہ آنکھ سے پنہاں رہی
جستجو میری شہیدِ حسرت و ارماں رہی

اختر اُرینوی

زخم

نارائن نے کوٹ کے شکستہ کالروں کو مٹھیوں میں بھینچتے ہوئے سامنے دیکھا۔ دو لوں تانگے دوڑے جا رہے تھے اور سبز اور سفید ٹائیاں ہوا میں اُڑ رہی تھیں۔

اُس کا دماغ کھولنے لگا اور وہ بے ارادہ ہی ایک طرف کو چل پڑا غصّے اور رنج کی شدّت نے اسے بے حس سا بنا دیا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر تک اسی طرح چلا گیا اور چلتے چلتے گول باغ میں پہنچ گیا۔ گرمیوں کے دن تھے اور شام کا وقت شہر کے بہت سے لوگ بیوی بچّوں سمیت سیر کو آئے ہوئے تھے۔ بچّے ہنستے، کھیلتے اور شور مچاتے اِدھر سے اُدھر بھاگتے پھرتے تھے۔ مگر نارائن اُن کے درمیان سے اس طرح گزر گیا گویا سنسان جنگل میں سے گزر رہا ہو۔ یہ شور غل اس کی بے حسی کو دور کرنے کے لئے کافی نہ تھا۔ وہ مردوں، عورتوں اور بچّوں سے پرے ہٹ کر ایک درخت کے نیچے دھم سے لیٹ گیا۔ اس نے ہری ہری گھاس پر سر رکھ دیا۔ اس لئے کہ شاید اسی طرح کچھ تسکین حاصل ہو۔ لیکن گھاس بھی اس کے دماغ کی طرح اُمس چھوڑ رہی تھی وہ پانچ ہی منٹ میں گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ دماغ میں بے پناہ خیالات کا ہجوم تھا۔ سامنے فوّارہ چل رہا تھا ٹھنڈے پانی کی بوندیں چاروں طرف اُڑ رہی تھیں۔ وہ اُٹھ کر فوّارے پر آیا۔ پانی میں ہاتھ ڈالا اور سر کو بوندوں میں رکھ دیا۔ اسے راحت محسوس ہوئی اور تیز تیز چلنے والے خیالات ایک مسلسل کڑی کی صورت اختیار کرنے لگے۔ وہ وہاں سے اٹھا اور لاجپت رائے کے بُت کے پاس جو بنچ رکھے رہتے ہیں اُن میں سے ایک خالی بنچ پر آبیٹھا۔ گزشتہ چند ماہ کے واقعات ایک ایک کر کے اس کے ذہن میں گھومنے لگے۔

. . . .

نارائن کالج لان میں تنہا بیٹھا تھا اور آسمان پر بادل کے ایک مختصر سے ٹکڑے کو دیکھ رہا تھا۔ یوں آسمان بالکل صاف تھا دور دور تک دیکھنے پر بھی بادل کا صرف یہی ایک ٹکڑا نظر آتا تھا۔ کہیں نیلا، کہیں کالا اور کہیں سے مٹیالا، یہ بادل کا ٹکڑا اپنے آپ میں مست معلوم ہوتا تھا۔ یکایک ہوا کا ایک جھونکا آیا اور اسے اپنے ساتھ اڑا لے گیا۔

اس وقت امیش وہاں آیا اور اس نے بات چیت شروع کرنے کے لئے نارائن کی دائیں طرف بیٹھتے ہوئے کہا:۔

"سناؤ نارائن جی، خوش تو ہو؟"

"مہربانی ہے" نارائن نے جواب دیا۔

"آپ تو بہت دور دور رہتے ہیں، کیا خفگی ہے کچھ؟"

"نہیں جناب خفگی کی کون بات ہے" نارائن نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔

"تو پھر ملا کریں نا" اور ہنستے ہوئے بولا "یہ آپ کے حسینوں کے سے انداز کچھ اچھے نہیں ہیں"

امیش نے یہ کہتے ہوئے ہاتھ نارائن کی طرف بڑھایا جسے اس نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس دن سے ان میں دوستی پیدا ہو گئی اور نارائن نے گاہے ماہے رمیش کے مکان پر جانا شروع کیا۔

امیش درمیانے قد کا خوش رو نوجوان تھا۔ بھرا ہوا سڈول جسم، کتابی چہرہ اور اُس پر گھنگریالے بال بہت ہی بھلے معلوم ہوتے تھے۔ اپنی زندہ دلی کے باعث وہ کالج بھر میں ہر دلعزیز تھا۔ بات بات میں مزاح کا پہلو نکالنا اس کی جدّت پسندی اور ظرافت داری کی دلیل تھا۔ ہنس مکھ اور ملنسار ہونے کی وجہ سے اس کے دوستوں کا دائرہ پہلے ہی کافی وسیع تھا۔ اب ان میں ایک نارائن بھی شامل ہو گیا۔

اُمیش اپنے بھائی رمیش کے ساتھ رام نگر میں رہتا تھا۔ انہوں نے دیو سماج کے قریب دو کمرے کرائے پر لے رکھے تھے۔ ایک اوپر اور ایک نیچے۔ اوپر کے کمرے میں امیش اور نیچے کے کمرے میں رمیش رہتا تھا جس طرح رمیش، امیش سے عمر میں ذرا بڑا اور تعلیم میں ذرا آگے تھا اسی طرح وہ امیش سے ذرا زیادہ قبول صورت لہٰذا زیادہ فیشن پرست اور قد میں بھی ذرا لمبا تھا اور اس کے دوستوں کی تعداد بھی امیش کے دوستوں سے کچھ کم نہ تھی۔ وہ سب اکثر نیچے کے کمرے

میں اکٹھے ہو جاتے۔ چائے کا دور چلتا۔ ڈیڑھ دو گھنٹہ خوب ہنسی مذاق اور دل لگی ہوتی۔ ایک دوسرے پر فقرے چُست کئے جاتے۔ خوب قہقہے لگائے جاتے۔ کوئی کسی کی رُو رعایت نہ کرتا اور کسی کے کہنے کا برا نہ مانتا گویا وہاں ہنسی مذاق اور خلوص کا ایک دریا بہتا تھا جو حسد، بغض اور نفرت کی کثافت سے یکسر پاکیزہ تھا۔ کسی کی کوئی انفرادی حیثیت نہیں کسی کو رنج، غم اور خفگی کا موقع نہیں۔

نارائن ابھی اس نئی دوستی پر خوش تھا وہاں محفلوں میں شامل ہو کر اکثر داد صحبت دیا کرتا تھا۔ اس کی پر خلوص طبیعت نے سنجیدگی کا نقاب الٹ دیا اور اس کے نقرئی قہقہے بلند تر ہوتے گئے۔ رفتہ رفتہ کسی بات کی تہ تک پہنچنے اور تجزیہ کرنے کی عادت ہی چھوٹ گئی۔ کیونکہ باغ میں جا کر آدمی پھولوں کو دیکھ کر ہی حظ اٹھا سکتا ہے۔ ان کی نباتاتی تحقیق میں پڑ جائے تو سارے لطف کا خون ہی ہو جاتا ہے۔

ایک دن امیش نے اسے سینما دیکھنے کے لئے بلایا۔ نشاط میں دیوداس چل رہا تھا، یہی فلم دیکھنے وہ جا رہے تھے کہ راستے میں نرنیدر مل گیا۔ امیش نے اسے بھی ساتھ چلنے کو کہا۔ وہ بولا۔ "چھوڑو یار! سینما کیا کرو گے جا کر! یہ فلم ایک بار تو دیکھ آئے ہیں۔ دوبارہ پھر کبھی دیکھا جائے گا۔ آج وائی۔ ایم۔ سی۔ اے میں پروفیسر کا لیکچر ہے۔ انہیں (نارائن کی طرف اشارہ کر کے) سینما دیکھنے جانے دیجئے۔ ہم لیکچر سننے چلتے ہیں!"

امیش جھٹ رضامند ہو گیا اور اپنی جیب میں سے ایک روپیہ نکال کر نارائن سے کہا: "اچھا نارائن جی، آپ سینما دیکھ آئیں۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ میں تو یہ پکچر دیکھ آیا ہوں۔ اب دوبارہ دیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ نے نہیں دیکھی آپ ضرور جائیں۔"

وہ یہ سب کچھ ایک ہی سانس اور فیصلہ کن انداز میں کہہ گیا اور روپیہ نارائن کے ہاتھ میں تھما کر نرنیدر کے ساتھ چل دیا۔

روپیہ نارائن کے ہاتھ سے نکل کر زمین پر جا گرا اور وہ حسرتناک نگاہوں سے ان کی طرف دیکھتا رہا ––– دیکھتا رہا لیکن انہوں نے ایک بار بھی مڑ کر نہیں دیکھا۔ جب وہ کافی دور نکل گئے تو اس نے روپیہ اٹھا لیا۔ پہلے اس کے جی میں آیا کہ نہ اٹھائے لیکن پھر اُس نے سوچا کہ یہاں چھوڑ دینے سے فائدہ؟

غریب کی غیرت بھی نیم مردہ ہوتی ہے اور ہر بات کے جواز میں کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ نکالتی ہے۔

نارائن سینما دیکھنے چلا تو گیا مگر جو شوق دل میں لے کر چلا تھا وہ افسردگی سے بدل چکا تھا فلم چل رہی تھی اور نارائن کا تصور کسی دوسری جگہ آوارہ تھا۔ اسے آج ہی کی طرح کا ایک دوسرا واقعہ یاد آ کر ستا رہا تھا۔ پہلے بھی ایک دن امیش نے اسے راوی پر چلنے کے لئے بلایا تھا۔ وہاں کشتی کی سیر کا ارادہ تھا، مگر جب وہ وقت مقررہ سے پندرہ منٹ پہلے ہی اس کے مکان پر جا پہنچا تو دروازہ بند تھا۔ اس کے پہنچنے سے پیشتر ہی وہ سب جا چکے تھے۔ اس کے احساس کو چوٹ تو لگی لیکن اس نے اُسے غلط فہمی سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ آج وہی بھولی ہوئی بات پھر ذہن میں کھٹکنے لگی اور اب وہ اُسے غلط فہمی پر بھی محمول نہیں کر سکتا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ انہوں نے دیدہ دانستہ اسے ساتھ لے جانے سے گریز کیا تھا لیکن ایسا کیوں ہوا؟ وہ تو سب ہنس مکھ، ملنسار اور زندہ دل انسان تھے ان سے ایسی بات کی توقع ہرگز نہیں ہو سکتی۔ اگر مجھے چھوڑنا ہی مطلوب تھا تو بلانے کی کیا ضرورت تھی! یہاں پہنچ کر اس کی منطق کام نہیں دیتی تھی آخر اس نے خود کو دھوکا دینے کے لئے فلم میں جی لگانے کی کوشش کی۔ کہانی کا ہیرو دیوداس غم کو بھلانے کے لئے بار بار شراب پیتا تھا اور نارائن سوچتا تھا کہ جو غم ہڈیوں میں سرایت کر چکا ہو اُسے بھی کبھی بھلایا جا سکتا ہے؟ اس کا جواب کہانی کا انجام تھا کہ جیتے جی ایسا ہونا ناممکن ہے۔

وہ اس طرح سوچتا اور اپنے غم کو دیوداس کے غم سے ہم آہنگ کرتا ہوا واپس ہوا۔ اور اپنا بھاری سر تکیے پر رکھ کر سو رہا۔

تعجب نہیں کہ اس کے بعد بھی اُن کی دوستی نبھتی رہی۔ دوسرے دن جب امیش ذرا ہنس کر ملا تو نارائن نے اس واقعے کو بھی اس کی فطری بے پروائی پر محمول کر کے نظر انداز کر دیا اور دل کو سمجھایا کہ انسان کے لئے ایسا ہی واجب ہے۔ ذرا ذرا سی بات کو طول دینے لگیں تو دنیا میں کوئی دوستی زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتی۔

اور دن اسی طرح گزرتے گئے۔

لیکن آج پھر نہ صرف یہ چھوٹے چھوٹے سے واقعات سانپ بن کر اُسے ڈس رہے تھے۔ بلکہ اور بہت سی معمولی معمولی باتیں بھی اس کے ذہن کو چنگاریوں کی طرح جلا رہی تھیں۔ اُسے اس دوستی کے پردے میں اپنی ذلت کا پورا پورا احساس ہو رہا تھا۔ یہ ذلت اس نے ایک دفعہ نہیں دو دفعہ نہیں اکثر اوقات گوارا کی تھی۔ وہ کس کس بات کو سوچ کر شرمندہ ہو۔ صرف شام کی سیر کو ہی لیجئے۔ امیش اور نرنیدر اپنی ہی باتوں میں محو چلتے رہتے۔ اور یہ بات بھول جاتے کہ نارائن بھی ان کے ساتھ ہے وہ ادھر ادھر دیکھتا اور بے ربط چیزوں سے جی بہلاتا بے دلی سے چلتا رہتا اکثر اوقات وہ ان سے بہت

پیچھے رہ جاتا۔ ایسے موقعوں پر اس کی توجہ کا مرکز لمبے لمبے بالوں والے وہ خوشنما کتے ہوتے جو اپنے خوشحال مالکوں کے پیچھے پیچھے سڑک سونگھتے ہوئے چلا کرتے تھے۔ جب یہ کتے بہت پیچھے رہ جاتے تھے تو ان کے نیک دل مالک بڑی خوش آئند آواز میں "پپی پپی" یا "جیک جیک" کہہ کر پکارتے تھے تب یہ لمبے لمبے بالوں والے خوبصورت جانور دُمیں ہلا ہلا کر بھاگتے —— خوب بھاگتے اور نارائن کھڑا انہیں دیکھا کرتا۔ یونہی کبھی امیش اور نریندر بھی مڑ کر پیچھے دیکھ لیتے اور کہتے —— واہ نارائن جی! آپ تو بہت ہی پیچھے رہ گئے۔ آؤ نا دوڑ کر۔ پھر اس کے ساتھ ملنے کا انتظار کئے بغیر ہی چل پڑتے اور پہلے کی طرح باتوں میں مشغول ہو جاتے۔

یہ ہا پانچ ماہ کی دوستی ایسی ہی ذلت آمیز باتوں کی ایک طویل داستان تھی جسے یاد کرنے کا نتیجہ اپنی نظروں میں اپنے آپ کو حقیر کرنے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ نارائن سوچتا تھا کہ میں کیوں اتنی دیر تک دھوکے میں رہا! میں کس طرح اس دھندلے غبار کو سطحی نظر سے دیکھا کیا! اگر ذرا بھی اس کے اندر جانے کی کوشش کرتا تو ان ہنسی مذاق کی محفلوں کی اصلیت ہی کچھ نہ تھی خوشحال لوگ گھر میں بیٹھ کر اپنے نوکروں سے بھی جی بہلاتے رہتے ہیں۔ ان قہقہوں میں ہی ایک نفرت آمیز حقارت چھپی تھی اور اس پر کسے ہوئے آوازے تو اس کی سادگی کا کھلم کھلا تمسخر تھے۔

وہ شدت احساس سے انگاروں پر لوٹنے لگا۔ پریشانی لمحہ بہ لمحہ بڑھنے لگی۔ ایک خوانچہ لگانے والا وہاں آیا تو وہ اس سے سنگترے لے کر کھانے لگا لیکن ان سے طبیعت نہ بھری اس لئے ایک دوسرے خوانچے والے سے رس گلے کھانے شروع کئے اس طرح اس کی جیب میں جو دس آنے کے پیسے تھے۔ وہ دس بارہ منٹ میں خرچ ہو گئے۔ انہیں دس آنوں سے اس کی ایک ہفتے کی روٹی چلتی مگر اب ایک معمولی حسرت بھی پوری نہ ہوئی وہ جیب ٹٹولتا اور خوانچے والوں کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس کے اندر جو خلاء پیدا ہو گیا تھا کیا یہ خوانچے اُسے پُر کر سکتے تھے!

وہ کسی طرح طبیعت کو دوسری طرف لگانا چاہتا تھا سامنے دو ننھے ننھے بچے غباروں سے کھیل رہے تھے۔ وہ غباروں کو ایک دوسرے کے پھول سے چہروں پر مارتے اور ہنس دیتے۔ کھیل ہی کھیل میں بچوں نے غباروں کو آپس میں ٹکرایا اور ہاتھوں سے ایک دوسرے کی طرف دھکیلنا شروع کیا۔ دباؤ پڑتے ہی ایک غبارہ پھٹ گیا۔ ربڑ کا حقیر سا ٹکڑا ہاتھ میں رہ گیا اور جس بچے کا غبارہ پھٹا تھا وہ منہ بسور کر اُسے دیکھنے لگا۔

نارائن چونک اٹھا اور آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے سر پر بادل کا ایک ٹکڑا اٹک رہا تھا۔ کیا یہ وہی اُس دن والا بادل تو نہیں جس دن اس کی غبارہ نما دوستی کی ابتدا ہوئی۔ ہوا کا وہ جھونکا اسے یہاں چھوڑ کر چل دیا۔ جیسے ربڑ کا حقیر ٹکڑا اپنا دینے کے لئے آج کے واقعے نے دباؤ کا کام دیا۔ ٹوٹا ہوا تسلسل پھر قائم ہو گیا۔

....

رمیش ایک مقابلے کے امتحان میں شامل ہونے کے لئے انبالہ جا رہا تھا۔ امیش کے اور اس کے دوست اسے الوداع کہنے آئے تھے۔ نارائن نے بھی اسٹیشن تک جانا مناسب سمجھا۔ وہ کل سات جنے تھے۔ اسٹیشن جانے کے لئے دو تانگے منگوائے گئے تھے۔ سب سامان بندھا رکھا تھا صرف تانگوں کا انتظار تھا لیکن نہ معلوم کیوں وہ سب بھاگے دوڑے پھرتے تھے کہ اتنے میں نوکر نے آکر کہا —— بابو جی تانگے آگئے —— چلنے کی بجائے وہ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ ان کی آنکھوں میں ایک مصیبت خیز گھبراہٹ تھی گویا کسی نے بھری بستی میں پلیگ پھیلنے کی خبر پھیلا دی ہو اور اس کے متعدی اثرات سے بچ نکلنے کی تجاویز سوچ رہے ہوں وہ باہر نکل نکل کر شور سے اور چہمے گوئیاں کرنے لگے۔ پھر اوپر چڑھ گئے۔ صرف نارائن اکیلا نیچے رہ گیا۔ اسے کچھ خبر نہ تھی وہ کچھ اور ہی دیکھ رہا تھا۔

مالک مکان کا لڑکا سامنے کی چھت پر پتنگ اڑا رہا تھا —— دن چھپ چلا اب تو اتر آؤ بیٹا —— اس کی ماں نے کہا لیکن لڑکا دن چھپنے اور نہ چھپنے سے بالکل بے خبر اپنا پتنگ دیکھنے میں منہمک تھا جو نیلے آسمان کی بلندیوں میں ایک ستارے کی طرح نظر آ رہا تھا۔

چند منٹ کے بعد وہ نیچے آئے اور نوکر کو سامان تانگوں پر رکھ دینے کا حکم دے کر باہر چلے گئے لیکن رمیش نارائن کے پاس آکر بولا:-

"آپ کو کچھ کام تو نہیں؟"

"نہیں" نارائن نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"دیکھئے ہماری وجہ سے آپ کا کچھ ہرج نہ ہو۔ بہتر ہے آپ یہیں رہیں"

"واہ ہرج کیا ہوگا۔ مان لیا کہ ہرج ہی ہوتا —— پھر بھی میں ضرور چلوں گا" نارائن نے ضرور پر زور دیتے ہوئے کہا۔

سامان تانگوں میں رکھا جا چکا تھا۔ رمیش اور نارائن کے سوا سب تانگوں میں بیٹھ چکے تھے۔ جب نارائن بیٹھنے لگا تو رمیش نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا کر

کہا:-

"اچھا، گڈ بائی۔ ہم آپ کو تکلیف دینا نہیں چاہتے"۔

اب نارائن پرشاد کی پریشانی کا راز کھلا اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے جسم کا تمام خون کھینچ لیا ہو۔ اس کا سرد ہاتھ آگے بڑھا جسے رمیش نے مسکراتے ہوئے، ہاں مسکراتے ہوئے بڑی گرمجوشی سے دبایا اور وہ۔ "پھر ملیں گے"۔ کہہ کر تانگے میں بیٹھ گیا۔

اس وقت چھت پر "وہ کاٹا" کا شور بلند ہوا مالک مکان کے لڑکے کا پتنگ کسی دوسرے لڑکے نے کاٹ دیا تھا اب وہ سر جھکائے ڈور سمیٹ رہا تھا لیکن کتنی لمبی چھوڑی تھی اس نے، وہ ڈور اکٹھی ہونے میں ہی نہ آتی تھی۔

نارائن نے کوٹ کے شکستہ کالروں کو مٹھیوں میں بھینچتے ہوئے سامنے دیکھا۔ دونوں تانگے دوڑے جا رہے تھے اور سبز اور سفید ٹائیاں ہوا میں اڑ رہی تھیں۔

رہبر بی اے

شہاب

نیلے پربت کی اوٹ میں جا کے
بیٹھتا ہے وہ کنوارا رن بسیرا
رات کی کالی شبوں سے پربت ہیں
جب جلایا ہے میرے تن سینے

اسعد گیلانی

اقرارِ محبت

وہ ساعت وہ رنگینیِ غم نہ پوچھ — مجھی سے مرا ایک عالم نہ پوچھ
تصور کے جھونکوں میں کھویا ہُوا — ہواؤں میں جیسے سمویا ہُوا
محبت کی کرنیں وہ کانپی ہوئی — تخیل میں رنگت شبِ ماہ کی
فضاؤں میں بکھرے ہوئے پھول سے — وہ لب ہلئے فطرت بھی ہلتے ہوئے
ہتھیلی پہ رنگین مشعل لئے — جوانی کھڑی تھی چراغاں کئے
لہو میں شراروں کا طوفان تھا — خموشی میں بھی ایک ہیجان تھا
"کہاں تک نہ اُن پر ہویدا کروں — محبت محبت، ارے کیا کروں"
خیالاتِ پیہم کا یہ حال تھا — اچانک کوئی مُسکرانے لگا
تبسم میں شبنم کی خنکی لئے — جوانی کا عالم گلابی کئے
لبوں پر رواں آبشاروں کا نُور — ستارے خمِ زلف میں چُور چُور

جلو میں وہ گنگا کی پریوں کی فوج — وہ عارض پہ جمنا کی شفاف موج
تنفس میں غنچے چٹکتے ہوئے — مری سمت مژگاں جھپکتے ہوئے
"کہو کیسے چُپ چُپ سے ہو آج تم" — یہ سنتے ہی میں ہو گیا جیسے گُم
مری طاقتِ ضبط تھرا گئی — تمنا اُٹھی، روح گھبرا گئی
سب احساس کے تار بجلنے لگے — نگاہوں پہ نغمے مچلنے لگے
"نکل ہی گیا، اے خدائے جمال — مجھی میں سما کر مجھی سے سوال!"
اُدھر جیسے دنیا ہی شرما گئی — اداؤں کو اک نیند سی آ گئی

کوئی رنگ اُلفت چھڑکنے لگا
نظر جھک گئی دل دھڑکنے لگا

مجروح سلطانپوری

ایک اور اشارہ

کتب خانہ ادبی دنیا نے وعدہ کیا تھا کہ وقتاً فوقتاً اچھی کتابوں کی طرف اشارہ کرنے کے لئے چنی ہوئی کتابوں کی تازہ بتازہ فہرستیں ادبی دنیا میں شائع کی جائیں گی تاکہ ناظرین ادبی دنیا کو اپنے مقبول رسالے ہی کے ذریعے سے ہر قسم کی اچھی کتابیں بہ آسانی مہیا ہو سکیں۔ چنانچہ اس سلسلے کی پہلی فہرست شائع ہو کر مقبول خاص ہو چکی ہے۔ اس دفعہ کتب خانہ ان فہرستوں کی دوسری قسط آپ کے پیش نظر کر رہا ہے۔ موجودہ فہرست میں التزاماً وہی کتابیں درج کی گئی ہیں جو خواتین اور بچوں کے لئے دلچسپ اور مفید ہو سکتی ہیں۔ حسب معمول اس انتخاب کی ضمانت بھی ادارۂ ادبی دنیا کا نام ہے۔

میجر کتب خانہ ادبی دنیا لاہور

نام کتاب و مصنف	قیمت
خواتین کے لئے	
ناول اور افسانے	
عورتوں کے افسانے۔ کوثر چاندپوری	۸؍
تحفے اور دیگر افسانے۔ حجاب امتیاز علی	۸؍
خانم ۔ ۔ ۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی	للعہ
شریر بیوی ۔ ״	۸؍
شام زندگی راشد الخیری	عہ
شب زندگی دو حصے ״	عہ
ماہ عجم ۔ ۔ ״	۸؍
شاہین و دراج ״	۸؍
لاشوں کا شہر۔ مسز عبد القادر	ہ؍
نرملا ۔ ۔ ۔ منشی پریم چند	۸؍
یوسف نجمہ۔ عبد الحلیم شرر	۸؍
بنات النعش۔ مولوی نذیر احمد مرحوم	ہ؍
یاسمین ۔ ۔ ۔ مرزا محمد سعید	۸؍
نظم	
آئینۂ حرم۔ محترمہ زخ بش کی نظمیں	۶؍
شمع خاموش نظمیں	۶؍

نام کتاب و مصنف	قیمت
آئینۂ جمال نظمیں	۱۲؍
صنعت اور خانہ داری	
گلدستۂ کروشیا۔ فاطمہ بیگم انور علی	۶
عصمتی کروشیا	۸؍
بیوی کی تعلیم۔ خواجہ حسن نظامی	۴؍
اولاد کی شادی ״	عہ
مشرقی اور مغربی کھانے	۶؍
مزاقیہ کھانے	۶؍
منفرق	
محبت نامے۔ مترجمہ پروفیسر رام سروپ کوشل	بمر
ادب زریں۔ حجاب امتیاز علی	۸؍
نغمات موت ״	۶؍
بچوں کے لئے	
قصے کہانیاں	
ولائتی نخلی۔ راشد الخیری	۲؍
دادا لال بھکڑ ״	۸؍
بچوں کا انصاف (ڈرامہ)	۳؍
مرغی اجمیر علی۔ محترمہ رقیہ ریحانہ	۲؍

نام کتاب و مصنف	قیمت
بیبیوں کے قصے	۵؍
تاریخ ہند کی کہانیاں	
پہلا حصہ	۳؍
دوسرا حصہ	۵؍
تفریح اور معلومات	
تعلیمی کھیل	۳؍
سمندر کا عجائب خانہ	۸؍
یورسٹ کی کہانی	۳؍
نظمیں	
بچوں کی نظمیں	۴؍
بچوں کے اسمٰعیل	
مرتبہ سعید انصاری پرنسپل مدرسہ جامعہ	ھا؍
بچوں کی رباعیاں	۱؍
بچوں کا علاج کتاب قلب کی بہترین اور نہایت سہل اور آسان ادبیات کا مجموعہ ہے۔ اس کا ہر گھر میں ہونا ضروری ہے۔ قیمت بہت کم مجلد ۶ر	مجلد ۱۲؍
حکمت کے موتی (نایاب اور صحیح مجربات کا بہترین مجموعہ)	۱۲؍

ملنے کا پتہ۔ کتب خانہ ادبی دنیا۔ دی مال۔ لاہور

ایک آرٹسٹ

ایک دن میرے دوست پروفیسر بشیر احمد نے باتوں باتوں میں مجھے بتایا۔ کہ خدا اور بیوی کے بعد اگر وہ کسی شخص سے ڈرتے ہیں۔ تو وہ ان کا خانساماں ہے۔ میں نے کہا "بچوں کی طرح ہم سب ایک نہ ایک ہوّے سے ساری عمر ڈرتے رہتے ہیں۔ کسی کا ہوّا کالج کا پرنسپل ہے۔ اور کسی کا دفتر کا سپرنٹنڈنٹ۔"

پروفیسر بشیر احمد نے پوچھا "اور تمہارا ہوّا؟" میں نے جواب دیا۔ ویسے تو میں متعدد چیزوں سے خائف رہتا ہوں۔ مثلاً۔ مالکِ مکان سے جو ہر صبح کرایہ کا تقاضا کرتا ہے۔ اپنے ڈاکٹر سے جس کا بل میں نے چھ مہینے سے نہیں چکایا۔ اور اپنے ہمسائے کے کُتے سے جو دو دفعہ مجھے کاٹ چکا ہے۔ مگر ان سب سے بڑھ کر میں اپنے اُن احباب سے ڈرتا ہوں۔ جو اپنے آپ کو "آرٹسٹ" کہتے ہیں۔ پروفیسر صاحب نے ذرا مسکرا کر کہا "یہ کیسے؟" میں نے کہا "یونہی ذرا یہ لوگ کچھ عجیب سے واقع ہوئے ہیں۔ ان کا باوا آدم نرالا ہے۔" میرے دوست کو میری بات کا یقین نہ آیا۔ کہنے لگے "تم آرٹسٹوں سے کُھلی ناانصافی کر رہے ہو۔" میں نے کہا "میں آپ کو ایک آرٹسٹ کا واقعہ سناتا ہوں۔ اس کے بعد آپ خود فیصلہ کر لیجیے گا کہ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ ٹھیک ہے یا نہیں۔"

پروفیسر نے ذرا دلچسپی لیتے ہوئے کہا "اچھا سنائیے۔"

میں نے کہا سنئے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے۔ پچھلی گرمیوں میں میں گلمرگ گیا تھا۔ وہاں میں نے ایک اوسط درجے کی کوٹھی جس کا نام "پیراڈائس" تھا۔ کرایہ پر لی۔ اور اپنی قیام گاہ کا پتہ اپنے سب احباب کو لکھ بھیجا۔ پتہ لکھنا تو صرف بہانہ تھا۔ دراصل اُن پر یہ ظاہر کرنا مقصود تھا۔ کہ میں کس طرح اُن سب پہ بازی لے گیا ہوں۔ یعنی جب وہ لاہور اور ملتان کے جہنموں میں جل رہے ہیں۔ میں نو ہزار فٹ کی بلندی پر بیٹھ کر چائے نوش کر رہا ہوں۔ میرے خطوط کا پہنچنا تھا۔ کہ چاروں طرف سے دوستوں نے جواب میں خط لکھنے شروع کر دئے کہ وہ پہلی فرصت میں میرے پاس گلمرگ آ رہے ہیں۔ خیر بہت سے دوستوں نے تو آنے کی دھمکی دی۔ مگر ایک صاحب نے جو کچھ لکھا اُس پر عمل بھی کیا۔ یہ میرے "آرٹسٹ" دوست دیویندر بھائی تھے۔ اب یہ صحیح ہے۔ کہ اگر کسی شخص سے میں کوسوں دور بھاگنا چاہتا ہوں تو وہ بھائی دیویندر ہیں۔ میں نے سمجھا تھا کہ تین سو میل کے فاصلے پر میں بھائی دیویندر سے بالکل محفوظ ہوں۔ مگر یہ معلوم نہ تھا۔ کہ عزرائیل کی طرح وہ ہر جگہ پہنچ سکتے ہیں۔ خط میں اُنہوں نے لکھا تھا کہ "مختصر سا سامان لے کر اتوار کو گلمرگ پہنچ رہا ہوں۔" مگر جب تشریف لائے تو معلوم ہوا کہ اُن کے نزدیک "مختصر" اور "مفصل" میں بہت کم فرق ہے۔ ان کا مختصر سا سامان ایک وزنی بستر۔ متعدد چھوٹی چھوٹی گٹھڑیوں۔ دو جہازی ٹرنکوں۔ ایک سُندریا۔ اور ایک کُتے کے پِلّے پر مشتمل تھا۔ چونکہ آپ اپنے آپ کو آرٹسٹ کہتے ہیں اس لئے ہر بات میں جدت پیدا کرنا آپ کا خاصہ ہے۔ چنانچہ جب موٹر سے اُترے تو آپ کے کندھے پر سُندریا تھی اور ہاتھ میں پلّے کی رسی۔ کالر اُلٹا لگا رکھا تھا۔ اور سر کے بال بے طرح بڑھ رہے تھے۔ بڑے تپاک سے ملے۔ اور گھر تک تمام راستہ اپنے ہم سفروں کی کور ذوقی کا ماتم کرتے آئے۔ کیونکہ اُن میں سے کئی اصحاب آپ کی سُندریا پر پھبتیاں اُڑاتے رہے تھے۔ میں نے اُن کے پاس خاطر سے ہمدردی کے چند کلمات کہے۔ اور ہم ادھر اُدھر کی باتیں کرتے "پیراڈائس" میں پہنچ گئے۔ ......

دوسرے دن میں اُنہیں سیر کے لئے لے گیا۔ مگر مجھے پہلے ہی دن معلوم ہو گیا کہ بھائی دیویندر کو ساتھ لے جانا کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔ آپ راہ چلتے ہوئے اپنی دونوں آنکھیں قدرتی مناظر پر رکھتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو کسی راہگیر کے ساتھ ٹکر کھاتے ہیں یا ہر آدھ گھنٹے کے بعد کسی درخت یا چٹان سے سر ٹکتے ہیں۔ چنانچہ پہلی دفعہ جب وہ ایک یورپین لیڈی کے ساتھ ٹکرائے تو مجھے ایسا معلوم ہوا گویا وہ دیدہ دانستہ اُس سے بغلگیر ہونے لگے تھے وہ خاتون بیچاری بہت گھبرائی اور میں نے معذرت پیش کر کے معاملہ سلجھایا۔ مگر اس کے بعد دیویندر بھائی نے تقریباً

ہر ایک راہگیر سے ٹکرانا اپنا معمول بنا لیا۔ اور میں اُنہیں ایک لمحہ میں "کیا دلفریب منظر ہے"! اور دوسرے میں "معاف کیجئے صاحب۔ چوٹ تو نہیں لگی" کہتے ہوئے سُنتا اور دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا کہ ان کو سڑک پر چلنا بھی نہیں آتا۔ یہ سمجھ کر کہ اگر سڑک پر یہ اس طرح ہر کہ و مہ سے ٹکراتے رہے تو شاید ہاتھا پائی تک نوبت پہنچے۔ میں اُنہیں ایک پگ ڈنڈی کی جانب لے گیا۔ یہ ایک نہایت تنگ اور پتھریلا راستہ تھا، اور میں نے اُنہیں ذرا محتاط ہو کر چلنے کو کہا مگر وہ عادت سے مجبور تھے۔ اس لئے برابر اِدھر اُدھر جھانکتے جاتے تھے یکلخت جبکہ وہ شاید دور افق کی طرف کچھ دیکھ رہے تھے۔ اُن کا پاؤں پھسلا اور قبل اس کے میں اُنہیں سنبھال سکتا۔ وہ نیچے ڈھلوان پر لڑھک چکے تھے۔ ان کے اس طرح گرنے پر مجھے پہلے تو کچھ مسرت ہوئی۔ سوچا ان کو یہیں پڑا رہنے دوں۔ اور سیدھا گھر لوٹ چلوں۔ مگر پھر خیال آیا آخر مہمان ہیں۔ اس لئے ان کو وہاں سے نکالنا میرا فرض ہے۔ خوش قسمتی سے گہرائی زیادہ نہ تھی۔ اور ایک دو کاندار اتفاق سے آس پاس موجود تھے۔ ان کی اور چند مزدوروں کی مدد سے بھائی صاحب کو نکالا گیا۔ پتہ چلا۔ کہ آپ کا پاؤں بُری طرح لچک کھا گیا ہے۔ بڑی مشکل سے اُنہیں گھوڑے پر بٹھا کر گھر لائے۔

کوٹھی کے نزدیک کسی ڈاکٹر یا طبیب کا دواخانہ نہ تھا۔ اس لئے ایک کشمیری پہلوان کو جو موچ نکالنے میں ماہر تھا بلا لائے۔ اب وہ بھائی صاحب کے پاؤں پر مالش کرنا چاہے تو بھائی صاحب اُسے ہاتھ نہ لگانے دیں۔ وُہ ہاتھ آگے بڑھائے اور یہ پاؤں پیچھے ہٹائیں۔ یہ کھیل بڑی دیر تک جاری رہا۔ آخر کشمیری پہلوان نے ایک دفعہ لپک کر جو پیر پکڑا تو بھائی دیویندر نے ایک بلند چیخ مار کر پہلوان کی پھرتی کی داد دی اور "ہائے مر گیا" کہہ کر اوندھے مُنہ فرش پر گر پڑے۔ اس کے بعد جوں جوں وہ مالش کرتا گیا۔ بھائی صاحب کی چیخیں بلند سے بلند تر ہوتی گئیں۔ اور پھر وہ بے طرح ہانپنے لگے اور میری طرف نمناک آنکھوں سے دیکھ کر بولے "کیوں کیا جان نکلوا کر ہی دم لو گے"! میں نے پہلوان کی طرف دیکھا، وہ کہنے لگا۔ "ابھی پندرہ منٹ میں درست کئے دیتا ہوں۔ یہ تو یونہی چلا رہے ہیں۔" بڑی مشکل اور خوشامد سے پہلوان صاحب کو اُن کی فیس دے کر رخصت کیا۔

اُس رات بھائی دیویندر نے چیخ چیخ کر سارے گھر والوں کی نیند حرام کی۔ ہر دس منٹ کے بعد وہ پوری طاقت سے چلاتے "ہائے میں گلمرگ کیوں آیا۔ افسوس مجھے کتنا درد ہے" خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔ اور میں ایک ڈاکٹر صاحب کو جو گلمرگ سیر و تفریح کے لئے آئے تھے، بُلا لایا۔ اُنہوں نے مالش کے لئے ایک دوا دی۔ اور سینکنے کے متعلق ہدایات دیں، بہت سی تشفی دی اور چلے گئے۔ بھائی دیویندر دس دن تک بستر میں رہے۔ اس عرصہ میں مجھے اُن کی بندریا اور اُن کے پلّے کی دیکھ بھال خود کرنی پڑی کیونکہ بندریا اُن کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھی اور پلے پر تو وہ بکے ہوئے تھے۔

گیارہویں دن وہ سہارا لے کر چلنے کے قابل ہوئے۔ میں خوش ہو رہا تھا کہ اب بندریا کو صبح و شام سیر کرانے کے ناخوشگوار فرض سے نجات ملی۔ مگر اُسی دن بندریا کو کھانسی کی شکایت ہو گئی۔ اب بھائی دیویندر کے ارشاد اور اصرار کے مطابق مجھے اُسے سرینگر مویشیوں کے ہسپتال میں لے جانا پڑا۔ جونہی میں سری نگر میں لاری سے اُترا۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کا مجمع میرے پیچھے ہو لیا۔ اور جب میں بازار میں داخل ہوا۔ تو سب نے یہی سمجھا کہ میں کوئی پڑھا لکھا قلندر ہوں جو سری نگر بندریا کا تماشا دکھانے آیا ہے۔ اس لئے بہت سے تماشائی میرے پیچھے ہو لئے۔ اور مجھ پر عجیب و غریب سوالات کی بوچھاڑ کرنے لگے۔ مثلاً آپ کہاں سے آئے؟ بندریا کا تماشا کہاں کریں گے؟ آپ کتنے عرصے سے بیکار ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ خیر جوں توں کر کے بندریا کو ہسپتال میں دکھایا۔ دوا لی اور بخرابی بسیار واپس گلمرگ پہنچا۔

دو تین دن کے بعد بھائی دیویندر بالکل ٹھیک ہو گئے۔ اب وُہ کچھ لکھنے پڑھنے کی طرف متوجہ ہوئے۔ بھائی دیویندر بیک وقت افسانہ نویس مصور اور شاعر واقع ہوئے ہیں۔ اس لئے وہ صبح کو افسانہ لکھتے۔ دوپہر کو اشعار موزوں کرتے۔ اور شام کو منظر کشی کرتے۔ عموماً ہر شام وُہ مجھے کسی بلند چوٹی پر لے جاتے۔ اور وہاں قدرت۔ شفق۔ خوبصورتی جیسے موضوعات پر مجھے لیکچر دیتے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ وہ اپنا تصویر کشی کا سامان گھر بھول آتے۔ اُس حالت میں یا تو مجھے اُن کی بندریا کو تھامنا پڑتا تاکہ وہ گھر جا کر سامان لے آئیں یا خود گھر سے سامان لیجانا پڑتا۔ وُہ گھنٹوں وہاں بیٹھے اپنی تصویر "گلمرگ میں شام کا منظر" کھینچتے اور مٹاتے رہتے۔ یہاں تک کہ رات پڑ جاتی۔ اور میں حیران ہوتا۔ کہ وہ اس اندھیرے میں افق کی جانب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کیا دیکھ رہے ہیں۔ پھر جب بہت دیر ہو جاتی اور میں اُنہیں ڈرتے ڈرتے گھر چلنے کو کہتا۔ تو وُہ فرماتے "میں اب تصویر مکمل کر کے آؤں گا۔ تم میرا کھانا یہیں پہنچا دینا"! اور چونکہ وہ ہر روز ایک نئی چوٹی پر بیٹھ کر منظر کشی کرتے تھے۔ اس لئے نوکر کی بجائے مجھے ہی اُن کا کھانا پہنچانا پڑتا تھا۔ .....

جس دن آسمان پر بادل چھائے ہوتے اُس دن بھائی دیویندر مجھے گھر نہ بیٹھنے دیتے۔ کیونکہ مینہ میں بھیگنا اُن کی دانست میں قدرت کے

کھلے حمام" میں نہاتا تھا۔ اس لئے نہ خود جھانتے جاتے اور نہ مجھے لے جانے دیتے۔ ایک دن ہم گلمرگ سے دو تین میل دور نکل گئے۔ اتنے میں پہلے بارش اور پھر اولے پڑنے شروع ہو گئے۔ میں دوڑ کر ایک چرواہے کی جھونپڑی میں پناہ گزین ہؤا۔ مگر بھائی دیویندر سر سے ہیٹ اُتار کر کہنے لگے "آہا کیسا دلفریب نظارہ ہے۔ کیا خوب اولے پڑ رہے ہیں" باوجودیکہ میں نے اُنہیں دو تین دفعہ جھونپڑی میں آنے کے لئے کہا مگر وہ برابر سڑک پر ننگے سر کھڑے اولوں کا نظارہ "محسوس کرتے" رہے......

ایک عجیب بات اُن میں یہ تھی کہ ان کو وقت بے وقت افسانہ یا نظم لکھنے کے لئے نئے موضوع سوجھتے رہتے۔ چنانچہ کئی دفعہ چلتے چلتے کسی ٹھہری ہوئی موٹر کے قریب وہ کھڑے ہو جاتے اور جیب میں سے ڈائری نکال کر کچھ اس طرح نوٹ کرتے کہ دیکھنے والے سمجھتے۔ موٹر کا نمبر نوٹ کر رہے ہیں۔ کئی دفعہ رات کے دو یا تین بجے مجھے نیند سے بیدار کرتے اور پوچھتے "تمہارے پاس پنسل اور کاغذ کا ٹکڑا ہے؟ بڑا اچھا خیال سوجھا ہے۔ نوٹ کر لوں۔ کہیں ذہن سے اُتر نہ جائے۔" ایک رات جونہی میری آنکھ کھلی۔ دیکھا کہ آپ کا بستر خالی ہے۔ حیران ہؤا کہ کہاں گئے۔ اُٹھ کر اِدھر اُدھر ڈھونڈھا۔ تو معلوم ہؤا کہ لائبریری میں بیٹھے افسانہ لکھ رہے ہیں میں نے ذرا ترشروئی سے کہا "یہ کیا حماقت ہے!" کہنے لگے "تم چلو میں ابھی افسانہ لکھ کر آتا ہوں۔ خدا کی قسم نہایت اچھوتا پلاٹ سوجھا ہے" ایک اتوار کو چند اور اصحاب کے ساتھ کھلن مرگ جانے کا پروگرام بنایا۔ بھائی دیویندر خاص طور پر کھلن مرگ جانا چاہتے تھے کیونکہ اُنہیں وہاں سے "دریائے جہلم کی وادی" کا منظر کھینچنا مطلوب تھا۔ جب ہم سب تیار ہو گئے تو بھائی دیویندر ایک منٹ کے لئے لائبریری میں گئے۔ آدھ گھنٹہ گذر گیا مگر وہ باہر نہ آئے۔ میں اُنہیں بلانے گیا تو دیکھا کہ لائبریری کا دروازہ اندر سے بند ہے۔ آواز دی۔ کہنے لگے "بھائی تم کھلن مرگ ہو آؤ۔ میں اب نظم مکمل کر کے ہی اُٹھوں گا" میں نے کہا "عجب بدتمیزی ہے" کہنے لگے "بھائی اگر اب مکمل نہ ہوئی تو کولیرج کی نظم قبلا خاں کی طرح ہمیشہ ادھوری رہے گی......"

خیر اس قسم کی عجیب و غریب حرکات کا کہاں تک شمار کروں۔ سب سے عجیب حرکت تو اُنہوں نے گلمرگ سے واپس آتے ہوئے کی۔ جب موٹر ٹانہال پہنچی۔ تو وہاں ایک آدھ گھنٹہ آرام کرنے کے لئے اُترے۔ کھانا کھانے کے بعد آپ سگریٹ لینے بازار کی جانب گئے۔ مگر پون گھنٹہ تک واپس نہ آئے۔ میں ان کی تلاش میں گیا۔ سارا بازار چھان مارا مگر پتہ نہ چلا۔ بازار سے نکل کر میں پہاڑ کی طرف گیا۔ وہاں دیکھا کہ ایک چشمے کے کنارے پانی میں پاؤں لٹکائے، ماتھے پر ہاتھ رکھے کچھ سوچ رہے ہیں۔ میں نے کہا "قبلہ کیا؟" فرمانے لگے "یہ چشمہ مجھے نہایت پسند ہے۔ اسی چشمے پر شکنتلا اور میں نے محبت اور وفا کا پیمان باندھا تھا۔ آہ! بیچاری شکنتلا اب اس دنیا میں نہیں۔ خدا اُسے جنت نصیب کرے۔ مگر میں آج آنسو بہا بہا کر اس چشمے میں ایک آبشار ملا دوں گا" میں نے کہا "اُٹھو۔ کیا بے سروپا باتیں کرتے ہو۔ اُدھر ڈرائیور سخت بیتاب ہو رہا ہے" اس پر دیویندر بھائی جھنجھلا کر بولے "تمہیں کچھ تمیز نہیں۔ جذبات سے تو تم بالکل کورے ہو۔ تمہیں مجھ سے زیادہ اپنے ڈرائیور کا خیال ہے" اس کا جواب میں کیا دیتا۔ بڑی منت سماجت کی کہ اُٹھو اب چلیں مگر وہ برابر آنسو بہائے چلے جاتے تھے اور کبھی کبھی رومال سے منہ پونچھ کر کہتے "پیاری شکنتلا یہ مت سمجھنا کہ میں تمہیں آسانی سے بھول جاؤں گا"

مختصر یہ کہ میں اُنہیں چشمے کے کنارے بیٹھا چھوڑ کر واپس بازار میں آیا۔ کچھ دیر اور انتظار کیا مگر جب وہ چار بجے تک نہ لوٹے۔ تو مجبوراً ڈرائیور سے موٹر چلانے کو کہا۔ دو ہفتے کے بعد ایک دن اتفاقاً میری ملاقات بھائی دیویندر سے ہال روڈ پر ہوئی۔ میں نے سمجھا کچھ شکوہ شکایت کریں گے مگر معلوم ہؤا۔ کہ وہ مجھ سے بے حد خوش ہیں۔ کیونکہ میں اُنہیں اُس چشمے پر اکیلا چھوڑ کر آ گیا تھا۔ اُنہوں نے بتایا کہ وہ ٹانہال پورے دس دن رہے اور ہر روز اُس چشمہ پر جاتے رہے۔ اس کے بعد اُنہوں نے جیب میں سے ایک تصویر نکالی۔ جو اُنہوں نے خود کھینچی تھی۔ اس میں ایک غم زدہ چہرہ ڈبڈبائی آنکھوں سے چشمے میں مچھلیوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ نیچے لکھا تھا۔ "آرٹسٹ کی محبوبہ"!

یہ واقعہ سنکر میرے دوست بشیر احمد جنہیں خود آرٹسٹ ہونے کا فخر ہے کہنے لگے "میرا اب بھی خیال ہے کہ دیویندر بھائی اپنی ہر حرکت میں حق بجانب تھے۔ اگر ایک آرٹسٹ ایسی باتیں نہ کرے تو پھر آرٹسٹ اور انسان میں فرق ہی کیا ہے"

کنہیالال کپور ایم۔اے۔

ایک منظر

تھکی تھکی سی ہر اک شاخ نے لی انگڑائی — وفورِ خواب سے غنچے کی آنکھ بند ہوئی

گیا ہے سونگھ ہر اک شے کو نیند کا اژدر — کلی خموش ہے پتّی کی اوڑھ کر چادر

ترا خیال بھی مجھ پر تبسّم افشاں ہے — فضائے باغ میں جگنو کا نور رقصاں ہے

سکوت اپنے اشاروں کے راز کھولتا ہے — فلک زمیں پہ ستاروں کے راز کھولتا ہے

ٹپک کے اشک مِرا دے رہا ہے اس کا جواب — وہ تارا ٹوٹا ہے اک آسماں سے شکلِ حباب

خموش جھیل کا پانی، خموش اس کا خروش — کنول کا پھول بھی ہے سطحِ آب پر خاموش

مِرے خیال کی گہرائیوں میں ہے خنداں — کنول کے پھول کی صورت ترا جمال اے جاں!

پڑا ہے جھیل کے سینے پہ کیوں کنول خاموش

تاثرات سے منظر کے ہو گیا مدہوش!

مسعود شاہد

غزل

جو نگاہِ شوق میں ہو کمی تو یقیں کرو کہ حجاب ہے
مجھے برقِ طور سے کم نہیں وہ نظر جو زیرِ نقاب ہے

تجھے اپنے عفو کا واسطہ مری خامیوں کا نہ کر گلہ
تری چشمِ مست کی ہر ادا مری لغزشوں کا حساب ہے

ابھی غم کے چشمے ابل پڑیں ابھی اگ عشق کے ڈھل پڑیں
مری زندگی کو نہ چھیڑیئے مری زندگی وہ رباب ہے

وہی پیش و پس وہی تاب و تب اُدھر اک نظر اِدھر اک نفس
اسی کشمکش میں ہے زندگی نہ سوال ہے نہ جواب ہے

تری ہر نگاہ طرب فزا مگر اپنے دل کو یہ کیا ہوا
نہ وہ ولولے، نہ وہ مشغلے، نہ شراب ہے، نہ شباب ہے

ابھی ثبت تھے، ابھی مٹ گئے، ابھی جی رہے تھے کہ مر گئے
کوئی نقش ہے کہ سراب ہے کوئی زندگی ہے کہ خواب ہے

جو کبھی چمک بھی ہوئی اُدھر تو کچھ اس طرح کہ تڑپ گئے
عجب اُس کی شانِ نمود ہے، عجب اپنا حال خراب ہے

یہ خبر کہاں تجھے واعظا کہ ہے کوئی نکتہ نواز بھی
تجھے ہر گھڑی یہی گفتگو یہ عذاب ہے، وہ ثواب ہے،

حرماںؔ خیرآبادی

ہار جیت

(ایک تمثیل)

افراد:- شوہر ——— بیوی ——— ملازم

وقت ۲۹ ستمبر ۱۹۴۰ء شام۔

منظر:-

ہندوستانی دیوان خانہ، فرنیچر بیحد مختصر ہے۔ وہ اٹھنے پر کمرہ خالی نظر آتا ہے۔ مگر ملحقہ کمرے سے برتن پٹکنے اور کسی پر بار بار بگڑنے کی آواز آ رہی ہے۔ بالکل ایسی جیسی ایک ہندوستانی باورچی خانے سے کسی بیگم کے بگڑنے، وہ خفا ہونے کی، ممکن ہے شوہر پر غصہ اتارا جا رہا ہو، دو منٹ کے وقفے کے بعد ایک نحیف لانبے قد کا نوجوان داخل ہوتا ہے، چہرے سے وہ تمام علامات ظاہر ہیں جو ایک ہندوستانی کلرک کو پہچاننے میں مدد دیتی ہیں، چہرا پھیکا، گال پچکے ہوئے، آنکھوں پر عینک، سر پر سیاہ بال کی ٹوپی، جسم پر شیروانی، ڈھیلا پاجامہ شیروانی کے اوپر کے نصف بٹن کھلے ہوئے، نوجوان کی بے تکلفی کو دیکھنے سے یہ اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ وہی اس گھر کا مالک ہے، لہذا ہمارا یہ خیال کہ باورچی خانے میں بیوی شوہر پر بگڑ رہی ہے قریب قریب غلط معلوم ہوتا ہے، نوجوان بغل میں کاغذوں کا پلندہ دبائے ہوئے ہے۔ داخل ہونے پر ٹوپی اتار کر میز پر رکھ دیتا ہے۔ اور پلندے سے دن کا تازہ اخبار نکال کر پڑھنے لگتا ہے، چونکہ چہرہ اخبار سے ڈھنکا ہوا ہے اس لئے یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ وہ کس قسم کی خبریں پڑھ رہا ہے یا کچھ پڑھ بھی رہا ہے یا بیوی سے بچنے کے لئے یونہی اخبار منہ کے سامنے تھامے ہے، باورچی خانے سے پھر برتن پٹکنے کی آواز آتی ہے، اور پھر یکایک کوئی کمرے میں داخل ہوتا ہے ساڑھی میلی، بال بکھرے ہوئے۔ ہاتھ کوئلے کی وجہ سے کالے، چہرہ حسین آنکھوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی وہ بے حد دلکش ہوں گی مگر اب بیک وقت ماں اور باورچی کے فرائض انجام دیتے رہنے کی وجہ سے کچھ ماند پڑ گئی ہیں۔ چونکہ نزول باورچی خانے سے ہوا ہے۔ اس لئے چہرے پر غازہ اور ہونٹوں پر سرخی کی تلاش کرنا فضول سی بات معلوم ہوتی ہے، چہرہ غصے سے لال۔ بھنویں تنی ہوئی ظاہر ہے کہ گھر کی مالکہ ان کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی، وہ کچھ دیر بغور شوہر کو دیکھتی ہے پھر نہایت متانت سے کہتی ہے:-

بیوی:- اچھا تو آپ آ گئے؟ (جیسے میاں کے آنے کا انہیں یقین ہی نہیں)

شوہر:- (بغیر کسی قسم کی حرکت کے) جی نہیں، میں آ گیا۔

بیوی:- معاف کیجئے میں سمجھی آپ نہیں آئے، ——— تو آج کوئی دوست سینما جانے والا نہیں ملا؟

شوہر:- (اخبار بدستور چہرے پر) ملا کیوں نہیں؟

بیوی:- تو سینما کیوں نہ گئے آپ؟

شوہر:- (اخبار ذرا نیچے کر کے تا کہ چہرہ نظر آ سکے) نہیں گیا!

بیوی:- نہیں گیا؟ ——— سمجھی! آج پھر میرے لئے ایثار کیا گیا ہے شکریہ!

شوہر:- تمہیں تو ہمیشہ مذاق ہی سوجھتا ہے۔

بیوی:- مذاق؟ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔

شوہر:- کاش تم سمجھ سکتیں کہ آج میری باتیں مذاق سے کس قدر بعید ہیں۔
(اخبار میز پر پھینک دیتا ہے۔)

بیوی:- جی ہاں! مذاق سے دور رہے لیکن "ایثار" کرنا بھی تو مشکل ہے!

شوہر:- خیر اگر تمہیں مجھ پر یقین نہیں تو چھوڑو ان باتوں کو، غلطی میری تھی، اگر رفعت کے ساتھ ہی چلا گیا ہوتا تو بہتر ہوتا۔

بیوی:- اب بھی جا سکتے ہیں آپ! ابھی صرف چھ بجے ہیں،

شوہر:- ہنسئے! خوب ہنسئے!! حماقت جو کی ہے میں نے۔

(اخبار دوبارہ اٹھا کر صفحے پر مایوسانہ نگاہ ڈالتا ہے، اس مسافر کی طرح جس کے سامنے سے ریل چھوٹ چکی ہو)

بیوی:- میں پوچھتی ہوں آخر یہ بے پروائی کب تک جاری رہے گی؟

شوہر:- بے پروائی؟ نہیں تو! میں تو تمہاری بے حد پروا کرتا ہوں، اتنی جتنی شاید میں خود اپنی بھی نہیں کرتا!

بیوی:- میری پروا کو بھاڑ میں جھونکیئے! یہ تو آپ اس وقت سے کہہ رہے جس وقت سے آپ مجھے بیاہ کر کے گھر لائے ہیں۔ میرا مطلب ہے آخر کچھ گھر کی فکر بھی تو کرنی چاہیے۔

شوہر:- گھر؟ لیکن ایک ملک میں دو بادشاہ کس طرح حکومت کر سکتے ہیں! ابھی گئے ہفتے تم نے مجھے تاکید کی تھی کہ میں گھر کے کاموں میں کوئی دخل نہ دوں!

بیوی:- تو گویا گھر کے معاملے سے آپ کو کوئی سروکار نہیں! لیکن میں کہتی ہوں کہ اس طرح سے تو دو دن بھی کاروبار نہیں چل سکتا، آپ ہی نے کہا تھا کہ مرد اور عورت زندگی کی گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ جب تک پہیے برابر اور ایک ساتھ نہ ہوں گاڑی نہیں چل سکتی۔

شوہر:- لیکن مجھے کسی طرح تو چین ہو، گھر کے معاملے میں تم میری مداخلت گوارا کرنا نہیں چاہتیں، باہر کے کاموں میں مجھے آزادی نہیں، تو اب بتاؤ کہ اس پہیے کا کوئی دوسرا مصرف بھی ہے یا نہیں؟

بیوی:- باہر کے کاموں میں تو ویسے ہی آپ کو آزادی حاصل ہے تنخواہ جب تک پوری ختم نہ ہو جائے آپ گھر میں قدم ہی نہیں رکھتے۔ "کپڑے والے کا بقایا دینا ہے، بنئے کا بل چکانا ہے، مکان کا کرایہ ادا کرنا ہے" اور ہفتے میں دو دو روز سینما کی سیر (سینما کے لفظ پر شوہر ذرا چونک جاتا ہے اور پھر صفحے پر نظریں گاڑ دیتا ہے۔ بیوی بیان جاری رکھتی ہے) اور اگر میں کسی مہینے ساڑھی یا ننھے کے کپڑے کے لئے کہوں تو کفایت شعاری پر لکچر شروع ہو جاتا ہے۔

شوہر:- اوہو! مطلب سعدی دیگر است، لیکن معاف کیجئے گذشتہ ماہ آپ کے لئے ایک عدد ساڑھی اور ننھے کے لئے کپڑا آ چکا ہے اس پر مزید اخراجات کے لئے نقد پیسے تو تمہیں مل ہی چکے ہیں، پھر یہ شکایت کاہے کی؟

بیوی:- یہ لو! وہی بات ہوئی نا جس کا مجھے پہلے ہی سے ڈر تھا، آپ نے یہ سب کچھ صرف میرے لئے نہیں کیا، میں تو صرف ایک ساڑھی کی گنہگار ہوں، سو وہ جوں کی توں دھری ہے، کہئے تو لا دوں!

شوہر:- توبہ توبہ! میرا ہرگز یہ مطلب نہیں، میں تو صرف ——— (اخبار اٹھاتے ہوئے) بات یہ ہے کہ آج دلکش ٹاکیز میں ———

بیوی:- جی ہاں! دلکش ٹاکیز میں ایک بہترین فلم کی نمائش ہو رہی اور آپ کا وہاں جانا ضروری ہے، آپ کے پاس پیسے نہیں، ۲۹ تاریخ جو ہے ٹھہرئیے میں ابھی آتی ہوں،

(تیزی سے اندر جاتی ہے اور کاغذ میں لپٹی ہوئی ساڑھی کو میز پر لا کر پٹک دیتی ہے)

لیجئے! حرام ہے جو اسے میں نے ہاتھ بھی لگایا ہو لے جائیے اسے، واپس کر دیجئے، شاید سینما کے لئے پیسے وصول ہو جائیں۔

شوہر:- ارے بابا خدا کے لئے اس سینما کے لفظ کو بار بار نہ دہراؤ میں دیوانہ ہو جاؤں گا، کان پکڑتا ہوں جو دوبارہ سینما کا نام لوں، میں تو صرف تمہارے لئے ———

(ملحقہ کمرے سے ننھے کے رونے کی آواز آتی ہے، پہلے آہستہ آہستہ پھر بتدریج بڑھتی ہوئی چونکہ ہندوستانی گھر میں ننھے کی آواز کا وہی درجہ ہے جو انگریزی فلموں میں بیک گراؤنڈ موسیقی کا، لہٰذا اس کی آواز سے میاں بیوی کی گفتگو میں کوئی خلل نہیں ہوتا، البتہ بحث جاری رکھنے کے لئے بیوی کو ایک نیا مضمون ہاتھ آ جاتا ہے)

بیوی:- آپ سینما سے کیوں توبہ کرتے ہیں، میں ہی منہ میں قفل دئے لیتی ہوں، میرے لئے دوسروں کے عیش میں کیوں خلل ہو، (مڑ کر غصے سے چلاتی ہے) داؤد! داؤد! کان پھوٹ گئے ہیں تیرے، ادھر لا ننھے کو ——

(ملازم ننھے کو احتیاط سے گود میں اٹھا کر لاتا ہے اور بیوی کی گود میں ڈال دیتا ہے)

میرا بچہ! دوا پلائی اس کو؟

ملازم:- دوا! کیسی دوا بیگم؟

بیوی:- کیسی دوا؟ الٹا مجھی سے پوچھ رہا ہے؟ نکٹے پاجی چور! ایک گھنٹے سے چیخ رہی ہوں کہ دوا پلا دوا پلا مگر تجھے تو اپنے کپڑے دھونے سے فرصت نہیں، کیا کہیں برات کا بلاوا ہے یا سینما کی تیاری ہے؟

ملازم:- مگر آپ نے تو مجھ سے دوا پلانے کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہا تھا، میں تو آلو چھیل رہا تھا بیگم، کپڑے تو میرے ابھی تک کھونٹی پر ہی ٹنگ

سہے ہیں۔

بیوی:- چپ رہ بدتمیز کہیں کے! الٹا مجھے جھٹلاتا ہے۔ (بچے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) میرا لال! دیکھو تو بخار کے مارے اس کا سر پھٹا جا رہا ہے اور مکار کہتا ہے میں نے دوا کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہا، نکل یہاں سے، میرا منہ کیا دیکھ رہا ہے۔ جیسے مالک ویسا نوکر۔

(داؤد کا منہ تعجب سے کھلا رہتا ہے، اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتا ہے مگر آخری فیصلہ سن کر ناکام باورچی خانے میں لوٹ جاتا ہے۔ بیوی بچے کو گلے سے لپٹا لیتی ہے، اس دوران میں شوہر کے چہرے پر کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوتی، جیسے وہ ان باتوں کا عادی ہے، اس کے لئے جو کچھ ہو رہا ہے بالکل فطری طور پر ہو رہا ہے اور اس کے خیال میں ایسا ہونا لازمی ہے)

شوہر:- (اٹھ کر بیوی کی طرف بڑھتے ہوئے) لاؤ میں اسے دوا پلا دوں، اسے بخار کب چڑھ آیا؟ تم نے تو اس کا ذکر بھی نہیں کیا!

بیوی:- (تیزی سے پیچھے ہٹتے ہوئے) رہنے دیجئے، آپ کو گھر کے کاموں سے کیا سروکار؟ اب مجھے اپنے بچے کی بیماری کے متعلق بھی آپ سے باقاعدہ "تذکرہ" کرنا ہوگا۔ "اطلاع" دینی ہوگی، دفتر کے کاموں سے فرصت کہاں؟ سینما اور اخبار بینی کے لئے بمشکل وقت نکلتا ہے، پھر گھر کے کاموں میں دلچسپی لینے کے لئے وقت کہاں ملے؟ گھر میں چاہے فاقہ ہو لیکن آپ کے سیر تماشے میں کوئی فرق نہ آئے، دو روز سے سبزی ادھار منگوائی جا رہی ہے گوالن کل سے نہیں معلوم کہاں مر کھپ گئی ہے، "ننھے" کے لئے دودھ کی ضرورت تھی آخر کلیجے پر پتھر باندھ کر چپ ہو رہی۔

شوہر:- دودھ ایرانی کے ہوٹل سے منگوا لیا ہوتا، یوں بھی اکثر چیزیں وہاں سے ادھار آتی ہیں، کیا چار پیسے کا دودھ دینے سے وہ انکار کر دیتا؟

بیوی:- میں کہتی ہوں یہ بے شرمی کی زندگی مجھے کب تک بسر کرنی ہوگی؟ جو چیز دیکھو ادھار، آخر اس ادھار کی نحوست سے کبھی چھٹکارا بھی ملے گا، تم نے تو ساری شرم گھول کر پی لی ہے مگر مجھے تو محلے کی عورتوں میں ناک اونچی رکھنی ہے، اب ننھے کا دودھ بھی ادھار ہی آئے گا۔

شوہر:- مگر گوالن تو برسوں سے ادھار دودھ دے رہی ہے!

بیوی:- میں کہتی ہوں آپ کو کبھی عقل آئے گی یا یونہی ہمیشہ بدھو بنے رہیں گے؟ بھلا گوالن اور ہوٹل کا بھی کوئی مقابلہ ہے؟

(بچہ پھر اونچے سروں میں اپنی راگنی الاپنے لگتا ہے)

داؤد! داؤد!! سن رہا ہے کن پھٹے، لے جا اسے جھولے میں ڈال!

(داؤد بغیر ایک لفظ کہے بچے کو گود میں لے کر چلا جاتا ہے، بیوی بھی مڑ کر جانا چاہتی ہے)

شوہر:- میں کہہ رہا تھا ــــ یہ اخبار ــــ

بیوی:- (تیزی سے پلٹتے ہوئے) جی ہاں اخبار سے اپنا دل بہلائیے! اب اخبار ہی کھانے کو بھی دے گا۔

(پھر جانا چاہتی ہے)

شوہر:- سنو تو! میرا مطلب ہے ــــ وہ میں نے تم سے جو وعدہ کیا تھا ــــ

بیوی:- جی ہاں! وعدہ! کس روز آپ نے وعدہ نہیں کیا؟

شوہر:- مگر سنو تو، آج میں سچ مچ بالکل مجبور ہوں۔ قسم ہے جو جیب میں ایک پائی بھی ہو، میں بہت شرمندہ ہوں۔

بیوی:- شرمندہ؟ آج بات کیا ہے؟ بہت زیادہ عزت افزائی ہو رہی ہے! آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟

شوہر:- میں ــــ مجھے سخت افسوس ہے۔ گذشتہ ہفتے میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ سینما لے چلوں گا، مگر بدقسمتی دیکھئے آج ۲۹ر تاریخ ہے۔ جیب میں ایک پائی نہیں، سوچا تھا آئندہ ہفتے تنخواہ ملے گی تو دیکھ آئیں گے، مگر یہ اخبار دیکھئے، (اخبار بڑھاتے ہوئے) آج "عورت" کا آخری دن ہے۔

(نہایت افسردگی کی حالت میں کرسی پر بیٹھ جاتا ہے اور انتہائی کوشش کرتا ہے کہ وہ مغموم نظر آئے، بیوی جوں جوں اخبار پڑھتی ہے اس کا رنگ پھیکا پڑتا جاتا ہے اور چہرہ متانت اور سنجیدگی کا نمونہ بن جاتا ہے۔)

بیوی:- لیکن آپ نے مجھ سے اب تک کہا کیوں نہیں؟

شوہر:- تم نے کہنے کا موقعہ ہی کب دیا؟ اور کہہ کے بھی کیا کرتا، جیب میں ایک پھوٹی کوڑی بھی تو نہیں!

بیوی:- لیکن میں خود اس کا انتظام کر لیتی!

شوہر:- تم؟ کس کا انتظام؟

بیوی:- پیسوں کا!

شوہر:- پیسوں کا؟ مگر تم انتظام کس طرح کرتیں؟

بیوی:۔ (بیتابی سے) میں سب کچھ کر لوں گی! چلئے جلدی کیجئے!

(میز پر پڑے ہوئے ساڑھی کے بنڈل کو اٹھاتے ہوئے)

کیا وقت ہوا ہے ابھی؟

شوہر:۔ (جلدی سے کلائی پر دیکھتے ہوئے) چھ بجکر پانچ منٹ۔

بیوی:۔ تو ابھی کافی وقت ہے! میں دو منٹ میں ساڑھی پہن لیتی ہوں، آپ بھی ذرا منہ ہاتھ دھو ڈالئے۔

شوہر:۔ لیکن پیسے کا انتظام؟

بیوی:۔ کہہ تو دیا میں سب کچھ کر لوں گی!

شوہر:۔ لیکن ننھے کا دودھ جو نہیں آیا!

بیوی:۔ میں کہتی ہوں اٹھو گے بھی یا اور دیر میں دیر لگاؤ گے؟

(ہاتھ سے پکڑ کر اٹھاتی ہے۔)

شوہر:۔ اور کھانا کون تیار کرے گا؟

بیوی:۔ داؤد جو ہے!

شوہر:۔ اور ننھا کیا اکیلا ہی گھر میں رہے گا؟

بیوی:۔ اسے ساتھ لے لوں گی۔

شوہر:۔ لیکن ننھا بخار میں پھنک رہا ہے! آخر محلے والے کیا کہیں گے؟

بیوی:۔ (بیتابی سے) مجھے آپ سے زیادہ ننھے کی فکر ہے! اب اٹھو گے بھی؟

شوہر:۔ لیکن ——

بیوی:۔ (احتجاجاً) لیکن ویکن کچھ نہیں! جلدی چلئے (اندر جانے کے لئے مڑتی ہے)

شوہر:۔ تو پھر سچ مچ چلوں؟

بیوی:۔ (پلٹ کر) اس میں شک کی کیا بات ہے؟

شوہر:۔ تو پھر منگواؤں تانگہ؟

بیوی:۔ (اندر سے) ہاں ہاں، ضرور!

(شوہر کھڑا ہو جاتا ہے اور ملازم کو بلاتا ہے)

شوہر:۔ داؤد! ارے او داؤد

ملازم:۔ (اندر سے آتے ہوئے) جی حضور!

شوہر:۔ جلدی! ایک تانگہ!

ملازم: بہت اچھا حضور!

(داؤد باہر جاتا ہے، شوہر فاتحانہ مسکراہٹ سے گھڑی کی طرف دیکھتا ہے، پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

محمد فاروقی

مقامِ حیرت

یوں دلِ غمزدہ کو ملتا ہے پیغامِ سرور — جس طرح آخرِ شب نورِ سحر کا ہو ظہور

آپ کو ہے مجھے محفل میں بلانا منظور — میرا احساس سپاسِ عالمِ انوار و سرور

پھر خیاباں بہ خیاباں ہے بہاروں کا ہجوم — پھر گلستاں بہ گلستاں ہے جہاں مسرور

شب کے سائے ہیں جمالِ سحری میں روپوش — نور موجود ہے اور گہبر دھندلکے مفرور

میری دنیا کو ملی نورِ مسرت کی نوید — میری دنیا سے غم و رنج کی کلفت ہوئی دور

برگِ گل نغمہ بہ لب فرطِ طرب سے ہے آج — خندۂ گل سے گلستاں کی فضا ہے پُر نور

پھر ہر اک قطرۂ شبنم کا دھڑکتا ہوا دل — گلِ صد چاک کو دینے لگا پیغامِ سرور

پھر فضاؤں میں وہ مستی ہے کہ اللہ اللہ — وجد میں آ گئے گویا مرے احساس و شعور

اس فضا میں دلِ حیراں ہمہ تن استفسار — کیا مجھی پر ہیں یہ الطاف مرے ربِّ غفور

مجھ سے ہنس کر یہ ستاروں کی خموشی نے کہا

بندۂ عشق! تری آہِ سحر ہے منظور

عبدالعزیز فطرت

ایک نظم اور ایک غزل

انتظار

نیند کے ماتے سو چکے ہوں گے
اب اُسے کون آنے سے روکے؟
چپکے چپکے سے سمٹی سمٹی سی، رات کی پردہ داریوں کو لئے
سوچتا ہوں وہ آ رہی ہوگی

چار سو دوڑتی ہے خاموشی
راہ پر کھیلتی ہے تاریکی
اس بھیانک سمے سے بے پروا، حسن کی شعلہ باریوں کو لئے
سوچتا ہوں، وہ آ رہی ہوگی

دُور کیوں پتے کھڑکھڑاتے ہیں
کس کے پاؤں سے ٹوٹے جاتے ہیں
میرے رنگیں خیالوں کی دیوی! عشق کی رازداریوں کو لئے
سوچتا ہوں کہ آ رہی ہوگی

ہر قدم پر قیامتیں برپا!
ہر ادا پر اٹھائے اک فتنہ!
مجھ کو دیئے سکون کی دنیا! دل میں کچھ بے قراریوں کو لئے
سوچتا ہوں وہ آ رہی ہوگی

میرے دل کی امنگ جاگ اُٹھی
ساز کی ہر ترنگ جاگ اُٹھی
اک نیا راگ چھیڑ جائے گی۔ عیش کی نغمہ باریوں کو لئے
سوچتا ہوں وہ آ رہی ہوگی

دلشاد کلانچوی

غزل

ہیں دل کے لئے آزار بہت
آلام بہت، افکار بہت

کچھ کثرت پر موقوف نہیں
چُبھنے کے لئے اک خار بہت

چھیڑے نہ کوئی بے دردی سے
نازک ہیں نفس کے تار بہت

اک دن وہ ذرا سی بے لطفی
ہے آج بھی دل پر بار بہت

دیوانہ کسی کا کہلائیں
اس فکر میں ہیں ہشیار بہت

دعوے ہے زباں پر الفت کا
ہے پست مگر معیار بہت

اِس طولِ امل سے کیا حاصل
بس دیکھ لیا سرکار، بہت

ہر چند کسی قابل نہ سہی
حیرت ہے مگر خوددار بہت

عبدالمجید حیرت

دنیائے ادب

تازہ ترین رسائل کے اہم مضامین

کا تذکرہ اور جائزہ

معارف نومبر

ملکی انتظام میں اورنگ زیب کا حصہ

جے پور عہد مغلیہ کی سب سے اہم راجپوت ریاست تھی اور اس کے فرمانروا مغل شہنشاہوں کے ساتھ رشتے ناطوں کے ذریعے بھی وابستہ تھے۔ مغل دربار کا یہ ایک خاص دستور تھا کہ بڑی بڑی ریاستوں کے مہاراج کمار یا دوسرے شہزادے مرکزی حکومت کے زیر سایہ سیاسی اور فوجی تربیت حاصل کرتے تھے، اور اس طرح نہ صرف انہیں قرب کے بہت سے مواقع حاصل ہوتے رہتے تھے بلکہ بارہا وہ اپنی ریاستوں کی طرف سے وکالت کے فرائض بھی سرانجام دیتے تھے۔ یہ وکلا جہاں ایک طرف دربار مغلیہ کو اپنے اطراف کی سیاسی صورتِ حالات سے مطلع رکھتے تھے، وہاں وہ اپنی ریاستوں کو بھی مرکزی حکومت کے حالات سے پوری طرح باخبر رکھتے تھے۔ اُن کی اس سیاسی خط و کتابت کو جو درباری حالات پر مشتمل ہوتی تھی، اصطلاحی طور پر "اخبارات" کہا جاتا تھا۔ حال ہی میں محض اتفاق سے جے پور کے ایک پرانے توشہ خانے سے ایسے اخبارات کا ایک انبار دستیاب ہوا ہے، جو وکیلِ جے پور نے عہد عالمگیر میں اپنی ریاست کو ارسال کئے تھے۔ ان اخبارات سے شہنشاہ اورنگزیب کے درباری اور سیاسی آئین و مشاغل پر ایک جدید روشنی پڑتی ہے۔ معزز معاصر معارف میں "ا۔ د" صاحب کے قلم سے ان کا ایک نہایت مجمل سا خاکہ شائع ہوا ہے، جسے ہم ان اوراق میں پیش کرنے کی عزت حاصل کرتے ہیں۔ مضمون کی مخصوص کیفیت کسی تفصیلی تعارف، تبصرے یا حاشیے کی متحمل نہیں ہوسکتی، اس لئے خلافِ دستور ہم اس بار اس خوشگوار معمول سے دست بردار ہوتے ہیں۔ (ادارہ)

"ریاست جے پور میں اورنگ زیب کے درباری اخبارات کے جو فائل نکلے ہیں۔ اُن کے مواد سے پروفیسر سری رام شرما نے اسلامک کلچر میں "ملکی انتظام میں اورنگزیب کا حصہ" کے عنوان سے ایک دلچسپ مضمون لکھا ہے۔ اس کی تلخیص پیش کی جاتی ہے وہ لکھتے ہیں، کہ

.... ۵ صفحوں کے اخبارات سے اورنگ زیب کے ایسے سچے اور صحیح حالات معلوم ہوتے ہیں جن پر کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔

ان اخبارات پر نظر ڈالنے سے اورنگ زیب کی ایک بڑی اور نمایاں خوبی یہ سامنے آتی ہے کہ وہ اپنے معمولات میں کبھی تساہل کو دخل نہ دیتا تھا۔ اس کے دورِ حکومت کے اڑتیسویں سال میں دس مہینہ تک کے جو اخبارات ہیں۔ ان میں صرف گیارہ دن فرصت کا ذکر ہے، اگر وہ دیوان عام کے دربار میں نہ آسکتا تھا تو غسل خانہ (حمام) یا اس سے بھی پوشیدہ گوشہ "خلوت خانہ" میں کام کرتا تھا۔

دکن میں اس کے کام کے چار طریقے تھے۔ عموماً وہ دیوان عام یا خاص میں بیٹھ کر ملکی معاملات طے کیا کرتا تھا، اور عدل و انصاف کے لئے ایک دیوانی عدالت خاص طور پر منعقد ہوتی تھی اس کے بعد غسل خانہ میں اجلاس ہوتا تھا، اس میں داخلہ کے خاص قوانین تھے۔ یہاں صرف حکومت کے ذی اقتدار امرا کو باریابی کا شرف حاصل ہوتا تھا، خلوت خانہ میں فوری یا ہنگامی اجلاس ہوتے تھے، یہاں وہی امرار داخل ہو سکتے تھے جن کو بادشاہ کسی ضروری اور اہم مسئلہ میں خاص طور سے مشورہ کے لئے طلب کرتا۔ دکن میں فوجی معاملات کی اہمیت کی وجہ سے دیوان عام اور خاص کا مخلوط دربار ہوتا تھا، جو اسی لحاظ سے دیوان عام و خاص کہلاتا تھا۔ اجلاس میں

داخلہ کے لئے بادشاہ کے اجازت نامے جاری ہوتے تھے، بعض امرار کو مستقل پروانہ ملتا تھا، ان میں سے اگر کوئی بغیر اطلاع کے کچھ دن غیر حاضر رہتا تو اسے از سرِ نو اجازت نامہ حاصل کرنا پڑتا تھا، ہر منصب دار کو پروانہ کے حصول کے لئے درخواست دینے کی اجازت تھی، جو تقریباً ہر ایک امیر کو اس کے تقرر، تبادلہ اور ترقی کے وقت مل جاتا تھا، جو امرا کسی ملکی یا ذاتی جرم کی بنا پر معتوب ہو جاتے تھے، وہ دربار کی حاضری سے محروم کر دیئے جاتے تھے، دیوان خاص و عام کوئی جمہوری اسمبلی نہیں تھی، اس کی شرکت کے لئے خاص قوانین اور پابندیاں تھیں، بادشاہ اور دربار مل کر حکومت کرتے تھے۔ اور امرا و حکام، یا ان کے نمائندے جو دار السلطنت سے دُور رہتے تھے، بادشاہ کے حکم سے باریاب ہوتے تھے، اور اپنے محکموں کے متعلق فرمان شاہی حاصل کرتے تھے۔ غیر سرکاری اشخاص کا کہیں ذکر نہیں ملتا، البتہ ملکی معاملات کے سلسلہ میں شاہی حکام کے ساتھ بادشاہ کی اجازت سے کبھی کبھی کوئی غیر سرکاری آدمی بھی نظر آ جاتا ہے۔ جشن کے موقعوں پر البتہ ایک تماشائی کی حیثیت سے گذر ممکن تھا۔

دربار سے متعلق چند خاص حکام مقرر تھے، جن کا کام شاہی احکام کو جاری کرانا تھا، ان کا افسر اعلیٰ میر تزک کہلاتا تھا، جو آداب شاہی کا نگہبان ہوتا تھا۔ عرض مقرر، معتمد خاص کی حیثیت رکھتا تھا۔ شاہی اخبار نویس اول کے ماتحت بہت سے اخبار نویس اور داروغہ ڈاک چوکی اپنے کثیر مخبروں کے ساتھ دربار میں حاضر رہتے تھے، جو ہر وقت احکام شاہی لے جانے کے لئے پابہ رکاب رہتے تھے، ان کے علاوہ خدام خاص مثلاً محافظ جان (باڈی گارڈ) میر شکار، محافظ خیمہ شاہی، بادشاہ کے خاص خدم و حشم میں شمار ہوتے تھے، جن کا کام بادشاہ کی جان کی حفاظت اور اس کی راحت رسانی تھی۔

ہر دن کی کارروائی عموماً گذشتہ دن کے احکام سنانے کے بعد شروع کی جاتی تھی۔ پھر ان احکام پر مہر تصدیق ثبت کر کے ان کو مختلف محکموں میں عمل درآمد کے لئے بھیجدیا جاتا تھا۔ اس کے بعد دیوان یا بخشی ان سرکاری خطوط کو پڑھ کر جو صوبہ دار، ضلع دار، سالار شہر پناہ، سردار مہم اور جنگی افسروں کے یہاں سے آتے تھے، ان کا خلاصہ سنا دیتا تھا، اور بادشاہ وہیں ان پر احکام صادر کر دیتا تھا، اس کے بعد بعض حکام اعلیٰ ان خطوط کو سناتے تھے جنہیں بیرونی حکام دار السلطنت کے باہر سے خفیہ بھیجتے تھے۔ ان پر بھی فوراً شاہی حکم صادر ہو جاتا تھا۔ کبھی کبھی حکام اعلیٰ کے کارندے مفصلات کے حاکموں کی وہ گذارشات پیش کرتے، جو سرکاری ذریعے سے پیش نہ ہو سکی تھیں۔ اس کے بعد شاہی اخبار نویس مختلف جگہوں کے مقامی اخبار نویسوں کے بیانات کا خلاصہ سناتا تھا، اس کے بعد حکام اعلیٰ اپنے ان ماتحت افسروں کی جن پر ان کی خاص نظر توجہ ہوتی تھی، مناسب الفاظ میں سفارش کرتے تھے، بعض محافظ شاہی یا معزز درباری اپنی طرف سے بھی تجویز پیش کرنے کا حق رکھتے تھے، جاسوس اور مخبر براہ راست بادشاہ کو اپنی کارگذاری کی خبر دیتے تھے۔ میر توپ خانہ کو بھی یہ عزت حاصل تھی۔

درخواستوں اور ان پر احکام شاہی کی مختلف صورتیں ہوتی تھیں، اکثر عرضی پرداز اپنی کارگذاریوں اور خدمات کا ذکر کر کے شاہی لطف و کرم کے امیدوار ہوتے تھے۔ انہیں بادشاہ وہیں پر جزاً یا کلاً قبول یا مسترد کر دیتا تھا بعض اوقات نامنظوری نرم اور دلچسپ الفاظ میں ہوتی تھی، جیسے "امیدوار باشد"، بعض وہ درخواستیں جو عام مسلوں کے ساتھ نہیں آتی تھیں، مختلف محکموں کے افسر جیسے دیوان یا بخشی یا خانِ سامان کے پاس رپورٹ کے لئے بھیج دی جاتی تھیں، بعض اوقات درخواست کنندہ کو حصولِ سفارش کے لئے اس کے افسر اعلیٰ کے پاس بھیجا جاتا تھا، جب بادشاہ کی توجہ اور اس کے تجسس کی وجہ سے کسی معاملہ کی اہمیت بڑھ جاتی، تو اس کی تحقیقات کے لئے ایک مقامی کمشنر مقرر کیا جاتا، لیکن یہ صورت انہی حالات میں پیش آتی تھی، جب ماتحت حکام میں سے کسی کو یہ شکایت ہوتی، کہ اخبار نویس یا افسر اعلیٰ نے دربار میں اس کی درخواست پیش نہیں کی۔

تمام منصب داروں کا تقرر ان کی ترقی، تنزل، برطرفی، عطیہ، جاگیر اور محکموں کے تعین پر نہ صرف شاہی حکم ہوتا تھا، بلکہ اس کی مفصل ہدایات بھی ہوتی تھیں، اور اس میں بڑے چھوٹے کی کوئی تخصیص نہیں تھی، البتہ صوبہ دار، سردار مہم، سالار شہر پناہ، اور فوجدار اپنے ماتحتوں کے تقرر کے لئے سفارش کر سکتے تھے، لیکن فوجدار یا ضلع دار کا تقرر اس سے مستثنیٰ تھا، اس سے مرکز کا بار کچھ کم ہو جاتا تھا، کابل اور بنگال کے صوبہ داروں کو اس بارے میں زیادہ اختیارات تھے لیکن نہ اتنے کہ وہ اپنے کو خود مختار سمجھنے لگیں، اسی لئے اکثر سرحد کے صوبہ داروں کی سفارشیں رد بھی کر دی گئی ہیں، جب کسی مہم کی سرکردگی پر کوئی امیر مقرر کیا جاتا، (جیسے جے سنگھ مرہٹوں کے خلاف بھیجا گیا تھا) تو اسے غیر معمولی اختیارات دیئے جاتے تھے، تاکہ اس مہم میں کوئی دشواری نہ پیدا ہو،

محکمۂ مال کی حیثیت کسی قدر جداگانہ تھی، ۳۱ر جولائی ۱۶۸۹ء کو ایک فرمان جاری ہوا جس میں یہ ہدایت تھی، کہ مال کے وہ کاغذات جو صوبہ کے افسروں نے بھیجے ہیں، دفتر شاہی میں داخل نہ کئے جائیں، بلکہ اپنے مرکزی دیوان کے محکمہ میں پیش کئے جائیں، اور غالباً برابر یہ اصول جاری رہا۔ کیونکہ پھر اخبارات میں اس کا ذکر نہیں ہے، لیکن صوبائی دیوان کی عرضداشتیں بادشاہ کے حضور میں پیش کی جاتی تھیں، چنانچہ ۱۷ر جولائی ۱۶۹۳ء کو دیوان تالکوکن کے معروضات

دربار عام میں پیش کئے گئے تھے، ۱۷ رمئی ۱۶۷۰ء کے فرمان سے واضح ہو جاتا ہے، کہ کس طرح مالیات کے کاغذات کا تصفیہ کیا جاتا تھا، دیوان خالصہ اور دیوان دکن کو حکم تھا کہ وہ اپنی رپورٹ اور تجاویز سربمہر شاہی دیوان کے پاس بھیجا کریں، جو بادشاہ کو ضروری اقتباسات سنا دیا کرے گا،

اخبار نویسوں کی رپورٹ پر بھی اکثر احکام صادر ہوا کرتے تھے، چنانچہ ۱۹ اپریل ۱۶۹۶ء کو بیدار بخت کی فوج سے یہ اطلاع آئی، کہ پرتھوی سنگھ اور دوسرے منصب داروں نے اپنے فرائض سے غفلت کی، اس پر حکم ہوا کہ وہ قابل تعزیر قرار دیئے گئے، اسی طرح ۲۳ راگست ۱۶۸۹ء کو حیدرآباد کے اخبار نویس نے اطلاع دی کہ بخشی کی علالت اور گھر چلے جانے کی وجہ سے آج کل یہ عہدہ خالی ہے اس رپورٹ پر فوراً دوسرے بخشی کا تقرر ہو گیا، اگرچہ منصب داروں کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اپنی تجویزیں اور سفارشیں بادشاہ کے حضور میں بھیجا کریں، اگر وہ قابل سماعت ہوں گی، تو انہیں قبول حاصل ہوگا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ چالیس سپاہیوں کے افسر کا تقرر بھی وہ خود کرتا تھا، گویا کوئی کام خواہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو اس کے حکم اور مرضی کے بغیر انجام نہیں پا سکتا تھا، دربار کے کاغذات سے معلوم ہوتا ہے کہ جو بات بھی اس کے علم میں آجاتی تھی، خواہ وہ کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو، اسے کبھی نظر انداز نہیں کرتا تھا، اور فوراً اس کی طرف توجہ کرتا تھا۔ گو اس سے مرکز کا کام بہت بڑھ گیا تھا، لیکن اس سے اس کی غیر معمولی محنت اور انہماک کا پتہ چلتا ہے، اسی طرح ۲۳ رجولائی ۱۶۸۹ء کو دیوان حیدرآباد کے خلاف شکایت پہونچی، وہاں کے مقامی اخبار نویس کو حکم ہوا کہ اس بارے میں وہ اپنی رپورٹ بھیجے، ۱۵ اپریل ۱۶۹۲ء کو اہل حصار کے مقامی فوجدار کے خلاف شکایت موصول ہوئی، کہ وہ ناواجب ٹیکس وصول کرتا ہے، اور بہت سے باشندوں کو بلاوجہ قید کر دیتا ہے، اس پر صوبہ دار دہلی کو تحقیقات کر کے رپورٹ پیش کرنے کا حکم ہوا، اسی طرح ایک منصب دار کے خلاف اس کے خادم کی شکایت سے یہ ظاہر ہوا کہ اس کے پاس مختلف مہریں ہیں، جن سے وہ جعل بنایا کرتا ہے — اسے گرفتار کر کے ۱۹ اپریل ۱۶۹۳ء کو دربار میں لایا گیا، اور قید سخت کی سزا ملی، ایک مرتبہ فوج کے صراف نے اپنے چودھری کے خلاف شکایت کی، ۲۵ اپریل ۱۶۹۳ء کو منصب دار کو اس شکایت کی تحقیقات کا حکم ملا، ایک چوری کا واقعہ پیش ہوا، صوبہ دار کو حکم ہوا کہ نائب فوجدار کو تحقیقات اور چور کے پتہ چلانے کا حکم دیا جائے، ۲۵ جون ۱۶۹۴ء کو یہ اطلاع ملی، کہ ادگیر کا فوجدار سارے مقدمات حتیٰ کہ شرعی معاملات کو خود ہی فیصل کرتا ہے، حکم ہوا کہ آیندہ سے ایسا نہ کرے، ۴ اپریل ۱۶۹۴ء کو ایک مغل سود خوار نے قرض کی وصولی میں اپنے مقروض کی جان لے لی، اس کے بدلے میں اس کے نوکروں نے مغل کو مار ڈالا، گوالیار میں مغلوں کے چار گھوڑے گم ہوگئے، وہاں کے فوجدار سعادت خاں کو حکم ہوا کہ اس نقصان کی تلافی کرے، ایک مرتبہ کشمیر کے صوبہ دار نے معروضہ پیش کیا، کہ کشمیر کی آب و ہوا اس کو راس نہیں آتی ہے، اس پر ۱۱ رجون ۱۶۷۰ء کو حکم ہوا کہ وہ سرما لاہور میں گذارا کرے، ۲۸ رمئی ۱۶۷۰ء کو حکم ہوا کہ بخشی شامیانہ کے زیر سایہ کام کیا کریں، جب کبھی کسی حاکم کے ظلم اور جبری ٹیکس وصول کرنے کی خبر پہنچتی تھی، تو ان کی پوری پوری خبر لی جاتی تھی، ۲۱ رنومبر ۱۶۶۹ء اور ۱۷ مارچ ۱۶۷۰ء کو سرکاری نوکروں کو مختلف خدمات کے پروانے اور عام لوگوں کے بے خطر سفر کے اجازت نامے ملے، ۱۴ راپریل ۱۶۷۰ء کو ایک ڈکیتی کی خبر آئی، فوجدار کو حکم ہوا کہ مقدمہ کی تحقیقات کر کے مفسدوں کو قانون شریعت کے مطابق سخت سزائیں دی جائیں۔

آداب عالمگیری میں جو خطوط ملتے ہیں، ان سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے، کہ اس کے سارے کاموں میں کس قدر مرکزیت تھی، وہ اجمیر میں بیٹھ کر جودھپور اور میواڑ کی فوجوں کو تفصیلی ہدایات اور نقل و حرکت کے متعلق تجویزیں بھیجا کرتا تھا۔ اور مقامی سالاروں کی رپورٹ دیکھ کر ان کی ہمت بڑھاتا تھا، اور جوش عمل کی تلقین کرتا تھا، ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان سالاروں کو خود کسی کام کی آزادی نہ تھی، گو بعض بہانہ ڈھونڈ کر شاہی حکم کی نافرمانی کر جاتے تھے، بادشاہ کا سب سے زیادہ وقت محکمۂ خانساماں پر صرف ہوتا تھا، کارخانوں، عمارتوں، سڑکوں، خیموں، باغ، کھیل اور دوسرے تفریحی مشاغل کے متعلق جتنے سوالات پیدا ہوتے تھے بادشاہ اپنے مذاق کے مطابق ان کو حل کرتا تھا۔

اخبارات سے پتہ چلتا ہے کہ صدر کے فرائض میں وہ دخل نہیں دیتا تھا، قاضی، محتسب، مفتی کے معاملات کی روداد اخبارات میں کم ملتی ہے، یہ لوگ اپنے حدود میں بہت کچھ آزاد تھے، اور کبھی حکام دیوانی کی مداخلت کے شاکی نظر نہیں آتے، البتہ ایک قاضی کے خلاف جبر و تعدی کی شکایت پیش ہوئی تھی۔

اب تک جو کچھ لکھا گیا، وہ زیادہ تر دیوان عام کے متعلق تھا، جہاں تک کام کا تعلق ہے، دیوان اور غسل خانہ میں کوئی فرق نہیں تھا، جب وہ دربار عام میں جانا نہیں چاہتا تھا، تو غسل خانہ میں اجلاس کرتا تھا، اس میں داخلہ کی شرائط کا مختصر بیان اوپر گذر چکا ہے، بعض سرداران ہم سے پوشیدہ اور رازدارانہ مشورہ ہوتا تھا، داخلہ کا پروانہ نقیب کو بھی دیا جاتا تھا تاکہ اسے معلوم ہو جائے کہ کن لوگوں کو داخلہ کی اجازت ہے، ایک محافظ غسل خانہ اس خدمت پر مامور تھا کہ یہاں بھی آداب دربار پورے پورے برتے جائیں، اگر کسی آداب دربار میں کسی منصب دار کی بے عنوانی پر جرمانہ ہو جاتا تھا، تو وہ بغیر ادا کئے ہوئے اپنی جگہ سے نہیں جا سکتا تھا،